

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

# سلسلہ جدید فقہی مباحث

مع تقاریط علمائے کرام

۹

- کاروبار میں اولاد کی شرکت
- قبضہ کی حقیقت اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت
- حقوق و منافع کی خرید و فروخت
- پگڑی اور اس سے متعلق شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت بركاتہم

تأثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی  
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت بركاتہم  
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت بركاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان





علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

# سلسلہ جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 9

کاروبار میں اولاد کی شرکت  
قبضہ کی حقیقت اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت  
حقوق و منافع کی خرید و فروخت  
پگڑی اور اس سے متعلق شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی  
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم  
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان

کاپی رائٹ رجسٹریشن نمبر.....

اسلامی فقہ اکیڈمی کی تحریری اجازت کے مطابق

جملہ حقوق طباعت و اشاعت بحق دارالاشاعت اردو بازار کراچی محفوظ ہیں

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات و کمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاک اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

V-Ref

297-3

حج 1493

140809

جلد 9

﴿..... ملنے کے پتے .....﴾

ادارۃ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی

مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد

دارالاحصاء صدف بلازہ محلہ جنگی پشاور

مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت القلم اردو بازار کراچی

مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

ISLAMIC BOOKS CENTRE  
119-121, HALLI WELL ROAD  
BOLTON BL 3NE, U.K.

AZHAR ACADEMY LTD.  
54-68 LITTLE ILFORD LANE  
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

DARUL-ULOOM AL-MADANIA  
182 SOBIESKI STREET,  
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE  
6665 BINTLIFF, HOUSTON,  
TX-77074, U.S.A.



## فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

۶۵	اولاد کی کمائی سے متعلق خلاصہ / مولانا محمد عثمان بستوی	۱۹	کاروبار میں اولاد کی شرکت
۶۹	والد کی کمائی میں اولاد کی شرکت / مفتی محمد اشرف قاسمی	۲۰	پیش لفظ / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۷۱	سعادتی	۲۰	پہلا باب / تمہیدی امور
۷۳	مسائل شرکت / مولانا محمد حذیفہ محمود	۲۱	سوالنامہ: کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت
۷۴	تیسرا باب / مختصر تحریریں	۲۱	اکیڑی کا فیصلہ
۷۴	والد کے کاروبار میں بچوں کی شرکت کا ایک تجزیاتی مطالعہ /	۲۲	تلخیص مقالات
۷۶	مولانا محمد قاسم مظفر پوری	۲۲	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مولانا ہارون
۷۶	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مولانا زبیر احمد قاسمی	۳۱	رشید ندوی
۷۹	اولاد کی والد کے ساتھ تجارت میں شرکت کے مسائل / شیخ	۳۱	عرض مسئلہ: کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت /
۸۱	سعید عبدالحمید حفیظ حجاوی	۳۷	مولانا خورشید انور اعظمی
۸۱	کاروباری معاملات میں والد اور اولاد کی شرکت کا اسلامی	۳۷	دوسرا باب / تفصیلی مقالات
۸۳	نقطہ نظر / مولانا شیر علی گجراتی	۳۷	کاروباری دنیا میں والد کے ساتھ اولاد کا تعاون - حیثیت
۸۳	کاروباری لین دین میں والد اور اولاد کی شرکت / مفتی انور	۳۷	اور ذمہ داریاں / مولانا شاہجہاں ندوی
۸۵	علی اعظمی	۳۷	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مولانا محی
۸۵	والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت / مولانا سلطان احمد اصلاحی	۳۹	الدین بڑودوی
۸۷	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت کا مسئلہ / مولانا	۳۹	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت کے مسائل /
۸۷	خورشید انور اعظمی	۵۳	ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی
۸۹	والد کے کاروبار میں بیٹوں کی شرکت / مفتی عبدالرحیم قاسمی	۵۳	مسائل کاروبار - والد اور اولاد کی شرکت / مولانا راشد
۹۱	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مفتی جمیل	۷۵	حسین ندوی
۹۱	احمد نذیری	۷۵	والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت کی مختلف نوعیتیں / مولانا
۹۳	بزنس میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مولانا خورشید	۷۹	محمد جعفر علی رحمانی
۹۳	احمد اعظمی	۷۹	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت و تعاون / مولانا
۹۵	بچوں کی شرکت والد کے کاروبار میں - مسائل اور حل /	۷۹	شاہد علی قاسمی
۹۵	مولانا ابوالسفیان مفتاحی	۷۹	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مفتی سلمان
۹۷	کاروبار میں تعاون اور شرکت کی مختلف شکلیں / مفتی محمد ثناء	۷۹	پالنپوری قاسمی
۹۷	الہدی قاسمی		



۱۵۳	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور قبضہ کی نوعیت / مفتی محمد عبید اللہ اسعدی	۹۹	والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت / ڈاکٹر سید اسرار الحق سیبیلی
۱۵۸	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور غرر کے احکام / مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی	۱۰۱	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت کے مسائل / مولانا ابوبکر قاسمی
۱۶۷	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت - اصولی مباحث / مولانا اختر امام عادل	۱۰۳	والد اور اولاد کے مابین کاروباری لین دین کا مسئلہ / مولانا اشتیاق احمد اعظمی
۱۷۴	خرید و فروخت میں ملکیت اور قبضہ کی کیفیت / مولانا ابوسفیان مفتاحی	۱۰۵	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / حافظ شیخ کلیم اللہ عمری
۱۷۹	شریعت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی	۱۰۶	کاروباری معاملات میں باپ اور بیٹوں کی شرکت کا تعین / مولانا صدر الحسن قاسمی
۱۸۴	قبضہ سے پہلے بیع و شراء کے احکام / مفتی نسیم احمد قاسمی	۱۰۷	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت - اسلامی نقطہ نظر / مولانا محمد صادق مبارک پوری
۱۹۳	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام / مفتی جنید عالم ندوی قاسمی	۱۰۸	کاروبار میں اولاد کی شرکت / مولانا ثار احمد گودھروی
۲۰۱	قبضہ سے پہلے فروختگی / مفتی جمیل احمد ندیری	۱۰۹	کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت / مولانا ریاض احمد قاسمی
۲۰۶	قبضہ سے پہلے بیع و شراء کا حکم / مولانا محمد زید مظاہری ندوی	۱۱۱	مسائل شرکت - فقہی نقطہ نظر سے / مفتی لطیف الرحمن مناقشہ
۲۱۳	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں فساد و بطلان کی تعیین / مفتی محمد محی الدین بڑودوی	۱۱۵	جدید تجارتی شکلیں
۲۲۰	خرید و فروخت میں قبضہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم / مفتی شبیر احمد قاسمی	۱۱۷	پیش لفظ / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۲۲۷	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا مسئلہ / مولانا ابوبکر قاسمی	۱۱۸	ابتدائیہ / قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
۲۳۸	بیع میں تحریری وثائق و دستاویز پر قبضہ کی حیثیت / مولانا ابوجندل قاسمی	۱۲۰	پہلا باب تمہیدی امور
۲۴۴	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام / مولانا محمد حنیف	۱۲۰	اکیڈمی کا فیصلہ: قبضہ سے پہلے خرید و فروخت
۲۵۶	قبضہ شرعی سے قبل اشیاء کی خرید و فروخت کا شرعی حکم / مولانا ارشاد قاسمی	۱۲۱	سوالنامہ
۲۶۶	قبل القبض بیع و شراء کی شرعی حیثیت / مولانا مجیب الغفار اسعدی	۱۲۲	تلخیص مقالات
۲۷۲	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مولانا ابوالحسن علی	۱۲۲	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام / مفتی محمد فہیم اختر ندوی
۲۷۷	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عمومی یا خصوصی؟ / مولانا اشتیاق احمد اعظمی	۱۲۸	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۲۸۳	قبضہ سے پہلے بیع و شراء کے مسائل / مولانا ظفر عالم ندوی	۱۳۲	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مفتی محمد فہیم اختر ندوی
		۱۳۵	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مفتی محمد عبید اللہ اسعدی
		۱۳۶	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مفتی نسیم احمد قاسمی
		۱۳۶	قبضہ کی حقیقت اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فقہ اسلامی کی روشنی میں / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی



۳۷۳	خرید و فروخت میں استیلاء اور قبضہ کا مفہوم / مولانا سلطان احمد اصلاحی	۲۸۷	قبضہ سے پہلے ہونے والی خرید و فروخت کا شرعی حکم / مولانا محمد عزیز اختر القاسمی
۳۷۵	کتاب و سنت کی روشنی میں قبضہ کی حقیقت / مفتی انور علی اعظمی	۲۹۷	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت - شریعت کی روشنی میں / مولانا وحید الدین
۳۷۹	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور اس کے چند احکام / مفتی عزیز الرحمن بجنوری	۳۱۱	بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث / مولانا اقبال قاسمی
۳۸۰	اسلام میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا اعتبار / مولانا خورشید احمد اعظمی	۳۱۹	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور چند جدید مسائل / مفتی احمد نادر القاسمی
۳۸۵	بیع پر قبضہ سے پہلے اس کی فروختگی کا حکم / مفتی اسماعیل بھد کو دروی	۳۲۷	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق مسائل و احکام / مولانا محمد ارشد قاسمی
۳۸۸	قبضہ سے پہلے بیع و شراء کا شرعی حکم / مولانا عبدالقیوم پالنپوری	۳۳۲	خرید و فروخت میں تخلیہ کی حیثیت / مفتی محمد شاہد قاسمی
۳۹۱	اشیاء منقولہ کی بیع قبضہ سے پہلے / مولانا منظور احمد قاسمی	۳۳۹	تیسرا باب مختصر تحریریں
۳۹۳	قبضہ سے پہلے کسی چیز کا فروخت کرنا / مولانا احمد حسن	۳۳۹	قبضہ سے پہلے بیع کی شرعی حیثیت / مولانا محمد بہان الدین سنہلی
۳۹۵	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق مسائل / مولانا عبداللطیف پالنپوری	۳۴۳	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شرعی حکم / مولانا زبیر احمد قاسمی
۳۹۷	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مفتی شکیل احمد سیتا پوری	۳۴۶	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی شرعی حیثیت / مولانا شمس پیرزادہ
۳۹۹	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور اس کا حکم / مولانا عبدالرحمن پالنپوری	۳۴۹	بیع قبل القبض فی ضوء الکتاب والسنة / مولانا ڈاکٹر عبداللہ جو لم
۴۰۳	اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کا حکم / مفتی محمد ارشد فاروقی قاسمی	۳۵۲	خرید و فروخت میں قبضہ کی حقیقت اور عرف / مولانا محمد رضوان القاسمی
۴۰۵	شرعی اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض / مولانا ابراہیم بن محمد بڑودوی	۳۵۷	خرید و فروخت میں قبضہ اور تخلیہ کا شرعی معیار / مفتی عبدالرحیم قاسمی
۴۰۶	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور اس کے چند اہم پہلو / مولانا اخلاق الرحمن قاسمی	۳۵۹	شریعت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا حکم / مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی
۴۱۰	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت / مولانا تنویر احمد قاسمی	۳۶۳	بیع و شراء میں قبضہ حس و حکمی کی نوعیت / مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی
۴۱۳	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شرعی حکم / مولانا خلیل احمد قاسمی	۳۶۵	قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور ائمہ کا موقف / مفتی احمد دیواری
۴۱۷	قبضہ سے پہلے متعلق احادیث کی حیثیت اور غرر کے احکام / مولانا محمد اختر قاسمی	۳۶۹	خرید و فروخت میں وثیقہ اور دستاویزات کی حیثیت / ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی
۴۱۹	حقوق کی خرید و فروخت	۳۷۰	شریعت میں قبضہ کا مفہوم و مصداق / مولانا محمد ابراہیم گجیا فلاحی
۴۲۱	پہلا باب تمہیدی امور		



۵۸۰	بیچ / ابو فرحان حنفی	۴۲۱	پیش لفظ / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۵۸۲	بیچ حقوق، سوالات کے جوابات / مولانا شمس پیرزادہ	۴۲۲	ابتدائیہ / مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
۵۸۴	بیچ کی تعریف / مفتی محمد زید مظاہری	۴۲۴	خطبہ استقبالیہ / مفتی اشرف علی صاحب
۵۹۲	بیچ حقوق / مولانا عبداللہ طارق	۴۲۵	عرض داعی / مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
۵۹۵	بیچ کی حقیقت اور حقوق کی بیچ / مولانا محمد طاہر مدنی	۴۲۷	خطبہ افتتاحیہ / مولانا ابوالسعود احمد
۵۹۹	بیچ حقوق / مفتی محمد افضل حسین بستی	۴۳۰	خطابات
۶۰۱	بیچ حقوق کا مسئلہ / مولانا اختر امام عادل	۴۳۴	خطبہ صدارت / حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۶۰۷	بیچ حقوق کا مسئلہ / مولانا مفتی عبدالوہاب صاحب	۴۳۹	اختتامی کلمات / قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
۶۰۸	حقوق کی خرید و فروخت / مولانا انور علی الاعظمی	۴۴۰	اکیڈمی کا فیصلہ
۶۱۰	مناقشہ ازیر صدارت ڈاکٹر شیخ محروس المدرس (بغداد)	۴۴۱	بیچ حقوق، مسئلہ کا تعارف اور چند سوالات / قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
۶۱۵	بیچ مراہجہ اور اسلامی بنکاری		
۶۱۷	اکیڈمی کا فیصلہ	۴۴۶	بیچ حقوق / اسرار عالم ریڈینس دہلی
۶۱۸	سوال نامہ: مراہجہ	۴۵۸	بیچ کی تعریف / مولانا مفتی نظام الدین
۶۱۸	مراہجہ / مولانا مجاہد الاسلام قاسمی	۴۵۹	مال کی حقیقت اور حقوق کی خرید و فروخت / مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۶۲۰	عقد مراہجہ / مولانا محمد برہان الدین سنہلی		
۶۲۳	مراہجہ / مولانا شمس پیرزادہ	۴۷۰	حقوق و منافع کی خرید و فروخت حنفی نقطہ نظر سے؟ ڈاکٹر محمد محروس المدرس
۶۲۵	مراہجہ سے متعلق سوالات کے جوابات / مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی	۴۹۲	حقوق کی بیچ، ایک علمی جائزہ / مولانا محمد صدر الحسن ندوی
۶۲۸	مراہجہ / مولانا محمد نظام الدین رضوی	۵۰۲	حقوق کی خرید و فروخت / مولانا جنید عالم ندوی قاسمی
۶۳۱	بیچ مراہجہ اور اسلامی بینک کاری / مولانا محمد شہاب الدین ندوی	۵۱۴	بیچ حقوق و منافع / مولانا عبید اللہ الاسعدی
		۵۳۱	بیچ حقوق / مولانا محمد نظام الدین رضوی
۶۳۸	مراہجہ سے متعلق مسائل / مولانا محمد صدر الحسن ندوی	۵۳۷	مال کی حقیقت اور منافع کی مالیت کا مختصر جائزہ / مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی
۶۴۲	مراہجہ / مولانا عبدالجلیل قاسمی		
۶۴۴	مراہجہ / مولانا محفوظ الرحمن	۵۴۰	مال کی حقیقت اور بیچ حقوق کا مسئلہ / مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوری
۶۴۴	مراہجہ کے بارے میں / عبدالعظیم اصلاحی		
۶۴۶	مراہجہ کی کاروبار / مفتی عزیز الرحمن مدنی	۵۵۴	مسئلہ بیچ حقوق و منافع / مولانا محمد ظفر الدین مفتاحی
۶۴۹	مراہجہ سے متعلق سوالات کے جوابات / مولانا جمیل احمد نذیری	۵۵۶	حقوق کی بیچ / مولانا معاذ الاسلام سنہلی
		۵۶۳	مسئلہ بیچ حقوق / مولانا محمد طیب الرحمن
۶۵۰	مراہجہ / مفتی محمد زید مظاہری ندوی	۵۶۵	مسئلہ بیچ الحقوق / مولانا زبیر احمد قاسمی
۶۵۵	مراہجہ / مولانا سراج احمد علی	۵۶۷	بیچ حقوق کا مسئلہ / مولانا رفیق المنان القاسمی



۶۹۱	مکانات اور دکانوں کی پگڑی کا مسئلہ / مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی	۶۵۷	مراجم اسلامی تجارت کا ایک اہم جز / مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوری
۶۹۳	پگڑی لینا اور دینا / مولانا مجیب اللہ ندوی	۶۶۱	مناقشہ / زیر صدارت: مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
۶۹۵	دوکان و مکان کی پگڑی کا حکم / مفتی جمیل احمد ندیری	۶۶۹	آخری اجلاس / زیر صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم
۶۰۷	پگڑی کا مسئلہ / مفتی افضل حسین		
۷۰۰	پگڑی کا مسئلہ / مفتی عزیز الرحمن، ممبئی	۶۷۱	دوکان و مکان کی پگڑی کا حکم
۷۰۶	پگڑی کا مسئلہ / مولانا محمد زید	۶۷۳	اکیڑی کا فیصلہ
۷۱۵	تحریری آراء	۶۷۳	پگڑی کا مسئلہ، وجوہات و اثرات / جناب طاہر بیگ
۷۱۵	پگڑی کا مسئلہ / مولانا عبداللہ جوم	۶۷۹	کرایہ داری میں پگڑی یا اسلامی اور اسلام / مشتاق احمد
۷۱۶	پگڑی کا مسئلہ / مولانا محمد آدم پالنیپوری کاکوسی، گجرات	۶۸۲	پگڑی کا مسئلہ، ایک تعارف / قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
۷۱۷	پگڑی کا مسئلہ / مولانا سید نظام الدین صاحب	۶۸۵	کرایہ کے مکانات اور دکانوں کی پگڑی کا مسئلہ / مولانا شمس پیرزادہ
۷۱۷	پگڑی کا مسئلہ / مولانا نسیم احمد قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ		
۷۱۹	مناقشہ / پگڑی کا مسئلہ	۶۸۹	ہندوستان میں کرایہ کنٹرول قانون / ایڈووکیٹ بدروریز







بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تبارک و تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت و لگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرفیولیت عطا فرمائے جو کمی کو تا ہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ”سلسلہ جدید فقہی مباحث“ کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ”اسلامی فقہ اکیڈمی“ کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریض شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ”منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا“ کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالحوں اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہو جائے بہر حال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت و اخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق



قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ بھی مرتبہ ہی ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

تم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ سوانح فقہائین کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ ایڈیٹرز نے ان نکتوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجود نسخے میں شامل ہے۔

۲۔ پورے علمی ذخیرے کو امر فور سے سائٹ میں کمپیوزیشننگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقالات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات اور جوری روٹی ہے تو قدرتی سکون اور اس سوزے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳۔ پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں جمع کیے گئے، پہلے جمع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع پر تین جلدوں میں ہے تو اس عنوان سے دو موضوعات ۳۳ نمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوعات ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴۔ ممکن ہے کہ مستندوں کو ملنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپیوزنگ بہت چلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی دکھایا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعی صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہوا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ بنتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵۔ محمد صاحب "سلسلہ فقہی مباحث" کا سائٹ بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

اس ذخیرے کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریوں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ، اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نفع بناویں (آمین)

والسلام

خلیفہ اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8772017

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

”اسلامک فقہ اکیڈمی ہند“ ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں..... بالخصوص علماء اور دینی غیرت و فکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری و فکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ و صحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

”مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کر سکے۔..... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔



## تقدیم

### شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين الصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک نغی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد مجتم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ پیشی نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاءنا امر ليس فيه امر ولاهي فماذا تأمرنا فيه“

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”شاؤروا الفقهاء العابدین ولا تمضوا فيه برای خاص“

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجے میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

”کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔“

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندہ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہو جاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگا دی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شریعہ کا استنباط کر سکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کر سکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکٹریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجتا کہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے ساہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورہ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی



تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطہ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہو سکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہو سکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربو کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کر لیں..... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجے میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جوئی و با مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ..... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی..... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چون کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ ”جس کی لاشی اس کی بھینس“ جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلوئی کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلوئی کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہوئی ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشبیہ کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر ”جمع بین المذاہب“ اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کر لیا..... اتباع ہوئی کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

”اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔“

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباع ہوئی کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ ”جمع بین الصلوٰتین“ کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تا کہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک مدت قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدت سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطہ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ



میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا..... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مد نظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مد نظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاہب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہوئی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعہ اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہوئی، تشبیہ اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیر اور تکرار عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو..... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلواریں سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے..... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یا کلھن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی..... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمد للہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے دیگر علوم و فنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت و دستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور و توجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# کاربائیں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت (ایک تجزیاتی مطالعہ)

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے انیسویں فقہی سمینار منعقدہ  
مورخہ ۱۲-۱۵ / فروری ۲۰۱۰ء کو جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ میں  
پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات و مناقشات کا مجموعہ

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان





## پیش لفظ

شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جو بھی معاملہ کیا جائے، خواہ وہ قریب ترین رشتہ داروں کے درمیان ہو؛ لیکن اسے واضح ہونا چاہئے، اس میں ایسا ابہام نہیں ہونا چاہئے جو آئندہ نزاع کا باعث بن سکتا ہو؛ اسی لئے خرید و فروخت کی ایسی تمام صورتوں کو منع کیا گیا ہے، جس میں بیچی جانے والی شئی، ادا کی جانے والی قیمت، سامان کی سپردگی کے مقام اور ادھار ہونے کی صورت میں ادائیگی کا وقت مبہم ہو، فقہ میں تجارت کے بہت سے احکام اسی اصول پر مبنی ہیں اور ایک اصول کے طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ جو معاملات کسی پہلو میں ابہام کی وجہ سے آئندہ نزاع کا سبب بن سکتے ہوں، وہ درست نہیں ہوں گے۔

اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ اگر کسی کاروبار میں والد کے ساتھ ان کے بچے بھی شریک ہوں تو جس وقت وہ شریک ہوں اسی وقت یہ معاملہ طے ہو جائے کہ اس معاملے میں ان کی شرکت کس حیثیت سے ہے؟ کیا وہ اس میں پارٹنر ہیں؟ یا ان کی حیثیت ملازم کی ہے؟ یا وہ محض اپنے والد کے معاون و مددگار ہیں؟ افسوس کہ عام طور پر جس وقت لڑکوں کا کاروبار میں عملی اشتراک ہوتا ہے، اس وقت اس بات کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی؛ بلکہ بعض دفعہ تو لوگ اسے احترام کے خلاف سمجھتے ہیں، یا ایسی باتوں کو واضح کرنے میں انہیں حیا محسوس ہوتی ہے، بعد کو جب کاروبار بڑھ جاتا ہے اور خاص کر اس وقت جب والد کا انتقال ہو جاتا ہے تو ان امور کے پہلے سے طے نہ پانے کی وجہ سے بڑی نزاع پیدا ہو جاتی ہے، قریبی رشتہ داروں کے درمیان نفرت کی دیوار قائم ہو جاتی ہے، دلوں میں ایک دوسرے کے تئیں کدورتیں بڑھتی رہتی ہیں، مقدمہ بازی بھی ہوتی ہے اور بعض دفعہ تو قتل و خون تک نوبت آ جاتی ہے۔

آج کل ارباب افتاء اور اصحاب قضاء کے پاس اس طرح کے مقدمات کثرت سے آنے لگے ہیں، اس پس منظر میں ”اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا“ نے اپنے انیسویں فقہی سمینار منعقدہ جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ (گجرات) میں اس موضوع کو بھی شامل کیا تھا، یہ مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، اس کے باوجود بھگت اللہ ملک کے ۳۱ / ممتاز اہل علم اور ارباب افتاء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اکیڈمی کو اپنے مقالات بھیجے، پھر سمینار میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث ہوئی اور تجاویز منظور کی گئیں، ان مقالات، سمینار کے درمیان ہونے والے مناقشات اور تجاویز کا مجموعہ اس وقت قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

عزیزی مولانا محمد ہارون رشید ندوی سلمہ اللہ (رفیق شعبہ علمی) نے توجہ اور خوش سلیقگی کے ساتھ اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے، امید ہے کہ اس اہم مسئلہ پر یہ مجموعہ اہل علم کے لئے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کلید ثابت ہوگا، اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ اکیڈمی کا اصل موقف وہ ہوتا ہے جو تجاویز کی صورت میں طے پاتا ہے، البتہ افادہ و استفادہ کے لئے تمام تحریری کاوشیں پیش کی جاتی ہیں؛ تاکہ مسئلہ کے مختلف پہلو اہل علم کے سامنے رہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کے دوسرے لٹریچر کی طرح اسے بھی قبول عام و تمام عطا فرمائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکرٹری)

۱۶ / صفر ۱۴۳۲ھ / ۲۱ / جنوری ۲۰۱۱ء



## پہلا باب / تمہیدی امور

سوالنامہ:

### کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

تجارت اور کاروبار میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کاروبار شروع کیا، اس وقت اس کے بچے چھوٹے تھے، رفتہ رفتہ کاروبار بھی بڑھا اور بچے بھی بڑے ہوئے اور بڑا لڑکا یا یکے بعد دیگرے کئی لڑکے والد کا ہاتھ بٹانے لگے اور کام میں شامل ہو گئے جب کہ والد سے کوئی واضح معاملہ طے نہیں پایا کہ کاروبار میں تعاون کرنے والے بیٹوں کی حیثیت ملازم کی ہوگی یا پارٹنر کی، یا یہ صرف ان کی طرف سے والدین کا تعاون ہوگا؟ والد کی زندگی میں کوئی بیس سال کاروبار میں معاون رہا، کوئی دس سال، کوئی پانچ سال، بعض دفعہ اسی کاروبار سے دوسری جائدادیں بھی خریدی جاتی ہیں، اب جب والد کا انتقال ہو جاتا ہے، تو یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ والد کے اس کاروبار کی کس طرح تقسیم عمل میں آئے گی؟ کیا پوری جائداد کی ملکیت ہوگی؟ جس بھائی نے اپنی پوری زندگی والد کے ساتھ لگا دی، اس کا حصہ اور جس نے کہیں اور ملازمت کی، باہر جا کر کام کیا، اسی کاروبار کے پیسوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، جس سے مستقبل میں معاشی ترقی کے امکان ہیں اور انہوں نے اپنی آمدنی کو علاحدہ اپنے لئے مخصوص رکھا، ایسے مواقع پر اکثر بعد میں بڑی نزاع پیدا ہو جاتی ہے، اس پس منظر میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

- ۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے، پارٹنر کی، ملازم کی یا معاون کی؟
- ۲- اگر یہی صورت ہو، لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟
- ۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟
- ۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جب کہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟
- ۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنے سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار کو شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگی یا والد کی؟

☆☆☆

## اکیڈمی کا فیصلہ:

### کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

- ۱- شریعت اسلامیہ نے مسلمانوں کو معاملات کی صفائی کی طرف خاص توجہ دلائی ہے، اس لئے مسلمان اپنی معاشرت میں معاملات کی صفائی کا خاص اہتمام کریں، خصوصاً تجارت اور کاروبار میں اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔ ایک شخص تجارت کر رہا ہے، اور اس کی اولاد بھی اس کاروبار میں شریک ہے تو جو بیٹے باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو رہے ہیں، ان کی حیثیت (شریک، اجیر یا معاون کے طور پر) شروع سے متعین ہو جائے، تو خاندانوں میں ملکیت کے اعتبار سے جو نزاعات ہوتے ہیں ان کا بڑی حد تک سدباب ہو جائے گا، اس لئے اس طرح کے معاملات میں پہلے سے حیثیت متعین کرنے کا اہتمام کیا جائے۔
- ۲- اگر والد نے اپنے سرمائے سے کاروبار شروع کیا، بعد میں اس کے لڑکوں میں سے بعض شریک کار ہو گئے، مگر الگ سے انہوں نے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا اور والد نے ایسے لڑکوں کی کوئی حیثیت متعین نہیں کی، تو اگر وہ لڑکے باپ کی کفالت میں ہیں تو اس صورت میں وہ لڑکے والد کے معاون شمار کئے جائیں گے، اور اگر باپ کی زیر کفالت نہیں ہیں تو عرفاً جو اجرت عمل ہو سکتی ہے وہ ان کو دی جائے۔
- ۳- اگر والد کے ساتھ بیٹوں نے بھی کاروبار میں سرمایہ لگایا ہو اور سب کا سرمایہ معلوم ہو کہ کس نے کتنا لگایا ہے تو ایسے بیٹوں کی حیثیت باپ کے شریک کی ہوگی، اور سرمائے کی مقدار کے تناسب سے شرکت مانی جائے گی، سوائے اس کے کہ سرمایہ لگانے والے بیٹے کی نیت والد کے یا مشترکہ کاروبار کے تعاون کی ہو شرکت کی نہیں۔
- ۴- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو لیکن بہ طور احترام دوکان پر والد کو بٹھایا ہو یا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، والد کو دوکان پر بٹھانے یا ان کے نام پر دوکان کا نام رکھنے سے کاروبار میں والد کی ملکیت و شرکت ثابت نہ ہوگی۔
- ۵- باپ کی موجودگی میں اگر بیٹوں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع کسب اختیار کئے اور اپنی کمائی کا ایک حصہ والد کے حوالے کرتے رہے تو اس صورت میں باپ کو ادا کردہ سرمایہ باپ کی ملکیت شمار کی جائے گی۔
- ۶- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا لیکن کاروبار کی جگہ باقی ہو، خواہ وہ جگہ مملوکہ ہو یا کرائے پر حاصل کی گئی ہو، اور اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی جگہ اور اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا تو اس صورت میں جس نے سرمایہ لگا کر کاروبار شروع کیا، کاروبار اس کی ملکیت ہوگی، والد کی ملکیت نہیں ہوگی لیکن وہ جگہ (خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر لی گئی ہو) دوبارہ کاروبار شروع کرنے والے کی نہیں بلکہ اس کے والد کی ہوگی اور والد کی وفات کی صورت میں اس میں تمام ورثہ کا حق ہوگا، اور اسی طرح کاروبار کا گڈول بھی باپ کا حق ہے اور اس کی وفات کے بعد تمام ورثہ کا حق ہوگا۔
- ۷- اس موضوع سے متعلق سماج میں پیش آنے والے مختلف مسائل ہیں جن کو واضح کرنے اور عام مسلمانوں کو ان سے واقف کرانے کی ضرورت ہے؛ اس لئے یہ اجتماع اکیڈمی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ایک مفصل رہنما تحریر تیار کرے اور ان میں جو مسائل قابل تحقیق ہوں حسب گنجائش آئندہ منعقد ہونے والے سمیناروں میں انہیں اجتماعی غور و فکر کے ذریعہ طے کرے۔
- ۸- ائمہ و خطباء اور علماء کرام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں معاملات کی صفائی کے سلسلے میں ذہن سازی کریں، اور شرکت و میراث وغیرہ کے جو شرعی اصول و احکام ہیں ان سے ان کو آگاہ کریں، خاص طور پر والدین، اولاد، بھائیوں اور میاں بیوی کے درمیان شرکت کے مسائل سے واقف کرائیں۔

☆☆☆



## تلخیص مقالات:

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مولانا ہارون رشید ندوی

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا انیسواں فقہی سمینار صوبہ گجرات کے مشہور ادارہ جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، گجرات میں منعقد ہو رہا ہے۔ اکیڈمی کے ذمہ داران اور ارباب حل و عقد نے سمینار سے متعلق جن موضوعات کا انتخاب کیا اور سوالنامہ جاری کیا، ان میں ایک موضوع ”کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت“ بھی ہے۔

ہندوستان کے مختلف اداروں کے علماء، فقہاء اور ارباب علم و دانش نے اس موضوع پر اپنے گرانقدر علمی مقالات اکیڈمی کو ارسال کئے۔

تا دم تخریر تقریباً ۲۶ حضرات کے مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے: جن کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محمد صادق مبارک پوری، مولانا شتا جہاں ندوی، مولانا محمد صدر الحسن ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا لطیف الرحمن، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا فاخر میاں فرنگی محلی، مفتی اشرف قاسمی سعادت، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی خورشید انور اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود اجدوی، مولانا ابو بکر قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا جعفر ملی رحمانی۔

اس موضوع سے متعلق پانچ سوالات جاری کئے گئے، سوالوں پر علماء کی آراء و خیالات نیز دلائل بالترتیب پیش کئے جاتے ہیں:

سوال ۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے؟ پارٹنر کی، ملازم کی، یا معاون کی؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام ہی مقالہ نگاران حضرات نے لکھا ہے کہ لڑکے والد کے معاون ہی قرار پائیں گے۔

(دیکھئے مقالہ: مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا لطیف الرحمن، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبد الرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ناصر الحسن ندوی، مولانا صادق مبارک پوری، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا ابو بکر قاسمی، مولانا محمد حذیفہ، مولانا شیر علی گجراتی، مولانا اشرف قاسمی سعادت، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شتا جہاں ندوی)۔

بعض حضرات نے اسکے ساتھ چند شرائط کا بھی ذکر کیا ہے: مولانا جمیل احمد ندیری صاحب نے اپنے مقالہ میں مزید اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ والد کے مرنے کے بعد اگر بیٹے والد کے کاروبار کو چلاتے رہے اور آگے بڑھاتے رہے تو اس صورت میں سب بیٹے آپس میں برابر کے شریک قرار دیئے جائیں گے۔

بعض مقالہ نگاران کی رائے کے مطابق اس کے لئے تین شرطوں کا ہونا لازمی ہے:

(۱) باپ اور بیٹے دونوں ایک ہی پیشے میں شریک ہو کر کام کر رہے ہوں، (۲) سرمایہ کل باپ کا ہو، (۳) اولاد باپ کی زیر کفالت ہوں، اس صورت میں باپ کی موت کے بعد ترکہ "للذکر مثل حظ الأنثیین" کے تحت تقسیم ہوگا۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا لطیف الرحمن، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد عثمان بستوی)۔

مولانا راشد حسین ندوی صاحب نے مزید کہا کہ الگ سے کام کرنے والے کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب کے مطابق: اگر لڑکے باپ کی عیال میں نہ ہوں تو ان کے عمل کی اجرت شرط کے مطابق ملنی چاہئے۔

"أن يشترك يذنان بمال أحدهما وهو أن يكون المال من مثل أن يخرج أحدهما أيضًا ويعملان فيه معًا والربح بينهما فهذا جائز" (المغنی مع الشرح الكبير: ۵/۱۳۴)۔

جناب خورشید احمد اعظمی صاحب نے کہا کہ: حیثیت تو معاون کی ہوگی، کیونکہ ارکان شرکت مفقود ہے، والد کی وفات کے بعد اس متروکہ کاروبار میں وہ لڑکے جو شریک کار رہے اور وہ جنہوں نے والد کے ساتھ اس کاروبار میں شرکت نہیں کی، سب وراثت میں اپنے شرعی مستحق حصوں کے بقدر حقدار ہوں گے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ لڑکے باپ کے ساتھ ہی رہتے ہوں، ان کے عیال میں ہوں، لیکن اگر لڑکا الگ رہتا ہو، ساری چیزیں الگ ہوں، مگر کاروبار میں ساتھ ہو تو اجر مثل کا مستحق ہوگا۔

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی صاحب نے آپس میں صلح و اتفاق کے ساتھ ایک موزوں حصہ مقرر کر لینے کی تاکید کی تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور بطور حوالہ اس حدیث کو پیش کیا کہ "لا ضرر ولا ضرار" (دیکھئے مقالہ: حافظ کلیم اللہ عمری)۔

مولانا محمد عثمان بستوی صاحب کے الفاظ میں: مذکورہ صورت میں لڑکے کا شریک ہونا تو متعین ہے، کیونکہ اس صورت میں نہ تو شرکت عقد ہے اور نہ تو شرکت املاک البتہ اس کا معاون یا ملازم ہونا اس جگہ کے عرف پر موقوف ہوگا۔

مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ نصوص کو بطور دلائل پیش کیا ہے:

☆ أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للأب، إذا كان الابن في عيال الأب لكونه معيّنًا له ألا تری أنه لو غرس شجرة تكون للأب (ہندیہ: ۲/۲۲۹)۔

☆ لو اجتمع إخوة يعملون في شركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأى (رد المحتار: ۲/۲۸۲)

☆ إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل وولده يعد معيّنًا له، فيه قیدان احترازیان کما تشعر عبارة المتن: الأول أن يكون الابن في عيال الأب، الثاني: أن يعمل معًا في صنعة واحدة إذ لو كان لكل منهما صنعة يعمل فيها وحده فربحه له (شرح المجلة: ۱۲۹۸)۔

☆ أنت ومالك لأبيك فكلوا من كسب أولادكم (ابوداؤد: ۲/۲۹۸)۔

☆ وإن أولادكم من كسبكم (ابن ماجه)۔

☆ ولد الرجل من كسبه (نسائی)۔

☆ إذا عمل أحد في صنعة هو وابنه الذي في عياله واكتسب أموالًا ولم يكن معلومًا أن للابن مالًا سابقًا، فکافة الكسب لذلك الشخص ولا يكون لولده حصّة في الكسب بل يعد وولده معيّنًا وليس له طلب أجر المثل (درر الحکام شرح مجلة الأحكام: ۲/۲۲۵)۔

☆ لو دفع إلى ابنه مالًا يتصرف فيه الابن يكون للأب إلا إذا دلّت دلالة بلى التملیک کذا في الملتقط (عالمگیری: ۲/۲۹۲)



☆ رجل دفع إلى ابنه في صحته ما لا يتصرف فيه ففعل وكثر ذلك فمات الأب إن أعطاه به فالك ل له وإن دفع إليه لأن يعمل فيه للأب فهو ميراث، كذا في جواهر الفتاوى، قال لولده الصغير تصرف في هذا الأرض فأخذ يتصرف فيهما لا تصير مالكا (عالمگیری: ۴/۲۹۲)۔

سوال ۲- اگر یہی صورت ہو، لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران حضرات کی رائیں مختلف ہیں:

بعض حضرات نے کہا کہ اگر سرمایہ معلوم ہو کہ کس نے کتنا لگایا ہے، تو بیٹوں کی حیثیت والد کے پارٹنر کی ہوگی اور سرمایہ کے مقدار کے اعتبار سے شرکت مانی جائے گی (دیکھئے مقالہ: مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا اسرار الحق سیبلی، مولانا شاہد علی قاسمی)۔

لیکن اگر سرمایہ کی مقدار معلوم نہ ہو تب بھی اولاد والد کے شریک ہی ہوں گے گرچہ اس صورت میں والد اور بیٹے سب برابر کے حصہ دار ہوں گے (دیکھئے مقالہ: مفتی اشرف قاسمی سعادت، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا صدر الحسن ندوی، مولانا صادق مبارکپوری، شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا ابو بکر قاسمی)۔

مولانا ثناء الہدی قاسمی صاحب نے اس سلسلہ میں وضاحت کی کہ: یہ معاملہ شرکت کا ہوگا اور طے شدہ شرائط پر عمل ہوگا، نفع و نقصان میں سب برابر کے شریک ہوں گے اور ہر شریک اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کے بقدر کاروبار کا مالک ہوگا۔

جبکہ بعض مقالہ نگاران کے مطابق: یہ شرکت عنان کی صورت ہوگی، رأس المال کے بقدر بھی منافع تقسیم ہو سکتے ہیں اور کمی بیشی کے ساتھ بھی، اصلاً معاہدہ کے مطابق عمل کیا جائے گا (دیکھئے مقالہ: مفتی لطیف الرحمن، مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

بعض حضرات نے کہا کہ اگر شرکت مقصود نہ تھی بلکہ باپ کی اعانت مقصود تھی تو اولاد معاون ہوں گے اور اگر بیٹوں نے قرض کہہ کر سرمایہ لگایا ہو تو بیٹوں کی حیثیت دائن اور مقروض کی ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا سلمان پلپوری، مولانا محمد حذیفہ)۔

مولانا راشد حسین ندوی کے الفاظ میں: اولاً تو دونوں کو چاہئے یہ تھا کہ معاملات صاف رکھتے اور شرکت کے ارکان و شروط کا لحاظ رکھتے، لیکن اب چونکہ شرکت ہوگئی تو مسئلہ صورت میں سرمایہ کے بقدر نفع کا بیٹا مالک ہوگا اور اس مقدار کو باپ کے ترکہ سے خارج رکھا جائے گا (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب نے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: یہ شرکت عنان کی قبیل سے ہے جس میں کئی شرطوں کے ساتھ ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس میں سرمایہ کا برابر و مساوی ہونا شرط نہیں، سرمایہ کے عدم مساوات کے باوجود نفع میں اگر مساوات کی شرط ہے تو فقہاء عراق نے اسے جائز قرار دیا ہے، امام مالک و امام شافعی کے یہاں عدم جواز ہے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا عبدالرحیم قاسمی صاحبان نے اس مسئلہ کے سلسلہ میں دو صورتوں کا ذکر کیا کہ اگر بچوں کی رہائش والد کے ساتھ ہو تو بچے والد کے معاون ہوں گے، لیکن اگر ان کا رہنا سہنا الگ ہو تو وہ سرمایہ کے تناسب سے نفع میں شریک ہوں گے۔

مولانا شیر علی گجراتی صاحب نے اس صورت میں ملکیت باپ کی قرار دی اور بچوں کو ان کا تابع قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر باپ کے ساتھ رہنا، سہنا، کھانا پینا وغیرہ ہو تو تمام بھائی متروکہ مال میں برابر کے شریک ہوں گے، لہذا یہ مال بھی باپ کا ہوگا اور تمام بھائی باپ کے مرنے کے بعد اس مال میں برابر کے شریک ہوں گے۔

مولانا خورشید انور اعظمی صاحب کے الفاظ میں: سرمایہ اگر بغیر معاہدہ کے لگایا ہے تو تعاون ہوگا ورنہ حسب معاہدہ اس کاروبار میں شرکت ہوگی اور یہ شرکت فی الملک ہوگی، جیسا کہ ذکر ہے:

”فإذا خلطا المالين على وجه لا يمكن تمييز أحدهما عن الآخر فقد ثبتت الشركة في الملك فينبى عليه شركة

العقد“ (مبسوط: ۱۱/۱۵۲)۔

مولانا شاہجہاں ندوی صاحب نے اس کی حیثیت متعین نہ کرنے کی صورت میں تبرع قرار دیا اور کہا کہ یہی عرف بھی ہے لہذا بچوں پر لازم ہے کہ وہ اپنا سرمایہ کی حیثیت ضرور متعین کریں اور نفع کا تناسب بھی طے کریں۔

مقالہ نگاران حضرات نے مندرجہ ذیل نصوص کو بطور دلائل پیش کیا ہے:

☆ نظیرہ: ویؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتماعا في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوى ولا التمييز فأجاب بأنه بينهما سوية (رد المحتار: ۲/۲۸۲)۔

☆ وأما شرط جوازها فكون رأس المال عيّنًا حاضرًا أو غائبًا ويجوز التفاؤل في الربح مع تساويهما في رأس المال (كذا في محيط السرخي: ۲/۲۱۹)۔

☆ الربح على ما شرطاً والوضیعة على قدر المالین (الفقه الإسلامی وأدلته: ۲/۷۹۲)۔

☆ فإنهم اتفقوا على أنه إذا كان الربح تابعًا لرؤوس الأموال أعني إن كان أصل مال الشركة متساويين كان الربح بينهما نصفين واختلفوا هل يجوز أن يختلف رؤوس أموالها ويستويان في الربح فقال مالك والشافعي لا يجوز وقال أهل العراق يجوز ذلك (بداية المجتهد: ۲/۲۷۵)۔

☆ زوج بنیه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاء فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم وإن أقروا أنه كان يوم موته فهو ميراث من الأب (شامی)۔

☆ والمساواة في رأس المال ليست بشرط فما كان من ربح فهو بينهما على قدر رؤوس أموالهما. فإن كانا اشترطا التفاوت فيه كتباه ذلك (هنديہ: ۲/۲۲۰)۔

☆ إذا شرطوا الربح على قدر أو متفاوتًا فلا شك أنه يجوز ويكون الربح بينهما على الشرط سواء شرط العمل عليهما أو على أحدهما (بدائتہ: ۶/۶۲)۔

سوال ۳:- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا ہو، لیکن دکان پر والد کو بٹھایا ہو یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام ہی مقالہ نگاران حضرات نے کہا ہے کہ کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، مذکورہ صورت میں والد کو دکان پر بٹھانے یا تبرکاً ان کے نام پر دکان کا نام رکھنے سے کاروبار میں والد کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا جمیل احمد نذیری، مولانا لطیف الرحمن، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا فاخر میاں فرنگی محلی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد صادق مبارک پوری، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد حذیفہ)۔

جبکہ بعض حضرات نے اس مسئلہ کی توضیح و تنقیح اس طرح کی ہے:

چونکہ یہاں شرکت کے ارکان و شروط نہ پائے جانے کی وجہ سے شرکت نہیں ہے اور والد کو غاصب بھی نہیں کہا جاسکتا، پھر جب نہ عقد ہے نہ غصب تو ایک ہی صورت بچتی ہے کہ اس کے عمل کو تبرع قرار دیا جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کل نفع کا مالک بیٹا ہوگا، باپ کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا، لہذا باپ کا انتقال ہو تو اس مال کو باپ کے ترکہ سے خارج رکھا جائے گا (دیکھئے: مفتی راشد حسین ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد اشرف قاسمی سعادت)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے اس سلسلہ میں یہ وضاحت کی کہ اگر والد نے بیٹھنے سے قبل کوئی شرط نہیں لگائی ہے تو والد کی رضا مندی کی دلیل ہوگی اور یہ



بیٹھنا تبرعاً ہوگا، یعنی یہی حکم والد کے نام پر دکان کے نام رکھنے کا بھی ہونا چاہئے۔

بعض حضرات نے کہا کہ اس صورت میں والد معاون ہوں گے اور اجر مثل کے مستحق ہوں گے جبکہ سرمایہ مکمل لڑکے کا ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا صدر الحسن ندوی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، ابو بکر قاسمی)۔

اسی ضمن میں مولانا اسرار الحق سبیلی صاحب نے کہا کہ: البتہ اگر دکان کی رجسٹری میں مالکانہ حیثیت سے والد کا نام ہو تو دکان کی عمارت میں والد کی ملکیت سمجھی جائے گی۔

مولانا شیر علی گجراتی صاحب اس کی وضاحت میں الگ رائے رکھتے ہیں وہ عرض کرتے ہیں: اگر کھانا پینا وغیرہ سب کچھ والد کے ساتھ ہو تو کاروبار باپ کا ہوگا اور والد کے بعد تمام بھائی اس میں شریک ہوں گے، لیکن اگر رہائش و طعام ساتھ نہ ہو تو کاروبار لڑکے کا شمار ہوگا اور اگر باپ پابندی سے نہ بیٹھتا ہو اور باپ کے ساتھ اجرت کی بات ہو تو اجرت کا مستحق ہوگا اور بعد میں تمام بھائی اس اجرت میں شریک ہوں گے اور تبرکاً والد کے نام پر دکان کا نام رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ وہ مال صرف اسی لڑکے کی ملکیت ہوگی۔

مقالہ نگاران حضرات نے جن نصوص کو بطور دلائل پیش کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ والربح فی الشركة الفاسدة بقدر المال قوله والربح حاصله أن الشركة الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين أو من أحدهما فحكم الأولى أن الربح فيها للعامل كما علمت، والثانية بقدر المال ولم يذكر أن لأحدهم أجراً لأنه لا أجر للشريك في العمل بالمشارك كما ذكره في قفيز الطحان، والثالثة لرب المال وللآخر أجر مثله۔

☆ الشركة عبارة عن عقد بين المتشاركين في رأس المال والربح (الفقه الإسلامي وأدلته: ۲/۷۹۲)۔

☆ ولو أن رجلاً اجلس في دكانه رجلاً يطرح عليه العمل بالنصف فالقياس أن لا تجوز هذه الشركة لأنها شركة العروض لأن من أحدهما العمل ومن الآخر الخانوت والخانوت من العروض وشركة العروض من غير جائزة وفي الاستحسان جائزة لأن هذه شركة الأعمال (بدائنة الصنائع: ۵/۸۵)۔

☆ وكل واحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين (السنن الكبرى للبيهقي: ۷/۷۹۰)۔

☆ إن الشركة الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين أو من أحدهما فحكم الأولى أن الربح فيها للعامل كما علمت والثانية بقدر المال والثالثة لرب المال وللآخر أجر مثله (شامی)۔

☆ إذا كان للأب أموال سابقة كسبها ولم يكن معلوماً للابن أموال بأن ورث من مورثه أموالاً معلومة فيعد الابن في عيال الأب (در الحکام: ۳/۲۲۵)۔

سوال ۳:- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جبکہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران حضرات کی رائیں مختلف ہیں:

البتہ بیشتر حضرات نے کہا کہ اگر رہنا، سہنا، کھانا پینا ساتھ ہو تو دوسرے بھائیوں کی کمائی و جائیداد وغیرہ سب کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی اور دوسرے بھائی باپ کے معاون سمجھے جائیں گے (دیکھئے مقالہ: مولانا لطیف الرحمن، مولانا سلمان پلپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا فاخر میاں فرنگی علی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ناصر الحسن ندوی، مولانا صادق مبارک پوری، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا ابو بکر قاسمی، مولانا شیر علی گجراتی، خورشید انور اعظمی)۔

بعض حضرات نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ: کبھی کھانا پینا مشترک ہوتا ہے، لیکن کچھ بھائی کاروبار میں باپ کے ساتھ ہوتے ہیں اور بعض کی

کمانی باقاعدہ الگ ہوتی ہے تو جنگی کمانی الگ ہووے خود اس کے مالک ہوں گے (دیکھئے مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا شاہد علی قاسمی)۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے کہا کہ: جن بھائیوں نے اپنا کاروبار الگ کیا، لیکن رہائش وغیرہ ساتھ ہے تو جنہوں نے کمانی کے دوسرے ذرائع اختیار کئے تو وہ جو رقم والد کو کما کر دیں گے صرف وہ مشترک سمجھی جائے گی۔

مفتی راشد حسین ندوی صاحب نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا کہ: مذکورہ صورت میں بیٹوں کی کمانی خود ان کی ہوگی، باپ یا دوسرے بیٹوں کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا، لیکن اگر باپ نے خود یہ کاروبار کر دیا ہو، اور باضابطہ مضاربہ کی شکل ہو تو پھر شرائط کے مطابق باپ کا حق ہوگا اور بعد از انتقال ورثہ میں تقسیم ہوگا اور اگر قرض کی صورت میں تھا تو مال کے بقدر واپسی لازم ہوگی، جس کے مالک باپ اور بقیہ ورثاء ہوں گے۔

مفتی جمیل احمد ندیری صاحب نے اس مسئلہ کی دو صورتیں بیان کی ہیں:

اگر دوسرے بھائیوں کی کمانی اختیار کرنے میں ان کے والد اور اس بھائی نے مالی و اخلاقی تعاون دیا ہو خواہ صراحتاً ہو یا دلالتاً اور پھر تقسیم نہ ہوئی ہو کھانا وغیرہ سب کچھ ساتھ ہو تو ان دوسرے بھائیوں کی کمانی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی، ان کی تہا ملکیت نہ ہوگی، سارے بھائی کسی نہ کسی طور پر گھر کی معاشی و کاروباری ترقی میں ایک دوسرے کے معاون سمجھے جائیں گے۔

لیکن اگر کاروبار اختیار کرنے والے بھائیوں کو اس بھائی اور باپ کی جانب سے کوئی اخلاقی و مالی تعاون نہیں ملا ہو اور انہوں نے خود اپنے بل پر اور جانفشانی و محنت کے ذریعہ اپنی تجارت کی ہو تو پھر ان کی کمانی خود ان کی ہوگی، کھانا پینا ایک ساتھ ہونے کے باوجود مشترک نہ سمجھی جائے گی۔

جبکہ بعض حضرات نے یہ وضاحت کی کہ اگر تقسیم نہیں ہوئی ہو سب ساتھ ہیں، بھائیوں نے کمانی والد کو دے دی، جس سے مشترک طور پر گھر کا خرچ چلتا ہو تو وہ والد کی ملکیت شمار ہوگی اور بعد از وفات ترکہ للذکر مثل حظ الانثیین کے تحت تقسیم ہوگا، لیکن اگر ان بھائیوں نے اپنا سرمایہ کی کمانی الگ جمع کر رکھی ہو تو پھر وہ ان کی ذاتی ملکیت ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا سلمان پانچوری، مولانا محمد حذیفہ)۔

بعض حضرات نے اس سلسلہ میں مطلقاً کہا کہ جنہوں نے کمانی کے دوسرے ذرائع اختیار کئے تو ان کی آمدنی و کمانی خود ان کی اپنی ہوگی دوسرے اس میں شریک نہ ہوں گے۔ "للرجال نصیب مما اکتسبوا" (دیکھئے مقالہ: حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا شاہجہاں ندوی)۔

جبکہ مولانا اسرار الحق سیلی صاحب کے الفاظ میں: دوسرے بھائیوں کی کمانی سب کے درمیان مشترک نہیں سمجھی جائے گی، البتہ جس بھائی نے والد کا ہاتھ بٹایا اور اس نے معاوضہ و تنخواہ نہیں لی تو اس کو والد کے مال سے اجرت مثل ادا کی جائے گی۔

نصوص مندرجہ ذیل ہیں:

☆ وفي الخانية زوج بنیه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير (شامی)

☆ للرجال نصيب مما اکتسبوا وللنساء نصيب مما اکتسبن (النساء)۔

☆ زوج امرأة وابنها اجتماعاً في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب عليحدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمييز فأجاب بأنه بينهما سوية۔ (رد المحتار: ۲/۲۸۳)۔

☆ ولو استاجر ابنه والمرأة ابنا ليخدمها في بيتها لم يجز ولا يجبر الآخر إذا خدم إلا إذا كان حرّاً أو مكاتباً كذا في الخلاصة (الهندية: ۲/۲۲۵)۔

☆ فإذا كان الأب مزارعاً والابن صانعاً أخذية فكسب الأب من الزراعة والابن من صناعة الخدائ فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله (درر الحکام: ۲/۲۲۵)۔

سوال ۵:- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام



سے دوبارہ کاروبار کو شروع کیا تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگی یا والد کی؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاران نے کہا کہ جس نے سرمایہ لگا کر کاروبار شروع کیا اسی کی ملکیت ہوگی، والد کی ملکیت نہیں ہوگی (دیکھئے مقالہ: مفتی اشرف قاسمی سعادت، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا محمد صادق مبارک پوری، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا خرمیاں فرنگی محلی)۔

جبکہ بعض حضرات نے مزید وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کی تنقیح کی ہے کہ ملکیت تو لڑکے کی ہوگی، لیکن اگر والد کی جگہ مملوکہ ہو تو اس کا کرایہ مقرر کرنا ہوگا اور اگر کرایہ کی ہو تو اس کا کرایہ از خود ادا کرنا ہوگا (دیکھئے مقالہ: مفتی لطیف الرحمن، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا صدر الحسن ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا ابو بکر قاسمی)۔

مولانا راشد حسین ندوی نے فرمایا کہ: اگر دکان کرایہ کی تھی تو تجدید اجارہ کے بعد کرایہ لڑکے کے ذمہ ہوگا، اگر والد کی ملکیت تھی تو جب تک والد نظر انداز کریں کوئی بات نہیں ورنہ جب چاہیں اس دکان کا کرایہ مقرر کر دیں، یا وہاں سے ہٹانے کا مطالبہ کریں۔

مفتی ثناء الہدی قاسمی، خورشید انور اعظمی صاحبان نے انخراج بالضممان کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اگر باپ نے وہ دکان اس لڑکے کو ہبہ نہیں کیا ہے، صرف کاروبار کی اجازت دی ہے تو دکان کی مالیت والد کی باقی رہے گی اور ان کے انتقال کے بعد صرف دکان کی پوزیشن کی جو قیمت ہوگی اس میں سارے وارثوں کا حصہ ہوگا لیکن کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا۔

بعض حضرات نے کہا کہ دکان کو خریدنے یا کرایہ پر لینے کے لئے اگر پیشگی رقم دی گئی تھی تو اس میں سب شریک ہوں گے، لیکن وہ مملوکہ جگہ والد کی رہے گی (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا انور علی اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

مولانا محمد حذیفہ کی وضاحت کے مطابق: اگر لڑکے کا مقصود والد کی اعانت تھا تو پھر یہ لڑکے کی جانب سے تبرع ہوگا اور ملکیت والد کی قرار پائے گی جبکہ اگر یہ مقصد نہ تھا تو پھر ساری ملکیت سرمایہ لگانے والے لڑکے کی ہوگی۔

مولانا مفتی سلمان پالنپوری صاحب نے اس مسئلہ کی تنقیح کرتے ہوئے چار صورتوں کا ذکر کیا کہ ان کا ہونا ضروری ہوگا:

(۱) والد کے لئے ان کی اجازت کے ساتھ کاروبار شروع کیا تو کاروبار والد کا ہوگا اور والد پر سرمایہ کے بقدر قرض ہوگا۔ (۲) والد کے لئے اجازت کے بغیر کاروبار شروع کیا تو تبرع ہوگا اور کاروبار والد کا ہوگا۔ (۳) اپنے لئے والد کی اجازت سے کاروبار شروع کیا تو کاروبار لڑکے کا ہوگا اور اگر جگہ مملوکہ ہو تو بطور عاریت اس کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ (۴) اپنے لئے کاروبار کیا مگر والد کی اجازت کے بغیر تو کاروبار لڑکے کا ہوگا، بغیر اجازت اس جگہ استعمال غصب قرار پائے گا، حاصل یہ کہ اگر اپنے لئے شروع کیا تو مالک خود ہوگا اور اگر والد کے لئے شروع کیا تو مالک والد ہوں گے۔

مولانا جعفر علی رحمانی صاحب نے جدید دور کے اصطلاح کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح وضاحت کی کہ: جس نے سرمایہ لگایا ملکیت تو اسی کی ہوگی، کیونکہ نام تو محض ایک حق منفعت ہے، جس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، البتہ اگر یہ نام رجسٹرڈ ہوں تو چونکہ Trade Mark آج کل گاہکوں کی زیادہ رغبت یا بے رغبتی کا سبب بن گیا ہے، اس لئے فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق عوض لے کر اپنے اس حق کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن محض ٹریڈ مارک کی وجہ سے باپ کی ملک نہیں ہوگی، کیونکہ باپ کی ملکیت کے ثبوت کے لئے اسباب ملک میں سے کوئی سبب شرعی موجود نہیں ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ اگر رہائش و طعام والد کے ساتھ ہو تو کاروبار والد کا اور اگر الگ ہو تو کاروبار خود اس کا ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا شیر علی گجراتی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

نصوص مندرجہ ذیل ہیں:

☆ المرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملهما أموال كثيرة، ففيل هي للزوج وتكون المرأة معينة له إلا إذا كان لها كسب على حدة فهو لها، وقيل بينهما نصفان (شامی: ۱/۲۹۲)۔

☆ قالت الحنفية: الشركة عبارة عن عقد بين المتشاركين في رأس المال والربح (الفقه الاسلامی وادلة: ۳/۷۹۳)۔



☆ وفي الخانية زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير (شامی)

☆ وما اشتراه أحدهم لنفسه يكون له ويضمن حصة شركائه من ثمنه إذا دفعه من المال المشترك (شامی: ۲/۲۷۸)۔

☆ إذا كان الابن في عيال أبيه ومعينًا له يكون جميع ما تحصل من الكسب لأبيه وما اشتراه ودفع ثمنه من مال أبيه إن كان شراءه لأبيه بإذنه لا يكون له الاختصاص بدون وجه شرعي بل بوخاص بالأب فإن كان شراءه لنفسه ودفع ثمنه من مال أبيه بإذنه يكون خاصًا به وبدل الثمن مضمون للأب (الفتاوى الكاملة، كتاب الشركة: ۵۱)۔

☆ لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة، المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، لكن أفتى كثير باعتباره وعليه فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال (در المختار مع الرد: ۴/۲۵، ۲۶)۔

☆ اعلم أن أسباب الملك ثلاثة: ناقل كبيع وبيعة، وخلافة كإرث، وإصالة وهو الاستيلاء حقيقة بوضع اليد أو حكمًا بالتهية كنصب شبكة لصيد (در مع الرد: ۱۰/۳۶)۔





## عرض مسئلہ:

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مولانا خورشید انور اعظمی

اسلامک فقہ اکیڈمی کے انیسویں فقہی سمینار واقع جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ گجرات میں مجھ بے بضاعت و کم مایہ کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی ہے کہ ”کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت“ جیسے اہم اور حساس موضوع پر عرض مسئلہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ اس موضوع پر بیس مقالات موصول ہوئے، ماشاء اللہ بیشتر مقالات، عمدہ، جامع اور موضوع پر پورے طور پر حاوی ہیں، جن سے مقالہ نگار حضرات کی محنت و جانفشانی اور دقت نظری کا پتہ چلتا ہے، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں:

شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد صادق مبارکیوری، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد صدر الحسن قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا لطیف الرحمن بمبئی، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا فاخر میاں فرنگی محلی، مفتی محمد اشرف قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شیر علی قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود اودی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، راقم سطور خورشید انور اعظمی۔

سوال ۱:- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے، پارٹنر کی، ملازم کی یا معاون کی؟

اس سوال کے جواب میں شیخ کلیم اللہ عمری نے بیٹے کی حیثیت متعین کئے بغیر کہا: باپ اور بیٹوں کے درمیان کوئی اصول یا شرط طے نہ ہونے کی صورت میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ آپس میں صلح و اتفاق کے ساتھ شرکت عمل کا موزوں حصہ مقرر کر لیا جائے تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ آپ نے سنن ابن ماجہ کی حدیث ”لا ضرر ولا ضرار“ سے استدلال کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ آپ کا رجحان بیٹے کے پارٹنر ہونے کی جانب ہے۔

بقیہ مقالہ نگار حضرات نے بیٹے کو معاون مانا ہے، آپ حضرات نے عمومی طور پر فقہاء کرام کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

۱- الأب والإبن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کله للأب إن کان فی عیالہ لکونہ معینا لہ (رد المحتار ۳/۲۸۳)۔

۲- إذا عمل رجل فی صنعة هو وابنه الذی فی عیالہ فجمیعہ الکسب لذلك الرجل وولده یعد معینا لہ (شرح المجله لسیر رستم باز رقم المادة ۱۳۹۸)۔

۳- لو دفع إلى ابنه ما لا یتصرف فیہ الابن یكون للأب إلا إذا دلت دلالة علی التملیک، کذا فی الملتقط (عالمگیری ۳/۲۹۲)۔

۴- ”وإن استاجر الرجل ابنه لیخدمه فی بیته لم یجز، ولا أجر علیہ، لأن خدمة الأب مستحقة علی الابن دینا وهو مطالب به عرفا، فلا یأخذ علیہ اجرا، ویعد من العقوق إن یأخذ الولد الأجر علی خدمة ابیه، والعقوق

مصدر مدرس جامعہ مظہر العلوم بنارس۔



حرام“ (المبسوط ۱۶/۶۱)۔

مفتی راشد حسین ندوی، مولانا شاہد علی قاسمی نے زیر بحث مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: چونکہ یہاں نہ شرکت کے ارکان موجود ہیں اور نہ اجارہ کے، اسی طرح اجارہ کی شرط ”اجرت معلومہ“ بھی مفقود ہے، اس لئے بیٹے کی حیثیت معاون کی ہوگی۔ مولانا شاہد جہاں ندوی کا خیال ہے کہ والد کا ہاتھ بٹانے والے لڑکوں پر لازم ہے کہ والد سے واضح معاملہ طے ہو جائیں ورنہ ان کی حیثیت متبرع کی ہوگی، اسی طرح والد پر لازم ہے کہ اگر وہ یہ بھانپ لیں کہ لڑکے اپنے تعاون کے بدلے عوض کے خواہشمند ہیں تو وہ ان کے لئے دیگر ملازم کی طرح ماہانہ اجرت یا نفع میں سے ایک حصہ مقرر کر دے۔ مولانا محمد حذیفہ کی رائے ہے کہ اگر شریک کار ہوتے وقت والد سے کوئی معاملہ ملازمت طے ہوا ہے تو اس کے مطابق عمل ہوگا اور اگر کوئی معاملہ طے نہ ہوا، تو لڑکا معاون شمار ہوگا اور ساری کمائی باپ کی ہوگی۔

مفتی سلمان پالنپوری، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا محمد حذیفہ داہودی وغیرہ نے بشرح مجلہ کے حوالہ سے بیٹے کے معاون ہونے کیلئے تین شرطوں کی صراحت بھی کی ہے: (۱) باپ اور بیٹے کا پیشہ متحد ہو (۲) سرمایہ باپ کا ہو (۳) بیٹا باپ کی کفالت میں ہو۔ مفتی سلمان پالنپوری نے یہ بھی واضح کیا کہ اگر مذکورہ شرطیں نہ پائی جائیں تو لڑکا معاون نہ ہوگا، چنانچہ باپ کو بیٹے کی الگ پیشے سے حاصل شدہ کمائی میں مداخلت کا حق نہ ہوگا اگرچہ بیٹا باپ کے زیر عیال ہو، اسی طرح اگر بیٹا باپ کے زیر عیال نہیں ہے اور دونوں ایک پیشے میں شریک ہو کر کام کر رہے ہیں تو بیٹا طے شدہ اجرت کا مستحق ہوگا اور اگر اجرت طے نہ ہو تو جہالت اجرت کے سبب یہ اجارہ فاسدہ ہے۔ لہذا اکل سرمایہ باپ کا ہوگا اور لڑکا اجرت مثل کا مستحق ہوگا، مولانا خورشید احمد اعظمی نے بھی بیٹے کو باپ کے عیال میں نہ ہونے کی صورت میں اجرت مثل کا مستحق مانا ہے اور شامی کی عبارت ”وما حصلہ أحدہما باعانة صاحبه فله ولصاحبه اجر مثله“ (رد المحتار ۶/۵۰۲) سے استدلال کیا ہے، راقم سطور کی بھی ناقص رائے یہی ہے کہ اگر لڑکا والد کے زیر عیال نہ ہو اور والد کے کاروبار میں بحیثیت معاون شریک کار ہو تو جس طرح عقد فاسد میں معاون اجرت مثل کا مستحق ہوتا ہے یہ لڑکا بھی اجرت مثل کا مستحق ہوگا، عالمگیری (۶۲۵/۳) میں ہے:

”فإن عمل أحدہما واعانہ الآخر فی جمیع ما أخذہ کان للمعین أجر المثل“۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کا خیال ہے کہ لڑکوں کے عمل کی اجرت شرط کے مطابق ملنی چاہئے۔ آپ نے اس سلسلے میں المغنی لابن قدامہ کی ایک عبارت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک یہ صورت از قبیل مضاربت ہے:

”إن يشترك بدنان بمال أحدہما وهو أن يكون المال من أحدہما والعمل منہما مثل ان يخرج احدہما الفاً ويعملان فیہ معا والربح بينهما فهذا جائز ونص علیہ احمد فی رواية ابی الحارث وتكون مضاربة، لأن صاحب المال يستحق المشروط له من الربح بعمله فی مال غیره وهذا هو حقيقة المضاربة“ (المغنی ۵/۱۳۷، ۱۳۸)

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں مضاربت میں مال کو مضارب کے حوالے کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ زیر بحث مسئلہ میں یہ صورت نہیں ہے۔

سوال ۲:- اگر یہی صورت ہو، لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مفتی شیر علی قاسمی کی رائے ہے کہ اگر بچوں نے اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہے تب بھی ملکیت باپ کی ہوگی، اس وجہ سے کہ بچے باپ کے تابع ہوتے ہیں، نیز صحابہ کرام کے زمانہ سے تعامل بھی یہی چلا آ رہا ہے کہ کچھ اولاد کام کرتی ہو اور کچھ نہیں، اور باپ کے ساتھ رہنا سہنا کھانا پینا وغیرہ ہو تو تمام بھائی متروکہ مال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

مولانا شاہد جہاں ندوی کا خیال ہے کہ اگر سرمایہ کی حیثیت متعین نہ ہو تو لڑکا متبرع ہوگا یہی عرف ہے، بچوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کی حیثیت متعین اور نفع کا تناسب طے کر لیں، اور اگر ایسا نہیں کیا تو والد کو چاہئے کہ ان کے لئے نفع کا ایک تناسب طے کر دے، اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکا تو دفع ضرر کے لئے اسے شرکت فاسدہ مانتے ہوئے اس کے مال کے بقدر نفع کی شرح مقرر کر دینا چاہئے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی کا خیال ہے کہ اگر لڑکا والد کے عیال میں ہے تو معین ہوگا اور اگر عیال میں نہیں ہے تو بقدر سرمایہ اس کاروبار کے نفع میں شریک مانا

جائے گا، اگرچہ اس کا معاہدہ نہ ہوا ہو، اس وجہ سے کہ الگ رہنا اور اپنا سرمایہ لگا کر شریک ہونا مقتضیات شرکت سے ہیں۔ مفتی عبدالرحیم قاسمی کا بھی یہی خیال ہے، آپ نے عیال میں ہونے کی صورت میں شامی کی عبارت:

زوج بنیہ الخمسة فی دارہ وکلہم فی عیالہ واختلفوا فی المتاع فهو للاب وللبنین الثیاب التی علیہم لا غیر (رد المحتار ۲/۲۵۰) سے اور عیال میں نہ ہونے کی صورت میں فتاویٰ امارت شرعیہ و احسن الفتاویٰ کے بعض فتاویٰ سے استدلال کیا ہے۔

مولانا محمد حذیفہ نے کہا: سرمایہ لگاتے وقت اگر شرکت، قرض، یا اعانت کی صراحت ہو تو اسی کے مطابق لڑکا شریک قرض خواہ، یا معاون ہوگا، ورنہ عرف یا قرینہ حال سے کوئی پہلو تلاش کیا جائے گا۔

بقیہ مقالہ نگار حضرات نے لڑکوں کو پارٹنر مانا ہے۔ شیخ کلیم اللہ عمری نے کہا: طے شدہ اصول و ضوابط کی روشنی میں اتنے حصے میں وہ شریک کاروبار سمجھے جائیں گے جتنا سرمایہ انھوں نے لگایا تھا، مولانا محمد صادق مبارکپوری کی رائے ہے: جتنے نفع پر معاملہ طے ہوا ہے اس کے حقدار ہوں گے، مولانا ابوسفیان مفتاحی اور مولانا فاخر میاں فرنگی محلی نے کہا: بچے اپنے اپنے سرمایہ کے بقدر خود مالک ہوں گے معاون نہ ہوں گے، مولانا صدر الحسن قاسمی نے کہا: چونکہ بچوں نے والد کی اجازت سے اپنا سرمایہ لگایا ہے اس لئے اپنے حصے کے مطابق والد کے کاروبار میں پارٹنر ہوں گے۔ مولانا ابو بکر قاسمی نے کہا: لڑکا بقدر سرمایہ مالک ہوگا یا بوقت شرکت نفع کا جو فیصلہ طے ہوا ہے اس کے مطابق نفع تقسیم ہوگا آپ نے بدائع الصنائع کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے:

إذا شرط الربح علی قدر المالین متساویا أو متضامنا فلا شک أنه یجوز ویكون الربح بینہما علی الشرط سواء شرط العمل علیہما أو علی أحدهما۔ (بدائع ۶/۲۶۶)۔

مولانا لطیف الرحمن بمبئی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی نے اس صورت کو شرکت عنان کے قبیل سے مانا ہے۔ اس لئے بچے حسب معاہدہ طے شدہ حصے کے بقدر باپ کے کاروبار میں شریک اور طے شدہ حصے کے بقدر نفع کے مستحق ہوں گے۔

مفتی راشد حسین ندوی اور مولانا شاہد علی قاسمی نے کہا: بہتر تو یہ تھا کہ باپ بیٹے معاملہ صاف کر لیتے اور باقاعدہ شرکت کے ارکان و شروط کا لحاظ رکھتے لیکن اگر ایسا نہیں کیا تو اس صورت میں چونکہ شرکت عقود کے ارکان لفظاً و معنی مفقود اور شرکت ملک کارکن اجتماع نصیبین موجود ہے، اس لئے یہ شرکت ملک ہوگی یا ربح کے بارے میں کوئی بات طے نہ ہونے کے سبب شرکت فاسدہ ہوگی۔ اور دونوں صورتوں میں نفع کا استحقاق بقدر مال ہوگا۔ آپ حضرات نے (شرکتہ ملک) و رکنها اجتماع النصیبین و حکمها وقوع الزیادة علی الشركة بقدر الملك (فتاویٰ ہندیہ ۲/۲۰۱) و شرط جواز هذه الشركات كون المعقود علیہ عقد الشركة قابلاً للوكالة کذا فی المحيط وان یكون الربح معلوم القدر فان کان مجهولاً تفسد الشركة (ہندیہ ۲/۲۰۲) و الربح فی الشركة الفاسدة بقدر المال (شامی ۳/۲۸۲) وغیرہ عبارتوں سے استدلال کیا ہے۔

راقم سطور کی ناقص فہم میں بھی یہی بات آتی ہے کہ یہ شرکت ملک کی صورت ہے۔ اس لئے کہ درمختار میں شرکت ملک کی تعریف: وہی ان یمثل متعدد عینا أو دینا بارث أو بیع أو غیرہما“ کے بعد توضیحی عبارت: ”بأی سبب کان جبریا أو اختیاریا ولو متعاقبا کما لو اشتری شیئاً ثم اشرك فیہ آخر“ (رد المحتار ۶/۲۶۶) سے اسی جانب اشارہ ملتا ہے۔ یا پھر جہالت ربح کے سبب شرکت فاسدہ مانا جائے اور بقدر مال بیٹے کو نفع کا مستحق قرار دیا جائے۔

سوال ۳:- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو یا تبرکات اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مفتی شیر علی قاسمی کا خیال ہے کہ اگر کھانا پینا وغیرہ سب کچھ والد کے ساتھ ہو تو کاروبار باپ کا ہوگا ورنہ لڑکے کا شمار ہوگا اور اگر باپ کیساتھ اجرت کی بات طے ہوئی ہو تو اجرت کا مستحق ہوگا۔

بقیہ مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ کاروبار لڑکے کا ہوگا، مولانا محمد صادق مبارکپوری نے سنن بیہقی کی حدیث: کل واحد أحق بماله من



والدہ وولده والناس اجمعین سے استدلال کیا ہے، مفتی راشد حسین ندوی نے کہا: والد کا یہ عمل بیٹے کے حق میں تبرع ہوگا اس لئے نفع کا مالک بیٹا ہوگا، مولانا لطیف الرحمن بمبئی نے اس سلسلے میں امداد الفتاویٰ سے مدد لی ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مفتی عبدالرحیم قاسمی کی رائے ہے کہ اگر لڑکا علیحدہ رہتا ہے تو والد کے دوکان پر بیٹھنے کے باوجود کاروبار لڑکے کا ہوگا، اور والد اجر مثل کے مستحق ہوں گے۔ آپ کا مسئلہ شامی کی یہ عبارت ہے:

إن الشركة الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين أو من أحدهما فحكم الأولى ان الربح فيها للعامل كما علمت والثانية بقدر المال الى قوله والثالثة لرب المال وللآخر أجر مثله (شامی ۲/۲۵۰)

مفتی محمد اشرف قاسمی نے کہا: چونکہ کاروبار لڑکے نے اپنے سرمایہ سے شروع کیا ہے اور باپ کی طرف سے لڑکے کی محض اعانت ہوئی ہے، اس لئے یہ کاروبار لڑکے کا ہوگا، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے کہا: اگر والد بغیر شرط کے بیٹھتے ہیں تو یہ تبرع ہے، اور والد کو اپنے بیٹھنے کے عوض نصف نفع کا معاملہ طے کرنے کا اختیار ہے۔ اسے شرکت اعمال اور شرکت تقبیل کے قبیل سے سمجھا جائے گا (بدائع ۵/۸۵)۔

مفتی انور علی اعظمی اور مولانا اشتیاق احمد اعظمی نے لڑکے کے کاروبار کے مالک ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس پر شرکت کی تعریف:

الشركة عبارة عن عقد بين المتشاركين في رأس المال والربح (الفقه الإسلامي وادلتہ ۴/۷۹۲) صادق نہیں آتی،

مولانا محمد حذیفہ نے کہا: لڑکے کے معاون کہلانے کی شرط یہ ہے کہ سرمایہ باپ کا ہو اور یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے اس لئے لڑکا مالک اور باپ معین ہوگا۔ مولانا ابوبکر قاسمی نے جامع ترمذی کی حدیث: "الخراج بالضمنان" سے استدلال کیا ہے، مولانا شاہجہان ندوی نے الفقه الاسلامی وادلتہ کی عبارت:

ما يتولد من شيء مملوك يكون مملوكا لصاحب الأصل لأن مالک الأصل هو مالک الفرع (الفقه الاسلامی وادلتہ لوہبۃ الزحلی ۳/۲۹۱۳) وغیرہ سے استدلال کیا ہے۔

راقم الحروف کا بھی خیال یہی ہے کہ لڑکا اس کاروبار کا مالک ہے، اس لئے کہ یہاں شرکت کی کوئی بھی صورت موجود نہیں ہے، نہ شرکت ملک اور نہ شرکت عقد، والد کی حیثیت صرف ایک معاون کی ہے۔

رہا والد کے نام پر تبرک دوکان کا نام رکھے جانے کا مسئلہ تو اس سلسلے میں بعض مقالہ نگار حضرات نے کوئی رائے نہیں دی ہے، لیکن جن حضرات نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی وجہ سے لڑکے کے کاروبار ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال ۴:- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے جبکہ آپس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا شاہجہان ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا محمد حذیفہ داہودی کا خیال ہے کہ دوسرے ذرائع معاش اختیار کرنے والے بھائیوں کی کمائی مشترک نہ ہوگی بلکہ اس کے وہ تنہا مالک ہوں گے، شیخ کلیم اللہ عمری نے اللہ تعالیٰ کے قول: للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء مما اكتسبن (النساء) سے استدلال کیا ہے، مولانا شاہجہان ندوی نے حدیث نبوی: كل أحد أحق بماله من والده وولده والناس اجمعین (سنن دار قطنی ۲/۲۲۵ و سنن بیہقی ۱۰/۲۱۹) وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے مزید کہا: والد کا ہاتھ بٹانے والے بھائی کو چاہئے کہ باپ سے ماہانہ اجرت، یا نفع کا ایک حصہ طے کر لے یا اپنا سرمایہ لگا کر والد کے کاروبار میں شریک ہو جائے، مفتی راشد حسین ندوی کا بھی یہی خیال ہے، مگر آپ نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ اگر باپ نے اپنے سرمایہ سے کاروبار کرایا ہے تو یا تو وہ مضاربت کے طور پر ہے تو شرائط کے مطابق اس میں باپ کا حق ہوگا اور اگر بطور قرض دیا ہے تو واپسی لازم ہوگی اور اگر تبرعاً دیا ہے تو ملکیت باپ کی ہوگی، اس لئے کہ بلوغ کے بعد والد کی ذمہ داری اولاد کے نفقات سے ختم ہو جاتی ہے، مولانا محمد حذیفہ نے کہا: چونکہ اتحاد صنعت نہیں ہے، اس لئے دوسرے ذرائع معاش اختیار کرنے والے بھائی اپنی کمائی کے تنہا مالک ہوں گے: آپ نے درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام سے استدلال کیا ہے:

فإذا كان مزارعا والابن صنایع احذیة فكسب الأب من الزراعة والابن من صناعة الحذاء فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للآب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عیالہ“ (۲/۲۲۵ مادہ ۱۳۹۸)



البتہ اگر مال باپ کے پاس جمع ہوتا ہو تو وہ مشترک سمجھا جائے گا۔

دیگر مقالہ نگار حضرات نے اس طرح کی آمدنی کو مشترک قرار دیا ہے، بعض نے مطلقاً اور بعض نے کچھ قیود کے ساتھ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے فتاویٰ رحیمیہ ۱۸۵/۹ کے حوالے سے کہا: اگر لڑکے نے رقم دوسرے ذرائع معاش کے ذریعہ کم کر باپ کے پاس جمع کیا تو وہ رقم مشترک سمجھی جائے گی، مفتی عبدالرحیم قاسمی کا بھی یہی خیال ہے، اس تفصیل کے ساتھ کہ اگر والد کھانے پینے کے خرچ کے بقدر لیتے ہیں اور باقی مال میں مداخلت نہیں کرتے تو باقی ماندہ مال کا لڑکا مالک ہوگا۔

مولانا ابو بکر قاسمی نے کہا: اگر ساری کمائی ایک جگہ جمع ہوتی ہے تو وہ مشترک ہوگی، آپ نے شامی کی عبارت:

قال في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتماعا في دار واحدة وكل منهما يكتسب عليحدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت والتساوي ولا التمييز فاجاب بانه بينهما على السوية سے استدلال کیا ہے۔

مفتی انور علی اعظمی کا خیال ہے کہ اگر کھانا پینا مشترک ہے اور لڑکے کے ذرائع معاش کے سلسلے میں پونجی باپ نے فراہم کی ہے یا کسی ادارہ میں ملازم ہے تو جب تک کھانا پینا مشترک ہے کمائی بھی مشترک ہوگی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی کا بھی یہی خیال ہے مگر ملازم کی تنخواہ کو وہ لڑکے کی ملکیت قرار دیتے ہیں اور باپ کے ساتھ رہنے والے لڑکے کے لئے دونوں حضرات بطور حق الخدمہ وصلہ رحمی کچھ عطیہ و ہبہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

مفتی شیر علی قاسمی اور مولانا محمد صادق مبارکپوری نے اس طرح کی کمائی کے تمام بھائیوں میں مشترک ہونے کے سلسلے میں شامی کی عبارت:

وفي الخانية زوج بنه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للاب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير (رد المحتار ۳/۲۸۳) سے مفتی لطیف الرحمن بمبئی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی نے فتاویٰ رحیمیہ (۱۸۹/۹، ۱۵۹/۵) سے اور مولانا شاہد علی قاسمی نے کفایت المفتی ۳۰۹/۷ وغیرہ سے استدلال کیا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی نے شامی کی وفي الخانية زوج بنه الخمسة والی عبارت کو اپنا مستدل بناتے ہوئے کہا: اگر لڑکے کے باپ کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں تو ذرائع آمدنی کے الگ ہونے کے باوجود وہ سب عرفا والد کے معاون سمجھے جائیں گے۔

راقم سطور کی ناقص رائے بھی یہی ہے کہ اگر لڑکا باپ کے عیال میں ہے، اور آپس میں تقسیم نہیں ہوئی ہے تو صنعت خواہ متحدہ ہو یا مختلف بہر صورت تمام کمائی کا مالک باپ ہوگا، اس لئے کہ عرف میں تمام لڑکوں کو ایک مشترک فیملی کا فرد سمجھا جاتا ہے، کسی کے حاشیہ خیال میں بھی ان کی علیحدگی کا تصور نہیں ہوتا۔ رہیں وہ عبارتیں جن میں لڑکے کے معاون ہونے کے لئے اتحاد صنعت کی صراحت موجود ہے تو اس سلسلے میں نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی اپنے زمانے کے عرف پر مبنی ہیں، جبکہ آج کی صورت حال یہ ہے کہ لڑکوں کو دوسرے ذرائع معاش کے اپنانے کا باپ مشورہ دیتا ہے، مالی تعاون کرتا ہے، اس سلسلے میں اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتا ہے، اس کے نفع نقصان کی فکر رکھتا ہے، اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ میرے مختلف بیٹے مختلف ذرائع کے توسط سے میرے معاون ہیں، لہذا آج کے عرف میں لڑکے کے تعاون ہونے کے لئے اتحاد صنعت کی شرط محل غور و فکر ہے۔

سوال ۵:- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا لیکن کاروبار کی جگہ خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو موجود ہو اور اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی مقام سے دوبارہ شروع کیا تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگی یا والد کی؟

اس سوال کے جواب میں مفتی شیر علی قاسمی کا خیال ہے کہ اگر کاروبار کی جگہ والد کی ہو اور والد کے ساتھ رہنا سہنا ہو تو کاروبار والد کا ہوگا اور اگر والد کے ساتھ رہنا سہنا نہ ہو اور جگہ بھی دوسرے کی ہو اور لڑکا اس کا کرایہ دیتا ہو تو کاروبار لڑکے کا ہوگا، اس وجہ سے کہ اگر لڑکا مر جائے تو باپ وراثت کا مستحق ہوگا، اگر باپ کا مال ہوتا تو باپ وراثت کا مستحق نہ ہوتا بلکہ کل مال باپ کا ہوتا۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی نے فتاویٰ رحیمیہ کے حوالے سے کہا: اگر لڑکا باپ کے ساتھ رہتا ہے تو کاروبار باپ کا ہوگا اور اگر الگ رہتا ہے تو لڑکے کا ہوگا، لڑکا کاروبار کی جگہ کرایہ دے یا معاوضہ سے خریدے۔

مفتی سلمان پالنپوری کا خیال ہے کہ اگر لڑکے نے والد کے لئے شروع کیا ہے تو کاروبار والد کا ہوگا اور اگر اپنے لئے شروع کیا ہے تو اس کا ہوگا، آپ نے شامی کی عبارت:

”عمر دار زوجته بماله باذنها فالعمارة لها والنفقة دين عليها لصحة امرها ولو عمر لنفسه بلا اذنها فالعمارة له ويكون غاصبا للعرصة فيومر بالتفريغ بطلبها ذلك ولها باذنها فالعمارة لها وهو متطوع في البناء فلا رجوع“ (شامی ۱۰/۲۹۲)

اس جگہ کے سلسلے میں آپ کا خیال ہے کہ وہ جگہ اگر والد کی مملوک ہو اور کاروبار اس کی اجازت سے شروع کیا ہو تو اس کا استعمال بطور عاریت ہے بشرطیکہ عقد اجارہ نہ ہو، اور اگر بغیر اجازت کے شروع کیا ہو اس کا استعمال غصب ہوگا اور منافع غصب کا ضمان مضمون نہیں ہوتا الا یہ کہ وہ وقف یا مال صغیر ہو تو منافع کا ضمان یعنی اجرت مثل لازم ہوگا لہذا لڑکے سے کرائے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔ ”ولو استعمل واحد ما لا بدون اذن صاحبه كان غاصبا فلا يلزمه منافعه“ (شرح المجملہ لسلم رستم باز رقم المادة ص: ۵۹۶)۔

مولانا محمد حذیفہ کا خیال ہے کہ اگر مقصود اعانت ہو تو لڑکے کی طرف سے تبرع ہے، کاروبار والد کی ملکیت ہوگا اور اگر مقصود اعانت نہ ہو تو کاروبار لڑکے کا ہوگا، اس وجہ سے کہ کاروبار باپ کا ہونے کیلئے سرمایہ باپ کا ہونا چاہئے نہ کہ لڑکے کا عبارت: یوجد ثلاثة شروط لاعتبار الولد معينا لایہ اتحاد الصنعة وفقدان الأموال سابقا اذا كان للاب اموال سابقة كسبها ولم يكن معلوما للابن اموال ... (۳/۲۳۵) وغیرہ سے استدلال کیا ہے۔

بقیہ مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، مولانا محمد صادق مبارکپوری نے درمختار کی عبارت: وفي الدرر لا يستحق الربح الا باحدى ثلاث بمال او عمل او تقبل (الدر المختار ۳/۳۸۳) سے استدلال کیا ہے، مولانا شاہجہاں ندوی نے تحفۃ الفقہاء کی عبارت: فيكون الربح لرب المال بسبب ماله لانه نماء ماله (۱۹/۳) وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا: اصل یہ ہے کہ جس کا سرمایہ ہے ملکیت اسی کی ہوتی ہے، مفتی راشد حسین ندوی نے کہا: کاروبار لڑکے کا ہوگا البتہ دوکان اگر کرایہ کی ہو تو تجدید کرایہ کے بعد اس کا کرایہ لڑکے کے ذمہ ہوگا اور اگر باپ کی مملوک ہو تو کرایہ طے کر لے یا ہٹانے کا مطالبہ کرے یا نظر انداز کر دے۔ مفتی لطیف الرحمن بمبئی نے اس سلسلے میں: ”المرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملها أموال كثيرة قيل بي للزوج وتكون المرأة معينة له إلا إذا كان لها كسب علیحدة فهو لها“ (شامی ۳/۳۹۲) سے استدلال کیا ہے اور جگہ کے بارے میں کہا کہ اگر وہ والد کی مملوک ہو تو لڑکے کو اس کا کرایہ دینا ہوگا اور کرایہ کی ہو تو خود اس کا کرایہ ادا کرے، مولانا خورشید احمد اعظمی نے کہا مملوک جگہ والد کی ہوگی اور اگر کرایہ کی ہو اور اسکی پیشگی رقم والد نے ادا کر دی ہو تو اس میں بقیہ اولاد شریک ہوں گے، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے کہا: والد کی رضامندی کے بعد اسی فرم سے شروع ہونے والا کاروبار لڑکے کی ملکیت میں ہوگا والد اگر اس پر کچھ عوض لینا چاہیں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ آپ نے مفتی تقی عثمانی، یوسف قرضاوی، وہبہ زحیلی اور حضرت تھانوی کی تحریروں سے استدلال کیا ہے۔ مفتی انور علی اعظمی اور مولانا اشتیاق احمد اعظمی نے کہا: زیر بحث مسئلہ پر شرکت کی تعریف صادق نہیں آتی اس وجہ سے کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، جگہ اگر باپ کی ملکیت ہے تو وہ کرایہ لے سکتا ہے اور اگر کرایہ کی ہے تو لڑکا کرایہ کا مسئلہ اصل مالک سے طے کرے گا، مفتی عبدالرحیم قاسمی کی رائے ہے کہ کاروبار لڑکے کا ہوگا، جگہ اگر مملوک ہو تو اس کی مالیت میں تمام ورثہ کا حصہ ہوگا، اور اگر کرایہ کی ہو تو جس نے مالک سے لی ہو وہ جگہ اسی کی ہوگی، مولانا ابو بکر قاسمی نے اس سلسلے میں الخراج بالضمان (ابوداؤد ۲/۳۹۵) سے استدلال کیا ہے اور جگہ کے تعلق سے کہا کہ اگر وہ باپ کی مملوک ہو تو باپ کو اس کا مناسب کرایہ ادا کرے۔

مولانا شاہد علی قاسمی نے کہا: چونکہ سرمایہ کا مالک لڑکا تھا، اور باپ کی جانب ملکیت کی منتقلی کے ذرائع ہبہ، بیع، قرض وغیرہ اختیار نہیں کئے گئے اس وجہ سے لڑکا ہی مالک ہوگا، البتہ باپ جگہ کا کرایہ لے سکتا ہے، جب دوسرے کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے کھیتی کرنے یا مکان تعمیر کرنے پر بھی صاحب زمین اس کھیتی یا مکان کا مالک نہیں ہوتا تو صورت مسئولہ میں باپ بدرجہ اولیٰ اس کاروبار کا مالک نہیں ہوگا۔ درمختار میں ہے:

”من بنی او غرس فی أرض غیره بغیر اذنه امر بالقلع والرد“ (الدر المختار ۲/۲۰۷)۔

راقم سطور کی ناقص رائے بھی یہی ہے کہ کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا خواہ کاروبار کی جگہ باپ کی مملوک ہو یا کرایہ کی، اس لئے کہ اس میں صرف لڑکے کا سرمایہ لگا ہے، شرکت کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے، البتہ مملوک جگہ والد کی ہوگی اور کرایہ کی صورت میں والد کی جانب سے پیشگی ادا شدہ رقم بھی والد کی ہوگی اور والد کے بعد تمام ورثہ اس کے حقدار ہوں گے۔

\*\*\*

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب

## دوسرا باب / تفصیلی مقالات

### کاروباری دنیا میں والد کے ساتھ اولاد کا تعاون - حیثیت اور ذمہ داریاں

مولانا شاہجہاں ندوی

یہ ایک سماجی مسئلہ ہے جو افراط و تفریط کا شکار ہے، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لڑکے شروع میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور ان کے کام میں شامل ہو کر ان کا بھرپور تعاون کرتے ہیں، لیکن جب ان کی شادی ہو جاتی ہے، اور وہ خود بیوی اور بال بچے والے ہو جاتے ہیں، تو پھر ان کے ذہن میں اس طرح کی بات آتی ہے کہ ہمارے دیگر بھائی اپنی آمدنی جمع کر رہے ہیں، اور میں نے اپنی پوری زندگی والد کے ساتھ کھپادی، اور مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا، لیکن اس کے باوجود وہ والد کے ساتھ اپنا معاملہ طے نہیں کرتے ہیں، والد بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان تعاون کرنے والے لڑکوں کی قربانی کا خیال نہیں کرتے ہیں، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ والد صاحب اپنے بڑے بچوں کی قربانی کو نظر انداز کرتے ہوئے، چھوٹے بچوں ہی کو زیادہ نواز دیتے ہیں، یہ اس مسئلہ کا افراط پر مبنی پہلو ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس طرح کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے، اور مستقبل کے خطرات کے پیش نظر بہت سے بچے اپنے والد کے تعاون سے دست کش ہو جاتے ہیں، اور ان کو مشکل کی گھڑی میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں، یہ اس مسئلہ کا تفریط پر مبنی پہلو ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ والدین کی خدمت اور ان کا تعاون بڑی سعادت مندی کی بات ہے، ارشاد باری ہے: "وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه. وبالوالدين إحساناً" (الإسراء: ۲۳) (اور تیرے رب نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو) یقیناً اگر ضرورت ہو تو والدین اپنی اولاد کے مال سے لے سکتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وولده من كسبه" (یقیناً پاکیزہ ترین کھانا وہ ہے جو آدمی اپنی کمائی سے کھائے، اور اس کی اولاد اس کی کمائی سے ہے) (سنن نسائی، کتاب البیوع، باب البحث علی الكسب، حدیث نمبر ۴۲۶۱، و سنن ابوداؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجل یا کمل من مال ولده، حدیث نمبر ۳۵۲۸، والحاکم فی المستدرک، وصححه ووافقه الذہبی حدیث نمبر ۲۲۹۵، وابن حبان فی صحیحہ، حدیث نمبر ۴۲۵۹، ۴۲۶۰)۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہ سے وارد ہے: "إن أولادکم ہبۃ اللہ لکم" یہب لمن یشاء إناثاً، ویہب لمن یشاء الذکور (اشوری: ۴۹)، "فہم وأموالہم لکم إذا احتجتم إلیہا" (آخر جہ الحاکم ۲/۲۸۳، وعنه البیہقی ۴/۳۸۹، باسناد صحیح) (بے شک تمہاری اولاد تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں نوازتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے، چنانچہ وہ اور ان کے اموال تمہارے لئے ہیں، جب کہ تمہیں اس کی ضرورت ہو)۔

حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أنت ومالک لأبیک" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر ۲۲۹۱، و سنن الکبریٰ للبیہقی ۷/۳۸۰) (تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے)۔

ابن قدامہ حنبلی تحریر فرماتے ہیں:

جامعہ اسلامیہ شانہ پورم کیرالہ۔



”وللأب أن يأخذ من مال ولده، ما شاء ويملكه، مع حاجة الأب إلى ما يأخذه، مع عدمها، صغيراً كان الولد أو كبيراً، بشرطين، أحدهما: أن لا يجحف بالابن، ولا يضربه، ولا يأخذ شيئاً تعلقت به حاجته، الثاني: أن لا يأخذ من مال ولده، فيعطيه الآخر، نص عليه أحمد في رواية إسماعيل بن سعيد، وذلك لأنه ممنوع من تخصيص بعض ولده بالعطية من مال نفسه، فلأن يمنعه من تخصيصه بما أخذ من مال ولده الآخر أولى، وقد روي أن مسروقاً زوج ابنته بصداق عشرة آلاف، فأخذها، وأنفقها في سبيل الله، وقال للزوج: جهز امرأتك، وقال أبو حنيفة ومالك والشافعي: ليس له أن يأخذ من مال ولده إلا بقدر حاجته، لأن النبي ﷺ قال: إن دمائكم وأموالكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا (متفق عليه)، وروي الحسن أن النبي ﷺ قال: كل أحد أحق بكسبه من والده وولده والناس أجمعين (رواه سعيد في سننه) وهذا نص، وروي أن النبي ﷺ قال: ”لا يحل مال امرئ مسلم إلا عن طيب نفسه“ (رواه الدارقطني)، ولأن ملك الابن تام على مال نفسه، فلم يجز انتزاعه منه، كالذي تعلقت به حاجته، ولنا ما روت عائشة قالت: ”إن أطيب ما أكلتم من كسبكم، وإن أولادكم من كسبكم“ (أخرجه سعيد والترمذي وقال: حديث حسن)، إلى أن قال رحمه الله: وقوله: ”أحق به من والده وولده“ مرسل، ثم هو يدل على ترجيح حقه على حقه، لا على نفى الحق بالكلية، والولد أحق من الوالد، بما تعلقت به حاجته (المغني، كتاب الهبة والعطية ۶/۲۲۰، ط: دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ۱۹۸۴، ۵۱۴۰۲م).

(اور باپ کے لئے جائز ہے کہ اپنی اولاد کے مال سے جس قدر چاہے لے، اور اسے اپنی ملکیت میں لے لے، خواہ جو مال لے رہا ہے اس کی باپ کو ضرورت ہو یا نہ ہو، لڑکا بالغ ہو یا نابالغ، دو شرطوں کے ساتھ: (۱) ایک یہ کہ بیٹے کے سارے مال کا ہی خاتمہ نہ کر دے، اور نہ اسے نقصان پہنچائے، اور نہ ایسی چیز لے، جس سے بیٹے کی حاجت وابستہ ہو (۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اپنی اولاد کا مال لے کر دوسرے لڑکے کو نہ دے، اسماعیل بن سعید کی روایت میں امام احمد نے اس کی صراحت کی ہے، اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ اسے روک دیا گیا ہے کہ اپنے مال میں سے عطیہ کے ذریعہ اپنی بعض اولاد کو خاص کرے، تو اسے دوسری اولاد کا مال لے کر کسی اولاد کو خاص کرنے سے بدرجہ اولیٰ منع کیا جائے گا، اور مروی ہے کہ مسروق نے اپنی بیٹی کا نکاح دس ہزار درہم مہر میں کیا، اور اسے لے کر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر دیا، اور شوہر سے کہا کہ اپنی بیوی کے لئے سامان فراہم کرو، اور امام ابو حنیفہ مالک اور شافعی کا قول ہے کہ باپ حاجت کے بقدر ہی اپنی اولاد کے مال میں سے لے سکتا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”تمہارا خون اور مال تم پر حرام ہے جس طرح تمہارے لئے اس مہینہ میں آج کے دن کی حرمت ہے“ (بخاری و مسلم)، حسن بصری نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر ایک اپنی کمائی کا اپنے والد، اپنی اولاد اور تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے“، سے سعید نے اپنی سنن میں روایت کی ہے، اور یہ صریح نص ہے، اور مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی مسلمان کا مال اس کی خوشنودی کے بغیر حلال نہیں ہے، اس کی روایت دارقطنی نے کی ہے، اور اس لئے کہ بیٹے کی ملکیت اپنے مال پر کامل ہے، تو اس سے لینا جائز نہیں ہو، جیسے وہ مال لینا جائز نہیں، جس سے اس کی حاجت وابستہ ہو، اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ”پاکیزہ ترین کھانا وہ ہے جو تم اپنی کمائی سے کھاؤ، اور یقیناً تمہاری اولاد تمہاری کمائی ہیں“ اس کی روایت سعید اور ترمذی نے کی ہے، اور ترمذی کا قول ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، یہاں تک کہ مغنی کے مؤلف نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ لڑکا اپنے باپ اور اپنی اولاد کے مقابلہ میں اپنی کمائی کا زیادہ حقدار ہے“ یہ مرسل ہے، پھر یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بیٹے کا حق اپنی کمائی میں باپ کے حق پر راجح ہے، بالکل یہ باپ کے حق کی نفی پر دلالت نہیں کرتی ہے، اور بلاشبہ والد کے مقابلہ اولاد اپنے اس مال کی زیادہ حقدار ہے جس سے اس کی حاجت وابستہ ہو۔

یہ مسئلہ صرف شہر یا کاروبار کا ہی نہیں ہے، بلکہ دیہات میں بھی عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ بڑا لڑکا اپنی کمائی کے ذریعہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کی تعلیم اور شادی کا انتظام کرتا ہے، اور اس طرح باپ کا تعاون کر کے زمین و جانکد کو فروخت ہونے سے بچا لیتا ہے، جب کہ چھوٹے بھائی بالعموم ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوتے ہیں، لیکن بڑے بیٹے کو اس قربانی کا کوئی صلہ نہیں ملتا ہے۔

بلاشبہ شریعت کا مسئلہ واضح ہے کہ بغیر عوض کے کسی کو کوئی چیز یا منفعت کا مالک بنانا ”ہبہ“ اور ”تبرع“ کہلاتا ہے، اس طرح کے مسائل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ائمہ اور خطباء لوگوں کی ذہن سازی کریں، اور ان کو بتائیں کہ معاملہ خواہ والد کے ساتھ ہو یا بھائی کے ساتھ واضح ہونا چاہئے اور حیثیت کا تعین کر کے

کاروبار میں شرکت ہونی چاہئے، یا باپ کو جو رقم دے رہا ہے وہ کس حیثیت سے ہے، سب واضح ہونا چاہئے، مفتی تقی عثمانی مدظلہ اپنے بیانات میں مسئلہ کے اس پہلو کو واضح کر رہے ہیں۔

بہت حد تک والد بھی اس طرح کے معاملات کو سلجھا سکتے ہیں، چنانچہ ایک باپ کا فرض بنتا ہے کہ تعاون کرنے والے بیٹے یا رقم فراہم کرنے والی اولاد کی قربانی کا خیال رکھتے ہوئے جائداد یا کاروبار کا ایک حصہ ان کے نام سے کر دے، ”خانہ“ میں ہے:

”ولو وب رجل شيئاً لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض في ذلك على عن أبي حنيفة أنه لا بأس به، إذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين، فإن كانا سواء يكره، وروى المعلى عن أبي يوسف أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار، سوى بينهم، يعطى للابنة مثل لا يعطى للابن، وقال محمد: يعطى للذكر ضعف ما يعطى للأنثى، والفتوى على قول أبي يوسف“ (الخانبة بهامش الهندية ۲/۲۶۹، ط: دار الفكر، بيروت ۱۹۹۱، ۵۱۳۱۱م)۔

(اور اگر کوئی شخص صحت و تندرستی کی حالت میں اپنی اولاد کو کوئی چیز ہبہ کرے، اور اس سلسلہ میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا چاہے، تو ہمارے علماء سے اصولی کتابوں اور ظاہر الروایہ میں اس کے بارہ میں کوئی روایت نہیں ہے، اور امام ابوحنیفہ سے روایت کی گئی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ ترجیح و تندرستی میں زیادتی کی بنا پر ہو، تو اگر دونوں برابر ہوں، تو مکروہ ہے، اور معالی نے ابو یوسف سے روایت کی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ اس کے ذریعہ نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرے، اور اگر اس کے ذریعہ ضرر پہنچانے کا قصد کرے، تو پھر ان کے درمیان برابری کرے، چنانچہ بیٹے کو بیٹے کے بقدر دے، اور امام محمد کا قول ہے کہ بیٹے کو بیٹی کا دو گنا دے، اور فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے)۔

اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات تحریر ہیں:

”تنوير الأَبصار“ میں ہے: ”الإجارة شرعاً: تملك نفع مقصود من العين بعوض“ (تنوير الأَبصار مع الدر المختار ۹/۵، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ۱۹۹۲، ۵۱۳۱۵م)۔

(شریعت کی اصطلاح میں ”اجارہ“ عوض کے بدلہ ایسے نفع کا مالک بنانا ہے جو کسی چیز سے مقصود ہو)۔

اور ”ہندیہ“ میں ہے: ”وأما ركن الإجارة فالإيجاب والقبول بالألفاظ الموضوع في عقد الإجارة“ (الهندية ۲/۴۰۹) (جہاں تک رکن اجارہ کا تعلق ہے، تو وہ ایجاب و قبول ہیں ان الفاظ کے ساتھ جو عقد اجارہ میں مقرر ہیں)۔

عالمگیری ہی میں ہے: ”وأما شرائط الصحة، فمنها رضا المتعاقدين، ومنها أن تكون الأجرة معلومة“ (الهندية ۲/۴۱۱، ط: دار الفكر، بيروت) (جہاں تک اجارہ کے صحیح ہونے کی شرطوں کا تعلق ہے، تو ان میں سے ایک عاقدین کی باہمی رضامندی ہے، اور انہی میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اجرت معلوم ہو)۔

ردالمحتار میں ہے: ”بخلاف غيره، فإنه عدوان محض“ (رد المحتار، مطلب الأمر لاضمان عليه إلا في ستة ۶/۲۱۳، ط: دار الفكر، بيروت، ۲۰۰۰م) (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں جب کہ باپ اپنے بیٹے کو اپنی زمین میں ہو اور الے دن یا معمول سے زیادہ آگ روشن کرنے کا حکم دے، اور آگ پھیل کر پڑوسی کی زمین تک پہنچ کر کسی چیز کو ہلاک کر دے، تو باپ ضامن ہوگا، کیونکہ یہ بیٹے سے خدمت لینا ہے، لہذا حکم صحیح ہے کیونکہ باپ کی خدمت واجب ہے، برخلاف باپ کے علاوہ دوسرے شخص کے، کیونکہ دوسرے کے حکم دینے کی صورت میں یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے لہذا ضمان آگ روشن کرنے والے پر ہوگا نہ کہ حکم دینے والے پر)۔

”مبسوط“ میں ہے: ”إن استأجر الرجل ابنه ليخدمه في بيته، لم يجز، ولا أجر عليه، لأن خدمة الأب مستحقة على الابن ديناً، وهو مطالب به عرفاً، فلا يأخذ عليه أجراً، ويعد من العقوق أن يأخذ الولد الأجر على خدمة أبيه، والعقوق حرام، وكذلك إن استأجرته الأم، لأن خدمتها أوجب عليه، فإنها أحوج إلى ذلك، وأشفق عليه، وإن كان أحدهما استأجره ليرعاه غنماً، أو يعمل غير الخدمة جاز، فإن ذلك غير مستحق عليه، ولا هو مطلوب في



العرف، وإن استأجر الابن أباه أو أمه أو جده أو جدته لخدمته لم يجز، لأنه منهي عن استخدام هؤلاء، لما فيه من الإذلال فلا يجوز أن يصير ذلك مستحقاً له من قبلهم بعقد الإجارة، وكيف يستحق هو، ولا يترك هو ليستخدم والده ولا الوالدة تخدمه، ولكن إن عمل شيئاً من ذلك، فله الأجر، لأن بعد الاستخدام، لو لم يوجب عليه الأجر، كان معنى الإذلال فيه أكبر، ولأننا لم نحكم بصحة العقد في الابتداء، لكي لا تصير خدمته مستحقة عليه، وقد زال هذا المعنى، حتى أقام العمل“ (المبسوط، باب إجارة الرقيق في الخدمة وغيرها“ ۱۶/۱۱، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت الطبعة الأولى ۱۳۲۲ھ)۔

(اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کو اجرت پر رکھے، تاکہ گھر میں وہ اس کی خدمت کرے، تو یہ جائز نہیں ہے، اور اس پر کوئی اجرت نہیں ہے، اس لئے کہ دینی حیثیت سے بیٹے پر باپ کی خدمت لازم ہے، اور بیٹے سے عرف میں اس کا مطالبہ ہے، تو وہ اس پر اجرت نہیں لے سکتا ہے، اور نافرمانی میں سے سمجھا جاتا ہے کہ بیٹا اپنے باپ کی خدمت پر اجرت لے، اور ماں باپ کی نافرمانی حرام ہے، اور ایسے ہی ماں اگر بیٹے کو اجرت پر رکھے، اس لئے کہ ماں کی خدمت اس پر زیادہ واجب ہے، کیوں کہ ماں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے، اور ماں اس پر زیادہ شفیق ہے، اور اگر والدین میں سے کوئی اپنے بیٹے کو اپنی بکری چرانے کے لئے اجرت پر رکھے، یا خدمت کے علاوہ کام کرنے کے لئے رکھے، تو جائز ہے، کیونکہ یہ اس پر لازم نہیں ہے، اور نہ ہی عرف میں مطلوب ہے، اور اگر بیٹا اپنے باپ یا ماں یا دادا یا دادی کو اپنی خدمت کے لئے اجرت پر رکھے، تو یہ جائز نہیں، اس لئے کہ اسے شرعاً منع کر دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے خدمت لے، کیونکہ اس میں ان کو ذلیل کرنا ہے، تو جائز نہیں کہ یہ عقد اجارہ کے سبب ان کی طرف سے اس کے لئے لازم ہو، اور اسے اس کا کیونکر استحقاق ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اسے چھوڑا نہیں جاسکتا ہے کہ اپنے والد سے خدمت لے، اور نہ ہی والدہ اس کی خدمت کر سکتی ہے، لیکن اگر والد اس میں سے کوئی کام کرے تو اس کو اجرت ملے گی، اس لئے کہ خدمت لینے کے بعد اگر اس پر اجرت واجب نہ کی جائے تو اس میں ذلیل کرنے کا مفہوم زیادہ ہے، اس لئے کہ ہم نے ابتدا میں عقد کے صحیح ہونے کا فیصلہ اس لئے نہیں کیا کہ بیٹے کی خدمت کا استحقاق باپ پر نہ ہو، اور یہ علت دور ہو چکی کہ اس نے عمل کو انجام دے دیا ہے)۔

”تنویر البصائر“ میں ہے: ”الشركة شرعاً: عبارة عن عقد بين المتشاركين في الأصل والربح“ (التنوير مع الدر المختار ۶/۲۶۶)

(شرکت شریعت میں سرمایہ اور نفع میں دو شریک ہونے والے کے درمیان ہونے والے عقد کا نام ہے)۔

”ہندیہ“ میں ہے: ”شركة ملكت، وهي أن يتملك رجلان شيئاً من غير عقد الشركة بينهما“ (الهنديّة ۲/۲۰۱)

(شرکت ملک یہ ہے کہ دو شخص کسی چیز میں باہم شرکت قائم کیے بغیر مالک بن جائیں)؛ ”موسوعة“ میں ہے:

”التبرع: بذل المكلف ما لاً أو منفعة لغيره في الحال أو المال، بلا عوض، بقصد البر والمعروف غالباً“ (الموسوعة الفقهية ۱۰/۶۵)

(تبرع عاقل بالغ کا مال یا منفعت کو فوری طور سے یا بعد میں دوسرے کے لئے صرف کرنے کا نام ہے جو بالعموم بھلائی کے قصد سے ہو)۔

ان فقہی عبارات سے واضح ہے کہ اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی حیثیت نہ پارٹنر کی ہے نہ ملازم کی ہے، بلکہ ان کی حیثیت معاون اور تبرع کرنے والوں کی ہوگی۔

والد کا ہاتھ بٹانے والے لڑکوں پر لازم ہے کہ والد سے واضح معاملہ طے کر کے شریک کار بنیں، ورنہ ان کی حیثیت تبرع کرنے والوں کی ہوگی، جن کا مقصد والد کا تعاون کر کے آخرت کا ثواب حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اسی طرح والد پر لازم ہے کہ اگر وہ اس بات کو بھانپ لے کہ لڑکا تعاون کے بدلہ عوض کا خواہش مند ہے تو وہ اس کے لئے دیگر ملازم کی طرح ماہانہ اجرت یا نفع میں سے ایک حصہ جیسے پانچواں یا دسواں حصہ مقرر کر دے، کیونکہ نفقہ واجبہ کے علاوہ میں اولاد کے درمیان فرق کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ نفقہ میں عدل یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دے، باقی امور میں برابری لازم ہے تاکہ ظلم میں نہ پڑ جائے، چنانچہ سلف صالحین اپنے چھوٹے بچوں کو بوسہ لینے میں بھی برابری کرتے تھے، تاکہ ظلم نہ ہو جائے، اس حدیث شریف کی بنا پر جس میں یہ بات آئی ہے کہ بشیر بن سعد انصاری نے جب اپنے بیٹے نعمان بن بشیر کو عطیہ دیا اور ان نعمان نے کہا کہ میں اس وقت راضی ہوں گی جب تم اس بات کا گواہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا لو، اور انہوں نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”أكل ولدك نخلتهم مثل ذلك؟ قال: لا، قال: اتقوا الله، واعدلوا بين أولادكم، أشهد على هذا“



غیری، فانی لا أشهد علی جور“ (صحیح بخاری کتاب الہبة، باب الإشهاد فی الہبة، حدیث نمبر ۲۵۸۷، وصحیح مسلم، کتاب الہبات، باب کراهة تفضیل بعض الأولاد فی الہبة، حدیث نمبر ۱۶۲۳) (کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو اسی کی مانند دیا ہے، تو انہوں نے عرض کیا، نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ سے ڈرو، اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف سے کام لو، میرے علاوہ کسی اور کو اس کا گواہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم کا گواہ نہیں بنتا ہوں)۔

یہ عدل نہیں ہے کہ جس لڑکے نے اپنی پوری زندگی والد کے ساتھ لگا دی اس کو اس لڑکے کے برابر دے، جس نے کہیں اور ملازمت کر کے آمدنی کو علاحدہ اپنے لیے مخصوص رکھا، لہذا والد پر لازم ہے کہ ہاتھ بٹانے والے لڑکے کی اجرت مقرر کر دے، اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا، تو پھر مرنے سے پہلے اس لڑکے کے لئے جائیداد یا کاروبار کا کوئی حصہ خاص کر کے اس کے نام کر دے جس نے اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ کھپا دی ہے، اگر نہ لڑکوں نے اپنی حیثیت متعین کر کے کام کیا، اور نہ والد صاحب نے اس کی قربانی کا خیال رکھا، تو کیا ”الضرر یزال“ (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة ۱/۱۵۳) (ضرر کو دور کیا جائے گا)۔ اور ”لا ضرر ولا ضرار“ (شرح القواعد الفقهية، القاعدة الثامنة عشرة، المادة: ۱/۹۳، ۱۹) (کسی کو نہ ابتداءً ضرر پہنچانا درست ہے اور نہ مقابلہ کے طور پر)، نیز ”الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف“ (شرح القواعد الفقهية للزرقي، القاعدة السادسة والعشرون، المادة: ۱/۱۱۶، ۲۷) (شدید ترین ضرر کو خفیف ترین ضرر سے زائل کیا جائے گا)، ان قواعد کی روشنی میں اجارہ فاسدہ مانتے ہوئے اجرت مثل لازم کی جاسکتی ہے جب کہ ہاتھ بٹانے والے لڑکوں کے بال بچے کی تعلیم و شادی والد کے مال سے نہ ہوئی ہو، اس بارہ میں اکیڈمی اجتماعی غور و خوض کر سکتی ہے۔

۲- ”ہندیہ“ میں ہے: ”الہبة تملیک عین بلا عوض“ (الہندیہ ۲/۳۷۳) (ہبہ بغیر کسی عوض کے کسی چیز کا مالک بنانے کا نام ہے)، اور ”رد المحتار“ میں ہے: ”القرض شرعاً: ما تعطیہ من مثلی لتقاضی مثله“ (رد المحتار مع الدر المختار، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولية، فصل فی القرض ۷/۳۸۸) (شریعت کی اصطلاح میں قرض یہ ہے کہ تم مثلی دے کر اس کے مثل کو وصول کرو)۔

”بدائع الصنائع“ میں ہے: ”أما ركن القرض، فهو الإيجاب والقبول، والإيجاب قول المقرض: (أقرضتك هذا الشيء، أو خذ هذا الشيء قرضاً، ونحو ذلك، والقبول: هو أن يقول المستقرض: استقرضت، أو قبلت، أو رضيت، أو ما یجری هذا المجری“ (البدائع ۷/۳۹۳، کتاب القرض)۔

(جہاں تک قرض کے رکن کا تعلق ہے، تو وہ ایجاب و قبول ہیں، اور ایجاب قرض دینے والے کا یہ کہنا ہے کہ میں نے تجھے یہ چیز قرض دیا، یا اس چیز کو قرض کے طور پر لو، اور اسی کی مانند دیگر الفاظ، اور قبول یہ ہے کہ قرض لینے والا یہ کہے کہ میں نے قرض لیا، یا قبول کیا، یا میں راضی ہوا، یا جو اس کے قائم مقام ہو)۔

”عالمگیری“ میں ہے: ”وشرکة عقد، وهي أن يقول أحدهما: شاركك في كذا، ويقول الآخر قبلت“ (الہندیہ ۲/۲۰۱) (اور شرکت عقد یہ ہے کہ شریکین میں سے ایک کہے کہ میں نے اتنے مال میں تیرے ساتھ شرکت کی، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا)۔

”تنویر الابصار“ میں ہے: ”ورکنها“ ”أي ما بهيتها“ ”الإيجاب والقبول“ ولو معنی، كما لو دفع له ألفاً، وقال أخرج مثلها، واشتر، والربح بیننا“ (التنوير مع الدر ۶/۳۷۲)۔

(اور شرکت عقد کا رکن یعنی ماہیت ایجاب و قبول ہیں، اگرچہ معنی کے لحاظ سے ہو، جیسا کہ اگر اسے ہزار روپے حوالہ کرے، اور کہے کہ اسی کے مثل نکالو، اور خرید کر کے تجارت کرو اور نفع ہمارے درمیان ہوگا)، ”رد المحتار“ میں ہے: ”ولو معنی“ ”یرجع إلى کل من الإيجاب والقبول“ (رد المحتار ۶/۳۷۳) (اگرچہ معنی کے اعتبار سے ہو، اس کا تعلق ایجاب و قبول میں سے ہر ایک سے ہے)۔

”ہندیہ“ میں ہے: ”الشركة الفاسدة: هي التي فاتها شرط من شرائط الصحة“ (الہندیہ ۲/۲۲۲) (شرکت فاسدہ یہ ہے کہ اس میں شرکت کی صحت کی شرطوں میں سے کوئی شرط فوت ہو)۔

اسی میں ہے: ”وکل شركة فاسدة، فالربح فيها علی قدر رأس المال كالف لأحدهما ألفين، فالربح بينهما أثلاثاً، وإن كانا شرطاً الربح بينهما نصفين، بطل ذلك الشرط“ (الہندیہ ۲/۲۲۵)۔

(اور ہر شرکت فاسدہ میں نفع سرمایہ کے بقدر ہوگا، جیسے ایک کا ہزار ہو اور دوسرے کے دو ہزار، تو دونوں کے درمیان نفع تہائی کے اعتبار سے ہوگا، اور اگر

دونوں نے باہم نصف نصف نفع کی شرط لگائی ہو، تو وہ شرط باطل ہو جائے گی۔

”رد المحتار“ میں ہے: ”إذا دفع لا بنه مالا، فتصرف فيه الابن، يكون للأب، إلا إذا دلت دلالة التمليك“ (رد المحتار، کتاب الہبۃ ۸/۲۹۰)

(اگر باپ اپنے بیٹے کو مال دے، اور بیٹے نے اس سے کاروبار کیا، تو سارا سرمایہ باپ کا ہوگا، مگر یہ کہ مالک بنانے کا قرینہ موجود ہو، تو پھر سارا سرمایہ بیٹے کا ہوگا۔)

”ولو كان الابن كبيرًا، فهو متبرع، لأنه لا يملك الأداء بلا أمره“ (رد المحتار، مطلب في ضمان الولي المهر ۳/۲۸۹)

(اور اگر بیٹا بالغ ہو اور باپ اس کی طرف سے مہر ادا کر دے، تو وہ تبرع کرنے والا ہوگا، کیونکہ اسے بیٹے کی اجازت کے بغیر ادا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔)

”ولو شري لصبيه طعاما بماله، وللصبي مال، فهو متبرع استحسانا“

(مجمع الضمانات، باب في الوصي والولي والقاضي ۷/۲۳۱، جلد اور صفحہ نمبر مکتبہ شاملہ کے مطابق ہے)

(اور اگر اپنے بچے کے لئے اپنے مال سے کھانا خریدے، حالانکہ بچے کے پاس مال ہو، تو وہ بہ طور استحسان تبرع کرنے والا ہوگا۔)

”كل من أدى حقا عن الغير بلا إذن أو ولاية، فهو متبرع، ما لم يكن مضطرا“ (قواعد الحمزاوی، مسائل الشركة ۲۵۶/۱)

(ہر وہ شخص جو دوسرے کی طرف سے اجازت یا ولایت کے بغیر حق ادا کر دے تو وہ تبرع کرنے والا ہوگا، جب کہ مجبور نہ ہو۔)

ان فقہی عبارات سے واضح ہوا کہ اگر بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو، اور اس سرمایہ کی حیثیت متعین نہ کی ہو، تو یہ ان کی طرف سے تبرع ہوگا، اور یہی عرف ہے، لہذا بچوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کی حیثیت متعین کر لیں اور نفع کا تناسب بھی طے کر لیں، اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو خود والد کو چاہئے کہ ان کے لئے نفع کا ایک تناسب طے کر دے، اگر اسے ایسا محسوس ہو کہ یہ تعاون اور سرمایہ کے بدلہ مال کے خواستگار ہیں، اور اگر والد نے ایسا نہیں کیا تو مرنے سے پہلے ان کے ایثار کا خیال رکھتے ہوئے جائداد یا کاروبار کا ایک حصہ ان کے نام کر دے، تاکہ عدل کا تقاضا فوت نہ ہو، اور اگر والد نے اپنی زندگی میں ایسا نہیں کیا اور اس لڑکے نے اپنی جان و مال سے والد کا تعاون کیا، اور اس کے بال بچوں کی تعلیم اور شادی بھی والد کے مال سے نہ ہوئی، تو کیا ایسی صورت میں اس کے سرمایہ کی شرکت کے پیش نظر، دفع ضرر کے لئے اسے شرکت فاسدہ مانتے ہوئے اس کے مال کے بقدر نفع کی شرح مقرر کی جاسکتی ہے؟ اس پر اکیڈمی اجتماعی غور و خوض کر سکتی ہے۔

۳۔ ”تحفۃ الفقہاء“ میں ہے: ”ثم المضاربة متى فسدت، وقد ربح فيها، فالربح لرب المال، وللمضارب أجر المثل، لأن استحقاق رب المال الربح، لكونه نماء ماله، والمضارب إنما يستحق بالشرط، وقد فسد العقد، لكن عمل له بحكم عقد فاسد، فيلزمه أجر المثل، وكذا إذا لم يربح، لأنه استعمله مدة في عمله، فكان عليه أجر العمل“ (التحفة، کتاب المضاربة: ۲/۲۵، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۰۵، ۱۹۸۳م)

(پھر مضاربت جب فاسد ہو جائے اور اس میں نفع ہوا ہو تو سارا نفع مال کے مالک کا ہے، اور مضاربت کرنے والے کو اجرت مثل ملے گی، کیونکہ مال کا مالک نفع کا حقدار اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس کے مال کی بڑھوتری ہے، اور مضاربت کرنے والا شرط کی بنا پر نفع کا حقدار ہوتا ہے، اور عقد فاسد ہو چکا، لیکن اس نے عقد فاسد کی بنا پر اس کے لئے عمل کیا ہے تو اس پر اجرت مثل لازم ہے، اور ایسے ہی جب کہ نفع نہ ہو، کیونکہ اس نے اسے ایک مدت تک اپنے کام میں استعمال کیا ہے تو اس پر کام کی اجرت لازم ہوگی۔)

”ہندیہ“ میں ہے: ”وان كان الابن حرا، فاستأجر أحد الأبوين، ليرعى غنما له، أو استأجره لعمل آخر، وراء الخدمة، فإنه يجوز، كذا في الذخيرة“ (الہندیۃ ۴/۲۳۵)

(اور اگر بیٹا آزاد ہو، اور وہ ماں باپ میں سے کسی کو اجرت پر رکھے، تاکہ وہ اس کی بکری چرائے یا دوسرے کام کے لئے اجرت پر رکھے، خدمت کے علاوہ، تو یہ جائز ہے، ایسے ہی ذخیرہ میں ہے۔)

ڈاکٹر وہب زحلی تحریر کرتے ہیں: ”ما يتولد من شئ مملوك يكون مملوكا لصاحب الأصل، لأن مالك الأصل،

هو مالك الفرع“ (الفقه الإسلامي وأدلته ۲/۲۹۱۲، ط: دار الفكر المعاصر، بیروت ۱۹۹۶م)

(مملوکہ چیز سے جو پیدا ہو وہ اصل کے مالک کی مملوک ہوگی کیونکہ اصل کا مالک ہی فرع کا مالک ہے)۔

فتح القدیر میں ہے: ”والربح للعامل وهو صاحب العظام، لأنه كسب ماله“ (فتح القدیر: ۵/۴۱۱، ط: دار إحياء التراث العربی، بیروت) (اور نفع کام کرنے والے یعنی جو کہ اس جگہ خود کھانا کا مالک ہے اس کے لئے ہے کیونکہ وہ اس کے مال کی آمدنی ہے)۔

اسی میں ہے: ”لأن الربح في وجوده تابع للمال“ (فتح القدیر: ۵/۴۱۲) (اس لئے کہ نفع اپنے وجود میں مال کے تابع ہے)۔

”بدائع الصنائع“ میں ہے: ”ولو قال: خذ هذه الألف على أن لك نصف الربح أو ثلثه، ولم يزد على هذا، فالمضاربة جائزة قياسًا واستحسانًا، وللمضارب ما شرط، وما بقي، فلرب المال والأصل في جنس هذه المسائل أن رب المال إنما يستحق الربح، لأنه نماء ماله، لا بالشرط، فلا يفتقر استحقاقه إلى الشرط، بدليل أنه إذا فسد الشرط، كان جمع الربح له، والمضارب لا يستحق إلا بالشرط، لأنه إنما يستحق بمقابلة عمله، والعمل لا يتقوم إلا بالعقد“ (البدائع، فصل وأما ركن العقد ۸۰/۲) (اور اگر کوئی کہے کہ یہ ہزار لو، اس شرط کے ساتھ کہ تجھے آدھا نفع یا تہائی نفع ملے گا، اور اس پر اضافہ نہیں کیا، تو مضارب بت قیاس اور استحسان دونوں اعتبار سے جائز ہے، اور مضارب بت کرنے والے کو وہی ملے گا جو مشروط ہے، اور باقی نفع سرمایہ کے مالک کو ملے گا، اور اس طرح کے مسائل میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ سرمایہ کا مالک نفع کا حقدار اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس کے مال کی بڑھوتری ہے، شرط کی بنا پر حقدار نہیں ہوتا، تو اس کا حقدار ہونا شرط لگانے کا محتاج نہ ہوگا، اس دلیل سے کہ اگر شرط فاسد ہو جائے، تو سارا نفع اسی کا ہوگا اور مضارب بت کرنے والا شرط کی وجہ سے حقدار ہوتا ہے، کیونکہ وہ تو صرف اپنے کام کے مقابلہ میں حقدار ہوتا ہے، اور عمل عقد کے ذریعہ ہی قیمت والا ہوتا ہے)۔

”تحفة“ میں ہے: ”فيكون الربح لرب المال بسبب ماله، لأنه نماء ماله، وللمضارب باعتبار عمله، الذي هو سبب وجود الربح“ (تحفة الفقهاء كتاب المضاربة ۱۹/۳) (سبب سرمایہ کے مالک کا ہوگا اس کے مال کی وجہ سے، اس لئے کہ وہ اس کے مال کی بڑھوتری ہے، اور مضارب کا ہوگا اس کے عمل کے اعتبار سے جو نفع کے وجود کا سبب ہے)۔

- ۱- ان فقہی عبارات سے واضح ہوا کہ اگر لڑکے نے والد کو سرمایہ کا مالک نہیں بنایا اور نہ ہی والد نے اپنے کام کی حیثیت طے کی، تو یہ والد کی طرف سے لڑکے کے حق میں تبرع ہوگا، اور سارا سرمایہ اس لڑکے کا ہوگا جس نے کاروبار اپنے سرمایہ سے شروع کیا ہے۔
- ۲- اسی طرح تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو، تو بھی سارا سرمایہ اسی لڑکے کا ہوگا، جس نے کاروبار شروع کیا ہے، کیونکہ اصل یہی ہے کہ جس کا مال اور سرمایہ ہے، کاروبار کی ملکیت اسی کی ہے۔
- ۳- حبان بن ابی جبلہ جو ثقہ تابعی ہیں ان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”كل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين“ (سنن دارقطنی ۳/۲۳۵، حدیث نمبر ۱۱۲، سنن بیہقی ۱۰/۳۱۹، حدیث نمبر ۷۰۷، ۲۱۳۰، اور یہ حدیث مرسل ہے، اور اس میں عبدالرحمن ابن ابی سعید بن جبلی نے کہا کہ میں نے ان کی تصنیف کی ہے)، (ہر ایک آدمی اپنے مال کا اپنے والد، اولاد اور تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے)، ایک روایت میں ہے: ”كل أحد أحق بكسبه من والده وولده والناس أجمعين“

(اس کی روایت سعید بن منصور نے اپنی سنن میں کی ہے جیسا کہ ”معنی“ ۶/۳۲۱، میں ہے) (ہر ایک اپنی کمائی کا اپنے والد، اولاد اور تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے)۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه“ (سنن دارقطنی کتاب البیوع ۳/۲۶، حدیث نمبر ۹۱) (کسی مسلمان آدمی کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

عمرو شربی کہتے ہیں کہ میں منی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں حاضر تھا کہ آپ کو فرماتے ہوئے سنا: ”لا يحل لامرئ من مال أخيه شيئ إلا ما طابت به نفسه“ (سنن دارقطنی، کتاب البیوع، ۳/۲۵، حدیث نمبر ۸۹، ۹۰، و مسند احمد، حدیث نمبر ۱۵۵۲، ۲۱۱۲، شعیب



ارتو و ط کا کہنا ہے کہ عمارہ بن حارث ضمری سے روایت صرف عبدالرحمن بن ابی سعید خدری نے کی ہے، اور ان کی توثیق ابن حبان کے علاوہ سے منقول نہیں، اور اس کے باقی روایات ثقہ ہیں۔ (کسی آدمی کے لئے اس کے بھائی کے مال سے کچھ حلال نہیں مگر جو وہ خوشی سے دے دے)۔

زیلعی تحریر کرتے ہیں: ”وإسناده جيد، وأخرج نحوه عن أنس بإسنادين: في الأول مجابيل، وفي الثاني علي بن زيد بن جدعان“ (نصب الراية، كتاب الغصب: ۳/۱۶۹، ط: مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الأولى ۱۳۱۸ھ/۱۹۹۶م)  
(اس کی سند عمدہ ہے، اور اسی کی مانند حضرت انس بن مالک سے دو سندوں سے روایت کی گئی ہے، پہلی سند میں مجہول رواۃ ہیں، اور دوسری سند میں علی بن زید بن جدعان ہیں جو کہ ضعیف ہیں)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه“ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریر ظلم المسلم، حدیث نمبر ۲۵۶۳، والجمعۃ بین الصحیحین لحمیدی ۲/۱۶۲، حدیث نمبر ۲۳۸۳، ط: دار ابن حزم، بیروت، الطبعة الثانية ۱۳۲۳ھ/۲۰۰۲م)۔ (ہر ایک مسلمان کا مال، جان اور عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے)،  
حضرت ابو بکرہؓ، رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”فإن دمائكم وأموالكم وأعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا، في بلدكم هذا“

(صحیح بخاری، کتاب العلم، باب نمبر ۹، حدیث نمبر ۶۷)

(چنانچہ تمہاری جان، تمہارا مال اور تمہاری عزت باہم حرام ہے، جیسے تمہارے آج کے دن کی حرمت تمہارے اس ماہ اور تمہارے اس شہر میں ہے)۔

ان تمام احادیث شریفہ سے معلوم ہوا کہ آدمی اپنی کمائی کا زیادہ حقدار ہے، اور وہ اس کی ملکیت ہے، لہذا اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جبکہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں بھی دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی، اس لئے والد کا ہاتھ بٹانے والے بھائی کو چاہئے کہ وہ بھی والد سے اپنی ماہانہ اجرت یا نفع کا ایک حصہ طے کرائے، یا کچھ سرمایہ لگا کر والد کے ساتھ کاروبار میں شرکت کر لے اور نفع کی شرح اپنے لئے طے کرائے۔

۵- ”تنوير الأَبصار“ میں ہے: ”وتنفسخ بلا حاجة إلى الفسخ بموت أحد عاقدین عندنا“ (التنوير مع الدرر ۹/۱۱۳-۱۱۵)۔

(ہمارے نزدیک عاقدین میں سے کسی کی موت سے اجارہ فسخ کئے جانے کی حاجت کے بغیر فسخ ہو جاتا ہے)۔

”ہدایہ“ میں ہے: ”وإذا مات أحد المتعاقدين، وقد عقد الإجارة لنفسه، انفسخت، لأنه لو بقي العقد، تصير المنفعة المملوكة به أو الأجرة المملوكة لغير العاقد، مستحقة بالعقد، لأنه ينتقل بالموت إلى الوارث، وذلك لا يجوز وإن عقدها لغيره لم تنفسخ مثل الوكيل والوصي والمتولي في الوقف، لانعدام ما أشرنا إليه من المعنى“ (الهداية ۳/۲۲۷)  
(اور اگر عاقدین میں سے کوئی مر جائے، اور اس نے اپنے لئے اجارہ کیا تھا، تو اجارہ فسخ ہو جائے گا، اس لئے کہ اگر عقد باقی رہے، تو اس کی وجہ سے مملوکہ منفعہ یا مملوکہ اجرت غیر عاقد کے لئے عقد کی وجہ سے لازم ہو جائے گی، کیونکہ وہ موت کی وجہ سے وارث کی طرف منتقل ہو جائے گی، اور یہ جائز نہیں ہے، اور اگر دوسرے کے لئے عقد کرے تو اجارہ فسخ نہ ہوگا، جیسے وکیل، وصی اور متولی وقف عقد اجارہ کرے، اس لئے کہ وہ علت نہیں پائی جا رہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے)۔

اور ”تکملة فتح القدير“ میں ہے: ”عقد کی وجہ سے استحقاق اس منفعہ کا ہے جو اجارہ پر دینے والے کی ملکیت میں پیدا ہوتی ہے اور ملکیت اس

کی موت سے فوت ہو چکی ہے، لہذا اجارہ باطل ہو جائے گا، اس لئے کہ معقود علیہ فوت ہو چکا ہے، کیونکہ گھر کی ملکیت وارث کی طرف منتقل ہو جائے گی، اور منفعت مالک رقبہ کی ملکیت میں پیدا ہوگی، اس وجہ سے کہ اجارہ میں معقود علیہ کے حق میں تجدد اور نیا پن ہوتا رہتا ہے، پیدا ہونے والی منفعت کے لحاظ سے اور اسے دوسرے کی ملکیت میں عقد کو لازم کرنے کا اختیار نہیں ہے“ (مکملہ فتح القدیر ۸/ ۸۴)۔

اور اسی میں ہے: ”اور دوسرا طریقہ اجرت پر لینے والے کی موت کے سلسلہ میں ہے کہ اگر اس کی موت کے بعد عقد باقی رہے، تو اس بنا پر باقی رہے گا کہ وارث اس کا قائم مقام بنے، اور خالص منفعت میں وراثت جاری نہیں ہوتی ہے، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ عاریت پر لینے والا اگر مر جائے، تو منفعت میں اس کا وارث اس کا قائم مقام نہ ہوگا، اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ عاریت پر لینے والا منفعت کا مالک ہوتا ہے، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وراثت قائم مقامی ہے، اور اس کا تصور صرف ایسی چیزوں میں ہو سکتا ہے جو دو وقت تک باقی رہے، تاکہ پہلے وقت میں مورث کی ملکیت رہے اور دوسرے وقت میں اس ملکیت میں وارث اس کا قائم مقام ہو، اور اجرت پر لینے والے کی زندگی میں جو منفعت وجود میں آتی ہے، وہ باقی نہیں رہتی ہے، کہ اس میں وراثت جاری ہو، اور جو منفعت بعد میں وجود میں آتی ہے، وہ مورث کی ملکیت میں نہیں ہوتی ہے کہ اس میں وارث اس کا قائم مقام ہو، چنانچہ ملکیت وجود منفعت سے پہلے نہیں ہو سکتی ہے، اور جب وراثت کی نفی ثابت ہوگئی، تو عقد کا باطل ہونا متعین ہو گیا“ (حوالہ سابق ۸/ ۸۴-۸۵)۔

اور ”ہندیہ“ میں ہے: ”والإرث فی اللغۃ البقاء، وفی الشرع انتقال مال الخیر إلی الخیر علی سبیل الخلافة“ (الہندیہ ۱/۲۴۷) (اور ”ارث“ لغت میں بقاء کو کہتے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں وراثت قائم مقامی کے طور پر دوسرے کا مال دوسرے کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے)، ”تحفہ“ میں ہے: ”فیكون الربح لرب المال بسبب مباله لأنه نماء ماله“ (التحفہ ۱۹/۳) (چنانچہ نفع مال کے مالک کا اس کے مال کی وجہ سے ہوگا، کیونکہ وہ اس کے مال کی بڑھوتری ہے)، ان فقہی عبارات سے واضح ہوا کہ مرنے کے بعد کوئی چیز کسی کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہے، اور اصل یہ ہے کہ جس کا سرمایہ ہے ملکیت اسی کی ہے، لہذا:

- ۱- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ جو کہ مملوکہ ہے، موجود ہے اور اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے والد کی اجازت سے دوبارہ کاروبار کو شروع کیا، تو یہ کاروبار اسی کی ملکیت ہوگی، والد کی ملکیت نہیں ہوگی، دلائل پیچھے گذر چکے ہیں۔
- ۲- اور اگر والد کا انتقال ہو گیا ہے اور ورثہ کی اجازت سے کسی نے اس جگہ کاروبار شروع کیا، تو بھی کاروبار اسی کی ملکیت ہوگی۔
- ۳- اگر والد کا کاروبار ختم ہو گیا، اور کاروبار کی جگہ جو کہ کرایہ پر حاصل کی گئی ہے، موجود ہے، اور والد کی اجازت سے کسی لڑکے نے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اسی لڑکے کی ملکیت ہوگی، والد کی ملکیت نہیں ہوگی۔
- ۴- اگر والد کی وفات کی وجہ سے اجارہ ختم ہو گیا، اور نئے سرے سے کسی لڑکے نے اجارہ قائم کر کے اپنے سرمایہ سے کاروبار دوبارہ شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اسی لڑکے کی ملکیت ہے۔

### خلاصہ بحث

- ۱- معاملہ خواہ والد کے ساتھ ہو، یا اولاد کے ساتھ یا بھائی کے ساتھ یا اجنبی کے ساتھ واضح اور متعین ہونا چاہئے۔
- ۲- اگر حیثیت کا تعین کئے بغیر کسی نے والد کا ہاتھ بنایا تو یہ تبرع سمجھا جائے گا، جس میں تبرع کرنے والے کا قصد آخرت کا ثواب ہوتا ہے۔
- ۳- اگر والد کو محسوس ہو کہ لڑکا تعاون کے بدلہ عوض کا خواہش مند ہے تو اس کی ماہانہ اجرت مقرر کر دے، یا نفع کا ایک حصہ اسے دے دے۔
- ۴- اگر لڑکوں نے اپنی حیثیت طے نہیں کی، اور نہ ہی والد نے اس کی حیثیت طے کر کے اسے کچھ دیا، تو والد کا فرض بنتا ہے کہ مرنے سے پہلے ایسے لڑکوں کے نام جائیداد یا کاروبار کا کوئی حصہ کر دے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی والد کے ساتھ لگا دی، اور ان کے بال بچوں کی تعلیم اور شادی

والد کے مال سے نہیں ہوئی، کہ یہی عدل کا تقاضا ہے۔

- ۵- اگر والد نے قربانی دینے والے لڑکے کی رعایت نہیں کی، تو کیا بغیر سرمایہ کے والد کے کام میں شریک ہونے والوں کے کام کو اجارہ فاسدہ پر محمول کر کے اجرت مثل کو دفع ضرر کے لئے لازم کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں اکیڈمی اجتماعی غور و خوض کر سکتی ہے۔
- ۶- اصل یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی رقم باپ یا بھائی کو حیثیت کا تعین کیے بغیر دے، یا اپنا سرمایہ لگا کر کاروبار کو ترقی دے، تو یہ سب تبرع سمجھا جائے گا۔
- ۷- والد کا فرض بنتا ہے کہ اپنے سرمایہ سے کاروبار کو ترقی دینے والے لڑکے کے نام سے مرنے سے پہلے کوئی جائداد یا کاروبار کا کوئی حصہ کر دے کہ یہی عدل کا تقاضا ہے، جب کہ اس کے مال سے تعاون دینے والے کے بچے کی تعلیم اور شادی کا نظم نہ ہوا ہو۔
- ۸- اگر سرمایہ فراہم کر کے کاروبار کو ترقی دینے والی اولاد کی رعایت والد نے زندگی میں نہ کی، تو کیا اسے شرکت فاسدہ مانتے ہوئے مال کے بقدر نفع کی شرح، ازالہ ضرر کے لئے طے کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں اکیڈمی اجتماعی غور و فکر کر سکتی ہے۔
- ۹- اصل یہ ہے کہ جس کا سرمایہ ہے، کاروبار کی ملکیت اسی کی ہے، مگر یہ کہ وہ اپنا سرمایہ کسی کو ہبہ کر کے اس کا مالک اسے بنا دے، چنانچہ ایسی صورت میں اگر والد یا بھائی نے اپنی حیثیت کا تعین نہیں کیا، تو یہ ان کی جانب سے تبرع ہوگا۔
- ۱۰- شریعت میں اصل یہ ہے کہ ہر ایک کی کمائی تنہا اس کی ملکیت ہے، خواہ سب کا کھانا پینا ساتھ ہو۔
- ۱۱- چونکہ جس کا سرمایہ ہے، کاروبار کی ملکیت اسی کی ہے، دیگر حضرات جنہوں نے اپنی حیثیت کا تعین نہ کیا ہو، وہ تبرع کرنے والے ہیں، لہذا اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اور اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ والد کی اجازت سے کاروبار شروع کیا ہو، تو کاروبار اسی شروع کرنے والے لڑکے کی ملکیت ہوگی۔
- ۱۲- اگر والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہو اور ورثہ کی اجازت سے کسی لڑکے نے کاروبار کی مملوکہ جگہ میں اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، تو یہ تنہا اس کی ملکیت ہے۔
- ۱۳- اگر والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہو اور کاروبار کی جگہ کرایہ کی ہو، تو اجارہ فسخ ہو جائے گا، اب اگر کوئی لڑکانے سرے سے اجارہ کا عقد کر کے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کرتا ہے تو یہ تنہا اس کی ملکیت ہوگی۔



## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مولانا محی الدین بڑودوی

۱- اگر والد کے سرمایہ سے کاروبار شروع ہوا اور بچے بھی کام میں شریک رہے تو والد کے مرنے کے بعد یہ سب کاروبار میں شرکاء کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ شرکت ملک ہوگی۔

”الشركة نوعان، شركة ملك، وهي أن يتملك رجلان شيئاً من غير عقد الشركة بينهما كذا في التهذيب. وشركة عقد، وهي أن يقول أحدهما شاركك في كذا ويقول الآخر قبلت هكذا في كذا الدقائق“۔

(شرکت کی دو قسمیں ہیں: ایک شرکت ملک: دو آدمی عقد شرکت کے بغیر کسی شئی کے مالک بن جائیں، تہذیب میں اسی طرح ہے۔

اور شرکت عقدیہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کہے کہ میں تجھے اس شئی میں شریک کرتا ہوں، دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا، کنز الدقائق میں اسی طرح ہے)

”وشركة الملك نوعان، شركة جبر واختيار، فشركة جبر أن يختلط المالان لرجلين بغير اختيار المالين خلطاً لا يمكن التمييز بينهما حقيقة بأن كان الجنس واحداً أو يمكن التمييز بضرب كلفة وفشقة نحو أن تختلط الحنطة والشعير أو يرثا مالاً“۔

”وركنها اجتماع النصيين، وحكمها وقوع الزيادة على الشركة بقدر الملك ولا يجوز لأحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر إلا بأمره وكل واحد منهما كالأجنبي في نصيب صاحبه ويجوز بيع أحدهما نصيبه من شريكه في جميع الصور ومن غير شريكه بغير إذنه إلا في صورة الخلط والاختلاط، كذا في الكافي“ (فتاویٰ ہندیہ: ۲/۳۰۱، ذکر یاد دیوبند)۔

(شرکت ملک کی دو قسمیں ہیں: شرکت جبر اور شرکت اختیار، شرکت جبریہ ہے کہ دو آدمی کے دو مال مالکوں کے اختیار کے بغیر اس طرح مل گئے کہ دونوں مالوں کو جدا کرنا واقعی ناممکن ہو، جیسے دونوں مال ایک ہی جنس کے ہوں یا محنت و مشقت سے جدا کرنا ممکن ہو جیسے جو ادھر گہوں مخلوط ہو جائیں یا دو آدمی کسی مال کے وارث ہو جائیں۔

اور اس شرکت کارکن دونوں حصوں کا اکٹھا ہو جانا ہے اور اس کا حکم: ملک کے بقدر شرکت میں زیادتی ہے، اور ان میں سے کسی کے لئے کسی دوسرے کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں ہے، اور ہر شخص دوسرے کے حصہ میں اجنبی کی طرح ہے اور ان میں کوئی اپنا حصہ اپنے شریک کو فروخت کر سکتا ہے، تمام صورتوں میں، اور غیر شریک کو بھی فروخت کر سکتا ہے، شریک کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، مگر خلط و اختلاط کی صورت میں غیر شریک کو فروخت کرنا ہو تو اپنے شریک کی اجازت ضروری ہے، کافی میں اسی طرح ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ سب شریک رہیں گے، سب شرکاء اپنے حصہ کے بقدر برابر کے شریک رہیں گے، اگرچہ کسی کا کام زیادہ ہو یا کوئی زیادہ تجربہ کار ہو، اور رائے صواب رکھتا ہو۔

”يقع كثيرا في الفلاحين ونحوهم أن أحدهم يموت فتقوم أولاده على تركته بلاقسمة بينهم ويعملون فيها من حرث وزراعة وبيع وشراء واستدانة ونحو ذلك وقارة كبيرهم هو الذي يتولى مهماتهم ويعملون عنده بأمره، وكل ذلك على وجه الإطلاق والتفويض لكن بلا تصريح لفظ المفاوضة، ولا بيان جميع مقتضياتها مع كون الشركة

أغلبها أو كلها عروض لا تصح فيها شركة عقد، ولا شك أن هذه ليست شركة مفاوضة خلافاً لما أفتى به في زماننا من لا خيرة له بل هي شركة ملك كما حررته في تنقيح الحامدية، ثم رأيت التصريح به بعينه في فتاوى الحانوتي، فإذا كان سعيهم واحداً ولم يتميز ما حصله كل واحد منهم بعمله يكون ما جمعه مشتركاً بينهم بالسوية وإن اختلفوا في العمل والرأي كثرة وصواباً كما أفتى به في الخيرية“ (رد المحتار ۶/۴۷۸ زكريا ديوبند)۔

(کثیر الوقوع بات ہے کہ کسان وغیرہ میں سے کسی کی وفات ہو جاتی ہے پھر اس کی اولاد بلا تقسیم ترکہ پر قائم رہتی ہے اور زمین میں محنت، زراعت، خرید و فروخت، قرض کالین دین مطلقاً ہوتا رہتا ہے اور لفظ مفاوضہ کے بغیر تفویض ہوتی ہے، مفاوضات کے مقتضیات کا کوئی بیان نہیں ہوتا، حالانکہ ترکہ زیادہ تر پورا عروض کی شکل میں ہوتا ہے، جس میں شرکت عقد صحیح نہیں ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ یہ شرکت مفاوضہ نہیں ہے، اس فتویٰ کے خلاف جن کو تجربہ نہیں ہے جنہوں نے شرکت مفاوضہ کا فتویٰ دیا ہے۔

بلکہ یہ شرکت ملک ہے، جیسا کہ میں نے فتاویٰ تنقیح الحامدیہ میں لکھا ہوا ہے، پھر بعینہ فتاویٰ حانوتی میں تصریح دیکھی، پس جبکہ سب کا کام ایک ہے اور ہر ایک کے کام سے اس کے حصہ میں کیا آتا ہے اسی کی تمیز مشکل ہے تو کچھ جمع کیا ہے وہ ان کے درمیان برابری کی حیثیت سے مشترک رہے گا، اگر چہ کام میں مشورہ میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہو، جیسے فتاویٰ خیریہ میں اسی پر فتویٰ دیا ہے) (رد المحتار ۶/۶۷۸)۔

اس صورت میں بڑے لڑکے زیادہ محنت کرنے والے باپ کی زندگی میں اس کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کر سکتے ہوں یا اپنے لئے زیادہ کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو باپ کے ساتھ معاملہ طے کر لے۔

۲- اگر بچوں نے اپنا سرمایہ والد کی اجازت سے لگایا ہو تو یہ شرکت عقد ہے اتنے سرمایہ کے حساب سے وہ اپنے نفع کے حقدار ہو سکتے ہیں لیکن نقصان کی صورت میں وہ نقصان ان کے سرمایہ پر بھی پڑے گا۔

۳- لڑکے نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا ہے تو وہ اس کا ہے، تہہ کا باپ کو بٹھانے یا قانونی کارروائی سے بچنے کے لئے برائے نام باپ کا نام رکھا ہو تو باپ شریک نہیں ہے اور اس کی وساطت سے دوسری اولاد بھی شریک نہ ہوگی۔

۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں ہاتھ بٹایا، دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے تو باپ کی زندگی میں ہی معاملہ طے ہو جانا چاہئے، اگر دوسرے ذرائع اختیار کرنے والے بھائی باپ کے ساتھ کھاتے پیتے رہے، سرمایہ اگر باپ کا ہے تو اسی وقت طے کر لینا چاہئے کہ دوسرے بھائیوں کی کمائی کاروبار میں لگے گی یا نہیں؟ اگر ان کی کمائی باپ کے کاروبار میں لگتی ہے تو باپ کے ساتھ معاملہ طے کر لیں، اگر صرف کھانا پینا ساتھ ہو کھانے پینے کا حساب دے دیں، جن بھائیوں نے جدا محنت کر کے اپنے بل بوتے پر کمایا ہے ان کی کمائی میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں ہے۔

اگر باپ کی زندگی میں ساتھ کھاتے پیتے رہے کوئی معاملہ طے نہ پایا تو باپ کے مال میں دوسرے بھائی بطور وراثت کے شریک رہیں گے، اس صورت میں صرف کھانے پینے میں شرکت رہی تو اپنی یہ شرکت باپ کے مال میں باپ کی رضامندی سے رہی ہے باپ کے بعد متروکہ مال سب وراثت کا ہے۔

لیکن ایسی صورت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو بھائی باپ کے ساتھ ہے اور بڑا ہے تو اس کے بچے پلتے اور بڑے ہوتے ہیں، کبھی ان کی شادیوں اور دواؤں نیز تعلیم پر بھاری خرچ باپ کی کمائی میں سے ہی ہوتا ہے اور جدا کمانے والے بھائیوں پر ان کی کمائی میں بیوی بچوں کے جملہ اخراجات آتے ہیں، اس طرح باپ کے ساتھ رہنے والا بھائی بڑے فائدہ میں رہتا ہے، اس لئے باپ کی زندگی ہی میں یہ معاملات طے ہو جانے چاہئیں۔

۵- باپ کی زندگی ہی میں باپ کا کاروبار ختم ہو گیا، باپ کی مملوکہ جگہ یا کرایہ کی جگہ میں اولاد میں سے کسی نے کاروبار شروع کیا تو جگہ مملوکہ ہونے کی صورت میں اگر دوسرے بھائیوں کی اجازت سے شروع کیا ہو تو اگر اسی وقت کوئی معاملہ طے پا گیا تھا تو اسی کے مطابق عمل ہوگا، اگر کوئی معاملہ طے نہ پایا تھا تو مملوکہ جگہ میں دوسرے وراثت اپنے حصہ کی نسبت سے شریک ہیں، قابل تقسیم ہو تو جگہ تقسیم کی جائے گی، قابل تقسیم نہ ہو تو دوسرے وراثت کے حصہ کی قیمت کاروبار کرنے والا چکائے گا، یا اجرت معروضہ دے گا، باپ کی زندگی میں کاروبار شروع کیا ہو تو باپ کے ساتھ معاملہ طے کرنا ہوگا۔

اگر باپ کی کرایہ کی جگہ تھی تو باپ کی وفات سے عقد اجارہ جو باپ کے ساتھ تھا ختم ہو گیا، اس لئے اب جو کاروبار کرنے والے کا ہوگا، کرایہ کی جگہ میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے، نئے عقد اجارہ کے ماتحت جو بھی کاروبار کرے گا، کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا۔

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت کے مسائل

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی ع

شرکت کا ثبوت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ و اجماع امت سے ہے، آیت ربانی: فہم شرکاء فی الثلث، وإن کثیرا من الخلق لیبغی بعضهم علی بعض... وقال رسول اللہ ﷺ، أنا ثالث الشریکین ما لم یخن أحدهما صاحبه فإذا خانه خرجت من بینہما (رواہ ابوداؤد)، شرکت کے جواز پر مسلمانوں کا اجماع ہے: وأجمع المسلمون علی جواز الشركة فی الجملة (کشاف القناع لمنصور ابن یونس بہوق ۲/۲۸۵ مطبعہ الحکومتہ بمکة، المغنی مع الشرح الکبیر ۵/۱۰۹، مکتبۃ المؤید بالطائف ومکتبۃ السلفیۃ بالمدينة وفی ہامش الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۴۹۳ مطبوعہ دار الفکر)۔

۱- اگر لڑکا باپ کی عیال میں ہو اور والد کے کاروبار میں عملاً لڑکے کی شرکت والد کی رضامندی سے ہو رہی ہے اور لڑکے نے کسی طرح کی کوئی شرط اجرت کے متعلق نہیں لگائی ہے تو لڑکوں کا یہ عمل تبرعاً ہوگا اور وہ معاون و مددگار ہوں گے۔

الأب وابنه یکتسبان صنعة واحدة ولم یکن لہما شیء فالکسب کلہ للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ (رد المحتار علی الدرر ۶/۵۰۲، کفایت المغنی ۸/۲۴۸)۔

لیکن اگر لڑکے باپ کی عیال میں نہ ہوں تو ان کے عمل کی اجرت شرط کے مطابق ملنی چاہئے۔

أن یشرتک بدنات بمال أحدهما وهو أن یکون المال من أحدهما والعمل منہما مثل أن ینخرج أحدهما ألفا ویعملان فیہ معا والربح بینہما فهذا جائز ونص علیہ أحمد فی روایة أبی الحارث وتكون مضاربة لأن غیر صاحب المال یتحقق الشروط من الربح بعملہ فی مال غیرہ وهذا بو حقیقة المضاربة (المغنی مع الشرح الکبیر ۵/۱۲۴۱۳۸)۔

اگر دو شخص محنت کریں اور رأس المال صرف ایک کا ہو مثلاً ان پر سے ایک نے ایک ہزار روپے کاروبار میں لگائے اور دونوں شخص مل کر محنت کریں اور نفع باہم تقسیم ہو تو یہ جائز ہے امام احمد بن حنبل نے ابو الحارث کی روایت سے اس کے جواز کا قول فرمایا ہے، مسئلہ مجوشہ سے متعلق حضرت مفتی اعظم کی تحریر ملاحظہ ہو: ”بالغ اور نابالغ بچے جب کہ باپ کے کاروبار میں باپ کے ساتھ شریک رہیں یعنی کام کاج کرتے رہیں لیکن ان کی محنت کا کوئی معاوضہ مقرر نہ کیا گیا اور نہ کبھی انہوں نے اس کا مطالبہ کیا ہو تو تمام آمدنی باپ کی ملک تصور ہوتی ہے اور اولاد اس کی معین و تبرع قرار دی جاتی ہے (کفایت المفتی ۸/۲۷۹-۲۸۰)۔

نیز مفتی صاحب ”جلد مذکور کے ص ۲۸۱ پر ایک سوال کے جواب پر رقمطراز ہیں: ”ہاں والد کی زندگی میں پریس میں کتابت کا کام کیا اور آپ نے والد کے لئے کیا یا منجری کا کام کیا اس کا معاوضہ آپ والد کے ترکہ میں سے طلب نہیں کر سکتے، وہ سب کا والد کی اعانت اور تبرع قرار پائے گا۔

۲- یہ شرکت عنان کے قبیل سے ہے جس پر کئی شرطوں کے ساتھ ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس پر سرمایہ کا برابر و مساوی ہونا شرط نہیں، سرمایہ کے عدم مساوات کے باوجود نفع میں اگر مساوات کی شرط ہے تو فقہاء عراق نے اسے جائز قرار دیا ہے، امام مالک و امام شافعی کے یہاں عدم جواز ہے۔

وہی جائزۃ بالاجماع کما ذکر ابن المنذر (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ۳/۴۰)

دکتور وہب الزحیلی الفقہ الاسلامی کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں: ”من شركة العنان هذا متفق علیہ بین الحنفیۃ والشافعیۃ

ع شیخ الحدیث دارالعلوم مئو۔



والزیدیۃ والظاہریۃ والحنبلیۃ فی الحد قولین عندهم الخ“ (حاشیہ الفقہ الاسلامی ۳/۷۹۶)۔

اگر باپ کے برابر سرمایہ ہے تو برابر نفع ملے گا اور بچوں کو ان کے سرمایہ کے بقدر، لیکن اگر سرمایہ کم لگانے کے باوجود برابر نفع کے طالب ہیں تو فقہاء عراق نے اس کی اجازت دی ہے، امام مالک و امام شافعی کے یہاں عدم جواز ہے،

علامہ ابن رشد تحریر فرماتے ہیں: فإفهم اتفقوا علی أنه إذا كان الربح تابعا لرؤوس الأموال أعني إن كان أصل مال الشركة متساويين كان الربح بينهما نصفين واختلفوا هل يجوز أن يختلف رؤوس أموالها ويتساويان في الربح فقال مالك والشافعي: لا يجوز وقال: أهل العراق يجوز ذلك (بداية المجتهد: ۲/۲۵۵ مكتبة الكليات الأزهرية)۔  
علامہ ابن نجیم نے نفع کی مساوات کی تقلیل سرمایہ کی صورت میں صراحت ان الفاظ میں کی ہے:

وقد يكون أحدهما أحزق وأهدى أو أكثر عملا فلا يرضى بالمساواة فمشت الحاجة إلى التفاضل (بحر الرائق ۵/۱۷۳، ایچ، ایم سعید کراچی پاکستان)۔ ولنا قوله عليه السلام الربح على ما شرطنا (الحديث)۔

فأما شركة العنان فهي أن يشترك اثنان فأكثر بمالين على أن يعمل معًا في تميمتها والربح بينهما على ما اشترطا (كتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ: ۲/۷۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان)۔

ولا تتضمن الكفالة بهذت المفاوضة ولا تشترط المساواة في رأس المال في هذه الشركة عندنا ولا اتفاق الحبس في رأس المال ولا خلط المالين (فتاویٰ قاضی خان علی ہندیۃ: ۲/۲۱۳)۔

یہ معاملہ نہ تو کفالتہ کو متضمن ہوتا ہے اور نہ ہی دونوں کے رأس المال کی برابری اور نہ جس پر دونوں کی موافقت اور نہ دونوں کے مال کا گڈڈ ہو جانا کفالت اس میں معتبر نہیں، ہاں اگر کفالت کے ساتھ معاملہ کر لیا جائے تو یہ معاملہ باطل نہ ہوگا۔

لأن العنان معتبر فيها عدم الكفالة ويمكن أن يقال لا تبطل لأن المعتبر فيها عدم اعتبار الكفالة لا اعتبار عدمها فتصح عنانا ثم كفالة كل الآخر زياده على نفس الشركة (شرح فتح القدير ۵/۲۰ مطبوعہ دار عام الکتب مملکتہ العربیۃ السعودیہ)۔ بہر حال والد کی اجازت سے کاروبار میں شامل کیا جانے والا اثاثہ مشترک طور پر رہتے ہوئے الگ سے کمایا ہوا نہ ہو تو والد کا ہوگا، ورنہ بچوں کا اور شرکت درست ہوگی۔

۳- اگر والد نے بیٹھنے سے قبل لڑکے سے کسی طرح کی کوئی شرط نہیں لگائی ہے تو یہ والد کی رضامندی کی دلیل ہوگی اور یہ بیٹھنا تبرعا ہوگا، بعینہ یہی حکم والد کے نام پر دوکان کے نام رکھنے کا بھی ہونا چاہئے۔

ولو أن رجلا أجلس في دكانه رجلا يطرح عليه العمل بالنصف فالقياس أن لا تجوز هذه الشركة لأنها شركة العروض لأن من أحدهما العمل ومن الآخر الحانوت والحانوت من العروض وشركة العروض من غير جائزة وفي الاستحسان جائزة لأن هذه شركة الأعمال ولأنها شركة التقبل وتقبل العمل من صاحب الحانوت عمل، وشركة الأعمال جائزة بلا خلاف بين أصحابنا لأن مبناهما الوكالة والوكالة على هذا الوجه جائزة (بدائع الصنائع ۵/۸۵ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ اگر دوکان پر بیٹھنے کے لئے نفع پر نصف نصف کا معاملہ کر لیا تو استحساناً جائز ہے۔

۴- اگر قبل تقسیم کچھ بھائیوں نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور کچھ نے دوسرے ذرائع معاش اختیار کئے اور سبھوں کا رہنا سہنا یکجا تھا تو دوسرے بھائی جنہوں نے دوسرے ذرائع اختیار کئے کما کر جو رقم باپ کو دے دیں گے وہ مشترک سمجھی جائے گی، فتاویٰ رحیمیہ میں موجود ہے ”باپ بیٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی ماہانہ تنخواہ اپنے والد کے حوالہ کر دیتا ہے تو اس صورت میں جمع شدہ رقم سے جو مکان زمین وغیرہ خریدی گئی وہ سب باپ کی شمار ہوگی (۱۸۵/۹)۔“

۵- اگر اپنا سرمایہ لگا کر (جو مشترک طور پر رہتے ہوئے الگ سے کمایا ہو سرمایہ نہیں ہے) کاروبار شروع کیا گیا تو یہ تجارت اس لڑکے کی ہوگی فرم کا استعمال والد کی اجازت سے جائز ہوگا اور اگر والد اس پر کچھ عوض لینا چاہیں تو اس پر بھی جواز کی گنجائش نکلی چاہئے اور یہ عوض تنازل کے طور پر ہوگا، مولانا تقی عثمانی، ڈاکٹر قرضاوی اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی تحریروں سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں: ”اور کارخانہ کا نام بھی مشابہ وظائف کے ہے کہ ثابت علی وجہ الاصلت ہے، نہ کہ دفع ضرر کے لئے اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے، پس اس بنا پر اس کے عوض دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، گولینے والے کے لئے خلاف تقویٰ ہے، مگر ضرورتاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (حوادث الفتاویٰ ۱/۳۷۱)۔“

چونکہ فرم، ٹریڈ مارک وغیرہ عرف عام میں رجسٹریشن کے بعد یا بغیر رجسٹریشن ایک طرح کی ملکیت کے قائم مقام ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کی بیع بھی جائز ہونی چاہئے، حضرت مفتی ظفر الدین صاحب زید مجدہ تحریر فرماتے ہیں: حقوق عرفیہ کی بیع۔ لہذا پر گنجائش ملنی چاہئے..... فقہاء امت نے اپنے دور کے حالات اور عرف عام کا بڑا لحاظ رکھا ہے اور انہوں نے اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے ہمیں بھی اپنے دور کے عرف و عادت سے صرف نظر کرنا درست نہ ہوگا (مجلہ فقہ اسلامی سہ ماہی ۳/۲۸۱)۔

بہر حال تعامل اور عرف و عادت کی حجیت پر اصول فقہ پر کافی سرمایہ موجود ہے، ذیل میں صرف ایک تحریر پیش ہے:

وقد قرر العلماء أن الفتوى تقدر زمانا ومكانا وشخصا واعتبار المآلات، الذي نحن فيه يحتاج إلى كل هذا يحتاج إلى معرفة أحوال الزمان والمكان والأشخاص (نظريه المقاصد للشاطبي از شيخ احمد الريسوني/۳۸۲)۔

### خلاصہ

- ۱- اگر بدون کسی شرط لڑکوں کی شرکت ہے تو وہ معاون ہوں گے۔
- ۲- یہ شرکت عنان ہے اور یہ ان کے قبیل سے ہے، یہ سرمایہ اگر باپ کے ساتھ رہ کر الگ سے کمایا ہوا ہے یا الگ رہ کر کمایا ہوا ہے تو کاروبار میں اس کی شمولیت بطور پارٹنر ہوگی۔
- ۳- والد اگر اپنی مرضی سے بدون کسی شرط دوکان پر بیٹھ رہے ہوں تو ان کا یہ بیٹھنا تبرعا ہوگا بصورت ثانی شرکت فی العمل ہوگی جس پر استحسانا اجرت کا جواز ہے
- ۴- دوسرے ذرائع اختیار کرتے ہوئے اگر اپنی تنخواہ یا اس میں سے کچھ والد کو دے دیتے ہیں تو والد کو دی ہوئی کمائی مشترک سمجھی جائے گی۔
- ۵- والد کی رضامندی کے بعد اسی فرم سے شروع کیا جانے والا کاروبار لڑکے کی ملکیت میں ہوگا، بصورت دیگر والد بطور تنازل یا بطور حقوق عرفیہ معاوضہ بھی لے سکتے ہیں۔





## مسائل کاروبار - والد اور اولاد کی شرکت

مولانا راشد حسین ندوی

آج کل کسی کی میراث کی تقسیم کے وقت اس طرح کے تنازعات کثرت سے پیش آتے ہیں کہ بعض بھائی زیادہ حصوں کے طلب گار ہوتے ہیں، ان کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ والد کے کاروبار میں انہوں نے اپنا خون پسینہ بہایا ہے، جبکہ دوسرے بھائی چاہتے ہیں کہ مساویانہ تقسیم ہو، اس نزاع کو دور کرنے کے لئے پہلے تو یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ وراثت میت کے ترکہ میں جاری ہوتی ہے، لہذا سب سے پہلے تو ترکہ کی حقیقت سمجھ لینا ضروری ہے، پھر اگر معلوم ہو کہ فلاں چیز میت کے ترکہ میں شامل ہے تو اس میں حسب ضابطہ تقسیم کیا جائے، اور جو چیزیں ترکہ میں شامل نہیں ہیں ان کو الگ کر لیا جائے۔

ترکہ کی تعریف: ..... لغت میں ترکہ: ترک کا وتر کانا بالکسر: ودعه وخلفه (چھوڑا) سے ماخوذ ہے، ترکة الرجل وترکة الرجل کفرحة: میراثہ: (آدمی کی میراث) کو کہتے ہیں (القاموس المحيط المعجم الوسيط)۔

شرعی اصطلاح میں ترکہ اس چیز کا نام ہے جس کو کوئی اپنی موت کے بعد چھوڑتا ہے، چاہے وہ چیز مال ہو یا مالی یا غیر مالی حقوق

”والتركة ما يتركه الشخص بعد موته من أموال وحقوق مالية أو غير مالية فكل ما يتركه الشخص بعد وفاته يقال له في اصطلاح جمهور الفقهاء ”تركة“ سواء كان على الميت دين أولم يكن، وسواء كانت ذينونه عينية أو شخصيته“ (الوارث في الشريعة الاسلاميه للصابوني/۱۹)۔

اس تعریف سے واضح ہو گیا کہ باپ کی اپنی املاک ہی اس کا ترکہ ہیں، اس کے کسی بیٹے یا دوسرے کی املاک اس سے خارج ہیں، لہذا ہمیں صرف یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اکیڈمی کے ارسال کردہ ان پانچ سوالوں میں جو حالات ذکر کی گئی ہیں ان میں کتنا حصہ باپ کا ترکہ ہے، اور کتنا حصہ اس سے خارج ہے:

### سوال ۱: سرمایہ لگائے بغیر باپ کی معاونت کا حکم

اگر باپ کے کاروبار میں اس کی اولاد میں سے کوئی ہاتھ بٹانے لگا، تو اولاد تو باپ بیٹے کو پہلے مرحلہ ہی میں معاملہ صاف کر لینا چاہئے کہ اس تعاون کی حیثیت کیا ہوگی؟ لیکن اگر معاملہ صاف نہیں کیا گیا اور صورت حال یہ ہے کہ بیٹا باپ کے ساتھ ہی رہتا ہے، بیٹے کے جملہ خرچ بھی باپ ہی برداشت کرتا ہے، اور اس نے اپنا ذاتی سرمایہ بھی اس میں کچھ بھی نہیں لگایا ہے، تو بیٹے کی حیثیت باپ کے معاون کی ہوگی، وہ نہ اس کا شریک اور پارٹنر ہوگا نہ ملازم یا اجیر، اس طرح کاروبار کی کل آمدنی باپ کی ملکیت ہوگی، اور اس کے انتقال کے بعد معاونت کرنے والے بیٹے کو الگ سے کچھ نہیں ملے گا، دوسرے بیٹوں کے ساتھ اسے مساوی طور پر وراثت دی جائے گی، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اس تعاون کو شرکت قرار دینا ممکن نہیں، اس لئے کہ شرکت کے ارکان یعنی ایجاب و قبول مفقود ہیں، اور رکن نہ پائے جانے پر کسی بھی چیز کا وجود تسلیم نہیں کیا جاسکتا، ”ورکنها الايجاب والقبول“ (فتاویٰ ہندیہ ۲/۳۰۱، شامی ۳/۳۶۸ ط: مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (شرکت کے ارکان ایجاب و قبول ہیں)۔

۲- اسی طرح اس کو عقد اجارہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ اجارہ میں بھی ایجاب و قبول رکن ہے، ”أفاد أن رکنها الإيجاب والقبول“ (شامی ۵/۳ ط: مکتبہ فیض القرآن، دیوبند) (معلوم ہوا کہ اجارہ کارکن ایجاب و قبول ہے) اور ایجاب و قبول نہ لفظاً پایا جا رہا ہے اور نہ معنی۔

اسی طرح اجارہ کی شرط یہ ہے کہ اجرت اور منفعت دونوں معلوم ہوں اور یہاں اجرت مجہول ہے، اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے۔

ط استاذ مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی۔

”وشرطها: كون الأجرة والمنفعة معلومتين“ (ایضاً وهدایہ مع الفتوح ۸/۶)۔

۳- ذکر کردہ صورت حال میں قنیہ کے حوالہ سے فتاویٰ ہندیہ اور فتاویٰ شامیہ میں صراحت سے بیٹے کو معین و مددگار قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ہندیہ میں ہے:

”أب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما مال، فالكسب كله للأب إذا كان الابن فی عیال الاب“ وكذا فی الشامی وفيه بعد نقل هذه العبارة: ”وفی الخانیة زوج بنیه الخمسة فی داره وكلهم فی عیاله، واختلفوا فی المتاع فهو للأب، وللبنین الثیاب التي علیهم، فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم، وإن أقروا أنه كان یوم موته فهو میراث من الأب“ (بندیہ ۲/۲۲۹، شامی کتاب الشركة باب الشركة الفاسدة ۲/۲۸۲ مکتبہ فیض القرآن، دیوبند)۔

(باپ بیٹے ایک ہی صنعت میں کمائی کر رہے ہیں، دونوں کے پاس مال نہیں ہے تو اگر بیٹا باپ کے عیال میں ہے تو کل کمائی باپ کی ہوگی (یہ عبارت شامی میں بھی ہے، اس میں اس عبارت کے بعد یہ اضافہ بھی ہے) الخانیة میں ہے: اپنے پانچ بیٹوں کی اپنے گھر ہی میں شادی کی اور وہ سب اس کے عیال میں ہیں اور سامان کے بارے میں ان میں اختلاف ہو گیا تو سامان باپ کا ہوگا، اور بیٹوں کے صرف وہ کپڑے ہوں گے جو وہ پہنے ہوئے ہیں، اور اگر اس کی موت کے بعد بیٹے یا اس کی اہلیہ کہیں کہ اس مال کو ہم نے اس کی موت کے بعد حاصل کیا ہے تو ان کی بات معتبر ہوگی، اور اگر وہ یہ اقرار کریں کہ یہ سامان موت کے دن تھا تو وہ باپ کی میراث میں (شامل) ہوگا)۔

۴- عصر حاضر کے کئی مفتیان کرام کے فتاویٰ بھی اس کی تائید کرتے ہیں، مثلاً:

الف- مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”باپ بیٹے سب مل کر ایک ساتھ ایک ہی کاروبار کرتے ہوں، کھانا پینا بھی ساتھ ہو تو ساری کمائی باپ کی شمار ہوگی، باپ کی وفات کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا تو لہذا کر مثل حظ الأنثیین کے اصول پر تقسیم ہوگا، شامی میں ہے: الأب وإن بدأ منهم (فتاویٰ رحیمیہ ۶/۶۰)۔

ب- مفتی کفایت اللہ صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”بالغ اور نابالغ بچے جب کہ باپ کے کاروبار میں باپ کے ساتھ شریک رہیں یعنی کام کاج کرتے رہیں، لیکن ان کی محنت کا کوئی معاوضہ مقرر نہ کیا گیا ہو، نہ کبھی انہوں نے اس کا مطالبہ کیا ہو، تو تمام آمدنی باپ کی ملک متصور ہوتی ہے، اور اولاد اس کی معین و متبرع قرار دی جاتی ہے“ (کفایت المفتی، ۸/۳۰۹)۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”اگر زید کے ان لڑکوں کی ملکیت جدا نہیں ہے، بلکہ باپ کے ساتھ سب شریک اور باپ کے مددگار ہیں تو ان میں سے کسی کی موت پر اس کی میراث ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اس کا اپنا ترکہ کچھ نہیں ہے“ (ایضاً ۸/۳۰۸)۔

ج- مولانا رشید احمد لدھیانوی صاحب ایک سوال کے جواب میں جس میں تھا کہ دو بیٹوں نے باپ کی معاونت کی، ایک نے نہیں کی، جائداد کس طرح تقسیم کی جائے گی؟ تحریر فرماتے ہیں:

”باپ اور بیٹوں کے مشترک کاروبار کی صورت میں تمام ملک باپ کی شمار ہوتی ہے، لہذا باپ اپنی زندگی میں جو تصرف چاہے کر سکتا ہے، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے تیسرے بیٹے کو بھی ترکہ میں برابر کا حصہ ملے گا: قال العلامة ابن عابدین رحمه الله معزياً إلى القنية الأب وابنه۔ الخ۔

خلاصہ کلام

یہ کہ صورت مسئلہ میں لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہے، لہذا باپ کے انتقال کے وقت کل مال کو اس کا ترکہ قرار دیا جائے گا، اور تمام بیٹوں بیٹیوں کے درمیان لہذا کر مثل حظ الأنثیین کے انداز میں تقسیم کیا جائے گا، کاروبار میں تعاون کرنے والے کو الگ سے کچھ نہیں دیا جائے گا۔

سوال: ۲- جب باپ کے کاروبار میں کسی بیٹے نے اپنا سرمایہ لگایا ہو

اگر کوئی بیٹا باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو، ساتھ ہی اس نے باپ کی اجازت سے اپنا کچھ سرمایہ بھی لگا دیا، تو بہتر تو یہ تھا کہ دونوں معاملہ صاف کر لیتے، اور باقاعدہ شرکت کے ارکان و شروط کا لحاظ رکھتے تاکہ معاملہ صاف رہتا، لیکن اگر ایسا نہیں کیا تو یہ شرکت عقود کی کوئی شکل تو ہو نہیں سکتی، اس لئے کہ گزر چکا ہے کہ اس کے انعقاد کے لئے ایجاب و قبول رکن ہے اور ایجاب و قبول پایا نہیں گیا، نہ لفظاً نہ معنی، اس لئے کہ لفظاً ایجاب و قبول کی مثال دیتے ہوئے

علامہ شامی فرماتے ہیں: ”کان یقول أحدهما: شاركك في كذا ويقبل الآخر“ (شامی ۲/۲۶۸)

(مثلاً دونوں میں سے ایک کہے میں نے تم کو فلاں چیز میں شریک کیا اور دوسرا قبول کرے۔)

اور معنوی ایجاب و قبول کی مثال دیتے ہوئے صاحب ”الدر المختار“ فرماتے ہیں:

”كما لو دفع له ألفاً وقال: اخرج مثلها، واشتر والربح بيننا“ (ایضاً ص. ۲۶۹)

(مثلاً ایک ہزار دے کر کہے: اتنے ہی تم بھی نکالو، خریداری کرو اور نفع ہم دونوں کے درمیان ہوگا) اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں دونوں طرح کے الفاظ نہیں پائے جاتے، البتہ یہ شرکت املاک کی شکل ہو سکتی ہے، اس لئے کہ اس کے ارکان اور احکام بتاتے ہوئے ہندیہ میں فرماتے ہیں:

(شركة ملث) ”وركنها اجتماع النصيبين، وحكمها وقوع الزيادة على الشركة بقدر الملك“ (فتاویٰ ہندیہ: ۳۰۱)

(شرکت ملث کا رکن دونوں کا اکٹھا ہونا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ شرکت کی بنیاد پر ملک کے بقدر زیادتی (بڑھوتری) واقع ہوتی ہے۔)

ظاہر بات ہے کہ شرکت ملث کا مذکورہ رکن یہاں پایا جا رہا ہے، لہذا اس کا حکم بھی پایا جانا چاہئے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مال کے بقدر دونوں نفع میں شریک ہوں گے، لہذا سرمایہ لگانے والے نے جتنا سرمایہ لگایا تھا، اسی کے بقدر سرمایہ اور نفع اس بیٹے کی ذاتی ملک ہے، اس کو باپ کے ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا، قرین قیاس ہے کہ قنیہ کے حوالے سے ہندیہ اور شامی میں جو عبارت آئی ہے اس میں ”ولم يكن لها مال“ کی قید لگی ہوئی ہے، اور یہ بات معروف ہے کہ فقہی عبارات کے مفہوم مخالف معتبر ہوتے ہیں، لہذا اس صورت کا الگ حکم ہونا چاہئے۔

اگر بیع بالتعاطی پر قیاس کر کے اس کو شرکت عقود بالتعاطی قرار دیں (اگرچہ فقہی عبارات میں اس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی) تب بھی ربح وغیرہ کے بارے میں کوئی بات طے نہ ہونے کے سبب یہ شرکت فاسد ہوگی، اور شرکت فاسدہ کا حکم بعینہ وہی ہے جو اوپر شرکت املاک کا لکھا گیا، یعنی بقدر مال نفع کا استحقاق ہوا کرتا ہے، شامی میں ہے:

”والربح في الشركة الفاسدة بقدر المال“ (شامی ۲/۲۸۲، شركة الشركة الفاسدة، مكتبة فيض القرآن)

(شرکت فاسدہ میں نفع مال کے بقدر ہوتا ہے۔)

ہندیہ میں ہے: ”وشرط جواز هذه الشركات كون المحقود عليه عقد الشركة قابلاً للوكالة كذا في المحيط، وأن يكون الربح معلوم القدر فإن كان مجهولاً تفسد الشركة“ (ہندیہ ۲/۳۰۲)۔

دوسری جگہ ہے: ”وكل شركة فاسدة فالربح فيها على قدر رأس المال كألف لأحدهما مع ألفين فالربح بينهما

أثلاثاً“ (ہندیہ ۲/۳۲۵)

(ان شرکت کی شرط جواز یہ ہے کہ جس پر عقد شرکت کی جا رہی ہے وہ وکالت کو قبول کر سکتا ہو، محیط میں اسی طرح ہے، نیز یہ کہ نفع کی مقدار معلوم ہو، اگر یہ مقدار مجهول ہو تو شرکت فاسد ہوگی، دوسری جگہ ہے: ”اور ہر فاسد شرکت میں نفع رأس المال کے بقدر ہوگا جیسے دو ہزار کے ساتھ ایک کے ایک ہزار ہوں تو نفع دونوں کے درمیان اثلاثاً (ایک ہزار والے کو تہائی دو ہزار والے کو دو تہائی ہوگا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں سرمایہ کے بقدر نفع کا بیٹا مالک ہوگا، اس مقدار کو باپ کے ترکہ سے خارج رکھا جائے گا۔



## سوال: ۳- دوکان پر والد کو بٹھانا یا والد کا نام استعمال کرنا

اوپر گزر چکا ہے کہ شرکت فاسدہ میں مال کے بقدر نفع دیا جاتا ہے، شامی میں ہے: ”والربح في الشركة الفاسدة بقدر المال (قوله والربح الخ) حاصله أن الشركة الفاسدة إما بدون مال، أو به من الجانبين أو من أحدهما، فحكم الأولى أن الربح فيها للعامل كما علمت، والثانية بقدر المال ولم يذكر أن لأحدهم أجرًا لأنه لا أجر للشريك في العمل بالمشترك كما ذكره في قفيز الطحان، والثالثة لرب المال وللآخر أجر مثله“ (شامی ۳/۲۸۲)۔

یہاں اگر شرکت ہوتی تو تیسری شکل ہوتی، اور باپ کو اجرت مثل ہوتی، لیکن ظاہر ہے کہ یہاں شرکت کے ارکان اور شروط نہ پائے جانے کے سبب شرکت نہیں ہے، پھر باپ کو غاصب بھی نہیں کہا جاسکتا کہ غصب کی تفصیلات صادق آسکیں، پھر جب نہ عقد ہے نہ غصب تو ایک ہی صورت بچتی ہے کہ اس کے عمل کو تبرع قرار دیا جائے، پھر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کل نفع کا مالک بیٹا ہوگا، باپ کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا، لہذا باپ کا انتقال ہو تو اس مال کو باپ کے ترکہ سے خارج رکھا جائے گا۔

اس کا اشارہ اس بات سے بھی مل رہا ہے کہ سوال (۱) میں جن فقہی عبارات کے حوالہ سے باپ کو کل مال کا وارث قرار دیا گیا تھا اس میں یہ حکم کچھ قیود سے مقید تھا، وہ قیود یہاں مفقود ہیں، اور یہ معلوم ہے کہ فقہی عبارات کا مفہوم مخالفت معتبر ہوتا ہے، مثلاً: ”أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولا مال لهما“ (ہندیہ ۳۲۹/۲) (باپ بیٹے ایک ہی پیشہ میں کمائی کر رہے ہوں اور دونوں کے پاس مال نہ ہو)، ظاہر ہے کہ اس حالت میں مال موجود ہے، اور جب کسی کے پاس مال موجود ہو تو اس کا حکم اس عبارت میں ہے جس کو رقم نے ابھی نقل کیا ہے۔

## سوال: ۴- جب بعض بیٹے والد کی معاونت کریں بعض الگ کاروبار کریں

اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی ان کی ذاتی ملکیت ہوگی اس میں باپ یا اس کے دوسرے بیٹوں کا کوئی حق نہ ہوگا۔

البتہ اگر یہ دوسرا کاروبار باپ نے اپنے مال ہی سے کرایا تھا تو اگر صاف لفظوں میں مضاربت کی بات ہوئی تھی تو شرائط کے مطابق اس میں باپ کا حق ہوگا، اور اس کے انتقال کے بعد اس حق کو سب وراثت میں ضابطہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

اور اگر قرض کے انداز میں تھا تو جتنا مال دیا تھا اتنے کی واپسی لازم ہوگی اور اس کے مالک بیٹے باپ اور اس کے بعد تمام وراثت ہوں گے، اور تبرع دیا تھا تو پہلی شکل رہے گی۔

جہاں تک ایک ساتھ کھانے پینے کا تعلق ہے تو بلوغ کے بعد والد کی ذمہ داری اولاد کے نفقات کی ختم ہو جاتی ہے، لیکن اگر اپنے طور سے والد برداشت کر رہا ہے تو وہ اس کا تبرع ہے، لیکن اس کی بنیاد پر لڑکے کی ذاتی ملکیت میں اس کو حق نہیں دیا جاسکتا الا یہ کہ باضابطہ کوئی بات طے کی گئی ہو۔

## سوال: ۵- باپ کی موت کے بعد اپنے سرمایہ سے باپ کا کاروبار پھر سے شروع کرنا

اس شکل کا حکم بھی (۴) جیسا ہوگا، اس فرق کے ساتھ کہ اگر دوکان کرایہ کی تھی تو تجدید اجارہ کے بعد اس کا کرایہ اب اس لڑکے کے ذمہ ہوگا، اور اگر والد کی ملکیت تھی تو جب تک والد نظر انداز کرے کوئی بات نہیں، ورنہ جب چاہے اس دوکان کا کوئی کرایہ مقرر دے، یا وہاں سے دوکان ہٹالینے کا مطالبہ کرے۔

## والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت کی مختلف نوعیتیں

مولانا محمد جعفر علی رحمانی

۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، الگ سے اپنا کچھ سرمایہ وغیرہ نہیں لگایا تو ان کی حیثیت والد کے ساتھ معاون کی ہوگی۔

”ما فی“ شرح المجلة لسليمة رستم باز: ”إذا عمل رجل في صناعة هو ابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل وولده يعد له معينا له“ (ص ۷۳۱، رقم المادة ۱۳۹۸)۔

”ما فی“ ردالمحتار: ”الأب وابنه يكتسبان في صناعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إذا كان الابن في عيال الأب لكونه معينا له“ (۶/۲۲۹، مطلب اجتماعا في دار واحدة... الخ)۔

”ما فی“ الفتاوى الهندية: ”أب وابن يكتسبان في صناعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للأب إذا كان الإبن في عيال الأب لكونه معينا له“ (۲/۲۲۹، كتاب الشركة، مطلب اب وابن يكتسبان... الخ)۔

۲- اگر والد کے ساتھ لڑکے بھی کاروبار میں شریک ہوئے، اور اپنا سرمایہ بھی کاروبار میں لگایا تو اس کی چند صورتیں ہوں گی:

۱- لڑکے والد ہی کے ساتھ اکٹھا رہتے ہوں، اور کاروبار میں والد کو اپنا سرمایہ، تعاون کے طور پر دیا ہو، تو تمام سرمایہ والد کی ملکیت میں شمار ہوگا، اور لڑکے والد صاحب کے معاون سمجھے جائیں گے (حوالہ سابق)۔

۲- کاروبار میں سرمایہ لگاتے وقت والد کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کیا ہو، تو یہ کاروبار میں شریک کی حیثیت سے شمار ہوں گے، اور ان میں منافع کی تقسیم پہلے سے باہمی رضامندی سے طے شدہ شرح کے مطابق ہوگی۔

”ما فی“ الموسوعة الفقهية الكويتية: ”فشركة الأموال: عقد بين اثنين فأكثر على أن يتجروا في رأس مال لهم، ويكون الربح بينهم بنسبة معلومة، سواء علم مقدار رأس المال عند العقد أم لا، لأنه يعلم عند الشراء، وسواء شرطوا أن يشتركوا جميعا في كل شراء وبيع، أم شرطوا أن ينفرد كل واحد بصفقاته أم أطلقوا، وليس حتما أن يقع العقد بلفظ التجارة، بل يكفي معناها“ (۲۶/۲۶، شركة)۔

”ما فی“ المبسوط للسرخسي: ”ثم يذكر فما كان فيه من ربح فهو بينهما على قدر رؤوس أموالهما وما كان من وضیعة أو تبعة فكذلك اشتركا على ذلك في شهر كذا من سنة كذا... فأما في المال العين إذا تساويا في رأس المال واشترطا أن يكون الربح بينهما أثلاثا، أو تفاوتتا في رأس المال فكان لأحدهما ألف وللآخر ألفان، واشترطا أن يكون الربح بينهما نصفين يجوز عندنا“ (۱۱/۱۶۸، ۱۶۹، كتاب الشركة دار الكتب العلمية بيروت)۔

”ما فی“ الفتاوى الهندية: ”أما الشركة بالمال فهي أن يشترك اثنان في رأس مال فيقولان اشتركتنا فيه على أن يشتري ونبيع معا أو شيء أو طلقا على ما رزق الله عز وجل من ربح فهو بيننا على شرط كذا، أو يقول أحدهما ذلك ويقول الآخر نعم، كذا في البدائع (۲/۲۰۲، كتاب الشركة، الباب الأول في بيان أنواع الشركة... الخ)۔

جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر۔

۳- اگر والد کے ساتھ لڑکا کاروبار میں معاون کے طور پر تھا، مگر اس نے اپنا کچھ سرمایہ باپ کو بطور قرض دیا تھا، تو وہ لڑکا باپ کا معاون ہی رہے گا، البتہ لڑکے نے جتنی رقم قرض کے طور پر دی تھی، اتنی رقم باپ سے لینے کا حقدار ہوگا۔

ما فی ”بدائع الصنائع“: وأما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في المقرض للحال، وثبوت مثله في ذمة المقرض للمقرض للحال، وهذا جواب ظاهر الرواية (۶/۵۱۹- کتاب القرض، دارالکتاب دیوبند)۔

ما فی ”ردالمحتار علی الدر المختار“: لا يحبس أصل وإن علا في دين فرعه بل يقضى القاضي دينه من عين ماله أو قيمته (۸/۱۱۱، کتاب القضاء، مطلب في حبس الصبي، دارالکتاب دیوبند، بدائع الصنائع ۶/۱۷۹، دارالکتاب دیوبند)۔

۳- اگر کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے کاروبار شروع کیا ہو، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہو، یا تبرک اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس کاروبار پر لڑکے کی ملکیت ہوگی، نہ کہ باپ کی، اس لئے کہ باپ کی ملک کے لئے اسباب ملک میں سے کوئی سبب نہیں ہے:

”ما فی ”الدر المختار مع رد المحتار“: اعلم أن أسباب الملك ثلاثة: ناقل كبيع وهبة، وخلافة كإرث، وإصالة وهو الاستيلاء حقيقة بوضع اليد، أو حكما بالتهمة كنصب شبكه لصيد“ (۱۰/۳۶، کتاب لصيد، دارالکتاب دیوبند)۔

۴- اگر بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹھایا، اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، درآنحالیکہ ان کی آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، اور سب بھائی اپنی کمائی باپ کو دے دیتے ہوں، تو تمام مال باپ کا شمار ہوگا۔

”ما فی ”الردالمحتار“: وفي الخانية: زوج بنیه الخمسة في داره وكهف في عياله، واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير“ (۶/۳۹۳، فصل في الشركة الفاسدة، دارالکتاب دیوبند)۔

۵- اگر کسی شخص کا کاروبار کسی وجہ سے ختم ہو گیا ہو، پھر اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو یہ کاروبار اسی لڑکے کی ملکیت شمار ہوگی، جس نے سرمایہ لگایا ہے، کیونکہ نام تو محض ایک حق منفعت ہے جس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، البتہ اگر یہ نام رجسٹرڈ ہوں تو چونکہ ٹریڈ مارک (Trade Mark) آج کل گاہوں کی زیادہ رغبت یا بے رغبتی کا سبب بن گیا ہے، اس لئے فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق عوض لے کر اپنے اس حق کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔

”ما فی ”الدر المختار مع رد المحتار“: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة، وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة، المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، لكن أفتى كثير باعتبارها وعليه فيفتي بجواز النزول عن الوظائف بمال“ (۷/۲۵، ۲۶، کتاب البيوع، مطلب لا يجوز العتياض الخ)۔ لیکن محض ٹریڈ مارک کی وجہ سے باپ کی ملکیت نہیں ہوگی، کیونکہ باپ کی ملکیت کے ثبوت کے لئے اسباب ملک میں سے کوئی سبب شرعی موجود نہیں ہے۔

”ما فی“: ”الدر المختار مع رد المحتار“: اعلم أن أسباب الملك ثلاثة: ناقل كبيع وهبة، وخلافة كإرث، وإصالة وهو الاستيلاء حقيقة بوضع اليد، أو حكما بالتهمة كنصب شبكه لصيد الخ“ (۱۰/۳۶، کتاب لصيد، كفايت الفتى ۶/۶، فقہی مقالات ۱/۲۲۰)۔

خلاصہ

- ۱- لڑکوں کی حیثیت والد کے ساتھ معاون کی ہوگی۔
- ۲- یہ تین صورتوں پر مشتمل ہے، جو بالتفصیل جوابات میں مذکور ہیں، ان میں سے پہلی اور تیسری صورت میں معاون اور دوسری صورت میں شریک ہوں گے۔
- ۳- کاروبار پر لڑکے کی ملکیت ہوگی نہ کہ باپ کی۔
- ۴- تمام مال باپ کا شمار ہوگا۔
- ۵- کاروبار اس لڑکے کی ملکیت شمار ہوگا جس نے سرمایہ لگا کر دوبارہ کاروبار شروع کیا۔



## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت و تعاون

مولانا شاہد علی قاسمی <sup>ط</sup>

۱- اگر کوئی لڑکا اپنے باپ کے کاروبار میں والد کی خواہش پر شریک ہو جائے، اور اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو اس کی حیثیت کاروبار میں معاون کی ہوگی، پارٹنر یا ملازم کی نہیں ہوگی، کیونکہ پارٹنر بننے کے لئے، عقد شرکت کرنا ضروری ہے اور یہاں عقد شرکت نہیں پایا گیا، نیز ملازم ہونے کے لئے عقد اجارہ کرنا مطلوب ہے، جو یہاں مفقود ہے، اس لئے لڑکے کی حیثیت معاون کی ہوگی، چنانچہ علامہ شامی نے قنیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس طرح کی صورتوں میں اولاد کی حیثیت معاون کی ہوتی ہے:

”لما فی القنیة: الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب. إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ، ألا تری لو غرس شجرة تكون للأب“ (رد المحتار ۶/۵۰۲، فصل فی الشركة الفاسدة)۔

۲- اگر بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے اپنا کچھ سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا، تو اس کی حیثیت ”شرکت ملک“ کی ہوگی، جسے ”شرکت عین“ بھی کہا جاتا ہے، شرکت عنان، یا شرکت مفادضہ وغیرہ میں یہ صورت داخل نہیں ہوگی، کیونکہ ان میں باضابطہ عقد اور نفع کی تعیین وغیرہ ضروری ہے، جو یہاں مفقود ہے، علامہ شامی نے صراحت کی ہے کہ باپ کے انتقال کے بعد اس کی جائداد بچوں کی طرف منتقل ہوتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک بھائی ولی امر اور ذمہ دار ہوتا ہے، جو زیادہ کام کرتا ہے، بعض بھائی کام کم کرتے ہیں، تو اس کی حیثیت شرکت ملک کی ہوتی ہے، چنانچہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

یقع کثیرا فی الفلاحین ونحوہم أن أحدہم یموت فتقوم أولادہ علی ترکتہ بلا قسمة ویعملون فیہا من حرث وزراعة ویبع وشرء واستدانة ونحو ذلك، وتارة یکون کبیرہم هو الذی یتولی مہما تم ویعملون عنده بأمرہ، وکل ذلك علی وجه الإطلاق والتفویض، لکن بلا تصریح بلفظ المفاوضة ولا بیان جمیع متقضياتھا مع كون التركة أغلبھا أو کلھا عروض لا تصح فیہا تركة العقد، ولا شک أن هذه لیست شركة مفاوضة، خلافا لما أفتی بہ فی زماننا من لا خبرة لہ، بل ہی شركة ملکت کما حررتہ فی تنقیہ الحامدیة (رد المحتار ۶/۴۸۱، ۴۸۲)۔

اس لئے صورت مسئولہ کی حیثیت بھی شرکت ملک کی ہوگی، اور جب ایسی مشترک چیز سے کاروبار کیا جائے تو ہر ایک کا نفع اس کے تناسب سے ہوتا ہے، اس لئے ان بچوں کو جنہوں نے کاروبار میں سرمایہ بھی لگایا اور کاموں میں بھی شریک ہیں، کاروبار کا پارٹنر بہ اعتبار شرکت ملک قرار دیا جائے گا، لہذا اپنے سرمایہ کے تناسب سے نفع کے مالک ہوں گے، باقی ان کے والد کا سمجھا جائے گا، گو کہ باپ کی محنت کم ہو اور ان بچوں کی زیادہ۔

۳- اسلام نے ہر شخص کو حق ملکیت دیا ہے، ایک بچہ دنیا میں آتے ہی سرمایہ دار ہو سکتا ہے، جیسے کوئی خیر خواہ اس کو کوئی مال ہبہ کر دے، یا اس کا باپ ہی کچھ مال کا مالک بنادے، تو اگر بچہ اپنی رقم سے کاروبار شروع کرے، اور اپنے والد کو دوکان پر تبرکاً بیٹھانے، یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھے تو اس کی وجہ سے والد کو کاروبار میں شریک نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ پورا کاروبار اسی بچہ کا سمجھا جائے گا، اور باپ کو کاروبار میں وقت لگانے کی وجہ سے معاون سمجھا جائے گا، جیسا کہ سوال-۱ کے ذیل میں آیا کہ جب مال باپ کا ہو اور اولاد باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے تو اولاد کی حیثیت معاون کی ہوتی ہے، تو اگر بعض بچوں کا مال ہو اور باپ ان بچوں کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے تو باپ کی حیثیت معاون کی ہوگی، نہ کہ پارٹنر کی۔

۴- اگر سب بھائیوں نے کسب معاش کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جب کہ بعض بھائی اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے ہوئے ہیں، تو جس طرح والد کے ساتھ کاروبار کرنے والے بھائیوں کی کمائی باپ کی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے والے بھائیوں کی کمائی باپ کی ہوگی، علامہ شامی رقمطراز ہیں:

”الأب والابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیئی فالکسب کلہ للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینالہ“ (رد المحتار ۲/۵۰۲)

اور اگر الگ کسب معاش اختیار کرنے والے بھائی کھانے پینے رہنے سہنے میں باپ سے علاحدہ ہو تو پھر ان بھائیوں کی کمائی ذاتی ہوگی، باپ اس میں شریک نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ شامی کی عبارت کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوتا ہے۔

نیز اسی طرح کے سوال کے جواب میں سابق مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں: لڑکے کی اجرت (تنخواہ) جو باپ کے نام جمع ہوتی تھی، لڑکا اس کا مستحق ہے، بشرطیکہ اس لڑکے کا کھانا پینا، رہنا سہنا باپ سے علاحدہ ہو۔ (کفایت المفتی ۷/۳۰۹، کتاب المعاش)۔

تاہم اگر الگ کسب معاش اختیار کرنے والے بھائیوں نے سرمایہ کاری کرتے ہوئے آمدنی حاصل کی ہو، تو گوان کا کھانا پینا باپ کے ساتھ ہو پھر بھی یہ آمدنی ان بھائیوں کی ہی ہوگی، باپ کی، یا مشترکہ طور پر تمام بھائی اور باپ کی نہیں ہوگی، جیسا کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر بیوی کسب معاش کے لئے شوہر سے جدا گانہ دوسرا ذریعہ اختیار کرے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بیوی ہی کی ہوگی، نہ کہ شوہر کی اور اگر دونوں ایک ساتھ محنت کر کے کمائی کر رہے ہوں تو پھر پوری کمائی شوہر کی ہوگی، اور بیوی صرف مددگار سمجھی جائے گی، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وکذا الحکم فی الزوجین إذا لم یکن لهما شیئی، ثم اجتمعا بسعیہما أموال کثیرة، فہی للزوج، وتکون المرأة معینة لہ، إلا إذا کان لہا کسب علی حدۃ فہو لہا (ہندیہ ۲/۲۲۹، کتاب الشركة)۔

نیز بیٹے کی کمائی باپ کی اور بیوی کی کمائی شوہر کی ہونے کے لئے شامی میں ”ولم یکن لهما شیئی“ اور ہندیہ میں ”إذا لم یکن لهما شیئی“ کی شرط لگائی گئی ہے، لہذا اگر یہ قید نہیں پائی گئی یعنی اگر کاروبار میں بیٹے یا بیوی کا مال لگا ہو تو پھر پوری کمائی باپ یا شوہر کی نہیں ہوگی، اس لئے اگر بعض بھائیوں نے اپنے مال سے الگ سرمایہ کاری کی تو اس کی آمدنی میں دوسرے بھائی اور باپ شریک نہیں ہوں گے۔

۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ -خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اور بعض اولاد اپنے سرمایہ سے دوبارہ کاروبار اسی جگہ شروع کرے، تو اس کاروبار میں والد کی ملکیت نہیں ہوگی، کیونکہ جب بچے کاروبار میں لگائے ہوئے سرمایہ کے مال تھے تو اس کی منتقلی والد کی طرف اسی وقت ہوگی جب کہ ملکیت کی منتقلی کے ذرائع اختیار کئے گئے ہوں، جیسے بھہ، بیع، قرض وغیرہ اور یہاں ان میں کوئی صورت نہیں پائی گئی، البتہ کاروبار کی جگہ چونکہ والد کی ہے، یا اس نے کرایہ پر حاصل کیا تھا، اس لئے اگر والد چاہے، تو اس جگہ کا کرایہ طلب کر سکتا ہے، کہ یہ اس کا حق ہے۔

بہر حال: محض مملوکہ جگہ ہونے یا اس جگہ کو کرایہ پر حاصل کر لینے کی وجہ سے باپ ان بچوں کے کاروبار کا مالک ہو سکتا ہے، اور نہ ان کے کاروبار میں پارٹنر، بلکہ اگر کوئی دوسرے کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے کھیتی کر لے، یا مکان تعمیر کر لے پھر بھی زمین پر ملکیت کی وجہ سے صاحب زمین کھیتی یا مکان کا مالک نہیں ہوگا، علامہ حصفی رقمطراز ہیں:

من بنی أو غرس فی أرض غیرہ بغیر إذنہ أمر بالقلع والرد (الدر المختار ۲/۲۰۷)۔

تو صورت مسئولہ میں بدرجہ اولیٰ باپ کاروبار کا مالک نہیں ہوگا، کیونکہ عرف عام میں اولاد اپنے باپ کی بعض املاک میں بلا اجازت بھی تصرف کرتا ہے، اور اس کے صحیح ہونے کے لئے باپ کی خاموشی بھی کافی سمجھی جاتی ہے، جیسا کہ ذیل کے جزیئہ میں بیوی کے تصرف کو درست قرار دیا گیا ہے،

دفعت فی تجہیزھا لبنتھا أشياء من أمتعة الأب (الاشباہ والنظائر ۲۲۷)۔

اس لئے جب بعض بچوں نے اس جگہ کاروبار شروع کیا اور باپ خاموش رہا، تو یہ خاموشی اس جگہ کو استعمال کرنے کی اجازت متصور ہوگی، اور اس کی وجہ سے باپ ان بچوں کے کاروبار کا مالک نہیں سمجھا جائے گا۔

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مفتی سلمان پانپوری قاسمی ؒ

۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے اپنا الگ سے کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو حضرات فقہاء کی تصریح کے مطابق اگر تین شرطیں پائی جائیں تو لڑکوں کو والد کا معین و مددگار مانا جائے گا اور مال سارا کا سارا (سرمایہ اور نفع) والد کی ملکیت ہوگا اور والد کی وفات کے بعد ترکہ لڈ کر مثل حظ الاثمین کے اصول پر تقسیم ہوگا۔

الف- باپ اور لڑکے دونوں ایک ہی پیشے میں شریک ہو کر کام کر رہے ہوں۔

ب- سرمایہ مکمل باپ کا ہو۔

ج- لڑکے باپ کی عیال داری میں ہوں۔

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل وولده يعد معيناً له، فيه قيّدان احترازيان كما تشعر عبارة المتن: الأول أن يكون الابن في عيال الأب، الثاني أن يعمل معاً في صنعة واحدة إذ لو كان لكل منهما صنعة يعمل فيها وحده فربحه له (شرح المجلة لسليمان رستم بان رقم المادة، ۱۳۹۸ البحث الثاني في مسائل عائدة إلى شركة الاعمال)۔

(جب کسی شخص اور اس کے اس لڑکے نے جو اس کی عیال داری میں ہے ایک ہی پیشے میں کام کیا، تو پوری کمائی اس شخص کی ہوگی اور اس کا لڑکا اس کا معاون شمار کیا جائے گا، اس میں دو احترازی قیدیں ہیں: (۱) پہلی یہ کہ لڑکا باپ کی عیال داری میں ہو اور دوسری یہ کہ دونوں ایک ساتھ ایک ہی پیشے میں کام کرتے ہوں، اس لئے کہ اگر ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ پیشہ ہے جس میں وہ تنہا کام کرتا ہے، تو اس کا نفع اسی کے لئے ہوگا)۔

الأب والابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معيناً له ألا ترى لو غرس شجرة تكون للأب (الرد المحتار: ۶/۲۹۲، فصل في الشركة الفاسدة، مكتبة دار الكتاب ديوبند)

(باپ اور بیٹا ایک ہی پیشہ میں کمائی کر رہے ہیں اور ان کا کچھ (سرمایہ) نہیں تھا، تو پوری کمائی باپ کی ہوگی، بشرطیکہ بیٹا اس کی عیال داری میں ہو، کیونکہ وہ باپ کا معین ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر درخت لگایا تو وہ باپ کا ہوگا) "قلت فما كان المال للأب كان كله بالأولیٰ"۔

اگر مذکورہ شرطوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو جائے، تو کام کرنے والے بیٹوں کی حیثیت معین و مددگار کی نہیں رہے گی، چنانچہ اگر باپ اور بیٹے نے الگ الگ پیشہ اختیار کر کے کمائی حاصل کی ہے، تو باپ کو بیٹے کی کمائی میں دخل اندازی کرنے کا حق نہ ہوگا، بلکہ بیٹا اپنی کمائی کا مالک ہوگا اگرچہ بیٹا باپ کے زیر عیال ہو، (اگر بیٹا باپ کے زیر عیال نہ ہو، تو اس کا حکم بدرجہ اولیٰ معلوم ہو گیا کہ بیٹا ہی اپنی کمائی کا مالک ہوگا)۔

اور اگر باپ اور بیٹے ایک ہی پیشہ میں شریک ہو کر کام کر رہے ہیں اور بیٹے باپ کی عیال داری میں نہیں ہیں، پس اگر اجرت سے یہ کام کرنا طے ہوا ہے اور اجرت بھی متعین کر دی ہے، تو وہ اسی کے مستحق ہوں گے اور اگر اجرت طے نہیں ہوئی ہے، تو جہالت اجرت کی وجہ سے یہ اجارہ فاسدہ ہے، لہذا

مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ، ماہی، پانپور، گجرات۔



کل مال (سرمایہ اور نفع) باپ کا ہوگا اور بیٹے اجرت مثل کے مستحق ہوں گے، اور ان دونوں صورتوں میں بیٹوں کی حیثیت ملازم کی ہوگی اور اگر کوئی وضاحت (اجرت سے کام کریں گے یا بلا اجرت) نہیں ہوئی ہے، تو بیٹوں کا یہ کام کرنا تبرع ہوگا، وہ اجرت یا حق المحنت کسی کے حقدار نہیں ہیں، کیونکہ اجرت کا استحقاق عقد اجارہ سے ثابت ہوتا ہے اور یہاں کوئی عقد منعقد نہیں ہوا ہے، لہذا اس صورت میں بیٹوں کی حیثیت متبرع اور متطوع کی ہوگی اور کل مال باپ کی ملکیت ہوگا۔

حاصل یہ کہ اگر بیٹے باپ کی عیال داری میں ہیں، تو ان کی حیثیت معین و مددگار کی ہوگی، اور اگر بیٹے باپ کی عیال داری میں نہیں ہیں اور اجرت سے کام کرنا طے ہوا ہے، تو ان کی حیثیت ملازم کی ہوگی، اور اگر کوئی وضاحت نہیں ہوئی ہے تو ان کی حیثیت متبرع کی ہوگی اور چونکہ مکمل سرمایہ باپ کا ہے، لہذا بیٹوں کی حیثیت شریک اور پارٹنر کی نہ ہوگی۔

۲- اور اگر والد نے کاروبار شروع کیا اور بیٹوں نے کاروبار میں شریک ہونے کی غرض سے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے لگایا ہے، تو بیٹوں کی حیثیت شریک اور پارٹنر کی ہوگی اور بیٹے بوقت اشتراک اپنے سرمایہ کے تناسب سے کاروبار اور اس کے منافع میں شریک ہوں گے اور اگر کاروبار میں شریک ہونے کی غرض سے نہیں لگایا، بلکہ باپ کی اعانت اور مدد کے لئے اپنا سرمایہ لگایا ہے، تو پھر بیٹوں کی حیثیت شریک کی نہ ہوگی، بلکہ معاون یا متبرع کی ہوگی، اور اگر صراحتاً قرض کہہ کر لگایا ہے، تو بیٹوں کی حیثیت دائن اور مقرض کی ہوگی۔

۳- اگر کاروبار لڑنے کے لئے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا ہے اور صرف کاروبار سنبھالنے کے لئے دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہے، کاروبار (دوکان) کا اپنے والد کو ہبہ اور قبضہ دے کر مالک نہیں بنایا ہے، تو کل (کاروبار اور نفع) لڑنے کے کاملوک ہوگا، لہذا باپ بحیثیت ملکیت و شرکت لڑنے کے سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کر سکتا، اور باپ کی حیثیت اجیر (ملازم) کی ہوگی بشرطیکہ اجرت کے ساتھ کام کرنے کے لئے بٹھایا ہو، اور اگر کچھ وضاحت نہیں ہوئی ہے یعنی باپ اجرت سے کام کرے گا یا بلا اجرت، تو باپ کی حیثیت متطوع اور متبرع کی ہوگی۔

اور اگر لڑنے کے لئے کاروبار اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا ہے، لیکن تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہے، تو نام رکھنے کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے، لہذا دوکان اور اس کے منافع لڑنے کے کی ملک ہوں گے۔

۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹھایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جب کہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، اور دوسرے بھائیوں نے اپنی کمائی مشترکہ خرچ میں یا اپنے والد کو دیدی ہے، تو وہ والد کی ملکیت ہوگی اور والد کی وفات کے بعد ترکہ للذکر مثل حظ الانثیین کے اصول پر تقسیم ہوگا، اور اگر دوسرے بھائیوں نے اپنی کمائی الگ جمع کر کے رکھی ہے (مشترکہ خرچ میں یا والد کو نہیں دی ہے) تو وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی، لیکن ان پر اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا خرچ والد کو دینا لازم ہے، کیونکہ والد نے ان پر اور ان کی بیوی بچوں پر کھانے پینے وغیرہ کا خرچ اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی کمائی والد کو دیں گے، لہذا جب انہوں نے اپنی کمائی علیحدہ جمع کی اور والد کو نہیں دی، تو ان پر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا خرچ والد کو دینا ضروری ہے، ہاں اگر والد صاحب بخوشی نہ لیس تو دوسری بات ہے۔

۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف- والد کے لئے اس کی اجازت سے کاروبار شروع کیا، تو کاروبار والد کا ہوگا، اور لڑنے کے لئے جو سرمایہ لگایا ہے وہ والد پر قرض ہوگا۔

ب- والد کے لئے اس کی اجازت کے بغیر کاروبار شروع کیا، تو تبرع شمار ہوگا اور کاروبار والد کا ہوگا۔

ج- لڑنے کے لئے اپنے لئے والد کی اجازت سے کاروبار شروع کیا تو کاروبار لڑنے کے کا ہوگا اور جگہ والد کی رہے گی اگر والد کی مملوکہ ہو، اور لڑنے کے جگہ استعمال کرنا بطور عاریت ہوگا بشرطیکہ عقد اجارہ نہ ہوا ہو۔

د- والد کی اجازت کے بغیر اپنے لئے کاروبار شروع کیا تو کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا اور جگہ والد کی رہے گی اگر والد کی مملوکہ ہو، اور لڑکے کا والد کی اجازت کے بغیر جگہ کا استعمال کرنا غصب ہے اور غصب کے منافع مضمون نہیں ہوتے ہیں الا یہ کہ وہ وقف یا صغیر کا مال ہو، تو منافع کا ضمان یعنی اجرت مثل لازم ہے، لہذا اس صورت میں والد لڑکے سے کرایہ وغیرہ کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتا ہے، اور اگر جگہ کرایہ کی ہے تو ظاہر ہے کہ لڑکا ہی کرایہ دیتا ہوگا۔

(عمر دار زوجته بماله بإذنها فالعمارة لها والنفقة دين عليها لصحة امرها (ولو) عمر (لغنه بلا إذنها فالعمارة له) ويكون غاصبا للعروة فيؤمر بالتفريغ بطلبها ذلك (ولها بلا إذنها فالعمارة لها وهو متطوع) في البناء فلا رجوع له (الدر المختار مع رد المحتار المعروف بالشامى ۱۰/۲۹۲، كتاب الخنثى مسائل بينى)۔

(شوہر نے بیوی کے لئے اپنے مال سے اس کی جگہ پر اس کی اجازت سے تعمیر بنائی، تو تعمیر بیوی کی ہوگی اور مال بیوی پر قرض ہوگا، کیونکہ بیوی کا حکم دینا صحیح ہے، اور اگر شوہر نے اپنے لئے بیوی کی اجازت کے بغیر تعمیر بنائی، تو تعمیر شوہر کی ہوگی، اور وہ زمین کو غصب کرنے والا ہوگا، لہذا شوہر کو بیوی کے زمین کا مطالبہ کرنے پر فارغ کرنے کا حکم دیا جائے گا، اور اگر تعمیر بیوی کے لئے بنائی اس کی اجازت کے بغیر، تو تعمیر بیوی کی ہوگی اور شوہر تعمیر بنانے میں متطوع ہوگا، لہذا وہ رجوع نہیں کر سکتا ہے)۔

ولو استعمل واحد ما لا بدون إذن صاحبه كان غاصبًا فلا يلزمه منافعہ... الخ

(شرح المجلة لسليمة رستم بان رقم المادة- ۵۹۶، الفصل الأول في ضمان المنفعة)۔

(اور اگر کسی نے دوسرے کا مال اس کی اجازت کے بغیر استعمال کیا، تو وہ غاصب ہوگا، لہذا اس پر اس کے منافع کا ضمان لازم نہیں ہوگا)۔

حاصل یہ کہ اگر لڑکے نے والد کے لئے کاروبار شروع کیا ہے، تو کاروبار والد کا ہوگا، اور اگر اپنے لئے شروع کیا ہے، تو اسی کا ہوگا۔





## اولاد کی کمائی سے متعلق خلاصہ

مولانا محمد عثمان بستوی علیہ

جب بچے اپنے والدین کے ساتھ رہ کر کماتے ہوں تو اس میں بچوں کی حیثیت معاون کی ہوگی یا ملازم یا شریک کی؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہم کتب فقہیہ سے اولاً چند مسائل ذکر کرتے ہیں، تاکہ والد کے ساتھ رہنے والے بچوں کی حیثیت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

لڑکے کو اپنے والد کا معین سمجھے جانے کی شروط

باپ و بیٹوں دونوں کا ذریعہ آمدنی ایک ہو، اور بیٹے کے ذاتی سرمایہ کا لگنا معلوم نہ ہو، بیٹا باپ کے ساتھ اس کی ماتحتی میں رہتا ہو تو ایسی صورت میں اس کاروبار اور ذریعہ آمدنی سے جو کچھ کمائی ہوگی سب والد کی مانی جائے گی، اور بیٹے کی حیثیت صرف ایک معاون کی ہوگی اور بس، اسی وجہ سے باپ کی ماتحتی میں رہنے والا بیٹا باپ کی زمین پر کوئی درخت لگا دے تو وہ درخت ”الشجر للغارس“ کے برعکس والد کا ہی مانا جائے گا۔

”كما في رد المحتار: الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب إن كان الإبن في عياله لكونه معيناً له ألا تری أنه لو غرس شجرة تكون للأب“ (شامی ۶/۵۰۲ طبع زکریا)۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ بچے کو اپنے والد کا معین سمجھے جانے کے لئے تین شرطیں ہیں:

۱- ذریعہ آمدنی دونوں کا ایک ہی ہو۔

۲- بچے کے سرمایہ کا لگنا معلوم نہ ہو۔

۳- بچے کی رہائش والد کی ماتحتی میں اسی کے ساتھ ہو۔

مذکورہ بالا شرائط ثلاثہ کو درر الاحکام شرح مجلۃ الاحکام میں اچھی طرح سے واضح کیا گیا ہے، ہم اس کو (بحث و نظر کے شمارہ ۳۲، ۳۳/ص ۶۹-۱۶۸) سے نقل کرتے ہیں: ”ویوجد ثلاثة شروط لأجل اعتبار الولد معيناً لابیہ“۔

۱- ”اتحاد الصنعة فإذا كان الأب مزارعاً والإبن صانعاً أخذية فكسب الأب من الزراعة والابن من صنعة الحذاء فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله“۔

(یعنی بیٹے کو باپ کا معاون قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ بیٹے اور باپ کا کام ایک ہی ہو اگر اس کے خلاف ہو، یعنی مثلاً باپ کھیتی کرتا ہے اور بیٹے نے جوتے سازی کا کام شروع کیا اور اس سے دولت کمائی تو محض اس لئے کہ بیٹے نے باپ کے عیال میں رہتے ہوئے یہ دولت کمائی ہے باپ کو بیٹے کی کمائی میں مداخلت کا حق نہ ہوگا)۔

۲- ”فقد الأموال سابقاً، إذا كان للأب أموال سابقة كسبها ولم يكن معلوماً للإبن أموال بأن ورث من مورثه أموالاً معلومة فيعد الابن في عیال الأب“۔

(یعنی بیٹے کے پاس پہلے سے مال کا موجود نہ ہونا، جب کہ باپ کے پہلے سے مال موجود ہیں جس کو اس نے کمایا ہے اور بیٹے کے پاس مال کا موجود ہونا)

مدرسہ ریاض العلوم گورنمنٹی جوہنپور۔

معلوم نہیں کہ وہ وارث ہو یا اپنے مورث سے متعین مال کا تو بیٹا باپ کی عیال میں سمجھا جائے گا۔

۳- ”ان یکون الابن فی عیال آبیہ، أما إذا کان الأب یسکن فی دار والابن فی دار آخری وکسب الابن أموالاً عظیمة فلیس للأب المداخلۃ فی أموال ابنه بداعی أنه لیس للابن مال فی حیاة آبیہ“۔

(باپ ایک گھر میں رہتا ہو اور بیٹا دوسرے گھر میں رہائش رکھتا ہو اور بیٹے نے بہت ساری دولت کمائی ہو تو باپ کو اپنے بیٹے کے مال میں مداخلت کا حق نہیں ہے) (المجلد دفعہ نمبر ۱۳۹۸، شرح مجلۃ الاحکام / ص ۳۳۵، بحث و نظر شمارہ ۳۳، ۳۴ / ص ۱۶۸، ۱۶۹)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ بچے کو کن صورتوں میں اپنے والد کا معاون محض سمجھا جائے گا، اور جب بچہ معاون ہوگا تو وہ کسی اجرت وغیرہ کا حقدار نہیں ہوگا اور جب بچہ معاون محض نہ بنے تو اس صورت میں وہ یا تو اجیر و ملازم ہوگا یا شریک و پارٹنر۔

چند لوگوں کی کمائی یکجا ہو اور کمی و بیشی معلوم نہ ہو تو اس کا حکم

”زوج امرأة وابنها اجتماعاً فی دار واحدة وأخذ کل منهما یکتسب علی حدة ویجمعان کسبهما ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمییز فأجاب بأنه بینهما سویة ولو اختلفوا فی العمل والرأی... الخ۔ وقد منأ أن هذا لیس شركة مفاوضة مالم یصرحها بلفظها أو بمقتضياتها مع استیفاء شروطها“ (۵/۲۰۵ طبع زکریا)۔

(کسی عورت کا خاوند اور عورت کا بیٹا دونوں ایک ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوں اور علیحدہ علیحدہ کماتے ہوں اور دونوں اپنی کمائی ایک ساتھ رکھتے ہوں اور کمی زیادتی اور برابری معلوم نہ ہو اور دونوں کی کمائی الگ الگ کرنا بھی مشکل ہو اس کے بارے میں صاحب فتاویٰ خیر یہ سے مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ جمع کی ہوئی کمائی دونوں کے درمیان برابر برابر ہوگی، اگرچہ وہ لوگ صنعت اور رائے میں مختلف ہوں، اور ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ شرکت مفاوضہ نہیں ہوگی جب تک کہ شرکت مفاوضہ کے لفظ کے ساتھ یا اس کے مقتضیات مع شرطہا کے ساتھ دونوں نے صراحت نہ کی ہو)۔

والد کی وفات کے بعد بھائیوں کا ایک ساتھ رہ کر ان کے کاروبار وغیرہ کو بڑھانے کا جو عرف و رواج ہے اس کا حکم

کسانوں وغیرہ میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی اولاد کے ترکہ پر بلا تقسیم کے برقرار رہتی ہے اور اس میں عمل کرتی ہے، بھتی باڑی، خرید و فروخت اور لین دین وغیرہ کا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی اولاد میں سے بڑا ان کے تمام اہم امور کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور وہ لوگ اس کے پاس اس کے حکم سے کام کرتے ہیں، اور ان سارے امور میں ہر ایک امر مطلق اور تفویض کے طور پر ہوتا ہے، لیکن لفظ مفاوضہ کی صراحت اور اس کے تمام مقتضیات بیان نہیں کئے جاتے، باوجودیکہ اکثر ترکہ یا پورا کا پورا ترکہ ایسا سامان ہوتا ہے جس میں شرکت عقد صحیح نہیں ہے، اور اس کے شرکت مفاوضہ (یعنی مال میں تمام شرکاء برابر ہوں اور تصرفات میں صراحتاً ایک دوسرے کے وکیل ہوں) نہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، برخلاف موجودہ زمانہ کے فتوے، جس کا فتویٰ دیا ہے ان لوگوں نے جن کو خبر نہیں ہے بلکہ یہ شرکت ملک ہے جیسا کہ ہم کو شفیق فتاویٰ حامدیہ میں وضاحت سے بیان کیا ہے، پھر ہم نے اس کی صراحت فتویٰ حانوتی میں دیکھی کہ جب ان لوگوں کی کمائی ایک ہو اور ہر ایک نے جو کمایا ہے وہ علاحدہ علاحدہ نہ ہو تو تمام جمع شدہ مال ان لوگوں کے درمیان برابری کے ساتھ تقسیم ہوگا اگرچہ وہ لوگ صنعت اور رائے کثرت و صواب میں مختلف ہوں جیسا کہ صاحب فتاویٰ خیر یہ نے بیان کیا ہے:

”یقع کثیراً فی الفلاحین ونحوہم أن أحدهم یموت فتقوم أولاده علی ترکته بلا قسمة ویعملون فیہا من حرث وزراعة و بیع و شراء واستدانہ ونحو ذلك وتارة یکون کبیرهم هو الذی یتولی مهماتهم ویعملون عنده بأمره وکل ذلك علی وجه الإطلاق والتفویض. لکن بلا تصریح بلفظ المفاوضہ ولا بیان جمیع مقتضياتها مع کون التركة أغلبها أو کلها عروض لا تصح فیہا شركة العقد ولا شک أن هذه لیست شركة مفاوضة خلافاً لما أفتی به فی زماننا من لا خبرة له بل هی شركة ملک كما حررتہ فی تنقیح الحامدیة ثم رأیت التصریح به بعینه فی فتاویٰ الحانوتی فإذا کان سعيهم واحداً ولم یتمیز ما حصله کل واحد منهم بعمله یکون ما جموعه مشترکاً بینهم بالسویة وإن اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصواباً كما أفتی به فی الخیرية“ (شامی ۶/۲۴۸ طبع زکریا)۔

مال مشترک سے شریک کا صرف اپنے لئے خرید ہوئی چیز کا حکم

ایک ساتھ رہنے والے بھائیوں میں سے اگر کوئی بھائی مال مشترک سے صرف اپنے لئے کوئی چیز خریدتا ہے جبکہ ان کے درمیان صراحتاً توکیل اور عقد و شرکت کا معاملہ نہ ہو، تو اس کا مالک تنہا خریدنے والا ہوگا، دوسرے بھائی اس میں شریک نہیں ہوں گے، البتہ اس کی خریداری میں جتنا سرمایہ کا حصہ دوسرے بھائیوں کا لگا ہے وہ خریدار کے ذمہ واجب الادا ہے۔

”وما اشتراه أحدہم لنفسہ یكون له یضمن حصۃ شرکانہ من ثمنہ إذا دفعہ من المال المشترک“۔

شرکت میں رہتے ہوئے قرض لینے کا حکم

اگر چند مشترک طور پر رہنے والے بھائیوں میں سے کسی نے قرض لیا ہے تو اس کا مطالبہ بھی تنہا اسی سے کیا جائے گا۔

”وکل ما استدانہ أحدہم یطالب بہ وحدہ“ (شامی ۶/۴۷۸)۔

دو بھائیوں میں لفظاً و صراحتاً و کالت کا معاملہ ہو تو اس کا حکم

ایک ساتھ رہنے والے چند بھائیوں وغیرہ کے درمیان اگر لفظاً و صراحتاً یہ معاہدہ ہو جائے کہ ان میں سے جو بھی اپنی کمائی سے کوئی چیز خریدے گا تو وہ تمام بھائیوں میں مشترک ہوگی۔

اس صورت میں معاہدہ میں شامل تمام بھائی ایک دوسرے کی طرف خریداری کے وکیل ہو جائیں گے، لہذا ان میں سے جو بھی خریداری کرے گا تو اس کی خریدی ہوئی چیز حسب معاہدہ تمام بھائیوں میں مشترک ہوگی، اگرچہ خریدنے والے نے صرف اپنی ہی نیت سے کیوں نہ خریدا ہو، اور اس خریداری پر آنے والے اخراجات بقدر حصہ داری سب پر تقسیم ہوں گے، لیکن اگر چند بھائی بلا کسی لفظی معاہدہ وغیرہ کے ایک ساتھ رہتے سبتے ہوں تو ان میں سے ہر شخص اپنی کمائی اور اپنے لئے خریدی ہوئی چیز کا تنہا ہی مالک ہوگا اس میں دوسرے بھائی کا حق نہیں ہوگا (شامی ۵/۲۱-۳۲)۔

اگر کسی سے کام لیا جائے اور اجرت طے نہ کی جائے تو اس کا حکم

صاحب ایشاہ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ کسی آدمی نے کسی سے بازار میں اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے تعاون لیا اس کے بعد معاون نے اس سے اجرت کا مطالبہ کیا تو اس جگہ کے عرف و عادات کا اعتبار کیا جائے گا، اور ایسے ہی عرف و عادات کا اعتبار اس مسئلے میں بھی ہوگا کہ کوئی شخص کسی کو اپنی دکان میں کام کرنے کے لئے رکھا، اور صاحب در نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ کسی نے اپنے غلام یا بیٹے کو کسی کاریگر کے پاس ایک متعین مدت تک کے لئے رکھا کہ وہ اس کو کاریگری سکھائے اور ہر مہینہ اس کی اجرت متعین کر دے تو جائز ہے، اور اگر اجرت نہیں متعین کی تو کاریگری سکھانے کے بعد کاریگر اور مولیٰ دونوں نے ایک دوسرے سے اجرت کا مطالبہ کیا تو اس کام میں اس شہر کے عرف و عادات کا اعتبار ہوگا۔

”وفی الأشیاء: استعان برجل فی السوق لیبیع متاعہ فطلب منہ أجرا فالعبرة لعادتهم وكذا لو ادخل رجلا فی حانوتہ لیعمل لہ، وفی الدرر دفع غلامہ او ابنہ لحائک مدة کذا لیعلمہ النسج وشرط علیہ کل شہر کذا جاز، ولولم یشرط فبعد التعلیم طلب کل من المعلم والمولی أجرا من الآخر اعتبر عرف البلدة فی ذلک العمل“ (۵۷، ۵۸/۹ طبع زکریا)۔

کسی سے کام لیا جائے اور اجرت نہ طے ہو نہ ہی اس کا عرف ہو تو اس کا حکم:

اگر کوئی شخص اپنی رضا سے کسی کا کوئی کام کر دے اور اس کام پر اجرت وغیرہ لینے کا نہ تو عرف ہو اور نہ ہی اس کی کوئی اجرت متعین کی گئی ہو تو اس وقت اجرت کا استحقاق نہیں ہوگا۔ ”إن المنافع لا تتقوم إلا بالعقد“ (شامی ۸/۲۷۵)۔

۱- مذکورہ صورت میں لڑکے کا شریک نہ ہونا تو متعین ہے کیونکہ اس صورت میں نہ تو شرکت عقد ہے اور نہ تو شرکت املاک، البتہ اس کا معاون یا ملازم ہونا یا اس جگہ کے عرف پر موقوف ہے: ”إن المنافع لا تتقوم إلا بالعقد“ (شامی ۹/۵۸-۵۷)۔

”استعان برجل فی السوق بیع متاعہ فطلب منہ أجرا فالعبرة لعادتهم وكذا لو ادخل رجلا فی حانوتہ لیعمل



لہ " (شامی ۹/۵۸۰۵۷)۔

۲- اگر بچوں نے اپنے سرمایہ کا مالک والد کو نہ بنایا ہو تو یہ شرکت ملک ہے اور بچہ اپنے سرمایہ کے اعتبار سے شریک مانا جائے گا، کیونکہ معاون ہونے کی شرط ثلاثہ میں سے شرط ثانی مفقود ہے:

"ویوجد ثلاثة شروط لأجل اعتبار الولد معيناً لأبيه: ۱/ اتحاد الصنعة، ۲/ فقد الأموال سابقاً... ولم يكن معلوماً للإبن أموال، ۳/ أن يكون الابن في عيال أبيه... الخ... لفقد الشرط الثاني" (المجلة دفعة نمبر ۱۳۹۸)۔

۳- اس صورت میں کاروبار لڑکے کا ہو گا نہ کہ والد کا، کیونکہ اپنے والد کو اپنی دکان پر بیٹھانا اور تبرکات ان کے نام پر دکان کا نام رکھنا یہ نہ اسباب ملک میں سے ہے اور نہ اسباب شرکت میں سے۔

### خلاصہ بحث

۱- مذکورہ صورت میں لڑکے کا شریک نہ ہونا تو متعین ہے کیونکہ اس صورت میں نہ تو شرکت عقد ہے اور نہ تو شرکت املاک، البتہ اس کا معاون یا ملازم ہونا یہ اس جگہ کے عرف پر موقوف ہے:

"إن المنفعة لا تتقوم إلا بالعقد" (شامی ۸/۲۴۵)، "استعان برجل في السوق يبيع متاعه فطلب منه أجراً فالعبرة لعادتهم وكذا لو ادخل رجلاً في حانوته ليعمل له" (۹/۵۷، ۵۸ طبع زکریا)۔

۲- اگر بچوں نے اپنے سرمایہ کا مالک والد کو نہ بنایا ہو تو یہ شرکت ملک ہے اور بچہ اپنے سرمایہ کے اعتبار سے شریک مانا جائے گا، کیونکہ معاون ہونے کی شرط ثلاثہ میں سے شرط ثانی مفقود ہے:

"ویوجد ثلاثة شروط لأجل اعتبار الولد معيناً لأبيه: ۱/ اتحاد الصنعة، ۲/ فقد الأموال سابقاً... ولم يكن معلوماً للإبن أموال، ۳/ أن يكون الابن في عيال أبيه... الخ... لفقد الشرط الثاني" (المجلة دفعة نمبر ۱۳۹۸)۔

۳- اس صورت میں کاروبار لڑکے کا ہو گا نہ کہ والد کا، کیونکہ اپنے والد کو اپنی دکان پر بیٹھانا اور تبرکات ان کے نام پر نام رکھنا یہ نہ اسباب ملک میں سے ہے نہ اسباب شرکت میں سے۔

"أسباب الملك ثلاثة: ۱- ناقل كبيع وهبة، ۲- وخلافة كارث، ۳- واصالة وهو الاستيلاء... الخ" (۱۰/۳۷)

"وأسباب الشركة ضربان: ۱- شركة ملك، ۲- شركة عقد" (ملخصاً من الدر المختار: ۶/۲۶۶، ۲۶۷)۔

۳- اس صورت میں وہ کمائی تنہا کمانے والے کی ملک ہوگی اور دوسرے بھائیوں کا اس میں شرعاً کوئی استحقاق نہ ہوگا۔

"وما اشتراه أحدهم لنفسه يكون له" (۶/۲۷۸)۔

"كسب الأب من الزراعة والابن من صنعة الحذاء فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله" (المجلة دفعه نمبر ۱۳۹۸)۔

۵- جس نے اپنے سرمایہ لگایا ہے اس کاروبار کا مالک وہی ہوگا۔

"وما اشتراه أحدهم لنفسه يكون له... الخ" (۶/۲۷۸)۔

## والد کی کمائی میں اولاد کی شرکت

مفتی محمد اشرف قاسمی سعادت علی

سوال:- والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا بعد میں بعض لڑکے والد کی خواہش پر اس کاروبار میں شریک ہو گئے اور الگ سے اپنا سرمایہ نہیں لگایا؟  
جواب:- والد کے متروکہ کاروبار میں لڑکوں کی حیثیت عمومی حالات میں پارٹنر کی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہاں شرکت کی بظاہر کوئی نوع متحقق نہیں، اور نہ ہی لڑکوں کو ملازم قرار دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ والد کی طرف سے عموماً اجرت مقرر کر کے بطور ملازم ان کو نہیں رکھا جاتا ہے، اس لئے بچوں کو محض معاون قرار دیا جائے گا، جبکہ وہ بیٹا باپ کی کفالت میں ہو۔

مجلد کی دفعہ نمبر ۲۶۹ / میں کہا گیا ہے: إذا عمل شخص في صناعة هو وابنه الذي في عياله فکافة الکسب لذلك الشخص وولده يُعد معینًا له (مجلد الأحكام العدلیة ص ۲۶۹ رقم المادة ۱۲۹۸ / قدیمی کتب خانہ کراچی)۔

(اگر باپ اور اس کا بیٹا ایک کاروبار میں شریک ہو اور وہ بیٹا باپ کی کفالت میں ہو تو ساری کمائی باپ کی ہوگی، اور بیٹے کو محض معاون سمجھا جائے گا)۔  
بیٹے کو باپ کا محض معاون قرار دینے کی تین شرطیں ہیں: جو مجلہ کی شرح در احکام میں مذکور ہیں:

(۱) باپ اور بیٹے ایک ہی کاروبار میں شامل ہوں (۲) بیٹے کے پاس پہلے سے کوئی مال نہ ہو (۳) بیٹا باپ کی پرورش میں ہو۔

ويوجد ثلاثة شروط لأجل اعتبار الولد معینًا لأبيه؛ اتحاد الصناعة، فإن كان الأب مزارعًا والابن صانع أحذية فكسب الأب من الزراعة والابن من صناعة الحذاء فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله، وفقدان الأموال سابقًا إذا كان للأب أموال سابقة كسبها ولم يكن معلومًا للابن أموال بأن ورث من مورثه أموالا معلومة فيعد الابن في عيال الأب، وأن يكون الابن في عيال أبيه؛ أما إذا كان الأب يسكن دارا والابن في دار أخرى وكسب الابن أموالا عظيمة فليس للأب المداخلة في أموال ابنه۔  
(در الاحکام شرح مجلہ لا احکام ص ۳۳۵ بحث و نظر خصوصی شماره، دار القضاء کے فیصلے ص ۲۰۶)۔

(یعنی باپ کو بیٹے کا معاون قرار دینے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں (۱) باپ اور بیٹے کا کام ایک ہو۔ لہذا اگر باپ کا شکار ہو اور بیٹا جوتا ساز ہو، باپ کی کمائی کھیتی باڑی سے اور بیٹے کے کمائی جوتا سازی سے ہوتی ہو تو ہر ایک کی کمائی اس کی اپنی شمار ہوگی، باپ کو محض اس بنا پر بیٹے کی کمائی میں مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا کہ بیٹا باپ کی عیال میں ہے (۲) بیٹا پہلے سے اموال کا مالک نہ ہو، اگر باپ کے پاس پہلے سے مال ہو اور بیٹے کے پاس متعین مال نہ ہو اس طور سے کہ وہ اپنے مورث سے اموال معلوم کا وارث بنا ہو، تو بیٹا باپ کے عیال میں شمار ہوگا (۳) بیٹا باپ کی پرورش میں ہو، اگر باپ الگ مکان میں رہتا ہو اور بیٹا دوسرے مکان میں رہتا ہو اور بیٹے نے ڈھیر سا مال کمایا تو باپ کو بیٹے کے اموال میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے)۔

علامہ شامی نے بھی ان تینوں شرائط کی طرف سے اشارہ کرتے ہوئے قنیہ کے حوالہ سے لکھا ہے: ”الأب وابنه يكتسبان في صناعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معینًا له“ (ابن عابدین رد المحتار ۶/۵۰۲)  
(باپ بیٹے ایک ہی کاروبار میں ہوں اور پہلے سے کچھ نہ ہو، تو پوری کمائی باپ کی شمار ہوگی اگر بیٹا باپ کی پرورش میں ہو، کیوں کہ اس صورت میں بیٹا باپ کا معاون خیال کیا جائے گا)۔

جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ۔

سوال :- بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا؟

جواب :- (۲) اگر بیٹوں نے اپنا سرمایہ لگایا تھا اور تفاوت و تساوی کا علم نہ ہو اور نہ ہی تمیز کی کوئی صورت ہو تو متروکہ مال ان کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہوگا

يؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتماعا في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمييز. فأجاب بأنه بينهما سوية، وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في شركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية. ولو اختلفوا في العمل والرأى (ابن عابدین رد المحتار ۶/۵۰۲)۔

(یعنی باپ بیٹے ایک گھر میں تھے لیکن دونوں الگ الگ کماتے تھے، تفاوت، تمیز، تساوی، کا کوئی علم نہیں، تو مال دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، اسی طرح اگر باپ کے متروکہ مال میں چند بھائی کاروبار کریں اور مال میں اضافہ ہو جائے، تو یہ سارا مال ان سب کے درمیان مساوی تقسیم ہوگا، اگرچہ کام اور رائے کا اختلاف موجود ہو)۔

سوال :- لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے کاروبار شروع کیا لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا؟

جواب :- (۳) اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے کیا ہو، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہو یا تبرکاً والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو کاروبار اور اس

کے نتیجے میں حاصل شدہ ساری املاک کا مالک وہ لڑکا ہوگا، باپ کے وفات کے بعد دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا، اس لیے کہ کاروبار لڑکے نے اپنے سرمایہ سے شروع کیا ہے، اور باپ کی طرف سے لڑکے کی محض اعانت ہوئی ہے۔

سوال :- ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹھایا اور دوسروں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کیے؟

جواب :- (۴) ایک بھائی، باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک رہا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے تو اس صورت میں یہ

لڑکا جو باپ کے ساتھ شریک تھا یہ محض باپ کا معاون تھا، بشرطیکہ تینوں شرطیں موجود ہوں، یعنی اتحاد صنعت، فقدان الاموال سابقاً اور بیٹے کا باپ کی عیال میں ہونا۔ لہذا باپ نے جو کچھ سرمایہ چھوڑا ہے، وہ اسی کی ملک ہوگا، اور تمام لڑکوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہوگا، البتہ اس مسئلے میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کہ کیا بڑا بیٹا ہونا یا کسی اور وجہ سے باپ کا شریک کار ہونا اس کی محرومی کا باعث بن سکتا ہے جب کہ کھانا، پینا ایک ساتھ تھا تو باپ کے اموال سے بلکہ اس لڑکے کی محنت سے حاصل شدہ منافع سے ایک درجہ ان دوسروں لڑکوں نے بھی انتفاع کیا ہے پھر تقسیم میراث میں تسویہ بظاہر انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو کیا اجارہ فاسد قرار دیکر اجرت مثلیہ کا اسے حقدار قرار دے سکتے ہیں؟

سوال :- والد کا کاروبار ختم ہونے کے بعد اولاد میں سے کسی نے والد کی جگہ پر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا؟

جواب :- (۵) اولاد میں سے کسی نے باپ کی مملوکہ زمین یا کاروبار میں سرمایہ لگایا ہو، تو باپ کی وفات کے وقت جو کچھ تھا صرف اس میں سارے ورثاء برابر

کے حقدار ہوں گے، اس کے ذریعہ جو بھی زائد آمدنی ہوئی ہے وہ اسی بیٹے کی شمار ہوگی جس نے اپنا انفرادی سرمایہ لگا کر اسے آگے بڑھایا، البتہ اس دوران مشترکہ حصہ سے انتفاع کیا ہے، اس لیے قبضے کے وقت سے اب تک اجرت مثل طے کر کے اسے بھی باپ کا متروکہ شمار کیا جائے۔

وفي الخانية: زوج بنیه الخمسة في دار، وكلهم في عیالہ واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنین الثیاب اللتی علیہم لا غیر، فإن قالوا هم وامراته بعد موته إن هذا استفدنا بعد موته فالقول لهم فإن أقروا أنه كان يوم موته فهو میراث من الأب (ابن عابدین: رد المحتار ۶/۵۰۲)۔

(ایک شخص کے پانچ بیٹے اس کے گھر میں رہتے ہیں اور سب کے سب اسی کے زیر کفالت ہیں، اب اگر باپ بیٹوں میں سامان کی بابت اختلاف ہو جائے تو وہ مال باپ کا ہی شمار ہوگا، اور بیٹوں کا حق صرف ان کپڑوں پر ہوگا جو ان کے جسم پر موجود ہیں، لیکن اگر شوہر اس شخص کے بیٹے یا اس کی بیوی، اس شخص کے مرنے کے بعد یہ دعویٰ کریں کہ ہمیں یہ مال اس کے مرنے کے بعد حاصل ہوا ہے، تو ان کا قول معتبر ہوگا، اور اگر یہ اقرار کریں کہ یہ چیز وفات کے دن موجود تھی تو وہ میراث میں سے شمار ہوگی۔



## مسائل شرکت

مولانا محمد حذیفہ محمود

مذکورہ سوالات کے حل کے لئے مناسب ہے کہ پہلے اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات و ذکر کردہ شرائط کو ذہن نشین کر لیا جائے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”الاب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کله للاب إن کان الابن فی عیاله لکونه معینا له، ألا تری أنه لو غرس شجرة تكون فی الأب... وفی الخانیة: زوج بنیه الخمسة فی داره وکلهم فی عیاله واختلفوا فی المتاع فهو للاب وللبنین الثیاب التي علیهم لا غیر، فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم وإن أقروا أنه کان یوم موته فهو میراث من الأب (شامی ۲/۵۰۲)۔“

ہندیہ میں ہے: ”اب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کله للاب إن کان الابن فی عیاله لکونه معینا له، ألا تری أنه لو غرس شجرة تكون للاب وكذا الحکم فی الزوجین إذا لم یکن لهما شیء ثم اجتمع بسعیهما أموال كثيرة فهي للزوج وتكون المرأة معینة له إلا إذا کان لها کسب علی حدة فهو لنا“ (۲/۲۲۱)۔

مجلتہ الاحکام میں ہے: ”إذا عمل أحد فی صنعة مع ابنه الذی فی عیاله فکافة الکسب لذلك الشخص وبعد ولده معینا کما أنه إذا غرس أحد شجرة فأعانه ولده الذی فی عیاله فیکون الشجر لذلك الشخص ولا یشاركه ولده فیہ۔“

درر الاحکام میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: ”یوجد ثلاثة شروط لأجل اعتبار والولد معینا لأبيه (۱) اتحاد الصنعة... (۲) فقدان الأموال سابقا... (۳) أن یكون الابن فی عیال أیه“ (۳/۳۳۳-۳۳۵، مادة ۱۳۹۸)۔

مذکورہ بالا عبادات سے مستفاد ہوتا ہے کہ کاروبار میں والد کے ساتھ بیٹا بھی ہو تو تین شرطوں کے پائے جانے سے بیٹا والد کا معین شمار ہوگا، پہلی شرط: کاروبار دونوں کا ایک ہی ہو، دوسری شرط: بیٹے کا پہلے سے کوئی مال نہ ہو، تیسری شرط: بیٹا باپ کی پرورش میں ہو، کھانا پینا، باپ کے ساتھ ہو۔

اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱- والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، پس اگر شریک کار ہوتے وقت والد سے کوئی معاملہ ملازمت کا طے ہوا ہے تو اس کے مطابق عمل ہوگا اور اگر کوئی معاملہ اس قسم کا طے نہیں ہوا تو پھر جب کاروبار ایک ہے، لڑکے کا کوئی سرمایہ نہیں لگا اور لڑکا باپ کی پرورش میں ہے تو لڑکا باپ کا معاون شمار ہوگا اور ساری کمائی باپ کی ہوگی۔

درر الاحکام میں ہے: ”إذا عمل أحد فی صنعة ہو وابنه الذی فی عیاله واکتسبا أموالا ولم یکن معلوما أن للابن مالا سابقا فکافة الکسب لذلك الشخص ولا یكون لولده حصة فی الکسب بل یعد ولده معینا وليس له طلب أجر المثل حتی أنه لو تنازع الأب فی المتاع الموجود فی بیته مع أولاده الخمسة الذین یقیمون معه فی ذلك البیت وادعی کل منهم أن المتاع له فالمتاع للاب ولا یكون للأولاد غیر الثیاب التي هم لابسوها ما لم یثبتوا عکس ذلك... إذا کان للاب أموال سابقة کسبها ولم یکن معلوما للابن أموال بأن ورث من مورثه أموالا معلومة فیعد الابن فی عیال الأب“ (درر الاحکام شرح مجلہ الاحکام ۲/۳۳۵، مادة ۱۳۹۸، مطبوعة دارالکتب العلمیة بیروت)۔

مدرس مدرسہ عربیہ تعلیم المسلمین دارالعلوم لونا واڑہ گجرات۔

منتخبات نظام الفتاویٰ میں ہے: ”محمد اشرف کے تہا والد کے ساتھ اخیر تک دوکان میں محض کام کرتے رہنے سے محمد اشرف کا دوکان میں شریک و سہم ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ اولاد ایسے وقت محض والد کی معین و مددگار شمار ہوتی ہے، ”کما صرح بہ الفقہاء“ (۲/۲۱۳)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: ”اگر زید والدین کے ساتھ رہتا تھا اور رہنا سہنا، کھانا پینا ان کے ساتھ تھا اور ان کے ماتحت رہ کر کمائی ہوئی رقم سے زمین خریدی تو وہ جگہ والد کی شمار ہوگی اور اس میں والد صاحب کے تمام ورثہ حق دار ہوگا (۱۵۹/۶)۔

نیز لکھا ہے: ”باپ بیٹے سب مل کر ایک ساتھ ہی کاروبار کرتے ہوں، کھانا پینا ساتھ ہو تو ساری کمائی باپ کی شمار ہوگی، باپ کی وفات کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا تو لہذا کو مثل حظ الانثیٰ کے اصول پر تقسیم ہوگا (فتاویٰ رحیمیہ ۱۶۰/۶)۔

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے: ”جو بیٹا باپ کی عیال میں تھا اس کا کمایا ہوا مال و اسباب باپ کے مکسوبہ میں شامل ہو کر باپ ہی کی ملکیت ہوگا اور اس کے مرنے کے بعد ترکہ میں شمار ہوگا، لہذا دونوں بیٹے اس میں برابر حصے کے حقدار ہیں“ (۷۸/۱۳)۔

منتخبات نظام الفتاویٰ میں ایک مقام پر ہے:

”جب والد محترم زندہ تھے اور سب بھائی ان کے ساتھ ہی کام کرتے تھے تو والد صاحب تہا سب کے مالک تھے“ (۲۵۹/۲)۔

۲- والد کے کاروبار میں اپنا کچھ سرمایہ بھی لڑکے نے لگایا اور کام میں شریک ہو گیا اس صورت میں اگر سرمایہ لگاتے وقت شرکت کا معاملہ طے ہوا ہے تو اس کے مطابق لڑکا شریک ہوگا، اور اگر قرض کہہ کر دیا ہے تو وہ سرمایہ قرض شمار ہوگا، اور اگر زبانی طور پر شرکت یا قرض وغیرہ کی کوئی صراحت نہیں ہوئی مگر لڑکے کا مقصود سرمایہ لگانے سے باپ کی اعانت اور اس کے ساتھ حسن سلوک ہے تو پھر یہ اس کی طرف سے تبرع ہے، کل کاروبار والد کا ہوگا، اور اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں ہے، یعنی نہ کوئی صراحت ہے اور نہ ہی مقصد اعانت ہے تو پھر عرف یا قرینہ حال سے کوئی پہلو طے کیا جائے گا۔

۳- جب کاروبار لڑکے نے اپنے سرمایہ سے شروع کیا ہے، چاہے دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہے یا تہر کا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں کاروبار لڑکے ہی کا شمار ہوگا، ساری کمائی اسی کی ہوگی، کیونکہ لڑکے کے معاون کہلانے کے لئے شرط یہ ہے کہ سرمایہ باپ کا ہونہ لڑکے کا، جیسا کہ پہلے گذرا، ”إذا كان للأب أموال سابقة كسبها ولم يكن معلوماً للابن أموالاً بأت ورث من مورثه أموالاً معلومة فيعد الابن في عیال الأب“ (درر الحکام ۲/۲۳۵، مادہ ۱۳۹۸) اور یہاں تو معاملہ برعکس ہے، سرمایہ لڑکے کا ہے، نہ کہ باپ کا پس اس صورت میں بیٹا اصل ہوگا اور باپ معین ہوگا اور کاروبار کا مالک بیٹا ہوگا، والد کو دوکان پر بٹھانے یا ان کے نام پر دوکان کا نام رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: ”کسی مصلحت کی وجہ سے دوسرے کے نام مکان جائیداد خریدی جائے تو محض ان کے نام پر خریدنے کی وجہ سے وہ شخص اس مکان اور جائیداد کا مالک نہ ہوگا، جس کے ساتھ سودا ہوا ہے، جس نے رقم ادا کی ہے، وہی اس کا مالک ہوگا“ (۵۳۱/۱۰)۔

۳- جس بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹھایا وہ والد کا معاون شمار ہوگا، اس لئے کاروبار سے حاصل شدہ تمام مال والد کی ملکیت ہوگی جس میں والد کی وفات کے بعد تمام ورثہ شریک ہوں گے، اور جن دوسرے بھائیوں نے دوسرے ذرائع معاش اختیار کئے ہیں ان کی کمائی کے وہ تہا مالک ہوں گے، سبھوں کے درمیان مشترک نہیں ہوگی، کیونکہ اتحاد صنعت یعنی کاروبار ایک نہیں ہے، چاہے کھانا، پینا ایک ہے۔

درر الحکام میں ہے: ”فإذا كان الأب مزارعاً والابن صانعاً أخذت فکسب الأب من الزراعة والابن من صناعة الحذاء، فکسب کل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلتة فی کسب ابنه لكونه فی عیاله، وقول المجلة ”مع ابنه“ إشارة لهذا الشرط، مثلاً إن زیداً یسکن مع أبیه عمرو فی بیت واحد ویعیش من طعام أبیه وقد کسب مالا آخر فلیس لإخوانه بعد وفاة أبیه إدخال ما کسبه زید فی الشركة“ (۲/۲۳۵، مادہ ۱۳۹۸)۔

تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں علامہ شامی نے لکھا ہے:

”سئل فی ابن کبیر ذی زوجہ وعیال له کسب مستقل حصل بسبہ أموالاً، مات: هل هی لوالده خاصة أم تقسم بین

ورثتہ؟ اُجاب ہی للابن تقسم بین ورثتہ... حیث کان له کسب مستقل“ (۲/۱۶) از حاشیہ محمودیہ جدید ۲۰/۲۱۱۔

ہاں! البتہ دوسرے ذرائع معاش اختیار کرنے والے بھائیوں میں سے کسی نے یا سبھوں نے اپنی کمائی یا تنخواہ میں سے کچھ یا سب کچھ باپ کے حوالہ کر دیا تھا، باپ کو اعلیٰ یا ہبہ دے دیا تھا تو وہ دیا ہوا سب کچھ باپ کا ہوگا، فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: ”باپ بیٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور ہر ایک اپنی ماہانہ تنخواہ اپنے والد کو حوالہ کر دیتا ہے تو اس صورت میں جمع شدہ رقم سے جو مکان زمین وغیرہ خریدا گیا ہے وہ سب باپ کی شمار ہوگی“ (۱۶۰/۹)۔

اسی طرح اگر ان دوسرے ذرائع معاش اختیار کرنے والے بھائیوں نے اپنی کمائی علاحدہ جمع نہیں کی بلکہ تمام نے اکٹھا ایک ساتھ رکھی تو پھر یہ سب جمع شدہ اموال ان تمام کے درمیان مشترک ہوں گے، تمام کے درمیان مساوات سے تقسیم کئے جائیں گے۔

درر الحکام میں ہے: ”لوکان اثنتا یسکنان فی دار وکل منہما یکسب علی حدۃ وجمعا کسبہما فی محل واحد ولم یعلم مجموعہ لمن کما أنه لم یعلم التساوی ولا التفاوت فیہ فیقسم سویۃ بینہما ولوکان مختلفین فی العمل والرأی“ (۲/۲۳۵، مادۃ ۱۳۹۸)۔

شامی میں ہے: ”زوج امرأۃ وابنہا اجتمعا فی دار واحدة وأخذ کل منہما یکسب علی حدۃ ویجمعان کسبہما ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمییز فأجاب بأنه بینہما سویۃ“ (۶/۵۰۲)۔

۵- والد کا کاروبار کسی وجہ سے ختم ہو گیا اور کاروبار کی جگہ پر اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، پس اگر لڑکے کا مقصود اس سے والد کی اعانت کرنا تھا تو وہ لڑکے کی طرف سے تبرع ہے، اور کاروبار والد کی ملکیت ہوگا اور اگر مقصود اعانت نہ تھا تو پھر یہ کاروبار اس لڑکے کی ملکیت ہوگی جس نے اپنا سرمایہ لگا کر دوبارہ کاروبار شروع کیا، کیوں کہ کاروبار والد کا شمار ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ سرمایہ باپ کا ہو، نہ کہ لڑکے کا، جیسا کہ گذرا:

”یوجد ثلاثة شروط لاعتبار الولد معینا لأبیہ (۱) اتحاد الصنعة، (۲) فقدان الأموال سابقا، إذا کان للأب أموال سابقۃ کسبہا ولم یکن معلوما للابن أموال بأن ورث من مورثہ أموالا معلومة فیعد الابن فی عیال الأب، (۳) أن یکون الابن فی عیال أبیہ“ (درر الحکام ۲/۲۳۵)

اور یہاں سرمایہ لڑکے کا لگایا گیا ہے اور کاروبار شروع ہوا ہے، اس لئے یہ کاروبار لڑکے کی ملکیت ہوگا۔

الفتاویٰ الکاملیہ میں ہے: ”إذا کان الابن فی عیال أبیہ ومعینا له یکون جمیع ما تحصل من الکسب لأبیہ وما اشتراه ودفع ثمنه من مال أبیہ إن کان شرائه لأبیہ یاذنه لا یکون له الاختصاص بدون وجه شرعی بل هو خاص بالأب فان کان شرائه لنفسه ودفع ثمنه من مال أبیہ بأذنه یکون خاصا به وبدل الثمن مضمون للأب“ (الفتاویٰ الکاملیہ کتاب الشركة ۵۱/۵۱، از حاشیہ فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۳/۲۰۵)۔

اس عبارت سے دو باتیں مستفاد ہوئیں:

ایک یہ کہ بیٹا جو والد کے زیر پرورش اور اس کا معین ہو وہ باپ کے لئے باپ کے کہنے سے کوئی چیز خریدے تو وہ باپ کی ہوگی، پس زیر بحث صورت میں بھی بیٹے کا مقصود کاروبار کے لئے سرمایہ لگانے سے باپ کی اعانت تھا تو پھر یہ کاروبار باپ کا ہوگا۔

دوسری یہ کہ بیٹا جو والد کی زیر پرورش اور اس کا معین ہو وہ اپنے لئے کوئی چیز خریدتا ہے چاہے اس کی قیمت باپ کے مال میں سے ادا کرتا ہے، وہ بیٹا اس چیز کا مالک ہو جاتا ہے، پس زیر بحث صورت میں لڑکا اپنے ہی سرمایہ سے اپنے لئے کاروبار شروع کرتا ہے، چاہے والد کے کاروبار کی جگہ پر ہو یا اسی کے نام سے ہو بدرجہ اولیٰ کاروبار اس کی ملکیت ہوگا۔



## تیسرا باب / مختصر تحریریں

### والد کے کاروبار میں بچوں کی شرکت کا ایک تجزیاتی مطالعہ

مولانا محمد قاسم مظفر پوری

اس سوانامہ سے متعلق سوالات کے مختصر جوابات حسب ذیل ہیں:

۱- خاندانی نظام اگر مشترک ہو اور والد نے کاروبار کے آغاز یا اثناء میں اولاد کی شرکت کی نوعیت کی صراحت یا تعیین نہیں کی اور پورا سرمایہ والد ہی کا رہا، تو جو اولاد بھی شریک کارر ہے ان کی حیثیت معاون کی ہوگی اور اس حال میں چھوڑی ہوئی کل جائیداد وراثت کے اصولوں پر تقسیم ہوگی، دراصل اس مسئلہ کا تعلق کاروباری عرف و عادت سے ہے، اور یہ عرف و عادت مختلف زمانوں، علاقوں اور خاندانوں میں الگ الگ ہوتی ہے، مسلم معاشرہ میں اولاد کا اپنے والد کے کاروبار میں تعاون عموماً اخلاقی بنیادوں پر ہوتا ہے، اس لئے والد کے انتقال کے بعد عرفاً ان کی جائیداد مشترک مانی جائے گی، اولاد کو پارٹنر یا ملازم کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ نہ شراکت کا کوئی عقد ہوتا ہے اور نہ اجارہ کا، جب کہ اجارہ کی صحت کے لئے اجرت کا معلوم ہونا ضروری ہے:

”ولا تصح حتی تکون المنافع معلومة والأجرة معلومة“ (ہدایہ: ۲/۲۶۰)

، اسی طرح پارٹنرشپ کے لئے بھی ایجاب و قبول ضروری ہے: شركة العقود رکنها الإيجاب والقبول (حوالہ سابق) اور ان دونوں عقود کی یہ شرائط یہاں مفقود ہیں، اس لئے اولاد کو پارٹنر یا ملازم کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

۲- اولاد نے اگر باپ کی اجازت سے اپنا سرمایہ کاروبار میں لگایا اور باپ بیٹے کے درمیان اس سرمایہ کے بارے میں کوئی واضح پالیسی متعین نہیں ہوئی تو عرفاً وہ بھی کاروبار کو مستحکم کرنے کے لئے اس کا اخلاقی تعاون قرار دیا جاسکتا ہے، اور اگر باپ نے بیٹے کی اس رقم کے بارے میں کوئی وضاحت کی ہو تو اسے ہی بنیاد قرار دیا جائے گا۔

۳- جس لڑکے نے اپنے سرمایہ سے اپنی تجارت شروع کی، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا، یا والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا تو اسے باپ کی شہرت اور کاروبار کی دنیا میں اعتماد سازی کی حیثیت دی جاسکتی ہے، اس کی وجہ سے باپ کو اس تجارت میں شرعی پارٹنر نہیں قرار دیا جائے گا الا یہ کہ باپ بیٹے کے درمیان کوئی معاہدہ شرکت یا اجارہ کا ہوا ہو۔

۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا تعاون کیا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کئے جب کہ خورد و نوش کا نظام مشترک تھا، اور دوسرے بھائیوں نے اپنے ذاتی سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، تو وہ کاروبار ان بھائیوں کی ذاتی ملکیت ہوگی، اور اگر والد نے سرمایہ دیا تھا تو پھر اسے مشترک سرمایہ قرار دینا چاہئے، تنہا ان کی ملکیت نہ ہوگی، البتہ جس بھائی نے والد کا ہاتھ بنا یا وہ اس کا اخلاقی تعاون سمجھا جائے گا، اور والد کی حاصل کردہ ذرائع آمدنی پر سبھوں کی ملکیت ہوگی اور وراثت کے اصولوں پر اس کی تقسیم عمل میں آئے گی۔

۵- والد کے کاروبار کے ختم ہونے کے بعد اسی جگہ پر اسی نام سے کسی لڑکے نے اپنا سرمایہ لگا کر اپنا کاروبار شروع کیا، تو اس کاروبار پر اس لڑکے کی ملکیت ہوگی، وہ جگہ اگر والد کی ہو اور وہ زندہ ہوں تو وہ اس کے اجرت مثل کے مستحق ہوں گے۔

میری ناقص رائے کے مطابق اس پورے سوال نامہ میں عرف و عادت کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جائے گا جب کہ کوئی واضح پالیسی موجود نہ ہو، یہ بھی واضح رہے کہ کسب معاش کے باب میں مختلف ذرائع مکاسب کے عرف و عادت اور رواج و تعامل جدا جدا ہیں، بلکہ بعض خاندانوں اور فیملی میں بھی مشترکہ خاندانی نظام کے بارے میں الگ الگ طریقہ مروج ہے، عام طور پر مسلم معاشرہ میں شوہر و بیوی، بیٹے و بیٹیاں، بھائی اور بہن کے درمیان ایثار و ہمدردی اور تعاون باہمی کا ایسا جذبہ ہوتا ہے کہ املاک و اثاثہ جات کی تقسیم و تعیین کو اہمیت نہیں دی جاتی، جس کے نتیجے میں بعض دفعہ نزاعات کا دروازہ کھل جاتا ہے، اس طرح کے معاملات میں قاضی شریعت کو تنازع فیہ امور میں باریک بینی سے عرف و عادت اور خاندانی مروجات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، آیت قرآنی: "للرجال نصیب مما اكتسبوا وللنساء نصیب مما اكتسبن" (النساء: ۳۲) کے نص سے بھی بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے۔

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مولانا زبیر احمد قاسمی

آج ہمارے معاشرہ میں والد کی وفات کے بعد اولاد کے درمیان باپ کی متروکہ جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں جو مختلف پیچیدگیاں اور بڑے بڑے نزاع اور باہمی خلفشار ہوتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ دراصل صورت حال کی ابہام اور غیر واضح ہونا ہی ہوتا ہے، ایک طویل عرصہ تک فیملی ایک ساتھ جوائنٹ رہتی ہے سب کا کھانا پینا رہنا سہنا ساتھ رہتا ہے اور ساری ضروریات کا مہیا کرنا اور سب ہی لوگوں کے لوازم زندگی کی تکمیل باپ کرتا رہتا ہے اور کچھ اولاد باپ کے ساتھ شریک عمل ہو کر اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتی ہے، کچھ اسی کاروبار کے پیسوں سے تعلیم و ہنر کی تحصیل میں لگی رہتی ہے، پھر اسی کاروبار سے مزید کچھ جائیدادیں بھی حاصل کی جاتی ہیں، پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اولاد تو زندگی بھر باپ ہی کا شریک رہ جاتا ہے اور بعض کسی علم و ہنر میں باکمال بن کر یا تو مستقبل میں معاشی طور پر مضبوط بن جانے کا اہل ہو جاتا ہے اور اس کے لئے معاشی ترقی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے یا پھر وہ الگ تھلگ مستقل ذریعہ معاش ملازمت تجارت یا کوئی دوسرا پیشہ وارانہ کام کرنے بھی لگتا ہے اور اس کی کمائی الگ بھی کلا یا جزء جمع ہونے لگتی ہے، اور فیملی تاہنوز جوائنٹ ہی رہتی ہے اور اب تک کسی بھی اولاد کی کسی حیثیت کا تعین نہ ہو کر پوری صورت حال غیر واضح اور مبہم مبہم سی بنی رہتی ہے، اور اب والد کی وفات کے بعد اسی ابہام کے نتیجے میں کبھی کسی لڑکے کی اولاد یعنی پوتے کی محرومی جیسا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو کبھی کسی اولاد کے بہت زیادہ نفع اور کسی کے بے حد ضرر نقصان میں رہ جانے کا سوال پیدا ہونے لگتا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ صورت حال ہی مزاج شریعت اور اسلاف کے طرز عمل کے خلاف ہوتی ہے، اس لئے اولاد مناسب بات یہی ہوگی کہ اکیڈمی کی جانب سے باتفاق علماء اس ضابطہ و اصول کی تشہیر و اشاعت ہو کہ جب کسی کی کوئی اولاد بالغ شادی ہو کر صاحب اولاد بن جائے تو کم از کم اب اس کی حیثیت کا تعین ضرور ہو جائے، خود باپ یا اس کا قائم مقام ولی و سرپرست بڑا بھائی، سب کے مشورہ و استمراج کے بعد سب کی حیثیت واضح کر دے کہ کون اجیر و ملازم ہوگا کون شریک اور کون محض معاون، پھر کون اپنی علیحدہ مستقبل کمائی کا کس تناسب سے مکمل مالک ہوگا اور فیملی کس انداز سے جوائنٹ رہے گی یا مستقل، وغیرہ، سارے نزاع اور باہمی خلفشار کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا اگر سب کی حیثیتوں کا تعین ہو جائے۔

اس تمہید کے بعد عنوان بالا سے متعلق مرسلہ سوالوں کے باضابطہ جوابات ہمارے خیال میں درج ذیل ہیں:

۱، ۲- اگر فیملی جوائنٹ ہو سب کا کھانا پینا رہنا ساتھ ہو اور باپ کے بغیر سرمایہ والے کسی پیشہ وارانہ کام مثلاً دھلائی، سلانی، حدادی، زرگری یا یومیہ مزدوری وغیرہ جیسے کاموں میں، یا سرمایہ والے کسی تجارتی کاروبار میں عملی طور پر جو بھی اولاد شریک ہوگی، خواہ بغیر اپنا کوئی سرمایہ ملائے یا بہ اجازت والا سرمایہ ملا کر، بہر حال اس کام اور اس تجارت سے حاصل شدہ ساری کمائی اور پھر اس کمائی سے حاصل کردہ دیگر ساری جائیدادیں، باپ ہی کی مملوکہ سمجھی جائیں گی، اور مرنے کے بعد باپ ہی کی متروکہ بنکر اس کے جمیع ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے مطابق تقسیم ہوگی، اولاد کی حیثیت محض معاون کی ہوگی۔

”لما فی القنیۃ: الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ ألا تری لو غرس شجرة تكون للأب“ (شامی ۲/۲۳۹)۔

جامعہ عربیہ اشرف العلوم کہواں سیتا مڑھی بہار۔



اور جب بغیر مال کے ہونے والی کمائی باپ کی ہوتی ہے بیٹا محض معاون ہوتا ہے تو اگر مال بھی باپ کا ہی ہو، خواہ اس مال میں کچھ بھی بیٹا کا نہ ہو یا والد کی اجازت سے بغیر حیثیت کی وضاحت کے کچھ حصہ مال بیٹا کا بھی شامل ہو جائے تب تو بدرجہ اولیٰ، کمائی اور نفع کا مالک باپ ہی ہوگا، بیٹا محض ایک معاون رہے گا۔“

۳- اگر کسی بیٹے نے کسی طرح کچھ سرمایہ حاصل کر کے اپنے ہی سرمایہ سے اپنا کوئی کاروبار مستقل خود شروع کیا ہو تو گودکان پر تبرکاً باپ کو بٹھاتا ہو اور ضمناً کبھی باپ عملاً کچھ تعاون بھی کر دیتا ہو، یا صرف باپ کے نام پر اپنی دکان کا نام رکھے ہوئے ہو، بہر صورت اس کاروبار کی کمائی اور منافع کا مکمل مالک خود ہی لڑکا ہوگا، باپ کی نہ تو اس میں کچھ شرکت ہوگی نہ ملکیت۔“

فقہاء لکھتے ہیں: ”والأصل أن الربح إنما يستحق عندنا بالمال أو بالعمل وأما بالضمائم“ (بدائع الصنائع ۶/۶۲)۔

۴- ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کا دوسرا ذریعہ مثلاً تجارت و ملازمت کو بنایا، فیملی گوجوانٹ رہی کھانا پینا ساتھ ہوتا رہا، تاہم اوپر بدائع الصنائع کے حوالہ سے جو اصول لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں اس صورت کا حکم تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ باپ کے عمل میں شریک بھائی کی کمائی تو باپ کی مملو کہ ہو کر اس کے ورثاء کے درمیان گویا مشترک ہوگی بعض ان دوسرے بھائیوں کی کمائی جن کے نہ تو عمل میں کوئی دوسرا بھائی یا باپ شریک ہوا، نہ مال میں، ان کی کمائیاں مشترک نہیں بلکہ تنہا انہیں کی ملکیت ہوگی، کھانے پینے وغیرہ میں اگر دوسرے بھائی یا باپ نے اس کو شریک بھی رکھا تو اس کا یہ تبرع و احسان ہوگا اور بس۔

۵- اگر والد کے کاروبار ختم ہو جانے کے بعد اسی مکان یا دکان مملو کہ یا کرایہ پر حاصل کردہ، میں کسی اولاد نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے نیا کاروبار شروع کیا تو ظاہر ہے کہ صرف فرم و دکان کا نام کسی کے نام پر رکھ دینے سے تو کسی کی شریکت و ملکیت ثابت نہیں ہوتی، اس لئے اس کاروبار کی ساری کمائی کاروبار کرنے والے کی ہوگی، والد کی شرکت نہیں ہوگی، البتہ اس صورت میں باپ کے مملو کہ مکان و دکان کو استعمال کرنے کے سبب مالک مکان کرایہ کا مستحق ہو سکتا ہے اب اگر معاملہ اجارہ واضح، اور اجرت ماہانہ یا سالانہ وغیرہ طے شدہ ہو تو حسب معاہدہ، ورنہ اجارہ فاسدہ کے سبب اجرت کا مستحق ہوگا، اور اگر وہ مکان و دکان کرایہ ہی پر حاصل کردہ ہو تو اصل مالک اجرت معہودہ یا اجرت کا مستحق کہلائے گا۔





## اولاد کی والد کے ساتھ تجارت میں شرکت کے مسائل

شیخ سعید عبدالحفیظ حجاوی

- ۱- اس صورت میں تجارت کی نوعیت کو دیکھا جائے گا، اگر سارے بچے یا اولاد اپنا مستقل اور الگ کام کرتے ہیں اور اصل سرمایہ والد کا لگا ہوا ہے تو ایسی صورت میں یہ شرکت مضاربت ہوگی، جہاں نفع کے تناسب سے ہر ایک کا حصہ ہوگا، اگر زیادتی اور کوتاہی کسی کی جانب سے نہ ہو اور خسارہ ہو جائے تو اسے رأس المال برداشت کرے گا، اور بیٹے معاون سمجھے جائیں گے۔
- ۲- مال اور جسم کی شرکت کی وجہ سے یہ صورت شرکت عنان کی ہے، اور رأس المال میں اپنے حصہ کے مطابق ہی ہر ایک کا حصہ ہوگا، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ رأس المال میں شرکت ہو اور تمام لوگ ماہانہ متعینہ طور پر تنخواہ دار کی حیثیت سے شریک ہوں اور اس پر سب متفق بھی ہوں، مزید یہ کہ نفع کا تناسب رأس المال میں شرکت کے اعتبار سے ہو۔
- ۳- اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:
  - ایک یا تو والد بحیثیت مضارب شریک ہوں گے اور نفع کے تناسب سے ان کا حصہ ہوگا، اور اگر زیادتی اور کوتاہی اکثر نہ ہوتی ہو تو خسارہ اور نقصان بھی برداشت نہیں کریں گے۔
  - دوسرا یا تو والد کو ماہانہ بطور اجرت تنخواہ ملے گی یا نفع کے حساب سے تنخواہ ملے گی۔
- ۴- جب تمام لوگ ایک ہی خاندان میں ایک ساتھ رہتے ہوں تو سارے مال میں وہ سب شریک ہوں گے، اور یہ والد کی ترتیب کے اعتبار سے ہوگا۔ بایں طور کہ وہ بیٹا جو والد کے ساتھ ایک متعین مدت سے ساتھ کام کر رہا تھا تو اس کو اس کے نام سے ماہانہ الگ سے تنخواہ دی جائے، یا پھر اس بیٹے کے لئے نفع میں سالانہ الگ سے کچھ مقرر کر دیا جائے۔
- ۵- اگر وہ جگہ کسی کی ذاتی ملکیت میں ہو یا کرایہ کی ہو، تو اب از سر نو تجارت کرنے والے شخص پر لازم ہے کہ وہ مکان کی اجرت مالک کو عین کرے، اب مالک خواہ والد ہوں یا کوئی دوسرا، اگر وہ جگہ نہایت پسندیدہ ہو اور تجارت بہت مشہور ہو تو پھر اس شہرت اور زمان و مکان کے رائج عرف کے مطابق خالی کرنے کا مطالبہ درست ہوگا، اور کرائے کے عقد کی وہ شرطیں جو اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہوں لگائی جاسکتی ہیں۔

مدیر عام برائے تنظیم آل بیت، اردن۔





## کاروباری معاملات میں والد اور اولاد کی شرکت کا اسلامی نقطہ نظر

مولانا شیر علی گجراتی

سوال- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد میں اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے؟ پارٹنر کی، ملازم کی یا معاون کی؟

جواب- ایسے لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہوگی اس لئے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے آج تک یہ تعامل چلا آ رہا ہے کہ اولاد باپ کے ساتھ رہتی ہو اور کچھ اولاد کام کرتی ہو اور کچھ نہ کرتی ہو تو وہ کمائی باپ کی شمار ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: لو دفع إلى ابنه ما لا يتصرف فيه الابن يكون للأب إذا دلت دلالة على التملك كذا في الملتقط (عالمگیری ۲/۲۹۲)۔

(اگر کسی شخص نے اپنے بیٹے کو مال دیا پھر بیٹے نے اس مال میں تصرف کیا تو وہ مال باپ کی ملکیت شمار ہوگا، مگر جب کہ تملیک پر کوئی دلیل قائم ہو)۔ جب باپ اس مال میں تصرف کرنے میں شریک نہیں بلکہ سارا تصرف بیٹا کر رہا ہے تب بھی وہ مال باپ کے لئے ہوگا، تو جب باپ بیٹا دونوں تصرف کریں گے بدرجہ اولیٰ باپ کے لئے ہوگا۔

رجل دفع إلى ابنه في صحته ما لا يتصرف فيه ففعل وكثر ذلك فمات الأب إن أعطاه بية فالكل له، وإن دفع إليه لأن يعمل فيه للأب فهو ميراث كذا في جواهر الفتاوى۔

قال لولده الصغير تصرف في هذه الأرض فأخذ يتصرف فيها لا تصير مالاً (عالمگیری ۲/۲۹۲)۔

أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة لم يكن لها مال فالكسب كله للأب إذا كان الابن في عيال الأب لكونه معينا له إلا أنه لو غرس شجرة تكون للأب (عالمگیری ۲/۲۲۹)۔

سوال: اگر یہی صورت ہو لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب- اگر بچوں نے اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو تب بھی ملکیت باپ کی ہوگی بچوں کے باپ کے تابع ہونے کی وجہ سے، نیز صحابہ کرام کے زمانہ سے تعامل بھی چلا آ رہا ہے، کہ کچھ اولاد کام کرتی ہو اور کچھ نہیں اور باپ کے ساتھ رہنا سہنا کھانا پینا وغیرہ ہو تو تمام بھائی متروکہ مال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لہذا یہ مال بھی باپ کا ہوگا اور تمام بھائی باپ کے مرنے کے بعد اس مال میں برابر کے شریک ہوں گے۔

سوال: اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا ہو لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہو یا تمبر کا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب - اگر کھانا پینا وغیرہ سب کچھ والد کے ساتھ ہو تو کاروبار باپ کا ہوگا اور والد کے بعد تمام بھائی اس میں شریک ہوں گے، لیکن اگر کھانا پینا وغیرہ ساتھ نہ ہو تو کاروبار لڑکے کا شمار ہوگا، اور اگر باپ پابندی سے نہ بیٹھتا ہو اور باپ کے ساتھ اجرت کی بات کی ہو تو اجرت کا مستحق ہوگا اور بعد میں تمام بھائی اس اجرت میں شریک ہوں گے اور تبرکات والد کے نام پر دوکان کا نام رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ وہ مال صرف اسی لڑکے کی ملکیت ہوگی۔

سوال: اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جب کہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟

جواب - جس لڑکے نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا ظاہر ہے کہ وہ باپ کا معاون ہوگا اور دوسرے بھائیوں کا کھانا پینا سب ساتھ ہے تو اس کی کمائی بھی باپ کی ہوگی

علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں: وفي الخانية زوج ينيه الخمسة في داره وكلهم في عياله فاختلفوا في المتاع فهو للآب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير (شامی ۶/۹۵۰۲ کتاب الشركة)۔  
فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

زید کنوارے پن میں والدین سے الگ رہتا تھا اور اس نے اپنی سمجھ اور کمائی سے زمین خریدی تھی تو اس کا وہ خود مالک ہوگا، لیکن اگر زید والدین کے ساتھ رہتا تھا اور اس کا رہنا سہنا کھانا پینا ان کے ساتھ تھا اور ان کے ماتحت رہ کر کمائی ہوئی رقم سے زمین خریدی ہے تو وہ جگہ والد کی شمار ہوگی اور اس میں والد صاحب کے تمام ورثاء حقدار ہوں گے (فتاویٰ رحیمیہ ۵/۱۵۹)۔

سوال - اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار کو شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگا یا والد کی؟

جواب - اگر کاروبار کی جگہ والد کی ہو اور والد کے ساتھ رہنا سہنا ہو تو اس صورت میں یہ کاروبار والد کا شمار ہوگا اور اگر والد کے ساتھ رہنا سہنا نہ ہو یا دوسرے کی جگہ ہو اور لڑکا اس کا کرایہ دے رہا ہو، تو اس صورت میں کاروبار لڑکے کا ہوگا۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر لڑکا مر جائے تو باپ وراثت کا مستحق ہوگا، اگر باپ کا مال ہوتا تو باپ وراثت کا مستحق نہ ہوتا بلکہ کل مال باپ کا ہوتا۔



## کاروباری لین دین میں والد اور اولاد کی شرکت

مفتی انور علی اعظمی ؒ

۱- اگر والد نے اپنے کاروبار کا آغاز اپنے سرمایہ سے کیا بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی حیثیت نہ پارٹنر کی ہوگی اور نہ ہی ملازم کی، بلکہ وہ باپ کے معاون مانے جائیں گے، چنانچہ علامہ شامی نے قنیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کله للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ (۲/۲۹۷، شامی دارالکتب ایڈیشن)۔

گویا فقہاء نے اس صورت میں بیٹے کو باپ کا شریک نہیں مانا بلکہ معین و مددگار مانا، علامہ شامی نے اس پر ایک نظیر پیش کی:

الألو غرس شجرة تکون للأب (شامی ۲/۲۹۷)۔

۲- اگر یہی صورت ہو لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی لگایا ہو تو اس صورت میں طے شدہ حصہ کے بقدر نفع کے حقدار ہوں گے، اور طے شدہ حصہ کے بقدر وہ باپ کے کاروبار میں شریک یعنی پارٹنر ہوں گے، یہ صورت شرکت عنان کے قبیل سے ہوگی، اور شرکت عنان بالاجماع جائز ہے، جیسا کہ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳/۷۹۶)۔

شرکت عنان میں نہ تو مال میں مساوات شرط ہے اور نہ ہی کام میں اس لئے ہو سکتا ہے کہ شرکاء میں سے ایک کا مال دوسرے سے زیادہ ہو، مال کی کمی بیشی کے باوجود اگر ان لوگوں نے طے کر لیا کہ نفع میں برابر رہیں گے اس کی بھی گنجائش ہے، نفع ان کے درمیان ان کی طے شدہ شرط کے مطابق تقسیم ہوگا، البتہ خسارہ رأس المال کے حساب سے ہوگا، اس لئے کہ قاعدہ ہے: الربح علی ما شرطنا والوضیعة علی قدر المالین (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳/۷۹۷)۔

۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے سرمایہ سے شروع کیا لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا تو اس صورت میں کاروبار کا مالک تنہا لڑکا ہوگا، محض والد کو دوکان پر بٹھانا یا والد کے نام پر دوکان کا نام رکھنا والد کے کاروبار میں شریک ہونے کی بنیاد نہیں بن سکتا، کیونکہ شرکت نام ہے و شرکاء کے درمیان ایسے معاہدہ کا جو رأس المال اور رخ میں کیا جائے۔

قالت الحنفیة: الشركة عبارة عن عقد بین المتشاکین فی رأس المال والربح (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۲۹۷)۔

۴- اس صورت حال میں دوسرے بھائیوں کے الگ کسب معاش کے ذرائع اپنانے کی صورتیں متعدد ہیں:

۱- والد نے پیسوں کا بندوبست کر کے لڑکے کو کمانے کے لئے باہر بھیجا، جیسے آجکل بہت سارے باپ اپنے لڑکوں کو ملک میں معاشی پریشانی کی وجہ سے دوسرے ملک بھیجتے ہیں اور اس کے لئے لمبا خرچ برداشت کرتے ہیں ان کی ساری ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں تو ایسی صورت میں کھانا پینا جب تک ایک ساتھ ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ لڑکا باپ کے ماتحت ہے اور اس کی آمدنی باپ کی ملک ہوگی اور وہ باپ کا معاون سمجھا جائے گا وہ اپنی کمائی کا تنہا مالک نہیں ہوگا، البتہ اتنی سہولت ضرور ہونی چاہئے کہ باپ بھی اس کی ذاتی ضروریات میں توسیع برتے اور ایک ایک پیسہ کا حساب نہ لے، البتہ اس صورت میں جب وہ اپنا کھانا پینا الگ کرے اور باقاعدہ الگ ہونے کا اظہار کر دے تو اس کے بعد وہ الگ مانا جائے گا اور اپنی کمائی کا وہ خود مالک ہوگا۔

۵- مفتی دارالعلوم مئو۔

۲- کسب معاش کا الگ ذریعہ اپنانے کی دوسری شکل یہ ہے کہ کچھ بھائی یا کوئی لڑکا باپ کے کاروبار سے الگ اپنا کاروبار کرتا ہو اور کھانا پینا، رہنا سہنا باپ کے ساتھ ہو تو اس صورت میں اگر کاروبار میں لگی ہوئی پونجی باپ نے نہیں فراہم کی ہے لڑکے نے خود کہیں سے حاصل کیا ہے تو اس صورت حال میں وہ اپنی کمائی کا خود مالک ہے اور کھانے پینے کے خرچ میں معاہدہ کے مطابق حصہ دار ہوگا، البتہ اگر پونجی باپ نے فراہم کی ہے تو وہ کاروبار بھی باپ کا مانا جائے گا اور ساری کمائی باپ کی ہوگی۔

۳- کسب معاش کا الگ ذریعہ اپنانے کی تیسری شکل یہ ہے کہ کسی لڑکے کا کھانا پینا باپ کے ساتھ ہو اور وہ باقاعدہ کسی سرکاری یا پرائیویٹ ادارہ میں ملازم ہو تو جب تک کھانا پینا مشترک ہے اس کی کمائی بھی مشترک ہے اپنی آمدنی کا وہ تنہا مالک نہیں ہے، مذکورہ صورت حال کی سب سے بڑی نزاکت یہ ہے کہ باپ کے ساتھ ہاتھ بٹانے والے لڑکے کے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ یعنی زمین جائداد نہیں بنایا، اپنی ساری تو انائی باپ کی معاونت میں صرف کی، اور باپ کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ میں وہ لڑکے بھی اپنے مکمل استحقاق کا دعویٰ کریں گے جنہوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اپنائے اور الگ سے سرمایہ اور جائداد بنائی، یہ لڑکا باپ کے انتقال کے بعد یہ محسوس کر سکتا ہے کہ باپ کے ساتھ رہ کر اور باپ کا تعاون کر کے مجھے مالی خسارہ ہوا ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس لڑکے کو خسارہ سے بچانے کے لئے الگ سے کچھ عطیہ اور حصہ کر دے باپ اگر پہلے ہی سے ایسا کوئی بندوبست کرے تو اچھا ہوگا، باپ کے اس عمل کو حق الخدمۃ اور صلہ رحمی پر محمول کیا جائے گا، نا انصافی اور عدم مساوات پر محمول کرنا مناسب ہوگا۔

۵- اگر کسی وجہ سے باپ کا کاروبار ختم ہو گیا لیکن کاروبار کی جگہ خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو موجودہ اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا تو وہ کاروبار اس لڑکے کی ملک ہوگا، دوسرے بھائی اس میں حصہ کی دعویٰ داری نہیں کر سکتے، کیونکہ شرکت ثابت ہونے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ موجود نہیں۔

قالت الحنفیة: الشركة عبارة عن عقد بين المتشاركين في رأس المال والربح (الفقه الاسلامی وادلتہ ۴/۷۹۴)۔

اسی طرح باپ بھی اس کاروبار کا مالک نہ ہوگا کیونکہ اس کی شرکت بھی معدوم ہے ہاں اتنا ہو سکتا ہے کہ کاروبار کی جگہ اگر باپ کی ملک ہو تو بیٹے سے اس کا کرایہ لینے کا حقدار ہے اور اگر وہ جگہ کرایہ پر حاصل کی گئی ہو تو کاروبار کرنے والا بیٹا کرایہ داری کا مسئلہ اصل مالک سے طے کرے گا باپ کے انتقال کے بعد مملوکہ ہونے کی صورت میں دوسرے لڑکے بھی کرایہ میں شریک ہوں گے، یعنی کاروبار کرنے والے لڑکے کو باپ کی مملوکہ دکان کا کرایہ اپنے بھائیوں کے حصہ کے مطابق نہیں ادا کرنا ہوگا۔

## والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت

مولانا سلطان احمد اصلاحی <sup>ط</sup>

اس سوالنامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں میں مروجہ ”مشترکہ خاندانی نظام“ (Joint Family System) کے سلسلے میں ابھی بھی ہمارے علماء کرام کا ذہن صاف نہیں ہے، یہ خالص ہندوانہ نظام ہے اور کامرس اور تجارت سے متعلق کتابوں میں اس کا تذکرہ اسی حیثیت سے ہے، آخری محمدی شریعت کے لحاظ سے یہ پورا نظام نظر ثانی کے قابل ہے، اس لئے سوالنامہ میں قائم کردہ سوالات سے آزاد ہو کر ہم اس مسئلہ کی الگ سے تفتیح کرتے ہیں جس سے ان سوالات کے جوابات اپنے آپ فراہم ہو جائیں گے۔

۱- اولاد کے بالغ اور شادی شدہ ہو جانے کے بعد ان کی علیحدہ رہائش کے ساتھ ان کے مالی معاملات بھی بالکل الگ اور آزاد ہو جانے چاہئیں، اولاد کے اوپر باپ کا حق ہے کہ ضرورت مند ہونے پر جسمانی خدمت کے ساتھ وہ اس کی مالی ضرورتوں کی تکمیل پر دھیان دے، عام حالات میں آدمی کو اپنے کسی قریبی عزیز کے یہاں بھی ملازمت نہیں کرنی چاہئے، چہ جائیکہ باپ بیٹے کو یا بیٹا باپ کو اپنے یہاں ملازم رکھے، حدیث کی رو سے اولاد اور اس کا مال سب اسی کے باپ کا ہے، ”أنت و مالک لآبیک“، اسی صورت میں کاروبار میں شرکت کی صورت میں بیٹا کس بنیاد پر باپ کا ہاتھ پکڑے گا اور اسی پر مالی قدغنائیں عائد کرے گا، حضرت عمر فاروقؓ اپنے بچوں کو ایک جگہ نہیں کھیلنے دیتے تھے اور ان کو الگ الگ رکھتے تھے کہ مبادا وہ ایک ساتھ کھیلنے میں لڑیں جھگڑیں اور قطع رحمی کے گناہ کے مرتکب ہوں، تو جب آپس میں بھائیوں کے معاملے میں بھی صلہ رحمی کے حوالہ سے اس ایثار کی ضرورت ہے، تو باپ کے ساتھ اولاد کا جو فاصلہ اور جو احترام ہونا چاہئے اس کا اندازہ اپنے آپ کیا جاسکتا ہے۔

۲- اس بناء پر باپ کی اپنے بیٹے کے ساتھ کاروبار میں صرف اسی صورت میں شرکت ہونی چاہئے جب کہ وہ اکلوتی اولاد ہوتا کہ باپ کے بعد وہ جائداد کا اکیلا مالک ہو، اور کئی بھائیوں کے ساتھ معاملات کے مشترک ہونے کے باعث جھگڑے اور نزاع کی جو صورتیں متوقع ہیں اس کا امکان کم سے کم رہے، یہ مطلب نہیں کہ پوری جائداد کا لڑکا اکیلا مالک ہو جائے اور بہن اور دیگر ورثہ کو باپ کے مرنے کے بعد کچھ نہ ملے، شریعت کے مطابق وراثت کا مسئلہ الگ سے حل کیا جائے اور ہندوستان جیسے ملکوں میں اس کے لئے درکار قانونی مخطوطات الگ سے فراہم کئے جائیں، لیکن بیٹے کے ساتھ باپ کی کاروبار میں شرکت یا معاونت اسی مخصوص صورت میں ہو جب کہ اولاد ذریعہ اکیلی ہو اور کاروبار کے حوالہ باپ اور بیٹے کے مابین نزاع اور کشمکش کا امکان کم سے کمتر ہو۔

۳- کئی بیٹے ہونے کی صورت میں شادی کے بعد ہر لڑکے کی الگ رہائش کے ساتھ کاروبار سمیت ہر ایک کے جملہ مالی معاملات علیحدہ اور ممتاز ہوں، آپ <sup>ط</sup> کی ازواج مطہرات کے مالی معاملات علیحدہ اور ممتاز تھے، چنانچہ ایک زوجہ مطہرہ کی طرف سے دوسری زوجہ مطہرہ کے پیالے کے توڑ دئے جانے کے بعد آپ <sup>ط</sup> کی طرف سے اس کا باقاعدہ تادان ادا کیا گیا تھا، حدیث و سیرت کے ذخیرے میں اس کی تفصیل ہے، تو جب ایک شخص کی کئی بیویوں کے مالی معاملات دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز ہونے چاہئیں تو ایک باپ کے کئی بیٹوں کے مالی معاملات کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط اور گڈمڈس بنیاد پر رکھا جاسکتا ہے، اس لئے ایک باپ کے کئی جوان بیٹوں کے کاروبار اور مالی معاملات بالکل ممتاز اور آزاد ہونے چاہئیں، باپ اپنے تجربے اور نگرانی سے اگر ان میں کسی کو یا سب کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو یہ اس کا اپنا

ط ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ۔



فیصلہ ہو سکتا ہے، اولاد کی طرف سے اس کی مرضی کے علی الرغم کاروبار میں معاونت کا باپ کو پابند نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

۴- باپ کا اپنا جو قائم کردہ کاروبار ہے وہ اس کا ہے، جس سے وہ اپنی نابالغ اور کمسن اولاد اور اپنی بیوی/ بیویوں کے علاوہ اپنی تفصیل کے مطابق اپنی بالغ اولاد نرینہ اور بالغ شادی شدہ بچیوں پر خرچ کرے گا، اس کی زندگی میں اس کی نرینہ اولاد اس کے کاروبار اور جائداد میں حصہ کی دعویٰ نہیں ہو سکتی، باپ سے بڑھ کر اپنی اولاد کا دوسرا کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا لیکن ہندوستان کے اس ہندو اہل عرف سے مسلمان معاشرے کو بچانے کی ضرورت ہے کہ باپ کی بڑی اولاد اس کی زندگی میں ہی جائداد اور کاروبار کی دعویٰ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں باپ کو معطل کر کے جملہ اختیارات کی خود مالک بن جاتی ہے، اس لئے جو ان اولاد اگر باپ کو کمانے سے فارغ نہ کر سکے اور وہ اپنی مصلحتوں کے تحت اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کا فیصلہ کئے ہوئے ہو تو باپ کے کاروبار کو خالص اس کا کاروبار مانا جائے، اولاد اس کی زندگی میں اس کے اوپر اپنی مرضی مسلط نہ کرے۔

۵- باپ اپنی گنجائش کے مطابق اپنی اولاد لڑکے/ لڑکی کو دین و دنیا کی تعلیم دلائے، اسی طرح اس کی گنجائش بنے تو کاروبار میں کھڑا کرنے کے لئے اپنی اولاد کی مدد کرے، البتہ ان تمام معاملات میں اس کو اس کا دھیان رکھنا چاہئے کہ اس کا طریقہ اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف کا رہے، اس مہم میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی ایک بچے پر نسبت زیادہ خرچ ہو جائے اور دوسرے پر اس سے کم خرچ ہو، گھر کے اندر اعتماد اور تسامح کا ماحول ہو تو اس سلسلے کی امکانی ناہمواریوں اور نا برابر یوں کے مسئلہ کو آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے، باپ کی یہ ذمہ داری اپنی جگہ رہتی ہے کہ اس کی طرف سے دانستہ اپنے کسی بچے/ بچی کے ساتھ بے انصافی اور جانبداری کا معاملہ نہ ہو۔

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت کا مسئلہ

مولانا خورشید انور اعظمی علیہ

ہمارے معاشرے میں عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ لڑکے بڑے ہو جانے کے بعد بھی اپنے والد کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے کاروبار میں پورے طور پر معاونت کرتے ہیں، اس کاروبار کو اپنا کاروبار تصور کرتے ہیں اور حسب استطاعت اس کو ترقی دینے کی سعی کرتے ہیں، والد ان کی جملہ ضروریات کی مکمل کفالت کرتا ہے اور جب تک حالات خوشگوار رہتے ہیں وہ یہی چاہتا ہے کہ یہ مشترکہ نظام برقرار رہے، لیکن والد کے انتقال کے بعد جب کبھی اس کاروبار کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو بڑے لڑکوں کا یہ احساس ہوتا ہے کہ کاروبار میں چھوٹے بھائیوں کی نسبت ان کا تعاون زیادہ رہا ہے، اس لئے اسی تناسب سے انہیں زیادہ کا حقدار بھی ہونا چاہئے، پھر جب تمام بھائیوں میں اس کی مساویانہ تقسیم کی بات ہوتی ہے تو ان کے احساس کو ٹھیس لگتی ہے، اور اس میں اپنی حق تلفی محسوس کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں بھائیوں کے درمیان فاصلے بڑھنے لگتے ہیں، اور کبھی کبھی ایسی نزاعی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ماضی کے تمام تعلقات پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں، فقہاء کرام نے اس مسئلے کی مختلف صورتیں بیان کر کے ان کے احکام بتائے ہیں۔

۱- اگر صورت حال یہ ہے کہ والد کا اپنا کاروبار ہے، لڑکے اس کے شریک کار تو ہیں مگر لڑکوں نے اس میں الگ سے اپنا سرمایہ نہیں لگایا ہے تو یہ لڑکے باپ کے معاون تصور ہوں گے اور وہ کاروبار باپ کا ہوگا، اور ان کے بعد تمام بھائی اس کے برابر کے حقدار ہوں گے، ردالمحتار میں ہے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معيناله (رد المحتار/۵۰۲)۔

(باپ، بیٹا ایک صنعت میں کمائی کرتے ہیں اور ان دونوں کے پاس کچھ نہ ہو تو پوری کمائی باپ کی ہوگی، بشرطیکہ بیٹا باپ کی معاشی کفالت میں ہو، اس وجہ سے کہ بیٹا باپ کا معاون ہے)۔

مذکورہ بالا عبارت میں ”إن كان في عياله“ کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر لڑکا والد کے عیال میں نہ ہو، بلکہ اس کے کھانے پینے کا نظم علیحدہ ہو اور والد کے کاروبار میں بحیثیت معاون شریک کار ہو تو اس کی نوعیت بدل جائے گی اور جس طرح عقد فاسد میں معاون اجر مثل کا مستحق ہوتا ہے یہ لڑکا بھی اجر مثل کا مستحق ہوگا، البسوط للشرخی میں ہے:

”فإن احتطب أحدهما وأعانه الآخر فله أجر مثله على الذي احتطب لأنه استوفى منافعه بحكم عقد فاسد فيلزمه أجر مثله“ (البسوط ۱۱/۲۱۶)۔

(اگر ایک آدمی نے لکڑی چٹی اور دوسرے نے اس کی اعانت کی تو اس کو اس کی چٹی ہوئی لکڑی پر اجر مثل ملے گا، اس وجہ سے کہ اس نے اس کے منافع عقد فاسد کے سبب حاصل کئے ہیں، لہذا اس کو اجر مثل لازم ہوگا)۔

عالمگیری میں ہے:

”فإن عمل أحدهما وأعانه الآخر في جميع ما أخذه كان للمعين أجر المثل“ (عالمگیری ۳/۶۲۵)۔

(اگر ایک آدمی نے کام کیا اور دوسرے اس تمام حاصل شدہ شے میں اس کی اعانت کی تو معین کو اجر مثل ملے گا)۔

مصدر مدرس جامعہ مظہر العلوم، بنارس۔

۲- اگر والد کا اپنا کاروبار ہے اور لڑکے اس میں شریک کار ہیں، مگر والد کی اجازت سے انہوں نے اس میں اپنا سرمایہ بھی لگایا ہے تو دیکھا جائے گا کہ انہوں نے اگر اپنا سرمایہ بغیر کسی معاہدہ کے لگایا ہے تو یہ ایک طرح کا تعاون ہوگا ورنہ حسب معاہدہ اس کاروبار کے حقدار ہوں گے، مبسوط میں ہے:

”إن الاستحقاق بعد صحة العقد بالشرط لا بنفس العمل“ (المبسوط للسرخسی ۱۱/۱۵۸)۔  
(صحت عقد کے بعد استحقاق کا ثبوت شرط سے ہوتا ہے نہ کہ نفس عمل سے)۔

اسی طرح المبسوط میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ دو مال باہم ملا دینے سے شرکت فی الملک ثابت ہو جاتی ہے:

”فإذا خلطا المالین علی وجه لا یمكن یتمیز أحدهما عن الآخر فقد ثبتت الشركة فی الملک فیبنی علیہ شركة العقد“ (المبسوط ۱۱/۱۵۲)۔

(اگر دو آدمی نے اپنے مال کو اس طرح ملا لیا کہ ایک کی دوسرے سے تمیز ممکن نہ ہو تو شرکت فی الملک ثابت ہو جائے گی، جس پر شرکت عقد کا مدار ہوگا)۔

اور شرکت ملک میں ہونے والے اضافے کے دونوں آدمی بقدر ملک حقدار ہوتے ہیں:

”ما یتولد من الزیادة یکون مشترکا بینہما بقدر الملک“ (المبسوط ۱۱/۱۵۱)۔

(اور اس میں کا اضافہ دونوں کے مابین بقدر ملک مشترک ہوگا)۔

۳- اگر لڑکا والد سے علیحدہ ہو، اور اس نے اپنے سرمایہ سے ایک کاروبار کر رکھا ہو، اور اس دکان پر اپنے والد کو بٹھاتا ہو یا ان کے نام پر اس دکان کا نام رکھ دیا ہو تو یہ کاروبار لڑکے کا ہوگا خواہ اس کے والد اس کے ساتھ ہی رہنے لگے ہوں، کیونکہ اس کاروبار میں صرف لڑکے کا سرمایہ لگا ہوا ہے، باپ کی ملکیت کا اس میں کچھ بھی دخل نہیں ہے، اس لئے یہاں شرکت کی کوئی بھی صورت موجود نہیں ہے نہ شرکت ملک اور نہ شرکت عقد، والد اپنے لڑکے کے اس کاروبار میں صرف ایک معاون ہے۔

۴- اگر تمام لڑکے اپنے والد کے ساتھ ہیں ان کے درمیان علیحدگی نہیں ہوئی ہے، اور ان میں سے بعض اپنے والد کے کاروبار میں شریک کار ہیں اور بعض نے دوسرے ذرائع معاش اختیار کر لئے ہیں تو وہ سارے لڑکے والد کے معاون ہوں گے اور سارا مال والد کا ہوگا، نیز والد کے انتقال کے بعد تمام لڑکے اس مال کے حقدار ہوں گے، شامی میں ہے:

”وفی الخانیة زوج بنیہ الخمسة فی دارہ وکلہم فی عیالہ واختلفوا فی المتاع فهو للآب وللبنین الثیاب التی علیہم لا غیر“ (شامی ۶/۵۰۲)۔

(فتاویٰ خانہ میں ہے کہ والد نے اپنے پانچ لڑکوں کی اپنے گھر میں شادی کی جب کہ وہ سب ان کی کفالت میں ہیں، پھر ان سبھوں کا سامان کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا تو وہ سامان والد کا ہوگا لڑکے صرف اپنے بدن کے کپڑے کے مالک ہوں گے)۔

۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ کی، موجود ہو، اور اسی لڑکے نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو یہ کاروبار لڑکے کا ہوگا اور وہ مملوکہ جگہ والد کی ہوگی، اور کرایہ کی دوکان کے سلسلے میں والد کی جانب سے ادا شدہ پیشگی رقم بھی والد کی ہوگی، اور تمام بھائی والد کے بعد اس کے حقدار ہوں گے۔



## والد کے کاروبار میں بیٹوں کی شرکت

مفتی عبدالرحیم قاسمی

۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا پھر اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو ایسے لڑکے والد کے معاون ہوں گے، فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: ”باپ بیٹے سب مل کر ایک ساتھ ایک ہی کاروبار کرتے ہوں، کھانا پینا بھی ساتھ ہو تو ساری کمائی باپ کی شمار ہوگی، باپ کی وفات کے بعد ترکہ ”للذکر مثل حظ الانثیین“ کے اصول پر تقسیم ہوگا۔“

شامی میں ہے: ”الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ“ (شامی ۳/۳۲۹ فصل شرکت فاسدہ) (باپ اور بیٹا دونوں ایک ہی کاروبار میں کما تے ہیں، علاحدہ کچھ نہیں تو سب کمائی باپ کی ہوگی اگر بیٹا اس کی عیال میں ہے، اس کا معاون مددگار ہونے کی وجہ سے)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے: ”باپ اور بیٹوں کی مشترک کاروبار کی صورت میں تمام ملکیت باپ کی شمار ہوتی ہے، لہذا باپ اپنی زندگی میں جو تصرف چاہے کر سکتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے تیسرے بیٹے کو بھی ترکہ میں برابر کا حصہ ملے گا۔“

۲- اس مسئلہ میں دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ لڑکوں نے اپنا سرمایہ کاروبار میں لگایا مگر یہ لڑکے باپ کے ساتھ ہی رہتے کھاتے ہیں، تو پورے مال کی ملکیت والد ہی کی ہوگی۔

شامی میں ہے: ”زوج بنیہ الخمسة فی دارہ وکلہم فی عیالہ واختلفوا فی المتاع فهو للأب وللبنین الثیاب اللتی علیہم لا غیر فإن قالوا ہم أو امرأته بعد موتہ ان هذا استفدناہ بعد موتہ فالقول لهم وإن أقروا أنه کان یوم موتہ فهو میراث من الأب“ (شامی ۳/۵۰)۔

(باپ نے پانچ لڑکوں کی شادی کر دی وہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہتے ہیں انہوں نے سامان میں اختلاف کیا تو وہ سب مال باپ کا ہے اور لڑکوں کے لئے صرف وہ کپڑے ہیں جو ان کے بدن پر ہیں، اگر وہ کہیں کہ یہ مال ہم نے والد کی موت کے بعد حاصل کیا ہے تو ان کی بات مانی جائے گی، اور اگر وہ اقرار کریں کہ میں والد کی موت کے وقت موجود تھا تو وہ مال باپ کی میراث میں شامل ہوگا)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لڑکا علاحدہ رہتا ہے، رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نظام الگ رکھتا ہے، لیکن اپنا سرمایہ لگا کر باپ کے کاروبار میں شریک ہو گیا تو اپنے سرمایہ و محنت کے بقدر مال کا وہ مالک ہوگا، چنانچہ احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: رحیم بخش کے دو بیٹے ہیں، کریم بخش اور دھنی بخش، دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں، کریم بخش جدائی کے ایک سال بعد باپ کے ساتھ شریک ہو گیا اس شرکت کو سولہ سال کا عرصہ گزر گیا، پھر رحیم بخش کی وفات ہو گئی، اب مرحوم کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

جواب: بوقت اشتراک دونوں کے اموال میں جو تناسب تھا اس کے مطابق ترکہ سے کریم بخش کے حصہ کا وہ مالک ہے باقی ترکہ سب وارثوں پر بقدر سهام تقسیم ہوگا (احسن الفتاویٰ ۶/۴۰۴)۔

فتاویٰ امارت شریعیہ میں ہے: اگر باپ و بیٹے کا سرمایہ مساوی و مشترک تھا، یا دونوں نے اپنی محنت سے سرمایہ جمع کر کے تجارت شروع کر دی اور دونوں کی

مساویانہ حیثیت تھی، تو اس تجارت کے اموال میں سے نصف مال لڑکے رمضان علی کو بطور ملکیت لینے کا حق ہے اور نصف مال متروکہ اس کے باپ کا ہے۔

(فتاویٰ امارت شرعیہ ۱/۲۱۳)۔

۳- لڑکا جب علاحدہ رہتا ہے، اس کا کاروبار بھی الگ ہے، جس کو اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا ہے، تو صرف دوکان پر والد کو بٹھانے سے ان کو شریک نہیں مانا جائے گا، بلکہ یہ شرکت فاسدہ کی ایک صورت ہوگی، جس میں والد اجر مثل کے مستحق ہوں گے، شامی میں ہے:

”الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين أو من أحدهما فحكم الولى أن الربح فيها للعامل كما علمت والثانية بقدر المال إلى قوله والثالثة لرب المال وللآخر أجر مثله“ (شامی ۳/۲۵۰)۔

(شرکت فاسدہ کی تین صورتیں ہیں: ۱- بغیر مال کے، ۲- دونوں جانب سے مال، ۳- ایک جانب سے مال۔ پہلی صورت میں نفع عامل کا ہے، دوسری صورت میں جس قدر جس کا مال ہے اتنا اس کو نفع ملے گا، تیسری صورت میں سرمایہ لگانے والے کو نفع ملے گا اور دوسرے کو اس کے مثل کام کی اجرت و مزدوری ملے گی)۔

۴- علاحدہ کاروبار کرنے والے لڑکے اگر پوری کمائی والد کو لا کر دیتے ہیں اور والد ہی ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں تو ان کا مال باپ کے مال میں مشترک ہوگا، اور اگر ان کے کھانے اور خرچ کے بعد مال والد لیتے ہیں اور باقی مال میں والد کوئی دخل نہیں رکھتے لڑکے اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں، یا جمع رکھتے ہیں تو اس کے مالک لڑکے ہی ہوں گے، کیونکہ ساتھ کھانے پینے خرچ کے مصارف لڑکوں نے والد کو ادا کر دیئے اور باقی ماندہ مال میں وہ خود مختار ہیں اس کا وہ خود حساب کتاب رکھیں گے، اور وہ خود اس کے مالک ہوں گے۔

”زوج امرأة وابنها اجتماعا في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب عليحدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التميز فأجاب بأنه بينهما سوية“ (شامی ۳/۲۳۹)۔

(عورت کا شوہر اور اس کا بیٹا ایک گھر میں رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک علاحدہ کماتا ہے وہ اپنی کمائی کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں، اس کا فرق و امتیاز اور برابری کا علم نہیں تو جواب یہ ہے کہ وہ مال ان کے درمیان برابر تقسیم ہوگا)۔

حضرت مفتی شفیع صاحب نے تحریر فرمایا ہے: جن حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ دوسرے وارث بھی ان میں شریک ہیں، انہوں نے غالباً شامی کی پوری عبارت پر غور نہیں فرمایا، کیونکہ وہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ سب بھائی مل کر باپ کے ساتھ کھانے اور کمانے دونوں میں شریک رہیں اور جو چیز خریدی جائے مشترک روپے سے خریدی جائے اور یہ تفاوت معلوم نہ ہو کہ کس کا حصہ کتنا ہے تو یہاں سب میں برابر تقسیم ہوتا ہے، ایک دوسری صورت بھی شامی نے لکھی ہے کہ بیٹے کا مال باپ ہی کی ملک ہوتا ہے مگر یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ دونوں ایک ہی صنعت میں شریک ہوں، اور بیٹا باپ ہی کے ساتھ کھانے پینے وغیرہ میں شریک ہو اور ظاہر ہے کہ صورت مذکورہ میں بروئے اقرار نامہ گل محمد شاہ کی ملک بالکل جداگانہ منفصل اور متمیز ہے، اور کسب میں صنعت واحدہ میں شرکت ہی نہیں، لہذا جن جانکادوں کو اقرار نامہ نے گل محمد شاہ کی خاص ملک قرار دیا ہے وہ شرعاً اسی کی ملک ہیں اور کسی کا ان میں حق نہیں (امداد المفتین/ص ۸۲۳)۔

۵- والد کا کاروبار ختم ہو گیا ان کی جگہ یا دوکان اگر مملوک تھی تو اس کی قیمت یا مالیت میں تمام وارثوں کا حصہ ہوگا، ان سے حاصل کر کے اگر کوئی اس میں کاروبار کرے تو وہ کاروبار خاص اس کی ملکیت ہوگی، وارثوں کا اس میں حصہ نہیں ہوگا، اگر والد نے دوکان یا جگہ کرایہ پر لے کر کاروبار شروع کیا اور والد کا کاروبار ختم ہونے کے بعد مالک سے جس نے وہ جگہ یا دوکان کرایہ پر حاصل کر لی وہ جگہ اس کی ہوگی، وہ اس میں جو کاروبار کرے گا وہ کاروبار بھی خاص اسی کا ہوگا، اس میں دیگر وارثوں کو دخل اندازی کا حق نہیں ہوگا۔

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مفتی جمیل احمد زیری

۱- والد کی زندگی میں ایسے لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہوگی، کیونکہ یہاں تو والد نے اپنا سرمایہ لگایا ہے، لیکن اگر والد نے سرے سے کوئی سرمایہ ہی نہ لگایا ہوتا، اور والد کے ساتھ رہتے ہوئے والد اور بیٹوں نے مل کر کوئی کاروبار کیا ہوتا تو اس صورت میں بھی بیٹے، والد کے معین ہی قرار دیے جاتے، سرمایہ لگانے کی صورت میں بدرجہ اولیٰ وہ معاون ہی ہوں گے، پارٹنر نہ ہوں گے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: ”أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للأب إذا كان الابن في عيال الاب لكونه معيئاً له ألا تری أنه لو غرس شجرة تكون للأب“ (۲/۲۲۹)۔  
یہی عبارت رد المحتار (۳/۳۸۳) پر بھی موجود ہے۔

والد کے مرنے کے بعد اگر بیٹے، والد کے کاروبار کو چلاتے رہے اور آگے بڑھاتے رہے تو اس صورت میں سب بیٹے آپس میں برابر کے شریک (پارٹنر) قرار دیئے جائیں گے۔

لوا اجتماع إخوة يعملون في شركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرائی (رد المحتار ۳/۲۸۲، ۲۷۰)۔

۲- اگر والد کے ساتھ بیٹوں نے بھی کاروبار میں سرمایہ لگایا ہو اور سب کا سرمایہ معلوم ہو کہ کس نے کتنا لگایا ہے تو ایسے بیٹوں کی حیثیت والد کے پارٹنر (شریک) کی ہوگی اور سرمایہ کی مقدار کے اعتبار سے شرکت مانی جائے گی۔  
اگر سرمایہ کی مقدار معلوم نہ ہو تب بھی بیٹے والد کے پارٹنر (شریک) ہی قرار دیئے جائیں گے لیکن اس صورت میں والد اور بیٹے برابر کے حصہ دار اور پارٹنر ہوں گے۔

نظيره ويؤخذ من هذا ما افتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتماعاً في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوى ولا التمييز فأجاب به بأنه بينهما سوية (رد المحتار ۳/۲۸۲)۔

۳- اس صورت میں کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، اگر والد کو دوکان پر بٹھایا اور والد محض ظاہر میں سرپرستی کے طور پر آکر بیٹھتے ہیں، کاروبار میں نہیں لگتے، تو باپ کی حیثیت محض تبرکاً سرپرستی کی ہوگی اور اگر بیٹے کے ساتھ کاروبار میں لگے رہتے ہیں تو ان کی حیثیت معاون کی ہوگی۔  
تبرکاً دوکان کے نام اپنے والد کے نام پر رکھنے سے بیٹے کی ملکیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور محض والد کا نام رکھ دینے سے والد کی ملکیت ثابت نہ ہوگی۔

۴- جن دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے ہیں، ان کے ان ذرائع کے اختیار کرنے میں اگر والد یا اس بھائی جس

مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نوادہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی۔



نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا ہے، کامالی یا اخلاقی تعاون حاصل رہا ہے، یعنی والد یا اس بھائی کی مرضی، اجازت، صراحت نہ سہی دلالت ہی سہی، یا ان کی کسی قسم کی مدد و اثر و رسوخ کے نتیجے میں دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کا کوئی اور ذریعہ اختیار کیا ہے، لہذا چونکہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی اور سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، اس لئے ان دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی، ان کی تنہا ملکیت نہ ہوگی، سارے بھائی کسی نہ کسی طور پر گھر کی معاشی و کاروباری ترقی میں ایک دوسرے کے معاون سمجھے جائیں گے۔

لیکن اگر دوسرے ذرائع اختیار کرنے والے بھائی یا بھائیوں کی، والد یا والد کے ساتھ کاروبار کرنے والے بھائی نے کسی قسم کی مالی یا اخلاقی مدد نہ کی ہو، بلکہ ایک طرح سے بے توجہی اور بے زاری کا اظہار کیا ہو اور ان بھائی یا بھائیوں نے اپنی محنت، جانفشانی، اپنے اثر و رسوخ اور اپنے دم پر قرض و ادھار لے کر کوئی دوسرا ذریعہ معاش اختیار کیا ہو اور اس میں وہ کامیاب ہو گیا تو ایسی صورت میں چونکہ آپسی تعاون مفقود ہے اس لئے وہ کمائی تنہا اسی کی ہوگی، کھانا پینا ایک ساتھ ہونے کے باوجود مشترک نہ سمجھی جائے گی۔

۵- جس نے سرمایہ لگا کر کاروبار شروع کیا اس کی ملکیت ہوگی، والد کی ملکیت نہ ہوگی۔

## بزنس میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مولانا خورشید احمد اعظمی

الشركة لغة: خلط النصيبين بحيث لا يتميز أحدهما (فتح القدير ۵/۳۷۶)۔

(شرکت کا لغوی معنی ہے، دو (یا زیادہ) حصوں کا اس طرح مل جانا کہ ان دونوں میں سے کوئی ممتاز نہ ہو)۔

وشرعا: عبارة عن عقد بين المتشاركين في الأصل والربح (در مختار ۶/۳۶۶)۔

اور شرعاً: اصل اور نفع میں شواہ کے مابین معاہدہ کا نام ہے۔

صاحب بدائع نے اصلاً اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں، شرکت لاء ملاک اور شرکت العقود، شرکت ملک سے مراد یہ ہے کہ کسی مال میں یا ملکیت میں شرکت ہو، خواہ وہ مال کسی بھی جائز طریقہ سے حاصل ہوا ہو، اور شرکت عقد سے مراد یہ ہے کہ کسی شے میں اشتراک آپس کے معاہدہ سے وجود میں آیا ہو۔

وركنها في شركة العين اختلاطهما، وفي العقد اللفظ المفيد له وشرط جوازها كون الواحد قابلاً للشركة (الدر المختار ۶/۳۶۶)۔

(اور ملکیت میں شرکت کی اساس ان دونوں (شرکاء) کا اختلاط یعنی شریک ہونا ہے، اور عقد میں اس کا رکن وہ لفظ ہے جو عقد کا فائدہ دے، اور شرکت کے جواز کی شرط معقود علیہ (یا ملکیت) کا شرکت کے قابل ہونا ہے)۔

۱- لہذا اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکے یا ان میں سے بعض والد کی خواہش پر یا خود ہی شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، اور والد سے کوئی معاہدہ بھی نہیں ہوا تو والد کے اس کاروبار میں ان کی حیثیت محض ایک معاون کی ہوگی، کیونکہ ارکان شرکت مفقود ہیں، والد کی وفات کے بعد اس متروکہ کاروبار میں وہ لڑکے جو شریک کار رہے اور وہ جنہوں نے والد کے ساتھ اس کاروبار میں شرکت نہیں کی، سب وراثت میں اپنے شرعی مستحق حصوں کے برابر حقدار ہوں گے، یہ اس صورت میں ہے جب کہ لڑکے باپ کے ساتھ ہی رہتے ہوں، ان کے عیال میں ہوں اور کھانا پینا والد کے ذمہ ہو۔

وقدمنا أن هذا ليس شركة مفاوضة ما لم يصرحا بلفظها أو بمقتضياتها مع استيفاء مشروطها. ثم هذا في غير الابن مع أبيه، لما في القنية: الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معيناً له (شامی ۶/۵۰۶)۔

(اور ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے کہ یہ شرکت مفاوضت نہیں ہوگی جب تک کہ دونوں اس کے لفظ یا اس کے مقتضیات کی صراحت نہ کریں شرائط کے پورا ہونے کے ساتھ، پھر یہ لڑکے کی باپ کے ساتھ شرکت کے علاوہ ہے بہ سبب اس کے جو قنیہ میں مذکور ہے کہ والد اور اس کا لڑکا کسی ایک صنعت میں کسب کرتے ہوں، اور ان دونوں کے پاس کچھ نہ ہو تو کمائی سب کی سب والد کی ہوگی اگر لڑکا اس کے عیال میں ہو، اس (لڑکے) کے اس (والد) کا معین و مددگار ہونے کی وجہ سے)۔

اور اگر لڑکا والد کے عیال میں نہیں ہے، الگ رہتا ہے، اپنا کرتا کھاتا ہے، اور اس نے والد کی خواہش یا اس کے کہنے پر اس کے کاروبار میں شرکت کیا تو وہ

ملر گونا تھ پور ہمو۔

اجر مثل کا مستحق ہوگا، جو والد کے ترکہ میں سے دیا جائے گا بعدہ بقیہ متروکہ میں یہ اپنی وراثت کا مستحق ہوگا۔

وما حصله أحدهما بإعانة صاحبه فله ولصاحبه أجر مثله (در مختار ۶/۵۰۲)۔

(اور جو کچھ حاصل کیا ان دونوں میں ایک نے اپنے ساتھی کی مدد سے تو سب اسی کا ہوگا اور اس کے معاون کے لئے اجر مثل ہے)۔

۲- اگر لڑکا والد کے عیال میں ہے اسی کے ساتھ اس کا کھانا پینا ہے، اور اس نے والد کی اجازت سے اپنا کچھ سرمایہ والد کے کاروبار میں لگایا اور اس کا شریک کار رہا تب بھی یہ والد کا معین و مددگار ہی سمجھا جائے گا، والد کے کاروبار میں شریک نہیں مانا جائے گا۔

اور اگر والد کے عیال میں نہیں ہے، اپنا الگ کرتا کھاتا ہے، اور اس نے والد کی اجازت یا اس کی درخواست پر اپنا سرمایہ لگا کر باپ کے کاروبار میں شرکت کیا، تو اپنے سرمایہ کے تناسب سے کاروبار اور اس کے نفع میں شریک مانا جائے گا، اگرچہ دونوں کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو، کیونکہ اس کا الگ رہنا اور والد کی اجازت سے اپنا سرمایہ لگا کر شریک ہونا مقتضیات شرکت سے ہے۔

۳- اگر لڑکا والد سے الگ رہتا ہے، اپنا کرتا کھاتا ہے، اور اس نے اپنے سرمایہ سے کام شروع کیا اور دوکان پر والد کو بٹھایا، یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو یہ کاروبار لڑکے کا ہوگا، اور والد کو دوکان پر بٹھایا ہے تو وہ اس کے معاون ہوں گے، اور اجر مثل کے مستحق ہوں گے۔

نیز اس صورت میں بھی یہی حکم ہوگا جب کہ لڑکا والد کے ساتھ رہتا ہو، اور ان کے ساتھ کھاتا پیتا ہو، کیونکہ کاروبار میں سرمایہ اس کا لگا ہے، اور وہ اس کی ملکیت ہے، یہ کاروبار والد کا ترکہ قرار نہیں پائے گا۔

۴- اس صورت میں جب کہ سارے لڑکے والد کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں، آپس میں تقسیم بھی نہیں ہوئی ہے، کچھ لڑکے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹارے ہیں، اور کچھ لڑکے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے ہیں، تو سارے لڑکوں کی کمائی مشترک سمجھی جائے گی، اور ان میں سے کسی کی کمائی بھی تنہا اس کی ملکیت نہیں ہوگی، اور عرفاً یہ سب کے سب باپ کے معاون سمجھے جائیں گے، اگرچہ بعض لڑکوں کی کمائی کا ذریعہ باپ کی صنعت و کاروبار کے علاوہ کوئی دوسرا ہو مگر چونکہ سب والد کے عیال میں ہے، اور سب کا کھانا پینا انہیں کے ساتھ ہے، اس لئے ان کا کاروبار الگ نہیں سمجھا جائے گا، جب تک کہ آپس میں تقسیم نہ ہو جائے، یا آپس میں کوئی معاہدہ ہو جائے۔

”فی الخانیة: زوج بنیہ الخمسة فی داره وکلهم فی عیالہ واختلفوا فی المتاع فهو للآب وللبنین الثیاب التي علیهم لا غیر، فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدنا بعد موته فالقول لهم وإن أقروا أنه كان یوم موته فهو میراث من الآب (شامی ۶/۵۰۲)۔“

(خانہ میں مذکور ہے: اپنے پانچوں لڑکوں کی شادی اپنے گھر میں کیا اور سب کے سب اسی کے عیال میں ہیں، اور انہوں نے سامان میں اختلاف کیا، تو وہ سب والد کے لئے ہوگا، اور لڑکوں کے لئے صرف وہ کپڑا ہوگا جو ان کے بدن پر ہے، اور اس کی بیوی یا وہ لوگ اگر کہیں کہ ہم نے ان کی وفات کے بعد حاصل کیا ہے تو ان کا قول مان لیا جائے گا اور اگر اقرار کریں کہ یہ سب مال ان کی وفات کے دن موجود تھا تو وہ والد کا ترکہ ہوگا۔

اس لئے اگر لڑکے باپ کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں، تو اگرچہ ان کی آمدنی کے ذرائع الگ الگ ہو، عرفاً وہ سب کے سب والد کے معاون سمجھے جائیں گے۔

۵- اگر والد کا کاروبار ختم ہو گیا، مگر کاروبار کی جگہ موجود ہے، اور اولاد میں سے کوئی اپنا سرمایہ لگا کر اسی جگہ سے کاروبار کر رہا ہے، اور اسی نام سے کر رہا ہے، تو یہ کاروبار اس لڑکے کی ملکیت ہوگی، اور مملوکہ جگہ والد کی ہوگی، یا دوکان کرایہ پر تھی اور اس کے لئے کچھ رقم پیشگی والد نے دیا تھا تو وہ رقم بھی والد کی ہوگی جس میں بقیہ اولاد شریک ہوں گے۔



## بچوں کی شرکت والد کے کاروبار میں - مسائل اور حل

مولانا ابوسفیان مفتاحی مدظلہ

والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، والد کی خواہش پر بعد کو اس کے بعض لڑکے والد کے شریک کار ہو گئے مگر ان بعض لڑکوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو اس صورت مسئولہ میں والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہوگی، چنانچہ شامی ج ۳ / ص ۳۸۳ میں ہے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لها شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معيناً له ألا تری لو غرس شجرة تكون للأب، وفي الخانية: زوج بنیه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کمائی تنہا باپ کی ہوگی اور اولاد سب محض باپ کے معاون ہوں گے، احسن الفتاویٰ ۶ / ۳۹۳ میں ہے: باپ اور بیٹوں کی مشترک کاروبار کی صورت میں تمام ملک باپ کی شمار ہوتی ہے، لہذا باپ اپنی زندگی میں جو تصرف چاہے کر سکتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی یہ تمام ملکیت از روئے شرع سب پر تقسیم ہوگی، معلوم ہوا کہ بیٹوں کی حیثیت باپ کے معاون کی ہوگی۔

فتاویٰ رحیمیہ ۶ / ۱۶۰ میں ہے: باپ بیٹے سب مل کر ایک ساتھ ایک ہی کاروبار کرتے ہوں کھانا پینا بھی ساتھ ہو تو ساری کمائی باپ کی شمار ہوگی، باپ کی وفات کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا تو لہذا کو مثل حظ الانثیین کے اصول پر تقسیم ہوگا (حوالہ شامی)۔

نیز ۹ / ۱۶۰ میں اس طرح ہے: باپ بیٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی ماہانہ تنخواہ اپنے والد کو حوالہ کر دیتا ہے تو اس صورت میں جمع شدہ رقم سے جو مکان، زمین وغیرہ خرید گیا ہے وہ سب باپ کی شمار ہوگی۔

(شامی ۳ / ۳۸۳ میں ہے: وفي الخانية زوج ابنيه الخمسة)۔

فتاویٰ رحیمیہ ۶ / ۱۶۰ میں ایک صورت یہ مذکور ہے: اور جو لڑکے باپ سے الگ ہو کر اپنا مستقل کاروبار کرتے ہوں کھانے پینے کا حساب بھی ان کا الگ ہو تو ان کی کمائی کے وہی مالک ہوں گے۔

نیز ۶ / ۱۵۹ میں ہے: زید کنوارے میں ہی والدین سے الگ رہتا ہے اور اس نے اپنی سمجھ اور کمائی سے زمین خریدی تھی تو اس کا وہ خود مالک ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں ایسے لڑکوں کی حیثیت باپ کے معاون کی ہوگی۔

۲۔ اگر بچوں نے کاروبار میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا تو اس صورت میں یہ بچے اپنے سرمایہ سے حاصل شدہ نفع یا خریدی ہوئی زمین و جائیداد وغیرہ کے خود مالک ہوں گے، لہذا یہ بچے اپنے سرمایہ کے بقدر مشترک سے الگ کر کے باپ کے سرمایہ سے حاصل شدہ نفع یا خریدی ہوئی زمین و جائیداد وغیرہ کی تقسیم میں تمام ورثہ کے ساتھ رہیں گے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں بچے اپنے سرمایہ کے بقدر خود مالک ہوں گے باپ کے معاون نہ ہوں گے، لہذا باپ کے مرنے

مدظلہ مدرسین جامعہ مفتاح العلوم متو۔

کے بعد ان بچوں کے سرمایہ کے بقدر کو الگ کر کے تمام ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

۳- صورت مسئولہ میں کہ کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو یا تبرک اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں شرعاً یہ کاروبار لڑکے ہی کی ملک شمار ہوگا، باپ کی نہیں، اس صورت میں باپ کی حیثیت محض تبرک کی ہوگی، رہا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھنا محض تبرک ہی کے لئے ہے مالک بنانا مقصود نہیں ہے، لہذا باپ کے مرنے کے بعد کاروبار مذکور باپ کی ملکیت میں شمار نہ ہوگا پس باپ کی جائیداد کے تقسیم میں یہ کاروبار اور اس کی آمدنی باپ کے ورثہ کے درمیان تقسیم نہ ہوگا۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں کاروبار لڑکے ہی کی ملک شمار ہوگا، لہذا باپ کے مرنے کے بعد بقیہ ورثہ کے درمیان یہ تقسیم نہ ہوگا۔

۴- صورت مسئولہ میں جس بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا تو وہ اپنے باپ کا معاون ہوگا اور یہ ظاہر ہے اور جن بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے اور کمائی آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا تو اس صورت میں ان دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی وہ تنہا ان کی ملکیت نہ ہوگی۔

چنانچہ فتاویٰ رحیمیہ ۱۵۹/۶ میں ہے: اگر زید والدین کے ساتھ رہتا تھا اور رہنا سہنا کھانا پینا ان کے ساتھ تھا اور ان کے ماتحت رہ کر کمائی ہوئی رقم سے زمین خریدی ہے تو وہ والد کی شمار ہوگی اور اس میں والد صاحب کے تمام ورثہ حقدار ہوں گے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ باپ کا ہاتھ بٹانے والا لڑکا باپ کا معاون ہوگا اور جن لڑکوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے تو والد کے ساتھ رہنے اور کھانے پینے کی وجہ سے ان کی کمائی والد کی شمار ہوگی تو باپ کے مرنے کے بعد ان کی کمائی میں والد کے تمام ورثہ حقدار ہوں گے۔

۵- صورت مسئولہ میں کہ کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا لیکن کاروبار کی جگہ چاہے مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو وہ موجود ہو اب اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار کو شروع کیا تو اگر وہ لڑکا باپ سے الگ تھا تو یہ کاروبار اسی کی ملکیت میں ہوگی اور اگر باپ کے ساتھ رہتا تھا کھاتا پیتا تھا تو یہ کاروبار باپ کی ملک شمار ہوگا۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں اگر لڑکا باپ سے الگ تھا تو یہ کاروبار اس کی ملک ہوگا، البتہ اس لڑکے کو اس کاروبار کی جگہ کا کرایہ دینا ہوگا یا معاوضہ سے خرید لے اور اگر باپ کے ساتھ رہتا کھاتا پیتا تھا تو یہ کاروبار باپ کی ملک شمار ہوگا۔

## کاروبار میں تعاون اور شرکت کی مختلف شکلیں

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ؒ

اسلام مشترکہ خاندان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، اسی لئے بلوغیت کے بعد نان و نفقہ والد کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے، صدقہ فطر اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس طرح کے دوسرے شرعی حقوق و احکام خود لڑکوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اس کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں میں عموماً مشترکہ خاندان کی جڑیں مضبوط، مستحکم اور گہری ہیں، اسی لئے یہاں ایک باپ کی اولاد ہی نہیں، دادا کی اولاد کو بھی ایک ساتھ زندگی گزارتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے، ان کا خانگی اور معاشی نظام ایک ساتھ ہوتا ہے، اور کبھی کبھی پشتہا پشت تک یہ معاملہ چلتا رہتا ہے، سماج میں بھائی کا بھائی سے جدا ہونا معیوب سمجھا جاتا ہے، اور بیٹا باپ سے الگ ہو جائے تو ایسے لڑکے کو ”ناخلف“ کہتے ہیں، لوگ ایک ساتھ رہنے کو فخر یہ بیان کرتے ہیں اور تغیر مزاج اور تغیر احوال کے باوجود جو لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں انہیں سماج میں عزت ملتی ہے، اور ایک قسم کا وقار حاصل ہوتا ہے۔

۱- اس صورت حال کی وجہ سے باپ کی جو معاش ہوتی ہے، لڑکا جب کمانے کے لائق ہوتا ہے تو حسب استطاعت و طاقت کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے، اس کا اپنا کوئی سرمایہ نہیں ہوتا اور معاملات طے کرنے، اجرت مقرر کرنے کا خیال بھی کبھی دل میں نہیں آتا، جو آمدنی ہوتی ہے، سب پر خرچ ہوتی ہے، اس صورت میں والد کے انتقال کے بعد پورا کاروبار وارثوں پر بقدر سہام شرعی تقسیم ہوگا اور والد کے ساتھ کام کرنے والوں کی حیثیت محض معاون کی ہوگی، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الأب والابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء، فالکسب کلہ للأب (۲/۲۲۹)  
(یعنی باپ بیٹے مل کر کاروبار کر رہے ہوں اور ان کے درمیان کوئی معاملہ طے نہ ہو تو پوری کمائی باپ کی ہوگی)۔

یہاں پر أنت ومالك لأبيك، فكلو من کسب أولادکم (ابوداؤد ۲/۲۹۸)، وإن أولادکم من کسبکم (ابن ماجہ، ابواب التجارات ۲/۱۶۵) ولد الرجل من کسبه (نسائی ۲/۱۵۸) جیسے فرمان رسول کی معنویت کو بھی دھیان میں رکھنا چاہئے۔

۲- البتہ اگر ایک یا کئی لڑکوں نے والد کی اجازت سے کاروبار میں اپنا سرمایہ بھی لگایا، تو اس صورت میں یہ معاملہ شرکت کا ہوگا اور جو شرائط طے ہوئے ہوں گے، ان پر عمل کرنا ضروری ہوگا، نفع و نقصان میں سب کی شرکت ہوگی اور ہر شریک اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے بقدر کاروبار کا مالک ہوگا۔ بدائع میں ہے:

إذا شرط الربح علی قدر المالین متساویا ومتفاضلا، فلا شئ أنه یجوز ویكون الربح بینهما علی الشرط، سواء شرط العمل علیهما أو علی أحدهما (بدائع ۶/۶۲)۔

(جب دو شرکاء نے اپنے مال کے بقدر، برابر یا زیادتی کے ساتھ نفع کی شرط پر معاملہ کیا تو یہ صورت جائز ہے، اور نفع کی تقسیم ہر دو کے درمیان شرط کے مطابق ہوگی، چاہے دونوں کے کام کرنے کی شرط ہو یا دونوں میں سے ایک کے کام کرنے کی ہو)۔

۳- عمل میں معاونت ہی کی ایک شکل یہ ہے کہ کاروبار تو لڑکے نے اپنا سرمایہ لگا کر کھڑا کیا، اور والد کی عظمت کے پیش نظر دوکان کا نام والد کے نام

ؒ نائب ناظم امارت شرعیہ، بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ۔



پر رکھا، والد مختلف اوقات میں دوکان پر بیٹھ کر کاروبار سنبھالتے بھی رہے، اس کے باوجود والد کی حیثیت حدیث رسول ﷺ الخراج بالضمآن (یعنی آمدنی اس کی ہوگی جو ضامن ہوگا) کے اصول پر محض معاون کی ہوگی، یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے اور اس باب میں اصول کا درجہ رکھتی ہے، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک شخص کے چند لڑکے ہیں، خاندان اور خانگی نظام مشترک ہے، چند لڑکے باپ کے ساتھ دوکان پر کام کرتے ہیں اور چند لڑکے دوسرے معاشی کاموں میں مشغول ہیں، سب کی آمدنی ایک ساتھ جمع ہوتی ہے اور سب کا کھانا پینا ایک ساتھ ہوتا ہے تو اس صورت میں باپ کے متروکہ جائیداد اور سارے بھائیوں کی جمع آمدنی مشترک ہوگی۔ دوسرے کام کرنے والے کی اپنی کمائی تنہا اس کی ملکیت نہیں قرار پائے گی، علامہ شامی نے شرکت فاسدہ کے ذیل میں اس صورت کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

قال في الخيرية: في زوج امرأة وابنها اجتماعا في دار واحدة وكل منها يكتسب علحده ويجمعان كسبها ولا يعلم التفاوت والتساوي ولا التمييز فأجاب بأنه بينهما على السوية۔

(فتاویٰ خیر یہ میں ہے کہ کسی عورت کا شوہر اور اس کا لڑکا ایک گھر میں رہائش پذیر ہے، الگ الگ کسب معاش کرتا ہے، اور ایک ساتھ جمع کرتا ہے، کمائی کی آمدنی کے برابر اور کم و بیش کا اندازہ نہیں ہے، تو اس صورت میں دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا)۔

اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر جمع شدہ رقم میں کمائی کا تناسب معلوم ہو تو ہر ایک کی آمدنی کے برابر تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ ”ولا يعلم التفاوت والتساوي ولا التمييز“ سے معلوم ہوتا ہے۔

۵- والد کا کاروبار کسی وجہ سے ختم ہو گیا، دوکان بند تھی، کسی لڑکے نے پرانے یا نئے نام سے اپنا سرمایہ لگا کر دوکان کو والد کی اجازت سے شروع کیا، تو اس صورت میں اس کی آمدنی الخراج بالضمآن کے اصول سے اس لڑکے کی ہوگی، جس نے اسے پھر سے جاری کیا ہے، اور اس صورت میں اس کے والد اور بھائیوں کی شرکت نہیں ہوگی، دوکان اگر کرایہ پر ہے تو اس کا کرایہ لڑکے کو ادا کرنا ہوگا۔

آج کل پوزیشن کی بھی مالیت ہوتی ہے، اس لئے اگر باپ نے وہ دوکان اس لڑکے کو ہبہ نہیں کیا ہے، صرف کاروبار کی اجازت دی ہے تو دوکان کی مالیت والد کی باقی رہے گی، اور اس کے انتقال کے بعد صرف دوکان کی پوزیشن کی جو قیمت ہوگی، اس میں سارے وارثوں کا حصہ ہوگا۔

## والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت

ڈاکٹر سید اسرار الحق سیبیلی ع

آج کل مسلم گھرانوں میں وراثت کے جھگڑے عام بات ہیں، خصوصاً جب والدین کے کاروبار میں کچھ لڑکے بھی شریک رہے ہوں، اور کاروبار میں شریک رہنے والوں میں بھی کوئی پانچ سال سے شریک رہا ہو، تو کوئی پندرہ، بیس سال سے، ایسی صورت میں وراثت کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہو جاتا ہے، اس کو حل کرنا علماء و ارباب افتاء کی ذمہ داری ہے، تاکہ مسلم خاندانوں میں اس پیچیدگی کے باعث تنازع کا مستقل حل نکل آئے۔

### ۱- والد کے کاروبار میں تعاون

والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد میں اس کے کچھ لڑکے بھی والد کی خواہش پر کاروبار میں شریک ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ کاروبار میں ان لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہوگی، کیوں کہ لڑکوں کا کاروبار میں سرمایہ نہیں ہے، اس لئے ان کو کاروبار میں شریک (Partner) نہیں سمجھا جاسکتا، اور ان سے ملازمت کی اجرت بھی طے نہیں کی گئی ہے، اس لئے ان کو اجیر بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، لہذا ان کی حیثیت معاون کی سمجھی جائے گی، جب کہ لڑکے باپ کے زیر کفالت تھے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”اب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لہما مال، فالکسب کلہ للاب إذا کان الابن فی عیال الاب، لکونہ معینا لہ، الا تری انه لو غرس شجرة تکون للاب“ (الفتاویٰ الہندیۃ ۲۲۹/۲ ط: مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

(باپ اور بیٹے دونوں ایک ہی فرم میں کام کرتے ہوں اور ان دونوں کا مال نہ لگا ہو، تو پوری کمائی باپ کی شمار ہوگی، جب کہ بیٹا باپ کی کفالت میں ہو، اس کے معاون ہونے کی وجہ سے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر اس نے درخت لگایا، ہوتا تو وہ باپ کا ہوتا)۔

### ۲- سرمایہ میں شراکت

مذکورہ صورت میں بچوں نے کاروبار میں شریک ہوتے ہوئے اپنا کچھ سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو، تو اس صورت میں وہ سرمایہ کے اتنے حصے میں شریک سمجھے جائیں گے، اور اپنے حصے کے تناسب سے نفع کے حق دار ہوں گے، جب کہ نفع کی کوئی خاص مقدار طے نہیں ہوئی تھی، فقہ کی اصطلاح میں اس شرکت کا نام شرکت عنان ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والمساواة فی رأس المال لیست بشرط...، فما کان من ربح فهو بینہما علی قدر رؤوس أموالہما، فإن کانا اشتراطاً التفاوت فیہ کتبناہ ذلک (الفتاویٰ الہندیۃ ۲۲۰/۲)۔

(اصل سرمایہ میں برابری (شرکت عنان میں) شرط نہیں ہے،...، تو جو نفع ہوگا، وہ ان کے درمیان ان کے سرمایہ کے تناسب کے حساب سے ہوگا، اگر ان دونوں نے نفع میں تفاوت کی شرط رکھی تو اس کو لکھ لیں)۔

### ۳- والد کے نام پر دوکان کا نام رکھنا

کسی لڑکے نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا ہو، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہو، یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو، ایسی صورت میں

ع لکچر گورنمنٹ جونیور کالج مظہر آباد، اے، پی۔

لڑکے کا کاروبار ہی سمجھا جائے گا، والد کو دوکان پر بٹھانے پر ان کی حیثیت معاون کی ہوگی، اور محض والد کے نام پر دوکان کا نام رکھنے سے والد کی ملکیت نہیں ہوگی، البتہ اگر دوکان کی رجسٹری میں مالکانہ حیثیت سے والد کا نام ہو تو دوکان کی عمارت میں والد کی ملکیت سمجھی جائے گی۔

### ۴- چند بھائیوں کا دوسرے ذرائع معاش اختیار کرنا

ایک بھائی نے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جب کہ جائداد آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی اور سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سب کے درمیان مشترک نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ ہر بھائی کی کمائی تنہا اس کی ملکیت شمار ہوگی، البتہ جس بھائی نے والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹایا اور اس نے تنخواہ نہیں لی، تو اس کو والد کے مال سے اجرت مثل ادا کی جائے گی، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو استاجر ابنه والمرأة ابنتها لخدمتهما في بيتها لم يجز. ولا يجب الأجر إذا خدم، إلا إذا كان حراً أو مكاتباً.  
كذا في الخلاصة (الفتاوى الهندية ۲/۲۲۵)۔

(اگر کسی مرد یا عورت نے اپنے بیٹے کو اپنے گھر میں خدمت کے لئے رکھا، تو یہ جائز نہیں، اور خدمت پر اجرت واجب نہیں ہوگی، مگر جیسا کہ بیٹا آزاد یا مکاتب ہو)۔

### ۵- ختم شدہ کاروبار کا اولاد کی طرف سے احیاء

کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ مملوکہ یا کرایہ والی موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ وہی کاروبار شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اسی لڑکے کی ملکیت سمجھی جائے گی، جس نے اپنے سرمایہ سے دوبارہ کاروبار شروع کیا ہے۔

### خلاصہ جوابات

- ۱- والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد میں اس کے کچھ لڑکے بھی والد کی خواہش پر کاروبار میں شریک ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ کاروبار میں ان لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہوئی۔
- ۲- بچوں نے کاروبار میں شریک ہوتے ہوئے والد کی اجازت سے اپنا کچھ سرمایہ بھی داخل کیا، تو اس صورت میں سرمایہ کے اتنے حصے میں وہ شریک (Partner) سمجھے جائیں گے، اور اپنے حصے کے تناسب سے نفع کے حق دار ہوں گے، جب کہ نفع کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں ہوئی تھی۔
- ۳- کسی لڑکے نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا، یا تبرکاً والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا، تو یہ کاروبار اسی لڑکے کا شمار ہوگا، محض والد کو بٹھانے یا اس کے نام پر دوکان کا نام رکھنے سے والد کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔
- ۴- ایک بھائی نے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، سب کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو دوسرے بھائیوں کی کمائی سب کے درمیان مشترک نہیں سمجھی جائے گی، ہر بھائی کی کمائی اس کی اپنی ملکیت ہوگی، البتہ جس بھائی نے والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹایا، اس کو والد کی جائداد سے اجرت مثل ادا کی جائے گی۔
- ۵- کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ موجود تھی، کسی لڑکے نے اسی جگہ اسی نام سے اپنا سرمایہ لگا کر وہی کاروبار شروع کیا، تو یہ کاروبار اسی لڑکے کی ملکیت سمجھی جائے گی۔



## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت کے مسائل

مولانا ابو بکر قاسمی

### ۱- والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت کا حکم

تجارت اور کاروبار میں عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنا سرمایہ لگا کر کاروبار شروع کرتا ہے کاروبار کے آغاز کے وقت اس کے بچے چھوٹے تھے، رفتہ رفتہ کاروبار بھی بڑھا اور بچے بھی بڑے ہوئے، پہلے بڑا لڑکا پھر یکے بعد دیگرے کئی لڑکے کاروبار میں والد کا ہاتھ بنانے لگے اور اس طرح کئی لڑکے والد کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو کر کام کرنے لگے، لیکن والد سے کوئی واضح معاملہ طے نہیں ہو پایا کہ کاروبار میں تعاون کرنے والے لڑکوں کی حیثیت ملازم کی ہوگی یا پارٹنر کی یا یہ صرف ان کی طرف سے والدین کا تعاون ہوگا؟ اور اس طرح والد کی زندگی میں کوئی لڑکا بیس سال تک باپ کی معاونت کرتا رہا اور کوئی دس سال تک اور کوئی پانچ سال تک، اور اسی کاروبار سے جائیدادیں بھی خریدی گئیں تو حضرات فقہاء کی صراحت کے مطابق اور دنیا کے رائج عرف کے مطابق پورا کاروبار باپ کا مانا جائے گا، اور لڑکوں کی حیثیت معاون کی ہوگی، لہذا والد کے انتقال کے بعد ہر لڑکے کو برابر ترکہ میں حصہ ملے گا، چنانچہ علامہ شامی نے شرکت فاسدہ کے ذیل میں یہ مسئلہ لکھا ہے:

الأب والابن یکستبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب (شامی ۲/۳۰۰، عالمگیری ۲/۲۲۹)۔  
(باپ اور بیٹے مل کر ایک کاروبار کر رہے ہوں اور کسی کا کوئی حصہ طے نہ ہو تو پوری کمائی باپ کی ہوگی)

حدیث پاک میں خود اولاد کو باپ کی کمائی کا ایک حصہ کہا گیا ہے: ”وان أولادکم من کسبکم“ (ترمذی کتاب الاحکام ۱/۱۰۰)۔

اسی حدیث میں یہ اضافہ بھی ہے: أنت ومالک لأبیک حدیث کا آخری لفظ ہے فکلوا من کسب أولادکم

(رواد ابو داؤد ۲/۳۹۸، باب الرجل یا کل من مال ولده)۔

۱۰ (بلاشبہ تمہاری اولادیں تمہاری کمائیوں میں سے ہیں) (ابن ماجہ ابواب التجارات ۲/۱۶۵)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: ولد الرجل من کسبه (ابوداؤد کتاب البیوع ۲/۳۹۷-۳۹۸، نسائی ۲/۱۱۸۵، ماجہ ۲/۱۵۵) (آدمی کا لڑکا اس کی کمائی کا ایک حصہ ہے)۔

لہذا باپ کے کاروبار میں معاونت کرنے والے لڑکے شرعاً کاروبار کے مالک نہ ہوں گے بلکہ باپ مالک ہوگا۔

### ۲- باپ کے کاروبار میں سرمایہ لگا کر شریک ہونے والی اولاد کا حکم

باپ نے کاروبار شروع کیا اور بیٹے کو بھی سرمایہ لگا کر اپنے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جانے کی اجازت دیدی جب دو شریکوں نے نفع کی تقسیم کے لئے مال شرکت کی مقدار کے اعتبار سے برابر سہا بریا کی زیادتی کی شرط لگائی تو یہ شرعاً جائز ہے اور نفع کی تقسیم شرط کے مطابق ہوگی، خواہ کام کی شرط دونوں شریک کے لئے ہو یا ایک کے لئے ہو، تو ایسی صورت میں پورے کاروبار کا باپ مالک نہ ہوگا، بلکہ کاروبار میں جس کا سرمایہ جس قدر لگا ہوا ہے وہ اس کاروبار میں اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کے بقدر حصہ کا مالک ہوگا، اور کاروبار کے حصہ کی تقسیم ہر ایک کے لگائے ہوئے سرمایہ کے بقدر ہوگی، یا بوقت شرکت نفع کا جو فی صد جس کے لئے طے ہو اس کے مطابق نفع کی تقسیم ہوگی،

”إذا شرط الربح علی قدر المالین متساویا أو متفاضلا فلا شئ أنه یجوز ویكون الربح بینهما علی الشرط

مدرسہ اسلامیہ شکر پور، در بھنگہ۔

سواء شرط العمل علیہما أو علی أحدہما“ (بدائۃ ۶/۶۲)۔

۳- کسی لڑکے کا اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کرنے اور باپ کو ساتھ رکھنے یا باپ کے نام پر دوکان کھولنے کا حکم اگر تجارت و کاروبار کسی لڑکے نے اپنا سرمایہ لگا کر کیا لیکن والد کو اپنے ساتھ دوکان پر بٹھایا یا تبرکاً والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا تو ایسی صورت میں کاروبار کا مالک وہی لڑکا ہوگا، جس نے کاروبار اپنا سرمایہ لگا کر شروع کیا ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

الخراج بالضممان (رواہ الترمذی عن عائشة وقال ہذا حدیث حسن صحیح ۱/۲۴۱، نسائی ۲/۱۸۸)۔  
(آمدنی اسی کو ملے گی جو ضامن ہوگا)

معنی الحدیث ضمان الأصل سبب الملك خراجہ (ابن ماجہ ابواب التجارات: ۲/۱۶۲، ابوداؤد: ۲/۳۹۵)۔

۴- تمام لڑکوں کا باپ کے ساتھ رہنا اور الگ الگ کاروبار کرنے کا حکم

اگر کسی شخص کے پاس چند لڑکے ہیں، سب لڑکوں کا کھانا پینا ایک ساتھ ہے، لیکن ایک لڑکا تو باپ کے ساتھ شریک ہو کر باپ کی معاونت کرتا ہے اور دوسرے لڑکے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے ہوئے ہیں مگر سب کی کمائی ایک ساتھ جمع ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں باپ کی املاک سے اور ہر ایک کے کاروبار کے منافع سے سب کو برابر حصہ ملے گا، چنانچہ علامہ شامی نے شرکت فاسدہ کے ذیل میں یہ مسئلہ لکھا ہے:

”قال فی الخیریۃ فی زوج امرأۃ وابنہا اجتماعا فی دار واحدة وكل منہما یکتسب علیحدۃ ویجمعان کسبہما ولا یعلم التفاوت والتساوی ولا التمییز فأجاب بأنه بینہما علی السویۃ“۔

(فتاویٰ خیریہ میں لکھا ہے کہ ایک عورت کا شوہر اور ایک لڑکا ایک گھر میں ایک ساتھ رہائش پذیر ہے اور ہر ایک علیحدہ کام کرتا ہے مگر کمائی ساتھ رکھتا ہے، اور کچھ معلوم نہیں کہ کس کی کمائی کتنی ہے، کم ہے یا زیادہ، یا برابر ہے یا ہر ایک کی کمائی علیحدہ ہے تو ایسی صورت میں مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ پوری آمدنی ان دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگی)

۵- کاروبار کے ختم ہونے کے بعد والد کے کاروبار کی جگہ میں لڑکے کے کاروبار کرنے کا حکم

والد نے کوئی کاروبار کیا مگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، البتہ کاروبار کی جگہ خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ والی ہو موجود ہے، اب اولاد میں سے کسی نے اس جگہ پر اپنا سرمایہ لگا کر دوبارہ کاروبار اسی نام سے شروع کیا تو ایسی صورت میں کاروبار کا مال لڑکا ہوگا، کیونکہ حدیث نبوی ہے:

الخراج بالضممان (رواہ ابوداؤد و مرفوعاً عن عائشۃ ۲/۳۹۵)۔ (جو شخص کسی چیز کا ضامن ہوگا وہی اس کے نفع کا بھی مالک ہوگا)۔

چونکہ لڑکے ہی نے اپنا سرمایہ اور پونجی لگا کر کاروبار کو از سر نو کھڑا کیا ہے اور وہی اپنا خون پسینہ لگا کر محنت کر رہا ہے، نیز اس جگہ کے کرایہ پر ہونے کی صورت میں وہی کرایہ بھر رہا ہے، لہذا اس کاروبار سے جو آمدنی ہو رہی ہے وہی اس کا مالک ہوگا، اگر اس کاروبار میں کوئی نقصان ہوگا تو اسے ہی سہنا پڑے گا، البتہ اگر وہ جگہ باپ کی مملوکہ ہے تو ایسی صورت میں اس پر لازم ہے کہ باپ کو اس جگہ کا مناسب کرایہ ادا کرے۔

## والد اور اولاد کے مابین کاروباری لین دین کا مسئلہ

مولانا اشتیاق احمد اعظمی ع

۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں بعض، اپنے والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے اس متروکہ کاروبار میں ایسے لڑکے شرعاً نہ تو پارٹنر سمجھے جائیں گے اور نہ ہی ملازم، بلکہ ان کی حیثیت باپ کے معاون کی ہوگی۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ (رد المحتار ۲/۲۹۲)۔

علامہ شامی نے بطور نظیر ایک جملہ تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ ہو: ألا لو غرس شجرة تکون للأب (رد المحتار ۲/۲۹۲)۔ معلوم ہوا کہ باپ کے ساتھ بود و باش کے ہوتے ہوئے جو کمائی بھی لڑکا کرے گا، وہ سب باپ کی ملکیت ہوگی، لڑکے کی اس میں شرکت نہیں مانی جائے گی۔

۲- مذکورہ بالا صورت میں لڑکوں نے باپ کے کام میں شریک ہوتے ہوئے اپنا کچھ سرمایہ بھی والد کی اجازت سے لگایا ہو تو ایسی صورت میں طے شدہ حصہ کے بقدر باپ کے کاروبار میں وہ شریک ہوں گے اور طے شدہ حصہ کے بقدر نفع کے مستحق ہوں گے، لڑکوں کی کاروبار میں شرکت، شرکت عنان کے قبیل کی ہوگی اور یہ شرکت (عنان) باتفاق فقہاء جائز ہے۔ شرکت عنان میں مال اور عمل میں تساوی کی شرط بھی نہیں ہے، اس لئے اگر کسی ایک شریک کا مال زائد بھی لگا ہو اور دونوں نے نفع میں تساوی طے کر لیا ہو، تو اس کی بھی پوری گنجائش موجود ہے، طے شدہ معاملہ کے مطابق، نفع میں دونوں شریک ہوں گے، ہاں، خسارہ میں دونوں کی شرکت، بقدر اس المال ہوگی، کیونکہ یہ شرعی ضابطہ موجود ہے:

الربح علی ما شَرَطَا والوضیعة علی قدر المالین (الفقه الاسلامی وادلتہ ۲/۴۹۲)۔

۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے سرمایہ سے شروع کیا، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا یا تمبر کا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا تو اس صورت میں کاروبار کا تنہا مالک لڑکا ہوگا، والد کو دوکان پر بیٹھانے یا والد کے نام پر دوکان کا نام رکھ دینے سے والد کاروبار میں شریک نہیں مانے جاسکتے، کیونکہ شرکت ایک ایسے عقد کا نام ہے، جو اس المال اور ربح میں بین المتشارکین طے کیا گیا ہو، اور یہاں یہ صورت بالکل مفقود ہے:

”الشركة عبارة عن عقد بین المتشارکین فی راس المال والربح“ (الفقه الاسلامی وادلتہ ۲/۴۹۲)۔

۴- اگر ایک بھائی نے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، جبکہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگ کھانے پینے میں شریک تھے۔ اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائیگی یا وہ تنہا ان کی ملک ہوگی؟

مذکورہ بالا صورت میں دوسرے بھائیوں کے کسب معاش کے الگ ذرائع کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱- استاذ حدیث و فقہ دارالعلوم منواتھ بھنجن، یوپی۔



الف - آج کل لوگ معاشی پریشانیوں کے باعث اپنے لڑکوں کو کسب معاش کے لئے پیسوں کا بندوبست کر کے غیر ممالک میں بھیجا کرتے ہیں، ایسے لڑکوں کا پورا خرچ باپ برداشت کرتے ہیں، کھانا پینا سب مشترک ہی رہتا ہے، تو ایسے حالات میں ایسے لڑکوں کی غیر ممالک میں کمائی پوری باپ کی ملک ہوگی، ایسے لڑکے باپ کے معاون مانے جائیں گے، وہ اپنی کمائی کے تنہا مالک نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنا خورد و نوش بالکل علیحدہ نہ کر لیں اور اس کا اظہار باپ سے نہ کر دیں، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اب وہ ساری کمائی کے خود ہی مالک ہوں گے۔

ب - کبھی علیحدہ کسب معاش اپنانے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ کچھ بھائی باپ کے کاروبار سے الگ اپنا کاروبار خود کرتے ہیں، لیکن کھانا پینا سب مشترک ہی ہوتا ہے، تو اس صورت میں ایسے لڑکے اپنی کمائی کے خود مالک ہوں گے، کھانے پینے میں طے شدہ معاملہ کے تحت وہ شریک ہوا کریں گے۔

ج - کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لڑکا باپ کے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہے، لیکن وہ باقاعدہ سرکاری یا پرائیویٹ ادارہ میں یا کمپنی میں ملازمت اختیار کئے ہوئے ہے، تو اس کی ساری تنخواہ اس کی اپنی ملک ہوگی، مشترک کھانا پینا ہے، تو خرچ میں شامل ہونا اس کی ذمہ داری ہے۔

جو لڑکا باپ کے ساتھ شریک کاررہا، اس نے الگ سے کوئی کمائی کا راستہ نہیں اپنایا، اور نہ ہی اس نے اپنی کوئی خاص جائداد بنائی وہ صرف باپ کی معاونت میں لگا رہا۔ تو باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنے کو مالی خسارہ میں محسوس کر سکتا ہے، کیونکہ باپ کے متروکہ مال میں اب وہ بھائی بھی استحقاق کا دعویٰ کریں گے، جن کے ذرائع کسب معاش علیحدہ تھے۔ ایسی صورت میں باپ کو اپنے ساتھ شریک لڑکے کو اس قسم کے خسارہ سے بچانے کے لئے اپنی زندگی ہی میں کچھ رقم یا جائداد الگ سے بہہ اور عطیہ کر کے قبضہ و دخل کروا دینا چاہئے، باپ کی طرف سے ایسا کوئی عمل شرعاً نا انصافی پر محمول نہیں ہوگا۔

۵ - اگر باپ کا کاروبار کسی وجہ سے ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اور اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا تو وہ کاروبار اسی لڑکے کی ملک ہوگا، دوسرے بھائیوں کو اس کاروبار میں کسی قسم کے استحقاق کے دعویٰ کا کوئی حق نہیں، کیونکہ اس کاروبار میں ان کی کوئی شرکت نہیں ہے:

فإن الشركة عبارة عن عقد بين المتشاركين في رأس المال والربح (الفقه الاسلامي وادلته ۴/۷۹۲)

ایسے ہی باپ کی بھی اس کاروبار میں کوئی شرکت نہیں ہوگی، ہاں کاروبار کی جگہ اگر باپ کی ملکیت ہے، تو اس کا کرایہ لے سکتا ہے، اور اگر کاروبار کی جگہ کرایہ پر لی گئی ہو، تو یہ لڑکا کرایہ کا مسئلہ، اصل مالک سے طے کرے گا، کاروبار کی جگہ اگر باپ کی ملک ہو، تو باپ کے انتقال کے بعد دوسرے بھائی بھی کرایہ لینے میں شریک ہوں گے۔

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

حافظ شیخ کلیم اللہ عمری

س (۱): اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا پھر اس کے بعض لڑکے والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے، ملازم، پارٹنر یا معاون؟

ج: مسئلہ صورت میں باپ اور بیٹوں کے درمیان کوئی اصول یا شرط طے نہ ہونے کی صورت میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ آپس میں صلح و اتفاق کے ساتھ شرکت عمل کا موزوں حصہ مقرر کر لیا جائے تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لا ضرر ولا ضرار (سنن ابن ماجہ ۲۳۴۰)۔

س (۲): اگر بچوں نے کاروبار میں شریک رہتے ہوئے اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

ج: اگر بچوں نے کاروبار میں شریک رہتے ہوئے اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو تو طے شدہ اصول و ضوابط کی روشنی میں اتنے حصے میں وہ شریک کاروبار سمجھے جائیں گے جتنا سرمایہ لگایا گیا تھا۔

س (۳): اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

ج: کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں وہ کاروبار اسی لڑکے کا ہوگا جس نے سرمایہ لگایا نہ کہ والد کا۔

س (۴): اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے جب کہ آپس میں (جائیداد) تقسیم نہیں ہوئی تھی سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائیگی یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟

ج: قال اللہ تعالیٰ: للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن (النساء) ترجمہ: مردوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے اور عورتوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے۔

مذکورہ آیت کی روشنی میں دوسرے بھائی اپنی کمائی کے تنہا مالک ہوں گے اس میں دوسرے بھائی شریک نہیں ہوں گے۔

س (۵): اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنے سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگی یا والد کی ملکیت میں؟

ج: مذکورہ جگہ اگر مملوکہ ہو تو اس جگہ کی شرعی تقسیم عمل میں آئیگی، اگر کرائے کی زمین ہو تو عرف عام کے مطابق اس کا تعامل ہوگا البتہ کاروبار اسی کا ہوگا جس نے سرمایہ لگایا اور شروع کیا نہ کہ والد کا۔

☆☆☆

## کاروباری معاملات میں باپ اور بیٹوں کی شرکت کا تعین

مولانا صدر الحسن قاسمی

- ۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا تو والد کے اس متروکہ کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے، پارٹنر کی؟ ملازم کی؟ یا معاون کی؟
- مذکورہ صورت حال میں لڑکوں کی شرکت والد کے ساتھ معاون کی ہے، اس لئے والد کا متروکہ اس کے تمام وارثوں پر تقسیم ہوگا۔
- ۲- اگر یہی صورت حال ہو، لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اس صورت میں چونکہ بچوں نے والد کی اجازت سے اپنا سرمایہ لگایا ہے، اس لئے ان کی حیثیت اپنے حصہ کے مطابق والد کے ساتھ کاروبار میں شریک یا پارٹنر کی ہوگی۔
- ۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا ہو، لیکن دکان پر اپنے والد کو بٹھایا، تو تیر کا اپنے والد کے نام پر دکان کا نام رکھا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟
- اس صورت میں کاروبار کا مالک لڑکا ہوگا، اور والد کی حیثیت معین و مددگار کی ہوگی۔
- ۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹھایا اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے جب کہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی۔
- اس صورت میں تمام کمائی کی ملکیت والد کی ہوگی اور بھائیوں کی حیثیت معاون کی ہوگی۔
- ۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجودہ اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگی یا والد کی؟
- مذکورہ صورت میں کاروبار کی ملکیت اس کی ہوگی جس نے اپنا سرمایہ لگایا ہے اور جگہ یا دکان کا کرایہ طے کر کے جو بھی کرایہ کی آمدنی ہوگی وہ والد کی ملکیت ہوگی۔
- مذکورہ بالا جوابات کی تائید اس سے ہوتی ہے جو خاص شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام رحمہ اللہ علیہ نے ایک مقدمہ کی سماعت میں فیصلہ فرمایا ہے، جس میں ایک اراضی کا تنازع تھا۔

”..... ایسی صورت میں ایک سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ حسب بیان جب کہ سبھی لڑکے باپ کے ساتھ رہا کرتے تھے اور بیٹوں نے کما کر آمدنی باپ کے حوالہ کی تو ایسی صورت میں جو اراضی باپ نے خریدی باپ کی ملک قرار پائیں گی یا نہیں؟ اس بارے میں جہاں تک عبارات فقہیہ پر میں نے غور کیا ہے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر ایسی صورت جہاں بیٹوں کی حیثیت کمائی کے معاملہ میں تابع محض اور معین کی ہو اور باپ اصل کمانے والا ہو ایسی صورت میں شرعی بیٹوں کی کمائی باپ کی ملک سمجھی جائے گی اور اگر بیٹے محض معین و تابع نہ ہوں وہاں ملکیت بیٹوں کی قائم رہے گی“ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”مجلہ بحث و نظر“ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۳ء ص ۹۱-۹۰)۔



## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت - اسلامی نقطہ نظر

مولانا محمد صادق مبارک پوری

ج ۱: ایسے لڑکے کی حیثیت معاون کی ہے، فتاویٰ شامی میں ہے:

الأب والإبن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب إن کان الإبن فی عیالہ لکونہ معیناً لہ ألا تری لو غرس شجرة تکون للأب (۲/۲۸۳ فصل فی الشركة الفاسدة، کتاب الشركة رشیدیہ، پاکستان)۔  
(باپ بیٹے ایک صنعت کے ذریعہ روزی کماتے ہیں اور ان دونوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، تو ساری کمائی باپ کی ہوگی، اگر بیٹا اپنے باپ کی عیال داری میں ہو کیوں کہ اس کی حیثیت معاون کی ہے کیا تم نہیں جانتے کہ اگر درخت لگایا تو باپ کی ملک ہوگا)

ج ۲: صورت مسئلہ میں اگر بچوں نے باپ سے شرکت کی بات طے کر کے اپنا سرمایہ لگایا ہے تو ایسے لڑکوں کی حیثیت پارٹنر کی ہوگی، جتنے نفع پر معاملہ طے ہوا ہے، اس کے حقدار ہوں گے۔

ج ۳: اس کاروبار و نفع کا مالک یہ لڑکا ہوگا، حدیث شریف میں ہے:

وکل واحد أحق بما لہ من والدہ وولده والناس أجمعین (السنن الکبریٰ للبیہقی ۴۹۰/۷، دارالکتب العلمیۃ بیروت)  
(ہر آدمی اپنی اولاد، اپنے والد اور تمام لوگوں سے زیادہ اپنے مال کا حق دار ہے)۔

ج ۴: سبھی بھائیوں کی کمائی والد کی حیات میں والد کی ملک ہوگی اور ان کے بعد سب بھائیوں کے درمیان مشترک تصور کی جائے گی۔  
مایہ ناز فقیہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

”وفی الخانیة: زوج بنیہ الخمسة فی دارہ وکلہم فی عیالہ واختلفوا فی المتاع فهو للأب وللبنین الثیاب التی علیہم لا غیر“ (۲/۲۸۳ رد المحتار فصل فی الشركة الفاسدة، کتاب الشركة، رشیدیہ پاکستان)۔

(خانہ میں ہے کہ باپ نے اپنے پانچ لڑکوں کی شادی اپنے گھر میں کی، اور سب کے سب اس کی عیال داری میں ہیں، تو اگر سامان کے سلسلہ میں اختلاف ہو تو وہ باپ کی ملک ہوگی، اور لڑکوں کی ملکیت میں صرف وہ کپڑے ہوں گے جو ان کے بدن پر ہوں)۔  
ج ۵: یہ کاروبار اس لڑکے کی ملک ہوگا، والد کی ملک نہیں ہوگا، علامہ علانی حنفی ”الدر المختار“ ۳/۸۲ میں لکھتے ہیں:

وفی الدر: ولا ینتحق الربح إلا یاجدی ثلث بمال أو عمل أو تقبل۔

(در مختار میں ہے کہ نفع کا مستحق تین چیزوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ ہوگا، مال یا کام یا شرکت تقبل کے ذریعہ)۔

ع۔ استاذ جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی۔

## کاروبار میں اولاد کی شرکت

مولانا ثار احمد گودھروی <sup>ط</sup>

- ۱- والد کا اپنی اولاد کو کاروبار میں کسی بھی قسم کی بغیر وضاحت داخل کرنا یہ والد کے لئے تعاون کا درجہ رکھے گا کیونکہ کاروبار میں شرکت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ باقاعدہ شرکت کا عقد کیا جائے اور شرکت کی تمام شرائط کو مد نظر رکھا جائے، اگر والد اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنا شریک بنانا چاہتے ہیں تو جتنی مقدار میں شریک بنانا چاہیں اتنی مقدار کے مال کا اس کو مالک بنا دیں اور نفع نقصان میں دونوں شریک ہو جائیں۔
- ۲- اگر والد نے اولاد کے ساتھ کسی بھی قسم کی وضاحت و صراحت نہیں کی اور نہ اولاد میں سے کسی نے بھی کسی قسم کا سرمایہ داخل کیا تو والد کے انتقال کے بعد سارا مال ورثہ کے درمیان بحیثیت میراث تقسیم کیا جائے گا۔
- ۳- اگر سرمایہ بیٹے کا ہے اور والد کو تبرکاً بٹھایا یا اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا تو اس صورت میں ساری کمائی بیٹے کی ہوگی کیونکہ تملیک میں نام وغیرہ کو دخل نہیں۔
- ۴- دوسرے بھائیوں کی کمائی ان کی اپنی ہوگی وہ میراث میں شامل نہ ہوگی۔
- ۵- اگر کسی بیٹے نے باپ کے کاروبار کے نام پر اپنا کاروبار شروع کیا اور سرمایہ ان کا اپنا ذاتی ہے اور باپ نے اجازت بھی دی ہو تو کمائی اس کی اپنی ہوگی باپ اس میں شریک نہیں ہوگا، البتہ جو چیزیں ان کے استعمال کی ہوں اس کا معاوضہ انہیں دیدیا جائے۔

☆☆☆

## کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

مولانا ریاض احمد قاسمی

سوال: ۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی حیثیت کیا ہوگی؟ پارٹنر کی، یا ملازم کی، یا معاون کی؟

جواب: ۱- صورت مذکورہ میں نہ تو کوئی معاملہ آپس میں طے ہوا، نہ عرف میں اس شرکت کو کوئی معاملہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے باپ کی خواہش پر اس کے کاروبار میں شریک ہونے والے لڑکے کی حیثیت معاون کی ہوگی اور یہ اس کی طرف سے تبرع شمار کیا جائے گا۔ ہمارے یہاں کا عرف یہی ہے کہ باپ کی زندگی میں اگر اولاد باپ کے ساتھ ہو، تو وہ سب باپ کے معاون ہیں اور گھر کے تمام اثاثے، زمین و جائداد اور کاروبار کا مالک تنہا باپ ہی ہوتا ہے، جو اس کے مرنے کے بعد بھائیوں میں برابر تقسیم کیا جاتا ہے۔

سوال: ۲- اگر یہی صورت ہو، لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے وقت کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۲- اس صورت میں وہ اپنے حصہ کے بقدر کاروبار میں باپ کے ساتھ شریک اور پارٹنر ہوگا، لہذا اس کے سرمایہ لگانے سے پہلے کا جو سرمایہ تھا وہ باپ کا ہوا اور اس کے بعد لڑکے نے جو سرمایہ لگایا وہ اس کا ہوا، اب آگے اس کاروبار سے جو آمدنی ہوگی اور کاروبار جتنا ترقی کرے گا، اس میں اپنے اپنے سرمایے کے تناسب سے باپ بیٹا شریک ہوں گے، اور شرکت کے احکام جاری ہوں گے۔

سوال: ۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو، یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۳- اس کاروبار کا مالک تنہا وہ لڑکا ہوگا، جس نے اپنا سرمایہ لگا کر کاروبار شروع کیا ہے، اس کے والد اس کی خواہش پر اگر دوکان پر بیٹھ جائیں، تو یہ ان کی طرف سے تعاون ہے، بیٹے اور باپ میں اس طرح کا تعاون رائج ہے، اس لئے ان کی قانونی شرکت ثابت نہیں ہوگی۔

سوال: ۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا، اور دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے جب کہ آپس میں تقسیم اور علاحدگی نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی، یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟

جواب: ۴- صورت مذکورہ میں ”المعروف كالمشروط“ والا قاعدہ جاری ہوگا، اور عرف و عادت کو حکم بنایا جائے گا، بعض جگہوں میں عرف یہ ہے کہ کھانا پینا ساتھ ہے، اس کا خرچ سب مل کر اٹھاتے ہیں، اس کے بعد جس کے پاس جو رقم بچ جائے اس کا وہ تنہا مالک ہے۔ ایسی صورت میں ہر بھائی اپنی آمدنی کے بقیہ حصے کا مالک ہوگا اور باپ کا ہاتھ بٹانے والا بھائی بھی اپنے حق الحنت کا مالک ہوگا۔ اس کے بعد والد کا بقیہ سرمایہ

مولانا خاتون رحمانی موٹگیر۔



بھائیوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا؛ جبکہ بعض جگہوں کا عرف یہ ہے کہ تمام بھائیوں کی کمائی والد کے پاس یکجا ہوتی ہے، خواہ کسی کی کمائی کم ہو یا زیادہ، پھر مشورے سے، یا والد کے حکم سے کسی کام میں خرچ کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں بھائیوں کی کمائی سب کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی اور تمام بھائیوں کے درمیان کل اثاثہ برابر تقسیم کیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

سوال: ۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہو گیا، لیکن کاروبار کی جگہ (خواہ مملوکہ ہو یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو) موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگا یا والد کی؟

جواب: ۵- مذکورہ صورت میں کاروبار اس لڑکے کی ملکیت ہوگا، جس نے اپنے سرمایہ سے از سر نو کاروبار شروع کیا ہے، البتہ والد کو یہ حق ہوگا کہ چاہے تو اپنے اس لڑکے کو وہاں کاروبار کرنے دے، یا وہاں سے ہٹا دے، کیونکہ وہ جگہ اس کی ملکیت ہے یا اس کی طرف سے کرایہ پر لی ہوئی ہے، جس کا کرایہ دار قانوناً وہی ہے، اور اگر والد کا انتقال ہو جائے، تو یہ حق مملوکہ مکان کی صورت میں ورثہ کی طرف منتقل ہو جائے گا اور کرایہ پر ہونے کی صورت میں مالک مکان کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

## مسائل شرکت - فقہی نقطہ نظر سے

مفتی لطیف الرحمن ع

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ معاملات چاہے بھائیوں کے درمیان ہوں، باپ بیٹے کے درمیان ہوں، شوہر اور بیوی کے درمیان ہوں، وہ معاملات بالکل صاف اور بے غبار ہونے چاہئے، اور ملکیتیں آپس میں متعین ہونی چاہئیں کہ کونسی چیز باپ کی ملکیت ہے، کونسی چیز شوہر کی ملکیت ہے، ہم سے بنیادی غلطی ہو رہی ہے کہ شروع میں کوئی بات صاف نہیں ہوتی، مدت دراز تک کاروبار ویسے ہی چلتا رہتا ہے، اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ بیٹا باپ کے ساتھ جو کام کر رہا ہے وہ آیا شریک ہے، یا ملازم یا معاون، غرض بیٹے کی حیثیت متعین نہیں ہو پاتی، اور نہ باپ بیٹے کی حیثیت متعین کرتا ہے، اور نہ ہی بیٹا نیز متعین کرنے کو دونوں غیرت کے خلاف سمجھتے ہیں، پھر اچانک عرصہ دراز کے بعد سوالات پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں، اور ایک ہی گھر میں نہ جانے کتنے شکوک و شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں، اگر شروع میں حیثیت متعین ہو جاتی تو کوئی بھی سوال پیدا نہیں ہوتا، غرض ابتدا ہی سے بیٹے کی حیثیت متعین ہو جانی چاہئے۔

۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، پھر بیٹے بھی بغیر سرمایہ لگائے اس کاروبار میں شریک ہو گئے، تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں لڑکوں کی حیثیت ”معاون“ کی ہوگی۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: لما فی القینة: الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیء فالکسب کلہ للأب إن کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ، ألا تری لو غرس شجرة تکون للأب (۶/۳۹۲)، وهکذا فی فتاویٰ الہندیة، (۲/۳۲۹)۔

اسی طرح شرح المجملہ میں ہے: إذا عمل رجل فی صنعة هو وابنه الذی فی عیالہ فجمیع الکسب لذلك الرجل وولده یعد معینا لہ، قیدان احترازیان: الأول أن یكون الابن فی عیال الأب، الثانی، أن یعملا معًا فی صنعة واحدة إذ لو کان کل منهما صنعة یعمل فیها وحده، فرجحه (بجوالہ فتاویٰ محمودیہ ۱۲/۱۹۳، جدید ترتیب)۔

حضرت مفتی رشید احمد اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

باپ اور بیٹوں کے مشترک کاروبار کی صورت میں تمام ملک باپ کی شمار ہوتی ہے، لہذا باپ اپنی زندگی میں جو تصرف چاہے کر سکتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے تیسرے بیٹے کو بھی ترکہ میں برابر کا حصہ ملے گا (احسن الفتاویٰ ۶/۳۹۳)۔

فتاویٰ حقانیہ میں ہے: باپ اور بیٹے نے مشترک کاروبار سے جو پیسے کمائے ہیں، وہ باپ کی ملکیت شمار ہوں گے، کیونکہ بیٹا باپ کا معین اور مددگار ہوتا ہے، لہذا باپ اپنی زندگی میں اس میں جو بھی تصرف چاہے کر سکتا ہے (۳۳۶/۶)۔

کفایت المفتی میں ہے: بالغ اور نابالغ بچے جب کہ باپ کے کاروبار میں باپ کے ساتھ شریک رہیں یعنی کام کاج کرتے رہیں لیکن ان کی

مدارالافتاء چونا بھٹی مسجد شاننا کروڑ، ممبئی۔

محنت کا کوئی معاوضہ نہ مقرر کیا گیا ہو اور نہ کبھی اپنوں نے اس کا مطالبہ کیا ہو تو تمام آمدنی باپ کی ملک تصور ہوتی ہے اور اولاد اس کی معین و متبرع قرار دی جاتی ہے (۲۸۰/۸)۔

۲- صورت یہی ہو مگر بچوں نے کچھ سرمایہ بھی والد صاحب کی اجازت سے کاروبار میں لگایا ہے تو یہ شرکت عنان ہے تو اس المال کے بقدر بھی منافع تقسیم ہو سکتے ہیں، اور نفع میں کمی بیشی کی بھی اجازت ہوگی، غرض آپس میں جیسا معاہدہ ہوا، ہوا ہی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: إن شرط جوازها فكون رأس المال عينا حاضرًا أو غائبًا ويجوز التفاضل في الربح مع تساويهما في رأس المال كذا في محيط السرخسي (۲/۲۱۹)۔

فتاویٰ حقانیہ میں ہے: باپ بیٹے اپنے مشترکہ کاروبار سے جو روپے کمائے ہیں وہ باپ کی ملکیت شمار ہوں گے تاہم اگر اس المال دونوں کا مشترکہ ہو اور معاہدہ بھی یہی ہوا ہو تو منافع بھی دونوں میں مساوی تقسیم ہوگا (۳۳۶/۶)۔

۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے شروع کیا تو محض والد کے بیٹھنے سے یا تہر کا دوکان والد کے نام کرنے سے باپ مالک نہیں ہوگا بلکہ اس دوکان اور پورے سرمایہ کا مالک یہ لڑکا ہوگا۔

امداد الفتاویٰ میں ہے: کسی کے نام جائیداد خریدنے سے شرعاً اس کی ملک نہیں ہوتی، کیونکہ خریدنے کے قبل تو دوسرے کی ملک تھی غیر کی ملک میں تصرف ہبہ وغیرہ کا نافذ نہیں ہوتا اور بعد خریدنے کے کوئی عقد موجب انتقال نہیں پایا گیا اس بنا پر شرعاً وہ جائیداد خریدنے والے ہی کی ہے (۱۳۵/۳)۔

۴- صورت مسئلہ میں گرچہ دوسرے بھائیوں نے کسب معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کئے، لیکن آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، کھانا پینا ساتھ تھا، تو دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی، وہ لوگ تنہا اس کے مالک نہیں قرار دیے جائیں گے۔

فتاویٰ رحیمیہ کی عبارت ملاحظہ ہو: سوال: ایک شخص کے چار بیٹے ہیں سب ایک ساتھ رہتے ہیں اور سب شادی شدہ ہیں، چاروں بیٹے مختلف کام کرتے ہیں مشترکہ کاروبار نہیں ہے، البتہ سب اپنی اپنی تنخواہ اپنے والد کے حوالہ کرتے ہیں اور والد پورے گھر کا نظام چلاتے ہیں، والد صاحب نے ان پیسوں سے مختلف چیزیں بھی خریدی ہیں اور کچھ زمین اور مکان بھی خریدا ہے، سوال یہ ہے کہ زمین اور مکان کس کی شمار ہوگی؟ والد کی یا سب بیٹوں کی؟

جواب- باپ بیٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور ہر ایک اپنی ماہانہ تنخواہ اپنے والد کے حوالہ کر دیتا ہے تو اس صورت میں جمع شدہ رقم سے جو مکان، زمین وغیرہ خریدا گیا ہے وہ سب باپ کی شمار ہوگی، شامی میں ہے: وفي الخانية: زوج بنیه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب، وللبنين الثياب التي عليهم لا غيره (فتاویٰ رحیمیہ ۹/۱۸۵)، اب اگر دوسرے بھائی اپنی کمائی سے الگ کوئی جائیداد خریدتے ہیں تو یہ بھائی بھی اس میں برابر شریک ہوگا، گرچہ کسب علیحدہ ہے لیکن کھانا مشترک ہے اور عیال مشترک ہے۔

۵- اگر جگہ والد کی ہو خواہ کرایہ پر ہو یا مملوکہ ہو اور لڑکے نے اگر اپنے سرمایہ سے کاروبار دوبارہ شروع کیا تو اب یہ کاروبار لڑکے کی ملکیت ہوگی والد کا نہیں ہوگا، البتہ اگر یہ جگہ والد کی مملوکہ ہے تو اس کا کرایہ لڑکے کو مقرر کرنا ہوگا اور والد کو دینا ہوگا اور اگر کرایہ کی ہو تو اس کو از خود کرایہ ادا کرنا ہوگا۔

شامی میں ہے: المرأة مع زوجها إذ اجتمع بعملهما أموال كثيرة، فقیل هی للزوج وتكون المرأة معینة له إلا إذا كان لها كسب علی حدة فهو لها، وقیل بینها نصفان (۶/۲۹۲)۔



مناقشہ:

## والد کے کاروبار میں اولاد کی شرکت

مولانا زبیر بیاض صاحب (افریقہ)

ہمارے یہاں مزید ایک پیچیدگی یہ ہے کہ عورتوں کی شوہر کے ساتھ کاروبار میں شرکت قطع نظر اس سے کہ شرعاً یہ درست ہے یا نہیں ہے بعض وجوہات کی وجہ سے، تو یہ مسئلہ ہمارے یہاں کافی الجھا ہوا ہے کہ اس کو کچھ ملتا ہے یا نہیں۔ بعض دفعہ شوہر اس کو طلاق دیدیتا ہے اور وہ اپنے حصہ کا مطالبہ کرتی ہے تو کیا اس کو اس سے کچھ ملے یا نہ ملے، اس کے بارے میں بھی ہمارے یہاں کوئی پوری تحقیق نہیں ہوئی ہے، باقی اجرت کی جو بات کی جا رہی تھی، مجھے صحیح یاد نہیں ہے، جزئیہ عبارت، لیکن غالباً شامی میں اس کا ذکر ہے۔ اور علامہ شامی نے اس کو قبیل سے تعبیر کیا ہے، جس سے اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ مل رہا ہے تو یہ عرض کرنا تھا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ایک بات ابھی ذہن میں آگئی ہمارے مولانا مفتی عثمان صاحب کے سوال پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عام طور پر تو قیدیوں سے خدمت لینے کا ذکر نہیں ملتا ہے، لیکن اسیران بدر کے لیے جو آپ نے فدیہ مقرر کیا تو اس میں اس بات کی گنجائش رکھی کہ جو قیدی ہمارے دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے ان کے لیے یہی فدیہ ہوگا۔ تو گویا یہ ایک طرح کی بالواسطہ اجرت کی شکل ہوتی ہے، یعنی اس مسئلہ سے استدلال تو نہیں استیناس کیا جاسکتا ہے۔

مولانا زبیر احمد قاسمی

در اصل یہ جو مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اس کی بنیاد جو میری سمجھ میں آئی ہے میں اس بنیاد کو واضح کرتے ہوئے اس موضوع سے متعلق جو تجاویز منظور ہوگی وہ تو بعد کی بات ہے، لیکن چاہے اسے میری رائے کہی جائے یا میرا مشورہ کہا جائے یا میری تجویز مانی جائے۔ وہ یہ ہے کہ دراصل ان سارے اشکالات یا سارے تنازعات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کا وہ طرز عمل نہ بنا سکے جو طرز عمل ہمارے اسلاف کا تھا اور مزاج شریعت سے ہم آہنگ بھی تھا، بد قسمتی یہ ہے کہ اسی بنیاد پر یعنی مسئلہ کے گوگلو، صورت حال کو مجمل اور مبہم بنائے رکھنے کے نتیجے میں ہم کو بعض ایسے منصوص مسائل پر طنز اور تحقیر جیسے جملے سننے پڑتے ہیں، مثلاً یہ پوتے کی وراثت کی محرومی کا مسئلہ ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ہم یعنی ایک باپ بوڑھا ہونے کے باوجود، بیٹوں کے صاحب اولاد ہونے کے باوجود کس کی کیا پوزیشن ہے کیا حیثیت ہے اس کو واضح نہیں کر پاتے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے یا میری تجویز یہ ہے کہ ہم پورے ہال کی طرف سے، یا اکیڈمی کی طرف سے اس صورت حال کے ابہام کو پہلے دور کرنے کی تجویز رکھیں، مثلاً باپ ہے، ٹھیک ہے وہ بڑے ہوتے ہیں اپنی صورت حال کے مطابق کاروبار کرتے ہیں۔ ایک بیٹا کو پہلے وہ شریک کرتے ہیں دوسرے بیٹے بھی بوقت ضرورت اس میں شرکت کا معاملہ کرتے رہتے ہیں، لیکن جب وہ شادی شدہ ہو جائے، بالغ ہو جائے کم از کم صاحب اولاد ہو جائے تو اس کے بعد اس بوڑھے باپ کی ذمہ داری مانی جائے کہ ان کی حیثیت کو بالکل واضح کر دیا جائے، حیثیت کے واضح نہ ہونے کی بنیاد پر ساری کمائی عیال کے اندر مشترک ہونے کی بنیاد پر، ہم بوڑھے باپ صحیح حقیقت متعین نہیں کر پاتے اور اس کے نتیجے میں جب باپ کی موت ہوتی ہے تو بھائیوں کو

اپنے غرر فاحش کا احساس ہوتا ہے، کسی کے لیے نفع خالص کا احساس پیدا ہوتا ہے اور سارے جھگڑے کی بنیاد بن جاتی ہے، اس لیے میں یہ چاہوں گا کہ یہ تجویز عام طور پر ذہن سازی کے لیے اس کی اشاعت ہونی چاہئے کہ باپ کاروبار میں جس کو بھی شریک کرے، اس کی حیثیت کو واضح ضرور کر دے، کم از کم بلوغ یا صاحب اولاد ہونے کے بعد۔ انشاء اللہ یہ تنازعات نہیں پیدا ہوں گے۔

### مولانا عبدالرحیم صاحب کشمیری

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہمارے یہاں کشمیر میں دو تین صورتیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ عرض میں نہیں آیا ہے نہ سوالات میں۔ ایک تو صورت یہ ہے کہ باپ اپنی حیات میں کسی بیٹے کو یا بیٹی کو زبانی طور پر بطور ہبہ کوئی چیز اپنی وراثت میں سے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد میں سے دے دیتا ہے اور دیگر وراثت کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہ اس کو تسلیم کریں گے یا نہیں کریں گے۔ حالانکہ اس کے پاس اپنے طور پر شہادت بھی ہوتی ہے معلوم بھی ہوتا ہے، کہ اس نے مجھے بطور ہبہ مثلاً فلاں کمرہ یا فلاں جگہ..... تو اس کے بارے میں بھی کوئی وضاحت تجویز میں آ جانی چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب مکان وغیرہ مشترک بنتا ہے، اس موقع پر جو عورتیں ہوتی ہیں ان کا زیور بھی استعمال کیا جاتا ہے اس کے بارے میں بھی وضاحت نہیں ہوتی کہ یہ زیور کیسے لیا گیا، بطور قرض لیا گیا، بطور عاریت لیا گیا مکان بن جاتا ہے اور بعد میں جھگڑا رہ جاتا ہے، یہ مسئلہ بھی آنا چاہئے، میری اس سلسلہ میں گزارش ہے۔

### مفتی نذیر احمد کشمیری

معاشرتی زندگی میں جو صورت حال ہے اس کی بے شمار شکلیں ہیں اور ایسے اصول جو ہر ہر شکل پر منطبق ہو جائیں اس کا قائم کیا جانا بہت زیادہ ضروری ہے، عورتوں کے معاملہ میں جو تجویز مفتی عبدالرحیم صاحب نے عرض کی، واقعتاً یہ صورت حال ہمارے یہاں ہے اور اب تک اس سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا ہے اور ہم لوگوں کے سامنے جب یہ مسائل آتے ہیں تو الجھے رہتے ہیں، واضح طور پر کوئی حکم لکھ نہیں پاتے ہیں، کتابوں سے مکمل رہنمائی اس سلسلہ میں نہیں مل پاتی ہے تو اس سلسلہ میں، میں درخواست کروں گا کہ ہمارے باہر سے تشریف لائے ہوئے مہمان نے جو تجویز پیش کی تھی فقہ اکیڈمی کی طرف سے، کوئی رہنمائی کا اصول مستقلاً اگر سامنے آئے تو شاید یہ فقہ اکیڈمی کی روایت کے خلاف بھی نہیں ہوگا، اس سے پہلے بھی جب مہر کے مسئلہ میں تجویز دی گئی تھی کہ مسلمانوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ مہر جنس میں مقرر کریں، اسی طرح کی ایک تجویز، لیکن بہت زیادہ مفصل اور واضح ہو، تاکہ اس معاشرتی نزاع کے لیے رہنما حقوق پر مشتمل ایک واضح لائحہ عمل آجائے، اس کے نتیجے میں غالباً تمام دنیا میں کام کرنے والے ارباب افتاء کو بھی یہ سہولت ہوگی اور جو مسلمان ماہرین قانون ہیں، ان کو بھی اس کا موقع ملے گا کہ وہ معاشرتی زندگی میں یہ جو نزاعات ہیں اور نزاعات کی بناء پر لوگوں کی رقیب عدالتوں میں صرف ہو جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اس کا بھی حل نکل سکے۔

### مفتی مقصود احمد صاحب (راپور)

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اب تک جتنی صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صورت یہ ذکر نہیں کی گئی کہ اگر وہ لڑکا جس نے باپ کے ساتھ شرکت کی ہے ان کے کاروبار کو بڑھایا ہے، اس کا انتقال پہلے ہو جائے تو اس کے جو وارث ہیں ان کو ملے گا یا نہیں۔ فقہ کا جو قاعدہ ہے وہ تو یہ ہے کہ جس کا انتقال باپ کی موجودگی میں ہو جائے تو وہ لڑکا وراثت سے محروم ہو جاتا ہے یہ بات تو مسلم ہے، لیکن اس لڑکے نے اتنا کاروبار کیا، باپ کے ساتھ بڑھایا، محنت کی، مشقت کی، جوان لڑکیاں ہیں، اس کا باپ سے پہلے انتقال ہو جاتا ہے تو دوسرے جو اس کے باپ کے وارث ہیں وہ اس کو بالکل محروم کر دیتے ہیں۔ اکیڈمی کو اس سلسلہ میں ایسا ٹھوس فیصلہ کرنا چاہئے کہ یہ مسئلہ تنازع فیہ نہیں بنے، وہ لڑکا جس کا پہلے انتقال ہوا ہے اس کے وارثوں کو بھی کچھ مل جائے، تبرعات تو کہا جاتا ہے کہ باپ جو ہے دیدے، لیکن دوسرا بیٹا تبرع کو نہیں مانتا، اس لیے کوئی ٹھوس فیصلہ اس سلسلہ میں ہونا چاہئے۔



عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# جدید تجارتی تشکیلیں

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام

(اصولی مباحث)

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان





## پیش لفظ

تجارتی معاملات میں ایک اہم عمل ”قبضہ“ کا ہے، قبضہ کے بغیر اگر خرید و فروخت کی زنجیر بنتی جائے اور سامان بنانے والے اور اصل سامان حاصل کرنے والے کے درمیان، آٹھ، دس واسطے ہو جائیں تو دس روپے کی چیز سو روپے کی ہو جاتی ہے، اور جن لوگوں نے درمیان میں خرید و فروخت کی، وہ نقصان کا کوئی خطرہ مول لئے بغیر نفع کماتے چلے جاتے ہیں، دوسرے قبضہ کرنے سے پہلے اگر کوئی چیز فروخت کی جاتی ہے تو اس بات کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ بیچنے والا بروقت خریدار کو وہ چیز مہیا نہیں کر پائے، اس طرح خریدار کو دھوکہ ہو سکتا ہے، ان مصالح کے پیش نظر شریعت نے کسی چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اسے بیچنے سے منع کیا ہے، حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں دو نکات قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ یہ حکم تمام چیزوں کی خرید و فروخت سے متعلق ہے، یا کچھ خاص چیزوں کی خرید و فروخت سے؟ فقہاء نے شریعت کی مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں اجتہاد کیا ہے، بعض فقہاء نے تمام اشیاء سے اس حکم کو متعلق رکھا ہے، کیونکہ بغیر قبضہ کے خرید و فروخت سے مصنوعی گرانی پیدا ہوتی ہے، بعض فقہاء نے غذائی اشیاء اور دوسری اشیاء کے درمیان فرق کیا ہے، کیونکہ غذائی اشیاء انسان کے لئے ناگزیر ضرورت ہے، ان کو ارزاں ہونا چاہئے، انسانی زندگی کے لئے دوسری اشیاء کی اہمیت نسبتاً کم ہے، تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ منقولہ اشیاء میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت ہے، کیونکہ اس میں اندیشہ ہے کہ بیچنے والا وہ شیء مہیا نہ کر سکے، غیر منقولہ اشیاء کو آگے بیچنے کے لئے قبضہ ضروری نہیں، مالک ہونا کافی ہے، کیونکہ اس کے ضائع ہو جانے یا چراگے جانے کا اندیشہ نہیں، اس مسئلہ پر تفصیلی بحثیں فقہاء اور شارحین حدیث کی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں۔

دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ قبضہ کا اطلاق کس کیفیت پر ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے قبضہ سے پہلے بیچنے کو منع تو فرمایا، لیکن قبضہ کی حقیقت کیا ہے؟ اسے متعین نہیں کیا، غالباً اس کی حکمت یہ ہے کہ مختلف ادوار میں اشیاء کی نوعیت اور لوگوں کے رواج کے اعتبار سے قبضہ کی کیفیت متعین کی جائے؛ اسی لئے فقہاء متقدمین کے یہاں قبضہ کا دائرہ بہت تنگ ہے، اور فقہاء متاخرین نے اس میں وسعت برتی ہے۔

عصر حاضر میں بہت سی ایسی چیزیں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان پر فقہاء کی ان تعریفات کے لحاظ سے قبضہ کا تحقق ناممکن یا دشوار ہے؛ اسی لئے موجودہ دور میں اسلامی مالیات کے باہرین نے قبضہ کی دو قسمیں کی ہیں: قبضہ حسی اور قبضہ معنوی، اسی کو بعض اہل علم نے قبضہ حقیقی اور قبضہ حکمی سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع بڑا اہم ہے اور شریعت پر مبنی سرمایہ کاری کرنے والے ادارے، بجا طور سے اسے اپنی تحقیق کا موضوع بنا رہے ہیں۔

اسی پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اپنے نویں فقہی سمینار (جے پور) بتاریخ ۲۷-۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۱-۱۳ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں اس مسئلہ کو علماء اور ارباب افتاء کے غور و فکر کا موضوع بنایا اور اس پر بڑے تفصیلی مقالات آئے، یہ کہنا مبالغہ آفرین نہ ہوگا کہ اردو زبان میں اس سے پہلے اس موضوع پر اتنی تفصیل سے قلم نہیں اٹھایا گیا، مقالہ نگاروں نے قرآن و حدیث کی عبارات و اشارات اور مذاہب اربعہ کے اجتہادات کو سامنے رکھ کر اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان مضامین کا مجموعہ پہلی بار بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی نگرانی میں ان ہی کی زندگی میں شائع ہوا تھا، بحمد اللہ اہل علم اور اصحاب ذوق کے درمیان اکیڈمی کے دوسرے لٹریچر کی طرح اسے بھی بڑی پذیرائی حاصل ہوئی، اب ”ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی“ سے اس کا نیا ایڈیشن نئی ترتیب کے ساتھ دوبارہ شائع ہو رہا ہے، جسے محب عزیز مولانا مفتی احمد نادر القاسمی صاحب نے بڑی کاوش کے ساتھ مرتب کیا ہے، امید کہ اب یہ مجموعہ ”نقش ثانی بہتر از نقش اول“ کا مصداق ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کے سلسلے میں عالمی سطح پر جو کوششیں کی جا رہی ہیں، اس میں اس حقیر خدمت کو بھی مدد و معاون بنائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۹ صفر ۱۴۳۲ھ / ۱۳ جنوری ۲۰۱۱ء

## ابتدائیہ

تجارت، لین دین اور باہمی معاہدہ کی مختلف دور میں مختلف صورتیں رائج رہی ہیں، بہت سے عقود اور معاملات بنیادی طور پر قدیم زمانہ میں بھی رائج تھے اور عہد جدید میں ان کی ترقی یافتہ صورتیں رائج ہو گئیں ہیں، کہیں جو پہلے مطلق تھا اب مقید تھا اب مطلق ہو گیا ہے، آج کے دور میں زیادہ سے زیادہ فائدہ کی طلب مقصود ہوتی ہے، معاملات میں عدل و قسط کی رعایت کم سے کم یا معدوم ہے، اور غرر اور دھوکہ عام ہے، نہ ذہنوں میں خدا کا تصور ہے نہ آخرت کی جواب دہی کی فکر، اس لئے تجارت کے رائج طریقوں میں صرف مادی اور نقد نفع مطلوب رہ گیا ہے، ایسے نازک موقع پر ایک مسلمان کے لئے بہت سی دشواریاں کھڑی ہو جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ تجارت کی دنیا سے جلا وطن نہیں ہو سکتا اور نہ محرمات اور ظلم کا مرتکب ہو سکتا ہے، اس لئے وہ صحیح احکام شرعی کو جاننے کے لئے بے چین ہے۔

علماء و فقہاء اسلام نے عبادات میں اصل حرمت اور حظر کو قرار دیا ہے، اور معاملات میں حلت و اباحت کو، یعنی معاملہ اور عقد کی ہر وہ صورت جائز ہوگی جو نصوص میں کتاب و سنت اور قواعد شرع سے متعارض نہ ہو، عام طور پر ہمارے فقہاء نے معاملات میں سہولت کو پیش نظر رکھا ہے، اور مسائل اجتہاد میں دفع حرج اور دفع ضرر کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ایک امام مجتہد کے قول سے دوسرے امام مجتہد کے قول کی طرف رجوع کو جائز قرار دیا ہے۔

اس طرح کے تجارتی مسائل میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا خریدی ہوئی شئی پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو فروخت کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور اس کا منافع حاصل کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ آج قبضہ کے عنوان سے بہت سارے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، مثلاً صرف کے وہ تمام عقود جن میں تقابض بدلین کا مجلس واحد میں ہونا ضروری ہے، کیا چیک، ڈرافٹ، کریڈٹ کارڈ یا دوسری سندات مالی کو قبضہ تصور کیا جائے گا یا نہیں؟ یا کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ ادائیگی کو فوری قبضہ تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ بین الاقوامی تجارت میں جو آج زیادہ تر فون، فیکس اور ای میل کے ذریعہ انجام پا رہے ہیں، کروڑ ہا کروڑ روپے کے معاملات اور لین دین طے ہو جاتے ہیں، جب کہ ہر دو فریق ہزار ہا میل کی دوری پر ہے، اسی طرح ایک ملک کا تاجر دوسرے ملک میں LC (سند اعتماد) کھلوا کر کاروبار کرتا ہے، دوسرے ملک کا تاجر مال کا شپمنٹ (Shipment) کرتا ہے اور قبل اس کے کہ مال خریدار تک پہنچے خریدار محسوس کرتے ہوئے کہ بازار میں تیزی آچکی ہے اگر میں ابھی اس مال کو فروخت کر ڈالوں تو مجھے زیادہ نفع ملے گا، اس لئے وہ اس مال کو اپنے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی جبکہ مال راستہ میں ہے، فروخت کر ڈالتا ہے، تجارت کی یہ صورتیں کئی سوالات کھڑا کرتی ہیں:

۱۔ اتحاد مجلس کی صورتیں: کیا ٹیلیفون، فیکس اور ای میل کی صورت میں بائع اور خریدار کی مجلس متحد قرار پائے گی اور وہ ایجاب و قبول جس میں اتحاد مجلس ضروری ہے اس صورت میں اس ضروری شرط کے پورا ہونے کی کیا صورت ہے؟

۲۔ اسی طرح دوسرا سوال یہ ہے کہ قبضہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور اشیاء کی نوعیت کے مختلف ہونے کی وجہ سے کیا قبضہ کی نوعیت بھی مختلف ہو جائے گی، چیک یا ڈرافٹ پر قبضہ اصل نقد پر قبضہ تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟

۳۔ اس مسئلہ میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ اگر وہ شئی جو خریدی گئی ہے درمیان میں ضائع ہو جائے تو اصل بائع پر اس کی ضمانت ہوگی یا درمیان والے اس خریدار پر ضمانت ہوگی جس نے اس کو تیسری پارٹی کے ہاتھ فروخت کیا ہے، یا اس تیسری پارٹی کو اس نقصان کو بھگتنا پڑے گا، پس "بیع مالہ یقبض" کے ذیل میں "ربح مالہ یضمن" کا سوال پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ایسا تو نہیں کہ کوئی شخص ایسی چیز سے فائدہ اٹھا رہا ہے جس کے ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کے خسارہ اور نقصان کو اسے نہ بھگتنا پڑے؟



مشہور قاعدہ فقہیہ "المخارج بالضمنان" اور "الغنم بالغرم" کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کے ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کے نقصان کا ذمہ دار نہیں تو اس سے حاصل ہونے والے فائدہ کا بھی وہ ذمہ دار نہیں۔

یہ اور اس طرح کے کئی وہ سوالات ہیں جن کا حل عہد حاضر کے بہت سے تجارتی مسائل، مشکلات اور دشواریوں کو حل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اسی لئے "مجمع الفقہ الاسلامی الہند" نے اس اصولی مسئلہ کو نوویں فقہی سمینار میں موضوع بحث بنایا کہ "بیع قبل القبض" کا کیا حکم ہے، اور اس کے ذیل میں جو دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا حل ہے؟

مجھے خوشی ہے کہ علماء نے اس پر بہت باریک بینی کے ساتھ اپنی بحثیں تیار کیں اور سنجیدہ مذاکرہ کے بعد تجاویز طے کیں جن کی حیثیت اصولی ہے، اور اس طرح کے تجارتی احکام و مسائل کو حل کرنے میں مفید و معاون ہیں۔

آج جب ہم ان مباحث کے مجموعہ کو شائع کرنے جا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے بہت زیادہ شکر اگزارگی کا جذبہ اپنے قلب میں محسوس کرتے ہیں کہ اس نے اس کی توفیق عطا فرمائی، جو لوگ علمی کام کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کی بحث علمی اور مباحثات و مذاکرے کی تصحیح و ترتیب کتنا مشکل کام ہے۔ میں اکیڈمی میں کام کرنے والے اپنے رفقاء کے لئے دل سے دعا گو ہوں جنہوں نے بہت خاموشی اور سنجیدہ محنت کے ذریعہ اس اہم کام کو انجام دیا۔ جزاھم اللہ أحسن الجزا، وتقبل اللہ منهم ومن العلماء الباحثین۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

## پہلا باب تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ:

### قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

دور حاضر میں خرید و فروخت کی بہت سی ایسی صورتیں مروج ہیں جن میں فروخت شدہ شی پر قبضہ کے بغیر خریدار دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے "بیع قبل القبض" سے منع فرمایا ہے، اسی پس منظر میں ایسے مروجہ معاملات کی بابت اسلامک فقہ اکیڈمی کے نویں سمینار منعقدہ "جامعۃ الہدایہ جے پور" میں درج ذیل باتیں طے پائیں:

- ۱۔ اصولی طور پر قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، تاہم اگر قبضہ سے پہلے بیع کر دی جائے تو یہ بیع فاسد ہوگی نہ کہ باطل، اور قبضہ کے بعد مفید ملک ہوگی۔
- ۲۔ کتاب و سنت میں قبضہ کی حقیقت اور اس کی کوئی خاص صورت مقرر نہیں کی گئی ہے، گویا شریعت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے عرف کو اصل قرار دیا ہے، لہذا ہر عہد کے مروجہ طریقوں اور اشیاء کی مختلف انواع کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت متعین ہوگی۔
- ۳۔ فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ اصل میں بیع پر خریدار کے ایسے استیلاء کا نام ہے کہ بیع پر اس کے تصرف میں کوئی مانع باقی نہ رہے، اسی کو فقہ کی کتابوں میں "تخلیہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- ۴۔ بیع قبل القبض کی ممانعت "غرر انفساخ" کی علت پر مبنی ہے، یعنی جب تک بیع خریدار اول کے ہاتھ نہ آجائے اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ بیع اس کے قبضہ میں آہی نہ پائے، اور وہ خریدار دوم کو بیع کی حوالگی پر قادر نہ رہے۔
- ۵۔ "بیع قبل القبض" کی ممانعت کا تعلق اموال منقولہ سے ہے، اموال غیر منقولہ میں "بیع قبل القبض" جائز ہے، بشرطیکہ خریدار کے لئے انتفاع سے کوئی قوی مانع نہ پایا جاتا ہو۔
- ۶۔ اگر ایک شخص کسی بائع (فیکٹری وغیرہ) سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دے، اور ابھی خریدار ہوا مال فیکٹری نے روانہ بھی نہ کیا ہو تو یہ صورت "بیع قبل القبض" میں داخل ہے اور جائز نہیں ہے۔
- ۷۔ اگر ایک شخص کسی فیکٹری وغیرہ سے خرید کر اس کو کسی خاص ذریعہ (جہاز، ٹرانسپورٹ، پرمٹ وغیرہ) سے سامان کی ترسیل کا آڈر دے اور مطلوبہ سامان فیکٹری سے روانہ بھی کر دیا جائے اور نقصان کی صورت میں خریدار اس کا ضامن ہوتا ہو، نیز ترسیل کی اجرت خریدار کے ذمہ ہے، تو جس ذریعہ سے مال روانہ کیا جائے اس کا قبضہ خریدار کی طرف سے وکالت قبضہ متصور ہوگا، لہذا اس صورت میں مال پہنچنے سے پہلے خریدار کو فروخت کرنا جائز ہے، اور یہ "بیع قبل القبض" میں داخل نہیں، البتہ جس شخص نے اس خریدار سے مال خریدا ہے اس خریدار دوم کے لئے مال پہنچنے سے پہلے دوبارہ بیع جائز نہیں اور اگر بیع کرے تو یہ "بیع قبل القبض" کے زمرہ میں داخل ہوگی۔

☆☆☆

## سوالنامہ:

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنے کی ممانعت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف احادیث مروی ہیں، ان میں سے بعض مطلق ہیں، بعض مقید۔ احادیث و روایات کے اختلاف کی بنیاد پر ”بیع قبل القبض“ کے مختلف مسائل میں فقہاء مجتہدین میں اختلاف بھی ہوا ہے، جن کی تفصیل کتب فقہ اور شروح حدیث میں موجود ہے، لیکن جمہور فقہاء فی الجملہ ”بیع قبل القبض“ کے ناجائز ہونے پر متفق ہیں، ادھر دور حاضر میں خرید و فروخت کی ایسی بہت سی شکلیں مروج ہیں جن کے بارے میں ”بیع قبل القبض“ کے دائرے میں شامل ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہے، اس لئے ”بیع قبل القبض“ کی حقیقت، احکام اور اس سے وابستہ جدید مسائل و معاملات کے بارے میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

- ۱۔ شرع اسلامی کے اعتبار سے ”بیع قبل القبض“ جائز ہے یا ناجائز؟ اور ناجائز ہے تو اس کا شمار بیع باطل میں ہے یا بیع فاسد میں یا بیع مکروہ میں؟
- ۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت کیا ہے، کتاب و سنت نے قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین کر دی ہے یا اسے لوگوں کے عرف و عادت پر چھوڑ دیا ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے۔
- ۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق ہوگا یا دونوں میں قبضہ کی ایک ہی صورت ہوگی؟
- ۴۔ ”بیع قبل القبض“ کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلۃ ہیں یا نہیں، اگر معلول بالعلۃ ہیں تو علت نہی کیا ہے؟
- ۵۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت عام ہے یا اس میں کچھ استثناءات اور تخصیصات بھی ہیں، اس بابت مختلف ائمہ کی آراء اور ان کے وجوہ و دلائل تحریر کئے جائیں۔
- ۶۔ ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدہ ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار نمبر (۲) کو روانہ کر دیتا ہے، اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آتی ہے، نہ خریدار نمبر (۲) پر، بلکہ یہ اسی شخص (خریدار نمبر (۱) کا نقصان قرار پاتا ہے، اس صورت معاملہ میں اگر فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر اگرچہ حسی قبضہ نہیں ہوا، لیکن وہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے سے پہلے اس کے ضمان میں رہا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ”زح یا لم یضمّن“ (ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) حاصل کیا، بلکہ اس نے مال مضمون پر نفع حاصل کیا ہے، سوال یہ ہے کہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے کی طرف سے قبضہ حسی نہ پائے جانے کی وجہ سے دوسرے شخص کے ہاتھ اس فروختگی کو ناجائز قرار دیا جائے گا یا ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا؟
- ۷۔ وہ صورت جس میں بین الاقوامی تجارت میں شیپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے، جبکہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دیتا ہے اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے، کیا یہ صورت شرعاً جائز ہوگی؟





## تلخیص مقالات:

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام

مفتی محمد نعیم اختر ندوی

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے مختلف الفاظ میں متعدد احادیث مروی ہیں، بعض احادیث میں بعض مخصوص سامانوں کا نام لے کر قبضہ سے پہلے ان کی خرید و فروخت سے روکا گیا ہے، جب کہ دیگر احادیث میں یہ حکم ممانعت کسی سامان کی تصریح کے بغیر عمومی الفاظ میں آیا ہے، اس بنا پر فقہاء مجتہدین کے درمیان قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے مختلف مسائل میں اختلاف بھی ہوا ہے، اس مسئلہ سے متعلق جو سوالات یہاں اٹھائے گئے تھے، مقالہ نگار حضرات علماء کرام نے ان پر تفصیل سے اظہار خیال فرمایا ہے، مجموعی طور پر متعدد نکات کے تعلق سے ان کی آراء میں کوئی اختلاف نہیں ہے، چند نکات کی بابت اختلاف آراء ہوا ہے، ذیل میں ان سوالات سے متعلق مقالہ نگار حضرات کے جوابات بالترتیب درج کئے جا رہے ہیں:

## ۱۔ ”بیع قبل القبض“ کی حیثیت:

تقریباً تمام حضرات نے کتب فقہ کی مختلف جزئیات کے حوالہ سے ”بیع قبل القبض“ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسے فاسد بتایا ہے، بعض حضرات کا رجحان جواز کی جانب بھی ہے، چنانچہ:

- ۱۔ جناب شمس پیرزادہ صاحب نے موجودہ کاروباری طریقوں میں جہاں ضرورت متقاضی ہے، ضرر کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر ہے اور بائع کی طرف سے ضمانت بھی ہے، ”بیع قبل القبض“ کی اجازت دی ہے۔
- ۲۔ مولانا زبیر قاسمی صاحب کا خیال ہے کہ فساد کا حکم محض قضاء ہے، لہذا اگر کوئی نزاع نہ ہو تو اس کے جواز و صحت اور نفاذ و لزوم ہی کا فتویٰ دیا نہ دیا جانا چاہئے۔
- ۳۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا شکیل احمد سیتا پوری کی رائے میں موجودہ حالات میں فقہ مالکی یا فقہ حنبلی کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

## ۲۔ قبضہ کی حقیقت:

تمام مقالہ نگار حضرات کا خیال ہے کہ قرآن و سنت میں قبضہ کی کوئی خاص حقیقت نہیں بتائی گئی ہے، بلکہ احادیث میں قبضہ کی مختلف کیفیات کا ذکر ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر کی ایک روایت میں مقام خریداری سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ تجارت خرید کردہ مال کو اپنے کجاوے میں منتقل کر لیں، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ناپ تول کو قبضہ قرار دیا گیا ہے، اسی لئے فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس بابت لوگوں کا عرف ہی معیار ہے، جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”ولا يشترط القبض بالبراجم، لأن معنى القبض هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“۔ (انگلیوں سے قبضہ شرط نہیں، اس لئے کہ قبضہ کے معنی ”تمکن“ اور ”تخلي“ اور عرف و عادت اور حقیقت کے اعتبار سے موانع کے ختم ہو جانے کے ہیں)۔

علامہ درویر مالکی تحریر فرماتے ہیں: ”وقبض العقار... بالتخلية... و قبض غيره... بالعرف الجاری بین الناس“۔ (غیر منقولہ اموال میں قبضہ تخلیہ کے ذریعہ..... اور دوسری اشیاء میں لوگوں کے عرف و رواج کے مطابق ہوگا)۔

امام نووی شافعی کا بیان ہے: ”لأن القبض ورد به الشرع وأطلقه فحمل على العرف، والعرف في ما ينقل النقل، وفي ما لا ينقل التخلية“۔ (شریعت نے قبضہ کا ذکر کیا ہے اور اسے مطلق رکھا ہے، لہذا اس کو عرف پر محمول کیا جائے، اور عرف کی رو سے منقولہ اموال میں منقلی اور غیر منقولہ میں تخلیہ قبضہ ہے)۔

ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں: ”لأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى العرف“۔ (کیونکہ قبضہ شریعت میں مطلق ہے، لہذا عرف کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے)۔

### ۳۔ قبضہ میں سامان کی نوعیت کا لحاظ:

مذہب اربعہ کی کتب فقہ میں مذکور متعدد جزئیات اور فروعی مسائل کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے مختلف اشیاء میں مختلف نوعیت کے عمل دخل کو قبضہ تصور کیا ہے، منقلی اور ناپ تول سے لے کر سامان کی جانب اشارہ، کنجی کی حواگی اور تخلیہ، یعنی موانع کا ہٹا دینا یہ سب قبضہ ہی کی شکلیں ہیں، جو اشیاء کی نوعیت کے لحاظ سے ہر شئی میں اس کے حسب حال ہوتی ہیں، اگرچہ فقہاء احناف کے نزدیک منقولہ وغیر منقولہ تمام اشیاء میں تخلیہ ہی قبضہ مانا گیا ہے، اور مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اموال غیر منقولہ میں تخلیہ کو قبضہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اموال منقولہ میں ان اشیاء کے حسب حال قبضہ کی علاحدہ علاحدہ شکلیں بیان ہوئی ہیں، تاہم احناف کے نزدیک تخلیہ کے مفہوم میں داخل قبضہ حقیقی اور قبضہ حکمی کے وسیع دائرہ میں ہی وہ تمام شکلیں آجاتی ہیں، ان تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ ہر دور کے عرف و رواج اور ہر شئی کے حسب حال قبضہ کی نوعیت متعین ہوگی۔

### ۴۔ ممانعت کی علت:

تمام مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ ”بیع قبل القبض“ سے ممانعت پر مشتمل احادیث علت پر مبنی ہیں، چند مقالات میں امام مالک کی صرف ایک روایت یہ نقل کی گئی ہے کہ یہ ممانعت امر تعبدی ہے۔

متعدد حضرات نے مسالک اربعہ میں اس ممانعت کی علت اور بعض صحابہ کرام سے اس بابت منقول علت کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس کی علت ربا ہے، ”فتح الباری“ میں حضرت طاؤس کے سوال پر ان کا یہ جواب مذکور ہے: ”ألا تراهم يتبايعون بالذهب والطعام مرجأ“۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی اسے ربا ہی قرار دیا ہے، مردان سے انہوں نے فرمایا: ”أحللت بيع الربا؟ فقال ما فعلت؟ فقال أبو هريرة، أحللت بيع الصكالك، وقد نهي رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يستوفى“ (صحیح مسلم)۔

مالکیہ کے نزدیک علت ممانعت ربا و سود ہے، ایک دوسرے قول میں منفعہ عمل کے ضیاع کو علت قرار دیا گیا ہے (الفقہ علی المذہب الاربعہ)۔

احناف کے نزدیک اس کی علت غرر ہے، ”فتح القدير“ میں ہے: ”لأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“۔ شوافع اور حنابلہ نے بھی غرر کو ہی ممانعت کی علت قرار دیا ہے۔

ابو اسحاق شیرازی رقمطراز ہیں: ”ولأن ملكه عليه غير مستقر، لأنه ربما هلك، فانفسخ العقد وذلك غرر من غير حاجة فلم يجز“۔

اور ابن قدامہ لکھتے ہیں: ”ما يتوهم فيه غرر الانفساخ بهلاك المحقود عليه لم يجز بناء عقد آخر عليه تحرزا من الضرر، وما لا يتوهم فيه ذلك الغرر، انتفى المانع فجاز العقد عليه“۔

بعض حضرات نے ایک مزید علت ”ربح ما لم يضمن“ (ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) کا بھی ذکر کیا ہے۔



مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے ”فتح الباری“ کے حوالہ سے امام شافعی کے نزدیک اسے ہی ممانعت کی علت بتایا ہے، اور مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب نے ”ربح ما لم یضمن“ کی علت کو راجح قرار دیا ہے۔

### ۵۔ ممانعت عام یا مخصوص:

”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے الفاظ میں باہم فرق ہے اور اسی فرق کی بنیاد پر فقہاء کی آراء میں اختلاف ہوا ہے، چنانچہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ ممانعت تمام اشیاء میں عام ہے، جبکہ دیگر فقہاء نے حکم ممانعت کو مختلف اشیاء کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے۔

فقہاء کی آراء ذکر کرنے سے پہلے بعض وہ احادیث بیان کی جا رہی ہیں جن میں مختلف الفاظ میں قبضہ سے خرید و فروخت کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ: ”إن رسول الله ﷺ نهي أن يبيع الرجل طعاما حتى يستوفيه“ (بخاری)۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ: ”من اشترى طعاما بكيلى أو وزن فلا يبعه حتى يقبضه“ (مسند احمد)۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے الفاظ ہیں: ”من اشترى طعاما فلا يبعه حتى يكتاله“ (مسلم)۔

حضرت حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ: ”قلت يا رسول الله، إني اشترى بيوعا فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال: فإذا اشتريت فلا تبعه حتى تقبضه“ (مسند احمد)۔

اور حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ: ”إن النبي ﷺ نهي أن تبايع السلع حيث تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم“ (ابوداؤد)۔

انہیں صحابہ کرامؓ سے الفاظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کچھ اور روایات بھی مروی ہیں، مذکورہ روایات میں کہیں قید کے ساتھ ممانعت اور کہیں علی الاطلاق ممانعت کے پیش نظر فقہاء مجتہدین کی آراء میں اختلاف ہوا ہے، فقہاء کی آراء ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

حکم ممانعت عام ہے، کسی بھی سامان کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، یہ رائے حضرت امام شافعی، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام زفر کی ہے۔

”لا يجوز بيع المبيع قبل قبضه عقارا كان أو منقولا لا ياذن البائع ولا بغير إذنه، لا قبل أداء الثمن ولا بعده“ (شرح المہذب)۔

ابن عقیل کی ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کا بھی ایک قول یہی ہے۔

ان حضرات نے بنیادی طور پر حضرت حکیم بن حزام اور حضرت زید بن ثابت کی ان روایات کو پیش نظر رکھا ہے، جن میں مطلق خریدی ہوئی اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، مسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے ”وأحسب كل شئ مثله“ یعنی میرا خیال ہے کہ دوسری اشیاء کا بھی یہی حکم ہے۔

یہ ممانعت صرف اشیاء خورد و نوش کے ساتھ خاص ہے، دوسری اشیاء قبضہ سے پہلے فروخت کی جاسکتی ہیں، یہ رائے حضرت امام احمد بن حنبل کی ہے۔

ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: ”نقل عن أحمد أن المطعوم لا يجوز بيعه قبل قبضه سواء كان مكيلا أو موزونا أو لم يكن“ (المغنی)۔

ان کا مستدل حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وہ روایات ہیں جن میں صراحت ہے کہ یہ ممانعت خوردنی اشیاء کی بابت تھی۔

مالکیہ کے نزدیک یہ ممانعت صرف خوردنی اشیاء جو ناپ کر، تول کر، یا گن کر خریدی گئی ہوں، کے ساتھ مخصوص ہے، چنانچہ اگر خوردنی اشیاء بھی بلا تعین مقدار، مجموعہ (جزاا) خریدی گئی ہوں تو ان کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کیا جاسکتا ہے۔

ابن قدامہ حنبلی امام مالک کا قول نقل کرتے ہیں: ”فإنه قال: ما يبيع من الطعام مكيلا أو موازنة لم يجزيعه قبل قبضه، وما



بیع مجازفة أو بیع من غیر الطعام مکایلة أو موازنة جاز بیعه قبل قبضه“ (المغنی)۔

مالکیہ کے پیش نظر وہی روایات ہیں جن میں ممانعت صرف طعام کے ساتھ مخصوص بیان ہوئی ہے، ناپ تول کر خریدی ہوئی اشیاء ہی میں ممانعت مخصوص کرنے کی دلیل غالباً مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر کی وہ روایت ہے، جس میں ناپ تول کر خریدی ہوئی اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، مالکیہ کے نزدیک بلا کیل و وزن خرید و فروخت کی صورت میں نفس عقد ہی سے بیع خریدار کے ضمان میں آجاتی ہے اور تصرف کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

صالح عبدالسمیع الابی لکھتے ہیں: ”بخلاف الجزاف وهو بیع الشئ بلا کیل ولا وزن ولا عدد، فإن بیعه قبل قبضه جائز علی المشهود؛ لأنه ملکہ بالعقد ولذا لو تلف قبل قبضه کان ضمانه من المشتري“ (اثر الدانی)۔

احناف کے نزدیک حکم ممانعت صرف اشیاء منقولہ کے ساتھ مخصوص ہے، جو اشیاء منتقل نہیں کی جاسکتی ہیں، جیسے زمین و مکان وغیرہ، ان کی فروخت قبضہ سے پہلے جائز ہے، یہ رائے امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی ہے۔

احناف کے پیش نظر گرچہ وہی روایات ہیں جن میں حکم ممانعت عام ہے، لیکن انہوں نے روایات کے الفاظ کے بجائے مقصد پر نگاہ رکھی ہے کہ اصل مقصد غرر سے بچانا ہے، اموال غیر منقولہ میں یہ اندیشہ نہیں کہ حوالگی سے پہلے وہ چیز ضائع ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ اگر اموال غیر منقولہ میں بھی یہ اندیشہ پیدا ہو جائے، مثلاً زمین و مکان دریا کے کنارے واقع ہوں اور سیلاب کی زد میں آجانے کا خطرہ ہو، یا صحرائی علاقہ میں ریت میں ڈھک جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں مکان و زمین کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہیں ہے۔

قبضہ سے پہلے زمین کی فروختگی کا جواز حضرت عثمانؓ سے عملاً ثابت بھی ہے۔

پس قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے مسئلہ میں سب سے زیادہ تنگی حضرات شوافع کے یہاں ہے اور اس کے برعکس سبب سے زیادہ وسعت مالکیہ و حنابلہ کے نزدیک ہے، احناف نے علت کی بنا پر نص میں تخصیص کا راستہ اختیار کرتے ہوئے غیر منقولہ میں جواز اور منقولہ اشیاء میں عدم جواز کی رائے اپنائی ہے۔

ابن حزم کے نزدیک یہ ممانعت صرف گندم کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ طعام سے مراد ان کے نزدیک صرف گندم ہی ہے۔

عثمان البتی سے مطلقاً جواز کی رائے منقول ہے، ابن حزم نے عطا کی بھی یہی رائے نقل کی ہے، لیکن یہ ایک قول شاذ و غیر معتبر ہے۔

”هذا قول مردود بالسنة والحجة المجمعۃ علی الطعام“ (تکملہ فتح الملہم)۔

## ۶۔ فیکٹری سے خریداری کے بعد قبضہ سے پہلے فروختگی:

فیکٹری سے مال کی خریداری کے بعد اسے قبضہ میں لئے بغیر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر کے فیکٹری ہی سے اپنی ضمانت پر مال ترسیل کرائی جائے تو مال پر قبضہ حسی نہ پائے جانے کی وجہ سے اس فروختگی کو ناجائز قرار دیا جائے گا، یا ضمانت کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھتے ہوئے حکم جواز دیا جائے گا، اس بابت شرکائے گرامی کی آراء میں اختلاف ہے۔

بیشتر حضرات علماء کرام نے اس صورت معاملہ کو جائز قرار دیا ہے، مجوزین حضرات میں سے اکثریت کی رائے میں خریدار اول کے ضمانت کو قبضہ حسی کا قائم مقام، بائع کو خریدار کا وکیل قرار دیتے ہوئے بائع کے تصرف کو خریدار کے لئے قبضہ حسی اور ضمانت کو قبضہ حسی مان کر اس صورت معاملہ میں جواز کا فتویٰ دیا جائے گا، یہ استدلال درج ذیل حضرات کا ہے:

مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محبوب علی وجیبی، مولانا شاہین جمالی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مفتی شکیل احمد سیٹاپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا منظور عالم قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا احمد دیولوی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا ایوب سیبلی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا نور عالم قاسمی، مولانا مسعود احمد، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شمس پیرزادہ، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا قمر عالم، مولانا ابرار احمد خاں ندوی، مولانا شہزاد اکرام۔

درج ذیل حضرات نے اس مسئلہ میں مسلک مالکی کو اختیار کرتے ہوئے فتویٰ جواز دینے کی رائے دی ہے:

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا عزیز اختر قاسمی، مولانا عبدالرشید، مولانا طاہر مظاہری۔

درج ذیل علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ اگر فیکٹری میں خریدار کا مال علاحدہ کر دیا جائے یا اس پر نشان وغیرہ لگا کر کسی طرح ممیز کر دیا جائے، تا کہ تخلیہ کی کوئی صورت پائی جاسکے تو یہ صورت معاملہ درست ہو جائے گی:

مفتی نسیم احمد قاسمی، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا ابو جندل قاسمی۔

مولانا نعیم اختر قاسمی کی رائے میں رسید پر قبضہ کے بعد فروختگی درست ہے۔

دوسری رائے عدم جواز کی ہے، اس رائے کے قائلین کا استدلال ہے کہ ضمان کا وجود قبضہ پر موقوف ہوتا ہے، اس لئے قبضہ سے پہلے ضمان درست نہیں، نیز نقصان کا ضامن ہو جانا قبضہ کے تحقق کے لئے کافی نہیں ہے، لہذا چونکہ قبضہ حسی موجود نہیں، یہ صورت معاملہ ناجائز ہوگی:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا رضوان القاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا ابراہیم بن محمد، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد زید ندوی، مولانا حنیف ملی۔

مولانا محمد برہان الدین سنہلی صاحب کی رائے میں قبضہ سے پہلے فروختگی کی ممانعت کی وجہ صرف ”ربح ما لم یضمن“ نہیں، بلکہ انفساخ عقد کا احتمال، غرر، ملک غیر کی بیع بغیر اجازت مالک، سبھی ہیں، لہذا ایک وجہ کے ارتقاع سے حکم ممانعت ختم نہیں ہوگا۔

۷۔ ایک سامان پر قبضہ سے پہلے متعدد خرید و فروخت:

بین الاقوامی تجارت میں جہاز پر مال چڑھانے کے بعد فروخت کنندہ کی ذمہ داری ختم ہو کر خریدار کی ضمانت میں مال آجاتا ہے، اور مال جہاز پر سمندر میں ہوتے ہوئے پہلا خریدار دوسرے شخص کے ہاتھ اسے فروخت کر کے اپنی ضمانت سے فارغ ہو جاتا ہے، اس صورت مسئلہ کی بابت بھی مقالہ نگار علماء کرام کی آراء میں اختلاف ہوا ہے، کچھ حضرات نے جواز کی رائے دی ہے، جبکہ بیشتر حضرات نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے پہلی خریداری اور دوسری خریداری کے احکام میں فرق بھی کیا ہے، یہ مختلف نقطہائے نظر اور ان کے استدلال درج ذیل ہیں:

عدم جواز کی رائے اپنانے والے علمائے کرام کے نزدیک یہ صورت مسئلہ قبضہ سے پہلے فروختگی اور فروخت کنندہ کی جانب سے عدم ضمان کی وجہ سے ناجائز ہے:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابوالحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد برہان الدین سنہلی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابو جندل قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا مجیب الغفار اسعدی، مولانا احمد دیولوی، مولانا عبداللطیف، مولانا ابراہیم بن محمد، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا عبدالرشید، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا قمر عالم، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا شہزاد اکرم، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا سعید احمد، مولانا عبدالرحیم۔

دوسری رائے جواز کی ہے، اس رائے کے قائلین میں سے درج ذیل حضرات کے نزدیک خریدار اول، اسی طرح دوسرے خریدار کا قبضہ حکمی بھی پایا جا رہا ہے، اور ساتھ میں ضمانت بھی، اس لئے یہ صورت درست ہے۔

مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی محبوب علی وجیبی، مولانا مسیح اللہ قاسمی، مولانا نور قاسمی، مولانا نعیم رشیدی قاسمی، مولانا ظفر الاسلام اعظمی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری

مندرجہ ذیل حضرات کے نزدیک جہاز کا عملہ خریدار کے اجیر کی حیثیت رکھتا ہے، لہذا اجیر کا قبضہ مستاجر کا قبضہ ہوگا، اسی طرح جب دوسری خریداری عمل میں آتی ہے تو عملہ دوسرے خریدار کا اجیر ہو جاتا ہے اور قبضہ حکمی دوسرے خریدار کو حاصل ہو جاتا ہے، اس بنیاد پر یہ صورت مسئلہ درست ہے۔

مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا عزیز اختر قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ایوب سبیلی۔

درج ذیل حضرات نے موجودہ حالت میں مسلک مالکی پر عمل کرتے ہوئے فتویٰ جواز دیئے جانے کی رائے دی ہے:

مولانا محمد زید، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مولوی مجاہد الاسلام۔

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب اور مولانا نعیم اختر قاسمی نے بالترتیب دستاویز اور رسید پر قبضہ کے بعد اس صورت کو بکراہت جائز اور درست بتایا ہے۔

تیسری رائے ان علمائے کرام کی ہے جنہوں نے اس صورت مسئلہ میں پہلی خریداری کو تو درست قرار دیا ہے کہ جہاز پر مال چڑھانے سے خریدار اول کا قبضہ حکمی پایا گیا اور مال اس کی ضمانت میں بھی آ گیا، لیکن اب جبکہ مال نمند ر میں ہے خریدار اول اس مال کی خواہگی پر قادر نہیں ہے، نیز دوسرے خریدار تک مال کی وصولی تک وہ مال کی ضمانت بھی نہیں لے رہا ہے، اس لئے مال کی وصولیابی سے پہلے خریدار اول کے لئے اس کی فروختگی جائز نہیں ہوگی۔

مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا شاہین جمالی، مفتی حنیف ملی۔

درج ذیل تین علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ چونکہ خریدار اول کا مال پر قبضہ حکمی پایا گیا، لہذا وہ دوسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت تو کر سکتا ہے، لیکن وصولی سے پہلے اگر مال ضائع ہو جائے تو اس کا ضمان خریدار اول ہی پر ہوگا، خریدار ثانی کا اس مال پر نہ تو قبضہ پایا گیا ہے اور نہ ہی خریدار اول کی جانب سے حمل و نقل یا تخلیہ وغیرہ کوئی عمل صادر ہوا ہے، لہذا اگرچہ زبانی معاہدہ بھی ہو جائے اس مال کو خریدار ثانی کے ضمان میں داخل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی۔



## عرض مسئلہ:

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

## سوال نمبر ۱

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بیع قبل القبض کے مسئلہ پر کل چالیس علماء اور تیرہ طلبہ تخصص نے اپنی تحریریں اکیڈمی کو بھیجی ہیں، ان کے نام درج ذیل ہیں:

مولانا ابوالحسن علی، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مفتی عبد الرحیم قاسمی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا منظور احمد قاسمی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا نازیر احمد قاسمی، مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مفتی شاہین جمالی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد برہان الدین سنہجلی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبدالرحمن مدنی، مولانا ابراہیم گجیا فلاحی، مفتی محمد زید مظاہری، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا ابوجندل قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا احمد ابوموسیٰ، مولانا ارشاد قاسمی، مولانا عزیز اختر القاسمی، مفتی شکیل احمد سیٹاپوری، مولانا ڈاکٹر اسرار الحق سبیلی، حکیم ظل الرحمن اور راقم الحروف۔

طلبہ تخصص میں گیارہ طلبہ دارالعلوم سبیلی السلام حیدرآباد، اور دو دارالعلوم حیدرآباد کے ہیں، جہاں تک ”بیع قبل القبض“ کے جائز اور ناجائز ہونے کی بات ہے، تو سوائے حکیم ظل الرحمن کے یہ سبھی حضرات اس کے ناجائز ہونے پر متفق ہیں، اور ان حضرات کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت حکیم بن حزام کی ان صحیح اور صریح روایات سے ہے جو صحاح اور مسند احمد میں منقول ہیں، حکیم صاحب نے ”بیع سلم“ سے استدلال کیا ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ بیع سلم مستثنیات میں سے ہے، اس لئے ان صریح روایات کے مقابلے میں یہ دلیل قابل قبول نہیں ہو سکتی، محترم جناب شمس پیرزادہ صاحب کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ بیع قبل القبض ہے تو ناجائز ہی ہے، لیکن ”مروجہ کاروباری طریقوں میں جہاں ضرورت متقاضی ہے اور غرر کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر ہے اور بائع کی طرف سے ضمانت بھی ہے، تو ایسی صورت میں بیع قبل القبض کی اجازت ہوگی“ گویا موصوف بیع قبل القبض کی ممانعت کی نصوص کو غرر پائے جانے کے ساتھ مشروط تصور کرتے ہیں، اسی طرح اصولی طور پر عدم جواز سے وہ بھی متفق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض جزئی اختلافات سے قطع نظر، بیع قبل القبض کی ممانعت ایسی صحیح اور صریح نصوص پر مبنی ہے کہ اس سے نہ صرف نظر ممکن ہے اور نہ تاویل کی گنجائش ہے، شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ اس مسئلہ پر امت کا اجماع و اتفاق ہے، صرف ابن حزم نے اس سلسلے میں عطاء اور نووی نے عثمان بنی کا اختلاف نقل کیا ہے (دیکھئے: لکھی ۸/۵۲۰، شرح نووی شرح مسلم ۵/۲)، لیکن نووی کی یہ بات بالکل بجا معلوم ہوتی ہے کہ یہ شاذ اور غیر معتبر قول ہے، ”وَأَمَّا الْخِلَافُ فِيمَا سِوَاهُ فَهُوَ شَاذٌ مَتْرُوكٌ“ (شرح نووی شرح مسلم ۵/۲)، اس لئے اس پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، رہ گئی یہ بات کہ اس کی تفصیل میں فقہاء کے درمیان کیا اختلاف رائے پایا جاتا ہے تو یہ سوال نمبر ۵ تا ۳۵ میں زیر بحث ہے، اس لئے اس پر آپ مستقل عرض سماعت فرمائیں گے۔

سوال نمبر ۱ کا دوسرا جز یہ ہے کہ اگر بیع قبل القبض ناجائز ہے تو یہ کس زمرے میں داخل ہے؟ بیع باطل ہے یا فاسد یا مکروہ؟ محض مکروہ ہونے کا کوئی قائل نہیں، مولانا منظور احمد قاسمی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی نے بیع باطل قرار دیا ہے، مولانا عبدالعظیم اصلاحی کا خیال ہے کہ عوضین شریعت کی نظر میں مال ہوں تو بیع فاسد ہوگی، ورنہ باطل، میرے خیال میں دونوں حضرات نے جن صورتوں کو بیع باطل قرار دیا ہے، اس کے باطل ہونے میں شاید کوئی اختلاف نہ ہو، سوال کا منشاء وہ صورتیں ہیں جن میں ربوہ پیدا ہوتا ہو اور خرید و فروخت ایسی چیز کی جاری ہو جو شریعت کی نظر میں مال ہو، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ ان دو حضرات کے نزدیک بھی یہ بیع، بیع فاسد ہی کے زمرے میں داخل ہے، یہی نقطہ نظر مولانا منظور احمد اور مولانا مفتاحی کے علاوہ سبھی حضرات کا ہے، البتہ مولانا سلطان احمد اصلاحی کا نقطہ نظر

میری سمجھ میں نہیں آیا، وہ لکھتے ہیں کہ ”اس پر بیع باطل، فاسد اور مکروہ تینوں کے احکام وارد کئے جاسکتے ہیں۔ جن حضرات نے بیع باطل قرار دیا ہے ان کی دلیل فقہاء کی بعض عبارات ہیں جیسے ابن ہمام کا قول:

”وقبل القبض في المنقول لا ينعقد اصلاً“ (فتح القدیر ۶/۲۲) (مولانا منظور احمد قاسمی)۔

اور ابن نجیم کی یہ عبارت: ”فلم ينعقد ببيع المعدوم وماله خطر العدم“ (البحر الرائق ۵/۲۶۹)۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر بیع قبل القبض میں بائع اور خریدار معاملہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، اور بیع ایسی چیز کو بنایا گیا ہو جس میں بیع بننے کی صلاحیت ہو تو یہ بیع فاسد ہی ہوگی، جیسا کہ اکثر حضرات کی رائے ہے نہ کہ باطل۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عام طور پر فقہاء نے بیع باطل و فاسد کی جو تعریف کی ہے وہ خاصی مبہم ہے، یعنی یہ کہ جو بیع اصل کے اعتبار سے مشروع و درست نہ ہو وہ باطل ہے، اور جو کسی خارجی وصف کی وجہ سے نادرست قرار دی گئی ہو وہ فاسد ہے (دیکھئے فتح القدیر وعنا ۶/۲۰۲)، لیکن عمدۃ الفقہاء علامہ شامی نے اپنے مزاج و مذاق خاص کے مطابق اس عقیدہ کو بھی حل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

”كل ما اوردت خلافا في ركن البيع فهو مبطل، وركن البيع هو الإيجاب والقبول، بأن كان من مجنون أو صبي لا يعقل... أو في محله أعني المبيع، فإن الخلل مبطل، بأن كان البيع ميتة أو دماً أو حراً أو خمراً“ (رد المحتار ۲/۱۱۲ طبع کوئٹہ)۔

اس طرح بیع باطل وہ ہے جس میں ایجاب و قبول درست نہ ہو، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسے اشخاص سے ایجاب و قبول کا صدور ہوا ہو جو اس کے اہل ہی نہ ہوں، یا ایسی چیز کو بیع کا محل بنایا گیا ہو جس میں محل بیع ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

اس اصول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر خریدار اور فروخت کنندہ بیع کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور معاملہ کی اساس (بیع) ایسی چیز کو بنایا گیا ہو جو شرعاً مال ہو تو یہ بیع باطل نہیں ہوگی، بیع قبل القبض کی ممانعت اصل میں اس اندیشے کی وجہ سے ہے کہ معلوم نہیں بائع اس کو خریدار کے حوالہ کر سکے گا یا نہیں؟ اور ابن ہمام کے بقول: ”الوجه عندى ان عدم القدرة على التسليم مفسد لا مبطل“ (فتح القدیر ۶/۲۲۲)۔

یہ تو اصولی بحث تھی، فقہاء کے یہاں ایسی تصریحات بھی موجود ہیں جن سے اس بیع کا فاسد ہونا معلوم ہوتا ہے، نہ کہ باطل، درمختار میں ہے:

”وفسد ببيع المنقول قبل قبضه ونفى الصحة يَحْتَمِلُهُمَا“ (الدر المختار مع الرد ۲/۱۸۲ طبع کوئٹہ)۔

(مال منقول کی بیع قبضہ سے پہلے فاسد ہو جائے گی اور بیع کے صحیح ہونے کی نفی باطل ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہے اور فاسد ہونے کا بھی)۔

اس پر شامی کا بیان ہے: ”أى يحتمل البطلان والفساد والظاهر هو الثانى؛ لأن علة الفساد الغرر كما مر مع وجود ركنى العقد“ (رد المحتار ۲/۱۸۲)۔ (یعنی بطلان اور فساد دونوں کا اس لفظ میں احتمال ہے اور یہ ظاہر فاسد ہونا مراد ہے، اس لئے کہ جیسا کہ مذکور ہوا) فساد کی علت غرر ہے اور ایجاب و قبول پایا جا رہا ہے۔

اس لئے یہ بیع فاسد ہے، بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ قبضہ کے بعد خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، البتہ اہم سوال یہ ہے کہ بیع فاسد کے ذریعہ جو چیز خریدی گئی ہے اگر اس کو نفع کے ساتھ فروخت کیا جائے تو وہ نفع حلال ہوگا یا نہیں؟ عام طور پر فقہاء نے اس کی بابت لکھا ہے: ”لا يطيب له الربح“۔

میرا خیال یہ ہے کہ ”لا يطيب له الربح“ حرمت یا کراہت تحریمی کا اظہار نہیں ہے، بلکہ اس سے کراہت تنزیہی کی طرف اشارہ ہے، اس سلسلہ میں علامہ بابر ترقی کی یہ عبارت قابل توجہ ہے:

”ورد بأن المبيع لو كان ما كولا لم يحل أكله ولو كانت جارية لم يحل وطؤها ذكره في شرح الطحاوى فلم يملك التصرف مطلقاً وأجيب بالمنع فإن محمداً نص في كتاب الاستحسان على حل تناوله، قال: لأن البائع سلطه على ذلك وذكر شمس الأئمة الحلواني يكره الموطأ ولا يحرم فالمذكور في شرح الطحاوى يحتمل على عدم



الطیب“ (عناہ مع الفتۃ ۲۰۲۶)۔

فقہاء کے یہاں بیع فاسد کی تعبیر بہت عام ہے، چاہے فساد کا سبب حق اللہ ہو یا حق العباد، ظاہر ہے کہ اگر فساد حق اللہ کی بنا پر ہو تب تو یہی حکم ہوگا، جیسے شراب کی بیع یا مردار وغیرہ کو معاملہ میں شمن کا درجہ دینا، لیکن اگر فساد بیع کا سبب حق العباد ہو جیسے اندیشہ غرر کہ شاید بائع خریدار کو بیع حوالہ ہی نہ کر پائے یا اندیشہ نزاع کہ ممکن ہے بیع کی تعیین میں آئندہ اختلاف پیدا ہو جائے تو اگر بیع خریدار کے حوالہ کر دی گئی اور نزاع پیدا نہ ہوئی تو وجہ فساد کا نہ پایا جانا متحقق ہو گیا، اس لئے اس صورت میں خیال ہوتا ہے کہ نفع کو حلال ہونا چاہئے، کیونکہ نہ بائع نے کسی حرام چیز کو بیع یا شمن کا درجہ دے کر شریعت کی بے حرمتی کی ہے، اور نہ دھوکہ دہی سے کام لیا ہے۔

یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ بیع قبل القبض کی ممانعت چونکہ حدیث میں ہے، اس لئے یہ صورت بھی شریعت کی بے حرمتی کے مترادف ہے، کیونکہ بیع قبل القبض کی ممانعت بذات خود مقصود نہیں، اگر ایسا ہوتا تو بیع استصناع اور بیع سلم کی بھی اجازت نہ ہوتی، مقصود لوگوں کو غرر سے بچانا ہے، یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے شرط کے ساتھ خرید و فروخت کو منع کیا گیا ہے، اور یہ بھی بیع فاسد ہے، لیکن اگر کوئی شرط معروف و مروج ہو جائے تو فقہاء نے اس کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، کیونکہ اصل مقصود نزاع سے بچانا ہے، اور جب کوئی چیز معروف و مروج ہو جاتی ہے تو وہ باعث نزاع نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے مضاربت اور شرکت کے بعض معاملات کو فاسد قرار دینے کے باوجود اس کے نفع کو حلال قرار دیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں مشائخ کے یہاں مجھے کوئی صراحت نہیں مل پائی، البتہ ماضی قریب کے معروف و ممتاز مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی نگاہ دور رس نے اس طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

”إن من البيوع الفاسدة مالوأتی بها أحد جازت ديانة، وإن كانت فاسده قضاء، وذلك، لأن الفساد قد يكون لحق الشرع بأن اشتمل العقد على مائم فلا يجوز بحال، وقد يكون الفساد لمخافة التنازع ولا يكون فيه شئ آخر يوجب الاثم، فذلك إن لم يقع فيه التنازع جاز عندی ديانة، وإن بقي فاسدا قضاء لأنتفاء علة الفساد وهي المنازعة، ويدل عليه مسائلهم في باب المضاربة والشركة، فإنه ربما تكون فاسدة مع أن الربح يكون طيبا وراجع ”الهدايه“ وبه الحافظ ابن تيمية في رسالته على أن من البيوع ما لا يقع فيه النزاع فتكون تلك جائزة فإذا دخلتها في الفقه وجدتها محظورة، لأن أكثر أحكام الفقه تكون من باب القضاء والديانات فيها قليلة، وإنما يصار إلى القضاء بعد النزاع، فإذا لم يقع النزاع ولم يرقع الأمر إلى القاضي نزل حكم الديانة لا محالة فيبقى الجواز“ (فيض الباری ۳، ۲۵۸)۔

(بیع کے بعض فاسد معاملات وہ ہیں کہ اگر کوئی ان کو کر ہی لے تو دیانہ جائز ہے گو قضاء فاسد ہے، اور وہ اس لئے کہ فساد کبھی حق شرع کی بنا پر ہوتا ہے، بائیں طور کہ انجام دیا گیا معاملہ کسی گناہ کو شامل ہو تو یہ کسی حال میں جائز نہیں، اور کبھی معاملہ اندیشہ نزاع کے تحت فاسد ہوتا ہے اور اس میں کچھ اور باعث گناہ نہیں ہوتا، تو اگر اس میں نزاع کی صورت نہ پیدا ہو تو میرے نزدیک یہ معاملہ دیانہ جائز ہے، گو یہ قضاء فاسد رہے گا، کیونکہ نزاع جو علت فساد تھی وہ موجود نہیں اور اس کی دلیل مضاربت و شرکت کے ابواب کے مسائل ہیں، کہ بعض اوقات یہ معاملات فاسد ہوتے ہیں، لیکن نفع حلال ہوتا ہے (اس سلسلہ میں ”ہدایہ“ سے مراجعت کی جاسکتی ہے)، نیز حافظ ابن تيمية نے اپنے رسالہ میں اس پر تشبیہ فرمایا ہے کہ جس بیع میں نزاع پیدا نہ ہو وہ جائز ہوگی، اگر تم اس کو باب فقہ میں داخل کر دو گے تو ناجائز پاؤ گے، کیونکہ فقہ کے اکثر احکام و قضاء کے باب سے ہوتے ہیں، اور دیانت کے احکام اس میں بہت کم ہوتے ہیں، قضاء کی طرف اسی وقت رجوع کیا جاتا ہے کہ نزاع پیدا ہوگئی ہو، لہذا اگر نزاع پیدا نہیں ہوئی اور معاملہ قاضی کے پاس نہیں گیا تو لا محالہ دیانت کا حکم جاری ہوگا اور جواز باقی رہے گا)۔

پس ”بیع قبل القبض“ فاسد ہے، قبضہ کے بعد اس پر خریدار کی ملکیت حاصل ہو جاتی ہے، اور اگر وہ فروخت کرے اور نفع حاصل ہو تو اس سے استفادہ کی گنجائش ہے، البتہ حاصل شدہ نفع کو صدقہ کر دینا بہتر اور قرین احتیاط ہے۔

قبضہ کی حقیقت کے بارے میں سوائے مولانا اخلاق الرحمن قاسمی کے سبھوں کا اتفاق ہے کہ یہ بنیادی طور پر عرف پر مبنی ہے، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی کا خیال ہے کہ ”قبضہ کے باب اور حد میں عرف کو دخل نہیں“، بلکہ خود شریعت نے اس کی حد مقرر کر دی ہے، چنانچہ حدیث میں وارد ہے: ”یا امرنا بانتقاله من

المكان الذی ابتعناہ فیہ الی مکان سواہ قبل أن نبیعه“۔



تاہم صحیح نقطہ نظر وہی نظر آتا ہے جس کا اظہار اکثر حضرات نے کیا ہے کہ شریعت نے قبضہ کی حقیقت اور حد کو قطعی طور پر بیان نہیں کیا ہے، بلکہ یہ ان الفاظ میں ہے جس کی حقیقت عرف سے متعین ہوگی، سیوطی وغیرہ نے اس سلسلہ میں اصولی بات لکھی ہے کہ:

”كل ماورد به الشرع مطلقا ولا ضابط له فيه ولا في اللغة يرجع فيه إلى العرف، ومثله بالحرز في السرقة والتفرق في البيع والقبض“ (الاشباه والنظائر للسيوطی ۱۹۶)۔

(شریعت میں جو لفظ مطلق وارد ہو، اور اس کی بابت نہ شریعت میں ضابطہ مقرر ہو اور نہ لغت میں تو اس میں عرف کی طرف لوٹنا یا جائے گا، چوری کے مسئلہ میں ”حرز“ (حفاظت) بیع میں ”تفرق“ نیز ”قبضہ“ سے فقہاء نے اس کی مثال دی ہے)۔

فقہاء حنفیہ میں علامہ علاء الدین کاسانی (بدائع الصنائع ۵/۲۲۴)، فقہاء مالکیہ میں ابوالبرکات ردیر (الشرح الکبیر علی ہاشم الدسوقی ۱۳۵۳)، شافعیہ میں نووی (شرح مہذب النووی ۹/۲۷۵)، اور حنابلہ میں ابن قدامہ (المغنی ۴/۹۰) کے یہاں صراحت ملتی ہے کہ قبضہ کا مفہوم عرف پر محمول ہے۔

چنانچہ خود روایتوں میں قبضہ کی مختلف صورتیں موجود ہیں، یعنی احادیث میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان منتقل کرنے کو قبضہ قرار دیا گیا ہے (دیکھئے: الموطا امام مالک ۲۶۳ عن عبد اللہ بن عمر)، بعض روایتوں میں خرید کردہ مال کو کجاوہ میں منتقل کر لینے کو قبضہ کہا گیا ہے (ابوداؤد ۲/۳۹۳، عن زید بن ثابت)، اور حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت میں ناپ تول کو قبضہ قرار دیا گیا ہے (مسلم ۵/۲)، اس لئے روایت میں قبضہ کی کوئی خاص صورت منقول ہو تو وہ قبضہ کے مفہوم کی تحدید و تعیین نہیں ہے، بلکہ قبضہ کی صورتوں میں سے ایک صورت کا بیان ہے، تاہم بنیادی طور پر فقہاء کے یہاں قبضہ تخلیہ سے عبارت ہے، علامہ کاسانی کے الفاظ میں:

”القبض هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة وحقيقة“ (بدائع الصنائع ۵/۲۲۴)۔

(قبضہ کے معنی تمکن و تخلی ہیں اور عرف و عادت اور حقیقت کے اعتبار سے موانع کے ختم ہو جانے کے ہیں)۔

گو فقہاء کے کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حنفیہ کا مسلک ہے، دوسرے فقہاء کے نزدیک صرف اموال غیر منقولہ میں تخلیہ قبضہ ہے، اموال منقولہ میں نہیں، لیکن میرے خیال میں کوئی جوہری اختلاف نہیں، بلکہ حنفیہ نے ”تخلیہ“ کے مفہوم میں وسعت پیدا کی ہے، اور تخلیہ حقیقی و حکمی کی دو صورتیں کر کے استیلاء کی تمام صورتوں کو اس میں سمیٹ لیا ہے، اور دوسرے فقہاء نے ”تخلیہ“ کو تخلیہ حقیقی تک محدود کر کے اس کا دائرہ نسبتہ تنگ رکھا ہے، اور اس کے مقابلہ میں قبضہ کی دوسری کیفیات متعین کی ہیں، اگر تخلیہ حکمی کی کیفیات شامی دیرہ کتب حنفیہ میں دیکھی جائیں اور اموال منقولہ میں قبضہ کی تفصیلات دوسرے فقہاء کی کتابوں میں، تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوگا۔

بہر حال فقہاء کی عبارات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ تسلیم کے لئے ”تخلیہ“ ضروری ہے، اور تخلیہ محض اس بات کا نام ہے کہ بیع اور خریدار کے درمیان کوئی رکاوٹ اور خریدار کے لئے مانع تصرف باقی نہ رہے، علامہ کاسانی کے الفاظ میں:

”فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتحلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه“ (بدائع الصنائع ۵/۲۲۴)۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بعض اشیاء میں اصل شئی پر قبضہ ممکن نہیں ہوتا، یا بہت دشوار ہوتا ہے، تو جہاں ایسی صورت درپیش ہو وہاں ”سند شئی“ کو اصل شئی کا درجہ حاصل ہوگا، اور سند پر قبضہ اصل پر قبضہ کے حکم میں ہوگا، میں اس کی دو مثالیں پیش کروں گا:

الف۔ اگر کوئی شخص ایک مقام سے روپیوں کا ڈرافٹ بنوا کر دوسرے شہر لے جائے اور اس کے بدلہ نقد رقم حاصل کرے تو یہ طرفین کی طرف سے تقابض فی المجلس ہی تصور کیا جائے گا، اور اس کا شمار بوائفاسد میں نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی اس نظیر سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جس میں مکان کی کنجی پر قبضہ کو مکان پر قبضہ کے حکم میں رکھا گیا ہے، کہ یہ اسناد بھی گویا سرمایہ کے لئے کلید ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔

البتہ میں نے جس قدر بھی غور کیا ہے یہ بات صحیح نظر نہیں آتی کہ محض کسی سامان کے نقصان کی ضمانت قبول کر لینے کو قبضہ تصور کیا جائے۔



## عرض مسئلہ:

### قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سوال نمبر ۲

مفتی محمد فہیم اختر ندوی

معزز علمائے گرامی قدر!

یہ عرض مسئلہ زیر بحث سوالنامہ کے دو جزء سے تعلق رکھتا ہے، پہلا جزء ”مختلف سامانوں میں قبضہ کی مطلوبہ نوعیت و صورت کیا ہے؟ اور دوسرا جزء قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کا دائرہ اور اس بابت مختلف ائمہ مجتہدین کی آراء اور دلائل کیا ہیں؟

ان دونوں اجزاء پر تمام مقالہ نگار علمائے کرام نے اپنی تحریروں میں کتب حدیث و فقہ کے متعلقہ مسائل اور ائمہ مجتہدین کی آراء اور ان کے دلائل کی تفصیلات کا عطر کشید کر کے اپنی اپنی ترتیب و اسلوب میں پیش فرمایا ہے، چونکہ یہ ساری تفصیلات بیشتر مقالات میں محض نقل و اقتباس کی حیثیت سے اور معدودے چند میں تبصرہ و رائے کے ساتھ آئی ہیں، اس لئے ان دونوں اجزاء کی بابت مقالہ نگار حضرات کے درمیان کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے، ہم ذیل میں بالترتیب ان دونوں اجزاء کے مشتملات اور اس بابت چند قابل غور نکات پیش کرتے ہیں۔

#### ۱۔ مختلف سامانوں میں قبضہ کی مطلوبہ نوعیت:

سوالنامہ میں یہ سوال ان الفاظ میں آیا ہے: ”اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق ہو گا یا دونوں میں قبضہ کی ایک ہی صورت ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کا جب یہ اتفاق ہے کہ قبضہ کی حقیقت میں لوگوں کا عرف ہی معیار ہے اور ہر شئی پر قبضہ اس شئی کی نوعیت کے لحاظ سے معتبر ہے، تو پھر اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی ایک ہی صورت کیونکر ہو سکتی ہے، تاہم اشیاء چونکہ بے شمار ہیں، اور ہر دور کا عرف و رواج بھی اس میں مؤثر ہوتا ہے، اس لئے فقہاء حنفیہ نے ایک ایسی جامع تحدید کرنی چاہی جو مختلف اشیاء میں معتبر قبضہ کی نوعیت پر محیط ہو، اور جس سے قبضہ کی کچھ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہو، چنانچہ انہوں نے منقولہ اور غیر منقولہ تمام اشیاء میں ”تخلیہ“ کو قبضہ قرار دیا، تخلیہ کا مفہوم علامہ کاسانی کے الفاظ میں یہ ہے کہ خریدار اور سامان کے درمیان رکاوٹ اس طرح دور کر دی جائے کہ خریدار کو اس پر تصرف کی قدرت حاصل ہو جائے، ظاہر ہے کہ تخلیہ اور اس کا یہ مفہوم اپنا ایک وسیع دائرہ رکھتا ہے جس میں حسی اور معنوی قبضہ کی بہتیری شکلیں سمٹ کر آ جاتی ہیں، جو مختلف اشیاء میں ان کی نوعیت کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ تخلیہ کو منقولہ و غیر منقولہ تمام اشیاء میں قبضہ قرار دیتے ہوئے، تفصیلات میں آ کر فقہاء حنفیہ خود مختلف اشیاء میں قبضہ کے اعتبار کے لئے علاحدہ علاحدہ شکلوں کو ضروری قرار دیتے ہیں، علامہ ابن عابدین شامی نے تخلیہ کو حکمی قرار دیتے ہوئے ”لکن ذلک یختلف بحسب حال المبیع“ کہہ کر اس ضمن میں جو مثالیں بیان کی ہیں، وہ اس حقیقت کی واضح غمازی کرتی ہیں۔

فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ نے بھی غیر منقولہ اشیاء جیسے مکانات و اراضی وغیرہ میں تخلیہ کو قبضہ مانا ہے، لیکن اشیاء منقولہ میں قبضہ کی شکلیں متعین کرتے ہوئے ناپ، تول، وزن اور عدد والی اشیاء میں انہی امور کی انجام دہی، جزافاً، یعنی مجموعہ کے بطور خرید و فروخت میں منتقلی، درہم و دینار جیسی چیزوں کو ہاتھ میں لے لینے وغیرہ کی مثالیں دی ہیں، ظاہر ہے کہ ان شکلوں کی تعیین مثالوں ہی کی حیثیت رکھ سکتی ہیں، اصولی تحدید اگر تلاش کی جائے تو مالکی، شافعی، اور حنبلی تینوں دبستان فقہ اس بابت عرف ہی کو معیار قرار دیتے ہیں، اور فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ کاسانی بھی مفہوم قبضہ کی تشریح میں ایک دوسرے مقام پر عرف کی اثر اندازی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ”لأن معنى القبض هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة وحقیقة“۔



ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فقہاء عظام نے اپنے اپنے دور کے عرف و رواج کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف اشیاء میں قبضہ کی مختلف شکلیں متعین فرمائی ہیں، اور احادیث و روایات میں گرچہ قبضہ کا کوئی متعین مفہوم و مصداق بیان نہیں ہوا ہے، لیکن قبضہ کی جن مختلف کیفیات کی جانب اشارے موجود ہیں، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ناپ تول، حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت میں اپنے کجاوہ میں منتقلی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں مقام خریداری سے دوسرے مقام تک منتقلی، ان کیفیات کو بھی بعینہ فقہاء نے ضروری نہیں قرار دیا ہے، جبکہ امام نووی نے تو صراحت فرمائی ہے کہ اپنے کجاوہ میں منتقلی کی شرط کے غیر لازمی ہونے پر اجماع ہے، ”وَأَمَّا التَّخَصُّصُ بِالرَّحَالِ فَخَرَجَ عَلَى الْغَالِبِ وَدَلَّ الْجَمَاعَ عَلَى أَنَّهُ لَيْسَ بِشَرَطٍ فِي أَصْلِ النُّقْلِ“ (المجموعہ ۹: ۲۸۳)۔

لہذا ہمارے سامنے قابل غور امر اب یہ آتا ہے کہ آج کے دور میں جہاں خرید و فروخت کے نئے نئے طریقے سامنے آگئے ہیں، تجارتی کاروبار بہت ہی تیز رفتار ہو گئے ہیں، سامانوں کی رسید، بلٹی، قیمتوں کی ادائیگی میں چیک، ڈرافٹ، کرنسیوں کے نقل و تبادلے اور مختلف اشیاء میں جاری کئے جانے والے سرفیکٹس وغیرہ کی بابت موجود عرف و رواج کو سامنے رکھتے ہوئے قبضہ کی کیا شکلیں اور کیفیات ہوں گی، اس سلسلہ میں اصولی اور تطبیقی دونوں طرح کی تحدید کی ضرورت ہے۔

## ۲۔ ممانعت بیع قبل القبض کا دائرہ:

قبضہ سے قبل خرید و فروخت کی ممانعت کے باب میں رسول اللہ ﷺ سے مروی احادیث بنیادی طور پر دو طرح کی ہیں، ایک جن میں طعام کی قید کے ساتھ ممانعت وارد ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے الفاظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مروی متعدد روایات، حضرت ابن عمرؓ کی متعدد روایات، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایات طعام کی صراحت کے ساتھ آئی ہیں، دوسری قسم کی روایات میں ممانعت علی الاطلاق ہے، حضرت حکیم بن حزام کی حدیث ہے: ”فَإِذَا اشْتَرَيْتَ بَيْعًا فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَقْبِضَهُ“ (مسند احمد)، اور ایک دوسری روایت میں ”بَيْعًا“ کی جگہ ”شَيْئًا“ کا لفظ ہے، اور حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث ہے: ”هِيَ أَنْ تَبَاءَ السَّلْعَ حَيْثُ تَبَاءَ حَتَّى يَجُوزَهَا التَّجَارُ إِلَى رِحَالِهِمْ“ (ابوداؤد)، ان دونوں احادیث میں ”کوئی چیز“ اور ”سامانوں“ کے الفاظ عمومی ممانعت کو بتا رہے ہیں، مگر روانہ کرتے ہوئے حضرت عتاب بن اسید کو دیئے گئے حکم ”أَنْ يَبِيعَ مَا لَمْ يَقْبِضُوهُ“ میں بھی عمومی ممانعت کا اسلوب ہے، ان دونوں کی احادیث کے علاوہ چند روایات ایسی بھی ہیں جن سے سامان یا قیمت میں قبضہ سے پہلے تصرف کی مثالیں ملتی ہیں، حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا حضرت عمرؓ سے اونٹ کی خریداری کے بعد قبضہ سے قبل حضرت ابن عمرؓ کو ہدیہ کر دینے، حضرت جابرؓ سے اونٹ کی خریداری اور قبضہ سے پہلے انہیں ہی ہدیہ کر دینے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں قبضہ سے قبل ثمن پر تصرف کے تذکرے ملتے ہیں۔

ان تینوں اقسام کی روایات کے پیش نظر فقہاء مجتہدین کے نزدیک اس بابت اختلاف رائے ہوا کہ قبضہ سے قبل خرید و فروخت کی ممانعت کا دائرہ کیا ہے، آیا یہ ممانعت تمام اشیاء کے لئے عام ہے یا حکم ممانعت سے کچھ چیزیں مستثنیٰ ہیں۔

پہلا رجحان حضرت امام شافعی، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام زفر نے اختیار فرمایا ہے، اور عمومی ممانعت والی روایات اور بالخصوص طعام والی روایات کے ایک راوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واضح خیال ”وَأَحْسَبُ كُلَّ شَيْءٍ مِثْلَهُ“ کی بنیاد پر حکم ممانعت کو بالکل عام قرار دیا ہے، فقہ شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے صاحب ”شرح المہذب“ صاف لکھتے ہیں: ”لَا يَجُوزُ بَيْعُ الْمَبِيعِ قَبْلَ قَبْضِهِ عَقَارًا كَانَتْ أَوْ مَنْقُولًا لَا يَأْذَنُ الْبَائِعُ وَلَا بَغِيرَ إِذْنِهِ لَا قَبْلَ آدَاءِ الشَّمَنِ وَلَا بَعْدَهُ“۔

امام ابو یوسف کی بھی ابتدائی رائے یہی تھی، اور ابن عقیل کی روایت کے مطابق حضرت امام احمد بن حنبل کا بھی ایک قول یہی ہے۔

دوسرا رجحان فقہاء حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا اختیار کردہ ہے، ان حضرات کی آراء میں گرچہ کافی اختلاف ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ ساری آراء حکم ممانعت سے کچھ اشیاء کو مستثنیٰ قرار دینے پر متفق ہیں۔

فقہاء حنفیہ میں سے امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف نے صرف اراضی و مکانات وغیرہ غیر منقولہ اشیاء کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، انہوں نے ایک جانب روایات جواز اور حلت بیع کے قرآنی حکم کے عموم اور دوسری جانب ممانعت والی روایات کے مقصد پر نظر رکھتے ہوئے علت کی بنیاد پر ان میں تخصیص اور دونوں آراء میں تطبیق کی راہ اپناتے ہوئے غیر منقولہ اشیاء میں جواز کی رائے دی ہے۔



فقہاء مالکیہ نے تمام غیر خوردنی اشیاء اور بلا تعین مقدار مجموعی طور پر خریدی ہوئی خوردنی اشیاء کو بھی مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے حکم ممانعت کو صرف ان اشیاء خوردنی کے دائرہ میں محدود رکھا ہے، جن کا حصول بطریق معاوضہ اور ناپ تول یا تعداد کے ساتھ ہوا ہو، امام مالک کی ایک دوسری روایت کی رو سے تمام مطعومات میں حکم ممانعت عام ہے، خواہ وہ جزافاً ہی کیوں نہ حاصل ہوئی ہوں۔

فقہاء حنابلہ کے نزدیک روایت المذہب کے مطابق صرف کیل، وزن، عدد اور ذراع کے ذریعہ خریدی گئی اشیاء قبضہ سے پہلے فروخت کی جاسکتی ہیں، خود امام احمد بن حنبل سے اس بابت متعدد روایات منقول ہیں، ابن عقیل کی اختیار کردہ ایک روایت کے مطابق حکم ممانعت عام ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ صرف خوردنی اشیاء خواہ وہ کیلی اور وزنی ہوں یا نہ ہوں، قبضہ سے پہلے فروخت نہیں کی جاسکتیں، ابن عبدالبر نے اسے ہی "الأصح عن أحمد" قرار دیا ہے، تیسری روایت کی رو سے قبضہ سے قبل فروختگی کا جواز صرف ان اشیاء میں ہے جو جزافاً، یعنی مجموعی طور پر خریدی گئی ہوں، ان کے علاوہ اشیاء میں ممانعت ہے۔

ان دونوں رجحان سے ہٹ کر تمام ہی اشیاء میں جواز کا ایک تیسرا شاہد رجحان عثمان الہتی اور عطا سے منقول ہے جس کے غلط و باطل ہونے پر بقول امام نووی اجماع نقل کیا گیا ہے، ابن عبدالبر کہتے ہیں: "هذا قول مردود بالسنة والحجة المجمعۃ علی الطعام"۔

### فقہاء کی آراء پر ایک نظر:

ان مختلف آراء پر بحیثیت مجموعی اگر نظر ڈالی جائے تو درج ذیل امور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ خوردنی اشیاء میں قبضہ سے قبل خرید و فروخت کی ممانعت پر تمام فقہاء متفق ہیں، فقہاء حنفیہ اور شافعیہ کی رائے تو واضح ہے، امام مالک نے کیل و وزن کی صورت میں ناجائز تو قرار دیا ہی ہے، جزافاً بھی قبضہ کے بعد ہی فروختگی کو انہوں نے اختلاف سے بچنے کے لئے بہتر بتایا ہے، "حکى القاضي أبو محمد أن مالكا استحب أن يباع بعد نقله ليخرج من الخلاف" (قوانين فقيهيه ۲۳۹، بداية المجتهد ۲، ۱۴۶، منتقى ۴، ۲۸۳)، اور امام احمد کی بھی صحیح روایت میں تمام خوردنی اشیاء کی خرید و فروخت بشمول جزافاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، ابن قدامہ کے الفاظ ہیں: "وهذا يدل على تعمير المنع في كل طعام مع تنصيصه على المبيع مجازفة" (المغني ۴، ۲۲۶)، اسی لئے ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کرتے ہوئے کہا ہے: "أجمع أهل العلم على أن من اشترى طعاماً فليس له أن يبيعه حتى يستوفيه" (سابق حوالہ)۔

۲۔ قبضہ سے قبل خرید و فروخت کا مسئلہ مجتہد فیہ ہے، تقریباً تمام فقہاء نے احادیث ممانعت کو معلول بالعلہ قرار دیا ہے، گوکہ انہوں نے علاحدہ علاحدہ علتیں ذکر فرمائی ہیں، بنیادی طور پر یہ علتیں تین ہیں: ربا، ربح مالم یضمن اور غرر، موجودہ تجارتی کاروبار میں ان علتوں کے وجود اور ان کے تناسب پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔



## عرض مسئلہ:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت  
سوال نمبر ۳، ۴، ۵

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

”بیع قبل القبض“ سے متعلق سوال نمبر ۳ تا ۵ کا عرض پیش خدمت ہے، سوال نمبر ۳ یہ ہے کہ: اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

اس بابت فقہاء کے کلام میں اگرچہ قبضہ کی ایک اصطلاحی و اصولی حیثیت و حقیقت کا تذکرہ ملتا ہے، بالخصوص حنفیہ کے یہاں، لیکن مذاہب اربعہ کے محققین کی صراحت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک یہ امر اتفاقی ہے کہ ہر شئی میں قبضہ کی ایک ہی صورت متعین و مطلوب نہیں، بلکہ اشیاء کے اختلاف کے ساتھ ان کے مناسب صورت و شکل کا اعتبار ہوگا اور اس میں بنیادی چیز عرف ہے، جیسا کہ ”لفقہ الاسلامی“ میں ذکر کیا گیا ہے، اس لئے اس بابت قبضہ حسی و قبضہ حقیقی و تقدیری کی گفتگو و بحث بھی آتی ہے، تفصیل کے لئے مذاہب اربعہ کی کتب مثلاً ”در مختار و رد المحتار، شرح الکبیر علی ہامش الدسوقی، الوجیز للامام الرافعی، المغنی لابن قدامہ“ ملاحظہ کی جائیں، فقہ حنفی کی ایک قدیم و معتد کتاب ”المنتفہ فی الفتاویٰ“ میں اس بابت یوں تفصیل آئی ہے:

قبضہ کی پانچ صورتیں ہیں:

اول۔ انگور کے باغ اور مکانات، نیز ایسی جگہیں جس کا دروازہ اور بند کرنے کا کوئی نظام ہو تو یا تو بیچنے والا کنجی دے دے، ورنہ خریدار اگر اندر تک پہنچے اور بیچنے والا کہے کہ میں نے اس کو تمہارے سپرد کر دیا تو کافی ہے۔

دوم۔ زمین (یعنی خالی زمین جیسے کھیت) پر قبضہ تو اس کی صورت اس زمین پر پہنچنا ہے اور اس کو دیکھ لینا ہے۔

سوم۔ جانور پر قبضہ، اس کی صورت یہ ہے کہ جانور ایسی جگہ و ایسے حال میں ہو کہ خریدار اس کو اپنے ہاتھ و تصرف میں لے سکے۔

چہارم۔ ناپی و تولی جانے والی چیز پر قبضہ۔ اگر خریدار اس کو اپنے برتن میں تول لے یا بیچنے والا اس کے سامنے تول دے یا وکیل کی موجودگی میں تو قبضہ ہو جائے گا، اس طرح اگر خریدار نے برتن دے دیا اور اس کی غیر موجودگی میں تول لے لیا تو بھی امام ابو حنیفہ وغیرہ کے یہاں قبضہ ہے۔

پنجم: دیگر اشیاء پر قبضہ، تو اس کی صورت یہ ہے کہ ان کو خریدار کے سپرد کر دیا جائے، یا اس حال میں کر دیا جائے کہ خریدار جو چاہے کر سکے (المنتفہ فی الفتاویٰ، ۴۸۰، ۴۸۱)

اس سوال کے تحت تمام مقالہ نگار حضرات مذکورہ تفصیل پر متفق ہیں، اور اس بابت عرف کا بھی تذکرہ کیا ہے، نیز بعض حضرات، جیسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد زید مظاہری صاحب وغیرہ نے خصوصیت سے قبضہ حسی و قبضہ حکمی کی تفصیل کی ہے، البتہ اعظم گڑھ اور گجرات کے اکثر حضرات نے قبضہ کی بابت اصولی بات تخلیہ کی جو کہی گئی ہے اس کی بنیاد پر فرمایا ہے کہ فرق نہیں ہے، یا یہ کہ فرق نہ ہونے کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ مذکورہ تفصیل ان میں سے اکثر حضرات کے کلام میں آئی ہے۔

اس گفتگو کو حضرت مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی کی تحقیق پر ختم کرنا مفید معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عہد میں۔ معاملات کے باب میں امامت و اجتہاد کے منصب پر فائز تھے جس کی شاہدان کی گرفتار کتاب، عطر ہدایہ ہے اور دوسرے معاصر ارباب افتاء نے اس کی فی الجملہ تائید ہی کی ہے وہ فرماتے ہیں:

پھر اس امر میں کہ قبضہ معتبر کس طور کا ہے، فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، جن سب کا مرجع عرف پر ہے، اور ہے بھی بات کہ قبضہ کوئی شرعی ایجاد نہیں، جسے لوگ



قبضہ سمجھتے آئے وہی شرع میں بھی قبضہ سمجھا گیا۔

خصوصاً اس زمانہ میں اس اعتبار قبضہ کو وسعت دینے کی سخت ضرورت ہے، مثلاً چھکڑے مالوں سے بھرے آتے ہیں، اور کھڑے کھڑے کئی بار بک کر آخر کار مال اتارا جاتا ہے، تو ہر بار کسی قسم کی نقل و حرکت میں غالباً مصارف اصل کے قریب یا زیادہ بڑھ جائیں گے، پس ضرورتاً (۱) بلٹی، (۲) قول قبضہ سمجھ لیا جائے، مثلاً مال کی بلٹی پر دستخط کر کے حوالے کر دے یا بیچ کر کہہ دیا کہ تم لے لو، یہ قبضہ ہے، کیونکہ عرف موجودہ میں یہ تمام امور قبضہ جائز مقصود ہوتے ہیں اور ان سے مشتری کو باقاعدہ تصرف کا اختیار ہوتا ہے (عطر الہدایہ ص ۴۸)۔

### سوال نمبر ۴:

سوال نمبر ۴ میں یہ بات آئی ہے کہ اس بابت ممانعت کی احادیث معلول بالعتہ ہیں یا نہیں اور یہ کہ اگر معلول ہیں تو علت کیا ہیں؟

”بیع قبل القبض“ سے متعلق نہیں کی احادیث کی بابت اگرچہ مالکیہ و حنفیہ کے یہاں ایک رجحان نہیں کے تعبیری اور غیر معلول ہونے کا پایا جاتا ہے (جیسا کہ فقہ المذاہب الاربعہ ۲۳۵/۲ اور البدائع ۵/۲۴۴ میں تذکرہ آیا ہے)، مگر عموماً فقہاء کا رجحان یہ ہے کہ یہ احادیث و نہیں معلول ہے، یہی وجہ ہے کہ مقالہ نگار حضرات میں سے اگرچہ بعض نے تعبیری اور غیر معلول ہونے کے پہلوؤں کو کئے ہیں، مگر سب اس پر متفق ہیں کہ یہ احادیث معلول ہیں۔

اور علت کیا ہے؟ تو اس بابت کئی چیزوں کا تذکرہ آیا ہے، زیادہ تر حضرات نے ترتیب اور تین علتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۔ غرر انفساخ العقد: جس کا مطلب یہ ہے کہ بیع کا معاملہ طے پا جانے کے بعد۔ اگر خریدار نے مال پر قبضہ نہیں کیا تو اس کا اندیشہ پایا جاتا ہے کہ اس کے قبضہ سے پہلے خرید کردہ سامان ضائع ہو جائے اور پھر فروخت کنندہ اس کو سپرد کرنے اور خریدار اس کو حاصل کرنے سے عاجز ہو جائے اور نتیجہ عقد کو فسخ کرنا پڑے، اس لئے کہ عقد بیع میں ”بیع“ خرید کردہ سامان ہی اصل ہوتا ہے۔

۲۔ ربح الم یضمّن: جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی سامان کسی شخص کے ضمان میں داخل ہوتا ہے، اور ضمان میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سامان کا ضیاع و نقصان اس شخص کی ملک و اثاثہ کا ضیاع و نقصان شمار کیا جائے، اور خریدار جب تک کہ خرید کردہ سامان کو اپنے قبضہ میں نہ لے وہ اس کے ضمان میں نہیں آتا، لہذا قبضہ سے پہلے اس کو فروخت کر کے اس سے نفع حاصل کرنا۔ ایسے مال سے نفع حاصل کرنا ہے جو کہ ضمان میں داخل نہیں ہوا۔

۳۔ ربا و سود کے پہلو کا پایا جانا: اور وہ یوں کہ جب ایک آدمی ایک سامان کو خرید کر قبضہ و ہاتھ میں لئے بغیر دوسرے کے ہاتھ سے بیچے گا تو حاصل معاملہ یہ نکلے گا کہ اس نے سو روپے کا سامان خرید کر ایک سو بیس میں دیا۔ اور یوں فروخت کنندہ اول کو سو روپے جو دیئے اس کے مقابلہ میں ایک سو بیس حاصل کر لئے، درمیان میں نہ سامان اپنے ہاتھ و قبضہ میں لیا اور نہ ہاتھ سے دیا۔

مولانا محمد برہان الدین سنہجلی، مولانا اختر امام عادل صاحب نے بعض دوسری علتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جیسے بعض دوسرے حضرات نے غیر مقدور التسلیم ہونے یا مزدوروں کی منفعت کے ضائع ہونے کا ذکر کیا ہے، (ان چیزوں کا تذکرہ مبسوط سرخسی اور الفقہ علی المذاہب وغیرہ میں آیا ہے)، مگر زیادہ تر مذکورہ بالا تین علتوں کا تذکرہ مقالہ نگار حضرات نے کیا ہے، اور چند ہی حضرات ہیں جنہوں نے تیسری علت کا تذکرہ کیا ہے، کسی نے مالکیہ کی طرف نسبت کر کے اور کسی نے مطلقاً۔ جن میں مفتی شکیل احمد صاحب (دارالعلوم اسلامیہ بستی) نے صرف اسی علت کے ذکر و بیان پر اکتفاء کیا ہے اور اس کو مدار حکم قرار دیا ہے۔

ایک بڑی جماعت نے دوسری علت کا تذکرہ کیا ہے جن میں مولانا عبدالقیوم پالنپوری و مولانا عبداللطیف پالنپوری نے اس پر اکتفاء کیا ہے اس کے ساتھ غیر مقدور التسلیم ہونے کو ذکر کیا ہے۔

اور پہلی علت کا معاملہ یہ ہے کہ مفتی شکیل احمد، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا عبداللطیف پالنپوری صاحبان کے علاوہ بقیہ تمام حضرات اس کے ذکر پر متفق ہیں، اور غرر کی مناسبت سے بعض مقالہ نگار حضرات نے ”غرر“ کی تحقیق و تفصیل بھی کی ہے، خصوصیت سے مولانا خالد صاحب، مولانا نسیم احمد صاحب، مولانا ارشاد صاحب بھاگلپوری اور اسی علت ”غرر انفساخ عقد“ کا عموماً فقہاء حنفیہ نے تذکرہ کیا ہے اور بعض محققین کی صراحت اور بعض مقالہ نگار حضرات کی نقل کے مطابق حنفیہ اور شافعیہ و حنابلہ اس پر متفق ہیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۴، ۴/۷۳)، ربا کے پہلو کا تذکرہ مالکیہ کے یہاں ملتا ہے، جن کے اس بابت کئی



اقوال ہیں، جن میں یہ زیادہ معروف ہے، اور "ربح مالہ یضمن" کا تذکرہ بھی فقہاء حنفیہ، اور دیگر بعض حضرات کے یہاں ملتا ہے، بلکہ امام طحاوی وغیرہ نے نیز بعض معاصر محققین نے اسی پر اکتفاء کیا ہے یا یہ کہ اس کو کثرت و اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو مکملہ فتح الملہم اور اعلاء السنن نیز امداد الفتاویٰ وغیرہ)، ان علتوں میں سے اہم و اساسی کون سی علت ہے، جبکہ ایک سے زائد علتوں کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے، اور کیا جاسکتا ہے، تو جائزہ لینے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ روایات کی رو سے ان میں سے دو زیادہ اہم ہیں، یعنی دوسری و تیسری۔ ربح مالہ یضمن اور ربا کا پہلو۔ ایک تو اس لئے کہ ان دونوں کے احاطہ سے معاملہ کی کوئی صورت خارج قرار نہیں پاتی۔

برخلاف پہلی علت کے کہ اس کے تحت ہی امام ابوحنیفہ کی طرف سے منقول و غیر منقول۔ اور زمین و جائداد نیز دوسری چیزوں کا فرق کیا جانا معروف ہے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ہو جانے کے بعد قبضہ سے پہلے خرید کردہ شے کے ضیاع کا تصور و اندیشہ زمین و مکان میں نہیں پایا جاتا، ایک دو صورتوں کے علاوہ جن کا "فتح القدیر" وغیرہ میں استثناء بھی آیا ہے۔

دوسرے یہ کہ دوسری و تیسری علت کے روایات و آثار میں وارد ہونے کی وجہ سے ان میں نص و منصوص ہونے کا پہلو پایا جاتا ہے۔

تیسری علت، یعنی ربا کا پہلو، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے، اس کی وضاحت اور قوت سند کی وجہ سے کہ اس کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے، علامہ شوکانی نے اس کو اہمیت دی ہے، اور مولانا ظفر احمد صاحب نے بھی استحسان ذکر کیا ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۵، مسلم مع کملہ ۱/۳۵۳)۔

اور دوسری یعنی "ربح مالہ یضمن" مرفوعاً ثابت وارد ہے، اسی لئے مولانا تقی صاحب عثمانی نے "مکملہ فتح الملہم" میں اس کو علت منصوصہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ قبل القبض بیع کی ممانعت سے متعلق روایات میں مختلف الفاظ آئے ہیں، لیکن وہ عموماً ہم معنی اور ایک مفہوم کو ادا کرنے والے ہیں، البتہ ایک لفظ "نھی عن ربح مالہ یضمن" بھی آیا ہے جس کو حضرات عبداللہ بن عمرو بن عاص کے واسطے سے متعدد محدثین نے روایت کیا ہے، نیز حضرت عتاب بن اسید سے بھی مروی ہے، سنن اربعہ کے علاوہ مستدرک حاکم اور بیہقی کی سنن کبریٰ و مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں بھی آئی ہے اور امام محمد نے بھی کتاب الآثار میں اس کو روایت کیا ہے، امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے، مقالہ نگار حضرات میں مولانا ارشاد احمد صاحب بھگلپور (ریاض العلوم گورینی) نے اس حدیث کی تخریج تفصیل سے کی ہے۔

ائمہ حدیث و فقہ میں امام احمد نے اس کو قبل القبض بیع کی ممانعت پر ہی محمول کیا ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے، اور امام طحاوی نے اس نہی و ممانعت کو ربح مالہ یضمن پر محمول کیا ہے، جیسے کہ امام محمد نے بھی اس کو اختیار کیا ہے (کتاب الآثار ص ۱۶۱)۔

اس لئے یہ لفظ "الحديث يفسر بعضه بعضا" کے قاعدہ سے اس نہی و ممانعت کی علت کو بتاتا ہے، اور یوں یہ اس حکم و ممانعت کی علت منصوصہ قرار پاتی ہے۔ اور مذکورہ تینوں علتوں میں راجح یہی علت معلوم ہوتی ہے، جس کی متعدد وجوہ ہیں۔

اول تو یہ کہ یہ منصوص ہے اور خود شارع علیہ السلام کی زبان سے صادر ہوتی ہے۔

دوم یہ کہ اس سے اس باب کا کوئی جزئیہ باہر نہیں قرار پاتا، سوم یہ کہ فقہاء نے بیع قبل القبض کے تحت جو جزئیات ذکر کئے ہیں، اور جو فتاویٰ تحریر کئے ہیں، ان سے جس کثرت و وسعت سے اس کا اعتبار ظاہر ہوتا ہے دوسری علت کا نہیں۔

چہارم۔ یہ کہ یہ علت صرف خرید و فروخت کے باب میں ہی معتبر و موثر نہیں مانی گئی ہے، بلکہ دوسرے ابواب و معاملات، مثلاً شرکت و مضاربت وغیرہ میں بھی اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔

پنجم: دوسرے بعض نبوی ارشادات جو کلیہ اور قواعد فقہیہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسے "الخراجه بالضمائم" اور "الغنم بالغرم"۔ مولانا تقی صاحب نے "مکملہ فتح الملہم" (۱/۳۵۳) کے حاشیہ میں ان احادیث کا تذکرہ کیا ہے، نیز مولانا ظفر احمد صاحب نے "اعلاء السنن" میں جہاں تک ربا کے پہلو والی علت کا معاملہ ہے تو وہ موقوف ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اجتہاد پر مبنی ہے، جیسا کہ مولانا تقی صاحب نے ذکر کیا ہے (کملہ ۱/۳۵۳)، پھر یہ کہ اس کے تحت ربا و احتمال ربا کا جو اعتبار کیا گیا ہے تو وہ براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ ہے کہ دو معاملے مل کر یہ بات پیدا کرتے ہیں، اور اس طرح کی بالواسطہ صورتیں خود شارع علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ساقط ہیں، معروف ہے کہ اچھی کھجور ایک کیلو، بمقابلہ دو کیلو معمولی کھجور کے آپ ملے گا، یعنی منع فرمایا اور بالواسطہ اجازت دے دی کہ ایک کیلو کو بمقابلہ نقد فروخت کر کے، پھر نقد سے دو کیلو خرید لو، تو وہی آدمیوں کے درمیان ایک معاملہ

دو کر دیا کر دیا گیا، تو درست قرار پا گیا، یہاں تو تین کے درمیان معاملہ ہوتا ہے۔

اور معرفت علت، غرر انفساخ للعقد بھی اس سے الگ نہیں، اس لئے کہ اس کو مؤثر ماننے کا باعث یہی ہے کہ قبضہ سے پہلے ہلاک ہو جانے کی صورت میں خرید کردہ سامان خریدار کے ضمان میں نہیں آئے گا، لہذا قبضہ سے پہلے فروخت کا معاملہ اس خدشہ و اندیشہ کے ہوتے ہوئے ”ربح مالہ یضمن“ پر ہی مشتمل و مبنی ہوگا، یہی وجہ ہے کہ بعض محققین کے کلام میں یہ دونوں علتیں مل جلی آئی ہیں (ملاحظہ ہو: مکملہ فتح الملہم ۱/۳۵۳)۔

پھر یہ کہ اس علت کے تحت عقار کے استثناء میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ہلاکت نادر ہے، دو ہی ایک صورتوں میں مقصود ہے۔ تو معاملہ یہ ہے کہ عقار کے ماسوا تمام منقولات میں بھی یہ ہلاکت نادر نہ سہی، لیکن ایسی واقعی و عام بھی نہیں کہ اس کو مدار حکم ہی مان لیا جائے، فقہ حنفی کی رو سے بھی یہ یوں اہم ہے کہ امام محمد نے مؤطا اور کتاب الآثار دونوں میں اس مسئلہ کے ذکر کے ساتھ امام صاحب کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے، مؤطا میں قبل القبض بیع سے ممانعت کی حدیث آئی ہے اس کے تحت اور ”کتاب الآثار“ میں بواسطہ امام ”نھی عن ربح مالک یضمن“ والی حدیث آئی ہے، اور ”قبل القبض بیع“ سے ممانعت والی روایت نہیں آئی ہے، تو ”کتاب الآثار“ میں اس حدیث کے تحت اختلاف کا تذکرہ کیا ہے، اور دوسری کوئی وجہ و علت ذکر نہیں فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

”قوله ﷺ: ربح مالہ یضمن۔ فالرجل یشتري الشيء، فليبيعه قبل أن يقبض بربح فليس، فيبغى له ذلك وكذلك لا يبغى له أن يبيعه شيئاً اشتراة حتى يقبضه، وهذا كلة قول أبي حنيفة فيه إلا في خصلية واحدة“ (کتاب الآثار للامام محمد ص ۱۶۲، ۱۶۱)، اس علت کی روشنی میں دو چیزوں کو طے کیا جاسکتا ہے، ایک تو قبضہ کی حقیقت اور دوسرے اس بابت تخصیص و استثناء کا مسئلہ مختصر بات یہ کہ جب علت، ربح مالہ یضمن قرار پاتی ہے تو کسی چیز کی خریداری کے بعد وہ امر و حال۔ قبضہ شمار ہوگا، کہ جس کے بعد خرید کردہ شیء کا ضمان بائع کی طرف سے خریدار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، خواہ شرعاً خواہ عرفاً۔

اور یہ کہ اصل نہی و ممانعت سے کوئی شیء باہر و خارج قرار نہیں پائے گی، جیسا کہ مجموعی روایات کا تقاضا ہے، بلکہ حکم عام ہوگا، اور منقول و غیر منقول اور عقار و غیر عقار سب میں ہی دیکھا جائے گا، کہ انتقال ضمان اور اس کی بنیاد پر معاملہ پایا جا رہا ہے یا نہیں، اس موقع سے یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ عموماً ”نھی عن بیع مالہ یقبض“ اور ”نھی عن ربح مالہ یضمن“ الگ الگ آیا ہے، لیکن ”کتاب الآثار“ بروایت امام ابو یوسف میں اور بروایت امام محمد میں بھی ایک موقع پر ایک ہی روایت آئی ہے، ”نھی عن ربح مالہ یضمن، و عن بیع مالہ یقبض“۔ ایک روایت کو دوسرے پر محمول کرنے کی وجہ سے یہ عطف تفسیری قرار دیا جائے گا، اور گزر چکا ہے کہ ائمہ فقہ و حدیث امام محمد، امام احمد، امام ترمذی و امام طحاوی اس کے قائل ہیں، امام صاحب کے استدلال میں اہتمام سے جو ”غرر“ کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ خود ان سے منقول نہیں، بلکہ بظاہر ہمارے فقہاء کی تفسیح ہے، جس سے صرف عقار کا استثناء ہے جو کما صلاً حضرت عثمان کے اثر و عمل پر مبنی ہے اور یوں اس اصل و نص سے خارج ہے۔

سوال نمبر ۵: سوال نمبر ۵ یہ ہے کہ ممانعت عام ہے یا یہ کہ اس میں استثناء بھی ہے، اور ائمہ کی آراء و دلائل کیا ہیں؟

اس سلسلہ میں تمام مقالہ نگار حضرات نے کتب فقہ و شروح حدیث کے اندر اس مسئلہ میں جو اختلاف مشہور ہے، اس کا اختصار و بسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، متعدد حضرات نے مذاہب کو تفصیل و وضاحت سے، نیز دلائل کو بھی بسط و تفصیل سے ذکر کیا ہے، مثلاً مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا اختر امام عادل، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد، مولانا ارشاد احمد صاحب اور بعض حضرات نے اس سلسلہ کی روایات کا بھی استقصاء کرنے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ و معروف اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ بعض تابعین حضرت عطاء وغیرہ سے مطلقاً جواز منقول ہے، مگر اس کو شاذ قرار دیا گیا ہے، جمہور علماء امت کے نزدیک ممانعت ہی کا قول ہے، البتہ تخصیص و تفصیل میں اختلاف ہے، اور اتفاق سے چاروں اماموں و مذاہب کی آراء باہم مختلف ہیں، لیکن ان کو دورایوں میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ امام مالک و امام احمد تو صرف کھانے پینے کی چیز میں ممانعت کے قائل ہیں، البتہ امام مالک کھانے پینے کی ان اشیاء کو ممنوع کہتے ہیں جن میں ناپ و تول کا عمل متعارف و رائج ہے۔ (اس بابت ان حضرات کے دوسرے اقوال بھی ملتے ہیں، جیسا کہ مکملہ فتح الملہم، اعلاء السنن وغیرہ میں آیا ہے)۔ اور امام ابو حنیفہ و امام شافعی۔ اس ممانعت کو عام قرار دیتے ہیں، کوئی بھی شے ہو کھانے پینے کی یا ناپ و تول کی، یا پیمائش، مثلاً کپڑا، زمین و مکان وغیرہ، ہاں امام ابو حنیفہ ایسی زمین و مکان کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، جس میں اس کے حال کو دیکھتے ہوئے ضیاع کا اندیشہ نہ ہو، اور جس میں اندیشہ ہو، مثلاً مکان کی بالائی منزل، اور دریا وغیرہ کے ٹھیک کنارے بنے ہوئے مکانات و زمین جس میں ضیاع کا احتمال ایک درجہ قوی ہوتا ہے، ایسے زمین و مکان کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، اور موجودہ



عہد کے مضبوط ٹھوس لوہے و سمنٹ وغیرہ کے طرز تعمیر کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اب اس طرح کا قوی اندیشہ اور لائق لحاظ نہیں ہو گیا ہے اور حنفیہ کے یہاں جو فرق و تفصیل ہے اس کے لئے معروف تعبیر یہ ہے کہ منقول میں منع ہے اور غیر منقول میں نہیں۔

دلائل۔ ان سب کے اصلاً نقل و احادیث سے ہیں، اگرچہ دلیل و استدلال میں حکم کی علت کا تذکرہ بھی فقہاء کرتے ہیں، مگر علت نص صریح کے ہوتے ہوئے ثانوی چیز ہے۔

اور فرق و تفصیل کے اعتبار سے مالکیہ و حنابلہ کا مذہب توسع زیادہ رکھتا ہے، جبکہ امام شافعی کا مذہب سب سے تنگ ہے۔

امام احمد و امام مالک نے ان روایات کو دیکھا ہے جن میں اس بابت ”طعام“ کا لفظ آیا ہے، یہ روایات حضرت عبداللہ بن عباس (بخاری) حضرت عبداللہ بن عمر (بخاری و مسند احمد) حضرت ابو ہریرہؓ (مسلم)، حضرت جابر (مسلم) وغیرہ سے مروی ہیں، بعض میں جیسے حضرت ابن عمر کی روایت میں کیل و وزن کی قید آئی ہے، جس کو امام مالک نے اہمیت دے کر حکم کو مقید کر دیا ہے۔

ان روایات کے علاوہ بعض روایات ایسی ہیں جن میں ایسا کوئی لفظ نہیں، بلکہ مطلق بیع کا تذکرہ ہے، یا کسی بھی شے کی بیع کا، جیسے حضرت حکیم بن حزام کی روایت (مسند احمد)، حضرت زید بن ثابت کی (ابوداؤد و مستدرک حاکم وغیرہ) عبداللہ بن عمرو بن عاص کی (ترمذی وغیرہ)، نیز عتاب بن رشید کی (کتاب الآثار وغیرہ)۔ یہ روایات بھی صحیح قرار دی گئی ہیں، امام احمد، امام مالک ان مطلق روایت کو پہلی قسم کی مقید روایات پر محمول کر کے حکم کو خاص قرار دیتے ہیں۔

لیکن امام ابو حنیفہ و امام شافعی کا رجحان یہ ہے کہ دونوں روایات صحیح و ثابت ہیں، ایک دوسرے پر محمول نہیں ہیں، جبکہ دوسری قسم کی روایات میں صاف لفظ ”إلا تبع ما لم يقبضه“ اور ”فهي أن تباع السلعة حيث تباع حتى تجوزها التجار إلى رحالهم“ وغیرہ جیسے الفاظ آئے ہیں، پھر یہ کہ کھانا و پینا جیسی عام اشیاء ضروریہ میں جب پابند بنا جا رہا ہے تو دوسری اشیاء میں بدرجہ اولیٰ پابندی ہوگی۔

اب رہا امام ابو حنیفہ و امام شافعی کے درمیان اختلاف کہ امام صاحب غیر منقول یا عقار کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، تو اگرچہ بعض مقالہ نگار حضرات نے فرمایا کہ امام صاحب مقصود و غرض کا لحاظ فرماتے ہیں (مقالہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جیسے حکم میں عموم روایت کی وجہ سے اختیار کیا ہے اسی طرح یہ خصوص بعض آثار کی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ امام بیہقی و امام طحاوی نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت طلحہ سے ایک زمین مدینہ منورہ کی خریدی، اپنی زمین کے بدلہ جو کہ کوفہ میں تھی، اور فرمایا کہ میں تم سے ایسی چیز فروخت کر رہا ہوں جو کہ میں نے دیکھی نہیں اور حضرت جبیر بن مطعم نے اس خرید و فروخت کی صحت کا فیصلہ کیا جبکہ قضیہ ان کے سامنے لایا گیا (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۹)۔

مقالہ نگار حضرات میں بعض ہی نے اس دلیل کا تذکرہ کیا ہے، عموماً عقلی دلیل پر اکتفاء کی گئی ہے، اور اس اثر و دلیل کی بابت صاحب مغنی ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحابہ کرام کے اتفاق کی دلیل ہے کہ اس قسم کی خرید و فروخت درست ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۵)۔

ان مذاہب و آراء میں نقل و عقلا راجح۔ عموم کا، یعنی امام شافعی و امام ابو حنیفہ کا مذہب ہی معلوم ہوتا ہے (امام صاحب کے نزدیک جو استثناء ہے اس کے ساتھ) اس لئے کہ:

۱۔ عام ممانعت کے متعلق متعدد صحیح و صریح احادیث موجود ہیں اور مطلق کو مقید قرار دینا خلاف اصل ہے۔

۲۔ جن حضرات سے طعام کی قید کے ساتھ روایات آئی ہیں خود ان سے مرفوعاً و موقوفاً عموم منع کی بات بھی منقول ہے، مثلاً حضرت زید بن ثابت کی روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی نقل کیا ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بہت معروف ہے کہ انہوں نے طعام سے ممانعت کی روایت نقل کی ہے، اور اس کے بعد فرمایا: ”وا حسب كل شئ مثله“ (میں تو تمام چیزوں کو ایسا ہی سمجھتا ہوں)۔

۳۔ اس ممانعت و حکم کی معروف علتیں جن کا حنابلہ و مالکیہ وغیرہ نے بھی اعتبار کیا ہے، ان سب کا تقاضا بھی یہی ہے، خواہ وہ غرر اور ”رجح الملم يضمن“ ہو یا سود کا پہلو۔ اور غیر مقدور و غیر مقبوض کی خرید و فروخت وغیرہ۔

البتہ حالات و موجودہ عرف کو دیکھتے ہوئے حنابلہ و مالکیہ کے مذہب میں جو وسعت ہے اس سے فائدہ ضرور اٹھایا جاسکتا ہے، متعدد مقالہ نگار حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے، مگر غور کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں، اس لئے کہ اس وقت ہر شے کی خرید و فروخت بڑے پیمانے اور دروازہ علاقوں سے ہو رہی ہے، اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ عرف کے مطابق ضمان میں آجانے کے بعد معاملات و امور کو قبضہ قرار دیا جائے، اور اس کے بغیر خرید و فروخت کو منع کیا جائے، جیسا کہ مولانا فتح محمد صاحب نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے اور دوسرے معاصر ارباب فقاہت و محققین فقہاء نے بھی ذکر کیا ہے۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

سوال نمبر ۶، ۷

مفتی نسیم احمد قاسمی

اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے مجھے ”بیع قبل القبض“ کے سوال نمبر ۶ و ۷ پر عرض مسئلہ کا حکم دیا گیا ہے، سوال نمبر ۶ یہ تھا:

ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار نمبر (۲) کو روانہ کر دیتا ہے، اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آتی ہے، نہ خریدار نمبر (۲) پر، بلکہ یہ اسی شخص (خریدار نمبر (۱) کا نقصان قرار پاتا ہے، اس صورت معاملہ میں اگر فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر اگرچہ حسی قبضہ نہیں ہوا، لیکن وہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے سے پہلے اس کے ضمان میں رہا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ”بیع مالم یضمن“ (ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) حاصل کیا، بلکہ اس نے مال مضمون پر نفع حاصل کیا ہے، سوال یہ ہے کہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے کی طرف سے قبضہ حسی نہ پائے جانے کی وجہ سے دوسرے شخص کے ہاتھ اس فروختی کو ناجائز قرار دیا جائے گا یا ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا؟۔

اس سوال کے جواب میں اکیڈمی کوکل ۵۰ مقالات موصول ہوئے جن میں ۳۸ مقالہ نگاروں نے صورت مسئلہ کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ ۱۱ مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے، ۲ مقالہ نگاروں نے اس میں تفصیل ذکر کی ہے، قائلین جواز کے اسما حسب ذیل ہیں:

مجوزین:

مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا شکیل احمد سیتا پوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مولانا عزیز اختر قاسمی، حکیم ظل الرحمن، مولانا محمد زید ندوی، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا سید محمد ایوب، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا محمد خورشید احمد اعظمی، مولانا احمد دیولوی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی انور علی اعظمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا محمد نور قاسمی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولوی مجاہد الاسلام سنبھلی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی محبوب علی وجیہی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مفتی شاہین جمالی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابوالحسن علی، مولانا محمد شہزاد اکرم قاسمی، مولانا سعود احمد انصاری، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام قاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا محمد ظاہر مظاہری، مولانا سلطان احمد اصلاحی۔

مجوزین حضرات نے درج ذیل دلائل سے جواز پر استدلال کیا ہے۔

وجوہ و دلائل:

۱۔ ضمان قبضہ حکمی کے درجہ میں ہے، لہذا جب سامان مشتری اول کے ضمان میں آ گیا تو اس کا قبضہ حکماً ثابت ہو گیا، مولانا ظفر الاسلام قاسمی نے اپنے مقالہ میں قواعد الفقہیہ کے حوالہ سے یہ قاعدہ نقل کیا ہے:

”الأصل عندنا ان جواز البیع یتبع الضمان فکل ما کان مضموناً بالاتلاف جازیعہ ومالا یضمن بالاتلاف لا یجوز بیعہ“ (قواعد الفقہیہ ۴۸)۔

مولانا شاہین جمالی اور مولانا مجیب الغفار اسعدی اعظمی نے علامہ ابن عابدین کی رد المحتار کی درج ذیل عبارت سے استدلال کرتے ہوئے صورت مسئلہ

میں قبضہ کو ثابت کیا ہے۔

”ومن القبض ما لو اودعه المشتري عند اجنبي او اعره وامر البائع بالتسليم اليه“ (شامی ۴۲۲)۔

مولوی مجاہد الاسلام سیبلی متعلم سیبیل السلام حیدرآباد و مولانا محمد ارشد اور بعض دیگر علماء نے صورت مسئولہ میں بیع کے خریدار اول کے ضمان میں آجانے اور قبل القبض محض وجوب ضمان کی وجہ سے اس کی بیع کے جواز پر اس قدامہ کی درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے۔

”لو دخل في ضمان المشتري جازله بيعه والتصرف فيه كما بعد القبض“ (المنغنی ۴۸۸)۔

مفتی احمد دیوبندی نے اپنے مقالہ میں قبضہ ضمان کی قسمیں بیان کرتے ہوئے صورت مسئولہ کو ”قبضہ ضمان“ کے درجہ میں رکھ کر اس پر جواز کا حکم لگایا ہے۔

۲۔ صورت مسئولہ میں گرچہ مشتری اول کا قبضہ حسی نہیں ہوتا ہے مگر چونکہ تجار کے عرف میں ضمان کی وجہ سے اسے قبضہ حسی کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے، اس لئے عرف خاص کی وجہ سے اسے درست ہونا چاہئے، مولانا منظور احمد اعظمی نے اپنے مقالہ میں اس کا اظہار کیا ہے۔

۳۔ ”الحرج مدفوع“ کے تحت اسے جائز ہونا چاہئے کیونکہ عدم جواز کی صورت میں حرج عظیم لازم آئے گا (مولانا ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محمد ابراہیم ندوی)۔

۴۔ اگرچہ یہ صورت ناجائز ہے مگر چونکہ اس میں تعامل ناس پایا جاتا ہے جس کا شریعت اسلامی میں اعتبار کیا گیا ہے اس لئے اسے جائز ہونا چاہئے (مولانا محمد برہان الدین سنہلی)۔

۵۔ مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد زید باندی، مولانا محمد عزیز اختر القاسمی کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ یہ صورت فقہ حنفی کی رو سے ناجائز ہے، مگر فقہ مالکی کی رو سے جواز کی گنجائش نکلتی ہے، اس لئے امت کو حرج سے بچانے کے لئے فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دینا چاہئے، امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ طعام کے.....

۶۔ مفتی جمیل احمد ندیری نے فیکٹری کے مالک کی دو حیثیتیں تسلیم کر کے اسے جائز قرار دیا ہے، پہلی حیثیت بائع کی ہے اور دوسری حیثیت مشتری اول کے وکیل کی، اصول الشاسی کی عبارت سے بھی انہوں نے استدلال کیا ہے۔

۷۔ مولانا زبیر احمد قاسمی نے اپنے مقالہ میں دیانت و قضاء کا فرق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: بیع غیر مقبوضہ کی بیع و شراء کا حکم جو فساد و عقد سے بیان کیا جاتا ہے یہ حکم محض قضاء ہے جو کسی بھی سبب سے باہمی نزاع کے بعد مرافعہ الی القاضی کے نتیجہ میں اس بیع غیر مقبوضہ کے متعلق قاضی شریعت کا حکم و فیصلہ ہوگا، لیکن اگر بیع قبل القبض کے باوجود عاقدین میں کوئی نزاع نہیں ہو اپنی اپنی جگہ معاملہ کی اس نوعیت پر راضی اور مطمئن رہے اور بالآخر اپنے حق تک پہنچ گئے تو ایسے معاملہ کے جواز و صحت اور نفاذ و لزوم ہی کا فتویٰ دینا نہ دیا جانا چاہئے۔

مولانا ابوجندل نے اپنے مقالہ میں اشیاء منقولہ کی قسمیں مثالی وغیر مثالی کے احکام کا فرق ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر اشیاء مبیعہ غیر مثالی ہیں تو فیکٹری کے تخلیہ سے ان اشیاء پر مشتری (۱) کو قبضہ تام حاصل ہو جائے گا، اور اگر بیع مثالی ہے تو فیکٹری کے تخلیہ سے مشتری اول کو قبضہ تام حاصل نہیں ہو بلکہ قبضہ ناقص ہے جو جواز تصرف کے لئے کافی نہیں ہے، لہذا قبل الکیل والوزن تصرف درست نہیں ہوگا، الا یہ کہ درمیان کا آدمی کمپنی کا ایجنٹ ہو تو پھر یہ شخص فیکٹری کے لئے بحیثیت وکیل ہوگا اور اس کے نفع کو اجرت و کالت قرار دی جائے گی، اشیاء مثالی میں انہوں نے فیکٹری کے مالک کو مشتری اول کی طرف سے وکیل بالقبضہ یا مشتری ثانی کو مشتری اول کا وکیل بالقبضہ مان کر بھی اس معاملہ کو دائرہ جواز میں شامل کیا ہے۔

مفتی محمد عبید اللہ سعدی نے اپنے مقالہ میں اس کی دو صورتیں نکالی ہیں:

۱۔ فیکٹری سے مال خرید لیا قیمت ادا کر دی گئی اور مال ابھی بھی فیکٹری کے گودام میں ہے کہ مشتری اول نے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا اور فیکٹری کو آرڈر دیا کہ اسے فلاں شخص کو پہنچا دو تو یہ معاملہ بیع قبل القبض کا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا ہے، الا یہ کہ خریدار اول کے معاملہ کے بعد فیکٹری نے اس کے خرید کردہ مال کو گودام میں ایک طرف کر دیا ہو تو تخلیہ کی صورت میں معاملہ درست قرار پائے گا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فیکٹری سے مال خریدنے والے نے پہلے معاملہ خریدار دوم سے کیا، پھر فیکٹری کو آرڈر دیا مال کی خرید وارسال کا تو اس میں بیع قبل القبض کا معاملہ تو نہیں ہے، البتہ بیع معدوم وغیرہ کی خرابیاں پیدا ہوں گی، تو اس صورت میں انہوں نے خریدار اول پر وجوب ضمان کی وجہ سے اس پر قبضہ تسلیم کر کے اسے جواز کے دائرہ میں رکھا ہے۔



## مانعین:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا ابرہیم محمد، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا اقبال قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی۔

مولانا اقبال قاسمی کے مقالہ سے صراحتاً عدم جواز کا پتہ نہیں چلتا ہے، البتہ اسلوب تحریر سے عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔

مولانا عبداللطیف پالنپوری نے احسن الفتاویٰ کے حوالہ سے اپنے مقالہ میں جواز کی دو صورتیں ذکر کی ہیں:

۱۔ مال پہنچنے سے پہلے خریدار اول بیع نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کرنے اور مال پہنچنے کے بعد معاملہ بیع کرے۔

۲۔ یا جہاں مال خریدار ہے وہاں کسی مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے، اور اس پر انہوں نے فتاویٰ ہندیہ (۱۹۳۳) کی عبارت سے استدلال کیا ہے جس میں اجیر کے قبضہ کو مشتری کا قبضہ قرار دیا گیا ہے۔

رقم الحروف مفتی نسیم احمد قاسمی نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ یہ معاملہ بیع قبل القبض ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، البتہ اگر یہ شکل ہو کہ خریدار اول بائع اول مالک فیکٹری سے مال خرید لے اور مالک فیکٹری اس کے درمیان اور مال کے درمیان تخلیہ کر دے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کر سکے، تو محض تخلیہ کی وجہ سے بھی قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا۔

## مانعین کے وجوہ و دلائل:

عام طور پر مجوزین نے جواز پر اس سے استدلال کیا ہے کہ چونکہ مال خریدار اول کے ضمان میں آجاتا ہے، اس لئے اس پر خریداروں کا قبضہ حکمی تسلیم کر لینا چاہئے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے مقالہ میں اس دلیل کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”نقصان کا ضامن ہو جانا“ قبضہ کے تحقق کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی شخص قبضہ کے بغیر اپنے اوپر ضمان کی ذمہ داری قبول بھی کر لے تو اس کا اعتبار نہیں، اور علامہ شامی کی عبارت: ”اشتری بقرة مریضة و خلاها فی منزل البائع قائل: ان هلكت فمنی وماتت فمن البائع لعدم القبض“ (رد المحتار ۴۰۸، ۴۰۹) سے استدلال کیا ہے۔

مولانا محمد رضوان القاسمی نے بھی ضمان قبول کرنے کو قبضہ کے پائے جانے کے لئے کافی قرار نہیں دیا ہے۔

۲۔ قبضہ حکمی کے لئے بھی بیع کا عاقدین سے اتنا قریب ہونا ضروری ہے کہ قبضہ حسی کا تحقق ہو سکے، رد المحتار میں ہے: ”لأن إذا كان قریبا يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض أما إذا كان بعيدا لا يتصور فيه القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض“ (رد المحتار ۴۰۶، ۴۰۹)۔

اس لئے صورت مسئولہ میں قبضہ حکمی ماننا بھی مشکل ہے (مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا عبدالرحمن پالنپوری)۔

۳۔ بیع خریدار کے ضمان میں اس وقت آتی ہے جب اس پر اس کا قبضہ ہو جائے، قبل القبض۔ بیع بائع ہی کے ضمان میں رہتی ہے، ابن قدامہ کی عبارت سے اس کا صراحتاً ثبوت ملتا ہے۔

”وقال أبو حنيفة كل مبيع تلف قبل قبضه من ضمان البائع إلا العقار... وقال الشافعي: كل مبيع من ضمان البائع حتى يقبضه المشتري“ (۴۰۸، ۴۰۹) (مقالہ مولانا محمد نعیم گوری)۔

## قول فیصل:

صورت مذکورہ میں جہاں تک سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشتری اول ”مال“ پر قبضہ سے پہلے ہی اسے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، البتہ وہ اس مال کا ضمان قبول کر لیتا ہے کہ ہلاکت کی صورت میں وہی ضامن قرار پائے گا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض ضمان قبول کر لینا تحقق قبضہ کے لئے کافی ہے اور کیا قبل القبض ضمان کا اعتبار ہوگا، اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ ”محض نقصان کا ضامن“ ہو جانا کافی نہیں ہے، اور اگر خریدار قبضہ سے پہلے اپنے اوپر ضمان کی ذمہ داری بھی قبول کر لیتا ہے تو بھی اس کا اعتبار نہیں ہوگا جیسا کہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے مقالہ میں ”رد المحتار“ کے حوالہ سے



اور مولانا محمد نعیم نے ”المغنی“ کے حوالہ سے صراحت کی ہے، اس لئے قبل القبض جب ضمان کا اعتبار ہی نہیں ہے تو اسے قبضہ حکمی کے درجہ میں رکھنا مشکل ہے، البتہ اس کے جواز کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مالک فیکٹری کی طرف سے تخلیہ کر دیا جائے کہ جب مشتری چاہے اپنے مال میں تصرف کر سکے، فقہاء حنفیہ کی صراحت کے مطابق تخلیہ بھی قبضہ کے حکم میں ہے، لہذا یہ صورت جواز قرار پائے گی۔

جواز کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں فتویٰ فقہ مالکی پر دے دیا جائے کہ ان کے نزدیک بیع طعام کے علاوہ ہر چیز کی بیع قبل القبض درست ہے۔

سوال نمبر: ۷۔ وہ صورت جس میں بین الاقوامی تجارت میں شیپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے، جبکہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دیتا ہے اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے، کیا یہ صورت شرعاً جائز ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں اکیڈمی کوکل ۵۲ مقالات موصول ہوئے جن میں سے ۲۹ مقالہ نگاروں نے صورت مسئولہ کو ناجائز اور ۲۱ حضرات نے جائز قرار دیا ہے، مولانا محمد زید اور مفتی عزیز الرحمن بجنوری کے مقالے میں سوال نمبر ۷ کا جواب نہیں ملا، مجوزین حضرات کے اسماء درج ذیل ہیں:

اسمائے مجوزین: ..... مولانا سمیع اللہ قاسمی، مفتی شکیل احمد سیٹاپوری، مولانا سید محمد ایوب سبیلی، مولانا تنویر عالم قاسمی، مولانا نور القاسمی، مولوی مجاہد الاسلام سبیلی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا محمد نعیم گنوزی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عزیز اختر القاسمی، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی محمد عبید اللہ سعدی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا اقبال قاسمی۔  
مجوزین کے دلائل:

۱۔ مشتری اول نے جب جہاز پر لے ہوئے مال کو اپنے مملوک و مقبوض ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ بیع قبل القبض نہیں ہوئی، بلکہ بیع مقبوض و مملوک ہونے کی وجہ سے جائز و درست قرار پائے گی اور جس طرح مالک جہاز کا قبضہ مشتری اول کا قبضہ مانا جائے گا اسی طرح مالک جہاز کا قبضہ اس مال پر مشتری ثانی کا قبضہ تصور کیا جائے گا اور جب اس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا تو اس کے لئے اس کی بیع درست قرار پائے گی، فتاویٰ ہندیہ میں اجیر کے قبضہ کو مستاجر کا قبضہ تسلیم کیا گیا ہے۔

”إلا أن يقول استاجر على من يحمله فقبض الأجير يكون قبض المشتري“ (فتاویٰ ہندیہ ۱۹، ۲۰) (مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی نسیم احمد قاسمی)۔

۲۔ محکمہ ریل یا جہاز کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے اور چونکہ وکیل کا قبضہ مشتری کا قبضہ ہوتا ہے، اس لئے جب مشتری اول نے اسے فروخت کر دیا اور علاحدہ ہو گیا تو جہاز کے عملہ کا قبضہ مشتری ثانی کا قبضہ قرار پائے گا اور اس طرح سے یہ معاملہ درست قرار پائے گا (مولانا محمد طاہر مظاہری)۔

۳۔ آج کی بین الاقوامی تجارت میں اشیائے منقولہ میں صحت بیع کے لئے اگر ہر حال میں قبضہ حسی ہی کو شرط قرار دیا جائے تو یہ چیز عامۃ الناس کے لئے زحمت و تنگی کا باعث ہوگی، لہذا امت کو حرج و تنگی سے بچانے کے لئے اسے جائز قرار دیا جانا چاہئے (مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولوی مجاہد الاسلام سبیلی)۔

۴۔ چونکہ معاملات میں ناگوار چیز کو بھی گوارا کر لیا جاتا ہے، اس لئے صورت مسئولہ میں جواز کا فتویٰ ہونا چاہئے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۵۔ اسے معاملہ بیع نہ مان کر وعدہ بیع قرار دے دیا جائے اور مال آنے پر بیع کا معاملہ کیا جائے (مفتی محمد عبید اللہ سعدی)۔

۶۔ جہاز پر مال لادنے کے بعد مشتری اول کے ضمان میں وہ مال آجاتا ہے اور ضمان کی وجہ سے اس کا قبضہ حکمی پایا گیا، اس لئے دوسرے کے ہاتھ اس کی بیع درست ہوگی (مفتی محبوب علی وجیہی)۔

۷۔ فقہ حنفی کی رو سے تو جواز کی صورت نہیں نکلتی ہے، مگر فقہ مالکی کے مطابق جواز کا فتویٰ درست ہے (مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی)۔

۸۔ آج کل چونکہ یہ صورت کثرت سے وقوع پذیر ہو رہی ہے، اس لئے قبضہ کے عرف پر مبنی ہونے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر محض

خرید و فروخت کے معاملہ کو "قبضہ" تصور کر لیا جائے (مولانا محمد نور القاسمی)۔

۹۔ مشتری اول بیع کرتے وقت کسی دوسرے شخص کو یا مال بردار کمپنی ہی کو وکیل بالقبض بنادے تو ایسی صورت میں وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ قرار پائے گا، یہ معاملہ درست قرار پائے گا (مولانا مسیح اللہ قاسمی)۔

۱۰۔ جب مشتری اول نے سمندر ہی میں مال کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا اور سامان کی سرٹیفیکٹ اس کے حوالہ کر دی تو اسی سرٹیفیکٹ کی حوالگی کو حکماً قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا، اس لئے کہ آج کے عرف میں سرٹیفیکٹ پر قبضہ اصل بیع پر قبضہ تصور ہوتا ہے۔

مولانا تنویر عالم قاسمی اور مولانا منظور احمد صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ معاملہ تو درست قرار پائے گا، البتہ مشتری ثانی کو ضامن قرار دینا درست نہیں ہوگا، مولانا عبدالعظیم اصلاحی نے جواز مع الکرہت کے قول کو اختیار کیا ہے۔

اسمائے مانعین:..... مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، حکیم ظل الرحمن، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی احمد دیولوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابوالحسن علی، مولانا شہزاد اکرم قاسمی، مولانا مسعود احمد انصاری، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا ارشد قاسمی، مولانا عبداللطیف پلنپوری، مولانا عبدالقیوم پلنپوری، مولانا عبدالرحمن پلنپوری، مولانا ابراہیم گیلائی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا ابوحنبل قاسمی۔

### دلائل و مستدللات:

۱۔ مذکورہ صورت میں "ربح مالم یضمن" لازم آتا ہے، یعنی خریدار ایک ایسے مال کو فروخت کر کے نفع حاصل کرتا ہے جو اس کے ضمان میں نہیں آیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربح مالم یضمن" کی ممانعت فرمائی ہے (مولانا ابوحنبل قاسمی، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مفتی احمد نادر القاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

مولانا ابرار خاں ندوی نے "ربح مالم یضمن" کی ممانعت پر حدیث ابن ماجہ سے استدلال کیا ہے:

"قال رسول الله ﷺ: لا یحل بیع مالیس عندک ولا ربح مالم یضمن" (ابن ماجہ ۱۰۱۵۸)۔

۲۔ بیع قبل القبض اور بیع معدوم ہونے کی وجہ سے یہ صورت ناجائز ہے، کیونکہ اشیاء منقولہ کی قبیل سے ہے اشیاء منقولہ کی قبضہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، حدیث میں بھی اس کی ممانعت کی گئی ہے۔

مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی احمد دیولوی، مولانا عبداللطیف پلنپوری، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے اسے بائع کے حق میں غیر مقدور تسلیم اور مشتری ثانی کے حق میں غیر مقبوض ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے، مولانا ابوالحسن علی نے بھی اسے بیع قبل القبض اور بیع معدوم (مالیس عندک) ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے، مولانا محمد ارشد قاسمی نے اسے بیع قبل القبض اور غیر مقدور تسلیم ہونے کی وجہ سے ناجائز کہا ہے۔

۳۔ بیع الکالی بالکالی ہونے کی وجہ سے یہ عقد ناجائز ہے، یعنی اس میں ادھار کی بیع ادھار کے عوض لازم آتی ہے، اور حدیث میں بیع الکالی بالکالی سے ممانعت کی گئی ہے (مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۴۔ اگر اس طرح کے معاملات کو جائز قرار دے دیا جائے تو زبردست اقتصادی بحران پیدا ہو جائے گا، اس لئے اقتصادی بحران سے امت کو بچانے کے لئے اس طرح کے عقود و معاملات ناجائز قرار دیئے جائیں۔

مولانا عبداللطیف پلنپوری، مولانا شہزاد اکرم قاسمی اور مولانا مسعود احمد انصاری نے (تکلمہ فتح الملہم ۱/ ۳۵۳) سے مولانا تقی عثمانی صاحب کی ایک عبارت سے عدم جواز پر استدلال کیا ہے، جس میں انہوں نے اس طرح کے معاملات کو اقتصادی بحران پیدا ہونے کے خطرہ کے پیش نظر ناجائز قرار دیا ہے۔

مولانا عبدالرحمن پلنپوری اور مولانا عبدالقیوم پلنپوری نے عدم جواز کا حکم لگانے کے ساتھ ساتھ احسن الفتاویٰ کے حوالہ سے جواز کی دو

صورتیں ذکر کی ہیں: ۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ جہاں مال خریدا گیا ہے وہاں کسی دوسرے شخص کو یا کسی مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے، اس طرح وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ قرار پائے گا، اور کوئی قباحت لازم نہیں آئے گی، ۲۔ دوسری شکل یہ ہے کہ خریدار ہی کو وکیل بالقبض بنا دے اور مال پہنچنے سے پہلے بیع کا معاملہ نہ کرے، بلکہ صرف وعدہ بیع کرے، اس صورت میں اگر فریقین کی طرف سے انکار پایا جائے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، قانوناً اسے بیع پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

### قول راجح:

صورت مسؤلہ میں مشتری اول نے مال کی خریداری کے بعد بائع اول سے کہا کہ میرا فلاں مال فلاں جہاز پر لاد دیا جائے اور بائع اس کے حکم کے مطابق مال جہاز پر لدا دیا تو اب وہ مال بائع کے قبضہ و ضمان سے نکل کر مشتری اول کے قبضہ و ضمان میں آ گیا اور میرے نزدیک جہاز کے عملہ کا قبضہ جن کی حیثیت مشتری کے اجیر کی ہے، مشتری جو مستاجر کا قبضہ قرار پائے گا اور جب سامان اس کے قبضہ و ضمان میں آ گیا تو اس کے لئے اس میں ہر طرح کا تصرف کرنا بھی جائز قرار پائے گا اور جب اس نے جہاز پر لدا دے ہوئے مال کو مقبوض و مملوک ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ بیع قبل القبض نہیں ہوگی، بلکہ بیع مقبوض و مملوک ہونے کی وجہ سے جائز و درست قرار پائے گی، اور جس طرح جہاز کے عملہ کا قبضہ مشتری اول کا قبضہ نہ مانا جائے گا اسی طرح جہاز کے عملہ کا قبضہ مشتری ثانی کا قبضہ بھی قرار پائے گا، ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”إلا أن يقول استاجر على من يحملة فقبض الأجير يكون قبض المشتري“ (فتاویٰ ہندیہ ۳۰۱۹)۔





## قبضہ کی حقیقت اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ فقہاء کے اقوال و مذاہب سے پہلے ایک نظر ان روایات پر ڈال لی جائے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، اس سلسلہ کی روایات عام طور پر کتب حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہم سے نقل کی گئی ہیں، الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ ان صحابہ سے اسی مضمون کی متعدد روایتیں منقول ہیں، یہاں چند روایات ذکر کی جاتی ہیں، جن کے الفاظ کو مختلف مکاتب فقہ نے اپنے پیش نظر رکھا ہے:

(۱) عبداللہ بن عباس سے روایت ہے: ”ان رسول اللہ ﷺ نھی أن یبیع الرجل طعاماً حتی یتوفیہ، قلت لابن عباس: کیف ذلک؟ قال: ذلک درہم بدرہم والطعام مرجأ“ (بخاری ۱۰۲۸۶)۔

(رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی کھانے کی چیز وصول کرنے سے پہلے فروخت کر دے، میں نے عبداللہ بن عباس سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ درہم سے درہم کی فروخت ہے اور کھانا (غلہ) ادھار رہا؟)۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”من اشترى طعاماً بکیل أو وزن فلا یبعه حتی یقبضہ“ (مسند احمد ۱۱۱۰۲)۔ (جو کیل یا وزن سے کھانا خرید کرے وہ قبضہ میں لئے بغیر اس کو فروخت نہ کرے)۔

(۳) حضرت ابو ہریرہ نے آپ ﷺ کا ارشاد ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ”من اشترى طعاماً فلا یبعه حتی یکتالہ“ (مسلم ۲۰۵)۔ (جو کھانا خریدے وہ پیمانہ سے ناپے بغیر فروخت نہ کرے)۔

(۴) حضرت جابر بن عبداللہ راوی ہیں: ”کان رسول اللہ ﷺ یقول: إذا ابتعت طعاماً فلا تبعه حتی یتوفیہ“ (مسلم ۲۰۶)۔ (رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جب کھانا خرید کر تو وصول کرنے سے پہلے فروخت نہ کرو)۔

حضرت حکیم بن حزام سے منقول ہے: ”قلت یا رسول اللہ ﷺ إني اشتریت بیوعاً فما یحل لی منها وما یحرم علی؟ قال: فإذا اشتریت فلا تبعه حتی یقبضہ“ (مسند احمد ۲۰۲)۔ (میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں خرید و فروخت کے بعض معاملات کرتا ہوں، تو میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ فرمایا: جب خرید کر تو قبضہ کئے بغیر فروخت نہ کرو)۔

فقہاء کی آراء:..... ان احادیث کی روشنی میں فی الجملہ کسی چیز پر قبضہ سے پہلے ہی اس کو فروخت کرنے کے ناجائز و نادرست ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، اور کہا جاسکتا ہے کہ تفصیلات میں اختلاف سے قطع نظر اصولی طور پر یہ ایک اجماعی رائے ہے، ابن حزم نے عطاء کا اختلاف نقل کیا ہے کہ وہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو مطلقاً جائز تصور کرتے تھے (المحلی ۸، ۵۲۰)، عثمان البتی سے بھی ایسا ہی منقول ہے (شرح نووی علی مسلم ۸/۲)۔ لیکن بقول نووی یہ ایک قول شاذ و غیر معتبر ہے (حوالہ سابق)، البتہ تفصیلات اور احادیث کے مصداق کی بابت فقہاء کی رائیں مختلف ہیں۔

شنا فعیبہ:

فقہاء شافعیہ کے نزدیک کوئی شے جو خرید کی گئی ہو جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے اس کو فروخت کرنا درست نہیں، مال منقول ہو یا غیر منقول، خوردنی شے

۱۔ جنرل سکرٹری اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) و ناظم المعهد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

ہو یا کچھ اور فروخت کنندہ کی اجازت سے تصرف کرے یا بلا اجازت اور قیمت کی ادائیگی کے بعد کرے یا اس سے پہلے ہی، بہر صورت یہ جائز نہیں۔

”لا یجوز بیع المبیع قبل قبضہ عقاراً کان أو منقولاً، لا یاذن البائع ولا بغیر اذنه، لا قبل أداء الثمن ولا بعدہ“ (شرح المہذب ۹، ۲۶۳)۔ (قبضہ سے پہلے بیع کو فروخت کرنا جائز نہیں، مال منقول ہو یا غیر منقول، نہ فروخت کنندہ کی اجازت سے اور نہ بلا اجازت، نہ قیمت کی ادائیگی سے پہلے اور نہ اس کے بعد)۔

امام محمد کی بھی وہی رائے ہے جو امام شافعی کی ہے (مختصر الطحاوی ۸۳)۔

فقہاء شوافع نے بنیادی طور پر حضرت حکیم بن حزام کی روایت کو پیش نظر رکھا ہے جس میں مطلق خریدی ہوئی اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس کے علاوہ مسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ حضور نے تو کھانے کی اشیاء کو قبضہ سے پہلے بیچنے سے منع فرمایا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ دوسری اشیاء کا بھی یہی حکم ہوگا، ”وأحسب کل شیء مثله“ (مسلم ۲، ۵) خود امام شافعی نے ”کتاب الامر“ میں عبداللہ بن عباس ہی کے قول کو اپنے متدل کی حیثیت سے ذکر کیا ہے (کتاب الام ۶۹۳)۔

حنابلہ:

حنابلہ کے نزدیک غیر خوردنی اشیاء میں قبضہ سے پہلے فروختی جائز ہے، پھر خوردنی اشیاء میں حنابلہ کے یہاں یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ جو چیزیں تول کر، ناپ کر اور گن کر فروخت کی جاتی ہیں ان میں قبضہ کے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں، دوسری اشیاء کی بابت امام احمد سے مختلف اقوال منقول ہیں، اور کون سا قول صحیح تر ہے؟ اس بابت بھی اختلاف ہے، ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ کسی بھی خوردنی شے کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہیں (المغنی ۸۸/۴)۔ حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ اور جابر کی روایات میں صراحت موجود ہے کہ یہ ممانعت خوردنی اشیاء کی بابت تھی، اور امام احمد کا وہ قول کہ ناپی و تولی جانے والی اشیاء ہی میں قبضہ ضروری ہوگا، غالباً عبداللہ بن عمر کی اس روایت پر مبنی ہے جو مسند احمد میں ان الفاظ میں منقول ہے:

”من اشتری طعاماً بکیل أو وزن فلا یبعہ حتی یقبضہ“ (مسند احمد ۲، ۱۱۱)۔  
جس نے ناپ یا تول کے ذریعہ کھانا خرید کیا تو جب تک اس پر قبضہ نہ کر لے اس کو فروخت نہ کرے۔

مالکیہ:

مالکیہ کے یہاں اس مسئلہ میں حسب ذیل تفصیل ہے:

(الف) غیر خوردنی اشیاء قبضہ کے بغیر بھی فروخت کی جاسکتی ہیں۔

(ب) خوردنی اشیاء اگر پیمانے سے خریدنے کی گئی ہوں بلکہ بلا تعیین مقدار مجموعہ (جزافاً) خریدی گئی ہوں تو ان کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کیا جاسکتا ہے، یہی مالکیہ کے یہاں قول مشہور ہے، کیونکہ ایسی بیع پر مالکیہ کے نزدیک عقد کے ساتھ ہی ملکیت قائم ہو جاتی ہے۔

(ج) جو خوردنی اشیاء ناپ کر یا گن کر خریدی گئی ہوں اور اموال ربویہ میں سے نہ ہوں یعنی اس لائق نہ ہوں کہ اس کا ذخیرہ کیا جاسکے، قبضہ سے پہلے ان کی بیع کے بارے میں امام مالک کے دونوں طرح کے قول ہیں، لیکن قول مشہور کے مطابق ان کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں۔

(د) جو خوردنی اشیاء اموال ربویہ کے قبیل سے ہوں، قبضہ سے پہلے ان کو فروخت کرنا درست نہیں (دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۲، ۱۱۳، اثر الدانی ۱۹، المدونۃ الکبریٰ ۱۶۶/۳)۔

مالکیہ نے ان روایات کو پیش نظر رکھا ہے جن میں قبضہ سے پہلے طعام کی بیع کو منع کیا گیا ہے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ ایک ہی مضمون کی روایت ایک جگہ مطلق مذکور ہو اور دوسری جگہ اس کے ساتھ کوئی قید لگائی ہو تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ مطلق روایت میں بھی یہی قید ملحوظ ہے، اور ناپ تول کر خریدی ہوئی اشیاء میں ہی اس بیع کی ممانعت کی وجہ غالباً مسند احمد کی وہی روایت ہے جس کا ذکر ہوا کہ عبداللہ بن عمر سے منقول ہے کہ ”اگر کسی شخص نے ناپ کر کوئی چیز خریدی ہو تو اس کو قبضہ کے بغیر فروخت نہ کرے“ (مسند احمد ۱۱۱/۲)۔



حنفیہ:

حنفیہ کے نزدیک غیر منقول اشیاء جیسے زمین و مکان وغیرہ قبضہ سے پہلے فروخت کی جاسکتی ہیں، منقول اشیاء قبضہ سے پہلے فروخت نہیں کی جاسکتیں (البحر الرائق ۱۱۶/۶)، امام ابو یوسف کا رجحان ابتدائی اسی رائے کی طرف تھا جو امام شافعی کی ہے، مگر پھر انہوں نے امام صاحب کی رائے کی طرف رجوع کر لیا (مختصر المحادی ۸۳)۔

حنفیہ نے روایات کے الفاظ کے بجائے مقصد پر نگاہ رکھی ہے کہ اصل مقصد غرر سے بچانا ہے، اموال غیر منقولہ میں یہ اندیشہ نہیں کہ حوالگی سے پہلے وہ چیز ضائع اور ہلاک ہو جائے لیکن اموال منقولہ میں اس کا احتمال موجود ہے، اس لئے اموال منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہوگی، اور اموال غیر منقولہ میں قبضہ سے پہلے بھی فروخت درست ہوگی (فتح القدیر ۱/۵۱۳) یہی وجہ ہے کہ اگر زمین و مکان بھی ایسی جگہ میں واقع ہو جہاں ضیاع کا خطرہ موجود ہو مثلاً مکان دریا کے کنارے واقع ہو اور اس کا سیلاب کی زد میں آجانا بعید از قیاس نہ ہو، یا وہ صحرائی علاقہ میں واقع ہو اور ریت سے ڈھک جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں زمین و مکان پر بھی قبضہ کے بعد ہی اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا (البحر الرائق ۱۱۶/۶)۔

غرض اس مسئلہ میں سب سے زیادہ وسعت مالکیہ اور حنبلیہ کی رائے میں ہے اور سب سے زیادہ تنگی شوافع کی رائے میں، اور حنفیہ کی رائے ان دونوں کے درمیان ہے۔

ممانعت کی علت:

فقہاء کی آراء کو سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے فروختگی کی ممانعت کی جو روایات ہیں تمام ہی فقہاء کے نزدیک علت پر مبنی ہیں، البتہ خود اس علت کی تعیین میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے، یوں تو اہل علم نے اس کی متعدد علتوں کا ذکر کیا ہے (ہامش عون المعبود ۹/۳۸۵) لیکن اصل میں فقہاء نے دو چیزوں کو علت قرار دیا ہے: غرر اور ربا۔ حنفیہ کے نزدیک اس کی علت غرر ہے، یعنی جب تک بیع پر قبضہ نہ ہو جائے اس بات کا اندیشہ ہے کہ شاید اس پر قبضہ حاصل ہی نہ ہو پائے اور اس طرح بیع خریدار کو حوالہ نہ کی جاسکے، چنانچہ صاحب ”ہدایہ“ کہتے ہیں: ”والحدیث معلول بہ“ (ہدایہ مع الفتح ۵۱۳/۶) اور داماد آفندی کا بیان ہے:

”الغرر المنہی عنہ غرر انفساخ العقد والحدیث معلول بہ“ (مجموع الأثر ۲۰۴۹)۔

جس غرر کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کے ٹوٹ جانے کا خطرہ درپیش ہو اور حدیث اسی علت سے متعلق ہے۔

حنابلہ کے نزدیک بھی اصل علت غرر ہی ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

”ما یتوہر فیہ غرر الانفساخ بہلاک المعقود علیہ لم یجز بناء عقد آخر علیہ تحرزاً من الضرر وما لا یتوہر فیہ ذلك الغرر انتفی المانع فجاز العقد علیہ“ (المغنی ۳۰۹۲)۔

(جس معاملہ میں بیع کے ضائع ہوجانے کی وجہ سے معاملہ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ موجود ہو تو غرر سے بچتے ہوئے اس پر دوسرے معاملہ کی بنیاد رکھنا درست نہیں، اور جس میں غرر کا اندیشہ نہیں اس میں مانع موجود نہیں، اس لئے اس پر عقد جائز ہے)۔

فقہاء شوافع کے یہاں بھی ممانعت کی اصل علت غرر ہی ہے، علامہ ابواسحاق شیرازی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ولأن ملكه علیہ غیر مستقر؛ لانه ربما بلك فانفسخ العقد وذلك غرر من غیر حاجة فلم یجز“ (شرح المہذب ۹/۲۶۲)۔ (اس لئے کہ اس پر اس کی ملکیت خدشہ سے محفوظ نہیں ہے، کیونکہ بعید نہیں کہ بیع ضائع ہو جائے اور معاملہ فسخ ہو جانے کی نوبت آجائے، اور یہ غرر ہے جو بلا حاجت ہے، لہذا یہ جائز نہیں ہوگا)۔

اس طرح حالانکہ حنفیہ، شوافع اور حنبلیہ کی آراء میں خاصا اختلاف ہے، لیکن اس بارے میں سبھی متفق ہیں کہ اس کی علت غرر ہے، البتہ شوافع اور حنبلیہ نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر اس علت کو منطبق کرنے کی کوشش کی ہے اور احناف نے علت کی بنا پر نص میں تخصیص کا راستہ اختیار کیا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک ممانعت کی اصل علت سود کے امکانی راستے کو بند کرنا ہے، اور اہل علم کے لئے یہ امر محتاج اظہار نہیں کہ سد ذرائع اور عقود ربویہ کے باب



میں مالکیہ کے یہاں احتیاط سب سے زیادہ ہے، تاہم اس کی طرف حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں بھی واضح اشارہ موجود ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اس کی ممانعت کیوں ہے؟ تو فرمایا: ”ذلت الدارہم بدرہم والطعام مرجأ“ (بخاری ۲۰۶۸)۔ (یہ درہم بہ مقابلہ درہم ہے اور کھانا ادھار رہا)۔

یعنی اگر ”الف“ نے ”ب“ سے ایک ہزار میں گیبوں خرید کیا اور قبضہ کئے بغیر ”ج“ سے بارہ سو روپے میں فروخت کر دیا تو گویا اس نے ایک ہزار روپے کر بارہ سو روپے حاصل کیے اور درمیان میں گیبوں کا واسطہ بھی نہ ہوا، سو اس طرح گویا اس نے بالواسطہ سود حاصل کیا۔ اس لئے گویا اس حدیث کا معنول ہونا ائمہ متبعین کے درمیان متفق علیہ امر ہے۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بیع فاسد ہے:

بیع کے باطل و فاسد ہونے کا سبب یہ ہے کہ اگر ایجاب و قبول ایسے شخص نے کیا ہو جو اس کا اہل نہ ہو یا معاملہ کی اساس (بیع) ایسی چیز کو بنایا ہو جو شریعت کی نگاہ میں مال نہ ہو تو بیع باطل ہے ورنہ فاسد، اس اصول پر اگر کسی حلال مال کی بیع قبضہ سے پہلے کی جائے تو یہ باطل نہ ہوگی اور نہ مکروہ ہی ہوگی، کیونکہ بیع مکروہ میں کراہت کسی خارجی وصف جیسے وقت یا مقام کی وجہ سے آتی ہے، بلکہ بیع فاسد ہوگی، شامی کے یہاں اس کی صراحت موجود ہے، درمختار میں ہے: ”وفسد بیع المنقول قبل قبضہ ونفی الصحة یحتملہما“ (در مختار ۲۰۱۸۲)۔

(مال منقول کی بیع قبضہ سے پہلے فاسد ہو جائے گی، اور بیع کے صحیح ہونے کی نفی باطل ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہے اور فاسد ہونے کا بھی)۔

اس پر شامی کا بیان ہے: ”أی یحتمل البطلان والفساد والظاهر هو الثاني لأن علة الفساد الغرر كما مر مع وجود ركني العقد“ (رد المحتار ۲۰۱۸۲)۔ (یعنی بطلان اور فساد دونوں کا اس لفظ میں احتمال ہے اور بظاہر فاسد ہونا مراد ہے، اس لئے کہ (جیسا کہ مذکور ہوا) فساد کی علت غرر ہے اور ایجاب و قبول پایا جا رہا ہے)۔

اس لئے یہ ”بیع فاسد“ ہے، اور قبضہ کے بعد خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، ”بیع فاسد“ کے سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اگر بیع میں فساد حق شرع کی بنا پر پیدا ہوا ہو اور وہ کسی کارگناہ پر مشتمل ہو تو یہ بہر حال باعث گناہ ہے، اگر نزاع کے اندیشہ سے ہو اور عملاً نزاع نہ پیدا ہو تو گویا بیع فاسد ہوگی، لیکن دلیلہ درست و صحیح ہو جائے گی، اس سلسلہ میں مولانا نور شاہ کشمیری کی یہ تحریر چشم کشا ہے:

”إن من البيوع الفاسدة ما لو أتی بها أحد جازت ديانته، وإن كانت فاسدة قضاء وذلك، لأن الفساد قد يكون لحق الشرع، بأن اشتمل العقد على مائم فلا يجوز مجال وقد يكون الفساد لمخافة التنازع، ولا يكون فيه شيء آخر يوجب الإثم فذلك إن لم يقع فيه التنازع جاز عندی ديانته وإن بقي فاسداً قضاء لارتفاع علة الفساد وهي المنازعة، ويدل عليه مسائلهم في باب المضاربة والشركة، فإنها ربما تكون فاسدة مع أن الربح يكون طيباً، وراجع ”الهداية“ ونبه الحافظ ابن تيمية في رسالته على أن من البيوع ما لا يقع فيه النزاع فتكون تلك جائزة، فإذا أدخلتها في الفقه وجدتها محظورة؛ لأن أكثر أحكام الفقه تكون من باب القضاء و الديانات فيها قليلة وإنما يصار إلى قضاء بعد النزاع، فإذا لم يقع النزاع ولم يرفع الأمر إلى القاضي نزل حكم الديانة لا محالة فيبقى الجواز“ (فيض الباری ۳۰۲۵۸)۔

(بیع کے بعض فاسد معاملات وہ ہیں کہ اگر کوئی ان کو کر ہی لے تو دلیلانہ جائز ہے گویا بیع فاسد ہے، اور وہ اس لئے کہ فساد کبھی حق شرع کی بنا پر ہوتا ہے، بایں طور کہ انجام دیا گیا معاملہ کسی گناہ کو شامل ہو تو یہ کسی حال میں جائز نہیں، اور کبھی معاملہ اندیشہ نزاع کے تحت فاسد ہوتا ہے اور اس میں کچھ اور باعث گناہ نہیں ہوتا تو اگر اس میں نزاع کی صورت نہ پیدا ہو تو میرے نزدیک یہ معاملہ دلیلانہ جائز ہے گرچہ یہ قضائی فاسد ہی رہے گا، کیونکہ نزاع جو علت فساد تھی وہ موجود نہیں، اور اس کی دلیل مضاربت و شرکت کے ابواب کے مسائل ہیں کہ بعض اوقات یہ معاملات فاسد ہوتے ہیں لیکن نفع حلال ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ”ہدایہ“ سے مراجعت کی جاسکتی ہے، نیز حافظ ابن تيمية نے اپنے رسالہ میں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس بیع میں نزاع نہ پیدا ہو، وہ جائز ہوگی، اگر تم اس کو باب فقہ میں داخل کرو گے تو ناجائز پاؤ گے، کیونکہ فقہ کے اکثر احکام قضاء کے باب سے ہوتے ہیں، اور دیانت کے مسائل اس میں کم ہوتے ہیں، قضاء کی طرف اسی وقت رجوع کیا جاتا ہے کہ نزاع

پیدا ہوگئی ہو لہذا اگر نزع پیدا نہیں ہوئی اور معاملہ قاضی کے پاس نہیں گیا تو بالاحوالہ دیانت کا حکم جاری ہوگا اور حوازی باقی رہے گا۔

اس لئے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ "قبضہ سے پہلے خرید و فروخت" کی ممانعت اور قبیل حق شرع ہے یا حق عبادہ اور یہ صرف قضاء کا سد ہے یا قبضہ بھی؟ رقم الحروف کا خیال ہے کہ اس کی ممانعت حق عبادہ کی بنا پر ہے نہ کہ حق شرع کی بنا پر، اور اس کا نفاذ یا نہ ہے، نہ کہ قضاء۔

قبضہ کے مفہوم میں عرف کا دخل:

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں قبضہ کا کوئی متعین و محدود مذاق بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ خود احادیث میں قبضہ کی مختلف کیفیات کی طرف اشارہ موجود ہے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر کی ایک روایت میں ہے کہ ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ مقام خریداری سے منتقل کئے بغیر دوبارہ اس کو فروخت نہ کریں، "یا عرفنا بانتقالہ من السكان الذی ابتعناہ فیہ اى مکان سواہ قبل ان نبیعہ" (موطا امام مالک ۳۴۳)۔ حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ جب تک تجارت خرید کر وہ مال کو اپنے کجاوے میں منتقل نہ کر لیں فروخت نہ کریں، "حتى یحوزھا للتجار اى رحانہم" (۳۴۳)۔ حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت میں ہے: "فلا بیعہ حتی یکتالہ" (مسلم ۳۰۵)۔ ظاہر ہے کہ یہ سب قول، مسلمانوں کو اس کی جگہ سے ہٹانے، اور سامان کو اپنی دوکان یا سواری میں منتقل کرنے کے مفہوم و معنی میں خاصاً فرق ہے اور جن الفاظ کی شریعت نے تحدید نہ کی ہو ان کی بابت حصول ہے کہ "عرف" ہی سے ان کی مراد متعین ہوگی، سیوٹی کا بیان ہے:

"کل ماورد بہ الشرع مطلقاً ولا ضابطہ لہ فیہ ولا فی اللغۃ یرجع فیہ اى العرف ومثلہ بالحرز فی السرقة والتفرق فی البیعہ والقبض" (الاشیاء والنظام للسیوطی ۱۱۶)۔ (شریعت میں جو لفظ مطلق وارد ہو، وہ اور اس کی بابت نہ شریعت میں ضابطہ مقرر ہو اور نہ لغت میں ہو اس میں عرف کی طرف لوٹنا جائے گا، چودہی کے مسئلہ میں ترز (حفاظت) بیع میں تفرق، نیز قبضہ سے فقہاء نے اس کی مثال دی ہے۔

اس لئے فقہاء متفق انسان ہیں کہ قبضہ کا معنی اخت اور اشیاء کی نوعیت کے لحاظ سے ہوگا مثلاً علامہ علاء الدین کا سامنی کہتے ہیں: "ولا یشترط القبض بالبراجع۔ لأن معنی القبض هو التمكن والتخلی وارتضاء الموانع عرفاً وعادۃً حقیقۃً" (بدائع الصنائع ۲۲۲)۔ (انہوں سے قبضہ شرط نہیں ہے اس لئے کہ قبضہ کے معنی "تمکن" و "تخلی" اور عرف و عادت اور حقیقت کے اعتبار سے موانع کے ختم ہوجانے کے ہیں)۔

علامہ ابو البرکات دردیر مقرر فرماتے ہیں: "وقبض العقار... بالتخلیة... وقبض غیرہ... بالعرف جاری بین الناس" (الشرح الکبیر علی هامش النسوق ۱۲۵)۔ (غیر منقول اموال میں قبضہ تخلیہ کے ذریعہ اور دوسری اشیاء میں لوگوں کے عرف و رواج کے مطابق ہوگا)۔

امام نووی کا بیان ہے: "لأن القبض ورد بہ الشرع وأطلقہ فحمل علی العرف، والعرف فی ما ینقل النقل وفی ما لا ینقل التخلیة" (شرح المہذب ۲۰۵)۔ (شریعت میں قبضہ کا ذکر ہے اور مطلق ہے لہذا اس کو عرف پر محمول کیا جائے گا، اور عرف منقولہ اموال میں یہ ہے کہ نقل قبضہ ہے اور غیر منقولہ اموال میں تخلیہ)۔

فقہاء حنبلیہ میں ابن قدامہ لکھتے ہیں: "لأن القبض مطلق فی الشرع، فیجب الرجوع فیہ اى العرف کالاحراز والتفرق" (المنہج ۲۰۰)۔ (کیونکہ قبضہ شریعت میں مطلق ہے لہذا اس میں عرف کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، جیسے احراز و تفرق)۔

اس لئے قبضہ کے سلسلہ میں یہ متفق علیہ ہے کہ قبضہ دراصل "تخلیہ" یعنی مالک اور اس شے کے درمیان کوئی مانع تصرف امر کو باقی نہ رکھنے کا نام ہے، پھر یہ ہر دور کے عرف اور ہر عہد کے مدعاں اور ظروف طریق ہی سے متعین ہو سکتا ہے۔

قبضہ میں سامان کی نوعیت کا لحاظ:

جیسے قبضہ میں ہر عہد کے عرف کا اعتبار ہے، اسی طرح ہر شے کا قبضہ اسی کے لحاظ سے ہوگا، شامی کے الفاظ ہیں: "یختلف بحسب البیعہ" (رد المحتار ۲۰۸)۔

اس لئے فقہاء کے یہاں مختلف صورتوں میں الگ الگ کیفیات کو قبضہ قرار دیا گیا ہے، مثلاً چند صورتیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ بیع قاسد میں قبضہ کے لئے اس شے کو اپنے ہاتھ میں لینا ضروری ہے، محض تخلیہ، یعنی موانع کا ہٹا دینا کافی نہیں، "المراد بالقبض هنا القبض

بالبراجع لا بالتخلية يرید باليد“ (البحر الرائق ۶۰۱۹۳)۔

۲۔ کبھی خریدار کے تھیلے میں اس کی اجازت سے فروخت کردہ شے کار کھ دینا قبضہ کے حکم میں ہے، چاہے ایسا کرتے وقت خریدار موجود نہ ہو، ”لو اشتری مکیلاً معیناً و دفع المشتري الى البائع ظرفاً وأمره أن يكيه في ظرف ففعل البائع والمشتري غائب صح“ (البحر الرائق ۶۰۱۶۸)۔

۳۔ کبھی قبضہ کا اطلاق کسی شے اور اس کے خریدار کے درمیان موانع تصرف کے ختم کر دینے سے تسلیم کیا جاتا ہے، مثلاً کسی شخص کے پاس بطور امانت یا عاریت سامان موجود تھا، صاحب امانت اور صاحب عاریت نے اسی شخص سے وہ چیز فروخت کر دی تو جب بھی یہ اس سامان کے پاس آجائیں، قبضہ کی تکمیل ہو جائے گی، اب اگر اس کے بعد وہ سامان ضائع ہو جائے تو خریدار کی ملکیت سے ضائع ہوگا۔

”يضر المشتري قابضاً بالتخلية، فإذا هلك بعد ذلك يهلك من مال المشتري“ (البحر الرائق ۶۰۸۰)۔

(خریدار تخلیہ کی وجہ سے قبضہ کرنے والا متصور ہوگا، لہذا اگر اس کے بعد بیع ضائع ہو جائے تو یہ خریدار کے مال میں سے متصور ہوگا)۔

قاضی خان لکھتے ہیں: ”أجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قابضاً“ (فتاویٰ قاضیخان ۲۰۴۴)۔ اس پر اجماع ہے کہ بیع صحیح میں تخلیہ قبضہ ہے۔

عالمگیری نے بھی یہی بات نقل کی ہے، تاہم لکھا ہے کہ صاحب اجناس نے ”تخلیہ“ کے ساتھ یہ بھی شرط لگائی ہے کہ خریدار کو اس پر قبضہ کرنے کو کہہ دے، ”أن يقول خليت بينك وبين المبيع فاقبضه“ (فتاویٰ ہندیہ ۳۰۹)، نیز خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے کہ بیع اگر دروری پر بھی واقع ہو پھر بھی ”تخلیہ“ قبضہ کے لئے کافی ہوگا، ”إن بالتخلية يقع القبض وإن كان المعقود عليه يبعد عنها“ (خلاصۃ الفتاویٰ ۳۰۸۹)، یہی رائے حنبلی دستان فقہ کے مشہور شارح ابن قدامہ کی ہے، فرماتے ہیں کہ قبضہ کے لئے تخلیہ اور بیع کا ممتاز و مشخص ہونا کافی ہے، ”إن القبض في كل شيء بالتخلية مع التميز“ (فتاویٰ ہندیہ ۳۰۱۰)۔

۴۔ کبھی فقہانے مکان کی کنجی حوالہ کر دینے کو قبضہ کے لئے کافی تصور کیا ہے، گو وہ خود اس مکان تک نہ گیا ہو، ”ولو باء الدار وسلم المفتاح فقبض المفتاح ولم يذهب إلى الدار يكون قابضاً“ (فتاویٰ قاضیخان ۲۰۴۹)۔

عالمگیری میں ہے: ”وقبض المفتاح قبض الدار إذا تهيأ له فتحها بلا كلفة“ (فتاویٰ ہندیہ ۳۰۱۰)۔ اگر کنجی سے بلا تکلف مکان کھولا جاسکتا ہو تو کنجی پر قبضہ مکان پر قبضہ کے حکم میں ہے۔

۵۔ کبھی سامان میں خریدار کا تصرف قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، مثلاً خریدار کے حکم سے فروخت کنندہ نے فروخت کئے ہوئے گیسوں کو پیس دیا، تو گیسوں پر قبضہ ہو گیا، ”وإذا أمر المشتري للبائع بطحن الحنطة فطحن صار قابضاً“ (فتاویٰ ہندیہ ۳۰۱۲)۔

۶۔ بیع میں خریدار کے حکم سے کوئی اور شخص تصرف کرے تو یہ بھی قبضہ کے لئے کافی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ باندی پر قبضہ سے پہلے اس کا نکاح کر دے اور نکاح اس سے طلی کر لے، تو بعض حضرات کا خیال ہے کہ نکاح بجائے خود اس کی طرف سے قبضہ سمجھا جائے گا، اور بعض حضرات کے نزدیک ”طلی“ کے بعد قبضہ متحقق ہوگا، ”ومن اشترى جارية ولم يقبضها حتى زوجها فوطيها فالنكاح جائز“ (ہدایہ ۳۰۸۶)۔ اس سے معلوم ہوا کہ خریدار کے وکیل کا تصرف خود خریدار کا تصرف سمجھا جائے گا۔

۷۔ بعض صورتوں میں ایک چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینے پر قبضہ کا اطلاق ہوتا ہے، ”وإن كان... فقبض المبيع نقله“ (المغنی ۳۰۱۱)۔

ایک لفظی نزاع:

بہر حال فقہاء حنفیہ کے یہاں ”قبضہ“ تخلیہ سے عبارت ہے، البتہ اس کی کیفیت مختلف اشیاء کے لحاظ سے علاحدہ ہو سکتی ہے، خواہ اموال منقولہ ہوں یا غیر منقولہ (رد المحتار ۳۸۸۳)، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اموال غیر منقولہ میں تو قبضہ ”تخلیہ“ کے ذریعہ وجود میں آتا ہے اور دوسری اشیاء میں ان کے حسب



حالات، چنانچہ امام نووی نے لکڑی وغلہ جات وغیرہ میں منتقلی اور درہم و دینار میں ہاتھ یا کپڑے وغیرہ میں لے لینے کو قبضہ قرار دیا ہے (شرح المہذب ۲۷۶/۹)۔ حنابلہ نے ان کے علاوہ ناپی، تولی اور شمار کی جانے والی اشیاء میں خریدار کے ناپ، تول اور شمار کو بھی قبضہ شمار کیا ہے (الروض المربع ۲۲۴)۔ مالکیہ نے بھی منقولہ اشیاء میں حسب عرف و رواج قبضہ کا مفہوم متعین کیا ہے (الشرح الکبیر علی ہاشم الدسوقی ۱۳۵/۳)۔

تاہم میرے خیال میں یہ کوئی جوہری اختلاف نہیں، بلکہ حنفیہ نے ”تخلیہ“ کے مفہوم میں وسعت پیدا کی ہے اور تخلیہ حقیقی و حکمی کی دو صورتیں کر کے استیلاء کی تمام صورتوں کو اس میں سمیٹ لیا ہے، اور دوسرے فقہاء نے ”تخلیہ“ کو تخلیہ حقیقی تک محدود کر کے اس کا دائرہ نسبتاً تنگ رکھا ہے اور اس کے مقابلہ میں قبضہ کی دوسری کیفیات متعین کی ہیں، اگر تخلیہ حکمی کی کیفیات شامی وغیرہ کتب احناف میں دیکھی جائیں اور اموال منقولہ میں قبضہ کی تفصیلات دوسرے فقہاء کی کتابوں میں تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوگا۔ حاصل یہی ہے کہ قبضہ کے مفہوم میں ہر عہد کا عرف و رواج بھی ملحوظ ہے اور شے مقبوض کی نوعیت بھی۔

خلاصہ بحث:

پس قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی بابت تمام مباحث کا حاصل یہ ہے کہ:

- ۱- قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے مسئلہ میں موجودہ حالات میں فقہ مالکی یا فقہ حنبلی کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔
- ۲- قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فاسد ہے اور قبضہ کے بعد خریدی ہوئی شے پر ملکیت حاصل ہو جاتی ہے۔
- ۳- قبضہ کا مصداق نہ کتاب و سنت میں متعین ہے اور نہ فقہاء نے اس کا کوئی قطعی مفہوم مقرر کیا ہے، بلکہ ہر دور کے عرف اور خرید کی گئی اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہو سکتا ہے۔
- ۴- ”قبضہ سے پہلے خرید و فروخت“ کی ممانعت ”غرر“ کی بنا پر ہے، غرر کثیر سے عقد فاسد ہو جاتا ہے، غرر یسیر سے فاسد نہیں ہوتا۔
- ۵- جو غرر باعث نزاع بن جائے وہ کثیر ہے، اور جو باعث نزاع نہ ہو اور عرف میں مردوح ہو وہ یسیر ہے۔
- ۶- قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے بیع فاسد ہوتی ہے نہ کہ باطل۔
- ۷- قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا فساد حق عبد کی بنا پر ہے نہ کہ حق شرع کی بنا پر، اس لئے اس کا فاسد ہونا دیا ہے نہ کہ قضاء۔
- ۸- فیکٹری سے خریدے ہوئے مال کو منتقل کئے یا کوئی ایسا عمل کئے بغیر جو حسی طور پر قبضہ کہلائے دوسرے سے فروخت کر دینا ”بیع قبل القبض“ میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، ”نقصان کا ضامن ہو جانا“ قبضہ کے تحقق کے لئے کافی نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص قبضہ کے بغیر اپنے اوپر ضمان کی ذمہ داری قبول بھی کر لے تو اس کا اعتبار نہیں، علامہ شامی کا بیان ہے: ”اشتری بقرة مریضة وخلاها فی منزل البائنة قائلاً ان ہلکت فمینی وماتت فمن البائنة لعدم القبض“ (رد المحتار ۴۰۸)۔ (بیمار گائے خریدی اور یہ کہہ کر فروخت کنندہ کے گھر میں چھوڑ دی کہ ہلاک ہو جائے تو میری ہلاک ہوئی اور گائے مر گئی تو یہ بائع کے مال میں سے ہلاکت متصور ہوگی، کیونکہ قبضہ نہیں پایا گیا)۔
- اس لئے محض ہلاکت مال کا ضامن ہو جانا قبضہ نہیں۔
- ۹- بین الاقوامی تجارت میں شپنگ کے ذریعہ خرید و فروخت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بھی ہے اور ”ربح مالہ یضمن“ بھی، اس لئے یہ صورت بھی جائز نہیں۔

☆☆☆

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور قبضہ کی نوعیت

مفتی محمد عبید اللہ سعدی <sup>ط</sup>

۱۔ شرع اسلامی کی رو سے خرید کردہ چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو فروخت کرنا منع ہے، اور یہ ممانعت ”بیع فاسد“ کے درجہ کی ہے، نہ کہ بیع باطل، اگرچہ بعض حضرات کی صراحت یا الفاظ اس انداز سے ضرور ہیں (در مختار مع الشامی ۱۳۸/۵)۔

امام محمد نے اس کے متعلق فرمایا ہے: ”إن هذا مردود لایجوز“ (المبسوط ۵۰۹)۔

لیکن ترجیح فساد کو ہے، لایجوز وغیرہ جیسے الفاظ کے مفہوم میں وسعت ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں: ”والظاهر الثاني (أى الفساد) لأن علة الفساد الغرر كما مع وجود ركني البيع وكثيرا ما يطلق الباطل على الفساد“ (شامی ۵، ۱۳۸-۱۳۹) فساد کی وجہ یہ ہے کہ علت غرر اور دھوکہ ہے جس کی وجہ سے فساد کا ہی حکم لگا کرتا ہے، یعنی عموماً ”فتح القدیر“ میں بھی فساد کا ذکر ہے (۳۷۶) پھر یہ کہ اس ممانعت کی بنیادی وجہ احادیث میں وارد ہونے والی نہیں و ممانعت ہے جو کہ حنفیہ کے اصول کی رو سے فساد کا ہی فائدہ دیتی ہے بطلان کا نہیں، امام محمد نے بھی (الجامع الصغیر ۳۳۵) میں ”فالبیع فاسد فرمایا ہے۔

۲۔ یوں تو اس بابت وارد ہونے والی روایات میں ممانعت مختلف لفظ و انداز میں آئی ہے (فتح القدیر ۶/۱۳۶، اعلاء السنن ۱۳/۲۳۳-۲۳۴، نیل الاوطار - الجزء الخامس)، لیکن بظاہر روایات میں قبضہ کی حقیقت و صورت کی کوئی تعیین نہیں آئی ہے، اس سے، نیز فقہاء محققین کی تصریح و تفصیل سے بھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں توسع ہے اور عرف و معاملہ کا اعتبار ہوگا، اور اس بنا پر موقع محل اور اشیاء کے اختلاف و فرق کی وجہ سے قبضہ کی صورت و حقیقت میں بھی فرق ہوگا، اس سلسلہ کی بعض روایات میں آنے والی تفصیل بھی صورت قبضہ کے مختلف ہونے کو بتاتی ہے، مثلاً یہ کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ خرید و فروخت کی جگہ سے منتقل کر کے اپنے ٹھکانے پر لے جائے بغیر خریدار اول کو اس کا فروخت کرنا منع ہے (ابن حبان والحاکم وغیرہ، اعلاء السنن ۱۳/۲۲۳)، اور بعض روایات میں دو مرتبہ کی ناپ و تول کے بغیر فروخت کی ممانعت آئی ہے جس میں ایک ناپ و تول تو پہلے بیچنے والے کی طرف سے ہوگی اور دوسری خریدار کی طرف سے، اور خریدار کی تول و ناپ کو قبضہ کی حیثیت دی گئی ہے اور اس کے بغیر اس کے حق میں فروخت کی ممانعت کو بھی (قبضہ سے پہلے فروخت) کے قبیل و باب سے قرار دیا گیا ہے، گویا غلہ کی خرید کے بعد اس پر قبضہ کی ایک شکل تو یہ ہے کہ اس کو دکان اور جائے خرید سے ہٹا کر اپنے ٹھکانے پر یا ہاتھ میں لے لیا جائے، اور ایک شکل یہ ہے کہ فروخت کنندہ کی ناپ و تول کے بعد خریدار خود ناپ و تول کرے تو یہ ناپ و تول قبضہ ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۳۱، ۲۳۲-۲۳۳)، نیز ”بدائع و شامی“ وغیرہ میں بھی اس قسم کی بات آئی ہے۔ بہر حال اس بابت توسع سمجھ میں آتا ہے اور اس کا اعتبار بھی کیا گیا ہے، لیکن ضرورت اصولی تحدید کی ہے، تاکہ اس کی روشنی میں نئی نئی شکلوں کا حکم معلوم کیا جاسکے اور مروج قدیم و جدید شکلوں کا اس پر یا اس کا ان شکلوں پر انطباق ظاہر ہو سکے۔

قبضہ کا ایک ہی دو شکلوں میں منحصر نہ ہونا، یا ایک ہی دو شکلوں میں اس کا معتبر نہ ہونا، بلکہ اس میں توسع، بظاہر یہ مذاہب اربعہ کا اتفاق حکم ہے، جیسا کہ قدیم محققین فقہاء مذاہب سے صراحت ملتی ہے، مثلاً:

فقہ حنفی کی ایک معتبر کتاب ”النتف فی الفتاویٰ“ میں آیا ہے: ”والقبض علی خمسة أوجه: أحدها قبض الكرم والدار وماله غلق وباب فيما لم يسلم البائع المفتاح إلى المشتري أو يقبض المشتري بإذن البائع فليس بقبض، وإذا كان في وسط الكرم والدار، وقال البائع: سلمت إليك فلا يحتاج حينئذ إلى قبض المفتاح. والثاني قبض الأرض فما لم يدخل فيها أو يمر على حد من حدودها ويراه فلا يكون قبضا، فإذا دخل فيها ومر على حد من حدودها، فيكون قبضا عند ذلك. والثالث قبض الحيوان وهو أن يكون في موضع يصل إليه بيده أو إلى لحامه أو مقوده، فيكون

<sup>ط</sup> شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ، و سکرٹری برائے سمینار و برنامہ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔



قبضا۔ والرابع قبض الكيلی فان اکتاله المشتري في وعائه أو كاله البائع في وعائه بمحض منه أو من وكيله، فيكون قبضا، ولو دفع الوعاء إلى البائع فكاله فيه بغير محضر منه يكون قبضا في قول أبي حنيفة وأصحابه ولا يكون قبضا في قول الشافعي ومالك... والخامس قبض الغروض وهو أن يسلمها إلى المشتري بحيث تناولها يد المشتري وخلي بينه وبينها من غير حاجز ومانع“ (النتف في الفتاوى ۲۸۰-۲۸۲)۔

(یعنی قبضہ کی پانچ صورتیں ہیں: ایک تو باغ و مکان وغیرہ جس کا باقاعدہ دروازہ ہو اس پر قبضہ، تو اگر کنجی دیدی جائے یا یہ خریدار مالک و بائع کی اجازت سے تصرف کرنے لگے تو قبضہ ہو گیا، یا یہ کہ خریدار مکان و باغ کے اندر موجود ہو اور بائع کہے کہ میں نے سپرد کر دیا تو بھی کافی ہے۔

دوسرے عام زمین پر قبضہ، اس کے لئے زمین پر پہنچنا وغیرہ ضروری ہے۔ تیسرے جانور پر قبضہ، اس کی صورت یہ ہے کہ جانور ایسی جگہ و ایسے حال میں ہو کہ خریدار اس کو کام میں لاسکے۔ چوتھے ناپ و تول کی چیز کہ اگر خریدار یا اس کے وکیل کے سامنے فروخت کنندہ نے تول تو قبضہ ہو گیا، اور اگر غیر موجودگی میں، لیکن خریدار کے تھیلے وغیرہ میں تول تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک قبضہ ہو گیا۔ اور پانچویں سامان (برتن وغیرہ) پر قبضہ کی صورت یہ ہے کہ اس کو خریدار کے سپرد کر دیا جائے یا اس کو تصرف کا پورا موقع دے دیا جائے۔

ابن عبدالبر مالکی کی کتاب ”الکافی“ میں جو کہ فقہ مالکی کی معتمد کتابوں میں ہے، نیز امام رافعی شافعی کی ”شرح الوجیز“ میں، اور حنابلہ کی ”المغنی“ میں بھی اسی انداز میں تفصیل آئی ہے (الکافی ۶۶۱/۲، اعلاء السنن ۲۳۱/۱۳ بحوالہ شرح الوجیز ۲۸۸/۳، ۲۸۹/۳، المغنی ۲۲۰/۳)۔

جیسے کہ اس بابت یہ بات بھی آئی ہے: ”القبض قبضان، قبض حکم و قبض رقبة (قبض حقیقی) فقبض الحكم مثاله أن يشتري عبداً ثم يقتله أو يفقأ عينه أو يكسر رجله ونحو هذا، فقد صار قابضاً للعبد بهذه الجناية، وقبض الرقبة ما ذكرنا في الوجوه الخمسة“ (المغنی فی الفتاوی ص ۳۸۲) اور ”البحر الرائق“ میں تصرف قولی وحسی یعنی قبض قولی و قبض فعلی کا تذکرہ آیا ہے (البحر الرائق)۔

”تصف“ کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قبضہ کی دو صورتیں ہیں: قبضہ حکمی اور قبضہ حقیقی، قبضہ حکمی کی مثال تو یہ ہے کہ ایک غلام خریدار اور پھر اس کو نقصان پہنچادیا، مثلاً اس کو قتل کر دیا، یا ہاتھ و پیر، آنکھ وغیرہ کو نقصان پہنچادیا، تو اس کی وجہ سے خریدار کا قبضہ ہو جائے گا، اور قبضہ حقیقی وہ ہے جس کی پانچ شکلیں پیچھے ذکر کی جا چکی ہیں۔

”الفقہ الاسلامی“ میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں عرف کا اعتبار ہے (الفقہ الاسلامی ۴، ۳۱۹)۔

اسی لئے ہر فرقہ و مذہب کی جزئیات جو کہ قبضہ کے بیان میں آئی ہیں مختلف انداز کی ملتی ہیں، اور ان میں مختلف شکلوں کو قبضہ کے تحت اور قبضہ کے حکم میں یا مفید قبضہ مانا گیا ہے، فقہ حنفی میں بھی اور دوسرے مذاہب میں بھی (ملاحظہ ہو: المغنی، فتاویٰ خانہ، شامی وغیرہ)۔

اب ان تصریحات و جزئیات اور تفصیلات کو مد نظر رکھ کر اصولی تحدید کی جائے گی، تو اس بابت فقہ حنفی کے مشہور محقق و ترجمان علامہ کاسانی کا یہ بیان ملتا ہے جس پر اعتماد بھی کیا گیا ہے:

”التسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي، وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له، وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع“ (البدائع ۵، ۲۲۲)۔

(حنفیہ کے نزدیک قبضہ یہ ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو جانے کے بعد فروخت کنندہ، خریدار اور خرید کردہ چیز کے درمیان یوں آزادی کر دے کہ خریدار کے لئے حسب خواہش و ضرورت خرید کردہ چیز میں ہر قسم کا تصرف، استفادہ و انتفاع ممکن ہو جائے اور بائع کی طرف سے کوئی روک و رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔

یہ اصل و بنیادی بات ہے، باقی جزئیات اور ”المغنی“ کا بیان اس کی صورتوں کی وضاحت و بیان ہے، جس میں عرف کے مطابق اضافہ کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ مذکورہ صورتیں عرف و معاملہ پر ہی مبنی ہیں، مثلاً آج کل بعض معاملات بالخصوص زمین کے معاملات میں کاغذی اندراج، اور اس کی سرکاری کارروائی کو



بڑی اہمیت حاصل ہے، لہذا اس کو بھی کافی سمجھا جائے گا، ویسے تو زمین کے معاملہ میں یوں بھی فقہ حنفی کے اندر وسعت ہے، اور فروخت کردہ سامان کے نقصان و ضمان کا خریدار کی طرف منتقل ہو جانا خاص شکلوں میں۔

قبضہ کی بابت اختلاف کے باوجود جو تفصیلات محققین مذاہب نے ذکر کی ہیں، جیسا کہ تذکرہ آتا ہے، احقر ان سے یہ سمجھا ہے کہ خرید و فروخت میں قبضہ بہر حال مطلوب ہے اور خریدار کے تصرف کے لئے ضروری ہے اور ہر چیز میں ضروری ہے، اختلاف اصل میں اس بابت ہوا ہے کہ قبضہ کا مفہوم مختلف اشیاء و صورتوں کے اعتبار سے کیا ہے، مثلاً یہ کہ آیا زمین وغیرہ منقولات میں بھی قبضہ بایں معنی ضروری ہے کہ خریدار استعمال و انتفاع شروع کر دے یا یہ کہ بائع کی طرف سے اس کو موقع حاصل ہو جائے، کتب مذاہب کی جزئیات اس توافق و اتفاق کے ساتھ مذکورہ جزئی و ضمنی اختلاف کو بتاتے ہیں۔

البتہ فقہاء احناف نے اس کے ساتھ یہ بحث کی ہے کہ ایک نفس قبضہ ہے اور ایک قبضہ تام، تخلیہ جو ذکر کیا گیا اس سے نفس قبضہ حاصل ہوتا ہے، لیکن قبضہ تام کے حاصل ہونے میں اختلاف ہے، اس اختلاف کی اہمیت یہ ہے کہ بالخصوص خرید و فروخت پر اس کا اثر پڑے گا، بعض حضرات ناپ و تول والی چیزوں میں ناپ و تول کے بغیر قبضہ تام کو نہیں مانتے، اور کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ان اشیاء کی خرید و فروخت منع ہے، اگرچہ ایک بڑی جماعت اصل قبضہ اور نفس تخلیہ کو دوسری اشیاء کی طرح اس میں بھی کافی مانتی ہے (البدائع ۱۵/۲۴۴)۔

جو لوگ قبضہ تام کو الگ مانتے ہیں ان کے نزدیک اس کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں، مثلاً: (۱) اتلاف کہ مشتری (خریدار) خرید کردہ شے کو تلف و ضائع کر دے یا نقصان پہنچا دے، (۲) خرید کردہ شے فروخت کنندہ کی طرف سے خریدار کو بطور امانت وغیرہ دیدی جائے، (۳) جو شخص خرید کردہ شے کو کچھ نقصان پہنچائے خریدار اس سے ضمان لے لے، (۴) سابق قبضہ، یعنی خریدنے سے پہلے شے کا خریدار کے پاس موجود ہونا بشرطیکہ جہت ایسی ہو کہ اس پر ضمان لازم آتا ہو، (۵) اور تخلیہ بھی، اگرچہ ہر جگہ نہ ہو (لفقہ الاسلامی ۱۸/۴۲۲۳)۔

اور اس ضمن میں پھر یہ گفتگو بھی آتی ہے کہ خریدار کے حق میں فروخت کی اجازت و صحت کے لئے مال کا خریدار کے ضمان میں آ جانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے باوجود ممانعت رہتی ہے، اس لئے کہ ضمان تو نفس تخلیہ و نفس قبضہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ”بدائع“ وغیرہ میں بھی آیا ہے: ”وان باء مکایلة أو موازنة فی المکیل والموزون و خلی فلا خلاف فی أن الصبیع ینخرج عن ضمان البائع و یدخل فی ضمان مشتری حتی لو ہلک بعد التخلیة قبل المکیل والوزن ینهلک علی مشتری و كذلك لا خلاف فی أنه لا یجوز للمشتری بیعه والانتفاء به قبل المکیل والوزن“ (بدائع ۶/۲۴۴)۔

۳۔ سوال نمبر (۲) کے جواب کے تحت جو تفصیل آئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اشیاء کے فرق کی وجہ سے قبضہ کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے، اگرچہ اصولی طور پر ”تخلیہ“ بنیادی چیز ہے اور اصل قبضہ ہے، پھر بھی منقولات میں نقل مکانی وغیرہ جیسی صورتیں مطلوب اور معتبر ہوتی ہیں، جبکہ غیر منقولہ اشیاء میں نفس تخلیہ ہی کافی ہے، یا یہ کہ مکان و دکان کی کنجی کامل جانا وغیرہ۔

۴۔ اکثر حضرات کا میلان و رجحان اس بات کی طرف ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے نہی و ممانعت معلول ہے، اگرچہ فقہاء احناف کی ایک جماعت یا ایک بڑی جماعت اس کی قائل نہیں، جن حضرات نے تخلیہ کو ہی مکمل قبضہ اور قبضہ تام کی حیثیت ہر شے میں دیدی ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ حکم تعبیدی ہے، جیسا کہ ”بدائع“ میں نقل کیا ہے اور دوسرے حضرات نے بھی ذکر کیا ہے۔

اور اکثر حضرات کے نزدیک اس نہی کی علت ”غرر انفساخ“ ہے، یا ”ربح مالہ یضمن“، ”غرر انفساخ“ کا مطلب یہ ہے کہ قبضہ میں لینے سے پہلے کسی وقت بھی خرید کردہ سامان کے ضیاع کا اندیشہ ہے، جس کی وجہ سے بیع فسخ و ختم ہو جائے گی، اور چونکہ زمین کے اندر یہ اندیشہ نہیں ہوتا، اسی لئے اس کا استثناء ہے۔ اور ”ربح مالہ یضمن“ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز خریدار کے ضمان میں نہیں آئی کہ وہ ضائع ہو تو خریدار کا نقصان مانا جائے اس کا نفع لینا درست نہیں ہے۔

ایک علت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کی گئی ہے کہ ایسی خرید و فروخت میں ربا اور سود کا پہلو پایا جاتا ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۵ وغیرہ)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خریدار نے جبکہ مال خرید کر اس کی قیمت ادا کر دی اور مال کو قبضہ میں نہیں لیا، اور بیچ دیا اور بیچ کر نفع کمایا تو معاملہ کا

حاصل نقد بمقابلہ نقد بنا، خریدار نمبر (۱) نے جیب سے نقد دیا، اور پھر خریدار نمبر (۲) سے نقد ہی بڑھا کر حاصل کیا، درمیان میں مال کو واسطہ نہیں بنایا کہ اس پر قبضہ کرتا پھر فروخت کرتا۔

اس علت کو علامہ شوکانی نے ترجیح دی ہے، جیسا کہ ”اعلاء السنن“ میں مذکور ہے اور صاحب اعلاء نے بھی اس کو پسند کیا ہے، اور احقر کی رائے میں بھی یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ غرر انفساخ والی بات درجہ نادر میں ہے اور ضمان نفس تخلیہ کی وجہ سے مان لیا جاتا ہے، نیز صاحب ”اعلاء السنن“ نے ذکر کیا ہے کہ انتقال کی شرط تمام قبضہ کے لئے نہیں ہے، اس لئے کہ قبضہ عرفاً معلوم ہے اور یہ بات محتمل ہے، اس لئے معلوم کو مدار و معتبر مانا جائے گا، ”غرر انفساخ و ربح مالم یضمّن“ کی علت امام صاحب وغیرہ نے، نیز عموماً فقہاء نے مانی ہے، اور مجموعی طور پر ان سب کا اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ علت ایک سے زائد بھی ہو سکتی ہے، چنانچہ صاحب ”اعلاء“ نے سب کا تذکرہ کیا ہے۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت میں محل ممانعت کیا ہے، اختلاف ہے، ایک جماعت جس میں امام شافعی و امام محمد شامل ہیں، مطلقاً منع کرتی ہے، یعنی ہر چیز میں، اور بقیہ سب کے یہاں تفصیل و تخصیص ہے، مختصر بات یہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے حق میں تو یہ ممانعت اتفاقی و اجماعی ہے، بقیہ میں اختلاف اور توسع ہے، کم از کم ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام احمد کے نزدیک، اگرچہ باہم ان کے درمیان بھی اختلاف ہے کہ امام ابوحنیفہ یہ ممانعت تمام منقولات کے حق میں مانتے ہیں اور غیر منقول کو مستثنیٰ مانتے ہیں، اصل میں بات یہ ہے کہ روایات میں کھانے پینے کی چیز کا تذکرہ زیادہ ہے، امام ابوحنیفہ نے اسی کی تنقیح منقول سے کی ہے، اور غیر منقول کے حق میں حضرت عثمان کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں کہ انہوں نے ایک زمین خرید کر بغیر قبضہ حسی فروخت کی تھی (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۷، ۲۲۹)۔

۶۔ کسی فیکٹری سے مال خرید کر دوسرے کو فروخت کرنا اور دوسری فروخت سے قبل اس کو فیکٹری سے ٹھکانہ و مقام کی طرف منتقل نہ کرانا، یا یہ کہ قبضہ کی ظاہری کوئی شکل اختیار نہ کرنا، اس میں دو شکلیں نکلتی ہیں:

ایک تو یہ کہ فیکٹری سے مال خرید لیا، یعنی معاملہ طے کیا، قیمت دیدی، اور مال ابھی فیکٹری اور اس کے گودام میں ہے، کہ دوسرے شخص سے خریدنے کا معاملہ مکمل کیا، اور اس معاملہ کو مکمل کر کے فیکٹری کو آرڈر دیا کہ میرا خرید کردہ مال فلاں جگہ، فلاں شخص کو پہنچایا جائے، تو یہ معاملہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا، خواہ کوئی چیز ہو، اس لئے کہ تخلیہ اور قبضہ کسی طرح کا نہیں پایا گیا۔ الا یہ کہ خریدار اول کے معاملہ کے بعد فیکٹری نے اس کے خرید کردہ مال کو گودام میں ایک طرف کر دیا ہو، یا یہ کہ نشان وغیرہ لگا کر ممتاز کر دیا ہو تو یہ تخلیہ ہو گیا جو کہ کافی سمجھا گیا ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ فیکٹری سے مال خریدنے والے نے پہلے معاملہ خریدار نمبر (۲) سے کیا، پھر فیکٹری کو آرڈر دیا مال کی خرید و ارسال کا، تو اس میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا معاملہ تو نہیں، البتہ معدوم کی بیع وغیرہ کی خرابیاں پیدا ہوں گی، ضرورت کی وجہ سے توجیہ کر لیں تو مال جب روانہ ہوگا اور سوال میں مذکور تفصیل کے مطابق کہ درمیانی وقفہ میں ضیاع کی ذمہ داری خریدار نمبر (۱) کی ہے تو قبضہ مان لیا جائے گا، اور یہ معاملہ درست ہوگا، جبکہ مذکورہ صورت میں نقل مکانی بھی پایا جا رہا ہے جس کی قبضہ میں اہمیت ہے۔

۷۔ آج کل شکلیں بہت رائج ہو گئی ہیں اور ان کا تعامل ہے۔

الف۔ جن صورتوں میں عرفاً و معاملتاً فروخت کنندہ نمبر (۱) کی طرف سے ضمان خریدار نمبر (۱) کی طرف منتقل مان لیا جاتا ہے، جبکہ مال فیکٹری و فروخت کنندہ کے ٹھکانہ سے روانہ ہو چکا ہو، ان صورتوں میں یہ معاملہ درست ہے کہ خریدار نمبر (۱) اس سامان کو تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، یہ فروخت بعد القبض ہوگی، اس لئے کہ تخلیہ اور ضمان پایا جا رہا ہے (امداد الفتاویٰ کے بعض مندرجات سے اس کی گنجائش مترشح ہے، ۱۳۵-۱۳۶)۔

ب۔ اور اس دوسری فروخت میں اگر خریدار نمبر (۱) مال کے راستہ میں رہنے کے باوجود ضمان سے بری ہو جاتا ہے اور ضمان خریدار نمبر (۲) کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کو تصرفات کے تمام مواقع حاصل ہوتے ہیں تو یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ تخلیہ اور ضمان دونوں پائے گئے اور

قبضہ کی اصل حقیقت ضمان ہے۔

ج۔ فقہاء عصر کی تحریرات میں بعض رہنمائیاں اور صراحتیں ملتی ہیں جو کہ مروج معاملات میں کافی و کارآمد ہوں گی، مثلاً:

۱۔ خریدار نمبر (۱) جبکہ کسی بینک کو واسطہ بنائے اور وہ بینک اپنی شاخوں کے واسطے سے مال کے نقل و ارسال و ایصال کا کام لے اور کرے تو قبضہ پا لیا گیا، اور اس صورت میں بھی خریدار کی طرف سے اگلی فروخت درست ہے۔

۲۔ خریدار نمبر (۱) کی طرف سے نقل و حمل کی کسی کمپنی کی تعیین پائی جائے تو جب مال اس کمپنی کے سپرد کیا جائے گا تو بھی اس کا قبضہ مان لیا جائے گا۔

۳۔ خرید کردہ مال کی آمد و وصولیابی کے جملہ اخراجات (کرایہ وغیرہ) اگر بذمہ خریدار نمبر (۱) ہے تو مال کی روانگی کے بعد قبضہ معتبر ہے، خواہ نقل و حمل کا ذریعہ اس نے متعین کیا ہو یا نہیں (احسن الفتاویٰ ۶/۵۲۵-۵۲۶)۔

ایسی صورتوں کے فقدان کی صورت میں مال کے خریدار (۱) کے قبضہ میں آنے سے پہلے فروخت کے معاملہ کو معاملہ بیع نہ مان کر وعدہ بیع قرار دے لیا جائے، اور مال آنے پر بیع ہو جس میں اختیار رہے گا تو درست ہے، بعض معاملات میں ایسی توجیہ و مشورہ ”احسن الفتاویٰ و امداد الفتاویٰ“ وغیرہ میں آیا ہے۔

قبضہ کی مذکورہ بالا صورتوں میں غلہ وغیرہ ناپی و تولی جانے والی چیزوں کا معاملہ اہم ہے، کہ خریدار نمبر (۱) کی طرف سے اگلی فروخت صرف تخلیہ و ضمان کی بنیاد پر درست نہیں ہے، بلکہ ناپ و تول مطلوب ہے جس کے بغیر قبضہ تام نہیں ہوتا، اور اگر ہو جائے تو بھی بیع درست نہیں، البتہ ایسی چیزوں کے حق میں دوسری گنجائشوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، مثلاً یہ کہ ناپ و تول کا لزوم اس وقت ہوگا، جبکہ پہلی فروخت اس بنیاد پر ہو، اور اگر وہ بورے کی بنیاد پر ہو کہ اتنے بورے مال اور اتنی دیگر وغیرہ اور مال بورے کا بورا رکھا ہوا اٹھا کر دیا جائے تو یہ پابندی نہ ہوگی۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور غرر کے احکام

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی ؒ

۱۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع قبل القبض فاسد ہے اور یہ صورت ”ربح مالہ یضمن“ میں شامل ہے، اس کی صورت یہ ہے ”ان یشتري متاعا ویبیعه من آخر قبل قبضه“۔ صاحب ”اعلاء السنن“ لکھتے ہیں: ”فهذا البيع باطل ورجحه لا يجوز“ (اعلاء السنن ۱۳، ۱۴) آگے مولف مذکور نے ابطال کی وجہ بھی بیان کر دی ہے، وہ یہ کہ ابھی بیع پہلے شخص ہی کے ضمان میں ہے مشتری کے قبضہ میں نہ آنے کے باعث ضمان میں داخل نہیں ہوئی، اس کے عدم جواز میں وہ حدیث بھی پیش کی جاسکتی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسیدؓ کو اہل مکہ کی جانب بھیجا کہ وہ یہ چار باتیں ان تک پہنچادیں، (۱) ”ان لا یصلح شرطان فی بیع (۲) ولا بیع وسلف (۳) ولا بیع ما لا یملک (۴) ولا ربح ما لا یضمن“، حضرت عبداللہ بن عمرو سے بھی یہ روایت موجود ہے جس کی اصحاب خمسہ نے بجز ابن ماجہ کے تخریج کی ہے، اس مفہوم کی دیگر مرویات باختلاف سیر ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حاکم نے مستدرک میں، نسائی نے سنن کبریٰ میں، امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں نقل کی ہیں (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: معنی لابن قدامہ ۲۲۰-۲۲۱، محلی لابن حزم ۸/۵۲۲)۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ”فمذهب أبي حنيفة لا يدخل المبيع كله في ضمان المشتري إلا بالقبض إلا العقار وعند الشافعي العقار وغيره سواء وهو رواية عن أحمد“ (فتاوی لابن تیمیہ ۲۹، ۳۰۵)، عبدالرحمن الجزیری نقل فرماتے ہیں: ”الحنفية قالوا من البيع الفاسد بيع الأعيان المنقولة قبل قبضها“، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک بیع منقول ہو یا غیر منقول، قدرت علی التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیع باطل ہوگی ”فإذا اشترى منقولاً كان أو غيره ولم يسلم ثم باعه وقع البيع باطلا“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲، ۲۲۲)۔

اس طرح کی بیع سے متعلق ہمارے بعض علماء نے بھی باطل کا قول کیا ہے، چونکہ باطل اور فاسد میں تعارض ہے، اسلئے اس کا جواب اگر یوں دیدیا جائے کہ یہاں پر باطل بمعنی فاسد ہے تو اب تعارض نہ رہ جائے گا، نیز اس کے نظائر نصوص فقہاء میں موجود بھی ہیں، دوسرا جواب اس عبارت سے بھی دیا جاسکتا ہے جو درج ذیل ہے:

”الحنفية قالوا إذا اصطاد طيرا فکان فی یدہ ثم أرسله فی الهواء فإن بیعه فی هذه الحالة یكون فاسدا لعدم القدرة علی التسليم، أما إذا باع الطیر فی الهواء قبل أن یصطاده فالبيع باطل لا ینعقد أصلا لعدم الملك“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲، ۲۲۲)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر شکار کر کے چڑیا اپنے ہاتھ میں لے رکھا اور پھر فضا میں چھوڑ دیا تو اس صورت میں یہ بیع فاسد ہوگی قدرت علی التسلیم نہ ہونے کی وجہ سے، لیکن اگر شکار سے پہلے فضا ہی میں بیع کر لی گئی تو یہ بیع باطل ہوگی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے۔

لہذا فساد کی وجہ عدم تسلیم للقدرة ہے اور ابطال کی وجہ عدم ملکیت ہے۔

علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں: ”فالشافعي یمنعه مطلقا ویقول هو من ضمان البائع وهو رواية ضعيفة عن أحمد وأبو حنيفة یمنعه إلا العقار ویقول: هو من ضمان البائع وهو لاء یعللون بتوالی الضمانین“ (فتاوی لابن تیمیہ ۲۹، ۳۰)۔

(۵۰۶)

شیخ الحدیث، پرنسپل، دارالعلوم، منو، منو۔

ائمہ اربعہ میں سے حضرت امام مالکؒ کے نزدیک بیع قبل القبض اعیان منقولہ میں ہو یا غیر منقولہ میں، سوائے طعام کے صحیح ہے، ”الباکیۃ قالوا: یصح للمشتري أن يتصرف في المبيع قبل قبضه بالبيع سواء كان المبيع أعيانا منقولة أو أعيانا ثابتة كالارض والنخيل ونحوهما الا الطعام كالقمح والفاكهة“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲۰۲۴۵) ”وقال مالکؒ: يجوز لأن النبي ﷺ خص الطعام بالذكر عند النهي“ (مبسوط للسرخی ۱۳۰۸) ”ونقل عن أحمد: أن المطعوم لا يجوز بيعه قبل قبضه سواء كان مكيلا أو موزونا أو لم يكن“ (مغنی لابن قدامہ ۱۱۵، ۲) ”الحنابلۃ: قالوا یصح التصرف فی المبیع بالبیع قبل قبضه، إذا كان غير مكيل أو موزون أو معدود“ (الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲۳۶، ۲)۔

مذکورہ مذاہب کی روشنی میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت امام مالک کے یہاں جواز میں توسع ہے تو حضرت امام شافعی کے یہاں عدم جواز میں، حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اعیان منقولہ میں غیر صحیح اور اعیان غیر منقولہ میں صحیح، پھر اگر کسی نے اعیان منقولہ میں عدم جواز کے باوجود قبل القبض بیع کر لی تو وہ بیع فاسد ہوگی، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”ومنها القبض في بيع المشتري المنقول، فلا یصح بیعه قبل القبض لما روى النبي ﷺ نهي عن بيع مال يقبض، والنهي يوجب فساد المنهي ولأنه يبيع فيه غرر الانفساخ بهلاك المعقود عليه“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۰)۔

فقہاء نے ایک مسئلہ بڑی وضاحت سے اٹھایا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ اگر کر لی گئی تو اس کا حکم کیا ہوگا، حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو یہ بیع سرے سے فاسد ہے، چاہے بیچنے والے کو ہی کیوں نہ بیچ دی گئی ہو، یعنی اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”وقد نهي رسول الله عن بيع فيه غرر سواء باعه من غير بائعه؛ أو من بائعه لأن النهي مطلق لا يوجب الفصل بين البيع من غير بائعه أو بين البيع من بائعه وكذا معنى الغرر لا يفصل بينهما“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۰)، علامہ عبدالرحمن الجزيري بھی یہی تحریر فرماتے ہیں: ”سواء باعها لمن اشتراها عنه أو لغيره“ (الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲۳۲، ۲) حضرت امام شافعی کے نزدیک بیع قبل القبض جائز نہیں، مگر چند صورتوں میں، جن میں سے پہلی صورت یہ ہے: ”الأول أن يبيعه قبل قبضه لمن اشتراه منه بنفس الثمن الذي اشتراه به بدون زيادة“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲۳۲، ۲)۔

مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہو گیا کہ حضرت امام شافعی کے مسلک میں ”بیع قبل القبض“ اولاً تو جائز نہ تھی، لیکن اگر مشتری نے خود بائع کو ہی ثمن اول کے ساتھ بیچ دیا تو یہ بیع صحیح ہو جائے گی، حضرت امام احمد بن حنبل کے یہاں بھی بیع کی صحت کی چند صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ اگر بائع نے خود خرید تو یہ صحیح نہ ہوگی، الا یہ کہ بائع کے لڑکے باپ، یا خادم، یا بیوی نے اسے خرید لیا۔

(۱) ”فإذا اشتراها ابنه أو أبوه أو خادمه أو زوجه فإنه یصح إذا لم یکن ذلك حيلة يتوصل بها إلى الشراء“۔

(۲) ”فإن اشتراها بمثل ثمنها أو أكثر فإنه یصح“۔

(۳) ”أما إذا لم یکن من جنس ثمن الأول كما إذا باعها بنقد ثم اشتراها بعروض تجارة فإنه یصح“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲۳۶، ۲)۔

اس میں کچھ اور تفصیلات ہیں جو مغنی لابن قدامہ ۱۱۸/۲، رد المحتار ۴/۲، بدایۃ المجتہد ۱۲/۱۳۴-۱۳۵ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

اب ائمہ اربعہ کا مسلک اس طرح ہوگا:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ فاسد ہے، سوائے غیر منقول کے، یہ بیع خود بائع سے ہو، یا بائع کے علاوہ کسی اور سے۔

امام مالک کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ اعیان منقولہ وغیر منقولہ دونوں میں صحیح ہے، بجز طعام کے، امام شافعی کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ منقول وغیر منقول دونوں میں صحیح نہیں، الا یہ کہ مشتری خود بائع کو ہی ثمن اول کے ساتھ بیچ دے۔

حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک غیر مکیل وغیر موزون وغیر معدود وغیر مذروع میں قبل القبض ہے، اس کے ماسوا میں نہیں۔

حنبلی مسلک کی ایک روایت جو قوی ہے وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مؤید ہے، اور ایک ضعیف روایت حضرت امام شافعیؒ کی۔

خلاصہ کلام:

”بیع قبض القبض“ تو مطلقاً جائز ہے اور نہ ناجائز، نیز اگر بیع کر لی گئی تو قاسد ہوگی اعیان منقولہ میں، اور صحیح ہوگی غیر منقولہ میں۔

۲۔ کتاب وصفت و نصوص فقہاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے، حالات، زمان و مکان و بیع کے اختلاف سے قبضہ کی نوعیتیں جدا گانہ ہوں گی۔

پس اولاً عرض ہے کہ فقہاء نے قبضہ کی دو قسمیں کی ہیں: حقیقی اور حکمی۔ حقیقی قبضہ تو جس اور تسلیم سے ہوگا، اور حکمی استیلاء، تمکن، اشارہ، تخلیہ و تیز سے، ابن قدامہ کی درج ذیل عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے مراد استیلاء ہی ہے جو لوگوں کے بیچ متعارف ہو۔

”وکل ما یحتاج الی قبض اذا اشتراه لم یجز یبعه حتی یقبضه“ (مغنی لابن قدامہ ۴، ۲۲۰)۔

علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں: ”ثم قال الخرق: ومن اشتری ما یحتاج الی قبضه لم یجز یبعه حتی یقبضه ففرق بین ما یحتاج الی القبض وما لا یحتاج فما لا یحتاج یکفی فیہ التمكن“ (فتاویٰ لابن تیمیہ ۲، ۲۶، ۲۷، ۲۸)۔

اسی رائے کی تائید ابن قدامہ کی اس تحریر سے بھی ہو رہی ہے: ”وقبض کل شیء بحسبه، فلین کان مکیلاً أو موزوناً فقبضه بکیله ووزنه. وبهذا قال الشافعی. وقال أبو حنیفة التخلية فی ذلك قبض، وقد روی أبو الخطاب عن أحمد روایة أخرى أن القبض فی کل شیء بالتخلية مع التميز“ (مغنی لابن قدامہ ۴، ۲۲۰)۔

ہر چیز کا قبضہ بیع کے شایان شان ہوگا، چنانچہ اگر بیع از قبیل کیل یا موزون ہے تو اس پر قبضہ کیل اور وزن سے ہوگا اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے، اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر قبضہ تخلیہ سے ہوگا، ایک روایت ابو الخطاب نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے نقل کی ہے کہ صرف تخلیہ سے ہی قبضہ نہ ہوگا تا وقتیکہ خریدی ہوئی شیء تمیز نہ ہو جائے۔

یہاں پر تخلیہ سے مراد قبضہ کی اجازت دیدینا ہے نہ کہ تخلیہ کا معنی مخصوص، ”قوله أن یقول: خلیت الظاهر أن المراد به الإذن بالقبض لا خصوص لفظ التخلية“۔

وہ چیزیں جو جزافاً اور اندازہ سے خریدی جاتی ہیں ان کا قبضہ نقل ہے۔ ”وان یبع جزافاً فقبضه نقله“ (مغنی لابن قدامہ ۴، ۲۲۰)۔

حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ بروہ تصرف جس میں بدون قبضہ کے جواز ہوا اس میں اگر مشتری قبضہ سے قبل تصرف کرے تو وہ جائز نہ ہوگا، اور ہر وہ تصرف جس میں تصرف قبضہ کے علاوہ جائز نہیں اس میں مشتری قبضہ سے پہلے تصرف کرے تو وہ جائز ہوگا۔

”کل تصرف یجوز من غیر قبض إذا فعله المشتري قبل القبض لا یجوز وکل ما لا یجوز إلا بالقبض کالهبه إذا فعله المشتري قبل القبض جاز ویصیر المشتري قابضاً له“ (شامی ۴، ۵۶۱)۔

علامہ سرخسیؒ کی بھی تحریر پیش خدمت ہے: ”قال محمد: کل تصرف لا یتع إلا بالقبض، فذلک جائز فی البیع قبل قبضه إذا سلطه علی قبضه فیقبضه“ (البسوط ۸، ۱۳)۔

علامہ شامی نے قبضہ کی بہت ساری صورتیں تحریر فرمائی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

”ومنه مالو اشتری دهننا ودفعه قارورة یزنه فیها فوزنه فیها بخضرة المشتري فهو قبض، وكذا بغیته فی الأصح وكذا کل مکیل أو موزون إذا دفع له الوعاء فکاله أو وزنه فیه بأمره ومنه مالو غصب شیئاً ثم اشتراه صار قابضاً“ (رد المحتار ۴، ۵۶۱)۔

حضرت امام احمدؒ کے نزدیک قبضہ سے مراد تمکن ہے نہ کہ نفس قبضہ: ”فظاهر مذهب أحمد أن الناقل للضمان إلى المشتري هو



التمکن من القبض لا نفس القبض“ (فتاوی لابن تیمیہ ۲۹، ۵۰۷)۔

صاحب ”رد المحتار“ نے تخلیہ کو حکماً قبضہ قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: ”وحاصله أن التخلية قبض حکماً“ آگے علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ قبضہ کی مختلف صورتیں ہیں: ”لکن ذلك يختلف، بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيع مثلاً فدفعة المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض، وفي نحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض... وفي الملتقط: ولو باع داراً وسلمها إلى المشتري دار فيها متاع قليل أو كثير لا يكون تسليمها حتى يسلمها فارغة“ (رد المحتار ۴، ۵۶۲)۔

ملک العلماء ابو بکر کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”أما الحديث فظاهر قوله عليه السلام: ”يدا يد“ فنحملها على التعيين“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۱۹)۔

ابن حزم تحریر فرماتے ہیں کہ جب شئی کسی خاص کی ہو جائے تو اسے قبضہ کہیں گے: ”فهذا عمر يقول بذلك ويبين أن القبض هو الذي يكون الشيء للمرء“ (محل لابن حزم ۱، ۵۲۰)۔

علامہ کاسانی نے قبضہ کی تفسیر اس طرح کی ہے: ”وأما تنسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له، وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۳)۔

تسليم اور قبضہ ہمارے نزدیک تخلیہ ہے اور تخلیہ یہ ہے کہ بائع بیع اور مشتری کے درمیان موانع کو اس طرح دور کر دے کہ مشتری تصرف پر قادر ہو جائے، لہذا بائع بیع کو سونپنے والا اور مشتری اس پر قبضہ کرنے والا ہو جائے، ایسے ہی ثمن مشتری سے نکل کر بائع کے پاس چلا جائے، صاحب ”بدائع“ اسی مفہوم کو ایک مقام پر اس طرح بیان کرتے ہیں: ”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۲۸)۔

مذکورہ بالا قبضہ کی تائید قواعد الفقہ کی اس عبارت سے بھی ہو رہی ہے: ”التخلية في البيع هو أن يأذن البائع للمشتري بقبض المبيع عند عدم وجود مانع من تسليم المشتري إياه“ (قواعد الفقہ از سید عمیر الاحسان ۲۲۲) تخلیہ فی البیع یہ ہے کہ بائع مشتری کو بیع پر قبضہ کی اجازت دیدے اور اس کیلئے بیع کو سونپنے سے کوئی شئی مانع نہ ہو۔

بہر کیف مذکورہ تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ فقہاء نے جس بیع کے قبضہ کیلئے جو صورتیں بیان فرمائی ہیں وہی معمول بہا ہوں گی، اور جہاں کوئی صراحت نہیں ہے، تعال اور عرف کے مطابق عمل ہوگا۔

۳۔ قبضہ کی نوعیت اعیان منقولہ اور غیر منقولہ کے اعتبار سے جداگانہ ہے، لہذا اگر بیع از قبیل عقار ہو کر جائیداد وغیرہ ہو تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اسے فصل سے خالی کر کے مشتری کے حوالہ کر دیا جائے، اور اگر مکان ہو تو اسباب سے خالی کر کے تالہ اور کنجی خریدار کے حوالہ کر دیا جائے، یہی تمکن اور ید کے مرادف ہے، لیکن اگر منقولات سے ہوں تو اس میں تفصیل ہے، حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک نقل اور تحویل کے ذریعہ قبضہ ہوگا اور حضرت امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک قبضہ تخلیہ سے ہوگا، غالباً حضرت امام شافعی کی بھی تخلیہ سے یہی مراد ہے۔

جواب (۲) کے ضمن میں تخلیہ کی تعریف اور اس سلسلہ میں فقہاء کی نصوص مفصلاً بیان کر دی گئی ہیں۔

علامہ ابن رشد قرطبی تحریر فرماتے ہیں: ”وإنما استثنى أبو حنيفة ما يحول وينقل عنده مما لا ينقل؛ لأن ما ينقل القبض عنده فيه هي التخلية“ (بدایة المجتہد ۲، ۱۳۵)۔

حضرت امام ابو حنیفہ نے اشیاء منقولہ کے حکم کو اعیان غیر منقولہ سے الگ کر دیا ہے کیونکہ اعیان منقولہ میں حضرت الامام کے نزدیک قبضہ شرط ہے جو تخلیہ کے مرادف ہے۔

۳۔ احادیث مبارکہ جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام احادیث معلول بالعلتہ ہیں، اور علت نہی "غرر" ہے، "نھی رسول اللہ عن بیع مالہ یقبض، وعن ربیع مالہ یضمن، ونھی عن بیع الطعام قبل قبضہ" یا اس کے علاوہ دیگر روایات میں نہی کی علت قدرے مشترک کے طور پر "غرر" ہے، کیونکہ ایک دوسری روایت صریحاً بھی موجود ہے، جو اس علت منع کی وضاحت کر رہی ہے "نھی النبی عن بیع الغرر" صاحب "بدائع الصنائع" تحریر فرماتے ہیں: "نھی رسول اللہ عن بیع فیہ غرر و بین تمکن الغرر أن الغرر هو الخطر" (بدائع الصنائع ۵، ۱۶۳)۔

ابن حزم نقل فرماتے ہیں: "عن أبي هريرة قال: نھی رسول اللہ عن بیع الطعام حتی یجری فیہ الصاعان فیکون لصاحبه الزیادة وعلیه النقصان" (محلّی لابن حزم ۸، ۵۲۲)۔

حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام شافعی نے جو عدم جواز کا قول کیا ہے اس کی وجہ علامہ ابن تیمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: اگر بیع تلف ہوگئی تو دونوں شخص اس کے ضامن نہ ہوں گے، بلکہ وہی ہوگا جس نے اسے بیچا ہے، یعنی بائع اول "وهؤلاء یعللون المنع بتوالی الضمانین" (فتاویٰ لابن تیمیہ ۵۰۶، ۲۹)۔

اسی طرح علامہ جزیری عدم جواز کی علت یوں تحریر کرتے ہیں: "وقد قیل فی علّة النھی ان فی قبضه منفعه للعمال إذ ینتفعون بکیله وحمله ووزنه وغیر ذلك، بخلاف ما إذا بیع وهو عند صاحبه، فإن ذلك یضیع تلك المنفعة، وقیل: إنه أمر تعبدي" (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲، ۲۳۵)۔

نہی کی علت میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ بیع پر قبضہ کرنے سے عاملین کا نفع ہے، اس لئے کہ وہ لوگ کیل، وزن اور بار برداری سے نفع حاصل کرتے ہیں، برخلاف اس صورت، کہ جبکہ بیع پر قبضہ نہ ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ منفعہ ضائع ہو جاتی ہے، اور ایک دوسری علت یہ بھی ہے کہ وہ امر تعبدی ہے۔ خلاصہ کلام: جب قبضہ امر تعبدی ہے تو اس کی شرط وہیں لگے گی جہاں حدیث موجود ہے، کیونکہ یہ امر غیر مدرک بالقیاس ہونے کے باعث "یقصر علی مورد النص" ہوگا۔

لگے ہاتھوں علامہ ابن رشد قرطبی کا بھی عندیہ معلوم کرتے چلیں، وہ اس منع کی علت یوں تحریر کرتے ہیں: "ومن طریق المعنی ان بیع مالہ یقبض یتطرق منه إلى الربا" (بداية المجتهد ۲، ۱۲۵)۔

اسی طرح ایک مقام پر علامہ جزیری فساد بیع کی انواع بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ومنها بیع الغرر وهو التردد بین أمرین أحدهما یوافق الفرض والآخر یخالفه" (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲، ۲۴۲)۔

صاحب قواعد الفقہ "غرر" کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں: "ما یكون مجهول العاقبة لا یدری أن یكون أم لا" (قواعد الفقہ ۳۹۹) یعنی جس کا نتیجہ نامعلوم ہو یا مرتب ہوگا یا نہیں، مندرجہ بالا حدیث جسے "بیع قبل القبض" کے عدم جواز کی علت بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس سے استدلال اس وقت ہوگا جبکہ "غرر" بمعنی خطر ہو، لیکن اگر "غرر" غرور سے مشتق مانیں، یا "غرر فی صلب العقد" پر محمول کریں تو استدلال صحیح نہ ہوگا، علامہ کا سانی تحریر فرماتے ہیں: "الغرر هو الخطر الذی استوی فیہ الطرف والوجود والعدم بمنزلة الشك، وأما الحدیث فیحتمل أن یكون الغرر هو الخطر ویحتمل أن یكون من الغرور فلا یكون حجة أو نحملة علی الغرر فی صلب العقد بالتعلق بشرط أو بالإضافة إلى وقت" (بدائع الصنائع ۵، ۱۶۳)۔

عند الفقہاء "غرر" کی دو قسمیں ہیں: غرر یسیر، غرر کثیر، غرر یسیر کی فقہاء کے یہاں گنجائش ہے، اس سے بیع کے جواز میں خلل واقع نہیں ہوتا، جیسا کہ "کتاب الفقہ" میں موجود ہے:

"ویغتفر الغرر الیسیر للضرورة وکاجارھا بمشاهدة مع احتمال نقصان الشهور وزیادتها، بخلاف ما إذا کان

الغرر كثيرا كبيع الطير في الهواء“ (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۲، ۲۲۲)۔ (ضرورۃ غرر قليل کی گنجائش ہے، جیسے مہینوں کی ایام کے اعتبار سے کمی و بیشی کے باوجود اجارہ کا صحیح ہونا، البتہ غرر کثیر کی گنجائش نہیں، جیسے فضا میں چیزوں کی بیع وغیرہ)

ایک مقام پر علامہ ابن القیم جوزی کا قول مفتی ظفر احمد صاحب تھانوی نقل فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ہر ”غرر“ تحریم کا باعث نہیں ہوتا، اگر ”غرر“ یسیر ہو تو مصلحتہ للناس اس کے جواز کا قول کرنا چاہئے۔ اور اسے مانع صحت عقد قرار نہیں دینا چاہئے: ”ولو قدر أن في ذلك غرر افهو غرر يسير يفتقر في جنب المصلحة العامة التي لا بد للناس منها، فليس كل غرر سببا للتحريم، والغرر إذا كان يسيرا، أو لا يمكن الاحتراز منه لم يكن مانعا من صحة العقد“ (اعلاء السنن ۱۲۲، ۱۳)۔

جب بیع کے عدم جواز کی وجہ غرر کثیر کا وجود ہے تو ان صورتوں میں بیع بدون کسی زیغ کے صحیح ہو جائے گی، جہاں غرر کلیۃ مفقود ہو، جیسے غیر منقول کہ اس میں غرر کا شائبہ تک نہیں، اور اگر غرر ہے بھی تو یہ غرر نادر ہے اور نادر کا اعتبار نہیں، ”واحتج أبو حنيفة بأن الحكم معلل بغير انفساخ العقد بهلاك المبيع والهالك في غير المنقول نادر والنادر كالمعدوم“ (اعلاء السنن ۲۲۵، ۱۳)۔

۵۔ علامہ ابن رشد قرطبی بیع کی انواع اور ائمہ کے مذاہب بیان کرنے کے بعد قبضہ کی شرطوں کا سات اقوال میں احاطہ فرماتے ہیں، وہ تحریر کرتے ہیں: ”فيحتمل في اشتراط القبض سبعة أقوال: الأول في الطعام الربوي فقط، والثاني في الطعام بإطلاق، والثالث في الطعام المكيل والموزون، والرابع في كل شيء ينقل، الخامس في كل شيء، السادس في المكيل والموزون، السابع في المكيل والموزون والمعدوم“ (بداية المجتهد ۲، ۱۳۵)۔

مندرجہ بالا اقوال میں سے صرف پانچواں قول جس میں بیع کی صحت کیلئے ہر طرح کی بیع پر قبضہ شرط ہے جس کے قائل حضرت امام شافعی اور سفیان ثوری ہیں، عام ہے، بقیہ سارے اقوال میں کسی نہ کسی درجہ کی تخصیص ہے۔

بہر کیف جمہور ائمہ کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت خاص ہے، مسند احمد کی ایک روایت سے جسے حضرت عبداللہ بن عمرو نے مرفوعاً نقل کیا ہے، یہی معلوم ہوتا ہے۔ ”من اشترى طعاما اشتراه بكيل أو وزن فلا يبعه حتى يقبضه“، دوسری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مگر الفاظ مختلف ہیں، نسائی کی روایت میں: ”حتى يستوفيه“ اور دارقطنی میں ”حتى يجري فيه الصاعان“ ہے، ظاہر ہے ”استيفاء“ اور ”يجري الصاعان“ کا تعلق مکیل اور موزون سے ہی ہے۔

ابن رشد قرطبی لکھتے ہیں: ”وانما استثنى أبو حنيفة ما يحول وينقل عنده مما لا ينقل“ (بداية المجتهد ۲، ۱۳۵)۔

فالخالص حضرت امام ابو حنیفہ اور حضرت امام ابو یوسف نے نصوص کو خاص کیا ہے منقول کے ساتھ، نیز یہ ممانعت ”معلول بالعلتہ“ ہے، اور امام شافعی نے ان نصوص کو عدم جواز میں عموم پر محمول کیا ہے، بشرطیکہ وہ بیع متمیز نہ ہو، حضرت امام محمد کے نزدیک بھی نبی سے عمومی نبی ہے، حضرت مولانا مفتی ظفر احمد صاحب تھانوی تحریر فرماتے ہیں: ”إلا أن أبا حنيفة وأبا يوسف خصا النصوص بالمنقول بعلة النهي وهو غرر انفساخ العقد بالهالك قبل القبض، ومحمد أجراها على عمومها، والشافعي خصها بما لم يكن متميزا، وهو اختلاف الاجتهاد“ (اعلاء السنن ۲۲۲، ۱۳) حضرت امام احمد بن حنبل کا مسلک بھی تخصیص ہی کا ہے: ”ونقل عن أحمد أن المطعوم لا يجوز بيعه قبل قبضه سواء كان مكيلا أو موزونا أو لم يكن“ (مغنی لابن قدامه ۱۱۵، ۴)۔

ذکر کردہ عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکیل اور موزون میں بیع قبل القبض صحیح نہیں، لیکن اس سے مراد کیا ہے اس کی وضاحت بعض فقہاء اس طرح کرتے ہیں: ”وقال القاضي وأصحابه: المراد بالمكيل والموزون والمعدوم ما ليس بمتعين كالقفيز من صبرة والرطل من زيدة فأما المتعين في ضمان المشتري كالصبرة يبيعها من غير تسمية“ (مغنی لابن قدامه ۱۱۵، ۴) قاضی اور ان کے اصحاب نے فرمایا ہے کہ مکیل، موزون اور معدود سے مراد جو متعین نہ ہو، جیسے غلہ کی بوریوں سے ایک بوری اور سکہ سے ایک رطل، پس بہر حال جو متعین ہوگا وہ مشتری کے



ضمان میں داخل ہوگا، جیسے صبرہ کو بغیر تعیین کے کوئی بیچے۔

بیع قبل القبض کی تخصیص کا پتہ ظاہر روایت سے بھی چلتا ہے، علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: ”ظاهر المذهب أن المكيل والموزون لا يدخل في ضمان المشتري إلا بقبضه“ (مغنی ۴، ۱۱۵) اس سلسلہ میں عبدالرحمن الجزیری کی بھی تحریر ملاحظہ فرمائیں: ”أما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض والفضياء والنخيل والدور ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها فإنه يصح“ (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۲، ۲۴۲)۔

۶۔ صورت مسئلہ میں اگر درج ذیل ضابطے ملحوظ ہوں تو مسئلہ کی وضاحت میں قدرے رہنمائی مل سکتی ہے، علامہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں: ”وكل عوض ملك بعقد يفسخ بهلاكه قبل القبض لم يجز التصرف فيه قبل قبضه... وما لا يفسخ العقد بهلاكه جاز التصرف فيه قبل قبضه“ (مغنی لابن قدامہ ۲، ۲۴۱) وقال أبو حنيفة كل ما ملك بعقد ينتقض العقد بهلاكه فلا يجوز بيعه قبل قبضه كالبيع والإجارة إلا العقار“ (محلّ لابن حزم ۸، ۵۲۰) حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ معاملہ جس میں انسان عقد کے ساتھ مالک ہو اگر وہ معاملہ ہلاکت سے ختم ہو گیا تو اس کی بیع و شراء قبل القبض جائز نہیں ہے۔

علامہ کاسانی کی رائے اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو: ”والأصل أن كل عوض ملك بعقد يفسخ فيه العقد بهلاكه قبل القبض لا يجوز التصرف فيه كالبيع والإجارة إذا كان منقولاً عينا وكل عوض ملك بعقد لا يفسخ العقد فيه بهلاكه قبل القبض لا يجوز التصرف فيه كالمهر وبدل الخلع“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۱)۔

اگر ان ضابطوں کو سوال (۶) کے ساتھ منسلک کر دیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بیع کی ہلاکت سے خریدار (۱) کا معاملہ بائع سے یا فیکٹری سے ختم نہیں ہوتا ہے، اسلئے خریدار (۱) کا تصرف بھی صحیح ہونا چاہئے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ صورت مسئلہ میں ”بیع قبل القبض“ کا ثبوت بھی ہوا کہ نہیں، میری فہم ناقص میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب قبضہ کی بہت ساری قسمیں ہیں تو قبضہ حکمی مان کر جواز کا قول کر دینا چاہئے، کیونکہ جب مشتری، یا اسکے وکیل نے معاملہ میں بیع کر لیا تو کم از کم قبضہ حکمی اشارہ اور تمیز ضرور ہوگا، نیز یہ صورت تو ”رجح الملم يضمن“ میں بھی داخل نہیں ہو رہی ہے، کیونکہ مشتری اول تو نفع و نقصان دونوں کا ضامن ہو رہا ہے، اور مشتری ثانی کا اس میں کوئی نقصان بھی نہیں، پھر علت نہی تو ”غرر“ ہے اور یہاں سرے سے غرر ہی نہیں، کیونکہ نئے نئے ناپ تول کے آلات ایسے ایجاد ہو گئے ہیں کہ ان پر غرر کا شائبہ تک نہیں ہے، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ ساری دنیا میں اکثریت کے ساتھ وزن ہی کے ساتھ معاملہ ہو رہا ہے، اور جدید ترین وزن کے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جن میں ذرہ برابر قلت و زیادت کا شائبہ نہیں، اس لئے جب بیع ایک بار تول لی گئی تو پھر ثانیاً وزن کی ضرورت نہیں، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”ولو كاله البائع أو وزنه بحضرة المشتري كان ذلك كافياً ولا يحتاج إلى إعادة الكيل؛ لأن المقصود يحصل بكيه مرة واحدة بحضرة المشتري“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۴۵)۔

نیز اگر بیع پر حقیقہ قبضہ کی شرط لگائی جائے تو یہ مشتری پر ایک طرح کا جرم ہوگا، کیونکہ اس طرح کے آلات اول تو ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے، اور اگر دستیاب ہوں بھی تو بیع کے انتقال پر کتنا صرفہ اور غیر ضروری خرچ ہوگا جسے بجز زیر باری کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ”لا ضرر ولا ضرار، الحرج مدفوع“ کے تحت اس معاملہ کو جائز قرار دینا چاہئے۔

بہر حال نص کا منشاء اور مقتضی تو صرف یہ تھا کہ غرر سے بچا جائے، چنانچہ صورت مسئلہ کے جواز میں ”غرر“ تو کجا شائبہ ”غرر“ بھی نہیں، اور اگر ”غرر“ سے مراد ”غرر فی صلب العقد بالتعليق بشرط أو بالإضافة إلى وقت“ لیا جائے تو اس معاملہ کی صحت اور بے غبار ہو جاتی ہے، کیونکہ اس میں اس طرح کی کوئی شرط نہیں ہے، ساتھ ہی ”بیع قبل القبض“ کے جواز میں دو تابعی کی بھی روایتیں موجود ہیں، کیا ان روایتوں کی موجودگی میں حکم کی شدت پر اثر نہیں پڑ سکتا؟ (۱) ”عن سعيد بن المسيب أنه كان لا يرى بأساً أن يبتاع الرجل يبعه لا يكال ولا يوزن يبيعه قبل أن يقبضه“ (۲) ومن طريق عبد الرزاق عن معمر عن أيوب عن ابن سيرين قال لا بأس بأن يشتري شيئاً لا يكال ولا

یوزن بنقد ثم بیعه قبل أن یقبضه وهو قول الحکم و ابراهیم و حماد بن ابی سلیمان، و ذکره النخعی عن لقی  
وقال عطاء جائز بیع کل شیء قبل أن یقبض“ (محلّ لابن حزم ۸۰۵۲۰)۔

واضح ہو کہ میں نے تابعی سے دونوں روایتوں کو ذکر کر کے اسے مخالف پر حجت شرعیہ قرار نہیں دیا ہے، بلکہ محض یہ ثابت کرنا ہے کہ ان دونوں جلیل القدر  
تابعی کا بھی یہی قول ہے، مذکورہ بالا عبارتوں سے اگر اس مسئلہ میں توسع پیدا کر دیا جائے تو میری فہم ناقص میں کوئی حرج نہ ہوگا، نیز ائمہ کا اختلاف خود اس کا مؤید  
ہے کہ اس کے حکم میں تخفیف ہونی چاہئے، ابن قدامہ حنبلی کی اس عبارت: ”فأما المتعین فیدخل فی ضمان المشتري“ سے بھی یہی معلوم ہوتا  
ہے کہ اس طرح کی بیع اور اس کا تصرف صحیح ہوگا، کیونکہ جس بیع میں تصرف کی جارہی ہے وہ بیع معلوم و متعین ہے نہ کہ بیع مجہول۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”فكانت التخلية فيها قبضا تاما فيكتفي بها في جواز التصرف قبل الذرع بخلاف  
المكيلات والموزونات على ما بينا، إلا أنه يخرج من ضمان البائع بالتخلية نفسها لوجود القبض بأصله والخروج عن  
ضمان البائع يتعلق بأصل القبض لا بوصف الكمال“ (بدائع الصنائع ۵۰۲۳۵)۔

تخلیہ قبضہ تام کے مرادف ہے اور اس میں تصرف ہو سکتا ہے ذرع سے پہلے پہلے، بخلاف مکیلات و موزونات کے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، مگر یہ کہ وہ بیع بائع  
کے ضمان سے نکل جاتی ہے نفس تخلیہ ہی سے قبضہ کے پائے جانے کی وجہ سے، اور بائع کے ضمان سے بیع کا خارج ہو جانا اصل قبضہ پر منحصر ہے نہ کہ قبضہ کاملہ پر۔

اور اگر بیع عین بالدين ہو تو قبضہ کی شرط بھی نہیں ہے، جیسا کہ صاحب ”بدائع“ لکھتے ہیں: ”ومثما ما لا يشترط فيه القبض أصلا كبيع العين  
بالعين مما سوى الذهب والفضة وبيع العين بالدين مما لا يتضمن ربا النسأ كبيع الخنطة بالدرهم“ (بدائع الصنائع ۵۰۲۳۷)۔

چنانچہ صورت مسئلہ میں بیع عین بالدين ہی تو ہے، اس لئے قبضہ کی شرط نہیں لگے گی، اگر علامہ ابن رشد قرطبی کی وہ تفصیلی بحث جو غرر و بیوع غرر سے متعلق  
ہے گوش گزار کر لیا جائے تو اس سے صورت مسئلہ کا ثانی جواب دیا سکتا ہے۔

علامہ مذکور تحریر فرماتے ہیں: ”الغرر يوجد المبيعات من جهة الجهل على أوجه: (۱) ومن جهة الجهل بتعيين المعقود عليه  
(۲) جهالة تعيين العقد (۳) أو من جهة الجهل بوصف الثمن والمثمن المبيع (۴) أو جهالة قدره أو أجله إن كان  
هنالك أجل (۵) من جهة الجهل بوجوده أو تعذر القدرة عليه (۶) من جهة الجهل بسلامته“ (بداية المجتهد ۱۲۸، ۲)۔  
(۱) معقود عليه کی تعیین میں جہالت (۲) تعیین عقد کی جہالت (۳) ثمن و مثمن کے وصف کی جہالت (۴) قدر اور مدت کی جہالت (۵) بیع کے وجود اور  
قدرت علی التسليم کی جہالت (۶) بیع کی سلامتی اور اس کے بقا کی جہالت)۔

اب سوال یہ ہے کہ صورت مسئلہ میں نہ تو اسباب غرر سے ہی کوئی سبب پایا جاتا ہے، اور نہ وہ بیع بیوع غرر سے ہی شمار کی جاتی ہے، جن میں علت مذکور یا  
غیر مذکور ہو، اس لئے ضمان کو قبضہ حسی مان کر جائز قرار دینا چاہئے، نیز اس کے جواز میں اصول فقہ کے قاعدہ مشہورہ کو بھی متدل بنایا جاسکتا ہے۔ ”الأصل  
عندنا أن جواز البيع يتبع الضمان، فكل ما كان مضمونا بالإتلاف جاز بيعه وما لا يضمن بإتلاف لا يجوز بيعه“  
(قواعد الفقہ ۲۸) چونکہ بیع کی ہلاکت کی صورت میں بائع ضامن ہے اس لئے اس کا فروخت کرنا صحیح ہوگا۔

۷۔ اگر قبضہ حقیقی یا حکمی پائے جانے کے بعد شپنگ کیا گیا ہے تو اس صورت میں ہلاکت سے بائع اول ضامن نہیں ہوگا، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ”إلا  
أنه يخرج من ضمان البائع بالتخلية نفسها لوجود القبض بأصله والخروج عن ضمان البائع يتعلق بأصل  
القبض لا بوصف الكمال“ (بدائع الصنائع ۵۰۲۳۵)۔

اس کے جواز کی دوسری دلیل فقہ کا قاعدہ مشہور ہے: ”الأصل أن الضمانات في الذمة لا تجب إلا بأحد الأمرين إما بأخذ أو  
بشرط يعني بشرط قبول العقد“ (قواعد الفقہ ۱۵)۔

ظاہر ہے اس صورت میں دونوں (اخذ یا قبول عقد) میں سے کوئی ایک ضرور ہوگا، اس لئے بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی اور یہ معاملہ درست ہوگا، لیکن اگر قبضہ کلیۃً مفقود ہے تو یہ بیع درج ذیل اصل کی بنیاد پر ملکیت نہ پائے جانے کی وجہ سے باطل ہوگی: ”أما إذا باء الطير في الهواء قبل أن يصطاده، فالبيع باطل أصلاً لعدم الملك“ (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲، ۲۲۲)۔

چنانچہ جب مشتری اول (جو من وجہ بائع اور مشتری دونوں ہے) کی بیع باطل ہوگی تو مشتری ثانی کی کیسے صحیح ہو سکتی ہے، ”بناء فاسد علی الفاسد“ فاسد ہے نہ کہ بناء فاسد علی الفاسد صحیح، نیز یہ صورت تو احناف کے اس قاعدہ مسلمہ سے بھی متصادم ہے جس میں تصرف کی شرط بوقت ہلاکت ضمان قرار دیا گیا ہے۔

”إذا فات الشرط فات المشروط“ کے تحت جب یہاں ضمان نہیں تو پھر تصرف بھی نہیں، ”الأصل عندنا أن جواز البيع يتبع الضمان، فكل ما كان مضموناً بالإتلاف جاز بيعه وما لا يضمن بالإتلاف لا يجوز بيعه“ (قواعد الفقه ۲۸)۔

نیز اس میں غرر کثیر بھی ہے ”والغرر الكثير لا يغتفر“ اور غرر کے اعتبار کرنے اور نہ کرنے کی بابت مفصلاً جواب (۴) کے ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ سرخسی یوں تحریر فرماتے ہیں: ”وفي المنقول قبل القبض في الملك غرر؛ لأن بهلاكه ينتقض البيع ويعطل ملك المشتري، فإذا قبضه انتفى هذا الغرر“ (مبسوط للسرخسی ۹، ۱۳)۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت - اصولی مباحث

مولانا اختر امام عادل رحمۃ اللہ علیہ

قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ائمہ اربعہ کے درمیان یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

مذہب ائمہ:

بنیادی طور پر اس سلسلہ میں تین رائیں پائی جاتی ہیں:

۱- قبضہ سے قبل علی الاطلاق کسی بھی چیز کی بیع درست نہیں، خواہ بیع منقول ہو یا غیر منقول، طعام ہو یا غیر طعام، یہ رائے امام شافعی، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام زفر کی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس کی جانب بھی اس کی نسبت کی گئی ہے (بدائع الصنائع ۱۸۱/۵، الفقه علی المذہب لأربعہ ۲/۲۳۳، ۲۳۵)۔

۲- طعام کے سوا جس چیز کو کیل یا وزن کے ساتھ فروخت کیا گیا ہو، دوسری چیزوں کی بیع قبضہ سے قبل درست نہیں، طعام کو بھی اگر اندازے سے فروخت کر دیا گیا اور اس کو کیل یا وزن کے ساتھ فروخت نہیں کیا گیا تو اس کی بیع بھی قبضہ سے قبل درست ہے، یہ رائے امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی ہے (الفقه علی المذہب لأربعہ ۲/۲۳۳، بلوغ الامانی ۱/۴۶، مبسوط سرخسی ۸/۱۳، نووی شرح مسلم ۱/۱۶۹)۔

۳- اشیاء منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت علی الاطلاق درست نہیں، اور اشیاء غیر منقولہ کی بیع قبضہ سے قبل اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ ان کے ہلاک یا ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً زمین، جائداد اور مکان وغیرہ، لیکن اگر زمین کسی ایسی ندی کے کنارے ہو جو موج کی طغیانی سے کٹ سکتی ہو، یا مکان ایسی پوزیشن میں ہو کہ اس کے گرجانے کا اندیشہ ہو، ایسی شکلوں میں بغیر قبضہ فروخت کرنا درست نہیں، یہ رائے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی ہے (فتح القدر ۵/۶۶، مبسوط سرخسی ۸/۱۳، الفقه علی المذہب لأربعہ ۲/۲۳۳)۔

دلائل و وجوہ:

مذہب اول: پہلی رائے جو امام شافعی، امام محمد اور امام زفر کی طرف منسوب ہے جس میں علی الاطلاق قبضہ سے پہلے کسی چیز کی بیع و شراء درست نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) پہلی دلیل وہ روایات ہیں جن میں بلا کسی قید کے قبضہ سے قبل کوئی چیز فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، مثلاً: ”عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ نهي أن تباع السلع حيث يتباع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم“ (اخرجه ابو داؤد ۲۵۶ بحوالہ تکملہ فتح الملہم ۱/۲۲۵)۔ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاں سامان خریدا جائے وہیں سامان بیچنے سے منع فرمایا، جب تک کہ تجار اپنی حفاظت و قبضہ میں سامان کو نہ لے لیں۔

اور ابان کی روایت میں ہے کہ جب کسی چیز کو خریدو تو اس وقت تک فروخت نہ کرو جب تک کہ قبضہ نہ کر لو۔ ”فی روایۃ ابان إذا اشتريت بیعا فلا تبعه حتى تقبضه“ (السنن الکبریٰ ۵/۳۱۳)۔

اس مضمون کی ایک روایت عبداللہ بن عمرو ابن العاص سے بھی منقول ہے:

”ان رسول الله ﷺ قال: لا یحل سلف و بیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس

مولانا ظفر جامعہ ربانی، منورہ شریف، سستی پور۔

عندك“ (أخرجہ الترمذی فی باب كراهية بيع مال ليس عندك، وقال: هذا حديث حسن صحيح، بحواله تكمله فتح الملهم ۱۰۴۵۰)۔ ان روایات میں سے کسی بھی روایت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کے لئے کوئی قید ذکر نہیں کی گئی ہے، اس لئے یہ ممانعت تمام چیزوں کے لئے یکساں رہے گی۔

(۲) دوسری دلیل اس رائے کے حاملین نے یہ دی ہے کہ تمام منقول چیزوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے (المحررات ۱۱۶/۶)۔

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ کسی بھی عقد کی صحت کیلئے مقدوراً تسلیم ہونا شرط ہے اور یہ بغیر قبضہ کے ممکن نہیں، بغیر قبضہ کے مال انسان کی مکمل ملکیت میں نہیں آتا اور جس پر مکمل ملکیت نہ ہو اس کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

(۴) اس کے علاوہ اس میں سامان کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، جس سے مشتری ثانی کو غرر ہو سکتا ہے (بدائع الصنائع ۵/۱۸۱، الفقه علی المذاہب لأربعہ ۲۳۵/۲)۔

مذہب ثانی: دوسرا مذہب امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا ہے، ان حضرات کے نزدیک اصولی طور پر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، مگر اس عموم سے صرف ایک صورت کا استثناء ہے وہ یہ کہ طعام کی بیع اگر کیل یا وزن، یا گنتی کے ساتھ کی جائے تو اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں، طعام کے علاوہ تمام چیزوں کی بیع قبضہ سے قبل درست ہے، اور اگر طعام کو بھی کیل یا وزن یا گنتی کے بجائے اندازہ سے بیچا جائے تو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ محض عقد ہی سے مشتری کے ضمان میں آجاتا ہے، اس لئے کہ یہ مقبوض کے درجہ میں ہے، قبل القبض ہے ہی نہیں۔

ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت والی متعدد روایات میں طعام کی قید مذکور ہے، بعض میں ”یکتالہ“ کی قید کا بھی ذکر ہے، اگر یہ حکم عام ہوتا تو ان قیدوں کا فائدہ کیا تھا (مبسوط ۸/۱۳)۔

وہ روایات یہ ہیں: ”عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه، وعن عبد الله ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه ويقبضه“ (مسلم شریف ۲۰۵)۔ (حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کھانے کی چیز خریدے تو اس کو فروخت نہ کرے، جب تک کہ قبضہ نہ کرے)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ ”حتی یکتالہ“ یہاں تک کہ اسے کیل سے ناپ نہ لے:

”عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال من اشترى طعاما فلا يبعه حتى يكتاله“ (مسلم شریف ۵۲)۔

اس طرح امام مالک اور امام احمد نے طعام اور کیل کی قید کو احترازی قرار دیا، جبکہ دوسرے علماء نے ان کو قید اتفاتی قرار دیا ہے (بلوغ الامانی ۳۶۱)۔

مذہب ثالث: حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف جو منقولات میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی اجازت نہیں دیتے، اور غیر منقولات میں دیتے ہیں بشرطیکہ ضیاع کا اندیشہ نہ ہو۔

(۱) ان کے سامنے بھی وہی احادیث ہیں جن میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت آئی ہے، مگر یہ غیر منقول کا استثناء کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ ممانعت ایک علت کی بنا پر آئی ہے، اور وہ علت ہے غرر کا امکان، مشتری اگر بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ فروخت کر دے اور کسی وجہ سے ہلاک ہو جائے تو یہ بیع نافذ نہیں ہو سکے گی، اس طرح مشتری ثانی کو دھوکہ ہو جائے گا، اور یہ علت مستفاد ہوتی ہے اس حدیث سے جس میں حضورؐ نے بیع غرر اور بیع غیر مقدوراً تسلیم سے منع فرمایا (ترمذی شریف ۱۱۳، الفتح الربانی ۳۵/۱۵)۔

اور جب یہ ممانعت کسی خاص سبب سے ہے تو جس صورت میں یہ سبب نہیں پایا جائے گا ممانعت باقی نہیں رہے گی، غیر منقول چیزیں، مثلاً زمین، مکان وغیرہ کے ضیاع کا اندیشہ عموماً نہیں ہوتا، اس لئے ان چیزوں کی بیع قبضہ سے قبل بھی درست ہوگی (تکملہ فتح الملہم ۱/۳۵۰، مبسوط خمس ۸/۱۳)۔

(۲) ایک بات اور ان کی طرف سے کہی جاتی ہے، وہ یہ کہ جب کوئی معاملہ دو عاقل، بالغ مسلمان کے درمیان طے پائے، اور جس چیز پر معاملہ کیا گیا ہے وہ اس

کے لائق بھی ہو تو یہ معاملہ اصولاً جائز ہونا چاہئے، ایک بیع جو معدوم نہیں موجود ہے، اس پر بائع کی ملکیت بھی ہے، صرف قبضہ نہیں ہے، یہ محل بیع بن سکتا ہے، اور جب یہ عقد و اہل کے درمیان طے پائے تو اس کو درست ہونا چاہئے، یہ شریعت کے اصول کلی کے تحت سمجھ میں آتا ہے، اور قرآن نے جو "أحل الله البيع" (سورہ بقرہ: ۲۷۵) کہہ کر بیع کی اجازت دی ہے، اس کے عموم میں ہر طرح کی بیع آجاتی ہے، اب اگر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت والی شکل کو احادیث کی بنا پر ہم خاص کر لیں تو خبر واحد سے کتاب اللہ کے عموم میں تخصیص کرنا لازم آتا ہے، جو اصول کے مطابق درست نہیں، اس بنا پر ہم اخبار احاد کی بنا پر قرآن پاک کے عموم اور شریعت کے اصول کلی کو ترک نہیں کر سکتے، زیادہ سے زیادہ حدیث پر عمل کرنے کیلئے ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ان تمام احادیث کو جن میں بیع قبل القبض کی ممانعت آئی ہے ان کو اشیاء منقولہ پر محمول کر لیں، تاکہ کتاب اللہ اور احادیث کے درمیان تطبیق ہو جائے اور کسی کا ترک لازم نہ آئے۔

اور منقول کو کتاب اللہ کے عموم سے ہم خارج اس لئے کرتے ہیں کہ یہ بھی شریعت کے ایک اصول کلی سے ثابت ہے، وہ یہ کہ "بیع غرر" اور "بیع مال مضمّن" درست نہیں، اور یہ دونوں خرابیاں منقول کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں لازم آتی ہیں، رہا غیر منقول تو اس میں عموماً ہلاکت کا اندیشہ ہی نہیں کہ دھوکہ ہو، یا ضمان میں لینے کی ضرورت پیش آئے (فتح القدیر ۲/۲۶۶، البحر الرائق ۶/۱۱۶، بدائع الصنائع ۵/۱۸۱)۔

### بیع قبل القبض کی ممانعت والی روایت معلول بالعلتہ:

اس پوری تفصیلی گفتگو سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی امام کے نزدیک مطلقاً جائز نہیں ہے، بعض فقہاء نے تو مطلقاً ناجائز قرار دیا اور بعض نے بعض صورتوں کا استثناء کر کے اس کو ناجائز قرار دیا، اس طرح ایک طرف فقہاء کا عمومی رجحان کم از کم منقولہ چیزوں میں عدم جواز کا معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ بعض صورتوں کا جن لوگوں نے استثناء کیا ہے ان کے ذہن میں ممانعت کی کوئی علت ہے، جس کے نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں نے جواز کا حکم لگایا۔

مثلاً جمہور احناف نے اعیان غیر منقولہ کو قبضہ سے قبل بیچنے کی اجازت دی ہے، اور اس کو ممانعت والے حکم کے عموم سے خارج کر دیا ہے، ان کے ذہن میں اس ممانعتی حکم کی بنیادی علت اندیشہ غرر ہے جو منقول میں پایا جاتا ہے، غیر منقول میں نہیں (فتح القدیر ۲/۲۶۶)۔

اسی طرح شافعیہ اور امام محمد نے جو عمومی ممانعت کی دلیلیں دی ہیں، ان میں بھی بنیادی اہمیت روایات کے بعد اسی اندیشہ غرر اور غیر مقدور تسلیم ہونے والی بات کو حاصل ہے (الفقہ علی المذاہب لاربعہ ۲/۲۳۵)۔

### قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کے دلائل:

ان مخصوص صورتوں کے علاوہ عام حالات میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جمہور فقہاء جائز نہیں قرار دیتے، اگر مختلف ائمہ کے یہاں پھیلی ہوئی بحثوں کو اس جمہوری نقطہ نظر کیلئے سمیٹا جائے تو تمام مباحث اور دلائل کا پتہ یہ نکلے گا:

کہ خریدے ہوئے سامان کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنا، یا اس قسم کا کوئی اور تصرف کرنا جائز نہیں، الا یہ کہ مشتری کوئی ایسا تصرف کرے جو قبضہ کے مترادف سمجھا جائے، مثلاً کسی کو ہبہ کر دے، یا صدقہ کر دے، یا کسی تیسرے شخص کے پاس رہن رکھ دے، یا بطور قرض دیدے وغیرہ، تو اس قسم کے تصرفات مشتری کی جانب سے درست ہوں گے، اس معنی میں کہ مشتری اس بیع پر قبضہ حاصل کر رہا ہے یا کر چکا ہے (شامی ۴/۱۸۱، مبسوط خسی ۱۳/۸)۔

(۱) اور اس کے لئے دلیل ایک طرف وہ روایات ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ نے قبضہ کرنے سے پہلے خریدے ہوئے سامان کو بیچنے سے منع فرمایا ہے، روایات ماقبل میں گذر چکی ہیں (مشکوٰۃ ۲/۲۳۸، مسلم شریف باب بطلان بیع المبیع ۲/۵)۔

دوسرے عقلی دلائل ہیں جو دراصل وجوہ و علل کا درجہ رکھتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

(۲) قبضہ کے بغیر کسی چیز پر ملکیت تام نہیں ہوتی اور جب تک مکمل ملکیت حاصل نہ ہو اس وقت تک اس کو فروخت کرنا صحیح نہیں، قبضہ میں بھی قبضہ ضمان ضروری ہے، قبضہ امانت کافی نہیں (الاشباہ والنظائر ۲/۲۷۵)۔

(۳) قبضہ سے قبل تصرف اس لئے بھی جائز نہیں کہ وہ مقدور تسلیم نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اب تک بائع کے قبضہ میں ہے اور اس حالت میں اس کو کسی کے ہاتھ بیچنا دراصل بائع کے حق میں تصرف کرنا ہے جو درست نہیں (مبسوط خسی ۱۳/۸)۔



(۴) جس چیز پر مشتری کا قبضہ نہ ہو اس کو فروخت کرنے میں اندیشہ غرر ہے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ سامان مشتری ثانی کو حوالہ کرنے سے پیشتر ہی کسی وجہ سے ضائع ہو جائے، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے (بدائع الصنائع ۱۸۵/۵، البحر الرائق ۱۱۶/۶)۔

(۵) جس سامان پر انسان کا قبضہ نہ ہو وہ محل تملیک نہیں بن سکتا، اور وہ انسان کے ضمان میں نہیں آتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز کے بیچنے سے منع فرمایا ہے جو انسان کے ضمان میں نہ ہو، یا جو محل تملیک نہ بن سکتا ہو۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بیع فاسد ہے:

یہاں ایک اہم ترین بحث یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک عام حالات میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کر لے تو اس کو بیع ممنوع کی تین قسموں (بیع باطل، بیع فاسد، بیع مکروہ) (در مختار ۱۱۱/۴) میں سے کس قسم میں داخل کیا جائے؟

اس کا جواب فقہاء کی تصریحات اور اصولی بحثوں کے مطابق یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فاسد کے ذیل میں آتی ہے، اس لئے کہ بیع باطل کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ جو اپنے اصل اور وصف دونوں لحاظ سے جائز نہ ہو اور بیع فاسد کی تعریف کی گئی ہے کہ جو اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہو، مگر وصف کے اعتبار سے جائز نہ ہو اور بیع مکروہ کہتے ہیں: جو اپنے اصل اور وصف دونوں لحاظ سے درست ہو، مگر کسی خارجی نقص کی بنا پر اس میں کراہت آگئی ہو، جیسے جمعہ کی اذان کے وقت بیع و شراء کرنا (شامی ۱۱۱/۴)۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اپنے اصل کے لحاظ سے جائز ہے، کیونکہ یہ معاملہ ایک قابل بیع چیز پر دو عاقل بالغ مسلمانوں کے درمیان طے ہوا ہے، اور ”مبادلتہ المال بالمال“ کی حقیقت بھی پائی جاتی ہے، اور رکن بیع ایجاب و قبول بھی درست ہے، اسلئے اس کو اصل کے لحاظ سے غلط نہیں کہہ سکتے، البتہ غیر مقبوض، یا غیر مقدور لتسلیم، یا اندیشہ غرر ہونا یہ وصف کا نقصان ہے جس کی بنا پر اس کو بیع فاسد قرار دے سکتے ہیں، جیسا کہ بعض فقہاء کے یہاں اس کی تصریح بھی ملتی ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲۳۳/۲)۔

بعض کتابوں (مثلاً الجوبہرۃ) میں اس کو بیع باطل کہہ دیا گیا تو شامی نے اس کی وضاحت کی کہ یہ اطلاق عام معنی میں ہے، اصطلاحی معنی میں نہیں ہے (شامی ۱۸۲/۴، وکذا فی المطحطاوی علی الدر المختار)۔

قبضہ کی حقیقت:

اس موضوع کی ایک خصوصی بحث قبضہ کی حقیقت و نوعیت سے متعلق ہے۔ فقہاء نے قبضہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ قبضہ حقیقی، ۲۔ قبضہ حکمی۔

قبضہ حقیقی اس قبضہ کو کہیں گے جس میں شیء انسان کے واقعی تصرف میں آجائے، مثلاً کتاب خریدی تو اپنے ہاتھ میں لے لے، کوئی موٹر خریدی تو اس پر سوار ہو جائے، جانور خرید تو اس کی باگ ڈور پکڑ لے وغیرہ۔

اور قبضہ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے سامان اس پوزیشن میں ہو جائے کہ وہ چاہے تو اسے آسانی اپنے تصرف میں لاسکتا ہو اور استعمال کر سکتا ہو، مثلاً کسی نے کپڑا خریدا اور بائع نے اس کے سامنے کپڑا اتنی دور پر رکھ دیا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کو بے تکلف لے سکتا ہے تو یہ قبضہ حکمی ہے (تواعد الفقہ ۲۲۲، فتاویٰ انقرویہ ۱/۲۵۳، بدائع ۲۳۷/۵)۔

قبضہ حکمی کی مختلف شکلیں کتب فقہ میں ملتی ہیں، فقہاء نے متعدد امثال وعلامات ذکر کئے ہیں، جن کے پیش نظر ہر کسی چیز پر قبضہ حکمی کا حکم لگا سکتے ہیں، ویسے انہی صورتوں میں انحصار نہیں ہے، کسی فقیہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ قبضہ حکمی کی یہی چند شکلیں ہیں جو اس نے ذکر کی ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں ہو سکتی، بلکہ فقہاء نے جو کچھ لکھا اپنے استقراء اور تتبع کے لحاظ سے لکھا، اور آخر میں یہ قاعدہ کلیہ لکھ دیا کہ:

”لکن ذلک یختلف بحسب حال المبیع“ (شامی ۳۰۷)۔

قبضہ کی کوئی ایک صورت و نوعیت متعین نہیں ہے، بلکہ وہ بیع کی حالت و کیفیت کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہے، شامی نے اس کو مثالوں سے واضح کیا

ہے، مثلاً کمرے میں اناج رکھا ہوا ہو، تو اس پر قبضہ اس وقت مانا جائے گا جب کہ اس کمرے کی چابی مشتری کو مل جائے اور وہ اسے بے تکلف کھول سکے، کسی مکان کی فروخت میں مکان پر قبضہ اس وقت مانا جائے گا جب کہ اس کے بند کرنے پر مشتری قادر ہو جائے۔

چراغ کے جانور پر قبضہ اس وقت متصور ہوگا جب کہ وہ نگاہ کے سامنے ہو اور اس کی طرف اشارہ کیا جاسکے، کسی مکان میں بند گھوڑے اور پرندے پر قبضہ اس وقت ہوگا، جبکہ مشتری بغیر کسی کی مدد کے ان کو پکڑ سکے وغیرہ (شامی ۴۸/۳)۔

یہ مثالیں سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ قبضہ کی کوئی ایک صورت معین نہیں ہے، بلکہ بیع کے حال کے لحاظ سے وہ تبدیل ہوتی رہتی ہے، اس کے باوجود فقہاء نے چند علامتی افعال و احوال کا ذکر کیا ہے جن سے قبضہ حکمی کا بڑی حد تک احاطہ ہو جاتا ہے، علامہ کاسانی نے تو مستقل باب ہی قائم کیا ہے: ”بیان ما یصیر بہ مشتری قابضاً للمبیع من التصرفات وما لا یصیر بہ قابضاً“۔

ان افعال و احوال کا ہمارے سامنے رہنا ضروری ہے، تاکہ ان کی روشنی میں آج کے حالات و ظروف میں سے کسی چیز کے قبضہ کے بارے میں ہم فیصلہ کر سکیں، وہ افعال و احوال درج ذیل ہیں:

(۱) تخلیہ کو فقہاء نے قبضہ حکمی قرار دیا ہے، تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ہونے کے بعد بیع کو بائع مشتری کیلئے چھوڑ دے تو یہ قبضہ متصور ہوگا، بشرطیکہ تین باتیں پائی جائیں:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ بائع کہہ دے کہ یہ سامان میں نے تمہارے لئے چھوڑ دیا، اور مشتری کہے کہ میں نے قبضہ کر لیا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ بیع مشتری کے سامنے موجود ہو، بایں طور کہ وہ اس کو باسانی حاصل کر سکتا ہو۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ بیع کے ساتھ حق غیر اس طور پر وابستہ نہ ہو کہ یہ تابع ہو اور حق غیر اصل، لیکن اگر حق غیر کی وابستگی اس طور پر ہو کہ بیع اصل ہو اور حق غیر تابع، مثلاً گیہوں بائع کے تھیلوں میں رکھے ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں مضائقہ نہیں (فتاویٰ انقرویہ ۱/۲۵۳، الاشاہ والنظار ۲/۲۷۸-۲۷۹، شامی ۴۸/۳)۔

(۲) مشتری یا بائع کی طرف سے ایسا فعل صادر ہو جائے جس سے پتہ چلے کہ بائع کی طرف سے بیع پر تصرف کرنے کی اجازت ہے تو اسے بھی حکماً قبضہ قرار دیا جائے گا، مثلاً بیع ابھی بائع کے قبضہ میں ہو اور مشتری اس کو ضائع کر دے، یا اس میں کوئی ایسا تصرف کر دے جو بیع میں حقیقتاً یا حکماً کوئی نقص یا عیب پیدا کر دے اور بائع اس پر کوئی اعتراض نہ کرے، تو یہ مشتری کا قبضہ ہی سمجھا جائے گا، حقیقی نقص کی مثال جیسے جانور خرید اتھا، اس کا پاؤں کاٹ دیا، یا سریا آنکھ زخمی کر دیا۔ اور حکمی نقص کی مثال: جیسے باندی تھی اس کو ام ولد بنا دیا، یا غلام تھا اس کو مدبر بنا دیا، یعنی ام ولد ہون یا مدبر ہونے کا اقرار کر لیا تو اس سے غلام یا باندی میں نقص پیدا ہو گیا کہ اب اس کو فروخت نہیں کر سکتے، کسی کو بہہ یا ہدیہ میں نہیں دے سکتے وغیرہ (بدائع الصنائع ۲/۲۳۶، شامی ۴۷/۳)۔

(۳) یا یہ کہ بیع کو نقصان پہنچانے والے افعال مشتری کی اجازت و حکم سے خود بائع انجام دے، تو یہ بھی مشتری ہی کی طرف حکماً منسوب ہوں گے، اور اس صورت میں بھی مشتری کا قبضہ تسلیم کیا جائے گا، لیکن اگر بائع نے مشتری کے کہنے پر ایسے افعال انجام دیئے جو بیع کو نقصان نہیں پہنچائے، مثلاً مشتری کے کہنے پر اس نے بیع کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا وغیرہ، تو اس صورت میں مشتری کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ یہ تصرفات خود بائع ہی کی طرف منسوب ہوں گے، اور وہی تصرف کرنے والا قرار دیا جائے گا (بدائع ۲/۲۳۶، شامی ۴۷/۳)۔

(۴) مشتری کی طرف سے بیع کے تعلق سے ایسی حرکت سرزد ہو جس سے اندازہ ہو کہ وہ اس معاملہ پر پوری طرح راضی ہے اور اسی بنا پر وہ اس کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے، مثلاً معاملہ ہونے کے بعد مشتری بیع کسی کو بطور عاریت، یا بطور بہہ، یا ودیعت کے دیدے، یا کوئی اور ایسا تصرف کر دے جس کے وجود و انعقاد کیلئے قبضہ ضروری ہے، تو علامتی طور پر یہ مشتری کا قبضہ متصور ہوگا، بشرطیکہ اس نے یہ معاملات خود بائع سے نہ کئے ہوں، اس لئے دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے کی صورت میں وہ دوسرا شخص قبضہ کے باب میں مشتری کا نائب تصور کیا جائے گا کہ پہلے وہ مشتری کی طرف سے قبضہ کرے گا، پھر اپنی طرف سے، اس کے برخلاف اگر مشتری یہ معاملہ خود بائع سے کرے تو بیع پر قبضہ کے باب میں بائع کو مشتری کا نائب قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ اس کا قبضہ بیع پر بطور اصل کے قائم ہے، اسلئے اس کو نائب کی حیثیت سے قابض نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اسی طرح اگر مشتری بیع میں ایسا تصرف کرے جس کا انعقاد قبضہ پر موقوف نہیں ہے، مثلاً کسی کے ہاتھ بیع کر دے تو اس سے بھی مشتری کا قبضہ نہیں سمجھا



جائے گا، اس لئے کہ جب قبضہ اس کیلئے لازم نہیں تو مشتری ثانی کو مشتری اول کی طرف سے بطور نیابت قابض ماننے کی ضرورت نہیں ہے (بدائع الصنائع ۵/۲۳۶)۔

(۵) اگر بیع مشتری کے ضمان میں آجائے اور قانونی طور پر وہ اس کی ضمانت قبول کرے، تو اگرچہ کہ حسنا اس کا قبضہ اس پر نہ ہو مگر حکماً اس کا قبضہ سمجھا جائے گا، اور اگر حسناً قبضہ ہو، مگر قبضہ ضمان نہ ہو، بلکہ مثال کے طور پر قبضہ امانت ہو تو حسناً قبضہ کے باوجود وہ قابض نہیں سمجھا جائے گا (فتح القدیر ۵/۲۶۶، الاشبہ والنظائر ۲/۲۷۵)۔

اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت جدا جدا:

اس تفصیل سے ایک طرف قبضہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت ایک نہیں ہوگی، بلکہ خود تمام اشیاء غیر منقولہ میں بھی قبضہ کی نوعیت ایک نہیں ہوگی، مکان اور زمین دونوں اشیاء غیر منقولہ میں سے ہیں، مگر کتب فقہ میں دونوں کے قبضہ کی نوعیت الگ بتائی گئی ہے، زمین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی نے جنگل میں کوئی زمین فروخت کی اور وہ زمین اس کے حوالہ کر دی تو یہ قبضہ اس وقت مکمل ہوگا جبکہ مقام عقد سے وہ زمین قریب ہو جس کو وہ دیکھ اور سمجھ سکتا ہو، ورنہ قبضہ تسلیم نہیں کیا جائے گا (الاشبہ والنظائر ۲/۲۷۸)۔

اور مکان کے بارے میں فقہی جزئیہ ملتا ہے کہ مکان پر قبضہ اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ اس کی چابی اس کے حوالے کر دے اور مشتری اس مکان کو بند کرنے پر قادر ہو جائے ورنہ قبضہ نہیں ہوگا (عالمگیری ۱۶/۳)۔

تو جب خود اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت میں فرق ہے تو اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ کے درمیان قبضہ کی نوعیت میں فرق واقع ہونا طبعی ہے، اور اس کیلئے صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں، تخلیہ کی شرائط میں ایک شرط یہ ہے کہ بیع مشتری کے سامنے موجود ہو، یہ اشیاء منقولہ کیلئے ہے، اشیاء غیر منقولہ میں سامنے کے بجائے قریب ہونا کافی ہے (شامی ۴/۱۷۳)۔

قبضہ ضمان کی ایک شکل:

اس اصولی گفتگو کی روشنی میں اس صورت مسئلہ کا جواب بآسانی دیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال بظاہر اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار (۲) کو روانہ کر دیتا ہے اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے، تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آتی ہے نہ خریدار (۲) پر، بلکہ یہ اسی شخص (خریدار نمبر (۱)) کا نقصان قرار پاتا ہے، اس صورت معاملہ میں اگرچہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر حسی قبضہ نہیں ہوا، لیکن وہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے سے پہلے اس کے ضمان میں رہا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ”رج مال یضمین“ (ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) حاصل کیا، بلکہ اس نے مال مضمون پر نفع حاصل کیا ہے جو قبضہ حکمی کے درجہ میں ہے، اس لئے یہ صورت معاملہ شرعاً جائز معلوم ہوتی ہے۔

ایک ناجائز شکل:

البتہ وہ صورت جس میں بین الاقوامی تجارت شپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے، جبکہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے، یہ صورت معاملہ شرعاً ناجائز ہے۔

(۱) ایک تو ”رج مال یضمین“ کی وجہ سے (۲) دوسرے اقتصادی بحران پیدا ہونے کے خطرہ کی وجہ سے، اس لئے کہ ایک چیز کی جو قیمت جہاز پر چڑھاتے وقت تھی، اس کی دس گنی قیمت جہاز سے اترتے وقت تک ہو جاتی ہے (تکملہ فتح الملہم ۱/۳۵۳)۔

خلاصہ جوابات:

اب سوالات کی ترتیب پر خلاصہ جوابات ملاحظہ ہو۔



- ۱۔ شرع اسلامی کی رو سے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں اور یہ بیع فاسد میں داخل ہے۔
- ۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو کسی چیز پر واقعی تصرف حاصل ہو جائے، یا قدرت علی التصرف حاصل ہو جائے، اس کیلئے کتاب و سنت نے کوئی خاص صورت متعین نہیں کی ہے، بلکہ اسے لوگوں کے عرف و عادت پر چھوڑ دیا ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا۔
- ۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے فرق واقع ہوگا، جو اشیاء کے حسب حال عرف کے مطابق طے کیا جائے گا۔
- ۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث جمہور علماء کے نزدیک معلول بالعلتہ ہیں، اور علت بنیادی طور پر ”اندیشہ غرر“ ہے۔
- ۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت جمہور احناف اور مالکیہ و حنابلہ کے نزدیک عام نہیں ہے، بلکہ اس میں کئی تخصیصات اور استثناءات کی گئی ہیں، مثلاً حنفیہ نے اشیاء غیر منقولہ کی تخصیص کی، اور مالکیہ و حنابلہ نے اس حکم ممانعت کو صرف ایسے طعام کے ساتھ خاص کر دیا جس کو کیل و وزن، یا گنتی سے فروخت کیا گیا ہو، باقی چیزوں میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو وہ جائز کہتے ہیں، شافعیہ اور امام محمدؒ و زفرؒ کے نزدیک، البتہ یہ حکم عام ہے۔
- ۶۔ فیکٹری سے مال خرید کر بھجوانے کی صورت میں جب مشتری اول ضمان لیتا ہو تو یہ قبضہ سمجھا جائے گا اور بیع درست ہوگی۔
- ۷۔ اور اگر پہلا خریدار سامان کی ضمانت نہیں لیتا تو یہ قبضہ نہیں ہوگا اور بیع درست نہ ہوگی۔



## خرید و فروخت میں ملکیت اور قبضہ کی کیفیت

مولانا ابوسفیان مفتاحی <sup>ط</sup>

۱۔ شرع اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض ناجائز ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: ”عن حکیم بن حزام قال: نھانی رسول اللہ ﷺ أن أبيع ما ليس عندي، رواه الترمذی، وفي رواية له ولأبي داؤد والنسائی قال: قلت: يا رسول الله يأتيني الرجل فيريد مني البيع وليس عندي فأبتاع له من السوق، قال: لا تبع ما ليس عندك“ (مشکوٰۃ علی المرقاة ۳۰۲۲۳)۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیز خرید و فروخت کے وقت اپنی ملکیت میں نہ ہو اور قبضہ میں نہ ہو اس کا بیچنا جائز نہیں، اب اس کی دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ وہ چیز نہ تو اپنی ملکیت میں ہو اور نہ تو قبضہ میں ہو، اس صورت میں اس کی بیع صحیح ہی نہ ہوگی، بلکہ باطل ہوگی، دوم یہ کہ وہ اپنی ملکیت میں نہیں ہے، ایک دوسرا شخص اس کا مالک ہے، لیکن ہے وہ اپنے ہی پاس، اس صورت میں بھی مالک کی اجازت کے بغیر اس کی بیع درست نہیں ہے۔

پہلی صورت کے حکم میں اس چیز کی بیع داخل ہے جس پر قبضہ حاصل نہ ہوا ہو، یعنی قبضہ سے پہلے بیع ہو رہی ہو، یا وہ چیز گم ہوگئی ہو، یا بھاگ گئی ہو، جیسے غلام وغیرہ، یا اس کو خریدار کے حوالہ کرنے پر قادر نہ ہو، جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی چیز یا اور وہ مچھلی جو ابھی دریا یا تالاب سے نکالی نہ گئی ہو (مرقاۃ ۳۰۲۲۳)۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ شرائط معقود علیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وأما شرائط المعقود عليه، فإن يكون موجوداً مالا متقوماً مملوكاً في نفسه وأن يكون ملك البائع فيما يبيعه لنفسه، وأن يكون مقدور التسليم، فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم“ (بحر ۵، ۲۷۹)، یعنی معقود علیہ کیلئے شرط ہے کہ موجود مال متقوم مملوک ہو، اور بائع کی ملکیت میں ہو، اور مقدور التسليم ہو۔ صاحب ”در مختار و رد المحتار“ نے لکھا ہے کہ جو چیز ملکیت اور قبضہ میں نہ ہو اس کی بیع باطل ہے، اور دلیل میں ”البحر الرائق“ کی عبارت پیش کیا ہے جو اوپر مذکور ہوئی (شامی ۱۱۸/۳)۔

۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ بیع کو خریدنے کے بعد اس کی جگہ سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ رکھ دیا جائے چاہے دوسری جگہ کتنی ہی قریب ہو، مرقاة کی عبارت یوں ہے: ”فإن القبض فيه بالنقل عن مكانه و قال ابن الملك: وفيه أن قبض المنقول بالنقل و التجويل من موضع إلى موضع“ (مرقاۃ ۳۰۲۱۸)۔

بظاہر حق میں ہے: یہ بات ملحوظ رہے کہ اگر اس چیز کو پیمان یا وزن کے ذریعہ لیا ہے تو پیمانہ میں پتو کر، یا وزن کرانے کے بعد ہی اسے اٹھالے، اور اگر بغیر پیمانہ یا وزن لیا ہے تو پھر اس کے بغیر ہی اٹھا کر رکھ دے، حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اشیاء منقولہ میں سے کوئی چیز خریدے اور پھر اسے کسی دوسرے کو فروخت کرنا چاہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس چیز کو قبضہ میں لے لے اس کے بعد اسے فروخت کرے، کیونکہ بیع اشیاء منقولہ میں قبل قبضہ کے دوسری بیع جائز نہیں ہے (۱۳/۳)۔

اس سلسلہ میں صاحب ”در مختار“ رقمطراز ہیں: ”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل، و شرط في الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن يقول: خلعت بينك و بين المبيع، فلو لم يقله أو كان بعيداً لم يصر قابضاً“ (۳۸-۳۷، ۳)۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بیع پر قبضہ کیلئے کوئی مانع و حائل نہ ہو، بایں طور کہ بائع کہدے کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان چھوڑ دیا سے لے لو، اگر یہ نہ کہے تو مشتری قابض نہ ہوگا۔

ط جامعہ عربیہ مفتاح العلوم، شاہی کٹرہ، منو۔

علامہ شامی کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ شریعت میں قبضہ کی حقیقت بیع کے حال کے اعتبار سے مختلف ہے، اگر اشیاء منقول ہوں تو گھر کے اندر گہوں جیسی چیز کی بیع میں بائع کا کنجی دیدینا جبکہ گھر کا کھولنا بغیر تکلف ممکن ہو، قبضہ ہے، اور چرگاہ کے اندر گائے جیسی چیز کی بیع میں گائے کا اس طرح ہونا کہ وہ دیکھی جائے اور اس کی طرف اشارہ کیا جاسکے، قبضہ ہے، اور کپڑا جیسی چیز کی بیع میں کپڑے کا اس طرح ہونا کہ خریدار اپنا ہاتھ بڑھائے تو کپڑے تک پہنچ جائے، قبضہ ہے، اور گھر کے اندر گھوڑا یا چڑیا جیسی چیز کی بیع میں بغیر مددگار کے اسے پکڑ لینا ممکن ہو، قبضہ ہے۔

اور اگر اشیاء غیر منقول ہوں تو گھر جیسی چیز کی بیع میں گھر کو تالا بند کرنے پر قادر ہونا قبضہ ہے، اور بازار و دوکان میں غلہ وغیرہ پر قبضہ یہ ہے کہ خریدار کیلئے بائع کی طرف سے بیع کو لے لینے میں کوئی مانع نہ ہو (شامی ۴/۲۷۷)۔

سنت میں صرف بیع طعام میں حقیقت قبضہ متعین کی گئی ہے

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں قبضہ سے پہلے بیع کی ممانعت وارد ہے اور بیع طعام کے باب میں حقیقت قبضہ یہ متعین کی گئی ہے کہ طعام کو مکان بیع سے منتقل کر لیا جائے، ”عن ابن عمر قال: كانوا يبتاعون الطعام في أعلى السوق، فيبيعونه في مكانه، فنهاهم رسول الله ﷺ عن بيعه في مكانه حتى ينقلوه“ (رواه ابو داؤد)۔

منتقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے قبضہ میں لے لیں، اور اشیاء منقولہ کا قبضہ میں لینا یہ ہے کہ اس کو خریدنے کے بعد اس کی جگہ سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ رکھ دیا جائے، چاہے وہ دوسری جگہ کتنی ہی قریب کیوں نہ ہو (مظاہر حق ۳/۱۳)۔

ایک دوسری حدیث: ”عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه، وفي رواية ابن عباس حتى يكتاله“ (متفق علیہ)، ایک اور حدیث: ”عن ابن عباس: قال أما الذي نهي عن النبي ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب كل شيء إلا مثله“ (متفق علیہ)۔

حضرت ابن عباسؓ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غلہ کو قبل قبضہ بیچنا جائز نہیں ہے اسی طرح کسی بھی چیز کو اس وقت تک بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ قبضہ میں نہ آجائے، یہ گویا حضرت ابن عباسؓ کا اپنا گمان و خیال ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں غلہ پر غیر غلہ کو قیاس کیا ہے (مظاہر حق ۳/۱۵)۔

اور علامہ خطابیؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ طعام کی بیع قبل القبض باتفاق ناجائز ہے، اور اس کے علاوہ اشیاء میں اختلاف ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک گھر اور زمین و جائداد کی بیع قبل القبض جائز ہے اور اشیاء منقولہ میں ناجائز ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں سے ہر ایک کی بیع قبل القبض ناجائز ہے، اور امام مالکؒ کے نزدیک ماکول و مشروب کے علاوہ ہر چیز کی بیع قبل القبض جائز ہے، اور امام احمدؒ کے نزدیک مکمل و موزون کے علاوہ ہر چیز کی بیع قبل القبض جائز ہے (بذل ۳/۲۸۴)۔

نیز علامہ خطابیؒ قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”المقبوض يختلف في الأشياء حسب اختلافها في أنفسها فمنها ما يكون بأن يوضع المبيع في يد صاحبه، ومنها: ما يكون بالتخلية بينه وبين المشتري، ومنها: ما يكون بالنقل عن موضعه، ومنها: ما يكون بأن يكتال وذلك فيما يبع من المكيل كيلا، فأما ما يباع جزافاً صبرة مصبوبة على الأرض فبالقبض أن ينقل ويحول من مكانه، فإن ابتاع طعاماً كيلاً ثم أراد أن يبيعه بالكيل الأول لم يجز حتى يكيه على المشتري ثانياً“ (بذل ۳/۲۸۴)۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اشیاء میں قبضہ ان کی ذات کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے، چنانچہ کبھی قبضہ مشتری کے ہاتھ میں رکھ دینے سے ہوتا ہے، اور کبھی بیع کو مشتری اور بیع کے درمیان چھوڑ دینے سے ہوتا ہے، اور کبھی بیع کی جگہ سے انتقال سے ہوتا ہے اور کبھی کیل سے ہوتا ہے۔

اور علامہ ابن قدامہؒ نے کہا ہے: ہر چیز کا قبضہ اسی کے اعتبار سے ہوتا ہے، اگر شیء مکیل، یا موزون ہے اور کیل و وزن سے بیع کی جا رہی ہے تو قبضہ کیل و وزن سے ہوگا، ”وقبض كل شيء بحسبه فإن كان مكيلاً أو موزوناً يبيع كيلاً أو وزناً فقبضه بكيه ووزنه“ (مغنی ۴/۱۲۵)۔

۳۔ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے فرق مندرجہ ذیل ہے:



علامہ خطابیؒ لکھتے ہیں: ”المقبوض يختلف في الأشياء حسب اختلافها في أنفسها فمنها ما يكون بان يوضع المبيع في يد صاحبه، ومنها ما يكون بالتخلية بينه وبين المشتري، ومنها ما يكون بالنقل من موضعه، ومنها ما يكون بان يكتال وذلك فيما يبيع من المكيل كيلاً“ (بذل ۴۰۲۸۳)۔

یعنی اشیاء منقولہ میں قبضہ یہ ہے کہ بیع کو مشتری کے ہاتھ رکھ دی جائے، اور بعض میں بیع کو مکان بیع سے منتقل کر دینا قبضہ ہے اور بعض میں کیل کرنا قبضہ ہے۔ اور اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری اور بیع کے درمیان چھوڑ دے اور قبضہ سے مانع نہ بنے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ کی چند انواع ہیں: (۱) گھر کے اندر گہیوں جیسی چیز کی بیع میں گھر کی کنجی دینا جبکہ گھر کو بغیر تکلف کھولنا ممکن ہو۔ (۲) گائے جیسی چیز کی بیع میں گائے کا دیکھا جانا اور اس کی طرف اشارہ کیا جانا ممکن ہو۔ (۳) کپڑا جیسی چیز کی بیع میں کپڑے کا اس طرح ہونا کہ مشتری ہاتھ بڑھائے تو وہاں تک پہنچ جائے۔ (۴) گھر کے اندر گھوڑا یا چڑیا جیسی چیز کی بیع میں بغیر مدگار کے پکڑ لینا ممکن ہو، اور اشیاء غیر منقولہ میں گھر اور زمین جیسی چیز کی بیع میں گھر کو تالابند کرنے پر قادر ہونا اور پھر اس کو بغیر تکلف کھولنا ممکن ہو اس طرح کہ بائع مشتری کو کنجی دیدے قبضہ ہے، اور زمین و جائداد میں تصرف پر قادر ہونا قبضہ ہے (شامی ۴۷۴/۳۸)۔

۴۔ ”بیع قبل القبض“ سے متعلق احادیث ”معلول بالعلۃ“ ہیں، اور علت نبی غرر ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ ”لأن علة الفساد الغرر“ (شامی ۱۸۲/۳)۔

اور بیع غرر ناجائز ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی روایت ہے: ”عن أبي هريرة قال: نهي رسول الله ﷺ عن بيع الحصة و عن بيع الغرر“۔

اور بیع غرر اس بیع کو کہتے ہیں جس میں بیع مجہول، یا بائع کے قبضہ و قدرت سے باہر ہو، جیسے پانی میں مچھلی کی بیع، یا ہوا میں اڑتی چڑیا کی بیع، اور عبد آبق کی بیع، ”أى ما لا يعلم عاقبة من الخطر الذى لا يدري أكون أم لا كبيع الآبق و الطير فى الهواء و السمك فى الماء و الغائب المجهول، و مجمله أن يكون المعقود عليه مجهولاً و معجوزاً عنه“ (مرقاۃ ۲۰۲/۲)۔ اور امام نوویؒ نے بیع غرر مقدوراً لتسليم کو بھی شمار کیا ہے (نووی ۲۱۲) اور ظاہر ہے کہ قبضہ سے پہلے غیر مقدوراً لتسليم ہوتی ہے اور صحت بیع کیلئے بیع کا مملوک و مقدوراً لتسليم دونوں ہونا شرط ہے۔

امام نوویؒ کی عبارت یوں ہے: ”و يدخل فيه مسائل كثيرة غير مختصرة كبيع الآبق و المعدوم و المجهول و ما لا يقدر على تسليمه و ما لا يتم ملك البائع عليه، و بيع السمك فى الماء الكثير الخ، فكل هذا يبعه باطل؛ لأنه غرر من غير حاجة“ (۲۰۲)۔

۵۔ بیع قبل القبض کی ممانعت طعام کے باب میں تمام ائمہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک عام ہے، اور اس کے علاوہ اشیاء کی بیع قبل القبض میں ائمہ کے نزدیک کچھ استثناءات و تخصیصات ہیں، اس باب میں ائمہ کی آراء مع دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

علامہ خطابیؒ لکھتے ہیں: طعام کی بیع قبل القبض ناجائز ہے، اسی پر علماء کا اجماع ہے، اور امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ اس حکم سے گھر اور زمین و جائداد کا استثناء و تخصیص کرتے ہوئے ان کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز کہتے ہیں۔ اور امام شافعیؒ اور امام محمدؒ اس ممانعت کو عام رکھتے ہوئے بیع قبل القبض کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں، اس میں کچھ استثناء و تخصیص نہیں کرتے ہیں اور امام مالکؒ طعام میں بیع قبل القبض کو ناجائز کہتے ہیں، اور اس حکم سے غیر طعام کا استثناء و تخصیص کرتے ہیں۔ اور امام احمدؒ وغیرہ کیل اور موزوں میں ”بیع قبل القبض“ کو ناجائز کہتے ہیں، اور اس حکم سے کیل و موزوں کے علاوہ کا استثناء و تخصیص کرتے ہیں، یہ علماء رحمہم اللہ کی آراء ہیں (دیکھئے: نووی ۵۲/۵)۔

اور حدیث میں طعام سے مراد تمام دانے ہیں، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: ”والمراد به فى كلام المصنف الحبوب كلها لا البر و حده ولا كل ما يؤكل بقريئة قوله كيلاً و جزافاً“ (شامی ۲۰۲/۵، البحر الرائق ۵، ۲۰۵)۔

دلائل ائمہ: ..... طعام کے سلسلہ میں بیع قبل القبض کی ممانعت عام ہے، اس پر اجماع ہے، دلیل: ”عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه، وكذا روى عن ابن عباس، والمرور عنهما روايات في صحيح لمسلم“ (۲۰۵) (فی أبی داؤد مع البذل ۲، ۲۸۴)۔

### استثناءات و تخصیصات کے سلسلہ میں دلائل ائمہ:

علامہ شامی، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”صح بیع عقار لا یخشی ہلاکتہ قبل قبضہ من بائعہ لعدم الغرر ای غرر انفساخ العقد علی تقدیر الهلاک وعللہ لندرة هلاک العقار حتی لو کان علواً أو علی شط نهر، تفریع علی مفہوم قولہ ”لا یخشی ہلاکتہ و نحوہ“ بأن کان فی موضع لا یؤمن أن تغلب علیہ الرمال کان کمقول ای بمنزلتہ من حیث لحوق الغرر بهلاکہ فیصح البیع لکنہ یتوقف“ (شامی ۴، ۱۸۱)۔

یعنی زمین و جائداد غیر منقول کی بیع قبل القبض جائز ہے، عقد کے فسخ ہونے کے غرر و دھوکا نہ ہونے کی وجہ سے، کیونکہ ان کی ہلاکت نادر و شاذ ہے، اور اس کا اعتبار نہیں ہوگا، اگر ہلاکت کا اندیشہ، بایں طور ہو کہ زمین و جائداد کا محل وقوع ایسا ہے کہ اس پر ریت کے غلبہ کا خطرہ ہے تو اس کی بیع تو صحیح ہو جائے گی، لیکن موقوف رہے گی، اسی طرح گھر و زمین و جائداد جس کے قبضہ و دخل میں خطرہ ہے تو اس کی بیع بھی قبل القبض صحیح ہوگی لیکن نافع نہ ہو کر موقوف رہے گی۔

### امام شافعی کی دلیل:

”عن ابن عباس قال: أما الذی نھی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فهو الطعام أن یباع قبل أن یقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب کل شیء إلا مثله“ (متفق علیہ) (مسلم ۲، ۵، ابو داؤد مع البذل ۳، ۲۸۵)۔

یعنی امام شافعی کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ مطلقاً جائز ہے، اس میں کچھ بھی استثناء و تخصیص نہیں ہے، اور حدیث ابن عباس دلیل ہے۔

امام مالک ماکول و مشروب کے علاوہ ہر چیز کی بیع قبل القبض جائز کہتے ہیں، اور ماکول و مشروب کا استثناء کرتے ہیں، علامہ ابن قدامہ ان کی دلیل بیان کرتے ہیں: ”وجه ذلك ما روى الأوزاعي عن الزهري عن حمزة بن عبد الله بن عمر يقول مضت السنة إن أدركته الصفة حيا مجموعاً فهو من مال المبتاع (رواه البخاري) تعليقا عن ابن عمر و قول الصحابي ”مضت السنة“ يقتضى سنة النبي ﷺ ولأن المبيع المعين لا يتعلق به حق توفيقه فكان من مال المشتري كغير المكيل و الموزون“ (مغنی ۳، ۱۲۱)۔

”وعلله الإمام مالك لنفسه في المدونة قال: لأن النبي ﷺ نهي عن بيع الطعام حتى يستوفي وهو عندنا على الكيل والوزن و كل شيء ما خلا الطعام و الشراب فهو جائز أن تبعه قبل أن تستوفيه إن كنت اشتريته وزنا أو كيلاً أو جزافاً فهو سواء وإن كان الحديث إنما جاء في الطعام وحده“ (المدونة ۳، ۱۲۶)۔

امام احمد کلیل اور موزون کی بیع قبل القبض کو ناجائز کہتے ہیں، اور ان کے علاوہ کا استثناء و تخصیص کرتے ہیں، اور دلیل بیان کرتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ولنا قول النبي ﷺ الخراج بالضمان، وهذا المبيع إنما للمشتري فزمانه، وقول ابن عمر: ”مضت السنة ان ما أدركته الصفة حيا مجموعاً فهو من مال المبتاع“ ولأنه لا يتعلق به حق توفيقه و تخصیص النبي ﷺ الطعام بالنهي عن بيعه قبل قبضه دليل على مخالفة غيره له“ (مغنی ۳، ۱۲۵)۔

طریق استدلال یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت میں طعام کی تخصیص کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ طعام کے علاوہ کی بیع قبل القبض جائز ہے۔

۶۔ چونکہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے کی طرف سے قبضہ نہیں پایا گیا جو جواز بیع کیلئے شرط تھا شرعاً، لہذا دوسرے شخص کے ہاتھ اس خریدار کی فروختگی کو ناجائز قرار دیا جائے گا، اور ضمان قبضہ کے قائم مقام تصور نہ ہوگا، اور مشتری نمبر (۱) کا یہ ضمان درست نہیں، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”و فی الفتح و الدر المنتقی: لو هلك المبيع بفعل البائع أو بفعل المبيع أو بأمر سماوى بطل البيع و يرجع بالثمن لو مقبوضاً، وإن هلك بفعل المشتري فعليه ثمنه إن كان البيع مطلقاً أو بشرط الخيار له، وإن كان الخيار للبائع أو كان البيع فاسداً لزمه ضمان مثله إن كان مثلياً و قيمته إن كان قيمياً“ (شامی ۲۰۴۷)۔

یعنی اگر بیع بائع کے فعل سے (مثلاً کوتاہی، یا غیر معتمد علیہ آدمی کے ذریعہ سے پارسل وغیرہ ہو) ہلاک ہو جائے، یا کسی امر سماوی کی وجہ سے ہو تو بیع باطل ہو جائے گی، اور بائع قیمت واپس کرے گا اگر اس نے قیمت لے لی ہے، اور اگر بیع خریدار کے فعل (مثلاً پارسل چھڑانے میں کوتاہی وغیرہ کے ذریعہ) سے ہلاکت ہوئی ہو تو خریدار کے ذمہ قیمت ادا کرنا واجب رہے گا۔

اور قبضہ سے پہلے عدم جواز بیع کے باب میں علامہ شامی فرماتے ہیں: ”محمد عن يعقوب عن أبي حنيفة قال إذا اشترت شيئاً كما يكال أو يوزن أو يعدّ عدا فلا تبعه حتى تكيله و تزنه و تعده، فإن بعته قبل أن تفعل و قد قبضته، فالبيع فاسد في الكيل و الوزن، قلت: و ظاهره أن الفاسد هو البيع الثاني وهو بيع المشتري قبل كيله و أن الأول وقع صحيحاً لما مر من أن العلة كون الكيل من تمام القبض فإذا باعه قبل كيله، فكأنه باعه قبل القبض، و بيع المنقول قبل قبضه لا يصح“ (شامی ۲۰۱۸۳)۔

یعنی امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جب تم کیلی، یا وزن، یا عددی چیز خریدو تو کیل، یا وزن، یا عدد سے خریدو، پھر اس کو بغیر کیل یا وزن یا عدد کے، یعنی بغیر قبضہ کے مت بیجو، پس اگر تم نے اس کو بغیر کیل، یا وزن، یا عدد کے یعنی بغیر قبضہ کے بیچ دیا تو دوسری بیع فاسد ہے اور بیع اول صحیح واقع ہوئی، کیونکہ کیل یا وزن سے پہلے بیچنا قبضہ سے پہلے بیچنا ہے، اور منقول کی بیع قبضہ سے پہلے صحیح نہیں ہے۔

۷۔ یہ عرف کہ جس میں بین الاقوامی تجارت میں جہاز پر مال چڑھانے کے بعد بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے جبکہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ مال کو فروخت کر دیتا ہے، اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے۔

یہ صورت شرعاً جائز نہ ہوگی، جیسا کہ سوال (۶) کے جواب میں تحریر کیا جا چکا، اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ نص اقوی من العرف ہوتی ہے، لہذا نص کے مقابلے میں یہ عرف شرعاً معتبر نہیں، علامہ شامی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لأن العرف جاز أن يكون على الباطل، ولأن حجة العرف على الذين تعارفوه والتزموه فقط والنص حجة على الكل فهو أقوى، ولأن العرف إنما صار حجة بالنص وهو قوله ﷺ ما رآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن“ (شامی ۲۰۲، ۲)۔





## شریعت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی

۱۔ بیع قبل القبض عام طور پر جائز نہیں ہے، کچھ مستثنیات اور فقہاء کے اختلافات ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے، فقہاء احناف نے بیع باطل و فاسد و مکروہ کی جو تعریف کی ہے، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ بیع فاسد ہے، ”الموسوعة الفقهية“ میں ابن عابدین، زلیعی کی ”تبيين الحقائق، بدائع، اور فتح القدير“ وغیرہ کے حوالہ سے بیع باطل و فاسد و مکروہ کی تعریف، اور ان کے احکام تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

”والبيع الباطل عند الحنفية هو: ما لم يشرع لا بأصله ولا بوصفه“ (الموسوعة الفقهية ۹۰۵۲)۔

”والبيع الفاسد في الاصطلاح: ما يكون مشروعاً أصلاً لا وصفاً والمراد بالأصل: الصيغة، والعاقدان، والمعقود عليه، وبالوصف: ما عدا ذلك“ (الموسوعة الفقهية ۹۰۹۸)۔

”والباطل هو ما لا يكون صحيحاً أصلاً ووصفاً، والفاسد هو ما لا يصح وصفاً، وكل ما أورث خللاً في ركن البيع فهو مبطل وما أورثه في غيره كالتسليم والتسلم الواجبين به، والانتفاء المقصود منه، وعدم الإطلاق عن شرط لا يقتضيه وغير ذلك فهو مفسد“ (عنايه على فتح القدير ۶۰۰۲)۔

یہی وجہ ہے کہ ”موسوعہ“ میں شامی کے حوالے سے ”بیع قبل القبض“ کو بیع فاسد میں شمار کیا ہے۔

”وعدم الصحة هنا، يعني الفاسد لا البطلان، وإن كان نفي الصحة يحتملها لكن الظاهر عند الحنفية هو الفساد، لأن علة الفساد هي الغرر مع وجود ركني البيع وكثيراً ما يطلق الباطل على الفاسد“ (الموسوعة الفقهية ۹۰۱۲۵)۔ علامہ ابن ہمام نے باطل و فاسد کی بیع اور اس کے احکام کی جو تفصیلات ذکر کی ہیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ بیع قبل القبض ان کے نزدیک بیع فاسد ہے، لکھتے ہیں:

”لأن فيه غرر انفساخ العقد (الأول) (على اعتبار الهلاك المبيع) قبل القبض فيتبين حينئذ أنه باء ملك العين بغير إذنه وذلك مفسد للعقد“ (فتح القدير ۶۰۵۱۲) ”والفساد بمعنى البطلان إلا في السلم أو مع الملك لكن قبل قبضه“ (فتح القدير ۶۰۲۰۲)۔

فقہاء احناف کی کتابوں میں جہاں بھی بیع قبل القبض کی بحث کی گئی ہے تقریباً تمام ہی حضرات نے اس کو بیع فاسد ہی میں شمار کیا ہے۔

۲۔ قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں ہے، بلکہ عرف و عادت پر موقوف ہے، جس چیز کے بارے میں جس درجہ کا استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے گا، وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا۔

علامہ حصکفی نے ثمن و بیع کی سپردگی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سپردگی یہ ہے کہ تخلیہ اس طرح ہو کہ بغیر کسی رکاوٹ و دشواری کے قبضہ ممکن ہو۔

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل“ (در مختار علی رد المحتار ۴۰۵۶۰)۔ علامہ شامی نے اس عبارت پر ”بحر“ کے حوالہ سے تفصیلات ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

”وحاصله: أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“  
(ردالمحتار ۲۰۵۲۱)۔

صاحب ”بذل المجهود“ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری تحریر فرماتے ہیں: ”قال الخطابي: القبوض تختلف في الأشياء حسب اختلافها في أنفسها، فمنها: ما يكون بأن يوضع في يد صاحبه، ومنها: ما يكون بالتخلية بينه وبين المشتري، ومنها: ما يكون بالنقل من موضعه، ومنها: ما يكون بأن يكتال“ (بذل المجهود ۲۰۲۸۳)۔

”مذهب المالكية والشافعية والحنابلة أن قبض كل شيء بحسبه: فإن كان مكيلا أو موزوناً أو معدوداً أو مذكوراً فقبضه بالكيل أو الوزن أو العدد أو الذرع“۔

”والمالكية شرطوا في قبض المثل تسليمه للمشتري وتفريغته في أوعيته... وإن كان جزافاً فقبضه نقله... وإن كان منقولاً من عروض وأنعام فقبضه بالعرف الجاري بين الناس كما يقول المالكية: كاحتياز الثوب وتسليم مقود الدابة... وإن كان عقاراً، فقبضه بالتخلية بينه وبين المشتري بلا حائل دونه تمكنه من التصرف فيه بتسليمه المفتاح، وإن وجد... ولم يفصل الحنفية... بل اعتبروا التخلية وهي رفع الموانع والتمكين من القبض قبضاً حكماً على ظاهر الرواية... نص الحنفية على مذهبهم هذا في الرهن في التخلية بينه وبين المرتهن، وقالوا: إن التخلية فيه قبض، كما هي في البيع، فإنها فيه أيضاً قبض، وقالوا: لأنها تسليم فمن ضرورته الحكم بالقبض، فيترتب عليه ما يترتب على القبض الحقيقي، وهذا هو الأصح“ (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۳۲-۱۳۳)۔

”خلاصة الفتاوى، فتح القدير، البحر الرائق“ میں بھی تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

۳۔ اوپر کی تفصیلات سے واضح ہے کہ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے فرق ہوگا۔

۴۔ نہیں قبیل القبض کے سلسلہ میں جو احادیث مروی ہیں وہ معلول بالعلتہ ہیں۔

علامہ مرغینانی فرماتے ہیں: ”والحديث معلول به عملاً بدلائل الجواز“ (هدایہ ۲۰۵۸)۔ نبی کریم ﷺ نے قبضہ سے پہلے بیع کرنے سے منع فرمایا ہے، اور خود آپ نے ثمن میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنے کی اجازت دی ہے۔

”عن ابن عمر قال كنت أبيع الإبل بالبقية، فأبيع بالدينار وأخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وأخذ الدينار، فأتيت النبي ﷺ وهو يريد أن يدخل حجرته، فأخذت بثوبه فسأته، فقال: إذا أخذت واحدا منها بالآخر فلا يفارقت وبينك وبينه بيع“ (فتح القدير ۶۰۱۹)۔

اس سے واضح ہے کہ جب آپ نے ”بیع قبل قبض المبيع“ سے منع فرمایا اور ”بیع قبل قبض الثمن“ کی اجازت دی، تو منع کرنے کی کوئی خاص وجہ ضرور ہے جو بیع ”قبل قبض المبيع“ میں پائی جا رہی ہے، اسلئے آپ منع فرما رہے ہیں، اور بیع ”قبل قبض الثمن“ میں نہیں پائی جا رہی ہے: اس لئے اس میں آپ اجازت دے رہے ہیں، اور وہ وجہ غرر ہے، یعنی ”غرر انفساخ العقد الاول“ ہے، ”فی الصحاح أنه ﷺ نهي عن بيع الغرر“ (فتح القدير ۶۰۵۱۲)۔ یعنی اگر بیع قبضہ سے قبل ہلاک ہو جائے تو بیع منسوخ ہو جائیگی، مشتری کو معلوم نہیں ہے کہ جس مال کو اس نے خریدا ہے وہ قبضہ میں آئے گا یا نہیں، بلکہ ہلاک ہونے کی صورت میں بیع ہی منسوخ ہو جائے گی، اسلئے اس کو اجازت نہیں دی جا رہی ہے کہ وہ قبضہ میں آنے سے پہلے اس کو فروخت کرے، لیکن ثمن کے ہلاک ہونے کا اثر بیع پر نہیں پڑتا ہے، اس لئے کہ اگر ثمن متعین بھی ہے تو اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں بیع منسوخ نہیں ہوگی، بلکہ مشتری پر لازم ہوگا کہ اس متعین ثمن کی قیمت بائع کو ادا کرے۔

یہیں سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ ہر وہ عقد جس میں قبضہ سے پہلے بدل کے ہلاک ہونے سے عقد پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہاں اس بدل میں قبضہ سے پہلے بھی تصرف کی اجازت ہے۔

مثلاً عورت کے لئے مہر، زوج کیلئے بدل خلع، عتق علی مال، دم عمد میں صلح کا بدل، یہ سب وہ عقود ہیں کہ بدل کے ہلاک ہونے سے عقد منسوخ نہیں ہوتا، بلکہ اگر بدل متعین ہو تو ہلاک ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرائی جاتی ہے، اس لئے ان سب میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے۔

”فصار الأصل أن كل عقد يفسخ بهلاك العوض قبل القبض لم يجز التصرف في ذلك العوض قبل قبضه كالبيع في البيع والأجرة إذا كانت عينا في الإجارة وبدل الصلح عن الدين إذا كان عينا لا يجوز بيعه شيء من ذلك... وما لا يفسخ بهلاك العوض، فالتصرف فيه قبل القبض جائز، كالمهر إذا كان دينا وبدل الخلع والعتق على مال وبدل الصلح عن دم العمدة كل ذلك إذا كان عينا يجوز بيعه وهبته وإجارته قبل قبضه وسائر التصرفات في قول أبي يوسف: ولو أوصى به قبل القبض ثم مات قبل القبض صحت الوصية بالإجماع؛ لأن الوصية أخت الميراث ولو مات قبل القبض ورث عنه فكذا إذا أوصى به“ (فتح القدير ۶۰۵۱۲)۔

”إن كل عوض ملك بعقد يفسخ بهلاكه قبل القبض لم يجز التصرف فيه قبل قبضه وما لا يفسخ بهلاكه جاز التصرف فيه قبل قبضه، فمثال الأول المبيع والأجرة وبدل الصلح عن الدين إذا كان الثمن والأجر والبدل عينا... ومثال الآخر المهر إذا كان عينا... وكذا بدل الخلع والعتق على مال وبدل الصلح عن دم العمدة“ (الموسوعة الفقهية ۹۰، ۱۲۸-۱۲۹)۔

یہاں پر حضرت امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کا عقار کے سلسلہ میں بیع قبل القبض کی اجازت دینا بھی سمجھ میں آتا ہے، کہ جس طرح ثمن میں قبضہ کے پہلے تصرف کرنا جائز ہے، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہاں ”غرر“ نہیں ہے، اور مہر وغیرہ میں بھی غرر کے نہ ہونے کی وجہ سے ہی تصرف قبل القبض کی اجازت ہے، اسی طرح عقار میں بھی چونکہ ”غرر“ کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا ضائع ہونا نادر ہے، اور ”النادر لا عبدة به“ قبل القبض کی اجازت دی گئی ہے۔

البتہ خود ان حضرات نے بھی کہا ہے کہ اراضی لب دریا ہو، یا ایسی جگہ ہو کہ ریت کے بھر جانے کا اندیشہ ہو تو وہاں چونکہ زمین کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے، وہاں ”غرر انفساخ“ موجود ہے تو وہاں بھی بیع قبل القبض کی اجازت نہیں دی جائے گی، ”حتى قال بعض المشائخ: إن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن يصير بحراً أو يغلب عليه الرمال، فأما في موضع لا يؤمن عليه ذلك، فلا يجوز كما في المنقول ذكره المحبوبي، وفي الاختيار: حتى لو كان على شط البحر أو كان المبيع علواً لا يجوز بيعه قبل القبض“ (فتح القدير ۶۰۵۱۳)۔

۵۔ بیع قبل القبض کی تفصیلات میں حضرات ائمہ کرام میں اختلافات ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد نے خطابی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اہل علم کا اجماع اس پر ہے کہ طعام کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، اس کے علاوہ دوسری اشیاء میں اختلافات ہیں۔ امام اعظم اور امام ابو یوسف ”مکانات اور اراضی کی بیع قبل القبض جائز قرار دیتے ہیں، باقی تمام طعام“ غیر طعام میں ناجائز قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی اور امام محمد ”طعام وغیر طعام، مکانات اور اراضی تمام ہی چیزوں میں ”بیع قبل القبض“ کو ناجائز کہتے ہیں۔ امام مالک ”ماکول و مشروب کے علاوہ تمام اشیاء میں ”بیع قبل القبض“ کو جائز مانتے ہیں۔ اوزاعی، احمد بن حنبل، اسحق بن راہویہ، مکمل و موزون کے علاوہ تمام چیزوں میں بیع قبل القبض کو جائز کہتے ہیں۔ یہی ابن السیب، حسن بصری، حکم اور حماد سے مروی ہے (بذل الجہود ۲۸۴)۔ ”الموسوعة الفقهية“ میں پوری تفصیل مذکور ہے۔

حضرت امام مالک نے اس کو طعام کے ساتھ مخصوص کیا ہے، جبکہ وہ معاوضہ لے کر حاصل کیا گیا ہو، اور کیل یا وزن کے ساتھ حاصل کیا گیا ہو، اگر بلا معاوضہ حاصل ہوا ہے، یا تخمینہ سے خریدا گیا ہے تو اس میں بھی ”بیع قبل القبض“ کی اجازت دیتے ہیں، دوسری تمام چیزوں میں وہ ”بیع قبل القبض“ کی اجازت دیتے ہیں۔

”ومذهب المالكية أن المحرم المفسد للبيعه هو بيع الطعام دون غيره من جميع الأشياء قبل قبضه، سواء كان الطعام ربوياً كالقمح أم غير ربوياً كالتفاح عندهم، أما غير الطعام فيجوز بيعه قبل قبضه وذلك لحديث ابن عباس المتقدم من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يقبضه، ولغلبة تغير الطعام دون ما سواه، لكنهم شرطوا لفساد هذا



النوع من البيع شرطين:

(الف) أن يكون الطعام مأخوذاً بطريق المعاوضة أي في مقابلة شيء بإجارة أو شراء أو صلح أو إرش جنابة... فهذا الذي لا يجوز بيعه قبل قبضه إما لو صار إليه الطعام بهبة أو ميراث مما ليس أخذه بعوض، فيجوز بيعه قبل قبضه۔

(ب) وأن تكون المعاوضة بالكيل أو الوزن أو العدد فيشتره بكيل و يبيعه قبل قبضه... أما لو اشتراه جزافاً ثم باعه قبل قبضه فيكون جائزاً“ (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۲۶)۔

موسوعہ میں امام احمد سے مختلف روایتیں منقول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ طعام کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے جس چیز میں ”بیع قبل القبض“ سے منع کیا ہے وہ طعام ہے، اس کا مطلب ہوا کہ طعام کے علاوہ دوسری چیزوں میں ”بیع قبل القبض“ جائز ہوگی۔

”الأصح أن الذي يمنع من بيعه قبل قبضه هو الطعام، وذلك؛ لأن النبي ﷺ ”نهي عن بيع الطعام قبل قبضه“ فمفهومه إباحة ما سواه قبل قبضه“ (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۲۷)۔

اس کے ساتھ ہی ان روایات کا بھی تذکرہ ہے جن میں طعام میں ”بیع قبل القبض“ سے مختلف الفاظ میں منع کیا گیا ہے، ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ کھیل و موزون، معدود اور مذروع میں مشتری کا تصرف قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، جیسا کہ حضرت سہارنپوری نے نقل کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ حدیث میں طعام قبل القبض سے منع کیا گیا ہے، اور اس زمانہ میں غالباً طعام کا لفظ کھیل و موزون میں ہی استعمال کیا جاتا تھا، معدود و مذروع کو اس پر قیاس کیا گیا ہے۔

”إن الحديث المذكور نهي عن بيع الطعام قبل قبضه وكان الطعام يومئذ مستعملاً غالباً فما يكال ويوزن وقيس عليها المعدود والمذروع لاحتياجهما إلى حق التوفية“ (حوالہ سابق ۹، ۱۲۸)۔

ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ کسی چیز کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، جبکہ امام محمد اور امام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب ہے:

”وفي رواية ثالثة عن الإمام أحمد: أنه لا يجوز بيع شيء قبل قبضه وهي التي وافق فيها الإمام الشافعي وغيره“ (حوالہ سابق)۔

امام محمد اور امام شافعی کا مذہب ہے کہ کسی چیز کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، طعام ہو غیر طعام ہو، منقول ہو یا غیر منقول اراضی وغیرہ ہو، ان کا استدلال وہ روایات ہیں جن میں مطلقاً قبضہ سے پہلے بیع سے منع کیا گیا ہے۔

”وذلك لحديث حكيم بن حزام رضي الله عنه قال: قلت: يا رسول الله إني أشتري بيوعاً فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال: إذا اشتريت بيعاً فلا تبعه حتى تقبضه“ (حوالہ سابق ۹، ۱۲۳)۔

نیز طعام میں ”بیع قبل القبض“ کی نہی کے راوی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے: ”ولا أحسب كل شيء إلا مثله“ (مشکوٰۃ ۲۴، ابوداؤد کے الفاظ ہیں: ”وقال ابن عباس وأحسب أن كل شيء مثل الطعام“ (ابوداؤد ۳، ۱۰۴)۔

حضرت امام اعظم و ابو یوسف نے طعام کے ساتھ تمام منقول اشیاء میں ”بیع قبل القبض“ کو ناجائز کہا ہے، اراضی و مکانات وغیرہ غیر منقولہ اشیاء میں وہ ”بیع قبل القبض“ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جواب (۴) میں اس کی کچھ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے۔

۶۔ فیکٹری کا مال بیچنے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص فیکٹری کا ایجنٹ ہوتا ہے، وہ سفر کرتا ہے، خریداروں سے بات کرتا ہے، ان سے آرڈر لیتا ہے، اور پھر فیکٹری سے آرڈر کے مطابق خریداروں کو مال روانہ کر دیا جاتا ہے، اور اس شخص کو فیکٹری کی طرف سے کمیشن ملتا ہے، اس صورت میں وہ فیکٹری کا وکیل ہوتا ہے، یہ ”بیع قبل القبض“ نہیں ہے، اس لئے جائز ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص فیکٹری کے ساتھ معاملہ طے کر لیتا ہے، ہر ماہ میں مجھے اتنا مال ملنا چاہئے، اور وہ سفر کر کے خریدار تیار کرتا ہے، اور مال کی قیمت اس کو معلوم ہے، اسی میں اپنا منافع رکھ کر خریدار سے بات کر لیتا ہے، اور فیکٹری سے مال اس کو روانہ کر دیتا ہے، اس صورت میں تو ”بیع قبل القبض“ ہی

نہیں، بلکہ "بیع مالیس عندہ" ہے، یعنی ابھی تو اس نے فیکٹری سے خریداری نہیں کی اور مال کا مالک نہیں بنا اور فروخت کر دیا، یہ بیع قبل الملک ہے، اور سراسر ناجائز ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نے مال فیکٹری سے خرید لیا، پھر اس میں دو صورتیں ہیں:

اول یہ ہے کہ فیکٹری کے اموال میں سے خرید کردہ مال جدا کر کے ایک جگہ محفوظ کر دیا، پھر اس نے کسی خریدار سے بات کی، اور فیکٹری سے اس کو براہ راست مال روانہ کر دیا، میرے خیال سے فیکٹری سے خرید کردہ مال کو جدا کر کے رکھوادینا قبضہ مانا جائے گا، اس لئے اس بیع کو صحیح قرار دیا جائے گا، یہ "بیع بعد القبض" ہے نہ کہ "قبل القبض"۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے فیکٹری سے مال خرید لیا، اور ابھی اس نے قبضہ نہیں کیا، اور کسی دوسرے خریدار کے ہاتھ فروخت کر کے فیکٹری سے مال براہ راست دوسرے خریدار کو بھیج دیا، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو یہ صورت "بیع قبل القبض" کی ہے اور ناجائز ہے۔

یہ کہنا کہ جب مال فیکٹری سے روانہ ہوتا ہے تو خریدار اول کے ضمان میں آجاتا ہے اور یہ "رجع مالم یضمن" نہیں ہے، صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ "رجع مالم یضمن" کا معنی "بیع قبل القبض" ہے، ومعنی "رجع مالم یضمن، ربح ما بیع قبل القبض، مثل: أن يشتري متاعاً و یبیعه إلى آخر قبل قبضه من البائع فهذا البیع باطل و ربحه لا یجوز؛ لأن البیع فی ضمان البائع الأول و لیس فی ضمان المشتري منه لعدم القبض" (الموسوعة الفقهية ۹۰۱۲۲)۔

جس وقت اس نے فروخت کیا مال اس کے قبضہ میں نہیں تھا، بعد میں اس کے قبضہ میں آیا، اس لئے یہ جائز نہیں ہوگا، البتہ چونکہ اس طرح سے بیع و شراء کرنے کا عام رواج ہو چکا ہے، اس لئے امام مالک کے قول کے مطابق اگر طعام نہ ہو تو اس طرح بیع و شراء کی اجازت دی جاسکتی ہے، عموم بلوئی کی وجہ سے دوسرے ائمہ کے مسلک کو اختیار کرنے کی اجازت فقہاء دیتے ہیں، اور یہ مسئلہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں معروف ہے۔

ماضی قریب کے مشہور فقیہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: یہ معاملہ حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے..... چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، لہذا امام شافعیؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے (امداد الفتاویٰ ۲۱۳)۔

اس طرح چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، اس لئے میرے خیال میں امام مالک کے قول پر عمل کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔

۷۔ جب مشتری نے مال کی خریداری کے بعد بائع کو کہہ دیا کہ میرا مال فلاں جہاز پر لا دیا جائے اور بائع نے اس کے حکم کے مطابق مال جہاز پر بھیج دیا، تو اب وہ مال مشتری کے ضمان میں آ گیا اور جہاز پر لا دینا مشتری کا قبضہ مانا جائے گا، اور جب اس کے قبضہ اور ضمان میں آ گیا تو اس کے لئے اس میں ہر طرح کا تصرف کرنا بھی جائز قرار پائے گا، اس لئے اگر اس نے اس مال کو فروخت کر دیا تو یہ فروختگی جائز قرار پائے گی۔

اسی طرح اجیر کا قبضہ مستاجر کا قبضہ قرار دیا جائے گا، اور صاحب جہاز اجیر ہے، اس کا قبضہ مالک کا قبضہ قرار پائے گا، تو جس طرح مالک جہاز کا قبضہ مشتری اول کا قبضہ مانا جائے گا، اسی طرح مالک جہاز کا قبضہ مشتری ثانی کا قبضہ بھی مانا جائے گا، اور مشتری ثانی کیلئے بھی جائز ہوگا کہ وہ کسی تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دے..... میری رائے ہے کہ اس صورت کو جائز ہونا چاہئے۔



## قبضہ سے پہلے بیع و شراء کے احکام

مفتی نسیم احمد قاسمیؒ

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فاسد ہے یا باطل؟

قبضہ سے پہلے کسی چیز کے فروخت کرنے کی ممانعت کے بارے میں جناب نبی کریم ﷺ سے مختلف احادیث و روایات مروی ہیں، بعض احادیث میں مطلقاً قبضہ سے پہلے سامان کے فروخت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، بعض احادیث میں کھانے کی چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، حضرت امام بخاریؒ نے اپنی ”الجامع الصحیح“ میں ”باب بیع الطعام قبل أن یقبض و بیع ما لیس عندک“ کے تحت صرف ان احادیث کا تذکرہ کیا ہے جن میں نبی کریم ﷺ سے قبضہ سے پہلے طعام کے بیع کی ممانعت ثابت ہے، حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے:

”أما الذی نھی عنه النبی ﷺ فهو الطعام أن یباع حتی یقبض“

راوی حدیث ابن عباس کہتے ہیں کہ ”ولا أحسب کل شیء إلا مثله“ (فتح الباری ۴، ۲۳۹) یعنی میرا خیال ہے کہ ممانعت صرف بیع طعام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دوسری اشیاء میں بھی قبل القبض بیع درست نہیں ہوگی، دوسری روایت ابن عمرؓ سے منقول ہے: ”من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یتوفیه“۔

اسماعیل کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یقبضه“ (حوالہ سابق)۔

یعنی کوئی شخص کھانے کی کوئی چیز خریدے تو اس پر قبضہ سے پہلے اس کی بیع درست نہیں ہوگی، مختلف سندوں سے امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر کی روایات ذکر کی ہیں، مسلم شریف میں ابو ہریرہ کی روایت میں ہے:

”إن رسول اللہ ﷺ قال من اشتری طعاماً فلا یبعه حتی یکتالہ“ (تکملة فتح الملهم ۱، ۲۵۷)۔

اور ابو داؤد شریف میں ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”إذا ابتعت یباعاً فلا تبعه حتی

تقبضه“ (ابو داؤد ۳، ۲۸۳)۔

جب تم کوئی چیز خریدو تو اس کو قبضہ سے پہلے مت فروخت کرو۔

حضرت عمر فاروق کا بھی فتویٰ ہے کہ قبضہ سے پہلے طعام کی بیع جائز نہیں ہے، انہوں نے حکیم بن حزام سے فرمایا: ”لا تبع طعاماً ابتعتہ حتی

تستوفیه“ (الاستذکار ۱۹، ۲۶۳)۔

حضرت عبداللہ بن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی فتویٰ یہی ہے کہ قبضہ سے پہلے طعام کی بیع درست نہیں ہے (حوالہ بالا ۱۹، ۲۵۲)۔

ان احادیث و آثار کی وجہ سے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہوا ہے، حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک تمام منقولات میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع ہے، البتہ ایسی زمین و عقار جس کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو قبضہ سے پہلے بھی اس کی بیع جائز ہے، حضرت امام شافعی اور محمد بن الحسن شیبانی حنفی کے نزدیک ہر چیز کی بیع قبضہ سے پہلے ناجائز ہے، چاہے منقولات کی بیع ہو یا عقار کی اور چاہے طعام کی ہو یا غیر طعام کی، حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کا حکم بیع الطعام کے ساتھ خاص ہے، حضرت امام مالک کے نزدیک طعام کی بیع کیل یا وزن کے ساتھ ہو تو اس صورت میں قبل القبض اس کی بیع ممنوع ہوگی (تکملہ فتح الملهم ۱، ۳۵۰-۳۵۱)۔

سابق نائب ناظم، امارت شریعہ پھلواری شریف، پٹنہ۔



اب رہا یہ سوال کہ حنفیہ کے نزدیک قبضہ سے پہلے طعام یا منقولات کی بیع ناجائز ہے تو اس کا شمار ان کے نزدیک بیع کی کس قسم میں ہوگا، فاسد میں یا باطل میں؟ کتب حنفیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہاء نے اسے بیع فاسد میں شمار کیا ہے، جبکہ بعض فقہاء نے اس پر بیع باطل کا بھی اطلاق کیا ہے، چنانچہ صاحب جوہرۃ النیرہ کے حوالہ سے علامہ علاء الدین <sup>حسکفی</sup> نے درمختار میں لکھا ہے: ”بخلاف بیعہ قبلہ فانہ باطل“ یعنی قبضہ سے پہلے بیع باطل ہے۔

مگر صاحب ”درمختار“ نے صاحب جوہرہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے، ان کا اپنا ذاتی رجحان یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فاسد ہے، باطل نہیں ہے، چنانچہ مواہب کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وفسد بیع المنقول قبل قبضہ“ انتہی یعنی قبضہ سے پہلے منقولی اشیاء کی بیع فاسد ہے۔

عدم جواز میں چونکہ فساد اور بطلان دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اسلئے کبھی فاسد پر باطل کا بھی اطلاق کر دیا جاتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے فساد کے قول کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ”والظاهر الثاني لأن علة الفساد الغرر كما مر مع وجود ركني البيع و كثيرا ما يطلق الباطل على الفاسد“ (رد المحتار ۷۰۲۱) یہی فساد کا قول زیادہ مناسب و مفتی بہ ہے، اس لئے کہ علت فساد غرر ہے، یہاں پر بیع کے دونوں رکن پائے جاتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فاسد پر باطل کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، علامہ سید احمد الطحاوی حنفی نے حاشیہ در مختار میں فساد کے قول کو راجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”وهو الظاهر؛ لأن ركني البيع وهما العوضان ثابتان وإنما جاء الفساد من جهة أخرى وهو الغرر أي غرر انفساخ العقد بهلاكه والغرر حرام وكثيراً ما يطلق الباطل على الفاسد“ (حاشیہ طحطاوی علی الدر المختار ۲۰۱۰۰)۔  
 علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو بیع فاسد قرار دیا ہے چنانچہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:  
 ”قبل القبض فتبين حينئذ أنه باء ملك الغير بغير إذنه و ذلك مفسد للعقد وفي الصحاح أنه <sup>صلى الله عليه وسلم</sup> نهي عن بيع الغرر“ (فتح القدیر ۶۰۱۲۶)۔

یعنی قبضہ سے پہلے ملک غیر کو اس کی اجازت کے بغیر فروخت کیا جاتا ہے جو مفسد عقد ہے، اور صحاح میں نبی کریم <sup>صلى الله عليه وسلم</sup> سے بیع غرر کی ممانعت ثابت ہے۔  
**قبضہ کی حقیقت:**

علامہ ابن ہمام حنفی نے قبضہ کی حقیقت کے بارے میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:  
 ”قبضہ اور بیع کی حوالگی و سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مشتری (خریدار) اور خریدے ہوئے سامان کے درمیان اسی طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ خریدار کیلئے بغیر کسی رکاوٹ اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو، اور یہی مفہوم ثمن کی حوالگی کا ہے۔“

اور وبری سے منقول ہے کہ اگر کسی مکان میں خریدے گئے سامان تجارت کے ساتھ بائع کے سامان کے علاوہ کسی دوسرے کا سامان ہو تو وہ قبضہ کے حق میں مانع ہوگا، پس اگر اسے قبضہ کی اجازت دے دی جائے تو قبضہ صحیح ہو جائے گا اور سامان بائع کے پاس بحکم ودیعت ہوگا، کیڑے میں قبضہ کی صورت یہ ہے کہ خریدار اسے اپنے ہاتھ میں لے لے، یا اگر کیڑا زمین پر رکھا ہو اور بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اور کیڑے کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے، پس اس پر قبضہ کر لو، اور خریدار نے اس کے جواب میں کہا میں نے قبضہ کر لیا تو اسے شرعاً قبضہ قرار دیا جائے گا، اور اگر کسی مکان میں رکھے ہوئے گندم کو خریدا گیا اور بائع نے مشتری کو اس مکان کی کنجی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان تخلیہ کر دیا تو اسے شرعاً قبضہ قرار دیا جائے گا (فتح القدیر ۴۹۶/۵)۔

علامہ علاء الدین <sup>حسکفی</sup> صاحب درمختار نے قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”پھر قبضہ اور سامان کی سپردگی ایسے تخلیہ سے عمل میں آئے گی جس میں مشتری کیلئے بیع پر قبضہ کرنا کسی رکاوٹ کے بغیر ممکن ہو“ (در المختار ۵۶۱/۲-۵۶۲)۔

علامہ شامی کی صراحت کے مطابق تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے، بشرطیکہ تخلیہ کے بعد بیع پر کسی مانع کے بغیر قبضہ و تصرف ممکن ہو (حوالہ ۱۱۱)۔

فقہ طاہر بن عبدالرشید نے ”خلاصۃ الفتاویٰ“ کی ”کتاب المبیوع“ میں ایک باب ہی اس عنوان سے قائم کیا ہے: ”فیما یكون قبضاً وفيما لا یكون“ اس باب کے تحت انہوں نے قبضہ کی حقیقت و اصلیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”تجرید میں بیع پر قبضہ کے باب میں لکھا ہے کہ سامان پر قبضہ اور اس کی سپردگی کی صورت یہ ہے کہ بائع سامان اور مشتری کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دے کہ کسی رکاوٹ کے بغیر خریدار کیلئے اس پر قبضہ ممکن ہو، اور اسی طرح ثمن کی سپردگی ہوگی، اجناس میں ہے کہ سامان کی حوالگی کیلئے تین چیزیں معتبر ہیں: ۱۔ بائع خریدار سے کہے کہ میں نے سامان اور تمہارے مابین تخلیہ کر دیا، ۲۔ بیع خریدار کے پاس اس طرح ہو کہ اگر وہ اس میں کوئی تصرف کرنا چاہے تو کسی مانع کے بغیر کر سکے، ۳۔ بیع حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے اس پر قبضہ کر لو..... (خلاصۃ الفتاویٰ ۸۹/۳)۔“

فتاویٰ ہندیہ میں بیع جائز میں تخلیہ کو قبضہ تسلیم کرنے پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے: ”وأجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضاً“ (فتاویٰ ہندیہ ۳۰۱۶)۔

البتہ بیع فاسد کی صورت میں تخلیہ قبضہ کے حکم میں ہوگا یا نہیں، اس میں دو روایت ہے مگر اس میں بھی مفتی بہ قول یہی ہے کہ تخلیہ قبضہ کے حکم میں ہوگا۔ ”والصحيح أنها قبض“ (حوالہ سابق)۔

قبضہ کی حقیقت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے: ”سامان کی حوالگی اور قبضہ کی صورت یہ ہے کہ بیع اور مشتری کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ کسی رکاوٹ کے بغیر مشتری کیلئے اس سامان پر قبضہ ممکن ہو“ (حوالہ بالا)۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک چاہے منقولات کی بیع ہو یا عقار کی، ہر صورت میں تخلیہ قبضہ کے حکم میں ہوگا: ”وقال أبو حنيفة رحمه الله: القبض في الجميع التخلية“ (حلیۃ الاولیاء ۴۰۸۲)۔

ان عبارت کا حاصل یہ ہے کہ قبضہ اور سامان کی حوالگی کا مطلب یہ ہے کہ خریدار اور بیع کے درمیان ایسا تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر وہ اپنے خریدے ہوئے سامان میں کوئی تصرف کرنا چاہے تو کر سکے، اب رہا یہ سوال کہ ہر چیز کا قبضہ ایک ہی نوعیت کا ہوگا یا اشیاء کی نوعیت کے لحاظ سے قبضہ کی حقیقت و نوعیت بدلتی رہے گی، تو اس سلسلہ میں یہ تفصیل ہے۔

اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کا فرق:

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے صراحت کی ہے کہ ہر چیز کا قبضہ اس کی نوعیت کے لحاظ سے ہوگا: ”وقبض كل شیء بحسبه“ (المغنی ۴۰۱۲۵)۔

مکملی یا موزونی اشیاء اگر کیل یا وزن کے ساتھ فروخت کی جائیں تو ان میں کیل یا وزن ہی کے ذریعہ قبضہ معتبر ہوگا، حضرت امام شافعی کی یہی رائے ہے، حضرت امام ابوحنیفہ ہر چیز کی بیع میں تخلیہ کو قبضہ کے حکم میں تسلیم کرتے ہیں (المغنی لابن قدامہ ۱۲۵/۴)۔

محدث ظفر عثمانی صاحب ”اعلاء السنن“ نے ”شرح الوجیز“ کے حوالہ سے قبضہ کی حقیقت و کیفیت اور ہر چیز کی نوعیت کے لحاظ سے قبضہ کی نوعیت کا فرق ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

۱۔ اگر بیع ان چیزوں کے قبیل سے ہو جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے جیسے اراضی (عقار) مکانات، تو ایسی چیزوں کا قبضہ ایسے تخلیہ کے ذریعہ عمل میں آئے گا جس کے نتیجہ میں خریدار کو بیع پر قبضہ اور تصرف کا حق حاصل ہو جائے، مثلاً بائع کہے کہ میں نے تمہارے اور مکان کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے تم جس قسم کا چاہو اس میں تصرف کرو، تو یہ تخلیہ قبضہ کے حکم میں ہوگا۔

۲۔ اور اگر بیع منقولات کے قبیل سے ہو تو مذہب مشہور یہ ہے کہ اس میں تخلیہ کافی نہیں ہوگا بلکہ سامان کو منتقل کرنا ضروری ہوگا، امام احمد کا یہی قول ہے، حضرت امام مالک اور امام ابوحنیفہ عقار ہی کی طرح بیع منقولات میں بھی تخلیہ کو قبضہ تسلیم کرتے ہیں (اعلاء السنن ۲۳۱/۱۳)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے مختلف اشیاء کے قبضہ کی نوعیت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ہر چیز کا قبضہ اسی کی نوعیت کے لحاظ سے ہوگا، کیلی یا وزنی چیزیں کیلی یا وزن کے ذریعہ فروخت کی جاتی ہیں تو ان کا قبضہ کیلی یا وزن کے ذریعہ متحقق ہوگا۔“

امام شافعی کی یہی رائے ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کی بیع میں بھی تخلیہ قبضہ کے حکم میں ہوگا، ابوالخطاب نے امام احمد سے دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ہر چیز کی بیع میں تخلیہ مع التمییز قبضہ کے حکم میں ہوگا“ (المغنی ۴/۱۲۵)۔

امام نووی صاحب ”المجموع شرح المہذب“ نے تحریر کیا ہے کہ: قبضہ میں اصل عرف ہے (۲۷۶/۹) (لہذا جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے گا وہی شرعاً بھی اس کے حق میں قبضہ مانا جائے گا)۔

ہر چیز کی نوعیت کے لحاظ سے قبضہ کی نوعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱۔ عقار مثلاً زمین، مکانات اور درختوں پر پھل کی بیع کی صورت میں تخلیہ کے ذریعہ قبضہ کا تحقق ہوگا۔

۲۔ جو چیزیں عرف و عادت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاتی ہیں، مثلاً درخت کی لکڑیاں، جوب (اناج) مچھلیاں اور اس قسم کی دیگر چیزیں، تو ایسی چیزوں کی بیع کی صورت میں قبضہ اس وقت تسلیم کیا جائے گا جب اسے ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں بائع کا عمل دخل نہ ہو، چاہے بائع کی ملکیت میں منتقل کر دیا جائے، یا عام راستہ یا مسجد یا کسی اور جگہ۔

۳۔ جو چیزیں ہاتھ میں لے کر قبضہ کی جاتی ہیں مثلاً درہم و دینار، کرنسی نوٹ، رومال، کپڑے، برتن، کتاب وغیرہ تو ان چیزوں میں اسی وقت قبضہ تسلیم کیا جائے گا جب بائع سے سامان مشتری اپنے ہاتھ میں لے لے (المجموع شرح المہذب ۲۷۶/۹)۔

ان عبارات کا حاصل یہ ہے کہ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے لحاظ سے فرق ہوگا، اشیاء منقولہ میں نقل و تحویل کے ذریعہ قبضہ کا تحقق ہوگا، عقار اور غیر منقولہ اشیاء میں تخلیہ ہی قبضہ قرار پائے گا، اور جو چیزیں ہاتھ میں لے کر مقبوض سمجھی جاتی ہیں، ان میں تناول بالید کے بعد ہی قبضہ کا تحقق ہوگا، اور کیلی و وزنی اشیاء میں کیل اور وزن کے ذریعہ قبضہ تحقق ہوگا، علامہ انور شاہ کشمیری نے قبضہ کی حقیقت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: ”واعلم ان القبض یختلف فی الأشیاء حسب اختلافها فی أنفسها“ (انوار محمود ۴/۲۳۷)۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث محدثین و فقہاء کے نزدیک معلول بالعلتہ ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مشہور حنفی عالم شیخ الاسلام برہان الدین المرغینانی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”ہدایہ“ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی احادیث کو معلول بالعلتہ قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”والحدیث معلول بہ عملاً بدلائل الجواز“ (فتح القدیر ۴/۶۰۴)۔

یعنی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی حدیث معلول بالعلتہ ہے کیونکہ بیع عقار دلائل کی وجہ سے جائز ہے۔

علامہ ابن الہمام نے ”معلول بہ“ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ”والحدیث الذی استدل (معلول بہ) ای بغرر الانفساخ“۔ اور علت غرر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: ”قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں نہی کی علت غرر انفساخ کی دلیل یہ ہے کہ وہ تصرف جس میں احتمال غرر نہ ہو وہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں نافذ ہوتا ہے، مثلاً غلام کو آزاد کرنا، ”والدلیل علیہ ان التصرف الذی لا یمتنع بالغرر نافذ فی المبیع قبل القبض وهو العتق“ (حوالہ بالا)۔

اور صاحب ”البنایہ“ نے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی حدیث کو ”معلول بالعلتہ“ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: ”والحدیث معلول بہ ای بغرر انفساخ العقد فیما قبل القبض بهلاك العقود علیہ فیکون مخصوصاً بالمنقول ألا تری أنه یجوز الإعتاق قبل القبض والوصیة“ (البنایہ شرح الہدایہ ۶/۵۰۹)۔

یعنی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی حدیث علت غرر انفساخ عقد کی وجہ سے معلول بہ ہے کیونکہ قبل القبض معقود علیہ کے ہلاک ہونے کا احتمال رہتا ہے، لہذا یہ حدیث منقول کے ساتھ خاص ہوگی، یہی وجہ ہے کہ قبل القبض اعتاق اور وصیت جائز ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی حدیث کو ”معلول بالعلتہ“ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: ”والغرر المنہی غرر انفساخ العقد والحدیث معلول بہ عملاً بدلائل الجواز“ (البحر الرائق ۶/۱۲۶)۔



یعنی وہ غرر جس کی ممانعت کی گئی ہے وہ انفساخ عقد کا غرر ہے، دلائل جواز کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ اس کی بیع میں علت غرر نہیں ہے۔

اوجز المسالك شرح مؤطا امام مالک میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "لأن النهي معلول بغير انفساخ العقد بخوف الهلاك" (۱۱،۲۰۰)۔

صاحب "اعلاء السنن" نے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث کو معلول بالعلت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے علت کی نہی کی وجہ سے نصوص کو منقول کے ساتھ خاص کیا ہے اور علت نہی اندیشہ ہلاکت سے انفساخ عقد کا غرر ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۳)۔

علامہ تفتی عثمانی نے بھی "تکملہ فتح الملہم" میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث کو "معلول بالعلت" قرار دیا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به بدلائل الجواز" (تکملہ فتح الملہم ۱،۲۵۳)۔

مذکورہ بالا اقوال و عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع کی ممانعت سے متعلق احادیث معلول بالعلت ہیں اور علت نہی غرر انفساخ عقد ہے، یعنی چونکہ قبضہ سے پہلے سامان خریدار کے پاس نہیں آتا ہے تو اس کا احتمال اور اندیشہ رہتا ہے کہ کسی وجہ سے سامان (بیع) بائع کے پاس ہلاک ہو جائے، اور بیع کی ہلاکت کی وجہ سے عقد کو فسخ کرنا پڑ جائے، اگر خریدار قبل القبض بیع کرتا ہے تو وہ ایسے سامان کا نفع حاصل کرتا ہے جو ابھی تک اس کے ضمان میں نہیں آیا ہے، اور حدیث میں "رجح الملم يضمن" سے ممانعت کی گئی ہے۔

منقولی اشیاء میں اندیشہ ہلاکت کی وجہ سے فسخ بیع کا احتمال، بلکہ ظن غالب رہتا ہے، اسلئے حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ ممانعت کی احادیث بیع منقول کے ساتھ خاص ہیں، عقار (ارضی) میں اندیشہ ہلاکت شاذ و نادر ہی رہتا ہے، اس لئے قبضہ سے پہلے بھی ان دونوں حضرات نے عقار کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، البتہ اگر بیع عقار میں بھی اندیشہ ہلاکت کی وجہ سے غرر انفساخ عقد ہو تو عقار میں بھی علت نہی کی وجہ سے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع ہوگی، مثلاً کوئی زمین دریا کے کنارے واقع ہو اور پانی کے بہاؤ کے نتیجے میں اس کے دریا میں ضم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی زمین میں بھی قبض بیع جائز نہیں ہوگی، چنانچہ "تکملہ فتح الملہم" میں ہے:

"إن العلة في النهي عن بيع المبيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح مال يضمن وإنما يضمن الإنسان ما يخاف فيه الهلاك، وأما العقار فلا يخشى فيه ذلك إلا نادراً حتى لو كان العقار على شط البحر أو كان المبيع علواً لا يجوز بيعه قبل القبض" (حوالہ سابق)۔

یعنی بیع قبل القبض کی علت یہ ہے کہ ایسی صورت میں انسان ایسی چیز کا نفع حاصل کرتا ہے جو اس کے ضمان میں نہیں ہے، اور انسان اسی چیز کا ضمان قبول کرتا ہے جس میں اندیشہ ہلاکت ہو، زمین میں شاذ و نادر ہی اندیشہ ہلاکت رہتا ہے، پس اگر کوئی زمین لب دریا ہو یا بیع مکان کا اوپری حصہ ہو تو قبضہ سے پہلے اس کی بیع درست نہیں ہوگی، حضرت امام ابو حنیفہ اور ان کے ممتاز شاگرد امام ابو یوسف نے علت نہی کا اعتبار کرتے ہوئے بیع منقول میں علی الاطلاق قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا، عقار کی بیع میں چونکہ علت نہی نہیں پائی جاتی ہے اسلئے اسے جائز قرار دیا، البتہ اگر عقار کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں بھی علت غرر موجود ہو تو وہ بھی ناجائز قرار پائے گی۔

غرر کی تعریف اور حقیقت:

جناب نبی کریم ﷺ سے بیع غرر کی ممانعت ثابت ہے "غرر كالغوى مفهوم، خطر، دھوکہ کسی چیز کو معرض ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اصطلاح فقہاء میں غرر کی تعریف "ما يكون مستور العاقبة (مضبوط ۱۲/۱۹۳) سے کی گئی ہے، فقہاء احناف نے غرر کی یہ تعریف کی ہے:

"الغرر ما يكون مجهول العاقبة لا يدري أيكون أم لا (تعريفات ۱۳۱) بارتی نے غرر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "الغرر ما طوى عنك علمه" (العنايه ۵، ۱۹۲) غرر وہ ہے جس کا علم تم سے پوشیدہ ہو، صاحب "فتح القدير" نے بھی غرر کی یہی تعریف کی ہے (۱۳۶/۶)۔

امام قرانی مالکی نے لکھا ہے: ”اصل غرر یہ ہے کہ کسی چیز کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ وہ حاصل ہوگی یا نہیں؟ جیسے ہوا میں اڑنے والا پرندہ یا پانی میں مچھلی، اگر کوئی شخص فضا میں پرواز کرنے والے پرندہ یا پانی میں مچھلی کی بیج کرتا ہے تو یہ بیج غرر ہے، کیونکہ پرندہ یا مچھلی کا قبضہ میں آنا موہوم ہے۔“

علامہ ابن تیمیہ نے مجہول العاقبہ سے غرر کی تعریف کی ہے، علامہ ابن القیم کے نزدیک غرر سے مراد وہ چیز ہے جس کی سپردگی اور حواگی پر قدرت حاصل نہ ہو، چاہے وہ چیز موجود ہو یا معدوم، جیسے بھگوڑے یا سرکش اونٹ کی بیج۔

ان تعریفات کا خلاصہ یہ ہے کہ بیج غرر سے مراد وہ بیج ہے جس میں دھوکہ ہو اور دھوکہ فریقین میں سے کسی کو لاحق ہو جس سے اس کے مال کے ضیاع کا اندیشہ ہو۔

بیج غرر کے ممنوع ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہے، بیج غرر کی مختلف صورتیں ہیں، مثلاً جانور کے تھن میں دودھ کی بیج، جانور کی پشت پر بال اور اون کی بیج، جانور کے حمل کی بیج، پانی میں مچھلی اور فضا میں اڑنے والے پرندہ کی بیج میں غرر کثیر پایا جاتا ہے، اسلئے یہ بیج جائز نہیں ہے۔

البتہ غرر یسیر کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے، حنفیہ کے نزدیک ان چیزوں کی بیج درست ہے جن میں غرر یسیر ہوتا ہے، جیسے کیلا، اخروٹ، اور باقلاء کی بیج چھلکے کے ساتھ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک بھی غرر یسیر کی صورت میں بیج جائز ہے، غرر متوسط کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات نے اسے غرر یسیر کے ساتھ اور بعض فقہاء نے اسے غرر کثیر کے ساتھ شامل کیا ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۳۴۰)۔

## ۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے بارے میں علماء کی آراء اور ان کے دلائل:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت سے متعلق دو قسم کی احادیث ہیں، بعض احادیث میں مطلقاً قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے ممانعت کی گئی ہے، ان احادیث کا تقاضہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام ہے چاہے بیج منقول ہو یا بیج عقار، ہر دو صورت میں بیج پر قبضہ سے پہلے صرف طعام (کھانے کی اشیاء) کی بیج سے ممانعت کی گئی ہے، اب رہا یہ سوال کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی احادیث کو ممانعت پر محمول کرتے ہوئے ہر قسم کی بیج میں بیج قبل القبض کی ممانعت کا حکم لگایا جائے، یا مطلق احادیث کو مقید احادیث پر محمول کرتے ہوئے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کا حکم صرف بیج طعام کے ساتھ خاص رکھا جائے گا، فقہاء کی ایک جماعت نے مطلق احادیث کو مقید پر محمول کرتے ہوئے صرف بیج طعام کو قبضہ سے پہلے ممنوع قرار دیا، جبکہ بعض فقہاء نے دونوں قسم کی احادیث پر غرور و فکر کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ یہ احادیث معلول بالعلتہ ہیں، اور قبضہ سے پہلے بیج کی ممانعت کی علت غرر انفساخ عقد ہے یعنی اندیشہ ہلاکت کی وجہ سے عقد کے فسخ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے، لہذا جہاں بھی علت غرر پائی جائے گی وہاں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع ہوگی، اور جہاں یہ علت نہیں پائی جائے گی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست ہوگی۔

قبضہ سے پہلے بیج طعام کی ممانعت کے بارے میں اہل علم کا اجماع ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے ابن المنذر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

”أجمع أهل العلم على أن من اشترى فليس له أن يبيعه حتى يستوفيه“ (المغنی ۳/۱۲۲)۔

بیج طعام کے علاوہ دوسری چیزوں کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے بارے میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے، علامہ نووی نے المجموع شرح المہذب میں ائمہ کے چار مذاہب نقل کئے ہیں:

- ۱۔ بیج طعام ہی کی طرح قبضہ سے پہلے کسی بھی چیز کی بیج جائز نہیں ہے، حضرت امام شافعی اور حنفیہ میں سے امام محمد بن حسن شیبانی کی یہی رائے ہے۔
- ۲۔ مکلی اور موزونی اشیاء کے علاوہ قبضہ سے پہلے ہر چیز کی بیج جائز ہے، حضرت عثمان بن عفان، سعید بن المسیب، حسن، حکم، حماد، اوزاعی، احمد بن حنبل اور اسحاق کا یہی مسلک ہے۔
- ۳۔ مکانات اور اراضی کے علاوہ قبضہ سے پہلے کسی بھی چیز کی بیج جائز نہیں ہے، البتہ قبضہ سے پہلے مکانات اور اراضی کی بیج درست ہے، حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کی یہی رائے ہے۔
- ۴۔ ماکول (کھانے کی چیزیں) اور مشروب (پینے کی چیزیں) کے علاوہ قبضہ سے پہلے ہر چیز کی بیج درست ہے، امام مالک اور ثور کا یہی مسلک ہے، ابن المنذر نے اس رائے کو ”اصح المذاہب“ قرار دیا ہے (المجموع ۲/۲۷۰)۔



علامہ ابن قدامہ حنبلی نے فقیہ الہندی کی رائے یہ نقل کی ہے کہ ان کے نزدیک قبضہ سے پہلے ہر چیز کی بیع درست ہے، مگر علامہ ابن عبدالبر نے احادیث اور اجماع امت کی وجہ سے اس قول کو مردود قرار دیا ہے (المغنی ۱۲/۳)۔

وجوہ دلائل:

امام شافعی، محمد بن الحسن، ابن عقیل اور ان کے ہم خیال فقہاء نے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی کے عموم پر مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱۔ امام ابو داؤد نے حضرت زید بن ثابت سے یہ حدیث نقل کی ہے: ”ان رسول اللہ ﷺ نھی ان تباع السلع حیث تباع حتی یجوزھا التجار الی رحالہم“ (تکملة فتح الملہم ۱۰۳۵)۔ یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ جس جگہ سے سامان خرید جائے اسی جگہ سے فروخت کر دیا جائے، الا یہ کہ تجار اس سامان کو اپنے گھروں میں منتقل کر لے، تو پھر ایسی صورت میں بیع جائز ہوگی۔

اس حدیث میں مطلقاً قبضہ سے پہلے سامان فروخت کرنے سے ممانعت کی گئی ہے، قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی کو صرف بیع طعام کے ساتھ محدود نہیں رکھا گیا، امام شافعی اور ان کے ہم مسلک فقہاء نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے قبضہ سے پہلے ہر چیز کی بیع کو ممنوع قرار دیا ہے۔

۲۔ حکیم بن حزام سے مروی ہے کہ میں نے جناب نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میں مختلف چیزیں خریدتا ہوں تو اس میں سے میرے لئے حلال و حرام کی وضاحت فرمائیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بھائی کے بیٹے! قبضہ سے پہلے کسی چیز کو مت فروخت کرو، اور جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے قبضہ سے پہلے مت بیجو (حوالہ بالا)۔

اس حدیث میں بھی قبضہ سے پہلے مطلقاً بیع کی ممانعت کی گئی ہے۔

۳۔ عبداللہ بن عمرو سے منقول ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا یحل سلف و بیع و لا شرطان فی بیع و لا ربح مالہ یضمن و لا بیع مالیس عندک“۔

اس حدیث میں ”رج مال یضمن“ یعنی ایسی چیزوں پر نفع لینے سے منع کیا گیا ہے جو خریدار کے ضمان میں نہ آئی ہو، ”بیع مال یقبض“ کے فاسد اور ممنوع ہونے کی علت یہی ہے کہ اس میں ”رج مال یضمن“ لازم آتا ہے، جس کی ممانعت کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک بیع پر خریدار قبضہ نہ کر لے اس وقت تک بیع اس کے ضمان میں نہیں آئے گی، اگر وہ اسے قبل القبض فروخت کر دیتا ہے تو ”رج مال یضمن“ لازم آتا ہے جو شرعاً ممنوع ہے، حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے بھی انہیں دلائل سے استدلال کیا ہے، البتہ ان حضرات نے بیع عقار کو علت نہی کے نہ ہونے کی وجہ سے نہی کے عموم سے خارج کیا ہے، کیونکہ بیع عقار کی صورت میں علت نہی غرر انفساخ عقد نہیں پائی جاتی ہے، قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی صورت میں اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ کسی وجہ سے بیع بائع کے پاس ہلاک ہو جائے اور عقد کو فسخ کرنے کی نوبت آجائے، اس صورت میں اگر خریدار اس چیز کو فروخت کر کے نفع حاصل کرتا ہے، تو وہ ایسی چیز سے نفع حاصل کرنے والا قرار پائے گا جو اس کے ضمان میں نہیں آئی ہے، ایسی صورت کو حدیث میں ”رج مال یضمن“ سے تعبیر کیا گیا ہے، غور کیا جائے تو یہ علت غرر صرف بیع منقول کی صورت میں پائی جائے گی، کیونکہ منقولات میں اندیشہ ہلاکت کی وجہ سے غرر انفساخ عقد کا صرف احتمال ہی نہیں، بلکہ ظن غالب رہتا ہے، عقار میں اندیشہ ہلاکت شاذ و نادر ہی رہتا ہے، اس لئے غرر انفساخ عقد کا احتمال نہیں ہے، البتہ عقار میں بھی علت غرر کے پائے جانے کی صورت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست نہیں ہوگی، چنانچہ علامہ ابن الہمام نے بیع عقار کے جواز کی دلیل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

”والمانع المشیر للنہی وهو غرر الانفساخ بالہلاک منتف (فإن ہلاک العقار نادر) والنادر لا عبرة به ولا یبنی الفقہ باعتبارہ فلا یمنع الجواز“ (فتح القدیر ۶/۱۳۸)۔

اگر کوئی زمین لب دریا ہو اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ اس زمین کے دریا میں شامل ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں علت نہی کے پائے جانے کی وجہ سے قبضہ سے پہلے اس کی بیع درست نہیں ہوگی، قبضہ سے پہلے بیع عقار کا جواز حضرت عثمان اور طلحہ سے عملاً ثابت ہے (اعلاء السنن ۲۲۹/۱۳)۔



حنابلہ نے اپنے مسلک پر حضرت ابن عباس کی حدیث ”من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یستوفیہ“ سے استدلال کیا ہے، اسی طرح حضرت ابن عمر کی اس حدیث سے بھی حنابلہ نے استدلال کیا ہے کہ: ابن عمر کہتے ہیں کہ میں بیع میں دنانیر کے ذریعہ اونٹ فروخت کرتا تھا اور دنانیر کے عوض درراہم وصول کرتا، اسی طرح درراہم کے عوض اونٹ فروخت کرتا اور درراہم کی جگہ دنانیر وصول کرتا، میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: قیمت میں ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (تکملہ فتح الملہم ۱/۳۵۱)۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عمر نے قبضہ سے پہلے ثمن میں تصرف کیا اور آپ ﷺ نے اسے جائز قرار دیا، ثمن عوضین میں سے ایک عوض ہے، جب ثمن میں قبل القبض تصرف جائز ہے، تو بیع میں بھی قبل القبض تصرف جائز ہونا چاہئے، مگر چونکہ بیع طعام کی صورت میں قبضہ سے پہلے نبی وارد ہوئی ہے، اس لئے ہم بیع طعام کو قبل القبض جائز نہیں مانتے ہیں۔

مگر حنابلہ کا حضرت ابن عمر کی حدیث سے استدلال اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ اس حدیث میں صرف استبدال ثمن کا تذکرہ ہے قبضہ سے پہلے، ثمن کی بیع کا تذکرہ نہیں ہے، اور استبدال ثمن کے جواز میں حنفیہ کا بھی اتفاق ہے، کیونکہ اس میں اندیشہ ہلاکت کی وجہ سے غرر انفساخ عقد نہیں پایا جاتا ہے۔

مالکیہ نے ابن عمر کی مندرجہ ذیل روایت سے استدلال کیا ہے: ”من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یقبضہ“، رواہ البخاری، ان ہی سے دوسری روایت منقول ہے: ”لقد رأیت الناس فی عهد رسول اللہ ﷺ یتبايعون جزافاً یعنی الطعام، فضر بوا أن یبيعوه فی مکافئہم حتی یؤووه إلی رحالہم“۔ اسی طرح حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے: ”أما الذی نھی عنہ النبی ﷺ فهو الطعام أن یباع حتی یقبض، قال ابن عباس: وأحسب کل شیء مثله“ (حوالہ سابق)۔

مالکیہ کا کہنا ہے کہ ان احادیث میں قبضہ سے پہلے بیع طعام کی صراحت اس بات کی دلیل ہے کہ غیر طعام کی بیع قبضہ سے پہلے درست ہوگی، مالکیہ کے نزدیک قبضہ سے پہلے بیع طعام کی نہی کی علت یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بسا اوقات ربا النسبیہ کا ذریعہ بن جائے گا اس لئے سداً للذریعۃ اسے ممنوع قرار دیا گیا، حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک علت نہی غرر ہے۔

## ۶۔ قبضہ سے پہلے مال فروخت کرنا:

سوال سے واضح ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی فیکٹری کے مالک سے مال خریدتا ہے اور اس پر قبضہ سے پہلے اور سامان کو اپنی تحویل میں لینے سے پہلے ہی اسی سامان کو کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، جس وقت اس نے اپنے خریدے ہوئے مال کا معاملہ دوسرے شخص سے طے کیا، اس وقت سامان اس کے قبضہ میں نہیں آیا تھا، اور قبضہ میں نہیں آنے کی وجہ سے اس کے ضمان میں بھی نہیں آیا، بلکہ بائع اول ہی کے قبضہ و ضمان میں رہا، پھر جب اس نے مشتری ثانی سے معاملہ طے کر لیا تو بائع اول فیکٹری کے مالک سے یہ کہا کہ میں نے جو سامان خریدا ہے وہ سامان براہ راست میرے پاس بھیجنے کے بجائے مشتری ثانی کے پاس روانہ کر دو، تو جب سامان بائع اول کی ملکیت اور قبضہ سے نکل کر مزدور کے حوالہ یا سامان اٹھانیوالی گاڑی پر رکھا گیا، تو یہ سامان بائع اول کے ضمان سے نکل کر مشتری اول کے ضمان میں داخل ہو گیا اور جب تک مشتری ثانی اس پر قبضہ نہ کرے اسی کی ضمان میں رہے گا، ایسی صورت میں چونکہ معاملہ طے کرتے وقت ”مال“ مشتری اول کے قبضہ میں نہیں تھا (اگرچہ بعد میں آ گیا) اس لئے یہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی صورت ہے جس میں ربح الم یضمن لازم آتا ہے جو شرعاً ممنوع ہے، لہذا میرے نزدیک یہ عقد معاملہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے، اگر مشتری اول کی اجازت اور رضامندی سے مشتری ثانی اس پر قبضہ کر لے تو اس کا مالک قرار پائے گا، اور اس پر تصرف کرنا اس کے لئے جائز ہوگا۔

ہدایہ میں ہے: ”وإذا قبض المشتري المبیع فی البیع الفاسد بأمر البائع وفي العقد عوضان کل واحد منهما مال ملکت المبیع“ (هدایہ علی هامش فتح القدیر ۶/۹۲)۔

البتہ اگر یہ شکل ہو کہ خریدار اول بائع اول مالک کی فیکٹری سے مال خرید لے، اور مالک فیکٹری اس کے درمیان اور مال کے درمیان تخلیہ کر دے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کر سکے، تو محض تخلیہ کی وجہ سے بھی اس کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا، یا قبضہ حکمی کسی اور طرح ہو جائے اس کے بعد خریدار اول

دوسرے کے ہاتھ مال فروخت کرے تو یہ صورت بلاشبہ جائز ہوگی۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت کی ایک مخصوص صورت:

سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں شیپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے اور فروخت کیا ہوا مال اس کے قبضہ اور ضمان سے نکل جاتا ہے، اس صورت میں اگر درمیان میں مشتری تک پہنچنے سے پہلے مال ضائع ہو جائے تو بائع اس کا ضامن نہیں ہوتا ہے، گویا صورت مسئلہ یہ ہوئی کہ ایک شخص نے کسی کے ہاتھ اپنا سامان فروخت کیا، سامان کی فروختگی کے بعد اس نے مشتری کی ہدایت کے مطابق مال بردار جہاز کے حوالہ سامان کر دیا، لہذا اب وہ سامان اس کے قبضہ و ضمان سے نکل کر مشتری کے قبضہ و ضمان میں داخل ہو جائے گا، میرے نزدیک جہاز کے عملہ کا قبضہ جن کی حیثیت مشتری کے اجیر کی ہے مشتری جو مستاجر ہے، کا قبضہ قرار پائے گا، اور اس طرح سے وہ سامان مشتری اول کے قبضہ و ضمان میں آجائے گا، مملوک اور مقبوض ہونے کی وجہ سے اس سامان پر مشتری اول کو تصرف کا حق حاصل ہوگا، چاہے وہ اسے فروخت کر دے یا کسی کو ہبہ کر دے۔

پس جب مشتری اول نے جہاز پر سوار مال کو مقبوض و مملوک ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت نہیں ہوگی بلکہ بیع مملوک و مقبوض ہونے کی وجہ سے جائز و درست ہوگی، اور معاہدہ بیع کے مکمل ہو جانے کے بعد جب مشتری اول مشتری ثانی سے مال کی قیمت وصول کر کے اپنی ملک و قبضہ ختم کر دے گا تو اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ جہاز کا عملہ مشتری ثانی کے اجیر ہو گئے اور اب ان کی اجرت کی ادائیگی مشتری ثانی کے ذمہ واجب ہوگی، اور جہاز کے عملہ کا اس مال پر قبضہ مشتری ثانی کا قبضہ تصور کیا جائے گا اور جب مشتری ثانی کا قبضہ اس پر تسلیم کر لیا گیا تو مال بھی اس کے ضمان میں آ گیا، لہذا اگر مشتری ثانی کے مال وصول کرنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو مشتری ثانی کا مال ضائع ہوگا، نہ کہ مشتری اول کا، فتاویٰ ہندیہ میں اجیر کے قبضہ کو مستاجر کا قبضہ تسلیم کیا گیا ہے۔

”إلا أن يقول استأجر على من يحملة، فقبض الأجير يكون قبض المشتري“ (فتاویٰ ہندیہ ۱۹، ۲۰)۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام

مفتی جنید عالم ندوی قاسمی ط

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شرعی حکم:

تقریباً تمام فقہاء کرام قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو کسی نہ کسی درجہ میں ناجائز کہتے ہیں، البتہ یہ بیع فاسد ہے یا باطل اس سلسلہ میں حکم شرعی بیان کرنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ حنفیہ کے علاوہ جمہور فقہاء بیع باطل اور بیع فاسد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک بیع جب تک صحیح نہ ہو اس وقت تک بیع کے اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے کتابوں میں اس خاص مسئلہ میں جمہور کا مسلک بیان کرتے ہوئے ”ولای یجوز“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ”الموسوعة الفقهية“ میں ہے:

”وعند الجمهور وهم لا يفرقون بين الفاسد والباطل في الجملة۔ هو ما لم يترتب اثره عليه، فلم يشمر ولم تحصل به فائدته من حصول الملك۔ (یری جمہور الفقہاء المالکیة والشافعیة والحنابلة) أنه لا فرق بين البیع الفاسد والبیع الباطل، فهما مترادفات، لأن كلا من البیع الفاسد والباطل وقع على خلاف ما طلبه الشارع، ولذلك لم يعتبره، ولم يترتب عليه الأثر الذي رتبته على البیع الصحيح من حصول الملك وحل الانتفاء (الموسوعة الفقهية ۹۵۲، ۵۳)۔  
البتہ فقہاء احناف بیع فاسد اور بیع باطل کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیع باطل وہ بیع ہے جو نہ اصلاً مشروع ہو اور نہ ہی وصفاً۔ اور بیع فاسد وہ بیع ہے جو اصلاً مشروع ہو، لیکن وصفاً مشروع نہ ہو۔ اصل سے مراد یہ ہے کہ بیع کے ارکان (ایجاب و قبول) میں کوئی خلل ہو مثلاً: عاقدین میں ایجاب و قبول کی اہلیت نہ ہو۔ جیسے کوئی مجنون یا کوئی غیر عقل بچہ ایجاب و قبول کرے تو یہاں پر بیع کے ارکان ایجاب و قبول ہی میں خلل ہے۔ یا محل، یعنی بیع میں کوئی خلل ہو، مثلاً: بیع مردار یا خنزیر یا خون یا شراب ہو تو دونوں صورتوں میں بیع باطل ہے۔ اور وصف سے مراد یہ ہے کہ بیع کے رکن اور محل کے علاوہ کسی دوسری چیز میں خلل ہو، مثلاً: شراب کے عوض میں کوئی چیز خریدی جائے، تو یہاں پر ثمن میں خلل ہے۔ یا بیع غیر مقدور تسلیم ہو۔ یا کوئی ایسی شرط لگادی جائے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو تو ان صورتوں میں بیع فاسد ہوگی، نہ کہ باطل۔

فقہاء احناف نے بیع باطل اور بیع فاسد کے درمیان فرق کرنے کے لئے ایک ضابطہ بیان کر دیا ہے کہ..... جب عوضین میں سے کوئی ایک کسی بھی دین سماوی میں مال نہ ہو تو اس کی بیع باطل ہے خواہ وہ بیع ہو یا ثمن، لہذا مردار، خون اور آزاد شخص کی بیع باطل ہے۔ اس لئے کہ یہ اشیاء کسی بھی دین سماوی میں مال نہیں ہیں۔ اور اگر عوضین میں سے کوئی ایک کسی دین سماوی میں مال ہے اور کسی میں نہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر اس کو بیع بناتے ہیں تو اس کی بیع باطل ہے، اور اگر ثمن بناتے ہیں تو اس کی بیع فاسد ہے۔ مثلاً: اگر شراب کو درہم و دنانیر یا روپے پیسے کے عوض میں فروخت کرتے ہیں تو ایسی صورت میں شراب کا بیع ہونا متعین ہو جائے گا اور اس کی بیع باطل ہوگی، اور اگر شراب کے عوض میں کوئی چیز خریدتے ہیں تو اس کی بیع فاسد ہوگی۔

”وكل ما أورث خللاً في ركن البیع فهو مبطل وما أورثه في غيره فمفسد... (در مختار) (وقوله في ركن البیع) هو الإيجاب والقبول بأن كان من مجنون أو صبي لا يعقل... أو في محله أعني المبيع، فإن الخلل فيه مبطل، بأن كان المبيع ميتة أو دماً أو حراً أو خمرًا كما في ط عن البدائع (قوله وما أورثه في غيره) أي في غير الركن، وكذا في غير المحل وذلك بأن كان في الثمن بأن يكون خمرًا مثلاً أو بأن كان من جهة كونه غير مقدور التسليم أو فيه شرط مخالف لمقتضى العقد، فيكون البیع بهذا الصفة فابداً لا باطلاً لسلامة ركنه و محله عن الخلل... وبه

ط صدر مفتی امارت شرعیہ پھلوا ری شریف پٹنہ۔



ظهر أن الوصف ما كان خارجاً عن الركن والمحل (تنبيه) في شرح مسكين ثم الضابط في تمييز الفاسد من الباطل إن أحد العوضين إذا لم يكن ما لا في دين سماوي فالبيع باطل سواء كان مبيعاً أو ثمناً فبيعه الميتة والدم والحر باطل، وكذا البيع به وإن كان في بعض الأديان ما لا دون البعض إن أمكن اعتباره ثمناً فالبيع فاسد فبيعه العبد بالخمر أو الخمر بالعبد فاسد وإن تعين كونه مبيعاً فالبيع باطل فبيعه الخمر بالدرهم أو الدرهم بالخمر باطل“ (رد المحتار ۳۰۱۰۰)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جمہور فقہاء کے نزدیک قبضہ سے قبل بیع ناجائز ہے۔ بیع صحیح کے احکام و اثرات (ملکیت و انتفاع) اس پر مرتب نہیں ہوں گے، البتہ فقہاء احناف کے نزدیک چونکہ نہ تو بیع کے ارکان میں کوئی خلل ہے اور نہ ہی بیع میں، بلکہ یہ خلل خارج میں ہے، اس لئے یہ بیع فاسد ہوئی نہ کہ باطل۔ بیع باطل میں سرے سے بیع ہوتی ہی نہیں۔ بیع کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوتے ہیں۔ قبضہ کی وجہ سے نہ تو فروخت کرنے والا ثمن کا مالک ہوتا ہے اور نہ خریدار بیع کا۔ البتہ بیع فاسد میں قبضہ کی وجہ سے بائع ثمن کا اور مشتری بیع کا مالک ہو جاتا ہے۔ لہذا قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں خریدار قبضہ کے بعد بیع کا مالک ہو جائے گا اور اس کے لئے دوسروں سے فروخت کرنا جائز ہوگا۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے متعلق فقہاء کے اقوال:

قبضہ سے قبل کن اشیاء کی بیع جائز ہے اور کن اشیاء کی ناجائز؟ اور عدم جواز کا حکم عام ہے یا خاص؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ متفق علیہ قول:

اس پر تقریباً تمام فقہاء متفق ہیں کہ طعام کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے۔ اس میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ”الموسومہ“ میں ”شرح کبیر“ کے حوالہ سے ابن المنذر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ طعام کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔

”ويقول ابن المنذر: أجمع أهل العلم على أن من اشترى طعاماً فليس له أن يبيعه حتى يستوفيه“ (الموسومة

الفقهية ۹۰۱۳۷)۔

البتہ علامہ ابن قدامہ الحنبلی نے ”المغنی“ میں عثمان البتی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہر چیز کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ گویا کہ البتی کے نزدیک طعام کی بیع بھی قبضہ سے قبل جائز ہے۔ البتی کے اس قول کے متعلق علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ قول احادیث نبویہ اور متفق علیہ دلائل کی روشنی میں مردود ہے اور ایسا لگتا ہے کہ حرمت والی حدیث ”البتی“ تک نہیں پہنچی تھی۔ اس جیسے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

”ولم اعلم بين أهل العلم خلافاً، إلا ما حكى عن البتي أنه قال: لا بأس ببيع كل شيء قبل قبضه، وقال ابن عبد

البر: وهذا قول مردود بالسنة والحجة المجمع على الطعام، وأظنه لم يبلغه هذا الحديث، ومثل هذا لا يلتفت إليه“

(المغنی ۳۰۱۳۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ طعام کی بیع قبضہ سے قبل ناجائز ہے۔ اس میں سوائے ایک مردود اور ناقابل اعتناء قول کے کسی بھی اہل علم کا اختلاف نہیں ہے۔ البتہ طعام کے علاوہ دیگر اشیاء کی خرید و فروخت قبضہ سے قبل جائز ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

۲۔ شافعیہ کا مسلک:..... اس مسئلہ میں شوافع کا مسلک یہ ہے کہ قبضہ سے قبل کسی چیز کی بیع ناجائز نہیں ہے، خواہ وہ منقول ہو یا غیر منقول اور اگرچہ بائع کی

اجازت دینے اور ثمن پر قبضہ کر لینے کے بعد ہو۔ امام شافعی ”کتاب الام“ میں تحریر فرماتے ہیں: ”(قال الشافعي) وبهذا نأخذ فمن ابتاع شيئاً

كائناً ما كان فليس له أن يبيعه حتى يقبضه“ (كتاب الام ۳۰۶۰)، ”تحفة المحتاج“ میں ہے: ”ولا يصح بيع المبيع قبل قبضه“ اس

کی شرح ”شرح منہاج“ میں ہے: ”(قوله ولا يصح بيع المبيع) قال في شرح الروض أي والمغني وإن أذن البائع وقبض

الشمن“ (تحفة المحتاج مع شرح المنہاج ۳۰۴۰۱)۔

## شافعیہ کے دلائل:

شافعیہ کے دلائل وہ روایات ہیں جن میں مطلقاً قبضہ سے قبل بیع کی بیع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں حکیم ابن حزام کی روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ میں چیزوں کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔ ان میں سے کوئی چیز میرے لئے حلال ہے اور کون سی چیز حرام، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”یا ابن اخی! إذا اشتریت منها بیعا فلا تبعه حتی تقبضه، یعنی جب تم کوئی چیز خریدو تو اس پر قبضہ کرنے سے قبل فروخت نہ کرو (مصنف عبدالرزاق ۳۹۸)۔“

حکیم بن حزام ہی کی روایت نسائی شریف میں ہے کہ: حضور اکرم ﷺ نے غیر موجودی کی بیع سے منع فرمادیا ہے (نسائی ۲۲۵)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جو چیز اپنے ضمان میں نہ ہو اس سے نفع حاصل کرنا حلال نہیں ہے۔ یہ روایت نسائی اور ترمذی میں ہے۔

شوافع فرماتے ہیں کہ بیع پر قبضہ سے قبل بیع کرنا ”بیع مالیس عندک“ اور ”ربح مالہ یضمن“ ہے جس کی ممانعت احادیث میں آئی ہے۔ شوافع کی ایک دلیل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا وہ قول بھی ہے جس کو امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں نقل کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: ”أما الذی نھی عنہ النبی ﷺ فهو الطعام أن یباع حتی یقبض قال ابن عباس ولا أحسب کل شیء إلا مثله“ (بخاری ۱۰۲۸۶)، یعنی حضور ﷺ نے طعام کی بیع قبضہ سے قبل کو منع فرمایا، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ہر چیز کو طعام ہی کے مثل سمجھتا ہوں۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس طعام کی طرح ہر چیز کی بیع کو قبضہ سے قبل ناجائز سمجھتے تھے۔

شوافع کی عقلی دلیل یہ ہے کہ قبضہ سے قبل بیع پر مشتری کی ملکیت کمزور ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بیع قبضہ سے قبل ہلاک ہو جائے تو بیع ختم ہو جائے گی۔ اور جب ملکیت کمزور ہے تو اس کی بیع جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ درحقیقت غیر مملوک کی بیع ہوگی جس کی ممانعت احادیث میں موجود ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر قبضہ سے قبل بیع کو جائز قرار دیتے ہیں تو شے واحد پر دو شخصوں کا ضمان لازم آتا ہے۔ ایک تو بائع اول ضامن ہے، اور دوسرا مشتری اول، مشتری ثانی کے لئے ضامن ہوگا، اور یہ صحیح نہیں ہے۔

”وعلتہ ضعف الملك لانفساخہ بتلفہ کما مر، وقیل: اجتماع الضمانین علی شیء واحد إذ لو صح لضمنه المشتري أيضا للثانی قبل قبضہ، فیکون مضمونا له وعلیه“ (تحفة المحتاج ۲۰۲۰۱)۔

## ۳۔ مالکیہ کا مسلک:

مالکیہ کے نزدیک صرف طعام کی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے۔ خواہ طعام ربوی ہو، جیسے گےہوں، یا غیر ربوی ہو، جیسے پھل۔ طعام کے علاوہ دیگر تمام اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے۔ مالکیہ کے نزدیک طعام کی بیع قبضہ سے قبل ناجائز ہے۔ اس کے لئے بھی دو شرطیں ہیں:

طعام کسی چیز کے عوض میں لیا گیا ہو۔ مثلاً اجارہ یا شراء یا صلح کے ذریعہ حاصل ہو۔ ایسی صورت میں طعام کی بیع قبضہ سے قبل ناجائز ہے۔ اگر بغیر کسی عوض کے حاصل ہو، مثلاً ہبہ یا وراثت میں ملا ہو تو ایسی صورت میں قبضہ سے قبل بھی طعام کی بیع جائز ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ناپ کر یا تول کر یا گن کر کے طعام کو حاصل کیا ہو۔ اس صورت میں قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں ہے، خواہ وہ دوسروں کو کیل کر کے فروخت کرے یا اندازہ سے۔ اگر کیل یا وزن یا گن کر کے طعام حاصل نہیں کیا، بلکہ اندازہ سے حاصل کیا تو ایسی صورت میں قبضہ سے قبل بھی اس کی بیع جائز ہے، خواہ وہ دوسروں کو کیل کر کے فروخت کرے یا اندازہ سے۔ ”الموسوعة الفقہیہ“ میں مذہب مالکیہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

”ومذہب المالکیة أن المحرم المفسد للبیع، هو بیع الطعام دون غیره من جمیع الأشياء قبل قبضہ سواء أ کان الطعام ربویا کالقمح أم غیر ربوی کالتفاح عندہم۔“

أما غیر الطعام فیجوز بیعہ قبل قبضہ... لکنہم شرطوا فساد هذا النوع من البیع شرطین:



الف: أن يكون الطعام مأخوذاً بطريق المعاوضة أى في مقابلة شئ بإجارة أو شراء أو صلح أو إرث جنابة أو آل لامرأة في صداقها أو غير ذلك من المعاوضات، فهذا الذى لا يجوز بيعه قبل قبضه۔  
أما لو صار إليه الطعام بهبة أو ميراث مما ليس أخذه بعوض فيجوز بيعه قبل قبضه۔

ب: وأن تكون المعاوضة بالكيل أو الوزن أو العدد فيشترطه بكيل وبيعه قبل قبضه سواء باعه جزافاً أم على الكيل أما لو اشتراه جزافاً ثم باعه قبل قبضه فيكون بيعه جائزاً سواء باعه جزافاً أم على الكيل (الموسوعة الفقهية ۹: ۱۲۶)۔

مالکیہ کے دلائل:..... ان کے دلائل وہ تمام روایات ہیں جن میں صراحت کے ساتھ طعام کی بیع قبضہ سے قبل ممنوع قرار دی گئی ہے۔ یہ روایات بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں۔ بعض روایات میں ”قبل قبضہ“ اور بعض روایات میں ”قبل أن يستوفيه“ کا جملہ آیا ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ ”طعام“ کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ طعام کے ماسوا کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے، ورنہ تخصیص کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت والی روایات بعض تو مطلق ہیں اور بعض مقید۔ شوافع نے مقید کو مطلق پر محمول کیا ہے اور مالکیہ نے مطلق کو مقید پر۔ شوافع اور مالکیہ کے مابین اختلاف کی اصل وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔

### ۴۔ حنابلہ کا مسلک:

اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبل سے متعدد روایتیں منقول ہیں۔ ان میں سے دو مشہور روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ کسی چیز کی بھی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن عقیل نے اختیار کیا ہے۔

۲۔ صرف طعام کی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے۔ علامہ ابن قدامہ نے اس روایت کو اظہر الروایتین قرار دیا ہے۔ علامہ ابن قدامہ ”المغنی“ میں امام احمد بن حنبل کے مسلک کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وأما غير ذلك فيجوز بيعه قبل قبضه في أظهر الروایتین... وعن أحمد رواية أخرى: لا يجوز بيعه شيء قبل قبضه اختارها ابن عقیل“ (المغنی ۴: ۱۲۴)۔

حنابلہ کے دلائل: امام احمد بن حنبل کا ایک قول شوافع کے مطابق ہے، اور ایک قول مالکیہ کے مطابق ہے، لہذا ان کے دلائل بھی وہی ہوں گے جو شوافع اور مالکیہ کے ہیں۔

حنفیہ کا مسلک:..... اس مسئلہ میں حنفیہ کے مابین اختلاف ہے۔ امام محمد اور ایک قول کے مطابق امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ تمام اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے، خواہ وہ منقولی ہوں یا غیر منقولی۔ منقولی اشیاء کی طرح زمین و جائداد کی بیع بھی قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ اور راجح قول کے مطابق امام ابو یوسف یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ غیر منقولی اشیاء مثلاً زمین کی بیع قبضہ سے قبل بھی جائز ہے۔

### امام محمد کے دلائل:

اس سلسلہ میں امام محمد کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

الف: قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت سے متعلق روایات مطلق اور عام ہیں۔ ان میں منقولی اور غیر منقولی تمام اشیاء شامل ہیں، نیز غیر مضمون اشیاء سے نفع حاصل کرنے کی ممانعت احادیث میں آئی ہے۔ اور منقول اشیاء کی طرح زمین و جائداد بھی قبضہ سے قبل غیر مضمون ہیں۔ مشتری کے ضمان میں زمین نہیں آئی ہے، لہذا مشتری کے لئے اس سے انتفاع جائز نہیں ہوگا۔

ب: عین شے کی ملکیت عقد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور اس میں تصرف کی ملکیت قبضہ کے ذریعہ۔ اور عقد کے ذریعہ عین کی ملکیت حاصل ہونے میں عقار اور منقول دونوں برابر ہیں۔ لہذا قبضہ کے ذریعہ تصرف کی ملکیت حاصل ہونے میں بھی عقار اور منقول دونوں برابر ہوں گے۔

ج: بیع کے جواز کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بیع مقدوراً تسلیم ہو۔ بائع بیع کو مشتری کے حوالہ کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ اور جب غیر منقولی اشیاء قبضہ میں نہ



ہوں تو بائع ان کو مشتری کے حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہوگا، اس لئے وہ شے نہ تو اس کے قبضہ میں ہے اور نہ ہی اس کے نائب کے قبضہ میں، اگر نائب کے قبضہ میں ہوتی تو بھی مشتری کے حوالہ کر سکتا تھا، جہاں تک بائع اول کے قبضہ کا سوال ہے تو وہ مشتری اول کا نائب نہیں ہے۔

### شیخین کے دلائل:

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے دلائل یہ ہیں کہ بیع کے ارکان ایجاب و قبول بھی صحیح ہیں، اس لئے کہ اپنے اہل عاقل، بالغ کی طرف سے صادر ہوئے ہیں اور ایجاب و قبول کا محل بھی صحیح ہے، اس لئے کہ وہ مال مملوک ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ قبضہ سے قبل بھی بیع صحیح ہو، البتہ منقول اور عقار دونوں میں فرق یہ ہے کہ منقول اشیاء میں قبضہ سے قبل یہ اندیشہ ہے کہ بیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے بیع ختم ہو جائے اور مشتری کو بیع نہ مل سکے اس طرح مشتری کو دھوکہ ہوگا، اور روایات میں دھوکہ کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ ایسا غرر و دھوکہ ہے جس سے احتراز ممکن ہے۔ جہاں تک غیر منقول اشیاء کی بات ہے تو ان میں اس طرح کے دھوکہ کا امکان کم ہے۔ ان میں بیع کے ہلاک ہونے کا اندیشہ شاذ و نادر ہے جس کا اعتبار نہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اگر زمین ایسی جگہ میں ہو جہاں پر ضائع اور برباد ہونے کا اندیشہ غالب ہو، مثلاً دریا اور سمندر کا کنارہ ہو، پانی یاریت کے غالب آ جانے کی وجہ سے زمین کے برباد ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی جگہ میں زمین یا دیگر عقار کی بیع بھی قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے۔ اب رہا یہ اندیشہ کہ بیع کے بعد کوئی مستحق شخص نکل آئے تو اس کی وجہ سے بھی بیع ختم ہو جائے گی اور مشتری کو دھوکہ ہوگا تو یہ اندیشہ قبضہ کے بعد بھی ہے۔ اس طرح کے غرر اور دھوکہ سے بچنا ممکن نہیں ہے، لہذا اس کا اعتبار نہیں۔ عقار کی بیع قبضہ سے قبل بھی جائز ہے۔ اس کی مزید دلیل یہ ہے کہ شفیق کو قبضہ سے قبل بھی حق شفیعہ حاصل ہے اور وہ بدل دے کر خریدی ہوئی جائداد کا مالک ہو جائے گا۔ جب وہ بدل دے کر بیع کو لے لے گا تو مشتری کا حق ختم ہو جائے گا۔ اگر عقار پر قبضہ سے قبل بدل کے ذریعہ اس کے مالک بنانے کا احتمال نہ ہوتا تو شفیق کو قبضہ سے قبل حق شفیعہ حاصل نہیں ہوتا۔

شیخین کے مسلک پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ممانعت والی روایات تو مطلق اور عام ہیں۔ ان میں منقول اور غیر منقول کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ اور آپ قیاس کے ذریعہ یہ فرق کر رہے ہیں جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ روایات عام خص منہ البعض ہیں، اس لئے کہ چند چیزیں ایسی ہیں جن میں قبضہ سے قبل بھی تصرف صحیح ہے۔ مثلاً ثمن یا مہر یا بدل صلح یا بدل خلع۔ ان میں بالاتفاق قبضہ سے قبل تصرف جائز ہے۔ اور احناف کے نزدیک وہ روایات جو عام خص منہ البعض ہوں ان کی تخصیص قیاس کے ذریعہ بھی جائز ہے۔

### دیگر فقہاء کے دلائل کے جوابات:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے جو دلائل ہیں ان کے جوابات شیخین کی جانب سے دیے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

امام مالک کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ روایات میں طعام کی تخصیص ہے، لہذا طعام کے علاوہ دیگر اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہوگی، ورنہ اس تخصیص کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شے کی تخصیص ماسوا کی نفی نہیں کرتی ہے، احناف کے نزدیک نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں ہے۔ طعام والی روایات کے مقابلہ میں دوسری روایات بھی ہیں جو عام ہیں، جن کا ذکر شوافع کے دلائل کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ جہاں تک ان عام روایات کا تعلق ہے جن سے شوافع، حنابلہ اور امام محمد نے استدلال کیا ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ وہ روایات ”معلول بالعلۃ“ ہیں غرر کے ساتھ، جن جگہوں پر قبضہ سے قبل بیع کرنے میں ایسا غرر اور دھوکہ لازم آئے جس سے احتراز ممکن ہو تو وہاں پر قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں ہوگی اور جہاں پر اس طرح کا غرر شاذ و نادر ہو یا احتراز ناممکن ہو وہاں پر بیع جائز ہوگی۔ جیسا کہ ثمن، مہر، اسی طرح بدل صلح، بدل خلع، اور میراث میں قبضہ سے قبل تصرف جائز ہے، اس لئے کہ ان میں غرر اور دھوکہ کا امکان نہیں ہے۔ اگر ثمن یا مہر یا بدل صلح اور بدل خلع متعین ہوں تو بھی ان کے ہلاک ہونے کے بعد بیع ختم نہیں ہوگی بلکہ ان کی قیمت واجب الادا ہوگی۔

جہاں تک امام محمد کی اس دلیل کا تعلق ہے کہ قبضہ کے بعد بیع مشتری کے ضمان میں آتی ہے۔ اسی طرح قبضہ کے بعد ہی وہ بیع کو مشتری کے حوالہ کر سکتا ہے، اس سے قبل نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیع میں تصرف کی اجازت حاصل ہونے کے لئے ملکیت شرط ہے نہ کہ ضمان۔ اگر ملکیت ثابت ہے تو تصرف کی اجازت ہے گرچہ وہ شے ضمان میں نہ آوے۔ جیسا کہ شے موہوب پر قبضہ کر لینے کے بعد موہوب کو اس میں تصرف کی اجازت ہے، حالانکہ وہ شے اس کے ضمان میں نہیں آتی ہے۔ اسی طرح مشتری کے حوالہ کرنے پر قدرت دوسروں کے ذریعہ بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جبکہ دوسرا کوئی روکاوٹ پیدا نہ کرے (احناف کے مسلک اور ان کے دلائل کی تفصیل کے لئے دیکھئے: بنایہ مع ہدایہ ۶/۵۰۷، ۵۰۹، تبیین الحقائق ۳/۷۹، ۸۱، مبسوط للسخری ۷/۸۰، ۸۱)۔

قول راجح: ..... تمام دلائل پر غور کرنے کے بعد شیخین، یعنی امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف کا قول راجح اور اقرب الی الفقہ معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ شیخین کے دلائل اور دیگر فقہاء کرام کے دلائل کے جوابات سے واضح ہے۔

ایک ضابطہ:

کن چیزوں میں قبضہ سے قبل تصرف جائز ہے اور کن چیزوں میں جائز نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء احناف اور فقہاء حنابلہ نے ایک ضابطہ بیان کیا ہے کہ: ہر وہ عوض جو کسی عقد کے ذریعہ حاصل ہو قبضہ سے قبل اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں عقد ختم ہو جائے تو اس عوض میں قبضہ سے قبل تصرف جائز نہیں ہے، جیسے بیع یا اجرت، جبکہ وہ متعین ہو۔ اور اگر قبضہ سے قبل اس کے فوت ہونے سے عقد ختم نہ ہو تو اس میں تصرف قبضہ سے قبل بھی جائز ہے، جیسے مہر کی رقم، یا بدل خلع، یا عتق علی مال ہے۔

”وفی الإيضاح كل عوض ملك بعقد يفسخ العقد فيه بهلاكه قبل القبض لم يجز التصرف فيه كالمبيع والأجرة إذا كانت عينا وبدل الصلح إذا كان معيناً وما لا يفسخ العقد بهلاكه فالتصرف فيه جائز قبل القبض كالمهر وبدل الخلع والعتق على مال وبدل الصلح“ (بنایہ ۶۰۸، المغنی ۴۰۱۲۸)۔

حنفیہ میں امام محمد نے اس سلسلہ میں ایک دوسرا ضابطہ بیان کیا ہے کہ:

ہر وہ تصرف جو قبضہ کے بغیر تام و مکمل نہ ہو تو اس میں قبضہ سے قبل بھی تصرف جائز و درست ہے۔ مثلاً ہبہ، صدقہ، رہن اور قرض ہے۔ اگر مشتری بیع پر قبضہ سے قبل ہی اس کو ہبہ کر دے یا رہن رکھ دے یا کسی کو قرض دیدے یا صدقہ کر دے تو یہ جائز ہوگا، اس لئے کہ یہ عقود بغیر قبضہ کے مکمل نہیں ہوتے، جب موہوب قبضہ کرے گا تو وہ واہب کا (خریدار کا) نائب ہوگا، اس حیثیت سے وہ اولاً واہب کے لئے قبضہ کرے گا پھر اپنے لئے۔ ایسی صورت میں مشتری کا تصرف درحقیقت قبضہ کے بعد سمجھا جائے گا۔

اور ہر وہ تصرف جو قبضہ کے بغیر بھی مکمل ہو جائے اس میں قبضہ سے قبل تصرف جائز نہیں ہے، مثلاً بیع یا اجارہ ہے۔ ان میں قبضہ سے قبل تصرف اس لئے جائز نہیں ہے کہ مشتری ثانی کا قبضہ مشتری اول کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ تصرف قبضہ پر موقوف نہیں ہے۔ اب جب مشتری اول فروخت کر رہا ہے تو گویا کہ قبضہ سے پہلے بیع میں تصرف کر رہا ہے جو جائز نہیں ہے۔

”ثم قال محمد: كل تصرف لا يتم إلا بالقبض كالهبة والصدقة والرهن والقرض فهو جائز؛ لأنه يكون نائباً عنه ثم يصير قابضاً لنفسه... لأن الهبة لما كانت لا تتم إلا بالقبض صار الموهب له نائباً عن الواهب وهو المشتري الذي وهبه المبيع قبل قبضه، ثم يصير قابضاً لنفسه، فتم الهبة بعد القبض بخلاف التصرف الذي يتم قبل القبض كالمبيع مثلاً. فإنه لا يجوز؛ لأنه إذا قبضه المشتري الثاني لا يكون قابضاً عن الأول لعدم توقف البيع على القبض فيلزم منه تملك المبيع قبل قبضه وهو لا يصح“ (شامی ۴۰۱۲۴، ۱۲۳)۔

کیا قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں؟

اوپر کے بیان سے یہ واضح ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق احادیث ”معلول بالعلتہ“ ہیں۔ اس لئے کہ بعض چیزوں میں قبضہ سے قبل تصرف کی اجازت خود روایات سے ثابت ہے۔ مثلاً من میں قبضہ سے قبل تصرف کی اجازت ہے۔ اسی طرح مہر، بدل خلع اور بدل صلح میں قبضہ سے قبل تصرف کی اجازت ہے۔ اس سے واضح ہے کہ نبی والی روایات عام نہیں ہیں، بلکہ نبی کی ایک علت ہے۔ اور وہ علت غرر اور دھوکہ ہے۔ جہاں قبضہ سے قبل بیع کرنے میں یہ اندیشہ ہو کہ بیع کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں بیع ختم ہو جائے گی اور بیع مشتری ثانی کو نہیں مل سکے گی وہاں قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں ہوگی۔ اور جہاں غرر اور دھوکہ کا اندیشہ نہ ہو وہاں بلاشبہ قبضہ سے قبل بھی بیع جائز ہوگی، اس لئے کہ صحت بیع کی جو شرطیں ہیں وہ پائی جاتی ہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہے۔ صاحب ”ہدایہ“ لکھتے ہیں:

”والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به عملاً بدلائل الجواز“ صاحب ”بنایہ“ اس کے تحت لکھتے ہیں:

” (والحدیث) ای الحدیث المذكور (معلول بہ) ای بخرر انفساخ العقد فيما قبل القبض بهلاك المعقود عليه، فيكون مخصوصا بالمنقول، ألا ترى أنه يجوز الإعتاق قبل القبض والوصية قبله (عملا بدلائل الجواز) أي جواز البيع من الكتاب والسنة والإجماع“ (بنایہ شرح ہدایہ ۶۰۹)۔

”تبيين الحقائق“ میں ہے: ”وما رواه معلول بخرر انفساخ العقد بالهلاك قبل القبض... والدليل على أنه معلول به ان التصرف في الثمن قبل القبض جائز؛ لأنه لا غرر فيه وكذلك التصرف في المهر ونحوه جائز قبل القبض لما أمن منه والفقہ فيہ أن المطلق للتصرف وهو الملك قد وجد لكن الاحتراز عن الغرر واجب ما أمكن وذلك فيما يتصور فيه الغرر“ (تبيين الحقائق ۳۰۸)۔

### شرع اسلامی میں قبضہ کی حقیقت:

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک قبضہ کی شرعاً کوئی تحدید نہیں ہے، بلکہ ہر چیز کا قبضہ اس کے حساب سے متصور ہے اور یہ عرف و عادت پر محمول ہے۔ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کا استیلاء اور عمل دخل لوگوں کے عرف میں قبضہ متصور ہو وہی اس کے حق میں قبضہ مانا جائے گا۔ اگر کیلی اور زنی اشیاء ہوں تو ان کا قبضہ کیل اور وزن کے ذریعہ ہوگا۔ اگر دراہم و دنانیر اور روپے پیسے ہوں تو ان کا قبضہ ہاتھ میں لینے سے ہوگا۔ اور اگر کپڑا ہو تو اس کا قبضہ اس کی جگہ سے منتقل کر دینے سے ہوگا۔ اگر منقولی اشیاء ہوں تو ان کا قبضہ ان کی جگہ سے منتقل کر دینے سے ہوگا، اور اگر غیر منقولی اشیاء ہوں تو ان کا قبضہ تخلیہ کے ذریعہ ہوگا۔ یعنی مشتری اور بیع کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔

”وقبض كل شئ بحسبه فإن كان مكيلا أو موزونا يبع كيلا أو وزنا فقبضه بكيله ووزنه وبهذا قال الشافعي... وإن كان المبيع دراهم أو دنانير فقبضها باليد، وإن كان ثيابا باليد فقبضها نقلها، وإن كان حيوانا فقبضه تمشيته من مكانه، وإن كان مما لا ينقل ويحول فقبضه التخلية بينه وبين مشتريه لا حائل دونه... ولأن القبض مطلق في الشرع، فيجب الرجوع فيه إلى العرف كالأحراز والتفرق، والعادة في قبض هذه الأشياء ما ذكرنا“ (المغني ۱۲۶، ۱۲۵)۔

احناف کے نزدیک اس طرح کی کوئی تفصیل نہیں ہے، بلکہ بیع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز مانع اور حائل نہ ہو، یہ تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا، درمختار میں ہے: ”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع و حائل“ (در مختار)۔

علامہ شامی نے ”درمختار“ کی عبارت: ”على وجه يتمكن من القبض“ کے تحت تفصیلی بحث کی ہے کہ تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے اور ہر چیز کا تخلیہ اس کے حساب سے ہے، مثلاً اگر کسی گھر میں گھیرے ہوئے تو اس کا تخلیہ یہ ہے کہ نجی مشتری کے حوالہ کر دی جائے اور وہ بغیر کسی کلفت و پریشانی کے مکان کھولنے پر قادر ہو۔ اگر مکان ہے تو اس کا تخلیہ اور قبضہ یہ ہے کہ اس کے بند کرنے پر مشتری قادر ہو جائے، اگر جانور ہے تو اس کا تخلیہ اور قبضہ یہ ہے کہ چراگاہ میں جانور دکھا دیا جائے اور اس کی جانب اشارہ کر دیا جائے۔ اگر کپڑا ہے تو اتنا قریب ہو کہ مشتری جب ہاتھ اس کی جانب بڑھائے تو ہاتھ کپڑے تک پہنچ جائے۔

علامہ شامی اس کی پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے ”البحر الرائق“ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: ”وحاصله أن التخلية قبض حکماً أو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلا فدفق المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن تكون في البلد فيما يظهر وفي نحو بقر في مرعى، فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض وفي نحو ثوب، فكونه بحيث لو مديده تصل إليه قبض“ (رد المحتار ۳۰۳)۔

صاحب ”بدائع“ علامہ کاسانی قبض کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”إن معنى القبض هو التمكين والتخلية وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة“ (بدائع الصنائع ۵۰۱۳۸)۔



علامہ کامرانی اور علامہ شامی نے قبضہ اور اس کے ذیل میں تحبیر کی بحث کرتے ہوئے اس کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قبضہ کی شرعا کوئی تعین و تحدید نہیں ہے بلکہ ہر شے کا قبضہ اس کے حساب سے ہے اور یہ عرف و عادت پر محمول ہے۔ جہاں جس عمل دخل کو قبضہ سمجھا جاتا ہو وہاں وہ عمل دخل اس کے حق میں قبضہ سمجھا جائے گا۔ احواف اور اثرات کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مگر اہم الحروف کے خیال میں بھی ہر چیز کے قبضہ و عرف و عادت پر محمول کن چاہئے۔ جس جگہ جس عمل دخل کو قبضہ تصور کیا جاتا ہو اس عمل دخل کو اس کے حق میں قبضہ تسلیم کرنا چاہئے۔

اشیائے منتقلہ وغیر منتقلہ میں قبضہ کی نوعیت میں فرق:..... مذکور بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اشیاء منتقلہ غیر منتقلہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے فرق ہے۔ دونوں کے قبضہ کی ایک ہی صورت نہیں ہوگی۔

فیکٹری سے خرید کر دو مال کو قبضہ سے قبل فروخت کرنا:..... فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے قبل بیع کی بیع اس لئے جائز نہیں ہے کہ وہ خریداروں کے خمان میں نہیں آئی، اگر بیع خریدار کے خمان میں آجائے تو پھر اس کی بیع جائز ہے۔ گویا کہ فقہاء نے خمان کو جس قبضہ کے قائم مقام قرار دیا ہے "الموسومہ" میں حکام کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ: "قالوا: ولو دخل في ضمان المشتري جاز يبعه والتصرف فيه كما جاز ذلك بعد قبضة" (السبوعه الفقهيہ ۹۰۳)۔

یعنی فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ اگر حکام مشتری کے خمان میں داخل ہو جائے تو اس کی بیع اور اس میں تصرف جائز ہے جیسا کہ قبضہ کے بعد جائز ہے۔ امام مالک حکام کی بیع قبضہ سے قبل اس وقت جائز قرار دیتے ہیں جب کہ وہ مکمل یا وزن کر کے یا گن کر لیا گیا ہو، بلکہ اندازہ سے حاصل کیا گیا ہو اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ محض عقد ہی سے مشتری کے خمان میں آ گیا لہذا حکماً مقبوض ہونے کی وجہ سے اس کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے۔

"والتقيد عند المالكية بغير اجزاف، لاخراج ما يبع جزافا بغير كيل ولا عد ولا وزن من الضعاف، فانه يجوز يبعه قبل قبضه لدخول في ضمان المشتري بمجرد العقد فهو مقبوض حكما" (السبوعه الفقهيہ ۹۰۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ فقہاء کے نزدیک بیع کا خمان میں داخل ہونا قبضہ کے حکم میں ہے نیز فقہاء احناف امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک عقار کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے۔ یہ حضرات قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق روایات کو "معتول بالعدۃ" قرار دیتے ہیں۔ جب امام محمد کی جانب سے من پر اعتراض ہوا کہ عقار بھی قبضہ سے قبل مشتری کے خمان میں داخل نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ دیا کہ بیع میں تصرف کی اجازت ملکیت میں آجانے کے بعد ہو جاتی ہے۔ خمان میں داخل ہونا شرط نہیں ہے، اور محض عقد ہی سے ملکیت میں آجاتی ہے۔ منتقلہ اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز علت غرر کی بنیاد پر ہے جو عقار میں موجود نہیں ہے۔ کتب فقہی کی تفصیلات کے مطابق جس جگہ غرر اور ہوکہ سے امان ہو وہاں پر قبضہ سے قبل بیع جائز ہے۔

"وما يقولون من انه يلخل في ضمان المشتري بالتبض قلنا شرط ثبوت الملك بالتصرف في المحل أصل الملك دون الضمان بدليل جواز التصرف في الموهوب بعد القبض" (البيوط للرخي ۵۰۸)۔

اس مختصری وضاحت کے بعد سوال نمبر ۱۰ میں مذکور سوال کا جواب یہ ہے کہ فیکٹری سے مال خریدنے والا شخص اگر اپنا مال الگ کر لیتا ہے پھر وہیں سے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو یہ بلاشبہ بیع بعد القبض ہے جو جائز ہے، اگر قبضہ تسلیم کیا جائے گا۔ اور اگر اپنا مال الگ کر لے بغیر دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو سوال میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ بائع اور مشتری کے معاہدہ کے مطابق دو مال مشتری کے خمان میں داخل ہو جاتا ہے پھر بلاک ہونے کی صورت میں نہ تو بائع اول اس کا ضمان ہوتا ہے اور نہ مشتری ثانی، بلکہ مشتری اول اس کا ضمان ہوتا ہے۔ نیز یہاں پر غرر و ہوکہ بھی نہیں ہے لہذا خمان کو حکماً قبضہ تسلیم کرتے ہوئے اور ہوکہ نہ ہونے کی بنیاد پر اس طرح کی خرید و فروخت جائز ہونی چاہئے۔ میری رائے میں یہ صورت جائز ہے۔

جہاز پر مال چڑھا دینے کے بعد مشتری کا دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا: جب معاملہ بیع مکمل ہو جانے کے بعد مال جہاز پر چڑھا دیا گیا اور مال مشتری کے خمان میں داخل ہو گیا۔ خمان ہونے پر بائع پر کوئی ضمان نہیں، بلکہ مشتری کا نقصان ہوگا تو لکن صورت میں مشتری کا سند کے تادی جہاز پر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً جائز و درست ہوگا۔ اس کی جگہ سے منتقل کر کے جہاز پر چڑھا دیا اور اس کا مشتری کے خمان میں داخل ہو جائے اس کے قبضہ کی دلیل ہے بیع بعد القبض سمجھی جائے گی اس طرح مشتری ثانی بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے، کیونکہ خریداری کے بعد وہ مال اس کے خمان میں داخل ہو گیا۔

## قبضہ سے پہلے فروختگی

مفتی جمیل احمد زیری <sup>ط</sup>

۱۔ قبضہ سے پہلے بیع کا حکم:

قبضہ سے پہلے بیع کی دو صورتیں ہیں:

الف: ملکیت میں نہ ہونا، لہذا کوئی شخص ایسی چیز کو فروخت کرے جو اس کی ملکیت میں نہ ہو، تو یہ بیع باطل ہے۔

”بیع ما لیس فی ملکہ باطل“ (ردالمحتار ۱۱۹، ۳) اس چیز کی بیع جو بائع کی ملکیت میں نہ ہو باطل ہے۔

مرقاۃ المفاتیح میں ہے: ”أن بیع منہ متاعاً لا یملکہ ثم یشتریه من مالکہ و یدفعہ إلیہ و هذا باطل لأنه باع ما لیس

فی ملکہ وقت البیع و هذا معنی قوله قال: (لا تبع ما لیس عندک) أي شیئاً لیس فی ملکک حال العقد“ (مرقاۃ المفاتیح ۸۱۳، ۴)

خریدار کو ایسا سامان فروخت کیا جس کا مالک نہیں، پھر اسے مالک سے خریدے اور خریدار کو دے، یہ بیع باطل ہے، اس لئے کہ اس نے ایسی چیز فروخت کی

ہے جو بیع کے وقت اس کی ملکیت نہیں، یہی مطلب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کہ جو تمہارے پاس نہ ہو اسے مت فروخت کرو یعنی جو چیز عقد کے وقت

تمہاری ملکیت میں نہ ہو اسے مت بیجو۔

ب: ملکیت میں ہو لیکن قبضہ میں نہ ہو، ایسی چیز کو فروخت کرنا بیع فاسد ہے۔

”و فی معنی ما لیس عنده فی الفساد بیع العبد الآبق و بیع المبیع قبل القبض و فی معناه بیع مال غیرہ بغیر اذنه، لأنه

لا یدری ہل یحیی مالکہ أم لا“ (حوالہ سابق)۔

جو چیز بائع کے پاس نہیں اس کی بیع کے فاسد ہونے میں وہ صورت بھی داخل ہے جب بھاگا ہو انعام فروخت کرے یا قبضہ سے پہلے بیع فروخت کرے،

اور اسی کے معنی میں وہ صورت بھی ہے جب غیر کے مال کو غیر کی اجازت کے بغیر فروخت کرے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کا مالک اجازت دے گا یا نہیں۔

یہ آخری صورت امام شافعیؒ کے نزدیک بیع فاسد ہے، امام مالک، امام احمد اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مالک کی اجازت پر موقوف ہے (حوالہ سابق)۔

”و من البیع الفاسد أن یتصرف المشتري ما اشتراه قبل قبضه“ (الفقه علی المذاهب الأربعة ۲۰۲۲)۔

بیع فاسد میں سے یہ بھی ہے کہ مشتری بیع میں قبضہ سے پہلے تصرف کرے۔

۲۔ قبضہ کی حقیقت ”تخلیہ“ ہے، درمختار میں ہے: ”ثم التسليم یكون بالتخلية علی وجه یتمکن من القبض بلا مانع ولا

حائل و شرط فی الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن یقول: خلیت بینک و بین المبیع فلو لم یقله أو کان بعیداً لم یصر

قابضاً“ (درمختار ۲۸، ۴۷، ۴)۔

حوالگی ”تخلیہ“ یعنی مشتری اور بیع کے اکٹھا ہونے کی حالت میں اس طرح آزاد چھوڑ دینے سے ہوتی ہے کہ مشتری بیع پر بغیر مانع و بغیر حائل کے قبضہ پر

قادر ہو جائے، اجناس میں ایک اور شرط بھی لگائی گئی ہے وہ یہ کہ کہے کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان تخلیہ کیا، پس اگر یہ نہ کہے، یا بیع دور ہو تو قابض نہ ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

ط بانی و مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ مبارکپور اعظم گڑھ۔



ترجمہ: (اس طرح آزاد چھوڑ دینا کہ قبضہ پر قادر ہو جانے کا) نتیجہ یہ ہے کہ اگر گندم خریدے کسی گھر میں اور بائع مشتری کو اس گھر کی کنجی دے کر کبیرے میں نے تمہارے اور گندم کے درمیان تخلیہ کیا تو یہ قبضہ مانا جائے گا، اور اگر کچھ نہیں کہا تو قبضہ نہیں مانا جائے گا، اور اگر ایسے گھر کو جو وہاں موجود نہیں ہے بیس یا بئع نے کہا میں نے وہ گھر تمہارے سپرد کیا، مشتری نے کہا میں نے اس پر قبضہ کر لیا تو قبضہ نہیں مانا جائے گا، اور اگر قریب ہو تو قبضہ مانا جائے گا، قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مشتری اس پر تالا لگانے پر قادر ہو اور اگر تالا لگانے پر قادر نہ ہو تو دور مانا جائے گا، ”جمع النوازل“ میں ہے کہ گھر کی بیع میں کنجی دیدینا قبضہ و حوالگی ہے جب وہ اسے بلا کلفت و مشقت کھول دینے کیلئے مستعد ہو، اور اگر گائے کو گھر کے صحن میں خریدنا، بائع نے کہا جاؤ قبضہ کر لو، پس اگر وہ اس طرح دکھائی دے کہ اس کی طرف اشارہ کرنا ممکن ہو تو قبضہ مانا جائے گا، اور اگر کپڑا خریدا، بائع نے کہا کہ اس پر قبضہ کر لو، مشتری نے قبضہ نہیں کیا، یہاں تک کہ اس کپڑے کو کسی دوسرے نے لے لیا، تو جب بائع نے قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا، اگر مشتری کیلئے بغیر کھڑے قبضہ کرنا ممکن تھا تو حوالگی صحیح ہوگی (گویا دوسرے کے لے لینے سے نقصان مشتری کا ہوا، بائع کی ذمہ داری نہیں ہے) اور اگر بغیر کھڑے ہوئے قبضہ ممکن نہیں تھا تو حوالگی صحیح نہیں ہوگی (دوسرے کے لینے سے نقصان بائع کا ہوا) اور اگر کوئی چیز یا یا کوئی گھوڑا کسی گھر میں خریدا، بائع نے قبضہ کرنے کا حکم دیا، مشتری نے دروازہ کھولا، گھر میں گیا، تو اگر کسی مددگار کے بغیر پکڑنا ممکن ہو تو قبضہ مانا جائے گا، یہ ساری بحث ”البحر الرائق“ میں ہے، خلاصہ یہ کہ ”تخلیہ“ اس وقت حکماً قبضہ ہے جب بغیر کلفت و پریشانی کے اس پر قدرت ہو، لیکن یہ چیز بیع کے حال کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے، مثلاً گھر میں گندم فروخت کیا ہو تو کنجی کا دیدینا اس وقت قبضہ ہوگا جب گھر کو بلا کلفت کھولنا ممکن ہو، اور گھر کی بیع میں قبضہ اس وقت مانا جائے گا جب تالا بند کرنا ممکن ہو، اس سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ گھر اسی شہر میں ہو، چراگاہ میں گائے کی فروختگی میں قبضہ اس وقت مانا جائے گا جب وہ دکھائی دے اور اس کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہو، کپڑے میں ”تخلیہ“ کو قبضہ اس وقت قرار دیا جائے گا کہ ہاتھ بڑھانے سے ہاتھ کپڑے تک پہنچ جائے، گھوڑے اور چیز یا میں ”تخلیہ“ قبضہ اس وقت ہے، جب اس گھر میں جا کر بلا معین و مددگار کے اس کو پکڑنا ممکن ہو (ردالمحتار ۴/۷۳)۔

صاحب ”درمختار“ کے قول بلا مانع و لا حائل کی شرح کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

”قوله بلا مانع) بأن يكون مفرزا غير مشغول بحق غيره فلو كان المبيع شاغلا كالحنطة في جوالق البائع لم يمنعه بحر. وفي الملتقط: ولو باع دارا أو سلمها إلى المشتري وله فيها متاع قليل أو كثير لا يكون تسليما حتى يسلمها فارغة. وكذا لو باع أرضا وفيها زروع... (قوله ولا حائل) بأن يكون في حضرته الخ“۔

بلا مانع کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالص و علیحدہ ہو، حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، پس اگر بیع شاغل ہو، مثلاً گندم بائع کے بوروں میں ہو تو قبضہ سے مانع نہ ہوگا (البحر الرائق)، اور ملحقہ میں ہے کہ اگر کوئی گھر بیچا یا گھر مشتری کے حوالہ کیا اور اس میں بائع کا سامان ہے، کم ہو یا زیادہ، تو یہ حوالگی نہیں مانی جائے گی یہاں تک کہ خالی کر کے دے، ایسے ہی اگر زمین بیچے اور اس میں پیداوار ہو تو جب تک خالی کر کے نہیں دے گا قبضہ اور حوالگی نہ ہوگی..... اور بغیر حائل کا مطلب یہ ہے کہ حوالگی اور تخلیہ مشتری کی موجودگی میں ہو۔

محض قبضہ و تسلیم کے اقرار سے شرعاً قبضہ نہیں مانا جائے گا، درمختار میں ہے:

”فإنهم يشترون قرية و يقرون بالتسليم و القبض وهو لا يصح به القبض على الصحيح“۔

لوگ گاؤں خریدتے ہیں، حوالگی اور قبضہ کا اقرار کرتے ہیں، لیکن صحیح مذہب کے مطابق اس سے قبضہ صحیح نہیں ہوتا۔

”ردالمحتار“ میں عبارت بالا کی شرح میں ہے:

ترجمہ: اگر گھر دور ہو تو اگرچہ بائع کہے کہ میں نے تخلیہ کیا، قبضہ نہ ہوگا، دور سے مراد یہ ہے کہ بلا کلفت اس پر قبضہ کرنے پر قادر نہ ہو، اور یہ بیع کے بدلنے سے بدلتا ہے، جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں، یا اس سے مراد حقیقتہً دور ہونا ہے اور جو اس کے مشابہ ہو اس کو اسی پر قیاس کیا جائے گا، محض اقرار سے قبضہ صحیح نہ ہوگا اور قبضہ کے ساتھ مقید اس لئے کیا ہے، کیونکہ بیع فی ذاته صحیح ہے، لیکن مشتری پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے قیمت کی ادائیگی واجب نہ ہوگی، صاحب ”درمختار“ کے قول: ”علی الصحیح“ کا مطلب یہ ہے کہ ”ظاہر الروایہ“ یہی ہے، اس کے مقابلے میں وہ ہے جو ”محیط“ میں ہے، اور جامع شمس الائمہ میں ہے کہ محض ”تخلیہ“ سے قبضہ صحیح ہو جاتا ہے اگرچہ عقار (جاندا غیر منقولہ) دور ہو اور بائع اور مشتری سے غائب ہو امام ابوحنیفہ کے نزدیک، امام ابو یوسف اور امام محمد کا اختلاف ہے، محیط وغیرہ کی یہ بات ضعیف ہے، جیسا کہ ”البحر الرائق“ اور ”فتاویٰ قاضی خاں“ میں ہے، اور صحیح وہی ہے جو ”ظاہر الروایہ“ میں بیان کیا گیا ہے، کیونکہ جب جاندا غیر منقولہ قریب



ہوگی تو فی الحال بھی اس پر قبضہ حقیقی متصور ہوگا، لہذا ”تخلیہ“ قبضہ کے قائم مقام ہو جائے گا، اور جب دور ہوگی تو فی الحال قبضہ متصور نہ ہوگا، لہذا ”تخلیہ“ قبضہ کے قائم مقام نہ ہوگا (ردالمحتار ۳/۳۸۸)۔

عبارات بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ ”تخلیہ“ جسے قبضہ قرار دیا گیا ہے اس میں دو باتیں پائی جانی ضروری ہیں:

۱۔ بیع حق بائع یا حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، یعنی بیع سے کسی کا حق متعلق نہ ہو۔ ۲۔ تسلیم و حوالگی مشتری کی موجودگی میں ہو، یا اس کا وکیل موجود ہو۔

امام کاسانی نے قبضہ، تسلیم و حوالہ اور تخلیہ کی حقیقت ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

ترجمہ: حوالگی اور قبضہ ہمارے نزدیک تخلیہ اور تخلی ہے، وہ یوں کہ بائع، بیع اور مشتری کے درمیان رکاوٹیں دور کر کے قبضہ کی آزادی دیدے اس طریقہ سے کہ مشتری بیع میں تصرف کرنے پر قادر ہو جائے، لہذا بائع بیع کو سپرد کرنے والا اور مشتری قبضہ کرنے والا قرار دیا جائے گا، اسی طرح مشتری کی طرف سے بائع کی جانب شمن کی ادائیگی بھی ہونی چاہئے..... تسلیم (حوالگی) لغت میں نام ہے شی کو سالم و خالص بنانے کا، کہا جاتا ہے کہ ”سلم فلان بفلان یعنی فلان نے فلان کے لئے خالص کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”ورجلا سلما لرجل“ (اور ایک آدمی خالص ایک آدمی کیلئے ہے) اس میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ پس بیع کی مشتری کی طرف تسلیم (حوالگی و سپردگی) یہ ہے کہ بیع مشتری کیلئے اس طرح سالم و خالص بنا دی جائے کہ اس کے بارے میں اس سے کوئی دوسرا نزاع نہ کرے، یہ معنی ”تخلیہ“ کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے، لہذا ”تخلیہ“ بائع کی طرف سے سپردگی ہوئی اور ”تخلی“ مشتری کی طرف سے قبضہ ہوا۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں: ”ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال واختلفوا في أنها هل هي قبض تام فيها أم لا وجملة الكلام فيه أن المبيع لا يخلو إما أن يكون مما له مثل وإما أن يكون مما لا مثل له من المذروعات والمعدودات المتفاوتة فالتخلية فيها قبض تام بلا خلاف“ (بدائع الصنائع ۵/۲۳۴)۔

(ہمارے اصحاب (احناف) کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اصل قبضہ تمام اموال میں ”تخلیہ“ کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے، البتہ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ یہ قبضہ تام ہے یا نہیں، خلاصہ کلام یہ ہے کہ بیع یا تو ان چیزوں میں سے ہوگی جن کیلئے مثل ہوتا ہے یا ان چیزوں میں سے ہوگی جن کے لئے مثل نہیں ہوتا مثلاً مذروعات اور معدودات متفاوتہ وغیرہ، پس ”تخلیہ“ ان سب میں بغیر کسی اختلاف کے قبضہ تام ہے)۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً و عادة حقيقة“ (بدائع الصنائع ۵/۱۲۸)۔ اس لئے کہ قبضہ کا مطلب ہے کہ کسی چیز پر قادر کر دینا، تہائی میں ہونا، اور عرفاً و عادتاً جو موانع ہوں ان کو حقیقتاً اٹھا دینا۔

ان عبارات کی روشنی میں احقر کے خیال میں ”قبضہ“ کو متعین کرنے میں عرف کو دخل ہے، لیکن عرف صحیح ہونا چاہئے، جس کا شریعت نے اعتبار کیا ہے، ہر قسم کا عرف معتبر نہ ہوگا۔

قبضہ کی ایک ہی نوعیت ”تخلیہ“:

اشیاء منقولہ وغیر منقولہ دونوں میں قبضہ کی ایک ہی صورت ہے، یعنی ”تخلیہ“۔ البتہ بقول صاحب ”درمختار“ اجناس میں مزید یہ بھی شرط مذکور ہے کہ:

”وهو أن يقول خليت بينك وبين المبيع“ (درمختار ۳/۳۸۸)۔ بائع کہے کہ میں نے تمہارے درمیان اور بیع کے درمیان آزادی دیدی۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”(قوله أن يقول خليت الخ) الظاهر أن المراد به الإذن بالقبض لا خصوص لفظ التخلية لما في البحر: ولو قال: البائع للمشتري بعد البيع خذ لا يكون قبضاً ولو قال: خذه يكون تخلية إذا كان يصل إلى أخذه الخ وفي الفروع المارة ما يدل عليه أيضاً“ (ردالمحتار ۳/۳۸۸)۔

بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد قبضہ کی اجازت دینا ہے ”تخلیہ“ کا مخصوص لفظ مراد نہیں ہے، جیسا کہ ”البحر الرائق“ میں ہے کہ اگر بیع کے بعد بائع مشتری سے کہے ”لے لو“ تو قبضہ نہیں ہوا، اور اگر کہے ”اس کو لے لو“ تو یہ ”تخلیہ“ کہلائے گا جب کہ وہ اسے لینے کیلئے پہنچے، اور گذشتہ فروع بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

بیع صحیح اور بیع فاسد دونوں میں تخلیہ کو قبضہ مانا گیا ہے۔

”و أجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز يكون قبضاً، وفي البيع الفاسد روايتان والصحيح أنها قبض كذا في فتاوى قاضیخان“ (فتاویٰ ہندیہ ۳، ۱۶)۔ (فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ بیع صحیح میں ”تخلیہ“ قبضہ قرار دیا جائے گا، اور بیع فاسد کے بارے میں دو روایتیں ہیں، صحیح یہ ہے کہ بیع فاسد میں بھی ”تخلیہ“ قبضہ ہے، ایسے ہی فتاویٰ قاضیخان میں ہے)۔

احادیث مذکورہ معلول بالعلتہ ہیں:

ایک بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز کیوں ہے؟ جبکہ بیچنے والا ایسی چیز بیچ رہا ہے جو اس کی ملکیت میں ہے، ایجاب و قبول بھی موجود ہے، بیع و شراء کرنے والوں میں بیع و شراء کی اہلیت بھی ہے، بیع محل بھی ہے، پھر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کیوں جائز نہیں؟ وجہ صاف ظاہر ہے، وہ یہ کہ اس میں غرر اور دھوکہ ہے، کیونکہ جب بیع قبضہ میں نہیں ہے اور فروخت کردے تو مشتری کا حوالہ کرنا مشتبہ ہو گیا، ممکن ہے وہ حوالہ کر ہی نہ پائے، بیع ہلاک و ضائع ہو جائے وغیرہ وغیرہ، ایسی صورت میں بیع ہی فسخ ہو جائے گی۔

”ہدایہ“ میں ہے: ترجمہ: جس نے کوئی ایسی چیز خریدی جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے تو اس کی بیع اسی وقت جائز ہوگی جب اس پر قبضہ کر لے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی بیع سے منع فرمایا ہے جس پر قبضہ نہ کیا گیا ہو، اور اس لئے بھی یہ بیع جائز نہیں، کیونکہ اس میں بیع کے ہلاک ہو جانے پر بیع کے فسخ کا خطرہ ہے، البتہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک عقار (جائداد غیر منقولہ) کی بیع قبضہ سے پہلے بھی جائز ہے، امام محمد کے نزدیک جائز نہیں، حدیث کے مطلق ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے اور ”منقول“ کا اعتبار کرتے ہوئے جس طرح جائداد غیر منقولہ کا اجارہ قبل القبض جائز نہیں، اسی طرح بیع بھی جائز نہیں، شیخین کہتے ہیں کہ بیع کارکن اہل سے صادر ہوا ہے اور محل میں صادر ہوا ہے، اس میں کسی قسم کا دھوکہ اور غرر نہیں، اس لئے کہ عقار میں ہلاک ہو جانا نادر ہے، اور جس غرر سے منع کیا گیا ہے وہ عقد کے فسخ ہو جانے کا غرر ہے (وہ یہاں موجود نہیں) اور دلائل جواز پر عمل کرتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ یہ حدیث اسی ”غرر فسخ“ کے ساتھ معلول ہے، اور اجارہ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ بھی اسی اختلاف پر ہے، اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں اختلاف نہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معقود علیہ اجارہ میں منافع ہے اور اس کا ہلاک ہو جانا نادر نہیں ہے (ہدایہ ۵۸۳)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی احادیث معلول ہیں اور علت بیع کے فسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ غرر و دھوکہ منقولات میں ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کے ہلاک و ضائع ہونے کا بکثرت وقوع ہے، اس کے برخلاف زمین، جائداد، اشیاء غیر منقولہ، ان کا ہلاک و ضائع ہو جانا نادر ہے، لہذا چونکہ اس میں علت موجود نہیں اس لئے وہ ممانعت سے مستثنیٰ ہوں گی، کیونکہ حکم علت کے ساتھ دائر ہوتا ہے۔

امام کا سائی فرماتے ہیں: ترجمہ: شیخین (امام ابوحنیفہ و امام ابو یوسف) کی دلیل، قرآن مجید کی آیات بیع کا بلا تخصیص عموم ہے، اور ہمارے نزدیک کتاب اللہ کے عموم کی خبر واحد سے تخصیص جائز نہیں، یا پھر ہم اسے جائداد منقولہ پر محمول کریں گے، تاکہ دلائل کے درمیان موافقت رہے، تناقض نہ پیدا ہو، اور جائداد غیر منقولہ کی قبل القبض بیع اس لئے بھی جائز ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ رکن بیع (ایجاب و قبول) اہلیت رکھنے والے سے صادر ہو اور ایسی جگہ میں صادر ہو جو بیع کا محل بن سکے، تو اس بیع کو صحیح ہونا چاہئے، عدم جواز غرر (دھوکہ) کے عارض کی وجہ سے ہے، اور یہ ”غرر“ معقود علیہ کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں بیع کے فسخ ہو جانے کا ہے، کیونکہ جائداد غیر منقولہ کی ہلاکت کا اندیشہ نہیں، لہذا ”غرر“ بھی ثابت نہ ہوگا، لہذا بیع اصل کے حکم پر باقی رہے گی (بدائع الصنائع ۱۸۱/۵)۔

امام سرخسی فرماتے ہیں: ترجمہ: امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ عقار کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اسی طرح جائز ہے جس طرح ”منقول“ کی بیع بعد القبض جائز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تصرف کی اجازت ملکیت کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ قبضہ کی وجہ سے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر کوئی شخص اپنی ایسی ملکیت کو فروخت کرے جو مودع یا غاصب کے قبضہ میں ہو اور وہ مودع و غاصب اس شخص کی ملکیت کا اقرار بھی کرتے ہوں تو بیع جائز ہوگی (حالانکہ وہ اس شخص کے قبضہ میں نہیں ہے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر تصرف کی اجازت دینے والی ملکیت میں ایسا غرر ہو جس سے بچنا ممکن ہو تو یہ تصرف کے جواز کے لئے مانع ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”بیع غرر“ سے منع فرمایا ہے، لہذا جائداد منقولہ میں قبل القبض بیع کرنے میں یہ غرر ہے کیونکہ اس کے ہلاک ہو جانے سے بیع ٹوٹ جائے گی اور مشتری کی ملکیت باطل ہو جائے گی، اور جب قبضہ کر لے گا تو یہ غرر منثنیٰ ہو جائے گا اور صرف ایک غرر باقی رہے گا، وہ یہ کہ وہ چیز کہیں کسی اور کی نہ نکلے، لیکن اس غرر سے بچنا ممکن نہیں (کیونکہ یہ تو بیع کی ہر صورت میں پایا جاسکتا ہے)، عقار کی قبل القبض بیع میں مشتری کی ملکیت میں یہی ”غرر استحقاق“ ہے، کیونکہ عقار کی



ہلاکت متصور نہیں اور اس کی وجہ سے بیع کا فسخ ہو جانا بھی متصور نہیں، اور غرر کا منتهی ہو جانا اس کے سبب کے بالکل عدم تصور کی وجہ سے ابلغ ہے، اس غرر کے منتهی ہونے سے جس کے سبب کا تصور کیا گیا، لیکن اس نے عمل نہیں کیا، بیع میں ”غرر استحقاق“ کا تصور ہوتا ہے، لیکن اس سے احتراز ممکن نہیں یعنی غرر فسخ عقد کا سبب ہی منتهی ہے، اس کے برعکس غرر استحقاق کا سبب متصور ہے، مگر عمل نہیں کرتا، لہذا سبب کا ہی منتهی ہو جانا سبب کے پائے جانے کے بعد احتراز ممکن نہ ہونے کی وجہ سے عمل نہ کرنے کے مقابلے میں ابلغ ہے (مبسوط ۹/۱۳)۔

امام ابن ہمام شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں: ترجمہ: جو چیز منع اور نہی کا باعث ہے وہ غرر ”انفساخ“ ہے بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں، وہ یہاں منتهی ہے کیونکہ عقار کا ہلاک ہو جانا نادر ہے، اور جو نادر ہو اس کا اعتبار نہیں ہوتا، اور احکام فقہیہ اس پر مبنی نہیں ہوتے، لہذا مانع جواز نہ ہوگا، کیونکہ اس کا ہلاک ہو جانا متصور نہیں، الا یہ کہ وہ دریا وغیرہ بن جائے، یہاں تک کہ بعض مشائخ نے کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مسئلہ اس جگہ کے متعلق ہے جس کے دریا ہو جانے یا اس پر ریت وغیرہ کے غالب آ جانے کا اندیشہ نہ ہو، لیکن جو جگہ اس سے مامون نہ ہو وہاں قبل القبض بیع اسی طرح جائز نہ ہوگی جس طرح منقول میں، اسے محبوبی نے ذکر کیا ہے، اور اختیار میں ہے کہ اگر زمین دریا کے کنارے پر ہو یا بیع انتہائی بلندی پر تو اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے (فتح القدیر ۶/۱۳۷)۔

عبارات مذکورہ کا حاصل یہ ہے کہ اشیاء غیر منقولہ (عقار) میں بھی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اسی وقت جائز ہے جب اندیشہ ضیاع و ہلاکت نہ ہو، لیکن اگر اندیشہ ہلاکت ہو تو اس کا حکم اشیاء منقولہ کا ہی ہے، یعنی اس میں قبل القبض بیع جائز نہ ہوگی۔

اب تک کے مباحث سے سوال (۱، ۲، ۳، ۴، ۵) کے جوابات واضح ہو چکے ہیں، باقی ماندہ دو سوالات کے جوابات نیچے درج کئے جاتے ہیں:

۶۔ یہ خرید و فروخت جائز ہے، اول وہلہ میں فیکٹری کی حیثیت بائع کی ہے، ثانیاً مشتری اول کے وکیل کی جسے سوال میں خریدار نمبر (۱) سے تعبیر کیا گیا ہے، دونوں میں کوئی مناقات نہیں۔

”اصول الشاشی“ کی یہ عبارت اس کی صریح نظیر ہے: ”وإذا قال أعتق عبدك عنى بألف درهم، فقال: أعتقت يقع العتق عن الأمر فيجب عليه الألف، ولو كان الأمر نوى به الكفارة يقع عما نوى، وذلك؛ لأن قوله أعتقه عنى بألف درهم يقتضى معنى قوله بعه بألف ثم كن وكيلى بالإعتاق فأعتقه عنى فيثبت البيع بطريق الاقتضاء ويثبت القبول كذلك“ (اصول الشاشی ص ۴۲)۔

(جب کہے ”آزاد کر دو اپنے غلام کو میری طرف سے ایک ہزار درہم میں“ پس دوسرا کہے ”میں نے آزاد کر دیا“ تو یہ آزادی آمر کی طرف سے واقع ہوگی اور اس پر ایک ہزار درہم واجب ہو جائیں گے، اور اگر آمر نے اس کے ذریعہ کسی کفارہ کا ارادہ کیا تو یہ آزادی اسی کی طرف سے ہوئی جس کی نیت کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے شخص کا قول ”غلام کو میری طرف سے ایک ہزار درہم میں آزاد کر دو“ اس بات کو چاہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ تم مجھے اپنے غلام کو ایک ہزار میں فروخت کر دو، پھر میرے وکیل بالا عتاق بن کر میری طرف سے اسے آزاد کر دو، لہذا بیع بطریق الاقتضاء ثابت ہوگی اور ایسے ہی قبول بھی بطریق الاقتضاء ثابت ہوگا)۔

۷۔ یہ صورت جائز نہیں ہے، بیع فاسد ہے، حدیث نبوی ”ولا ربح مالہ یضمن“ کی شرح کرتے ہوئے مشہور حنفی عالم ملا علی قاری لکھتے ہیں:

ترجمہ: اس سے مراد وہ نفع ہے جو کسی چیز کو خریدنے کے بعد اس پر قبضہ کرنے سے پہلے بیع کرنے سے حاصل ہو، اور وہ بائع کے ضمان سے مشتری کے ضمان کی طرف منتقل نہ ہو، اس لئے کہ اس کی بیع فاسد ہے..... اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا نفع اسی وقت حلال ہوتا ہے جب خسارہ کی ذمہ داری بیچنے والے پر ہو، پس اگر خسارہ کی ذمہ داری اس پر نہ ہو، مثلاً قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جب تلف ہو جائے، تو اس کا ضمان بائع پر ہے اور مشتری کو حق نہیں ہے کہ اس کا وہ نفع واپس لے جس سے بائع قبل القبض منتفع ہو چکا ہے، اس لئے کہ بیع قبضہ کے ذریعہ مشتری کے ضمان میں داخل نہیں ہوئی، پس اس کے لئے قبل القبض بیع کا نفع بھی حلال نہ ہوگا۔

اس پہلے خریدار کی فروختگی اسی وقت جائز ہو سکتی ہے جب وہ مال اس کے ضمان میں ہو، اصلۃً یا نیلۃً و کالۃً، یہاں اصلۃً ممکن نہیں، و کالۃً و نیلۃً ممکن ہے، جبکہ اس خریدار نے اسی طریقہ (شیپنگ) سے مال منگوا یا ہو، اس صورت میں مال بردار جہاز کا عملہ پہلے خریدار کا وکیل مانا جائیگا، اور نقصان کی صورت میں وہی پہلا خریدار ضامن بھی ہوگا۔

لیکن اگر پہلا خریدار ضامن نہ ہو اور اس نے مال کی وصولی سے پہلے کسی شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تو بیع جائز نہ ہوگی۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے بیع و شراء کا حکم

مولانا محمد زید مظاہری ندوی

۱۔ احادیث صحیحہ (مصنف عبدالرزاق ۳۹۸، مسلم شریف، ابوداؤد وغیرہ) کی وجہ سے تمام ائمہ اور اہل علم اس پر متفق ہیں کہ مشتری کیلئے قبضہ سے پہلے اس کی بیع ناجائز ہے، اور یہ ایک ایسا جماعی مسئلہ ہے کہ صحابہ اور اہل علم میں سے کسی کا بھی اس میں اختلاف نہیں، البتہ عثمان بنی سے اس کا جواز منقول ہے، لیکن تمام علماء نے ان کے قول کو مردود قرار دیا ہے۔

”لا يجوز للمشتري بيع أى شئ كائنا ما كان حتى يقبضه وهو قول جابر، ولا يعرف مخالف في الصحابة، ولا خلاف فيه بين أهل العلم إلا ما حكى عثمان البتي من جواز البيع كل شئ قبل قبضه وهو قول مردود“ (موسوعة الفقه الاسلامي ۱۰۱۸۳)۔

ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ قول سنت اور جماعی مسئلہ کی دلیل سے بالکل مردود ہے، ایسے قول کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے گا۔

”قال ابن عبد البر هذا قول مردود بالسنة والحجة المجمع على الطعام وأظنه لم يبلغه هذا الحديث ومثل هذا لم يلتفت“ (المغني ۴، ۱۱۳، تكملة فتح الملهم شرح مسلم)۔

اب رہی یہ بات کہ قبل القبض بیع، بیع فاسد ہے یا باطل؟ تو امام شافعیؒ کے نزدیک تو بیع فاسد و باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ان کے نزدیک دونوں ایک ہیں، البتہ احناف کے نزدیک قبل القبض بیع، بیع فاسد ہے، نہ کہ باطل، کیونکہ فاسد و باطل کے مابین امتیازی فرق یہی ہے کہ بیع باطل اس کو کہتے ہیں جس میں عوضین بیع کے قابل، یعنی مال نہ ہوں، اور اگر عوضین مال تو ہوں، لیکن بیع کی عدم صحت کے دوسرے اسباب مثلاً شرط فاسد، کسی نص کی مخالفت، ربا وغیرہ لازم آئے تب بیع فاسد ہوتی ہے، ملا علی قاری اور دوسرے فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

”والباطل والفساد عند الشافعية واحد وتحرير مذهب الحنفية أن العوضين إن لم يكونا قابلين للبيع فهو باطل وإن كانا قابلين لكن اشتملا على مقتضى عدم الصحة كالربا ففساد ويفيد بالقبض الملك الخبيث“ (مرقاة شرح مشکوٰۃ ۶، ۶۶)۔

اور قبل القبض بیع میں بیع میں بائع ثانی کی ملک تو محض عقد سے ثابت ہو جاتی ہے گو قبضہ نہیں ہوتا ”إن ملك التصرف يستفاد بالقبض كما أن ملك العين يستفاد بالعقد“ (مبسوط ۹، ۱۱۳) اس لئے یہ بیع بیع فاسد ہوگی اور اس میں بیع فاسد کے احکام جاری ہوں گے، چنانچہ عنایہ شرح ہدایہ میں قبل القبض بیع کے بیع فاسد ہونے کی صراحت موجود ہے۔ ”والنهي يقتضى الفساد فيكون البيع فاسدا قبل القبض“ (عنایة علی ہامش فتح القدیر ۶، ۱۳۷)۔

۲، ۳۔ قبضہ کی حقیقت اور اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کا فرق:

قبضہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کوئی شئی کسی کے حرز و ضمان میں آجائے، یعنی اس کے زیر اثر و زیر تصرف ہو جائے کہ وہ اس میں جو چاہے تصرف کرے، کوئی نقصان و تاوان ہوگا تو وہ بھی اسی کا ہوگا، قبضہ کی اصل حقیقت یہی ہے، باقی تفصیلات وہ سب اسی حقیقت کی علامات ہیں۔

”أما القبض فهو أن يأتي بالشئ في حرزه وضمانه كذا يظهر من كلام الحافظ في الفتح“ (تكملة فتح الملهم للشيخ تقي عثمانی ۱، ۲۵۰، فتح الباری ۴، ۲۳۹)۔

کتاب و سنت نے قبضہ کی کوئی خاص صورت متعین نہیں کی، البتہ فقہاء کرام نے اپنے اجتہاد سے اشیاء کے منقولہ و غیر منقولہ ہونے کے اعتبار سے قبضہ کی خاص صورتوں کی تعیین کی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ہر شی کا قبضہ اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے، چونکہ شریعت نے قبضہ کی کوئی خاص صورت متعین نہیں کی، اس لئے اس کا مدار عرف پر ہے۔

”قال ابن قدامة قبض كل شئ بحسابه... لأن القبض مطلق في الشرع، فيجب الرجوع فيه إلى العرف كالإحراز والتفرق“ (المغنی ۲، ۱۲۵-۱۲۶)۔

اشیاء غیر منقولہ میں تو صرف تخلیہ کافی ہے (یعنی زمین و مکان سے اپنا قبضہ و تصرف ہٹا کر اس کو خالی کر دینا)، کیونکہ عرف میں تخلیہ ہی سے زمین پر قبضہ سمجھا جاتا ہے اور اشیاء منقولہ میں حمل و نقل کے ذریعہ اور لینے دینے کی چیزوں میں ہاتھ میں لینے سے قبضہ سمجھا جائے گا۔

قبضہ کی یہ تعریف و تفصیل امام احمد و امام شافعی کے مسلک کے مطابق ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں اور امام نووی نے ”شرح مہذب“ میں اور حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں نقل فرمائی ہے:

”قال النووي: قد ذكرنا أن مذهبنا أن القبض في العقار ونحوه بالتخلية، وفي المنقول بالنقل، وفي المتناول باليد المتناول، وبه قال أحمد“ (شرح مہذب للنووی ۹، ۲۸۳)۔

”وقال الحافظ في الفتح: وفي صفة القبض عن الشافعي تفصيل فما يتناول باليد كالدرهم والدنانير والشوب فقضه بالتناول“ (فتح الباری ۲، ۲۵۰)۔

۲۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک اشیاء منقولہ و غیر منقولہ دونوں ہی میں تخلیہ کافی ہے، یعنی یہ کہ بائع اپنا قبضہ ہٹا کر مشتری کیلئے راستہ چھوڑ دے کہ اگر وہ قبضہ کرنا چاہے تو کر سکے۔

”وقال مالك و أبو حنيفة: القبض في جميع الأشياء بالتخلية قياساً على العقار“ (شرح مہذب للنووی ۹، ۲۸۳)۔

امام مالک سے یہ بھی منقول ہے کہ اشیاء غیر منقولہ میں تو قبضہ کا مدار تخلیہ پر ہے اور اشیاء منقولہ میں قبضہ کا مدار عرف پر ہے، یعنی عرف میں جس صورت میں قبضہ سمجھا جاتا ہو بس وہی کافی ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴، ۲۱۹)۔

فقہاء حنفیہ کے نزدیک قبضہ کا مفہوم و توسع:

قبضہ کے مفہوم میں سب سے زائد توسع فقہاء احناف کے یہاں پایا جاتا ہے، چنانچہ: (مبسوط سرخسی، بدائع الصنائع، فتح القدير، البحر الرائق) وغیرہ میں تصریح ہے کہ اشیاء منقولہ ہوں یا غیر منقولہ سب میں قبضہ کی حقیقت تسلیم و تخلیہ ہے، یعنی بائع مشتری کو بیع کے حق میں اس طرح کر دے کہ مشتری اگر اس پر قبضہ کرنا چاہے تو درمیان میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ ہو جو حقیقت یا عرف و عادت کے اعتبار سے قبضہ کیلئے مانع ہو، یعنی بائع کی جانب سے تسلیم و اختیار اور مشتری کی جانب سے قدرت، بس یہ حاصل ہے قبضہ کا، قبضہ کی اس حقیقت کے پائے جانے کے بعد بھی اگر بیع بائع کے پاس موجود رہے تو وہ بطور امانت ہوگی۔

”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً و عادة حقيقة، وقال: فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً والمشتري قابضاً“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۳۸-۱۳۹، فتح القدير ۵، ۳۹۶، البحر ۵، ۲۰۸)۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ قبضہ کی اس حقیقت کے تحقق کیلئے بھی مشتری یا اس کے نائب کا قریب میں حاضر ہونا ضروری ہے، حتیٰ کہ اگر زمین جائداد بھی خریدی جائے اس میں فقہاء نے مشتری کی حاضری کو ضروری قرار دیا ہے۔

”إذا باع ضيعة وخلي بينها وبين المشتري إن كان يقرب منها يصير قابضاً، وإن كان بعيد لا يصير قابضاً... المعتمد فيها القرب الذي يتصور معه حقيقة القبض“ (رد المحتار ۲، ۲۳)۔



ابن ہمام اور ابن نجیم نے اجناس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ قبضہ اور تسلیم کے معتبر اور صحیح ہونے کی تین شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان راستہ چھوڑ دیا، یعنی بیع سے اپنا قبضہ ہٹا کر تمہارے حوالہ کیا، دوسری شرط یہ کہ مشتری اس وقت موجود ہو کہ قبضہ کرنے سے اس کو کوئی مانع نہ ہو، تیسری شرط یہ کہ وہ شیء علیحدہ ہو، یعنی غیر کا حق اس سے متعلق نہ ہو۔

”وفی الأجناس: يعتبر في صحة التسليم ثلاثة معان أن يقول خليت بينك وبين المبيع وأن يكون بحضرة المشتري على صفة يتأق في الفعل من غير مانع وأن يكون مفرداً غير مشغول بحق غيره“ (البحر ۵۰۲۰۸، فتح القدير، مجمع الأنهر)۔

الغرض قبضہ کیلئے بائع کی جانب سے تخلیہ و تسلیم، اور مشتری کی موجودگی اور بیع پر بغیر کسی رکاوٹ کے قبضہ کی قدرت، بس یہی حاصل ہے قبضہ کا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ قبضہ پر قدرت کی کیفیت بیع کے حال کے اعتبار سے مختلف ہوگی، چنانچہ علامہ شامی نے اس کی تصریح فرمائی ہے، مثلاً کسی گودام میں بھرے ہوئے غلہ کی بیع کی تو بائع کا گودام کی چابی مشتری کے حوالہ کر دینا جس سے کہ وہ بلا تکلف دروازہ کھول سکے، بس قبضہ کے لئے اتنی بات کافی ہے، کسی جانور مثلاً گائے وغیرہ پر قبضہ کیلئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ مشتری کو دکھلا دیا یا اشارہ کر دیا کہ وہ گائے موجود ہے چراگاہ میں، کپڑوں وغیرہ میں قبضہ اس طرح ہوگا کہ اگر ہاتھ پھیلا کر لینا چاہے تو لے سکے۔

”إن التخلية قبض حکما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع، ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض... إلى قوله: وفي نحو بقرف في مرعى، فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض، وفي نحو ثوب، فكونه بحيث لو مديده تصل إليه قبض“ (شامی ۴۰۲۳)۔

### قبضہ کی دو قسمیں:

۱۔ حقیقی، ۲۔ حکمی۔ فقہاء احناف نے قبضہ کی دو قسمیں فرمائی ہیں: قبضہ حقیقی، قبضہ حکمی۔

حقیقی قبضہ تو یہی ہے کہ کسی شیء کو ہاتھ سے اپنے قبضہ میں لے لیا جائے: ”لأن حقيقة القبض التسلم باليد“ (حاشیة البحر ۵۰۲۰۸) اس کو قبضہ حسی بھی کہتے ہیں، فقہاء کی تصریح کے مطابق قبضہ حسی کی طرح قبضہ معنوی و حکمی بھی ہوتا ہے بلکہ ”تخلیہ“ کی حقیقت بھی قبضہ حکمی ہی ہے۔ ”وحاصله أن التخلية قبض حکما“ (رد المحتار ۴۰۲۳)۔

قبضہ معنوی کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، فقہاء کے کلام میں تتبع کرنے، اصول و جزئیات پر نظر کرنے سے بنیادی طور پر دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں جن سے قبضہ حکمی کا تحقق ہوتا ہے:

۱۔ ایک تو یہ کہ مشتری بیع میں ایسا کوئی اقدام یا ایسا کوئی تصرف کرے جس سے بیع تلف یا عیب دار ہو جائے، یا اس کی ملک سے خارج ہو کر دوسرے کی ملک میں منتقل ہو جائے، یہ تصرف اور یہ اقدام قبضہ حکمی ہے جس سے کہ بیع بائع کے ضمان سے خارج ہو کر مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے۔

”وأما الثاني: فالمشتري إذا ألتف المبيع أو أحدث عيباً قبل القبض يصير قابضاً“ (البحر ۵۰۲۰۷)۔

کیونکہ جب تخلیہ و تمکین کو قبضہ کہا گیا ہے (جس کا حاصل قدرت علی التصرف ہے) تو نفس تصرف جو قدرت علی التصرف سے بڑھ کر ہے بدرجہ اولی قبضہ کہنا چاہئے۔

”لأنه صار قابضاً بالتخلية فبالإتلاف أولى؛ لأن التخلية تمكين من التصرف في المبيع والإتلاف تصرف فيه حقيقة“ (بدائع ۵۰۲۲۲)۔

البتہ ان تصرفات میں کچھ تفصیل ہے ہر تصرف کو قبضہ کیلئے کافی نہیں سمجھا گیا، اصولی طور پر تصرفات کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ تصرفات کہ قبضہ کے بغیر جن کی تکمیل نہیں ہوتی، مثلاً ہبہ، عاریت، ودیعت وغیرہ، کہ جب تک قبضہ کامل نہ ہو یہ تصرفات ناقص رہتے ہیں، دوسرے وہ تصرفات کہ قبضہ کے بغیر بھی درست ہو جاتے ہیں، مثلاً بیع وغیرہ، تو پہلی قسم کے تصرفات سے تو مشتری بیع پر قابض سمجھا جائے گا اور دوسری قسم کے تصرفات میں مشتری بیع پر قابض نہ سمجھا جائے گا،



یعنی پہلی قسم کے تصرفات قبضہ حکمی میں داخل ہیں اور دوسری صورت کے نہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل بحر، عنایہ، فتح القدر، خانہ وغیرہ میں امام محمدؒ کے حوالہ سے منقول ہے (دیکھئے: فتح القدر ۷۶/۳۳، عنایہ شرح ہدایہ ۳۶۶/۳۶، بحر ۵/۳۰، شامی ۳۲/۳۲)۔ اس تفصیل کے پیش نظر مشتری نے اگر بیع پر قبضہ سے پہلے بیع کر دی تو درست نہیں، البتہ اگر قبضہ سے پہلے ہبہ کر دیا تو درست ہے، چنانچہ ”فتاویٰ بزازیہ“ میں اس کی صراحت موجود ہے:

”لا یصح بیع المنقول قبل قبضہ من البائع أو الأجنبي“ (بزازیہ ۲۹۶)۔

۲۔ قبضہ حکمی و معنوی کا دوسرا معیار یہ ہے کہ انعقاد بیع کے بعد خود مشتری یا اس کا نائب وکیل ایسی کوئی بھی صورت اختیار کرے جس سے کہ عرف میں وہ بیع مشتری کیلئے نامزد، مخصوص و متعین اور زیر اثر و تصرف سمجھی جائے، بس اسی سے مشتری کو قابض سمجھا جائے گا، گو بیع بائع کے پاس موجود ہو، مثال کے طور پر فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص نے سرکہ یا اس جیسی کوئی شے خریدی جو ابھی بائع کی دکان یا اس کے گھر میں موجود ہے اور اسی حال میں بائع نے مشتری کو بیع پر قبضہ کرنے کا اختیار دیا، اور مشتری نے بیع پر مہربان یا ایسی کوئی علامت لگا دی جس سے وہ بیع متعین اور نامزد ہوگی گویا مشتری نے اس کو اپنے زیر اثر و تصرف کر لیا، اس صورت کے متعلق ابن ہمام فرماتے ہیں کہ مشتری کو بیع پر قابض سمجھا جائے گا اور بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہوگی گویا بیع بائع کے پاس ہی موجود ہے۔

”ولو باء خلاً ونحوه فی دت و خلی بینہ و بین مشتری فی دار نفسه و ختم مشتری علی الدت فهو قبض“ (فتح القدر ۲۹۷)۔

اسی طرح فقہاء نے اور بھی جزئیات تحریر فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتری کا بائع سے ایسی کوئی بات کہنا یا ایسی کوئی صورت اختیار کرنا جس سے کہ عرف میں بیع مشتری کے حرز و ضمان میں سمجھی جاتی ہو اور اسی کے زیر اثر و تصرف ہو جاتی ہو قبضہ کے قائم مقام ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی شخص نے غلہ خرید کر بائع سے یوں کہا کہ اس کو چکی میں پیس دو، یا غلہ خرید کر یوں کہا کہ اس کو اس بورے میں بھر دو، اتنا کہنے سے مشتری کو بیع پر قابض سمجھا جائے گا، اس کے بعد اب بائع جو تصرف کرے گا، یعنی بورے میں غلہ بھرنا، آٹا پیسنا یہ سب مشتری کی نیابت اور وکالت میں ہوگا اور اب بائع کا قبضہ مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا، اب ایسی صورت میں اگر بائع مشتری کے حکم سے بیع کسی دوسری جگہ بھیجے گا تو وہ مشتری کی نیابت ہی میں بھیجے گا، یہ وہ تفصیل ہے جو علامہ کاسانی نے ”بدائع الصنائع“ میں تحریر فرمائی ہے:

”ولو اشتری من إنسان کذا بعینه و دفعه غرائره وأمره بأن یکیل ففعل صار قابضا سواء کان مشتری حاضرا أو غائبا؛ لأن المعقود علیہ معین، وقد ملکہ مشتری بنفس العقد فصح أمر مشتری؛ لأنه تناول عینا هو ملکہ فصح أمره و صار البائع وکیلا له وصارت یدہ ید مشتری، وكذلك الطحن إذا طحن البائع بأمر مشتری صار قابضا“ (بدائع ۲۲۷)۔

اس تفصیل کے پیش نظر اگر کوئی شخص، مثلاً کسی فیکٹری یا کمپنی سے مال خریدتا ہے اور کمپنی سے فروخت شدہ مال کو دوسری جگہ اپنے مشتری کے پاس بھیجنے کو کہتا ہے، ایسی صورت میں مشتری کا اپنے مخصوص و متعین مال کو دوسری جگہ بھیجنے کیلئے کہنا ہی قبضہ کے قائم مقام سمجھنا چاہئے، جیسا کہ غلہ خرید کر آٹا پیسنے کا حکم دینے کو قبضہ کے قائم مقام کیا گیا۔

لیکن چونکہ یہ کہنا اور دوسری جگہ بھیجنے کا حکم دینا ہی قبضہ کے قائم مقام ہے، لہذا اس حکم سے پہلے اگر دوسری جگہ اس مال کی بیع کر چکا ہے پھر بھیجنے کا حکم دیا تو یہ صورت بیع قبل القبض کی ہوگی اور ناجائز ہوگی، البتہ بھیجنے کا حکم پہلے دے کر پھر اپنے مشتری سے معاملہ کیا جائے تو یہ صورت بعد القبض بیع کی ہوگی اور درست ہوگی۔

”ولو أودعه أو أعاره أجنبیا صار قابضا؛ لأن الإعارة والإيداع صحیح“ (بدائع ۲۳۶)۔

قبل القبض بیع کی ممانعت کی علت:

بیع قبل القبض کی ممانعت متعدد احادیث میں وارد ہوئی ہے، ائمہ مجتہدین نے ان احادیث کو معلول بالعلت قرار دیا ہے، اگر علت پائی جائے گی تو ممانعت کا حکم باقی رہے گا، ورنہ نہیں۔

ائمہ مجتہدین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل القبض بیع کی ممانعت کی تین علتیں ہیں اور وہ علتیں ایسی ہیں جو خود بھی مستقلاً حدیث سے ثابت ہیں، اور وہ یہ ہیں: (۱) احتمال غرر، (۲) ربح مالم یضمن، (۳) احتمال ربا النسیہ۔  
پہلی علت:

پہلی علت یعنی "احتمال غرر" اس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ قبل القبض بیع کرنے میں اس بات کا خطرہ اور احتمال ہے کہ شاید قبضہ سے پہلے بیع ہلاک ہو جائے اور سخ عقد کی نوبت آجائے کیونکہ مشتری خود نہیں جانتا کہ قبضہ سے پہلے بیع باقی رہے گی یا ہلاک ہو جائے گی اور اسی حال میں بیع کر رہا ہے، یہ صورت بلاشبہ غرر و خطر کی ہے، اور غرر حرام ہے، بکثرت احادیث و آثار صحابہ میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے، النرض چونکہ قبل القبض بیع میں غرر کا احتمال ہے جس کی ممانعت منصوص ہے اس علت کے پیش نظر قبل القبض بیع ممنوع ہے:

"لا يجوز بيع المنقول قبل القبض؛ لأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك قبل القبض؛ لأنه إذا هلك المبيع قبل القبض يفسخ العقد فيتبين أنه باء ما لا يملك والغرر حرام لما روينا أي أنه يحتمل الهلاك فلا يدري المشتري هل يبقى المبيع أو يهلك قبل القبض" (تبيين الحقائق ۲، ۸۰، فتح القدير ۶، ۱۳۶، الفقه الإسلامي وأدلته ۴، ۴۴۴)۔  
اس علت کا فقہاء احناف نے خاص طور پر ذکر فرمایا ہے، اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اشیاء غیر منقولہ جائداد وغیرہ کی قبل القبض بھی بیع جائز ہے، کیونکہ ممانعت کی علت، یعنی بیع کی ہلاکت کا احتمال اور غرر کا خطرہ اس میں نہیں ہے، اور اگر اس میں بھی ہو تو پھر اس کا بھی یہی حکم ہے، امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ شوافع و حنابلہ نے بھی اس علت کو اختیار فرمایا ہے (الفقه الاسلامی وأدلته ۴، ۴۴۴-۴۴۵)۔

دوسری علت:

قبل القبض بیع ممنوع ہونے کی دوسری علت "ربح مالم یضمن" ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ بیع سے مقصود ربح، یعنی نفع حاصل کرنا ہے اور "ربح مالم یضمن" یعنی مشتری کا ایسی شئی سے نفع حاصل کرنا جو بھی اس کے ضمان میں نہ آئی ہو شرعاً منہی عنہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً اس سے منع فرمایا ہے۔  
"عن عمرو بن شعيب عن أبيه: نهي رسول الله ﷺ عن سلف، وعن يبيع ما ليس عندك، وعن ربح ما لم تضمن" (مصنف عبد الرزاق ۸، ۳۹)۔

اور قبل القبض بیع ربح مالم یضمن کو مستلزم ہے، لہذا جب تک بیع مشتری کے ضمان میں نہ آجائے اس وقت تک اس کی بیع درست نہ ہوگی، اور ضمان میں آنے کی شکل صرف قبضہ ہے نہ کہ شرط ضمان، اسی وجہ سے امام ترمذیؒ نے امام احمدؒ سے حدیث کے الفاظ "مالم یضمن" کی تفسیر "مالم یقبض" سے فرمائی ہے۔  
"قوله لم تضمن فسرہ أحمد بقوله ما لم تقبض، ذكره الترمذی" (حوالہ سابق)۔

ممانعت کی اس علت کو امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمدؒ نے اختیار فرمایا ہے، اور اس علت ہی کی وجہ سے اپنے استاد امام کے مسلک کے خلاف اشیاء غیر منقولہ کی بیع کو بھی قبضہ سے پہلے ناجائز قرار دیا ہے، کیونکہ اگرچہ اس میں ہلاکت کا خطرہ نہ ہونے کی وجہ غرر کا احتمال نہیں لیکن "ربح مالم یضمن" کی علت تو موجود ہے کہ ایک شئی کے ضمان میں داخل ہوئے بغیر اس سے نفع اٹھا رہا ہے اور یہ منہی عنہ ہے۔

"وقال صاحباه: إن لم يكن فيه غرر الانفساخ ففي بيعه قبل القبض ربح ما لم يضمن، وهو منهي عنه" (إعلاء السنن ۱۲، ۲۲۵، مبسوط ۳، ۹، عنایہ علی الہامش ۶، ۱۳۴)۔

تیسری علت:

قبل القبض بیع ممنوع ہونے کی تیسری علت "احتمال ربا النسیہ" ہے، اس کو صرف مالکیہ نے اختیار کیا ہے اور بطور حکمت کے ابن قیمؒ نے بھی تہذیب السنن (۱۳/۵) میں ذکر فرمایا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ قبل القبض بیع "ربا النسیہ" کا ذریعہ ہے، اس لئے سد ذرائع کے طور پر اس کی ممانعت کی گئی، اور وہ اس طرح کہ مثلاً ایک شخص نے سو روپے کا غلہ خریدا اور غلہ پر قبضہ کئے بغیر اس مشتری نے دوسرے کے ہاتھ ایک سو بیس روپے میں فروخت کر دیا تو یہ ایسا

ہوا کہ گویا اس نے سو روپے کے عوض سو روپے دیئے اور یہ بیس روپے سود کے ہو گئے، کیونکہ مشتری نے بیع میں کچھ بھی تصرف نہیں کیا، یہ تفصیل اسی مثال کے ساتھ علامہ شوکانی نے تحریر فرمائی ہے جس کو مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے نقل فرمایا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: نیل الاوطار ۲۱/۵، اعلاء السنن ۱۳/۲۲۵)۔

چونکہ یہ صورت ربانسیہ کے مشابہ ہے، اس لئے سد ذرائع کے طور پر اس کی ممانعت کی گئی، اور چونکہ اس کی علت ربانسیہ ہے اسی وجہ سے امام مالکؒ کے نزدیک اس کی ممانعت صرف مطعومات، یعنی کھانے پینے کی چیزوں میں ہوگی وہ بھی اس وقت، جبکہ کیل و وزن کے ساتھ اس کی بیع ہو، اور اگر اس کے بغیر ہو تو ارتفاع علت کی وجہ سے یہ ممانعت بھی نہ ہوگی، بلکہ قبل القبض بھی اس کی بیع (جزافاً) جائز ہوگی (دیکھئے: الفقہ الاسلامی ۴/۴۷۳)۔

ممانعت کی یہ علت حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے، علامہ شوکانی نے اس کی تحسین فرمائی ہے:

”وسئل ابن عباس عن سبب هذا النهي فقال الدراهم بالدراهم والطعام ربا الخ“ (نیل الاوطار ۵/۲۱، اعلاء السنن ۱۳/۲۲۵)۔

اور بعض علماء کے فرمان کے مطابق قبل القبض بیع کی ممانعت معلول بالعلت نہیں، بلکہ یہ امر تعدی ہے (الفقہ علی المذہب الاربعہ ۲/۲۳۵)۔  
الغرض قبل القبض بیع کی ممانعت پر ائمہ اربعہ متفق ہیں گو علتوں میں فرق ہے، اور قبل القبض ممانعت کی بیع اتنی شدید ہے کہ مسلم شریف کی ایک روایت میں قبل القبض بیع کرنے پر ضرب و تادیب کا ذکر آیا ہے (مسلم شریف حدیث نمبر ۳۰۷۳، جملہ فتح الملہم ۳۵۷)۔

بیع قبل القبض کی ممانعت کا حکم عام ہے یا مخصوص:

جن احادیث میں قبل القبض بیع کی ممانعت آئی ہے وہ مطلق ہیں اور عام ہیں جس کا مقتضی یہ تھا کہ یہ حکم اشیاء منقولہ وغیر منقولہ سب کو عام ہوتا، لیکن ائمہ مجتہدین نے حدیث کی علت کے پیش نظر اس حکم میں تخصیص فرمائی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) حضرت امام شافعی اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منقولات، غیر منقولات، مکملات و موزونات، مذروعات و عددیات سب کو عام ہے، کسی بھی بیع کی قبل القبض درست نہیں، ان حضرات کے نزدیک دلیل اس کی یہی ہے کہ حدیث ”نہی عن بیع ما لم يقبض“ عام ہے، لہذا اس کا حکم بھی عام رہے گا، اور عقلی دلیل یہ ہے کہ بیع کی صحت کے واسطے چونکہ بیع پر قدرت علی التسليم شرط ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جبکہ بیع مقبوض ہو، غیر مقبوض پر قدرت علی التسليم کا تحقق نہیں ہوتا (المہذب ۱/۲۶۳، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۵۷۳، اعلاء السنن ۱۳/۲۲۳)۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قبل القبض بیع کی ممانعت کا حکم اشیاء منقولہ کے ساتھ خاص ہے۔

”إن أبا حنيفة خص النصوص بالمنقول بعلة النهي وهو غرر انفساخ العقد بالهلاك قبل القبض“ (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۳)۔

اشیاء غیر منقولہ اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ اس کی علت بیع کی ہلاکت کا خطرہ اور اس کے نتیجے میں فسخ عقد کا احتمال ہے جو غرر کی صورت ہے اور یہ علت اشیاء غیر منقولہ میں نہیں پائی جاتی، علت کے نہ پائے جانے کی وجہ سے معلول، یعنی ممانعت کا حکم بھی نہ پایا جائے گا، اور بالفرض اگر اشیاء غیر منقولہ میں بھی یہ احتمال موجود ہو، مثلاً یہ کہ زمین وغیرہ ایسے موقع پر ہوں جس میں کہ ضیاع و ہلاکت کا خطرہ ہو، ایسی صورت میں ممانعت کا حکم اشیاء غیر منقولہ کو بھی شامل ہوگا، ذیل یعنی نے اس کی تصریح فرمائی ہے:

”حتى لو تصور هلاكه قبل القبض لا يجوز بيعه وذلك، بأن كان على شط النهر ونحوه“ (فتح القدير ۶/۱۳۷، تبیین الحقائق ۴/۸۰)۔

(۳) امام احمد اور امام مالکؒ کے نزدیک قبل القبض بیع کی ممانعت کا حکم طعام، یعنی کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ خاص ہے وہ بھی اس وقت جب کہ ان کی بیع کیل یا وزن کے ساتھ ہو، غیر مطعومات اور وہ مطعومات جن کی بیع بغیر کیل و وزن کے ہو اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، یعنی ان کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے۔

امام احمد اور امام مالکؒ کا یہ مسلک ان کے مذہب کی اصل کتابوں میں اسی طرح منقول ہے اور دلیل اس کی یہ لکھی ہے کہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف طعام کی بیع کو قبل القبض منع فرمایا ہے جس کا مفہوم یہ نکلا کہ اس کے ماسوا کی بیع قبل القبض جائز ہے۔



”قال ابن قدامة: وقال الأثرم: سألت أبا عبد الله عن قوله: نهي عن ربح ما لم يضمن قال: هذا في الطعام وما أشبهه من مأكول أو مشروب فلا يبيعه حتى يقبضه، قال ابن عبد البر: الأصح عن أحمد بن حنبل أن الذي يمتنع من بيعه قبل قبضه وهو الطعام وذلك؛ لأن النبي ﷺ نهي عن بيع الطعام قبل قبضه فمفهومه إباحة بيع ما سواه قبل القبض“ (المغني ۲۰۱۲۲)۔

وفي المدونة: قلت: لم وسع مالك في أن أبيع ما اشتريت قبل أن أقبضه من جميع الأشياء كلها الطعام والشراب إذا كان جزافا وأبي أن يميز لي أن أبيع ما اشتريت مما يؤكل ويشرب كيلا أو وزنا قليلا أو كثيرا حتى أقبضه؟ قال: لأن النبي ﷺ نهي عن بيع الطعام قبل أن يستوفي وهو عندنا على الكيل والوزن وكل شيء ما خلا الطعام والشراب فهو جائز أن تبيعه قبل أن يستوفيه إن كنت اشتريته كيلا أو وزنا أو جزافا فهو سواء لأن الحديث إنما جاء في الطعام وحده“ (المدونة في الفقه المالكي ۲۰۸)۔

فیکٹری اور کمپنی سے خریدا ہوا مال قبضہ سے پہلے دوسرے کو فروخت کرنا:

فیکٹری سے خریدا ہوا مال جس پر کہ ابھی مشتری نے قبضہ بھی نہیں کیا اور معاملہ اس شرط کے ساتھ ہوا کہ نقصان ہونے کی صورت میں بائع کا نہیں، بلکہ مشتری کا نقصان ہوگا، ایسی صورت میں بغیر قبضہ کے بیع فروخت کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

(۱) ظاہرات ہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک صورت مسئلہ میں جب قبضہ حسی یا معنوی نہیں پایا گیا تو بلاشبہ یہ صورت ناجائز ہونی چاہئے اور مشتری پر ضمان کی شرط عائد کرنے کے باوجود بیع بائع کے ضمان سے خارج نہ ہوگی کیونکہ بیع کے بائع کے ضمان سے خارج ہونے کے لئے قبضہ شرط ہے اور قبضہ یہاں پایا نہیں گیا، لہذا بیع ابھی مشتری کے ضمان میں داخل نہیں ہوئی، اور نفس ضمان کی شرط قبضہ کے تحقق کیلئے کافی نہیں، کیونکہ ضمان کا انتقال خود قبضہ پر موقوف ہے اور قبضہ ضمان کا موقوف علیہ ہے، ایک ہی شئی موقوف اور وہی موقوف علیہ ہو یہ کیسے ممکن ہے، اور اقتضاء قبضہ بھی نہیں کہا جاسکتا اور نہ پھر قبل القبض بیع ممنوع ہونے کی کوئی بھی صورت نہ ہوگی، اور اس مضمون کی احادیث بے معنی ہو کر رہ جائیں گی، یہ گفتگو احناف کے مسلک کے مطابق ہے۔

(۲) حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک بھی بیع کے مشتری کے ضمان میں داخل ہونے کیلئے قبضہ شرط ہے اس کے بغیر ضمان منتقل نہ ہوگا، ابن رشد مالکی نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

”وعند الشافعي أن القبض شرط في دخول المبيع في ضمان المشتري“ (بدایہ المجتہد ۱۰۹)۔

”قال الشافعي: كل مبيع من ضمان البائع حتى يقبضه المشتري“ (المغني ۲۰۱۲۳)۔

(۳) امام مالکؒ کے نزدیک مطعومات کیلئے ووزنیہ میں انتقال ضمان کیلئے قبضہ شرط ہے اس کے علاوہ دیگر مبیعات میں نفس عقد ہی سے بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے۔

”وعمدة المالكية أن الجراف ليس فيه حق توفية فهو عندهم من ضمان المشتري بنفس العقد“ (بدایہ

المجتہد ۲۰۱۱۰)۔

(۴) امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مکملی و موزونی اور معدودی اشیاء کے علاوہ جملہ مبیعات میں قبضہ کے بغیر نفس عقد ہی سے بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے۔

”ما عدا المكيل والموزون والمعدود فإنه يدخل في ضمان المشتري قبل قبضه“ (المغني ۲۰۱۲۳)۔

حافظ ابن حجرؒ نے ”فتح الباری“ میں امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر ایک مسئلہ کے ضمن میں تفریح کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ اگر بیع متعین ہو تو نفس عقد ہی سے بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے۔

”و فرع بعضهم على ذلك أن المبيع إذا كان معيناً دخل في ضمان المشتري بمجرد العقد ولو لم يقبض

بخلاف ما يكون في الذمة فإنه لا يكون من ضمان المشتري إلا بعد القبض“ (فتح الباری باب ۵۷: ۴۰۲۵۲)۔  
مذکورہ بالا مذاہب کی تفصیل کے پیش نظر کسی مسلک کی رو سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محض یہ شرط لگا دینے سے کہ ”نقصان ہونے کی صورت میں بائع پر اس کا ضمان نہ ہوگا“ اتنا کہہ دینے سے بیع بائع کے ضمان سے خارج نہ ہوگی۔

بالفرض اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ صورت مسئلہ میں بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہوگئی تب بھی ربح مالیم یضمّن کے علاوہ ممانعت وعدم جواز کی دوسری علت ”قبل القبض“ کی موجود ہے، اور ضمان کی شرط لگا دینے سے قبضہ کا تحقق کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں، البتہ جن ائمہ کے یہاں جن صورتوں میں بیع قبل القبض کی اجازت ہے ان صورتوں میں جواز ہوگا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔  
جواز اور گنجائش کی صورتیں:

(۱) فیکٹریوں اور کمپنیوں کے توسط سے تجارت کرنے میں جس میں کہ مشتری اول بیع پر قبضہ سے پہلے ہی اس کو فروخت کر دیتا ہے اور اسی کے حکم سے کمپنی مشتری اول کے مشتری کو مال روانہ کر دیتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ صورت قبل القبض بیع کی ہے جو احناف و شوافع کے نزدیک تو ناجائز ہے، لیکن مالکیہ و حنابلہ کے نزدیک بلاشبہ جائز ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک صرف طعام یعنی کھانے پینے کی چیزیں جو کیل یا وزن سے فروخت کی جائیں ان کی بیع تو قبل القبض ناجائز ہے اس کے علاوہ جملہ اشیاء کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے، کیونکہ نفس عقد ہی سے بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے، اس لئے موجودہ حالات میں کوئی حرج نہیں کہ ضرورت عامہ کے پیش نظر مسلک حنفی سے عدول کر کے مالکیہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے جواز کا حکم لگایا جائے۔

اس سلسلہ میں محقق تھانوی کا فرمان بار بار غور سے پڑھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں:

”میں نے چاہا تھا کہ تمام اہل معاملہ اپنے اپنے معاملات کو سوالات کی صورت میں جمع کر کے مجھ کو دیں خواہ وہ تجارت پیشہ ہوں یا زراعت پیشہ ہوں یا ملازمت پیشہ، میں کوشش کر کے ان کے متعلق روایتیں جمع کر دوں گا اور احکام بتلا دوں گا، اگر کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے مذہب پر جواز نہ نکلتا تو میں نے یہ یہ طے کیا تھا کہ امام شافعی کے مذہب پر فتویٰ دوں گا، امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دوں گا، امام احمد بن حنبل کے مذہب پر فتویٰ دوں گا، اور ان سے بھی کوئی صورت نہ نکلے گی تو ان کی اہل تدابیر بتلاؤں گا کہ یوں کر لیا کرو جس صورت سے جواز نکل آتا، اور اگر کوئی بات سمجھ سے باہر ہوتی تو اس کا علاج نہیں معذوری ہے، لیکن اب اتنے بڑے کام کی ضعف کی وجہ سے ہمت نہیں (ملفوظات حکیم الامت ۳/۳۱۳)۔“

الغرض زیر بحث مسئلہ میں طعام، یعنی کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ میں مسئلہ آسان ہے کہ مالکیہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے جواز کا فتویٰ دیا جائے اور چونکہ نفس عقد ہی سے بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی لہذا ضمان کی شرط لگائے بغیر بھی مشتری ہی پر ضمان ہوگا، بلکہ اس کے خلاف شرط لگانے کی صورت میں بھی مشتری ہی پر ضمان ہونا چاہئے۔

(۲) البتہ طعام، یعنی کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت میں پھر بھی مسئلہ محل غور ہے، کیونکہ مطعومات کی بیع قبل القبض کسی کے نزدیک جائز نہیں، اور ضمان کی شرط عائد کر دینے سے قبضہ کسی کے نزدیک نہیں ہوتا، نیز دونوں علتیں مستقل ہیں، ضمان کی شرط کے باوجود قبل القبض بیع کی خرابی لازم آئے گی، اس لئے اس کے جواز کی آسان صورت یہی ہے کہ حنفی مسلک کے مطابق مشتری اگر حسی قبضہ پر قادر نہ ہو تو خود جا کر یا اپنے وکیل کو بھیج کر کم از کم قبضہ حکمی و معنوی کر لے جس سے کہ بیع اس کے ضمان میں داخل ہو جائے قبضہ معنوی کی صورتیں ماقبل میں گذر چکیں۔

(۳) جواز کی ایک شکل یہ ہے کہ کمپنی یا فیکٹری جس ذریعہ اور واسطہ سے مشتری کا مال دوسری جگہ بھیجتی ہے یہ مشتری اس ذریعہ اور واسطہ کو اپنا وکیل ہمیشہ کیلئے بنا دے خواہ وہ ایک ہوں یا متعدد، مثلاً یہ کہہ دے کہ فلاں کمپنی سے میرا مال آیا کرے گا اس کو اپنے قبضہ میں لے کر حسب ہدایت پہنچا دیا کرنا، اس صورت میں وہ واسطہ مشتری کا وکیل سمجھا جائے گا اور بیع بائع کے ضمان سے خارج ہو کر مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی۔

(۴) جواز کی ایک شکل یہ ہے کہ ابھی بیع کا معاملہ نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کرے، جب مال مشتری ثانی کے پاس پہنچ جائے تب بیع کا معاملہ کرے اور اگر پہلے کر بھی چکا ہے تو مال پہنچنے کے بعد پھر سے بیع کرے تاکہ یہ معاملہ درست ہو جائے، اخیر کی دونوں صورتوں کا تذکرہ مفتی عبدالرشید صاحب نے احسن الفتاویٰ میں کیا ہے (احسن الفتاویٰ ششم)۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں فساد و بطلان کی تعیین

مفتی محمد نجی الدین بڑودوی

### ۱۔ بیع قبل القبض از قبیل فاسد ہے یا باطل؟

باطل وہ ہے جو نہ اصلاً درست ہو اور نہ وصفاً، اور فاسد وہ ہے جو وصفاً درست نہ ہو۔ ہر وہ چیز جس سے رکن بیع میں خلل آتا ہو وہ باطل ہے اور جس شئی سے رکن بیع کے سوا دوسری طرح خلل آتا ہو وہ فاسد ہے، جیسے تسلیم و تسلیم میں خلل آتا ہو جو بیع کی وجہ سے واجب ہو گئے ہیں، یا بیع سے انتفاع مقصود میں خلل آتا ہو تو ایسی شئی مفسد بیع ہے، یا بیع خلاف مقتضی عقد شرط سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ خلل واقع ہو تو ایسی بیع بھی فاسد ہے۔

”والباطل هو ما لا يکون صحيحاً أصلاً ووصفاً والفساد هو ما لا یصح ووصفاً. وکل ما أورث خللاً فی رکن البیع فهو باطل وما أورث غیره کالتسليم والتسليم الواجبین به والانتفاء المقصود منه و عدم الاطلاق عن شرط لا یقتضیه و غیر ذلك فهو مفسد“ (عناية على الهدایة بهامش، فتح القدیر ۶۰۴۳)۔

یہ الگ بات ہے کہ فقہاء کرام کے یہاں فاسد کا لفظ اصطلاحی باطل اور فاسد دونوں پر بولا جاتا ہے، جہاں جہالت بیع یا ثمن مفضی رالی النزاع ہو اس پر بھی فساد کا اطلاق ہوتا ہے، اور بیع پر بایع کی ملک نہ ہونے کی صورت میں بھی فساد کا اطلاق ہوتا ہے، حالانکہ عدم ملک کی صورت میں فساد باطل کے معنی میں ہوتا ہے، اسی طرح تسلیم و تسلیم سے عجز کی صورت میں بھی فساد کا اطلاق ہوتا ہے۔

”ثم الفساد بالمعنى الذى يعمر الباطل يثبت بأسباب منها الجهالة المفضية فى البیع والضمن وبعدهم ملك البیع للبائع والفساد بمعنى البطلان إلا فى المسلم أو مع الملك لكن قبل قبضه و منها العجز عن التسليم و التسلم“ (فتح القدیر ۶۰۴۳)۔

در اصل بات یہ ہے کہ باطل کے بعض افراد اس قدر کمزور ہیں کہ فاسد سے ملتے جلتے ہیں، اس لئے ان کو فاسد کہہ دیا جاتا ہے اور فاسد کے بعض افراد میں فساد اس قدر قوی ہوتا ہے کہ ان کو باطل سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ قدوری نے مدبر اور ام ولد اور مکاتب کی بیع کو فاسد کہا۔ اور صاحب ”ہدایہ“ نے باطل کہا ہے۔ ”ہدایہ“ کے باطل کہنے پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ باطل تو وہ ہے جس میں ملک ثابت نہیں ہوتی ہے، اور فاسد وہ ہے جس میں قبضہ کے بعد ملک ثابت ہو جاتی ہے۔

اور فقہاء لکھتے ہیں، مدبر یا ام ولد یا مکاتب کے ساتھ ملا کر کسی خالص غلام کو بیچا جائے تو مدبر وغیرہ میں بیع باطل ہوگی، لیکن خالص غلام میں اسکے مقابل ثمن کے عوض بیع درست ہوگی، تو اگر بیع باطل ہے تو غلام میں بھی باطل ہونا چاہئے، اور فاسد ہے تو مدبر اور ام ولد پر بھی ملک ثابت ہونی چاہئے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ باطل اسلئے کہا گیا کہ مدبر اور ام ولد حر کی طرح قبضہ کے بعد بھی مملوک نہیں ہوں گے، اگر اس پر فساد کا اطلاق ہوتا تو یہ مغالطہ ہوتا کہ مدبر، ام ولد اور مکاتب بھی قبضہ کے بعد مملوک ہو سکتے ہیں۔

صرف خطرہ یہ ہے کہ بائع قبضہ دینے سے انکار کر دے تو مشتری کی ملک تام نہ ہو سکے گی، اس لئے اس کو فاسد قرار دیا ہے۔

تو بیع قبل القبض فاسد کا وہ فرد قوی ہے جو باطل سے ملتا جلتا ہے، لیکن درحقیقت فاسد ہے، جیسے بیع مدبر مع اقلن باطل کا فرد ہے جو فاسد سے ملتا جلتا ہے، لیکن درحقیقت باطل ہے۔ اس لئے بیع قبل القبض میں نفس عقد سے جو ملک وجود پذیر ہوتی ہے اس کی بنیاد پر اس کو باطل سے ممتاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ قبضہ کے بعد وہ ملک مؤکد ہو جاتی ہے۔ صاحب ”ہدایہ“ فرماتے ہیں:

”وإذا قبض المشتري البیع فى الفساد بأمر البائع وفى العقد عوضان کل منهما مال ملك البیع و لذمه



قیمتہ، وقال الشافعی: لا یملکھ وان قبضہ؛ لأنه محظور فلا ینال نعمة الملك الخ ولنا ان رکن البیع صدر من أهله مضافا إلى محله فوجب القول بانعقاده ولا خفاء فی الأهلیة وركنه مبادلة المال بالمال“ (ہدایہ)۔

(جب مشتری بیع فاسد میں بیع پر بائع کی اجازت سے قابض ہو جائے اور عقد میں دونوں عوض مال ہوں تو مشتری بیع کا مالک ہو جاتا ہے اور اس پر بیع کی قیمت لازم ہو جاتی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ بیع فاسد میں قبضہ کے بعد بھی مشتری مالک نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ بیع شرعاً ممنوع ہے، اس وجہ سے ایسی ممنوع بیع سے نعمت ملک حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ رکن البیع (مبادلتہ المال بالمال) صادر ہو رہا ہے اس کے اہل سے، اور محل بیع میں صادر ہو رہا ہے، اس لئے بیع کے منعقد ہو جانے کا قائل ہونا واجب ہے۔ اہلیت میں خفاء نہیں ہے، اور رکن مبادلتہ المال بالمال موجود ہے، اور کلام اسی میں ہے (ہدایہ)۔

۲۔ بائع کی طرف سے مشتری کو بیع میں تصرف پر قدرت دینے کا نام قبضہ ہے۔ جب بائع نے مشتری کو بیع میں تصرف کرنے پر آزاد چھوڑ دیا اور موانع اٹھانے تو مشتری بیع پر قابض سمجھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ تصرف پر قدرت اور تخلیہ ہرشی، ہر ماحول ہر زمانہ کے لحاظ سے بدل سکتا ہے، اس لئے اس کی کوئی حد قطعی مقرر نہیں کی جاسکتی۔

حضرت امام فخر الدین قاضیخان اپنے فتاویٰ میں رقمطراز ہیں: حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں بیع و مشتری کے درمیان تخلیہ تین شرطوں پر قبضہ شمار ہوگا: اول بائع مشتری کو زبانی طور پر کہہ دے کہ میں نے تمہیں بیع لینے کی اجازت دیدی ہے تم اسے لے لو، مشتری نے کہا کہ میں نے قبضہ کر لیا (لے لیا) (ظاہر بات ہے کہ عقار و غیر منقول میں اس قسم کا تخلیہ کافی ہو سکتا ہے)، دوسری شرط یہ ہے کہ بیع مشتری کے سامنے موجود ہو اس طرح کہ مشتری بیع کو لینا چاہے تو بلا کسی مانع (رکاوٹ) کے لے سکتا ہو (یہ منقولات کے بارے میں ممکن ہے)، تیسری شرط یہ ہے کہ بیع غیر کے حق سے معمور و پُر نہ ہو اور دوسرے کی ملک سے ممتاز و علیحدہ ہو، جیسے گھر میں بائع کا سبب، اگر دوسرے کے حق کو بیع معمور و پُر کر رہا ہو، جیسے گھروں بائع کے ظرف میں ہو یا اس جیسے کسی کو تو یہ تخلیہ میں مانع نہ ہوگا (قاضیخان ۲۵۸/۲)۔

### بیع فاسد میں قبضہ کی حیثیت:

حضرت علامہ فخر الدین قاضیخان فرماتے ہیں: ”البائع إذا خلی بین المبیع و بین مشتری بحيث یتمکن مشتری من قبضہ یصیر مشتری قابضا للمبیع حتی لو هلك قبل أن یقبضه حقیقة یهلك علیه، و کذا لو خلی مشتری بین البائع والشمع... أجمعوا علی أن التخلية فی البیع الجائز تكون قبضا وفي البیع الفاسد روايتان، والصحيح أنه قبض“ (فتاویٰ قاضیخان بہامش ہندیہ ۲۰۲۵)۔

(جب بائع نے بیع اور مشتری کو چھوڑ دیا کہ مشتری بیع کے قبضہ پر قادر ہو جائے تو ہلاکت مشتری کی ملک و قبضہ میں شمار ہوگی (بائع ضامن نہ ہوگا)، اسی طرح اگر مشتری نے بائع اور شمع میں تخلیہ کر دیا تو بائع شمع پر قابض شمار ہوگا۔۔۔ اس پر فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ بیع جائز میں تخلیہ کو قبضہ کہیں گے، اور بیع فاسد میں تخلیہ کے قبضہ ہونے کے بارے میں دو روایتیں ہیں، صحیح روایت یہ ہے کہ بیع فاسد میں بھی تخلیہ قبضہ شمار ہوگا)۔

### ہرشی میں تخلیہ اور قبضہ کی صورت جدا ہوگی:

”ولو باع تمرا علی النخیل و خلی بینہ و بین مشتری صار قابضا“ (قاضیخان)۔

(اگر کھجور درخت پر بیچ ڈالی اور مشتری کو اجازت دیدی تو مشتری قابض ہو گیا۔ تو کھجور کا درخت اگرچہ بائع کا مملوک ہے، مگر پھر بھی تخلیہ سے قبضہ ہو گیا)۔ لیکن گھر خریدا اور بائع کا سبب گھر میں ہے تو تخلیہ کے باوجود گھر پر قبضہ شمار نہ ہوگا، کیونکہ تخلیہ کو قبضہ قرار دینے کی شرط یہ ہے کہ بیع غیر کی ملک سے معمور و مشغول نہ ہو۔

اسی طرح زبانی تخلیہ کا قبضہ شمار ہونا عقار و غیر منقول اشیاء میں متصور ہے، جبکہ گھر یا جائداد قریب ہو اور حق غیر سے خالی ہو، لیکن گھر یا جائداد دور ہو اور مشتری اس میں داخلہ یا اس کو مقفل کرنے پر قادر نہ ہو تو صرف زبانی کہہ دینے سے مشتری قابض نہ ہوگا، بلکہ حقیقی قبضہ مطلوب ہوگا، مثلاً دوسرے ملک میں جائداد ہے کہ مشتری بلا دیر وغیرہ کے پہنچ نہیں سکتا تو زبانی تخلیہ سے قابض نہ ہوگا، جب تک کہ مشتری یا اس کا وکیل قابض نہ ہو جائے۔

آج کل جائداد وغیرہ کے دستاویز جو بواسطہ عدالت ہوتے ہیں۔ ایک ملک میں ہوں اور جائداد حق غیر میں مشغول نہ ہو، قبضہ شمار ہو سکتے ہیں۔ لیکن

دوسرے ملک میں ہوں تو دستاویز کے باوجود بھی مشتری کو قابض نہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ قاضی خاں فرماتے ہیں:

اگر کسی شخص کے ہاتھ مکان فروخت کیا اور مکان بائع و مشتری کے سامنے موجود نہیں ہے، بائع نے کہا میں نے سپرد کر دیا، مشتری نے کہا میں نے قبول کیا، تو ظاہر الروایہ میں ہے کہ مکان اور جائیداد غیر منقولہ میں یہ زبانی تخلیہ قبضہ کے قائم مقام ہوگا، جبکہ مکان قریب ہو۔ اور نوادروایت میں ہے کہ جب بائع مشتری سے کہتا ہے میں نے مکان سپرد کر دیا اور مشتری کہہ دے کہ قبول کیا، مکان سامنے موجود نہیں ہے (مگر وہ پہلے دیکھ لیا ہو) تو امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق مشتری قابض ہو جائے گا (خواہ مکان قریب ہو یا دور ہو)، اور صاحبین فرماتے ہیں کہ مکان قریب ہو اور داخلہ ممکن ہو یا مشتری اس پر اپنا نقل لگا سکتا ہو تب تو زبانی تخلیہ قبضہ شمار ہوگا اور مشتری قابض کہلائے گا، ورنہ نہیں، لیکن ظاہر الروایت میں قریب کا اعتبار ہے، اور صاحبین اور امام صاحب کے درمیان اختلاف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور صحیح وہی ہے جو ظاہر الروایت میں ہے، کیونکہ جب مکان قریب ہو اور حقیقی قبضہ متصور ہو تو تخلیہ حقیقی قبضہ کے قائم مقام بن سکتا ہے، اور اگر مکان دور ہو اور قبضہ حقیقی متصور نہ ہو تو تخلیہ اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ بہ اور صدقہ میں بھی یہی حکم ہے (قاضی خاں ۲۵۷/۲)۔

اس مذکورہ تفصیل سے قبضہ حقیقی اور حکمی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

۳۔ مذکورہ بالا وضاحت سے اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت واضح ہو گئی کہ منقولہ میں اشیاء کے لحاظ سے نوعیت جدا ہو سکتی ہے اور غیر منقولہ میں نوعیت کا فرق ممکن ہے، اور یہ شریعت میں قبضہ کا ایک خاص مفہوم ہے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی نوعیت مقام و مواقع کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے، لوگوں کے عرف و عادت کا اعتبار تو ہوگا، مگر قبضہ کے شرعی مفہوم اور تخلیہ کی شرائط کی رعایت ضروری رہے گی۔ عرف و عادت میں قبضہ اور قبضہ شرعی میں تساوی نہیں ہے بلکہ عام خاص من وجہ کی نسبت ہے۔

۵، ۴۔ احادیث متعلقہ بیع قبل القبض اور ممانعت کی نوعیت:

حضرت امام مالکؒ کے یہاں طعام مکیل و موزون کے ساتھ مخصوص ہے، اور حضرت امام احمدؒ کے یہاں بھی طعام کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسری اشیاء میں ”بیع قبل القبض“ جائز ہے۔

حضرت امام محمد اور حضرت امام شافعیؒ کے یہاں ”بیع قبل القبض“ جائز نہیں ہے، نہ منقولات نہ غیر منقولات میں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول اول بھی یہی ہے، لیکن حضرات شیخین کا قول معمول بہ یہ ہے کہ منقولات میں ”بیع قبل القبض“ جائز نہیں ہے اور عقار وغیر منقولات میں ”بیع قبل القبض“ جائز ہے۔

حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا استدلال وہ احادیث ہیں جن میں خاص طعام کی بیع سے ممانعت ہے۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں: ”قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا يبيعه حتى يكتاله فقلت لابن عباس لم؟ فقال ألا تراهم يتبايعون بالذهب والطعام مرجأ ولم يقل أبو كريب مرجأ“ (مسلم شریف)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی غلہ خریدے تو اس کو مکیل کرنے سے قبل فروخت نہ کرے، تو میں نے ابن عباسؓ سے دریافت کیا کیوں؟ فرمایا تم (دیکھ رہے ہو) کہ لوگ سونے اور طعام (غلہ) کے عوض ادھار بیچتے ہیں۔ اور ابو کریب نے ادھار کا لفظ نہیں کہا)۔

اسی طرح مختلف طرق سے یہ روایت مروی ہے جسکو مسلم نے بیان کیا ہے، اور روایت کے عام طرق میں طعام کے ساتھ ہی ممانعت کو مخصوص کیا گیا ہے، اس لئے حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے ممانعت کو طعام کے ساتھ ہی مخصوص مانا ہے۔ خاص طعام کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے ماسوا میں حکم اس کے خلاف ہے، ورنہ تخصیص کا فائدہ ظاہر نہ ہوگا۔ ہم نے اس کا جواب دیا ہے کہ خاص طور پر کسی حکم کو کسی شے کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس شے کے ماسوا میں حکم اس کے خلاف ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فلا تظلموا فيهن أنفسكم“ (سورہ توبہ: ۳۶) (اشہر حرام میں اپنے اوپر ظلم نہ کیا کرو)۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اشہر حرام میں ظلم کرنا چاہئے۔

دیگر ائمہ فرماتے ہیں کہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جن میں مطلقاً ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت ہے اور ایسی روایات بھی موجود ہیں جن میں ممانعت کی صراحت ہے۔ ترمذی شریف میں عبد اللہ بن عمرو کی روایت ہے: ”إن رسول الله ﷺ قال لا يحل سلف ولا بيع ولا شرطان في بيع ولا ربح مالم يضمن ولا بيع ما ليس عندك أخرجه الترمذی فی باب كراهية بيع ما ليس عنده“ (وقال هذا حديث حسن

(صحیح)۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قرض اور بیع جائز نہیں اور ایک بیع میں دو شرطیں جائز نہیں اور جوئی اپنے ضمان و ذمہ داری میں نہیں آئی اس کا نفع : فائدہ حلال نہیں ہے اور جوئی اپنے پاس نہیں (جس کا مالک نہیں) اس کی بیع جائز نہیں)۔

دوسری روایت حکیم بن حزام کی ہے: ”عن حکیم بن حزام قال: قلت: یا رسول اللہ ﷺ إني أبتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال يا بن أخي لا تبعن شيئا حتى تقبضه وفي رواية أبا ن إذا اشتريت بيعا فلا تبعه حتى تقبضه۔ هذا اللفظ للبيهقي في سننه وقال: هذا إسناد حسن متصل و أخرجه أيضا ابن حبان في صحيحه و أحمد في مسنده (۳۱۲۰۲) وفيه تعميم الحكم لكل شيء“۔

(حکیم بن حزام فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تجارت کر رہا ہوں تو ان میں سے کون سی بیوع میرے لئے حلال اور کون سی بیوع حرام ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ایک ضابطہ کلیہ بیان کیا کہ کسی شیء کو قبضہ سے پہلے نہ بیچو، اور ابان کی ایک روایت میں ہے کہ جب کسی بیع کو خریدو تو جب تک قبضہ نہ کر لو فروخت نہ کرو۔ اس روایت میں ممانعت کا حکم ہر شیء پر عام ہے)۔

بیع قبل القبض کی نہی معلول بالعلت ہے:

گذشتہ روایات میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت گزری ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ نے خود ایک علت بیان کی ہے: ”لوگ سونے اور غلہ کے عوض ادھار بیع کرتے ہیں“۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیع منتج ہوتی ہے ”بیع الذہب بالذہب متفاضلاً“ پر۔ کیونکہ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص نے سو دینار میں ایک شیء فروخت کی، ثمن ادا کر دیا، بیع بائع کے قبضہ میں ہے، اور مشتری نے قبضہ سے پہلے ہی اس شیء کو ایک سو بیس دینار کے عوض فروخت کر دیا اور ایک سو بیس دینار لے لئے۔ گویا مشتری نے طعام پر قبضہ نہ کر کے بالا ہی بالا اس کی بیع کر دی تو نتیجہ یہ ہوا کہ مشتری نے بائع کو جو سو دینار دئے تھے اس کے بالمقابل اپنے مشتری سے ایک سو بیس دینار لے رہا ہے تو اس مشتری اول کو بیس دینار کا اضافہ سود کے بدلہ لے رہا ہے۔ طعام تو گویا درمیان میں رہا ہی نہیں۔

یہ علت منقولات اور غیر منقولات سب پر عام ہے کہ عقار کی بیع بھی قبل القبض جائز نہ ہونا چاہئے، منقولات کی خصوصیت نہیں ہے، لیکن یہ تعلیل حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے خلاف جاری ہے، کیونکہ وہ عقار کی بیع کو قبل القبض جائز قرار دیتے ہیں۔

اس لئے دیگر حضرات نے علت ”ربح مالم یضمن“ قرار دی اور کہا کہ ”بیع قبل القبض“ میں مشتری ایک ایسی شیء سے نفع اٹھا رہا ہے جس کے نقصان کا وہ ذمہ دار نہیں ہے، اس لئے یہ بیع جائز نہیں، اور عقار کی قبل القبض بیع میں ”ربح مالم یضمن“ کا تصور نہیں ہے، کیونکہ عقار کی ہلاکت متصور نہیں ہے، جب نقصان کا پہلو بیع عقار میں نہیں ہے تو ”ربح مالم یضمن“ بھی متحقق نہ ہوگا اور یہ علت حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مذکورہ بالا روایت میں مذکور ہے (تکملہ فتح ۲۹۲)۔

”تکملہ فتح المہم“ میں عبداللہ بن عمروؓ کی روایت کے حوالہ سے ”ربح مالم یضمن“ کے علت ہونے کے بارے میں صرف اشارہ ہے، لیکن مسئلہ وضاحت طلب ہے۔

حضرت علامہ شمس الدین سرخسیؒ نے اس مسئلہ پر مبسوط کلام کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

شیخین کے نزدیک بیع عقار قبل القبض جائز ہے، اور امام محمد و شافعی کے یہاں جائز نہیں ہے، حضرت امام محمد و شافعی اسی عبداللہ بن عمروؓ والی روایت اور بیع قبل القبض کی نہی کے بارے میں جو عمومی روایات آئی ہیں ان سے استدلال کرتے ہیں۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ بیع عقار قبل القبض میں بھی۔ جبکہ اپنی خرید قیمت سے زیادہ میں فروخت کیا جائے تو۔ ربح مالم یضمن کا متحقق ہوتا ہے، کیونکہ اس نے بیع قبل القبض کی بیع کی ہے، تو جس طرح منقول میں ”ربح مالم یضمن“ لازم آتا ہے عقار میں بھی لازم آئے گا، اس لئے دونوں میں بیع قبل القبض جائز نہ ہوگی، وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ملک عین (ذات) نفس عقد سے حاصل ہوتی ہے تو قبضہ سے ملک تصرف حاصل ہوتی ہے، اور عقار و منقول ملک عین و ملک تصرف میں برابر ہیں تو حکم میں بھی یکسانیت ہونی چاہئے۔

ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ سبب ملک بیع ہے اور بیع بلا قبضہ کے تام نہیں ہوتی ہے، اس لئے قبضہ سے پہلے عقد کے بعد بیع میں جو اضافہ حاصل ہوتا ہے، اس کو بوقت عقد موجود مان کر بیع میں شامل رکھا جاتا ہے، اور ملک مؤکد ہوتی ہے سبب ملک کے مؤکد ہونے سے (اور سبب ملک قبضہ سے مؤکد ہوتا ہے) اس میں



منقول وغیر منقول برابر ہیں۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”قبضہ سے قبل بیع مضمون بغیرہ ہوتی ہے، یعنی ثمن سے مضمون ہوتی ہے، (مشتري ثمن کا ذمہ دار ہوتا ہے) اگر قبضہ سے قبل بیع ہلاک ہو جائے تو مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط ہو جاتا ہے، اسی طرح عقار کی ہلاکت متصور ہو اور قبل القبض ہلاک ہو جائے تو ثمن ساقط ہو جائے گا، جب ثمن کے ضمان میں دونوں یکساں ہیں تو پھر ”رجع الم یضمّن“ کے بارے میں بھی دونوں یکساں رہیں گے۔

ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ عقار ہو یا منقول ہو جواز بیع کے لئے قدرت علی التسليم دونوں میں شرط ہے، قدرت علی التسليم بذاتہ حاصل ہو یا نائب و وکیل کے واسطے سے ہو، تو عقار جب تک بائع کے قبضہ میں ہے بائع اول کا قبضہ مشتری اول کے قبضہ کا نائب نہیں ہے، اس لئے مشتری اول کو بواسطہ نیابت قادر علی التسليم نہیں مانا جاسکتا، اسلئے بیع عقار قبل القبض قدرت علی التسليم نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

حضرات شیخین فرماتے ہیں کہ بیع عقار قبل القبض کا وہی درجہ ہے جو بیع منقول قبل القبض کا درجہ ہے، لیکن تصرف کے جواز کا مدار صرف ملک پر ہے قبضہ پر نہیں ہے۔

دیکھئے اپنے مودع یا غاصب کے قبضہ میں کوئی شیء ہے اور مودع اور غاصب کو اقرار ہے کہ اس شیء کا مالک فلاں ہے، تو فلاں کیلئے اس شیء کو فروخت کرنا مودع اور غاصب کے قبضہ میں رہتے ہوئے بھی جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ تصرف کا مدار ملک پر ہے۔

البتہ غرر جواز تصرف میں مانع بن جاتا ہے اگر ملک میں غرر درپیش ہو اور اس غرر سے احتراز ممکن بھی ہو تو غرر سے بچ کر چلا جائے اور غرر کی موجودگی میں بیع نہ کی جائے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع الغرر سے منع فرمایا ہے۔

منقول میں قبضہ سے پہلے ملک (مشتري) میں غرر ہے، اس لئے کہ بیع کی ہلاکت سے بیع منتفص ہو جائے گی اور مشتری کی ملک باطل ہو جائے گی، اور قبضہ کے بعد یہ غرر منتفی ہو جاتا ہے، اگر احتمال غرر رہتا ہے تو بیع کے استحقاق کا رہتا ہے، اور اس قسم کے غرر سے احتراز ممکن نہیں ہے (اس لئے ایسے غرر کا اعتبار بھی نہیں اور اس کو مانع عن البیع نہیں قرار دیا جاسکتا)۔ اور عقار میں قبضہ سے پہلے استحقاق کے سوا مشتری کی ملک میں کوئی غرر متصور نہیں ہے، جس سے ہلاکت بیع اور نسخ بیع کی نوبت آجائے (اسلئے عقار کی بیع قبل القبض جائز ہے)۔

علامہ شمس الدین السرخسی فرماتے ہیں: ”وانتفاء الغرر لعدم تصور سببه أصلاً يَكُونُ أبلغ من انتفاء الغرر إذا تصور سببه ولم يعمل وإنما يتصور الغرر فيه من حيث الاستحقاق وذلك لا يَكُنُ الاحتراز عنه والدليل عليه أن التصرف في الثمن قبل القبض جائز؛ لأنه لا غرر في الملك وكذلك التصرف في المهر قبل القبض يجوز عندنا لانعدام الغرر في الملك، فإن بالهلاك لا يبطل ملكها ولكن على الزوج قيمتها“ (المبسوط ۱۰، ۱۱)۔

سبب غرر کے بالکل متصور نہ ہونے کی وجہ سے غرر نہ ہونا زیادہ موثر ہے بہ نسبت اس کے کہ سبب غرر متصور ہو اور موثر نہ ہو (کیونکہ سبب غرر کا متصور ہونا بھی شبہ کا ناشی ہے) غیر منقول میں جبکہ استحقاق کے سوا دوسرا سبب غرر متصور ہی نہیں تو مانع بیع کا شبہ ہی نہیں ہے۔ استحقاق متصور ہے، لیکن احتراز ممکن نہ ہونے کی وجہ سے وہ مانع نہیں ہے۔

اور اس بات کی دلیل کہ جواز تصرف کا مدار عدم غرر پر ہے کہ ثمن میں قبل القبض تصرف جائز ہے، اس لئے کہ ثمن (نقد) کی ملک میں غرر نہیں ہوتا، کیونکہ عقود میں دراہم و دنانیر متعین نہیں ہوتے، اسی طرح مہر میں قبضہ سے پہلے زوجہ تصرف کر سکتی ہے کیونکہ مہر کی ملک میں غرر ہے ہی نہیں، اس لئے کہ مہر میں قبضہ سے قبل ہلاکت کی صورت میں مہر کی ملکیت باطل نہیں ہوتی، بلکہ شوہر پر ہلاک شدہ مہر (اگر عرض ہو) کی قیمت کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرات شوافع میں مہر کے قبل القبض ہلاکت کی صورت میں اختلاف ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ ہلاکت کی صورت میں تسمیہ باطل ہو جائے گا وہ قبضہ سے قبل مہر میں تصرف کے قائل نہیں ہیں ”لبقاء الغرر في الملك“ ملک میں غرر کی موجودگی کی وجہ سے، اور جو یوں کہتے ہیں کہ ہلاکت مہر سے تسمیہ باطل نہیں ہوتا وہ قبل القبض تصرف کو جائز قرار دیتے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل وہی ہے جو ہم کہتے ہیں کہ تصرف کا مدار عدم غرر پر ہے۔

فرماتے ہیں: جس تصرف سے غرر مانع نہیں ہے ایسا تصرف قبضہ سے پہلے بھی بیع میں جائز ہوتا ہے (جیسے آبق و عتق)، چنانچہ بیع قبل القبض میں عتق

نافذ ہو جاتا ہے، اسی طرح تزویج بیع قبل القبض میں نافذ ہو جاتی ہے (مبسوط)۔

اسی سے حضرات شوافع کے اس استدلال کا فساد واضح ہو جاتا ہے کہ ملک مؤکد ہوتی ہے سبب ملک کے مؤکد ہونے سے (یعنی بیع کے مؤکد ہونے سے) اور بیع قبضہ سے مؤکد ہوتی ہے (اس لئے بلا قبض عقار کی بیع بھی جائز نہ ہونا چاہئے، کیونکہ منقول و عقار اس سبب میں متفق ہیں تو حکم میں بھی متفق رہنا چاہئے)، کیونکہ عتق تاکد ملک کے تقاضہ میں محل کے اندر بیع سے بڑھ کر اور مضبوط ہے۔

رہی یہ بات کہ شوافع کہتے ہیں کہ ملک تصرف مشتری کو قبضہ سے حاصل ہوتی ہے اور قبضہ سے ہی بیع مشتری کے ضمان میں آتی ہے، ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ محل میں تصرف کی ملک (حق) اصل ملک سے ہی ثابت ہو جاتی ہے (ضمان سے ثابت نہیں ہوتی)، اس کی دلیل یہ ہے کہ موہوب شی میں قبضہ کے بعد تصرف جائز ہے (قبضہ سے قبل موہوب میں تصرف جائز نہیں ہے) کیونکہ ہبہ میں قبضہ کے بعد ہی ملک تام ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ تصرف کا مدار ملک پر ہے، اسی طرح قدرت علی التسلیم بھی ضمان سے متعلق نہیں ہے، بلکہ ملک سے متعلق ہے، چنانچہ قدرت علی التسلیم غیر کے ہاتھ سے بھی ثابت ہو جاتی ہے جبکہ مالک منع نہ کرے۔

اور حضرات شوافع کا یہ کہنا کہ حدیث نبی عام ہے اس لئے منقول اور غیر منقول سب پر عام رہے گی، ہمیں تسلیم نہیں ہے، کیونکہ حدیث اپنے عموم پر باقی نہیں ہے، اس میں تخصیص ہو چکی ہے، اس لئے کہ سب اس پر متفق ہیں کہ ثمن میں قبل القبض تصرف جائز ہے اور مہر میں بھی قبضہ سے پہلے تصرف جائز ہے۔ لہذا عام خص منہ البعض میں قیاس سے تخصیص جائز ہے، اس لئے ہم اپنی دلیل مذکور سے حدیث عام کو منقول پر محمول کرتے ہیں اور خاص سمجھتے ہیں۔ اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ حق شفیع کو قبل القبض ہی مل جاتا ہے، اور شفیع بدل و قیمت سے ہی جائداد کا مالک ہو سکتا ہے، تو عقار قبل القبض مملوک بننے کا احتمال نہ رکھتی ہو تو شفیع کو بھی قبضہ سے پہلے اس عقار کو قبضہ سے پہلے لینے کا حق نہ ملنا چاہئے۔

لیکن حق شفیع کو قائم مقام حق مشتری کا قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ حق شفیع مشتری کے حق سے مقدم ہے، اسی لئے شفیع کے بے لینے کی وجہ سے ملک مشتری باطل ہو جاتی ہے، اور ذمہ داری بائع پر عائد ہو جاتی ہے (المبسوط سرخسی ۱۰/۱۳)۔

☆☆☆



## خرید و فروخت میں قبضہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم

مفتی شبیر احمد قاسمی

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک کہ قبضہ کی حقیقت واضح نہ ہو جائے، اس لئے سب سے پہلے قبضہ کی حقیقت واضح کرنا ضروری ہے۔

قبضہ کی حقیقت:

کسی شے پر قبضہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہاتھ سے قبضہ کر کے لایا جائے یا بائع کے یہاں سے حقیقی طور پر منتقل کر لیا جائے، بلکہ مفہوم قبضہ کے دائرے میں داخل ہونے کیلئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ بائع شے بیع کو اپنے مال سے اس طرح الگ کر کے رکھ دے کہ خریدار جب چاہے اپنی چیز اپنی مرضی سے اٹھا کر لے جاسکے اور اختیار سے اٹھا کر لے جانے میں اس پر کوئی پابندی یا رکاوٹ پیش نہ آئے، لہذا اگر بائع نے شے بیع کو اپنے مال سے اس طرح الگ کر دیا ہے کہ خریدار جب چاہے لے جاسکتا ہے اور اس درمیان شے بیع بائع کی طرف سے تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو بائع پر کوئی تاوان ہوگا، بلکہ خریدار کی ملکیت میں سے اس کے گھر میں ہلاک ہو جانے کے حکم میں ہوگا، اس مسئلہ کی وضاحت کیلئے ہم چند فقہی جزئیات نقل کرتے ہیں:

”ولا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتقاء الموانع عرفاً وعادة حقيقة الخ“ (بدائع ۵، ۱۲۸)۔

(قبضہ حاصل ہونے کیلئے ہاتھ سے قبضہ کر کے لانا شرط نہیں ہے اس لئے کہ قبضہ کے معنی صرف قبضہ کرنے پر قادر ہونے اور بائع کا خریدار کے سامنے سامان کو چھوڑ دینے کے ہیں اور لوگوں کے عرف میں صحیح معنی میں قبضہ کرنے میں رکاوٹ دور ہو جانے کے ہیں)۔

صاحب ”بائع“ نے آگے چل کر مزید وضاحت فرمائی ہے۔ ”ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلي في سائر الأموال الخ“ (بدائع ۴، ۲۲۲)۔ (حضرات فقہاء احناف کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اصل قبضہ تمام اموال میں بائع کی طرف سے محض اختیار دینے اور سامنے رکھ دینے سے حاصل ہو جاتا ہے)۔

اور صاحب ”بائع“ نے ایک جزئیہ اس سے بھی واضح نقل فرمایا ہے: ”تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلي والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲)۔ (خریدار کو مال بیع سونپنے اور اس کے قبضہ کرنے کی تفصیلی وضاحت ہمارے علماء احناف کے نزدیک یہی ہے کہ خریدار کیلئے تخلیہ کر دیا جائے اور تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع کو خریدار کیلئے اس طرح پیش کر دے کہ درمیان سے رکاوٹ اس طرح دور ہو جائے کہ مشتری کو اس میں تصرف کرنے میں پوری طرح قدرت حاصل ہو جائے، تو کہا جائے گا کہ بائع نے بیع کو سونپ دیا اور مشتری نے قبضہ کر لیا ہے)۔

اشیاء منقولہ کی بیع قبضہ سے پہلے:..... اشیاء منقولہ ایسی اشیاء کو کہا جاتا ہے جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن ہو اور ایسی اشیاء پر قبضہ کے ثبوت کیلئے اتنا کافی ہے کہ بائع کی طرف سے مشتری کو قبضہ پر آزادانہ قدرت حاصل ہو جائے، لہذا قبضہ پر آزادانہ اختیار حاصل ہونے کے بعد مشتری کیلئے ان اشیاء میں تصرف کرنا اور دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا سب بلا کراہت جائز اور درست ہے (بدائع الصنائع ۵، ۱۲۸، ۲۲۲)۔

اشیاء منقولہ کے اقسام:

قاسمہ شاہی، مراد آباد (یو پی)۔



جو اشیاء منتقل کی جاسکتی ہیں وہ چار قسم کی ہیں:

(۱) کیلی اشیاء، جیسا کہ دودھ اور تیل وغیرہ جو کہ اکثر ممالک میں کیل کر کے فروخت کیا جاتا ہے اور قدیم زمانہ میں گیہوں، چاول، بھی کیل ہی کر کے فروخت کیا جاتا تھا، لہذا ایسی اشیاء کو کیل کر کے الگ کر دینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

(۲) وزنی اشیاء، جیسے دھات، سونا، چاندی پیتل، تانبا، دانگ، المونیم، لوہا وغیرہ اور اسی طرح اس زمانہ میں چاول، گیہوں وغیرہ بھی وزن کر کے فروخت کیا جاتا ہے، لہذا ایسی اشیاء کو وزن کر کے الگ کر دینے سے قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

(۳) زرعی اور پیمائشی اشیاء، جیسے کپڑے وغیرہ جو پیمائش سے فروخت کیا جاتا ہے، لہذا ایسی اشیاء کو پیمائش کر کے الگ کر دینے سے قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

(۴) عددی اشیاء، جس کو شمار اور گنتی سے فروخت کیا جاتا ہے، جیسے انڈے، جانور، گاڑی وغیرہ تو ایسی اشیاء کو شمار کر کے الگ کر دینے سے قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

اور ان چاروں قسم کی اشیاء کو الگ کر دینے کے بعد ثبوت قبضہ کیلئے آزادانہ قدرت حاصل ہونا بھی شرط ہے، علامہ کاسنائی نے ”بدائع الصنائع“ میں ان مسائل کو ان عبارتوں میں نقل فرمایا ہے: ”وان باء مکایلة أو موزونة فی المکیل والموزون وخلقى، فلا خلاف فی أن المبیع ینخرج عن ضمان البائع ویدخل فی ضمان المشتري... فإن کان مما لا مثل له من المذروعات والمعدودات المتقاربة فالتخلية فیها قبض تام بلا خلاف“ (بدائع الصنائع ۵۰۲۲۲)۔

اور اگر کیلی چیز کو کیل کر کے اور وزنی چیز کو وزن کر کے الگ کر دیا ہے تو اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ شئی بائع کے ذمہ سے نکل کر خریدار کے ذمہ میں داخل ہو جاتی ہے، اگر اشیاء مثلی نہ ہوں، بلکہ پیمائشی اور گنتی کی اشیاء ہوں تو ان میں الگ کر کے اختیار دینے سے بالاتفاق مکمل قبضہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اب مذکورہ دلائل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عددی اور پیمائشی اشیاء، جیسے، گاڑی، جہاز، لوہے، پیتل، کاغذ، غلہ، لکڑی، کپڑے کتاب جانور وغیرہ کا سودا مکمل ہو جانے کے بعد جب بائع مشتری کو قبضہ کا اختیار دیدیتا ہے تو بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے یا مشتری کے حکم سے بیع کو اپنی اشیاء سے الگ کر دے گا تو بائع کے ضمان سے منتقل ہو کر مشتری کے قبضہ اور اس کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے، جیسا کہ کتب فقہ کی مذکورہ عبارات سے واضح ہو جاتا ہے، لہذا مشتری کو اپنے یہاں منتقل کرنے سے قبل ان اشیاء میں تصرف کرنے اور دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا پوری طرح حق حاصل ہو جائے گا۔

غیر منقول اشیاء کی بیع قبضہ سے پہلے:

غیر منقولی اشیاء ایسی اشیاء کو کہا جاتا ہے جن کو اپنی جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن نہ ہو، جیسا کہ زمین، مکان، دوکان، تجارتی پلاٹ وغیرہ، تو ایسی اشیاء اور جائیداد کی خرید و فروخت میں صرف سودا اور معاملہ طے ہو جانے سے قبضہ کا ثبوت ہو جاتا ہے، لہذا ایسی اشیاء میں معاملہ طے ہو جانے کے بعد خریدار کیلئے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینا جائز ہو گا باقاعدہ وہاں جا کر اپنا سامان ڈال دینا یا چہار دیواری وغیرہ بنا دینا لازم نہیں ہے اور اشیاء غیر منقولہ کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کے جواز کو صاحب ہدایہ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

”ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف“ (ہدایہ ۳۰۵۸)۔

(حضرت امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کے نزدیک غیر منقول اشیاء کی فروختگی قبضہ سے پہلے جائز ہے)۔

”أما بیع الأعیان غیر المنقولة قبل قبضها کبیع الأرض والضياع والنخيل والدور ونحو ذلك من الأشیاء الثابتة التي لا یخشی هلاکها، فإنه یصح الخ“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲۰۲۲)۔ (بہر حال اشیاء غیر منقولہ کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا، مثلاً زمین، جائیداد، باغات، مکانات اور ان جیسی اشیاء جو قائم و ثابت ہیں جن کی ہلاکت کا کوئی خطرہ نہیں، صحیح ہے)۔

قبضہ کا مدار عرف پر ہے نصوص پر نہیں:

اسلامی شریعت نے کسی چیز میں تصرف سے پہلے اس پر مالکانہ قبضہ کا حکم فرمایا ہے اور مالکانہ قبضہ سے پہلے تصرف جائز نہیں ہے، اور ممانعت سے متعلق کتب حدیث میں مختلف قسم کی روایات موجود ہیں، اور ان میں سے حضرت حکیم بن حزام کی روایت زیادہ صریح اور واضح معلوم ہوتی ہے، مسند امام احمد بن حنبل

میں حضرت حکیم بن حزام کی روایت کو ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

”إن حکیم بن حزام أخبره قال: قلت: یا رسول اللہ! إنی اشتريت بیوعاً؟ فما یحل لی منها وما یحرم علی قال: فإذا اشتريت شیئاً فلا تبعه حتی تقبضه، الحدیث“ (مسند امام احمد بن حنبل ۴، ۴۰۲)۔ (حضرت حکیم ابن حزام فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میں بہت سی اشیاء کو خریدتا ہوں ان میں سے کون سی میرے لئے حلال ہے اور کون سی میرے اوپر حرام ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی چیز کو خریدو تو اس وقت تک نہ پیچو جب تک اس پر قبضہ نہ کر لو)۔

شریعت نے قبضہ سے پہلے شی کو فروخت کرنے اور اس کو اپنے تصرف میں لانے سے، اس قسم کی روایات سے منع فرمایا ہے، مگر شریعت نے قبضہ کی حقیقت کو متعین کر کے محدود نہیں کیا ہے، بلکہ ہر علاقہ اور ہر زمانہ کے عرف و عادت پر سوئپ دیا ہے، لہذا قبضہ کے بارے میں جہاں جیسا رواج ہے ویسا ہی قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا (بدائع الصنائع ۱۳۸/۵)۔

بیع قبل القبض فاسد ہی میں داخل ہے:

قبضہ سے پہلے کسی شی کا فروخت کرنا من جانب شریعت ممنوع اور ناجائز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو فروخت کرنے کیلئے سب سے پہلے شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز مشتری کے حوالہ کرنے میں بائع کو کسی قسم کی رکاوٹ لازم نہ آتی ہو اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب بیع بائع کے اختیار و ضمان میں داخل ہوتا کہ بیع کو مقتضاً عقد کے مطابق اپنے اختیار سے مشتری کے حوالہ کر سکے اور قبضہ سے پہلے فروخت کرنے میں مشتری اپنے اختیار سے ملکیت کو منتقل کرنے پر قادر نہیں ہوتا ہے، اسلئے شریعت نے قبضہ سے پہلے کسی شی کو فروخت کرنے سے ممانعت فرمائی ہے اور اس ممانعت کی وجہ سے عقد باطل تو نہیں ہوتا ہے، لیکن فاسد ہو جاتا ہے، لہذا ناجائز عقود کے اقسام ثلاثہ (یعنی عقد باطل، عقد فاسد اور عقد مکروہ) میں سے قبضہ سے پہلے جو عقد ہوتا ہے وہ عقد فاسد کے دائرہ میں ہوتا ہے، باطل یا مکروہ کے دائرہ میں نہیں، اس کو حضرات فقہاء نے اس قسم کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

”الذی یقتضی الفساد، فیکون البیع فاسداً قبل القبض، لأنه لم یدخل فی ضمانه“ (عناہ مع الفتح ۶، ۵۱۲)۔

(حدیث نبوی عقد کے فساد کا تقاضہ کرتی ہے، لہذا قبضہ سے پہلے جو عقد ہوتا ہے وہ عقد فاسد کے دائرہ ہی میں ہوتا ہے، اسلئے کہ اس عقد سے بیع مشتری کے ضمان میں منتقل نہیں ہوتی)۔

احادیث نبوی معلول بالعلتہ ہیں:

بیع قبل القبض کی ممانعت سے متعلق مختلف قسم کی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں اور ان میں حضرت حکیم ابن حزام کی روایت زیادہ صریح اور واضح معلوم ہوتی ہے (مسند احمد بن حنبل ۴، ۴۰۲)۔

شریعت نے قبضہ سے پہلے شی کو فروخت کرنے اور اس کو اپنے تصرف میں لانے سے اس قسم کی روایات سے منع فرمایا ہے، اور اس کی علت یہ ہے کہ اگر معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس پر مالکانہ قبضہ نہیں کیا گیا تو قبضہ سے پہلے خدا نخواستہ اگر بیع ہلاک ہو جائے تو عقد کے فسخ ہو جانے کا خطرہ ہے یا بیع میں کمی بیشی ہو جانے کا خطرہ ہے، اس لئے شریعت نے مالکانہ قبضہ اور اپنے اختیار و ضمان میں آنے سے پہلے تصرف سے منع فرمایا ہے۔

اس کو حضرات فقہاء نے اس قسم کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے: ”لأن فیہ غرر انفساخ العقد الأول علی اعتبار هلاك البیع قبل القبض“ (فتح القدیر ۶، ۵۱۲)۔

اس لئے کہ قبضہ سے پہلے تصرف کرنے میں بیع کے درمیان میں ہلاک ہو جانے کی وجہ سے عقد اول کے فسخ ہو جانے کا خطرہ ہے۔

خریدنے سے پہلے فروخت کرنا:

آج کل کے زمانہ میں اس طرح کا معاملہ کثرت کے ساتھ تاجروں کے درمیان رائج ہے کہ مشتری دوکاندار کے پاس مال خریدنے کیلئے جاتا ہے اور اس وقت اس کے پاس مال نہیں ہوتا ہے، بلکہ جہاں سے وہ مال منگایا کرتا ہے مشتری کو وہاں سے جا کر لینے کے لئے خود بل بنا کر دیتا ہے اور مشتری کمپنی کے پاس یہ

بل لے کر جاتا ہے یا اس تاجر کے پاس جاتا ہے جس کے پاس مال بنا کر بھیجا ہے اور اس بل کو دیکھ کر بل بتانے والے پر اعتماد کرتے ہوئے مشتری کو اس بھاء سے زیادہ قیمت پر دیا جاتا ہے، اب درمیان میں جو منافع ہوتا ہے وہ دوکاندار اور تاجر کو مل جاتا ہے، تو ایسی صورت میں دو عقد ہو جاتے ہیں۔

(۱) مشتری اور دوکاندار کے درمیان جس میں بلا اجازت ملک غیر کو فروخت کرنا لازم آتا ہے۔

(۲) دوکاندار اور کمپنی کے درمیان، جس میں ملک غیر کو فروخت چکنے کے بعد خریدنا لازم آتا ہے، اور ان دونوں عقدوں میں غور طلب بات یہ ہے کہ دوکاندار اور مشتری کے درمیان جو عقد ہوا ہے اس میں دوکاندار کے مذکورہ بیع کو خریدنے سے پہلے فروخت کرنا لازم آتا ہے اور کسی چیز کو خریدنے اور معاملہ طے کرنے سے پہلے فروخت کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح خریدنے کے بعد قبضہ کے اقسام میں سے اگر قبضہ معنوی بھی نہیں پایا جاتا ہے تب بھی فروخت کرنا جائز نہیں ہے، لہذا مذکورہ معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں ہوگا اور دوکاندار کے لئے درمیان کا نفع حاصل کرنا بھی جائز نہ ہوگا اور عدم جواز کی بات حضرات فقہاء کی اس قسم کی عبارت سے واضح ہوتی ہے۔

”یؤکل المشتري البائع، بأن يبيع سلعة من نفسه لا تصح هذه الوكالة ولا هذا البيع أو وكل زيد رجلاً مثلاً بشراء شيء بعينه ووكل صاحب العين ذلك الرجل أيضاً بأن يبيعه من زيد لا يجوز كما أن الواحد يصير مملوكاً ومتملكاً“ (عینی شرح ہدایہ ۲۰۱۱۳)۔ (مشتری نے بائع کو اس بات کا وکیل بنایا کہ بائع اس سامان کو مشتری کی طرف سے فروخت کر دے تو یہ وکالت صحیح نہیں ہے اور نہ یہ بیع صحیح ہوگی یا زید نے، مثلاً کسی شخص کو کسی متعین شے کو خریدنے کا وکیل بنایا ہے اور سامان والے نے بھی اسی آدمی کو وکیل بنایا اس بات کا کہ وہ سامان زید کی طرف سے فروخت کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں ہے جیسا کہ ایک ہی آدمی مالک بنانے والا اور مالک بننے والا دونوں بن جائے تو جائز نہیں ہوتا)۔

**بیع قبل القبض میں استثناء:**..... قبضہ سے پہلے تصرف کی جو ممانعت نصوص میں آئی ہے اس کا دائرہ صرف منقول اشیاء میں ہے، غیر منقول اشیاء ممانعت کے دائرہ سے خارج ہیں، لہذا جو چیز اپنی جگہ ثابت رہتی ہے اور ان میں انتقال کی صلاحیت نہیں ہے، ایسی اشیاء صرف ایجاب و قبول سے مشتری کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہیں، لہذا اس میں تصرف کے جواز کیلئے قبضہ کے نام سے کسی دوسرے امر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اسلئے کہ غیر منقول اشیاء ممانعت کے نصوص سے مستثنیٰ ہیں (کتاب الفقہ علی المذہب الاربعہ ۲۳۵/۲)۔

**قبضہ حسی کے بغیر فیکٹری کے توسط سے فروختگی:**

آج کل کے زمانہ میں تاجروں کے درمیان قبضہ حسی کے بغیر معاملہ کرنے کا زیادہ رواج ہے، صرف قبضہ معنوی پر سارے معاملات کا مدار ہے، اور اس کی بے شمار شکلیں ہیں ان میں سے دو شکلیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

شکل (۱) ایک شخص نے کسی فیکٹری سے اپنا کنکشن کر رکھا ہے اور مال خریدنے کے لئے خود نہیں لے جاتا بلکہ ٹیلی فون یا فیکس یا خط و کتابت کے ذریعہ سے معاملہ طے کرتا ہے اور فیکٹری کو ساتھ ساتھ یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ میرا مال فلاں شخص کے پاس روانہ کر دیا جائے، اس میں مال کی پیکنگ اور اس کے چڑھانے، اتارنے اور دوسری جگہ روانہ کرنے کے جتنے بھی اخراجات ہوتے ہیں ان سب کا ذمہ دار یہی خریدار (۱) ہوتا ہے اور مال پر اگرچہ خریدار (۱) کا قبضہ حسی نہیں ہوتا ہے، لیکن قبضہ معنوی پورے طریقہ سے حاصل ہو جاتا ہے اور مال کے نفع و نقصان سب کچھ پورے طریقہ سے خریدار (۱) کے ضمان میں داخل ہو جاتے ہیں، اب ایسی صورت میں محض قبضہ حسی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے خریدار (۱) اور (۲) کے درمیان جو عقد ہوتا ہے اس کو ناجائز اور فاسد نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ قبضہ کا مقصد صرف ضمان میں داخل کرنا ہوتا ہے اور وہ قبضہ حسی کے ذریعہ حاصل ہو چکا ہے، اس لئے خریدار (۱) اور خریدار (۲) کے درمیان جو عقد ہوا ہے وہ بلا تردید جائز اور درست ہے، لہذا اگر راستہ میں مال ہلاک ہو جائے تو فیکٹری اس لئے اس کی ذمہ دار نہیں ہے کہ اس کے ضمان سے نکل کر مشتری اول کے ضمان میں داخل ہو چکا ہے اور مشتری ثانی اس لئے ذمہ دار نہیں ہے کہ مال ابھی اس کے ضمان و اختیار میں داخل نہیں ہوا ہے، اور عرف و رواج میں طریقہ یہی ہے کہ خریدار (۲) اس وقت تک مال کا ضامن نہیں ہوتا ہے جب تک مال اس کے یہاں نہ پہنچ جائے، اور شرعی طور پر اس طرح کا معاملہ درست ہوتا ہے اور عرف میں خریدار (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے پہلے مال کا خریدار (۱) کی ضمانت میں رہنا اور خریدار (۲) کا ذمہ دار نہ ہونا بھی شرعی طور پر صحیح اور درست ہے، اس لئے کہ قبضہ ارتقاع موانع کا نام ہے، اور خریدار (۱) کے حق میں ارتقاع موانع ثابت ہو چکا تھا، اس لئے دوسرے کے ہاتھ اس کا فروخت کرنا جائز ہوا، مگر یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ مال خریدار (۲) کے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دے اس لئے کہ مال ابھی اس کے ضمان میں داخل نہیں ہوا (بدائع الصنائع ۱۳۸/۵، عنایہ مع الفتح ۵۱۲/۶)۔



شکل (۲) دوکاندار بل بنا کر مشتری کو نہیں دیتا، بلکہ کمپنی کے پاس اپنے آدمی کے ذریعہ بھیج دیتا ہے یا کمپنی سے فون یا فیکس کے ذریعہ سے بات چیت کر کے معاملہ طے کر لیتا ہے اور کمپنی سے کہتا ہے کہ میرا مال فلاں آدمی (یعنی مشتری) دوکاندار اور کمپنی کے درمیان معاملہ طے ہو چکا ہے، اب مشتری یا مشتری کا آدمی جا کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے یا کمپنی پیکنگ کر کے مشتری کے یہاں بھیج دیتی ہے تو یہ معاملہ اسلئے جائز ہے کہ کمپنی کے یہاں سے دوکاندار یا دوکاندار کا آدمی جو بھی جا کر اس مال پر قبضہ کرنا چاہے تو کمپنی کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اور قبضہ پر رکاوٹ نہ ہونے کا نام ہی قبضہ معنوی ہے اور قبضہ معنوی معتبر ہوتا ہے، جیسا کہ قبضہ کی حقیقت کے بیان میں گذر چکا ہے، اسلئے یہ معاملہ جائز اور درست ہو جائے گا۔

جہاز سے مال اترنے سے پہلے دوسرے کو فروخت کرنا:

آج کل کے زمانہ میں بین الاقوامی تجارت میں جب ایک سپورٹر مال جہاز پر چڑھا دیتا ہے اور اس کی اطلاع مشتری کو پہنچتی ہے، مال ابھی سمندر میں ہو یا ہوائی جہاز پر لیمپورٹر کی دو حالتیں ہوتی ہیں (۱) وہ مال کو اس وقت تک دوسروں کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا ہے، جب تک مال جہاز سے اتر کر اس کے قبضہ میں نہ آجائے تو ایسی صورت میں اس کے معاملات میں کسی قسم کی شرعی قباحت لازم نہیں آتی (۲) لیمپورٹر اس کا انتظار نہیں کرتا کہ مال جہاز سے اتر کر اس کے قبضہ میں آجائے، بلکہ مال ابھی سمندر میں یا ہوائی جہاز پر ہی ہوتا ہے، یہ دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسرا تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔

سوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ مال جہاز پر چڑھ جانے کے بعد اصل بائع کے ضمان سے خارج ہو جاتا ہے اور مشتری کے ضمان میں منتقل ہو جاتا ہے، واقعہ کلی طور پر صرف ایسا نہیں ہے جو سوالنامہ میں ہے، بلکہ مال جہاز پر چڑھائے جانے کے بعد اس کی پوری طرح ذمہ داری بیمہ کمپنی پر ہوتی ہے، اب بیمہ کمپنی پر ذمہ داری کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔

شکل (۱) جہاز یا راستہ میں مال کا مشتری کے ضمان میں ہونا:

بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ اس طرح طے ہوتا ہے کہ بائع اپنے ملک کی بندرگاہ سے جہاز پر چڑھا دینے کا ذمہ دار ہے اور جہاز پر چڑھا چکنے کے کاغذات جب اس کو حاصل ہو جائیں گے تو اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی، اور وہاں سے مشتری کے یہاں مال پہنچنے تک کیلئے مشتری بیمہ کراتا ہے، اور وہاں سے مشتری کے ہاں مال پہنچنے تک پوری ذمہ داری بیمہ کمپنی کے توسط سے مشتری کے اوپر ہوتی ہے، ایسے معاملہ کو تاجروں کی اصطلاح میں (FD) کہا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں اگر راستہ میں مال ہلاک ہو جائے تو اس مال کے نقصان کی تلافی کیلئے مشتری دوڑ دھوپ کرے گا اور بیمہ کمپنی کے توسط سے جو کچھ بھی ہرجانہ وصول ہو سکتا ہے مشتری ہی وصول کرے گا، اور بائع کو اپنے مال کی قیمت مل جائے گی، اور جو کچھ بھی نقصان ہوگا وہ مشتری کے ضمان میں ہوگا، لیکن اس میں یہ بات بھی ہے کہ اگر "ایل سی" (C-L) کے ذریعہ سے پہلے سے مال کی قیمت بائع کیلئے جمع نہیں ہوتی ہے اور مشتری وعدہ خلافی کرتا ہے اور رقم نہیں بھیجتا ہے تو اس پر کوئی کارروائی بھی نہیں ہو سکتی، یہ صرف اس کے اخلاق اور دیانتداری پر موقوف ہے، بہر حال ایسی صورت میں چونکہ مال مشتری کے ضمان کے دائرہ میں آجاتا ہے، اسلئے کہ اس کے یہاں مال پہنچنے سے پہلے اس کے حق میں قبضہ معنوی حاصل ہو جاتا ہے، لہذا وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت بھی کر سکتا ہے، ایسی صورت میں یہ گنجائش نکلتی ہے کہ عقد اول اور عقد ثانی صحیح ہو جائیں گے اور اس کے بعد تیسرے اور چوتھے نمبر کے عقود سب کے سب فاسد ہو جائیں گے، محض بل کی تبدیلی کی وجہ سے نہ مال کا ضمان منتقل ہو سکتا ہے اور نہ ہی عقد صحیح ہو سکتا ہے، اسلئے کہ بائع اول نے از خود مشتری اول کیلئے روانہ کیا ہے، وہ ہر طرح سے مال کے اوپر قابض تھا، لہذا اس نے اپنے ضمان کو مکمل طریقے سے مشتری اول کو منتقل کر دیا، مگر مشتری اول مال کے اوپر ہر طریقے سے قابض نہیں ہو جاتا کہ جس کی وجہ سے وہ اپنے ضمان کو دوسرے تک منتقل کر سکے، اسلئے مشتری اول کا عقد تو منعقد ہو سکتا ہے، لیکن ضمان منتقل نہیں ہو سکتا، اور ضمان کے منتقل نہ ہونے کی وجہ سے قبضہ بھی منتقل نہیں ہو سکتا، اور قبضہ سے پہلے فروخت کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے، اسلئے مشتری ثانی اور مشتری ثالث کا عقد ناجائز اور باطل ہوگا۔

شکل (۲) جہاز یا راستہ میں مال کا اصل بائع کے ضمان میں ہونا:

اوپر کے عنوان کے تحت شکل اول میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ صرف سوالنامہ کے پیش نظر لکھا گیا ہے، لیکن ہم نے براہ راست مراد آباد کے بڑے بڑے ایکسپورٹرجن کے کاروبار زیادہ تر یورپ و امریکہ اور عرب ممالک سے ہیں اور ان لوگوں کا رات دن کا مشغلہ ہی مال ایکسپورٹ کرنا ہے اور وہ از خود یورپ و امریکہ جا کر معاملہ طے کر کے آرڈر لایا کرتے ہیں، ان سے کاروبار اور معاملات سے متعلق پوری طرح معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور ان سے یہ پتہ چلا ہے

کہ جہاز پر مال چڑھانے کے بعد C-G-C کے معاہدہ کے علاوہ کاروبار کی بقیہ تمام صورتوں میں مال کا ذمہ دار مشتری نہیں ہوتا ہے، اگر ہوتا ہے تو بہت ہی کم ہوتا ہے جو (C&F) کے تحت معاملہ کرتے ہیں بلکہ اکثر معاملات میں مشتری کے یہاں مال پہنچنے تک ذمہ دار بائع ہی ہوا کرتا ہے اور ایسے معاملات کو (F-I-C) کہتے ہیں جس میں بائع مال کا بیمہ کرا کر ساری ذمہ داری بیمہ کمپنی پر ڈالتا ہے، لہذا مال کے ہلاکت کے نتیجے میں جو کچھ بیمہ کمپنی تلافی کرتی ہے اس کا تعلق صرف بائع کے ساتھ ہوتا ہے مشتری کے ساتھ نہیں ہوتا ہے، اس لئے جہاز پر مال روانہ کرنے کے بعد مال مشتری کے ضمان میں منتقل نہیں ہوگا، بلکہ بائع کا وکیل جو کہ بیمہ کمپنی ہے وہی ضامن ہوتی ہے، ایسی صورت میں مشتری کے حق میں مال پر قبضہ معنوی بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور جس مال پر قبضہ حسی یا قبضہ معنوی میں سے کوئی بھی ثابت نہ ہو اس کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا شرعی طور پر جائز نہیں ہو سکتا ہے اور ایسا عقد معرض العقاد کو نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ مال کی ہلاکت کی وجہ سے اس عقد کے فسخ کا خطرہ ہوتا ہے، اس کو صاحب "فتح القدير" نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

"لأن فيه غرر انفساخ القعد الأول على اعتبار هلاك المبيع قبل القبض فتبين حينئذ انه باء ملك الغير بغير إذنه وذلك مفسد للعقد" (فتح القدير ۶۰۵۱۲)۔ (اس لئے کہ قبضہ سے پہلے فروخت کرنے میں عقد اول کے فسخ ہو جانے کا خطرہ ہے، قبضہ سے پہلے بیع کے ہلاک ہو جانے کے اندیشے سے اس وقت یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اس میں غیر کی ملک کو بغیر اجازت فروخت کر دیا ہے اور یہ مفسد عقد ہے)۔

ٹرانسپورٹ پر رکھے رکھے عقد در عقد:

ملکی سطح پر ایک شہر سے دوسرے شہر جو مال منتقل کیا جاتا ہے اس کا حال کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مال ابھی بذریعہ ریل یا ٹرک وغیرہ راستہ میں ہے اور ادھر مشتری مال کا نمونہ اور نوعیت پیش کر کے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور کبھی ٹرانسپورٹ پر رکھے رکھے دوسرا تیسرے اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ فروخت کرتا جاتا ہے اور اس میں مال کا ضمان منتقل ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا، بلکہ صرف بل کی تبدیلی ہوتی جاتی ہے تو اس طرح محض تبدیل بل کی وجہ سے ملکیت منتقل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ضمان منتقل نہ ہو جائے، اس لئے کہ راستہ میں جو مال پڑا ہوا ہے یا ریل یا ٹرک وغیرہ کے ذریعہ سے آ رہا ہے وہ اگر ہلاک ہو جاتا ہے تو مشتری اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا، بلکہ ذمہ دار بائع ہی ہوتا ہے اور اس قسم کے عقود میں ماکولات اور غیر ماکولات سب کا حکم برابر ہے، جیسا کہ "فتح الملہم" کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے: "فنه في رسول الله ﷺ عن الربح ما لم يضمن والمبيع قبل القبض يتضمنه؛ لأن المبيع لا يأتي في ضمان المشتري حتى يقبضه، فإن باعه قبل ذلك بالربح كان ذلك ربحاً بما لم يضمنه وهذه العلة تعم الطعام وغيره" (تكملة فتح الملہم ۱۰۲۵۲)۔

اس میں رسول اللہ ﷺ نے کسی ایسی چیز سے نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا ہے جو ضمان کے دائرہ میں داخل نہ ہوتی ہو اور قبضہ سے پہلے اس کو اپنے ضمان میں لے لینا ہے، حالانکہ بیع مشتری کے ضمان میں قبضہ سے پہلے داخل نہیں ہوتی ہے، لہذا اگر قبضہ سے پہلے بیچ کر نفع حاصل کرے گا تو اس چیز سے نفع حاصل کرنا لازم آتا ہے جو اس کے ضمان کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی ہے اور ممانعت کی یہ علت ماکولات وغیر ماکولات سب کو شامل ہے۔

جواز کی متبادل شکل:

اگر بین الاقوامی سطح میں قبضہ سے پہلے دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنے کا معمول لوگوں کے درمیان عام ہو جائے اور اس سے بچاؤ کی کوئی شکل نہ بن سکے اور تمام لوگ اس میں مبتلاء ہو جائیں تو ایسی صورت میں "عدول عن المذہب" کی گنجائش ہو جاتی ہے اور قبضہ سے پہلے حضرت امام مالک اور امام بخاری کے نزدیک شی بیع کو فروخت کر دینا جائز اور درست ہے، البتہ حضرت امام مالک کے نزدیک اشیاء خوردنی کے علاوہ دیگر منقول اشیاء کا ہونا لازم ہے اور امام بخاری کے نزدیک یہ قید بھی نہیں ہے، بلکہ صرف ایجاب و قبول کے بعد مشتری کیلئے شی بیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینا بلا تردد جائز ہے، حضرت امام مالک کا مسلک "کتاب الفقہ علی المذہب الاربعہ" میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے: "المالکية قالوا: يصح للمشتري أن يتصرف في المبيع قبل قبضه بالمبيع سواء كان المبيع أعياناً منقولة أو عيناً ثابتة بالأرض والنخيل ونحوهما إلا الطعام" (کتاب الفقہ علی المذہب الاربعہ ۲۰۲۲۵)۔ حضرات مالکیہ فرماتے ہیں کہ بیع میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے چاہے بیع اموالی منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، اور غیر منقولہ، جیسا کہ زمین، باغات وغیرہ، مگر ماکول اشیاء، مثلاً پھل وغیرہ ان کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

اور امام مالک کا مسلک "أوجز المسالك" اور "تعلیق المجد" میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے: "قال مالك: يجوز جميع التصرفات في غير



الطعام قبل القبض لورود التخصيص في الأحاديث بالطعام“۔

اور حضرت امام بخاریؒ کے نزدیک محض ایجاب و قبول کی وجہ سے قبضہ کا ثبوت ہو جاتا ہے، بیع پر قبضہ لازم نہیں ہے، نہ قبضہ معنوی لازم ہے، نہ قبضہ حسی۔ اور امام بخاریؒ کا مسلک حضرت شاہ صاحبؒ نے ”فیض الباری“ میں اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے: ”أما عند البخاری فلا يشترط عنه (إلى قوله) وكان القبض يحصل عنده بمجرد الإيجاب والقبول ولا يحتاج بعد ذلك إلى أمر آخر يسمى قبضا“ (فیض الباری ۳، ۲۰۶)۔ (بہر حال امام بخاریؒ کے نزدیک قبضہ کی شرط نہیں ہے، لہذا ان کے یہاں محض ایجاب و قبول کی وجہ سے قبضہ کا ثبوت ہو جاتا ہے، اس کے بعد کسی ایسے دوسرے امر کی ضرورت نہیں رہتی ہے جس کا نام قبضہ رکھا جائے)۔

امام بخاریؒ نے حضرت جابرؒ کی حدیث بعیر کے تحت ترجمۃ الباب میں اپنی رائے ظاہر فرمائی ہے جو ”بخاری شریف ۲۸۱/۱“ پر موجود ہے، اور اس میں حضرت ابن عمرؓ کا وہ واقعہ بھی نقل فرمایا ہے جس میں حضرت عمرؓ کے خرید کردہ اونٹ کو حضور ﷺ کے ہاتھ فروخت کرنے کا ذکر ہے۔

لہذا مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ حضرت امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کے نزدیک غیر ماکول اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے، ابتلائے عام کی وجہ سے حنفی مسلک کے لوگ اس مسئلہ میں اپنے مسلک سے عدول کر کے حضرت امام مالکؒ کے مسلک کو اختیار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کو غور کرنا چاہئے۔

ماکول اشیاء میں حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے:

حدیث پاک میں یہ جو صراحت آئی ہے کہ ماکول اشیاء کو دوبارہ کیل یا وزن کرنے سے پہلے کھانا یا اس میں تصرف کرنا ممنوع ہے، یہ ممانعت اس وقت ہے جب کہ خریدار کو بائع کے ناپ تول پر اعتماد نہ ہو، لہذا اگر مشتری کو بائع کے ناپ تول پر پوری طرح اعتماد ہو تو پھر دوبارہ کیل یا وزن کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور بائع نے جو کیل یا وزن کیا ہے وہ مشتری کے سامنے ہونا لازم نہیں بلکہ مشتری کی عدم موجودگی میں کیل یا وزن کر کے رکھ دیا ہے اور مشتری کو اعتماد ہے تو کافی ہے۔

اس کو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے: ”فالذی یتبین أن المشتري إن اعتمد على كيل البائع جاز له أكله بدون إعادة الكيل سواء كان بحضرته أو بغيبته“ (فیض الباری ۳، ۲۲۰)۔ پس جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ مشتری اگر بائع کے کیل پر اعتماد کرتا ہے تو کیل کے اعادہ کے بغیر اس کو کھانا جائز ہے، چاہے بائع کا کیل مشتری کی موجودگی میں ہو یا اس کی غیبت میں ہو۔

ایک آدمی کا اپنے ملک میں رہ کر دوسرے ملک کے آدمی کا وکیل بن کر خرید و فروخت کرنا:

ایک شخص ہندوستان میں رہتا ہے دوسرا شخص، مثلاً امریکہ میں رہتا ہے، اب دونوں کے درمیان فون یا فیکس سے بات چیت ہوتی ہے، انڈیا میں رہنے والا شخص امریکہ میں رہنے والے شخص کو فون یا فیکس کے ذریعہ اس بات کا وکیل بناتا ہے کہ آج کی تاریخ میں سونا جس بھاؤ کا ہو خرید لے اور خرید کر اپنے ہی پاس رکھ لے تو امریکہ میں رہنے والے نے، مثلاً فی تولہ سوڈا لے کر کے حساب سے خرید لیا ہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد سونے کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے، مثلاً فی تولہ سو سو ڈالر ہو جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان گفتگو اور رابطہ رہتا ہے تو اب ہندوستان والے نے اجازت دیدی کہ میرے نام سے خرید لیا ہوا سونا سو سو ڈالر کے حساب سے فروخت کر دیا جائے اور وکیل طے شدہ معاہدہ کے مطابق فروخت کر دیتا ہے اور فی تولہ پچیس ڈالر کا منافع ہندوستان میں رہنے والے کو بیٹھے بیٹھے مل جاتا ہے تو کیا اس طرح کا معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ شرعی طور پر ایسا معاملہ جائز اور درست ہے، عدم جواز کی کوئی علت نہیں ہے، اس لئے کہ ایک آدمی وکیل بالبیع اور وکیل بالشراء دونوں ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرات فقہاء کی اس قسم کی عبارت سے واضح ہوتا ہے: ”وإذا وكل رجلا غائبا وأخبره رجل بالوكالة يصير وكيلًا سواء كان المخبر عدلاً أو فاسقاً أخبره من تلقاء نفسه أو على سبيل الرسالة صدقه الوكيل في ذلك أو كذبه“ (عالمگیری ۳، ۵۷۱)۔ اور جب کسی دور دراز رہنے والے عائب آدمی کو وکیل بنایا جائے اور اس کو وکالت کی خبر پہنچ جائے تو وہ وکیل ہو جائے گا چاہے خبر دینے والا عادل ہو یا فاسق، اس نے اپنی طرف سے خبر دی ہو یا بطور پیغام بات پہنچادی اور وکیل نے اس کی تصدیق کی ہو یا تکذیب، بہر حال وہ وکیل بن جائے گا۔

”والأصل فيه أن الجهالة اليسيرة تتحمل في الوكالة“ (هدایہ ۳، ۱۶۵)۔ (معمولی جہالت مسئلہ وکالت میں متحمل کر لی جاتی ہے)۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا مسئلہ

مولانا ابوبکر قاسمی

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں فقہاء کے مذاہب:

اب یہاں پر ”بیع قبل القبض“ یا ”بیع مالم یقبض“ کی یہ صورت جس میں انسان ایک سامان کو خرید کر اس کا مالک تو ہو چکا ہے، لیکن ابھی بیع پر سرے سے قبضہ نہیں کیا ہے اور قبضہ سے پہلے ہی وہ بیع کو فروخت کر دینا چاہتا ہے، تو بیع مالم یقبض کی یہی صورت عام طور پر رائج ہے اور اسی کے سلسلہ میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک کسی بھی سامان یا بیع کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے، خواہ وہ سامان اشیاء منقولہ کے قبیل سے ہو، یا وہ غیر منقولی چیز ہو، اور خواہ بائع نے ثمن پر قبضہ کر کے بیع کو فروخت کرنے کی اجازت دیدی ہو یا نہ دی ہو، حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کا بھی مسلک حضرت امام شافعی کے مسلک کے مطابق ہے۔

”فمذہب الشافعية... وهو... قول محمد إنه لا يصح بيع المبيع قبل قبضه سواء كان منقولاً أو عقاراً وإن أذن البائع وقبض الثمن“ (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۲۲)، ”وقال زفر ومحمد والشافعي: لا يجوز بيع شيء قبل القبض طعاماً كان أو غيره لإطلاق الأحاديث“ (التعليق المجدد ۲۳۲) ”اختلف العلماء في ذلك فقال الشافعي لا يصح بيع المبيع قبل قبضه سواء كان طعاماً أو عقاراً منقولاً أو نقداً أو غيره“ (حاشية النووي على مسلم ۲۰۵)۔

حضرت امام احمد کی ایک روایت تو حضرت امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق ہے، اور دوسری روایت میں وارد ہے کہ اگر بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے تو قبضہ سے پہلے اس بیع میں تصرف کرنا اور اسے فروخت کرنا جائز ہے۔

”ولو دخل في ضمان المشتري جاز بيعه والتصرف فيه كما جاز ذلك بعد قبضه“ (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۲۷)۔

اور حضرت امام احمد کی تیسری روایت جو بظاہر حضرات حنابلہ کا مذہب ہے، اس روایت کے مطابق حضرت امام احمد کے نزدیک مکملی و موزونی اور معدودی اشیاء کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، ہاں اس کے علاوہ میں بیع قبل القبض جائز ہے (دیکھئے: الفقه علی المذہب الاربعہ ۱۹۳، ۱۲۸)۔

اور حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے نزدیک صرف کھانے کے قبیل کی چیزوں کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ کیل و وزن سے بائع نے خرید اہو، ورنہ اس کے علاوہ اشیاء میں اور انکل کی بیع کی صورت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے (حوالہ سابق، حاشیہ سوتی ۱۳۵)۔

حضرت امام مالک نے بیع قبل القبض سے متعلق مقید روایات سے استدلال کیا ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے قبیل کی چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مسند مروی ہے:

” (قال طاؤس) سمعت ابن عباس يقول: أما الذي نهي عنه النبي ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض“ (حاشیہ ابو داؤد ۲، ۲۹۲)۔

اس روایت کو بغور پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے صرف کھانے کی چیزوں کی ممانعت ہے دیگر چیزوں کی نہیں، لہذا جن روایات میں مطلقاً سامانوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، وہاں سامانوں سے مراد کھانے کے سامان ہیں، دوسرے سامان نہیں۔

امام مالک علیہ الرحمہ کی دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ کھانے کی چیزوں میں خشک ہونے، سوکھ جانے کے سبب جتنا تغیر و تفاوت ہو جاتا ہے، دیگر چیزوں میں

مآ استاذ مدرسہ اسلامیہ، شکر پور بھروارہ، دربھنگہ۔

نہیں ہوتا ہے، اس لئے اس عقلی دلیل کا بھی تقاضا ہے کہ صرف کھانے کے قبیل کی چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا جائے اور دیگر سامانوں میں چونکہ تغیر کم ہوتا ہے اس لئے قبضہ سے پہلے اس کی بیع سے منع نہ کیا جائے، قال فی الموسوعۃ: ”ولغلبۃ تغیر الطعام دونما سواہ“ (بخاری ۱۰۲۸۶)۔

اور حضرت امام شافعی اور امام محمد و امام زفر نے اپنے مسلک کی تائید میں ان عام حدیثوں سے استدلال کیا ہے جن میں مطلقاً قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور ان روایات میں طعام کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے، چنانچہ حضرت حکیم بن حزام کی روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا کہ ”إذا ابتعت شیئاً فلا تبعہ حتی تقبضہ (طحاوی ۲۰۲) جب تم کوئی چیز خریدو تو قبضہ سے پہلے فروخت نہ کرو۔ اسی طرح حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کی دلیل وہ حدیثیں بھی ہیں، جن میں سامان کو منتقل کرنے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے: عن زید بن ثابت قال إن رسول اللہ ﷺ فہانا ان نبيع السلع حیث تبنا حتی یحوزھا التجار الی رحالہم“ (رواہ الطحاوی ۲۰۱، أبو داؤد ۲۰۳)۔ اسی طرح حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کی دلیل بعض صحابہ کرام کے فتاویٰ ہیں، جن میں بیع قبل القبض کی ممانعت کے حکم کو بغیر طعام کی تخصیص کے عام رکھا گیا ہے، مثلاً حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ ہے، ”واحب کل شیء مثل الطعام“ (أبو داؤد ۲۰۳، ابن ماجہ ۲۱۱) (میں سمجھتا ہوں کہ ہر بیع (کو قبضہ سے پہلے بیچنے) کا حکم کھانے کے مثل ہے)، نیز امام طحاویؒ نے حضرت جابرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

”عن جابر فی الرجل یبتاع المبیع فیبیعہ قبل أن یقبضہ قال اکره“ (معانی الآثار ۲۰۲)۔

مذکورہ دونوں صحابی ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت سے متعلق حدیث مقید بالطعام کے مشہور راویوں میں سے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ حضرات بیع قبل القبض کی ممانعت کے حکم کو عام قرار دیتے ہیں، لہذا ان صحابہ کرام کے فتاویٰ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیع قبل القبض کی ممانعت کا حکم عام ہے، ”لائ الصحابۃ أعرف بمقاصد الرسول“ (نیل الأوطار ۵۰، ۱۶۰ بحوالہ الموسوعۃ ۹۰۱۲)۔

رہی وہ روایتیں جن میں طعام کی قید مذکور ہے تو اس کا جواب حضرت امام شافعیؒ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ وہ قید احترازی نہیں ہے، بلکہ اتفاقی اور تمثیلی ہے، ”قال محمد وابن عباس إن قید الطعام اتفاقی“ (العرف الشذی ۱۰۲۳) چنانچہ علامہ طحاویؒ نے معانی الآثار میں مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح قرآن پاک میں حرم کے شکار کو قتل کرنے کی صورت میں جزا کا حکم عہد کی قید کے ساتھ مذکور ہے، لیکن وہ حکم عام ہے اور غیر عہد والی صورت کو بھی شامل ہے، چنانچہ بعینہ وہی جزا قتل عہد کی صورت میں بھی واجب ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی بیع قبل القبض کی ممانعت والی حدیث میں طعام کی قید کے سلسلہ میں بھی یہی سمجھنا چاہئے (شرح معانی الآثار ۲۰۲)۔

مذکورہ نقلی دلائل کے علاوہ بیع قبل القبض کی عام ممانعت کے سلسلہ میں حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کی جانب سے کچھ اور عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، مثلاً ان کا کہنا ہے کہ قبضہ سے پہلے سامان کو فروخت کرنے سے جو نفع حاصل ہوگا، وہ ربح مالہ یضمن ہے، یعنی مال غیر مضمون کے ذریعہ نفع حاصل کرنا لازم آتا ہے، جو شرعاً حلال و طیب نہیں ہے، کیونکہ حدیث پاک میں ”ربح مالہ یضمن“ سے منع کیا گیا ہے۔

”عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ قال فی رسول اللہ ﷺ... عن ربح مالہ یضمن“ (رواہ النسائی ۲۰۳۱)۔

اب ظاہر ہے کہ قبضہ سے پہلے سامان کو فروخت کرنے کی صورت میں جس طرح کھانے کی اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے ربح مالہ یضمن لازم آتا ہے اسی طرح غیر طعام کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے ”ربح مالہ یضمن“ لازم آتا ہے، لہذا اس دلیل کا بھی تقاضا ہے کہ بیع قبل القبض کی ممانعت عام ہو (دیکھئے: معانی الآثار ۲۰۲)۔

اسی طرح حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کی بیع قبل القبض کی ممانعت کے سلسلہ میں ایک عقلی دلیل یہ ہے کہ بیع میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنے میں شرعاً ربا (سود) کا شبہ پایا جاتا ہے، کیونکہ قبضہ سے پہلے جب بیع میں تصرف کیا جائے گا اور اس کو فروخت کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ بیع تو غائب ہے، ہاں ٹخن موجود ہے، لہذا اس صورت میں جو بیع کو قبضہ سے پہلے فروخت کیا گیا تو درحقیقت کی بیشی کے ساتھ ٹخن کا ٹخن سے تبادلہ کیا گیا، جو شرعاً درست نہیں ہے، اب ظاہر ہے کہ یہ شبہ ربا تمام بیع کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے میں پایا گیا، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کھانے کی اشیاء کے قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت والی مرفوع حدیث کو ذکر فرمایا تو حضرت طاؤسؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے ”بیع الطعام قبل القبض“ کی ممانعت کی وجہ پوچھی تو حضرت ابن عباسؓ نے

جواب دیا: ”ذات دراهم بدراهم والطعام مرجأ“ (رواہ البخاری ۱، ۲۸۶) ”ألا تراهم يتتاعون بالذهب والطعام مرجأ“ (مسلم شریف ۲۰۵)۔

اب یہاں بیع کر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت والی بیشتر احادیث میں طعام کی قید کیوں مذکور ہوئی ہے اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کیا جائے، تو جیسا کہ ماقبل میں درج کیا گیا وہ قید تمثیلاً ہے، دوسرے طعام کی قید کے ذکر کرنے کی مصلحت پر امام طحاوی علیہ الرحمہ نے معانی الآثار میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ طعام کی بیع کے اندر شریعت نے کچھ توسع سے کام لیا ہے، چنانچہ اس کے اندر بیع سلم کو جائز رکھا ہے، دوسری چیزوں کے اندر نہیں، جبکہ بیع سلم معدوم وغیر موجود کی بیع ہے، لہذا جب شریعت نے صراحت کے ساتھ طعام کے اندر ”بیع قبل القبض“ کے ناجائز ہونے کا اعلان کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ بدرجہ اولیٰ غیر طعام میں ”بیع قبل القبض“ ناجائز ہے، یہی وہ خاص مصلحت ہے جس کے سبب طعام کا ذکر ہوا، اب ظاہر ہے کہ اگر اس کے برعکس معاملہ ہوتا کہ طعام کو چھوڑ کر غیر طعام کو ذکر کر کے بیع قبل القبض کا اعلان کیا جاتا، تو پھر ایسی صورت میں طعام کے اندر ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت ثابت نہ ہو پاتی، اور سامع کو یہ نہ معلوم ہو پاتا کہ طعام کے اندر بیع قبل القبض کا کیا حکم ہے (دیکھئے: شرح معانی الآثار ۲۰۲)۔

اور حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام ابو یوسف نے بیع قبل القبض کی ممانعت کے حکم کو طعام کے علاوہ دیگر منقولی اشیاء کی بیع کے عدم جواز تک جو عام رکھا ہے، تو اس سلسلہ میں ان حضرات کی دلیل بھی تقریباً وہی حدیثیں اور فتاویٰ صحابہ اور عقلی دلائل ہیں جن سے حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ نے ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کے حکم کے عموم پر استدلال کیا ہے، البتہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف نے قبضہ سے پہلے غیر منقولی اشیاء کی بیع کے جواز کو جو حکم عام سے خاص کیا ہے، اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) قرآن پاک میں بغیر قبضہ کی قید کے مطلقاً بیع کو حلال قرار دیا گیا ہے، چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أحل الله البيع“ (سورۃ البقرۃ ۲۰۵) اس آیت کے عموم کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر قبضہ کے بھی خرید و فروخت کا معاملہ شرعاً جائز و درست ہو، لیکن دوسری طرف احادیث میں ”بیع قبل القبض“ کی مطلق ممانعت وارد ہے، جس کا تقاضا ہے کہ بغیر قبضہ کئے ہوئے کسی سامان کو بیچنا اور فروخت کرنا جائز نہ ہو، لہذا دونوں قسم کے دلائل کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ آیت کے عموم کی وجہ سے قبضہ سے پہلے غیر منقولی اشیاء کی بیع کو جائز قرار دیا جائے (جہاں قبضہ حسی متعذر ہے) اور احادیث نبویہ کے پیش نظر قبضہ سے قبل منقولی اشیاء کی بیع کو ناجائز کہا جائے، اور اس تخصیص کا قرینہ وہ حدیثیں ہیں جن میں بیع کو کل بیع سے منتقل کرنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ متفقہ طور سے تمام فقہاء نے قبضہ سے پہلے ثمن میں تصرف کرنے کی اجازت دی ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں، تو اس کا جواب حضرات فقہاء نے یہ دیا ہے کہ اس کا وجوب ذمہ میں ہوتا ہے، لہذا ثمن کے ہلاک ہونے سے بائع کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے، نہ اس کا حق ساقط ہوتا ہے، اور نہ ہی بیع فاسد ہوتی ہے، اس لئے قبضہ سے پہلے بائع جو اس میں تصرف کر رہا ہے، وہ اپنی ملک میں تصرف کر رہا ہے، چنانچہ حدیث نبوی میں بھی قبضہ سے پہلے ثمن میں مطلقاً تصرف کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

”عن ابن عمر ... فقلت يا رسول الله رويدك أسألت إني أبيع الإبل بالتقبيع فأبيع بالدنانير وأخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وأخذ الدنانير وأخذ هذه من هذه وأعطى هذه من هذه فقال رسول الله ﷺ: لا بأس إن تأخذها بسعريومها ما لم تفترقا وبينكما شيء“ (أبو داؤد ۲۰۲۶)۔

لیکن ثمن کے برعکس بیع میں قبضہ سے قبل جو تصرف کرنے سے منع کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیع کی دو قسم ہے: ایک وہ ہے جس میں ہلاکت کا امکان بہت زیادہ ہے، جس کے سبب بیع کے فاسد ہو جانے کا خطرہ ہے، جیسے منقولی اشیاء۔ بیع کی دوسری قسم وہ ہے جس میں ہلاکت کا امکان بہت کم ہے، جیسے غیر منقولی اشیاء، زمین و جانکاد وغیرہ۔ اب جس بیع کے ہلاک ہونے کا امکان زیادہ ہے، اگر قبضہ سے پہلے اس کے فروخت کرنے کی اجازت دی جائے تو قوی امکان ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع ہلاک ہو جائے اور بیع فاسد ہو جائے، اور اس طرح اس صورت میں اگرچہ بائع اول کا نقصان ہوگا، لیکن بائع ثانی کا کچھ نقصان نہ ہوگا، مگر یہاں پر دو خرابی پیدا ہوگی: ایک تو یہ کہ بائع ثانی نے قبضہ سے پہلے جو بیع میں تصرف کیا تو گویا اس نے غیر مملوک شیء میں تصرف کیا، دوسرے اس نے اپنے خریدار کے ساتھ بیع غرر کا معاملہ کیا، کیونکہ خریدار نے تو بیع کو یہ سمجھ کر خریدا کہ بائع ثانی جو اسے فروخت کر رہا ہے وہ اس کی ملک ہے، جبکہ اس کی ملک نہیں ہے، لہذا مذکورہ دونوں خرابیوں کی وجہ سے قبضہ سے پہلے بیع کو فروخت کرنے سے منع کیا گیا، ”لأن النبي ﷺ قال: ليس على رجل بيع فيما لا يملك، وفي



حدیث آخر لا تتبع ما ليس عندك“ (رواہ النسائی ۲، ۲۲۵)۔

اب ظاہر ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع کو فروخت کرنے کی صورت میں جو خرابیاں لازم آرہی ہیں وہ منقولی اشیاء کی بیع میں تو لازم آتی ہیں، کیونکہ ان میں ہلاکت کا امکان زیادہ ہے، لیکن غیر منقولی اشیاء کی بیع میں عام حالات میں یہ خرابیاں نہیں لازم آتی ہیں، لہذا قبضہ سے پہلے مذکورہ خرابیوں کے سبب منقولی اشیاء میں تو تصرف کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا، لیکن قبضہ سے پہلے غیر منقولی اشیاء کی بیع کو قبل القبض ثمن میں تصرف کرنے کے جواز پر قیاس کر کے جائز رکھا گیا، البتہ اگر غیر منقولی اشیاء میں بھی ہلاکت کا امکان زیادہ ہو، جیسے کوئی زمین دریا کے کنارے ہو اور اس کے کٹ جانے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں غیر منقولی اشیاء میں بھی قبل القبض تصرف جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی وہی سب خرابیاں پائی جا رہی ہیں جو قبضہ سے پہلے غیر منقولی اشیاء کے فروخت کرنے میں پائی جاتی ہیں۔

بیع قبل القبض کے جواز و عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے دلائل و نظریات کو ذکر کرنے کے بعد رقم سطور کی ناقص رائے یہ ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کے نقلی و سمعی اور عقلی دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق یا تو کھانے کے قبیل کی اشیاء سے ہے (چنانچہ حضرت حکیم بن حزام جو ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت والی مطلق حدیث کے راوی ہیں، ان کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ کھانے کے قبیل کی اشیاء کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، اور انہوں نے حضور پاک ﷺ سے انہیں چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کے سلسلہ میں دریافت فرمایا تھا جس کا جواب دیتے ہوئے حضور ﷺ نے ان کو کھانے کی اشیاء کی صراحت یا بغیر صراحت کے قبضہ سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا (معانی الآثار ۲۰۱/۲)۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت والی مطلق روایت میں بھی غالباً کھانے ہی کے قبیل کی اشیاء مراد ہیں، یا وہ منقولی اشیاء سے متعلق ہے، اور جو دلیلیں بظاہر عام نظر آتی ہیں اگر ان کو ان کے پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ تخصیص کا احتمال رکھتی ہیں، بلکہ ہر امام نے دلائل عموم میں تخصیص کی ہے، جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا، چنانچہ حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ جو بیع قبل القبض کے مطلقاً عدم جواز کے قائل ہیں وہ بھی انکل والی بیع میں قبضہ سے پہلے بیع کے اندر تصرف کرنے کے قائل ہیں، چنانچہ ”الفقہ علی المذاہب الاربعہ“ میں شوافع کا مسلک یہی نقل کیا گیا ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱۹۱/۳)۔

اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی اندازے والی بیع کی صورت میں قبضہ سے پہلے بیع میں تصرف کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اس کے علاوہ بھی بیع کی بعض صورتوں میں ائمہ اربعہ میں سے اکثر نے ”بیع قبل القبض“ سے ممانعت والی روایت میں تخصیص کی ہے، دوسری طرف اکثر احادیث میں صرف بیع الطعام قبل القبض کی ممانعت وارد ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع کرنے کے سلسلہ میں اصل شدت صرف کھانے کی اشیاء میں ہے، چنانچہ امام ترمذی نے بیع قبل القبض کی ممانعت کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ”إنما التشديد عند أهل العلم في الطعام“ (ترمذی ۱۰۲۲)۔

لہذا اگر کھانے کے علاوہ کسی اور بیع کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کا عرف ہو جائے اور اس کو ناجائز قرار دینے کی صورت میں لوگوں کو پریشانی و دقت ہوتی ایسی صورت میں حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے مسلک پر عمل کرنے اور فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔

علاوہ ازیں بعض علماء نے ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت سے بچنے کیلئے اور ”بیع قبل القبض“ کی تصحیح کیلئے درج ذیل صورتیں لکھی ہیں، جن کو بوقت ضرورت اپنایا جاسکتا ہے:

- (۱) جہاں مال خریدے وہیں کسی مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے، تو اس وکیل کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے۔
- (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ مال پہنچنے سے پہلے بیع نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کرے، اور جب مال پہنچے تب باضابطہ بیع کرے، اس صورت میں اگر جانبین میں سے کوئی انکار کر دے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔
- (۳) نیز اگر خریدار نے مال بھیجنے کیلئے کسی خاص کمپنی وغیرہ کی تعیین نہیں کی، البتہ مال پہنچانے کا کرایہ خریدار ہی ادا کرتا ہے تو اس صورت میں خریدار کا قبضہ مانا جائے گا، اور کمپنی کی تحویل میں مال کے آجانے کے بعد خریدار کیلئے اس مال کو فروخت کرنا جائز ہے (حسن الفتاویٰ ۵۲۶/۶)۔
- (۴) اور اگر سامان کو خریدنے سے پہلے خرید و فروخت کا معاملہ کیا جائے تو اسے محض وعدہ بیع یا بیع سلم یا بیع استصناع کے دائرہ میں رکھ کر جائز قرار دیا جائے گا۔

مذکورہ گذارشات کے بعد فقہ اکیڈمی دہلی کے مرسلہ سوالوں کا جواب ملاحظہ ہو:

## بیع قبل القبض فاسد ہے یا باطل؟

جیسا کہ اوپر مفصل عرض کیا گیا کہ ”بیع قبل القبض“ شرع اسلامی کے اعتبار سے ناجائز ہے، اور اس کے ناجائز ہونے پر جمہور فقہاء فی الجملہ متفق ہیں، اب یہ بات کہ ”بیع قبل القبض“ کا شمار عند الفقہاء بیع فاسد میں ہے، یا بیع باطل میں یا بیع مکروہ میں، تو اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بیع فاسد و مکروہ اور بیع باطل کی حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، فقہاء کرام نے بیع فاسد و مکروہ اور بیع باطل کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ: اگر خرید و فروخت کا معاملہ اصل اور وصف دونوں اعتبار سے صحیح نہ ہو تو بیع باطل ہے، اور اگر بیع کا معاملہ اصل کے اعتبار سے تو درست ہو، لیکن وصف متصل کی وجہ سے اس میں کوئی خرابی ہو تو یہ بیع فاسد ہے، اور اگر بیع کا معاملہ اصل و وصف کے اعتبار سے تو درست ہو، لیکن کسی امر مجاور کی وجہ سے اس میں کوئی قبح و خرابی پائی جائے تو یہ بیع مکروہ ہے، چنانچہ ”مشکوٰۃ“ کی شرح ”تنظیم الاشارات“ میں مرقوم ہے:

”والبیع الباطل ما لا یکون صحیحاً باعتبار الأصل والوصف والبیع الفاسد هو ما لا یصح ای ان کان القبح لوصف متصل والبیع المکروہ ان کان القبح لامر مجاور“ (تنظیم الاشارات ۲۰۱۱۵)۔  
حضرت علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ نے ”ہدایہ“ کے حاشیہ میں ”باب البیع الفاسد“ کے تحت بیع فاسد و مکروہ اور بیع باطل کی حقیقت پر اس سے زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (دیکھئے: حاشیہ ہدایہ ۳۳/۳)۔

بیع باطل و فاسد کی حقیقت سنا منے آجانے کے بعد ”بیع قبل القبض“ کے سلسلہ میں غور کرنا چاہئے کہ اس سے بیع فاسد ہوتی ہے یا بیع باطل ہوتی ہے، تو اگرچہ اس سلسلہ میں فقہاء کرام کا کلام مختلف ہے، چنانچہ ”جوہرہ نیرہ، باب المراسخہ“ میں لکھا ہے کہ:

”قال الخجندی: اذا اشتری منقولاً لا یجوز بیعہ قبل القبض لا من بائعہ ولا من غیرہ فان باعہ فالبیع الثانی باطل، والبیع الأول علی حالہ جائز ولو باعہ من البائع فقبلہ لا یصح البیع“ (الجوہرۃ النیرۃ)۔

اسی طرح صاحب درمختار نے بیع قبل القبض کے سلسلہ میں ایک قول یہ نقل کیا ہے: ”بخلاف بیعہ قبلہ (ای قبل القبض) فانہ باطل مطلقاً“ (الدر المختار ۶ رد المحتار ۲۰۱۸۲) یعنی قبل القبض باطل ہے، لیکن مذکورہ قول کے بعد بیع قبل القبض کے متعلق دوسرا قول بیع فاسد ہونے کا لکھا ہے: ”وفی المواہب وفسد بیع المنقول قبل قبضہ، انتہی“ (الدر المختار ۲۰۱۸۲)۔

اسی طرح ”فتاویٰ عالمگیری“ میں ”بیع قبل القبض“ کو بیع فاسد ہی لکھا ہے: ”ومنها القبض فی بیع المشتري المنقول وفي الدين قبل قبضه فاسد كالمسلم فيه“ (فتاویٰ عالمگیری کتاب البیوع الباب الاول ۲۰۲)۔

بیع باطل و فاسد کے مذکورہ بالا اصول کے پیش نظر ”بیع قبل القبض“ کو بیع فاسد ہی ہونا چاہئے، رہا بیع فاسد پر بیع باطل کا اطلاق تو یہ فقہاء کرام کے کلام میں بکثرت ہے، اسی طرح بیع باطل پر بھی فقہاء کرام کے اقوال میں بیع فاسد کا اطلاق ہوا ہے، چنانچہ ”شرح وقایہ“ میں لکھا ہے: ”قد یدکر الفاسد ویراد بہ الباطل كما أن فی أول کتاب القدوری جعل البیع بالمیتة فاسداً وهو باطل“ (شرح وقایہ ۲۰۶۰)۔

اسی طرح ”ہدایہ“ میں ہے: ”وبیع أمر الولد والمدبر والمکاتب فاسد ومعناه باطل“ (ہدایہ ۲۰۲۲)۔

قبضہ کی حقیقت تصریحات فقہاء کی روشنی میں:

اسلامی شریعت نے قبضہ سے پہلے کسی بیع میں تصرف کرنے سے منع کیا ہے، لیکن قبضہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا کتاب و سنت نے قبضہ کی کسی خاص حقیقت کی کوئی تحدید و تعیین کی ہے؟ یا لوگوں کے عرف میں جس درجہ کے عمل دخل کو قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً قبضہ مانا جائے گا، تو اس سلسلہ میں فقہاء کرام اور شارحین حدیث کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اسلامی شریعت نے قبضہ کی کوئی خاص تحدید نہیں کی ہے، البتہ نصوص شرعیہ کی روشنی میں بطور خود حضرات فقہاء کرام نے قبضہ کی تحدید کی کوشش کی ہے، لیکن تصریحات فقہاء کو درج کرنے سے پہلے قبضہ کے لغوی مفہوم کو یہاں تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ تصریحات فقہاء کو سمجھنے میں سہولت ہو، تو اس سلسلہ میں ارباب لغت نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قبض باب ضرب کا مصدر ہے، اور قبضہ اسی کا اسم مرۃ ہے، قبض کے لغوی معنی ہیں، لینا، پکڑنا، جمع کرنا، اکٹھا کرنا، گرفتار کرنا، ضبط کرنا، قابو پانا، وصول پانا، رکنا، باز رہنا، بٹنا، دور کرنا، سیٹنا، وفات دینا، تنگی ڈالنا،



کہا جاتا ہے: "صار المال في قبضة" مال اس کی ملکیت میں ہو گیا (ملاحظہ ہو: القاموس الجدید ۲۱/۵، مصباح اللغات ۶۵۳، النجد ۷۶۳، المعجم الوسيط ۷۱۱)، اور قواعد الفقہ میں قبض کی تشریح کرتے ہوئے اس کے مصنف نے لکھا ہے: "القبض خلاف البسط يقال قبض عليه إذا ضم عليه أصابعه وقبض الشيء أخذه، وهذا الشيء في قبضة فلان أي في ملكه وتصرفه، والقبضة من الشيء ملأ الكف منه" (قواعد الفقہ ۲۲۲) قبضہ کے لغوی معنی کو جان لینے کے بعد تصریحات فقہاء کی روشنی میں قبضہ کی حقیقت ملاحظہ ہو:

اس سلسلہ میں حضرات ائمہ ثلاثہ (امام مالک، شافعی اور احمد) کا نظریہ ہے کہ ہر چیز میں قبضہ اسی شے کی حیثیت کے اعتبار سے مانا جائے گا۔

"مذهب المالكية والشافعية والحنابلة أن قبض كل شيء بحسبه" (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۳۲، نص ابن قدامه في

المغني ۲، ۲۲۰)۔

اگر کوئی چیز وزن، کیل، عدد یا ذراع سے فروخت ہوئی تو اس میں قبضہ وزن، کیل، ذراع عدد (گن لینے) سے تسلیم کیا جائے گا۔

"فإن كان مكيلا أو موزونا أو معدودا أو مذروعا فقبضه بالكيل أو الوزن أو العدد أو الذراع وذلك لحديث عثمان... يا عثمان إذا ابتعت فاکتل وإذا بعت فكل" (علقه البخاری ۱، ۲۸۰، وصله أحمد ۱، ۶۲، وحسنه الهیثمی۔ ۲، ۹۸، البيهقي ۵، ۳۱۵، الموسوعة ۹، ۱۳۲)۔

البتہ امام مالک کے نزدیک مثلی چیزوں میں قبضہ کا تحقق خریدار کو بیع اس کے برتن میں رکھ کر حوالہ کر دینے سے مانا جائے گا، اور اگر منقولی سامان یا چوپائے کو خریدتا تو اس میں قبضہ کا اعتبار لوگوں کے درمیان رائج عرف کے مطابق ہوگا۔

"والمالكية شرطوا في قبض تسليمه للمشتري وتفريغ في أوعيته" (الشرح الكبير للدردير و حاشية الدسوقي عليه

۳، ۱۳۳)۔

"وإن كان جزافا فقبضه نقله وذلك لحديث ابن عمر قال كانوا يتبايعون الطعام جزافا بأعلى الصوت فنهاهم رسول الله ﷺ أن يبيعوه حتى ينقلوه وفي رواية حتى يحولوه، وإن كان منقولا من عروض و أنعام فقبضه بالعرف الجاري بين الناس كما يقوله المالكية كاحتياز الثوب و تسليم معقود الدابة" (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۳۲، الشرح الكبير۔ ۵، ۱۳۵)۔

اور حضرات حنابلہ کے نزدیک اگر بیع دراہم و دنانیر کے قبیل سے ہو تو اس میں قبضہ کا تحقق ہاتھ میں لینے سے ہوگا، اور اگر کپڑا ہو تو اس کو منتقل کر لینے سے ہوگا، اور اگر جانور ہو تو اس کو اس کی جگہ سے چلا دینے سے قبضہ مانا جائے گا، اور اگر زمین ہو تو اس میں قبضہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع مشتری کیلئے زمین کا تخلیہ کر دے:

"وفصل الحنابلة في المنقول من العروض والأنعام، فقالوا: إن كان المبيع دراهم أو دنانير فقبضها باليد وإن كان ثيابا فقبضها نقلها وإن كان حيوانا فقبضه تمشيته من مكانه... وإن كان عقازا فقبضه بالتخلية بينه وبين المشتري بلا حائل دونه" (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۳۲، نقلا عن المغني ۲، ۲۲۰، كشف القناع ۳، ۲۲۷)۔

اور حضرات شوافع کے نزدیک بھی بیع کی مختلف قسموں کے اعتبار سے قبضہ کے سلسلہ میں قدرے تفصیل ہے، اگر بیع ایسی ہے کہ وہ ہاتھ سے پکڑی جاسکتی ہے تو اس میں قبضہ ہاتھ میں لے لینے سے ہوگا، جیسے سونا، چاندی، درہم و دنانیر، اور کپڑا۔ اور اگر بیع منقولی اشیاء کے قبیل سے ہے، تو قبضہ کا تحقق سامان کو منتقل کر لینے سے ہوگا، اور اگر بیع غیر منقولی اشیاء میں سے ہے تو قبضہ تخلیہ کر دینے سے ہو جائے گا، البتہ مکان میں قبضہ کا اعتبار اس وقت ہوگا جبکہ بائع خریدار کو مکان کی کنجی حوالہ کر کے تصرف کرنے کی اجازت دیدے، اور اگر اس میں کسی اور کا سامان ہو تو اس کو نکال کر مکان کو خالی کر دے (الموسوعة الفقهية ۹، ۱۳۳، فتح الباری ۳، ۱۳۱)۔

اور ائمہ حنفیہ کے نزدیک قبضہ کے سلسلہ میں اتنی تفصیل نہیں ہے، بلکہ ان حضرات نے قبضہ کیلئے تخلیہ کو معتبر مانا ہے، لیکن تخلیہ کی تعریف بقول علامہ انور شاہ کشمیری معذرت ہے، البتہ ظاہر روایت کے مطابق اس کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ خریدار کیلئے بیع کو لے کر تصرف کرنے میں جو رکاوٹ پیش آسکتی ہے، بائع اس کو دور کر دے (العرف اشدی ۱، ۲۳۳)۔



اور حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک منقولی چیزوں میں قبضہ کا تحقق سامان کو منتقل کر لینے سے مانا جائے گا، لیکن بظاہر یہ حضرت امام ابو یوسف کی ایک روایت ہے ورنہ ان کا مذہب یہی ہے کہ تمام چیزوں میں قبضہ کا تحقق صرف تخلیہ سے ہو جاتا ہے۔

”قال في الموسوعة لأنها (أى التخلية) تسليم فمن ضرورته الحكم بالقبض فيترتب عليه ما يترتب على القبض الحقيقي وهذا هو الأصح و مقابل الأصح المروي عن أبي يوسف وهو أنه لا يثبت في المنقول إلا بالنقل“ (الموسوعة الفقهية ۹، ۲۲۲) ”ولكن قال صاحب البدائع لا خلاف بين أصحابنا في أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال“ (البدائع ۵، ۲۲۲) مندرجہ بالا تفصیل سے قبضہ کی حقیقت کے سلسلہ میں فقہاء احناف کا جو نظریہ پیش ہو کر سامنے آتا ہے اس سلسلہ میں صاحب بدائع نے متعدد جگہ کلام کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے، ”ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادةً وحقيقة“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۲۸) نیز ایک اور جگہ صاحب بدائع نے قبضہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ”تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“ (بدائع ۵، ۲۲۲)۔

مذکورہ تفصیل سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ فقہائے احناف نے قبضہ کے تحقق کیلئے تخلیہ کو معتبر مانا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہاء احناف کے نزدیک بیع پر قبضہ بالید کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، بلکہ حکماً قبضہ کو بھی ان حضرات نے معتبر تسلیم کیا ہے، چنانچہ علامہ شامی نے لکھا ہے: ”وقد يكون القبض حكماً، كمن قبضه حكماً، كمن قبضه، آگے چل کر علامہ شامی نے قبضہ حکمی کی متعدد مثالیں بیان فرمائی ہیں اور اسی ذیل میں لکھا ہے کہ ”ومنه (أى من القبض) مالواشترى دهنًا ودفعه قارورة يزنه فيها فوزنه فيها بحضرة المشتري فهو قبض، وكذا بغيته في الأصح، وكذا اكل مكيل أو موزون إذا دفع له الوعاء فكاله أو وزنه فيه بأمره ومنه مالو غصب شيئاً ثم اشتراه صار قابضاً بخلاف الوديعة والعارية إلا إذا وصل إليه بعد التخلية“ (رد المحتار ۲، ۲۷)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بیع پر قبضہ اس کے تخلیہ سے حاصل ہو جاتا ہے، چنانچہ ”رد مختار“ میں بھی لکھا ہے کہ بیع کو حوالہ کرنا اس کے تخلیہ سے ہوتا ہے، لیکن اس طرح کہ بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو، ”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل“ (الدر المختار ۲، ۲۷) اور علامہ شامی نے ”رد مختار“ کی مذکورہ عبارت کی شرح کرتے ہوئے ”رد المحتار“ میں قبضہ کے سلسلہ میں تفصیلی بحث کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر گریہوں کسی نے خرید اور وہ کسی مکان میں ہے، اور بائع نے خریدار کو مکان کی کنجی دیکر کہا کہ میں نے گریہوں کا آپ کیلئے تخلیہ کر دیا، تو اسے قبضہ مانا جائے گا، لیکن اگر کنجی دیکر کچھ نہیں کہا تو شرعاً قبضہ نہیں ہے، اور اگر کسی نے نظروں سے اوجھل مکان کو فروخت کیا، اور کہا کہ میں نے وہ مکان تیرے حوالہ کر دیا تو یہ قبضہ نہیں ہے، ہاں اگر مکان اتنا قریب ہو کہ خریدار اس کو بند کر سکتا ہو تو شرعاً یہ مکان پر قبضہ مانا جائے گا ورنہ نہیں، اور ”جمع النوازل“ میں لکھا ہے کہ گھر کو فروخت کر کے کنجی حوالہ کر دینا شرعاً قبضہ ہے جبکہ خریدار کیلئے بلا تکلف اس مکان کو کھولنا آسان ہو، اسی طرح اگر کسی نے چراگاہ میں گائے کو خرید اور بائع نے اس سے کہا کہ جاؤ قبضہ کر لو، تو اگر خریدار اس گائے کو دیکھ سکتا ہو اور اس کی طرف اشارہ کر سکتا ہو، تو یہ بھی قبضہ ہے ورنہ نہیں، اگر کسی نے کپڑا خرید اور بائع نے اس سے کہا کہ قبضہ کر لو اب اگر بغیر کھڑے ہوئے بھی کپڑے کو لینا ممکن ہے تو یہ قبضہ ہے ورنہ نہیں، اور اگر کسی نے گھوڑے یا پرندے کو خرید اور وہ دونوں کسی کمرہ میں ہوں، اور فروخت کنندہ نے خریدار سے کمرہ کا دروازہ کھول کر کہا کہ قبضہ کر لو، تو اگر خریدار کیلئے وہاں پہنچ کر بغیر کسی کی مدد کے پرندہ اور گھوڑے کو پکڑنا ممکن ہو تو یہ قبضہ ہے اور اس سلسلہ میں تفصیلی بحث بحر میں ہے، آخر میں بطور خلاصہ کے خود علامہ شامی نے لکھا ہے کہ ”وحاصله أن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض، أي بأن تكون في البلد فيما يظهر، وفي نحو بقر في مرعى، فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض، وفي نحو ثوب، فكونه بحيث لو مد يده تصل إليه قبض و في نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه بلا معين قبض“ (رد المحتار ۲، ۲۷، ۲۸)۔

آگے چل کر علامہ شامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر بیع اتنی دور ہو کہ بغیر مشقت کے اس پر قابض ہونے کی قدرت نہ ہو تو ایسی صورت میں صرف قبضہ کر لینے کی اجازت دیدینے سے شرعاً قبضہ نہیں مانا جائے گا، اسی طرح بیع کے دور ہونے کی صورت میں اس کے تخلیہ سے خریدار کا قبضہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

”لأنه إذا كان قريباً يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض أما إذا كان بعيداً لا يتصور القبض في الحال، فلا تقام التخلية مقام القبض“ (رد المحتار ۴۰۲۸)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ فقہاء احناف کے نزدیک تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام اسی وقت مانا گیا ہے جبکہ بیع قریب ہو، اور اس پر حقیقی قبضہ بھی ممکن ہو، ورنہ جہاں بیع کے دور ہونے کی وجہ سے حقیقی قبضہ متصور نہ ہو وہاں تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام نہیں مانا جائے گا، بلکہ وہاں حسی قبضہ معتبر ہوگا، البتہ جہاں حقیقی قبضہ ممکن و مقدور ہو وہاں قبضہ کے لئے بیع کا تخلیہ کر دینا کافی ہے، اور تخلیہ کا واضح مطلب یہ ہے کہ بائع بیع کو اپنے دیگر سامانوں سے اس طرح الگ اور جدا کر دے کہ خریدار جب چاہے، بلا روک ٹوک کے بیع میں تصرف کر سکے، اور بیع کے ساتھ خریدار کے علاوہ کسی اور کا کوئی حق وابستہ نہ ہو، اور ہر چیز میں قبضہ اسی شے کے مناسب حال معتبر ہوگا۔

### منقولی وغیر منقولی اشیاء میں قبضہ کی صورتیں:

غیر منقولی اشیاء میں قبضہ کے تحقق کیلئے تقریباً تمام فقہاء نے تخلیہ کو کافی قرار دیا ہے، جیسا کہ اوپر مفصل گذرا، البتہ دور حاضر میں زمین و جائداد کے قبیل کی غیر منقولی اشیاء میں عرف عام کے اندر رجسٹری کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ بغیر اس کے لوگ قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں کرتے، اس لئے دور حاضر کے بدلتے ہوئے حالات میں زمین و جائداد میں قبضہ کے تحقق و ثبوت کیلئے قضاء زمین کی رجسٹری کو لازم قرار دینا چاہئے، اگرچہ دیانتہً بغیر رجسٹری کے صرف تخلیہ اور رفع موانع کی وجہ سے قبضہ کو تسلیم کیا جائے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جائے۔

اور منقولی اشیاء میں قبضہ کے تحقق کیلئے اگرچہ فقہاء احناف نے بیع کے قریب ہونے کی صورت میں تخلیہ کو کافی قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مشتری کیلئے بیع کو قبضہ کرنے میں جو رکاوٹ پیش آسکتی ہے، بائع اس رکاوٹ کو دور کر دے، لیکن دیگر فقہاء نے اس کے ساتھ مکیلی و موزونی اور معدودی و مزدوری چیزوں میں کیل و وزن، پیمائش اور بیع کو گن کر الگ کر دینے کو لازم قرار دیا ہے، بلکہ حضرت امام مالک نے مثلی چیزوں میں قبضہ کے تحقق کیلئے بیع کو خریدار کے برتن میں رکھ دینے کو شرط قرار دیا ہے، اور دیگر منقولی سامانوں اور جانوروں میں قبضہ کے لئے لوگوں کے درمیان راجح عرف کا اعتبار کیا ہے، اور حضرات شوافع و حنابلہ نے ہاتھ سے پکڑی جانے والی چیزوں میں قبضہ کے ثبوت کیلئے بیع کو ہاتھ میں لینے اور دیگر منقولی چیزوں میں سامان بائع کے پاس سے منتقل کر لینے کو لازم کہا ہے، اسی طرح طعام کے قبیل کی چیزوں کو اگر خریدار نے اندازے سے خریدا ہو تو اس میں قبضہ کا اعتبار بیع کو منتقل کر لینے سے ہوگا اور جانور وغیرہ میں اس کی جگہ سے چلا دینے سے، ”قال في البدائع وقال الشافعي القبض في الدار والعقار والشجر بالتخلية وأما في الدراهم والدينار فتناولهما بالبراجم وفي الثياب بالنقل وكذا في الطعام إذا اشتراه مجازفة فإذا اشتراه مكيالة فبالكيل وفي العبد والبهيمة بالسير من مكانه“ (بدائع ۵۰۲۴)۔

اوپر فقہاء احناف کا جو یہ قول نقل کیا گیا کہ ان کے نزدیک صرف تخلیہ سے خریدار کا قبضہ مکمل ہو جاتا ہے، وہ فقہاء احناف کا ایک قول ہے، ورنہ دوسرے قول کے مطابق مکیلی و موزونی اشیاء میں قبضہ کی تمامیت کیلئے بیع کا کیل و وزن ہو جانا ضروری ہے، ”قال في البدائع: والدليل على أن الكيل والوزن في المكيل والموزون الذي يبيع مكيالة وموازنة من تمام القبض أن القدر في المكيل والموزون معقود عليه ألا ترى أنه لو كيل فازداد لا تطيب له الزيادة بل ترد أو يفرض لها ثمن ولو نقص يطر ح مجسته شيء من الثمن ولا يعرف القدر فيهما إلا بالكيل والوزن“ (بدائع ۵۰۲۵)۔

کیا بیع قبل القبض کی نہیں سے متعلق احادیث معلول بالعلہ ہیں؟

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ ”فعل الحكيم لا يخلو عن الحكمة“ حکیم کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا ہے، لہذا اللہ رب العزت جو حکم الہامی ہے، کیا اس کے کسی حکم کا حکمت سے خالی ہونا ممکن ہے؟ ظاہر ہے کہ ہرگز ایسا ممکن نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مؤمنوں میں تخلیق انسانی کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

”أفحسبتم أنما خلقناكم عبثاً وأنكم إلينا لا ترجعون“ (سورة المؤمنون ۱۱۵)۔

(اے لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم لوگوں کو بیکار پیدا کر دیا ہے؟ اور تم لوگ ہمارے پاس نہیں لوٹائے جاؤ گے؟)۔

باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ اس ذات وحدہ لا شریک لہ نے انسانوں کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ ہر انسان کو اس نے ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، وہیں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ باری تعالیٰ سبحانہ کا ہر کام حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے، البتہ اگر کسی امر خداوندی کی حکمت ہم کو معلوم ہو گئی تو اسے ہم امر معقول کہتے ہیں ورنہ اس حکم کو امر تعبدی کا عنوان دیا جاتا ہے، ”فما شرعہ ان ظہرت حکمتہ لنا قلنا: انہ معقول والا قلنا انہ تعبدی“ (رد المحتار کتاب الصلوٰۃ ۱۰۳۰)۔

مذکورہ تفصیل کا تقاضا ہے کہ نصوص شرعیہ میں تعلیل کو اصل کہا جائے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ نصوص شرعیہ اور احکام فرعیہ کی بنیاد بھی علتوں پر ہو، ورنہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے احکام کو بغیر کسی علت کے بیکار مشروع کیا ہے، جو سراسر باطل ہے، لہذا یہ بات واضح ہو گئی کہ فقہاء اصولیین نے جو یہ قاعدہ تحریر فرمایا ہے کہ:

”ان الأحكام الشرعية العملية جميعها إنما شرعت لمصالح الناس ولعلل بنيت عليها وما شرع حكم منها عبثاً بغير علة“ (أصول الفقه للخلاف ۶۲)، نیز اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ مرقوم ہے:

”ان الله سبحانه ما شرع حكماً إلا لمصلحة وإن مصالح العباد هي الغاية المقصودة من تشريع الأحكام“ (أصول الفقه للخلاف ۵۸)۔

مذکورہ تصریحات سے جب یہ بات واضح ہو گئی کہ احکام شرعیہ کی بنیاد علتوں پر ہوتی ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن احادیث نبویہ اور اکابر صحابہ کے فتاویٰ میں بیع قبل القبض سے منع کیا گیا ہے تو ان میں ممانعت کی علت ضعف ملک ہے، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں لکھا ہے کہ:

”لا يصح بيع المبيع قبل قبضه (إلى قوله) لضعف الملك قبل القبض لانفساخ العقد بتلفه وهذا المعنى الذي علل به الشافعي النهي عن البيع قبل القبض“ (الموسوعۃ الفقہیہ ۹۰۱۲۳)۔

”ومثله في الفقه على المذاهب الأربعة: لا يصح للمشتري أن يتصرف في المبيع قبل قبضه (إلى قوله) لضعف الملك قبل القبض فلا يصح التصرف في المبيع بالمبيع“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۳۰۱۹۱)۔

اور حضرات حنابلہ کے نزدیک بیع قبل القبض کے عدم جواز کی علت بیع پر مشتری کی ملکیت کا تام نہ ہونا ہے، ”وعلى الحنابلة عدم الجواز على هذه الرواية التي اختارها ابن عقيل من أئمتهم، بأنه لم يتم الملك عليه فلم يجز بيعه، كما لو كان عين متعين“ (الموسوعۃ الفقہیہ ۹۰۱۲۳)۔

اور حضرات مالکیہ کے نزدیک بیع قبل القبض سے ممانعت کی علت کے سلسلہ میں ”الفقه على المذاهب الأربعة“ میں دو قول منقول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ بیع پر قبضہ کر کے بیچنے کے ساتھ بہت سے لوگوں کا نفع وابستہ ہے، مثلاً جو لوگ سامان تولتے ہیں یا وزن کرتے ہیں، یا اس کو اٹھاتے ہیں، ان کو نفع ہوتا ہے، لیکن اگر بیع پر قبضہ کئے بغیر ہی اس کو فروخت کر دیا جائے تو مذکورہ حضرات کا نقصان اور گھانا ہوتا ہے اور ان کا نفع ضائع ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ممانعت کا حکم تعبدی ہے، یعنی ممانعت کی علت و مصلحت ہم کو معلوم نہیں ہے، ”وقد قيل في علة النهي إن في قبضه منفعة للعمال إذ ينتفعون بكيه وحمله ووزنه وغير ذلك بخلاف ما إذا بيع وهو عند صاحبه فإن ذلك يضيع تلك المنفعة وقيل إنه تعبدی“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۳۰۱۹۲)۔

اور علمائے احناف کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ کی علت غرر ہے، کیونکہ قبضہ سے پہلے اگر بیع بائع ہی کے پاس ہلاک ہو جائے تو عقد بیع فسخ ہو جاتا ہے، پس اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مشتری نے جو قبضہ سے پہلے بیع کو فروخت کیا ہے، تو گویا اس نے غیر مملوک شی کو فروخت کر کے مشتری ثانی کو دھوکہ دیا ہے، جو شرعاً ممنوع و حرام ہے، چنانچہ ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد اور مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ و ابن عباسؓ سے مروی ہے: ”نهي رسول الله عن بيع الغرر“ (ابن ماجہ ۱۰۱۵۸، ترمذی ۱۰۲۲۳، ابوداؤد ۲۰۲۶۹، مسلم ۲۰۲)۔



اور مفتی محمد تقی صاحب عثمانی نے بیع قبل القبض کی ممانعت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کا مدار دو وجہوں پر ہے:

(۱) قبضہ سے پہلے بیع مقدوراً تسلیم نہیں ہوتی، لہذا یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کر دے گا، یہ غرر ہے جس کی بنا پر بیع جائز نہیں ہے۔

(۲) ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں نہیں آتی، اور ”رجح الملم یضمن“ جائز نہیں (اسلام اور جدید معیشت، ص ۹۱)۔

اور علامہ طحاویؒ کے نزدیک بھی بیع قبل القبض کی علت ”رجح الملم یضمن“ ہے (معانی الآثار ۲/۲۰۲) لیکن زیادہ تر علمائے احناف نے ”بیع قبل القبض“ کی علت غرر (دھوکہ) کو قرار دیا ہے۔

(۵) بیع قبل القبض کی ممانعت کا حکم عام مخصوص منہ البعض ہے:

”بیع قبل القبض“ کی ممانعت باتفاق ائمہ عام مخصوص منہ البعض ہے، کیونکہ جب بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بالعلتہ“ ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جہاں ممانعت کی علت پائی جائے گی وہیں ممانعت کا حکم ہوگا ورنہ نہیں، چنانچہ حضرت امام شافعی جو قبضہ سے پہلے بیع کی خرید و فروخت کی ممانعت کی عمومیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی بیع کے علاوہ بہت سے دیگر تصرفات قبضہ سے پہلے بیع میں جائز ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک قبضہ سے پہلے وقف جائز ہے، بلکہ ان کے نزدیک اگر کسی نے بغیر کیل و وزن کے اٹکل سے غلہ کو مثلاً گیہوں وغیرہ کے ڈھیر کو بغیر کیل و وزن کے اندازے سے خرید تو اس میں خریدار قبضہ سے پہلے تصرف کر سکتا ہے۔

اسی طرح ”الفقہ علی المذاهب الاربعۃ“ میں لکھا ہے کہ حضرات شوافع کے نزدیک قبضہ سے پہلے بیع میں تصرف کے عدم جواز سے تین صورتیں مستثنیٰ ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ خریدار قبضہ سے پہلے بیع کو پہلی ہی قیمت کے عوض بغیر کسی اضافہ کے بائع کے ہاتھ فروخت کر دے تو یہ جائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بیع کا کچھ حصہ بائع کے پاس تلف ہو جائے تو خریدار تلف شدہ بیع کو بائع ہی کے ہاتھ فروخت کر دے، یعنی بائع خریدار کو تلف شدہ بیع کے مثل ثمن دیدے تو یہ بھی جائز ہے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی چیز بائع سے ادھار خریدی اور ابھی خریدار نے بائع کو ثمن نہ دیا، اور نہ بیع پر قبضہ کیا تو ایسی صورت میں بھی خریدار پہلی قیمت پر بیع کو بائع سے فروخت کر سکتا ہے، ”والبیع فی الأحوال الثلاثة یکون إقالة بلفظ البیع فلیس یبعا حقیقۃ“ (الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ۱۹۲، ۳)۔

نیز امام شافعیؒ کے نزدیک ترکہ میں، اسی طرح ثمن میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے۔

”لا یمتنع بیعہ ما ورثہ قبل قبضہ“ (مسلم شریف ۲/۶)۔

اور حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے نزدیک قبضہ سے پہلے صرف کھائی جانے والی چیزوں کو فروخت کرنا جائز ہے ورنہ جائز ہے، لیکن کھائی جانے والی اشیاء کے علاوہ دیگر چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر کسی نے کھائی جانے والی چیزوں کو اٹکل سے بغیر تولے اور وزن کئے ہوئے خرید تو اس کی بیع بھی قبضہ سے پہلے جائز ہے۔

در اصل امام مالک کے نزدیک قبضہ سے پہلے کسی چیز میں تصرف کا عدم جواز دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے: پہلی شرط یہ ہے کہ کھانے کی اشیاء کو کوئی عوض دے کر لیا گیا ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ کیل و وزن یا عدد سے لیا گیا ہے، لہذا اگر کسی کے پاس کھانے کی اشیاء ہبہ یا ترکہ میں آئی ہوں تو اس کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر کسی چیز کو اٹکل سے خریدا ہو تو قبضہ سے پہلے اس چیز کو اٹکل سے یا تول کر فروخت کرنا شرعاً درست ہے، البتہ اگر کھانے کی اشیاء کو کسی چیز کے عوض کیل سے خریدا تو اس کو قبضہ سے پہلے بیچنا اٹکل سے جائز ہے اور نہ کیل و وزن سے جائز ہے (حاشیہ الدسوقی ۳/۱۳۵، ۱۳۶)۔

اور حضرات حنابلہ کے نزدیک غیر مکملی وغیر موزونی، غیر معدودی اور غیر مذروعی چیز کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا، رہن رکھنا، ہبہ کرنا جائز ہے، اسی طرح جن چیزوں کو اٹکل سے خریدا ہو، ان چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے، البتہ جن چیزوں کو کیل و وزن سے یا ناپ کر یا گن کر خریدا ہو، ان چیزوں کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، ہاں قبضہ سے پہلے وصیت کرنا یا مال غیر مقبوض کو بدل خلع اور مہر ٹھہرانا درست ہے (الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ۲/۱۹۲)۔

اور حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک اگر بیع غیر منقولی اشیاء کے قبیل سے ہے جیسے زمین، تو اس کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے، اسی طرح قبضہ سے پہلے ثمن میں تصرف بھی جائز ہے (دیکھئے المسبوط ۱۰/۱۳۵، بدائع ۵/۲۳۳)۔

اور حضرت امام محمد کے نزدیک قبضہ سے پہلے بیع میں تصرف کا ضابطہ یہ ہے کہ جن تصرفات کی تمامیت کیلئے قبضہ شرط ہے، ان میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز ہے، جیسے قبضہ، صدقہ، رہن، قرض، اعارہ وغیرہ، اور جو تصرفات قبضہ سے پہلے ہی تام ہو جاتے ہیں جیسے بیع، اجارہ، بدل صلح جو اعیان کے قبیل سے ہوں، ان میں قبل القبض تصرف جائز نہیں۔ ”وضع محمد بن الحسن من الحنفیة (لمنع التصرف قبل القبض) هذا الضابط:-“

- (۱) ان كل تصرف لا يتم الا بالقبض كالهبة والصدقة والرهن والقرض والإعارة ونحوها يجوز قبل القبض۔  
 (۲) وكل تصرف يتم قبل القبض كالمبيع والإجارة وبديل الصلح عن الدين إذا كان عينا ونحوها لا يجوز قبل القبض“  
 (الموسوعة ۹۱۲۹)۔

اور قاضی شوکانی کے نزدیک جو تصرفات عوض لے کر کئے جاتے ہیں وہ بیع کے مثل ہیں، لہذا قبضہ سے پہلے ایسے تصرفات کو انجام دینا جائز نہیں ہے، اور جو تصرفات بغیر عوض لئے کئے جاتے ہیں وہ ہبہ کے مانند ہیں، یعنی قبضہ سے پہلے ان کا کرنا جائز ہے، اور اس سلسلہ میں علامہ شوکانی کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ قبضہ سے پہلے وقف کرنا اور غلام کو آزاد کرنا شرعاً جائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو تصرف بغیر عوض لئے کیا جاتا ہے، وہ قبضہ سے پہلے انجام دینا جائز ہے، کیونکہ وقف اور غلام کی آزادی کا تصرف بغیر عوض لئے ہوئے ہی کیا جاتا ہے، اور بیع قبل القبض کی ممانعت کی علت شبہ ربوا ہے، اور ربوا کا لین دین بھی معاوضات ہی کے اندر ہوتا ہے، لہذا جو معاملہ عوض لے کر کیا جائے اس میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہونا چاہئے (الموسوعة الفقهية ۱۳۱۹)۔

مندرجہ تصریحات علماء و فقہاء سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کا حکم عام مخصوص منہ البعض ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جن حضرات ائمہ نے بعض صورتوں میں بیع قبل القبض کے جواز کا فتویٰ دیا ہے ان کے دلائل کیا ہیں۔

## (۶-۷) بیع قبل القبض کی بعض مروجہ شکلیں:

اگر کوئی شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ اس مال کو فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خرید کر مال کو دوسرے خریدار کے پاس روانہ کر دیتا ہے یا فیکٹری ہی کو دوسرے خریدار کے پاس مال بھیج دینے کا حکم دے دیتا ہے، اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آئے گی، اور نہ خریدار نمبر (۲) پر، بلکہ یہ پہلے ہی خریدار کا نقصان مانا جائے گا، تو اس صورت میں، اگرچہ فیکٹری سے خریدنے والے شخص کا براہ راست حسی قبضہ تو نہیں ہوا، لیکن چونکہ خود خریدار اول نے اپنے نوکر کے ذریعہ مال اٹھوا کر خریدار ثانی کے یہاں بھیج دیا ہے یا فیکٹری ہی کو اس نے مال بھیجنے کا وکیل بنایا ہے، اس لئے وہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے سے پہلے اسی خریدار اول ہی کے ضمان میں رہے گا، اور اس خریدار اول کا مال پر حکمی قبضہ پایا گیا، اس لئے یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خریدار اول نے مال غیر مضمون سے نفع حاصل کیا ہے، یا اس نے قبضہ سے پہلے مال کو فروخت کیا ہے، بلکہ اس نے مال پر حکماً قبضہ کے بعد مال مضمون سے نفع حاصل کیا ہے، لہذا سوالنامہ کی اس درج شدہ صورت میں فیکٹری کے مالک کو بائع ماننے کے ساتھ خریدار اول کو وکیل بالقبض قرار دیا جائے گا، ”لأن أمور المسلمين محمولة على الصحة والسداد ما أمكن“ (بدائع ۵۰۲۱۷)۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی بائع (دوکاندار) سے مال خرید کر اس سے کہا کہ تم ہمارا مال جہاز کے ذریعہ روانہ کر دو، چنانچہ بائع نے ایسا ہی کیا اور وہ مال جہاز پر چڑھا کر اپنے ذمہ سے فارغ ہو گیا، اور مال مشتری کے ضمان میں داخل ہو گیا، پھر مشتری نے اپنے پاس مال پہنچنے سے پہلے ہی، جبکہ مال سمندر میں ہے، ایک تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دیا، اور اس مال کو تیسرے شخص کے حکم سے اسی کے پاس بھیج دیا اور درمیان میں مال کے ضائع ہونے کی صورت میں یہ درمیانی شخص مال کا ضامن نہیں ہوتا، اور نہ بائع اول ہی مال کا ضامن ہوتا ہے، بلکہ تیسرا شخص ضامن ہوتا ہے، تو شرعاً یہ صورت بھی جائز ہے، ”لأن فعل المسلم يجب حمله على أحسن الوجوه ما أمكن“ (اعلاء السنن ۱۳۲۳۸) اور مال بردار کمپنی کو تیسرے شخص کے حق میں وکیل بالقبض مانا جائے گا۔ ”قال في الهندية: رجل اشترى كرا من صبرة قال للبائع ... في جوالقي ودفع إليه الجوالق ففعل كالت المشتري قابضاً كذا في فتاوى قاضي خان“ (عالمگیری ۱۹۰۳)۔

”وفيه أيضاً إذا قال المشتري للبائع: قل للبعد: يعمل لي كذا فأمره البائع، فعمل صار المشتري قابضاً، كذا في المحيط“ (عالمگیری ۳۰۲۰)۔





## بیع میں تحریری وثائق و دستاویز پر قبضہ کی حیثیت

مولانا ابوجندل قاسمی ؒ

۱۔ آج کل قبضہ سے پہلے بیع عالمی تجارت کا ایک اہم عنصر بن گئی ہے، زیادہ تر تھوک کاروبار کا انحصار ٹیلی فون اور تحریری وثائق پر ہے، بلکہ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اصل جگہ سے روانہ ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی مال کی باقاعدہ بیع در بیع ہو جاتی ہے اور درمیان کا ہر بائع اپنا نفع وصول کر لیتا ہے، اس طرح قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے رواج نے علماء اور مفتیان کرام کے سامنے ایک مشکل کھڑی کر دی ہے، اس لئے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے صاف الفاظ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے ممانعت فرمائی ہے، جیسا کہ ”بخاری و مسلم“ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يقبضه“ (بخاری ۱۰۲۸۶، مسلم ۲۰۵)۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شمار بیع باطل میں ہے یا فاسد میں، تو پہلے بیع فاسد و باطل کی تعریف جان لینا مناسب ہے، چنانچہ تقریباً تمام فقہاء متفق ہیں کہ عقد فاسد وہ عقد ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو صحیح ہو، لیکن وصف کی کسی نقص اور خرابی کی وجہ سے وہ مشروع نہ ہو، مثلاً بیع یا شمن ایسی چیز ہو جو غیر مقدور تسلیم ہو، یا کوئی ایسی شرط عقد میں عائد کر دی جو عقد کے خلاف ہو، یا عقد میں کسی طرح کی جہالت ہو جو مفضی الی المنازعت ہو، وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر عقد اپنی ذات اور اصل ہی کے اعتبار سے مشروع نہ ہو، بلکہ ذات میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہو تو یہ عقد باطل ہے، مثلاً: احد المتعاقدين مجنون ہو، یا نام سمجھ بچہ ہو، یا بیع مال ہی نہ ہو، یا مال تو ہو، لیکن مستقوم نہ ہو، جیسے مینہ اور خمر۔ علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ ہدایہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

”الفساد ما يصح أصلاً لا وصفاً، والباطل ما لا يصح أصلاً ووصفاً... فكل ما أورث خللاً في ركنه فهو باطل وكل ما ليس كذلك بل أورث خللاً في غيره كالتسليم والتسليم الواجبين بالعقد... وغير ذلك فهو فاسد“ (ہامش الہدایہ ۲۰۲۲ باختصار)۔

عقد فاسد وہ ہے جو اصل کے اعتبار سے صحیح ہو، نہ کہ وصف کے اعتبار سے، اور عقد باطل وہ ہے جو نہ اصلاً صحیح ہو اور نہ وصفاً، پس (قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) ہر وہ چیز جو عقد کے رکن میں خلل انداز ہو تو وہ عقد باطل ہے، اور ہر وہ عقد کہ جس کے رکن میں کوئی خلل نہ ہو بلکہ اس کے علاوہ (کسی اور چیز) میں خلل ہو، مثلاً بیع کو سپرد کرنے اور قبضہ کرنے میں جو دونوں عقد سے واجب ہوتے ہیں، وغیرہ، تو یہ عقد فاسد ہے۔

اب رہی بات یہ کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فاسد ہے یا باطل، تو اس سلسلہ میں دونوں قول ملتے ہیں، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ باطل ہے اور بعض فساد کے قائل ہیں، چنانچہ مفتی ابوسعود مصریؒ فرماتے ہیں: ”(قولہ: ای لا يصح بيع المنقول) نفی الصحة یحتمل ثبوت فساد العقد وبطاله صرح بالأول في المواهب وبالغاني في الجوهرة شربلالیه، ومثل ما في المواهب في الزيلعي“ (فتح المعین علی شرح الکنز ۲۰۵۹۲)۔

نیز صاحب عنایہ فرماتے ہیں: ”النهي يقتضي الفساد فيكون البيع فاسداً قبل القبض“ (عنایہ مع الفتاویٰ ۱۲۷، ۶)۔ نیز ہدایہ کے مندرجہ بالا حاشیہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بیع فاسد ہے، اور یہی زیادہ صحیح ہے، اس لئے کہ یہاں رکن بیع میں کچھ خرابی نہیں، بلکہ صرف وصف بیع میں خرابی ہے جو فساد ہی کا مقتضی ہے۔



۲۔ قبضہ کی حقیقت اور مفہوم صرف اتنا ہے کہ بائع شیئ بیع کو اپنے مال سے اس طرح الگ کر دے کہ مشتری (خریدار) جب بھی چاہے اس شیئ بیع کو اپنی مرضی سے اٹھا کر لے جاسکے، اور اختیار سے اٹھا کر لیجانے میں اس کو کوئی مانع پیش نہ آئے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

”التسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲، ۲، ۱۶) (خریدار کو بیع سونپنے اور اس پر قبضہ کرنے کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ تخلیہ اور تخلی ہو جائے اور تخلیہ و تخلی کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع کو مشتری کے لئے اس طرح پیش کرے کہ درمیان سے رکاوٹ اس طرح دور ہو جائے کہ مشتری کو بیع میں تصرف کرنے پر پوری طرح قدرت حاصل ہو جائے، پس کہا جائے گا کہ بائع نے بیع سونپ دی اور مشتری نے قبضہ کر لیا)۔

ایک موقع پر فرماتے ہیں: ”ولا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۳۸)۔

حصول قبضہ کیلئے ہاتھ سے قبضہ کرنا کوئی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ قبضہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ مشتری قبضہ پر قادر ہو اور بائع مشتری کے سامان کو چھوڑ دے، اور یہ کہ عرف و عادت میں صحیح معنی میں موانع ختم ہو جائیں۔

علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی فرماتے ہیں: ”إن معنى التسليم والتسلم يحصل بالتخلية، ولهذا يدخل المبيع في ضمان المشتري بالتخلية نفسها بلا خلاف دل أن التخلية قبض“ (اعلاء السنن ۱۳، ۲۲۲، کراتشی)۔  
معلوم ہوا کہ قبضہ کی حقیقت صرف تخلیہ ہے ہمارے نزدیک، ہاتھ سے قبضہ کرنا یا نقل و تحویل کی قبضہ کے اثبات کیلئے ضرورت نہیں، اگرچہ تصرف کیلئے بعض صورتوں میں ضرورت ہے۔

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی ایک ہی صورت ہے یعنی تخلیہ۔  
علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲)۔

ہمارے اصحاب کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ اصل قبضہ تخلیہ سے حاصل ہو جاتا ہے تمام مالوں میں (خواہ وہ اموال منقولہ ہوں، جیسے مکملی و موزونی وغیرہ اشیاء، یا غیر منقولہ ہوں جیسے زمین و جائداد) (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲)۔

علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی لکھتے ہیں: ”قال العبد الضعيف: وفي ”شرح الوجيز“ للرافعي ما نصه في بيان أن القبض بم يحصل؟ فينظر إن كان المبيع مما لا ينقل كالنقود والأراضي فقبضه بالتخلية بينه وبين المشتري وتمكنه من اليد والتصرف، وإن كان المبيع من المنقولات... فقال مالك وأبو حنيفة: إنه يكفي فيه التخلية كما في العقار، وعن رواية حرملة قول مثله، وفيه وجه آخر: أن التخلية كافية لنقل الضمان إلى المشتري غير كافية للتسلط على التصرف“ (اعلاء السنن ۱۳، ۲۲۰)۔

(علامہ رافعی کی کتاب ”شرح الوجيز“ میں ہے کہ قبضہ کس طرح حاصل ہوگا؟ تو دیکھا جائے گا آیا بیع غیر منقولہ ہے یا منقولہ، اگر غیر منقولہ ہے جیسے گھر اور زمین و جائداد، تو اس پر قبضہ بیع اور مشتری کے درمیان صرف تخلیہ اور قبضہ و تصرف پر قدرت دینے سے ہو جائے گا، اور اگر بیع منقولہ ہے، تو اس سلسلہ میں بھی امام مالک اور امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ عقار کی طرح صرف تخلیہ قبضہ کیلئے کافی ہے، اور حرملة سے بھی اسی طرح کا ایک قول ہے، اور ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ تخلیہ مشتری کی طرف ضمان کے انتقال کیلئے تو کافی ہے، لیکن تصرف پر تسلط کیلئے کافی نہیں ہے۔

تفصیل بالا سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت ایک ہی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں حنفیہ کے نزدیک۔

## قبضہ کی قسمیں:

اس موقع پر قبضہ کی قسموں کو بھی بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا، چنانچہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) قبضہ کامل (۲) قبضہ ناقص۔ قبضہ کامل یہ ہے کہ بائع جب شی بیع کو الگ کر دے (تخلیہ کر دے) اور وہ شی مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے تو صرف اس قدر سے مشتری اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔

اور قبضہ ناقص یہ ہے کہ صرف بائع کے تخلیہ اور مشتری کے ضمان میں داخل ہونے سے مشتری کیلئے اس میں تصرف کرنے کا کوئی جواز نہ ہو۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت سے متعلق احادیث ”معلول بالعلت“ ہیں، اور ممانعت کی علت یہ ہے کہ قبل القبض اگر بیع کی جائے تو ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی وہ بیع ہلاک ہو جائے اور بیع کی ہلاکت عقد کو فسخ کر دیتی ہے، تو ”بیع قبل القبض“ میں قبضہ سے پہلے ہلاکت بیع کے ذریعہ عقد بیع کے ختم ہو جانے کا غرر ہے اور نبی کریم ﷺ نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی سند سے مروی ہے (بخاری ۲۸۷۱/۱، مسلم ۲/۱۲)۔

علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی لکھتے ہیں: ”وعلة النهی هو غرر انفساخ العقد بالهلاک قبل القبض“ (اعلاء السنن ۱۲، ۲۲۲)۔

مفتی ابوالسعود مصری فرماتے ہیں: ”وما روه معلول بخرر انفساخ العقد بالهلاک قبل القبض“ (فتح المعین ۲،

۵۹۳، وھکذا فی الأوجز ۵، ۷۶، فتح القدیر ۶، ۱۲۸)۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام نہیں، بلکہ اس میں استثناءات و تخصیصات بھی ہیں، چنانچہ طعام (جس کا ممانعت والی حدیث میں صراحتہ ذکر آیا ہے) کے سلسلہ میں تمام فقہاء متفق ہیں کہ اس کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں، اور طعام کے علاوہ بقیہ اشیاء میں اختلاف ہے، اور اس سلسلہ میں چار مذاہب ہیں:

(۱) یہ ہے کہ مکانات اور زمین و جائداد کے علاوہ بقیہ تمام اشیاء کا حکم بھی وہی ہے جو طعام کا ہے یعنی ان کی بیع بھی قبل القبض جائز نہیں، یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا مذہب ہے۔

(۲) طعام وغیر طعام تمام مبیعات کا حکم یکساں ہے، خواہ زمین و جائداد ہو یا مکان اور دکانیں وغیرہ، یعنی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی اجازت نہیں، یہ امام شافعی اور امام محمد بن الحسن شیبانی کا مسلک ہے، حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔

(۳) ماکولات و مشروبات کے علاوہ بقیہ تمام اشیاء کو قبل القبض فروخت کرنے کی اجازت ہے، یہ امام مالک کا مسلک ہے۔

(۴) مکلی اور موزونی اشیاء کے علاوہ تمام اشیاء قبل القبض فروخت کی جاسکتی ہیں، معدودی اشیاء کا حکم بھی مکلی و موزونی کی طرح ہے، یہ امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل، اسحق، سعید بن المسیب، حسن بصری، حماد اور حکم کا مذہب ہے (بذل الجہود ۲/۲۸۳، ہکذا فی الأوجز ۵، ۷۶، ہکذا فی اعلاء السنن ۱۲، ۲۳۶)۔

## دلائل:

## حنفیہ کی دلیل:

شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے غیر منقول کے استثناء کرنے کے سلسلہ میں دو دلیلیں ہیں، ایک دلیل عقلی اور ایک دلیل نقلی۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے ممانعت کی جو علت ہے، یعنی قبضہ سے پہلے ہلاکت بیع کے ذریعہ عقد بیع کے فسخ ہو جانے کا غرر، یہ ہلاکت غیر منقول میں تصور نہیں ہے، مگر شاذ و نادر، اور نادر معدوم کی طرح ہے، لہذا اس کا اعتبار نہیں ہوگا، لہذا اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت علت نہی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے جائز ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ زمین ایسی جگہ ہو جہاں اس کی ہلاکت کا خطرہ ہو، مثلاً دریا کے کنارے، ہو اور ندی وغیرہ کے کنارے جہاں اس کی ہلاکت کا ہر وقت خطرہ ہے، یا ایسی جگہ ہو کہ ریت کے غلبہ کا خوف ہو تو پھر چونکہ علت نہی پائی گئی، یعنی ”ہلاکت بیع کے ذریعہ غرر انفساخ عقد“ لہذا بالاتفاق اس کی بیع بھی قبل القبض جائز نہ ہوگی۔

علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی فرماتے ہیں: ”واحتج أبو حنیفة بأن الحكم معلل بخرر انفساخ العقد بهلاک المبیع،

والهلاک فی غیر المنقول نادر، والنادر کالمعدوم“ (اعلاء السنن ۱۲، ۲۲۲، ہکذا فی أوجز المسائل ۵، ۷۶، نیز دیکھئے: البحر الرائق

۶، ۱۱۶، ہکذا فی فتح المعین ۲، ۵۹۳، فتح القدیر ۶، ۱۲۸)۔

## نقلی دلیل:

نقلی دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت طلحہؓ سے مدینہ میں ایک زمین خریدی اپنی ایک زمین کے بدلہ میں جو کوفہ میں تھی، تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں نے وہ زمین بغیر دیکھے بیچ دی ہے ("بیچ دی ہے" اس لئے فرمایا کہ بدلہ ہوا تھا، گویا دونوں نے بیچی بھی اور خریدی بھی، واللہ اعلم) تو حضرت طلحہؓ نے فرمایا کہ دیکھنے کا اختیار مجھے حاصل ہوگا، کیونکہ جس کو آپ نے خریدا (یعنی مدینہ والی زمین) اس کو آپ دیکھ چکے، اور جس کو میں نے خریدا (یعنی کوفہ والی زمین) وہ میں نے نہیں دیکھی، دونوں حضرات حضرت جبیر بن مطعمؓ کے پاس مقدمہ لے گئے، تو انہوں نے بیان سن کر حضرت عثمانؓ کے خلاف اور حضرت طلحہؓ کی موافقت میں فیصلہ صادر فرمادیا، اور دلیل وہی دی کہ انہوں نے (حضرت طلحہؓ نے) بغیر دیکھے خریدی ہے۔ اس حدیث اور واقعہ میں زور کرنے سے معلوم ہوا کہ عقار کو قبل القبض فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنی کوفہ کی زمین بلا دیکھے بیچی، اور یہ اس سلسلہ میں ظاہر ہے کہ قبل القبض بیچی ہے، کیونکہ قبضہ رویت کو مستلزم ہے، اور اگر یہ اشکال کیا جائے کہ ممکن ہے وکیل کے واسطے سے قبضہ کیا ہو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وکیل کا دیکھنا مؤکل کا دیکھنا ہے، حالانکہ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "بعثتک مالہ أردہ" لہذا وکیل کے واسطے سے دیکھنے کا احتمال بھی باطل ہو گیا (رواہ ابن ابی ملیکہ، اعلاء السنن کراچی ۱۳/۲۳۸)۔

اس حدیث سے استدلال میں احقر کو ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ ابھی پیچھے گذرا کہ تمام مالوں میں تخلیہ قبضہ ہے، لہذا یہ تو بہت ممکن ہے کہ اس زمین میں تخلیہ ہو چکا ہو، لہذا قبل القبض بیچ نہ رہی، البتہ قبل الرویت ہے۔

## شافعیہ کی دلیل:

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کے عموم سے متعلق تین دلیلیں پیش کرتے ہیں، دو نقلی دلیلیں اور ایک قیاس، پہلی نقلی دلیل یہ ہے کہ ممانعت والی حدیث میں اطلاق ہے، چنانچہ حضرت حکیم بن حزامؓ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا تبیعن شیئا حتی تقبضہا" (رواہ النسائی بحوالہ اعلاء السنن ۱۲، ۲۲۲)، نیز ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں حضرت حکیم بن حزامؓ کی یہ حدیث ان الفاظ سے نقل کی ہے: "إذا ابتعت بیعا فلا تبعه حتی تقبضہ" (حوالہ بالا)، نیز حضرت ابن عباسؓ سے بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ سے پہلے طعام کی بیع سے منع فرمایا ہے، اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "وأحسب کل شیء مثله" (بخاری ۱۰۲۸۶ مسلم ۲۰۵ واللفظ لہ)۔

دوسری نقلی دلیل یہ ہے کہ جب تک کوئی چیز مشتری کے ضمان میں نہ داخل ہو اس وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا ہے، لہذا عقار کو قبل القبض بیچنے کی صورت میں "ربح مالہ یضمن" لازم آتا ہے لہذا اس کو بھی قبل القبض بیچنے کی اجازت نہیں ہو سکتی، چنانچہ ترمذی و ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا یحل سلف و بیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن" (ترمذی ۱۰۱۲۸، ابوداؤد مع البذل ۳۰۲۸۷)۔

تیسری قیاسی دلیل یہ ہے کہ کسی شیء کو قبل القبض اجارہ پر دینا جائز نہیں، لہذا اسی طرح بیع بھی جائز نہیں۔

چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں: "قولہ یجوز بیع العقار... وقال محمد: لا یجوز وهو قول الشافعی (رجوعا إلى اطلاق الحدیث) یعنی عمومہ وهو ما فی حدیث حکیم بن حزامؓ من قولہ ﷺ "لا تبیعن شیئا حتی تقبضہ" وللنہی عن ربح ما لم یضمن، ولو باء العقار بربح یلزم ربح ما لم یضمن، وصار بیع العقار کاجارته وإجارته قبل قبضہ لا تجوز فكذا بیعہ" (فتح القدیر ۶، ۱۳۷، مکذا فی الأوجز ۵، ۷۶، البحر ۶، ۱۱۶)۔

## مالکیہ کی دلیل:

امام مالکؒ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کو طعام کے ساتھ خاص کرتے ہیں، کیونکہ ممانعت والی حدیثوں میں صرف طعام کا لفظ آیا ہے، لہذا ممانعت حکم طعام ہی کے ساتھ خاص ہوگا، چنانچہ حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أما الذی نھی عنہ النبی ﷺ فهو الطعام أن یباع حتی یقبض" (حوالہ بالا) ایسے ہی حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إذا ابتعت طعاما فلا تبعه حتی تستوفیه" (رواہ مسلم ۲۰۶)۔



مذکورہ بالا تمام حدیثوں میں ممانعت کا حکم طعام کے ساتھ خاص آیا ہے، معلوم ہوا کہ طعام کے علاوہ بقیہ تمام اشیاء کا حکم اس کے برخلاف ہے، یعنی ان کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے۔

چنانچہ ظفر احمد صاحب عثمانی ” لکھتے ہیں: ”قالوا: التنصيص في هذه الأحاديث يدل على أن غيره بخلافه“ (اعلاء السنن ۱۳، ۲۳۷)۔

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب ” لکھتے ہیں: ”وفي التعليق الممجذ: قال مالك يجوز جميع التصرفات في غير الطعام قبل القبض لورود التنصيص في الأحاديث بالطعام“ (أوجز المسالك ۵، ۷۶)۔

حنابلہ کی دلیل:

طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے ساتھ امام اوزاعی اور امام احمد وغیرہ نے مکملی اور موزونی اشیاء کو بھی جوڑا ہے، اس لئے کہ پورا قبضہ اور استیفاء جو حدیث میں آیا ہے وہ مکملی اور موزونی اشیاء ہی میں ہوتا ہے، چنانچہ امام احمدؒ نے مرفوعاً حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من اشترى طعاماً اشتراء بكيلى أو وزن فلا يبيعه حتى يقبضه“۔ ایسے ہی امام ابو داؤد و نسائی نے بھی حضرت ابن عمرؓ سے یہ حدیث ان الفاظ سے نقل کی ہے: ”نهي أن يبيعه أحد طعاماً اشتراه بكيلى أو وزن حتى يستوفيه“ (اعلاء السنن ۱۳، ۲۳۳)۔ ان مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مکملی اشیاء میں کیل سے اور موزونی میں وزن سے قبضہ شرط ہے (لہذا مکملی اور موزونی اشیاء کو بھی طعام کی طرح قبل القبض فروخت کرنا جائز ہوگا) (اعلاء السنن ۱۳، ۲۳۳)۔

۶۔ اس سے قبل کہ اس سوال کا جواب لکھا جائے بطور تمہید اشیاء مبیعہ منقولہ کی قسمیں اور احکام لکھے جاتے ہیں تاکہ آسانی سے اس صورت کا حکم نکل آئے۔ اشیاء منقولہ کی اولاد دو قسمیں ہیں: (۱) بیع مثلی، (۲) غیر مثلی۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”وجملة الكلام فيه أن المبيع لا يخلو إما أن يكون مما له مثل، وإما أن يكون مما لا مثل له“ (بدائتہ ۵، ۲۳۳)۔

چنانچہ اگر بیع مثلی ہے، جیسے مکملی اور موزونی اشیاء، تو ان اشیاء میں صرف تخلیہ سے بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل تو ہو جائے گی، لیکن مشتری کیلئے اس میں تصرف کرنا اور انتفاع بغیر دوبارہ کیل و وزن کے جائز نہیں، کیونکہ تخلیہ سے مکملی اور موزونی اشیاء میں قبضہ تام حاصل نہیں ہوتا، بلکہ قبضہ ناقص حاصل ہوتا ہے اور قبضہ ناقص میں تصرف کی اجازت نہیں۔

الایہ کہ بائع بیع کرنے کے بعد مشتری کی موجودگی میں کیل و وزن کر دے، یا کیل و وزن سے نہ بیچے بلکہ اندازے اور اٹکل سے فروخت کرے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ”مجازفہ“ کہتے ہیں۔

چنانچہ علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”وإن كان (المبيع) مما له مثل... فإن باء مكالمة أو موازنة في المكيل والموزون وخطي فلا خلاف في أن المبيع يخرج عن ضمان البائع ويدخل في ضمان المشتري... وكذا لا خلاف في أن لا يجوز للمشتري بيعه والانتفاع به قبل الكيل والوزن“ (بدائتہ ۴، ۲۳۳)۔

ایک جگہ فرماتے ہیں: ”فأما جواز التصرف فيه فيستدعي قبضاً كاملاً لورود النهي عن بيع ما لم يقبض والقبض المطلق هو القبض الكامل“ (بدائتہ ۵، ۲۳۵)۔

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں: ”وإن كاله أو وزنه بعد العقد بحضرة المشتري مرة، فيه اختلاف المشائخ، قال عامتهم: كفاء ذلك حتى يحل للمشتري التصرف فيه قبل كيله ووزنه إذا قبضه وعند البعض لا بد من الكيل أو الوزن مرتين احتجاجاً بظاهر الحديث والصحيح قول العامة؛ لأن الغرض من الكيل والوزن صيرورة المبيع معلوماً وقد حصل بذلك الكيل واتصل به القبض“ (فتح القدير ۶، ۱۳۱، ہدایہ مع الفتح ۶، ۱۳۱، بدائتہ ۵، ۲۳۵)۔

ایک جگہ ابن الہمام فرماتے ہیں: ”أما إذا اشتراه مجازفة مبيع صبرة فله أن يتصرف فيه قبل الكيل والوزن، لأن كل المشار إليه له فلا يتصور اختلاط الملكين“ (فتح القدير ۶، ۱۴۰، بدائع ۵، ۲۲۲)۔  
دوسری قسم یہ ہے کہ بیع غیر مثلی ہو، جیسے مذروعات و معدودات متفاوتہ، ایسی اشیاء میں صرف تخلیہ سے بالاتفاق قبضہ تام حاصل ہو جائے گا اور بغیر شمار اور پیمائش کے ہی مشتری کیلئے ہر قسم کا تصرف جائز ہو جائے گا۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”فإن كان مما لا مثل له من المذروعات والمعدودات المتفاوتة فالتخلية فيها قبض تام بلا خلاف، حتى لو اشترى مذروعا مذارعة أو معدودا معاددة ووجدت التخلية يخرج عن ضمان البائع ويجوز له بيعه والانتفاع به قبل الذرع والعدد بلا خلاف“ (بدائع الصنائع ۶، ۲۲۲)۔

اب رہ گئی بات معدودات متقاربتہ کی تو اس میں ہمارے ائمہ کرام مختلف ہیں، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کا حکم بیع مثلی جیسا ہے، لہذا دوبار شمار کے بغیر مشتری کیلئے ان کی بیع جائز نہ ہوگی، لیکن حضرات صاحبین کے نزدیک معدودات متقاربتہ کا حکم بیع غیر مثلی جیسا ہے، یعنی صرف تخلیہ سے قبضہ تام حاصل ہو جائے گا، اور مشتری کیلئے ہر قسم کا تصرف جائز ہوگا۔

علامہ علاء الدین کاسانی فرماتے ہیں: ”وأما المعدودات المتقاربة إذا بيعت عددا لاجزا فحكمها حكم المكيلات والموزونات عند أبي حنيفة حتى لا يجوز بيعها إلا بعد العدّ، وعند أبي يوسف ومحمد حكمها حكم المذروعات فيجوز بيعها قبل العدّ“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۵)۔

مندرجہ بالا تفصیل کا حاصل یہ ہوا کہ مکملی اور موزونی اشیاء میں اور امام صاحبؒ کے نزدیک معدودات متقاربتہ میں بھی تخلیہ سے قبضہ تام حاصل نہ ہوگا، جبکہ جواز تصرف کیلئے قبضہ تام ضروری ہے، اور مذروعات و معدودات متفاوتہ میں نیز صاحبین کے نزدیک معدودات متقاربتہ میں بھی تخلیہ قبض تام ہے، اور تصرف جائز ہوگا۔

### صورت مسئلہ:

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر اشیاء مبیعہ غیر مثلی ہیں تو فیکٹری کے تخلیہ سے ان اشیاء پر مشتری نمبر (۱) کو قبضہ تام حاصل ہو جائے گا، اور قبل الذرع والعدّ ہر قسم کا تصرف مشتری نمبر (۱) کیلئے جائز ہوگا اگرچہ قبضہ حسی نہیں ہوا ہے، اس لئے کہ تخلیہ ہی قبضہ تام ہے جو جواز تصرف کیلئے شرط ہے۔  
ہاں البتہ اگر بیع مثلی ہے تو فیکٹری کے تخلیہ سے مشتری نمبر (۱) کو قبضہ تام حاصل نہیں ہوا بلکہ قبضہ ناقص ہے جو جواز تصرف کیلئے کافی نہیں، لہذا قبل الکیل والوزن تصرف درست نہ ہوگا۔

الایہ کہ درمیان کا آدمی کمپنی کا ایجنٹ ہو، تو پھر یہ شخص فیکٹری کیلئے بحیثیت وکیل ہوگا، اور اس کے نفع کو اجرت و کالت قرار دی جائے گی۔  
البتہ جواز کی دو صورتیں اور ممکن ہیں (بیع مثلی میں): (۱) کمپنی اور فیکٹری ہی کو مشتری اول کی طرف سے وکیل بالقبض مان کر (۲) یا مشتری ثانی کو ہی مشتری اول کا وکیل بالقبض مان کر یہ معاملہ دائرہ جواز میں لایا جاسکتا ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”فلو تصرف فيه البائع قبل قبضه إما بأمر المشتري أو لا، فلو بأمره وكان أمره أن يهبه من فلان أو يوجره ففعل وسلم صح وصار المشتري قابضا“ (رد المحتار ۵، ۱۴۹، کراتشی)۔

۷۔ اس صورت میں چونکہ مشتری ایسی چیز سے نفع حاصل کر رہا ہے جس کا وہ ابھی ضامن نہیں ہوا، یعنی ”ربح مالہ یضمن“ لازم آتا ہے، جس کا حدیث میں صراحتہ انکار ہے، چنانچہ ترمذی و ابوداؤد کی حدیث جس میں ”ربح مالہ یضمن“ کی ممانعت ہے، مذہب شوافع کی دلیل کے ذیل میں گذر چکی ہے، اس لئے یہ صورت دائرہ جواز میں آتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے احکام

مولانا محمد حنیف علی

۱۔ بیع قبل القبض شریعت میں ناجائز ہے، اسکا شمار بیع فاسد میں ہوتا ہے، ”صح بیع عقار لا یجشی ہلاکہ قبل قبضہ ولا یصح قبل قبضہ بیع المنقول و مفسد بیع المنقول قبل قبضہ“ (در مختار ۶۳، ۱۶۲، ۴)۔

۲۔ کتاب و سنت میں قبضہ کی کوئی حقیقت متعین نہیں کی گئی ہے، قبضہ کا مقصود بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہونا ہے۔ لہذا عرف میں جس چیز سے بیع بائع کے ضمان میں داخل ہو جائے اس کو قبضہ سمجھا جائے گا، بہر حال کتاب و سنت میں قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں ہے، اس لئے منقولہ کے قبضہ کی حقیقت میں حضرات علماء کا اختلاف ہوا ہے۔

اشیاء منقولہ میں قبضہ کی حقیقت:

حنفیہ کے نزدیک بیع کے اعتبار سے قبضہ کی حقیقت مختلف ہوتی ہے، لیکن ان حضرات کے نزدیک اتنی بات مسلم ہے کہ اگر بیع فی الحال مقدوراً تسلیم و تسلیم ہو تو مشتری کو اطلاع کے بعد تخلیہ قبضہ حکمی ہوتا ہے، البتہ اشیاء کے مختلف ہونے کے لحاظ سے تخلیہ کی صورت بھی مختلف ہوگی، بیع خواہ منقولہ ہو، یا غیر منقولہ اگر فی الحال مقدوراً تسلیم و تسلیم ہے، تو تخلیہ قبضہ ہے اور اگر فی الحال مقدوراً تسلیم و تسلیم نہیں تو تخلیہ قبضہ نہیں، مثلاً بیع دور ہو، خواہ منقولہ ہو، خواہ غیر منقولہ، یہی ظاہر الروایہ ہے، بعض کتابوں میں اشیاء غیر منقولہ کے سلسلے میں حضرات صاحبین کا جو اختلاف منقول ہے وہ ضعیف ہے۔

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل و شرط في الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن يقول: خليت بينك و بين المبيع، فلولم يقله أو كان بعيداً لم يصر قابضاً والناس عنها غافلون، فإنهم يشترون قربة و يقرون بالتسلم و القبض وهو لا يصح بالقبض على الصحيح“ (در مختار، ۴۲)۔

”وفي حاشية: و حاصله أن التخلية قبض حكماً ولو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت فدفع المفتاح وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن تكون في البلد فيما يظهر، وفي نحو بقرة في مرعى فكونه بحيث يرى و يشار إليه قبض، وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين۔

وقوله على الصحيح وهو ظاهر الرواية و مقابله ما في المحيط و جامع شمس الأئمة أنه بالتخلية يصح القبض وإن كان العقار بعيداً غائباً عنهما عند أبي حنيفة خلافاً لهما وهو ضعيف كما في البحر“ (در مختار ۴۳، ۴)۔

بہر حال عبارات مذکورہ سے یہ واضح ہے کہ تخلیہ کی صورت مختلف ہوتی ہے، اور تخلیہ فی الحال مقدوراً تسلیم و تسلیم اشیاء ہیں، خواہ منقولہ ہوں، یا غیر منقولہ قبضہ ہے، البتہ اشیاء غیر منقولہ کے سلسلے میں جب وہ فی الحال مقدوراً تسلیم و تسلیم نہ ہوں تو ایک روایت میں ہے کہ اس میں بھی اشیاء منقولہ غیر مقدوراً تسلیم کی طرح تخلیہ قبضہ نہیں ہے، اور محیط، جامع شمس الأئمة کی روایت میں حضرات صاحبین کا اختلاف منقول ہے کہ امام صاحب کے نزدیک تخلیہ قبضہ ہے، حضرات صاحبین کے نزدیک نہیں ہے۔

اشیاء منقولہ میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب:

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اشیاء منقولہ میں قبضہ کا مدار عرف پر ہے، قبضہ کے لئے عرف میں جو چیز رائج ہوگی اس کو قبضہ متصور کیا جائے گا، مثلاً دراهم و دنانیر میں



قبضہ بالبراجم، مکملات و موزومات میں قبضہ کے لئے کیل و وزن کی شرط لگاتے ہیں۔

”قال المالکة والشافعية: قبض المنقول كالأمعة والأنعام والدواب بحيث العرف جاری، بین الناس قال الحنابلة: قبض كل شیء بحسبه فإن كان مکیلا أو موزونا فقبضه بکیله ووزنه أى أنه يجب الرجوع فی القبض إلى العرف“ (الفقه الاسلامی ۴، ۲۱۹)۔

اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ:

”اتفق الفقهاء علی أن قبض العقار یكون بالتسليم الفعلي بالتخلية أى رفع المانع من القبض أو لتمکن من إثبات اليد بارتفاع الموانع (الفقه الاسلامی ۲۰۸) ثم لا خلاف بین أصحابنا فی أن أصل القبض یحصل بالتخلية فی سائر الأموال“ (بدائع ۵، ۲۳۳)۔

اشیاء غیر منقولہ میں تخلیہ قبضہ ہے اس میں تمام علماء کا اتفاق ہے۔ البتہ اگر اشیاء غیر منقولہ فی الحال مقدوراً تسلیم نہ ہوں تو اس میں قبضہ کے سلسلے میں حضرات احناف کا اختلاف ہے، جو کہ شروع میں گذر چکا ہے۔

قبضہ کی قسمیں:..... قبضہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) تام، (۲) ناقص، قبضہ تام اور ناقص، اشیاء اور ان کی بیع و شراء کے اعتبار سے مختلف ہوتا رہتا ہے، اس لئے اشیاء کے اقسام کو ذکر کیا جاتا ہے، ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی جائیگی کہ قبضہ تام کیا ہے اور قبضہ ناقص کیا ہے۔

مقدوراً تسلیم اشیاء کے اقسام:

(۱) اشیاء غیر منقولہ فی الحال مقدوراً تسلیم

(۲) اشیاء غیر منقولہ غیر مثلیہ۔ جیسے عدریات، مزروعات، متفادہ دونوں قسموں میں قبضہ تام صرف تخلیہ سے متحقق ہو جائے گا، بعد تخلیہ مشتری کو اس میں ہر طرح کے تصرف کی اجازت ہوگی۔

(۳) اشیاء منقولہ کیلی، یا وزنی ہوں ان کی بیع و شراء مجازتہ بغیر کیل و وزن کے ہو تو اس میں بھی صرف تخلیہ ہی قبضہ تام ہے، بعد تخلیہ مشتری کو تمام تصرفات کی اجازت ہے۔

(۴) اشیاء منقولہ کیلی، یا وزنی جس کی شراء مجازتہ، یعنی بغیر کیل و وزن کے ہو اور بیع کیلی، یا وزنی سے ہو تو مشتری اول کیلئے صرف تخلیہ ہی قبضہ تام ہے، اور مشتری ثانی کیلئے قبضہ تام نہیں ہے بلکہ قبضہ ناقص ہے۔ اس لئے اس صورت میں مشتری اول کے لئے بعد تخلیہ تمام تصرفات کی اجازت ہوگی اور مشتری ثانی کیلئے اس میں تصرف کرنا جائز نہ ہوگا۔

(۵) اشیاء منقولہ کیلی، یا وزنی جس کی شراء کیلی، یا وزنی سے ہو اور بیع بغیر کیل کے مجازتہ ہو تو اس صورت میں مشتری ثانی کے لئے قبضہ تام ہوگا، اور مشتری اول کے لئے قبضہ تام نہ ہوگا۔

(۶) اشیاء منقولہ کیلی، یا وزنی جسکی بیع و شراء دونوں کیلی، یا وزنی سے ہو، اس صورت میں تخلیہ کسی کے لئے بھی قبضہ تام نہ ہوگا دونوں کے لئے قبضہ ناقص ہے، کسی کے لئے بھی بغیر کیل، یا وزنی کے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں۔

(۷) عدریات و مزروعات متقاربه، اس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اشیاء کیلیہ، وزنیہ کے حکم میں ہے۔ اور حضرات صاحبین کے نزدیک اشیاء کیلیہ، و زنیہ کے حکم میں نہیں، بلکہ اشیاء غیر مثلیہ کے حکم میں ہے، لہذا حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عدریات و مزروعات متقاربه میں تخلیہ قبضہ تام نہیں ہے۔ اور حضرات صاحبین کے نزدیک تخلیہ قبضہ تام ہے (نوٹ) کیل اور وزن و عدد وغیرہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) حقیقی (۲) حکمی دونوں کا حکم ایک ہے۔

(۱) مشتری کا خود کیل ہو، یہ کیل حقیقی ہے۔

(۲) مشتری کے سامنے بائع کیل، یا وزن کر دے، یہ کیل حکمی ہے، دونوں میں سے، یعنی کیل حقیقی، اور حکمی میں سے کوئی بھی پالیا جائے تو قبضہ تام ہو جائے گا

مشتری کی موجودگی میں بائع کا کیل مشتری کا کیل متصور ہوتا ہے مقصود حاصل ہونے کی وجہ سے (۲۳۴/۵)۔

(۳) ”وإنما شرط الاكتيال على المشتري لكونه من تمام القبض في المكيل والموزون إذا وقع البيع مكيلاً، فلا يجوز التصرف فيه بالبيع ونحوه، قبل الكيل أو الوزن“ (تكملة فتح الملہم ۳۵۸) ”وفي البدائع ولو كاله البائع أو وزنه بحضرة المشتري كان ذلك كافياً لا يحتاج إعادة الكيل، لأن المقصود يحصل بكيه مرة واحدة بحضرة المشتري“ (ص ۲۳۴)۔

خلاصہ:..... یہ کہ بیع میں قبضہ تام سے پہلے مشتری کیلے کوئی تصرف کرنا جائز نہیں ہے، اور قبضہ تام اشیاء منقولہ مثلیہ (کیلیہ، وزینہ) کی اگر بیع و شراء دونوں کیل، یا وزن سے ہو تو تخلیہ نہ ہو تو مشتری اول اور نہ مشتری ثانی کے حق میں قبضہ تام ہوگا، کیونکہ دونوں کے قبضہ کی تمامیت کیلے کیل، یا وزن کا پایا جانا ضروری ہے، اور اگر بیع کیل، یا وزن ہو اور شراء مجازفہ بغیر کیل کے ہو تو مشتری اول کے لئے تخلیہ قبضہ تام ہے، اور مشتری ثانی کے لئے قبضہ تام نہیں ہے، اور اگر شراء کیل، یا وزن ہو اور بیع مجازفہ ہو تو مشتری ثانی کے لئے تخلیہ قبضہ تام ہے، مشتری اول کے لئے تام نہیں ہے، بلکہ اس کا کیل، یا وزن کرنا ضروری ہے، مذکورہ صورتوں کے علاوہ صرف تخلیہ ہی قبضہ تام ہو جاتا ہے، البتہ عدویات، مزروعات متقاربه میں حضرت ابوحنیفہؒ کے نزدیک تخلیہ قبضہ تام نہیں اور صاحبین کے نزدیک قبضہ تام ہے، قبضہ تام مشتری کے خود کیل کرنے، یا مشتری کے سامنے بائع کے کیل کرنے سے بھی محقق ہو جاتا ہے، اسی طرح مشتری کے وکیل کے سامنے بھی کیل و وزن کرنے سے قبضہ محقق ہو جاتا ہے۔

بیع و تصرف قبل القبض کے سلسلے میں مذاہب:

حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک کسی بھی چیز میں بیع قبل القبض جائز نہیں، خواہ مطعومات، یا غیر مطعومات، منقولات و غیر منقولات ہی کی قبیل سے کیوں نہ ہو، تمام چیزوں میں ان حضرات کے نزدیک قبضہ کی تمامیت شرط ہے۔

”قال الشافعي و محمد ابن الحسن من الحنيفة: يحرم بيع كل شئ قبل قبضه طعاماً أو كان غيره منقولاً أو كان غير منقول“۔

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک صرف مطعومات میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز نہیں۔

”قال ابن حنبل في المهر الرواية: إنما يختص النهي والطعام فلا يجوز بيعه قبل قبضه ويجوز فيما سوا، كما حققه ابن قدامة“۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک مطعومات و مشروبات میں بیع قبل القبض جائز نہیں۔

”قال مالك: إنما يمنع البيع قبل القبض في المكيل والموزون من الطعام خاصة“ (تكملة ۱۰۲۵۱-۵۲)۔

”يجوز كل مبيع قبل قبضه إلا المأكول والمشروب قاله مالك وأبو ثور قال ابن المنذر: وأصح المذهب لحديث النهي عن بيع الطعام قبل أن يستوفى“ (اعداد السنن ۲۲۱، ۲۲۲)۔

حضرات شیخینؒ کے نزدیک تمام منقولات میں قبضہ کی تمامیت سے پہلے بیع جائز نہیں۔ ”قال أبو حنيفة وأبو يوسف: يمنع البيع قبل القبض في سائر المنقولات، ويجوز في العقار الذي لا يخشى هلاكه“ (تكملة في فتح الملہم ۵۰۳۵۰-۵۱)۔

ائمہ کے دلائل:

(۱) ”نهی رسول ﷺ أن تباع السلع حيث يبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم“۔

(۲) ”وعن حكيم ابن حزام قال: قلت يا رسول الله ﷺ إني أبتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي قال: يا ابن أخي لا تبعن شيئاً حتى تقبضها، في رواية أبان إذا اشتريت بيعاً فلا تبعه حتى تقبضه“۔

(۳) ”وعن عبد الله ابن عمرو أن رسول الله ﷺ قال: لا يجل سلف وبيعه، ولا شرطان في بيعه، ولا ربح مال لم يضمن، ولا بيع ما ليس عندك“ (تكملة فتح الملهم)۔

روایت مذکورہ ثلاثہ بیع قبل القبض کے عدم جواز پر دال ہیں، خواہ بیع مطعومات وغیر مطعومات کے قبیل سے ہو، یہ روایات حضرات امام شافعی و امام محمد و امام ابو حنیفہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمہم اللہ جامعین کا مستدل ہے۔

دلیل احمد ابن حنبل و امام مالک:

”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبيعه حتى يستوفيه، وفي رواية: حتى يقبضه“۔

روایت مذکورہ بیع مطعومات میں قبل القبض تصرف کے عدم جواز پر دال ہے، یہ روایت حضرت امام احمد ابن حنبل کا مستدل ہے۔

دلیل حضرات شیخین: ..... ”نهی رسول الله ﷺ عن ربح ما لم يضمن وما ليس عندك، ونهی رسول الله ﷺ عن بيع الحصة وعن بيع الغرر، ونهی أن تباع السلع حيث تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم، فقال رسول الله ﷺ: يا ابن أخي لا تبیعن شیئا حتى تقبضه وفي رواية أبان: إذا اشتريت بیعا فلا تبعه حتى تقبضه“۔ روایت مذکورہ بیع قبل القبض کے عدم جواز پر دال ہے۔ حضرات شوافع، امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک بیع قبل القبض کی علت نہیں ”ربح ما لم يضمن“ ہے، کیونکہ بیع قبل القبض ”ربح ما لم يضمن“ کو متضمن ہے، جب بھی بیع قبل القبض ہوگی تو ”ربح ما لم يضمن“ ہوگا، اور ”ربح ما لم يضمن“ نص حدیث سے ممنوع ہے، لہذا ہر وہ بیع جو ”ربح ما لم يضمن“ کو متضمن ہوگی وہ ممنوع ہوگی، اس لئے بیع قبل القبض ناجائز ہے، جیسا کہ بہت سی احادیث شریفہ میں صراحت ہے۔ خواہ بیع قبل القبض مطعومات وغیر مطعومات، منقولات، غیر منقولات جس چیز میں بھی ہو، حضرات شوافع اور امام محمد کے نزدیک ”ربح ما لم يضمن“ کو متضمن ہونے کی بنا پر ممنوع ہوگی۔

حضرات شیخین:

حضرات شیخین کے نزدیک منقولات میں بیع قبل القبض ناجائز ہے۔ یعنی فاسد ہے۔ اور غیر منقولات میں بیع قبل القبض جائز ہے۔

”ومن اشترى شیئا مما ينقل ويحول لم يجز بيعه حتى يقبضه؛ لأنه عليه السلام نهي عن بيع ما لم يقبض؛ لأنه فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد: لا يجوز رجوعا إلى إطلاق الحديث واعتبارا بالمنقول وصار كالإجارة“ (هدایة)۔

حضرات شیخین کے مسلک کی توضیح دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک اس طرح سے کہ اصل علت نہیں ”ربح ما لم يضمن“ کو ٹھہرایا جائے اور جہت کے اطلاق و عموم سے غیر منقولات کو مستثنیٰ کر دیا جائے، کیونکہ حدیث شریف میں بیع قبل القبض کی اصل علت نہیں ”ربح ما لم يضمن“ ہے اور ضمان کا تصور صرف ان ہی چیزوں میں ہوتا ہے جن میں بیع کے ضیاع کا اندیشہ ہو اور چونکہ غیر منقولات میں ضیاع و ہلاکت نادر و کالعدم ہے، اس لئے غیر منقولات میں ضمان کا سوال ہی نہیں اور جب ضمان کا وجود نہیں تو ”ربح ما لم يضمن“ کا وجود کیسے ہوگا جو مدار نہیں ہے، لہذا قاعدہ فقہیہ: ”إذا فأت العلة فات الحكم“ سے غیر منقولات کی بیع جائز ہے۔

دوسری تشریح یہ ہو سکتی ہے کہ علت نہیں غرر انفساخ عقد کو ٹھہرایا جائے کہ جس میں بیع کے ضیاع سے عقد ختم ہو جائے تو ایسا عقد تصرف بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے جائز نہیں اور حدیث ”ربح ما لم يضمن“ کو مخصوص منہ البعض مانا جائے دلائل جواز پر عمل کرتے ہوئے، ”كما في الهداية: لهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول و الغرر منهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به عملا بدلائل الجواز أي من الكتاب والسنة“ (هدایة ۳۳۳)۔

حدیث ”ربح ما لم يضمن“ میں تخصیص بالاتفاق جائز ہے، مثلاً قبضہ سے پہلے ایسی بیع میں تصرف کرنا کہ اس سے بیع کے ضیاع سے نسخ کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی بیع میں تصرف بالاتفاق جائز ہے، حالانکہ اس میں بھی ”ربح ما لم يضمن“ موجود ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ حدیث ”ربح ما لم يضمن“ مخصوص منہ البعض ہے، ورنہ تو اس بیع میں بھی جس میں اس کے ضیاع سے نسخ عقد کا اندیشہ نہ ہو یہ تصرف جائز نہ ہوتا، مثلاً مہر، بدل خلع، عتق علی مال، بدل صلح من دم اعمد،



جب اعیان کی قبیل سے ہوں، تو ان میں قبضہ سے پہلے تمام تصرفات جائز ہیں۔ اسی طرح اخذ شفعہ "قبل قبض المبیع" بھی جائز ہے۔ تو ان سب سے معلوم ہوا کہ ایسی بیع میں تصرفات جس میں بیع کے ضیاع کا اندیشہ نہ ہو قبل القبض جائز ہیں۔ اور علت نہی غرر انفساخ عقد ہے جو حدیث ابو ہریرہ: "نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع الحصة وعن بیع الغرر" سے ثابت ہے (مسلم شریف)، اور اگر علت نہی "ربح مالہ یضمن" ہوتی تو بیع تولیہ کو جائز ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ بیع تولیہ بھی قبل القبض جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل علت نہی "ربح مالہ یضمن" نہیں بلکہ غرر انفساخ عقد ہے، تو جس طرح سے ایسی بیع میں جس میں اس کے ضیاع سے نسخ کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے، مثلاً: مہر، بدل خلع، صلح عن دم العمد، اخذ شفعہ قبل القبض وغیرہ جائز ہیں، اسی طرح سے غیر منقولات جس میں ضیاع نادر ہے، ان میں بھی تصرف قبل القبض جائز ہوگا، کیونکہ غیر منقولات کی بیع قبل القبض کی صورت میں انفساخ عقد کا احتمال نہیں رہتا ہے، لہذا غیر منقولات میں بیع قبل القبض جائز ہوگی، اسی علت پر مدار رکھ کر حضرات فقہاء نے یہ کلیہ بیان کیا ہے، "أن كل عوض ملث بعقد يفسخ بهلاكه قبل قبضه فالتصرف فيه غير جائز، وما لا فجائز" (عینی، در مختار ۱۶۲، ۲)۔

حاصل یہ ہے کہ حضرات شیخین کے نزدیک اصل علت نہی غرر انفساخ عقد ہے، اور حضرات امام شافعی و امام محمد کے نزدیک علت نہی "ربح مالہ یضمن" ہے۔ اور حضرات شیخین نے حدیث "ربح مالہ یضمن" کو مخصوص کر دیا ہے ان معاملات کے ساتھ جن میں بیع کے ضیاع سے نسخ عقد کا احتمال ہو۔

نہی عن بیع الطعام: ..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "نہی عن بیع الطعام حتی یجری فیہ الصاعان" "صاع البائع وصاع المشتري" کی علت نہی مال غیر میں بغیر اس کی اجازت کے تصرف کرنے سے بچانا مقصود ہے، کیونکہ مال غیر میں تصرف بغیر اس کی اجازت کے ناجائز و حرام ہے اس سے تحرر واجب ہے، "نہی عن بیع الطعام... إلى... فيكون لصاحبه والزيادة عليه النقصان ذكره الزيلعي: في نصب الرأية، وقال الحافظ: في الدراية، إسناده جيد، وهذا يدل على أن العلة في النهي عن بيع الطعام حتى يجري فيه الصاعان إنما هو امتياز حق البائع عن المشتري" (تكملة ۱۰۲۵۸)۔

خلاصہ:

سطور سابقہ میں ذکر کردہ مسائل و احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ بیع کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے، بیع اولاً و طرح کی ہوتی ہے (۱) بیع مثلیہ، کیلیہ، یا وزنہ مشتری بالکیل، یا بالوزن ہو (۲) بیع اس کے علاوہ ہو یعنی مثلی نہ ہو اور اگر مثلی ہو تو کیلی، یا وزنہ نہ ہو، کیلی، یا وزنہ ہو تو ثواب کیل، یا وزن سے نہ ہوئی ہو۔ ان دونوں قسموں میں سے قسم اول میں حضرات احناف کے نزدیک تخلیہ قبضہ ناقص ہے، اور قبضہ کی تمامیت کے لئے مشتری کے کیل، یا وزن کی شرط ہے کہ مشتری دوبارہ خود کیل، یا وزن کرے، یا کم از کم اس کے سامنے کیل، یا وزن کی گئی ہو تو تخلیہ قبضہ تام ہوگا، ورنہ نہیں، اور کسی چیز میں تصرف قبضہ کی تمامیت سے پہلے جائز نہیں۔ اگر عقد کرے گا تو عقد فاسد ہوگا۔ "اشتری کیلا بشرط الکیل حرم ای کرہ تحریماً بیعہ و اکلہ حتی یکیلہ وقد صرحوا بفسادہ" (در مختار ۱۶۲، ۳) اور بیع کی دوسری قسم میں اگر وہ فی الحال مقدوراً تسلیم ہے تو صرف یہ تخلیہ ہی قبضہ تام ہے، لہذا اس میں بعد تخلیہ مشتری کو ہر طرح کے تصرف کرنے کا اختیار ہے، لیکن اگر بیع ذرائعی اور عددی متقاربہ ہو اور ثواب عدد و ذراع سے ہوئی ہو تو حضرات صاحبین اور امام صاحب کا اس میں اختلاف ہے، حضرات صاحبین کے نزدیک ان میں بھی تخلیہ قبضہ تام ہوگا اور حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک تخلیہ قبضہ تام نہیں، بلکہ قبضہ کی تمامیت کیلئے عدد و ذراع کی شرط ہے۔

"في البدائع أما المعدودات المتقاربة إذا بيعت عددا لا جزافاً فحكمها حكم المكيلات والموزونات۔ عند أبي حنيفة حتى لا يجوز بيعها إلا بعد العدد و عند أبي يوسف و محمد حكم المذروعات فيجوز بيعها قبل العدد۔ ووجه قولهما أن العددي ليس من أموال الربوا كالذراع ولهذا لم تكن المساواة فيها شرطاً لجواز العقد كما لا تشرط في المذروعات فكان حكمه حكم المذروع" (بدائع ۵۰۲۲۵)۔

اور فتویٰ کے لئے ضرورہ عمومی بلوی کی بناء پر صاحبین کے قول کو اختیار کیا جائے گا تاکہ "یسر اولاً تعسراً" پر عمل ہو کر معاملات میں سہولت و آسانی پیدا ہو جائے اور نیز بیع قبل القبض کی مروجہ صورت میں سہولت و آسانی کیلئے بعض چیزوں میں حضرت امام مالک کا مسلک اختیار کرنے میں کوئی جرم نہیں ہے۔ اور ان کے مسلک و مذہب کے مطابق ضرورہ فتویٰ دینا جائز ہے، جیسا کہ فقہاء متقدمین فقہ حنفی کے اصول "إذا ضاق الأمر اتسع، إذا عمت البلية حفت خفية، المشقة تجلب التيسير" کی بنا پر ضرورت کے وقت دوسرے امام کے مذہب کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً شامی، طحاوی وغیرہ نے جمع بین

الصلا تین کو ضرورت کے وقت مذہب شافعی پر جائز فرمایا ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں۔ دیانت میں نہیں معاملات میں ابتلاء عام ہوتا ہے، دوسرے امام کے قول پر اگر جواز کی گنجائش ہوتی ہے، تو اس پر فتویٰ دیدیتا ہوں، دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ تھا کہ ایک رسالہ احکام معاملات میں ایسا لکھوں جن معاملات میں عوام مبتلا ہیں، اگر وہ صورتیں کسی بھی مذہب میں جائز ہوں تو اس کی اجازت دے دوں تاکہ مسلمانوں کے افعال کسی طرح بھی جائز ہو سکیں۔ اور فرمایا کہ احتیاطاً میں نے حضرت گنگوہی سے اس کی اجازت لے لی تھی، حالانکہ حضرت یکے حنفی تھے (فقہ حنفی کے اصول و ضوابط ۱۶۹)۔

امام مالک کا مذہب:..... حضرت امام مالک کے نزدیک مطعومات کے علاوہ تمام چیزوں میں تصرف قبل القبض جائز ہے۔ ”قال مالک: يجوز جميع التصرفات فيه قبل القبض في غير الطعام لأنه عليه السلام خص الطعام بالذکر عند النهي بقوله: ”من ابتاع طعاما فلا يبيعه حتى يقبضه“ فدل على تخصيص الحكم والا فليس لهذا التخصيص فائدة“ (بنایۃ ۴۰۲۱)۔

بیوع کے چند مروجہ طریقے:

- (۱) بائع کمپنی یا بڑی بڑی تھوک دوکانوں پر فون وغیرہ سے اشیاء کی قیمت معلوم کرتا ہے پھر جب اطمینان کر لیتا ہے تو بھیجنے کا آرڈر دیتا ہے۔
- (۲) بائع مشتری سے اشیاء کی قیمت معلوم کر کے یہ کہتا ہے کہ ان چیزوں کو نکال کر یا تول کر رکھ دو، پھر مشتری کا ملازم جا کر وہ سامان لے آتا ہے۔
- (۳) بائع لکھ کر، یا ٹیلی فون سے مشتری کو آرڈر دیتا ہے اور بائع مطلوبہ اشیاء کو مع قیمت کی فہرست کے بھیج دیتا ہے۔
- (۴) ایک شخص ایجنسی وغیرہ میں فون وغیرہ سے کسی چیز کا آرڈر دیتا ہے اور ایجنسی والے اس کا پتہ وغیرہ نوٹ کر کے کمپنی میں آرڈر دیتے ہیں، فلاں پتہ پر اتنا مال روانہ کر دیا جائے۔

(۵) کوئی شخص تھوک دوکان والوں سے کسی چیز کو طلب کرتا ہے، اور ان کے پاس نہیں ہوتی ہے تو وہ ایجنسی، یا کمپنی کو آرڈر دیتے ہیں، فلاں پتہ پر اتنا مال روانہ کر دیا جائے اس کو بھی اطلاع کر دیتے ہیں کہ تمہارا مال پہنچ رہا ہے۔

(۶) آجکل مختلف چیزیں اوزان کے ڈبوں میں اور مختلف اوزان کے سلے ہوئے بوروں، میں بندلوں میں، تھیلوں میں، عدد، کیل، وزن، ذراع شدہ رکھی رہتی ہیں جن پر متعینہ وزن لکھا ہوتا ہے اور بعض بیع میں بیع کے تعارف کی پوری تفصیل درج ہوتی ہے مشتری جب ان چیزوں میں سے کوئی چیز طلب کرتا ہے تو بائع وہی پیکٹ وغیرہ جو پہلے سے کیل وغیرہ کر کے رکھا ہے، دیدیتا ہے۔

(۷) باہر مالک سے مشتری کوئی چیز خریدتا ہے اور قبضہ سے پہلے ابھی مال جہاز ہی وغیرہ میں ہوتا ہے اس کو فروخت کر دیتا ہے دوسرا تیسرے کو، تیسرا کسی اور کو، اسی طرح سے وہ چیز قبضہ سے پہلے فروخت ہوتی رہتی ہے، ان سب مروجہ صورتوں کا کیا حکم ہے؟ کیا بغیر کیل و وزن کئے ہوئے اور بغیر قبضہ کئے ہوئے اس میں تصرف کرنا جائز ہے؟

بیع قولی و تعاطی:..... مذکورہ مروجہ صورت کے حکم سے پہلے بیع بالالفاظ، بیع بالافعال (تعاطی) کو سمجھ لینا ضروری ہے، نیز قبضہ کی حقیقت ٹرانسپورٹ وغیرہ کی شرعی حیثیت کا علم ہونا ضروری ہے، کیونکہ بیع کی مروجہ صورتوں میں ان سب کا واسطہ ہوتا ہے، لہذا ان صورتوں کا حکم بیع تعاطی قولی، قبضہ ٹرانسپورٹ وغیرہ کے بعد لکھا جائے گا، تاکہ اخذ حکم میں سہولت ہو۔

بیع قولی:

بیع بالالفاظ کی اولاً دو صورتیں ہیں۔ (۱) ایجاب و قبول دونوں لفظ ماضی یا حال سے ہوں (۲) ایجاب لفظ سے ہو قبول لفظ سے نہ ہو، بلکہ فعل سے ہو۔ مثلاً زید نے عمر سے کہا کہ میں نے آپ کے ہاتھ یہ چیز فروخت کی تو عمر نے اس پر قبضہ کر لیا۔ قبول کے لئے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا یہ بھی بیع بالالفاظ میں داخل ہے۔

”كما في الرد؛ قلت قوله من غير لفظ لغیر ما قد مناه عن الفتح من أنه لو قال بعتك بالف فلم يقل المشتري شيئاً كان قبضه قبولا وليس من التعاطی فلا لمن جعل منه ليس فيه إيجاب بل قبض بعد معرفة ثمنه“ (رد المحتار ۴۰۱۱)۔

(۲) دوسری قسم، یعنی ایجاب و قبول دونوں الفاظ سے ہوں، اسکی چار صورتیں ہیں، (۱) ایجاب و قبول دونوں صیغہ ماضیہ سے ہوں (۲) ایجاب و قبول دونوں



صیغہ حال سے ہوں (۳) ایجاب صیغہ ماضی سے ہو، قبول صیغہ حال ہو (۴) قبول صیغہ ماضی سے ہو اور ایجاب صیغہ حال سے ہو۔

”البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إذا كانا بلفظي الماضي مثل أن يقول بعت والآخر اشتريت ولا ينعقد بلفظين أحدهما لفظ المستقبل وفي التنوير - وهما عبارة عن كل لفظين ينبآن عن التملك والتملك ما ضين أو حالين ولكن لا يحتاج الأول إلى نية بخلاف الثاني، فإن توكل به الإيجاب للحال صح على الأصح والإلا لا وإذا استعمله للحال فكالماضي كأبيعتك الآن لتمحضه للحال وأما المتمحض للاستقبال فكان الأمر لا يفتح أصلاً إلا إذا دل على الحال كخذه بكذا فقال أخذت أو رضيت صح بطريق الاقتضاء“ (تنوير مع الدر المختار ملخصاً ۲۰۹، ۱۰۰)۔

حاصل یہ ہے کہ بیع بالالفاظ کی زیادہ سے زیادہ چھ صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) ایجاب لفظ سے ہو، قبول فعل سے ہو۔ (۲) ایجاب و قبول دونوں صیغہ ماضی سے ہوں (۳) ایجاب و قبول دونوں صیغہ حال سے ہوں (۴) ایجاب ماضی سے قبول حال سے ہو (۵) ایجاب حال سے اور قبول ماضی سے ہو (۶) ایجاب صیغہ امر سے ہو تو قبول کا صیغہ ماضی سے ہونا ضروری ہے، صیغہ امر ایجاب کے لئے اسی وقت ہو سکتا ہے، جبکہ امر سے اقتضائی حال کا معنی مستنبط ہو، بیع بالکتابت، اگر وہ..... مرسومہ ہو تو الفاظ کے ساتھ ملحق ہے، کیونکہ کتابت الفاظ کا ترجمان اور قائم مقام ہوتی ہے (ارجح للتفصیل إلی الدر ۳۸، ۱۰۰)۔

### بیع تعاطی:

بیع تعاطی کی پانچ صورتیں ہیں (۱) ثمن طے کرنے کے بعد ثمن حوالہ کر دے، بیع پر قبضہ بعد میں کرے۔ (۲) بیع پر قبضہ کر لے، ثمن بعد میں دے۔ (۳) ثمن طے کرنے اور معرفت ثمن سے پہلے ہی بیع پر قبضہ کر لے۔ (۴) ثمن کے علم و معرفت سے پہلے ہی ثمن دیدے، اور بیع پر قبضہ بعد میں کر لے۔ (۵) ثمن دیدے اور بیع لے لے۔ ”التعاطی هو الأخذ والإعطاء وفي الرد وصورته أن يتفقا على الثمن ثم يأخذ المشتري المتاع و يذهب يرضى صاحبه من غير دفع الثمن أو بدفع المشتري الثمن للبائع ثم يذهب من غير تسليم المبيع، فإن البيع لازم على الصحيح... قلت: فيها خامسة إنه ينعقد به ولو تأخرت معرفة الثمن لكون دفع الثمن قبل معرفته“ (رد المحتار ۱۱، ۴، البحر الرائق ۱۱، ۴)۔

حاصل یہ کہ ثمن کے علم کے بعد یا ثمن کے علم سے پہلے بائع ثمن پر قبضہ کر لے یا مشتری بیع پر قبضہ کر لے، یا دونوں ایک دوسرے پر قبضہ کر لیں، تو یہ بیع تعاطی ہے بشرطیکہ اس میں ایجاب و قبول کے وہ الفاظ جن کی تفصیل گذر چکی ہے نہ پائے جائیں۔

### بیع تعاطی کا حکم:

(۱) بیع تعاطی میں جب بیع، یا ثمن پر قبضہ ہو جائے تو بیع لازم ہو جاتی ہے

(۲) بیع تعاطی میں اشیاء کیلئے، وزنہ میں بھی تصرف کیلئے اعادہ کیل اور وزن کی شرط نہیں ہے: ”فی الدر“ اشتری مکیلاً بشرط الكيل حرم رأی کرہ تحریماً بیعہ و اکلہ حتی یکیلہ و مثلہ الموزون و المعدود غیر الدراہم و الدنانیر لجواز التصرف فیہما بعد القبض قبل الكيل و الوزن کبیع التعاطی، فإنہ لا یحتاج فی الموزونات إلی وزن المشتري ثانياً، لأنه صار تبعاً بالقبض بعد الوزن، قنیة وعلیة الفتوی خلاصۃ“ (الدر المختار ملخصاً ۴، ۱۶۳-۱۶۴)۔

عبارات مذکورہ سے واضح ہے کہ بیع تعاطی میں مشتری کے اعادہ کیل اور وزن کی شرط قبضہ کی تمامیت کیلئے نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع قول سے نہیں، بلکہ بائع، مشتری، یا ان میں سے کسی کے قبضہ سے ہوتی ہے (حاشیہ الدر ۳۸، ۱۶۴)۔

بیوع فاسدہ باطلہ کے بعد بیع تعاطی:

بیع فاسد و باطل کے بعد اگر متعاقدین سے تسلیم و تسلیم پالیا جائے تو کیا یہ عقد بیع تعاطی بن کر درست ہو سکتا ہے؟



بیع فاسد و باطل کے بعد جب تک عقد اول کو فسخ نہ کر دیا جائے اس وقت تک نہ تو، وہ معاملہ ایجاب و قبول سے اور نہ ہی بیع تعاطی سے درست ہو سکتا ہے، بلکہ علیٰ حالہ فاسد و باطل ہی رہے گا۔

”التعاطی لا ینعقد بعد بیع باطل أو فاسد ما لم یفسخ العقد الأول“ (حاشیة البحر ۶، ۷، ۸، ۱۱)۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیع فاسد و باطل کے بعد جب تک عقد اول کو بالکل ختم نہ کر دیا جائے اس وقت تک نہ تو دوبارہ ایجاب و قبول سے اور نہ ہی بیع تعاطی معاملہ درست ہو سکتا ہے، بلکہ عقد اول کو فسخ کرنا ضروری ہے پھر اگر فسخ کے بعد لین دین ہو جائے یا دوبارہ ایجاب و قبول ہو جائے تو معاملہ درست ہو سکتا ہے، لہذا اگر فی الحال غیر مقدور تسلیم و تسلیم اشیاء کو خریدتا تو جب تک قبضہ نہ کر لے اس وقت تک اس کو فروخت کرنا جائز نہیں اور اگر فروخت کر دے گا تو بیع فاسد ہوگی اور بیع فاسد کے بعد اگر لین دین بھی ہوگا تو یہ بیع تعاطی نہیں بن سکتا، بلکہ اس عقد کو ختم کرنا واجب رہے گا۔

نوٹ:

اگر وجہ فساد کو مجلس عقد ہی میں دور کر دیا جائے تو بیع تعاطی ہو کر معاملہ درست ہو جائے گا، ”والفرق أنه بعد المجلس تقرر الفساد من كل وجه فلا بد من المتاركة، أما في المجلس ولا يتقرر من كل وجه متحصل المتاركة ضمناً فتأمل“ (شامی ۴، ۱۲)۔  
مثلاً ”كل قفيز بدرهم“ والی صورت میں اگر صبرہ طعام کو مجلس عقد ہی میں کیل و وزن کر دیا جائے تو معاملہ درست ہو جائے گا۔

”فی الدر: وإن علم عدد الغنم في المجلس لم ينقلب صحيحاً عنده على الأصح ولو رضيا العقد بالتعاطی ونظيره البيع بالرقم سراج“ (در مختار ۲۹)۔

عبارت مذکورہ میں ”ولو رضيا العقد بالتعاطی کو اگر ”بعد المتاركة“ یا ”بعد عدد“ پر محمول کیا جائے تو درست ہو سکتی ہے، ورنہ یہ عبارت خود مصنف کی سابق ذکر کردہ عبارت کے خلاف ہے، جیسا کہ مضمون ہذا میں نقل کیا گیا۔

قبضہ کی حقیقت:

قبضہ کی اصل روح اور حقیقت بیع کے بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہونا ہے اور حضرات فقہاء احناف نے انتقال ضمان کے سلسلہ میں اگر فی الحال مقدور تسلیم و تسلیم ہو تو مشتری کو اطلاع دینے کے بعد تخلیہ کو حکماً انتقال ضمان کیلئے، یعنی قبضہ کیلئے کافی مانا ہے، اور اگر بیع فی الحال مقدور تسلیم و تسلیم نہ ہو تو تخلیہ قبضہ نہیں ہو سکتا، خواہ بیع منقولات کی قبیل سے ہو یا غیر منقولات کی قبیل سے، اگر فی الحال مقدور تسلیم و تسلیم ہے تو مشتری کو اطلاع دینے کے بعد تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ قبضہ میں عرف کا بہت دخل ہے، جیسا کہ حضرات ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قبضہ کا مدار ہی عرف پر ہے، اگر عرف میں کوئی چیز ایسی رائج ہو کہ جس سے بیع بائع کے ضمان و ذمہ داری سے نکل کر مشتری کے ضمان و ذمہ داری میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی قبضہ سمجھا جائے گا، کیونکہ حضرات احناف کے نزدیک بھی عرف کا بہت اعتبار ہے۔

(۱) ”اشتری فی المثل حطباً فغصبه غاصب حال حملة إلى منزله فمن البائع؛ لأن عليه التسليم في منزل الشاري بالعرف“ (رد مختار ۴، ۲۳)۔

عرف اگر کسی نص کے مخالف نہیں ہے تو عرف خاص ہو یا عام دونوں معتبر ہے، لہذا اگر عرف میں کوئی چیز قبضہ کیلئے رائج ہو تو اس کے پائے جانے کے بعد قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا، اور بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی۔

(۲) ”فی الدر: المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن أفتى كثير باعتبارها وفي حاشية: فأفاد أن عدم اعتبارها بمعنى أنه إذا وجد النص بخلافه لا يصلح ناسخاً للنص ولا مقيداً له وإلا فقد اعتبروه في مواضع كثيرة منها مسائل الإيمان وكل عاقد وواقف وحالف يحمل كلامه على عرفه كما ذكره ابن همام عرف العام يصلح مقيداً“ (رد المختار ۱۳)۔

”وفيه عبارة الأشباه أقول: على اعتباره أي اعتبار العرف الخاص ينبغي أن يفتى بأن ما يقع في بعض أسواق القاهرة

من خلو الحوانیت لازم“ (رد مختار ۱۵)۔

ایک بات یہ غور کرنے کی ہے کہ حضرات فقہاء نے تخلیہ وغیرہ کو قبضہ کیوں مانا ہے؟ اس میں کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات فقہاء کے تخلیہ وغیرہ کو قبضہ شمار کرنے کی دو وجہیں ہیں (۱) قدرت تصرف کامل (۲)۔

انقطاع تعلق البائع من المبيع بحکم مشتری، حضرات فقہاء کے تخلیہ وغیرہ کو قبضہ شمار کرنے کی یہی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔

(۱) ”أن التخلية تعتبر إقباضاً في العرف والشرع أما في العرف فلائنه لا يكون في العقار إلا بها فتقال هذه الدار في يد فلان فلا يفهم منه إلا التخلي وهو التمکن من التصرف“ (الفقه الاسلامی ۵، ۲۰۰)۔

(۲) ”وفي النهاية معزياً إلى الغاية: إن القبض في العقار بالتخلية وفي المنقول بالنقل إلى مكان لا يختص بالبائع“ (بحر الرائق ۵، ۲۰۹)۔

عبارت مذکورہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرات فقہاء کے تخلیہ وغیرہ کو قبضہ شمار کرنے کی دو وجہیں ہیں (۱) بائع کو مکمل قدرت تصرف حاصل ہو جائے (۲) بیع سے بائع کا تعلق، بالکل ختم ہو جائے مشتری کے حکم سے اور مشتری کے حق کے ساتھ مجبوس ہو جائے، جب ان دو وجہوں میں سے کوئی وجہ پائی جاتی ہے تو حضرات فقہاء اس کو قبضہ تسلیم کرتے ہیں۔

### ٹرانسپورٹ ڈاک وغیرہ کی شرعی حیثیت:

(۱) قبضہ کی حقیقت میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اگر مشتری کے حکم کی وجہ سے بائع کا تعلق بیع سے بالکل ختم ہو جائے تو یہ مشتری کا قبضہ ہے۔

(۲) ڈاک ٹرانسپورٹ وغیرہ کو حوالہ کر دینے کے بعد بیع بائع کے قبضہ سے نکل جاتی ہے، اور اس کا تعلق بیع سے بالکل ختم بھی ہو جاتا ہے، لیکن اگر ان کا کرایہ بائع خود ادا کرے تو یہ بائع کے وکیل بالاجرت ہوں گے اور وکیل کا فعل موکل کا فعل ہوتا ہے، لہذا بائع کے ان کا کرایہ ادا کرنے کی صورت میں بیع بائع کے وکیل کے قبضہ میں رہے گی اور وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ ہوتا ہے، لہذا بیع سے بائع کا تعلق ختم نہیں ہوگا، بلکہ اس کا تعلق علی حالہ باقی رہے گا، فرق صرف اتنا ہوگا، جیسے بائع نے بیع کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کر دیا اور جب بیع بائع کے قبضہ سے نکلے گی نہیں تو مشتری کے ضمان میں داخل بھی نہ ہوگی، اور جب ضمان میں داخل نہ ہوگی تو حقیقت قبضہ مفقود ہوگی اور اگر ان کا کرایہ بائع نہیں ادا کر رہا ہے تو بائع کا تعلق بیع سے مشتری کے حکم کی بناء پر بالکل ختم ہو جائے گا اور بیع سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا، اس لئے اگر ڈاک ٹرانسپورٹ وغیرہ کا کرایہ بائع نہ ادا کرے تو بیع کے بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہونے سے قبضہ کی حقیقت پالی جائے گی، اور مشتری کے ضمان میں آنے کی صورت میں اس کا قبضہ شمار ہوگا: ”قال في الهندية: إذا قال المشتري للبائع ابعت إلى ابني واستأجر البائع رجلاً يحمله إلى ابنه فهذا ليس بقبض والأجر على البائع إلا أن يقول استأجر من يحمله فقبض الأجير يكون قبض المشتري إن صدقه أنه استأجره ودفعه إليه وإن أنكر استيجاره والدفعة إليه فالقول قوله كذا في التاتارخانية“ (عالمگیریہ ۱۹، ۲ نقلاً من احسن الفتاویٰ ۶)۔

اگر مشتری بائع سے یہ کہے کہ فلاں کے ذریعہ سامان بھیج دو اور وہ شخص صرف جمالی کا کام کرتا ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ مشتری نے بائع کو اس کا حکم دیا ہے کہ اس شخص کو اس کی جانب سے اجیر رکھ کر سامان بھیج دیا جائے تو اگر بائع کرایہ نہ ادا کرے تو وہ شخص وکیل مشتری کا وکیل ہوگا، اسی طرح سے ڈاک ٹرانسپورٹ وغیرہ جو بار برداری کا کام کرتے ہیں، اگر مشتری نے ان کے ذریعہ بھیجنے کا حکم دیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے کہا: ”استأجر من يحمله إلى“: تو اگر ڈاک ٹرانسپورٹ وغیرہ کا خرچ مشتری کے ذمہ آتا ہو تو بائع مشتری سے وصول کر کے ان کو کرایہ دے یا مشتری خود کرایہ ادا کرے، بہر حال اگر ان کا کرایہ بائع نہیں ادا کر رہا ہے اور یہ کہنے کی صورت میں کہ ڈاک سے بھیج دو عرف میں ان کے کرایہ کی ادائیگی مبعوث الیہ کے ذمہ آتی ہے تو ڈاک وغیرہ مشتری کے وکیل ہوں گے، لہذا ان کے قبضہ میں مال پہنچنے کے بعد مشتری کا قبضہ تحقق ہو جائے گا، اور بیع بائع کے ذمہ سے نکل جائے گی۔

حاصل یہ ہے کہ ڈاک ٹرانسپورٹ وغیرہ کا کرایہ اگر اپنی جیب سے نہیں ادا کرتا ہے، بلکہ ان کے کرایہ کی ادائیگی مشتری کے ذمہ لازم ہوتی ہے تو یہ مشتری کے وکیل ہیں اور ان کا قبضہ مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا اور اگر ان کے کرایہ کی ادائیگی بائع کے ذمہ لازم آتی ہے اور وہ اپنی جیب سے ادا کر رہا ہے پہلے، یا بعد میں

مشتری سے وہ کرایہ وصول نہیں کرتا ہے تو یہ بائع کے وکیل ہیں اور ان کا قبضہ بائع کا قبضہ سمجھا جائے گا، اور بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل نہ ہوگی، جو قبضہ کی حقیقت اور روح ہے۔

بیوع کے مروجہ مذکورہ چند طریقوں کا حکم:

بیع بالالفاظ اور بیع بالافعال قبضہ ٹرانسپورٹ وغیرہ کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد مذکورہ صورتوں کا حکم نکالنا آسان ہے اب مذکورہ صورتوں کے احکام لکھے جا رہے ہیں (۱-۲-۳-۴-۵) ان سب صورتوں کا تعلق مشتری کے بائع کو آرڈر دینے سے ہے اور آرڈر حقیقت میں صیغہ امر ہے اور وہ بھی حال کے معنی میں نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ ایجاب لفظی نہ بنے گا اور جب بائع بیع کو مشتری کے کہنے کے مطابق ڈاک ٹرانسپورٹ ریلوے، اور ملازم وغیرہ کو دیدیتا ہے، اور دینے کے بعد بائع کے کرایہ نہ ادا کرنے کی صورت میں بیع سے اس کا تعلق بالکل ختم ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے وکیل کے قبضہ میں آ جاتی ہیں، اور وکیل کا فعل مشتری کا شمار ہونے کی وجہ سے وہ اشیاء مشتری کے قبضہ میں داخل ہو جاتی ہیں اور جب بغیر ایجاب لفظی کے مشتری کے قبضہ میں بیع آگئی تو یہ بیع تعاطی بنی اور بیع تعاطی کا حکم بیع کا لزوم ہے، اور اشیاء کیلیہ، وزنیہ مشتری بالکیل والوزن میں بھی قبل الکیل والوزن مشتری کو تمام تصرفات کی اجازت ہے، لہذا صورت مذکورہ میں اگرچہ وہ اشیاء کیلی، وزنی ہوں، یا کیلی، وزنی نہ ہوں، جب آرڈر دینے والے کے پاس پہنچ جاتی ہیں اور یہ ان پر قبضہ کر لیتا ہے تو پھر مشتری اول اور مشتری ثانی کے درمیان بیع تعاطی کے ذریعہ سے ایک نیا عقد ہو جاتا ہے، یہ ہونے والا عقد پہلے سے نہ تو باطل تھا نہ فاسد تھا، بلکہ اس کا وجود ہی نہ تھا، اس لئے جب مشتری اول مشتری ثانی کے درمیان بیع تعاطی ہوئی تو مشتری اول کو حاصل ہونے والا نفع حلال و طیب ہے، اور یہ بیع قبل القبض میں داخل نہیں، کیونکہ مشتری ثانی کے پاس بیع مشتری اول کے وکیل یعنی ڈاک، ٹرانسپورٹ وغیرہ کے ذریعہ پہنچی ہے اور وکیل کا فعل مؤکل کا شمار ہونے کی وجہ سے حقیقت میں وہ مشتری اول کے قبضہ سے مشتری ثانی کے قبضہ میں گئی ہے، نیز اصل قبضہ اور حقیقت قبضہ ضمان میں داخل ہونا ہے، تو اگر بیع مشتری اول کے ضمان میں آنے کے بعد وہ مشتری ثانی کے ضمان میں گئی ہے تو یہ بیع قبل القبض نہیں اور مشتری ثانی کا پہلے سے آرڈر دینا اور مشتری اول کا وعدہ کر لینا یہ بیع نہیں بنے گا، کیونکہ آرڈر امر ہے، اور امر ایجاب نہیں ہوتا ہے، اور مشتری اول کا وعدہ قبول نہیں ہوگا: ”أما قول المشتري يعني يساومة وطلباً والطلب أمر والإيجاب أمر آخر طلب الإيجاب ليس بإيجاب وإنما لم يذكر الشارح اللبيب برهان عدم الانعقاد على قول المشتري وهو يعني بظهوره“ (حاشیہ بنایۃ ۷۱۱)۔

حاصل یہ کہ آرڈر ایجاب نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف بیع کا مطالبہ ہوتا ہے، لہذا جب بیع بغیر ایجاب و قبول کے مشتری کے ضمان اور قبضہ میں داخل ہو جائے تو یہ بیع تعاطی ہوگی اور مشتری کیلئے اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی صورت میں بیع قبل القبض نہ ہوگی۔

(۶) کا حکم، یعنی پیک شدہ ڈبے، شیشیاں، بنڈل وغیرہ جن کو آج کے موجودہ زمانہ میں برقی مشینوں کے ذریعہ سے کیل، وزن، ذراع وغیرہ کرنے کے بعد بیع کو ڈبوں، بوروں، پیکٹوں میں سل کر بند کر دیا جاتا ہے، اور بہت سی چیزوں میں پیکٹ وغیرہ پر بیع کا پورا تعارف، وزن، قیمت تاریخ وغیرہ تمام چیزیں درج ہوتی ہیں، پھر اسی مکتوبہ وزنی، قیمت وغیرہ پر اعتبار کر کے اس کی بیع و شراء ہوتی ہے نہ تو بائع تو لتا ہے اور نہ مشتری اپنے گھر لے جانے کے بعد ان چیزوں کو تو لتا ہے، اور نہ بائع سے تولنے کیلئے کہتا ہے، اور اگر بالفرض پیک کو کھولنے کے بعد تول و ناپ لے تو کم ہونے کی صورت میں واپسی ہو جاتی ہے، لیکن اگر اسی وزن کے اعتبار سے قیمت کم کر کے بیع و شراء کرنا چاہیں، قیمت کچھ کم نہیں ہوتی، جب کہ قانون شرعی کے مطابق کم ہونے کی صورت میں قیمت کم ہونا چاہئے، نیز بائع و مشتری میں سے کوئی بھی معاملہ کرتے وقت، یا معاملہ کے بعد ان کو کیل و وزن نہیں کرتا ہے، معلوم یہ ہوا کہ جو چیزیں پیک ہو کر سلے ہوئے بوروں میں فروخت ہوتی ہیں تو ان میں کیل، وزن مقصود ہی نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ ڈبے، لفافہ پیکٹ وغیرہ مقصود ہوتا ہے، تو یہ چیزیں پیک ہونے کے بعد معدودات میں داخل ہو جاتی ہیں، ان کی بیع و شراء میں وزن مشروط نہ ہونے کی وجہ سے بیع مجازتہ میں داخل ہیں، اس لئے اگرچہ وہ اشیاء فی نفسہ کیلی یا وزنی ہوں مشتری نے شراء کے وقت ایک متعین کیل اور وزن کی مقدار بیان کر کے خریدا ہو تو بھی وزن مقصود نہیں ہوتا ہے، اس لئے اس کو قبل الکیل والوزن تصرف کرنا، بیع و شراء کرنا جائز ہے۔

(۷) جہاز وغیرہ سے بیع و شراء کا حکم یہ ہے کہ حضرات احناف کے نزدیک قبضہ کی حقیقت میں دو چیزیں داخل ہیں (۱) تخلیہ، یعنی قدرت تصرف (۲) بیع سے بائع کا بالکل انقطاع تعلق، لہذا اگر جہاز مال بردار کمپنی کا کرایہ مشتری ادا کر رہا ہے تو اس کا قبضہ متحقق ہو جانے کی وجہ سے قبضہ حسی سے پہلے اس کے لئے بیع و شراء جائز ہے، اور مشتری ثانی کیلئے جائز نہیں، کیونکہ بیع سے بائع کا تعلق منقطع نہیں ہوا اور نہ تخلیہ ہی ہوا۔



## کمپنی کی اشیاء اور ان کا حکم:

- (۱) کمپنی میں تیار ہونے والی چیزیں، خواہ مطعومات و مشروبات کی قبیل سے ہوں، یا غیر مطعومات کی قبیل سے ہوں، اکثر و بیشتر وہ پیک شدہ ہوتی ہیں۔
- (۲) اور اگر پیک شدہ نہ ہوں تو بھی، یا تو مشتری بالکلیل والوزن نہ ہوں گی، یا عددی ذرائعی ہوں گی ان تینوں قسموں کا حکم یہ ہے کہ ان میں سے بعض چیزیں معدودات میں داخل ہیں، اور بعض میں بیع مجازفہ ہوتی ہے، اس لئے بائع کے تخلیہ اور اس کے مشتری کے حکم کی بناء پر بیع سے انقطاع تعلق کے بعد قبضہ متحقق ہو جانے کی وجہ سے مشتری کیلئے ہر طرح کا تصرف جائز ہے، مگر یہ کہ مشتری ثانی کی بیع و شراء تخلیہ اور بائع کے انقطاع تعلق سے پہلے بیع قبل القبض ہونے کی بناء پر بیع فاسد ہوگی۔

نیز اگر حضرت امام مالکؒ کے مذہب کو اختیار کیا جائے تو ماکولات و مشروبات کے علاوہ بقیہ تمام چیزوں میں ان کے نزدیک بیع قبل القبض کے جائز ہونے کی وجہ سے سہولت و آسانی ہو جائے گی اور موجودہ دور میں ضرورت کے وقت حضرت امام مالک کے مذہب کو اختیار کر کے لوگوں کو حرج و تنگی سے بچانا ضروری ہے "لا حرج فی الدین، یسر اولا تعسرا" کا ارشاد ہے، اور فقہاء کا اصول ہے: "إذا ضاق الأمر اتسع، المشقة تجلب التيسير" وغیرہ، اس لئے حضرت امام مالک کے مذہب کو ضرورت کے وقت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

## کمپنی وغیرہ سے شراء کے بعد قبضہ حسی سے پہلے بیع کا حکم:

کمپنی سے مال کی خریداری پھر اس کی بیع چار طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

- (۱) مال خریدنے کے بعد اس کو نہ دیکھا، نہ اس پر قبضہ کیا، وہ مال کمپنی ہی کے پاس تھا صرف معاملہ کرنے کے بعد اس کو فروخت کر دیا۔
- (۲) خریدنے کے بعد اس کو ٹرانسپورٹ وغیرہ کے حوالہ کرنے کے بعد اس کی بیع کیا اور ٹرانسپورٹ کی اجرت بائع کے ذمہ نہ ہو۔
- (۳) مال خرید کر کمپنی ہی میں مشتری نے خود، یا اس کے وکیل نے اس کو الگ رکھوا دیا اور کمپنی نے اس کو پوری قدرت تصرف بھی دے دی، اور وہ مال مشتری کے ضمان میں داخل بھی ہو گیا کہ اگر ضائع ہوگا تو مشتری کا ضائع ہوگا۔
- (۴) مال خریدنے کے بعد بائع ہی کو اس کی بیع کا وکیل بنا دیا۔

پہلی صورت کا حکم:..... کمپنی سے مال خرید کر اپنے، یا وکیل وغیرہ کے قبضہ و ضمان میں آنے سے پہلے ہی کمپنی ہی سے اس کی بیع کر دیا تو یہ بیع فاسد ہوگی اگر اس سے ربح حاصل ہوگا تو "ربح مالہ یضمن" ہوگا، اگر چہ بیع کے بعد بیع مشتری اول کے ضمان میں آجائے، کیونکہ جس وقت عقد کیا ہے اس وقت وہ بیع غیر مقبوض تھی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع اسی عقد کی جانب منسوب ہو کر "ربح مانہ یضمن" ہوگا، کیونکہ ربح اسی عقد کا نتیجہ ہے، لہذا اگر اس صورت میں بیع کے تمام ارکان وغیرہ پائے گئے ہیں تو عقد بیع تعاطی بھی نہیں بن سکتا، عقد اول کے فاسد ہو جانے کی وجہ سے، لہذا اس ربح کا حضرات احناف کے مطابق تصدق واجب ہے، البتہ اگر ایجاب و قبول کیلئے صیغہ مستقبل استعمال کیا، مشتری نے کمپنی سے کہا بیع دو اور کمپنی نے کہا بیع دیا جائے گا، تو ایجاب و قبول نہ ہونے کی وجہ سے اگر بیع یا ضمن پر بعد میں قبضہ ہو جائے تو یہ بیع تعاطی بن جائے گی۔

## دوسری صورت کا حکم:

ٹرانسپورٹ وغیرہ کو حوالہ کرنے کے بعد اگر اس کی بیع کیا اور اس کی اجرت بائع نے نہ ادا کیا ہو تو وہ مال مشتری کا مقبوض سمجھا جائے گا، اور اس کی بیع درست ہے اور اس سے حاصل شدہ نفع "ربح مالہ یضمن" نہ ہوگا، لیکن مشتری ثانی کیلئے کسی تیسرے کے ہاتھ فروخت کرنا مال کے وصول ہونے سے پہلے جائز نہیں کیونکہ جب تک وہ مال ٹرانسپورٹ وغیرہ کے قبضہ میں ہے اس وقت تک وہ مقدر التسلیم نہیں، اس لئے مشتری کا قبضہ اس پر نہیں ہو سکتا، لہذا اس کا بیع کرنا بیع قبل القبض ہوگا جو بیع فاسد ہے۔

- (۳) مال خرید کر مشتری، یا اس کا وکیل کمپنی کے کسی کمرے، گودام وغیرہ میں رکھ دے اور مشتری کو پوری قدرت تصرف ہو تو وہ مال کا مشتری مقبوض سمجھا جائے گا اور اس کی بیع جائز ہے، البتہ مشتری ثانی کیلئے وصول ہونے سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں۔

(۴) بائع ہی کے پاس مال خرید کر چھوڑ دیا اور قبضہ سے پہلے بائع کو فروخت کرنے کا وکیل بنا دیا تو اس کی تین صورتیں نکلتی ہیں، اگر دیکھنے سے پہلے ہی بائع سے کہا کہ اس کو فروخت کر دو تو بائع مشتری کے درمیان ہونے والے عقد کو فسخ سمجھا جائے گا، بائع نے اس کو قبول کیا ہو یا نہ قبول کیا ہو، اور اگر مشتری نے بائع سے کہا کہ اس کو میرے لئے فروخت کر دو تو اس صورت میں اگر بائع قبول کر لے تو عقد فسخ سمجھا جائے گا، اور اگر بائع راضی نہ ہو تو فسخ نہ ہوگا، اور اگر قبضہ اور دیکھنے کے بعد اس سے کہا کہ اس کو فروخت کر دو یا میرے لئے فروخت کر دو تو یہ بیع کی وکالت ہوگی اور چونکہ قبضہ کے بعد بیع کا وکیل بنایا ہے، اس لئے بیع قبل القبض بھی نہ ہوگی۔

”ولو اشتری ثوباً أو حنطة فقال للبائع، قال الإمام الفضلي: إن كان قبل القبض والرؤية كان فسخاً وإن لم يقل البائع نعم لأن المشتري ينفرد بالفسخ في خيار الرؤية وإن قال: بعه لي أي كن وكيلاً في الفسخ فما لم يقبل البائع لا يكون فسخاً، وكذا لو بعد القبض والرؤية لكن يكون وكيلاً بالبيع سواء قال: بعه أو بعه لي هكذا كله ملخص مما في البحر“ (شامی ۴، ۲۳)۔

تفصیل مذکور حضرات احناف کے مذہب کے مطابق کی گئی، البتہ حضرت امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مسلک اختیار کرنے میں سہولت و آسانی ہے، ان کے نزدیک صرف مطعومات میں بیع قبل القبض ناجائز ہے، اس کے علاوہ میں جائز ہے۔

☆☆☆

## قبضہ شرعی سے قبل اشیاء کی خرید و فروخت کا شرعی حکم

مولانا ارشاد قاسمی <sup>ؒ</sup>

قبضہ شرعی کے حاصل ہونے سے قبل خریدار کا مال فروخت کر دینا جائز نہیں ہوگا، اور اس کی بیع از روئے شرع یا از روئے قواعد فقہیہ فاسد ہوگی۔ اور اس پر بیع فاسد کے احکام جاری ہوں گے۔

فاسد ہونے کی دلیل:

قبضہ شرعی سے قبل فروخت کرنے کی صورت میں فتح عقد کا غرر ہے، کہ بیع (خریدی ہوئی چیز) جو ابھی اس کے قبضہ میں نہیں آئی ہے شاید نہ آسکے اور ضائع ہونے کی وجہ سے عقد ختم ہو جائے۔ اور غرر کی اس کیفیت سے بیع فاسد ہوگی۔ جیسا کہ غرر اور اس کی تفصیل کے ذیل میں اس کی مفصل بحث کی گئی ہے۔ محقق ابن ہمام فتح القدر میں لکھتے ہیں: ”لأن فيه غرر انفساخ العقد الأول على اعتبار هلاك المبيع قبل القبض فتبين حينئذ أنه باء ملك الغير بغير إذنه وذلك مفسد للعقد“ (۶۰۵۱۲)۔

علامہ بدر الدین الحنفی العینی اس کی علت فساد پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ شرعی سے قبل مشتری کا فروخت کرنا ”ربح مالم يضمن“ میں داخل ہے، اور شارع علیہ السلام نے ضمان میں آنے سے قبل فروخت کرنے اور نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا۔ اور نبی مقضی فساد ہے، لہذا اس سے بیع فاسد ہوگی۔ چنانچہ ”ہدایہ“ کی شرح ”البنایہ“ میں لکھتے ہیں:

”والجامع اشتمالهما على ربح مالم يضمن، فان المقصود من البيع الربح والربح مالم يضمن فمى عنه شرعا والنهي يقتضى الفساد، فيكون البيع فاسدا قبل القبض لأنه لم يدخل في ضمانه كما في الإجارة“ (۷۰۲۲۲)۔

نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی علت غرر وصف ہے۔ محققین فقہاء کرام اس کی تصریح بھی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ابن ہمام کا قول ابھی گذرا۔ ”لأن فيه غرر انفساخ العقد الأول“۔ اسی طرح ”عمانیہ شرح ہدایہ“ میں ہے: ”لأن فيه غرر الانفساخ بالهلاك والاستحقاق“ (ص ۵۱۲)، نبی کی علت منصوص کی وضاحت کرتے ہوئے خطہ عرب کے مشہور محقق فقیہ علامہ زحلی ”الفقہ الاسلامی“ میں لکھتے ہیں: ”إن العلة عند الحنفية في عدم جواز بيع الشيء قبل قبضه هي الغرر“ (۴۰۲۲۲)۔ اور غرر جب من حیث الوصف ہو تو یہ مفسد ہے۔ چنانچہ علامہ زحلی غرر سے فساد اور ابطال کے ضابطہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”والغرر الذي يبطل البيع هو غرر الوجود وهو كل ما كان البيع فيه محتملا للوجود والعدم۔ أما غرر الوصف فمفسد للبيع“ (۴۰۲۲۴)۔

معلوم ہوا کہ غرر وجود جس میں بیع کے وجود اور عدم ہی کا علم نہ ہو بیع کو باطل کرتا ہے۔ سو یہاں غرر الوجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیع تو موجود ہے اس کے وجود نے بیع اول کو جائز قرار دیا ہے۔ البتہ یہ احتمال ہے کہ جس کا وجود ثابت ہو چکا ہے آیا قبضہ میں بھی آسکے گی یا نہیں، ملے گی یا ہلاک ہو جائے گی، یہ غرر وصف ہے۔ اور غرر وصف سے بیع فاسد ہوتی ہے۔ علامہ زحلی نے اس نہی کو سبب فساد قرار دیا ہے:

”قال الحنفية لا يجوز التصرف في البيع المنقول قبل القبض؛ لأن النبي ﷺ فمى عن بيع مالم يقبض والنهي يوجب الفساد المنهى عنه“ (ص ۴۷۳)۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نبی شارع کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوگی۔ اس سے زیادہ واضح طور پر علامہ زحلی نے ”الفقہ الاسلامی وادلتہ“ کے اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں وہ ترتیب سے بیع فاسد کو شمار کر رہے ہیں۔ اس میں انہوں نے ”بيع الشيء المملوك قبل“



القبض“ کو بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ (صفحہ ۷۳ جلد ۴) میں اسے بیع فاسد کی فہرست میں شمار کرتے ہیں۔

عناہ شرح ہدایہ میں بھی صراحتاً اس بیع کو بیع فاسد قرار دیا گیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”والنہی یقتضی الفساد فیکون البیع فاسدا قبل القبض؛ لأنه لم یدخل فی ضمانہ“ (حاشیہ فتح القدیر ۵۱۲/۶)، صاحب ”در مختار“ علامہ حصکفی نے بھی مواہب کے حوالہ سے اسے فاسد ہی قرار دیا ہے۔ ”وفی المواہب وفسد بیع المنقول قبل قبضہ“ (مضری نسخہ ۵، ۱۳۸)، علامہ شامی نے بھی غرر کو فساد کی علت قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”لأن علة الفساد الغرر“ (۵، ۱۳۸)، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی قبل القبض کی علت غرر ہے جو سبب فساد ہے۔

محقق طحاوی نے بھی ”الدر المختار“ کے ”حاشیہ طحاوی علی الدر“ میں اسے فاسد قرار دیا ہے۔ چنانچہ صاحب ”الدر“ کے قول ”وفسد بیع المنقول“ کے تحت لکھتے ہیں:

”وإنما جاء الفساد من جهة أخرى وهو الغرر أي غرر انفساخ العقد بهلاکہ“ (۳، ۱۰۰)، علامہ طحاوی نے صاحب الدر کے قول فساد کو بیع قرار دے کر اس کی علت اور وجہ بیان کی ہے کہ فساد کا سبب غرر ہے۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے باطل ہونے پر تحقیق و تنقیح:..... خیال رہے کہ بعض فقہاء نے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو باطل بھی قرار دیا ہے۔ مگر یہ تحقیق اور اصول کے اعتبار سے درست نہیں۔ اہل تحقیق نے خود اس کی تردید کی ہے۔ چنانچہ جوہرہ کے حوالہ سے در مختار میں ہے: ”بخلاف بیعہ قبلہ فإند باطل مطلقاً“۔ صاحب ”در مختار“ علامہ حصکفی خود اس سے متفق نہیں، وہ ”قلت“ سے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں: ”وفی المواہب وفسد بیع المنقول قبل قبضہ“۔ علامہ شامی دونوں قولوں کو سامنے رکھ کر تحقیقی فیصلہ فرماتے ہیں: ”والظاهر الثانی لأن علة الفساد الغرر كما مر“۔ اب رہی بات کہ پھر اسے باطل کیوں قرار دیا تو علامہ شامی اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وکثیرا ما یطلق الباطل علی الفاسد“۔

ربح مال یمضمن:..... نہی قبل القبض کی ایک علت جس کی وجہ سے یہ نہی واقع ہوئی ہے ”ربح مال یمضمن“ ہے۔ یعنی ضمان میں آنے سے قبل اسے فروخت کرنا اور اس سے نفع حاصل کرنا ہے۔ اور حدیث پاک میں ”ربح مال یمضمن“ کی نہی آئی ہے، چونکہ قبضہ شرعی سے شے ضمان میں داخل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعضوں نے قبضہ کی تشریح ضمان سے اور ”لم یقبض“ کی شرح ”لم یمضمن“ کے ساتھ کی ہے۔

ضمان سے قبضہ کا تحقق ہو جائے گا:..... کسی شے کا ضمان میں آنا گویا کہ اس کے قبضہ میں آنا ہے۔ چنانچہ ضمان سے قبضہ کو ثابت کرتے ہوئے علامہ زحلی ”لفقہ الاسلامی“ میں لکھتے ہیں: ”فاما أن تکون ید ضمان بنفسہ کید الغاصب فیصیر المشتري قابضا للمبیع بنفس العقد“ (۷، ۲۲۲) غاصب کے مثل اگر ضمان میں آجائے تو اس سے مشتری قابض ہو جائے گا۔ اس عبارت سے یہ بات بالکل صاف واضح ہوتی ہے۔ ضمان اور قبضہ ایک دوسرے کے لئے معاملات بیع میں لازم و ملزوم ہیں۔ اور ضمان میں کسی شے کا آجانا قبضہ کو ثابت کر دیتا ہے۔ اور اس پر خود حدیث پاک شاہد ہے، اور اسی کو فقہاء نے بھی جا بجا اختیار کیا ہے جو ان کے بیان کردہ جزئیات سے بھی ثابت ہوتا ہے، لہذا مشتری کے ضمان میں بیع آجائے تو اس کا بیع ناجائز ہو جائے گا۔

اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت:..... یہ واضح رہے کہ حدیث پاک میں جو قبضہ سے پہلے فروخت اور بعض تصرفات سے منع کیا گیا ہے اس میں قبضہ سے کیا مراد ہے۔ محض قبضہ حسی یعنی مشتری کے ہاتھ میں آجانا مراد ہے، یا اس کے مفہوم میں وسعت ہے۔ اور مرادی اعتبار سے قبضہ حسی کو جس طرح یہ شامل ہے اسی طرح تحویل، تسلیم، افراز، افراغ، ضمان وغیرہ جسے قبضہ حکمی اور معنوی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے شامل ہے؟ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اولاً قبضہ کے لغوی معنی۔ ثانیاً فقہاء کی اصطلاح میں قبضہ کا مفہوم اور اس بات کی تشریح کہ قبضہ سے مراد حسی قبضہ ہی نہیں، بلکہ قبضہ معنوی اور حکمی بھی ہے۔ اور دونوں قبضہ میں سے کسی قبضہ کا تحقق شارع علیہ السلام کی منع کردہ بیع سے خارج کرتے ہوئے جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

قبضہ لغت میں:..... قبض لغت میں متعدد معانی کے لئے آتا ہے۔ جن میں ایک معنی ملک اور تحویل میں آنا اور قبول کرنا بھی ہے (لسان العرب ۷/۲۱۳)۔

محدثین و فقہائے محققین کے یہاں قبضہ کا مفہوم و مراد:

علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ بخاری کی شرح ”فیض الباری“ میں قبضہ کے مفہوم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وبالجملة أن القبض في البيع والهبة والرهن يتحقق عندنا بالتخلية والممكنة على القبض ولا يحتاج إلى القبض الحسي والنقل“ (۳، ۲۰۶)، حاصل کلام یہ ہے کہ قبضہ، بیع، ہبہ، رهن میں تخلیہ اور تمکین قبضہ سے قبضہ محقق ہو جاتا ہے۔ حسی قبضہ اور منتقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر مزید اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ومعناها عندی رفع علائق ملکہ و تمکینہ للمشتري على أن يقبضه وذلك قد يكون بالفعل وأخرى بالقبول وتارة بالقرائن“۔ اور اس تمکین کی شرح ایک مثال سے کرتے ہیں۔ جسے فقہاء اپنے کلام میں تمکین کو قبضہ قرار دیتے ہوئے ذکر کرتے ہیں:

”ولوباء فرسافي الصحراء فإن كان المشتري أن يستطيع أن يقبضه بدون إعاية غيره تحقق القبض۔ فكأنهم نظروا إلى الممكنة“ (۲، ۲۰۶)، جنگل میں گھوڑا بیچا اگر مشتری کسی دوسرے کی مدد کے بغیر قبضہ کر سکتا ہے تو قبضہ کا تحقق ہو جائے گا۔ علامہ ابن ہمام ”فتح القدير، شرح“ ہدایہ“ میں ”محیط“ کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں: ”إن بالتخلية يقع القبض وإن كان المبيع يبعد عنهما“۔ تخلیہ سے قبضہ ہو جاتا ہے، خواہ بیع دور ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ابن ہمام فتح القدير میں ایک مثال سے قبضہ حکمی سے قبضہ شرعی کے واقع ہونے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ولو اشترى فرسا في حظيرة فقال البائع: سلمتها إليك ففتح المشتري الباب، فذهب الفرس إن أمكنه أخذها من غير عون كان قبضا“ (۶، ۲۹۸)۔ دیکھئے اس جزئیہ میں محض قدرت اور تمکین کو قبضہ قرار دیا گیا ہے۔ ابن ہمام نے تجرید کے حوالہ سے تسلیم و قبضہ کا ایک قاعدہ کلیہ ذکر کیا ہے جس سے مسئلہ مجبوث عنہ کے ثبوت میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”تسليم المبيع أن يخلى بينه وبين المبيع على وجه يتمكن من قبضه من غير حائل“ (۶، ۲۹۷)، سپردگی بیع کا مفہوم یہ ہے کہ بائع مشتری کو بیع اس طرح حوالہ کر دے کہ بغیر کسی مانع کے قبضہ ممکن ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض قدرت اور تمکین ہو جائے کہ وہ اپنے حوالہ اور قبضہ میں جب جس طرح چاہے قبضہ کر سکے تو اسے قبضہ کہا جائے گا۔

چنانچہ ایک جزئیہ سے اور یہ واضح ہوتا ہے: ”ولو اشترى حنطة في بيت و دفع البائع المفتاح إليه، وقال: خليت بينك وبينها فهو قبض“ (۶، ۲۹۷ بجز الرائق ۵، ۲۲۲)۔ دیکھئے محض کنجی حوالہ کر دینا اور اذن قبضہ دے دینا ہی قبضہ قرار دے دیا گیا۔

دیکھئے قبضہ نہیں کیا، مگر اس کے تحت آ گیا اور اس کے اختیار میں آ گیا کہ جب چاہے وہ قبضہ حسی بھی کر سکتا ہے۔ گویا یہ اختیار میں آ جانا قبضہ شرعی ہے۔ فقہ کا سانی ”بدائع الصنائع“ میں قبضہ اور تسلیم کے مفہوم اور مراد کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قبضہ کی کوئی ایک ہی خاص شکل مراد نہیں، بلکہ اس کے مفہوم میں وسعت ہے، جسے قبضہ حکمی اور معنوی سے بھی یاد کیا جاسکتا ہے۔

”التسليم أو القبض۔ معناه عند الحنفية هو التخلي أو التخلية۔ وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضاً له“ (بجوالہ الفقہ الاسلامی ص ۲۱۸)۔

ابن نجیم شرح ”کنز الدقائق“ میں لکھتے ہیں اگر بائع کا اس کی طرف اشارہ ہو جائے اور وہ ایسے طور پر ہو کہ وہ اشارہ سے ممتاز ہو جائے تو اسے بھی قبضہ تصور کیا جائے گا۔ مثلاً: ”وكذا لو اشترى بقرا في السرح فقال البائع: اذهب، فاقبض إن كان يري بحيث يمكنه الإشارة إليه يكون قبضا“ (۵، ۲۲۲)۔

دیکھئے اگر چراگاہ میں جانور ہے اور بائع کے اشارہ سے وہ ممتاز ہو جائے، یعنی بیع غیر بیع سے علیحدہ نمایاں ہو جائے تو اسے قبضہ کہا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ قبضہ کے مفہوم میں وسعت ہے اور اس کی کوئی ایک شکل نہیں ہے کہ قبضہ کو اسی پر منحصر کیا جائے۔

علامہ شامی نے بھی قبضہ کو صرف حسی میں منحصر نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی مختلف شکلیں جسے قبضہ شرعی سے موسوم کیا جاسکتا ہے، ذکر کیا ہے۔ جس کا حاصل تمکین اور ضمان میں آ جانا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۴/۵۶۱)۔

علامہ شامی ”الدر المختار“ میں ایک موقع پر تخلیہ کو اجماعاً قبضہ کے معنی میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”أجمعوا على أن التخلية في المبيع الجائز تكون قبضا“ (۲، ۵۶۲)۔

علامہ شامی نے ایک جزئیہ کا ذکر کیا ہے کہ مشتری نے اگر اپنا برتن بھیج دیا اور وہ خود نہ رہا اور بائع نے اس میں سامان ڈال دیا تو باوجودیکہ مشتری یا اس کا کوئی وکیل نہیں ہے پھر بھی قبضہ تصور کیا جائے گا۔ اس لئے کہ تخلیہ اور حوالہ پایا گیا۔ اور اس کے ضمان میں داخل ہو گیا۔

”لو اشترى دهنًا و دفع قارورة دزنه فيها فوزنه فيها بحضرة المشتري فهو قبض، وكذا بنغيته في الأصح“ (۳، ۵۶۱)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشتری کے غائبانہ میں بھی جبکہ مشتری نے افراز کا حکم دیدیا ہو تو قبضہ شرعی ہے۔

فقہ حنفی کی بیشتر کتابوں میں امام اعظمؒ کے نزدیک تخلیہ کے لئے عموماً ۳ شرطوں کا ذکر ملتا ہے۔ جسے قاضی خاں، علامہ شامی، صاحب ”البحر الرائق“ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

”قال أبو حنيفة: التخلية بين المبيع والمشتري تكون قبضا بشرائط: ثلاثة أحدها: أن يقول البائع: خلعت بينك وبين المبيع فاقبضه، ويقول المشتري: قد قبضت، والثاني: أن يكون البيع بحضرة المشتري بحيث يصل إلى أخذه من غير مانع، والثالث: أن يكون المبيع مفرزا غير مشغول بحق الغير“ (قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۲، ۲۵۸)۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے تخلیہ کے قبضہ ہونے کی ۳ شرطیں ذکر کی ہیں: (۱) بائع خلعت کہہ دے (۲) بیع کو مشتری بلا کسی روک و مانع کے قبضہ کر سکے (۳) بیع غیر بیع سے علیحدہ اور ممتاز ہو۔ خیال رہے کہ علامہ شامی نے خلعت کے مفہوم میں لکھا ہے کہ مراد یہ لفظ نہیں ہے، بلکہ اذن و اجازت کے کلمات مراد ہیں۔ جن سے حوالہ اور قبضہ دینے کا علم ہو جائے ضروری ہے)۔

”در مختار“ نے بھی اس شرط کو ذکر کیا ہے۔ ”و شرط في الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن يقول: خلعت بينك وبين المبيع فلو لم يقله أو كان بعيداً لم يصر قابضاً“ (ص ۵۶۱)۔ اجناس ناطقی نے یہ شرط لگائی ہے کہ قبضہ کا اذن ہو، اگر کچھ نہ کہا یا بیع دور ہے تو قبضہ شمار نہ ہوگا۔ خیال رہے کہ تخلیہ یا قبض کے الفاظ کا کہنا ضروری نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ بائع کی جانب سے ایسی کوئی بات پائی جائے جو تمکین یا قبضہ دینے کو ثابت کرتی ہو، چنانچہ رسید یا کیش میسوکا دینا بھی اس کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی اس احتمال کو دور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”الظاهر هو أن المراد به الإذن بالقبض لا خصوص لفظ التخلية“ (۳، ۵۶۱) مراد لفظ خلعت سے قبضہ کی اجازت ہے نہ کہ لفظ تخلیہ۔ معلوم ہوا کہ اس کی جانب سے اذن و اجازت ہونی کافی ہے۔ لفظ خلعت ضروری نہیں۔ ساری عبارتیں اس بات کی وضاحت کر رہی ہیں کہ قبضہ سے مراد حسی اور ہاتھ میں آ جانا ہے۔

اشیائے منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت اور اس کا فرق:

واضح رہے کہ فقہاء کرام کے نزدیک منقول اور غیر منقول اشیاء کے درمیان فرق ہے۔ علامہ رافعی کی ”شرح الوجیز“ کے حوالہ سے اعلیٰ السنن میں ہے:

”إن كان المبيع مما لا ينقل كالنقل والأراضى فقبضه بالتخلية بينه وبين المشتري و تمكنه من اليد والتصرف. وإن كان المبيع من المنقولات فالمذهب المشهور وبه قال أحمد أنه لا يكفي فيه التخلية بل لابد من النقل والتحويل... وقال مالك وأبو حنيفة: إنه يكفي فيه التخلية كما في العقار“ (۱۲، ۲۳۱)۔ عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ تخلیہ اور تمکین حاصل ہو جائے تو دونوں میں قبضہ کا تحقق ہو جائے گا۔ تخلیہ کا مفہوم دونوں میں شامل ہے۔ جیسا کہ ابن وہب زہلی کی عبارت واضح کر رہی ہے: ”فإن القبض عند الحنفية يكون بالتخلية سواء كان المبيع عقاراً أو منقولاً“ (۳، ۳۱۹)۔ السید السابق اپنی کتاب الفقہ النہیۃ میں قبضہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”والقبض في العقار يكون بالتخلية بينه وبين من انتقل ملكه اليه على وجه يتمكن“



معہ من الانتفاء فيما يقصد منه كزرع الأرض وسكنى المنزل والاستغلال بالشجر أو جنى ثماره ونحو ذلك“ (۳۰۱۳۹)۔  
عقار (زمین وکھیت) میں قبضہ کا یہ مفہوم ہے کہ ایسا تخلیہ اور حوالہ ہو جائے جس سے انتفاع ممکن اور قابو میں آجائے۔ مثلاً زمین ہو تو کھیتی کرے، مکان ہو تو بس جائے، درخت ہو تو سایہ اور پھل پر قابو پالے وغیر ذلک۔

اور منقول کے قبضہ کی شکل واضح کرتے ہوئے سید السابق الفقہ السنۃ میں ذکر کرتے ہیں: ”والقبض فيما يمكن نقله كالطعام والثياب والحيوان، ونحو ذلك يكون على النحو الآتي:

أولاً: باستيفاء القدر كيلاً أو وزناً إن كان مقدراً۔

ثانياً: بنقله من مكانه إن كان جزافاً۔

ثالثاً: يرجع إلى العرف فيما عدا ذلك“ (۳۰۱۳۹)۔

مطلب یہ ہے کہ اشیاء منقولہ مثلاً غلہ، کھانے کی چیزوں وغیرہ میں قبضہ کی شکل یہ ہوگی کہ کیلی ووزنی چیزوں میں کیل ووزن ہو جائے۔ اگر اندازے اور تخمینہ سے اس کی بیج ہوئی ہو تو اپنی تحویل میں لے لے یا اپنے پاس منتقل کر لے۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ عرف میں جس کو قبضہ تصور کیا جاتا ہو اس کا وقوع ہو جائے۔ عرف میں قبضہ کی شکل یہ ہوگی کہ کیش میمو اور رسید اس کے نام بن جائے۔ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس کا کاغذ اس کے نام آجائے، کاغذ کے ساتھ لوگوں کی زبان پر بھی آجائے کہ یہ تو فلاں کا ہے، اس ٹیکس پر مٹ کاغذ پر اس کا نام درج ہو جائے۔

سرکاری مواخذہ، راستہ ٹیکس (چنگلی) وغیرہ سب اس سے متعلق ہو جائے۔ یہی ضمان میں آنے کی علامت ہے۔ اور یہی قبضہ معنوی ہے۔ صاحب ”الفقہ السنۃ سید السابق“ کی اس عرفی قبضہ کے اعتبار سے حسی قبضہ کے بغیر اس کا فروخت کرنا جائز ہوگا۔

عقار کے قبضہ حکمی کے سلسلے میں فقہاء نے اس امر کا بھی اعتبار کیا ہے کہ اگر قریب ہے تو تخلیہ اور تمکین قبضہ شمار ہوگا، اور اگر بعید ہے تو تخلیہ قبضہ نہ ہوگا۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ”والصحيح ما ذكر في ظاهر الرواية؛ لأنه إذا كان قريباً يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض أما إذا كان بعيداً لا يتصور القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض“ (۳۰۵۶۱)، صاحب درمختار نے بھی اسی قریب وبعید کا فرق ملحوظ رکھا ہے: ”وكان بعيداً لم يصر قابضاً“ (۳۰۵۶۱)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں کہ محیط وجامع شمس الأئمة سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیہ مطلقاً قبضہ ہے، خواہ قریب ہو یا بعید ہو۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ”و مقابله ما في المحيط وجامع شمس الأئمة: أنه بالتخلية يصح القبض وإن كان العقار بعيداً غائباً عنهما عند أبي حنيفة“ (۳۰۵۶۱)۔  
قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی کی احادیث ”معلول بالعلتہ“ ہیں:

احادیث پاک میں جو قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی کی روایتیں پائی جاتی ہیں وہ جمہور فقہاء محدثین کے نزدیک معلول بالعلتہ ہیں۔ اور اس پر تمام محققین فقہاء کے اقوال شاہد ہیں جن کی تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے:

صاحب ”ہدایہ“ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی احادیث کو معلول بالعلتہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”والحدیث معلول به عملاً بدلائل الجواز“۔ اور اس کی شرح کرتے ہوئے ابن ہمام فتح القدير میں لکھتے ہیں: ”والحدیث الذی استدلل به معلول به أى بغير الانفساخ“ (۶۰۵۱۳)۔ اور اس معلول بالعلتہ کی دلیل واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”والدلیل علیہ أن التصرف الذی لا یمتنع بالغرر نافذ فی المبیع قبل القبض وهو العتق والتزوج علیہ“ (۶۰۵۱۳)۔

یعنی چونکہ حدیث معلول بالعلتہ ہے، کہ عدم جواز کی علت غرر انفساخ اور ہلاکت ہے۔ اور یہ بات عتق اور تزوج میں نہیں پائی جاتی۔ اس علت کے پیش نظر قبل القبض عتق اور تزوج جائز ہوگا۔ کیونکہ اس میں غرر اور ہلاکت کا احتمال نہیں۔ صاحب عنایہ ابن نجیم مصری اور اکثر اہل علم نے اس حدیث کے معلول ہونے کی صراحت کی ہے۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلے میں حنفیہ کا مسلک اور دلائل:

خیال رہے کہ امام محمد اور امام زفر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی کے سلسلہ میں عموم کے قائل ہیں۔ خواہ منقولات میں سے ہو یا عقار میں سے ہو، کسی

کی بھی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست نہیں ہے۔ یہی قول حضرت امام شافعی کا ہے۔ امام ابو یوسف کا بھی قول اول یہی ہے۔ ابن ہمام "فتح القدير" میں امام محمد کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رجوعا إلى إطلاق الحديث يعني عمومه... وهو ما في حديث حكيم من قوله ﷺ لا تبعن شيئا حتى تقبضه... وللنهي عن ربح مال م يضمن... ولو باء العقار بربح يلزم ربح مال م يضمن... ولأن السبب هو البيع إنما يتم بالقبض ولهذا جعل الحادث بعد العقد قبل القبض كالحادث عند العقد... والمثل متأكد بتأكد السبب وفي هذا العقار والمنقول سواء"

مطلب یہ ہے کہ نبی عام ہے، تمام اشیاء کو شامل ہے۔ مزید یہ کہ اس نبی کی علت خود حدیث پاک میں ہے کہ "ربح مال م يضمن" ممنوع ہے درست نہیں، لہذا عقار کی بیع قبضہ سے پہلے "ربح مال م يضمن" میں داخل ہو کر ناجائز ہوگی۔ مزید یہ کہ بیع کا اتمام قبضہ سے ہوتا ہے۔ اور جب قبضہ سے اتمام بیع ہوتا ہے تو اتمام بیع سے قبل اس کا تصرف کیسے درست ہوگا۔ تا وقتیکہ ملک جس کا سبب بیع ہے قبضہ سے تام اور مکمل نہ ہوگی، بیع درست نہ ہوگی۔ اور یہ علت منقول اور عقار دونوں کو شامل ہے، لہذا منقول وغیر منقول کسی کی بھی بیع جائز نہ ہوگی۔

### شیخین کا قول مع دلائل:

حضرات شیخین قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نبی والی حدیث کو اشیاء منقولہ کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔ اور اس نبی کا محل اشیاء منقولہ یا جو ہلاکت کے گمان غالب میں ہے، اسے مانتے ہیں، اسی وجہ سے زمین و کھیت کی بیع کو قبل القبض جائز قرار دیتے ہیں۔ یہی مسلک حنابلہ کا، مالکیہ کا، امام بخاری کا، عثمان الہتی کا اور علامہ نووی کے مطابق بیشتر فقہاء کا ہے، احناف کے نزدیک یہ حدیث چونکہ علت غرر کے ساتھ معلول ہے اس لئے جہاں غرر اور ہلاکت کا گمان غالب ہوتا ہے وہاں بیع اور تصرف قبل القبض کو ممنوع قرار دیتے ہیں، خواہ زمین اور کھیت ہی کیوں نہ ہو جس کی مثال آگے آ رہی ہے۔ "تکملہ الفقہ" میں شیخین کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إنهما يستثنيان العقار من عموم النهي؛ لأن علة النهي منتفية۔ فإن الحديث الأخير حديث عبد الله بن عمرو دل على أن العلة في النهي عن بيع المبيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح مال م يضمن، وإنما يضمن الإنسان ما يخاف فيه الهلاك۔ وأما العقار فلا يخشى فيه ذلك إلا نادرا حتى لو كان العقار على شط البحر أو كان المبيع علوا لا يجوز بيعه قبل القبض۔ كما في فتح القدير" (۵، ۲۶۶)، "لأن الهلاك فيه غير نادر" (ص ۲۵۲)۔

اور صاحب "ہدایہ" نے شیخین کے استدلال کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "إن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه، لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول۔ والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به عملا بدلائل الجواز"۔ اس کی شرح میں ابن ہمام صاحب "أح" فرماتے ہیں: "والدليل عليه أن التصرف الذي لا يمتنع بالغرر نافذ في المبيع قبل القبض وهو العتق والتزوج عليه۔ ويجوز في المبيع قبل القبض العتق" (ص ۵۱۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ غرر جہاں نہیں ہے، وہاں ممنوع نہیں ہے۔ چنانچہ عتق اور تزوج میں غرر کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس وجہ سے یہ نافذ ہو جائے گا۔ امام اعظم اور ابو یوسف کی جانب سے یہ جواب محققین احناف نے دیا ہے۔ جسے صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض واقع ہوتا ہے، جسے قریب قریب تمام شراح نے بیان کیا ہے کہ شیخین کا حدیث کو معلول قرار دے کر غرر نہ ہونے کی وجہ سے عقار کا مستثنیٰ کرنا یہ تعلیل فی مقابلۃ النص ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ عینی نے البناہ میں جو بیان کیا ہے اسے یہاں ذکر کیا جاتا ہے: "فإن قيل: هذا التعليل معارض لمطلق النص، فإن مطلقه يتناول العقار كما بينا"۔ اور صاحب "عناہ" نے "شرح ہدایہ" میں اس طرح نقل کیا ہے:

"واعترض بأنه تعليل في موضع النص وهو ما روى أنه عليه الصلوة والسلام نهي عن بيع مال م يقبض وهو عام والتعليل في موضع النص غير مقبول"۔ صاحب "فتح القدير" نے بھی اس اعتراض کو ذکر کیا ہے (۵۱۳ / ۶) جواب میں عنایہ کا قول سب سے زیادہ واضح ہے۔ چنانچہ وہ جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "وأجيب بأنه عام دخله الخصوص لإجماعنا على جواز التصرف في الثمن والصداق قبل القبض۔ ومثل هذا العام يجوز تخصيصه بالقياس فنحمله على المنقول، كذا في المبسوط"۔



جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ حدیث عام ہے، مگر اجماع کے ذریعہ اس میں تخصیص ہو چکی ہے، چنانچہ ثمن اور مہر پر تصرف بیع قبضہ سے پہلے اجماعاً جائز ہے۔ جب اجماع سے اس میں تخصیص ہو چکی ہے، اور اجماع نے اس میں تخصیص کر دی ہے تو اب اس میں تخصیص کا احتمال ثابت ہو گیا۔ چنانچہ قیاس سے تخصیص کر دی گئی کہ یہ منقول کے حق میں ہے، عقار کے حق میں نہیں ہے۔ اور اس قیاس کی بنیاد خود شارع ہی کا قول غرر اور ہلاکت ہے۔ علامہ عینی البنا یہ شرح ہدایہ میں بھی اسی طرح جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”قلنا الحدیث مخصوص فإن بیع عقد المہر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والمیراث والثلث قبل القبض یصح بالاتفاق“ (۷، ۲۲۲)۔

جب حدیث نبوی قبل القبض سے یہ امور اجماعاً مستثنیٰ ہیں تو اس میں استثناء اور تخصیص کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ ”عام خص عنہ البعض“ کا قاعدہ فقہیہ اصول فقہ کی مشہور کتاب ”اصول الشاشی“ میں ہے: ”وأما العام الذی خص عنہ البعض فحکمہ أنه یجب العمل بہ فی الباقی مع الاحتمالات، فإذا قام الدلیل علی تخصیص الباقی یجوز تخصیصہ بخبر الواحد أو القیاس، وفیہ: فإذا قام الدلیل الشرعی علی وجود تلك العلة فی غیر هذا الفرد المعین ترجح جهة تخصیصہ، فیعمل بہ مع وجود الاحتمال“ (ص ۹)۔

چنانچہ علامہ عینی فرماتے ہیں: ”فحینئذ یجوز تخصیصہ بالقیاس۔ والدلیل علیہ ثبوت حق الشفعة قبل القبض والشفیع یتملک۔ فلو كان العقار قبل القبض لا یحتمل الملك ببدل لما جاز للشفیع الأخذ بالشفعة قبل القبض“ (۷، ۲۲۲)۔ یعنی جب ایک تخصیص اجماع سے ثابت ہو گئی تو دوسری تخصیص بھی جائز ہوگی۔ اور تخصیص تو پہلے سے کر دی گئی ہے، چنانچہ حق شفعة قبل القبض ثابت کر دیا گیا ہے۔ جس کا تعلق عقار سے ہے۔ اور قبل القبض عقار میں تملک کی صلاحیت نہ ہوتی تو حق شفعة کا ثبوت اور اخذ قبل القبض جائز نہیں ہوتا۔ لہذا عقار میں ہم نے قبل القبض تصرف اور بیع کو جائز قرار دے دیا۔

خیال رہے کہ زمین کی بیع حضرت عثمان غنی اور حضرت طلحہ کے درمیان ثابت ہے جو قبل الرویۃ والقبض ہوا تھا۔ چنانچہ بیہقی کی ”سنن کبریٰ“ میں ہے۔ اور طحاوی کی ”معانی الآثار“ میں ہے: ”إن عثمان رضی اللہ عنہ ابتاع من طلحة أرضاً بالمدينة ناقلة بأرض له بالكوفة فقال عثمان: بعثك ما لم أره، فقال طلحة: إنما النظر لي؛ لأنني ابتعت مغيباً وأنت فد رأيت ما ابتعت فتحاكما إلى جبیر بن مطعم فقضی علی عثمان أن البیع جائز وأن النظر لطلحة، لأنه ابتاع مغيباً“۔

اس روایت میں ہے کہ حضرت عثمان نے بلاد کھیسے سے فروخت فرما دیا۔ ظاہر ہے جب دیکھا نہیں تو قبضہ کہاں ہوگا کہ قبضہ تو رویت کو مستلزم ہے۔ لہذا اس سے ”بیع الم یقبض“ کا ثبوت ہوگا۔ چنانچہ ”اعلاء السنن“ میں ہے:

”وهو یقتضی جواز بیع العقار قبل القبض فإن عثمان باع أرضاً له بالكوفة ولم یرها وهو ظاهر هو أنه باعها ولم یقبضها، فإن القبض یستلزم الرویۃ حتماً“ (۱۳، ۲۲۹)۔

مزید تخصیص کی گنجائش:..... اگر غرر اور ہلاکت کا نادر ہونا کسی منقول میں پایا جائے گا تو اس کا بھی استثناء اور اس کی بھی تخصیص جائز ہو جائے گی۔ مثلاً جہاز، موٹر، فیکٹریاں، بڑی بڑی فولادی مشینیں، جن میں غرر اور ہلاکت کا احتمال نہیں رہتا۔ ان میں بھی نہیں سے مستثنیٰ ہونے کی گنجائش رہے گی۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلے میں مختلف ائمہ کی رائے:..... قبل القبض بیع کے سلسلے میں احناف کے علاوہ دیگر ائمہ اربعہ وغیرہ کے مختلف اقوال ہیں:

امام مالک:..... ”أوجز المسالك“ شرح ”موطأ امام مالک“ میں مالکیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: ”یجوز بیعہ قبل قبضہ غیر الطعام“ (۱۱، ۱۹۹)۔ اسی طرح علامہ نور شاہ کشمیری انوار محمود شرح ابوداؤد میں فرماتے ہیں: ”وقال مالک بن أنس۔ ما عدا الماکول والمشروب جائز أن یباع قبل أن یقبض“ (۲، ۲۲۸)۔ علامہ نووی نے مالکیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے کہا ہے: ”وقال مالک: لا یجوز فی الطعام ویجوز فیما سواہ۔ ووافقہ کثیر ون“ (ص ۵)۔ اسی طرح ”فیض الباری“ میں ہے: ”قال مالک: لا یجوز فی الطعام ویجوز فیما سواہ“ (۳، ۲۲۲)۔ اور فتح القدیر میں ہے: ”وقال مالک: یجوز جمیع التصرفات من بیع وغیرہ قبل القبض إلا فی الطعام“ (۶، ۵۱۱)۔



ان کا حاصل یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے طعام کی تخصیص کر دی ہے۔ چنانچہ فتح القدر میں ہے: ”لأنه ﷺ خص الطعام بالنهي في حديث رواه مالك عن نافع عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه“ (اخرجه الشيخان ۶۵۱)۔

شافعیہ کا مسلک:..... شافعیہ کے نزدیک تمام اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے۔ خواہ وہ طعام ہو یا غیر طعام۔ چنانچہ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں: ”فقال الشافعي: لا يصح بيع المبيع قبل قبضه سواء كان طعاما أو عقارا أو منقولا أو نقدا أو غيره“ (۲۰۵)، اسی طرح فیض الباری میں ہے: ”فقال الشافعي: لا يصح سواها كان طعاما أو عقارا“ (۲۰۲۲)، خیال رہے کہ احناف میں امام محمدؒ بھی امام شافعیؒ کے ساتھ ہیں، چنانچہ ابن قدامہ کے حوالہ سے ”تکملة فتح الملہم“ میں ہے: ”قال الشافعي ومحمد بن الحسن من الحنفية: يحرم بيع كل شئ قبل قبضه طعاما كان أو غيره منقولا كان أو غيره“ (ص ۲۵۰)، اسی طرح امام زفر من الاحناف بھی اسی مسلک کے حامل ہیں۔ ”اوجز المسالك شرح مؤطا امام مالک“ میں ہے: ”زفر ومحمد والشافعي... لا يجوز طعاما أو غيره“ (۱۱، ۱۹۹)، ابن عقیل نے امام احمدؒ کا بھی یہ قول نقل کیا ہے۔ اور یہی قول صحابہ میں حضرت ابن عباس کا ہے: ”كذا في تكملة فتح الملهم: وهو ظاهر قول ابن عباس وهو رواية ابن عقيل عن أحمد“ (۱۰۲۵۰)۔

### شافعیہ کے دلائل:

”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه، قال ابن عباس: وأحسب كل شئ مثله۔ وفي رواية أخرى وأحسب كل شئ بمنزلة الطعام“ (مسلم)۔

”عن زيد بن ثابت أن رسول الله ﷺ نهي أن تبتاع السلف حتى تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم“ (ابو داؤد ۲۹۲)، ”فقد عمر هذا الحديث الحكم في سائر السلع ولم يقصره على الطعام“ (تكملة فتح الملهم ۲۵۲)، ”وعن حكيم بن حزام قلت يا رسول الله! إني أبتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي قال: يا ابن أخي لا تبعن شيئا حتى تقبضه“ (سنن كبرى ۵۰۲۱۲)۔

حنابلہ کا مسلک:..... حضرات حنابلہ اپنے بیشتر اقوال میں اسے طعام کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ چنانچہ ”تکملة فتح الملہم“ میں ہے: ”قال أحمد بن حنبل في أظهر روايته: إنما يختص النهي بالطعام، فلا يجوز بيعه قبل قبضه، ويجوز فيما سواه“ (۱۰۲۵۰)، امام احمد بن حنبل کے اظہر روایت میں ہے کہ نبی طعام کے ساتھ خاص ہے، لہذا اس کی بیع جائز نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کی جائز ہوگی۔ حنابلہ احادیث میں واقع شدہ لفظ طعام کی قید سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صرف طعام کے ساتھ خاص کرتے ہیں، باقی دیگر اشیاء میں قبل القبض تصرف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ”كذا في التكملة: استدلال الحنابلة بحديث الباب على أن النهي مقصور على الطعام لأن النبي ﷺ نص فيه الطعام“ (۱۰۲۵۱)، حنابلہ کہتے ہیں کہ نبی کے باب میں جو احادیث وارد ہیں وہ نبی طعام کے ذکر کے ساتھ خاص ہیں، لہذا طعام ہی پر منحصر رہیں گی۔

### قبضہ کے سلسلے میں دیگر ائمہ کی رائے:

ما قبل میں قبضہ کے سلسلے میں ائمہ اربعہ کے مسلک کا بیان تھا، اب ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر حضرات کے اقوال کا ذکر:

قبضہ کے سلسلے میں امام بخاری کے یہاں بہت وسعت ہے۔ وہ بیع و شراء میں قبضہ کی کسی نوعیت خاص کے قائل نہیں ہیں۔ تحقق قبضہ کے سلسلے میں ان کے یہاں بہت وسعت ہے۔ فیض الباری شرح بخاری میں علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ امام بخاری کا مسلک لکھتے ہیں:

”وأما عند البخاري فلا يشترط عنده هذا ولا ذلك بل القبض عنده أمر منهما بأن المشتري لو أراد له لم يمنعه عنه البائع وإن بقي المبيع مشغولا بقبضه في الحالة الراهنة فكان القبض يحصل عنده بمجرد الإيجاب والقبول ولا يحتاج بعد ذلك إلى أمر آخر يسمي قبضا... إذا علمت هذا فاعلم أنه يعلم من تراجم البخاري أن القبض عنده

لا يحتاج إلى التخلية ولا إلى النقل... وإن تصرف المشتري يصح عنده قبل قبض المبيع بمعنى النقل“۔۔۔ عبارت مذکورہ سے بالکل صاف واضح اور عیاں ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک مشتری کے تصرف کرنے کے لئے صرف ایجاب و قبول کا ہونا کافی ہے، قبضہ کی قسم کا پایا جانا ضروری نہیں۔ لہذا قبضہ سے پہلے مشتری کسی قسم کا بھی تصرف کرے تو جائز ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قبضہ کے مفہوم میں امام بخاری کے یہاں بہت توسع اور عمومیت ہے۔ اس کے برخلاف حضرات شوافع کے یہاں کہ ہر شے میں قبضہ ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ کشمیری لکھتے ہیں:

”فأصيق المذاهب فيه مذهب الشافعي وأوسعها مذهب البخاري“۔ حضرات شافعیہ کا مذہب اس بارے میں تنگ ہے، امام بخاری کا بہت وسیع۔ عثمان البتی کے نزدیک تو بیع میں قبضہ کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ تمام تصرفات قبل القبض جائز قرار دیتے ہیں بیع میں بھی۔ اسی طرح ”تکملہ فتح الملہم“ میں ہے: ”قال عثمان البتي يجوز بيع كل شيء قبل قبضه“ (۱، ۳۵۰)۔ ابن عبدالبر مالکی نے اس قول کو سنت و اجماع کے خلاف قرار دیا ہے۔ چنانچہ تکملہ فتح الملہم میں ہے: ”هذا قول مردود بالسنة والحجة المجمع على الطعام“ (۱، ۳۵۰)۔ عثمان البتی کا قول سنت اور اجماع سے مردود ہے کہ وہ طعام کی بیع قبل القبض جائز قرار دیتے ہیں۔ حسن بصری، حکم، سعید بن مسیب، حماد، اوزاعی، امام احمد اور اسحق راہویہ اس امر کے قائل ہیں کہ مکملی اور موزونی اشیاء کا تو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہیں، البتہ اس کے علاوہ تمام اشیاء کا فروخت کرنا درست ہے (اعلاء السنن ۲۲۷/۱۳)۔

یہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلے میں چار مشہور مسلک ہیں۔ صاحب ”اوجز المسالك“ نے اس سے زائد اقوال ذکر کئے ہیں۔

۶۔ اگر ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ لیکن فیکٹری سے خرید ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا ہے، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار نمبر ۲ یعنی مشتری دوم کو روانہ کر دیتا ہے۔ اور ان کے درمیان یہ معاملہ طے پاتا ہے کہ مال روانہ ہونے کے بعد مشتری ثانی کے پاس پہنچنے سے قبل مال ہلاک ہو جائے تو اس کی ذمہ داری نہ بائع (فیکٹری) پر نہ مشتری ثانی پر، بلکہ مشتری اول پر عائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہ مال مشتری ثانی کے پاس پہنچنے سے قبل مشتری اول کے ضمان میں رہا۔ جب ضمان میں رہا تو ”رجح مالہ یضمن“ میں داخل نہ ہوا۔ گو اس مشتری کا قبضہ حسی نہ ہوا۔ مگر قبضہ معنوی اور حکمی کے پائے جانے کی وجہ سے اس کا فروخت کرنا درست ہوا کہ نہیں۔ ذیل میں اس مسئلہ کو فقہی روشنی میں حل کیا جاتا ہے۔ اولاً ضمان کا مفہوم ذکر کیا جاتا ہے، پھر قبضہ حسی اور حکمی کے احکام ذکر کئے جاتے ہیں۔

ضمان کا مفہوم اور ضمان کے پائے جانے کی شکل:

کسی شے کے ضمان میں آنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کی تحویل اور اس کی قدرت انتفاع میں آجائے، چنانچہ ضمان کی تعریف کرتے ہوئے علامہ وہب زحلی نے ”لفقہ الاسلامی وأدلته“ میں لکھا ہے: ”هو ما كان فيه القابض مسئولاً عن المقبوض تجاء الغير فيضمنه إذا هلك عنده“ (۴، ۲۲۱)۔ مطلب یہ کہ قابض کی مقبوض کے متعلق ذمہ داری عائد آجائے۔ اور مقبوض کے متعلق سوال و جواب اسی پر عائد ہو۔ مثلاً ٹیکس خرچہ وغیرہ۔

خیال رہے کہ عرف کے اعتبار سے اور مروجہ قانون اور عمل کے اعتبار سے جب مشتری نے ایجاب و قبول کر لیا، ثمن کی تعیین، بیع کا افراز ہو گیا تو اب ساری ذمہ داری مشتری پر عائد ہوگی۔ کرایہ، محصول، بیع کا ٹیکس، راستہ کا ٹیکس سب اس پر عائد ہوگا۔ عرفاً بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں مشتری کا مال ہے، بائع کا مال نہیں ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ مشتری کے ضمان میں آ گیا۔ اور اب اس کا بلا قبضہ حسی کے فروخت کرنا ”رجح مالہ یضمن“ میں داخل نہ ہوگا۔ مگر ہم جب ضمان کے شرعی مفہوم پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ضمان میں داخل ہونے کا کیا مفہوم ہے اور بیع کا ضمان میں شمار کب ہوتا ہے، تو احادیث اور آثار صحابہ سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بغیر قبضہ کے ضمان میں داخل نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ ”اعلاء السنن“ میں ہے: ”باب يدخل المبيع في ضمان المشتري بالقبض ولا يدخل في ضمانه قبل القبض...“ اس کے بعد حضرت عثمان اور عبدالرحمن بن عوف کے درمیان پیش آمدہ واقعہ سے استنباط کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وفيه دلالة على اتفاق الصحابة على أن المبيع لا يدخل في ضمان المشتري قبل قبضه... سواء كان مكيلاً أو موزوناً أو غيرهما“ (۱۲، ۲۵۳)۔ مطلب یہ ہے کہ مشتری کا ضمان میں داخل ہونا قبضہ کرنا ہے۔ قبضہ میں ضمان کا مفہوم ہے۔ اسی طرح حسن بصری کے ایک اثر سے استدلال کیا گیا ہے۔ ”عن الحسن انه سئل عن رجل ابتاع من رجل طعاماً والطعام في بيت، فأمر به أن يغلق ويدفع المفتاح إليه حتى يستوفيه فأحرق البيت مما فيه من مال قال: هو من صاحب الطعام من أجل أنه لم يستوفيه“۔ دیکھئے اس واقعہ میں بائع نے تخلیہ اور تمکین کر دیا، کنجی دے دی کہ وہ اپنا مال لے لے، تمکین اور تحویل کی صفت پائی گئی مگر اس نے اپنی تحویل میں حنا نہیں



لیا تھا کہ وہ جل گیا، اس پر حسن بصریؒ نے بائع کا مال ہلاک قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ استیفاء اور قبضہ ہی سے ضمان میں داخل ہوتا ہے۔ ہاں اگر قبضہ سے مراد قبضہ حکمی لیا جائے تو پھر ضمان میں آجائے گا۔ اور یہاں حسن بصریؒ کے سوال میں جو صورت مذکور ہے اس میں افزائے یعنی بیع غیر بیع سے ممتاز ہو کر تحویل اور تمکین میں جانا نہ پایا گیا۔ اس لئے اس سے قبضہ حکمی کا ثبوت نہ ہونا ہمارے لئے کوئی حرج نہ پیدا کرے گا۔ قبضہ حکمی پائے جانے کی صورت میں ضمان میں داخل ہو جائے گا۔ اور اس کا خریدار نمبر ۲ سے فروخت کرنا جائز ہوگا۔

**قبضہ حکمی اور اس سے قبضہ کا ثبوت:**

ما قبل قبضہ کی شرعی صورتوں میں یہ بحث مکمل طور پر آچکی ہے کہ قبضہ حکمی کو بھی شریعت نے قبضہ مانا ہے۔ اور قبضہ صرف حسی میں منحصر نہیں۔ چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں: ”وبالجمله أن القبض في المبيع والهبة والرهن يتحقق عندنا بالتخلية والمكنة على القبض ولا يحتاج الى القبض الحسي والنقل“۔ پھر اس کی توضیح ایک جزیئہ سے بھی بخوبی ہو جاتی ہے: ”قالوا: إنه باء فرسا في الصحراء فإن كان المشتري يستطيع أن يقبضه بدون إعانة غيره تحقق القبض، فكأنهم نظروا فيه إلى المكنة فقط۔ وأوها كالقبض۔ وقالوا: إنه لو باء دارا أو صندوقا وسلم مفاتيحه فهو قبض“ (۲۰۶)۔

اولاً تو شاہ صاحب نے قاعدہ کلیہ بیان کیا کہ قدرت اور تمکین کا پایا جانا قبضہ ہے۔ حساً سے اپنے قبضہ اور ید میں کرنا ضروری نہیں۔ اور اس کو فقہاء کے کلام سے ثابت کیا کہ دیکھئے اگر جنگ میں موجود گھوڑے کو بیچا اور مشتری بغیر کسی دوسرے کی امانت کے اسے حاصل کر لے تو گویا قبضہ ہو گیا، اسی طرح کوئی بڑا بکس فروخت کیا اور اس کی کچی حوالہ کردی تو قبضہ ہو گیا۔ ظاہر ہے یہاں صرف قدرت اور تمکین ہی تو پائی گئی پھر بھی فقہاء نے اسے قبضہ تسلیم کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبضہ حکمی بھی موثر ہے۔ فقہاء کرام کی بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ حکمی کے شرعاً معتبر ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔ چنانچہ ”فتاویٰ قاضی خاں“ میں ہے:

”قال أبو حنيفة: التخلية بين المبيع والمشتري تكون قبضا بشرائط ثلاثة، أحدها: أن يقول البائع: خلعت بينك وبين المبيع فاقبضه، ويقول المشتري: قد قبضت... والثاني أن يكون البائع بحضرة المشتري بحيث يصل إلى أخذه من غير مانع، الثالث أن يكون المبيع مفرزا غير مشغول بحق الغير“ (خانیہ علی هامش الہندیہ ۲۰۵۸) مطلب یہ ہے کہ اولاً بائع تخلیہ اور تمکین دے دے، مشتری قبول کر لے، علامہ شامی نے لکھا ہے کہ لفظ خلیت کوئی ضروری نہیں، بلکہ اذن و اجازت مراد ہے۔ ثانیاً کسی رکاوٹ کے بغیر مشتری اس پر قبضہ کر سکے۔ ثالثاً بیع غیر بیع سے ممتاز اور الگ کر دی جائے۔ اس عبارت کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے طریقہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بائع کیش میمو، رسید اشتراء حوالہ کر دے، مشتری یا اس کا وکیل اسے قبول کر کے قبضہ کر لے۔ مال بیع موجود ہو کہ مشتری اگر فوراً اپنے انڈر میں کرنا چاہے تو کر لے یا کسی کو حوالہ مثلاً ٹرانسپورٹ وغیرہ کرنا چاہے تو کر لے۔ اور خریدار ہوا مال بالکل الگ ہو مشترک نہ ہو، یعنی اسے چھانٹ دیا ہو۔ اس کا مال الگ کر دیا گیا ہو ایسے طور پر کہ اگر اشارہ کیا جائے تو اشارہ صحیح واقع ہو جائے۔ اور کہنے والا کہہ سکے یہ مال فلاں کا ہے۔ تو اس صورت میں یہ مال قبضہ حکمی میں داخل ہو کر فروخت کرنا جائز ہو جائے گا۔

لہذا اگر یہ شکلیں پائی جا رہی ہیں تو خریدار نمبر (۱) کے ضمان اور قبضہ شرعی ہی پائے جانے کی وجہ سے فروخت کرنا اور نفع لینا جائز ہوگا، اور ”ربح مالہ یضمن“ میں داخل نہ ہوگا۔ خیال رہے کہ عرف اور ماحول میں بھی یہ مال مشتری کا مثل مقبوض کے سمجھا جاتا ہے، چونکہ کرایہ، ٹیکس، قانونی سوال و جواب یہ سب اسی مشتری سے متعلق ہوتا ہے۔ لہذا ”الفقه السنی“ کے مولف کے مطابق عرفاً قبضہ پائے جانے کی وجہ سے اس کا فروخت کرنا شرعاً درست ہوگا۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت کی صورت میں جس میں مال مشتری تک پہنچنے سے قبل ضائع ہو جائے تو بائع ضامن نہیں ہوتا ہے۔ یہ اس وقت درست ہے جبکہ مشتری کے ضمان میں وہ خریدار ہوا مال قبضہ کے ذریعہ سے آجائے، خواہ قبضہ حسی نہ ہو حکمی ہی سہی، ما قبل میں قبضہ حکمی اور اس کی جو شرطیں بیان کی گئی ہیں اگر اس کے مطابق ہو تو بائع کا ضامن نہ ہونا درست ہے۔

پھر اس شخص کے مال کی وصولیابی سے قبل کسی تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دینا قبضہ شرعی سے قبل فروخت کر دینا ہے جو درست نہیں۔ پھر مال کی ہلاکت اور ضائع ہونے کی صورت میں مشتری اول کا ضامن نہ ہو کہ مشتری ثانی جو تیسرا خریدار ہے ضامن ہونا بلا قبضہ شرعی کے ضامن بنانا ہے جو درست نہیں، یہ صورت شرعاً جائز نہیں، مشتری ثانی کا فروخت کرنا جبکہ مال سمندر میں ہے جو حالت غرر ہے، قبضہ شرعی اور بیع کے درست نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں کہ ”ربح مالہ یضمن“ ہے، جو تیسرے خریدار سے خریدنا اور بلا قبضہ شرعی کے ضامن ہونا، بیع کیا تماری گویا صورت ہے، جو شرعاً جائز نہ ہوگی۔ ☆☆☆



## قبل القبض بیع و شراہ کی شرعی حیثیت

مولانا مجیب الغفار اسعدؒ

۱۔ شرع اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض ناجائز ہے، اور اس کا شمار بیوع فاسدہ میں ہے، جیسا کہ تصریحات ذیل سے واضح ہے، فتح القدیر میں ہے:

” (لأن فيه غرر انفساخ العقد) الأول (على اعتبار هلاك المبيع) قبل القبض فيتبين حينئذ أنه باع ملك الغير بخير اذنه وذلك مفسد للعقد“ (۵، ۲۶۵)۔

(”بیع قبل القبض“ اس لئے ناجائز ہے کہ اس کے اندر قبضہ سے پہلے بیع کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں عقد اول کے فسخ ہو جانے کا خطرہ اور کھٹکا ہے، اگر ایسا ہوا تب تو کھل کر یہ بات سامنے آجائے گی کہ بیع قبل القبض کرنے والے نے دوسرے کا مال بدون اس کی اجازت کے بیچ دیا، اور ظاہر ہے کہ یہ مفسد عقد ہے)۔

”عناہ“ میں ہے: ”فإن المقصود من البيع الربح، و ربح ما لم يضمن منهي عنه شرعاً والنهي يقتضي الفساد، فيكون البيع فاسداً قبل القبض؛ لأنه لم يدخل في ضمانه كما في الإجارة“ (عناہ علی ہامش فتح القدیر ۵، ۲۶۵)۔

بیع سے مقصود نفع کمانا ہوتا ہے، اور جو چیز آدمی کے ضمان میں نہ آئی ہو اس سے نفع کمانا شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ اس سے نہی وارد ہوئی ہے، اور کسی چیز سے نہی شرعی اس کے فساد کو مقتضی ہوا کرتی ہے، اس کے تحت بیع قبل القبض فاسد ہوگی، کیونکہ بیع مشتری کے ضمان میں داخل نہیں ہے۔

### ۲۔ شرع اسلامی میں قبضہ کی حقیقت:

قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنے کی ممانعت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے مختلف احادیث مختلف الفاظ و تعبیرات کے ساتھ مروی ہیں، لیکن چونکہ قبضہ کی مختلف اور گونا گوں صورتیں تھیں، جیسا کہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں سے واضح ہے، اس لئے اس کی کوئی خاص صورت کتاب و سنت میں بطور تعین و حصر کے نہیں فرمائی گئی۔

احادیث میں قبضہ کی جو صورتیں مذکور ہیں، مثلاً نقل و تحویل، ”ایواء الی الرجال“ وغیرہ، وہ سب چونکہ غالب احوال پر محمول ہیں، قبضہ کیلئے لازمی اور ضروری شرطیں نہیں، کما قال الحافظ ”إن الأيواء إلى الرجال خرج مخرج الغالب“ (فتح الباری ۴، ۲۹۲)۔ اس لئے ان ساری صورتوں کے انضباط اور انتظام کے لئے ایک ایسے امر کلی کے بیان کی ضرورت تھی جس کے اندر قبضہ و دخل کی تمام صورتیں آجائیں، سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمادیا جس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آدمی شرعاً اسی چیز کو بیچنے اور فروخت کرنے کا مجاز ہے جو اس کے حرز و ضمان میں داخل ہو چکی ہو، ورنہ اس کا بیچنا درست نہ ہوگا، اور اس بیع کا جو نفع ہوگا وہ ”ربح مالہ یضمن“ کے تحت ناجائز ہوگا۔

”عن عبد الله بن عمرو قال: نهي النبي ﷺ عن ربح مالہ یضمن“ (أخرجه الترمذی) فتح الباری ۴، ۲۹۲)۔

(عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیز سے نفع کمانے سے منع فرمایا ہے جو آدمی کے حرز و ضمان میں نہ آئی ہو)۔

اسی کے معنی میں حضرت حکیم بن حزامؒ کی وہ حدیث بھی ہے۔ جس کی اصحاب سنن نے تخریج کی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

”قلت: يا رسول الله يأتيني الرجل فيسألني البيع ليس عندي، أبيع منه فممن أبتاعه له من السوق فقال: لا تبع ما ليس عندك“ (فتح الباری ۴، ۲۹۱)۔ (حکیم بن حزام کہتے ہیں ”میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایک شخص میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے ایسی چیز فروخت کرنے کی فرمائش کرتا ہے جو ابھی میری ملک اور ضمان میں نہیں ہے تو کیا میں اس وقت اس کے ہاتھ وہ شے بیچ دوں اور پھر بازار سے وہی چیز خرید کر اس کے حوالے کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو چیز تمہارے پاس، یعنی تمہاری ملک اور ضمان میں نہ ہو اسے فروخت نہ کیا کرو)۔

دارالعلوم ماٹلی والا، بھروج، گجرات۔

ان احادیث کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ کی شرعی حقیقت متعین فرمادی ہے، اسی بناء پر مولانا محمد تقی عثمانی نے قبضہ کی تعریف ضمان ہی سے کی ہے، لکھتے ہیں:

”وأما القبض فهو أن يأتي الشيء في حرزه و ضمانه كما يظهر من كلام الحافظ في الفتح“ (تكملة فتح الملهم ۱۰۲۵۰)۔

یعنی قبضہ کی حقیقت، جیسا کہ ”فتح الباری“ کے اندر حافظ کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے، یہ ہے کہ ”چیز آدمی کی ضمانت اور حفاظت میں آجائے“۔

اس سے صاف واضح ہے کہ قبضہ اور ضمان کا مفہوم ایک ہے، لہذا جو کسی آدمی کے ضمان میں ہو، یعنی جس کے نفع نقصان کا وہ ضامن ہو وہ اس پر شرعاً قابض مانا جائے گا اور اس کا اسے بیچنا از روئے شرع صحیح و درست ہوگا، گو نقل و حمل اور حسی قبضہ نہ ہو۔

علامہ انور شاہ کشمیری کی رائے:

حضرت علامہ فرماتے ہیں: واضح ہو کہ شواہح کے یہاں نقل و تحویل کے بغیر قبضہ کا تحقق نہیں ہوتا اور ہمارے یہاں بیع اور مشتری کے درمیان تخلیہ سے قبضہ پالیا جاتا ہے، لیکن تخلیہ سے کیا مراد ہے؟ اور اسکی حقیقت کیا ہے؟ سو یہ ایسی چیز ہے جس کا انضباط ذرا مشکل ہے، ہاں جزئیات پر غائر نظر ڈالنے سے کسی قدر اس کے مفہوم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، میرے نزدیک تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع سے اپنی ملکیت کے علائق کو اٹھالے اور اسے قبضہ پر قابو دیدے، اور یہ بات کبھی قول کے ذریعہ، کبھی فعل کے ذریعہ، اور کبھی قرآن کے ذریعہ پائی جاتی ہے، اور ناطفی کی اجناس میں جو یہ شرط لگائی ہے کہ بائع زبان سے کہدے کہ میں نے بیع اور مشتری کے درمیان روک اٹھادی ہے، یا اسی کے ہم معنی کوئی بات کہے، سو میرے نزدیک یہ کچھ ضروری نہیں ہے، اور میرے علم میں ناطفی کے علاوہ کسی اور نے یہ شرط نہیں لگائی ہے، اب میں آپ کے سامنے چند جزئیات رکھتا ہوں تاکہ بات مزید واضح ہو جائے، مسئلہ: فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر صحرا کے اندر کسی نے گھوڑا بیچا اب اگر مشتری اس پوزیشن میں ہے کہ بدون کسی تعاون کے قبضہ کر سکتا ہے تو قبضہ مان لیا جائے گا، دیکھئے فقہاء نے یہاں صرف مشتری کے تمکون کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے قبضہ کے حکم میں مان لیا (فیض الباری ۲۰۶۳)۔

فقہاء کا قول ہے کہ اگر کسی نے گھریا صندوق بیچا اور اس کی کنجیاں مشتری کے حوالے کر دیا تو یہ قبضہ ہو گیا، حاصل کلام یہ کہ بیع، ہبہ، رہن میں ہمارے نزدیک قبضہ تخلیہ اور قبضہ پر قدرت سے ہو جاتا ہے اس کیلئے نقل و حمل اور حسی قبضہ کچھ ضروری نہیں (فیض الباری ۲۰۶۳)۔

تخلیہ کے بارے میں ایک ضروری وضاحت:

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”وحاصله أن التخلية قبض حکما لو مع القدرة عليه بلا كلفة. لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفعة المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، ونحو بقرة في مرعى، فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض، وفي نحو ثوب، فكونه بحيث لو مديده تصل إليه قبض، وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض“ (رد المحتار ۲۰۵۹)۔

(حاصل یہ ہے کہ بدون کلفت و مشقت کے قبضہ پر قدرت اور تمکن کے باوجود بھی تخلیہ کو حکماً قبضہ قرار دیا جائے گا، لیکن تخلیہ کی نوعیت ہر جگہ یکساں نہیں ہوگی، بلکہ بیع کی حالت اور پوزیشن کے اعتبار سے اس کے اندر اختلاف ہوتا رہتا ہے، یعنی اس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے، مثلاً ایک کوٹھری میں گے ہوں ہے، بائع نے اسے بیچ دیا بعدہ اس کی کنجی مشتری کے حوالے کر دی ایسی صورت میں اگر مشتری آسانی تالا کھول سکتا ہے تو قبضہ مان لیا جائے گا، یا مثلاً گائے بیچی گئی جو چراگاہ میں چر رہی ہے تو اگر وہ اتنی قریب ہے کہ نظر آئے اور اس کو اشارہ سے بتلایا جاسکے تو یہ قبضہ ہو گیا، اسی طرح اگر کپڑا بیچا گیا اور اتنے فاصلہ پر ہیکہ مشتری اگر ہاتھ بڑھائے تو پا جائے تو یہ بھی قبضہ ہو گیا، اگر گھوڑا یا پرندہ کی بیچ ہوئی جو کوٹھری میں بند ہیں ایسی صورت میں دیکھنا یہ ہے کہ مشتری اسے اگر بدون کسی کی مدد حاصل کئے ہوئے پکڑ سکتا ہے تو اسے قبضہ مان لیا جائے گا)۔

حاصل بحث:

الحاصل قبضہ یہ ہے کہ چیز آدمی کی حفاظت اور ضمان میں آجائے، قبضہ کی یہ تعریف اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کو شامل ہے، فقہاء کے نزدیک قبضہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) قبضہ حقیقہ جس کو قبضہ حسی بھی کہتے ہیں (۲) قبضہ حکماً، قبضہ حکمی اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کے اندر تخلیہ سے ہو جاتا ہے، اور تخلیہ میں ہاتھ کا

قبضہ یعنی قبضہ حسی شرط نہیں بلکہ روک دور کر کے قابو دینا بھی قبضہ ہے، یعنی بائع اور مشتری کے درمیان اس طرح روک اٹھا دے کہ مشتری اس کے قبضہ کرنے پر قادر ہو جائے اور کوئی مانع نہ رہے، چنانچہ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ موانع کا درمیان سے اٹھا دینا بائع جائز میں قبضہ ہو جاتا ہے مگر بیع فاسد میں رد و روایتیں ہیں اور صحیح یہ ہے کہ اس میں بھی قبضہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ کے جواب میں عرض ہے کہ ہمارے نزدیک اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ دونوں میں تخلیہ کے ذریعہ قبضہ کا تحقق ہو جاتا ہے، البتہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے، ان کے یہاں جو چیز ہاتھ میں لی جاسکتی ہے، جیسے دراہم، دنانیر، کپڑے وغیرہ ان کا قبضہ ہاتھ میں لینے ہی سے ہوگا، اور غیر منقولہ کے اندر قبضہ تخلیہ سے ہوگا اور جو چیزیں عادتاً ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاتی ہیں، جیسے لکڑیاں، اناج، حیوانات، تو ان پر قبضہ اس وقت ہوگا، جبکہ انہیں ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جس کا بائع سے کوئی علاقہ نہ ہو، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان اشیاء میں بھی تخلیہ سے قبضہ ہو جائے گا، کمافی (فتح الباری ۴/۲۹۲)۔

۴۔ کے جواب میں عرض ہے کہ بیع قبل القبض کی ممانعت سے متعلق احادیث تعبدی نہیں، بلکہ معلول بالعلتہ ہیں اور نہ ہی کی علتیں دو ہیں (۱) ربح الملم یضمن کا لزوم ہے جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

”حدیث عبد اللہ بن عمرو دل علی أن العلة فی النہی عن بیع المبیع قبل القبض ہی أنه یستلزم ربح مالہ یضمن نصہ ما یأتی: أن رسول اللہ ﷺ قال: لا یحل سلف و بیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح مالہ یضمن، ولا بیع ما لیس عندک“ (أخرجه الترمذی فی باب کراهة بیع ما لیس عنده وقال هذا حدیث حسن صحیح)۔

(عبد اللہ بن عمروؓ کی حدیث اس امر پر دلیل ہے کہ بیع قبل القبض سے ممانعت کی علت ”ربح الملم یضمن“ ہے، یعنی اس چیز سے نفع اٹھانا لازم آتا ہے جو ابھی ضمان (قبضہ) میں نہیں آئی اور ایسا نفع ناجائز ہے اور جو عقد امر ناجائز کو مستلزم ہو وہ بھی ناجائز ہوتا ہے)۔

(۲) غرر انفساخ العقد، یہ علت صاحب ہدایہ نے بیان فرمائی ہے، مطلب یہ ہے کہ بیع قبل القبض اس لئے ناجائز ہے کہ اس کے اندر قبضہ سے پہلے بیع کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں عقد اول کے فسخ ہو جانے کا خطرہ اور کھٹکا ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ اس کے تحت لکھتے ہیں: ”والحدیث معلول بہ ای بغرر الانفساخ“، یعنی حدیث میں ممانعت غرر انفساخ کی وجہ سے ہے اور اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ جو تصرفات غرر انفساخ سے متاثر نہیں ہوتے وہ بیع کے اندر قبل القبض صحیح ہیں، جیسے غلام کو قبل القبض آزاد کرنے کا تصرف، اور بیع کو قبل القبض نکاح میں مہر مقرر کر دینے کا تصرف، یہ سب صحیح اور نافذ ہیں، غلام آزاد ہو گیا تو ہو گیا غلام کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں یہ تصرف باطل نہیں ہوتا اسی طرح اگر مہر معین ہلاک ہو گیا تو شوہر پر اس کی قیمت لازم ہوگی، لیکن اس کی وجہ سے نکاح ہی فسخ ہو جائے ایسا نہیں ہو سکتا (مکملہ فتح الملہم ۱/۳۵۳)۔

۵۔ کے جواب میں عرض ہے کہ احادیث نہی تعیم و تخصیص کے اعتبار سے فقہاء کے اجتہادات مختلف ہیں، اس سلسلہ میں چند مشہور اقوال مع وجوہ و دلائل کے ذکر کئے جاتے ہیں۔

### قول اول:

یہ کہ بیع قبل القبض ہر چیز کے اندر جائز ہے، یہ قول عثمان البتی کا ہے، یہ قول ناقابل التفات، شاذ، متروک اور مردود ہے۔

علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں: ”یہ قول، احادیث بالخصوص اناج کے اندر بیع قبل القبض کی ممانعت کے سلسلہ میں اجماعی حجت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے، شاید انہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ”من ابتاع طعاما فلا یبعہ حتی یستوفیہ“ کا علم نہ ہوا ہوگا، اس لئے انہوں نے یہ بات کہہ دی، لیکن کچھ بھی ہو یہ قول ناقابل التفات ہے (کذافی المغنی لابن قدامہ ۴/۱۱۳)۔

قول ثانی: ..... اشیاء منقولہ، غیر منقولہ غلہ وغیرہ ہر چیز کی بیع قبل القبض بدون کسی استثناء اور تخصیص کے حرام ہے، یہ قول امام شافعیؒ، امام محمد بن الحسن اشیبانیؒ کا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ظاہر بھی یہی ہے، اور ایک روایت میں بواسطہ ابن عقیل امام احمدؒ سے بھی یہی بات منقول ہے، کمافی المغنی۔



## دلائل:

(۱) ”عن ابن عمر قال: ”ابتعت زيتاني السوق، فلما ستوجبه لقيني رجل فأعطاني به رجحا حسناً، فأردت أن أضرب على يديه فأخذ رجل من خلفي بزراعي، فالتفت فإذا زيد بن ثابت، فقال: لا تبعه حيث ابتعته حتى تحوزه إلى رحلك فإن رسول الله ﷺ هي أن تباع السلع حيث تباع، حتى يحوزها التجار إلى رحالهم“ (ابوداؤد رقم الحديث: ۳۲۵۶)۔ (سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت موجود ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے بازار میں روغن زیتون خریدا، جب بیع لازم ہوگئی تو ایک صاحب وہیں پر ملے اور اس کا اچھا نفع دے کر مجھ سے خریدنے کیلئے تیار ہو گئے، میں نے ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ اس آدمی سے ہاتھ ملا لوں اور بیع کی پکی بات کر لوں کہ اتنے میں پیچھے سے ایک شخص نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، میں نے جوڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت زید بن ثابتؓ ہیں، کہنے لگے کہ بھائی! ایسا نہ کرو، جس جگہ تم نے خریدا ہے وہیں بیچنا درست نہیں، جب تک کہ اسے گھرنے پہنچا لو، سامان جس جگہ خریدا جائے وہیں اسے بیچ دیا جائے رسول اللہ ﷺ نے تاجروں کو ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے، تا آنکہ وہ اسے اپنی تحویل میں لے کر اپنے گھر اور ٹھکانے پر نہ پہنچالیں۔“

(۲) ”عن حكيم بن حزام قال: ”قلت: يا رسول الله! إني أبتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال: يا ابن أخي، لا تبين شيئاً حتى تقبضه“ (هذا اللفظ للبيهقي في سننه ۵۰۳۳) وقال: هذا إسناد حسن متصل“ و أخرجه أيضا ابن حبان في صحيحه“ (واحد في مسنده ۳۰۴۰۲)۔ (حکیم بن حزامؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں خرید و فروخت کرتا رہتا ہوں، میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے بھتیجے قبضہ کرنے سے پہلے کسی چیز کو آگے فروخت مت کرنا۔“

(۳) ”عن عبد الله بن عمرو أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم يضمن، ولا بيع ماليس عندك“ (أخرجه الترمذي في باب كراهية ما ليس عنده وقال: هذا حديث حسن صحيح)۔

(حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ قرضہ اور بیع کو جمع کرنا حلال نہیں اور نہ بیع میں دو شرطیں لگانا، اور نہ ایسی چیز کا نفع حاصل کرنا حلال ہے جو ابھی ضمان میں نہیں آئی، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

مندرجہ بالا احادیث عام ہیں اور ہر قسم کی بیع کو شامل ہیں، لہذا ان احادیث کے عموم پر نظر کرتے ہوئے قول ثانی کے اندر کسی طرح کا استثناء نہیں، بلکہ ہر ایک بیع کی بیع قبل القبض حرام ہے۔

قول ثالث:..... بیع کے صحیح ہونے کیلئے قبضہ کی شرط صرف طعام (غله) کی بیع کے ساتھ خاص ہے، طعام کے علاوہ دوسری اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہے، یہ قول امام احمد بن حنبلؓ کا ہے ”كما حققه ابن قدامه“۔

## دلائل:

(۱) ”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه، قال ابن عباس: وأحسب كل شيء مثله“ (أخرجه البخاري في البيوع باب ما يذكر في بيع الطعام والحكرة)۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ: حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے فرمایا کہ جو شخص غلہ بیچنے کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ قبضہ میں لانے سے پہلے فروخت نہ کرے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حکم غلہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ تمام چیزوں میں عام ہے۔

(۲) ”عن ابن عمر قال: ”كنت أبيع الإبل بالبقية بالدنانير وأخذ مكانها الورق وأبيع بالورق وأخذ مكانها الدنانير فأتيت النبي ﷺ فسألته عن ذلك، فقال: لا بأس به بالقيمة“۔ (حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں بقیع کے علاقہ میں اونٹ بیچا کرتا تھا، جب دنانیر کے بدلے بیچتا تو ان کی جگہ دراهم لے لیتا، اور بھی دراهم کے عوض فروخت کرتا تو ان کی جگہ دنانیر لے لیتا، میں نے حضور ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہو کر اس کے بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مالیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

”أخرجه أصحاب السنن الأربعة وأحمد و ابن حبان والحاكم من طريق سماك بن حرب عن سعيد بن جبير عن ابن عمر، ولم يرفعه إلا سماك بن حرب كما في التلخيص الحبير للحافظ“ (۲۰۲۵، ۲۱) باب القبض واحكامه۔

وجہ دلالت:

اس حدیث کی رو سے جب بیع کے ایک عوض (ثمن) کے اندر قبضہ سے پہلے تصرف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تو پھر دوسرے عوض (مبیع) کے اندر بھی قبضہ سے پہلے تصرف صحیح ہونا چاہئے، ہاں بیع جب غلہ ہو تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے، اس لئے کہ اس کو قبضہ سے پہلے بیچنا بصراحت منع ہے۔

نوٹ: قول ثانی کے اندر جو حدیثیں مذکور ہیں چونکہ وہ عام ہیں اور ہر قسم کی بیع کو شامل ہیں، اس لئے وہ حدیثیں ان کے خلاف حجت ہیں۔

قول رابع:..... بیع کی صحت کے لئے بیع پر قبضہ کی شرط صرف کیلی اور روزنی چیزوں کے ساتھ خاص ہے، ان چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی بیع میں قبضہ شرط نہیں، یہ قول امام مالک کا ہے۔

استدلال:..... ”بحديث ابن عمر مرفوعاً“ ”من اشترى طعاما بكييل أو وزن فلا يبعه حتى يقبضه“ (رواه احمد)۔ (حضرت ابن عمر کی مرفوعاً حدیث کے اندر ارشاد نبوی ہے کہ جو شخص غلہ خریدے کیل، یا وزن کے ذریعہ تو وہ اسے قبضہ سے پہلے نہیں بیچ سکتا)۔

قول خامس:..... زمین اور مکانات کے علاوہ باقی اشیاء میں آگے فروخت کرنے کے لئے بائع کا قبضہ ضروری ہے، یہ قول امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا ہے (کمانی فتح القدیر ۲۶۶/۵)۔

دلائل:

ان حضرات کی دلیلیں بعینہ وہی ہیں جو قول ثانی کے اندر مذکور ہو چکی ہیں بس فرق یہ ہے شیخین نے بر بناء درایت بیع قبل القبض سے ممانعت کی حدیثوں کا مصداق اشیاء منقولہ ہی کو قرار دیا ہے (۱) اعلیٰ السنن میں عقار کی بیع قبل القبض کے جواز پر حدیث بھی موجود ہے، لکھتے ہیں:

”ومما يدل بقول أبي حنيفة مارواه ابن أبي مليكة أن عثمان بن عفان من طلحة أرضا بالمدينة ناقلة بأرض له بالكوفة فقال عثمان: بعتك ما لم أرة، فقلت طلحة: إنما النظر لي لأني ابتعت مغيبا وأنت قد رأيت ما ابتعت فتحاكما إلى جبير بن مطعم فقضى على عثمان أن البيع جائز وأن النظر لطلحة؛ لأنه ابتاع مغيبا، رواه البيهقي بإسناد حسن، ويقتضى جواز بيع العقار قبل القبض فإن عثمان بن عفان باع أرضا له بالكوفة ولم يرها وهو ظاهر في أنه باعها ولم يقبضها فإن القبض يستلزم الروية حتما“ (۱۳، ۱۴۵)۔

اور امام شافعی وغیر ہم نے منقولہ وغیر منقولہ تمام مبیعات کو ان کا مصداق سمجھا ہے، شیخین کہتے ہیں کہ بیع کا دار و مدار چونکہ بیع ہی پر ہوتا ہے، اور مبیعات منقولہ میں ہلاکت کثیر الوقوع ہے، اس لئے غالب احوال کو دیکھتے ہوئے آگے فروخت کرنے کے لئے یہاں بائع کا قبضہ ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ بصورت ہلاکت بیع، عقد اول ہی فسخ ہو جائے اور پھر دوسرے کی ملک میں تصرف کرنا اور ایک ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا لازم آئے جو ابھی ضمان اور قبضہ ہی میں نہیں آئی ہے، اور یہ دونوں باتیں شرعاً ممنوع ہیں، اور جو چیز امر ممنوع کو مستلزم ہوا کرتی ہے وہ ممنوع ہوا کرتی ہے، اس لئے یہاں ”بیع قبل القبض“ کو ممنوع قرار دیا گیا، اور چونکہ اشیاء غیر منقولہ (گھر اور زمین) میں بیع کی ہلاکت شاذ و نادر ہے، اور نادر بمنزلہ معدوم کے ہوا کرتا ہے، اس لئے عام احوال میں بر بناء عدم فساد مذکور، آگے فروخت کرنے کیلئے یہاں بیع پر قبضہ کی شرط نہیں رکھی گئی، لیکن اگر یہاں بھی وہی فساد لازم آئے جس کا ذکر اوپر ہوا، مثلاً یہ کہ گھر، زمین دریا کے کنارے پر ہو اور سیلاب وغیرہ کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ غالب ہو تو ایسی صورت میں یہاں بھی فقہ حنفی کے اندر بیع قبل القبض جائز نہیں (کمانی فتح القدیر ۲۶۶/۵)۔

نوٹ:

سوال (۵) سے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات ”تکملہ فتح الملہم مفتی تقی عثمانی ۳۵۰، ۳۵۱، نیل الاوطار للشوکانی ۲۵۶/۵، اوجز المسالك للشيخ زكريا

۷۵/۵ سے ماخوذ ہیں۔

الحاصل ”بیع کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ بیع بائع، یا اس کے وکیل کے قبضہ میں ہو، پھر حنابلہ نے اس شرط کو طعام (غلہ) کی بیع کے ساتھ خاص کر دیا ہے، لہذا ان کے نزدیک طعام کے علاوہ دوسری اشیاء کی ”بیع قبل القبض“ جائز ہے، اور مالکیہ نے قبضہ میں ہونے کی شرط کو کیلی اور روزنی چیزوں کے ساتھ خاص کر دیا ہے، لہذا ان کے نزدیک کیلی اور روزنی چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی بیع میں قبضہ شرط نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام محمد بن حسن کے نزدیک بیع کا بائع کے قبضہ میں ہونا تمام مبیعات میں ضروری ہے، چاہے وہ طعام ہو، یا کیلی اور روزنی چیز ہو، یا زمین ہو، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک زمین کے علاوہ باقی اشیاء میں آگے فروخت کرنے کیلئے بائع کا قبضہ ضروری ہے (فتح القدیر لابن الہمام ۲۶۶/۵، المغنی لابن قدامة ۱۱۳/۳)۔

۶۔ کے جواب میں عرض ہے کہ یہ صورت جائز ہے۔

یہاں جواز کی صورت یہ سمجھ میں آئی کہ خریدار اول نے فیکٹری سے مال خریدا اور بیع کے بعد فیکٹری سے کہا کہ فیکٹری میرا خرید کردہ مال فلاں، یعنی خریدار دوم کے پتہ پر بھیج دے یہ عمل فیکٹری خریدار اول کی طرف سے وکالت کرتی ہے، اسلئے یہاں قبضہ اور ضمان پالیا گیا اور بیع جائز و درست ہوگئی۔

ردالمحتار میں ہے: ”ومن القبض مالو أودعه المشتري عند أجنبي أو أعاره وأمر البائع بالتسليم إليه“ (رد المحتار ۴۰۵۸)۔

۷۔ جواب میں عرض ہے کہ صورت مسئلہ میں بیع ناجائز ہے، یہاں بیع خریدار اول کے ضمان میں آئی ہی نہیں، اس لئے کہ بیع ضمان میں آتی ہے قبضہ حسی سے، یا تخلیہ (قبضہ حکمی) سے جو بائع، یا اس کے وکیل کی طرف سے پایا جائے، یا اس سے کہ خریدار نے بائع کو کسی کے پاس مال بھیجنے، یا سپرد کرنے کا وکیل بنا دیا ہو، یہاں یہ سب صورتیں مفقود ہیں، شرع میں مجرد عقد سے بیع ضمان میں نہیں آتی، لہذا ”رجح الملم يضمن“ کو مستلزم ہونے کی وجہ سے اس بیع کو ناجائز قرار دیا گیا، بیع کے ضمان میں آنے کی وجوہ مذکورہ کے بغیر کسی کو اس کا ضمان قرار دینا شرعاً غیر معتبر ہے بلکہ سراسر ظلم ہے، جب اس عقد کی بنیاد اول ہی صحیح نہیں تو جہاں تک بھی اس کا سلسلہ پہنچے گا سب ”بناء الفاسد علی الفاسد“ کی بنیاد پر فاسد قرار دیا جائے گا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی اس بیع کو، بیع قبل القبض ہی کی صورتوں میں شمار کیا ہے اور اس کے مفاسد پر بھی روشنی ڈالی ہے (مکملہ فتح الہمام ۱/۳۵۴)۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

مولانا ابوالحسن علیؒ

۱۔ بیع قبل القبض کے سلسلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف:

حنفیہ کی رائے:..... امام ابوحنیفہ کے نزدیک اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، اور غیر منقولہ جائیداد وغیرہ کی بیع قبل القبض جائز ہے۔

شافعیہ کی رائے:..... استقرار (قبضہ) سے پہلے بیع درست نہیں ہے، خواہ اشیاء منقولہ ہو یا غیر منقولہ، احناف میں سے امام محمد کا بھی یہی مذہب ہے۔

مالکیہ:..... صرف طعام کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، اور اس کے علاوہ کی بیع جائز ہے۔

حنابلہ:..... مکملی اور موزونی اور معدودی اشیاء کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، اور اس کے علاوہ میں جائز ہے۔

مولانا ظفر احمد تھانوی نے شرح مہذب کے حوالے سے اختلاف ائمہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۷۷)۔

شافعیہ کے نزدیک یہ بیع باطل ہے جیسے کہ امام نووی کی عبارت: "وقد ذکروا أن مذهبنا بطلانہ مطلقاً" کے الفاظ سے ظاہر ہے "الفقہ علی المذہب

الاربعۃ" میں بھی باطل ہی کا لفظ ہے: "فإذا اشترى شيئاً منقولاً كان أو غيره ولم يتسلمه ثم باعه وقع البيع باطلاً" (۲۰۳۳)۔

مگر حنفیہ نے اس کو بیع فاسد میں شمار کیا ہے۔

## ۲۔ قبضہ کی حقیقت:

فقہاء حنفیہ کے نزدیک قبضہ کا مفہوم وسیع ہے، کیونکہ عند الاحناف قبضہ کا حاصل صرف تخلیہ ہے، اور تخلیہ کا حاصل یہ ہے کہ بیع اور مشتری کے درمیان باعتبار حقیقت، یا باعتبار عرف و عادت ایسا کوئی مالع اور حامل نہ ہو جو مشتری کو عرفی قبضہ کرنے سے اور اس میں تصرف کرنے سے روک سکے، بلکہ بیع اس حال میں ہو کہ مشتری اگر اس میں تصرف کرنا چاہے تو آزادی کے ساتھ اس میں تصرف کر سکے اگرچہ بیع ابھی بائع کے پاس ہی موجود ہو۔

"وأما تفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً" (بدائع ۵۰۲۲۳)۔

اور دوسری جگہ لکھا ہے: "لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة" (بدائع ۵۰۱۲۸)۔

"ولهذا كانت التخلية تسليماً وقبضاً فيما لا مثل له" (بدائع ۵۰۲۲۳)۔

ایک ٹی بائع کے پاس ہونے کے باوجود اس پر مشتری کا قبضہ شمار کیا جاسکتا ہے جبکہ معاملہ ہو چکا ہو اور تخلیہ بھی ہو، بائع میں ایک مسئلہ لکھا ہے: "ولو اشترى

من إنسان كذا بعينه و وقع غرائره وأمره بأن يكيل فيها ففعل صار قابضاً سواء كان المشتري حاضراً أو غائباً؛

لأن المعقود عليه معين وقد ملكه المشتري بنفس العقد فصاح أمر المشتري؛ لأنه تناول عيناً هو ملكه فصاح أمره وصار

البائع وكيلاً له وصارت يده يد المشتري وكذلك الطحن إذا طحنه البائع بأمر المشتري صار قابضاً" (بدائع ۵۰۲۲۷)۔

اور ”البحر الرائق“ میں ہے: ”و ذكر في الذخيرة إذا اشترى ما هو أمانة في يده من ودیعة أو عارية، فإنه لا يكون قابضاً إلا إذا ذهب المودع أو المستعير إلى العين وانتهى إلى مكان يتمكن من قبضها فيصير الآن قابضاً بالتخلية“ (البحر الرائق ۶۰۸۷، وكذا في رد المحتار ۲۰۱۱۲)۔

شافعیہ کے یہاں قبضہ کی تفسیر بیع کو اس کی جگہ سے منتقل کر کے اپنے مقام تک پہنچانے سے کی جاتی ہے: ”وقال الشافعی: القبض في الدار و العقار و الشجر بالتخلية، و أما في الدراهم و الدنانير، فتناولها بالبراجم و في الثياب بالنقل“ (بدائع ۵۰۱۳۸)۔

حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی فرماتے ہیں: ”قال الموفق في ”المغنی“: و قبض كل شيء بحسبه فإن كان مكيلاً أو موزوناً فقبضه بكيله و وزنه و بهذا قال الشافعی و قال أبو حنيفة: التخلية في ذلك قبض، و قد روى أبو الخطاب عن أحمد رواية أخرى: أن القبض في كل شيء بالتخلية مع التمييز، لأنه خلى بينه و بين المبيع من غير حائل فكان قبضاً له“ (اعلاء السنن ۱۲، ۱۵۲)۔

حاصل یہ ہے کہ کتاب و سنت نے قبضہ کی کوئی خاص صورت تو متعین نہیں کیا ہے، لیکن ایسے اصول و قواعد اور اس کی مثالیں ضرور بیان کر دیا ہے جن سے ہر زمانہ میں ہم اس کی تعیین کر سکتے ہیں، اور اس کا زیادہ تر مدار عرف و عادت پر ہے، لیکن اس میں عرف کی حیثیت شرعیہ ملحوظ رکھتے ہوئے اعتبار ہوگا، مطلقاً عرف کا اعتبار نہیں ہوگا۔

### ۳۔ منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء میں فرق:

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، البتہ غیر منقولہ چیزوں کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے، اور امام محمد کے نزدیک دونوں کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، شیخین کی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ زمین جائداد وغیرہ میں ہلاکت شاذ و نادر ہے، اس لئے اس کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے، اور اشیاء منقولہ میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہے، اس لئے اس کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہوگی، ہدایہ میں ہے: ”ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول، والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد“۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ غیر منقول اشیاء میں ”بیع قبل القبض“ کے جواز کی علت ہلاکت کے خطرہ کا کم ہونا ہے، اور عقد کو فسخ کرنے والے غرر کا نہ ہونا ہے، اور ما قبل میں قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ عند الاحناف قبضہ کی تعریف میں بہت وسعت ہے، لہذا بظاہر دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

البتہ منقول اشیاء کے اندر ہلاکت کا خطرہ اور فسخ بیع کا امکان زیادہ ہے، اس لئے اس میں اس پہلو کا لحاظ کرتے ہوئے قبضہ کی تعیین کی جائے گی، جبکہ غیر منقول اشیاء کے اندر وسعت کا پہلو ملحوظ رہے گا اسباب مذکورہ کے معدوم ہونے کی وجہ سے، لیکن علامہ ابن ہمام نے اشیاء غیر منقولہ کو بھی اشیاء منقولہ کی طرح (ہلاکت کے خطرہ کی صورت میں) قبل القبض بیع کرنے سے منع فرمایا ہے: ”وهذا لأنه لا يتصور هلاكه إلا إذا صار بحراً أو نحو، حتى قال بعض المشائخ: إن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن يصير بحراً أو يغلب عليه الرمال، فأما في موضع لا يؤمن عليه ذلك، فلا يجوز، كما في المنقول ذكره المحبوبي، وفي الاختيار: حتى لو كان على شط البحر أو كان المبيع علواً لا يجوز بيعه قبل القبض“ (فتح القدير ۶۰۵۱۳ مطبوعه دار الفكر)۔

لہذا منقول اور غیر منقول اشیاء میں نوع اور کیفیات کے بدلنے سے حکم میں تبدیلی بھی آسکتی ہے، اگرچہ عام حالات میں دونوں کے درمیان حکم میں فرق ہی رہے گا۔

### ۴۔ احادیث کا معلول بالعلۃ ہونا:

صاحب ”ہدایہ“ نے بیع العقار میں شیخین کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے امام محمد کے جواب میں فرمایا کہ حدیث ”معلول بالعلۃ“ ہے، ”والحدیث معلول بہ عملاً بدلائل الجواز“۔

علامہ ابن ہمام نے اس کی علت میں فرمایا: ”(معلول بہ) أي بغير الانفساخ، والدليل عليه أن التصرف الذي لا يمتنع بالغرر نافذ في البيع قبل القبض وهو العتق والتزوج عليه“ (فتح القدير ۶۰۵۱۳)۔

صاحب ”عمانیہ“ نے وضاحت کے ساتھ علت غرر کا ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب زمین وغیرہ میں ہلاکت نادر ہے تو عقد کے فسخ ہونے کا غرر

جس سے روکا گیا ہے وہ منفی رہے گا، اور حدیث شریف "معلول بالانفساخ" ہے، لہذا جانکد اس میں داخل ہوگی اور اس کی بیع قبل القبض جائز ہوگی، کتاب و سنت اور اجماع کی دلیل جواز پر عمل کرنے کی وجہ سے۔

اس کے آگے فرماتے ہیں: "وإذا كان الحديث معلولاً بغير الانفساخ لا يحتمل تناول ما ليس فيه ذلك" (عناية مع الفتح ۶۰۵۱۳)۔

## ۵۔ بیع قبل القبض کی ممانعت:

اس سلسلہ میں احادیث مبارکہ کے الفاظ مختلف ہیں، اور فقہاء کرام نے اس میں تخصیص کر کے بہت سی چیزوں کو حکم سے خارج کر دیا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں نقل مذاہب کے سلسلہ میں گذر چکا ہے، امام مالک صرف غلہ میں ناجائز اور بقیہ تمام چیزوں میں جائز قرار دیتے ہیں: "كل ما اشتریت من العروض كلها الحيوان والعقار والثياب وغير ذلك ما خلا المبيع من الطعام على الكيل، فلا بأس عند مالك أن تبیع ذلك كله قبل أن تقبضه" "البتة اس میں عجلت کرے تاخیر نہ کرے،" "إذا تعجلت ذلك ولم توخره" (کتاب الکافی فی فقہ اہل المدينة المالکی ۲۰۲۲)۔

امام مالک کی دلیل حضرت ابن عمر کی وہ حدیث ہے جو آپ نے "موطا" میں بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کوئی اناج خریدا تو وہ اس کو فروخت نہ کرے، جب تک کہ وہ اس پر قبضہ پوری طرح نہ حاصل کرے، "عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يستوفيه" (موطا امام مالک: کتاب البيوع ۲۶۲)۔

امام احمد بھی اسی حدیث سے استدلال فرماتے ہیں کہ وہ ماکول و مشروب کے ماسوا میں قبل القبض بیع کو جائز قرار دیتے ہیں۔

امام شافعی اور امام محمد کے نزدیک طعام ہو یا عقار ہو، کسی کو بھی قبل القبض فروخت کرنا جائز نہیں ہے، یہ حضرات حکیم ابن حزام کی روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عن حكيم بن حزام قال: قلت يا رسول الله: إني رجل مبتاع هذه البيوع وأبيعها فما يحل لي منها وما يحرم؟ قال: لا تبیع شیئاً حتى تقبضه" (فتح القدير ۳، ۵۱۱، اعلاء السنن ۱۳، ۲۲۳)۔

اس حدیث میں تمام چیزوں کی بیع قبل القبض ناجائز و حرام فرمایا ہے، امام شافعی اپنی کتاب (کتاب الام ۷۰، ۳) میں ارشاد فرماتے ہیں: "وبهذا نأخذ فمن ابتاع شيئاً كائناً ما كان ليس له أن يبيعه حتى يقبضه"، نیز اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس کا اجتہادی قول بھی یہی ہے کہ غیر طعام کو بھی طعام کی طرح قبل القبض بیچنا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: "قلنا قد رواه ابن عباس أيضا قال: وأحسب كل شيء مثل الطعام، أخرج عنه أئمة الكتب الستة" (فتح القدير ۶، ۵۱۱)۔

امام اعظم اور امام ابو یوسف اشیاء منقولہ کو "نہی عن بیع ما لم يقبض" کی وجہ سے ناجائز قرار دیتے ہیں، اور اشیاء غیر منقولہ کو علت عدم غرر کی وجہ سے جائز قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ غیر منقول اشیاء کی بیع میں ایجاب و قبول اہل کی طرف سے محل بیع میں صادر ہوا اور منقول چیزوں میں جو مانع تھا "غرر انفساخ العقد" وہ یہاں متحقق نہیں ہے، لہذا یہ بیع جائز ہونی چاہئے (فتح القدير ۶، ۵۱۱)۔

مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں: "إلا أن أبا حنيفة وأبا يوسف خصا النصوص بالمنقول بعلّة النهي وهو غرر انفساخ العقد بالهالك قبل القبض ومحمد أجراها على عمومها، والشافعي خصها بما لم يكن متميزاً وهو اختلاف الاجتهاد" (اعلاء السنن ۱۳، ۲۲۳)۔

امام اعظم کی دلیل حضرت عثمان ابن عفان کی وہ روایت بھی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت عثمان نے اپنی کوفہ والی زمین کو دیکھے بغیر فروخت کر دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو قبل القبض ہی فروخت کر دیا، کیونکہ قبضہ رویت کو مستلزم ہے۔

مولانا ظفر احمد تھانوی اعتراض نقل کرتے ہیں کہ کوئی اگر یوں کہے کہ حضرت عثمان نے وکیل کی معرفت قبضہ کیا ہوگا، تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ وکیل کی



روایت بھی موکل کی ہی روایت ہے اور جبکہ روایت میں خود اس احتمال کو دور کرنے والا لفظ موجود ہے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں: ”بعثت ما لہ اربہ فبطل احتمال رؤیتہ بواسطۃ الوکیل وقبضہ بقبضہ“ حضرت عثمان کی روایت کی شرح مہذب میں مسلم شریف کے حوالہ سے نقل کر کے اس میں ایک راوی کے مجہول اور مختلف الاحتجاج ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ”قلت: و مسلم لا یروی عن مجہول و لا لمجہول فالحدیث حسن حجة“ (اعلاء السنن ۱۲، ۲۲۹)۔

امام مالک نے جس حدیث پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے اس کے بارے میں حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ایک خاص حکم سے متعلق ہے، جبکہ اس سلسلہ میں دیگر عام حدیثیں بھی موجود ہیں، کیونکہ حضرت ابن عمر والی حدیث جس سے امام مالک نے استدلال کیا ہے وہ حدیث حضرت ابن عباس سے بھی ”بخاری و مسلم“ میں موجود ہے جس میں راوی حدیث ابن عباس فرماتے ہیں کہ: ”ولا أحسب کل شیء إلا مثله“ (بخاری شریف: کتاب البیوع ۲۸۶/۱) پر یہ حدیث موجود ہے، (مسلم شریف جلد دوم صفحہ ۵) پر بھی یہ حدیث موجود ہے، اور اسی طرح کی ایک روایت ”ابوداؤد“ میں بھی ابن عمر سے مروی ہے، جس میں ”نہی عن بیع ما لم یقبض“ کا لفظ موجود ہے (نصب الرایہ ۱۹/۳، ۳۲/۳)۔

شوافع کی مستدل روایت جو حکیم ابن حزام سے مروی ہے اس پر محدثین نے کلام کیا ہے، لیکن ابن ہمام نے رجال پر گفتگو کرتے ہوئے حدیث بالا کو حجت قرار دیا ہے: ”والحق أن الحدیث حجة والذی قبلہ كذلك“ لیکن پھر اس کی تخصیص کی دلیل کا ذکر کیا ہے: ”والحاجة بعد ذلك إلى دلیل التخصیص لغير العقار لأبی حنیفة ما یذكر هناك، والأحادیث كثيرة فی هذا المعنی“ (فتح القدیر ۶، ۵۱۲)۔

## ۶۔ قبضہ ضمان:

فقہاء کرام نے قبضہ کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں جو جزئیات ذکر فرمائے ہیں، اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ قبضہ حسی کا ہونا ضروری نہیں ہے (شامی ۴۷۴، ۴۸۰)۔

قبضہ کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے فقہاء کرام نے اس کی مختلف قسمیں بیان فرمائی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) اول قبضہ ضمانت (۲) دوم قبضہ ضمان، اور پھر قبضہ ضمان کی دو قسمیں ہیں: (۱) اول ضمان بنفسہ (۲) دوم ضمان بغيرہ۔ ان میں سے ہر ایک کا حکم بھی جدا گانہ ہے۔

۱۔ مشتری کو اگر بیع پر پہلے سے قبضہ حاصل ہے اور وہ قبضہ ضمان بنفسہ کا ہے، مثلاً غاصب کا قبضہ شیء منصوب پر، تو اس کا حکم یہ ہے کہ بیع موجود ہو یا نہیں، بہر حال سابق قبضہ ہی جدید قبضہ کے لئے کافی ہوگا، اور نئے سرے سے قبضہ کی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ غاصب کا ضمان بنفسہ ہے اور منصوب شیء بصورت بنفسہ ہے۔

۲۔ اور اگر بیع پر مشتری کا قبضہ ضمان بغيرہ کا ہے، مثلاً شیء مرہون پر، ان کا قبضہ، تو رہن امانت ہوتا ہے، البتہ مضمون بالغير ہوتا ہے یعنی فرض کی وجہ سے، گویا کہ وہ مضمون بالغير تو ہے مگر مضمون بنفسہ نہیں ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شیء مرہون موجود ہو تو یہ قبضہ جدید قبضہ کی طرف سے کافی ہوگا، ورنہ نہیں۔

۳۔ اور اگر بیع پر مشتری کا قبضہ قبضہ امانت ہے، مثلاً عاریت، ودیعت وکالت اور اجارہ کا قبضہ، تو یہ سارے قبضے قبضہ امانت کہلاتے ہیں، اور ان کا حکم یہ ہے کہ یہ امانت والے قبضے ضمان والے (بیع کیلئے) قبضہ کیلئے کافی نہ ہوں گے، بلکہ تجدید قبضہ ضروری ہوگا (بدائع الصنائع ۲۳۸/۵، شامی ۴۶۶، ۴۸۰)۔

شامی میں ان تمام جزئیات کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: ”و حاصلہ أن التخلية قبض حکما مع القدرة علیہ بلا کلفة لکن ذلك یختلف بحسب حال المبیع، ففي نحو حنطة فی بیت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمکنه الفتح بلا کلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة علی إغلاقها قبض، أي بأن تكون فی البلد فیما یظهر، وفي نحو بقرة فی مرعى فکونه بجیث یری و یشار إلیه قبض الخ“ (شامی ۴، ۴۸، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ پاکستان)۔

ان تمام مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر بائع نے حسی قبضہ نہ کیا ہو، لیکن وہ ضامن ہو گیا ہو تو اس کو قبضہ ضمان کے درجہ میں شمار کر کے خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا۔

۷۔ صورت مسئلہ میں جب مشتری کا کسی قسم کا قبضہ پایا ہی نہیں جاتا اور اس سے پہلے ہی بائع اپنے ضمان سے بری ہو جاتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، لہذا بائع

کیلئے ایسا سودا کرنا جائز نہیں ہے، اور جب مشتری اس کا مالک نہیں ہوتا ہے تو یہ بیع ”بیع معدوم مالیس عندک“ اور ”بیع الم یقبض“ کے درجہ میں رکھے ہوئے اس کیلئے بھی کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

شامی میں لکھا ہے: ”اشتری بقرة مریضة و خلاها فی منزل البائع قائلان ہلکت فمنی و ماتت فمن البائع لعدم القبض، و کذا لو قال للبائع: سقها إلى منزلک فاذهب فانسلما فهلکت حال سوق البائع فإن ادعی البائع التسليم فالقول للمشتري“، اسی طرح کا ایک یہ مسئلہ بھی ہے: ”اشتری و عادلین خاثر فی السوق فأمر البائع بنقله إلى منزله فسقط فی الطريق فعلى البائع إن لم یقبضه المشتري“ (شامی جلد ۴۸، ۴۹)۔

ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اصل بائع کا ذمہ مشتری کے تخلیہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ہے، اور ہلاکت کی نسبت بائع کی طرف ہی ہوتی ہے، نہ کہ مشتری کی طرف، اور تیسرا خریدار کیسے ضامن ہو سکتا ہے جبکہ بائع اول اور مشتری کے درمیان ہی بیع صحیح نہیں ہوئی ہے، لہذا اس قسم کی خرید و فروخت شرعاً ناجائز ہی ہوں گے۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عمومی یا خصوصی؟

(ائمہ کرام کے اقوال و آراء اور ادلہ)

مولانا اشتیاق احمد اعظمی ؒ

بیع قبل القبض کی ممانعت مختلف احادیث میں وارد ہے، کہیں یہ نہیں بالکل عام ہے، اور کہیں خاص، جس کے باعث فقہاء امت کے درمیان ”بیع قبل القبض“ کے بارے میں اقوال و آراء کا اختلاف ایک فطری امر ہے، ذیل میں ہم فقہاء کرام کے آراء و اقوال بیان کرتے ہیں، پھر ہر ایک کے دلائل پیش کریں گے۔

پہلا قول حنفیہ کا ہے: حنفیہ نے بیع قبل القبض کے تعلق سے اشیاء منقولہ و غیر منقولہ کے درمیان فرق کیا ہے۔

جمہور حنفیہ کے نزدیک مشتری کے لئے اشیاء منقولہ پر قبضہ سے پہلے اس کی بیع کرنا درست ہے، رہا غیر منقولہ اشیاء کا معاملہ، جیسے عقار، دار اور شجر وغیرہ تو اس میں قبضہ سے پہلے بھی مشتری کے لئے بیع جائز ہوگی، ائمہ احناف میں سے حضرات شیخین (امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف رحمہما اللہ) کا یہ مسلک ہے، لیکن احناف ہی میں سے امام محمد و زفر، نیز امام شافعی ”غیر منقولہ اشیاء کے اندر بھی بیع قبل القبض کے عدم جواز ہی کے قائل ہیں (بدائع الصنائع ۱۸۱/۶-۱۸۰، مجمع لا نہر فی شرح ملتعی لا بحر ۸۰/۲)۔

دوسرا قول مالکیہ اور ابن حزم ظاہری کا ہے: ان حضرات کے یہاں ہر قسم کی چیزوں کی بیع، خواہ وہ منقول ہو یا غیر منقول، جائز ہے، اس عموم سے ان کے یہاں صرف طعام مستثنیٰ ہے، لیکن مالکیہ کے نزدیک طعام سے مراد صرف گندم ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ضمن میں دیگر مطعومات، مثلاً فا کہہ وغیرہ بھی آتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک گندم اور فا کہہ کی بھی بیع قبل القبض جائز نہ ہوگی، مگر علامہ ابن حزم ظاہری کے نزدیک، طعام سے مراد صرف گندم ہے، اس لئے گندم کی بیع ان کے نزدیک قبضہ سے پہلے بالکل درست نہ ہوگی (المغنی علی المذہب الاربعہ ۲۳۵/۲، المحلی لابن حزم ۵۱۸/۸)۔

تیسرا قول شافعیہ کا ہے: شوافع کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ کی نہیں بالکل عام ہے، ان کے یہاں اشیاء منقولہ و غیر منقولہ دونوں ہی کی بیع درست نہیں ہے، یہی امام احمد کی بھی ایک روایت ہے، اور ابن عقیل نے اسی کو اختیار کیا ہے، مغنی میں ہے: ”وعن أحمد رواية أخرى: لا يجوز بيع شيء قبل قبضه، اختارها ابن عقیل“ (المغنی ۴۰۱/۱)۔

چوتھا قول حنابلہ کا ہے: ان حضرات کے نزدیک قبضہ سے پہلے بیع کے اندر تصرف جائز ہے، بشرطیکہ بیع کیلی، وزنی، یا عددی نہ ہو، لیکن اگر بیع انواع مذکورہ میں سے کسی بھی نوع کی ہوگی تو اس میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز نہیں ہوگا (المغنی ۱۲۱/۳، المغنی علی المذہب الاربعہ ۲۳۶/۲)۔

پانچواں قول عثمان الہتقی کا ہے: ان کے نزدیک ہر طرح کی اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہے، ”أنه قال: لا بأس ببيع كل شيء قبل قبضه“ (المغنی لابن قدامہ ۴، ۱۲۷)۔

حنفیہ اور شافعیہ کے ادلہ:

حنفیہ اشیاء منقولہ، اور شوافع اشیاء منقولہ و غیر منقولہ کے اندر قبضہ سے پہلے تصرف کے عدم جواز کے قائل ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں ان دونوں جماعتوں کے ادلہ ایک ہی ہیں، اور ذیل کی وہ روایتیں ہیں جس میں عمومی طور سے قبضہ سے پہلے کسی بھی شے کی بیع سے روکا گیا ہے:

۱۔ ”ما رواه أبو داؤد عن زيد بن ثابت أن النبي ﷺ نهي أن تباع السلع حيث تبتاع حتى يحوزها التجار إلى



رحالہم“ (سنن أبي داود مع البذل ۴، ۲۸۵، ونيل الأوطار ۵، ۱۵۷)۔

۲۔ ”عن حكيم بن حزام قال: سألت رسول الله ﷺ فقلت: يأتيني الرجل فيسألني أن أبيع ما ليس عندي أبتاع له من السوق ثم أبيع، قال: لا تبع ما ليس عندك“ (ترمذی ۱، ۱۲۸)۔

۳۔ ”عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده رضى الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح ما لم يضمن، ولا بيع ما ليس عندك“ (رواه الخمسة نقلاً عن سبل السلام ۳، ۸۰۹)۔

حنفیہ نے اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کے درمیان جو فرق کیا ہے، اس کی بنیادی وجہ مذکورہ بالا احادیث کے اندر موجود علت نہی ہے، اور وہ علت ”غیر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک“ ہے، اور یہ علت منقولہ اشیاء کے اندر قبضہ سے پہلے موجود ہوا کرتی ہے، اس لئے منقولہ اشیاء کے اندر ”بیع قبل القبض“ کو حنفیہ نے ناجائز کہا، اور غیر منقولہ اشیاء کے اندر ہلاکت چونکہ نادر الوقوع ہے، اس لئے عدم تحقق علت کے باعث حنفیہ نے ان کی بیع قبضہ سے پہلے بھی جائز قرار دی، لیکن مکان و جائداد وغیرہ اگر ایسی ہوں جن کے اندر ہلاکت کا اندیشہ موجود ہو، مثلاً زمین جو دریا کے دہانے پر واقع ہو تو فقہاء احناف نے اس طرح کی چیزوں کو قبضہ سے پہلے بیچنے سے منع کیا ہے، چنانچہ عینی میں ہے:

”فأما في موضع لا يؤمن ذلك فلا يجوز“ (عینی شرح ہدایہ ۳، ۱۳۷)۔

حنفیہ کی دوسری دلیل وہ قاعدہ اور اصول ہے، جسے علامہ عینی نے ”ایضاح“ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے: ”کل عرض ملكت بعقد يفسخ العقد فيه بهلاكه قبل القبض ولم يجز التصرف فيه كالمبيع و الأجرة إذا كانت عيناً و ما لا يفسخ العقد بهلاكه فالتصرف فيه جائز قبل القبض كالمهر و بدل الخلع“ (عینی ۳، ۱۳۷)۔

اس قاعدہ کا حاصل یہ ہے کہ ہر عرض جس کا کسی عقد سے مالک بنا جاتا ہو اور اس عرض کی ہلاکت کے باعث اس میں منعقدہ عقد فسخ ہو جاتا ہو تو ایسے عرض میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز نہیں ہوگا، جیسے بیع اور اجرت جب کہ معین شئی ہو اور جہاں اس عرض کی ہلاکت کے باوجود عقد منفسخ نہ ہوتا ہو تو اس میں قبضہ سے پہلے بھی تصرف جائز ہوا کرے گا۔

اس ضابطہ کی رو سے اشیاء منقولہ وغیر منقولہ، دونوں ہی کے اندر قبضہ سے پہلے تصرف ناجائز ہونا چاہئے، لیکن غیر منقولہ اشیاء کے اندر ہلاکت کے نادر ہونے کے باعث اس میں قبضہ سے پہلے بھی جمہور احناف نے تصرف کو جائز قرار دیا۔

احناف میں سے حضرت امام محمد و زفر نے غیر منقولہ کی بیع کو بھی قبضہ سے پہلے ناجائز قرار دیا ہے، ان حضرات کی دلیل مذکورہ بالا وہ روایتیں ہیں جن کے اندر کلمہ ”ما“ وارد ہوا ہے ”لا تبع ما ليس عندك“ اور ”ولا بيع ما ليس عندك“ اور کلمہ ”ما“ عموم پر دلالت کرتا ہے، اس لئے اس میں منقولہ غیر منقولہ کی کوئی تخصیص نہ ہوگی۔

دوسری دلیل یہ کہ امام محمد وغیرہ نے بیع کو اجارہ پر قیاس کیا ہے، چونکہ عقار وغیرہ کا اجارہ قبل القبض درست نہیں، اس لئے عقار کی بیع بھی قبل القبض درست ہوگی، عینی میں مذکور ہے: ”وصار كالإجارة فإنها في العقار لا يجوز قبل القبض“ (عینی شرح ہدایہ ۳، ۱۳۷)۔

مالکیہ اور ابن حزم کے دلائل:

ان حضرات کے اولہ وہ روایتیں ہیں جن میں طعام کا لفظ وارد ہوا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ”عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: إذا ابتعت طعاماً فلا تبعه حتى تستوفيه“ (رواه احمد ومسلم بجواله نيل الأوطار ۵، ۱۵۷)۔

۲۔ ”عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ أن يشتري الطعام ثم يباع حتى يستوفى“ (رواه احمد ومسلم بجواله نيل الأوطار ۵، ۱۵۷)۔

۳۔ ”عن ابن عباس أن النبي ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه“ (نیل الأوطار ۵۱۵۸)۔  
ان جیسی حدیثوں میں چونکہ خاص طور سے طعام کی قبل القبض بیع سے روکا گیا ہے، اس لئے طعام کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہ ہوگی، لیکن اس کے مساویہ چیز کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہوگی، ”فإن تخصيصه الطعام بالبيع عن يبعه قبل قبضه يدل على إباحة ذلك في ما سواه“۔  
ہاں مالکیہ نے طعام سے مراد صرف گندم نہیں لیا ہے، بلکہ دیگر مطعومات، جیسے فاکہ وغیرہ کو بھی طعام کے ضمن میں لے لیا ہے، لیکن علامہ ابن حزم ظاہری نے کہا کہ لفظ طعام بغیر اضافت کے کلام عرب میں جب استعمال ہوتا ہے تو اس سے صرف ”غ“ گندم مراد ہوا کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں عربوں کے کلام سے استشہاد پیش فرمایا ہے، چونکہ احادیث مذکورہ بالا میں لفظ طعام بدون اضافت استعمال ہوا ہے، اس لئے عربوں کے استعمال کے بموجب اس سے مراد گندم (غ) ہی ہوگا (المحلی لابن حزم ۵۲۱، ۸)۔

حنابلہ کی دلیل:..... حنابلہ کی دلیل بھی وہ ساری احادیث ہیں جن میں قبضہ سے پہلے طعام کی بیع سے روکا گیا ہے، چونکہ مطعومات کیلی، وزنی یا عددی ہونے سے خارج نہیں ہوا کرتے، اس لئے نبی کا تعلق ان تمام انواع بیع سے ہوگا جو کیل، وزن، یا عدد کے ضمن میں آتی ہوں، علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اسے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ”إن الطعام المنهي عنه عن يبعه قبل قبضه لا يكاد يخلو من كونه مكيلاً أو موزوناً أو معدوداً فتعلق الحكم بذلك“ (المغنی ۲۰۱۲۲)۔

عثمان البتئی کی دلیل:

عثمان البتئی نے ہر طرح کی اشیاء میں قبضہ سے پہلے جو بیع کے جواز کا قول پیش کیا ہے، بظاہر ان کی کوئی دلیل سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ ان کو مذکورہ بالا احادیث نہیں پہنچ سکی ہوگی، جس کی بنا پر انہوں نے جواز کا عمومی قول پیش کر دیا، جیسا کہ علامہ ابن عبدالبر نے ان کے بارے میں اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے: ”قال ابن عبد البر: وهذا (ای قول عثمان البتئی) مردود بالسنة والحجة المجمععة على الطعام وأظنه لم يبلغه هذا الحديث، ومثله هذا لا يلتفت إليه“ (المغنی ۲۰۱۲۴)۔

شرع اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض جائز ہے یا ناجائز؟ اور ناجائز ہے تو اس کا شمار بیع باطل میں ہے، یا بیع فاسد میں، یا بیع مکروہ میں۔

اسلامی شریعت کی رو سے بیع قبل القبض فی الجملہ ناجائز ہے: ”لقوله عليه السلام: لا تبع ما ليس عندك“ دوسرے اس وجہ سے بھی کہ بیع کے ہلاک ہونے کے اعتبار سے، عقد ہی کے نسخ ہو جانے کا غرر موجود ہے، اور حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام نے بیع غرر سے بھی منع فرمایا ہے، اس لئے بھی بیع قبل القبض فی الجملہ درست نہ ہوگی (مجمع لا نہر فی شرح متعنی ۱۱۱۲)۔

رہا یہ امر کہ بیع قبل القبض فاسد ہے یا باطل، تو احناف کے یہاں یہ بیع فاسد ہے، اور شوافع کے نزدیک باطل، الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں ہے: ”الحنفية قالوا: من البيع الفاسد يبيع الأعيان المنقولة قبل القبض“ (۲۰۲۲۲)۔

مذکورہ بالا حوالہ کے اندر یہ بھی مذکور ہے: ”والشافعية قالوا: لا يصح للمشتري أن يتصرف في المبيع قبل قبضه... فإذا اشترى شيئاً منقولاً كان أو غيره ولم يستلمه ثم باعه وقع البيع باطلاً“ (الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲۰۲۲۲)۔

لیکن باعتبار مال کے دونوں قولوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ شوافع کے نزدیک فساد اور بطلان ایک ہی امر ہے: ”والفساد والباطل بمعنى واحد في عقود البيع فكل فاسد باطل وبالعكس“ (الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۲۰۲۲۲)۔

بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں یا نہیں؟

بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں، لیکن فقہاء کرام کے درمیان علت کے استخراج میں اختلاف ہے۔

(۱) حنفیہ کے نزدیک علت نہی: ”غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“ ہے (ہدایۃ ۵۹، ۳)۔

(۲) مالکیہ کے اس سلسلہ میں ہمیں دو قول ملتے ہیں:

۱۔ یہ کہ یہ احادیث معلول بالعلتہ ہیں۔ ۲۔ یہ کہ یہ احادیث معلول بالعلتہ نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک امر تعبدی ہے۔

بہر کیف نہی کی علت ان احادیث کے اندر مالکیہ کے یہاں اعمال کی منفعت کا ضیاع اور بربادی ہے، جیسا کہ اسے علامہ جزیری نے ”الفقہ علی المذاهب الاربعہ“ میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”وقد قيل في علة النهي: إن في قبضه منفعة للعمال إذ ينتفعون بكيهه وحمله ووزنه وغير ذلك بخلاف ما إذا بيع وهو عند صاحبه فإن ذلك يضيع تلك المنفعة وقيل: إنه أمر تعبدى“ (الفقہ علی المذاهب الأربعة ۲۰۲۵)۔

### قبضہ کی حقیقت:

حقیقہ کے یہاں قبضہ کی اصل اور حقیقت تمام اموال میں تخلیہ ہے، علامہ کاسانی ”بدائع الصنائع“ میں تحریر فرماتے ہیں: ”ثم لا خلاف بين أصحابنا أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال“ (بدائع ۵۰۲۲۲)۔

تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع، بیع اور مشتری کے درمیان تمام موانع اور رکاوٹوں کو اس طور پر ختم کر دے کہ مشتری بیع کے اندر ہر طرح کے تصرف پر پوری طرح قادر ہو جائے، علامہ کاسانی نے تسلیم اور قبضہ کے مفہوم کی وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے:

”أما تفسير التسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينها على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“ (بدائع ۵۰۲۲۲)۔

صاحب ”بدائع“ کی اس عبارت سے یہ واضح ہو گیا کہ احناف کے نزدیک اصل حوالگی بیع، بائع کی طرف سے تخلیہ اور مشتری کی طرف سے تخلی ہے، ہاں تخلیہ کی نوعیت میں اختلاف ہو سکتا ہے، جبکہ بیع کے انواع میں اختلاف ہو، اور تخلیہ کی نوعیت، اس تبدیلی کا دار و مدار عرف و عادت پر محمول ہوگا، چنانچہ جس مقام پر جس طرح کے استیلاء کو وہاں کے عرف میں قبضہ سمجھا جاتا ہوگا، اسی کو اس معاملہ میں شرعاً قبضہ مانا جائے گا۔

علامہ شامی ”بحر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: ”حاصله أن التخلية قبض حکماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“ (شامی ۲۰۵۹)۔

اور بدائع میں ہے: ”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع ۵۰۱۲۸)۔

### تخلیہ سے متعلق شرطیں:

صاحب درمختار نے تخلیہ کیلئے تین شرطیں ذکر فرمائی ہیں جن کی طرف اشارہ ”بدائع“ کی مذکورہ بالا عبارت (۲۲۳/۵) میں بھی ہو چکا ہے، وہ شرطیں درمختار کے الفاظ میں یوں ہیں:

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل وشرط في الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن يقول: خلّيت بينك وبين المبيع، فلو لم يقله أو كان بعيداً لم يصر قابضاً“ (درمختار مع الشامی ۲۰۵۹-۵۸)۔

درمختار کی عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ بیع کی تسلیم و سپردگی تخلیہ کی صورت میں اس وقت مکمل مانی جائے گی جبکہ مشتری بیع پر بلا کسی مانع اور حائل کے تصرف پر قادر ہو جائے، ”اجناس“ کے اندر ایک تیسری شرط یہ بھی لگائی ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ: ”خلّيت بينك وبين المبيع“۔

چنانچہ علامہ شامی نے اس کے ذیل میں جو مثال پیش کی ہے وہ یہ کہ اگر مشتری نے کسی مکان کے اندر موجود گیسوں خرید اور بائع نے اس مکان کی کچی مشتری کے حوالہ کر دی اور کہا کہ: ”خلّيت بينك وبينها“ تو اس صورت میں قبضہ نہیں ہوگا۔

تخلیہ کے اندر ”بلا مانع ولا حائل“ کی شرط کا مفہوم یہ ہے کہ بیع بالکل علیحدہ، الگ تھلگ اس انداز سے ہو کہ اس سے غیر کا حق متعلق نہ ہو ”(بان یكون مفرزاً غير مشغول بحق غيره“ (شامی ۲۰۵۹)۔

چنانچہ اگر کسی نے گھر بیچا اور اسے مشتری کے حوالہ بھی کر دیا، لیکن اس مکان کے اندر تھوڑا یا زیادہ، بائع کا سامان موجود ہے، تو اس صورت میں بیع کی حوالگی



اور تسلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ بائع اس مکان کو مکمل خالی نہ کر دے۔

الغرض شریعت نے قبضہ کی اصل اور حقیقت، تخلیہ کی شکل میں متعین کر دی ہے، لیکن اس کی نوعیت میں مکان اور بیع کے اختلاف کے باعث اختلاف ہو سکتا ہے، اور اس کا تعلق عرف اور عادت سے ہوگا، اس کی مختلف صورتوں کا ذکر علامہ شامی نے ان لفظوں میں فرمایا ہے:

”ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض، ونحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض وفي نحو ثوب فكونه بحيث لو مد يده تصل إليه قبض... إلى غير ذلك“ (شامی ۲۰۵۹)۔

اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت ایک ہوگی یا مختلف؟

احناف کے یہاں تمام اموال میں تسلیم و قبضہ کی حقیقت ایک ہی ہے، یعنی تخلیہ و تحلی، لیکن تخلیہ کی نوعیت اشیا منقولہ کے اندر بھی مختلف چیزوں میں مختلف ہو سکتی ہے، اور غیر منقولہ میں بھی حالات کے اعتبار سے مختلف ہوگی، جیسا کہ شامی کے حوالہ سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بیع کے اختلاف سے تخلیہ کی صورتیں اور نوعیتیں مختلف ہوا کرتی ہیں ”لکن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“، مثلاً کسی مکان کے اندر موجود گیہوں خرید تو بائع کا مشتری کو اس مکان کی کنجی اس طور پر حوالہ کر دینا کہ وہ اس کو بلا کسی تردد کے کھول سکے، مشتری کے حق میں قبضہ مانا جائے گا، ”ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض“ (شامی ۲۰۵۹)۔

اور اگر کسی نے گھر خریدا اور بائع اس کی کنجی مشتری کو دیدے کہ وہ اس گھر کو بند کر سکے تو اس صورت میں مشتری کا کنجی پالینا ہی قبضہ ہوگا، بشرطیکہ وہ گھر اس شہر میں ہو، ”وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض اى بأن تكون في البلد فيما يظهر“ (شامی ۵۹۰۲)۔

مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہو گیا کہ بائع کی طرف سے حوالگی کی ایسی صورت سامنے آجائے، جس کے بعد مشتری بیع پر قابض و متصرف ہو سکے تو اس کی طرف سے تسلیم کی یہ صورت تخلیہ ہوگی اور مشتری کے حق تحلی یعنی قبضہ ہوگا، خواہ بیع منقول ہو یا غیر منقول، جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا۔

البتہ غیر منقول بیع کا جائے وقوع اگر بعید ہو تو قبضہ محض تخلیہ سے نہ ہوگا، شامی میں ہے: ”أما إذا كان بعيداً لا يتصور القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض“ (۲۰۵۹)۔

شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت:

شوافع اور حنابلہ کے یہاں بھی غیر منقولہ اشیا کے اندر قبضہ تخلیہ ہی ہوتا ہے، چنانچہ بدائع میں مذکور ہے: ”وقال الشافعي: القبض في الدار والعقار والشجرة بالتخلية“ (۵۰۲۳)۔

اور مغنی میں علامہ ابن قدامہ حنبلی رقم طراز ہیں: ”وان كان مما لا ينقل ويحول فقبضه التخلية بينه وبين مشتريه لا حائل دونه“ (المغنی ۲۰۱۲۶)۔

اور منقولہ اشیا میں قبضہ ان حضرات کے یہاں مختلف شکل سے ہوا کرتا ہے، چنانچہ مغنی میں مذکور ہے: ”وقبض كل شئ بحسبه“ (۲۰۱۲۵) اس لئے اگر بیع درہم و دینار کی ہو تو قبضہ کی صورت ”اخذ باليد“ یا ”تناول بالبر اجم“ یعنی ہاتھ میں لینے سے ہوگی، اور اگر بیع کپڑا ہو، یا طعام ہو اور اسے مجازتہ بیچا جائے تو قبضہ اس کے منتقل کرنے سے ہوگا، اور اگر حیوان ہو تو اسے اس کے مقام سے چلا کر قبضہ ہوگا، مغنی میں ہے: ”وان كان المبيع ذراهم أو دنائير فقبضتها باليد وان كان ثياباً فقبضتها نقلها، وان كان حيواناً فقبضته تمشيته من مكانه“ (المغنی ۲۰۱۲۶)۔

اور اگر بیع کیلی یا وزنی ہو اور بیع بھی کیلی یا وزنی کی گئی ہو تو قبضہ کیل و وزن سے ہوگا، جیسا کہ مغنی میں ہے: ”فان كان مكيلاً أو موزوناً يبيع كيلاً ووزناً فقبضه بكيله ووزنه وبهذا قال الشافعي“ (المغنی ۱۲۵۰۳)۔

۶۔ ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار (۲) کو روانہ کر دیتا ہے، اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے، اگر درمیان میں

مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آتی ہے، نہ خریدار (۲) پر، بلکہ یہ اس شخص یعنی خریدار (۱) کا نقصان قرار پاتا ہے..... اس صورت معاملہ میں فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر اگرچہ حسی قبضہ نہیں ہوا، لیکن اس کے ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام مان کر اس کی بیع و شراء کو درست اور جائز قرار دیا جانا چاہئے، بشرطیکہ خریدار (۱) نے فیکٹری سے معاملہ اولاً طے کیا ہو، اور فیکٹری سے مال کی روانگی کے بعد خریدار (۲) سے معاملہ طے ہوا ہو، اس صورت میں خریدار (۱) کے حق میں تخلیہ مال کی روانگی کے بعد ثابت ہو جائے گا، جو قبضہ کی اساس و بنیاد ہے، تخلیہ کے حصول کے بعد خریدار (۱) کا بیع کے اندر تصرف صحیح ہوگا، اس لئے اس کی بیع خریدار (۲) کے حق میں درست ہوگی، خصوصاً جبکہ وہ ضمان بھی قبول کر رہا ہے۔

رہا مذکورہ بالا صورت معاملہ میں تخلیہ سے قبضہ کا ثبوت، تو بدائع میں مذکور ہے کہ: "فتسليم المبيع إلى المشتري هو جعل المبيع سالماً للمشتري أى خالصاً له بحيث لا ينازعه فيه غيره وهذا يحصل بالتخلية، فكانت التخلية تسليماً من البائع والتخلي قبضاً من المشتري" (بدائع ۵، ۲۲۲)۔

مذکورہ بالا صورت معاملہ میں فیکٹری سے مال کی روانگی بائع کی طرف سے تسلیم بیع یعنی تخلیہ پایا گیا، اور بیع کی یہ سپردگی مشتری کے حق میں تخلی یعنی قبضہ متصور ہوگی۔

اور "بدائع" میں یہ بھی مذکور ہے: "حتى لو اشترى مذبوحاً مذبوحاً أو معدوداً معاددة ووجدت التخلية تخرج عن ضمان البائع ويجوز له بيعه والانتفاع به قبل الزرع والعد بلاخلاف، وإن كان سما له مثل، فإن باعه مجازفة فكذلك" (بدائع ۵، ۲۲۶)۔

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں فیکٹری سے خریدا ہوا مال، خواہ مثلی ہو یا غیر مثلی، دونوں صورتوں میں تخلیہ کی بنیاد پر، مشتری کے قبضہ میں ہو جائے گا، مذکورہ بالا صورت معاملہ میں فیکٹری کی طرف سے مال کی روانگی تخلیہ مانی جائے گی، اور بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی، اور یہاں تو مشتری خود بخود ہی ضمان قبول کر رہا ہے، اس لئے مشتری کا اس بیع کو ناپنے اور شمار کرنے سے پہلے اس سے انقطاع اور اس کی بیع درست ہوگی۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ بائع کا بیع کے اندر مشتری کے امر سے کوئی بھی تصرف مشتری ہی کا تصرف مانا جاتا ہے، اس لئے اس صورت معاملہ میں بائع کا مشتری کے امر سے فیکٹری سے مال کو روانہ کرنا خود اس کے قبضہ کے مترادف ہوگا، بدائع میں ہے: "وكذلك لو فعل البائع شيئاً من ذلك بأمر المشتري؛ لأن فعله بأمر المشتري بمنزلة فعل المشتري بنفسه" (بدائع ۵، ۲۲۶)۔

مذکورہ بالا پوری بحث سے یہ امر واضح ہو گیا کہ مشتری اول کا مشتری ثانی کو مذکورہ بالا صورت معاملہ میں مال کو فروخت کرنا درست ہوگا۔ وہ صورت معاملہ جس میں بین الاقوامی تجارت میں شپنگ کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مال مشتری تک پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جاتا ہے تو بائع اس کا ضمان نہیں لیتا۔

تو اس صورت معاملہ میں چونکہ بائع کی طرف سے تسلیم بیع پایا گیا اور وہ یہاں پر مال کی شپنگ ہے، اس لئے اس صورت میں بائع کا فارغ الذمہ ہونا ہی قرین قیاس ہے، اور یہ بیع بھی درست ہوگی، کیونکہ بائع کی طرف سے بیع کی تسلیم بصورت شپنگ موجود ہے۔

اب اگر یہ مشتری اس مال کو اپنے ضمان میں لے لیتا اور پھر کسی کے ہاتھ سے فروخت کرتا تو یہ بیع بھی درست مانی جاتی، لیکن یہاں صورت معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ مشتری اول جو اب بیع کر رہا ہے، وہ مال کو سمندر میں رہتے ہوئے، بغیر ضمان لئے ہوئے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے، تو بیع کی یہ صورت جائز نہ ہوگی، کیونکہ یہ "رجح المضمن" کی شکل بن رہی ہے جو کہ منہی عنہ ہے اور منہی عنہ فساد عقد کی مقتضی ہے، "سبل السلام" میں یہ روایت ہے:

"عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده رضى الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم يضمن، ولا يبيع ما ليس عندك" (سبل السلام ۲، ۸۰۹)۔

علامہ صنعانی "ولاربح مالم يضمن" کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: "قيل معناه: ما لم يقبض لأن السلعة قبل قبضها ليست في ضمان المشتري إذا تلفت، تلفت من مال البائع"۔

اور یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے، وہ یہ کہ مشتری اول سمندر میں موجود مال کو مشتری ثانی تک پہنچنے کا ضمان قبول کئے بغیر بیع کر رہا ہے، اس لئے یہ بیع ناجائز ہوگی۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے بیع و شراء کے مسائل

مولانا ظفر عالم ندوی

۱۔ بیع کے سلسلہ میں جو اصولی احکام ہیں ان پر غور کرنے اور بعض فقہی نصوص کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شمار بیع فاسد میں ہوگا، کیونکہ جب بیع کے ارکان موجود ہوں اور عوضین موجود ہوں تو بیع کا وجود ہو جاتا ہے، البتہ اس بیع کو قبضہ سے قبل فروخت کر دینے میں معاملہ علی الخطر ہو جاتا ہے کہ ایسا اس کا حصول ہو یا نہ ہو، اس بنا پر اس میں فساد پیدا ہو جائے گا، پھر یہ کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں نصوص شرعیہ میں جو نہی وارد ہے، وہ فساد کو ثابت کرتی ہے، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے اپنی مشہور تصنیف ”الفقہ الاسلامی وأدلته“ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو بیع فاسد کی فہرست میں شمار کرایا ہے، اور لکھا ہے: ”لا يجوز التصرف في المبيع المنقول قبل القبض؛ لأن النبي ﷺ نهي عن بيع مال لم يقبض والنهي يوجب فساد المنهي عنه“ (أبو داؤد، الفقہ الاسلامی وأدلته ۴، ۲۲۲)۔ (ایسی بیع جو منقول ہو قبضہ سے پہلے اس میں تصرف جائز نہیں ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی چیز کی بیع سے روک دیا ہے جس پر قبضہ نہ ہوا ہو، اور نہی منہی عنہ کے فساد کو ثابت کرتا ہے)۔

۲۔ قبضہ کی کوئی خاص حقیقت غالباً کتاب و سنت میں بیان نہیں کی گئی ہے، البتہ کتب فقہ کے مطالعہ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے یہاں ایسا تخلیہ جو بلا مانع اور بلا حائل ہو قبضہ ہے، اس سلسلے میں ناچیز کا خیال ہے کہ قبضہ کا تعلق عرف و رواج ہی سے ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس طرح کا استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا۔ علامہ کاسانی نے ”بدائع الصنائع“ میں ایک مسئلہ کے ضمن میں قبضہ کے مفہوم کو مختصر ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف کے نزدیک قبضہ میں اصل معیار عرف ہی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں: ”ولا يشترط بالبراجع لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع الصنائع ۴، ۱۳۸۶)۔

اور انگریزوں سے پکڑنے کی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ قبضہ کا مطلب دراصل تمکین، تخلیہ اور موانع کو دور کرنا ہے اور یہ عرف و عادات اور حقیقت کے مطابق ہو۔

علامہ شامی نے تسلیم اور قبضہ کی تفصیلات ذکر کرنے کے بعد جو حاصل بحث لکھا ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شریعت اسلامی میں قبضہ کی کوئی خاص شکل اور حقیقت متعین نہیں ہے بلکہ عرف میں جس چیز پر جس درجے کے عمل دخل حاصل ہونے کو قبضہ سمجھا جاتا ہو شرعاً بھی وہی قبضہ تصور کیا جائے گا۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

”حاصله: أن التخلية قبض حکماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة، لكن ذلك بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن تكون في البلد فما يظهر، وفي نحو بقرة في مرعى، فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض، وفي نحو ثوب، فكونه بحيث لو مديدة تصل إليه قبض، وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض“ (رد المحتار ۴، ۱۵۶۰)۔

(خلاصہ یہ کہ تخلیہ حکماً قبضہ ہے اگر بلا تکلف اس پر قدرت حاصل ہو، البتہ یہ بیع کے حسب حال ہوگا، پس گیہوں جیسی چیز اگر کسی مکان واسٹور میں ہو تو کنجی کا دے دینا، جبکہ بلا کسی دقت کے کھولنا ممکن ہو تو یہ قبضہ تصور کیا جائے گا، مکان جیسی چیزوں میں قبضہ یہ ہے کہ اس کے بند کر دینے اور تالا لگا دینے پر قدرت حاصل ہو جائے، گائے جو چراگاہ میں ہو اگر اس کو دکھا دیا جائے یا اشارہ کر دیا گیا تو یہ قبضہ ہے، کپڑا اگر اس طرح پھیلا دیا گیا کہ اس تک پہنچ جائے تو یہ قبضہ ہے، گھوڑے یا پرندے اگر گھر میں ہوں، بلا کسی تعین کے ان کی گرفت یا ان کو حاصل کرنا آسان اور ممکن ہو تو یہ قبضہ ہے)۔

علامہ شامی کے بیان سے جو خاص بات معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ بیع کے حسب حال قبضہ کا تصور ہوگا۔ علامہ ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں حنا بلہ کا جو مسلک بیان کیا ہے اس میں صاف وضاحت ہے کہ قبضہ کے سلسلے میں عرف و رواج ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

ط سورت، گجرات۔



”قبض کل شیء بحسبہ فان كان مكيلا أو موزونا فقبضه بكيله و وزنه أي أنه يجب الرجوع في قبض إلى العرف“ (المغنی ۴/۱۱۱)۔ (ہر چیز کا قبضہ اس کے حسب حال ہوگا، اگر مکلی ہے تو کیل کرے یا موزونی ہے تو وزن کرے اس پر قبضہ ہوگا، یعنی قبضہ کے سلسلہ میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا)۔

اسی طرح مالکیہ اور شافعیہ کے یہاں قبضہ کے سلسلہ میں صراحت موجود ہے کہ لوگوں کے درمیان قبضہ کا جو عرف جاری ہو اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

”وقبض المنقول كالأمتعة والأنعام والدواب بحسب العرف الجاري بين الناس“ (المجموعہ ۹/۳۰۱۶، المہذب ۱/۲۳۳)۔

اشیاء منقولہ مثلاً سامان، جانور، چوپائے کا قبضہ اس عرف کے مطابق ہوگا جو لوگوں میں جاری ہو۔

مذکورہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں کتاب و سنت میں قبضہ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں ہے، لہذا لوگوں کے عرف میں جس چیز پر جس درجہ کے تسلط اور عمل دخل کو قبضہ سمجھا جاتا ہے شرع میں بھی وہی قبضہ مانا جائے گا۔

۳۔ علامہ شامیؒ کی اوپر درج شدہ عبارت ”ذالك بحسب حال المبيع“ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کی نوعیت سے قبضہ کی صورتوں میں فرق ہوگا۔ مالکیہ اور شافعیہ نے اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کے قبضہ میں فرق بیان کیا ہے:

”قبض العقار كالأرض والبناء ونحوهما يكون بالتخلية بين المبيع وبين المشتري و تمكينه من التصرف فيه بتسليم المفاتيح إن وجدت و قبض المنقول كالأمتعة والأنعام والدواب بحسب العرف الجاري بين الناس“ (الفقه الاسلامی وأدلته ۴/۲۲۳)۔ (زمین اور مکان جیسی چیزوں کا قبضہ دراصل بیع اور مشتری کے درمیان تخلیہ اور اس میں تصرف پر قدرت حاصل ہونا ہے، اگر کنجیاں ہوں تو مکان کی کنجیاں سپرد کر دینا قبضہ ہے، اور منقول، جیسے سامان، جانور اور چوپائے کا قبضہ اس عرف کے مطابق ہوگا جو لوگوں میں جاری ہو)۔

اس سلسلے میں علامہ ظفر احمد عثمانی نے بہت ہی واضح طور پر لکھا ہے جس سے مسئلہ کی پوری نوعیت سامنے آجاتی ہے، علامہ موصوف ”شرح الوجیز للرافعی“ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”قال العبد الضعيف: وفي ”شرح الوجيز“ للرافعي ما نصه في بيان أن القبض بما يحصل؟ فينظر إن كان المبيع مما لا ينقل كاللحور والأرض فقبضه بالتخلية بينه وبين المشتري وتمكنه من اليد والتصرف، وإن كان المبيع من المنقولات فالذهب المشهور وبه قال أحمد: إنه لا يكفي فيه التخلية؛ بل لابد من النقل والتحويل۔ وقال مالك وأبو حنيفة: إنه يكفي فيه التخلية كما في العقار، وعن رواية حرملة قول مثله، وفيه وجه آخر: أن التخلية كافية لنقل الضمان إلى المشتري غير كافية للتسلط على التصرف۔“

الحالة الثانية: أن يباع الشيء مع اعتبار تقدير فيه، كما إذا اشترى ثوبا أو أرضا مذارعة أو متاعا موازنة، أو صبرة حنطة مكايلة أو معدودا بالعدد فلا يكفي للقبض ما مر في الحالة الأولى، بل لابد مع ذلك من الذرع أو الوزن أو الكيل أو العدد“ (اعلاء السنن ۱۴/۲۳۱)۔

(امام رافعیؒ نے شرح الوجیز میں جو صراحت کی ہے کہ قبضہ کس طرح ہوا کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غور کیا جائے گا اگر بیع اشیاء منقولہ میں سے نہ ہو، مثلاً گھر اور زمین ہو تو ان پر قبضہ بیع اور مشتری کے درمیان تخلیہ کرنے اور تصرف پر قدرت حاصل کر دینے سے ہوتا ہے، اور اگر بیع اشیاء منقولہ میں سے ہو تو مشہور قول اور مسلک یہ ہے کہ صرف تخلیہ کافی نہیں، بلکہ نقل اور تحویل بھی ضروری ہے، یہی خیال امام احمد کا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اشیاء منقولہ میں بھی تخلیہ کافی ہے جیسا کہ عقار میں ہے۔ اور حرملة سے اسی طرح کا قول منقول ہے، اور اس میں ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ تخلیہ کافی ہے ضمان کے نقل ہونے کی وجہ سے مشتری کی طرف، اور نا کافی ہے تصرف پر قادر ہونے کے اعتبار سے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ اشیاء فروخت کی جائیں اس میزان کے اعتبار سے جو ان میں معتبر ہیں، مثلاً کپڑے یا زمین کو پیمائش کے اعتبار سے، گےہوں کے ڈھیر کو کیل کے اعتبار سے یا معدودی اشیاء کو عدد کے اعتبار سے، تو ان میں قبضہ کے لئے وہ چیز کافی نہیں جو پہلی صورت میں گذری، بلکہ یہاں پیمائش کرنا، وزن یا کیل کرنا یا گنتا ضروری ہے، جب ہی قبضہ کا تصور ہوگا)۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق جو احادیث ہیں وہ معلول بالعلیہ ہیں، عام طور پر مجتہدین نے علت نہی غرر کو بتایا ہے۔ محقق علامہ ظفر احمد عثمانی نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ”إن أبا حنيفة وأبا يوسف خصا النصوص المنقول بعللة النهي وهو غرر انفساخ العقد بالهالك قبل القبض، و محمد أجراها على عمومها، والشافعي خصها بما لم يكن متميزا وهو اختلاف الاجتهاد“ (اعلاء السنن ۱۲، ۲۲۲)۔

(امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف نے نصوص کو نہی کی علت کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ علت دراصل قبضہ سے قبل ہلاک ہونے کی وجہ سے عقد کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے، اور امام محمد نے ان نصوص کو عموم پر چھوڑ دیا ہے، اور امام شافعی نے ایسی چیزوں کے ساتھ خاص کیا ہے جو میسر و ممتاز نہ ہو، اور یہ اختلاف اجتہادی ہے)۔

ڈاکٹر وہب الزحلی نے احناف کے مسلک پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: ”والخلاصة أن العلة عند الحنفية في عدم جواز بيع الشيء قبل قبضه هي الغرر“ (الفقه الاسلامي وادلته ۴، ۲۷۳)۔ (خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے عدم جواز میں حنفیہ کے نزدیک علت غرر ہے)۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی صورت میں تمام اشیاء کی بیع کو ممنوع قرار نہیں دیا، بلکہ جہاں علت نہی پائی جاتی ہے وہاں ممنوع ہے اور جہاں علت نہیں پائی جاتی ہے وہاں ممنوع نہیں۔ مثلاً احناف میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف نے عقار کی بیع کو قبل القبض جائز قرار دیا ہے، اور وجہ جواز یہی بیان فرمایا ہے کہ اس میں غرر نہیں ہے: ”أما العقار كالأراضي والدور فيجوز بيعه قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف استحسانا... ولا غرر في العقار إذ لا يتوهم هلاك العقار ولا يخاف تغيره غالبا بعد وقوع البيع وقبل القبض أن تلف العقار غير محتمل فلا يتقرر الغرر“ (المبسوط ۸، ۱۳، بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲، فتح القدير ۵، ۲۶۳)۔

عقار مثلاً زمین اور مکان ان کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک استحساناً جائز ہے، اور عقار میں غرر نہیں ہے، کیونکہ عقار کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہی نہیں اور نہ ہی بیع ہونے کے بعد تبدیلی اور تغیر کا اندیشہ ہے، قبضہ سے قبل تلف ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے غرر ثابت نہیں ہے)۔ البتہ مالکیہ کے نزدیک علت نہی ”ربا النسبية“ ہے، ان کے نزدیک طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست نہیں ہے، اور طعام کے علاوہ اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے۔

”وقال المالكية: لا يجوز بيع الطعام قبل القبض ربويا كان أو غير ربوي لحديث ابن عباس رضي الله عنهما وابن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه“ (مجمع الزوائد ۲، ۹۸، نيل الأوطار ۵، ۱۵۸)۔ (مالکیہ نے کہا کہ طعام کی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے، خواہ وہ طعام اموال ربویہ میں سے ہو یا نہ ہو، اور یہ عدم جواز ابن عباس رضي الله عنهما و ابن عمر رضي الله عنهما کی روایت کی وجہ سے ہے کہ رسول اللہ صلى الله عليه وسلم نے فرمایا: جس نے طعام خریدو اس کو نہ فروخت کرے تا آنکہ اس پر قبضہ نہ کر لے)۔

”وأما سوى ذلك أو بيع الطعام جزافا، فيجوز بيعه قبل قبضه لغلبة تغير الطعام بخلاف ما سواه والعلة في منع بيع الطعام قبل قبضه عند المالكية هي أنه قد يتخذ البيعة ذريعة للتوصل إلى ربا النسبية، فهو شبيه ببيع الطعام بالطعام نساء فيحرم سدا للذرائع“ (الفقه الاسلامي وادلته ۲، ۲۶۶)۔

(اور اس کے علاوہ میں یا طعام کی بیع انکل سے ہو تو قبضہ سے قبل جائز ہے تغیر طعام کے غلبہ کی وجہ سے، برخلاف اس کے علاوہ اشیاء میں۔ مالکیہ کے نزدیک علت نہی یہ ہے کہ یہ بیع ربا النسبية تک پہنچنے کا ذریعہ بن رہی ہے، اس لئے یہ بیع الطعام بالطعام نسبية کے ہم مشابہ ہے، جو سدا للذریعہ حرام ہے)۔ احناف ہی کی طرح حنابلہ نے بھی علت نہی غرر کو مانا ہے، البتہ مکملی، موزونی اور معدودی اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے:

”قال الحنابلة: لا يجوز بيع الطعام قبل قبضه إذا كان مكيلا أو موزونا أو معدودا، وأما عدا المكيل والموزون والمعدود فيصح قبل قبضه، فالعلة عنده الغرر“ (حوالہ سابق ۲، ۲۶۳)۔

(حنابلہ نے کہا ہے کہ طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ مکملی یا موزونی یا معدودی ہو، اگر مکملی، موزونی اور معدودی کے علاوہ، تو اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، علت نہی ان کے نزدیک غرر ہے)۔



خلاصہ یہ کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق جو روایات ہیں وہ معلول بالعلتہ نہیں۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کے عموم و تخصیص کے سلسلے میں ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی ممانعت عام ہے، مہذب میں ہے: ”قال الشافعی: لا يجوز بيع مال مستقر ملكه عليه مطلقا قبل قبضه عقارا كان او منقولا لعموم النهي عن بيع مال يقبض“ (المہذب ۱۰۲۶)۔ (امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جس چیز میں ملکیت ثابت نہ ہو جائے اس کی بیع جائز نہیں ہے قبضہ سے قبل، خواہ عقار ہو یا منقول ہو، روایت میں بھی کے عموم کی وجہ سے)۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نے اس ممانعت سے عقار کی بیع کو مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اسے جائز قرار دیا ہے، ان کے نزدیک ممانعت عام نہیں ہے (بدائع الصنائع ۲۳۴/۵)۔ اسی طرح امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ممنوع عام نہیں ہے، بلکہ بعض اشیاء کو تفصیل سے فرمایا ہے جس سے مسئلہ کی پوری نوعیت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے، میں یہاں امام نوویؒ کی ہی کی بحث کو نقل کرنا زیادہ مفید سمجھتا ہوں، علامہ موصوف لکھتے ہیں:

ترجمہ: ہم نے بیان کیا ہے کہ ہمارا مسلک اس کے بطلان کا ہے، خواہ طعام ہو یا غیر طعام ہو، یہی بات ابن عباسؓ سے بھی ثابت ہے، اور امام محمدؒ بھی یہی کہتے ہیں، ابن المنذر نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص نے طعام خرید تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے بیچ دے، تا آنکہ اس پر قبضہ نہ کر لے، اور غیر طعام کے سلسلہ میں فقہاء کے چار مذاہب ہیں: ایک یہ کہ کسی چیز کی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں ہے، خواہ بیع جس قبیل سے ہو، جس طرح طعام میں جائز نہیں ہے، یہ قول امام شافعیؒ و امام محمدؒ کا ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ سوائے منکلی و موزونی کے تمام اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، یہ قول عثمان بن عفان، سعید بن مسیب اور دیگر حضرات کا ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ سوائے گھراور زمین کے دیگر تمام چیزوں کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے، یہ قول امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ چوتھا مذہب یہ ہے کہ سوائے ماکولات و مشروبات کے تمام چیزوں کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، یہ قول امام مالکؒ و ابو ثورؒ کا ہے۔ ابن المنذر کا خیال یہ ہے کہ یہی قول سب سے زیادہ صحیح ہے، اس حدیث کی بنا پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے منع فرمادیا ہے، امام مالکؒ اور ان کے موافقین نے ابن عمرؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے: ”من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه“، اور ابن عباسؓ کی روایت کو بھی مستدل بنایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے منع فرمایا وہ طعام ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ان روایات میں جو طعام کی صراحت ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیر طعام کا حکم اس کے برعکس ہے۔ ہمارے اصحاب شوافع نے حکیم بن حزام کی روایت سے استدلال کیا ہے: ”لا تبع مالہ تقبضہ“ یہی زید بن ثابت کی روایت ہے کہ سامان وہاں نہ خریدا جائے جہاں فروخت ہوا ہے تا آنکہ تجارا اپنے گھروں میں اسے جمع نہ کر لیں، امام ابو داؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے نصوص کے اطلاق سے استدلال کیا ہے، اور اس سے کہ عقار کے تلف ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، برخلاف غیر عقار کے..... یہ پوری بحث امام نوویؒ کی کتاب شرح المہذب سے تلخیص کے ساتھ نقل کی گئی ہے (شرح مہذب ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰)۔

۶۔ اس صورت میں ضمان کو قبضہ حسی کے قائم مقام قرار دیا جائے گا اور اس طرح کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ عرف میں بھی اسے قبضہ ہی تصور کیا جاتا ہے، اور یہ ایسا عرف ہے جو نصوص شارع سے متصادم بھی نہیں ہے، لہذا اس کے جواز میں کوئی تردد نہیں ہے۔

۷۔ جہاز پر لدا ہوا مال جو ابھی سمندر ہی میں ہو اور مشتری اول نے ابھی اسے وصول بھی نہ کیا ہو اس مال کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دینا یا تیسرے شخص کا اس مال کو خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ معاملہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممنوع صورت میں داخل ہے، اور فقہاء نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اشیاء منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔





## قبضہ سے پہلے ہونے والی خرید و فروخت کا شرعی حکم

مولانا محمد عزیز اختر القاسمی

۱۔ بیع قبل القبض شریعت کی روشنی میں:

حدیث اور فقہ و فتاویٰ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ ناجائز ہے، کیونکہ حدیث میں عتاب بن اسید کا واقعہ لکھا ہے کہ جب انہیں مکہ کا امیر بنا کر بھیجا جا رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جاؤ بیت اللہ والوں کی طرف اور انہیں چار چیزوں سے روکو، ان میں سے پہلی چیز قبل القبض ہے“ (فتح القدیر ۱۳۶/۶)۔ اور ”مشکوٰۃ شریف“ میں یہ حدیث ہے: ”قال رسول اللہ ﷺ: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه“، اور اس کے آگے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول مذکور ہے کہ ”أما الذي نهي عنه النبي ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب كل شيء إلا مثله“ (مشکوٰۃ ۱۰۲۴)۔

اور اس کے علاوہ مختلف محدثین نے اپنی اپنی تالیفات میں، بہت سی دوسری احادیث نقل کی ہیں جن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ درست نہیں ہے۔ علامہ برہان الدین نے بھی ایسی عبارت درج فرمائی ہے جن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیع قبل القبض ناجائز ہے (ہدایہ مع الفتح ۱۳۵/۶، البحر الرائق ۱۱۶/۶)۔ چنانچہ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اشیاء جسے منتقل کرنا ممکن ہو قبضہ سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

ہدایہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے جہاں یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ منقولہ اشیاء کی خرید و فروخت قبضہ سے قبل ناجائز ہے وہیں یہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ غیر منقولہ اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے، جیسے زمین۔

حضرت امام محمدؒ کی رائے اس کے متعلق بھی یہی ہے کہ قبضہ سے قبل اس کا فروخت کرنا جائز نہیں، ان کی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ حدیث میں مطلقاً غیر مقبوضہ اشیاء کی بیع سے منع کیا گیا ہے، لہذا حدیث اپنے اطلاق کی وجہ سے تمام اشیاء غیر مقبوضہ کی بیع کو شامل ہوگی، خواہ وہ شیء از قبیل منقولات ہو، یا غیر منقولات، سب کی بیع قبضہ سے قبل ناجائز ہوگی۔

لیکن حضرات شیخینؒ کی رائے ہے کہ حدیث تمام اشیاء کو عام نہیں ہے، بلکہ صرف منقولہ اشیاء کا حکم حدیث میں ذکر کیا گیا ہے، اور وہ اشیاء جو غیر منقولہ ہیں اس کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہوگی، ان کی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ حدیث مذکور معلل بعلت ہے، یعنی شبہ ”غرر“ لہذا جہاں کہیں یہ علت ہوگی، ”بیع قبل القبض“ ناجائز اور جہاں علت معدوم وہاں ”بیع قبل القبض“ جائز ہوگی (البحر الرائق ۱۱۶/۶)، علامہ شامیؒ نے بھی یہ تفصیل ذکر فرمائی ہے، چنانچہ انہوں نے جو فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

ہر وہ شیء جو نقل نہ کی جاسکتی ہو اس کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہوگی، لیکن جو منتقل کی جاسکتی ہو اس کی بیع قبضہ سے قبل درست نہیں ہے، عبارت اس طرح ہے:

”صح يبيع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار حتى لو كان علوا او على شط نهر ونحوه كان كمنقول فلا يصح اتفقا ككتابة وإجارة وبيع منقول قبل قبضه“ (در مختار ۴۰۲۲)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کے جائز و ناجائز ہونے کا مدار منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء ہونے پر نہیں ہے، بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر وہ بیع جس پر مشتری ثانی یا ثالث کی ملکیت اور قبضہ متحقق ہونے سے قبل اس بیع کا ہلاک ہونا نادر ہو، خواہ یہ ندرت کسی وجہ سے بھی ہو اس کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہوگی، خواہ وہ منقولہ ہی کیوں نہ ہو، اور ہر وہ شیء جس پر مشتری ثانی کی ملکیت و قبضہ سے قبل ہلاک ہونا اکثر ہو تو اس کی بیع قبضہ سے قبل درست نہیں ہے۔

## بیع قبل القبض باطل ہے یا فاسد:

وہ اشیاء کہ جن کی بیع قبضہ سے قبل ناجائز ہے تو اگر کہیں اس قسم کی بیع کا تحقق ہوتا ہے باطل کہا جائے گا، یا فاسد، یا مکروہ؟  
فقہاء محققین نے بیع منہی عنہ کی عموماً تین قسم ذکر فرمائی ہے: باطل، فاسد اور مکروہ۔

فاسد وہ بیع ہے جو اپنے اصل کے اعتبار سے صحیح اور وصف کے اعتبار سے غیر مشروع ہو، اور باطل وہ بیع ہے جو اصل و وصف دونوں اعتبار سے غیر مشروع ہو، اور مکروہ بیع وہ ہے جو اصل و وصف دونوں اعتبار سے مشروع ہو، لیکن کسی شیء مجاور کی وجہ سے اس قسم کی بیع سے روک دیا ہو، جیسے بیع بوقت اذان جمعہ کہ ایسی بیع اپنے اصل و وصف کے اعتبار سے مشروع ہے لیکن ”سعی الی الجمعہ“ جو واجب ہے، کا چونکہ ترک لازم آتا ہے اس لئے ایسی بیع مکروہ ہوگی، یہی وجہ ہے کہ اگر ”سعی الی الجمعہ“ کا ترک لازم نہ آوے اور بیع بھی ہو رہی ہو تو با اتفاق فقہاء اس میں کوئی حرج و کراہت نہیں ہے، جیسے بائع اور مشتری کسی کشتی میں سوار ہو کر جامع مسجد کی طرف جارہے ہوں اور درمیان راہ بیع بھی ہو رہی ہو تو یہ جائز ہوگی (نور الانوار ۶۲)۔

بیع باطل اور فاسد میں فرق و امتیاز اس طرح آسان ہوگا کہ عوضین میں سے کوئی ایک یا دونوں موجودہ شریعت یا سابقہ شریعت میں مال نہ ہو تو بیع باطل ہوگی، جیسے مردار اور خون کی بیع، لیکن اگر عوضین میں سے کوئی ایک سابقہ شریعت میں مال تو تھا، لیکن موجودہ شریعت میں مال نہیں ہے اور اسے کسی ایسی شیء کے ذریعہ فروخت کیا جا رہا ہے جو اموال کے قبیل سے ہے اثمان کے قبیل سے نہ ہو تو ایسی بیع فاسد ہوگی، اور اگر اس کا عکس ہو، یا اثمان کے ذریعہ خریداجا رہا ہو تو یہ بیع باطل ہوگی (ردالمحتار ۱۳۸)۔

بیع باطل و فاسد کی حقیقت اور فرق واضح ہو جانے کے بعد فیصلہ آسان ہو گیا، چنانچہ ”بیع قبل القبض“ میں عاقدین اہل ہوں، اور عوضین میں سے ہر ایک موجودہ شریعت میں مال ہے تو ایسی بیع فاسد ہوگی، اور اگر ایسا نہ ہو، بلکہ اس کے خلاف ہو تو ایسی بیع باطل ہوگی، چنانچہ متقدمین بزرگوں نے بھی اسی تفصیل کے مطابق ”بیع قبل القبض“ کو فاسد و باطل قرار دیا ہے، ”شرح عنایہ حاشیہ فتح القدیر“ میں عبارت اس طرح درج ہے:

”والنہی یقتضی الفساد، فیکون البیع فاسداً قبل القبض“ (فتح القدیر ۶۱۳۷) اور در مختار کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ باطل ہے، عبارت اس طرح ہے: ”بخلاف بیعہ قبلہ فانہ باطل مطلقاً“ (در مختار ۲۲۵، ۲) اور ”الجوہرۃ النیرۃ“ کی عبارت سے بھی یہی سمجھ میں آ رہا ہے، عبارت ملاحظہ ہو: ”لا یجوز بیعہ قبل القبض لا من بائعہ ولا من غیرہ فان باعہ، فالبیع الثانی باطل والبیع الأول علی حالہ جائز“ (۱۰۲۱۰)۔

مذکورہ دونوں عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ”بیع قبل القبض“ باطل ہے، لیکن اصل وہی ہے جو بحوالہ ”فتح القدیر“ اوپر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ حدیث میں صحت بیع کی جو نفی ہے وہ گرچہ باطل اور فاسد دونوں قسم کو شامل ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ ایسی بیع فاسد ہے، باطل تو اس صورت میں ہوتی جب عوضین میں سے کوئی ایک مال ہی نہ ہوتا، اور یہاں مفروضہ مسئلہ میں عوضین میں سے ہر ایک مال کا ہونا فرض کیا گیا ہے اور عاقدین اہلیت بھی رکھتے ہوں، صرف منع شبہ ”غرر“ کی وجہ سے کیا گیا ہے، اور متقدمین نے جو باطل قرار دیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ بیع فاسد ہوگی، باطل نہیں، اور علامہ شامی نے یہی محاکمہ بھی فرمایا ہے کہ باطل سے فاسد ہی مراد ہے باطل نہیں، عبارت اس طرح ہے: ”الواقع فی المتن یحتملہما ای یحتمل البطلان والفساد والظاہر الثانی“، ”لان علة الفساد الغرر كما مر مع وجود ركنی البیع وكثيرا ما يطلق علی الفساد“ (ردالمحتار ۲۲۶)۔

## ۲۔ قبضہ کی حقیقت:

قبضہ باعتبار لغت: ”قبض قبضاً الشئ و علی الشئ“ کسی شیء کو پکڑنا، قبضہ میں لینا اور سمیٹنا وغیرہ، اور اسلامی شریعت میں قبضہ کا حاصل یہ ہے، مالک اموال اپنی ملکیت سے اس طرح دست بردار ہو جائے اور علاحدہ ہو جائے کہ وہ شیء کسی شیء کے ساتھ نہ مشغول ہو اور نہ وہ شیء مالک اول کے کسی چیز کے ساتھ متصل ہو اور غیر کا اس پر استیلاء ہو جائے، نیز مالک اول ان باتوں کو اپنی زبان سے ظاہر بھی کر رہا ہو کہ میں نے مال تمہارے حوالہ کیا، جیسا کہ ”در مختار“ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، عبارت اس طرح ہے: ”ثم التسليم یكون بالتخلية علی وجه یتمكن من القبض بلا مانع و حائل و شرط فی الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن یقول: خلیت بینک و بین المبیع“ (در مختار ۵۸، ۲)۔



علامہ ابن نجیم مصری نے قبضہ کی حقیقت جو ذکر فرمائی ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے، ان کی ذکر کردہ عبارت اس طرح ہے: ”وأما ما يصير به قابضا حقيقة ففي التجريد تسليم المبيع أن يخلى بينه وبين المبيع على وجه يتمكن من قبضه بخير حائل“ (البحر الرائق ۵، ۲۰۸)۔

مذکورہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبضہ کی حقیقت متحقق ہونے کے لئے تین چیزوں کا وجود ضروری ہے، ایک یہ ہے کہ مالک مال غیر سے یوں کہے کہ میں نے مال تیرے حوالہ کیا، دوسری یہ کہ یہ قول اس غیر کی موجودگی میں اس طرح ہو کہ اس شخص کے لئے مال پر استیلاء کلی ممکن ہو اور کوئی چیز اس کے استیلاء سے مانع نہ ہو اور تیسری چیز یہ ہے کہ وہ اس طرح علاحدہ ہو کہ وہ شئی نہ کسی حق کے ساتھ مشغول ہو اور نہ کسی شئی کے ساتھ متصل ہو، اور شخص غیر یہ کہے کہ ”میں نے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا“ یا اس کی طرف سے کوئی ایسا فعل ہونا ضروری ہے جس سے قبضہ پر دلالت ہوتی ہو۔

لہذا اگر بائع یہ نہ کہے کہ میں نے یہ مال تیرے حوالہ کیا، یا غیر کیلئے فی الحال اس مال پر کسی وجہ سے استیلاء ممکن نہ ہو، یا وہ مال کسی کے حق کے ساتھ مشغول ہو، یا کسی شئی کے ساتھ متصل ہو تو ان تمام صورتوں میں قبضہ کا متحقق نہ ہوگا، جیسا کہ ”البحر الرائق“ کی عبارت سے سمجھ میں آرہا ہے، عبارت اس طرح شروع ہوئی ہے: ”إن دفعه ولم يقل شيئاً الخ“ (۵، ۲۰۸)۔

قبضہ کی کوئی متعین صورت نہیں ہے:

شریعت کے اعتبار سے قبضہ کے تحقق کیلئے کوئی خاص شکل متعین نہیں ہے کہ اس کے علاوہ صورت میں قبضہ کا متحقق ہی نہ ہو، بلکہ عرف و عادت کے لحاظ سے قبضہ کی جو شکل بھی معروف و متعارف ہو اور متصور ہو سکتی ہو وہی شکل باعتبار شرع معتبر ہوگی، یہی وجہ ہے کہ بیع تعاطی کارواج قائم ہے اور شریعت اس کو جائز قرار دیتی ہے، اگر باعتبار شرع قبضہ کی کوئی خاص شکل متعین ہوتی تو قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اس طرح کی خرید و فروخت ناجائز ہوتی اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والا مال خبیث ملک ہوتا، لیکن فقہ و فتاویٰ کی تمام کتابوں میں تقریباً اس کے جواز کا تذکرہ ملتا ہے، اور اسے خلاف قیاس بھی نہیں کہا گیا ہے (البحر الرائق ۵، ۲۰۸)۔

نیز اسی وجہ سے کہ قبضہ کی کوئی شکل باعتبار شرع متعین نہیں، بلکہ اسے عرف و عادت پر مبنی قرار دیا گیا ہے، مختلف اشیاء میں مختلف طرق سے قبضہ کا متحقق ہوتا ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم نے ”البحر الرائق“ میں قدرے اس کی تفصیل ذکر فرمائی ہے، مثلاً وہ پھل جو درخت پر ہوتے ہوئے فروخت کئے گئے ہیں تو گرچہ یہ پھل بائع کے درخت کے ساتھ متصل ہے، لیکن جب حوالہ کرنا اور مشتری کا دیکھنا پایا گیا تو قبضہ ہو جائے گا، اس کے برخلاف اگر کسی نے کوئی مکان فروخت کیا اور اس کا کچھ مال و اسباب اس میں ہے اور اسی حال میں بائع نے مکان کا تالا مشتری کے حوالہ کر دیا تو یہاں قبضہ کا متحقق نہ ہوگا، یا گندم، یا اور کوئی غلہ مشتری کے حوالہ اس طرح کیا کہ وہ بائع کی تھیلی میں ہے تو قبضہ کا متحقق نہ ہوگا (رد المحتار ۵۸۳، بحر الرائق ۵، ۳۰۸-۳۰۹)۔

اور کسی جگہ قبضہ کا متحقق اس طرح ہوگا کہ مشتری کے حوالہ اس طرح ہوگا کہ مشتری بیع کو اپنی جگہ، یا اپنے مکان کی طرف منتقل کر لے، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا، ابن عمرؓ کی روایت میں ہے: ”قمنها هم رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعة في مكان حتى ينقلوه“ تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ کے تحقق کے لئے ”نقل الشيء من مكان إلى مكان“ کافی ہے، اور دوسری حدیث جو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے، اس میں ”حتى تقبض“ کا لفظ ہے، جس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مطلقاً قبضہ ضروری ہے، چاہے جس صورت سے ہو اور چاہے ”نقل الشيء من مكان إلى مكان“ کا وجود ہو یا نہ ہو (مشکوٰۃ شریف ۱، ۲۴)۔

نیز شریعت نے بھی اس کو عرف و عادت ہی پر چھوڑ دیا ہے اس کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے، چنانچہ مسئلہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک زمین خریدی اور وہ زمین مشتری کی نگاہ سے اوجھل ہے پھر بھی قبضہ کا متحقق ہو جائے گا، اس کے برخلاف کسی نے کوئی مکان خرید اور وہ مکان مشتری کی نگاہ سے دور ہے تو بیع صحیح ہوگی، لیکن قبضہ کا متحقق نہ ہوگا، علامہ ابن نجیم نے بصراحت یہ مسئلہ لکھا ہے، البحر الرائق میں عبارت اس طرح ہے: ”وفي جامع شمس الأئمة يصح القبض وإن كان العقار غائباً عنهما عند أبي حنيفة“ اور دوسری جگہ عبارت اس طرح ہے: ”ولو باء داراً غائبة فقال: سلمتها إليك، فقال: قبضتها لم يكن قبضاً الخ“ (البحر الرائق ۵، ۲۰۸)۔

۳۔ منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کے قبضہ میں فرق ہے:

قبضہ کی حقیقت جو ابھی ذکر کی گئی اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کے قبضہ میں قدرے اشتراک ہے، کیونکہ جہاں کہیں قبضہ کے تصور و تحقق کا ذکر ہے وہاں ایسی عبارت ملتی ہے: ”تسليم المبيع أن يخلى بينه وبين المبيع على وجه يتمكن من قبضه بخير حائل“ (البحر الرائق)۔



مذکورہ عبارت میں بیع عام ہے، خواہ منقول ہو، یا غیر منقول، البتہ حدیث میں جو عبارت ملتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ منقولہ اشیاء کی بیع قبضہ سے قبل جائز نہیں، اور اس کی غایت یہ ذکر کی گئی ہے کہ مشتری اس کو ایسی جگہ منتقل کر لے جہاں بائع کا کوئی تعلق نہ ہو، روایت اس طرح ہے: ”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: کانوا یتبايعون الطعام في أعلى السوق، فيبيعونه في مكانه فنهاهم رسول الله ﷺ عن بيعه في مكانه حتى ينقلوه“ (مشکوٰۃ، ۱: ۲۲۷) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ منقولہ اشیاء میں قبضہ کا تحقق اس طرح ہوگا کہ مشتری بیع کو محل خریداری سے اپنی جگہ اور اپنے مکان کی طرف منتقل کر لے، لیکن غیر منقولہ اشیاء میں یہ ممکن ہی نہیں ہے، اسی وجہ سے صاحب ”بحر“ نے یہ نقل کیا ہے کہ منقولہ اشیاء میں تحقق قبضہ کیلئے ضروری ہوگا کہ مشتری کی طرف سے بیع کو منتقل کرنا پایا جائے، عبارت اس طرح ہے: ”وفي المنقول بالنقل والنقل إلى مكان لا يختص بالبائع“۔

مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ تسلیم المبیع کی صحت کیلئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، عبارت اس طرح ہے: ”وفي الأجناس يعتبر في صحة التسليم ثلاثة معان، أن يقول: خليت بينك وبين المبيع، وأن يكون يحضره المشتري على صفة يتأتى فيه الفعل من غير مانع، وأن يكون مفرزا غير مشغول بحق“ (البحر الرائق، ۵: ۲۸۰-۲۸۱)۔

اور غیر منقولہ اشیاء میں تحقق قبضہ کے لئے تینوں باتوں کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ اول کی دو باتیں یعنی تخلیہ کا قول و فعل اور مشتری کا حاضر ہونا کافی ہے، عبارت اس طرح ہے: ”وفي النهاية معزيا إلى الغاية: أن القبض في العقار بالتخلية، اور حضور مشتری کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ اگر نہ مشتری ہو اور نہ اس کا کوئی وکیل اور نہ کوئی نائب ہو تو بیع پر قبضہ جو مشتری کا فعل ہے، کا تحقق نہیں ہو سکتا ہے، گویا تحقق قبضہ کیلئے مشتری کا اس پر قبضہ کرنا ممکن ہونا بھی ضروری ہے، چنانچہ اگر کسی جگہ ایسا ممکن نہ ہو، بایں طور کہ مشتری موجود ہو، لیکن بیع کے مشتری سے دور ہونے کی بناء پر مشتری کے لئے اس پر قبضہ کرنا ممکن نہیں ہے تو قبضہ کا تحقق نہ ہو سکے گا، علامہ ابن نجیم وغیرہ بزرگان امت نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک قطعہ اراضی فروخت کیا اور اس کی طرف سے تخلیہ کا بھی تحقق ہو، اگر یہ قطعہ اراضی مشتری کے قریب نہیں ہے، بلکہ دور ہے تو قبضہ کا تحقق نہ ہوگا، عبارت اس طرح ہے:

”ذكر في النوادر إذا باء ضيعة وخلي بينها وبين المشتري إن كان يقرب منها يصير قابضا، وإن كان يبعد لا يصير قابضا“ (البحر الرائق، ۵: ۲۰۸، در مختار، ۴: ۵۹)۔

قریب و بعید کا یہ معیار قائم کیا گیا ہے کہ اگر اس بیع پر مشتری کیلئے وہاں پر رہتے ہوئے قبضہ کرنا بلا تکلف ممکن ہو تو وہ قریب ہے، اور اگر بلا تکلف ممکن نہ ہو تو وہ بعید ہے، مثلاً کسی شخص نے ایک مکان خریدا اور بائع نے اس مکان کی تالی مشتری کے حوالہ کر دیا تو مشتری کیلئے اگر اس مکان کو کھولنا اور اس کو بند کرنا بلا تکلف ممکن ہو تو قبضہ کا تحقق ہوگا اور اگر بلا تکلف کھولنا بند کرنا ممکن نہ ہو تو قبضہ کا تحقق نہ ہوگا، اگرچہ امام اعظم اور حضرات صاحبین کا اس میں قدرے اختلاف ہے، امام صاحب کی رائے یہ ہے کہ زمین پر قبضہ کے تحقق کیلئے مشتری کا زمین کے قریب ہونا ضروری نہیں، دور ہو تو بھی قبضہ کا تحقق ہو جائے گا، البتہ بائع کی طرف سے تخلیہ ہونا چاہئے، لیکن حضرت امام صاحب کا یہ قول مرجوح ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے ذکر فرمایا ہے۔

”وفي المحيط وجامع شمس الأئمة: أنه بالتخلية يصح القبض، وإن كان العقار بعيدا غائبا عنهما عند أبي حنيفة خلافا لهما وهو ضعيف“ (رد المحتار، ۴: ۵۹)۔

اور صاحب ”بحر“ نے بھی یہ وضاحت کی ہے کہ امام صاحب کا یہ قول ضعیف ہے، عبارت اس طرح ہے: ”فقد علمت ضعف ما في المحيط وجامع شمس الأئمة الخ“ (البحر الرائق، ۵: ۳۰۹)۔

”الموسوع الفقہیہ“ کے مطالعہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کے قبضہ میں بڑا فرق ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے کہ ہر شیء پر قبضہ اسی کی حیثیت سے ہوتا ہے، عبارت یوں ہے: ”إن قبض كل شيء بحسبه“ آگے مزید تفصیل یوں ذکر کی گئی ہے کہ اگر بیع کیلئے ہو تو قبضہ بذریعہ کیل ہوگا، اور وزنی ہے تو قبضہ بذریعہ وزن ہوگا، اور اگر عددی یا ذراعی ہے تو قبضہ شمار کر کے، یا ناپ کر کے، ہوگا، اور اگر اس کے علاوہ دوسری کوئی منقولہ شیء ہو تو اس پر قبضہ کا تحقق عرف جاری کے ذریعہ ہوگا، لہذا جس چیز پر قبضہ کا جو تصور اور جو طریقہ معروف و متعارف ہوگا اسی طریقہ کے مطابق قبضہ کا تحقق ہوگا، ساری چیزوں پر قبضہ کی ایک ہی شکل لازم و ضروری نہ ہوگی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔

## ۳۔ حدیث نبی معلول ہے:

خرید و فروخت کی صحت کے لئے جہاں اور بہت سی شرطیں ہیں وہیں ایک شرط یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا دھوکہ اور مشتری کے قبضہ میں آنے سے قبل ہلاکت بیع کا کوئی خطرہ نہ ہو، اگر اس طرح کا کہیں کسی طرح کا خطرہ پیدا ہو جائے تو خرید و فروخت ناجائز ہو جائے گی، چنانچہ علامہ ابن ہمام نے ”فتح القدير“ میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت میں دھوکہ بازی سے منع فرمایا ہے، الفاظ اس طرح ہیں: ”أنه ینہی عن بیع الغرر“ (فتح القدير، مشکوٰۃ، ۱، ۲۴۰)۔

اس سے صاف طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر وہ بیع جس میں ”غرر“ کا امکان ہو وہ بیع ناجائز ہوگی، کیونکہ خرید و فروخت کے متعلق بطور خاص وجود دھوکہ ہی نہیں، بلکہ امکانی دھوکہ کا سدباب بھی مقصود ہے، اسی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں رائج بیعوں میں سے جس بیع کے اندر امکانی دھوکہ کا تصور ہو اس سے منع کر دیا گیا، اور دھوکہ بازی کرنے والے شخص کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”من غش فلیس منا، اور: ”نہی رسول اللہ ﷺ عن المحاقلة والمزابنة والمخابرة والمعاومة“ وغیرہ احادیث سے صاف طور پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ دھوکہ کا امکان جس بیع میں ہوگا وہ بیع ناجائز ہوگی، اور جو شخص دھوکہ بازی کرے گا وہ امت کا فرد ہی نہ ہوگا۔

اسی طرح بیع قبل القبض کے متعلق جو روایتیں مختلف سندوں اور متنوں کے ساتھ پائی جاتی ہیں وہ ممنوع صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ فروخت کی جانے والی شے بائع کے قبضہ میں نہیں ہے، اور جہاں کہیں بھی بیع قبل القبض کا تصور ہو اسے ناجائز قرار دیا جائے، بلکہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت اس جگہ ہوگی جہاں دھوکہ کا امکان ہو، گویا کہ ہر وہ حدیث جس میں ”بیع قبل القبض“ سے نہی آئی ہے وہ مطلقاً نہیں بلکہ معلول ہے کسی علت کے ساتھ، اور اس کی علت امام ابوحنیفہ کے نزدیک ”غرر“ یعنی امکانی دھوکہ ہے، گویا ممانعت فرما کر امکانی دھوکہ کا بھی سدباب کر دیا گیا۔

اور علت نہی ”غرر“ یعنی امکانی دھوکہ ہی ہے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اس لئے کہ بعد استقراء و تتبع یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ معاملہ جہاں امکانی دھوکہ کا تصور ہو تو اس سے ممانعت کر دی گئی اور جہاں کہیں جس معاملہ میں امکانی دھوکہ کا تصور نہیں اس معاملہ کو درست قرار دیا گیا، جیسے کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی اور مہر میں غلام مقرر کیا گیا، تو عورت کیلئے اس پر قبضہ شرعی کے متحقق ہونے سے قبل ہی جائز ہے کہ وہ اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکے، چاہے اسے آزاد کر دے، چاہے تو اسے بیچ دے وغیرہ، اور اس کے علاوہ اور بہت سی املاک ایسی ہیں کہ ان پر قبضہ سے قبل کلی تصرف جائز ہوتا ہے، تو اسی وجہ سے کہ وہاں امکانی دھوکہ کا تصور نہیں ہے، علامہ ابن نجیم نے عبارت اس طرح ذکر فرمائی ہیں: ”أراد بالمنقول المبیع المنقول، فجاز غیرہ کالمہر و بدل الخلع“۔

اور اس کے بعد ایک ضابطہ ذکر فرمایا کہ ہر وہ عوض جو کسی ایسے عقد کے ذریعہ ملکیت میں آیا ہو کہ عوض کے ہلاک ہونے کی وجہ سے عقد ہی ختم ہو جائے تو ایسے عوض میں قبضہ صحیح ہوگا، عبارت اس طرح ہے: ”والأصل كما في الإيضاح أن كل عوض ملك بعقد تنفسخ بهلاكه قبل قبضه، فالتصرف فيه غير جائز وما لا فجائز“ (البحر الرائق، ۶، ۱۱۴)۔

تو حاصل یہ نکلا کہ بیع قبل القبض کی نہی جس حدیث میں آئی ہے وہ مطلقاً نہیں ہے، بلکہ معلول بالعلت ہے اور اس کی علت ”غرر انفساخ للبیع“ ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم نے عبارت اس طرح ذکر فرمائی ہے: ”بخلاف المنقول والغرر المنهي غرر انفساخ العقد والحديث معلول به عملاً بدلائل الجواز“ (البحر الرائق، ۶، ۱۱۶)۔

اور صاحب ”ہدایہ“ نے بھی بعینہ یہی عبارت ذکر فرمائی ہے (۵۸/۳)، علامہ ابن ہمام صاحب ”فتح القدير“ نے ”بیع قبل القبض“ سے متعلق نہی کیلئے بہت سی حدیثیں مختلف سندوں سے نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت پر حدیث مطلقاً حجت ہے، جیسا کہ امام محمد کا مسلک ہے، لہذا حضرات شیخین کے مذہب کے اعتبار سے دلیل تخصیص کی جستجو کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ وارد ہونے والی یہ نہی قطعاً اراضی کے علاوہ کیلئے ہے، تو انہوں نے صاحب ”ہدایہ“ کے قول کے متعلق فرمایا کہ وہی علت ہے جو صاحب ہدایہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ ”قبضہ سے قبل بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں عقد اول کے فسخ ہو جانے کا خطرہ ”بیع قبل القبض“ کے ممانعت کی علت ہے، لہذا اگر عقد اول فسخ ہو جائے تو بائع ثانی غیر کی ملکیت کو اس کی اجازت کے بغیر فروخت کرنے والا ہو جائے گا جو جائز نہیں ہے، مختصر یہ کہ علامہ برہان صاحب، ہدایہ، علامہ ابن ہمام صاحب فتح القدير، علامہ ابن نجیم مصری صاحب ”البحر الرائق“ اور علامہ شامی صاحب ”رد المحتار“ وغیرہ اکابر امت کی متفقہ رائے ہے کہ حدیث نہی معلول بالعلت ہے اور علت ”غرر انفساخ العقد الأول علی



اعتبار ہلاک المبیع ہے (فتح القدیر ۱۳۶۶)۔

## ۵۔ بیع قبل القبض عام ہے یا خاص:

”بیع قبل القبض“ کے متعلق ائمہ کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا یہ حکم ممنوع تمام چیزوں کو عام ہے، یا یہ حکم کسی خاص چیز کے بارے میں ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ تمام اشیاء کو شامل ہے، کسی بھی شئی کی ”بیع قبل القبض“ جائز نہیں ہے، خواہ وہ از قبیل مطعومات ہو، یا ملبوسات اور خواہ وہ از قبیل منقولات ہو، یا غیر منقول اور تقریباً ائمہ احناف میں سے حضرت امام محمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم تمام اشیاء کو عام نہیں ہے، بلکہ ہر وہ شئی جو از قبیل مطعومات ہے، اس کو قبضہ سے قبل خرید و فروخت کرنا جائز نہیں، گویا ان کے نزدیک یہ حکم ممنوع اشیاء خوردنی کے ساتھ خاص ہے، اور جو اشیاء خوردنی نہیں ہے جو ملبوسات میں سے ہو، یا اور کوئی چیز اس کی خرید و فروخت قبضہ سے قبل جائز ہوگی۔

حضرات شیخین امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے یہاں قدرے تفصیل ہے، ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم ممنوع ان تمام اشیاء کو شامل ہوگا جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن ہو، اور ہر وہ شئی جس کا حمل و نقل ممکن نہیں وہ اس حکم ممنوع میں داخل نہیں، یعنی غیر منقولہ اشیاء کی خرید و فروخت قبضہ سے قبل بلا کراہت جائز ہوگی، گویا حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ نے حدیث کے عموم پر عمل کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ حکم تمام اشیاء کو عام ہوگا، اور وہ حدیثیں جن میں خاص چیزوں کا ذکر ہے اس کو اس حدیث میں ضم کر دیا جس میں عموم پر دلالت ہو رہی ہے، اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو گیا، کیونکہ جہاں کہیں دو حکم ایک طرح کے دو جگہ وارد ہوں اور ان میں سے ایک عموم پر دلالت کرتا ہو اور دوسرا خصوص پر تو دونوں حکموں میں تطبیق دینے کیلئے اسی طرح کیا جاتا ہے کہ خصوص پر دلالت کرنے والے حکم کو عموم پر دلالت کرنے والے حکم کے ساتھ ضم کر دیتے ہیں، اور ایسا امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی بہت ہوتا ہے جیسے فائتہ نمازوں کی قضا کے متعلق دو طرح کی روایت ملتی ہے، ایک روایت میں صرف اقامت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا حکم ملتا ہے اور دوسری روایت میں اذان و اقامت دونوں کا تذکرہ ہے تو ائمہ احناف نے اذان و اقامت دونوں پر عمل فرمایا اور یہ کہا کہ وہ حدیث جس میں صرف اقامت کا تذکرہ ہے اسے اس حدیث کے ساتھ ضم کر دیا جائے گا جس میں اذان و اقامت دونوں کا تذکرہ ہے، اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا، گرچہ امام شافعیؒ اس خاص مسئلہ میں اس مذکورہ رائے سے متفق نہیں ہیں۔

مالکیہ نے ان حدیثوں کو اصل قرار دیا ہے جن میں صرف غذائی اشیاء پر قبضہ سے فروخت کرنے کی ممانعت کا ذکر ہے اور وہ حدیثیں جن میں غذائی اشیاء کا کوئی تذکرہ نہیں، بلکہ حکم ممانعت مطلق ہے اس میں مختلف تاویلیں کی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ حدیثیں جن میں کسی چیز کا تذکرہ نہیں، بلکہ حکم مطلق ہے اس سے مراد اشیاء خوردنی ہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان سب باتوں سے الگ ہو کر ائمہ احناف میں سے حضرات شیخین نے غور و فکر کرنے سے یہ نتیجہ برآمد کیا کہ مسئلہ کی اصل روح اور شریعت کا مقصد و منشاء کیا ہے اس پر نگاہ رکھی تو ان حضرات نے فرمایا کہ جہاں بس اس طرح کی خرید و فروخت میں امکانی دھوکہ کا بھی تصور ہو وہ بیع قبل القبض ناجائز اور جہاں یہ تصور نہ ہو وہاں ”بیع قبل القبض“ کے جائز ہونے کا حکم دیا جائے گا گویا ان کے نزدیک امکانی دھوکہ کا سدباب مقصود ہے (حلال و حرام)۔

## اختلاف ائمہ کی وجہ:

ائمہ کرام کے درمیان اختلاف اس لئے پیدا ہو گیا کہ بیع قبل القبض کی ممانعت کی جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے ابن عمرؓ سے جو روایت نقل فرمائی ہیں وہ اس طرح ہے: ”أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه“ اور ابن حبان اور مسند احمد میں حکیم ابن حزام سے جو روایت منقول ہے وہ اس طرح ہے ”قال قلت يا رسول الله اني رجل أبتاع هذه البيوع وأبيعها فما يحل لي منها وما يحرم قال لا تبعن شيئا حتى تقبضه“ تو حضرات شوافع نے ابن حبان والی روایت کے عموم پر نگاہ ڈالی اور جملہ اشیاء، خواہ منقولہ ہو، یا غیر منقولہ سب کی بیع کی ممانعت کا حکم دیدیا، اور مالکیہ حضرات نے شیخین کی روایت کو اصل قرار دیا اور غذائی چیزوں کی بیع قبل القبض کی ممانعت کا حکم دیا (فتح القدیر ۱۳۶۶)۔

احناف کے نزدیک یہ بات پیش نظر رہی کہ مقصود نہی ”غرر“ یعنی امکانی دھوکہ کا سدباب ہو، تو حکم دیا کہ جب تک کوئی شئی قبضہ میں نہ آجائے احتمال موجود ہے کہ شاید قبضہ ہی میں وہ شئی نہ آ پائے، ایسی شکل میں وہ شخص اپنے عہد کو پورا نہ کر پائے گا، منقولہ اشیاء میں اس طرح کا احتمال اس وقت تک موجود ہے جب تک



کہ وہ شئی قبضہ میں نہ آجائے، لیکن اشیاء غیر منقولہ میں اس طرح کا کوئی احتمال نہیں ہے کہ وہ شئی قبضہ میں آنے سے قبل ہلاک ہو جائے، یا گم ہو جائے، یا چرائی جائے، اس لئے صرف منقولہ اشیاء ہی کے فروخت کرنے کے لئے اولاً قبضہ کو ضروری قرار دیا، اور اس کے علاوہ اشیاء کے لئے یہ حکم نہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی جگہ قطعہ اراضی میں اس طرح کا احتمال موجود ہو تو اس قطعہ اراضی کی بیع بھی قبضہ سے قبل ناجائز ہوگی، چنانچہ صاحب "فتح القدیر" نے بحوالہ "محبوبی" یہ جزئیہ نقل کیا، عبارت اس طرح ہے: "قال بعض المشائخ أن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن يصير بحراً أو يغلب عليه الرمال، فأما في موضع لا يؤمن عليه ذلك فلا يجوز كما في المنقول ذكره المحبوبي" (فتح القدیر ۶، ۱۳۸)۔

اور اس بات کی دلیل کہ "بیع قبل القبض" کے متعلق وارد ہونے والی نہیں میں اصل و بنیادی چیز یہ ہے کہ امکانی دھوکہ کا سدباب ہو جائے، یہ ہے کہ جہاں کہیں کسی عقد میں بیع کے ضیاع کے باوجود عقد اول کے فسخ ہونے اور امکانی دھوکہ کا تصور نہیں وہاں منقولہ اور غیر منقولہ تمام اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہے، مثلاً ثمن میں قبضہ سے قبل تصرف کرنا اور اس کی بیع کرنا بالیقین جائز ہے، اسی طرح مہر کے اندر متعین کی ہوئی شئی پر قبضہ کرنے سے قبل ہر طرح کا تصرف کرنا جائز ہے، علامہ ابن نجیم نے اس طرح عبارت ذکر فرمائی ہے: "وأراد بالمنقول بالمبيع المنقول فجاز بيعه غيره كالمهر وبدل الخلع الخ" (البحر الرائق ۶، ۱۱۷)۔ اور علامہ ابن ہمام نے بھی اسی قسم کی بات لکھی ہے، گرچہ ایک سوال کے جواب میں عبارت یوں ہے: "أنه خص منها أشياء منها جواز التصرف في الثمن قبل قبضه وكذا المهر يجوز لها بيعه الخ" (فتح القدیر ۶، ۱۳۸) اور علامہ شامی نے یہ ضابطہ ہی ذکر فرمایا ہے، عبارت اس طرح ہے: "والأصل فيه أن كل عوض ملك بعقد يفسخ بهلاكه قبل قبضه فالتصرف فيه غير جائز وما لا فجائز عيني" (در مختار ۲، ۲۲۵)۔

اسی طرح ہر وہ تصرفات جو عقد اول کے فسخ ہوجانے کے باوجود نافذ ہوتے ہیں وہ قبضہ سے قبل منقولہ اشیاء کے اندر بھی جائز ہوں گے، جیسے خریدے ہوئے غلام کو قبضہ سے قبل آزاد کرنا وغیرہ۔

اس لئے یقین کے ساتھ یہ کہا جائے گا کہ حدیث نہیں جو وارد ہے اس کے نہ الفاظ مقصود ہیں اور نہ اس کا عموم، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اصل مقصد کیا ہے تو اصل مقصد یہ ہے کہ خریدار کو کسی طرح کا کوئی دھوکہ نہ ہونا چاہئے، لہذا کہیں دھوکہ کا امکان ہو اس جگہ بیع کونا جائز اور جہاں دھوکہ کا امکان نہ ہو اس جگہ دوسرے تصرفات کی طرح بیع کو بھی جائز قرار دیا جائے گا۔

۶۔ فیکٹری وغیرہ سے خریدا ہوا مال بیچنے کیلئے قبضہ حسی کی ضرورت نہیں ہے، موجودہ دور میں تجارت کی ایسی شکلیں وجود پذیر ہو رہی ہیں جس کا زمانہ قدیم میں تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا، اسی وجہ سے اس قسم کے معاملات کے احکام بھی فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں بصراحت مذکور نہیں ہیں، لیکن متقدمین نے ایسے اصول و ضوابط مثبت فرمائے ہیں جن کی روشنی میں پیش آمدہ جدید مسائل کا حل تلاش کرنا آسان ہو گیا ہے، چنانچہ کاروبار کی نئی شکلوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کارخانہ سے کوئی خام، یا پختہ و تیار مال خریدتا ہے اور مال بردار گاڑیوں پر سوار کر دیتا ہے اور قبل اس کے کہ یہ خریدار اس خریدے ہوئے مال پر حسی قبضہ کر لے دوسرے کسی شخص کے معرفت فروخت کر دیتا ہے اور مال فیکٹری سے براہ راست خریدار نمبر ۲ کے یہاں بھیجا دیتا ہے اور درمیان راہ میں اس مال کے ہلاک ہونے کی ذمہ داری خریدار نمبر (۱) اپنے اوپر رکھتا ہے اور عام طور پر اس قسم کا کاروبار بہت ہی قابل اعتماد اور بھروسہ مند ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض پیشہ ور لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے کا وقت بھی مقرر ہوتا ہے اور عموماً اسی مقررہ وقت پر مال پہنچ جاتا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کہ خال خال مال بردار گاڑی کسی حادثہ کا بھی شکار ہو جاتی ہے، لیکن عدم حادثہ کے مقابلہ میں ایسا بہت کم ہوتا ہے جو بہر حال کسی درجہ میں غیر معتبر بھی ہو سکتے ہیں، تو اس قسم کا معاملہ شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

شریعت نے خرید و فروخت کی صحت کیلئے بہت تفصیلی شرائط کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں موجود تفصیل و شرائط اس کی شاہد عدل ہے، منجملہ ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ بیع کیلئے ضروری ہے کہ وہ شئی اس بائع کی ملکیت میں ہو جو اپنے لئے بیع کر رہا ہو، یہی وجہ ہے کہ وہ شئی اگر بائع کی ملکیت میں نہ ہو تو اس کا فروخت کرنا درست نہ ہوگا، دوسری شرط وہ ہے جو حدیث کی کتابوں میں بصراحت موجود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی عقد بیع کا تصور ہو تو ضروری ہے کہ اس جگہ "غرر" یعنی دھوکہ بازی کا امکانی تصور بھی نہ ہو، شیخین نے اسی معنی میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے: "نہی رسول اللہ ﷺ عن بيع الغرر" اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس بیع پر فی الحال بائع کا قبضہ بھی ہو، اس پر حدیث کے یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں: "لا تبعه حتى تقبضه" (مشکوٰۃ شریف ۱۲۰، فتح القدیر ۶، ۱۳۶) اور اس کے علاوہ اور دوسری بہت سی شرطوں کا فقہاء نے تذکرہ کیا ہے (رد المحتار ۳، ۷۷-۶)۔

اس سلسلہ میں خاص بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ خرید و فروخت کرتے وقت بیع پر بائع کا قبضہ ہونا ضروری ہے، تو یہ شرط تمام اشیاء کیلئے ضروری ہے، یا خاص چیزوں کیلئے، تو حضرات فقہاء کرام کا اس میں قدرے اختلاف ہے جو اوپر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ امام مالک کے نزدیک صرف اشیاء خوردنی میں یہ شرط ہے، دیگر اشیاء میں نہیں، گرچہ شوافع کے نزدیک تمام اشیاء میں قبضہ ضروری قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے، لیکن احناف کے نزدیک بھی خاص ہے، لیکن غذائی اشیاء کے ساتھ نہیں، بلکہ منقولہ اشیاء کے ساتھ اس شرط کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں وارد ہونے والی ممانعت کی جو حدیث ہے اس کی علت نکالی گئی ہے۔

مذکورہ بالا صورت مسئلہ کو دیکھنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی بیع ناجائز ہوگی، کیونکہ حدیث میں وارد ہونے والی نہی کے صراحتہ خلاف ہے، نیز بظاہر شرط صحت بیع کے بھی خلاف ہے، کیونکہ مجملہ شرائط کے ایک شرط یہ ہے کہ وہ منقولہ شیء جس کو فروخت کیا جا رہا ہے ضروری ہے کہ وہ بائع کے قبضہ میں ہو اور یہاں اس کے قبضہ میں حسا نہیں ہے۔

مگر بایں ہمہ میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اس صورت بیع کو جائز قرار دیا جائے جس کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) فقہاء احناف نے ”بیع قبل القبض“ کی نہی کو اس کے ظاہر پر نہیں رکھا ہے، بلکہ فرمایا کہ اس قسم کی حدیث معلول ہے چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری نے ”البحر الرائق“ میں، علامہ ابن ہمام حنفی نے ”فتح القدیر“ میں، مولانا جلال الدین کرمانی نے ”کفایہ“ میں اور علامہ برہان الدین مرغینانی نے ”ہدایہ“ میں اور ان کے علاوہ دیگر فقہاء کرام نے متفقہ طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث معلول ہے، اور اس کی علت بیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے بیع اول کے ختم ہو جانے کا ”غرر“ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بیع کا بائع ثانی کی ملکیت میں آنے کا کسی طرح یقین ہو، یا نہیں، اگر کسی طرح بائع ثانی کی ملکیت میں آنے کا یقین ہو جائے تو بیع ثانی درست ہوگی، ورنہ بیع ثانی صحیح نہ ہوگی۔

اور کسی شیء بیع کے ملکیت میں آنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے ایک شکل یہ ہے کہ خریدار اول اس بیع کو اپنی جائے استقرار کی طرف منتقل کر لے، جیسا کہ حدیث میں ہے ”فھی ان تباع السلع حیث تباع حتی یحوزھا التجار الی رحالھم“۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری اول کا اس پر حسی قبضہ ہو جائے، جیسا کہ حدیث کے ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے: ”لا تبیعن شیئاً حتی تقبضہ“ اسی طرح ایک صورت یہ ہے کہ چراگاہ میں خریدار ہو جائے اور اس طرح ہو کہ اس کو خریدار اچھی طرح دیکھ رہا ہو اور اس کی طرف اشارہ حسیہ ممکن ہو اور بائع نے قبضہ کی اجازت دیدی ہو تو اس صورت میں بھی وہ جانور مشتری اول کی ملکیت میں آجائے گا، اسی طرح ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک پرندہ اس حال میں خریدا کہ وہ ایک مکان میں بند تھا اور بائع نے اس پر قبضہ کی اجازت دیدی تو وہ پرندہ مشتری کے مکان کھولتے ہی کیوں نہ اڑ جائے وہ پرندہ مشتری کی ملک میں شمار ہوگا، ”البحر الرائق“ میں اس طرح عبارت درج ہے: ”ولو اشترى طيراً فی بیت والباب مغلوق فأمروہ البائع بالقبض فلم یقبض حتی بہت الریح ففتحت الباب فطار لا یصح التسلیم وان فتحه فطار صح التسلیم“ (البحر الرائق ۵، ۲۰۹)۔

تو اسی طرح یہ کیوں نہ ہوگا کہ خریدار کارخانہ سے مال خرید لے اور خریدار نمبر (۲) کو مال بردار گاڑی کے ذریعہ وہ مال روانہ کر دے، تو میری سمجھ میں ایسا آرہا ہے کہ اس صورت میں بھی خریدار نمبر (۱) کی ملکیت ثابت ہو جائے گی، کیونکہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں تذکرہ جزئیات کے ذیل میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے گھر میں بند گندم خریدا اور بائع نے اس مکان کی چابھی مشتری کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ وہ گندم میں نے آپ کے حوالہ کیا تو بائع کا یہ فعل ہی مشتری کے قبضہ و ملکیت کیلئے کافی ہے، عبارت اس طرح ہے: ”لو اشترى حنطة فی دار ودفع البائع المفتاح الیہ وقال: خلیت بینک و بیننا فھو قبض“ میری سمجھ میں یہ آرہا ہے کہ کچھ ایسی ہی صورت مذکورہ بالا شکل یعنی فیکٹری سے مال خرید کرنے کی شکل میں ہوتی ہے کہ بائع اول کو مال بردار گاڑی پر لادنے کے بعد اپنے ذمہ سے بری ہو جاتا ہے، اور صراحتہً، یا عرفاً بائع اول مشتری اول سے یہ کہتا ہے کہ مال بردار گاڑی پر لادنا ہوا مال آپ کا ہے اور آپ ہی اس کے ذمہ دار مالک ہیں ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا فروختگی گندم کی مذکورہ بالا صورت پر قیاس کرتے ہوئے اس خاص صورت میں بائع ثانی کے اس طرح ثابت شدہ قبضہ کو تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی مانع نہ ہونا چاہئے۔

اور اس طرح جب بائع ثانی کا قبضہ فیکٹری سے لئے مال پر ثابت ہو گیا تو یہ خاص صورت بیع قبل القبض کی صورت نہ رہی، بلکہ بیع بعد القبض کی صورت ہوگی جو باتفاق فقہاء کرام جائز ہے۔



(۲) دوسرے اس وجہ سے کہ تحقق قبضہ کیلئے شریعت نے کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے کہ اس خاص طریقہ سے قبضہ ہو تو قبضہ شرعی کا تحقق ہوگا، ورنہ قبضہ کا تحقق نہ ہوگا، بلکہ قبضہ کا تحقق عرف پر مبنی ہے، عرف میں جو قبضہ کی شکل ہو سکتی ہے وہ سب صورتوں میں قبضہ شرعی شمار کیا جائے گا، جیسا کہ مالکیہ کی رائے ”الموسوعة الفقہیہ“ میں نقل کی گئی ہے، عبارت اس طرح ہے: ”ان كان منقولاً من عروض وأنعام فقبضته بالعرف الجاري بين الناس“ تو کیا مضائقہ ہے کہ خریدے ہوئے سامان کو مال بردار گاڑی پر سوار کروادینا ہی باعتبار عرف کے قبضہ شمار کیا جائے، اور عرف کے اثبات کیلئے یہ کافی ہے کہ اس طرح کا قبضہ اگر کئی نہ ہو تو کم از کم اکثری اور کثیر الاستعمال ہی ہو، تو میری سمجھ میں یہ آ رہا ہے کہ اس طرح کا معاملہ گرچہ کئی اور عمومی ہونے کی حیثیت حاصل نہ کر سکا ہو، لیکن بین الاقوامی تجارت میں ایسا ضرور ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے، کیونکہ ایس، ٹی، ڈی طریقہ فون نے اس پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر یکجا کر دیا ہے اور موجودہ دور میں کارخانہ وغیرہ سے مال کی خریداری اکثر و بیشتر اسی طرح ہو رہی ہے کہ ٹیلیفون سے خرید و فروخت ہوگئی اور قیمت کی ادائیگی ڈرافٹ کے ذریعہ اور بیع کو وصولی مال بردار گاڑی کے ذریعہ ہو رہی ہے، اسی طرح یہ خریدار نمبر (۱) یہ چاہتا ہے کہ مال یہاں آ کر رک نہ جائے، اس لئے یہ کسی دوسرے شخص سے بات چیت کرتا ہے کہ میرا فلاں قسم کا مال ٹرک وغیرہ سے آ رہا ہے اور پھر مال کی پوری تفصیل بیان کر کے دوسرے شخص کی خواہش جب معلوم ہو جاتی ہے تو اسی کے ہاتھ یہ خریدار نمبر (۱) مال فروخت کر دیتا ہے، پھر مال کو خریدار نمبر (۱) اپنے یہاں منگوانے کے بجائے فوراً کارخانہ دار سے بات چیت کرتا ہے کہ وہ مال جو میں نے آپ سے خریدا ہے وہ فلاں جگہ بھیجوادیں، چنانچہ وہ مال خریدار نمبر (۲) کے پاس وقت موعود پر پہنچ جاتا ہے۔

اور اس زمانہ میں اس طرح کا معاملہ اکثر و بیشتر ہو رہا ہے اور جماعت تجار کے عرف میں اس قسم کی تجارت نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے، نفوس تجار اس سے مانوس اور طبائع سلیمہ کے نزدیک مقبول ہو گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاملہ نے عرف و عادت کا مقام حاصل کر لیا ہے، لہذا صورت مذکورہ میں گرچہ مشتری اول کا حیا قبضہ نہ ہو، لیکن عرفاً اس کا قبضہ ہو گیا، اور جب عرفاً مشتری اول کا قبضہ ثابت ہو گیا تو یہ خاص صورت ”بیع قبل القبض“ کی فہرست سے خارج ہوگئی۔

اسی طرح ”الموسوعة الفقہیہ“ میں ایک عبارت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر چیز کا قبضہ یکساں نہیں ہوتا، بلکہ ہر شئی پر قبضہ اسی کی حیثیت سے ہوتا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ عددی اشیاء پر قبضہ شئی کو شمار کرنے، مکملی و موزونی اشیاء پر قبضہ اس کے کیل اور وزن کرنے اور ذرائعی اشیاء پر قبضہ گز کے ذریعہ مانپنے سے ہوتا ہے، لیکن کہیں یہ نظر نہ آیا کہ خریدی ہوئی شئی کو فروخت کرنے کیلئے اس پر حیا قبضہ ضروری ہے، لہذا مال بردار گاڑی پر لاد دی جانے والی شئی پر قبضہ کی یہ صورت ہوگی کہ اس کو مال بردار گاڑی پر لاد دیا جائے، تو ایسی صورت میں قبضہ کے تحقق کو ماننے میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے۔

اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ یہ صورت ”بیع قبل القبض“ کی ہے جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے تو عرض یہ ہے کہ فقہاء متقدمین نے لکھا ہے کہ بیع قبل القبض کے ممانعت والی حدیث اپنے عموم پر نہیں ہے، بلکہ ایک علت کے ذریعہ خاص کر لی گئی ہے اور وہ علت ”غدر انفساخ البیع الاول“ ہے تو جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں ”بیع قبل القبض“ ممنوع اور جہاں یہ علت معدوم ہو وہاں ”بیع قبل القبض“ جائز ہوگی، اس کی مثال میں سابقہ زمانہ میں منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کو پیش کیا جاتا ہے، لیکن موجودہ دور میں ابلاغ و ارسال کے ایسے تیز رفتار ذرائع وجود میں آچکے ہیں کہ جس کے ذریعہ اشیاء کی منتقلی صد فیصد نہیں تو کم از کم اسی فیصد ایسی ضرور ہوگئی ہے کہ جہاں ہلاکت بیع کا خطرہ بھی نہیں گذرتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ علت نہی کے معدوم، یا نادر ہونے کے باوجود عدم جواز بیع کا حکم دیا جائے، اگر یہی بات ہے تو پھر متقدمین فقہاء کرام نے علت کے معدوم ہونے کی صورت میں قطعاً اراضی کی بیع قبل القبض کی اجازت کیوں دی ہے؟ فقہاء کرام کا اراضی کی بیع قبل القبض کو جائز قرار دینا صرف علت کے معدوم ہونے کی وجہ سے ہے تو اسی طرح اس صورت میں علت معدوم، یا نادر ہے تو عدم جواز بیع کا حکم نہیں، بلکہ جواز بیع کا حکم دیا جائے گا۔

مختلف ممالک، مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں کبھی ایسی چیزیں رائج ہو جاتی ہیں جن میں عقل صحیح اور طبع سلیم پسند کرتی ہے اور وہ روح شریعت کے مخالف نہیں ہوتیں، جیسے عربوں میں مہمان نوازی کا رواج وغیرہ، دوسری اچھی باتیں تو ایسی باتوں کو عرف و معروف کہا جاتا ہے اور اگر وہ روح شریعت کے مخالف ہوں تو اسے منکر کہا جاتا ہے۔

تمام اقوام عالم کو اس بات کا کلی اعتراف ہے اور کسی کو انکار کی کوئی گنجائش نہیں اس بات سے کہ موجودہ دور ترقی میں جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی میں خاصی ترقی ہوئی اور ہو رہی ہے اسی طرح تجارتی لائن میں بھی خاصی ترقی ہو رہی ہے اور نت نئے طریقے ہمیشہ سامنے آرہے ہیں، اور ادھر موصلاتی نظام برقی نے اور بھی نئی نئی شکل تجارت کو جنم دیا ہے اور دے رہی ہے، اسی ترقی یافتہ صورت حال میں سے ایک طریقہ یہی ہے جو اوپر مذکور ہوا، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس قسم کا رواج تجارت روح شریعت کے خلاف ہے، یا نہیں، اگر روح شریعت کے خلاف نہیں تو جائز اور روح شریعت کے خلاف ہے تو ناجائز قرار دیا جائے۔



”بیع قبل القبض“ کی ممانعت میں روح شریعت امکانی دھوکہ کا سدباب ہے، لہذا جہاں کہیں امکانی دھوکہ ہو بیع قبل القبض ناجائز اور جہاں امکانی دھوکہ نہیں وہاں بیع جائز ہوگی۔

تو عرض یہ ہے کہ صورت مسئلہ میں اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ امکانی دھوکہ کا تصور نہیں ہوتا بلکہ معاملات ٹھیک اور صحیح طریقہ سے وعدہ کے مطابق جائے وعدہ پر پہنچ کر، یا پہنچا کر ہو رہے ہیں، ساتھ ہی اس قسم کے معاملات میں دھوکہ بازی نادر اور سہولتیں زیادہ حاصل ہو رہی ہیں، جس کی وجہ سے اس قسم کے معاملہ بیع نے مقبول عام ہونے کا درجہ حاصل کر لیا ہے، اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے معاملات جائز ہوں گے۔

۷۔ ”تجارت بذریعہ شیپنگ“ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے کوئی مال کسی فیکٹری سے خریدا اور بائع نے مشتری کے حکم کے مطابق مال کو بذریعہ جہاز مشتری کے پاس بھیجنے کا اہتمام کیا، ساتھ ہی بائع نے یہ طے کیا کہ مال کو جہاز پر سوار کر دینے کے بعد میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں، اگر یہ مال ہلاک ہو جائے تو آپ جانیں، ہم پر اس کا کوئی ضمان نہ ہوگا، اور مشتری نے اسے تسلیم کر لیا، پھر اس مشتری نے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا جب کہ مال درمیان سفر ہے، اور یہ طے کیا کہ مال یہاں پہنچنے کے بعد یا راہ ہی سے مشتری ثانی کے یہاں بھیجا دیتا ہے، اور اس نے بھی یہی طے کیا کہ جب بات طے ہوگئی اور مال آپ کے یہاں جانے کی حالت میں ہو گیا تو اب میں اس کی جملہ ذمہ داریوں سے بری ہوں۔

مذکورہ صورت مسئلہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

مال کو جہاز وغیرہ پر سوار کرنے کے بعد اپنی ذمہ داری سے بری ہونا طے کرتا ہے، مال جہاز وغیرہ پر سوار ہوتے ہی مشتری کی ذمہ داری میں آجاتا ہے، پھر وہ مشتری مال کو دیکھے بغیر کسی تیسرے شخص کے معرفت فروخت کر دیتا ہے، دراصل حالیکہ وہ مال درمیان سفر ہے، اور صاحب مال یہ طے کرتا ہے کہ مال دوران سفر ہونے کے باوجود آپ کا ہو گیا اور میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں، اگر کسی طرح کا نقصان ہو تو وہ آپ کا ہوگا میں اس کا ضامن نہیں ہوں۔

پہلی بات یہ کہ بیع جائز ہے اس لئے کہ کسی مال کو خریدنے کیلئے دیکھنا ضروری نہیں اور بغیر دیکھے ہوئے مال کو فروخت کرنے کیلئے بھی دیکھنا ضروری نہیں، ”فتاویٰ ہندیہ“ میں عبارت اس طرح: ”شراء مالہ بیکہ جائز اور دوسری عبارت اس طرح ہے: ”ولو باع شیئا لغيره بان ورث شیئا لغيره حتی باعہ جاز البیع“ (ہندیہ ۲، ۵۷، ۵۸)۔

وہ جہاز یا مال بردار گاڑی مشتری اول کا ذاتی ہے، یا اس نے اجارہ پر لے کر مال لانے کیلئے بھیجا ہے، یا مشتری نے بائع کو حکم دیا کہ اجرت پر کسی گاڑی کو لے کر مال بھیج دیں اور بائع مال اس طرح کی گاڑی پر لا دیتا ہے، تو ان تمام صورتوں میں مشتری اول کا قبضہ ہو جائے گا اور جب مال مشتری اول کے قبضہ میں آگیا تو اس کیلئے اس میں ہر طرح کا تصرف کرنا بھی جائز ہو جائے گا، لہذا وہ مشتری اول اس کو فروخت کرنے کا بھی مستحق ہوگا۔

یہاں یہ شبہ نہ ہوگا کہ مشتری نے ایسی شئی سے نفع اٹھایا ہے جو اس کے ضمان میں نہیں آتا ہے، کیونکہ معاملہ ہی اس طرح طے ہوا تھا کہ مال کے آپ خود ضامن ہوں گے، گویا یہ مال مشتری اول کی ضمانت میں بھی آچکا ہے، اس طرح ”بیع مالہ بیضمن“ کی بھی صورت نہ ہوتی۔

اول کی دو صورتوں میں جبکہ مال بردار گاڑی مشتری کی ہے، یا اس نے کرایہ پر لے کر بھیجا ہے، مشتری کا قبضہ تو ہو ہی جائے گا تیسری صورت میں، جبکہ بائع اول نے خود بھیجنے کا اہتمام کیا ہے اس صورت میں بھی مشتری اول کا قبضہ ہو جائے گا، کیونکہ اجیر کا قبضہ مشتری کا قبضہ تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں یہ جزئیہ لکھا ہے، کہ اگر کسی نے کوئی مال خریدا اور بائع کو یہ حکم دیا کہ مال کرایہ پر گاڑی لے کر ہمارے یہاں بھیج دیں تو یہ قبضہ مشتری کا ہوگا، اور ہلاک ہونے کی صورت میں بائع اس کا ضامن نہیں ہوگا، عبارت اس طرح ہے، ”إلا أن يقول: استأجر علی من یحملہ فقبض الأجير یكون قبض مشتری إن صدقہ“ (ہندیہ ۱۹، ۳)۔

ہاں اگر مشتری نے مطلقاً بھیجوانے کو کہا اور اجیر کا کوئی تذکرہ نہ کیا تو اس صورت میں اجیر کا قبضہ مشتری کا قبضہ تصور کیا جاتا ہے، اگر مشتری اول کسی دوسرے شخص کے معرفت فروخت کر دیتا ہے تو اگرچہ یہ مال دوران سفر ہے بیع جائز ہوگی، اسلئے یہی مشتری اول کے قبضہ میں آگئی ہے جو اس جگہ ضروری تھا، البتہ اس نے نہ دیکھا تو اس سے کوئی فرق پیدا نہ ہوگا، کیوں کہ یہ بھیجی ہوئی شئی فروخت کرنا جائز ہے (ہندیہ ۵۸، ۳)۔

☆☆☆

لیکن وہ صورت کہ جس میں وہی مشتری اول کے قبضہ میں نہ آئی ہے تو اس کا بیچنا درست نہ ہوگا۔

## قبضہ سے پہلے خرید فروخت - شریعت کی روشنی میں

مولانا وحید الدین

- ۱۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کے بارے میں مختلف احادیث صحاح اور دوسری کتابوں میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہیں:
- ”عن ابن عمر أن النبي ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبيعه حتى يقبضه“ (رواه البخاری، ومسلم۔)
- (حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا، کہ جس شخص نے غلہ خریدا تو اس کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے، اس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔)
- ”وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: أما الذي نهي عنه النبي ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض قال ابن عباس رضی اللہ عنہما وأحسب كل شيء مثله“ (رواه البخاری ومسلم۔)
- (حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بہر حال وہ چیز جس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا سو وہ غلہ ہے کہ اس کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کیا جائے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اور ہر چیز کو میں اسی کے مثل گمان کرتا ہوں، بخاری اور مسلم نے اس کو نقل کیا ہے۔)
- ”وعن جابر بن عبد الله قال، قال رسول الله ﷺ إذا ابتعت طعاما فلا تبعه حتى تستوفيه“ (رواه مسلم۔)
- (حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جب تم غلہ خریدا تو اس کو قبضہ سے پہلے فروخت مت کرو، امام مسلم نے اس کو نقل کیا ہے۔)
- ”وفي حديث زيد بن ثابت رضي الله عنه قال: إن رسول الله ﷺ نهي أن تبايع السلعة حيث تبتاع حتى تحوزها التجار إلى رحالهم“ (رواه ابن حبان في صحيحه، والحاكم في المستدرک وصححه۔)
- (حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ سامان جس وقت خریدے جاتے ہیں وہ فروخت کئے جائیں، یہاں تک کہ تاجران کو اپنے گھروں میں منتقل کر لیں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں اس کو نقل کیا ہے اور اس کی تصحیح فرمائی ہے۔)
- ”روى عن حكيم بن حزام أنه قال: قلت: يا رسول الله ﷺ إني رجل أبتاع هذه البيوع وأبيعها فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال لا تبيعن شيئا حتى تقبضه“ (أخرجه النسائي في سننه الكبرى ورواه أحمد في مسنده وابن حبان في صحيحه۔)
- (حکیم بن حزام سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ، میں خرید و فروخت کرنے والا (تاجر) ہوں تو میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ، کسی چیز کو قبضہ سے پہلے فروخت نہ کرو، امام نسائی نے اپنی ”سنن کبریٰ“ میں اس کی تخریج کی ہے اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔)
- ان کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث ہیں جن میں فی الجملہ بیع قبل القبض کی ممانعت وارد ہوئی ہے، ان تمام روایات اور احادیث سے ”بیع قبل القبض“ کا عدم جواز واضح ہے اور فی الجملہ ”بیع قبل القبض“ کے عدم جواز پر تمام ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے۔
- ہاں یہ حکم عام اور مطلق ہے کہ کسی بھی چیز کی بیع قبل القبض جائز نہیں، یا خاص اور مقید ہے کہ بعض چیزوں کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے، اس میں ائمہ اربعہ اور دوسرے مجتہدین کے درمیان اختلاف ہے، غالباً اس اختلاف کی بنیاد یہی ہے کہ اس باب میں روایات مختلف ہیں بعض مطلق اور بعض مقید ہیں، ہر امام نے

مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ، درہنگہ۔

اپنے اصول کے مطابق روایتوں کو اختیار کیا ہے۔

”بیع قبل القبض“ بیع فاسد ہے:

احناف کے نزدیک بیع منہی عنہ کی تین قسمیں ہیں، باطل، فاسد، اور مکروہ۔

”وذكر في البحر أن البيع المنهي عنه ثلاثة، باطل، وفاسد، ومكروه تحريماً“ (شامی ۲۰۱۰۰)۔

”البحر الرائق“ میں مذکور ہے کہ بیع منہی عنہ کی تین قسمیں ہیں، باطل، فاسد، اور مکروہ تحریمی۔

لہذا اب سوال یہ ہے کہ احناف کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ ان اقسام ثلاثہ میں سے کس قسم میں داخل ہے، یہاں ان اقسام ثلاثہ کی تفصیل میں جائے بغیر صرف یہ ذکر کیا جا رہا ہے کہ فقہاء کرام نے اس بیع قبل القبض کو کس قسم میں شمار کیا ہے۔

”در مختار“ میں ہے: ”وفسد يبيع المنقول قبل قبضه انتهى، ونفي الصحة يحتملها، فتدبر“ (شامی)۔

(بیع منقول قبل القبض فاسد ہے، اور صحت کی نفی بطلان اور فساد دونوں کا احتمال رکھتی ہے)۔

اور علامہ شامی نے ”نفی الصحة“ کے تحت ذکر کیا ہے: ”(قوله ففي الصحة) أي الواقعة في المتن يحتملها أي يحتمل البطلان

والفساد والظاهر الثاني؛ لأن علة الفساد الخمر كما مر مع وجود ركني البيع الخ“ (شامی ۱۶۳، ۲)۔

یعنی ”نفی الصحة“ جو متن میں موجود ہے اس میں بطلان اور فساد دونوں کا احتمال ہے، اور ظاہر ثانی (فساد) ہے اس لئے کہ فساد کی علت خمر ہے، جیسا کہ گذر چکا، باوجود کہ ارکان بیع موجود ہیں۔

علامہ شامی نے اس عبارت میں وضاحت کی ہے کہ ”بیع قبل القبض“ بیع فاسد ہے۔

صاحب ”بدائع“ علامہ کاسانی نے صحت بیع کی شرائط میں ایک شرط یہ ذکر کی ہے کہ منقول شی کو خریدنے والا جب اس منقول کو فروخت کرنا چاہے تو صحت بیع کے لئے اس منقول پر مشتری اول کا قبضہ شرط ہے، یعنی قبضہ سے پہلے اس منقول کو فروخت کرنا صحیح نہیں ہے۔

”ومنها القبض في بيع المشتري المنقول فلا يصح بيعه قبل القبض لما روى أن النبي ﷺ نهي عن بيع ما لم يقبض والنهي يوجب فساد المنهي، ولأنه بيع فيه غرر الانفساخ بهلاك المعقود عليه“ (البدائع ۵، ۱۸۰)۔

(منقول خریدی ہوئی چیز کی بیع کیلئے شرائط صحت میں سے قبضہ کا ہونا ہے، لہذا اس کی بیع قبل القبض صحیح نہیں ہوگی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”بیع ما لم يقبض“ سے منع فرمایا اور نبی فساد منہی کو ثابت کرتی ہے، اور اس لئے کہ یہ ایسی بیع ہے کہ اس میں معقود علیہ کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے عقد کے فسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے)۔

علامہ کاسانی کا اس قبضہ کو بیع کی صحت کیلئے شرط قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ قبضہ سے پہلے فروخت کرنا غیر صحیح یعنی فاسد ہے نہ کہ باطل، یعنی ارکان بیع کے پائے جانے کی وجہ سے انعقاد تو پایا جائے گا، لیکن غرر کی وجہ سے یہ انعقاد صحیح نہیں ہوگا۔

ان دونوں عبارتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ احناف کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ بیع منہی عنہ کی دوسری قسم، یعنی فاسد میں داخل ہے۔

۲۔ کتاب و سنت میں قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں کی گئی ہے، مطلق قبضہ کا ذکر ہے۔

جیسا کہ ”صاحب مہذب“ نے شی منقول میں نقل اور غیر منقول میں تخلیہ کو قبضہ قرار دینے کی علت بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: شرع میں قبضہ کا ذکر ہے، لیکن مطلق ہے (اس کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں کی ہے)، لہذا اس کو عرف پر محمول کیا جائے گا اور عرف منقول چیز میں نقل اور غیر منقول میں ”تخلیہ“ ہے۔

مالکیہ، شوافع اور حنابلہ نے قبضہ کے سلسلہ میں عرف کا اعتبار کیا ہے، غیر منقول میں عرف یہ ہے کہ تخلیہ سے قبضہ شمار ہوتا ہے، لہذا غیر منقول میں تخلیہ قبضہ ہے اور منقول میں قبضہ نقل، یعنی دوسری جگہ منتقل کرنا ہے، لہذا شی منقول میں انتقال قبضہ شمار کیا جائے گا۔

”وقال المالكية والشافعية: قبض العقار كالأرض والبناء ونحوهما يكون بالتخلية بين البيع وبين المشتري



وتمكنه من التصرف فيه بتسليم المفاتيح إن وجدت، وقبض المنقول كالأمثلة والأنعام والدواب بحسب العرف الجاري بين الناس“۔

(مالک کی اور شوائع نے کہا کہ عقار، مثلاً زمین مکان وغیرہ کا قبضہ بیع اور مشتری کے درمیان تخلیہ اور بیع میں تصرف پر قدرت دینے سے ہو جاتا ہے، مثلاً چابیاں موجود ہوں تو ان کے حوالہ کرنے سے، اور منقول میں قبضہ، مثلاً سامان چوپائے اور جانور اس عرف کے اعتبار سے شمار ہوگا جو لوگوں کے درمیان رائج ہو)۔

”وقال الحنابلة قبض كل شئ بحسبه فإن كان مكيلاً أو موزوناً فقبضه بكيه ووزنه أي أنه يجب الرجوع في القبض إلى العرف“ (الفقه الاسلامي ۴، ۲۱۹)۔

(اور حنابلہ نے کہا: ہر چیز کا قبضہ اس کے لحاظ سے ہوگا، اگر مکلی، یا موزونی ہے تو اس کا قبضہ کیل اور وزن سے ہوگا، یعنی قبضہ کے سلسلہ میں عرف کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے)۔

علامہ نووی ”مہذب“ کی مذکورہ عبارت کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: ”وأما الأحكام فقال أصحابنا: الرجوع في القبض إلى العرف وهو ثلاثة أقسام، أحدها: العقار والشمر على الشجرة فقبضه بالتخلية، والثاني: ما ينقل في العادة كالأخشاب والحبوب والحيتان ونحوها، فقبضه بالنقل إلى مكان الخ، والثالث: ما يتناول باليد كالدرهم والدنانير والمنديل والثوب والإناء الخفيف والكتاب ونحوها فقبضه بالتناول بلا خلاف الخ“ (المجموع شرح المہذب ۹، ۲۰۱)۔

(رہے عبارت مذکورہ میں بیان کردہ احکام تو ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ قبضہ کے سلسلہ میں عرف کی طرف رجوع کرنا ہے اور وہ تین قسم پر ہے، ایک یہ کہ عقار اور درخت کے اوپر پھل تو ان کا قبضہ ”تخلیہ“ سے ہوتا ہے، دوسری وہ چیز جو عموماً منتقل کی جاتی ہیں، جیسے لکڑیاں، غلے اور مچھلیاں وغیرہ، تو ان میں قبضہ دوسرے مکان کی طرف منتقل کرنے سے ہوگا، اور تیسری وہ چیزیں جو ہاتھ سے لی جاتی ہیں، مثلاً دراهم، دنانیر (روپے پیسے) تولیہ، کپڑا، ہلکے برتن اور کتاب وغیرہ، تو ان چیزوں میں قبضہ بالاتفاق تناول سے ہوگا)۔

الحاصل مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں قبضہ کے سلسلہ میں عرف کا لحاظ ہے، جن چیزوں میں تخلیہ کو قبضہ سمجھا جاتا ہے ان میں قبضہ کیلئے تخلیہ کافی ہے، اور جن چیزوں میں انتقال کو قبضہ شمار کرتے ہیں ان میں منتقل کرنے کو قبضہ کہا جائے گا، اور جن چیزوں میں قبضہ ”تناول بالید“ سے ہوتا ہے ان میں ”تناول بالید“ کو قبضہ گردانا جائے گا۔

خفیہ کے نزدیک قبضہ کی حقیقت کی تعیین کیلئے لغت کی طرف رجوع کیا گیا ہے کہ لغت میں تسلیم اور قبضہ کی کیا حقیقت ہے، کیونکہ ہر اصطلاحی معنی میں لغوی معنی ملحوظ ہوتا ہے۔

ملک العلماء علامہ کاسانی قبضہ کی تعریف ان الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں: ”أما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي، وهو أن يخلى البائع بين المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“ (البدائع المنائفة ۵، ۲۲۲)۔

جہاں تک تسلیم اور قبضہ کی تفسیر کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک تسلیم اور قبضہ یہ تخلیہ اور تخلی ہے، اور تخلیہ یہ ہے کہ بائع بیع اور مشتری کے درمیان سے ہٹ جائے، دونوں کے درمیان سے مانع کو اس طرح دور کر دے کہ مشتری اس میں تصرف پر قادر ہو جائے تو بائع کو بیع حوالہ کرنے والا اور مشتری کو اس پر قبضہ کرنے والا شمار کیا جائے گا۔

اس کے بعد علامہ کاسانی نے قبضہ اور تسلیم کی اس تفسیر کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ احناف کے یہاں تسلیم اور قبضہ کی مذکورہ تفسیر کیوں ہے۔

”ولنا أن التسليم في اللغة عبارة عن جعله سالماً خالصاً يقال سلم فلان لفلان أي خلص له وقال الله تعالى: ”ورجلا سلماً لرجل“ أي سالماً خالصاً لا يشركه فيه أحد فتسليم المبيع إلى المشتري هو جعل المبيع سالماً للمشتري أي خلص له بحيث لا ينازعه فيه غيره وهذا يحصل بالتخلية فكانت التخلية تسليماً من البائع والتخلي قبضاً من المشتري“ (ایضاً)۔

(ہماری دلیل یہ ہے کہ تسلیم لغت میں شی کو سالم اور خالص بنا دینے کا نام ہے، کہا جاتا ہے: "سلم فلان لفلان" یعنی فلاں آدمی فلاں کے لئے خالص ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "ورجلا سلما لرجل" یعنی ایک آدمی جو خالص ایک ہی کے لئے ہو کوئی اس میں اس کا شریک نہ ہو، لہذا بیع کو مشتری کے حوالہ کرنا بیع کو مشتری کے لئے سالم، یعنی اس طرح خالص کر دینا کہ اس بیع کے سلسلہ میں اس سے کوئی منازعت نہ کرے، اور یہ تخلیہ سے حاصل ہو جاتا ہے، لہذا تخلیہ بائع کی جانب سے تسلیم اور تخلی مشتری کی طرف سے قبضہ ہوگا۔

علامہ کاسانی کی اس عبارت میں وضاحت ہے کہ احناف نے تسلیم اور قبضہ کے شرعی معنی کی تعیین کے لئے لغوی معنی کا اعتبار کیا ہے، یعنی لغت میں تسلیم کے کیا معنی ہیں، اور اس معنی لغوی کے اعتبار سے "تسلیم المبیع" کے کیا معنی ہوں گے، اور یہ مفہوم کس چیز سے حاصل ہو سکتا ہے، چونکہ تخلیہ سے وہ لغوی مفہوم حاصل ہو جاتا ہے اس لئے حنفیہ نے تخلیہ کو تسلیم بیع کا شرعی مفہوم قرار دیا اور اس تخلیہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے "تخلی" کو مشتری کی طرف سے قبضہ قرار دیا، لہذا حنفیہ کے نزدیک تخلیہ سے قبضہ حاصل ہو جائے گا۔

علامہ کاسانی نے تخلیہ سے قبضہ کے حصول کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے: "لأن التسليم واجب و من عليه الواجب لا بد أن يكون له سبيل الخروج عن عهدة ما وجب عليه و الذي في وسعه هو التخلية و رفع الموانع، فأما الإقباض فليس في وسعه. لأن القبض بالبراجم فعل اختياري للقباض فلو تعلق وجوب التسليم به يتعذر عليه الوفاء بالواجب و هذا لا يجوز" (ایضاً)۔

(اس لئے کہ تسلیم واجب ہے اور جس پر واجب ہے اس کے لئے اس واجب سے اپنے ذمہ کو فارغ کرنے کے لئے کوئی راستہ ہونا ضروری ہے اور جو چیز اس کی قدرت میں ہے وہ تخلیہ اور موانع کو دور کر دینا ہے، اقباض (قبضہ کرانا) یہ اسکی قدرت میں نہیں ہے اس لئے کہ ہاتھوں سے لینا یا قبض کا اختیاری فعل ہے، اگر وجوب تسلیم کا تعلق اس فعل اختیاری سے ہو تو (تسلیم کرنے والے پر) واجب کو پورا کرنا معتذر ہو جائے گا اور یہ جائز نہیں ہے)۔

یعنی تخلیہ کو حکماً قبضہ قرار دیا گیا اس لئے کہ بائع یا ہر وہ شخص جس کے ذمہ تسلیم واجب ہے اس کی قدرت میں "اقباض" یعنی قبضہ کرانا نہیں ہے، اس وجہ سے کہ "قبض بالید" قبض کا اختیاری فعل ہے، اس میں تسلیم جس پر واجب ہے اس کا کوئی اختیار نہیں تو اگر وجوب تسلیم کو اس اقباض کے ساتھ متعلق کیا جائے، یعنی اس پر "اقباض" واجب کیا جائے تو یہ "تکلیف مالا یطاق" یا "تکلیف بقدرۃ الغیر" ہوگا اور یہ جائز نہیں، لہذا وہ چیز جو اس کے بس اور قدرت میں ہے اور وہ تخلیہ ہے اس کو اسی کا مکلف بنایا گیا، تاکہ اس سے وہ اپنے ذمہ کو واجب سے فارغ کر سکے۔

تخلیہ کی حقیقت:

جس تخلیہ کو حکماً قبضہ قرار دیا گیا ہے اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں اور آیا ہر چیز کے اندر تخلیہ کی ایک ہی صورت ہوگی یا اشیاء کے اعتبار سے تخلیہ کی مختلف صورتیں ہوں گی؟

علامہ انور شاہ کشمیری نے قبضہ کے تحقق کو بیان کرتے ہوئے تخلیہ کی حقیقت ان الفاظ میں ذکر کی ہے: "فاعلم أولاً أن القبض في المنقولات لا يتحقق عند الشافعية إلا بالنقل والتحويل، وعندنا بالتخلية بينه وبين المشتري، أما أن التخلية ماذا هي؟ فهذا مما لا يكاد ينضبط إلا بعد النظر إلى الجزئيات شيئاً، ومعناها عندی رفع علائق ملكه وتمكينه للمشتري على أن يقبضه، وذلك قد يكون بالفعل وأخرى بالقول وتارة بالقرائن" (فیض الباری ۲۰۶)۔

سب سے پہلے یہ جان لو کہ شوافع کے نزدیک منقول چیزوں میں قبضہ نقل اور تحویل ہی کے ذریعہ پایا جائے گا، اور ہمارے حنفیہ کے نزدیک بیع اور مشتری کے درمیان تخلیہ سے بھی قبضہ تحقق ہو جائے گا، ہاں تخلیہ کیا چیز ہے تو اس کا بیان کرنا مشکل ہے الا یہ کہ جزئیات میں کچھ نظر کی جائے، اور میرے نزدیک تخلیہ کا معنی یہ ہے کہ اپنی ملکیت کے تمام تعلقات کو ختم کر کے مشتری کو قبضہ پر قدرت دے دینا، کبھی یہ فعلاً ہوگا، کبھی قولاً اور کبھی قرائن سے۔

علامہ کاسانی نے ایک دوسری جگہ قبضہ کا معنی ذکر کیا ہے جس سے اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے: "لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي و ارتفاع الموانع عرفاً وعادة وحقيقة" (البدائع والصنائع ۵۱۳۸)۔



قبضہ کے معنی تمکین، تخلی اور عرف و عادت اور حقیقت کے اعتبار سے جتنے منافع ہوں سب کو دور کرنا ہے۔

”در مختار“ میں ہے کہ تسلیم تخلیہ سے اس وقت حاصل ہوگا جب مشتری قبضہ پر قادر ہو جائے، قبضہ سے کوئی مانع اور حائل نہ ہو:

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل و شرط في الاجناس شرطا ثالثا، وهو أن يقول: خلينت بينك وبين المبيع“ (الدر المختار هامش على رد المحتار)۔ (پھر تسلیم تخلیہ سے اس طرح حاصل ہوگا کہ مشتری قبضہ پر قادر ہو جائے بلا کسی مانع اور حائل کے اور اجناس میں ایک تیسری شرط یہ بھی ہے کہ بائع ”خلینت بینک و بین المبیع“ کہے)۔

”بلا مانع ولا حائل“ کی وضاحت علامہ شامی نے اس طرح فرمائی ہے: ”(قوله بلا مانع) بأن يكون مفرزا غير مشغول بحق غيره (وقوله ولا حائل) بأن يكون في حضرته“ (ایضا)۔ (مانع نہ ہو، یعنی بیع الگ ہو کسی غیر کے حق میں مشغول نہ ہو، اور حائل نہ ہو، یعنی مشتری کے سامنے ہو)۔

”اجناس“ ناٹھی نے جو تیسری شرط تخلیہ کی ذکر کی ہے علامہ انور شاہ کشمیری اس شرط کے متعلق فرماتے ہیں: ”و شرط في أجناس الناطفي أن يقول باللسان: “خليت بينه وبينك“ وغير ذلك مما يؤدي مؤداه وليس بضروري عندی و هذا الشرط لم أره عند غيره“ (فیض الباری ۲۰۶)۔

اور ناٹھی کے اجناس میں تیسری شرط ذکر کی گئی ہے کہ بائع زبان سے کہے ”خلیت بینہ و بینک“ یا اسکے علاوہ کوئی دوسرا جملہ جو اس مفہوم کو ادا کر رہا ہو، اور یہ میرے نزدیک ضروری نہیں، اور یہ شرط میں نے ان کے علاوہ کے یہاں نہیں دیکھی۔

صاحب ”در مختار“ نے تخلیہ کے قیود میں سے ”ولا حائل“ پر تفریح کرتے ہوئے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ اگر بیع مشتری کے سامنے نہ ہو بعید ہو تو صحیح قول کے مطابق مشتری قابض نہیں ہوگا، علامہ شامی نے اس صحیح قول کے مقابل جو دوسرا قول ہے اس کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

”قوله على الصحيح) و هو ظاهر الرواية و مقابله ما في المحيط و جامع شمس الأئمة أنه بالتخلية يصح القبض، وإن كان العقار بعيدا غائبا عنهما عند أبي حنيفة خلافا لهما و هو ضعيف كما في البحر، و في الخانية و الصحيح ما ذكر في ظاهر الرواية؛ لأنه إذا كان قريبا يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض، أما إذا كان بعيدا لا يتصور القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض“ (شامی ۲۰۳)۔

(صحیح قول ظاہر الروایۃ ہی ہے اور اس کے مقابل وہ قول ہے جو محیط اور شمس الأئمہ کے جامع میں ہے کہ تخلیہ سے قبضہ صحیح ہو جائے گا، اگرچہ عقار بعید، عاقدین کی نظروں سے اوجھل ہو، امام ابوحنیفہ کے نزدیک، برخلاف صاحبین کے قول کے، اور محیط وغیرہ کا یہ قول ضعیف ہے، جیسا کہ بحر میں ہے، اور خانہ میں ہے کہ صحیح وہی قول ہے جو ظاہر الروایۃ میں مذکور ہے، اس لئے کہ جب عقار قریب ہو تو اس میں فی الحال حقیقی قبضہ کا تصور ہو سکتا ہے، لہذا تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام گردانا جائے گا، لیکن جب دور ہو تو فی الحال اس میں قبضہ کا تصور نہیں ہو سکتا، اس لئے تخلیہ اس صورت میں قبضہ کے قائم مقام نہیں ہوگا)۔

مطلب یہ کہ صاحبین کا قول جو ظاہر الروایۃ میں ہے وہی صحیح ہے، اور خانہ کی عبارت سے اس صحت کی وجہ اور علت یہ معلوم ہوئی کہ تخلیہ کے قبضہ کے قائم مقام ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ عقد کے بعد فی الحال اس میں اگر قبضہ حقیقی کا تصور ہو سکتا ہے تو تخلیہ قبضہ کے قائم مقام ہوگا، ورنہ اگر فی الحال قبضہ حقیقی کا تصور نہ ہو تو تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہیں ہوگا، عقار کے قریب ہونے کی صورت میں چونکہ فی الحال قبضہ حقیقی ہو سکتا ہے، لہذا اس صورت میں تخلیہ قبضہ کے قائم مقام ہوگا اور دوسری صورت میں جب عقار دور ہو تو فی الحال قبضہ حقیقی کا تصور نہیں ہے، اس لئے تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہیں ہوگا۔

صاحب ”فیض الباری“ نے تخلیہ کی حقیقت کو چند جزئیات سے واضح کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے: ”و بالجمله أن القبض في البيع و الهبة و الرهن يتحقق عندنا بالتخلية و المكنة على القبض و لا يحتاج إلى القبض الحسي أو النقل“ (فیض الباری ۲۰۶)۔

(خلاصہ یہ کہ قبضہ بیع، ہبہ اور رهن میں ہمارے نزدیک تخلیہ اور قبضہ پر قدرت سے متحقق ہو جائے گا، قبضہ حسی یا نقل کی ضرورت نہیں ہے)۔

علامہ شامی اس تخلیہ کی جس سے قبضہ پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے چند صورتیں ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ”و حاصله أن التخلية قبض حکما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“ (شامی ۲۰۳)۔



حاصل یہ کہ تخلیہ حکماً قبضہ ہے، اگر بلا مشقت قبضہ پر قدرت حاصل ہو، لیکن یہ قبضہ حکمی بیع کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔

تخلیہ قبضہ تام ہے یا ناقص:

تخلیہ (جس سے بلا مشقت قبضہ پر قدرت حاصل ہو جائے) کے حکماً قبضہ ثابت ہو جانے کے بعد دو مسئلے اور زیر بحث رہ جاتے ہیں: (۱) تخلیہ قبضہ تام ہے یا نہیں، (۲) جواز تصرف کے لئے قبضہ تام ضروری ہے یا مطلقاً قبضہ تصرف کے جائز ہونے کیلئے کافی ہے۔

اس بحث کو علامہ کاسانی نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، دوسرے حضرات نے بھی علامہ موصوف سے اس بحث کو نقل کیا ہے، مثلاً صاحب "اعلاء السنن" ہیں۔

اول الذکر مسئلہ سے متعلق علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ تمام حنفیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام اموال میں تخلیہ سے اصل قبضہ حاصل ہو جائے گا، لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ تخلیہ قبضہ تام ہے یا نہیں۔

"ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال و اختلفوا في أنها بل هي قبض تام أم لا" (بدائع ۵۰۲۳۳)۔ (تمام حنفیہ کے مابین اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام احوال میں تخلیہ سے اصل قبضہ حاصل ہو جائے گا، لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ تخلیہ قبضہ تام ہے یا نہیں)۔

اس کے بعد اس اختلاف کا حاصل ذکر فرمایا ہے جس کو انہی کی عبارت میں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے: "وجملة الكلام فيه أن المبيع لا يخلو إما أن يكون له مثل و إما أن يكون مما لا مثل له، فإن كان مما لا مثل له من المذروعات والمعدودات المتفاوتة فالتخلية فيها قبض تام بلا خلاف، وإن كان مما له مثل فإن باعه مجازفة فكذلك؛ لأنه لا يعتبر معرفة القدر في بيع المجازفة، وإن باء مكايلة أو موازنة في المكيل والموزون وخلي، فلا خلاف في أن المبيع يخرج من ضمان البائع ويدخل في ضمان المشتري ولا خلاف في أنه لا يجوز للمشتري بيعه والانتفاء به قبل الكيل و الوزن لانعدام القبض بانعدام الكيل أو الوزن أو شرعا غير معقول المعنى مع حصول القبض بتمامه بالتخلية" (ملخصاً من البدائع ۵۰۲۳۳)۔

(حاصل یہ کہ بیع دو حال سے خالی نہیں، مثلی ہوگی یا غیر مثلی، اگر غیر مثلی مذروعات یا معدودات متفاوتہ میں سے ہو تو بلا اختلاف تخلیہ اس میں قبضہ تام ہے (تخلیہ سے بیع بائع کے ضمان سے نکل جائے گی اور مشتری کے لئے زرع اور ثمار سے پہلے اس کو بیچنا اور نفع اٹھانا جائز ہے) اور اگر بیع مثلی ہے اور اس کی بیع جزافاً ہی ہوئی ہے تو بھی یہی حکم ہے (تخلیہ سے بالاتفاق قبضہ حاصل ہو جائے گا) اس لئے کہ بیع جزافاً میں مقدار کی معرفت معتبر نہیں ہوتی، لیکن اگر کیل یا وزن چیز کو کیل یا وزن کے شرط کے ساتھ فروخت کیا اور تخلیہ کر دیا تو اس مسئلہ میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بیع بائع کے ضمان سے خارج ہو جائے گی اور مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی، اور اسی طرح اس میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ مشتری کے لئے کیل یا وزن سے پہلے اس کا فروخت کرنا یا اس سے انتفاع جائز نہیں ہے، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ تصرف کی حرمت کیل یا وزن سے پہلے کیل اور وزن کے نہ پائے جانے کی وجہ سے قبضہ کے معدوم ہونے کی بنا پر ہے یا تخلیہ سے قبضہ تام حاصل ہو جانے کے باوجود تصرف کی حرمت شرعاً غیر معقول المعنى ہے)۔

اس کے بعد علامہ کاسانی مشائخ احناف کا یہ اختلاف تحریر فرماتے ہیں: "قال بعض مشائخنا، إنما تثبت شرعا غير معقول المعنى، و قال بعضهم: الحرمة لمكان انعدام القبض على التمام بالكيل أو الوزن، و كما لا يجوز التصرف في المبيع المنقول بدون قبضه أصلاً لا يجوز بدون قبضه بتمامه" (ایضاً)۔

(بعض مشائخ احناف کا قول یہ ہے کہ تصرف کی حرمت کا ثبوت شرعاً غیر معقول المعنى (امر تعبدي) ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ کیل یا وزن کے ذریعہ قبضہ تام کے معدوم ہونے کی وجہ سے ہے اور جس طرح منقول بیع کے اندر اصل قبضہ کے بغیر تصرف ناجائز ہے، قبضہ تام کے بغیر بھی ناجائز ہے)۔

پھر مشائخ کی دونوں جماعتوں کی دلیل ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "وجه قول الأولين ما ذكرنا أن معنى التسليم والتسليم يحصل بالتخلية؛ لأن المشتري يصير سالماً خالصاً للمشتري على وجه يتهاى له تقليبه و التصرف فيه على حسب

مشیتہ و إرادته، و لهذا كانت التخلية تسليماً و قبضاً فيما لا مثل له و فيما له مثل إذا بيع مجازفةً دل أن التخلية قبض إلا أن حرمة التصرف مع وجود القبض بتمامه ثبت تعبدًا غير معقول المعنى والله عز و جل أعلم - وجه قول الآخرين تعليل محمد في هذه المسئلة في كتاب البيوع، فانه قال: و لا يجوز للمشتري أن يتصرف فيه قبل الكيل لأنه باعه قبل أن يقبضه و لم يرد به أصل القبض و الدليل على أن الكيل و الوزن في المكيل و الموزون الذي يبيع مكايلة و موازنة من تمام القبض أن القدر في المكيل و الموزون معقود عليه، ألا ترى! أنه لا كيل فإزداد لا تطيب له الزيادة بل تزداد يفرض لها ثمن و لو نقص يطرأ بحصته شيء من الثمن و لا يعرف القدر فيهما إلا بالكيل و الوزن لاحتمال الزيادة و النقصان، فلا يتحقق قبض القدر المعقود عليه إلا بالكيل و الوزن فكان الكيل و الوزن فيه من تمام القبض“ (ص ۲۲۵)۔

(اول الذکر مشائخ کے قول کی دلیل وہی چیز جو ہم نے ذکر کی کہ تسلیم اور تسلیم کا معنی تخلیہ سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ خریدی ہوئی چیز مشتری کے لئے اس طرح خالص ہو گئی کہ وہ اس میں اپنے ارادہ اور منشا کے مطابق تصرف کر سکتا ہے، اور اس وجہ سے تخلیہ غیر مثلی چیز اور اس مثلی میں جس کو جزافاً بیچا جائے قبضہ شمار ہوتا ہے، یہ دلیل ہے کہ تخلیہ قبضہ ہے، مگر قبضہ تام کے پائے جانے کے باوجود تصرف حرام ہے، اس لئے کہ حرمت کا ثبوت تعبدی ہے، یعنی غیر معقول المعنى ہے اس کی حرمت کی شرعاً کوئی علت نہیں بیان کی گئی ہے، واللہ عز و جل أعلم۔ دوسرے حضرات کے قول کی دلیل کتاب البيوع میں اس مسئلہ میں امام محمد کی تعلیل ہے، کیونکہ امام محمد نے فرمایا کہ مشتری کے لئے کیل سے پہلے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے، اس وجہ سے کہ اس نے اس کو قبضہ سے پہلے فروخت کیا ہے، امام محمد کی مراد اس سے اصل قبضہ نہیں ہے، بلکہ اس سے قبضہ تام مراد لیا ہے اس لئے کہ اصل قبضہ تو موجود ہے، اور اس کی دلیل کہ مکیلی اور موزونی چیز میں مقدار معقود علیہ ہے، کیونکہ دیکھے صورت مذکورہ ہی میں اگر بیع کو کیل کیا گیا اور بیع زائد نکلی تو یہ زیادتی مشتری کے لئے طیب نہیں ہے، بلکہ یا تو واپس کر دے یا اسکے عوض ثمن مقرر کرے، اور اگر بیع کم نکلی تو ثمن سے اتنی مقدار وضع کر دی جائے گی (لہذا مقدار معقود علیہ ہے) اور ان دونوں زیادتی اور کمی کے احتمال کی وجہ سے مقدار کو کیل اور وزن ہی سے جانا جاسکتا ہے، لہذا معقود علیہ کی مقدار پر قبضہ کیل اور وزن کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتا، لہذا اس میں کیل اور وزن قبضہ کے اکمال اور اتمام میں سے ہوگا)۔

اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ بعض مشائخ کے نزدیک تو تخلیہ سے قبضہ تام متحقق ہو جاتا ہے، خواہ بیع مثلی ہو یا غیر مثلی، اور مثلی ہونے کی صورت میں بیع مجازفہ ہو یا کیل و وزن کی شرط کے ساتھ، لیکن جب بیع مثلی ہو اور بیع کیل اور وزن کی شرط کے ساتھ ہوئی ہو تو قبل کیل و وزن اس بیع میں تصرف جائز نہیں، اس لئے کہ احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لہذا اشریعت کے اس حکم کی وجہ سے محض تعبداً اس میں تصرف ممنوع ہوگا، ہاں مشتری کے ضمان میں وہ بیع آجائے گی۔ دوسرے بعض مشائخ کی رائے ہے کہ اگر بیع غیر مثلی مذروعات اور معدودات متفاوتہ میں سے ہے یا مثلی ہے، لیکن بیع کیل یا وزن کی شرط کے ساتھ نہیں ہوئی ہے تو تخلیہ سے قبضہ تام حاصل ہو جائے گا اور اس میں اس کے لئے ہر طرح تصرف کرنا اور انتفاع جائز ہوگا، لیکن اگر بیع مثلی ہے اور بیع کیل اور وزن کی شرط کے ساتھ ہوئی ہے تو محض تخلیہ سے قبل کیل و وزن قبضہ تام حاصل نہیں ہوگا، لہذا کیل اور وزن سے پہلے اس میں تصرف جائز نہیں ہوگا، علامہ کاسانی کے نزدیک یہ قول راجح ہے اسی لئے اول الذکر حضرات کی دلیل کا ان کی دلیل کے تحت جواب بھی دیا ہے۔

نیز ان عبارتوں سے دوسرا مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ مشائخ کی دونوں جماعتوں کے نزدیک قبضہ تام کے بغیر تصرف جائز نہیں ہے جس طرح اصل قبضہ کے بغیر تصرف جائز نہیں ہے، ہاں ایک جماعت نے تخلیہ کو مطلقاً قبضہ تام شمار کیا ہے اور دوسری جماعت نے ایک صورت میں تخلیہ کو قبضہ تام نہیں شمار کیا ہے، بلکہ تخلیہ سے محض قبضہ متحقق ہوگا، اور کیل و وزن سے قبضہ تام ہو جائے گا۔

### ۳۔ قبضہ کی نوعیت میں اختلاف:

تمام ائمہ کرام کے نزدیک اشیاء کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت میں اختلاف ہوگا، احناف کے نزدیک بھی اگرچہ تمام اموال میں تخلیہ سے قبضہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن بیع کی حالت کے اعتبار سے تخلیہ کی نوعیت مختلف ہوگی، جیسا کہ شامی کے حوالہ سے ماقبل میں یہ بات گذر چکی ہے۔

”و حاصله أن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“۔

(حاصل یہ کہ تخلیہ حکماً قبضہ ہے اگر بلا مشقت و کلفت قبضہ پر قدرت حاصل ہو جائے، لیکن یہ قبضہ حکمی بیع کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوگا)۔



اس کے بعد علامہ شامی نے کچھ مسئلہ اور جزئیات اس اختلاف کی وضاحت کیلئے ذکر کی ہیں:

”ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن تكون في البلد فيما يظهر، وفي نحو بقر في مرعى، فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض، وفي نحو ثوب فكونه بحيث لو مد يده تصل إليه قبض، وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض“ (شامی ۴۰۳)۔

(لہذا گیہوں یا اس طرح کی چیز جو گھر میں ہو کئی کا دینا جب کہ اس سے بلا مشقت کھولنا ممکن ہو قبضہ ہے، اور دار کے مانند چیز میں اس کے بند کرنے پر قدرت کا ہونا قبضہ ہے، اس طرح کہ وہ اسی شہر میں ہو، اور گائے، بیل وغیرہ جو چراگاہ میں ہوں ان کا اس طرح ہونا کہ وہ نظر آرہے ہوں ان کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہو قبضہ ہے، اور کپڑے وغیرہ میں کپڑے کا اس طرح ہونا کہ اگر ہاتھ بڑھایا جائے تو ہاتھ پہنچ جائے قبضہ ہے، اور گھوڑے یا پرندے وغیرہ میں جو گھر کے اندر ہوں بلا کسی مددگار کے گھر سے ان کے پکڑنے کا ممکن ہونا قبضہ ہے)۔

اور اگر ثلاثہ کے نزدیک عرف کے اختلاف سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوگی، جیسا کہ قبل میں ”الجموع“ اور ”لفقہ ال اسلامی“ وغیرہ کے حوالہ سے ذکر کیا جا چکا ہے نیز صاحب ”بذل المجهود“ نے خطاب کا قول ذکر کیا ہے: ”قال الخطابي: القبوض يختلف في الأشياء بحسب اختلافها في أنفسها، فمنها: ما يكون بأن يوضع المبيع في يد صاحبه، ومنها: ما يكون بأن يكتال وذلك فيما يبيع من الكيل كالأرض، فأما ما يباع منه جزافاً صبرة مضبوطة على الأرض فالقبض أن ينقل ويحول من مكانه“ (بذل المجهود ۴۰۴)۔

(علامہ خطابی نے فرمایا کہ اشیاء کی ذات میں اختلاف کے اعتبار سے قبضہ بھی مختلف ہوتا ہے، قبضہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بیع مالک کے ہاتھ میں رکھ دی جائے، اور بیع، مشتری کے درمیان تخلیہ سے بھی قبضہ ہو جاتا ہے، اور ایک صورت یہ ہے کہ بیع کو اس کی جگہ سے منتقل کر دیا جائے، اور ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کیل کرنے سے قبضہ حاصل ہوتا ہے، اور یہ اس صورت میں جب کہ کسی منگلی شے کو کیل کی شرط پر بیچا جائے، لیکن اس صورت میں جب جزافاً زمین پر لگے ہوئے ڈھیر کے اعتبار سے فروخت کیا جائے تو پھر قبضہ منتقل کرنے سے ہوگا)۔

## ۴۔ بیع قبل القبض کی ممانعت سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں:

حضرت ابن عباسؓ سے اس نبی کے سبب کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس میں ربا ہے۔

”وسئل عن ابن عباسؓ عن سبب هذا النهي فقال: الدراهم بالدراهم والطعام ربا، قال الشوكاني وذلك؛ لأنه إذا اشترى طعاماً بمائة دينار ودفعها للبائع ولم يقبض منه الطعام ثم باع الطعام إلى آخر فكانه اشترى منه بذهبه ذهباً أكثر“ (اعلاء السنن ۱۲، ۲۲۵)۔

حضرت ابن عباسؓ سے اس نبی کے سبب کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: دراهم دراهم کے بدلے ہوئے اور غلہ ربا ہے، شوکانی نے کہا اور وہ اس لئے کہ اس نے (مشتری) جب سو دینار میں غلہ خریدا اور سو دینار بائع کو دیدیا، اور غلہ پر قبضہ نہیں کیا پھر غلہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا تو گویا اس مشتری نے بائع سے اپنے سونے کے بدلے زیادہ سونا خریدا)۔

علامہ شوکانی اس تعلیل کے بارے میں فرماتے ہیں: ”وهذا التعليل أجود مما علل به النهي؛ لأن الصحابة أعراف بمقاصد الرسول ﷺ“ (ایضاً)۔ (یہ تعلیل دوسری تمام تعلیلوں سے عمدہ ہے، اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سرکارِ دو عالم ﷺ کے مقاصد سے زیادہ واقف ہیں)۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول: ”الدراهم بالدراهم والطعام ربا“ کے بجائے ”ألا تراهم أنهم يتبايعون بالذهب والطعام مرجأ“ کے الفاظ ہیں، لیکن ان کا بھی وہی مطلب ہے کہ ”بیع الشيء قبل القبض بيع الذهب بالذهب متفاضلاً“ کو متضمن ہے جو ربا ہے یعنی ”ربا بالتفاضل“ ہے، جیسا کہ صاحب ”فتح الباری“ حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے (فتح الباری ۱۵/۲۵۳)۔

صاحب ”ہدایہ“ نے شیخین کے قول ”بیع العقار قبل القبض“ کے جواز کی دلیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:



”والغمر المنهى عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به ( قال ابن الهمام): والحديث الذي استدل به معلول به أى بغير الانفساخ“ (فتح القدير ۵، ۲۶۶)۔ (جس غرر سے منع کیا گیا ہے وہ عقد کے نسخ ہونے کا غرر ہے، اور حدیث (بیع قبل القبض عدم جواز کی) اسی غرر کے ساتھ معلول ہے، ابن ہمام نے کہا: وہ حدیث جس سے استدلال کیا گیا غرر انفساخ کے ساتھ معلول ہے)۔

یعنی شیخین کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ کی نہی سے متعلق احادیث معلول ”بعلة غرر الانفساخ“ ہیں، لہذا عقار کی بیع قبل القبض غرر انفساخ کی علت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے نزدیک جائز ہوگی، اور محمد عقار کی بیع کو بھی قبل القبض ناجائز قرار دیتے ہیں امام ابو یوسف کا بھی یہی قول اول تھا، کیونکہ عدم جواز کا حکم منقول اور غیر منقول دونوں کو عام ہے اس وجہ سے کہ نہی کی علت ”بیع قبل القبض“ کا ”رجع المالم یضمن“ کو متضمن ہونا ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

صاحب ”اعلاء السنن“ تحریر فرماتے ہیں: ”ثم أبو حنيفة قصر الحكم على المنقول وغير المنقول، واحتج أبو حنيفة بأن الحكم معلل بغير انفساخ العقد بهلاك المبيع والهالك في غير المنقول نادر والنادر كالمعدوم وقال صاحباه، إنه إن لم يكن فيه غرر الانفساخ، ففي بيعه قبل القبض ربح ما لم يضمن وهو منهى عنه“۔

(پھر امام ابو حنیفہ نے حکم کو منقول پر منحصر کیا ہے اور صاحبین منقول اور غیر منقول میں حکم کے عام ہونے کے قائل ہیں، امام ابو حنیفہ نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ حکم (عدم جواز بیع قبل القبض) معلل ہے بیع کی ہلاکت کی وجہ سے عقد کے نسخ ہو جانے کے غرر اور اندیشہ کے ساتھ، اور ہلاکت غیر منقول میں نادر ہے اور نادر کا معدوم ہے، اور صاحبین نے فرمایا کہ اگرچہ اس میں غرر انفساخ نہیں ہے لیکن عقار کے قبل القبض بیع میں ”رجع المالم یضمن“ ہے، اور اس سے منع کیا گیا ہے)۔

واضح رہے کہ امام ابو یوسف کا یہ قول اول ہے، قول ثانی اور آخر میں امام صاحب کے ساتھ ہیں، جیسا کہ صاحب فتح القدير نے ذکر کیا ہے (۲۶۵/۵)۔

بعض حضرات نے شیخین کے نزدیک بھی ”بیع قبل القبض“ کے عدم جواز کی یہی علت ذکر کی ہے کہ یہ ”رجع المالم یضمن“ کو متضمن ہے، پھر بیع العقار قبل القبض کے جواز کی یہ وجہ بیان فرماتے ہیں کہ انسان کے ضمان میں صرف وہ چیز آتی ہے جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو جس میں ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو یا نادر ہو وہ چیز مضمون نہیں ہوتی، اس میں بائع اور مشتری دونوں کا ضمان برابر ہوتا ہے، اور عقار میں ہلاکت کا اندیشہ نادر ہے۔ ہاں اگر عقار دریا کے کنارے ہو یا بیع بالا خانہ ہو اس کی بیع بھی قبل القبض جائز نہیں اس وجہ سے کہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

”تکملہ فتح الملہم“ میں ہے: ”وبعین هذه الدلائل الثلاثة يستدل أبو حنيفة وأبو يوسف رحمهما الله تعالى، غير أنهما يستثنيان العقار من عموم النهي، لأن علة النهي منفية فيه، فإن الحديث الأخير، حديث عبد الله بن عمرو، دل على أن علة النهي عن بيع المبيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح ما لم يضمن، وإنما يضمن الإنسان ما يخاف فيه الهلاك، وأما العقار فلا يخشى فيه ذلك إلا نادراً حتى لو كان العقار على شط البحر أو كان المبيع علواً لا يجوز بيعه قبل القبض“ (تکملہ فتح الملہم ۱، ۲۵۲)۔

(بعینہ انہی تینوں دلائل سے (جن سے امام شافعی اور امام محمد نے استدلال کیا ہے) امام ابو حنیفہ و ابو یوسف نے بھی استدلال کیا ہے، مگر ان دونوں نے نہی کے عموم سے عقار کو مستثنیٰ کیا ہے اس لئے کہ نہی کی علت اس میں موجود نہیں ہے، کیونکہ حدیث اخیر یعنی عبد اللہ بن عمرو کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نہی کی علت بیع قبل القبض کا ”رجع المالم یضمن“ کو متلزم ہونا ہے، اور انسان صرف انہیں چیزوں کا ضمان ہوتا ہے جن میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، اور ہاں عقار تو اس میں اس کا اندیشہ نہیں ہوتا الا شاذ و نادر، اگر عقار دریا کے کنارے ہے یا بیع اوپر کی منزل ہے تو اس کی بیع قبل القبض جائز نہیں) (اس لئے کہ اس میں ہلاکت کا اندیشہ ہے، لہذا یہ مضمون بھی ہوگی)۔

صاحب ”الفقہ الاسلامی وادلتہ“ نے ائمہ کرام کے مذاہب اور ہر ایک کے نزدیک نہی کی جو علت ہے اس کو ذکر کیا ہے: ”والخلاصة، أن العلة عند الحنفية في عدم جواز بيع الشيء قبل قبضه هي الغرر والعلة في منع بيع الطعام قبل قبضه عند المالكية هي أنه قد يتخذ البيع ذريعة للتوصل إلى ربا النسئة فهو شبهه ببيع الطعام فالطعام نساء فيحرم سداً للذرائع۔ فالعلة في منع هذا البيع عند الحنابلة هي الغرر كالحنفية۔

فالعلة في منع البيع عند الشافعية هي الغرر كالحنفية“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳، ۷۳، ۷۴، ملخصاً)۔

(خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک بیع اشیاء قبل القبض کے عدم جواز کی علت غرر ہے، اور بیع الطعام قبل القبض کے ممنوع ہونے کی علت مالکیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس بیع کو کبھی ”ربا بالنسیئة“ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے، لہذا یہ ”بیع الطعام بالطعام نساء“ کے مشابہ ہے، لہذا اسد اللذرائع اس کو حرام قرار دیا گیا، اور حنابلہ کے نزدیک اس بیع کے ممنوع ہونے کی علت غرر ہے احناف کی طرح، اور شوافع کے نزدیک بھی احناف کی طرح اس بیع کے ممنوع ہونے کی علت غرر ہی ہے)۔

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ نہی سے متعلق احادیث معلول ہیں، لیکن علت نہی میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے، اس لئے کہ نہی کی کوئی علت حدیث پاک میں منصوص نہیں ہے، بعض علماء نے ”بیع مالہ یضمن“ کے مستلزم ہونے کو علت منصوصہ قرار دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ بیع قبل القبض کے عدم جواز کی علت کے طور پر اس کی تصریح نہیں ہے، ہاں دوسری حدیث کے اندر اس کی ممانعت ہے، لیکن دوسری حدیث میں اس کی ممانعت ہونے اور بیع قبل القبض کے اس کو مستلزم ہونے کی وجہ سے اس کو علت منصوصہ نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے کہ پھر تو ”ربا بالنسیئة أو التفاضل“ اور ”غرر“ اس کی بھی ممانعت ہے اور ”بیع قبل القبض“ اس کو مستلزم ہے، لہذا یہ بھی علت منصوصہ ہونی چاہئے، لہذا یہ سب اجتہادی اور غیر منصوص علتیں ہیں، اور ہر امام نے اپنی اختیار کردہ علت کے اعتبار سے اس نہی میں استثناء یا تخصیص کی ہے اور دوسروں کے مسلک کے لحاظ سے وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

صاحب ”الفقہ الاسلامی“ اپنے رجحان کو ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کی علت فقہاء مذاہب کی ذکر کردہ علتوں کا مجموعہ ہے۔  
 ”نحن نرجح أن الحكمة في النهي أصلاً عن بيع ما لم يقبض هي أن هذا البيع يشبه الربا إذ أن المشتري إذا دفع دراهمه إلى البائع في سلعة، ثم عمد إليها فباعها قبل أن يقبضها فكأنها دفع دراهمه واستفاد بها ربحاً بمجرد دفعها إلى البائع دون القيام بعمل ما، وهذا شبهه الربا ثم أن في هذا البيع غرراً ناشئاً عن عدم القدرة على التسليم وبه تكون علة النهي عن بيع الشيء قبل قبضه هو مجموع ما ذكره فقهاء المذاهب“ (۴، ۲۷۵-۲۷۶)۔

(ہم راجح سمجھتے ہیں کہ ”بیع مالہ یضمن“ سے نہی کی حکمت یہ ہے کہ یہ بیع ”ربا“ کے مشابہ ہے، اس لئے کہ جب مشتری نے اپنے درہم بائع کو دیئے کسی سامان کیلئے، پھر اس سامان کا قصد کیا اور قبضہ سے پہلے ہی اس کو فروخت کر دیا تو گویا مشتری نے اپنے درہم بائع کو دیئے اور محض دینے سے اس سے نفع کمایا، جب کہ اس میں کچھ کیا نہیں، اور یہ ”ربا“ کے مشابہ ہے، پھر اس بیع میں تسلیم پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے غرر بھی پیدا ہونے والا ہے، اور اس کی وجہ سے ”بیع قبل القبض“ کے عدم جواز کی علت فقہاء مذاہب کی ذکر کردہ علتوں کا مجموعہ ہوگی)۔

مذکورہ تمام عبارتوں سے گرچہ یہ معلوم ہوا کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت ”معلول بالعلتہ“ ہے، لیکن علامہ ابن العربی مالکی، ”عارضۃ الاحوزی شرح ترمذی“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حکم غیر معلل ہے:

”أصل هذه المسائل أن البيع قبل القبض هل هو معلل أم لا وقد تقدم من كلامنا أنه غير معلل وإنما هو تعبد. وقال أبو حنيفة: لم يجز ما لم يقبض للغرر؛ لأنه يخشى انفساخ العقد بهلاكه“ (عارضۃ الاحوزی ۵، ۲۹۲)۔  
 (ان مسائل کی اصل یہ ہے کہ بیع قبل القبض (کی ممانعت) کیا معلل بالعلتہ ہے یا نہیں اور ما قبل میں ہمارے کلام کے اندر یہ گزر چکا کہ یہ غیر معلل ہے اور یہ حکم تعبدی ہے، اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ قبضہ سے پہلے بیع جائز نہیں غرر کی وجہ سے، اس لئے کہ بیع کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے عقد کے فسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے)۔  
 الحاصل حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عام ائمہ کرام کی رائے یہی ہے کہ یہ حکم معلل بالعلتہ ہے، ہاں تعیین علت میں اختلاف ہے۔

بیع قبل القبض کے سلسلہ میں ائمہ کرام کے مذاہب:

۵۔ علامہ نوویؒ نے ”المجموع شرح المہذب“ میں ابن المنذرؒ سے اور ”صاحب بذل الجہود“ نے خطابی سے ”بیع قبل القبض“ کے سلسلہ میں علماء کے مذاہب نقل کئے ہیں، یہاں بذل الجہود سے عبارت نقل کی جا رہی ہے:

”قال الخطابي أجمع أهل العلم على أن الطعام لا يجوز بيعه قبل القبض واختلفوا فيما عداه من الأشياء. فقال أبو حنيفة وأبو يوسف: ما عدا الطعام بمنزلة الطعام إلا الدور والأراضي. فإن بيعها قبل قبضها وغير الطعام من السلعة والدور والعقار سواء لا يجوز بيع شيء منها حتى يقبض وهو قول ابن عباسؓ، وقال مالك ابن انس: ما عدا“



الماکول والمشروب جائز أن يباع قبل أن يقبض، وقال الأوزاعي وأحمد بن الحنبل وإسحق: يجوز بيع كل شيء منها خلا المكيل والموزون روى ذلك عن ابن المسيب والحسن بصرى والحكم وحماد، انتهى“ (بذل المجهود ۴۰۸۳)۔

(علامہ خطابی نے کہا کہ اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ غلہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، غلہ کے علاوہ دوسری اشیاء میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ دار اور اراضی کے سوا غلہ کے علاوہ تمام چیزیں غلہ ہی کے درجہ میں ہیں، دار اور اراضی کی بیع قبل القبض جائز ہے، امام شافعی اور امام محمد نے فرمایا کہ غلہ اور غلہ کے علاوہ تمام چیزیں، خواہ سامان ہو یا دار ہو یا عقار ہو سب برابر ہیں کسی چیز کی بیع قبل القبض جائز نہیں، حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے، امام مالکؓ نے فرمایا کہ ماکول اور مشروب کے علاوہ ہر چیز کی بیع قبل القبض جائز ہے، امام اوزاعیؓ، امام احمد بن حنبلؓ اور اسحاقؓ نے فرمایا کہ مکلی اور موزونی چیز کے علاوہ ان میں سے ہر چیز کی بیع جائز ہے، حضرت ابن المسيب، حسن بصری، حکم اور حمادؓ سے یہی قول مروی ہے)۔

یعنی بیع قبل القبض کے سلسلہ میں علماء کے چار مذاہب ہیں:

- ۱۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک عقار کے علاوہ کسی چیز کی بیع قبل القبض جائز نہیں۔
- ۲۔ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک کسی چیز کی بیع قبل القبض جائز نہیں، حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔
- ۳۔ امام مالکؓ کے نزدیک ماکول اور مشروب کی بیع جائز نہیں، اس کے علاوہ تمام چیزوں کی جائز ہے۔
- ۴۔ امام اوزاعیؓ، امام احمد بن حنبلؓ اور اسحاقؓ کے نزدیک مکلی اور موزونی کے علاوہ ہر چیز کی بیع قبل القبض جائز ہے، صرف مکلی اور موزونی چیز کی بیع قبل القبض جائز نہیں، حضرت سعید بن المسیب، حسن بصری، حکم اور حمادؓ سے بھی یہی مروی ہے۔

دلائل:

حضرت امام شافعیؒ اور امام محمدؒ اپنے مسلک پر حضرت حکیم بن حزام اور زید بن ثابتؓ کی روایتوں سے استدلال کرتے ہیں، علامہ نوویؒ ”شرح مہذب“ میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے اصحاب (شوافع) نے حضرت حکیم بن حزامؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ: نہ فروخت کرو جب تک کہ اس پر قبضہ نہ کر لو، اور یہ حدیث حسن ہے، جیسا کہ شروع فصل میں بیان گذر چکا اور زید بن ثابتؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے سامانوں کو فروخت کرنے سے خریدنے کے وقت منع فرمایا، جب تک کہ تاجران کو اپنے گھروں میں منتقل نہ کر لیں، ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے (شرح مہذب ۲۹۶/۹)۔

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک یہ روایتیں عام ہیں، لہذا یہ حکم عام ہوگا، اس میں تخصیص نہیں کی جائے گی، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسفؒ نے بھی انہیں روایتوں سے استدلال کیا ہے، لیکن ان کے نزدیک یہ حکم عام نہیں، بلکہ ”عام لم یخص منه البعض“ ہے، علت نہی (قبضہ سے پہلے بیع کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے عقد کے فسخ ہو جانے کا اندیشہ) کی وجہ سے یہ حکم منقول کے ساتھ خاص ہوگا، غیر منقول کی بیع قبل القبض جائز ہوگی، شیخینؒ پر یہاں اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ نص تعلیل کے مقابلہ میں ہے، کیونکہ یہ تونس کے عموم کی تخصیص ہے، لہذا قیاس اور معنی کو نص پر ترجیح دینا لازم آئے گا، حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔

صاحب ”فتح القدیر“ نے یہ سوال اور اس کا جواب ذکر کیا ہے کہ یہ نص ”عام خص منه البعض“ ہے، لہذا علت کی وجہ سے مزید اس میں تخصیص ہو سکتی ہے، ہاں اگر یہ ”عام لم یخص منه البعض“ ہوتا تو اس میں تخصیص اور تعلیل جائز نہ ہوتی، لہذا علت کی وجہ سے تخصیص کی جا سکتی ہے۔

نیز عقار کی بیع قبل القبض بیع کے جواز پر دلیل وہ روایت بھی ہے جس کو صاحب ”اعلاء السنن“ نے ”شرح مہذب“ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، لہذا احناف اس روایت کی وجہ سے بھی اس حکم کو منقول کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔

امام مالکؓ اور ان کے موافقین حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباسؓ، نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی ان روایتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں طعام کی ”بیع قبل القبض“ سے ممانعت ہے، اس طرح کہ طعام کی تخصیص اور تصریح اس بات کی دلیل ہے کہ طعام کے علاوہ حکم یہ نہیں ہے۔

”قالوا فاللتخصیص فی هذه الأحادیث يدل علی أنه غیره بخلافه“ (شرح المہذب ۲۹۶/۹)۔



(انہوں نے کہا کہ ان احادیث میں طعام کی تصریح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غیر طعام اس کے برخلاف ہے)۔

نیز وراثت یا وصیت کے ذریعہ ملکیت میں آنے والی چیز پر قیاس سے بھی استدلال کرتے ہیں، نیز بیع کے قبل قبض اعناق اور اجارہ پر دینے کے جواز پر بھی قیاس کرتے ہیں۔

امام مالک کے ان روایتوں سے استدلال کا مطلب یہ ہوگا کہ طعام ان احادیث میں ماکول اور مشروب کے معنی میں ہے۔

بعض علماء نے امام مالک کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ مکلی، موزونی اور معدودی کے علاوہ دوسری چیزوں کی بیع قبل قبض جائز ہے، یعنی امام احمد بن حنبل کا جو مذہب نقل کیا گیا ہے وہی امام مالک کا بھی ہے جیسا کہ تاملہ فتح الملہم میں ہے:

”قال مالک: إنما يمتنع البيع قبل القبض في المكيل والموزون من الطعام خاصة وقال سحنون وابن حبيب من المالكية، أنه يمتنع في كل مكيل أو موزون أو معدود الخ“ (۲۵۱، ۱)۔

اس قول کے اعتبار سے امام مالک کا استدلال اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کا اپنے مذہب پر استدلال انہیں روایتوں سے ہوگا جن میں طعام کی قبل قبض بیع سے منع کیا گیا ہے، اس طرح سے کہ طعام سے مکلی یا موزونی چیز لیں گے، اور طعام کی تخصیص یہ دلیل ہے کہ غیر طعام کی بیع قبل قبض جائز ہے، جیسا کہ ”المغنی“ میں ابن قدامہ نے ذکر کیا ہے:

”والذي يمنع من بيعه قبل قبضه هو الطعام وذلك؛ لأن النبي ﷺ نهي عن بيع الطعام قبل قبضه، فيفهم من هذا أن بيع ما سواه قبل قبضه مباح، والطعام في ذلك الوقت كان مستعملا غالبا فيما يكال ويوزن وقيس عليهما المعدود والمزروع لاحتياجها عن توفيه“ (بحوالہ حاشیہ خلیۃ العلماء ۴، ۷۸)۔

(وہ چیز جس کی بیع قبل قبض ناجائز ہے وہ طعام ہے اور یہ اس لئے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے طعام کی بیع قبل قبض سے منع فرمایا ہے، لہذا اس سے یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ طعام کے علاوہ کی بیع قبل قبض جائز ہے، اور طعام اس وقت عموماً کیلی اور وزنی چیز کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، اور مکلی و موزونی پر معدود اور مزروع کو بھی قیاس کر لیا گیا، اس لئے کہ حق کی ادائیگی کے لئے ان کی ضرورت پڑتی ہے)۔

۶۔ کیا ضمان میں آجانا تصرف کے جواز کیلئے کافی ہے:

قبضہ کی حقیقت کی بحث میں (سوال کے جواب میں) یہ بات گزر چکی ہے کہ قبضہ کے لئے حسی یا نقل کی ضرورت نہیں ہے۔

”ولا يحتاج إلى القبض الحسی أو النقل“ (فیض الباری ۲، ۲۰۶)۔

یعنی تخلیہ سے قبضہ متحقق ہو جائے گا، حسی قبضہ یا نقل کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن محض ضمان میں آجانے کی وجہ سے انتفاع اور تصرف جائز ہوایا بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ما قبل میں قبضہ ہی کی بحث میں تخلیہ کے قبضہ تام یا ناقص ہونے کی تفصیل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ جس صورت میں تخلیہ سے قبضہ تام حاصل نہ ہو، بلکہ قبضہ ناقص ہی رہے تو بیع مشتری کے ضمان میں تو آجائے گی، لیکن اس میں تصرف کرنا یا اس سے انتفاع قبضہ تام سے پہلے مشتری کیلئے جائز نہیں ہے۔

”وان باء مكايلة أو موزونة في المكيل أو الموزون وخلي فلا خلاف في أن المبيع يخرج من ضمان البائع ويدخل في ضمان المشتري ولا خلاف في أنه لا يجوز للمشتري بيعه والانتفاع به قبل الكيل والوزن“ (البدائع الصنائع ۵، ۲۲۳)۔ (اگر مکلی یا موزونی چیز کو کیل یا وزن کی شرط پر فروخت کیا اور تخلیہ پایا گیا تو اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی، اور اس بات میں بھی اختلاف نہیں کہ مشتری کیلئے کیل یا وزن سے پہلے اس کا فروخت کرنا اور انتفاع جائز نہیں)۔

لہذا محض ضمان میں آجانے کی وجہ سے اس کی خرید و فروخت کو جائز نہیں کہا جاسکتا، نیز محض خریدنے کی وجہ سے شیء ضمان میں آجائے گی یہ بھی محتاج دلیل ہے، جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ محض خریدنے سے احناف کے نزدیک شیء مشتری کے ضمان میں داخل نہیں ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود یہ خرید و فروخت جائز ہے، اس لئے کہ خریدار نمبر ۱ کے حکم و اجازت سے فیکٹری جب وہ مال کسی ٹرانسپورٹ یا نقل و حمل والی کمپنی کے حوالہ کرے گی تو وہ ٹرانسپورٹ کمپنی یا نقل و حمل والی کمپنی اس خریدار نمبر ۱ کی اجیر یا وکیل قرار پائے گی، اور اجیر یا وکیل کا قبضہ مشتری کا قبضہ شمار ہوتا ہے، لہذا اجیر یا وکیل کے قبضہ میں آتے ہی گویا مشتری کے قبضہ میں آجائے گی، اس طرح اس خریدار کی فروختگی دوسرے نمبر کے خریدار سے جائز ہوگی اور اس کے ضمان میں داخل ہونے کی وجہ سے خریدار نمبر ۲ کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر ہلاک ہوگی تو ہلاکت اس خریدار نمبر ۱ کے مال سے شمار ہوگی۔

”عالمگیری“ میں اس طرح کا ایک مسئلہ مذکور ہے: ”إذا قال المشتري للبائع: ابعت إلى ابني واستأجر البائع رجلاً يحمله إلى ابني، فهذا ليس بقبض والأجر على البائع إلا أن يقول استأجر علي من تحمله، فقبض الأجير يكون قبض المشتري الخ“ (عالمگیری ۳۰۹)۔ (جب مشتری نے بائع سے کہا کہ (بیچ میرے بیٹے کے پاس بیچ دو، اور بائع نے ایک آدمی کو اجرت پر لیا جو اس کو مشتری کے بیٹے کے پاس پہنچا دے تو یہ قبضہ نہیں ہے اور اجرت بائع کے ذمہ ہوگی، ہاں اگر مشتری یہ کہے کہ میرے لئے اس شخص کو اجرت پر لے لو جو سامان پہنچا دے تو اجیر کا قبضہ مشتری کا قبضہ ہوگا)۔

اسی طرح ایک دوسری عبارت اور ہے: ”فإن قال المشتري للبائع: زب لي في هذا الإناء كذا وكذا وابتعت به مع غلامه، أو قال مع غلامي: ففعل فانكسر الإناء في الطريق، قال هو من مال البائع حتى يقول ادفعه إلى غلامه أو إلى غلامي، فإذا قال ذلك فهو وكيل، فإذا دفعه إليه، فكأنه دفعه إلى المشتري، فيكون الهالك عليه كذا في المحيط“ (ایضاً)۔ (جب مشتری بائع سے کہے کہ میرے لئے اس برتن میں اتنا اتنا تول دو اور اس کو اپنے غلام کے ساتھ بیچ دو، یا کہا میرے غلام کے ذریعہ، لہذا بائع نے ایسا ہی کیا پھر برتن راستہ میں ٹوٹ گیا تو یہ (نقصان) بائع کے مال سے ہوگا، یہاں تک کہ مشتری یہ کہے کہ وہ بیچ میرے غلام یا اپنے غلام کو دیدو، جب مشتری نے یہ کہا تو وہ غلام وکیل ہے جب بائع نے اس کو دیدیا تو گویا مشتری کو دیدیا، لہذا ہلاکت مشتری کے ذمہ ہوگی جیسا کہ محیط میں ہے)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اگر بائع نے خود مشتری کے حکم کے بغیر کسی کو اجرت پر لے کر بیچ مشتری یا اس کے وکیل وغیرہ کے پاس بھیجا دیا تو یہ اجیر بائع ہی کا ہوگا، ہاں اگر مشتری کے حکم سے کسی کو اجرت پر لیا ہے تو وہ مشتری کا اجیر ہوگا اور اس کا قبضہ مشتری کا قبضہ ہوگا، یا مشتری نے کوئی ایسی بات کہی جس سے بھیجوانے کی ذمہ داری بائع ہی کے ذمہ ڈال دی تو بائع جس شخص کے ذریعہ بھیجوائے گا، وہ مشتری کا وکیل نہیں ہوگا، لہذا اس سے اگر مال ہلاک ہو جائے گا تو بائع ہی کے مال سے ہلاک شمار کیا جائے گا، اور اگر بائع کے ذمہ نہیں ڈالا ہے تو جس کو دیدینے کا حکم دیا ہے اس کو دے کر بائع بری ہو جائے گا اور اس کا قبضہ مشتری کا قبضہ ہوگا، اگر ہلاک ہو جائے گی تو مشتری کے مال سے ہلاکت شمار ہوگی۔

فیکٹری سے اس طرح خرید کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کو جب کہ بیچ پر خود قبضہ نہیں کیا ہے، ”إدارة المباحث الفقہیة“ جمعیتہ علماء ہند کے پانچویں فقہی اجتماع میں مفتیان کرام کی ایک بھاری تعداد نے جائز قرار دیا۔

اس اجتماع میں مفتیان کرام کی متفقہ رائے سے جو تجویز پاس ہوئی، اس کا متن درج ذیل ہے۔

### تجویز (۵) قبضہ سے قبل بیچ:

کسی دوکاندار کے پاس کوئی خریدار کسی مال کا آرڈر دیتا ہے، وہ دوکاندار کسی بڑی کمپنی سے بذریعہ ٹیلیفون یا فیکس اس کا مطلوبہ مال خریدار کے پاس بھیجا دیتا ہے تو یہ معاملہ جائز ہے، اس طرح جو مال بازار میں آتا ہے اس کی خرید و فروخت عام مسلمانوں کے لئے درست ہے (بعض صورتوں میں دوکاندار کو کمپنی کا وکیل، بعض صورتوں میں کمپنی کو دوکاندار کا وکیل اور بعض صورتوں میں خود خریدار کو دوکاندار کی طرف سے وکیل بالقبض مان کر یہ معاملہ حدود جواز میں رہے گا اور دوکاندار جو نفع حاصل کرے گا وہ اصل یا وکالتہ جائز قرار دیا جائے گا) (ماخوذ از تجاویز پانچواں فقہی اجتماع منعقدہ ۱۸/۱۹ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ)۔

سوال ۶ کے جواب سے اتنی بات تو معلوم ہوگئی کہ مشتری مال کے وصول سے پہلے جب کہ مال سمندر میں ہے تیسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔ لیکن مال کے ضائع ہونے کی صورت میں تیسرے شخص کا ضامن ہونا یا تیسرے شخص کو ضامن بنانا جائز ہے یا نہیں، یعنی تیسرا شخص جبکہ اس کا قبضہ نہیں پایا گیا شخص یہ معاملہ کرنے سے ضامن ہو جائے گا اور مشتری اول کے ضمان سے وہ شئی نکل جائے گی یا نہیں؟ یا تیسرا شخص اس مشتری سے معاملہ کر لینے کی وجہ سے قبضہ کرنے والا شمار ہوگا یا نہیں؟

حنفیہ کے نزدیک محض معاملہ کرنے سے بیع مشتری کے ضمان میں نہیں آئے گی جب تک کہ مشتری یا اس کے وکیل وغیرہ کا قبضہ یا بائع کی طرف سے اس طرح کا تخلیہ جس سے مشتری بلا کلفت قبضہ پر قادر ہو جائے یا کوئی اور ایسا فعل جب تک مشتری کی طرف سے نہ پایا جائے جس کو قبضہ شمار کیا جاتا ہے۔

لہذا صورت مذکورہ میں مال کے ضائع ہو جانے کی صورت میں تیسرا شخص ضامن نہیں ہوگا، علامہ ابن العربی مالکی صاحب "عارضۃ الاحوزی شرح ترمذی" کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مالکیہ کے نزدیک نفس عقد ہی سے ضمان حاصل ہو جاتا ہے۔

"وعندنا أن المبيع بنفس العقد دخل في قبضه وحصل في ضمانه"۔

(اور ہمارے نزدیک نفس عقد سے بیع قبضہ میں داخل ہو جائے گی اور ضمان میں آجائے گی)۔

مالکیہ کے اس مذہب کے اعتبار سے ان کے نزدیک اس تیسرے شخص سے معاملہ کرنا اور اس کا ضامن ہونا درست ہے، لیکن احناف کے نزدیک محض عقد سے بیع ضمان میں نہیں آئے گی۔





## بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث

مولانا اقبال قاسمی ؒ

### ۱۔ بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث:

اس سے متعلق احادیث دو قسم کی ہیں: ۱۔ مقید، ۲۔ مطلق

- ۱۔ مقید یہ وہ احادیث ہیں جن میں غلہ کی بیع کا قبضہ سے پہلے عدم جواز مذکور ہے، اور اس قسم کی احادیث کے راوی چھ صحابہ ہیں، حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، جابر بن عبد اللہ اور حکیم بن حزامؓ، اور اتحاد مفہوم کے ساتھ سب راویوں کے الفاظ حدیث معمولی اختلاف کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں، مفہوم یہ ہے کہ جو شخص غلہ خریدے اور اس کو قبضہ کرنے سے پہلے نہ بیچے، اور جو اس قسم کی خرید و فروخت عہد نبوی میں کرتے تھے ان کو حکم دیا جاتا تھا کہ جب تک غلہ کو خرید کر کسی دوسری جگہ اپنے مکان، یا خیمہ میں یا مارکیٹ سے باہر منتقل نہ کر لیں کسی دوسرے کو نہ بیچیں، وہ روایات یہ ہیں:

”من ابتاع أو اشتری طعاماً فلا یبعه حتی یقبضه حتی یتوفیه، حتی یکتالہ، حتی یتوفیه ویقبضه، أھم کانوا یضربون علی عہد رسول اللہ ﷺ إذا اشتروا طعاماً جزافاً أن یتبعوه فی مکانہ حتی یحولوه، حتی یوؤوہ إلی رحالھم، وفی روایۃ کنا فی زمان رسول اللہ ﷺ نبتاع الطعام فیبعث علینا من یأمرنا بانتقالہ من المکان الذی ابتعناہ فیہ إلی مکان سواہ قبل أن یتبعہ“ (مسلم شریف: ۲۰۵)۔

۲۔ مطلق: یہ وہ احادیث ہیں جن میں طعام (غلہ) کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ مطلقاً سامان اور اشیاء کو قبضہ سے پہلے بیچنے کی ممانعت ہے اور اسی فہرست میں ان صحابہ کے اقوال بھی ہیں جو طعام والی روایت کے راوی ہونے کے باوجود نہی کو تمام اشیاء کے لئے عام خیال کرتے ہیں، اور طعام اور غیر طعام میں کوئی فرق نہیں تصور کرتے ہیں، وہ احادیث یہ ہیں:

۱۔ ”یقول زید بن ثابت: إن رسول اللہ ﷺ فھانا أن نبتع السلع حیث تبتاع حتی یحوزھا التجار إلی رحالھم“۔ (زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں اس جگہ سامان کو فروخت کرنے سے منع فرمایا جہاں اس کو خریدایا گیا ہے، جب تک تاجر اس کو اپنے مکان میں منتقل نہ کرے)۔

۲۔ ”أن حکیم بن حزام قال أخذ النبی ﷺ یدیی فقال إذا ابتعت شیئاً فلا تبعہ حتی تقبضہ“ (حکیم بن حزام نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جب تو کسی چیز کو خریدے تو قبضہ سے پہلے اس کو مت فروخت کر)۔

۳۔ ”عن یعلی بن حکیم بن حزام أن أباه سأل النبی ﷺ فقال: إنی اشتریت بیوعاً فما یحل لی منها قال: إذا اشتریت بیعاً فلا تبعہ حتی تقبضہ“۔ (یعنی حضرت حزام سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ میں چند چیزیں خریدتا ہوں تو میرے لئے اس کو کس طرح بیچنا جائز ہے، تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب تو کسی چیز کو خریدے تو اس کو قبضہ سے پہلے مت بیچ)۔

۴۔ ”عن ابن عباس قال: أما الذی نھی عنہ رسول اللہ ﷺ فبیع الطعام أن یتوفی قال ابن عباس: برأیہ وأحسب کل شیء مثله“ (شرح معانی الآثار: ۲۰۱، ۲۰۲)۔ (حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ کے رسول نے جس چیز سے منع فرمایا ہے وہ غلہ کو قبضہ سے

۱۔ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

پہلے بیچنا ہے اور خود میرا خیال یہ ہے کہ ہر چیز غلہ ہی کی طرح ہے۔

یہ وہ روایتیں ہیں جن میں طعام کی قید مذکور نہیں ہے، اور طعام غیر طعام میں کوئی فرق بیان نہیں کیا ہے۔

ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل:

بیع قبل القبض کی بابت بنیادی طور پر ائمہ کے تین اقوال ہیں۔

۱۔ کھانے پینے والی چیزوں میں قبضہ سے پہلے بیع جائز نہیں اور بقیہ چیزوں میں بیع جائز ہے، یہ حضرت امام مالک اور اسحاق بن راہویہ کا مذہب ہے۔

۲۔ مطلقاً ناجائز ہے، چاہے منقولی اشیاء ہو، یا غیر منقولی، مثلاً کیلی، وزنی چیزیں، یا جائداد مکان وغیرہ، یہ امام شافعی، محمد اور زفر کا مذہب ہے۔

۳۔ منقولی اشیاء، مثلاً غلہ، لوہا، پیتل، سونا، چاندی، کپڑا، خواہ مطعومات ہوں، یا غیر مطعومات ان میں ناجائز اور غیر منقولی اشیاء مثلاً زمین جائداد مکان وغیرہ میں

جائز، یہ حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا مختار مسلک ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے دلائل بالترتیب یہ ہیں:

پہلی دلیل:..... حضرت امام مالک کی دلیل پہلی قسم کی احادیث ہیں، جن میں طعام کی قید لگی ہوئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر غیر طعام کی بیع قبضہ سے پہلے ناجائز ہوتی تو پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم طعام کی تخصیص نہ فرماتے گویا ان کے نزدیک یہ احادیث معلول بالعلتہ نہیں ہیں اور بیع کے ناجائز ہونے کا حکم امر تعبدی ہے جس پر دوسری چیز کو قیاس کرنا درست نہیں، یا معلول بالعلتہ القاصرہ ہیں، جو امر تعبدی کے حکم میں ہوتا ہے۔

دوسری دلیل:

حضرت امام شافعی، امام محمد اور امام زفر کی پہلی دلیل دوسری قسم کی احادیث ہے جس میں طعام کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اور وہ طعام اور غیر طعام سب کو شامل ہے، چاہے وہ ان چیزوں میں سے ہو جن کو منتقل کیا جاسکے، یا نہ کیا جاسکے، جیسے زمین، جائداد، وغیرہ، دوسری دلیل یہ کہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن جابر طعام والی روایتوں کے راوی ہیں اس کے باوجود ان کے نزدیک طعام اور غیر طعام دونوں کا حکم ایک ہے اور صحابہ حدیث کے منشاء اور مفہوم کو زیادہ سمجھتے ہیں، ”نیل الاوطار“ میں یہ عبارت ہے: ”الصحابۃ أعراف بمقاصد الرسول“ (نیل الاوطار: ۵، ۱۶۰)۔ ”صحابہ منشاء نبوی کو زیادہ پہچانتے ہیں۔“

باقی احادیث میں طعام کی قید تمثیلاً ہے تخصیصاً نہیں، اور نصوص میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ مقید ذکر کیا جاتا ہے اور مراد مطلق ہوتا ہے، قرآن پاک میں ”سورہ مائدہ“ میں اللہ نے محرم کو حالت احرام میں عملاً شکار کو قتل کرنے سے منع کیا ہے، اور جو آدمی عمداً ایسا کرے اس کی سزا یہ بیان کی ہے کہ اسی جیسا جانور، یا پرندہ لا کر دینا ہے، ارشاد باری ہے۔ ”ومن قتله منکم متعمداً جزاء مثل ما قتل الخ“، حالانکہ بحالت احرام خطا قتل کرنے کا بھی بالاتفاق یہی حکم ہے اور عمدہ کا ذکر خطا کے منافی نہیں ہے، امام طحاوی فرماتے ہیں: ”أن ذکره العمد لا ینفی الخطأ فکذلک ذکره الطعام فی النہی عن بیعہ قبل القبض لا ینفی غیر الطعام“ (شرح معانی الآثار: ۲، ۲۰۲)۔

تیسری دلیل:

شہد ربا کا تحقق ہے، کیونکہ جب مشتری نے خریدی ہوئی چیز کو قبضہ سے پہلے بیچ دیا تو یہ بالکل روپے کو روپے کے بدلے بیچنے کے مشابہ ہو گیا، مثلاً زید نے ایک سامان کو ایک سو دینار میں خرید کر روپے بائع کے حوالہ کر دیا اور ابھی تک زید نے اس سامان پر قبضہ بھی نہیں کیا تھا کہ اتنے میں وہ سامان ایک سو بیس میں کسی دوسرے شخص کو بیچ ڈالا تو یہ بالکل ایک سو دینار کو ایک سو بیس دینار کے بدلے بیچنے کے مشابہ ہے، اور یہ علت طعام اور غیر طعام سب میں جاری ہوتی ہے، لہذا حکم بھی عام ہوگا، اور یہ علت خود حضرت ابن عباس نے حضرت طاؤس سے بیان کی تھی، اور صاحب ”نیل الاوطار“ نے اس علت کو بہت ہی عمدہ کہا ہے۔

”عن ابن عباس أن طاؤساً سأله عن سبب النهی فأجابہ بأثما إذا باء المشتري المبيع قبل قبضه وتأخر المبيع في يد البائع صار كأنه باعه دراهم بدراهم فإذا اشترى طعاماً بمائة دينار مثلاً دفعها إلى البائع ولم يقبض ومنه الطعام ثم باء الطعام من شخص آخر بمائة وعشرين مثلاً صار كأنه اشترى بذهبه ذهباً أكثر منه أي اشتراه بمائة وعشرين... وهو التعليل أجود ما علل به النهی لأن الصحابة أعراف بمقاصد الرسول“ (نیل الاوطار: ۵، ۱۶۰)۔

## چوتھی دلیل:

وہ ہے جس کو امام طحاوی نے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ طعام کی بیع قبضہ سے پہلے ناجائز ہونے کی علت ”ربح مالہ یضمن“ ہے اور جب قبضہ کر لیا تو اس کے ضمان میں آ گیا، لہذا اب نفع حاصل کرنا درست ہوگا اور اس کی خرید و فروخت کا مکمل اختیار ہوگا اور یہ علت بعینہ دوسری چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے، کیونکہ کسی بھی خریدی ہوئی چیز کو قبضہ سے پہلے بیع کر نفع حاصل کرنا مال غیر مضمون سے نفع حاصل کرنا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ربح مالہ یضمن“ (ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) سے منع کیا ہے اور اس میں طعام اور غیر طعام سب داخل ہیں اور ضامن بننے سے پہلے کسی بھی شخص کیلئے نفع اٹھانا درست نہیں، لہذا وہ تمام خریدی ہوئی چیزیں جس کا نفع خریدار کیلئے مباح ہو اس کو بیچنا بھی مباح ہوگا اور جن کا نفع جائز نہ ہو ان کو بیچنا بھی خریدار کیلئے جائز نہ ہوگا، امام طحاوی کے الفاظ یہ ہیں:

”وفي ذلك حجة أخرى وذلك أن المعنى الذي حرم به على المشتري الطعام يبيعه قبل قبضه هو أن لا يطيب له ربح ما في ضمان غيره فإذا قبضه صار في ضمانه فطاب له ربحه فجاز أن يبيعه متى أحب والعروض البيعة هذا المعنى بعينه موجود منها“ (شرح معاني الآثار: ۲۰۲)۔

حضرت امام ابوحنیفہ، امام یوسف کے دلائل حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ پہلی دلیل آیت باری تعالیٰ: ”أحل الله البيع“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵) جو مطلقاً بغیر قبضہ کی قید کے جواز بیع پر دلالت کرتا ہے، لیکن خبر آحاد کی بناء پر منقولی اشیاء میں تخصیص کر لی گئی ہے، اور غیر منقولی اشیاء میں آیت کے عموم کے تحت بیع قبل القبض جائز رہی۔
- ۲۔ دوسری دلیل: دوسری قسم کی احادیث ہیں جن میں طعام کی قید نہیں ہے، اور اس ممانعت کی علت صرف ”ربح مالہ یضمن“ نہیں بلکہ ”ربح مالہ یضمن“ اور ”غرر“ کا مجموعہ ہے، ”ربح مالہ یضمن“ کی تفصیل گزر چکی ہے اور ”غرر“ کی شرعی تعریف یہ ہے کہ ”غرر“ وہ چیز ہے جس کا انجام معلوم نہ ہو اور اس کے بارے میں یقین کے ساتھ نہ بتایا جاسکتا ہو کہ وہ چیز وجود میں آسکے گی، یا نہیں، بلکہ وجود اور عدم دونوں کا اندیشہ ہو مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں:

”الغرر ما طوى عنث علمه، وفي المبسوط: الغرر ما يكون مستور العاقبة، وفي المغرب: الخطر الذي لا يدري ما يكون أم لا“ (حاشیہ ہدایہ: ۲۰۲)۔

اور قبل القبض بیع کرنے میں غرر یہ ہے کہ بائع اول نے تو یقینی طور پر اپنے سامان کو بیچا ہے، چاہے خریدار کے قبضہ کے بعد بیع تمام ہو جائے، یا قبضہ سے پہلے بیع ہلاک ہو کر بیع فسخ ہو جائے اور بائع کی ملکیت لوٹ آئے، لیکن خریدار اگر قبضہ سے پہلے کسی دوسرے شخص کو بیچتا ہے تو یہ اندیشہ اور خطرہ ہے کہ وہ اپنی مملوکہ چیز کو بیچ رہا ہے، یا دوسرے کی مملوکہ چیز کو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بائع اول کے پاس وہ چیز ہلاک ہو جائے اور اس کا قبضہ نہ ہو سکے، اس صورت میں بیع فسخ ہونے کی وجہ سے وہ بائع کے سامان کو بیچنے والا ہو جائے گا، اور دوسرے کے مملوکہ چیز کو بلا وکالت اور بلا اصالت بیچنا جائز نہیں، اور جس بیع میں ایسا خطرہ اور اندیشہ لگا ہوا ہو اس کی بیع جائز نہیں اور قبضہ کرنے کے بعد یہ اندیشہ نہیں ہے، حدیث میں ہے: ”نہی رسول اللہ ﷺ عن بیوع الغرر“ (ترمذی شریف: ۲۳۲)۔

صاحب ”ہدایہ“ تحریر فرماتے ہیں: ”ومن اشترى شيئاً مما ينقل ويحول لم يجز يبيعه حتى يقبضه؛ لأنه نهي عن بيعه ما لم يقبض؛ ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“ (ہدایہ: ۵۸، ۳)۔

چونکہ علت مذکورہ ان ہی چیزوں میں متحقق ہوگی جن کا ہلاک ہونا کثیر الوقوع ہے، جیسے منقولی اشیاء، لہذا اس میں قبضہ سے پہلے بیع ناجائز ہوگی اور جن چیزوں کی ہلاکت نادر الوقوع ہے، جیسے غیر منقولی اشیاء زمین، جائداد وغیرہ، تو علت مذکورہ کے پائے جانے کی وجہ سے اس کی بیع جائز ہوگی، جیسے زمین، یا مکان دریا سے قریب ہو اور اندیشہ ہو کہ کہیں وہ زمین دریا بن جائے، یا ریت نہ بھر جائے جس کی وجہ سے قابل انتفاع نہ رہے، ہدایہ میں ہے:

”ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف... ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به عملاً بدلائل الجواز. وفي الحاشية قوله نادر حتى قال بعض أصحابنا: في موضع لا يؤمن عليه ذلك لا يجوز عنده كذا في المنقول“ (ہدایہ: ۲۰۵۸)۔



اور جب علت نہی غرر انفساخ عقد ہے تو جہاں کہیں یہ علت پائی جائے گی وہاں قبضہ سے پہلے تصرف ناجائز ہوگا، جیسے بیع میں بیع اور اجارہ میں اجرت اگر عین ہو تو اجرت میں تصرف کرنا قبضہ سے پہلے ناجائز ہے، اسی طرح اگر دین کی جانب سے عین پر صلح ہو تو بدل صلح میں قبضہ سے پہلے تصرف ناجائز ہوگا، کیونکہ بیع، اجرت، اور بدل صلح پر قبضہ سے پہلے تصرف کرنے میں عقد کے فسخ ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر عوض کے ہلاک ہونے کی صورت میں عقد علی حالہ باقی رہتا ہے تو پھر اس میں تصرف کرنا قبضہ سے پہلے اس کو بیچنا، ہبہ کرنا، اجارہ پر دینا اور اس کے علاوہ ہر قسم کا تصرف جائز ہے، یہاں تک کہ امام محمدؒ نے تصریح کی ہے کہ جو تصرف قبضہ کے بغیر تام نہیں ہوتا، جیسے ہبہ، صدقہ، رہن اور قرض و دہی جائز ہے اور جس کو ہبہ، صدقہ کیا گیا ہے اس کا قبضہ اولاً واجب اور مقررہ کا نائب بن کر ہوگا، پھر ثانیاً وہ اپنے لئے قبضہ کرے گا، اسی کو علامہ شامی "فتح القدیر" کے حوالہ سے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"وقال في الفتح: الأصل أن كل عقد ينفسخ بهلاك العوض قبل القبض لم يجز التصرف في ذلك العوض قبل قبضه كالمبيع في البيع والأجرة إذا كانت عينا في الإجارة وبدل الصلح عن الدين إذا كان عينا لا يجوز بيعه شيء من ذلك ولا أن يشرك فيه غيره، وأما لا ينفسخ بهلاك العوض فالتصرف فيه قبل القبض جائز كالمهر إذا كان عينا وبدل الخلع والعتق على مال وبدل الصلح عن دم العمد كل ذلك إذا كان عينا يجوز بيعه وببته وإجارته قبل قبضه وسائر التصرفات" (در المختار ۴۰۱۸)۔

### ۳۔ بیع قبل القبض کی احادیث معلول بالعلتہ ہیں:

فقہاء اصولین کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ نصوص شرعیہ علیہ میں اصل تعلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام ہی احکام شرعیہ فرعیہ کی بنیاد علتوں پر رکھی ہے، کسی بھی حکم کو بغیر علت کے بیکار شروع نہیں کیا ہے، عبد الوہاب خلاف لکھتے ہیں:

"أن الأحكام الشرعية العلمية جميعها إنما شرعت لمصالح الناس ولعلل بنيت عليها وما شرع حكم منها عبثاً لغير علة" (اصول الفقه للخلاف ۶۲)۔

اب علت نہی کیا ہے؟ تو حضرت امام شافعیؒ، امام محمدؒ کے نزدیک مال غیر مضمون سے نفع حاصل کرنا ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مال غیر مضمون پر نفع اور غرر انفساخ عقد کا مجموعہ ہے، جب کہ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک طعام کی بیع کا حکم امر تعبدی ہے جس پر دوسری چیزوں کو قیاس کر کے عدم جواز بیع کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، علامہ انور شاہ کشمیری تحریر کرتے ہیں:

"وأما الحديث ففيه ذكر الطعام فنقح فيه الشيطان المناط وقررا المناط أن يكون شيئاً منقولا وقصر الحجازيون الحكم على الطعام" (العرف الشذی علی الترمذی ۱۰۲۲۳)۔

اور ہم صاحب ہدایہ اور امام طحاویؒ کے حوالہ سے نص کا معلول بالعلتہ ہونا ثابت کر چکے ہیں، لہذا اس کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

### ۴۔ بیع قبل القبض باطل ہے یا فاسد؟

قبل اس کے کہ ہم قبضہ سے پہلے بیع کو باطل، یا فاسد ثابت کریں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم دونوں کی شرعی تعریف اور حکم بیان کریں تاکہ دونوں کا فرق واضح ہو کر سامنے آجائے اور فاسد، یا باطل کا حکم لگانا ہمارے لئے سہل ہو جائے، چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی "ہدایہ" کے حاشیہ میں، بہت جامع اور مختصر انداز میں تحریر فرماتے ہیں کہ بیع باطل وہ بیع ہے جو اصل اور وصف دونوں اعتبار سے ناجائز ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ ارکان عقد اور صلح عقد میں کوئی نقص اور خلل ہو، مثلاً ایجاب و قبول میں عدم موافقت، ثمن اور بیع کا مال نہ ہونا، یا بیع کے بعد خریدار کے مالک نہ ہونے کی شرط وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ مشتری کی ملکیت خریدی ہوئی چیز پر ثابت نہیں ہوگی، خواہ وہ قبضہ کرے، یا نہ کرے، لہذا اگر مردار کے عوض غلام کو خرید کر آزاد کر دیا تو آزاد نہ ہوگا، اور بیع فاسد وہ بیع ہے جو اصل کے اعتبار سے مشروع ہو اور وصف کے اعتبار سے غیر مشروع اس کی علامت یہ ہے کہ نقص اور خلل ارکان بیع میں نہ ہو، مثلاً ایسے شرائط لگانا جو مقتضائے عقد کے خلاف ہوں، اور ان سے بیع کی افادیت پر زبرد پڑتی ہو، یا عوضین کے لینے دینے میں بیجا شرط لگانا، اس کا حکم یہ ہے کہ بیع پر جب مشتری قبضہ کر لے گا تو وہ مالک ہو جائے گا، اگرچہ اس قسم کے عقد کو فسخ کرنا بیع اور مشتری کے اختیار میں ہے اور فاسد میں بیع پر قبضہ کر لینے سے چونکہ ملکیت ثابت ہو جاتی ہے اس لئے اگر غلام کو

شراب کے بدلے خرید کر آزاد کر دیا تو آزاد ہو جائے گا، مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں:

”والباطل فلا یصح أصلاً ووصفاً ولا یفید الملك بوجه..... والفساد ما یصح أصلاً ووصفاً وهو یفید الملك عند اتصال القبض به..... فكل ما أورث خللاً فی ركنه فهو باطل وكل ما لیس كذلك بل أورث خللاً فی غیره... فهو فاسد“ (حاشیہ ہدایہ ۲۰۲۲)۔

اس تفصیل کے بعد ہم اصل بحث کو شروع کرتے ہیں کہ قبضہ سے پہلے بیع فاسد ہے، یا باطل؟ ہم جواب دیں گے کہ اس بارے میں کتب فقہیہ میں دونوں طرح کی عبارتیں ملتی ہیں، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ باطل ہے، جیسا صاحب درمختار نے جوہرہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔

”بخلاف بیعہ قبلہ فانہ باطل مطلقاً، جوہرہ“ (درمختار ۲۰۱۸۲)۔

جبکہ زیادہ تر عبارتوں سے اس کے فاسد ہونے کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ خود صاحب ”درمختار“ نے گذشتہ عبارتوں سے متصل ”مواہب“ کے حوالہ سے بیان کیا ہے:

”وفی المواہب وفسد بیع المنقول قبل قبضہ“ (ایضاً)۔

علامہ نووی شرح مسلم میں ”کانوا یضربون إذا باعوا“ کے تحت لکھتے ہیں:

”هذا دلیل علی أن ولی الأمر یغزر من تعاطی بیعاً فاسدا“ (شرح للنووی علی المسلم ۲۰۵)۔

”عہد نبوی میں بیع قبل القبض پر پٹائی ہونا دلیل ہے اس پر کہ حکومت کے ذمہ داران بیع فاسد کرنے والوں کی تعزیر کر سکتے ہیں“۔

صاحب فتاویٰ ہندیہ بیع کی شرائط صحت کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ومنها القبض فی بیع المشتري المنقول وفی الدین فی بیع الدین

قبل قبضہ فاسد کالمسلم فیہ“ (ہندیہ ۲۰۲، درالمختار ۲۰۱۸۲)۔

”خریدار کے لئے منقولی اشیاء اور دین کو بیچنے کی ایک شرط قبضہ کرنا ہے، لہذا دین کو قبضہ سے پہلے بیچنا فاسد ہے، جیسا کہ مسلم فیہ کو بیچنا“۔

اور جن فقہاء نے لایصح کا لفظ استعمال کیا ہے وہ اگرچہ فساد اور بطلان دونوں کو جامع ہے لیکن فساد کا معنی مراد لینا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فساد کی علت ”غرر“ ہے، جو خارجی شئی ہے اور صلب عقد میں داخل نہیں ہے، اور بیع کے تمام ارکان، ایجاب و قبول متعاقدین کی اہلیت اور عوضین کی مالیت اس میں پائے جا رہے ہیں، صرف ایک خارجی چیز قبضہ مفقود ہے اور جس بیع میں تمام ارکان موجود ہوں اور ان کے صلب میں کوئی نقص اور خلل نہ ہو، بلکہ نقص اگر کسی خارجی چیز میں ہو تو وہ بیع فاسد ہوتی ہے، باطل نہیں، لہذا اس کو باطل قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا، علامہ ابن عابدین شامی صاحب ”درمختار“ کے قول ”وفی الصوۃ کحتملہ“ کے ذیل میں لکھتے ہیں: ”قوله ونفی الصحة... أى الواقع فی المتن یحتملہما أى یحتمل البطلان والفساد والظاهر الثانی؛ لأن العلة الفساد الغرر مع وجود ركنی البیع“ (درالمختار ۲۰۱۸۲)۔

باقی جن لوگوں نے باطل کہا ہے تو ان کے کلام کو فاسد پر محمول کیا جاسکتا ہے، کیونکہ فساد اور بطلان ایک دوسرے کی جگہ پر بہت کثرت سے مستعمل ہوتے ہیں، صاحب ہدایہ نے فاسد کی تفسیر باطل سے کی ہے۔ ”ویبیع أمر الولد والمدبر والمکاتب فاسد معناه باطل“ (ہدایہ ۲۰۲۲)۔

اور ”ردالمحتار“ میں اس کی تصریح ہے: ”وکفیرا ما یطلق الباطل علی الفساد“ (درالمختار ۲۰۱۸۲)۔

## ۵۔ قبضہ کی حقیقت:

کسی چیز پر قبضہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہاتھ سے قبضہ کر کے بائع کے یہاں سے منتقل کر لیا جائے، بلکہ قبضہ کی حقیقت تخلیہ اور تسلیم ہے کہ بائع بیع کو اپنے مال سے اس طرح خالی کر کے الگ کر دے کہ خریدار جب چاہے اپنی مرضی سے بلا روک ٹوک اس پر تصرف کرنے پر قادر ہو جائے، نیز بیع کے ساتھ کسی دوسرے کا حق وابستہ نہ ہو جس کی وجہ سے وہ روک ٹوک کر سکے اور ہر چیز پر قبضہ اور قدرت تسلیم اس کے مناسب حال ہو کرتی ہے اور اس کی کوئی ایسی تحدید نہیں کی جاسکتی ہے جو تمام چیزوں میں یکساں صادق آئے، چنانچہ مثلی، غیر مثلی، منقولی اور غیر منقولی ان سب پر قبضہ کی الگ الگ شکلیں ہیں، مثلاً بجلی کا کرنٹ اور میٹر، وغیرہ جو خریدار کے گھر میں لگایا جاتا ہے، یہ اس کے مناسب قبضہ اور تسلیم ہے اور مشتری کا زمین میں بیج ڈالنا، سیچائی کرنا، جوتنا، جستر کرنا، یز زمین کے مناسب قبضہ ہے، منقولی اشیاء کو اپنے برتن



میں ڈالنا، بائع کے مکان سے منتقل کر لینا، اپنے وکیل کو سامان اٹھالینے کا حکم دینا وغیرہ، یہ منقولی اشیاء پر قبضہ ہے، بائع میں ہے: ”ولا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع: ۶۱۸: ۵۰)۔

”انگلی کے پوروں سے قبضہ کرنا شرط نہیں ہے، اس لئے کہ قبضہ کی حقیقت قدرت دینا، سامان کو خریدار کے سامنے چھوڑ دینا اور عرفاً، عادتاً حقیقتاً رکاوٹ اور موانع کا دور ہو جانا ہے۔“

در المختار میں ہے: ”وحاصله أن التخليه قبض حکماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن يختلف بحسب حال المبيع“ (در المختار ۴، ۴)۔ ”خلاصہ یہ ہے کہ تخلیہ حکماً قبضہ ہے اگر وہ اس پر بغیر مشقت کے قادر ہو، لیکن وہ ہر خریدی ہوئی چیز کے مناسب حال مختلف ہوتا ہے گا۔“

قبضہ سے متعلق بعض اہم مسائل:

۱۔ اگر کسی دوکاندار سے کہا کہ یہ تیل کی شیشی میرے گھر بھیج دینا اس نے بھیج دیا، وہ شیشی راستہ میں گر کر ٹوٹ گئی تو یہ نقصان کس کا شمار ہوگا؟ اس بارے میں شیخ ابو بکر محمد بن فضل نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر خریدار نے کہا تھا کہ میرے غلام کے ہاتھ سے بھیج دینا اس نے ایسا ہی کیا تو یہ مشتری کا نقصان ہوا، اور اگر کہا تھا کہ اپنے غلام کے ہاتھ سے بھیج دینا اور اس نے اپنے غلام کے ہاتھ ہی سے بھیجا تو یہ نقصان دوکاندار کا ہوگا، کیونکہ مشتری کا غلام مشتری کے درجہ میں ہے اور بائع کا غلام بائع کے درجہ میں ہے (ہندیہ)۔

۲۔ خریدار نے دوکاندار سے ایک برتن دے کر کہا کہ اس میں اتنا تیل وزن کر کے اپنے غلام کے ہاتھ، یا میرے غلام کے ہاتھ سے بھیج دینا اس نے حکم کے مطابق تیل بھیج دیا، راستہ میں گر کر برتن ٹوٹ گیا تو یہ نقصان دوکاندار کا ہوا، ہاں اگر مشتری نے یہ کہا کہ میرے غلام کو، یا اپنے غلام کو دیدینا اور اس نے دیدیا تو ٹوٹ جانے کی صورت میں نقصان خریدار کا ہوا، کیونکہ یہ الفاظ وکالت کے ہم معنی ہیں، اور وکیل کو دیدینا مؤکل (خریدار) کو دینے کی طرح ہے (ہندیہ)۔

۳۔ خریدار نے بیچنے والے سے کہا یہ سامان میرے لڑکے کے پاس بھیج دینا بائع نے ایک آدمی کو مزدور رکھ کر اس کے لڑکے کے پاس بھیج دیا تو یہ قبضہ نہیں ہوا اور مزدور کی مزدوری بائع پر لازم ہوگی ہاں اگر یہ کہے کہ میرے لئے ایسے شخص کو مزدوری پر رکھ لینا جو اس کو لے جائے تو مزدور کا قبضہ خود خریدار کا قبضہ شمار ہوگا اگر خریدار تائید و تصدیق کر دے کہ ہاں میں نے اس کو کرایہ پر رکھ کر سامان حوالہ کیا ہے اور اس صورت میں مزدوری خریدار کے ذمہ ہوگی (ہندیہ)۔

۴۔ ایک شخص نے گائے یا بکری خرید کر بیچنے والے سے کہا کہ اس جانور کو لے کر اپنے گھر چلے جانا میں بعد میں آ کر اس کو اپنے گھر لے آؤں گا، بیچنے والا اس کو اپنے گھر لایا اور اس کی موت ہو گئی تو یہ نقصان بیچنے والے کا ہوا اور ایسی صورت میں اگر وہ جانور کو سپرد کر دینے کا دعویٰ دے اور اس کے پاس گواہ نہ ہو تو خریدار کی بات معتبر ہوگی اور اس سے قسم لیا جائے گا (ہندیہ)۔

۵۔ ایک شخص نے بیچنے والے کے مکان پر بیمار جانور خرید کر کہا کہ رات بھر نہیں رہے گا اور تم مطمئن رہو کہ اس کو بیچ کر اگر جانور کی موت واقع ہوگی تو میرا جانور مرے گا اس کے بعد وہ جانور مر گیا تو شرعی اعتبار سے بائع کا جانور مرے مشتری کا نہیں (ہندیہ)۔

۶۔ ایک شخص نے کپڑا خریدا، لیکن نہ قبضہ اور نہ روپے دیا اور کہا کہ مجھے آپ پر اعتماد نہیں کہیں آپ دوسرے کو نہ بیچ دیں اس لئے وہ کپڑا فلاں کو دیدیتے ہیں آ کر روپے دے دوں گا، بائع نے وہ کپڑا فلاں کو دیدیا اس کے پاس سے کپڑا ضائع ہو گیا تو وہ کپڑا بائع کا ضائع ہوا، کیونکہ جس شخص کو کپڑا دیا گیا ہے، وہ بائع کی خاطر شرم کو وصول کرنے کیلئے کپڑے کو روکے ہوئے ہے اس لئے اس کا قبضہ خود بائع کا قبضہ شمار ہوگا (ہندیہ)۔

۷۔ بائع نے خریدی ہوئی چیز مشتری کے اہل و عیال کو دے دیا تو ان کا قبضہ مشتری کا قبضہ شمار نہ ہوگا اور ہلاک ہونے کی صورت میں بیع فسخ ہو جائے گی (اور شرم مشتری پر لازم نہ ہوگا) (ہندیہ)۔

۸۔ مشتری نے بائع کو بیع پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا تو بائع کا قبضہ مشتری کا قبضہ شمار نہ ہوگا اسی طرح اگر خرید کر بائع ہی کو ودیعت، عاریت، اجارہ پر دے دیا تو اس کو مشتری کا قبضہ شمار نہیں کریں گے اور اجرت واجب نہیں ہوگی، یہ سب اہم مسائل عالمگیری میں ہیں (فتاویٰ ہندیہ ۱۹۳-۲۰)۔

۹۔ ایک چیز کو خریدا لیکن قبضہ نہیں کیا، یہاں تک کہ بائع نے کسی اور شخص کو زیادہ روپے میں بیچ دیا اور مشتری نے اس کی اجازت دے دی تو یہ جائز نہیں، اس لئے کہ یہ قبضہ سے پہلے بیچا ہے (شامی ۱۸۲/۳)۔



## ۶۔ منقولی اور غیر منقولی اشیاء پر قبضہ کی نوعیت:

حقیقہ کے نزدیک منقولی اور غیر منقولی اشیاء میں قبضہ کے اعتبار سے کوئی ایسا فرق نہیں ہے جس کو حد فاصل قرار دیا جائے، بنیادی چیز تخلیہ اور تسلیم ہے اور اس کی حقیقت کو بیان کرنا متعذر اور مشکل ہے اور ہر چیز کا قبضہ اس کے مناسب حال ہوگا اگر زمین ہو تو اس کا قبضہ زمین کو خالی کر دینا جوتنا، سیچائی کرنا بیج ڈال دینا، اس کے علاوہ ہر وہ تصور جس سے بائع کا قبضہ ختم ہو جائے اور اس زمانے میں رجسٹری کو اصل قبضہ کو تصور کیا جاتا ہے، اور رجسٹری کے بعد اگرچہ مشتری نے کسی بھی قسم کا تصرف نہ کیا ہو اس کے قبضہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا، حالانکہ شریعت اسلام میں رجسٹری کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن عصر حاضر میں احتیاطاً رجسٹری ضرور کروالینی چاہئے، تاکہ بعد میں کسی بھی قسم کا بائع دعویدار نہ ہو سکے اور مفاسد کا سدباب ہو سکے، اور دوکان کا قبضہ یہ ہے کہ بائع اپنے سامان کو خالی کر دے اور چابی مشتری کے حوالہ کر دے، یا گھر روم خالی کر دے اور چابی مشتری کے حوالہ کر دے، یا وہ اپنا کوئی سامان رکھ دے، یا اس کی مرمت قلعی وغیرہ کر دے یہ اس کے مناسب قبضہ ہے، اور کیلی یا وزنی چیزوں کو کیل کر کے، یا وزن کر کے مشتری کے برتن میں ڈال دے، اس کے ہاتھ میں پکڑا دے، یا وہاں سے منتقل کرالے، یہ کیلی و وزنی چیزوں کا قبضہ ہے، ایک غلام کو خرید کر کہا کہ میرے ساتھ چل وہ اس کے ساتھ چلا قبضہ ہو گیا، اسی طرح دوکاندار نے کپڑا چھاڑ کر دے دیا تو قبضہ ہو گیا ان سب مسائل میں بنیادی چیز بائع کا مشتری کو مکمل قدرت دے دینا ہے۔

البتہ حنا بلہ کے نزدیک اگر بیع دنانیر یا دراہم ہوں تو اس کا قبضہ ہاتھ سے لے لینے سے ہوگا اور کپڑے کو منتقل کرنے اور حیوان کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے اور چلا دینے سے ہو جائے گا اور زمین و جائداد کا قبضہ ہر قسم کی رکاوٹ کو ختم کر دینے سے ہوگا۔

## ۷۔ بیع قبل القبض کی بعض مروجہ شکلیں:

عصر حاضر میں قبضہ سے پہلے بیع عالمی تجارت کا ایک اہم عنصر بن گئی ہے، بلکہ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اصل جگہ سے روانہ ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی مال کی باقاعدہ بیع در بیع ہو جاتی ہے اور درمیان کا ہر بائع اپنا نفع وصول کر لیتا ہے، اس ”بیع قبل القبض“ سے ممانعت فرمائی ہے، بیع قبل القبض کی مروجہ شکلوں میں وہ دو شکلیں بھی بہت عام اور کثیر الوقوع ہیں جو مرسلہ سوالوں میں درج ہیں اور ان کے جواب یہ ہیں: ۱۔ اگر ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دے اور معاملہ یہ طے پائے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر ۲ کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری خریدار نمبر ۱ پر آئے گی، تو اس صورت کے جواز کی شرعاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ہے، اور یہ بیع فاسد ہوگی، لیکن جب خریدار نمبر ۲ کے قبضہ میں آجائے گی تو شرعاً اس کی ملکیت محقق ہو جائے گی، کیونکہ یہ معاملہ زیادہ سے زیادہ بیع فاسد کا ہے جس میں قبضہ کرنے کے بعد ملکیت آجاتی ہے، لیکن اگر خریدار نمبر ۱ فیکٹری کے مالک سے یہ کہے کہ وہ مال کسی کو مزدور رکھ کر، یا مال بردار کمپنی کے ذریعہ ہمارے پاس بھیج دینا، چنانچہ مالک فیکٹری نے وہ مال کسی شخص کو مزدور رکھ کر اس کی، یا مال بردار کمپنی کی تحویل میں دیدیا اس کے بعد خریدار نمبر ۱ خریدار نمبر ۲ کو بیچ دیتا ہے تو یہ درست ہے، اور اس صورت میں مزدوری، یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض قرار دیں گے۔

”إذا قال المشتري للبائع ابعت إلی ابني واستأجر البائع رجلاً یحمله إلی ابنه، فهذا لیس بقبض والأجر علی البائع إلا أن یقول استأجر علی من یحمله فقبض الأجر یكون قبض المشتري“ (ہندیہ ۲۰۱۹)۔

۲۔ اگر مشتری نے مال خریدنے کے بعد بائع سے یہ کہا کہ میرا مال بردار جہاز کے ذریعہ بھیج دینا، اور کسی خاص جہاز کی تعیین بھی نہ کی اور جہاز خرچ اپنے ذمہ لیا اور بائع نے حکم کے مطابق جہاز پر مال چڑھا دیا تو ایسی صورت میں مال کی وصولی سے قبل اور مال بردار جہاز کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد کسی تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کرنا اور اس کو ضامن بنانا شرعاً جائز اور درست ہے اور مال بردار جہاز کمپنی وکیل بالقبض ہوگی، جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ کے حوالہ سے ابھی گذرا۔

## ۸۔ بیع قبل القبض کی جائزہ شکلیں:

مال پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں، لہذا وہ منافع بھی حلال نہیں، اس کی تصحیح کی دو صورتیں ہیں:

- ۱۔ جہاں مال خریدا ہے وہاں کسی کو، یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے، اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے، جیسا کہ ”عالمگیری“ میں ہے:
- ۲۔ مال پہنچنے سے قبل بیع نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کر لے بیع مال پہنچنے کے بعد کرے اس صورت میں جانہین میں سے کوئی انکار کر دے تو صرف وعدہ خلافی کا

گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ مطعومات کے علاوہ باقی سبھی منقولات، غیر منقولات میں بیع قبل القبض جائز ہے اور اگر مطعومات کو بھی تول اور وزن کے بجائے اندازے سے بیچا جائے تو ان کی بیع بھی قبل القبض جائز ہے۔

”المالکیۃ قالوا: یصح للمشتري أن یتصرف فی المبیع قبل قبضه بالمبیع سواء کان المبیع أعیانا منقولة أو عیناً ثابتةً كالأرض والنخیل ونحوهما إلا الطعام كالقمح والفاکهة فإنه لا یصح بیعه قبل قبضه إلا إذا اشتراه جزافاً بدون کیل أو وزن أو عد“ (الفقه علی المذاهب الاربعه: ۲۰۲۵)۔

امام مالک کے اس قول پر عمل کرنے سے بھی کافی حد تک معاملہ آسان ہو جاتا ہے، اور حضرت امام بخاری کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ جائز ہے اور اس میں تخلیہ کی بھی ضرورت نہیں ہے، نفس ایجاب وقبول ہی کو وہ قبضہ کے درجہ میں رکھتے ہیں، چنانچہ ”فیض الباری“ میں ہے:

”إذا علمت هذا فاعلم أنه یعلم من تراجع البخاری أن القبض عنده لا یحتاج إلى التخلية ولا إلى النقل وإن تصرف المشتري یصح عنده قبل قبض المبیع“ (فیض الباری: ۳۰۶)۔

فیصلہ کے وقت آج کے حالات کو سامنے رکھ کر حضرت امام مالک اور امام بخاری کے مذہب کی طرف بھی نگاہ رہنی چاہئے، نیز یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بیع قبل القبض چونکہ فاسد ہے اور فاسد پر قبضہ کرنے سے ملکیت محقق ہو جاتی ہے، اس لئے خریدار نمبر ۲۔ قبضہ کے بعد مالک ہو جائے گا اور اس کے بعد اس کے لئے ہر قسم کا تصرف درست رہے گا۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور چند جدید مسائل

مفتی احمد نادر القاسمی

### بیع قبل القبض جائز ہے یا ناجائز؟

بیع و شراہ کی صحت اور عدم صحت کا مدار اصل میں قبضہ پر ہے، اسی لئے اسلامی شریعت نے قبضہ کو غیر معمولی نگاہ سے دیکھا ہے، ظاہری بات ہے کہ جو چیز انسان کے قبضہ و قدرت میں نہیں اسے فروخت کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے، خواہ اشیاء منقولہ ہوں، یا غیر منقولہ، فرق اتنا ہے کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ حسی ضروری ہے اور غیر منقولہ میں قبضہ حسی ضروری نہیں ہے، بلکہ عام لوگ جس کو قبضہ تصور کرتے ہیں وہ اس کا قبضہ شمار ہوتا ہے، اس لئے یہ بات پوری طرح بے غبار اور عیاں ہے کہ بیع قبل القبض نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: ”نبی عن بیع ما لم یقبض“ کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے، رہا اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں علماء کا اختلاف، تو یہ اختلاف بھی احقر کے خیال کے مطابق حقیقتاً جواز اور عدم جواز کا اختلاف نہیں بلکہ قبضہ کے تعین کا اختلاف ہے جو ائمہ مذاہب سے منقولات اور غیر منقولات، مطعومات اور غیر مطعومات کی تفصیلات کے ساتھ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، حکیم ابن حزام کی روایت جسے بیہقی نے نقل کیا ہے اس طرح ہے:

”عن حکیم بن حزام قال: قلت یا رسول اللہ انی ابتاع هذه البیوع فما یجلی لی منها وما یحرم علی قال: یا ابن اخی لا تبیعن شیئا حتی تقبضه هذا إسناد حسن متصلاً“۔

حکیم ابن حزام سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مختلف چیزوں کی خرید و فروخت کرتا ہوں ان میں سے کوئی چیز میرے لئے حلال ہے اور کون حرام؟ فرمایا کہ ان میں سے کوئی چیز اس طرح نہیں بیچی جائے گی جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے، امام بیہقی کہتے ہیں: حدیث کی یہ سند حسن اور متصل ہے (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۱۳۵، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع ۱۸۰/۵، کتاب الام محمد بن ادریس الشافعی ۶۹/۳، المغنی لابن قدامہ ۹۱/۳، فتح القدیر ۵۱۱/۶، المجموع شرح المہذب ۲۶۳/۹، شرح زرقانی ۲۸۹/۳، مختصر طحاوی ص ۸۳)۔

البتہ بیع کے اندر جب معاملہ بائع اور مشتری کے درمیان طے پا جاتا ہے تو گویا بیع متحقق ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ جب تک سپردگی نہیں ہوتی اس وقت تک اس کا التزام نہیں ہوتا، جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمن ادا کرتے ہی مشتری کا بیع پر معنوی قبضہ ہو جاتا ہے، حسی قبضہ نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے بیع پوری طرح قضائی بھی ثابت ہو جائے؟ لہذا اس نوعیت سے جبکہ معنوی قبضہ اور معنوی ملکیت ثابت ہو چکی ہے، حسی نہیں ہوتی ہے، اگر مشتری اس مرحلہ میں بیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو ظاہر ہے عدم قدرت علی التسلیم فی الفور کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی، باطل نہیں ہوگی، کیونکہ معاملہ بیع فوری بیع کی سپردگی کا تقاضہ کرتا ہے، جو بظاہر مہوم ہے، اس لئے کہ بیع قبل القبض اصل میں بیع غرہی سے عبارت ہے، جس میں بائع اول کی طرف سے سپردگی اور عدم سپردگی بیع دونوں کے امکانات رہتے ہیں، جو معاملہ بیع کے منافی ہے، چنانچہ صاحب عنایہ ابن محمود بابر ترقی لکھتے ہیں:

”وتقریرہ فی البیع قبل القبض غرر انفساخ العقد الاول علی تقدیر ہلاک البیع فی ید البائع والغرر غیر جائز“۔  
(اور بیع میں غرر کا تحقق اس طرح ہے کہ عقد اول کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے، بیع کی ہلاکت بائع کے قبضہ میں متحقق ہونے کی صورت میں، اور غرر جائز نہیں) (شرح العنایہ مع الفتح ۵۱۲/۶)۔

نیز علامہ عبدالرحمن جزیری لکھتے ہیں: ”قالوا: من البیع الفاسد بیع الأعیان المنقولة قبل قبضها سواء باعها لمن اشتراها منه أو لغيره فإذا اشتری حیوانا أو قطعاً أو ثياباً أو نحو ذلك ثم باعها لمن اشتراها منه أو لغيره كان البیع العانی فاسداً“۔ (فقہاء کہتے ہیں کہ بیع فاسد میں سے ایک، منقولہ اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بھی ہے، خواہ مشتری خود بیچنے والے شخص سے اس کو بیچے، یا اس کے علاوہ کسی اور سے، لہذا جب کسی نے جانور خریدا، یا جانوروں کا ریوڑ، یا کپڑا اور اس قسم کی کوئی اور چیز، پھر اس کو اسی سے بیچ دیا جس سے خریدا تھا، یا کسی اور سے



فروخت کر دیا تو دوسری بیع فاسد ہوگی) (الفقہ علی المداہب الاربعۃ ۲/۲۱۱)۔

علامہ ابن عابدین نے باطل اور فاسد کے احتمال کو ختم کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: ”یَحْتَمِلُ الْبَطْلَانُ وَالْفُسَادُ وَالظَّاهِرُ الثَّانِي؛ لِأَنَّ عِلَّةَ الْفُسَادِ الْغُرْرُ“ (رد المحتار ۴، ۱۸۲، المغنی لابن قدامہ ۶، ۵۱۲)۔ (علامہ شامی کہتے ہیں کہ: مصنف کی پیش کردہ عبارت میں بیع کے بطلان اور فساد دونوں کا احتمال ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد ثانی یعنی (فساد) ہے اس لئے کہ یہاں فساد کی علت غرر ہے)۔

### قبضہ کی حقیقت:

بیع اور ثمن پر قبضہ کے سلسلہ میں ایسی کوئی روایت یا نص موجود نہیں ہے جس سے کہ قبضہ کی کوئی خاص نوعیت معلوم کی جاسکے اور اس کو تعیین قبضہ کا مدار قرار دیا جائے، ایک روایت ہے بھی تو اس سے قبضہ کی کوئی حد متعین نہیں ہوتی، کتب احادیث اور فقہ کے عمومی جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ زمانہ اور حالات کی رفتار اور عادات و محاورات کا تغیر ہر دور میں جداگانہ طور پر وقوع پذیر رہا ہے، اس لئے شریعت نے قبضہ کو لوگوں کے رواج اور تعامل پر چھوڑ دیا ہے، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ حقیقتاً قبضہ کا مدار ارتفاع موانع ہے کہ بیع و ثمن کے بعد نہ مشتری کو بیع پر قبضہ کرنے میں رکاوٹ اور دقت ہو، اور نہ بائع کو ثمن پر، چونکہ ارتفاع موانع امور اضافیہ میں سے ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا مدار عرف و رواج ہی پر ہوگا، مگر اس میں اشیاء کی حقیقتوں کے اعتبار سے ائمہ کے یہاں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے، وہ یہ کہ مالکیہ نے صرف اشیاء منقولہ کے قبضہ کو عرف و رواج پر چھوڑا ہے، چنانچہ مشہور مالکی عالم احمد درویر قمر طراز ہیں:

”وقبض العقار بالتخلية وقبض غيره اى غير العقار من عروض وأنعام ودواب بالعرف الجارى بين الناس“۔  
(زمینوں کا قبضہ تخلیہ کے ذریعہ مانا جائے گا اور اس کے علاوہ سامان، جانور، چوپایہ وغیرہ کے قبضہ کی نوعیت وہ ہوگی جو عرف لوگوں کے درمیان رائج ہو) (الشرح الکبیر مع صوفی احمد الدرریر ۱۳۵/۳)۔

تاہم حنفیہ اور حنابلہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قبضہ کا مدار مطلقاً عرف کو قرار دیا ہے، منقولات کے قبیل کی چیز ہو یا غیر منقولات کے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“۔ (اس لئے کہ قبضہ کا معنی مشتری کو بیع پر قدرت دینا، تخلیہ اور عرفی و حقیقی طریقہ سے حائل رکاوٹوں کو دور کرنا ہے) (بدائع الصنائع ۱۳۸/۵)۔

نیز ابن قدامہ نے اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: ”لأن القبض مطلق في الشرع، فيجب الرجوع فيه إلى العرف كالإحراز والتفرق“۔ (اس لئے کہ قبضہ شریعت میں مطلقاً بیان کیا گیا ہے، لہذا اس سلسلہ میں عرف کی طرف مراجعت ضروری ہوگی، جیسے کسی چیز کی حفاظت اور علاحدگی کا تصور عرف پر مبنی ہوتا ہے) (المغنی لابن قدامہ ۹۰/۴)۔

### منقولی اور غیر منقولی اشیاء کے قبضہ کی نوعیت:

قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے منقولی اور غیر منقولی اشیاء میں احادیث اور ائمہ کی تشریحات کے مطابق خاصا فرق نظر آتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دونوں میں بنیادی فرق ہے، وہ اس طرح کہ اشیاء غیر منقولہ میں بعد المعاملہ بائع اور بیع کے درمیان اس طرح تخلیہ اور بیع کی حوالگی ہو جائے کہ مشتری بیع پر پوری طرح شرعی اور عرفی اعتبار سے بغیر کسی موانع اور دقت کے تصرف پر قادر ہو جائے۔ چنانچہ علامہ کاسانی نے تخلیہ کی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی ہے: ”وأما تفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“۔ (ربی سپردگی اور قبضہ کی تفسیر، تو سپردگی اور قبضہ کی نوعیت ہمارے یہاں تخلیہ ہے، اور تخلیہ کہتے ہیں بیع اور بائع کے درمیان حائل رکاوٹوں کے اس طرح ختم ہو جانے کو کہ مشتری پوری طرح بیع میں تصرف کرنے پر قادر ہو جائے، تو بائع سپرد کرنے والا اور مشتری قابض سمجھا جائے گا) (بدائع الصنائع ۲۳۳/۵)۔

نیز ابن قدامہ حنبلی نے غیر منقولی اشیاء عقار وغیرہ میں قبضہ کی نوعیت تخلیہ قرار دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ تخلیہ کے ذریعہ قبضہ اس وقت متصور ہوگا جب عرف میں لوگ اس کو قبضہ مان لیں، چنانچہ لکھتے ہیں: ”وان كان مما لا ينتقل ويحول فقبضه التخلية بينه ومشتريه لا حائل دونه لأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى العرف كالإحراز والتفرق والعادة في قبض هذه

الاشیاء۔“ (اور اگر ایسی چیز ہو جو اپنی جگہ سے منتقل نہیں ہوتی تو اس کا قبضہ بیع اور بائع کے درمیان اس طرح کا تخلیہ ہے کہ بیع اور مشتری کے مابین کوئی چیز حائل اور رکاوٹ نہ ہو، اس لئے کہ شریعت نے قبضہ کو مطلق بیان کیا ہے اس کی کوئی خاص نوعیت ذکر نہیں کی ہے، لہذا اس میں عرف و رواج ہی کی طرف رجوع ضروری ہوگا، جس طرح کسی چیز کی حفاظت اور اس سے علاحدگی کا تصور عرف پر مبنی اور ان اشیاء کے قبضہ کا رواج ہے) (المغنی لابن قدامہ ۹۰۴)۔

نیز امام شافعیؒ کے یہاں بھی قبضہ کی نوعیت میں غیر منقولی اشیاء میں تخلیہ کو کافی قرار دیا گیا ہے، علامہ نووی قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اپنا مذہب نقل فرماتے ہیں: ”قد ذکرنا أن مذهبنا أن القبض في العقار ونحوه بالتخلية، وفي المنقول بالنقل وفي التناول باليد التناول“۔ (ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہمارا مذہب بھی یہی ہے کہ عقار اور اس قسم کی دیگر اشیاء میں قبضہ کا مدار تخلیہ ہے اور منقولی چیزوں میں انتقال اور ہاتھ سے لی جانے والی چیزوں میں دست بدست سپردگی ہے) (المجموع شرح المہذب ۳۸۳)۔

اور منقولی اشیاء کے قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ اگر عددی چیز ہے تو اس کی گنتی کر دے اور کیلی چیز ہے تو اس کی کیل کر دے، اس کے بعد مشتری کو اس میں تصرف پر بغیر کسی رکاوٹ اور موانع کے قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو قبضہ تصور کیا جائے گا، البتہ بعض روایات میں انتقال کا تذکرہ بھی آیا ہے، لیکن وہ مجمل اور مطلق ہے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ وہ عرف پر مبنی ہے اگر صرف کیل اور وزن نیز گنتی کو عرف میں قبضہ تصور کیا جاتا ہو تو اسے ہی قبضہ قرار دیا جائے گا اور انتقال ہی قبضہ تصور ہو تو اسی کو قبضہ مانا جائے گا، جیسا کہ روایات اور ان کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے، تاہم حنفیہ نے اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کو قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے یکساں گردانتے ہوئے محض تخلیہ کو قبضہ کے لئے کافی شمار کیا ہے اور دست بدست اور انتقال کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ بدائع کی عبارت سے معلوم ہوا، نیز علامہ ابن ہمام نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کیا ہے، وہ رقمطراز ہیں: ”لابد من معرفة التسليم والتسليم الموجب للبراءة في التجريد لتسليم المبيع أن يخلى بينه وبين المبيع على وجه يتمكن من قبضه من غير حائل وفي الأجناس يعتبر صحة التسليم ثلاثة معان: أن يقول خليت بينك وبين المبيع وأن يكون المبيع بحضرة المشتري على صفة يتأق فيه الفعل من غير مانع وأن يكون مفرزاً غير مشغول بحق غيره“۔ (کسی چیز کے سپرد کرنے اور سپرد ہونے میں جو بری الذمہ ہونے کا سبب ہے اس کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے، چنانچہ تجرید میں ہے کہ بیع کی سپردگی یہ ہے کہ بیع کا بائع اور مشتری کے درمیان اس طرح تخلیہ ہو جائے کہ مشتری بغیر کسی رکاوٹ کے بیع کے قبضہ کرنے پر قادر ہو، اور اجناس میں سپردگی کی صحت کا اعتبار تین طرح سے ہوتا ہے: پہلی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں بیع اور تمہارے درمیان ملکیت کی بندش سے دستبردار ہوتا ہوں، اور دوسرے بیع مشتری کے سامنے اس ہیئت اور مرحلہ میں ہو کہ مشتری کو بغیر کسی کلفت کے تصرف کا اختیار ہو جائے، تیسرے یہ کہ بیع غیر کے کسی بھی حق سے آزاد ہو) (فتح القدیر ۲۹۷)۔

مگر رقم الحروف کے خیال کے مطابق قطعاً اور صحیح بات یہی ہے کہ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ کے قبضہ کی نوعیت میں خاصا فرق ہے، جیسا کہ مذکورہ تشریحات سے معلوم ہوا، نیز روایات و شواہد بھی اسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں، چنانچہ عبداللہ بن عمر کی روایت جس کو نبہتی نے بھی روایت کیا ہے مؤطا امام مالک میں ہے: ”عن عبد الله بن عمر أنه قال: كنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاع الطعام فبيعت علينا من يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه إلى مكان سواه قبل أن نبيعه“۔ (حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ عہد نبویؐ میں غلے خریدتے اور بیچتے تھے تو آپ ﷺ نے ہمارے یہاں قاصد بھیجا جس نے ہمیں حکم دیا منتقل کرنے کا دوسری جگہ اس جگہ سے جہاں ہم نے اس کو خریدا ہے، ان غلوں کو بیچنے سے پہلے) (مؤطا امام مالک ۲۶۳، صحیح مسلم ۵۲)۔

دوسری روایت جو بخاری میں ہے: ”قال: رأيت الناس في عهد رسول الله ﷺ إذا ابتاعوا طعاماً جزأفا يضربون أن يبيعوه في مكانهم حتى يؤووه إلى رحالهم“۔ (ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے عہد نبویؐ میں دیکھا کہ جب غلے تجارتی اٹکل سے خریدتے تو ان کی اس بات پر پٹائی اور سرزنش ہوتی کہ وہ اسے اس کی جگہ فروخت کریں جہاں انہوں نے خریدا ہے، لہذا یہ کہ اسے اپنی سواریوں اور کجاوے تک منتقل کر لیں) (بخاری ۲۸۶، ۸۷۱)۔

کیا بیع قبل القبض سے متعلق احادیث معطل بہ ہیں؟

”بیع قبل القبض“ کی روایتوں اور اس بارے میں پیش کردہ علماء کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کی تمام روایتیں کسی نہ کسی علت پر ضرور مبنی ہیں،



مثلاً غرر انفساخ عقد، ربح مالم یضمّن، شہ ربہا، ملکیت غیر کی فروختگی وغیرہ، مگر ان میں غرر انفساخ عقد زیادہ ہے، یعنی اس بات کا امکان ہے کہ بائع اول اس کو فسخ بھی کر سکتا ہے، یا بیع ہلاک بھی ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے بیع باطل ہو جائے، ظاہر ہے جب یہ بات ثابت ہوگی کہ اس سلسلے کی نصوص علت غرر یا خدشہ ہلاکت بیع پر مبنی ہیں تو جہاں بھی یہ علت پائی جائے گی بیع کی حرمت بھی ثابت ہوگی اور جہاں نہیں پائی جائے گی حلت ثابت ہوگی۔

حدیث کے معلل بالعلتہ ہونے ہی کی وجہ سے احناف نے منقولات کی بیع قبل القبض کو ناجائز اور غیر منقولات کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، اسی طرح حنابلہ نے مطعومات اور دیگر مکملات اور موزونات کے قبیل کی اشیاء کی بیع کو ناجائز اور مالکیہ نے مطعومات کے علاوہ تمام کی بیع کو جائز گردانا ہے، البتہ شواہح اس باب کی تمام احادیث کو غیر معلل بہ مان کر تمام ہی اشیاء میں قبل القبض بیع کو ناجائز قرار دیتے ہیں، چنانچہ مشہور حنفی عالم علامہ شہاب الدین احمد چلی روایات نبی کے مخصص اور معلل ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "إن القیاس أن یجوز بیع المنقول قبل القبض ایضاً لدلائل جواز البیع من الكتاب والسنة والإجماع إلا أنه ترک القیاس بالحدیث فلم یجوز بیعه قبل القبض وعلل الحدیث بغير انفساخ العقد بهلاك المبیع لأن العام إذا لم یکن إجراءه علی العموم حمل علی أخص الخصوص"۔ (قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ قبل القبض منقولات کی بیع بھی کتاب و سنت اور اجماع سے منقول دلائل جواز بیع کی وجہ سے جائز ہو، مگر احادیث رسول کی وجہ سے قیاس ترک کر دیا گیا ہے، لہذا منقولات کی بیع قبل القبض جائز نہیں، رہی حدیث میں مخالفت تو احادیث عقد بیع کے فساد کے خدشہ سے معلل ہے جو کہ بیع کی ہلاکت سے متعلق ہے، اس لئے کہ عام جب اپنی عمومیت پر باقی نہ رہے تو اس کو خاص پر محمول کیا جاتا ہے) (حاشیہ چلی مع التبعین لعثمان از یلعی ۸۰/۳، فتح القدیر ۵۱۳، المغنی ۸۸/۳، المدونۃ الکبریٰ)۔

اور ماضی قریب کے جلیل القدر فقیہ اور حنفی عالم مولانا ظفر احمد تھانوی حنفیہ کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "إلا أن أبا حنیفة وأبا یوسف خصا النصوص بالمنقول لعلة النهی وهو غرر انفساخ العقد بالهلاک قبل القبض واحتج أبو حنیفة، بأن الحكم معلل بغير انفساخ العقد بهلاك المبیع والهلاک فی غیر المنقول نادر و النادر کالمعدوم"۔ (مگر یہ کہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے نصوص کو منقولات کے ساتھ ممانعت کی علت کی وجہ سے خاص کیا ہے، اور وہ قبل القبض بیع کی ہلاکت کی وجہ سے عقد کے ختم ہونے کا خدشہ ہے، اور امام ابو حنیفہ نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ (ممانعت) کا حکم بیع کی ہلاکت سے بیع کے ختم ہونے کا خطرہ سے معلل ہے، اور غیر منقول اشیاء میں یہ اندیشہ نادر ہے جو کالعدم ہے) (إعلاء السنن ۲۲۵/۱۳)۔

البتہ دور حاضر کے مشہور فقیہ وہب زحیلی نے بیع قبل القبض سے متعلق احادیث کو معلل بہ قرار نہ دے کر انہوں نے نبی کی علت "ربا" کا شہ قرار دیا ہے، جو اصل میں غرر ہی کا لازمی نتیجہ ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳۷۶/۳)۔

غرض یہ حدیثیں معلل بہ ہیں اور علت غرر انفساخ عقد (بیع اول کے دوران معاملہ ختم ہو جانے کا خدشہ) ہے۔

بیع قبل القبض کی ممانعت اور اختلاف ائمہ:..... کتب فقہ اور ائمہ کے اقوال، نیز مذاہب اربعہ کی آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع قبل القبض کی ممانعت علی الاطلاق اور عام نہیں ہے، بلکہ ان میں تخصیصات و استثناءات بھی ہیں، بعض ائمہ کے یہاں تو صرف اشیاء خوردنی اور بعض کے یہاں منقولی اور بعض کے یہاں خورد و نوش کی اشیاء میں بھی مکملی اور موزونی، نیز دوسرے بعض حضرات کے یہاں منقولی اور غیر منقولی دونوں کی ممانعت کی صراحت ملتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق ائمہ کی آراء ان کے دلائل اور نقاط نظر علاحدہ علاحدہ ذکر کر دیئے جائیں۔

حنفی نقطہ نظر:

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے منقولی اشیاء کے اندر "بیع قبل القبض" کو ناجائز اور غیر منقولی میں جائز قرار دیا ہے، اور حنفیہ کے یہاں مختار قول یہی ہے، البتہ امام محمد نے اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کو ناجائز قرار دیا ہے، چنانچہ ابو جعفر طحاوی مسلک احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "ولا یجوز بیع مالہ یقبض من الأشیاء المبیعات إلا العقار، فإن أبا حنیفة کان یجوز بیعه قبل قبضه، وأما أبو یوسف و محمد، فكانا لا یجوزان بیعه ذلك ایضاً حتی یقبض وبه نأخذ، ثم رجع أبو یوسف عن ذلك إلى قول أبي حنیفة ولا یجوز لمن اشتری شیئاً کیلاً وإن قبضه أن بیعه حتی یکتالہ و كذلك حتی یعده إن کان اشتراه عدداً"۔ (خریدی اور بیچی جانے والی چیزوں میں سے کسی کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں سوائے زمین کے، امام ابو حنیفہ نے عقار کی بیع قبضہ سے پہلے جائز قرار دی ہے، امام ابو یوسف و محمد نے منقولی اشیاء



کی بیع قبل القبض نادرست قرار دی ہے، اور میں اسی کو اختیار کرتا ہوں، پھر امام ابو یوسفؒ نے امام صاحب کی طرف رجوع کر لیا، لہذا کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ کیلی چیز خرید کر لے اور اس کی کیل سے پہلے اس کو فروخت کرے اگرچہ اس پر قبضہ ہو جائے، اسی طرح عدوی چیز گنتی سے قبل فروخت کرے (مختصر طحاوی ۸۲، بدائع ۲۳۳/۵، فتح القدیر ۶/۵۱۰)۔

دلائل:

حنفیہ نے غیر منقولی اشیاء کی قبل القبض بیع کی ممانعت اور عقارات کے قبیل کی چیزوں کے جواز پر مندرجہ ذیل روایات سے استدلال کیا ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ منقولی اشیاء میں چونکہ نسخ عقد کا احتمال رہتا ہے، اور غیر منقولی اشیاء میں یہ احتمال نہیں رہتا، اس لئے ان کی خرید و فروخت جائز ہے، البتہ اگر غیر منقولی چیزوں میں بھی یہ احتمالات پیدا ہو جائیں تو ان کی بیع بھی قبل القبض جائز نہ ہوگی۔

”فإن هلاك العقار نادر ولا يبنى الفقه باعتبارها، فلا يمنع الجواز وهذا؛ لأنه لا يتصور هلاكه إلا صار بحرا أو نحوه حتى قال بعض المشائخ؛ إن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن يصير بحرا أو يغلب عليه الرمال، فأما في موضع لا يؤمن عليه ذلك، فلا يجوز كما في المنقول ذكره المحبوبي حتى لو كان على شط البحر أو كان المبيع علوا لا يجوز بيعه قبل القبض“۔ (کیونکہ عقار کا ہلاک ہونا شاذ و نادر ہوتا ہے اور شذوذ پر فقہ کی بنیاد نہیں ہوتی، لہذا یہ جواز بیع کے لئے بھی مانع نہیں ہوگا، اور یہ اس لئے ہے کہ اس کا ہلاک ہونا متصور نہیں ہوتا الا یہ کہ وہ زمین بحر یا نہر بن جائے، یہاں تک کہ بعض مشائخ احناف نے کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا جواب ان جگہوں کے بارے میں ہے جہاں اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ وہ بحر میں تبدیل ہو جائے گی یا اس پر ریت غالب آجائے گی، مگر وہ مقام جہاں اس سے مامون نہ ہو تو اس کا فروخت کرنا بھی قبضہ سے قبل منقولی اشیاء کی طرح جائز نہیں، اسی کو محبوبي نے ذکر کیا ہے کہ اگر بیع بحر کے کنارے ہو یا مکان وغیرہ کا اوپری حصہ ہو تو اس کا قبل القبض بیع جائز نہیں) (فتح القدیر ۶/۵۱۳)۔

مزید چند روایات جو حنفیہ کے نقطہ نظر کی مؤید ہیں، زیر قراطاس کی جاتی ہیں:

”عن حكيم بن حزام قال: قلت: يا رسول الله إني أبتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي قال: يا ابن أخي لا تبعن شيئا حتى تقبضه، هذا إسناد حسن متصل“۔ (حكيم بن حزام سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مختلف قسم کی چیزوں کی بیع کرتا ہوں اس میں سے میرے لئے کیا حرام اور کیا حلال ہے؟ فرمایا: اے بھتیجے! یہ چیزیں اس طرح نہیں بیچی جائیں گی، جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے، حدیث کی یہ سند صحیح اور متصل ہے) (السنن الکبریٰ للبیہقی ۵/۳۱۳)۔

دوسری روایت جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جو مسلم اور دیگر صحاح میں ہے: ”عن ابن عباسؓ أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه قال ابن عباسؓ وأحسب كل شيء مثله“۔ (ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص غلہ خریدے اس کو ہرگز نہ بیچے جب تک اس پر قبضہ نہ کر لے، ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس قسم کی تمام اشیاء کے بارے میں حکما میں یہی گمان کرتا ہوں) (مسلم شریف ۵/۲، مؤطا امام محمد ۲۳۲)۔

حنفیہ کے یہاں تخصیص منقولات کی وجہ:

اس سے پہلے تفصیل سے یہ بات گذر چکی ہے کہ احناف نے روایات ”نہی بیع قبل القبض کو معلل بہ قرار دیا ہے اور وہ علت بیع کی ہلاکت یا دیگر کسی اور وجہ سے انفساخ عقد کا خدشہ ہے اور جہاں تک غیر منقولی اشیاء کے جواز کی بات ہے تو اس بنا پر جائز قرار دیا ہے تاکہ کتاب اللہ میں جو بیع کی حلت آئی ہے اس کی عمومیت باقی رہے، اس لئے کہ قرآن کریم کی آیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ منقولی اور غیر منقولی دونوں اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہو، مگر چونکہ احادیث میں بعض اشیاء کی بابت ممانعت آئی ہے اس لئے اس کو معلل بہ مان لیا تاکہ احادیث پر بھی عمل ہو جائے، اور آیت کی عمومیت بھی باقی رہے، کیونکہ غیر منقولی اشیاء میں وہ اندیشہ نہیں ہے جو منقولی میں ہے۔ ”هذا تطبیق جید للأحناف“۔

چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی شیخین کی رائے کی توجیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”ولهما عمومات البياعات من الكتاب العزيز من غير تخصيص ولا يجوز تخصيص عموم الكتاب بخبر الواحد عندنا أو نحمله على المنقول تو فيقا بين الدلائل صيانة لها عن التناقض. ولأن الأصل في ركن البيع إذا صدر من الأهل في المحل هو الصحة والامتناء لعارض الغرر وهو غرر انفساخ العقد بهلاك المعقود عليه ولا يتوهم هلاك العقار فلا يتقرر الغرر فبقي بيعه على حكم الأصل“۔ (امام ابو حنیفہؒ و ابو یوسفؒ کی دلیل بغیر تخصیص کے خرید و فروخت کی اجازت کا عام ہونا ہے، اور ہمارے یہاں اصولی طور پر کتاب اللہ کے عموم کو خبر واحد سے مقید کرنا جائز نہیں ہے، یا یہ کہ اس ممانعت کو ہر منقول چیز پر محمول کریں گے، تا کہ دونوں دلائل میں تطبیق ہو جائے اور تناقض نہ ہو اور اصول یہ ہے کہ جب کوئی رکن اہل بیع و شراء سے صحیح محل میں صادر ہو تو اصل اس کی صحت ہے اور اس کی ممانعت خارجی علت کی بنا پر ہے اور وہ بیع کی ہلاکت کی وجہ سے عقد بیع کے فسخ کا امکان ہے، اور یہ امکان عقارات میں متصور نہیں، لہذا اس میں غرر بھی ثابت نہیں ہوگا، اور بیع اپنے حکم اصلی (جواز) پر باقی رہے گی) (بدائع الصنائع ۱۸۱/۵)۔

### شافعی نقطہ نظر:

بیع قبل القبض کے سلسلہ میں شافعیہ کا نقطہ نظر منقولات اور غیر منقولات دونوں میں عدم جواز کا ہے، البتہ ایسے حقوق جن میں بغیر عوض ملکیت ثابت ہوتی ہے، مثلاً وصیت، میراث، غلام کی آزادی، علی اختلاف الأقوال، تو ان میں قبل القبض تصرف دیگر ائمہ کی طرح شوافع نے بھی جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور شافعی عالم محی الدین ابن شرف نووی تحریر فرماتے ہیں:

”مذهبنا أنه لا يجوز بيع المبيع قبل قبضه عقارا كان أو منقولاً لا ياذن البائع ولا بغير إذنه لا قبل أداء الشمن ولا بعده“۔ (اس بارے میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ خواہ عقار کے قبیل کی چیز ہو یا منقولات کے قبیل کی، قبضہ سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں ہے، نہ تو بائع کی اجازت سے اور نہ بغیر اس کی اجازت کے، اسی طرح نہ أداء شمن سے قبل اور نہ بعد) (المجموع شرح المہذب ۹۰۲۶۲)۔

### دلائل:

شافعیہ نے بھی قریب قریب انہیں روایتوں سے استدلال کیا ہے، جن سے دیگر ائمہ مجتہدین نے کیا ہے اور انہوں نے منقولات پر غیر منقولات کو قیاس کیا ہے، وہ اس طرح کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء مطعومات جس کی کہ انسان ہر وقت ضرورت محسوس کرتا ہے، کی بیع قبل القبض کو ناجائز قرار دیا تو غیر منقولات کی بیع قبضہ سے قبل بدرجہ اولیٰ ناجائز اور باطل ہوگی، نیز اس لئے بھی باطل ہے کہ کسی چیز کی فروختگی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سپردگی پر انسان قادر ہو، اور قبل القبض کی صورت میں مشتری اس سے قاصر ہوگا، نیز شافعیہ کے یہاں بھی علت نبی وہی ہے جو حنفیہ کے یہاں ہے، یعنی غرر انفساخ عقد، چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں:

”واحتج أصحابنا بحديث حكيم بن حزام أن النبي ﷺ قال: لا تبع ما لم تقبضه و بحديث زيد بن ثابت أن النبي ﷺ نهي أن تباع السلع حيث تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم رواه أبو داود بإسناد صحيح“۔

(ہمارے اصحاب نے حکیم بن حزام کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مت بیچو تم کسی چیز کو جب تک اس پر قابض نہ ہو جاؤ، اور دوسری روایت زید بن ثابت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ سامان کو اسی جگہ فروخت کیا جائے جہاں سے اسے خریدا جائے، جب تک اس کو تجارت اپنے کجاوے اور سواری تک منتقل نہ کر دیں) (شرح المہذب ۲۷۱۹)۔

### حنبلی نقطہ نظر:

امام احمد کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی ”بیع قبل القبض“ عقار کے علاوہ تمام مطعومات غیر مطعومات، مکیلات و موزونات میں ناجائز ہے، اور امام ترمذی کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اشیاء خوردنی کے علاوہ جو کیلی اور روزنی نہ ہو ان تمام میں جائز ہے، اور ایک دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صرف اشیاء خوردنی اور مشروبات میں ناجائز، باقی تمام چیزوں میں قبل القبض بیع جائز ہے، ابن عبدالبر نے اسی تیسری روایت کو صحیح قرار دیا ہے، چنانچہ محقق ابن قدامہ حنبلی (متوفی ۶۳۰ھ) نقل فرماتے ہیں:

”ونقل عن أحمد أن المطعوم لا يجوز بيعه قبل قبضه سواء كان مكیلاً أو موزوناً أو لم يكن وهذا يقتضى



أن الطعام خاصة لا يدخل في ضمان المشتري حتى يقبضه، فإن الترمذی روی عن أحمد أنه رخص في بيع ما لا يكال ولا يوزن مما لا يوكل ولا يشرب قبل قبضه... وما أشبه من ما كول و مشروب فلا يبيعه حتى يقبضه قال ابن عبد البر: الأصح عن أحمد بن حنبل أن الذي يمنع من بيعه قبل قبضه هو الطعام“۔

(امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ اشیاء خوردنی کی بیع قبل القبض جائز نہیں، خواہ مکلی یا موزونی ہو یا نہ ہو، اس روایت کا تقاضا یہ ہے کہ اشیاء خوردنی خاص کر مشتری کے ضمان میں داخل نہ ہوگی جب تک قبضہ نہ کر لیا جائے، امام ترمذی نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ امام موصوف نے غیر مکلی اور موزونی جو اشیاء خورد و نوش نہیں ان کی بیع قبل القبض کے جواز میں رخصت دی ہے، ابن عبد البر کہتے ہیں کہ امام احمد کی صحیح روایت صرف طعام میں قبل القبض عدم جواز کی ہے) (المغنی لابن قدامہ ۸۸/۴)۔

دلائل:

حنابلہ کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ حنابلہ نے بھی اس باب کی ذکر کردہ روایتوں سے استدلال کیا ہے تاہم مطعومات کی چونکہ احادیث میں صراحت ہے، اس لئے مفہوم مخالف جس کا کہ حنابلہ کے یہاں کلام شارع میں اعتبار ہے۔ اس سے مطعومات کے علاوہ قبل القبض بیع کے جواز پر استدلال کیا ہے، چنانچہ ابن قدامہ کی ایک روایت پیش کر کے اس کے مفہوم مخالف کی تشریح کرتے ہیں:

”لأن النبي ﷺ نهي عن بيع الطعام قبل قبضه فمفهومه إباحة بيع ما سواه قبل قبضه“۔

(اس لئے کہ قبضہ سے پہلے غلہ کی بیع جائز نہیں ہے، لہذا اس کا مفہوم مخالف یہ نکلا کہ اس کے علاوہ چیزوں کی بیع قبل القبض جائز ہے) (المغنی ۸۸/۴)۔

”عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاما فلا يبيعه حتى يستوفيه، قال: كنا نشترى الطعام من الركبان جزافا فنهانا رسول الله ﷺ أن نبيعه حتى ننقله من مكانه“۔

(حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص غلہ خریدے، اس کو نہ بیچے جب تک اس کو وصول اور اس پر قبضہ نہ کر لے، ابن عمر کہتے ہیں کہ ہم لوگ سواری سے اٹکل سے غلہ خریدتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اس کے فروخت کرنے سے جب تک اس کو دوسری جگہ منتقل نہ کر دیا جائے) (صحیح مسلم ۵/۲)۔

مالکی نقطہ نظر:

”بیع قبل القبض“ میں مالکیہ نے صرف اشیاء خوردنی، خواہ ربوی ہوں یا غیر ربوی، کو ناجائز قرار دیا ہے، اس کے علاوہ تمام منقولات وغیر منقولات، ملکیات و موزونات کی تمام اجناس کو اس نبی سے مستثنیٰ گردانا ہے، چنانچہ مشہور مالکی علامہ سخون بن سعید تنوخی لکھتے ہیں:

”قلت: وما سوى الطعام والشراب مما سلفت فيه كيلا أو وزنا فلا بأس أن أبيع قبل أن أقبضه من الذي باعني أو من غيره قال مالك: لا بأس أن تبيع ما سلفت فيه إذا كان من غيره ما يوكل ويشرب من غير الذي عليه ذلك السلف بأقل أو بأكثر“۔

(میں نے پوچھا اشیاء خورد و نوش کے علاوہ وہ تمام چیزیں جو مکلی اور وزنی ہوں ان میں کوئی حرج ہے؟ کہ اس کی بیع قبضہ سے پہلے کی جائے اس شخص سے کہ جس کے ہاتھ سے میں نے خریدا ہے، یا اس کے علاوہ سے، تو امام مالک نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے کہ تم ان چیزوں کو فروخت کرو جس میں ادھار بیع کی جاتی ہے، جبکہ وہ اشیاء خورد و نوش نہ ہوں اس شخص سے جس سے کہ ادھار خریدا ہے خواہ کم میں خریدا ہو یا زیادہ میں) (المدونة الكبرى ۱۶۵/۳، بدایۃ المجتہد ۱۲/۱۳۴)۔

دلائل:

مالکیہ نے مطعومات اور غیر مطعومات میں، نیز عقارات کے درمیان قبل القبض بیع کی ممانعت میں جو عقلی طور پر فرق کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مطعومات قبل القبض ربا کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور غیر مطعومات میں چونکہ یہ اندیشہ نہیں ہے، اس لئے سد الذریعہ غالباً اشیاء خوردنی میں قبضہ سے پہلے بیع ناجائز اور اس کے علاوہ میں جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر وہب زحیلی مالکیہ کی طرف سے اسی علت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”والعلة في منع بيع الطعام قبل القبض عند المالكية هي أنه قد يتخذ البيع ذريعة التوصل إلى ربا النسئة فهو



يشبه بيع الطعام بالطعام نساء يعني سد الذرائع“۔

(مالکیہ کے یہاں قبل القبض اشیاء خوردنی کی بیع و شراء کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ وہ ربا نسبیہ تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہے، جو نسبیہ اشیاء خوردنی کی بیع کے مشابہ ہے یعنی مالکیہ نے سد الذریعہ اس سے روکا ہے) (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۳۷۴)۔

”عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه ويقبضه“۔

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص طعام خریدے اس کو نہ بیچے جب تک قبضہ نہ کرے) (صحیح مسلم ۵/۲)۔

فیکٹری سے مال خرید کر بغیر قبضہ فروخت کرنا:

مذکورہ بالا بیع و شراء سے متعلق تمام تفصیلات، قیود و شرائط کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فیکٹری سے مال خرید کر کوئی شخص بغیر اس پر قبضہ کئے کسی دوسرے کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے تو چونکہ کمپنی سے مال خریدنے اور عقد معاملہ کرنے کی وجہ سے معنوی قبضہ ہو گیا تھا، اگرچہ ظاہری نہیں ہو اور فیکٹری سے خرید کردہ بیع پر قبضہ آئندہ جب چاہے یقینی ہے، اس لئے محض ضمان کو کسی درجہ میں قبضہ مان کر تعامل ناس کی وجہ سے اس کو فروخت کرنا اور اس سے نفع کمانا جائز ہونا چاہئے، بشرطیکہ کسی قسم کا دھوکہ نہ ہو، اس لئے کہ شریعت نے جو ”بیع قبل القبض“ کو ناجائز قرار دیا ہے وہ دو علتوں کی بنا پر، ایک علت غرر ہے، اور دوسری ”رجح الم یضمن“ ہے، یہ دونوں صورتیں زیر بحث مسئلہ میں نہیں پائی جاتیں، اس بنا پر کہ تعامل ناس کی وجہ سے غرر بھی غرر یسیر کے حکم میں ہے، اور بائع اول چونکہ ضمان قبول کر رہا ہے اس لئے رجح الم یضمن بھی نہیں ہوگا، اس لئے اس صورت کے جواز میں کوئی خاص قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

شہینگ:

اور شہینگ کی صورت میں چونکہ بائع اس کا ضامن نہیں ہوتا، اس لئے اس طرح کا معاملہ ”رجح الم یضمن“ کی وجہ سے شرعاً درست ہوگا۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق مسائل و احکام

مولانا محمد ارشد قاسمی

۱۔ شرع اسلامی میں جہاں بہت ساری چیزیں ممنوع اور ناجائز ہیں وہیں ایک بیع قبل القبض بھی ہے، چنانچہ بیع قبل القبض کے ناجائز ہونے پر بہت ساری احادیث ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱۔ ”عن نافع عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه“ (مسلم شریف ۵/۲)۔
- ۲۔ ”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه، قال ابن عباس: وأحسب كل شيء مثله“ (مسلم شریف ۵/۲)۔
- ۳۔ ”عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يقبضه قال ابن عباس: وأحسب كل شيء بمنزلة الطعام“ (مسلم شریف ۵/۲)۔
- ۴۔ ”عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: من ابتاع طعاماً، فلا يبعه حتى يكتاله فقلت لابن عباس لِمَ، فقال ألا تراهم يبتاعون بالذهب والطعام مُرجأ ولم يقل أبو كريب مُرجأ“ (مسلم شریف ۵/۲)۔
- ۵۔ ”عن نافع عن ابن عمر قال: كنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاع الطعام فيبعث علينا من يأمرنا بانتقاله في المكان الذي ابتعناه فيه إلى مكان سواه قبل أن نبيعه“ (مسلم شریف ۵/۲)۔
- ۶۔ ”عن نافع عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه، قال: وكنا نشترى الطعام من الركبان جزافاً فنهانا رسول الله ﷺ أن نبيعه حتى ننقله من مكانه“ (مسلم شریف ۵/۲)۔
- ۷۔ ”عن نافع عن عبد الله ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه ويقبضه“ (مسلم شریف ۵/۲)۔

۸۔ ”عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يكتاله ومن رواية أبي بكر من ابتاع“ (مسلم شریف ۵/۲)۔

۹۔ ”جابر بن عبد الله يقول: كان رسول الله ﷺ يقول: إذا ابتعت طعاماً فلا تبعه حتى يستوفيه“ (مسلم شریف ۶/۲)۔

۱۰۔ ”عن سالم عن ابن عمر أنهم كانوا يضربون على عهد رسول الله ﷺ إذا اشتروا طعاماً جزافاً أن يبيعوه في مكانه حتى يحولوه“ (مسلم شریف ۵/۲)۔

جب ”بیع قبل القبض“ ناجائز ہے تو کیا اس کا شمار بیع باطل میں، یا بیع فاسد میں، یا بیع مکروہ میں ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ بیع قبل القبض ایک وصف ہے نہ کہ اصل، اور بیع فاسد وہ ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے مشروع ہونہ کہ وصف کے اعتبار سے، لہذا ”بیع قبل القبض“ کا شمار بیع فاسد میں ہوگا نہ کہ بیع باطل و مکروہ میں، نیز احادیث میں جو ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت ہے اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کا شمار بیع فاسد میں ہونہ کہ بیع باطل و مکروہ میں، کیونکہ احادیث میں جو ”بیع قبل القبض“ کی مخالفت آئی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ”بیع قبل القبض“ اصلاً ناجائز ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مشتری کو غرر

ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ ہو سکتا ہے بیع بائع اول کے پاس ہلاک ہو جائے، چنانچہ بیع ہلاک ہونے کی وجہ سے بیع ثانی فسخ ہو جائے گی نہ کہ باطل، چنانچہ امام اکمل الدین محمد بن محمود بابر ترقی "عناہ" میں لکھتے ہیں:

"والنہی یقتضی الفساد، فیکون البیع فاسداً قبل القبض؛ لانه لم یدخل فی ضمانہ کما فی الإجارۃ" (عناہ ۶ فتح القدیر ۶۰۵۱۲)۔ اور یہی فساد کا تقاضا کرتا ہے، پس بیع قبضہ سے پہلے فاسد ہوگی، اس لئے کہ بیع قبضہ سے پہلے مشتری کے ضمان میں داخل نہیں ہوتی، جیسا کہ اجارہ میں ہے۔

وہب زحلی فرماتے ہیں: "والنہی یوجب فساد المنہی عنہ، ولانه بیع فیہ غرر لتعرضہ الی الانفساخ بہلاک المعقود علیہ، فیبطل البیع الأول ویفسخ الثانی" (الفقہ الاسلامی وأدلہ ۲۰۲۱۱)۔ (نہی منہی عنہ کے فساد کو ثابت کرتی ہے، اور اس لئے کہ بیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے اس بیع کا فسخ ہونا ممکن ہے جو باعث غرر ہے، تو بیع اول باطل اور دوسری بیع فسخ ہو جائے گی)۔

۲۔ اسلامی شریعت میں کتاب وسنت نے قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں کی ہے، بلکہ اسے لوگوں کے عرف و عادت پر چھوڑ دیا ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً قبضہ مانا جائے گا، چنانچہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

"لأن القبض مطلق فی الشرع، فیجب الرجوع فیہ الی العرف" (المغنی ۲۰۹۰)۔  
(اس لئے کہ قبضہ شریعت میں مطلق ہے، پس اس میں رجوع واجب ہوگا عرف کی طرف)۔

### اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت:

اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت تخلیہ ہے، اور تخلیہ کہتے ہیں کہ بیع اور مشتری کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل نہ ہو جو بیع کیلئے مانع ہو اس طور پر کہ مشتری بیع میں تصرف کرنے پر قادر ہو جائے، گویا بائع بیع کو سپرد کرنے والا اور مشتری اس کو لینے والا ہو جائے، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"وأما تفسیر التسلیم والقبض، فالتسلیم والقبض عندنا هو التخلیة والتخلی وهو أن یخلى البائع بین البیع و بین المشتري برفع الحائل بینہما علی وجه یتمكن المشتري علی التصرف فیہ، فیجعل البائع مسلماً للبیع والمشتري قابضاً له وكذا تسلیم الثمن من المشتري الی البائع" (بدائع الصنائع ۵۰۲۲۳)۔

(سپردگی اور قبضہ کی تفسیر ہمارے یہاں (حنفی) سپردگی اور قبضہ تخلیہ ہے، اور تخلیہ یہ ہے کہ بائع بیع اور مشتری کے درمیان حائل کو ختم کر دے اس طریقے پر کہ مشتری بیع میں تصرف کرنے پر قادر ہو جائے، گویا بائع بیع کو سپرد کرنے والا اور مشتری اس کو قبضہ کرنے والا ہو جائے، اور ایسے ہی ثمن کی سپردگی ہے مشتری سے بائع کی طرف)۔

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت میں فرق:..... اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے مذاہب مندرجہ ذیل ہیں:

### حنفیہ کا مسلک:

حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں تمام چیزوں میں تخلیہ حکماً قبضہ ہے جبکہ مشتری اس پر بغیر مشقت کے قادر ہو، لیکن قبضہ کی نوعیت بیع کے اعتبار سے مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اشیاء غیر منقولہ میں تخلیہ قبضہ ہے اگر قریب ہو، لیکن اگر وہ دور ہے تو اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگرچہ اشیاء غیر منقولہ دور ہو پھر بھی تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا، صاحبین کا مذہب اس کے برخلاف ہے، لیکن امام صاحب کے مذہب کو البحر الرائق میں ضعیف کہا گیا ہے۔

اشیاء منقولہ میں قبضہ کی نوعیت ہر چیز کے اعتبار سے مختلف ہے، اگر گہروں کو گھر میں فروخت کیا گیا تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری کو چاہی دیدے اس طور پر کہ مشتری گھر کھولنے پر بغیر کسی مشقت کے قادر ہو جائے، اور اگر گھر کو فروخت کیا گیا ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری گھر بند کرنے پر قادر ہو جائے، اگر جانور کو چراگاہ میں فروخت کیا گیا ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری اس کو دیکھ لے، یا اس کی طرف اشارہ کر دے، اگر بیع کپڑا ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری اس سے متصل ہو، اگر گھوڑا یا چڑیا کو گھر میں فروخت کیا گیا تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ اس کو بغیر کسی مددگار کے لینا ممکن ہو، تیل میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری بائع کو پیشی دے اور بائع مشتری کی موجودگی میں اس میں تیل وزن کر دے، اور اگر بیع مٹیل یا موزونی ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری بائع کو برتن دیدے اور بائع



اس میں مشتری کے حکم سے کیل یا وزن کر دے، چنانچہ ابن عابدین شامی "رد المحتار" میں تحریر کرتے ہیں:

"إن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفعة المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن تكون في البلد فيما يظهر، وفي نحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض وفي نحو ثوب فكونه بحيث لو مديده تصل إليه قبض، وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض" (رد المحتار ۴۰۵۶۳)۔

(بے شک تخلیہ حکماً قبضہ ہے اگر اس پر بغیر مشقت کے قادر ہو، لیکن یہ بیع کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوتا رہتا ہے، پس گیہوں یا اس جیسی چیز اگر گھر میں فروخت کی گئی تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری کو چاہی دیدے جبکہ گھر کا بغیر کسی مشقت کے کھولنا ممکن ہو، اور گھر میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری اس کو بند کرنے پر قادر ہو جائے، بایں طور کہ وہ شہر میں ہو جس میں وہ ظاہر ہوتا ہو، اور اگر گائے یا اس جیسی چیز چراگاہ میں فروخت کی گئی تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری اس کو دیکھتا ہو، یا اس کی طرف اشارہ کرتا ہو، اور کپڑا اور اس جیسی چیز میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری اس سے متصل ہو، اور اگر گھوڑا یا چڑیا یا اس جیسی چیز گھر میں فروخت کی گئی تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری اس کو گھر سے بغیر مشقت کے لینے پر قادر ہو)۔

"لو اشترى دهنًا ودفعة قارورة يزنه فيها بحضرة المشتري فهو قبض، وكذا بنغيته في الأصح، وكذا كل مكيل أو موزون إذا دفع له الوعاء فكاله أو وزنه فيه بأمره، ومنه ما لو غضب شيئاً ثم اشتراه صار قابضاً" (رد المحتار ۴۰۵۶۱)۔

(اگر کسی نے تیل خرید اور شیشی بائع کو دیا اور بائع اس میں تیل مشتری کی موجودگی میں وزن کرتا ہے تو یہ قبضہ ہے اور ایسے ہی مشتری کی غیر موجودگی میں اصح قول کے مطابق قبضہ سمجھا جائے گا، اور ایسے ہی ہر مکیلی یا موزونی چیز کہ جب مشتری بائع کو برتن دیدے اور بائع اس میں مشتری کے حکم سے کیل یا وزن کر دے تو قبضہ سمجھا جائے گا، اسی میں سے یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی چیز غضب کیا پھر اس کو خرید تو وہ قبضہ کرنے والا ہو جائے گا)۔

"وجامع شمس الأئمة أنه بالتخلية يصح القبض وإن كان عقاراً بعيداً غائباً عنهما عند أبي حنيفة خلافاً لهما وهو ضعيف كما في البحر، وفي الخانية والصحيح ما ذكرنا في ظاهر الرواية، لأنه إذا كان قريباً يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض، أما إذا كان بعيداً لا يتصور القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض" (رد المحتار ۴۰۵۶۲، ۴۰۵۶۳)۔

(اور شمس الأئمة کی جامع میں یہ ہے کہ تخلیہ سے قبضہ درست ہو جاتا ہے، اگر چیز زمین دور غائب ہو بائع و مشتری سے، امام اعظمؒ کے نزدیک، اس میں صاحبین کا اختلاف ہے، اور امام صاحب کا یہ قول ضعیف ہے، جیسا کہ بحر الرائق میں ہے، اور خانہ میں ہے کہ صحیح قول وہ ہے جس کو ہم نے ظاہر الروایہ میں ذکر کیا ہے کہ جب زمین قریب ہو جس میں قبضہ حقیقی فی الحال تصور کیا جائے تو تخلیہ قبضہ کے قائم مقام ہوگا، اور اگر زمین دور ہو تو فی الحال قبضہ تصور نہیں کیا جائے گا، چنانچہ تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہ ہوگا)۔

حنابلہ کا مسلک:

حنابلہ کے یہاں اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت تخلیہ ہے، باقی اشیاء منقولہ میں قبضہ کی نوعیت مختلف ہے، اگر اشیاء منقولہ ان چیزوں میں سے ہے جس کو کیل یا وزن کیا جاتا ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ اس کو ہاتھ میں لے لیا جائے، اگر کپڑا ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ اس کو اس کی جگہ سے منتقل کر دیا جائے، اور اگر حیوان ہے تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ اس کو اس کی جگہ سے چلا دیا جائے، گویا ہر چیز کا قبضہ اس کی جنس کے ساتھ ہوگا، چنانچہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

"وقبض كل شئ بجنسه فإن كان مكيلاً أو موزوناً ببيع كميلاً أو موزوناً فقبضه بكيله ووزنه... وإن كان الجميع دراهم أو دنائير فقبضها باليد، وإن كان ثياباً فقبضها نقلها، وإن كان حيواناً فقبضه تمشية من مكانه، وإن كان مما لا ينقل ويحول فقبضه التخلية بينه وبين مشتريه لا حائل دونه"۔

(ہر چیز کا قبضہ اس کی جنس کے ساتھ ہے، پس اگر کوئی چیز مکیلی یا موزونی ہو، اور وہ کیل یا وزن کر کے فروخت کی جائے تو اس کا قبضہ اس کے کیل یا وزن کے ساتھ

ہے، اور اگر بیع درہم و دنانیر ہے تو اس کا قبضہ ہاتھ سے ہے، اور اگر کپڑا ہے تو اس کا قبضہ یہ ہے کہ اس کو اس کی جگہ سے منتقل کر دیا جائے، اور اگر حیوان ہے تو اس کا قبضہ اس کی جگہ سے چلا دینا ہے، اور اگر بیع ایسی چیز ہے جس کو منتقل نہیں کیا جاسکتا ہے، تو اس کا قبضہ تخلیہ ہے، اور تخلیہ نام ہے کہ بیع اور مشتری کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔

شافعیہ کا مسلک:

شافعیہ کے یہاں اشیاء غیر منقولہ اور منقولہ میں قبضہ کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ اشیاء غیر منقولہ میں تخلیہ ہے۔ ۲۔ اگر اشیاء ان چیزوں میں سے ہے جس کو عادتاً منتقل کیا جاتا ہے، مثلاً لکڑی، دانہ اور مچھلی وغیرہ، تو اس میں قبضہ یہ ہے کہ اس کو اپنی جگہ سے منتقل کر دیا جائے۔ ۳۔ اور اگر اشیاء منقولہ ان چیزوں میں سے ہے جس کو ہاتھ سے لیا جاتا ہے، مثلاً درہم و دنانیر، کپڑا اور برتن وغیرہ، اس میں قبضہ یہ ہے کہ اس کو ہاتھ میں لیا جائے، چنانچہ امام نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

(ہمارے اصحاب نے کہا کہ قبضہ کے سلسلہ میں عرف کی طرف رجوع کرنا ہوگا، احکام کی تین قسمیں ہیں، ان میں سے ایک زمین اور درخت پر پھل ہے اس کا قبضہ تخلیہ ہے، دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جو عادتاً منتقل کی جاتی ہیں، جیسے لکڑی، دانہ اور مچھلی اور اس جیسی دوسری چیزیں، اس کا قبضہ یہ ہے کہ اس کو اس کی جگہ سے منتقل کر دیا جائے، اس سلسلہ میں بائع کی کوئی تخصیص نہیں ہے، برابر ہے کہ وہ مشتری کی طرف منتقل کی جائے، یا غیر آباد زمین کی طرف، یا سڑک کی طرف، یا مسجد کی طرف، یا اس کے علاوہ کی طرف، تیسری قسم وہ ہے جس کو ہاتھ سے لیا جاتا ہے، جیسے درہم و دنانیر، رومال، کپڑا، وہ برتن جو ہلکا ہو اور کتاب اور اس جیسی دوسری چیزیں، پس اس کا قبضہ ہاتھ سے لینے سے ہے) (شرح المہذب ۲۷۹-۲۷۶)۔

۴۔ ”بیع قبل القبض“ کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بالعلت“ ہیں، اور علت نہی غرر ہے، چنانچہ علامہ ابن ہمام ”فتح القدیر“ میں تحریر کرتے ہیں:

”إن رسول الله ﷺ نهي عن بيع ما لم يقبض“۔

”والحدیث الذی استدلل به معلول به ای بغیر الانفساخ والدلیل علیہ أن التصرف الذی لا یمتنع بالغرر نافذ فی البیع قبل القبض وهو العتق والتزوج علیہ“ (فتح القدیر ۶۰۵۱۳)۔

(اس سلسلہ کی متدل حدیث معلول ہے جس کی علت عقد کے فسخ ہونے کا غرر و اندیشہ ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تصرف جس میں غرر مانع نہیں ہے، تو وہ بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے نافذ ہو جاتا ہے، مثلاً آزادی، تزوج وغیرہ)۔

۵۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت عام نہیں ہے، بلکہ اس میں استثناءات و تخصیصات ہیں، اس بابت ائمہ کے مذاہب مع دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

حنفیہ کا مسلک:

حنفیہ کے یہاں اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، جائز نہ ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں غرر کا اندیشہ ہے، وہ اس طرح کہ ممکن ہے کہ بیع بائع کے پاس ہلاک ہو جائے جس کی وجہ سے عقد فسخ ہو جائے، بطور دلیل کے یہ پیش کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے قبل القبض خرید و فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے، اشیاء غیر منقولہ کے سلسلہ میں خود احناف میں اختلاف ہے، امام محمد کا کہنا یہ ہے کہ اشیاء غیر منقولہ کی ”بیع قبل القبض“ جائز نہیں ہے، جس طرح اشیاء منقولہ کی بیع جائز نہیں ہے، نیز ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث میں جو ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت آئی ہے وہ مطلق ہے، اس میں اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اس لئے دونوں کی بیع قبل القبض جائز نہ ہوگی۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا کہنا یہ ہے کہ اشیاء غیر منقولہ کی بیع قبل القبض جائز ہے، ان دونوں حضرات کی دلیل یہ ہے کہ احادیث میں بیع قبل القبض کی جو ممانعت آئی ہے وہ غرر کی وجہ سے ہے، اور غرر اشیاء منقولہ ہی میں ممکن ہے۔

اشیاء غیر منقولہ میں ممکن نہیں ہے، اور اگر کبھی خدا نخواستہ غرر ہو بھی جائے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ یہ نادر ہے، اور نادر کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔

مشائخ نے کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اشیاء غیر منقولہ کی بیع کو قبل القبض جائز اس صورت میں قرار دیا ہے، جبکہ اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہ

ہو، لیکن اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً زمین، دریا، یا نہر کے کنارہ ہے، اور امکان اس بات کا ہے کہ وہ دریا کی نذر ہو جائے، تو پھر اس کو قبل القبض فروخت کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔

کسی شخص نے کوئی ایسی چیز خریدی جو منتقل کی جاتی ہے، تو اس کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بیع قبل القبض سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں عقد کے نسخ ہونے کا غرر ہے، اس طور پر کہ بیع ہلاک ہو جائے، اور زمین کی بیع قبضہ سے پہلے شیخین کے نزدیک جائز ہے، اور امام محمد کے نزدیک جائز نہیں ہے حدیث کے مطلق ہونے کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اور منقول پر قیاس کرتے ہوئے، گویا یہ اجارہ کی طرح ہو گیا، شیخین کی دلیل یہ ہے کہ بیع کارکن اس کے اہل (یعنی عاقل بالغ) سے صادر ہوا ہے، اس کے محل میں، اور اس میں کوئی غرر نہیں ہے، کیونکہ زمین کی ہلاکت شاذ و نادر ہوتی ہے۔ اور نادر کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور نہ فقہ کی بنیاد ایسی باتوں پر ہوتی ہے، اس لئے یہ جواز کے منافی نہیں ہے، ہاں اس کا ہلاک ہونا اس وقت متصور ہوتا ہے جب کہ خوف ہو کہ سمندر وغیرہ ہو جائے، اسی وجہ سے بعض مشائخ نے کہا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ایسی ہی جگہوں کے بارے میں ہے جو دریا ہونے، یاریت کے بھر جانے سے مامون ہو، لہذا ایسی جگہ جو مذکورہ باتوں سے مامون نہ ہو تو اس کا حکم شی منقول کی طرح ہے، اس کو محبوبی نے ذکر کیا ہے، اور اختیار میں ہے کہ اگر زمین دریا کے کنارہ ہو، یا بیع اونچائی پر ہو تو اس کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ۶/۵۱۰-۵۱۳)۔

### شافعیہ کا مسلک:

شافعیہ کے یہاں اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں سے کسی کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، ناجائز ہونے کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ اشیاء منقولہ میں سے طعام جس کی ضرورت اکثر پیش آتی ہے، اس کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، تو اس کے علاوہ جس کی ضرورت اکثر پیش نہیں آتی ہے، خواہ وہ منقولات میں سے ہو، یا غیر منقولات میں سے، اس کی بیع قبل القبض بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی، اور دلیل میں ابن عباسؓ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں:

۱- ”عن ابن عباسؓ أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه، قال ابن عباسؓ: وأحسب كل شيء مثله“ (مسلم شریف ۵/۲)۔

۲- ”عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يقبضه، قال ابن عباسؓ: وأحسب كل شيء بمنزلة الطعام“ (مسلم شریف ۵/۲)۔

قبل القبض کسی چیز کی بیع جائز نہیں ہے، اس سلسلہ میں امام نوویؒ اپنی کتاب شرح مہذب میں تحریر کرتے ہیں:

”لا يجوز بيع شيء قبل قبضه سواء جميع المبيعات كما في الطعام قاله الشافعي ومحمد بن الحسن“ (شرح المہذب ۹/۲۷۰)۔ ”فإنه إذا النهى عن بيع الطعام مع كثرة الحاجة إليه فغيره أولى“ (شرح المہذب ۹/۲۷۱)۔

کسی بھی چیز کی بیع قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، یہ (حکم) ان تمام چیزوں کو عام ہے جو بیچی اور خریدی جاتی ہے، جیسا کہ طعام کا حکم ہے، یہی قول امام شافعی اور محمد بن حسن کا ہے، نیز طعام میں حاجتوں کی کثرت کے باوجود اس کی بیع کو (قبل القبض) ناجائز قرار دیا گیا ہے، تو اس کے علاوہ بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

### حنابلہ کا مسلک:

حنابلہ کے یہاں صرف مطعومات کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، اس کے علاوہ جتنی بھی اشیاء ہیں، خواہ وہ منقولات میں سے ہوں، یا غیر منقولات میں سے، اس کی بیع قبل القبض جائز ہے، مطعومات کی بیع کے ناجائز ہونے پر مندرجہ ذیل روایات پیش کرتے ہیں:

۱- ”عن ابن عمرؓ أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه“ (مسلم شریف ۵/۲)۔



۲۔ ”عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه ويقبضه“ (مسلم شریف ۵۲)۔  
غیر مطعومات کے جائز ہونے پر اس روایت سے استدلال کرتے ہیں، جس میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جابرؓ سے ان کے اونٹ کو خریدا، پھر اس کو قبضہ کرنے سے پہلے حضرت جابرؓ کو ہبہ کر دیا۔

”واشترى من جابر ﷺ جملة ونقده ثمنه، ثم وبه إياه قبل قبضه، ولأنه أحد نوعي المعقود عليه فجاز التصرف فيه قبل قبضه“ (المغنی ۴۰۹)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے ان کے اونٹ کو نقد ثمن کے عوض خریدا، پھر اونٹ کو قبضہ کرنے سے پہلے ہبہ کر دیا، اور اس لئے کہ یہ معقود علیہ کے دو قسموں میں سے ایک ہے، پس اس میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے۔

ابن عبد البر امام احمدؒ سے مطعومات کے ناجائز اور غیر مطعومات کے جائز ہونے کے سلسلہ میں روایت کرتے ہیں: ”قال ابن عبد البر: الأصح عن أحمد بن حنبل أن الذي يمنع من يبعه قبل قبضه هو الطعام، وذلك، لأن النبي ﷺ نهي عن بيع الطعام قبل قبضه فمفهومه إباحة بيع ما سواه قبل قبضه“ (المغنی ۴۰۸)۔

(ابن عبد البر نے کہا کہ احمد بن حنبل سے اصح قول طعام کی بیع کا قبضہ سے پہلے ناجائز ہونا ہے، اور یہ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل القبض طعام کی بیع سے منع فرمایا ہے، پس اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ طعام کے علاوہ کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے)۔  
مالکیہ کا مسلک:

مالکیہ کے یہاں مطعومات کے علاوہ جتنی بھی اشیاء ہیں، خواہ وہ اعیان منقولہ میں سے ہو، یا اعیان ثابتہ میں سے، مثلاً زمین، درخت وغیرہ، اس کی بیع قبل القبض جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک مطعومات ربوی کی بیع کے قبل القبض ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، البتہ مطعومات غیر ربوی کے سلسلہ میں دور روایت ہے، ایک جواز کی، دوسرے عدم جواز کی، لیکن عدم جواز کی روایت ان سے زیادہ مشہور ہے، مطعومات کے ناجائز ہونے پر وہی روایت پیش کرتے ہیں، جس کو امام احمدؒ نے پیش کیا ہے، قبل القبض مطعومات کے ناجائز ہونے اور غیر مطعومات کے جائز ہونے کے سلسلہ میں ابن رشد القرطبی تحریر کرتے ہیں:

”وأما بيع ما سوى الطعام قبل القبض، فلا خلاف في مذهب مالك في إجازته، وأما الطعام الربوي فلا خلاف في مذهبه أن القبض شرط في بيعه، و أما غير الربوي من الطعام فعنه في ذلك روايتان أحدهما المنع وهي الأشهر... الرواية الأخرى الجواز“ (بداية المجتهد ۲۰۱۳)۔

(طعام کے علاوہ قبضہ سے پہلے جس چیز کو فروخت کیا جائے، امام مالک کے مذہب میں اس کے جائز قرار دینے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور بہر حال طعام ربوی تو اس میں قبضہ شرط ہے، فروخت کرنے سے قبل امام مالکؒ کے مذہب میں اور طعام غیر ربوی کے سلسلہ میں دور روایت ہے، ایک جواز کی، دوسرے عدم جواز کی، لیکن عدم جواز کی روایت زیادہ مشہور ہے)۔

خلاصہ:

ائمہ اربعہ کے مذاہب پر نظر دوڑانے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طعام کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، البتہ غیر طعام کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے، جیسا کہ معلوم ہوا، بالکل یہی بات ابن منذر نے مغنی کے اندر نقل کی ہے: ”وقال ابن المنذر: أجمع أهل العلم أن من اشترى طعاماً فليس له أن يبيعه حتى يستوفيه“ (المغنی ۴۰۸)۔ اور ابن منذر نے کہا کہ تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ جس نے طعام کو خریدا اس کے لئے اس کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہ ہوگا۔

۶۔ سوال نمبر چھ کے تحت جو صورت بیان کی گئی ہے، اس میں ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا، جیسا

کہ ”معنی“ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز مشتری کے ضمان میں آجائے تو اس کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے، جس طرح قبضہ کے بعد فروخت کرنا اور تصرف کرنا جائز ہے، چنانچہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

”ولو دخل في ضمان المشتري جاز له بيعه والتصرف فيه كما بعد القبض“ (المغنی ۴، ۸۸)۔

اگر کوئی چیز مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے تو اس کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے، جیسا کہ قبضہ کرنے کے بعد جائز ہے۔

نیز حدیث میں ”بیع مالہ یضمن“ سے منع کیا گیا ہے، اور مذکورہ صورت میں ”بیع مالہ یضمن“ نہیں ہے، بلکہ ”بیع مایضمن“ ہے، اس لئے مذکورہ صورت کو جائز قرار دیا جائے گا۔

۷۔ سوال نمبر سات کے تحت جو صورت بیان کی گئی ہے کہ سامان ابھی جہاز ہی میں رہتا ہے کہ مشتری اول کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، نیز بیع ہلاک ہونے کی صورت میں مشتری اول ضامن بھی نہیں ہوتا ہے، یہ شرعاً ناجائز ہے، اور ناجائز ہونے کی چار وجہیں ہیں: ۱۔ ”بیع مالہ یضمن“ اور حدیث میں ”بیع مالہ یضمن“ سے منع کیا گیا ہے، ۲۔ ”بیع قبل القبض“ اور حدیث میں ”بیع قبل القبض“ سے منع کیا گیا ہے، ۳۔ غیر مقدر التسلیم، ۴۔ جہالت، اگر کسی چیز کی بیع میں ان چار وجہوں میں سے کوئی ایک بھی وجہ پائی جائے تو اس کی بیع درست نہیں ہوتی ہے، اور صورت مسئولہ میں مذکورہ چاروں وجہیں پائی جا رہی ہیں، اس لئے اس کی بیع بدرجہ اولیٰ درست نہ ہوگی۔

☆☆☆

## خرید و فروخت میں تخلیہ کی حیثیت

مفتی محمد شاہد قاسمی

۳، ۲۔ قبضہ کی حقیقت:..... احادیث کے ذخیرے میں کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی جس سے قبضہ کی حقیقت واضح ہو جائے، اس لئے اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

مسئلک حنفی:..... احناف کے یہاں تمام اشیاء میں، چاہے منقولہ ہوں، یا غیر منقولہ، تخلیہ کو حکماً قبضہ سمجھا گیا ہے، لیکن ہر تخلیہ قبضہ کے حکم میں نہیں ہے، تخلیہ وہ معتبر ہے جس میں بیع پر قبضہ بلا مشقت ہو سکے، اور بائع بیع کو اس طرح مشتری کے حوالہ کرے کہ اس میں کسی کی شرکت نہ ہو اور مشتری بلا کلفت و مشقت تصرف کر سکے، تو تخلیہ کی نوعیت بیع کے احوال کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں: ”إن التخلية قبض حکماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض“ (رد المحتار ۴/۵۶۲)۔ (تخلیہ حکماً قبضہ ہے، اگر اس پر قدرت بلا مشقت ہو، لیکن یہ بیع کے حال کے اعتبار سے مختلف ہوگا، تو گھر میں رکھے ہوئے گیہوں کی بیع میں بھی دے دینا قبضہ سمجھا جائے گا جب کہ اس کا کھولنا بلا مشقت ممکن ہو، اور گھر جیسی چیز میں، تو اس کے بند کرنے پر قدرت قبضہ ہے)۔

اسی طرح کی بات علامہ کاسانی نے فرمائی ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/۲۴۴)۔

مسئلک شافعی:..... شافعیہ کے یہاں بھی قبضہ کی نوعیت بیع کے احوال کے اعتبار سے ہے، چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں: ”إن القبض في العقار ونحوه بالتخلية وفي المنقول بالنقل وفي المتناول باليد بالتناول“ (شرح مہذب: ۹، ۲۸۳)۔ (زمین اور ان جیسی چیزوں میں قبضہ کا تحقق تخلیہ سے، منقول میں نقل کر کے اور جو ہاتھ سے لیا دیا جاتا ہو، ہاتھ میں لے کر ہوگا)۔

مسئلک حنبلی:..... حنابلہ کے یہاں بھی قبضہ کی نوعیت تقریباً شوافع کی طرح ہے، چنانچہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

”إن كان المبيع دراهم أو دنانير فقبضها باليد وإن كان ثياباً فقبضها نقلها، فإن كان حيواناً فقبضه تمشيته من مكانه وإن كان مما لا ينقل ويحول فقبضه التخلية بينه وبين مشتريه لا حائل دونه... ولأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى العرف“ (المغني: ۴، ۹۰)۔ (اگر بیع دراهم، یا دنانیر ہوں تو اس میں قبضہ ہاتھ میں لے کر ہے، اگر بیع کپڑا ہو تو اس میں قبضہ اس کو منتقل کرنا ہے، اگر حیوان ہو تو اس کا قبضہ اس کو اپنی جگہ سے چلا دینا ہے اور اگر اشیاء غیر منقولہ میں سے ہو تو اس میں قبضہ مشتری اور اس شے کے درمیان تخلیہ ہے جو بلا واسطہ ہو..... اس لئے کہ قبضہ شریعت میں مطلق ہے تو اس سلسلہ میں عرف کی طرف لوٹنا واجب ہے)۔

تینوں مسالک میں حنابلہ کا مسلک کچھ زیادہ ہی وسیع ہے، چونکہ ان کے یہاں قبضہ کی حقیقت عرف پر مبنی ہے۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں احادیث:

۵، ۴۔ کن اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے اور کس کی جائز ہے، اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کی رائیں مختلف ہیں، پہلے اس سلسلہ کی احادیث نقل کرنے کے بعد فقہاء کرام کے طریقہ استدلال کو پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ”سمعت ابن عباس رضی اللہ عنہما يقول: أما الذبي فھی عنه النبی صلی اللہ علیہ وسلم فهو الطعام أن يباع حتى يقبض قال ابن عباس رضی اللہ عنہما:



ولا أحسب كل شئ إلا مثله“ (بخاری شریف: ۲۸۶۱/۱، مسلم شریف: ۵۱۲)۔ (ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اشیاء مطعومہ کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں ہر چیز کو طعام ہی کے مثل سمجھتا ہوں)۔

۲۔ ”من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه“ (بخاری شریف: ۲۸۶۱/۱، مسلم شریف: ۵۱۲، ابوداؤد: ۱۳۵۲)۔  
جوٹی مطعوم کو خریدے تو اس پر قبضہ کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے۔

لفظ طعام کے ساتھ بہت سی احادیث مسلم شریف اور دیگر کتب حدیث میں مروی ہیں، جن میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت ہے، طوالت سے بچتے ہوئے اسے ترک کیا جاتا ہے۔

۳۔ ”إن حكيم بن حزام قال: يا رسول الله إني أشتري بيوعاً فما يحل لي منها مما يحرم قال: إذا اشتريت شيئاً فلا تبعه حتى تقبضه“ (نصب الراية ۲، ۲۲ بحوالہ سنن کبریٰ للنسائی و مسند احمد)۔

(حکیم بن حزام نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں مختلف النوع اشیاء کی خرید و فروخت کرتا ہوں تو خرید و فروخت کا کون سا معاملہ میرے لئے حلال ہے اور کون حرام ہے، تو فرمایا کہ جب تم کسی چیز کو خریدو تو اسے قبضہ کرنے سے پہلے مت بیچو)۔

اس قسم کی بھی کئی احادیث ہیں، جن میں طعام کی قید نہیں اور حدیث مطلق ہے، تو بعض ائمہ کرام نے حدیث کے عموم کو باقی رکھتے ہوئے تمام اشیاء میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا اور بعض ائمہ نے ممانعت کو مطعومات کے ساتھ مختص کر دیا، اس لئے اب ہم اس سلسلہ میں فقہاء کے مسلک و نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔

مسلک حنفی:

احناف کے یہاں اس سلسلہ میں احادیث ”معلول بالعلّة“ ہیں، اور علت نبی غرر انفساخ عقد ہے، یعنی یہ ممکن ہے کہ بیع بائع کے پاس رہتے ہوئے ہلاک ہو جائے تو مشتری کا دوسرے سے یہ معاملہ (عقد کا) کالعدم ہو جائے گا، جو باعث غرر ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے غرر کی بیع سے منع فرمایا ہے (مسلم شریف: ۲۱۲)، گویا حدیث میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت مذکورہ غرر کی وجہ سے ہے، چونکہ اشیاء غیر منقولہ میں اس غرر کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے احناف کے یہاں اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی اجازت ہے اور منقولہ میں ممانعت، چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

”من اشترى شيئاً مما ينقل ويحول له يجز له يبعه حتى يقبضه لأنه عليه السلام ”نهي عن بيع الغرر ما لم يقبض“ ولأن فيه غرر إنفساخ العقد على إعتبار الهلاك فيجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف“ (هدایہ ۲، ۵۸)۔  
(اگر کسی نے غیر منقول شئی کو خرید تو قبضہ کرنے سے پہلے اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے غیر مقبوض شئی کی بیع سے منع فرمایا ہے، اور اس میں ہلاکت کے ممکن ہونے کی وجہ سے عقد کے فسخ ہونے کا غرر ہے، تو زمین کی بیع بیخین کے نزدیک قبضہ سے پہلے جائز ہوگی)۔

نیز علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”لا يجوز التصرف في المبيع المنقول قبل القبض بالإجماع، وفي العقار اختلاف“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۳۳)۔ حنفیہ کا اتفاق ہے کہ بیع منقول میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز نہیں ہے، اور زمین میں اختلاف ہے۔

اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ سے پہلے بیع کی اجازت نہیں ہے، نیز بعض اشیاء ایسی ہیں جس میں تخلیہ، جو قبضہ کے حکم میں ہے، کو کافی نہیں سمجھا گیا، وہ یہ ہے کہ اگر کسی کیل، یا وزن کر کے خریدا گیا تو مشتری کو دوبارہ کیل و وزن کئے بغیر بیچنے کی گنجائش نہیں ہے، اگر چہ تخلیہ کے ذریعہ قبضہ ہو گیا ہو (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵، ۲۳۳)، چونکہ حدیث شریف میں دوبارہ کیل و وزن کئے بغیر بیع کے عدم جواز کی صراحت ہے۔

”نهي رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يجري فيه الصاعان صاع البائع و صاع المشتري“ (مجموع الزوائد ۴، ۹۹)۔

”نهي رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يكال“ (مجموع الزوائد ۴، ۹۸)۔

بعض مشائخ نے اس صورت کو غیر معقول امر یعنی تعبدی قرار دیا ہے اور بعض مشائخ نے تخلیہ کو صرف اس مسئلہ میں قبضہ ناقص قرار دیا ہے اور دوبارہ کیل و وزن کو قبضہ تام۔

اب رہی یہ بات کہ بیع مشتری کے ضمان میں کب آتی ہے، اگر مطلقاً قبضہ کے بعد آتی ہے تو عقار کی بیع بھی قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ ”بیع مالہ یضمن“ میں داخل ہو کر ممنوع قرار پائے گی، تو اس سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ اشیاء منقولہ میں سے ہے تو قبضہ سے پہلے وہ مشتری کے ضمان میں نہیں آئے گی، یہی وجہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع ہلاک ہو جائے تو عقد فسخ ہو جاتا ہے اور مشتری اپنا ضمان واپس لے گا اور اگر ضمان ادا نہیں کیا تھا تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوتا ہے (رد المحتار ۵۶۰/۳)، اور اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ سے پہلے ہی وہ مشتری کے ضمان میں آ جاتی ہے، چونکہ بیع کا ہلاک ہونا تقریباً محال کے درجہ میں ہوتا ہے تو کسی قسم کا غرر نہ ہونے کی وجہ سے قبضہ سے پہلے تمامیت عقد کے بعد اس کا مضمون ہونا سمجھا گیا۔

### مسلك شافعیہ مع دلائل:

شافعیہ کے یہاں کسی بھی شی کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے، چاہے منقولہ ہو یا غیر منقولہ، چونکہ ممانعت والی حدیث عام ہے اور اس کی علت حنفیہ کی طرح غرر انفساخ عقد ہے، چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں:

جس چیز پر ملکیت مستقر نہ ہوئی ہو اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے، اس کی دلیل حکیم بن حزام کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں مختلف اشیاء کی بیع کرتا ہوں، تو ان میں سے کون سی بیع میرے لئے حلال ہے اور کون حرام ہے، تو فرمایا کہ غیر مقبوض شی کی بیع جائز نہیں ہے، اور اس لئے کہ اس کی ملکیت اس پر مستقر نہیں ہوئی ہے، تو ممکن ہے کہ بیع ہلاک ہو جائے اور عقد فسخ ہو جائے اور یہ غرر ہے جو بغیر حاجت کے پیش آئی، لہذا جائز نہیں ہے۔ رہے احکام تو ہمارا ہدایت ہے کہ بیع کی قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، چاہے غیر منقول ہو، یا منقول (شرح مہذب ۲۶۳/۹)۔

مسلك حنابلہ مع دلائل:..... حنابلہ کے نزدیک مطعومات کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے، جب کہ وہ مکملی، موزونی، یا معدودی ہو، اس کے علاوہ دیگر اشیاء میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی گنجائش ہے، چونکہ حدیث شریف مطعومات کے ساتھ خاص ہے، رہا مکملی، موزونی اور معدودی کے ساتھ خاص کرنا تو چونکہ ان کے نزدیک یہ تین چیزیں مشتری کے ضمان میں نہیں آتی ہیں، جب تک کہ قبضہ نہ کر لیا جائے اور اس کے علاوہ دیگر اشیاء قبضہ سے پہلے مشتری کے ضمان میں آ جاتی ہیں، نیز ان کے یہاں حدیث معلول بالعلتہ ہے اور وہ حنفیہ کی طرح غرر ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵۷۳/۳، المغنی ۱۱۰/۳)۔

### مسلك مالکیہ:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت مطعومات میں ناجائز ہے، اس کے علاوہ میں جائز ہے، چونکہ حدیث شریف مطعومات کے ساتھ خاص ہے، نیز مطعومات میں بھی عدم جواز اس وقت ہے جب کہ کیل، یا وزن کر کے خریدا گیا ہو، اگر جزافاً خریدی ہوئی ہو تو قبضہ سے پہلے اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہے، چونکہ جزافاً کی صورت میں بیع مشتری کے ضمان میں قبضہ سے پہلے ہی آ جاتی ہے اور اگر خرید کیل و وزن کے ذریعہ ہوئی ہو تو بغیر قبضہ کئے ہوئے بیع ضمان میں نہیں آتی ہے، لہذا قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی صورت میں ”بیع مالہ یضمن“ لازم آئے گا، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ یہ معاملہ ربانسیہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے، اس لئے سد الذرائع اسے ناجائز قرار دیا گیا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۷۳/۳)۔

نیز اثر الدانی میں ہے: غلہ، چاہے ربوی ہو، یا غیر ربوی، کو خریدنے کے بعد اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے اس لئے کہ نبی علیہ السلام نے اس سے منع فرمایا ہے، اور قبل القبض طعام کی بیع کی ممانعت اس وقت ہے جب کہ مشتری نے وزن، یا کیل، یا شمار کر کے خریدا ہو، برخلاف جزاف (کسی چیز کو کیل، یا وزن، یا شمار کئے بغیر فروخت کرنا) کے، چونکہ اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت مشہور قول کے مطابق جائز ہے، اس لئے کہ وہ اس کا مالک عقد کرنے ہی سے ہو گیا، اسی وجہ سے اگر بیع قبضہ سے پہلے تلف ہو جائے تو اس کا ضمان مشتری کی جانب سے ہوگا (اثر الدانی ۳۱۹)۔

### ۱۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا حکم:

شافعیہ کے نزدیک مطلقاً، احناف کے نزدیک اشیاء منقولہ، مالکیہ کے نزدیک مطعومات، جب کہ خرید کیل، یا وزن کر کے ہو، اور حنابلہ کے نزدیک مطعومات اگر معدودی، مکملی، یا موزونی ہو، کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے اور اس کا شمار احناف کے یہاں بیع فاسد میں ہوگا، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بیع باطل میں۔

علامہ عبد الرحمان جزیری فرماتے ہیں: ”الحنفیة قالوا: من البیع الفاسد بیع الاعیان المنقولة قبل قبضها، سواء باعها



لمن اشتراها منه أو لغيره“ (الفقه على المذاهب الاربعه ۲۰۲۱)۔

(حنفیہ کے نزدیک بیع فاسد ہی میں سے اعیان منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ہے، چاہے اس کو اس شخص کے ہاتھ فروخت کرے جس سے خریدا ہے، یا اس کے علاوہ کے ساتھ)۔

اور ڈاکٹر وہب الزحلی فرماتے ہیں:

”وعند غير الحنفية: البيع إما صحيح أو باطل وغير الصحيح لا يفيد الملك أصلاً“ (الفقه الاسلامي وادلتہ ۴۰۴۳)۔

(حنفیہ کے علاوہ کے نزدیک بیع، یا تو صحیح ہے، یا باطل ہے اور غیر صحیح ملک کا بالکل ہی فائدہ نہیں دیتا ہے)۔

۶۔ بندہ کے علم میں فیکٹری سے بھیجا ہوا مال عموماً تین طریقے سے مشتری کے پاس جاتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ مشتری اپنا آدمی گاڑی کے ساتھ خود بھیجے، یا گاڑی نہ ہو، لیکن سامان خریدنے کے بعد کسی کی گاڑی، خواہ بائع ہی کی کیوں نہ ہو، اجرت پر لے لیسی صورت میں گاڑی پر سوار سامان مشتری کے قبضہ میں سمجھا جائے گا تو بیع وغیرہ سے تصرف کرنا درست ہوگا، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشتری کے آرڈر دینے کے بعد بائع ہی کی ذمہ داری ہے کہ سامان اپنی گاڑی سے مشتری تک پہنچائے، تو گاڑی پر سوار سامان بائع کے ضمان میں سمجھا جائے، اگرچہ مشتری اپنے آپ کو ضامن سمجھتا ہو، لہذا حنفیہ کے مذہب کے مطابق مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا (رد المحتار مع الدر المختار ۴/۵۶۳)۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ فیکٹری والا سامان بک کر دے، جس میں بائع ضامن نہیں ہوتا ہے، بلکہ حکومت ہی اپنے ضمان میں لے لیتی ہے، اس صورت میں حکومت بائع کی وکیل ہوتی ہے، وکیل تو اس لئے ہے کہ وہ سامان کو مشتری تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتی ہے، اور بائع کی وکیل اس لئے ہے کہ اگر درمیان سفر بیع میں کسی قسم کی گڑبڑی پیدا ہو جائے، مثلاً ہلاک ہو جائے تو بائع ہی کا حق ہوتا ہے کہ مقدمہ دائر کر کے حکومت سے ضمان لے، مشتری کو کوئی مطلب نہیں رہتا، رہا یہ اشکال کہ وکیل کے پاس سامان بطور امانت رہتا ہے، تو اس سے ضمان نہیں لینا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت اس امانت کی حفاظت پر اجرت لیتی ہے اور جب مودع حفاظت پر اجرت لے تو ہلاک ہونے پر ضامن ہوتا ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

”وأما من جرى العرف بأنه يأخذ في مقابلة حفظه أجره يضمن. لأنه وديع بأجرة لكن الفتوى على عدمه“ (رد المحتار مع الدر المختار ۶/۵۶۲)۔

بہر حال اس عرف کا جاری ہونا کہ سامان کی حفاظت کے مقابلہ میں مودع اجرت لے تو وہ ضامن ہوگا، اس لئے کہ یہ ودیعت بالاجرة ہے، لیکن فتویٰ عدم ضمان پر ہے۔

اگرچہ فتویٰ عدم ضمان پر ہے، تاہم ایک قول یہ بھی ہے کہ مودع کو ضامن ٹھہرایا جائے گا، ساتھ ہی ساتھ حکومت بذات خود اپنے آپ کو ضامن سمجھتی ہے تو اس کا ضامن بننا درست ہوگا۔

اس صورت میں بھی مشتری ضامن نہیں ہو سکتا، اگرچہ اپنے آپ کو ضامن سمجھے، لہذا قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، یہ تفصیلات احناف کے مسلک کے موافق کی گئیں۔

اگر مسئلہ صورت اس ”ضرورت“ کے تحت داخل ہوگئی ہو جو افتاء علی مذہب الغیر کو جائز قرار دے تو مالکیہ کے مسلک پر جواز کی گنجائش ہے، چونکہ ان کے یہاں اگر بیع غائب ہو تو ایک قول کے مطابق بائع ضامن ہوتا ہے اور دوسرے قول کے مطابق مشتری ضامن ہوتا ہے، اور اگر بائع ضمان کی مشتری پر شرط لگا دے تو بہر صورت مشتری ہی ضامن ہوگا، چنانچہ محمد بن رشد قرطبی مالکی فرماتے ہیں:

”قال أبو حنيفة والشافعي: لا يضمن المشتري إلا بعد القبض..... أما المبيع الغائب. فمن مالك في ذلك ثلاث روايات أن الضمان من البائع إلا أن يشترطه على المبتاع والثانية: أنه من المبتاع إلا أن يشترطه على البائع“ (بداية المجتهد ۲۰۱۸۵)۔

امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے فرمایا کہ مشتری قبضہ کرنے کے بعد ہی ضامن ہوتا ہے..... رہی بات بیع غائب کی تو امام مالک سے اس کے متعلق تین



روایات ہیں، پہلی روایت یہ ہے کہ ضمان بائع کی جانب سے ہوگا، سوائے اس کے کہ مشتری پر ضمان کی شرط لگا دے، دوسرا قول یہ ہے کہ ضمان مشتری کی جانب سے ہوگا، مگر یہ کہ بائع پر ضمان کی شرط لگا دے۔

جب بیع مشتری کے ضمان میں آجائے تو قبل القبض بیع کی گنجائش ہے، خواہ وہ طعام ہی کے قبیل سے کیوں نہ ہو۔

”بخلاف الجزاف وهو بيع الشيء بلا كيل ولا وزن ولا عدد فإن بيعه قبل قبضه جائز على المشهور، لأنه قد ملكه بالعقد، ولذا لو تلف قبل قبضه كان ضمانه من المشتري“ (الشمر الدانی ۴۱۹)۔

برخلاف جزاف کے (اور وہ کیل، وزن اور عدد کے بغیر کسی چیز کو فروخت کرنا ہے) کہ اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت مشہور قول کے مطابق جائز ہے، اس لئے کہ وہ عقد کرنے سے اس کا مالک ہو گیا، اسی وجہ سے اگر بیع قبضہ کرنے سے پہلے تلف ہو جائے تو اس کا ضمان مشتری کی جانب سے ہوتا ہے۔

ان عبارات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ مشتری اول کا ضمان بننا صحیح ہے اور ضمان بننے کی وجہ سے قبل القبض بیع کی گنجائش ہے (اگرچہ ضمان بننے کو قبضہ نہیں سمجھا جائے گا)۔

۷۔ حنفی مسلک کے اعتبار سے مذکورہ صورت کی بیع کا عدم جواز ظاہر ہے، خواہ مشتری اول کا ضمان ہی کیوں نہ بن جائے، مالکی مسلک کے اعتبار سے اس کی تفصیل کی جاسکتی ہے کہ اگر مشتری اول سرے سے ضمان ہی نہ ہوا ہو یعنی بیع بائع کے ضمان سے نکلنے کے بعد مشتری اول مشتری ثانی کو ضمان ٹھہرائے تو یہ صورت ”ربح مالہ یضمن“ کے تحت داخل ہو کر ناجائز ہوگی، شاید کہ سوال کا منشاء یہی صورت ہے، اور اگر بیع بائع کے ضمان سے نکلنے کے بعد مشتری اول کے ضمان میں آجائے، لیکن بیع ابھی راستے ہی میں تھی کہ کسی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو مسلک مالکی کے موافق درست ہے، جیسا کہ تفصیل سے چھٹے سوال کے جواب میں گذرا۔



## تیسرا باب مختصر تحریریں

## قبضہ سے پہلے بیع کی شرعی حیثیت

مولانا محمد برہان الدین سنہجلی

- ۱۔ یہ شکل ناجائز ہے اور یہ بیع فاسد ہوگی (جیسا کہ بدائع وغیرہ کی عبارتوں سے مستفاد ہوتا ہے، عبارتیں آگے آرہی ہیں)۔
  - ۲۔ ’قبضہ کے بارے میں کتب فقہ کے اندر جو تعریفیں اور شکلیں ملتی ہیں ان سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ قبضہ کا مدار ’عرف‘ پر ہے، جس چیز کے قبضہ کا جو عرف ہے اس چیز کیلئے شرعاً بھی وہی عمل ’قبضہ‘ کہلائے گا، چنانچہ ’بدائع الصنائع‘ (۵، ۱۳۸) کی عبارت: ”معنی القبض هو التمسکین و التخلی و ارتفاع الموانع عرفاً و عادةً حقیقۃً“ سے یہی مستفاد ہوتا ہے، نیز ”در مختار“ اور اس کی شرح ”رد المحتار“ (۴، ۴۲، ۱۲۳، ۱۶۳) کے مطالعہ سے ’قبضہ‘ کی بہت سی صورتیں سامنے آتی ہیں، اسی طرح باب: ”بیع الفاسد“، ”حبس المبیع لقبض الثمن“ کے مطالعہ سے بھی، اسی میں ایک عبارت یہ ہے: ”هل التخلية قبض؟ صح في الخانية انما قبض وطحن البائنة المحملة بأمر المشتري قبض ... لو أمر البائنة بذبح الشاة (المشترأة فذبحها) فيصير المشتري قابضاً اقتضاء“ (شامی ۴، ۱۲۶)۔  
قبضہ کی ایک شکل کا ذکر سوال (۷) کے ذیل میں آرہا ہے۔
  - ۳۔ اس سوال کا جواب مذکورہ بالا سوال (۲) کے جواب سے نکل آتا ہے۔
  - ۴۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کی کئی وجہیں شراح حدیث و فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتی ہیں، (۱) غرر (۲) انفساخ عقد کا احتمال (۳) مالک غیر کی بیع، بغیر اجازت مالک۔  
اس پر حسب ذیل کتب کی یہ عبارتیں دال ہیں:
- ”أن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك (غرر انفساخ العقد الأول على تقدير هلاك المبيع في يد البائنة) ... والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد و الحديث معلول به (أى معلول بغير انفساخ العقد فيما قبل القبض بهلاك المعقود عليه) ... اشتماله على ربح مال لم يضمن ... والربح على ما لم يضمن منهي عنه شرعاً“ (ہدایہ ثالث مع حاشیہ ۵۸-۵۹)۔
- ”والنهي يوجب فساد المنهي عنه و لأنه يبيع فيه غرر الانفساخ بهلاك المعقود عليه؛ لأنه إذا هلك المعقود عليه قبل القبض يبطل الأول فينفسخ الثاني“ (بدائع ۵، ۱۸۰)۔
- ”بنایہ شرح ہدایہ للعینی“ میں ہے: ”على اعتبار الهلاك“ هلاك المبيع قبل القبض، فتبين أنه باء ملك الغير بغير إذنه و ذلك مفسد العقد“ (۳، ۱۳۷)۔
- ۵۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت اکثر فقہاء کے نزدیک عام ہے، البتہ امام ابوحنیفہؒ و ابو یوسفؒ کے نزدیک غیر منقول اشیاء (جائداد، زمین) اس سے مستثنیٰ ہیں،

نائب صدر، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

اور امام مالک کے نزدیک صرف غلہ کی ”بیع قبل القبض“ ممنوع ہے، بقیہ کی جائز ہے، اور امام احمد کے یہاں تمام مکمل، موزون اور محدود چیزوں کا یہی حکم ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل کتب میں ہے:

”هدایة“: ”يجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف، وقال محمد لا يجوز“ (۲،۵۸)۔

علامہ عینی نے اس پر اضافہ کیا ہے: ”وبه قال الشافعي وزفر وأحمد وأبو حنيفة أولاً“ (النبایہ ۲، ۱۲۷)۔

”فتح القدیر: قال مالك: يجوز جميع التصرفات من بيع وغيره قبل القبض إلا في طعام“ (۵، ۲۶۳)۔

”وقال أحمد: وإن كان المبيع مكيلاً أو موزوناً أو معدوداً لم يجز بيعه قبل القبض وفي غيره يجوز“ (یعنی شرح ہدایہ ۱۳۷۳ طبع نول کشور لکھنؤ)۔

مذکورہ بالا کتب میں ان اقوال کے دلائل بھی مذکور ہیں، تطویل سے بچنے کیلئے یہاں ذکر نہیں کئے جا رہے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ممانعت (بیع قبل القبض) کی وجہ، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، چونکہ بعض روایات میں صرف طعام کا ذکر ہے، اس لئے امام مالک ممانعت کو اسی کے ساتھ مختص کرتے ہیں، لیکن دوسرے ائمہ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات حدیث میں (بالخصوص حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں، اور ان کا فتویٰ بھی یہی ہے) ”بیع مالم یقبض“ عام آیا ہے، اس لئے ممانعت عام ہے، جو ائمہ عقار کا استثناء کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ”قبل القبض“ بیع کی ممانعت کا سبب بیع کے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہے، جس سے بیع اول ہی فسخ ہو جائے گی (اور نتیجہ بیع ثانی بھی) لیکن عقار میں یہ خطرہ نادر ہے۔

جنہوں نے اس ممانعت کو مکمل، موزون اور معدود کے ساتھ مخصوص رکھا ہے انہوں نے، طعام، والی روایت پر قیاس کیا ہے۔

۶۔ دوسرے شخص کے ہاتھ بیع کو ناجائز قرار دیا جائے گا، کیونکہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت کی وجہ تنہا ”بیع مالم یضمن“ نہیں ہے (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)، بلکہ اس کی کئی وجوہ ہیں، مشہور قاعدہ ہے کہ ”کئی وجوہ میں سے صرف ایک وجہ کے مرتفع ہو جانے سے حکم مرتفع نہیں ہوتا“ (جب تک تمام وجوہ مرتفع نہ ہوں حکم برقرار رہتا ہے)، بلکہ ہلاک بیع سے تو اس احتمال کا وقوع ہو گیا جس کی وجہ سے یہ عقد (بیع ثانی) ممنوع کیا گیا تھا، مقام غور ہے کہ جس وجہ کا احتمال موجب فساد تھا تو اس کا وقوع موجب فساد کیوں نہ ہوگا؟

ہاں! ”در مختار“ اور اس کی شرح ”رد مختار“ کی ایک عبارت: ”منه (من القبض) مالو اشتری (هنا و دفعه قارورة یزنه فیها فوزنه فیها بحضرة المشتري فهو قبض و كذا بغيبته فی الأصح و كذا كل موزون إذا دفع له الوعاء فكاله أو وزنه فیها بأمره“ (۲، ۲۲) سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اگر وہ جہاز جس پر سامان لادا گیا ہے (بعد میں سامان ہلاک ہو گیا) مشتری نے اسے مہیا کیا تھا تو اس صورت میں ”بیع“ پر مشتری کا قبضہ ہو گیا، لہذا اس کا بیع ثانی کرنا شرعاً درست ہوا، لیکن چونکہ بائع ثانی کے قبضہ (یعنی مشتری اول کے قبضہ) میں ہی وہ سامان ہلاک ہو گیا، لہذا اس کا ذمہ دار مشتری اول ہی ہوا، مشتری ثانی یا فیکٹری ذمہ دار نہ ہوگی۔

۷۔ تیسرے شخص کے ہاتھ بیع (تیسری بیع) تو بلاشبہ۔ اور غالباً اختلاف۔ ناجائز ہوگی، بلکہ منعقد ہی نہ ہوگی، دوسری بیع یا دوسرے شخص کے ہاتھ بیع (قبل القبض) کا حکم تو اوپر بالتفصیل مذکور ہی ہو چکا ہے کہ ناجائز ہے، باوجود اس کے اگر بیع کی تو یہ بیع فاسد ہوگی جس کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں، مزید ایک عبارت ”رد المحتار“ کی پیش کی جاتی ہے، جس سے اس بیع کا فاسد ہونا ہی مفہوم ہوتا ہے: ”ولو اشتری ثوباً أو حنطة فقال للبائع: بعه، قال الإمام الفضلی: إن كان قبل القبض والرؤية كان فسحاً، وإن لم يقل البائع: نعم... وإن قال: بعه لی أي کن وکیلاً فی الفسخ فما لم يقل البائع لا یكون فسحاً“ (۲، ۲۲)۔

☆☆☆



## اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کا تعین

مفتی محبوب علی وجیہی ۱

- ۱۔ منقولات میں قبضہ سے پہلے بیع فاسد ہے، اس لئے کہ منقولات میں قبضہ شرط ہے، بیع کی حقیقت نہیں ہے۔
- ۲۔ قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ مشتری کا بیع پر تصرف و قبضہ ہو جائے، خواہ حقیقی ہو یا حکمی، بظاہر شریعت نے قبضہ کی کوئی خاص صورت معین نہیں کی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بیع کی نوعیتوں میں فرق ہے، اس کے لئے کوئی صورت معین نہیں کی جاسکتی، اس لئے قبضہ کی صورتیں بھی الگ الگ ہیں، زمین بوروں اور بکسوں میں نہیں بھری جاسکتی، اس کا قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری کا اس میں قفل لگوا دے، اپنا سامان اگر اس میں ہو تو نکال لے، اس لئے شریعت مطہرہ نے نہ اس کی کوئی خاص صورت متعین کی اور نہ کوئی ایک طریقہ مقرر فرمایا، بلکہ عرف کے مطابق ایسا عمل جو مشتری کے اس پر غلبہ کو بتائے اور مشتری کو بیع میں تصرف کرنے میں کوئی مانع پیش نہ آئے، بلکہ آزادانہ طور سے مشتری اس میں حسب منشاء تصرف کر سکے اور بائع کے اموال سے اس کو امتیاز حاصل ہو جائے اسی کو قبضہ مان لیا ہے۔
- ۳۔ منقول چیزوں میں قبضہ کا طور طریق غیر منقول سے جدا ہے، دونوں کی نوعیت ایک نہیں ہے۔
- ۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی احادیث معلول ہیں، بعض چیزوں میں ربایا شبہ کے داخل ہونے سے محفوظ رکھنا ہے، اور بعض چیزوں میں غرر اور دھوکہ سے مشتری کو بچانا مقصود ہے۔
- ۵۔ قبضہ سے پہلے بیع کی ممانعت عام نہیں ہے، اسی لئے ائمہ مجتہدین اور اکابر علماء کا اس میں اختلاف ہے، ”بدایۃ المجتہد“ میں علامہ اندلسی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

”أما بیع ما سوی الطعام قبل القبض فلا خلاف فی مذہب مالک فی إجازته، وأما الطعام الربوی فلا خلاف فی مذہبه أن القبض شرط فی بیعه، وأما أبوحنیفہ: فالقبض عنده شرط فی بیعه ما عدا المبیعات التي لا تنتقل ولا تحول من الدور والعقار، وأما الشافعی: فان القبض عنده شرط فی کل بیعه، وبه قال الثوری“۔ اور آگے اسی میں ہے: ”وقال أبو عبید و إسحاق: کل شیء لا یقال ولا یوزن فلا بأس بیعه قبل قبضه فیتحصل فی اشتراط القبض سبعة أقوال، الأول فی الطعام الربوی فقط، الثانی فی الطعام بإطلاق، الثالث فی الطعام المکیل والموزون، الرابع فی کل شیء ینقل، الخامس فی کل شیء، السادس فی المکیل والموزون، السابع فی المکیل والموزون والمعدود“۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں قبضہ شرط نہیں ہے، بلکہ مستثنیات بھی ہیں، اس کے دلائل یہ ہیں: ”لا یحل بیع و سلف و لا ربح فی ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندک“ اور عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے: ”أن رسول اللہ ﷺ قال: من ابتاع طعاما فلا بیعه حتی یقبضه“

اس سے معلوم ہوا کہ جو بیع مشتری کی ضمان میں داخل نہیں ہوا اس کو فروخت کر کے نفع کمانا جائز نہیں، جب اس کی ضمان میں داخل ہو جائے تب اس کا قبضہ اور اس کا تصرف صحیح ہوگا، مگر یہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف منقولات میں ہے، اور غیر منقولات میں ضائع ہونے کا خطرہ نہیں ہے، اس لئے

۱۔ دارالعلوم فرقا نیہ، انگریزی باغ، راجپور۔

حکماً مشتری کی ضمان اور قبضہ میں مان لیا جاتا ہے، کیونکہ قبضہ حسی بھی ہوتا ہے اور حکمی بھی، امام صاحب کے نزدیک قبضہ کے لئے تخلیہ کافی ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے: ”ثم التسليم يَكُونُ بالتخلية على وجه يتمكن من القبض“، اور رد المحتار میں ہے: ”ولو اشترى حنطة في بيت و دفعه البائع المفتاح إليه، وقال: خلعت بينك وبينها فهو قبض“۔

۶۔ میں نے یہ تحریر کیا ہے کہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) حسی (۲) حکمی، ضمان میں بیع کا داخل ہونا قبضہ حکمی کے اندر داخل ہے، اس لئے خریدار نمبر (۲) کے ہاتھ بیع حکماً قبضہ ہو جانے کی وجہ سے صحیح ہے، جیسے بائع بیع کو ایک کوٹھری میں رکھ کر مشتری سے کہے کہ میں نے بیع کو کوٹھری میں رکھ کر بند کر دیا اور میں نے بیع اور تمہارے درمیان تخلیہ کر دیا تو مشتری کا حکماً قبضہ ہو جائے گا۔

۷۔ جب ضمان کو ہم نے حکماً قبضہ تسلیم کر لیا تو پہلے بائع نے مال جہاز پر چڑھا دیا اور مال جہاز پر چڑھانے کے بعد یہ مشتری جس کا مال ہے اس کا ضامن ہو گیا تو حکماً اس مال پر اس کا قبضہ ہو گیا، اور جب اس کا قبضہ ہو گیا تو اس کے فروخت کرنے کا بھی حق اس کو حاصل ہو گیا، اور جب اس نے دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تو اس کی ضمان سے نکل کر اس کی ضمان میں داخل ہو گیا، اور ضمان میں داخل ہونے کے ساتھ قبضہ بھی حکماً تسلیم کر لیا گیا، لہذا یہ بیع درست ہو گئی اور یہ صورت شرعاً درست ہو گئی۔

☆☆☆

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شرعی حکم

مولانا زبیر احمد قاسمی

عنوان بالا کے تحت سوالوں کے جوابات علی الترتیب حسب ذیل ہیں:

۱۔ کسی بیع پر قبضہ کئے بغیر اس میں ہبہ، صدقہ، اجارہ اور بیع وغیرہ جیسا کوئی بھی تملیکی تصرف کرنا شرعاً ناجائز ہے، گویہ عاقد ثانی جو مشتری اول ہے سابق ثراء صحیح کے سبب اس بیع کا مالک ہو چکا ہے، مگر قبل القبض اس کیلئے وہ بیع غیر مقدور التسلیم ہے، اس لئے اس کا یہ دوسرا تصرف بیع وغیرہ تصرف فاسد کہلائے گا "لفوات شرط من شرائط الصحة"۔ باطل نہیں ہوگا، لوجود شرائط انعقاد العقد من الأهلية والمحلية۔

۲۔ "لا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة وحقيقة" (بدائع ۵۰۱۳۸، پاکستان) وقوله: (بلا مانع) بأن يكون مفرزاً غير مشغول بحق غيره، وفي الملتقط: ولو باء دارا وسلمها إلى المشتري وله فيها متاع قليل أو كثير لا يكون تسليمها حتى يسلمها فارغة وكذا لو باء أرضاً وفيها زرع" (شامی ۴۰۴۳، بیروت)۔

مذکورہ بالا فقہی نصوص سے واضح ہے کہ قبضہ کے تحقق کے لئے ہاتھ میں لینا کوئی ضروری شرط نہیں صرف بیع و مشتری کے درمیان تخلیہ اور تمام موانع کو اس طرح اٹھادینا کافی ہے جس کے بعد ہاتھ میں لینے سے کوئی چیز، یا کوئی شخص اسے روک نہ سکے، اگر بلا ہاتھ میں لئے کسی خاص قسم کے اسٹیلاء اور عمل و دخل اور عہد و معاہدہ کے سبب وہ شی مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے، چنانچہ ہلاکت بیع کے بعد بوجہ معاہدہ اس کا ضمان مشتری پر لازم آتا ہے، اور عرفاً، عادتاً اس طرح کے داخل فی الضمان ہونے کو قبضہ سمجھا جاتا ہے تو "الثابت بالعرف كالثابت بالنص" کے مد نظر اسے شرعاً قبضہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۳۔ اشیاء مبیعہ، خواہ منقولہ ہوں، یا غیر منقولہ دونوں میں اس طرح کا تخلیہ کہ وہ حق غیر میں مشغول بھی نہ ہوں اور بلا تکلف بلا کسی کی مدد و تعاون کے اس پر قبضہ بالبراجم ممکن ہو جائے تو بس شرعاً قبضہ کا تحقق ہو جائے گا۔

"لو باء داراً وسلمها إلى المشتري وفيها متاع لا يكون تسليمها حتى يسلمها فارغة، وكذا لو باء أرضاً وفيها زرع" (شامی ۴۰۴۳)، ولو اشترى طيراً وفرساً في بيت وأمره البائع بقبضه ففتح الباب فذهب إن أمكنه أخذه بلا عون كان قبضاً، وتامه في البحر وحاصله أن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة" (ایضاً)۔

۴۔ "بیع قبل القبض" کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں، اور وہ علت غرر و خطر ہے، کیونکہ اگر بیع ہلاک ہوگئی تو پہلا ہی عقد بیع فسخ ہو جائے گا اور نتیجتاً اس پر مبنی دوسرا عقد بھی فسخ ہوگا، اس طرح قبل القبض بیع ثانی جب ہوگی تو مشتری ثانی کیلئے غرر بھی ہوگا اور اس کی ملکیت متردد بین القرار والزوال بھی ہوگی۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: "فلا يصح بيعه قبل القبض قد نهي رسول الله ﷺ عن بيع ما لم يقبض... لأنه بيع فيه غرر الانفساخ بهلاك المعقود عليه وقد نهي عنه الخ" (بدائع ۵۰۱۸۰)۔

۵۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی چیز پر کسی شخص کی ملکیت کا ثبوت مختلف عقود و تصرفات اور متعدد اسباب کے نتیجے میں ہوا کرتا ہے، مثلاً بیع، ثراء، ہدیہ، صدقہ، قرض، نکاح، خلع، وصیت وراثت وغیرہ، یہ سارے ہی کے سارے اسباب ملک ہیں، اب اگر سوال کا اصل مقصد صرف اتنا ہے کہ محض عقد بیع و ثراء کے ذریعہ جو چیز کسی کی ملکیت میں داخل ہوتی ہے، اس کی بیع قبل القبض، یا اس میں دیگر تملیکی تصرف بھی، مثلاً ہدیہ، ہبہ، قرض، رہن وغیرہ جو شرعاً قبل القبض ممنوع ہیں تو یہ ممانعت

ط ناظم، اشرف العلوم، کہنواں، سینٹا مرھی۔



عام ہے، یا اس میں استثناءات و تخصیصات بھی ہیں؟ تو اس کا جواب بڑا مختصر ہو سکتا ہے کہ یہ ممانعت خاص ہے اشیاء منقولہ کے ساتھ عند الشیخین، باقی غیر منقولہ میں یہ سارے تصرفات قبل القبض بھی جائز ہیں اور ممانعت سے مستثنیٰ ہیں، لعدم امکان الغرر۔

لیکن امام محمد، زفر اور امام شافعی علیہم الرحمۃ اس ممانعت کو عام ہی رکھتے ہیں، چونکہ احادیث نہیں ہیں ”مالم یقبض“ مطلق و عام ہے، اس مسئلے سے متعلق فریقین کے تفصیلی دلائل اور جوابات کیلئے دیکھا جائے (بدائع ۱۸۱/۵) اور دیگر کتب متداولہ۔

پھر حضرات شیخین تو صرف معقود علیہ کے منقول و غیر منقول ہونے پر نظر رکھتے ہوئے حکم ممانعت میں تخصیص پیدا کرتے ہیں، جبکہ امام محمد علیہ الرحمۃ تصرف ثانی کی نوعیت پر بعض وقت نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معقود علیہ، خواہ منقول ہو، یا غیر منقول اگر قبل القبض ایسے تصرفات کئے جائیں جو ”لا تتم بدون القبض“ کے قبیل سے ہوں، مثلاً ہبہ، صدقہ، قرض، رہن وغیرہ تو پھر یہ سارے تصرفات تملیکی جائز ہوں گے اور یہ حکم ممانعت سے مستثنیٰ ہی ہوں (تفصیلات کیلئے دیکھا جائے: شامی ۱۶۲/۳-۱۶۳)۔

لیکن اگر سوال کا مقصد اس سے وسیع تر ہے تو ظاہر ہے کہ پھر مستثنیات کی حدیں اور تعداد اس سے زائد بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ تصرفات قبل القبض کی ممانعت اور اس کے اندر استثناء و تخصیص میں کبھی اسباب ملک کے تنوع و اختلاف کو دخل ہوتا ہے، تو کبھی خود تصرف کی نوعیت کو اور کبھی عوض و معقود علیہ کی نوعیت کو، کما فی المنقول و غیر المنقول جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) مثلاً اسباب ملک میں سے بعض عقد معاوضہ ہلاکت عوض کے وقت قابل فسخ و انفساخ ہوتے ہیں، جیسے بیع و شراء ہے، اس عقد کے ذریعہ جو عاقدین عوضین کے مالک بنتے ہیں ان عوض پر قبل القبض تصرف کی ممانعت اور ان میں استثناء و تخصیص کی تفصیلات مع اختلاف ائمہ احناف اور مع دلائل ابھی اوپر مذکور ہوا ہے کہ حضرات شیخین سارے تصرفات کو (بیع، ہبہ، صدقہ، رہن، قرض وغیرہ) کو ناجائز کہتے ہیں، استثناء صرف غیر منقولہ کا کرتے ہیں، جبکہ امام زفر اور امام شافعی غیر منقولہ کا بھی استثناء نہیں کرتے، ہاں امام محمد حکم ممانعت سے ان تصرفات کا ضرور استثناء کرتے ہیں جو بدون القبض تام ہی نہیں ہوا کرتے، کما مر (ایضاً)۔

(ب) بعض اسباب ملک ایسے عقد معاوضہ ہوتے ہیں جو ہلاکت عوض کے باوجود فسخ و انفساخ کو قبول نہیں کیا کرتے، مثلاً نکاح، خلع، عتق علی المال، صلح عن دم العمد، ان عقود میں عورت مہر کی، شوہر بدل خلع کا، مولیٰ بدل عتق کا، اور مقتول کا وارث بدل صلح کا مالک بنا کرتا ہے، اور یہ ایسے عقود ہیں کہ ہلاکت عوض (مہر، بدل خلع، بدل عتق، بدل صلح) کے باوجود فسخ نہیں ہوا کرتے، اب یہ سارے عوض اگر قبیل اعیان ہوں، نہ کہ از دیون، تو ان عوضوں پر قبضہ کئے بغیر سارے تصرفات تملیکی (بیع، ہبہ، صدقہ، قرض، رہن وغیرہ) جائز ہیں، گوانعقاد تصرف اور صحت تصرف ہی کی حد تک، نہ کہ نفاذ و لزوم تصرف کی حد تک، گویا اس صورت میں یہ سبھی تصرفات باتفاق ابی یوسف و محمد حکم ممانعت سے مستثنیٰ ہیں۔

(ج) اسی طرح بعض سبب ملک ایسے ہوتے ہیں جو عقد معاوضہ کے قبیل سے نہیں، بلکہ مالک اول کی نیابت و خلافت کے طور پر اس کا کوئی مالک بن جاتا ہے، جیسے ارث و وصیت، کہ وارث نیابت و خلافت عن المورث ترکہ میں سے بقدر حق شرعی مال کا مالک ہو جاتا ہے، اور موصیٰ بقدر وصیت موصیٰ کے مال موصیٰ بہ کا مالک ہو جاتا ہے، اب یہ وارث و موصیٰ لہ اپنے میراث اور مال موصیٰ بہ میں قبل القبض سارا تصرف کر سکتا ہے ”لان معنی الغرر لا يتقرر فيه؛ لان الوارث خلف المیت فی ملث المورث الخ“ (بدائع ۱۸۱/۵)۔

شق الف وب میں درج تفصیلات کے دلائل (شامی ۱۶۲/۳-۱۶۳) میں دیکھے جائیں۔

(د) اسی طرح بعض تصرفات جو قبل القبض کئے جاتے ہیں وہ خود تصرف ہی ناقابل فسخ ہوتے ہیں، مثلاً اعتاق و تدبیر وغیرہ، ایسے تصرفات بھی باتفاق علماء احناف حکم ممانعت سے مستثنیٰ ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی غلام کا مالک بنے، خواہ اس عقد کے ذریعہ جو قابل فسخ ہوتے ہیں (بیع و شراء)، یا اس عقد کے ذریعہ جو قابل فسخ ہی نہیں ہوا کرتے (مثلاً نکاح، خلع وغیرہ) تمام صورتوں میں قبل القبض اس غلام کے اندر مالک کا تصرف اعتاق و تدبیر جائز ہی ہو جاتا ہے، (شامی ایضاً) واضح ہو کہ تصرفات قبل القبض کی اجازت و ممانعت کے متعلق ائمہ احناف کے علاوہ دیگر حضرات ائمہ رحمہم اللہ کے مذہب و مسلک کی تفصیلات کی ہمیں کوئی تحقیق اور علم نہیں۔

۶۔ حرم الربوا، الخراج بالضم، اور ”الغنم بالغرم“ جیسے نصوص قطعیہ و شرعیہ اور قواعد فقہیہ کی روشنی میں میرا ایک عرصہ سے یہی خیال ہے کہ دراصل شریعت اسلامیہ ان منافع و فوائد کو جائز نہیں کہتی جو بلا کسی ادنیٰ رسک کے اور کسی بھی نقصان کی کوئی ذمہ داری قبول کئے بغیر حاصل کئے جائیں۔

بعد القبض بیع سے منافع حاصل کرنا اسی لئے شرعاً جائز ہوتا ہے کہ وہ بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے، گویا قبضہ کر کے وہ مشتری قابض ایک رسک لے لیتا ہے، اسی طرح بظاہر قبضہ حسی نہ ہو، مگر بائع و مشتری کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ بیع کے حمل و نقل اور ارسال کے بعد وہ مشتری کے ضمان میں داخل سمجھی جائے گی تو یہ مشتری مال کی ہلاکت کے نقصان کا رسک لے لیتا ہے تو اسے حکماً مقبوضہ ہی کہنا چاہئے، کیونکہ اصل مقصد قبضہ حسی کا وہی دخول فی الضمان ہی ہے، جو بیع کے ارسال و تخلیہ اور حمل و نقل کے بعد اس معاہدہ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

اس لئے ایسی صورت میں اس کی بیع و شراء کو بعد القبض ہی قرار دینا چاہئے اور منافع کو جائز ہی ہونا چاہئے، کیونکہ یہ ربح مال مضمون ہوگا، نہ کہ ربح مال مضمون۔ اس کے علاوہ عرصہ سے میرا یہ بھی خیال ہے کہ بیع غیر مقبوضہ کی بیع و شراء کا حکم جو فساد عقد سے بیان کیا جاتا ہے، یہ حکم محض قضائی ہے جو کسی بھی سبب سے باہمی نزاع کے ”مرافعہ الی القاضی“ کے نتیجے میں اس بیع غیر مقبوضہ کے متعلق قاضی شریعت کا حکم و فیصلہ ہوگا۔

لیکن اگر ”بیع قبل القبض“ کے باوجود عاقدین میں کوئی نزاع نہیں ہو، دونوں اپنی اپنی جگہ معاملہ کی اس نوعیت پر راضی و مطمئن رہے اور بالآخر اپنے اپنے حق تک پہنچ گئے تو ایسے معاملہ کے جواز و صحت اور نفاذ و لزوم ہی کا فتویٰ دینا بیجا جانا چاہئے۔

ساتھ ہی ساتھ کتب فقہ میں جو عموماً احکام قضاء ہی پر مشتمل ہیں، جب بعض عقود کے متعلق بعض صورتوں میں اولاً فساد، پھر وجوہ فساد کے زوال کے بعد صحت و جواز کا حکم لگاتے ہوئے یوں بھی لکھا ہوا ملتا ہے کہ: ”ان عقد فاسداً وانقلب جائزاً“ تو اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہو رہی ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا قرائن و شواہد پر ہماری رائے یہی ہے کہ اگر کوئی شخص بذریعہ فون و فیکس، یا بالمشاہدہ کسی فیکٹری سے مال کی خریداری کرے اور یہ معاہدہ ہو جائے، جب فیکٹری مال کے نقل و حمل اور روانگی کا کام انجام دیدے گی تو اس کے بعد وہ مال مشتری کے ضمان میں داخل سمجھا جائے گا، پھر اس کے بعد وہی مال براہ راست فیکٹری سے خریدار (۲) کے پاس بھجواتا ہے تو اس معاملہ کو بھی جائز اور خریدار (۱) کے منافع کو بھی حلال ہونا چاہئے، کیونکہ مال کی روانگی کے بعد ہی وہ خریدار (۱) کے ضمان میں داخل ہو گیا اور بجائے خریدار (۱) کے خریدار (۲) کے پاس اس کے پتے اور راستے سے بھیجنا یہ فیکٹری کا عمل من جانب خریدار (۱) تو کیلئے یا تبرعاً ہوا۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت کا معروف اصول و ضابطہ، یا تاجروں کے درمیان مشروط معاہدہ یہی ہو کہ جہاز پر مال چڑھادینے کے بعد وہ مال بائع کے قبضہ و ضمان سے نکل کر مشتری کے قبضہ و ضمان میں داخل سمجھا جائے گا، تو یہ مال حکماً خریدار اول کا مقبوضہ بن گیا، اس کا کسی دوسرے خریدار کے ہاتھ فروخت کرنا تو صحیح ہوگا، لیکن مال سمندر ہی میں اگر ضائع ہو جائے تو اسے خریدار (۱) ہی کے ضمان میں ہلاک شدہ سمجھا جائے گا۔

خریدار (۲) کے ضمان میں داخل ماننے کی کوئی وجہ اور بنیاد نہیں، اگر زبانی معاہدہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تاہم اس معاہدہ کے بعد خریدار (۱) کی طرف سے مال کے حمل و نقل تخلیہ و رفع موانع وغیرہ کے قبیل کا کوئی عمل صادر نہیں ہوا ہے، اس طرح اس مال کو جہاز کے اندر رہتے ہوئے خریدار (۲) کے ضمان میں داخل کرنا جائز نہیں ہوگا۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

مولانا شمس پیرزادہؒ

۱۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت شرعی اعتبار سے:

ترمذی کی حدیث ہے، حکیم بن حزام کہتے ہیں: ”سألت رسول الله ﷺ فقلت يأتييني الرجل فيسألني من البيعة ما ليس عندي، أبتاع له من السوق ثم أبيعها قال: لا تبع ما ليس عندك“ (ترمذی أبواب البيوع)۔ (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی شخص آتا ہے اور ایسی چیز کا سودا طلب کرتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی، کیا میں اس کے لئے بازار سے خریدوں اور پھر اس کو فروخت کروں؟ فرمایا: جو چیز تمہارے پاس نہیں ہے وہ نہ بیجو)۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قبضہ سے پہلے مال فروخت کرنا جائز نہیں، فقہاء بھی عام طور سے اس کو جائز نہیں قرار دیتے، ”بدائع الصنائع“ میں ہے:

ومنها القبض في بيع المشتري المنقول فلا يصح بيعه قبل القبض (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۰)۔

(اور منقولہ مال کی بیع میں قبضہ ضروری ہے، قبضہ سے پہلے اس کی بیع صحیح نہیں)۔

اور ”فقہ السنہ“ میں ہے: ”أما التصرف بالبيع قبل القبض، فإنه لا يجوز، إذ يحتمل أن يكون هلك عند البائع الأول، فيكون بيع غرر، وبيع الغرر غير صحيح سواء أكان عقاراً أم منقولاً وسواء أكان مقدراً أم جزافاً“ (فقہ السنہ للسید سابق ۶، ۲)۔

(قبضہ سے پہلے بیع میں تصرف جائز نہیں، کیونکہ اس میں بائع اول کے پاس مال کے ہلاک ہونے کا احتمال ہے اور ایسی صورت میں یہ بیع غرر ہوگی اور بیع غرر صحیح نہیں، خواہ وہ غیر منقولہ کی، بیع ہو یا منقولہ چیزوں کی اور خواہ اس کی مقدار معلوم ہو یا تخمینہ سے ہو)۔

بعض فقہاء نے منقولہ اور غیر منقولہ میں تفریق کی ہے، اور غیر منقولہ کی فروخت قبضہ سے پہلے جائز قرار دی ہے:

”وأما بيع المشتري العقار قبل القبض فجائز عند أبي حنيفة وأبي يوسف استحساناً“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۱)۔

(رہی خریدنی ہوئی غیر منقولہ کی قبضہ سے پہلے بیع تو وہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک استحساناً جائز ہے)۔

اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ غیر منقولہ میں اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا، اس لئے اس میں غرر بھی نہیں ہوتا۔

اور مالکی مسلک میں تو اس سے زیادہ وسعت ہے: ”وأما بيع ما سوى الطعام قبل القبض فلا خلاف في مذهب مالك في إجازته“ (بدایۃ المجتہد ۲، ۱۲۳)۔ (جہاں تک غذائی اشیاء کے ماسوا کی قبضہ سے پہلے بیع کا تعلق ہے تو امام مالک کے مسلک میں اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے)۔

حدیث میں بیع سلم کو جائز قرار دیا گیا ہے، جبکہ مال کی صفات معلوم ہوں، حالانکہ بیع سلم میں فروخت کیا جانے والا مال بائع کے پاس موجود نہیں ہوتا، مگر ضرورت اور تعامل کے پیش نظر اس کی اجازت دی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے، لیکن اس میں کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں، جبکہ اس میں کوئی غرر نہ ہو، اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مروجہ



کاروباری طور طریقوں میں جہاں ضرورت متقاضی ہے اور غرر کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر ہے اور بائع کی طرف سے ضمانت بھی ہے تو ایسی صورت میں بیع قبل قبض کی اجازت ہوگی، اگر اس بیع کو ناجائز سمجھا جائے تو اس کا شمار بیع فاسد میں ہوگا، لیکن مالکیہ کے ہاں بعض صورتوں میں اس پر صحت کا حکم لگانے کی بھی گنجائش ہے:

”وربما صح عنده بعض البيوع الفاسدة بالقبض لخفة الكراهة عنده في ذلك“ (بدایۃ المجتہد ۲: ۱۸۲)۔  
(اور بعض صورتوں میں امام مالک کے نزدیک فاسد بیع قبضہ کے بعد صحیح ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس میں کراہت ہلکی ہے)۔

## ۲۔ شریعت میں قبضہ کی حقیقت:

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ”فالقبض مرجعه إلى عرف الناس حيث لم يكن له حد في اللغة ولا في الشرع“ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲: ۲۵۰)۔ (قبضہ کا مرجع عرف ہے، اس کی حد نہ لغت میں متعین ہے اور نہ شرع میں)۔

لہذا عرف و عادت کے مطابق قبضہ کا جو تصور ہوگا اس کو شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا، الا یہ کہ کوئی بات کسی نصی حکم کے خلاف ہو۔

جدہ کی ”منظمۃ المؤتمر الاسلامی“ کی مجلس ”مجمع الفقہ الاسلامی“ منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء نے قبضہ کے سلسلہ میں نئی صورت حال کے پیش نظر جو قرارداد منظور کی ہے اس میں کہا ہے کہ: ”قبض الأموال كما يكون حسيًا في حالة الأخذ باليد أو الكيل أو الوزن في الطعام، أو النقل و التحويل إلى حوزة القابض، يتحقق اعتبارًا و حكمًا بالتخلية مع التمكّن من التصرف ولو لم يوجد القبض حسا و تختلف كيفية قبض الأشياء بحسب حالها و اختلاف الأعراف فيما يكون قبضًا لها“۔

(مال کا قبضہ جس طرح حسی ہوتا ہے غذائی اشیاء میں ہاتھ سے لینے یا ناپ کر یا تول کر لینے میں یا نقل و تحویل کے ذریعہ قبض کے اختیار میں آجانے سے، اسی طرح تصرف کے اختیار کے ساتھ تخلیہ کر دینے سے اعتباراً و حکماً متحقق ہوتا ہے، اگرچہ حسی قبضہ نہ پایا جاتا ہو، اور اشیاء کے قبضہ کی کیفیت مختلف ہوتی ہے ان کے حال کی مناسبت سے قبضہ کے تعلق سے عرف کے مختلف ہونے کی بنا پر)۔

## ۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت:

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک غیر منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، ”بدائع“ میں ہے: ”بيع المشتري العقار قبل القبض فجائز عند أبي حنيفة و أبي يوسف استحساناً“۔ (خرید شدہ غیر منقولہ امور کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک استحساناً)۔

اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے صاحب ”بدائع“ لکھتے ہیں: ”ولأن الأصل في ركن البيع إذا صدر من الأصل في المحل هو الصحة والامتناع لعارض غرر انفساخ العقد بهلاك المعقود عليه و لا يتوهم هلاك العقار فلا يتقرر الغرر فبقي بيعه على حكم الأصل“ (بدائع الصنائع ۵: ۱۸۱)۔ (یہ اس لئے کہ بیع کے رکن کی اصل صحت ہے، جبکہ وہ اصل بیع سے صحیح مقام پر صادر ہو، اور ممانعت اس بنا پر ہے کہ مال کے تلف ہو جانے سے عقد کے فسخ ہو جانے کا غرر (خطرہ) ہے، لیکن غیر منقولہ اشیاء کے تلف ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا، اس لئے اس میں غرر (خطرہ) نہیں ہے، لہذا ان کی بیع اصل حکم پر برقرار ہے)۔

اور مالکیہ کے مسلک میں بہت وسعت ہے: ”يصح للمشتري أن يتصرف في المبيع قبل قبضه بالبيع سواء كان المبيع أعياناً منقولة أو أعياناً ثابتة كالأرض و النخيل و نحوهما إلا الطعام كالقمح و الفاكهة فإنه لا يصح بيعه قبل قبضه“ (کتاب الفقہ علی المذاهب الأربعة ۲: ۲۳۵)۔ (خریدنے والے کیلئے جائز ہے کہ وہ قبضہ سے پہلے خریدے ہوئے مال میں تصرف کرے خواہ مال منقولہ اشیاء میں سے ہو یا غیر منقولہ ہو جیسے زمین اور کھجور کے درخت وغیرہ، بجز غذائی اشیاء کے، مثلاً گہیوں اور پھل، کہ ایسی چیزوں کی بیع قبضہ سے پہلے صحیح نہیں)۔

اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں: ”لأنها بمجرد العقد تكون في ضمان المشتري فهي في حكم المقبوضة“ (حوالہ مذکور)۔ کیونکہ مجرد عقد سے یہ چیز خریدار کی ضمانت میں آ جاتی ہے اس لئے وہ قابض شدہ کے حکم میں ہے۔

راقم سطور کی رائے میں موجودہ زمانہ کے کاروباری عرف کو سامنے رکھنے اور قبضہ کے تصور میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

## ۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق احادیث:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں اور ان کی علت غرر (خطرہ) ہے، اور خاص طور سے یہ بات کہ خریدار جب مال کا ضامن نہیں ہے تو اس پر نفع کمانے کا اس کو کیا حق ہے، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے: ”ولا ربح مالہ یضمن“ (ترمذی أبواب البيوع)۔ (جس مال کی ضمانت نہیں لی گئی اس پر نفع حاصل کرنا درست نہیں)۔

لیکن اگر موجودہ تجارتی سسٹم میں خریدار مال کا قبضہ سے پہلے ضامن بنتا ہے اور غرر کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر رہتا ہے اور ضرورت بھی اس طرح کے معاملہ کی متقاضی ہے تو قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

## ۵۔ ممانعت عام ہے یا اس میں کچھ استثناءات ہیں:

اس کا جواب اوپر گزر چکا، مزید یہ کہ فقہانہ میں ہے: ”ویستثنی من هذه القاعدة جواز بيع أحد النقدين بالآخر قبل القبض فقد سأل ابن عمر رسول الله ﷺ عن بيع الإبل بالدنانير وأخذ الدراهم بدلا منها فأذن له“ (فقہ السنۃ للسید سابق ۶۸، ۲)۔ (اس قاعدہ سے مستثنیٰ ایک نقدی کی دوسری نقدی کے ساتھ قبضہ سے پہلے بیع ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا اونٹ کو دینار کے عوض بیچنے سے اور ان کے بدل کے طور پر درہم لینے سے متعلق، تو آپ نے ان کو اس کی اجازت دی۔ معلوم ہوا کہ کچھ مستثنیٰ صورتیں بھی ہیں)۔

## ۶۔ بائع اس کے ضامن ہونے کی صورت میں قبضہ سے پہلے بیچنا:

ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار نمبر (۲) کو روانہ کر دیتا ہے اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آتی ہے نہ خریدار نمبر (۲) پر بلکہ یہ اسی شخص (خریدار نمبر (۱)) کا نقصان قرار پاتا ہے، اس صورت معاملہ میں اگرچہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر حسی قبضہ نہیں ہوا لیکن وہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے سے پہلے اس کی ضمانت میں رہا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ”ربح مالہ یضمن“ (ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) حاصل کیا، بلکہ اس نے مال مضمون پر نفع حاصل کیا ہے، لہذا ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا۔

جب ملکیت ہی کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا مادی ہونا ضروری نہیں تو قبضہ کا مادی یا حسی ہونا کیوں ضروری ہو، مصطفیٰ احمد الزرقاء ملکیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وبذلك يتبين أن الملكية ليست ماديا، وإنما هي حق من الحقوق والحقوق نوع من الاعتبار الشرعي“ (المدخل الفقہی العام ۱، ۲۲۲)۔ (اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ ملکیت کوئی مادی چیز نہیں ہے، بلکہ حقوق میں سے ایک حق ہے، اور حق ایک ایسی نوع ہے جس کا شریعت نے اعتبار کیا ہے)۔

## ۷۔ مشتری کا جہاز پر چڑھائے ہوئے مال کو وصول کرنے سے پہلے فروخت کرنا:

بین الاقوامی تجارت میں جہاز پر مال چڑھانے کے بعد اصل بائع کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا، ایسی صورت میں مشتری مال کی وصولی سے پہلے، جبکہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دیتا ہے اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے تو یہ صورت شرعاً جائز نہیں قرار دی جاسکتی، کیونکہ رائج طریقہ کے مطابق مشتری کی ہدایت کے مطابق بائع مال جہاز کے ذریعہ بھیجتا ہے، لہذا اس کی ذمہ داری جہاز پر مال چڑھانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح مشتری دوسرے خریدار کو یہ مال وصول کرنے سے پہلے فروخت کرتا ہے تو یہ بات معہود (Understood) ہوتی ہے کہ یہ دوسرا خریدار جہاز پر چڑھائے ہوئے مال کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے اس لئے اول الذکر مشتری ضمانت سے بری ہے۔

خلاصہ یہ کہ مال کی ترسیل کے سلسلہ میں مشتری کی ہدایت کے مطابق مال جہاز وغیرہ کی تحویل میں دینے سے بائع اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر مال تلف ہو جاتا ہے تو بائع پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، البتہ مال کی تلافی کی صورت میں معاوضہ کے لئے قانون نے انشورنس کا طریقہ رائج کیا ہے، اور یہی اسی طرح جائز ہے جس طرح پوسٹل انشورنس۔

☆☆☆

## بیع قبل القبض فی ضوء الكتاب والسنة

مولانا ڈاکٹر عبداللہ جو لم

### معنى القبض فى اللغة:

القبض فى اللغة بمعنى الأخذ، قال الجوهري: قبضت الشيء قبضا أخذته، وقال ابن منظور: والقبض التناول للشيء بيدك ملامسة-

وبمعنى الجمع: ومنه قبض الطائر جناحه، جمعه، وقال ابن منظور: والقبض تحويلك المتاع إلى حيزك، وبمعنى التملك قال الجوهري: يقال صار الشيء فى قبضتك أى فى ملكك، وقال ابن الأعرابي: القبض قبولك المتاع وإن لم تحوله-

والقبض خلاف البسط، ومنه قوله تعالى: (والله يقبض ويبسط) (سورة البقرة ۲۴۵) (الصحاح، لسان العرب)-

### معنى القبض فى الاصطلاح:

”اتفق العلماء على أن القبض فى الأشياء غير المنقولة يكون بالتخلية بينها وبين من ينتقل إليه الملك بحيث يتمكن من الانتفاع به“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲، المجموع ۹، ۲۸۳)-

أما فى المنقولة فاختلّفوا فىه إلى قولين:

۱- ذهب الحنفية إلى أن القبض فى كل شئ يكون بالتخلية، ثم فرقوا بين القبض التام والقبض الناقص، قال الكاسانى: لا خلاف بين أصحابنا فى أن أصل القبض يحصل بالتخلية فى سائر الأموال واختلفوا فى أنها هل هى قبض تام فيها أم لا؟ وجملة الكلام فىه أن المبيع لا يخلو إما أن يكون مما له مثل، وإما أن يكون مما لا مثل له، فإن كان مما لا مثل له من المذروعات والمعدودات المتفاوتة فالتخلية فيها قبض تام بلا خلاف، وإن كان مما له مثل حتى لو اشترى مذروعات مزارعة أو معدودا معاددة ووجدت التخلية يخرج عن ضمان البائع ويجوز له بيعه والانتفاع به قبل الذرع والعد بلا خلاف، وإن كان مما له مثل فإن باعه مجازفة فكذلك لأنه لا يعتبر معرفة القدر فى بيعه المجازفة، وإن باء مكايلة أو موازنة فى المكيل والموزون وخلقى فلا خلاف فى أن المبيع يخرج عن ضمان البائع ويدخل فى ضمان المشتري، حتى لو هلك بعد التخلية قبل الكيل والوزن يهلك على المشتري، وكذا لا خلاف فى أنه لا يجوز للمشتري بيعه والانتفاع به قبل الكيل والوزن (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۲)-

والخلاصة أن المشتري يملك جميع أنواع التصرف فى القبض التام، بخلاف القبض الناقص فإنه يصير ضامنا فيه، ولكن لا يصح له التصرف فيه-

والقول بأن القبض فى جميع الأشياء التخلية، نقله النووى عن الإمام مالك (المجموع ۹، ۲۸۳) وهو رواية عن الإمام أحمد، قال ابن قدامة: ”وقد روى أبو الخطاب عن أحمد رواية أخرى أن القبض فى كل شئ بالتخلية مع

جامع دار السلام، عربك كالج، عمر آباد، تامل ناڈو-



التميز“ (المغنی ۴، ۱۲۵)۔

۲۔ وذهب الشافعية والحنابلة إلى أن التخلية في المنقول لا تكون قبضا، وإنما القبض في المنقول بالنقل، وفي المتناول باليد بالتناول، وفي المكيل والموزون بالكيل والوزن، قال الإمام الشافعي: ”ومن ابتاع طعاما كيلا فقبضه أن يكتاله، ومن ابتاع جزافا فقبضه أن ينقله من مواضعه إذا كان مثله ينقل“ (الأم ۳، ۴۰)۔

وقال النووي: ”قال أصحابنا الرجوع في القبض إلى العرف، وهو ثلاثة أقسام، أحدها: العقار والشمع على الشجرة فقبضه بالتخلية، والثاني: ما ينقل في العادة كالأخشاب والحبوب والحيتان ونحوها فقبضه بالنقل إلى مكان لا اختصاص للبائع به، والثالث: ما يتناول باليد كالدرهم والدنانير... فقبضه بالتناول بلا خلاف (المجموع ۹، ۲۴۵) وقال ابن قدامة: ”وقبض كل شيء بحسبه فإن كان مكيلا أو موزونا فقبضه بكيله ووزنه“ (المغنی ۴، ۱۲۵) وقال البهوتي: ”ويحصل القبض فيما يبيع بكيل أو وزن أو عد أو ذرع بذلك، أي بالكيل أو الوزن أو العد أو الذرع... ويحصل القبض في صبرة بنقلها، ويحصل القبض فيما ينقل كالثياب والحيوان بنقله كالصبرة... ويحصل فيما يتناول كالأثمان والجواهر بتناوله، إذا العرف فيه ذلك (كشاف القناع ۳، ۲۳۶)۔

### الأدلة:

الذين قالوا: إن القبض في جميع الأشياء بالتخلية استدلو بما يأتي:

۱۔ عن ابن عمر قال كنا مع النبي ﷺ في سفر فكنت على بكر صعب لعمر فكان يغلبني فيتقدم أمام القوم، فيزجره عمر ويرده، ثم يتقدم فيؤجره عمر ويرده فقال النبي ﷺ لعمر بعنيه، قال: هو لك يا رسول الله، قال رسول الله ﷺ: بعنيه، فباعه من رسول الله ﷺ، فقال النبي ﷺ: هو لك يا عبد الله بن عمر تصنع به ما شئت“ (البخارى ۴، ۲۳۲، ۶م فتح)۔

قال ابن حجر: وقد احتجت به المالكية والحنفية في أن القبض في جميع الأشياء بالتخلية، وإليه مال البخارى كما يقدم له في ”باب شراء الدواب والحمير إذا اشترى دابة وهو عليها هل يكون ذلك قبضا؟“ وأجاب عنه ابن حجر بأنه ”يحتمل أن يكون ابن عمر كان وكيلا في القبض قبل الهبة، وهو اختيار البغوي“ قال: إذا أذن المشتري للموهوب له في قبض المبيع كفى وتم البيع وحصلت الهبة بعده (فتح الباري ۴، ۲۳۵) ويمكن أن يقال: بأن ما ثبت فيه عن النبي ﷺ هو التصرف بالهبة وهذا لا يدل على وجود القبض، بل يدل على أن الهبة يصح قبل القبض۔

۲۔ ”إن التسليم في اللغة عبارة عن جعله سالما خالصا، يقال: سلم فلان لفلان أي خلص له، وقال الله تعالى: (ورجلا سلما لرجل) أي سالما خالصا لا يشركه فيه أحد، فتسليم المبيع إلى المشتري هو جعل المبيع سالما للمشتري أي خالصا له بحيث لا ينازعه فيه غيره، وهذا يحصل بالتخلية، وكانت التخلية تسليما من البائع، والتخلي قبضا من المشتري، وكذا هذا في تسليم الثمن إلى البائع، لأن التسليم واجب، ومن عليه الواجب لا بد أن يكون له سبيل الخروج عن عهدة ما وجب عليه، والذي في وسعه هو التخلية ورفع الموانع، فأما الإقباض فليس في وسعه، لأن القبض بالبراجم فعل اختياري للقابض، فلو تعلق وجوب التسليم به لتعذر عليه الوفاء بالواجب، وهذا لا يجوز“ (بدائع الصنائع ۵، ۲۳۳)۔

ويمكن أن يقال: إن التسليم والقبض أمران مختلفان، فتسليم المبيع يكون من البائع، وقبضه

يكون من المشتري، فالبايع يعتبر مسلماً بالتخية، فلا يكون ضامناً بهلاك المبيع بعد التخية، وإن لم يقبضه المشتري فعلاً، لأن البائع قدامى ما وجب عليه وهو التسليم بالتخية.

۳- القياس على العقار، قالوا كما أن القبض يحصل بالتخية في العقار كذلك يحصل في غيره (أخرجه أبو داؤد، أنظر المغني ۴، ۱۳۵) واجيب بأن في العقار لا يمكن القبض بالحمل والنقل، فاعتبر التخية قبضاً له، بخلاف غيره من المنقول.

### دليل القول الثاني:

أما الذين فرقوا في القبض بين المنقول وبين غيره فاستدلوا بما يأتي:

۱- عن زيد بن ثابت أن النبي ﷺ نهي أن تباع السلع حيث تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم (أبو داؤد كتاب البيوع ۲، ۴۶۵، فتح الباري ۲، ۲۵۰).

استدل به الشيرازي، وقال النووي: "رواه أبو داؤد بإسناد صحيح إلا أنه من رواية محمد ابن إسحاق بن يسار عن أبي الزناد، وابن إسحاق مختلف في الاحتجاج به وهو مدلس، وقد قال عن أبي الزناد: والمدلس إذا قال عن: لا يحتج به، لكن لم يضعف أبو داؤد هذا الحديث، وقد سبق أن ما لم يضعفه فهو حجة عنده، فلعله إعتضد عنده أو ثبت عنده بسماع ابن إسحاق له من أبي الزناد" (۹، ۲۴۱).

۲- "عن عثمان بن عفان أن النبي ﷺ قال: إذا بعته فكل وإذا ابتعت فاكتمل" (البخاري ۴، ۲۲۲، فتح الباري ۲، ۲۲۵).

۳- "عن جابر قال: نهي رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يجري فيه الصاعان، صاع البائع وصاع المشتري" (ابن ماجه كتاب التجارات ۲، ۴۵۰ بسند ضعيف).

استدل بهما ابن قدامة، ثم قال: هذا فيما يبيع كيلاً وإن يبيع جزافاً فقبضه نقله؛ لأن ابن عمر قال: كانوا يضربون على عهد رسول الله ﷺ إذا اشتروا طعاماً جزافاً أن يبيعه في مكانه حتى يحولوه (البخاري رقم الحديث ۲۱۲۷ كتاب البيوع).

۴- العرف، قال الشيرازي: لأن القبض ورد به الشرع وأطلقه، فحمل على العرف، والعرف فيما ينقل النقل وفيما لا ينقل التخية، (المهذب ۹، ۲۴۵ بيع المجموع) ونوقش بأن الأحاديث المذكورة تدل على منع البيع قبل النقل، لأن حقيقة القبض هو النقل، أما العرف فيتغير بالزمان والمكان فلا يكون عرف بلد وزمن حجة لبلد وزمن آخر.

### البيع قبل القبض:

اختلف العلماء في البيع قبل القبض إلى خمسة أقوال:

- ۱- لا يجوز بيع أي شيء قبل قبضه، وإليه ذهب ابن عباس والشافعي ومحمد بن الحسن.
- ۲- يجوز بيع كل شيء قبل قبضه إلا المكيل والموزون، وإليه ذهب عثمان بن عفان وسعيد بن المسيب والحسن والحكم وحماد والأوزاعي وأحمد وإسحق.
- ۳- لا يجوز بيع مبيع قبل قبضه إلا الدور والأرض، وبه قال أبو حنيفة وأبو يوسف.
- ۴- يجوز بيع كل مبيع قبل قبضه إلا المأكول والمشروب، وإليه ذهب مالك وأبو ثور وأحمد في رواية، قال: ابن المنذر وهو أصح المذاهب.

۵۔ يجوز بيع كل شئ قبل قبضه، وهو مروى عن عثمان البتي (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۱، المغنى ۳، ۱۲۱، المجموع ۹، ۲۶۰، نيل الأوطار ۵، ۱۶۸، الكافي ۴، ۲۶۱)۔

### الأدلة:

استدل أصحاب القول الأول بما يأتي:

۱۔ عن حكيم بن حزام قال: قلت يا رسول الله إني أشتري بيوعاً فما يحل لي منها وما يحرم علي، قال ماذا اشتريت شيئاً فلا تبعه حتى يقبضه (مسند الإمام أحمد ۳، ۴۰۲، نيل الأوطار ۵، ۱۶۸، المجموع ۹، ۲۸۱)۔

۲۔ عن زيد بن ثابت أن النبي ﷺ هي أن تباع السلع حيث تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم (أبو داود في البيوع ۳، ۶۶۵، الدارقطني ۲، ۱۱۳)۔

وجه الاستدلال أن لفظ "شئ" و "السلع" عام فيحمل على العموم، أما ذكر الطعام في بعض الأحاديث فلا يخص به، لأنه من قبيل التنبيه من الأعلى إلى الأدنى، فإنه إذا هي عن بيع الطعام قبل القبض مع كثرة الحاجة إليه فغيره أولى (المجموع ۹، ۲۶۱)۔

وهذا الذي فهمه ابن عباس، فإنه روى عن طاؤس أنه قال سمعت ابن عباس أنه يقول، أما الذي هي عن النبي ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب كل شئ إلا مثله (البخاري، البيوع ۳، ۲۳۹)۔

### دليل القول الثاني:

۱۔ "عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: من اشترى طعاماً بكيل أو وزن فلا يبيعه حتى يقبضه" (أخرجه أحمد في مسنده ۱، ۱۱۱)۔

۲۔ وعنه: أن رسول الله ﷺ هي أن يبيع أحد طعاماً بإشترائه بكيل حتى يستوفيه (أبو داود كتاب البيوع رقم الحديث ۳۳۹۵، النسائي ۴، ۲۸۶)۔

۳۔ وعن عثمان أن النبي ﷺ قال: له إذا بعت فكل وإذا ابتعت فاكتل (الدارقطني في البيوع ۳، ۸، أحمد ۱، ۶۲، البخاري ۳، ۲۳۳، الفتوح)۔

### دليل القول الثالث:

دليل منه المنقول هي الأحاديث السابقة، أما دليل استثناء الدور فاستدلوا بعموم الكتاب وهو قوله تعالى: (وأحل الله البيع) (البقرة ۲۷۵)۔

"ولأن الأصل في ركن البيع إذا صدر من الأهل في المحل هو الصحة، والامتناع لعارض الغرر، وهو غرر إنفساخ العقد بهلاك المعقود عليه، ولا يتوهم هلاك العقار فلا يتقرر الغرر فبقي بيعه على حكم الأصل" (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۱)۔

### دليل القول الرابع:

عن ابن عمر أن النبي ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يقبضه" (البخاري ۳، ۲۳۳، مسلم ۱، ۲۲۵) وعنه قال: لقد رأيت الناس في عهد رسول الله ﷺ يتبايعون جزافاً يعني الطعام يضربون أن يبيعه في مكائهم حتى يؤوه



إلى رحالهم (البخارى ۲، ۲۵۰، مسلم ۱، ۲۲۸) وعن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: إذا ابتعت طعاما فلا يبيعه حتى تستوفيه (مسلم ۱، ۲۲۸).

قالوا فالتنصيص في هذه الأحاديث على الطعام يدل على أن غيره بخلافه، واستدلوا أيضا بالقياس على الإعتاق والإجارة قبل القبض، وأجاب النووي عن الأحاديث بجوابين:

الأول: أن هذا استدلال بداخل الخطاب والتنبيه مقدم عليه، فإنه إذا نهى عن بيع الطعام مع كثرة الحاجة إليه فغيره أولى.

والثاني: أن النطق الخاص مقدم عليه وهو حديث حكيم، وحديث زيد، وأجاب عن القياس على الميراث والوصية بأن الملك فيهما مستقر بخلاف المبيع، وأما القياس على الإعتاق فلا يصح، لأن للإعتاق قوة وسراية لا يوجد في غيره، ولأن العتق إتلاف للمالية والإتلاف قبض، وأما الإجارة فلا يصح قبل القبض على الصحيح، لأنها يبيع (المجموع ۹، ۲۴۱-۲۶۵).

### دليل القول الخامس:

عموم قوله تعالى (وأحل الله البيع) (البقرة، ۲۷۵).

ويجاب بأن الحديث قد خصه، فلا يصح الاستدلال به.

### علة منع بيع الإنسان ما اشتراه قبل قبضه:

اختلف العلماء في أن الأحاديث المتعلقة، بالنهي قبل القبض معللة أم غير معللة إلى قولين، فمنهم من يرى أن الأحاديث غير معللة، وإليه ذهب الحنفية، قال كاساني: "قال بعض مشايخنا: أنها، أي حرمة التصرف قبل الكيل أو الوزن، تثبت شرعا غير معقول المعنى" (بدائع الصنائع ۵، ۲۲۳).

ومنهم من يرى أنها معللة، وهؤلاء اختلفوا في بيان العلة إلى عدة أقوال، فمنهم من يرى أن علة غرر انفساخ العقد بهلاك المعقود عليه، وإليه ذهب أكثر الحنفية والشافعية والحنابلة (بدائع الصنائع ۵، ۱۸۰ الهذب مع المجموع ۹، ۲۶۳، المغنى ۴، ۱۲۸) ومنهم من يرى أن علة انعدام القبض التام ومنهم من يرى أن علة كونه من قبيل "ربح مالر يضمن"، وإليه ذهب الشافعي (الأم ۳، ۴۰) ومنهم من يرى أن علة عجز المشتري عن تسليمه، لأن البائع قد يسلمه وقد لا يسلمه.

لا سيما إذا رأى المشتري قذر ربح، فيسعى في رد البيع إما بجحد أو باحتيال في الفسخ، وبه قال ابن تيمية (الاختيارات الفقهية، ۱۲۶).

ومنهم من يرى أن علة الربا، وإليه ذهب ابن عباس رضيه الله عنه فعن طاووس عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ نهى أن يبيع الرجل طعاما حتى يستوفيه، قلت لابن عباس: كيف ذلك؟ قال: أراهم بدراهم والطعام مرجأ (صحيح البخارى كتاب البيوع ۲، ۲۲۷، الفتوح).

### الترجيح:

بالنظر إلى الأدلة والعلل التي بينها العلماء يبدو لي أن القول الأول وهو منع بيع أى شئ اشتراه قبل قبضه هو الراجح، والمنع خاص بالمبيع، أما ما سواه من التصرف مثل العتق والهبة فهو جائز كما يدل عليه هبة النبي ﷺ لابن عمر البكر الصعب قبل القبض.



## خرید و فروخت میں قبضہ کی حقیقت اور عرف

مولانا محمد رضوان القاسمی <sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup>

۱۔ قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنے کی ممانعت مختلف احادیث سے ثابت ہے، بعض ان میں سے مطلق ہیں، مثلاً:

”عن حکیم بن حزام قال: قلت: یا رسول اللہ ﷺ! إني أبتاع هذه البيوع فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال:

يا ابن أخي لا تبیعن شیئا حتی تقبضه، هذا إسناد حسن متصل“ (السنن الكبرى للبيهقي: ۵، ۲۱۳، وكذا في مصنف ابن أبي شيبة: ۶، ۲۶۶)

اور ان میں سے بعض طعام یعنی خوردنی اشیاء کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً: ”عن ابن عمر رضي الله عنهما أن النبي ﷺ قال: من ابتاع

طعاماً فلا يبيعه حتى يقبضه“ (بخاری مع فتح الباری ۲، ۲۳۹، نیز دیکھئے: مجمع الزوائد ۴، ۹۸)۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اشیاء خوردنی خریدے، وہ اس کو اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک کہ اس پر

قبضہ نہ کر لے۔

یہ دو حدیثیں بطور مثال کے پیش کی گئی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن کی بنیاد پر فقہاء مجتہدین میں اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن جمہور فقہاء نے

الجملہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے ناجائز ہونے پر متفق ہیں (شرح المہذب ۲۶۳/۹، بدایۃ المجتہد ۱۳۳/۲، الروض المربع ۲۲۳، المغنی ۸۸/۳، البحر الرائق ۱۱۶/۶، بدائع

الصنائع ۱۸۰/۵، الہدایۃ مع الفتح ۵۱۰/۶، بزازیہ مع الہندیہ ۳۹۶/۳)۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بیع فاسد ہے، اس لئے کہ رکن بیع اور محل بیع میں کوئی خلل نہیں ہے، البتہ غرر اور دھوکہ ہے، چنانچہ

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”وفي المواهب: وفسد بيع المنقول قبل قبضه انتهى، ونفي الصحة يحتملها... أي يحتمل البطلان والفساد

والظاهر الثاني؛ لأن علة الفساد الغرر كما مر مع وجود ركني العقد“ (رد المحتار ۴، ۱۸۲)۔

۲۔ تمام دبستان فقہ کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ شرع اسلامی میں کتاب و سنت نے قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں

کی ہے، بلکہ اسے لوگوں کے عرف و عادت پر چھوڑ دیا ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے گا

وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا (بدائع الصنائع ۱۳۸/۵، المغنی ۹۰/۳، الشرح الکبیر بہامش حاشیہ السوقی ۱۳۵/۳، شرح المہذب ۲۷۵/۹)۔

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی یکساں صورت نہ ہوگی، بلکہ تمام مکتبہ فکر کے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اشیاء غیر منقولہ میں تو تخلیہ کو قبضہ کا درجہ حاصل

ہوگا، البتہ اشیاء منقولہ میں قدرے اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اشیاء منقولہ میں قبضہ کا دار و مدار لوگوں کا عرف

ورواج ہے، یعنی جن اشیاء میں جس کیفیت کو عوام قبضہ تصور کریں وہ شرعاً بھی قبضہ شمار کیا جائے گا، اور جس کو قبضہ نہ مانیں وہ قبضہ متصور نہ ہوگا، چنانچہ علامہ درویر مالکی

فرماتے ہیں:

”قبض العقار وهو الأرض وما اتصل بها... التخلية وقبض غيره أي غير العقار من عروض وأنعام ودواب

بالعرف الجاري بين الناس“ (الشرح الکبیر بہامش حاشیہ السوقی ۴، ۱۲۵)۔

عقار یعنی زمین اور جو زمین سے متصل ہوں، ان میں تخلیہ کے ذریعہ قبضہ ہوگا اور عقار کے علاوہ مثلاً سامان، جانور اور چوپائے میں قبضہ اس عرف کے مطابق

علی بانی و سابق ناظم دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد، و سابق نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

ہوگا جو لوگوں میں جاری ہو۔

یہی کچھ امام نووی نے لکھا ہے (شرح المہذب ۹، ۲۷۵)۔

اس سلسلہ میں حنفیہ کا کہنا ہے کہ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ دونوں میں تخلیہ کو قبضہ گردانا جائے گا، البتہ بیع کے احوال کے اعتبار سے تخلیہ کی نوعیت میں فرق ہوگا، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ”وحاصله أن التخلية قبض حکماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“ (رد المحتار ۲، ۲۷۸، نیز ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲، ۲۱۸-۲۱۹)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تخلیہ کو حکماً اس وقت قبضہ تصور کیا جائے گا، جبکہ بغیر مشقت کے اس پر تصرف کرنا ممکن ہو، لیکن قبضہ کی نوعیت بیع کی حالت کے اعتبار سے بدلتی رہے گی۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے بارے میں تقریباً تمام ہی فقہاء اور شراح حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ احادیث معلول بالعلۃ ہیں، چنانچہ علامہ برہان الدین مرغینانی فرماتے ہیں:

”والحدیث معلول بعلۃ عملاً بدلائل الجواز“ (ہدایہ مع الفتح ۶، ۵۱۳)۔

فقہاء حنفیہ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہاں پر بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں بیع کے فسخ ہونے کا غرر اور دھوکہ ہے، چنانچہ علامہ عبدالحئی لکھنوی فرماتے ہیں:

”لأن النهی معلول بخرر انفساخ العقد لخوف الهلاك“ (التعلیق المسجد ۳، ۱۹۹، نیز دیکھئے: مجمع الأثر ۲، ۷۹، فتح القدر ۶، ۵۱۳)۔

۵۔ بعض فقہاء کے یہاں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت بالکل عام ہے، جب کہ دوسرے فقہاء اس میں استثناءات اور تخصیصات کے قائل ہیں، ذیل میں ائمہ کی آراء اور ان کے وجوہ و دلائل قلمبند کئے جاتے ہیں:

شافعی نقطہ نظر:

یہ ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کی نہی بالکل عام ہے، اس میں کوئی استثناء اور تخصیص نہیں، خواہ بیع منقولی اشیاء ہو، یا غیر منقولی، چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں:

”أما الأحكام فمذهبنا أنه لا يجوز بيع المبيع قبل قبضه عقاراً كان أو منقولاً لا بإذن البائع ولا بغير إذنه لا قبل أداء الشمن ولا بعده (شرح المہذب ۹، ۲۶۲)۔“

ان حضرات کی بنیادی دلیل حضرت حکیم بن حزام کی روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام سے فرمایا تھا کہ ”بھیجے کسی چیز کو قبضہ کے بغیر فروخت نہ کرو“ (دیکھئے: السنن الکبریٰ ۵/ ۳۱۳، بخاری مع فتح ۳۳۹، مجمع الزوائد ۴/ ۹۸)۔

حنفی نقطہ نظر:

یہ ہے کہ منقول اشیاء کو بغیر قبضہ کے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، البتہ غیر منقول، مثلاً زمین، گھر وغیرہ کو بغیر قبضہ کے ہوئے بھی فروخت کر سکتے ہیں (دیکھئے: البحر الرائق ۱۱۶/ ۶، مختصر الطحاوی ۹۳، ارشاد الساری ۴/ ۵۷)۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ ممانعت کی اصل علت غرر اور دھوکہ ہے، وہ اس طرح کہ ہلاک ہونے کی صورت میں عقد کے فسخ ہونے کا اندیشہ ہے، اور یہ غرر صرف منقولی اشیاء میں متوقع ہے، نہ کہ غیر منقولی میں، اس لئے کہ غیر منقولی شی میں ہلاک ہونے کا اندیشہ بہت کم ہے (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲، ۷۴، البحر الرائق ۱۱۶/ ۶، فتح القدر ۶/ ۵۱۳) چنانچہ اگر عقار وغیرہ کے اندر بھی ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو وہاں بھی قبل القبض فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، مثلاً وہ زمین یا گھر وغیرہ جو دریا وغیرہ کے کنارے پر واقع ہو اور اس کے دریا میں ضم ہو جانے کا خدشہ ہو (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدر ۶/ ۵۱۳)۔

مالکی نقطہ نظر:..... اس سلسلہ میں یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت صرف خوردنی اشیاء کے ساتھ خاص ہے، جبکہ ان کو کیل یا وزن کے ساتھ



فروخت کیا جائے، اور خوردنی اشیاء کے علاوہ یا خوردنی اشیاء کو ”تھوک“ فروخت کیا جائے تو ان میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، (دیکھئے: بدایہ المجتہد ۱۲۴/۲، المغنی ۸۸/۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۷۴/۲) ان لوگوں نے ان احادیث کو اپنا استدلال بنایا ہے، جن میں قبضہ سے پہلے طعام کی بیع کو منع کیا گیا ہے۔  
حنبل بنی نقطہ نظر:

یہ ہے کہ خوردنی اشیاء جو کیل، وزن یا عدد سے فروخت کی جاتی ہیں، ان میں قبل القبض تصرف کرنا درست نہیں ہے، ان کے علاوہ تمام اشیاء قبل القبض فروخت کی جاسکتی ہیں، حتیٰ کہ اگر خوردنی اشیاء جو مجازفہ، یعنی بلا کیل و وزن بیچی گئی ہوں، ان کو بھی قبل القبض فروخت کرنا درست ہے، چنانچہ ابن قدامہ نقل فرماتے ہیں:

”قال ابن عبد البر: الأصح عن أحمد بن حنبل أن الذي يبيع من يبعه قبل قبضه هو الطعام“ (المغنی ۴۰۸)۔

ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو ہریرہؓ اور جابرؓ کی روایات سے ہے، جن میں صراحت موجود ہے کہ ممانعت خوردنی اشیاء کے ساتھ مخصوص ہے، مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یوں منقول ہے:

”من اشترى طعاماً بكيلى أو وزن فلا يبعه حتى يقبضه“ (مسند احمد)۔

۶۔ اگر کوئی شخص فیکٹری وغیرہ سے مال خرید کر اس پر قبضہ کئے بغیر دوسرے خریدار کے ہاتھوں اس شرط پر فروخت کر دیتا ہے کہ اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر عائد ہوگی اور نہ خریدار (۲) پر، بلکہ یہ میرا (خریدار (۱) کا) نقصان قرار پائے گا، ایسا معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں داخل ہے، جہاں تک ضمان کے قبول کرنے کا تعلق ہے، تو یہ قبضہ کے پائے جانے کے لئے کافی نہیں۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت میں شپنگ کی جو صورت رائج ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ جہاز پر مال چڑھا دینے کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوتا اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے، جبکہ مال سمندر میں ہے، تیسرے شخص کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے، اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا شخص ضامن ہوتا ہے، یہ صورت بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ”بیع قبل القبض“ کے قبیل سے ہے۔ واللہ اعلم



## خرید و فروخت میں قبضہ اور تخلیہ کا شرعی معیار

مفتی عبدالرحیم قاسمی ؒ

- ۱- شرع میں قبل القبض بیع فاسد ہے۔ ”یحتمل البطلان والفساد والظاهر الثاني لأن علة الفساد الغرر كما مر مع وجود ركني البيع“ (شامی ۲، ۱۶۳)۔
- ۲- شریعت نے قبضہ کی حقیقت کو کسی خاص کیفیت کے ساتھ متعین نہیں کیا ہے، بائع کی جانب سے سپردگی تسلیم اور تخلیہ اور مشتری کا تسلط و استیلاء، قدرت و غلبہ جس طرح بھی ہو فقہاء نے اپنے اپنے زمانہ کے عرف و عادت کے مطابق اس کی مختلف صورتوں پر قبضہ کے احکام مرتب کئے ہیں، دارمیعیہ کے تالے کی چابی سپرد کرنے کو گھر کی سپردگی کے مترادف قرار دیا ہے ”دفع المفتاح في بيع الدار تسليم إذا تمها له بلا كلفة“ تخلیہ کو بھی بعض شرائط کے ساتھ قبضہ کے قائم مقام مانا ہے، ”البائع إذا خلى بين المبيع وبين المشتري بحيث يتمكن المشتري من قبضه يصير المشتري قابضا للمبيع حتى لو هلك قبل أن يقبضه حقيقة يهلك عليه (خانية على هامش الهندية“ (۲، ۲۵۶)۔
- ۳- منقولات میں ظاہری تسلط کی زیادہ اہمیت ہے فقہاء نے مکملات میں کیل کو، موزونات میں وزن کو، معدودات میں عدد کو، قبضہ کا تمہ بتلایا ہے، نیز عقد کے وقت مرعی میں موجود جانور کی تعیین پر قبضہ کا حکم لگا کر اس میں توسع ظاہر فرمایا ہے۔ ”والصحيح أن البقرة إن كانت بقر بهما بحيث يتمكن المشتري من قبضها لو أراد فهو قابض لها“ (فتاویٰ ہندیہ ۲، ۱۸)۔
- ۴- عقار پر ظاہری قبضہ سے پہلے مشتری کے بیع اور ہبہ جیسے تصرفات کو صحیح قرار دینے اور اس کی طرف سے موہوب لہ، یا مشتری ثانی کے قبضے کو کافی سمجھے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء غیر منقولہ میں حکمی قبضہ پر اکتفا کیا جاسکتا ہے، ”صح بيع عقار، إلى قوله: لحصول القبض بقبض الموهوب له“ (شامی ۲، ۱۶۳)۔
- عقار عاقدین کی نظروں سے غائب اور دور ہونے کے باوجود تخلیہ اور اس تک پہنچنے کے لئے مناسب وقت گزر جانے کو بھی قبضہ تصور کیا گیا ہے۔
- ”أنه بالتخلية يصح القبض وإن كان العقار بعيدا غائبا عنهما عند أبي حنيفة خلافا لهما... إلى قوله: ”إنه متى مضى مدة يتمكن من الذهاب إليها والدخول فيها كان قابضا“ (رد المحتار ۲، ۲۳)۔
- اگرچہ یہ ظاہر الروایۃ نہیں، لیکن مذکورہ عبارت سے کم از کم یہ تو واضح ہوتا ہے کہ اشیاء منقولہ کے مقابلہ میں عقار پر قبضہ کی نوعیت میں وسعت اختیار کی گئی ہے۔
- ۴- قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے نہی کی احادیث ”معلول بالعلة“ ہیں اور معتقد علیہ ضائع ہو کر عقد فسخ ہو جانے کا غرر علت ہے۔ ”والغرر المنهى عنه غرر إنفساخ العقد والحديث معلول به عملا بدلائل الجواز“ (ہدایہ ۳، ۵۸)۔
- ۵- مشتری کا قبل القبض عقار کو بیچنا شیخین کے نزدیک استحساناً جائز ہے، اور امام محمد و زفر و شافعی کے نزدیک قیاساً ناجائز ہے، مانعین نے روایت نہی کے عموم سے استدلال کیا ہے، شیخین کے متدلات قرآن پاک میں بیع کے عمومی احکام ہیں اور قرآن کے عمومی حکم کی تخصیص خبر واحد سے

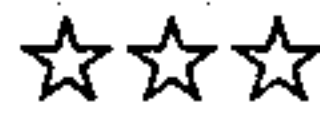
ناظم جامعہ خیر العلوم، بھوپال۔

ہمارے یہاں درست نہیں، باسلوب دیگر یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ دلائل کو تناقض سے بچانے اور تطبیق کیلئے ہم نے ہی روایت کو منقول پر محمول کرتے، ہیں اور بیع اہل سے محل پر صادر ہو تو اس کا صحیح ہونا اصل ہے، معقود علیہ کے ضائع ہونے سے عقد فسخ ہو جانے کی بناء پر غرر لاحق ہو جانے کے خطرہ کی وجہ سے ممانعت عارضی تھی اور عقار کے ضائع ہونے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا، لہذا اس کا حکم اصل پر برقرار رہے گا (خلاصہ بدائع الصنائع ۱۸۱/۵)۔

بالفاظ دیگر یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے، امام مالکؒ طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں کو مخصوص مذکور تک ہی محدود رکھتے ہیں، حالانکہ خود راوی حدیث حضرت عبد اللہ بن عباسؓ "وأحسب كل شئ مثلہ" فرماتے ہیں اور حضرت امام اعظمؒ حدیث نہیں "عن بیع مالہ یقبض" سے استدلال فرماتے ہیں، حضرت غیاث ابن اسدؒ کو مکہ کا قاضی بنا کر روانہ کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی تھی کہ لوگوں کو قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے منع کر دیں۔

امام شافعیؒ اس ممانعت میں منقولات و عقار وغیرہ سب کو شامل فرماتے ہیں، امام اعظمؒ کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے اور قبل القبض منقول کی ملکیت میں غرر ہے، کیونکہ اس کے ضائع ہو جانے کی بناء پر بیع میں نقض ہو سکتا ہے اور مشتری کی ملکیت باطل ہو سکتی ہے، اس کے قبضہ سے یہ غرر منتفی ہو جائے گا، اب استحقاق کے ظہور سے صرف معنوی غرر کا اندیشہ باقی رہا جس سے احتراز ناممکن ہے، لیکن عقار قبل القبض کی ملکیت میں اس کے ضائع ہونے اور بیع فسخ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، صرف استحقاق کی حیثیت سے غرر متصور ہو سکتا ہے جس سے احتراز ممکن نہیں، نیز اجماع نے ثمن و صدق میں تصرف کے جواز کو عام حدیث میں سے خاص کر دیا ہے، تو اس قسم کے عام کو قیاس کے ذریعہ بھی مخصوص کرنے کی گنجائش ہے، لہذا قبل القبض حق شفیعہ ثابت ہونے کی بناء پر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں کو منقول پر محمول کیا جاسکتا ہے (خلاصہ مبسوط بر خسی ۸-۹-۱۰-۱۳)۔

۷۶۔ فیکٹری سے خریدا ہوا مال ہو، یا شپنگ کا جہاز پر چڑھایا ہوا مال جو راستے میں ہو، مشتری اول قبضہ سے پہلے اس کو فروخت کر دے تو "بیع الکالی بالکالی" میں شامل ہونے کی بناء پر اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز معلوم ہوتی ہے۔





## شریعت میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا حکم

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی ؒ

شریعت اسلامی میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے:

”أما الذي نهي عنه النبي ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض قال: ابن عباسؓ ولا أحسب كل شيء إلا مثله“ (صحیح بخاری ۱۰۲۸۶)۔ وہ چیز جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے وہ ایسی کھانے کی چیزیں ہیں جنہیں قبضہ سے پہلے بیچا جائے۔ تا آنکہ ان پر قبضہ ہو۔

ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے: ”إن النبي ﷺ قال من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه، زاد اسماعيل من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه“ (بخاری: ۱۰۲۸۶)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کھانے کی اشیاء بیچنا چاہے تو اسے اس وقت تک نہ بیچے جب تک پوری طرح قبضہ میں نہ لے لے، اسماعیل نے اپنی روایت میں ”حتى يستوفيه“ کی جگہ ”حتى يقبضه“ کا اضافہ کیا ہے۔

علامہ عینی نے فرمایا ہے: ”والقبض والاستيفاء سواء والذي يستفاد من الحديث أنه ﷺ نهي عن بيع الطعام إلا بعد القبض“۔ اور قبضہ اور استيفاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور جو کچھ حدیث سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بیع طعام سے منع فرمایا ہے، مگر یہ کہ قبضہ کے بعد ہو (تو درست ہے) (عمدة القاری: ۴۷۸/۵)۔

ترمذی کی روایت میں مزید وضاحت ہے: ”عن حكيم بن حزام قال سألت رسول الله ﷺ فقلت يأتيني الرجل فيسألني من البيع ما ليس عندي۔ ابتاع له من السويق ثم أبعه۔ قال: لا تبع ما ليس عندك“ (ترمذی ۱۰۱۲۸)۔ (حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص ایسی چیز کے بیچ کا مجھ سے سوال کرتا ہے جو میرے پاس موجود نہیں ہوتی۔ میں اس کے لئے بازار سے خرید کر لاتا ہوں پھر اسے فروخت کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز تمہارے پاس موجود نہ ہو اسے مت فروخت کرو)۔

قبل القبض کا حکم:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فقہی نقطہ نظر سے بیع فاسد میں داخل ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: ”وقيد بالقبض؛ لأن العقد في ذاته صحيح غير أنه لا يجب على المشتري دفع الثمن لعدم القبض“ (شامی ۴۰۲۲)۔ قبضہ کی قید اس لئے لگائی ہے کہ معاملہ بیع ذاتی اعتبار سے صحیح ہے، البتہ قبضہ نہ ہونے کے سبب خریدار پر ثمن کی ادائیگی واجب نہیں۔ ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں:

”وحكم الفاسد ما لا يفيد بمجرده، بل بالقبض“۔ (بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ محض معاملہ بیع سے ملک کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ قبضہ سے ملک حاصل ہوتی ہے) (البحر الرائق ۶/۶۹)۔

قبضہ کی حقیقت:

قرآن وحدیث میں قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں کی گئی ہے، البتہ اشارۃ النص سے وہی ظاہر ہوتا ہے جو فقہاء کی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کچھ خاص قسم کے عمل دخل کو جو لوگوں کے عرف وعادت کے مطابق قبضہ تصور کیا جاتا ہے۔ قبضہ مانا جائے گا۔ علامہ شامی نے قبضہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

(۱) قبضہ حقیقی: جو شے مقبوض پر قابض کے عملی تصرف کو ظاہر کرتا ہو۔

۱۔ مدرسہ امداد الاسلام، صدر بازار، میرٹھ (یوپی)۔

(۲) قبضہ حکمی: جو قابض کو صرف اس درجہ میں حاصل ہو کہ وہ قبضہ کر سکنے کی پوزیشن میں ہو یا اس کو عرف میں قبضہ مانا جاتا ہو۔

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل“ (در مختار ۴۰۲۳)۔

پھر سپردگی خریدار اور سامان کے درمیان ایسی تنہائی پیدا کر دینے سے ہوتی ہے جس میں سامان پر قبضہ کرنے کی صورت ممکن ہو اور کوئی روکاوٹ یا آڑ نہ ہو، یعنی بیع خریدار کے سامنے ہو اور بائع اس کو اپنی ملک سے اس طرح علیحدہ کر دے کہ حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”وحاصله أن التخلية قبض حکماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“ (شامی ۴۰۲۳)۔

خلاصہ یہ کہ تخلیہ قبضہ حکمی ہے، بشرطیکہ بلا مشقت سامان پر قدرت حاصل ہو، لیکن بیع کے حسب حال یہ مختلف ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ گھر میں گیہوں ہو تو اس کا قبضہ یہ ہے کہ بائع کمرے کی کنجی خریدار کو دے دے۔ اور خریدار بلا مشقت اس کو کھول سکے۔ اور گھر پر قبضہ یہ ہے کہ خریدار اس کا تالا لگا سکتا ہو، جبکہ وہ گھر شہر میں ہو۔ اور چراگاہ میں قبضہ گائے کا یہ ہے کہ اس کو دیکھا جاسکے اور اس کی طرف اشارہ ہو سکے اور کپڑے میں قبضہ یہ ہے کہ مشتری ادھر ہاتھ پھیلائے تو کپڑے تک پہنچ جائے اور گھوڑے یا پرندے پر جو کسی گھر میں ہوں قبضہ یہ ہے کہ اس مکان سے بلا کسی مددگار کے خریدار کا ان کو پکڑ لینا ممکن ہو۔

اشیائے منقولہ وغیر منقولہ کا حکم:

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اشیائے منقولہ وغیر منقولہ میں باعتبار حکم فرق ہے۔ اشیائے غیر منقولہ میں ان حضرات کے یہاں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں:

”ولكن أبو حنيفة قال: لا بأس ببيع الدور والأرضين قبل القبض؛ لأنها لا تنتقل ولا تحول“ (عمدة القاری ۵۰۴۹)۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ گھر اور زمین کو قبل القبض بیچنے میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ ابن نجیم نے امام ابو یوسف کو اس مسئلہ میں امام صاحب کے ساتھ بتایا ہے۔

”صح بيع العقار قبل قبضه أي عند أبي حنيفة وأبي يوسف“ (البحر الرائق ۶۰۱۱۶)۔

زمین کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت صحیح ہے، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک، البتہ امام مالک اور ابن المنذر کے نزدیک طعام کی قسم کی جملہ اشیاء میں جو از قسم مکلیل و موزون ہوں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، مگر طعام کے علاوہ چیزوں میں جائز ہے۔

لیکن امام مالک اور امام احمد کی ایک روایت اور امام شافعی کے قول جدید کے مطابق ہر چیز میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، یہی مذہب حضرت ابن عباس، عطاء بن ابی رباح اور ثوری، ابن عیینہ، ابوحنیفہ، ابو یوسف و محمد سے منقول ہے (عمدة القاری ۴۷۹۵)۔

علت نہی:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں اور علت نہی غرر ہے۔

ابن نجیم لکھتے ہیں: ”لا يبيع المنقول أي لا يصح لنهيه ﷺ عن بيع ماله يقبض ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“ (البحر الرائق ۶۰۱۱۶)۔ (منقول شے کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل القبض بیع کو منع فرمادینے کی وجہ سے اور اس لئے بھی کہ اس میں غیر مقبوض سامان کی ہلاکت کے اعتبار سے عقد بیع ٹوٹ جانے کا غرر (خطرہ) ہے)۔

ممانعت عام ہے یا خاص:..... قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ ائمہ اربعہ اور فقہاء کے مسالک کی تفصیل پیچھے بیان کی جا چکی ہے۔ ہب، صدقہ، قرضہ، غلام اور باندی کا نکاح اور وصیت وغیرہ امور قبل القبض درست ہیں (البحر الرائق ۱۱۷۶)۔

## ایک مخصوص صورت مسئلہ:

ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا ہے۔ بلکہ براہ راست فیکٹری سے مال خرید کر خریدار نمبر ۲ کو روانہ کر دیتا ہے اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر ۲ کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ضائع ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری فیکٹری پر آتی ہے نہ خریدار نمبر ۲ پر بلکہ یہ اسی شخص (خریدار نمبر ۱) کا نقصان قرار پاتا ہے۔ اس صورت معاملہ میں اگرچہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر حسی قبضہ نہیں ہوا۔ لیکن وہ مال خریدار نمبر ۲ تک پہنچنے سے پہلے اس کے ضمان میں رہا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ”بائع مضمّن“ (اس چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضامن نہ ہو) حاصل کیا، بلکہ اس نے مال مضمون پر نفع حاصل کیا ہے۔

تو اس صورت معاملہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ چونکہ خریدار اول نے اگرچہ فیکٹری کے مال پر حسی قبضہ نہیں کیا ہے، لیکن چونکہ فیکٹری کے مالک، یا اس کے وکیل نے وہ مال اپنی ملک سے بحق مشتری فارغ کر دیا اور خریدار اول کے لئے بلا مشقت اس پر قبضہ کر لیتا ممکن ہے، بنا بریں اس پر قبضہ حکمی متحقق ہے۔ اور اس بنیاد پر خریدار اول کو یہ سامان خریدار نمبر ۲ سے بیچنا جائز ہے۔

فیکٹری کے مال کا خریدار اول کے ضمان میں رہنا بھی قبضہ حکمی کے معنی میں ہے، اس لئے اس کی بیع صحیح ہے۔

ایک فقہی جزئیہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

”ومن القبض مالو أودعه المشتري عند أجنبي أو أعاره وأمر البائع بالتسليم إليه“ (شامی ۴، ۴۲)۔

(اور یہ بھی قبضہ کی صورت ہے کہ خریدار نے مال کو کسی اجنبی کے پاس امانت رکھنے یا اس کو ادھار دینے کو کہا اور بائع کو حکم دیا کہ یہ بیع اس کے حوالے کر دے)۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں جب خریدار اول فیکٹری سے خریدار نمبر ۲ کو مال روانہ کر دیتا ہے تو گویا وہ بائع کو اپنی طرف سے خریدار نمبر ۲ کو سپرد کرنے کا پابند کر رہا ہے، اس صورت میں خریدار اول بیع پر حکماً قابض ہو جاتا ہے۔ مال کا خورد روانہ کرنا یا فیکٹری کے ذرائع سے روانہ کرنا اس کی دلیل ہے۔

اور ایسی شکل میں اس کا کسی دوسرے خریدار سے مال بیچنا اور اس پر نفع کمانا جائز ہے۔ مال کا اس کی ضمان میں ہونا قبضہ حکمی کے درجہ میں ہے۔

## شپنگ کا حکم:

وہ صورت جس میں بین الاقوامی تجارت میں شپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے جبکہ مال سمندر میں ہوتی سرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دیتا ہے اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے۔

اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ شپنگ مشتری کے لئے اس شیشی یا بوری کی طرح ہے جسے بائع کے حوالے کر کے مشتری نے یہ کہہ دیا ہو کہ اس میں تیل، یا غلہ وزن کر کے بھر دے۔

اب خواہ تیل وزن کرتے وقت یا غلہ بھرنے کے وقت مشتری وہاں موجود ہو یا نہ ہو، ہر دو صورت میں یہ بیع و شراء درست ہے، کیونکہ تیل یا غلہ کے لئے مشتری کا اپنی شیشی یا بوری پیش کر دینا ہی اس کے قبضہ کے قائم مقام ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”ومنہ مالو اشتری دھنا و دفعہ قارورة یزنہ فیہا فوزنہ فیہا بحضرة المشتري فهو قبض و کذا بغیثہ فی الأصح“ (شامی ۴، ۴۲)۔

(اور قبضہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مشتری نے تیل خرید کر شیشی بائع کے سپرد کر دی کہ اس میں تیل وزن کر دے۔ پس اس نے اس میں مشتری کی موجودگی میں تیل وزن کر دیا تو یہ قبضہ مانا جائے گا، اور یہ حکم صحیح قول کے مطابق اس کی غیر موجودگی میں بھی ہے)۔

یہاں مشتری اول نے بائع کو شپ کے ذریعہ مال بھیجنے کا آرڈر دے کر صورت حال اسی قسم کی بنا دی ہے جس میں کوئی خریدار اپنی خرید کردہ چیز کو قبضہ میں



لینے کے لئے بوری یا شیشی پیش کر دیتا ہے، اگرچہ شپ بوری یا شیشی کی طرح اس کی ملک نہیں ہے، لیکن اگر مشتری کسی دوسرے سے لے کر بائع کو بیع بوری میں بھر دینے کا حکم دے دے تب بھی قبضہ حکمی معتبر مانا جائے گا، اسی طرح جب شپ کو مشتری نے اپنی خرید کردہ اشیاء کی منتقلی کا ذریعہ بنایا اور بائع کو ایسا کرنے کو کہا تو یہ قبضہ حکمی کے معنی میں ہو گیا، لہذا بائع اول اور مشتری اول کے حق میں اس بیع و شراء کو جائز قرار دیا جانا چاہئے۔

البتہ بائع ثانی اور مشتری ثانی کے حق میں بیع و شراء کو درست قرار دینا مشکل ہے، کیونکہ مال جب تک سمندر میں ہے بائع ثانی کے لئے غیر مقدور لتسلیم اور مشتری ثانی کے حق میں غیر مقبوض ہے، اور یہ بیع غرر کے ذیل میں آتا ہے۔ جو شریعت اسلامی میں ممنوع ہے، لہذا مال ضائع ہو جانے کی شکل میں مشتری ثانی یعنی دوسرے نمبر کے خریدار پر ثمن کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی۔

”لا یجب علی المشتري دفع الثمن لعدم القبض“ (شامی ۴، ۴۳)۔ مشتری پر ثمن کی ادائیگی لازم نہیں۔ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے۔

### خلاصہ بحث:

- ۱۔ بیع قبل القبض احادیث نبویہ اور تصریحات فقہیہ کے مطابق ناجائز ہے۔
- ۲۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع بیع کی فاسد قسم میں داخل ہے۔
- ۳۔ اشیاء غیر منقولہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے۔ امام مالکؒ کے مسلک میں کھانے کی قسم کے علاوہ اشیاء میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے۔ باقی ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے۔
- ۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق احادیث معلول بالعلۃ ہیں اور علت نہی غرر انفساخ العقد ہے۔
- ۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام نہیں ہے، بلکہ بعض چیزیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے امام اعظمؒ و امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اشیاء غیر منقولہ۔ اور ہبہ، صدقہ، قرضہ، وصیت، اور غلام و باندی کا نکاح۔
- ۶۔ فیکٹری سے مال خرید کر روانہ کر دینا خریدار اول کے ضمان میں داخل ہے جو قبضہ حکمی کی طرح ہے۔ اس پر خریدار اول کا کسی دوسرے شخص کے ہاتھ مال بیع دینا اور اس پر نفع حاصل کرنا جائز ہے۔
- ۷۔ شپنگ کی رائج الوقت صورت معاملہ میں خریدار اول اور بائع کے درمیان کا معاملہ بیع و شراء درست ہے۔ البتہ خریدار اول کا دوسرے خریدار کو مال بیچنا، جب کہ مال سمندر میں ہو غیر مقدور لتسلیم اور مقبوض ہونے کی بنا پر جائز نہیں ہے۔ اگر یہ معاملہ کر لیا گیا تو خریدار ثانی پر ثمن کی ادائیگی لازم نہیں ہے۔



## بیع و شراء میں قبضہ حسی و حکمی کی نوعیت

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی

### قبضہ کی حقیقت:

قبضہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع کو اس طرح الگ کر کے رکھ دے اور موانع کو اٹھا دے کہ مشتری جب چاہے اس میں تصرف کر سکے۔ ”بدائع“ میں ہے: ”فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له“ (بدائع ۵۰۲۲۲) تخلیہ اور تمام موانع کے ارتقاع کے باوجود اگر مشتری بیع نہیں لے گیا تو بھی اسی کا قبضہ سمجھا جائے گا، کیونکہ قبضہ کے لئے حسی طور پر ہاتھ میں لینا اور بائع کے یہاں سے اسے منتقل کر لینا لازم نہیں ہے، بدائع میں ہے:

”ثم لا خلاف بين أصحابنا أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال“ (بدائع ۵۰۲۲۲)۔

اسی طرح ہر چیز میں قبضہ کے لئے جو تخلی اور ارتقاع موانع مطلوب ہے، اس کا مدار شریعت نے عرف و عادت پر چھوڑ دیا ہے، چنانچہ جس درجہ کا استیلاء اور عمل دخل لوگوں کے عرف و عادت میں قبضہ مانا جاتا ہے، اسی درجہ کا استیلاء اور عمل دخل ضروری ہوگا، بدائع میں ہے: ”ولا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع ۵۰۱۲۸)۔

### قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں ائمہ کے مذاہب:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلے میں ائمہ کی آرا مختلف ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک غیر منقولہ اشیاء کے علاوہ تمام چیزوں میں تصرف کیلئے قبضہ شرط ہے، امام مالکؒ کے یہاں طعام ربوی کے علاوہ میں قبضہ شرط نہیں ہے، جب کہ امام شافعیؒ تمام بیع میں قبضہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، یہی رائے صاحبین، عبداللہ ابن عباس اور ثوری کی ہے، ایک رائے ابو عبید اور اسحقؒ کی بھی ہے کہ جو اشیاء کیلی اور وزنی نہیں ہیں، ان کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست ہے، ابن حبیب عبد العزیز بن ابوسلمہ اور ربیعہ، کیلی اور وزنی کے ساتھ عدوی کا بھی اضافہ کرتے ہیں، امام احمدؒ، ابو ثور اور امام مالکؒ کی مشہور روایت یہ ہے کہ طعام ربوی ہوں، یا غیر ربوی، دونوں میں قبضہ شرط ہے، ابن رشد نے لکھا ہے:

”وأما بيع ما سوى الطعام قبل القبض فلا خلاف في مذهب مالك في إجازته، وأما الطعام الربوي فلا خلاف في مذهبه أن القبض شرط في بيعه، وأما غير الربوي من الطعام فعنه في ذلك روايتان: إحداهما: لا منع، وهي الأشهر، وبه قال أحمد وأبو ثور، إلا أنهما اشترطا مع الطعام الكيل والوزن، والرواية الأخرى الجواز، وأما أبو حنيفة فالقبض عنده شرط في كل مبيع ما عد المبيعات التي لا تنتقل ولا تحول من الدور و الحقار، وأما الشافعي فإن القبض عنده شرط في كل مبيع، وبه قال الثوري، وهو مروى عن جابر بن عبد الله وابن عباس وقال أبو عبید وإسحق: كل شيء لا يكال ولا يوزن فلا بأس ببيعه قبل قبضه واشترط هؤلاء القبض في المكيل والموزون، وبه قال ابن حبیب وعبد العزيز بن أبي سلمة وربيعة، وزاد هؤلاء مع الكيل والوزن والمعدود“ (بداية المجتهد ۲۰۱۰۸)۔

### قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا حکم:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت شرعاً ممنوع ہے، اور یہ ممانعت معلول بعلت ہے، علامہ کاسانی نے لکھا ہے: ”لأنه بيع فيه غرر الإنفساخ“

نائب ناظم، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

بہلاک المعقود علیہ“ (بدائع ۵۰۱۸۰)، اور جو بیع غرر کی وجہ سے ممنوع ہو، وہ بیع فاسد ہوتی ہے باطل نہیں، موطا امام محمد میں ہے: ”قال محمد: وبهذا نأخذ ببيع الغرر كله فاسد وهو قول أبي حنيفة والعمامة“ (موطا الإمام محمد: باب ببيع الغرر)۔

غیر منقولہ اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت:

ممانعت کے معلول بعلت ہونے کی وجہ سے ہی غیر منقولہ اشیاء میں قبضہ سے پہلے تصرف درست ہے، کیونکہ اس میں معقود علیہ کی ہلاکت کا خطرہ نہیں ہو تا۔ ”الفقه على المذاهب الأربعة“ میں ہے:

”وأما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض والضياع والنخيل والدور، ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها، فإنه يصح“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۲۰۲۲)۔

البتہ جابر بن عبد اللہ، ابن عباس، امام محمد، امام زفر اور امام شافعی ممانعت کو معلول بعلت نہیں قرار دیتے، اس لئے ان کے نزدیک اشیاء منقولہ ہوں، یا غیر منقولہ، قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام ہے اور سب کو شامل ہے، لہذا ان حضرات کے نزدیک غیر منقولہ اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست نہیں ہوگی۔

ضمان۔ قبضہ کی ایک شکل:

قبضہ کی ایک شکل ضمان بھی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے مال فیکٹری سے خرید کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا، اور فیکٹری نے خریدار اول کے کہنے پر اس پر قبضہ کئے بغیر خریدار نمبر دو کے پاس روانہ کر دیا، اور خریدار اول نے یہ ذمہ داری لی کہ اگر مال درمیان میں ہلاک ہو جائے اور خریدار نمبر دو تک نہ پہنچے تو وہ اس کا ضامن ہے، اس صورت میں جو نقصان ہو وہ مشتری اول کا ہوگا، تو منقولہ اشیاء ہونے کے باوجود اس طرح کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست ہوگی، اور ضمان قبضہ حسی کے قائم مقام ہوگا۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جن حضرات نے کیلی اور روزنی چیزوں میں قبضہ کو ضروری قرار دیا ہے، انکے یہاں کیل و وزن کرنے سے ہی بیع مشتری کے ضمان میں چلی جاتی ہے، بدایۃ المجتہد میں ہے:

”وأما من اعتبر الكيل والوزن، فلا تفاقهم أن الكيل والموزون لا يخرج من ضمان البائع إلى ضمان المشتري إلا بالكيل أو الوزن“ (بدایۃ المجتہد ۲۰۱۰۹)۔ لہذا جس وقت بائع نے مشتری کے لئے اس کو الگ کیا، بیع مشتری کے ضمان میں چلی گئی اور اس نے جو فروختگی کا معاملہ کیا، وہ رسک لے کے کیا، اس لئے اسے ”بیع مالم یضمّن“ قرار نہیں دیا جاسکتا، رہ گیا فیکٹری کا ڈائریکٹ مشتری ثانی کو مال روانہ کرنا تو یہ مشتری اول کے وکیل کی حیثیت سے ہے، جو شرعاً درست ہے۔

اس کے برعکس جب مال جہاز پر چڑھا دیا گیا، اور مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ہلاکت کا ذمہ بائع نے نہیں لیا، نیز مشتری نے بھی کوئی ذمہ داری نہیں لی، بلکہ مشتری ثانی کے سرسار رسک ڈال دیا، ایسے میں مشتری اول کا قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہیں ہوگا۔ بلکہ ”بیع مالم یضمّن“ کی ممانعت کی وجہ سے ایسی بیع ممنوع اور فاسد ہوگی۔





## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور ائمہ کا موقف

مفتی احمد ریوڑی علیہ

۱۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف:

حنفیہ: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اشیاء منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں اور غیر منقولہ جائداد وغیرہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے۔

شافعیہ: استقرار (قبضہ) سے پہلے بیع درست نہیں، خواہ اشیاء منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، امام محمد کا بھی یہی مسلک ہے۔

مالکیہ: صرف طعام کی بیع قبل قبضہ جائز نہیں، اس کے علاوہ میں جائز ہے۔

حنابلہ: مکملی و موزونی اور معدودی اشیاء کی بیع قبل قبضہ جائز نہیں، اس کے علاوہ میں جائز ہے۔ مولانا ظفر احمد تھانویؒ شرح مہذب کے حوالے سے

اختلاف ائمہ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”قد ذکرنا أن مذهبنا بطلانه مطلقاً سواء كان طعاماً أو غيره وبه قال ابن عباس، وثبت ذلك عنه ومحمد بن

الحسن۔

قال ابن المنذر: أجمع العلماء على أن من اشترى طعاماً فليس له بيعه حتى أن يقبضه قال: اختلفوا في غير

الطعام على أربعة مذاهب:

أحدها: لا يجوز بيع شيء قبل قبضه سواء جميع المبيعات كما في الطعام قاله الشافعي ومحمد بن الحسن۔

والثاني: يجوز بيع كل مبيع قبل قبضه إلا المكيل والموزون قاله عثمان بن عفان وسعيد بن المسيب

والحسن والحكم وحماد والأوزاعي وأحمد وإسحاق۔

والثالث: لا يجوز بيع مبيع قبل قبضه إلا الدور والأرض قاله أبو حنيفة وأبو يوسف۔

والرابع: يجوز بيع كل مبيع قبل قبضه إلا المأكول والمشروب قاله مالك وأبو ثور“ (إعلاء السنن ۱۴، ۲۲۷، الفقه على

مذاهب الأربعة ۲، ۲۲۲)۔

شواہد کے نزدیک یہ بیع باطل ہے جیسے کہ امام نوویؒ کی عبارت ”قد ذکرنا أن مذهبنا بطلانه مطلقاً“ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

”الفقه على المذاهب الأربعة“ میں بھی باطل کا ہی لفظ ہے: ”فإذا اشترى شيئاً منقولاً كان أو غيره ولم يسلمه، ثم باعه وقعه البيع باطلاً“ (۲، ۲۲۲)۔

حنفیہ نے اسے بیع فاسد میں سے شمار کیا ہے۔

۲۔ قبضہ کی حقیقت:

فقہائے حنفیہ کے نزدیک قبضہ کا مفہوم وسیع ہے۔ عند الاحناف قبضہ کا حاصل صرف تخلیہ ہے، اور تخلیہ کا حاصل ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان باعتبار

حقیقت یا باعتبار عرف و عادت کے ایسا کوئی مانع اور حائل نہ ہو جو عرفی قبضہ اور تصرف کرنے سے مانع ہو، بلکہ بیع اس حال میں ہو کہ مشتری اگر اس میں تصرف کرنا

بانی و مہتمم جامعہ علوم القرآن، جبوسر، بھروج، گجرات۔

چاہے تو آزادی کے ساتھ تصرف کر سکے گو بیع ابھی بائع کے پاس موجود ہو۔

”وأما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً“ (بدائع ۵، ۲۳۳)۔

دوسری جگہ ہے: ”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع ۵، ۱۳۸)۔

”ولهذا كانت التخلية تسليماً وقبضاً فيما لا مثل له“ (بدائع ۵، ۲۳۳)۔

ایک شئی کے بائع کے پاس ہونے کے باوجود مشتری کا قبضہ شمار کیا جاتا ہے، جبکہ معاملہ ہو چکا ہو۔ بائع میں ایک مسئلہ ہے: ”ولو اشترى من إنسان كزراً بعينه و دفع غرائره وأمره بأن يوكل فيها ففعل فصار قابضاً سواء كان المشتري حاضراً أو غائباً لأن المعقود عليه معين وقدم ملكه المشتري بنفس العقد فصح أمر المشتري لأنه يتناول عيناهو ملكه فصح أمره وصار البائع وكيلاً له وصارت يده يد المشتري وكذلك الطحن إذا طحنه البائع بأمر المشتري صار قابضاً“ (بدائع ۵، ۲۳۴)۔

”بحر الرائق“ میں ہے: ”وذكر في الذخيرة إذا اشترى ما هو أمانة في يده من ودیعة أو عارية فإنه لا يكون قابضاً إلا إذا ذهب المودع أو المستعير إلى العين وانتهى إلى مكان يتمكن من قبضها فيصير الآن قابضاً بالتخلية“ (البحر الرائق ۶، ۸۷، رد المحتار ۲، ۱۱۲)۔

شوافع کے یہاں قبضہ کی تفسیر بیع کو منتقل کر کے اپنے مقام تک پہنچانے کی ہے۔

”وقال الشافعي: القبض في الدار والعقار والشجر بالتخلية، وأما في الدراهم والدنانير فتناولها بالبراجم وفي الثياب بالنقل“ (بدائع ۵، ۱۳۸)۔

مولانا ظفر احمد تھانوی فرماتے ہیں: ”قال الموفق في ”المغنی“: وقبض كل شيء بحسبه فإن كان مكيلاً أو موزوناً قبضه بكيه ووزنه وبهذا قال الشافعي، وقال أبو حنيفة: التخلية في ذلك قبض وقد روى أبو الخطاب عن أحمد رواية أخرى إن القبض في كل شيء بالتخلية مع التمييز: لأنه خلى بينه وبين المبيع من غير حائل فكان قبضاً له“ (اعلاء ۱۴، ۱۵۳)۔

### ۳۔ منقول اور غیر منقول اشیاء میں فرق:

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں، البتہ غیر منقولی اشیاء کی بیع جائز ہے۔ امام محمد کے نزدیک دونوں کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، شیخین کی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ جائداد وغیرہ میں ہلاکت شاذ و نادر ہوتی ہے، اس کے برخلاف منقولی اشیاء میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ ”ہدایہ“ میں ہے: ”ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر منقول اشیاء میں قبل القبض جواز کی علت ہلاکت کے خطرہ کا کم ہونا اور عقد کو فسخ کرنے والے عذر کا نہ ہونا ہے۔

ما قبل میں قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے واضح کیا گیا کہ عند الاحناف قبضہ کی تعریف میں بہت وسعت ہے، لہذا بظاہر دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، البتہ منقول اشیاء کے قبضہ میں ہلاکت کا خطرہ اور فسخ کی شکل کا امکان ہے، لہذا اس میں پہلو کا لحاظ کرتے ہوئے قبضہ کی تعیین کی جائے گی، جبکہ غیر منقولی اشیاء میں وسعت کا پہلو زیادہ ہوگا۔ ان اسباب مذکورہ کے نہ ہونے کی وجہ سے علامہ ابن ہمام غیر منقولی اشیاء کو بھی منقولی کی طرح (ہلاکت کے خطرہ کی شکل میں) قبل القبض فروخت کرنے سے منع فرمایا۔ ”وهذا؛ لأنه لا يتصور هلاكه إلا إذا صار حجراً ونحوه حتى قال بعض المشائخ: إن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن يصير حجراً لو يغلب عليه الرمال، فأما في موضع لا يؤمن عليه ذلك فلا يجوز كما في المنقول ذكره المحبوبي، وفي الاختيار: حتى لو كان على شط البحر أو كان المبيع علواً لا يجوز بيعه قبل القبض“۔

لہذا منقول اور غیر منقول اشیاء میں تنوع اور کیفیات کے بدلنے سے حکم میں تبدیلی آ سکتی ہے، اگرچہ عام حالات میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

## ۴۔ احادیث کا معلول بالعلت ہونا:

صاحب ”ہدایہ“ نے بیع العقار میں شیخین کے دلائل ذکر کرتے ہوئے امام محمد کے جواب میں فرمایا کہ حدیث ”معلول بالعلت“ ہے۔ ”والحدیث معلول بہ عملاً بدلائل الجواز“۔

علامہ ابن ہمام نے اسکی علت میں فرمایا: ”(معلول بہ) أي بغرر الانفساخ والدلیل علیہ أن التصرف الذی لا یمتنع بالغرر نافذ فی المبیع قبل القبض وهو العتق والتزوج علیہ“ (فتح القدیر ۶۰۵۱۳)۔

صاحب ”عناویہ“ نے وضاحت کے ساتھ علت (غرر) کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب زمین وغیرہ میں ہلاکت نادر ہے تو عقد کے فسخ ہونے کا غرر جس سے روکا گیا وہ منتفی ہو جائیگا، اور حدیث شریف معلول بانفساخ ہے لہذا جائز ادا سمیں داخل ہوگی اور اسکی بیع قبل القبض جائز ہوگی، کتاب وسنت واجماع کی دلیل جواز پر عمل کرتے ہوئے آگے فرماتے ہیں: ”وإذا کان الحدیث معلولاً بغير الانفساخ لا یحتمل تناول مالیس فیہ ذلک“ (عناویہ مع الفتح ۶۰۵۱۳)۔

## ۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت:

اس سلسلہ میں احادیث مبارکہ کے الفاظ مختلف ہیں، اور فقہاء کرام نے اس میں تخصیص کر کے بہت سی اشیاء کو حکم سے خارج کیا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں نقل مذاہب کے سلسلہ میں گذر چکا۔

امام مالک ”صرف غلہ میں ناجائز اور بقیہ تمام چیزوں میں جائز قرار دیتے ہیں: ”کل ما اشتریت من العروض کلھا حیوان والعقار و الثیاب و غیر ذلک ما خلا المبیع من الطعام علی الکیل، فلا بأس عند مالک أن تبیع ذلک کلہ قبل أن تقبضہ“۔

مگر اس میں عجلت کرنی چاہئے تاخیر نہ کرے۔ ”إذا تعجلت ذلک ولم تؤخره“ (کتاب الکافی ۲۰۲۲)۔

امام مالک کی دلیل حضرت ابن عمر کی وہ حدیث ہے جو اپنی کتاب ”موطا“ میں بیان کی ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کوئی اناج خرید تو وہ اسے فروخت نہ کرے جب تک وہ اس پر پوری طرح قابض نہ ہو جائے۔ ”عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ ﷺ قال: من ابتاع طعاماً، فلا یبعہ حتی یتوفیہ“ (موطا امام مالک کتاب البیوع ۲۶۳)۔

”عن حکیم بن حزام قال قلت یا رسول اللہ انی رجل مبتاع هذه البیوع وأبیعها فما یحل لی منها وما یحرم؟ قال: لا تبیعن شیئاً حتی تقبضہ“ (فتح القدیر ۲۰۵۱۱، اعلاء السنن ۱۳۰۲۲۳)۔

اس میں تمام چیزوں کی بیع قبل القبض ناجائز و حرام فرمایا، نیز حضرت ابن عباسؓ کا اجتہادی قول بھی یہی ہے کہ غیر طعام کو بھی طعام کی طرح قبل القبض بیچنا جائز نہیں ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: ”قلنا: قد رواہ ابن عباس ایضاً قال: وأحسب کل شیء مثل الطعام أخرجہ عنہ أئمة الکتب الستة“ (فتح القدیر ۶۰۵۱۱)۔ امام اعظم اور امام ابو یوسف بمنقولی اشیاء کو نبی عن بیع الملم یقبض کی وجہ سے ناجائز فرماتے ہیں اور غیر منقولی کو علت عدم غرر کی وجہ سے جائز قرار دیتے ہیں۔

امام صاحب کی دلیل حضرت عثمان بن عفانؓ کی روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنی کوفہ کی زمین بغیر دیکھے فروخت کی، یہ دلیل ہے کہ آپ نے قبل القبض بیچی کیونکہ قبضہ رویت کو مستلزم ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب اعتراض نقل کرتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عثمانؓ نے وکیل کے واسطے سے قبضہ کیا ہو؟ تو ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ وکیل کی رویت بھی مؤکل کی ہی رویت ہے اور جبکہ روایت میں خود اس احتمال کو دور کرنے والا لفظ ہے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ”بعثتک ما لم أرہ فیطل احتمال رویتہ بواسطۃ الوکیل وقبضہ بقبضہ“۔ حضرت عثمانؓ کی روایت امام نووی ”شرح مہذب“ میں ”مسلم شریف“ کے حوالے سے نقل کر کے اس میں ایک راوی کے مجہول اور مختلف الاحتجاج ہونے کو ذکر کیا ہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ”قلت: و مسدہ



لا یروی عن مجهول، ولا لمجهول فالحدیث حسن حجة“ (اعلاء ۲۲۹، ۱۳)۔

اسی طرح کی روایت ابو داؤد میں بھی حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے جس میں ”نهی عن بیع مالہ یقبض“ کے الفاظ ہیں..... (نصب الرایہ ۳۲۱۹، ۴) شوافع کی مستدل روایت حدیث حکیم بن حزم پر محدثین نے کلام کیا ہے، لیکن ابن ہمام نے رجال پر گفتگو کرتے ہوئے حدیث بالا کو حجت قرار دیا ہے، ”والحق ان الحدیث حجة والذی قبلہ كذلك“۔

پھر اس کی تخصیص کی دلیل کو ذکر کیا ہے: ”والحاجة بعد ذلك إلى دلیل التخصیص بغیر العقار لأبی حنیفة بذكر هناك والأحادیث كثيرة فی هذا المعنی“ (فتح القدیر ۲، ۵۱۲)۔

## ۶۔ قبضہ ضمان:

فقہائے کرام نے قبضہ کی جو تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے جزئیات ذکر فرمائے ہیں ان سے بخوبی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قبضہ حسی کا ہونا ضروری نہیں ہے (شامی ۴، ۳۷۷-۳۸)۔

قبضہ کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے فقہاء کرام نے اس کی مختلف قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ قبضہ امانت، ۲۔ قبضہ ضمان۔

پھر قبضہ ضمان کی دو قسمیں ہیں: ضمان بنفسہ، ضمان بغيرہ۔ اور ہر ایک کا حکم بھی جدا گانہ ہے۔

(۱) مشتری کو اگر بیع پر پہلے سے قبضہ حاصل ہے اور وہ قبضہ ضمان بنفسہ کا ہے، مثلاً غاصب کا قبضہ شیء مغبوب پر۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بیع موجود ہو یا نہیں، بہر حال سابق قبضہ جدید قبضہ کے لئے کافی ہوگا اور تجدید قبضہ کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ غاصب کا قبضہ ضمان بنفسہ ہے، اور مغبوب شیء بہر صورت مضمون بنفسہ ہے۔

(۲) اگر بیع پر مشتری کا قبضہ ضمان بغيرہ کا ہے، مثلاً شیء مرہون پر، راہن کا قبضہ تو راہن امانت ہوتا ہے، البتہ مضمون بغير (قرض کی وجہ سے) ہوتا ہے گویا یہ مضمون بنفسہ نہیں، بلکہ بغير ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شیء مرہون موجود ہو تب تو یہ قبضہ جدید قبضہ کی طرف سے کافی ہوگا، ورنہ نہیں۔

(۳) اگر بیع پر مشتری کا قبضہ قبضہ امانت ہو مثلاً عاریت، ودیعت، وکالت، اجارہ کا قبضہ، کہ یہ سارے قبضے قبضہ امانت کہلاتے ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ یہ امانت والے قبضے ضمان والے قبضے (بیع کے لئے) کافی نہ ہوں گے، بلکہ تجدید قبضہ شرط ہے (بدائع الصنائع ۲۳۸، شامی ۴، ۳۷۷-۳۸)۔

ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگر بائع نے حسی قبضہ نہ کیا ہو، لیکن ضامن ہو گیا تو اس کو قبضہ ضمان کے درجہ میں شمار کر کے خرید و فروخت جائز قرار دیا جائے گا۔

۷۔ صورت مسئلہ میں جب مشتری کا کسی قسم کا قبضہ پایا نہیں جاتا اس سے پہلے ہی بائع اپنے ضمان سے بری ہو جاتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، لہذا بائع کے لئے ایسا سودا کرنا جائز نہیں ہے، اور جب مشتری اس کا مالک نہیں ہوتا تو بیع معدوم ”مالیس عندک“ اور ”مالہ یقبض“ کے درجہ میں رکھتے ہوئے اس کے لئے بھی تیسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

شامی میں ہے: ”اشتری بقرة مریضة و خلاها فی منزل البائعه قائلان ان هلكت فمنی وماتت فمن البائعه لعدم القبض، وكذا لو قال للبائعه: سقمها إلى منزلک فاذهب فاستلمها فهلكت حال سوق البائعه، فإن ادعى البائعه التسليم فالقول للمشتري“۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی ہے: ”اشتری وعاء لبن خائری فی السوق فأمر البائعه بنقله إلى منزله فسقط فی الطريق فعلى البائعه ان لم یقبضه المشتري“ (۴، ۳۸) ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اصل بائع کا ذمہ مشتری کے قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، اور ہلاکت کی نسبت بائع کی طرف ہوتی ہے نہ کہ مشتری کی طرف، اور تیسرا خریدار کیسے ضامن ہو سکتا ہے، جبکہ بائع اور مشتری کے درمیان ہی بیع صحیح نہ ہوئی، لہذا اس قسم کی خرید و فروخت شرعاً ناجائز ہوگی۔



## خرید و فروخت میں وثیقہ اور دستاویزات کی حیثیت

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی ؒ

- ۱۔ ”بیع قبل القبض“ ناجائز ہے، ”ربا الفضل“ و ”ربا النسیئہ“ کے تحت آنے والے مبادلات میں فوری قبضہ نہ ہونے کی شکل میں یہ بیع یا مبادلہ باطل ہوگا، دیگر اشیاء میں قبضہ کی نوعیت کے مطابق بیع فاسد یا مکروہ ہوگی۔
  - ۲۔ کتاب اللہ اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہے۔ اور سنت میں طعام کو ناپ لینے یا وزن کر لینے یا خرید کی جگہ سے منتقل کر لینے کو قبضہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، بقیہ اشیاء کے سلسلہ میں کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے اسے عرف و عادت پر چھوڑ دینا چاہئے، اور یہ صحیح ہوگا کہ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے۔
  - ۳۔ مذکورہ بالا اصل کے مطابق نہ صرف اشیاء منقولہ و غیر منقولہ بلکہ ہر چیز کی نوعیت و مزاج کے مطابق قبضہ کی شکل میں فرق ہوگا۔
  - ۴۔ ”بیع قبل القبض“ کی نہی کی بہت سی حکمتیں ہو سکتی ہیں، جہاں تک علت کا سوال ہے جن لوگوں نے اسے مطعومات تک محدود کیا ہے ان کے نزدیک علت ”طعام“ ہونا ہے، کچھ کے نزدیک کیلی، وزنی یا عددی ہونا ہے، بیع قبل القبض کی نہی کا عموم اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ نفس بیع یا مبادلہ بالمال ہی کو علت مانا جائے۔
  - ۵۔ ”بیع قبل القبض“ کے متعلق ائمہ مجتہدین سے سات طرح کے اقوال منقول ہیں۔ (۱) یہ نہی صرف مطعومات ربویہ تک محدود ہے (۲) مطلق مطعومات میں ہے (۳) ان مطعومات میں ہے جو کیلی یا وزنی ہیں (۴) ہر اس چیز میں جو قابل انتقال ہو (۵) بلا قید ہر چیز میں قبضہ شرط ہے (۶) ہر اس چیز میں جو کیلی یا وزنی، (۷) ہر اس چیز میں جو کیلی، وزنی یا عددی ہو (از بدایہ ابن رشد)۔
- اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ خود روایات اس سلسلہ میں مختلف یا مجمل ہیں۔
- ۶۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی کمرشیل رول (تجارتی قانون) نہیں ہے تو عرف و عادت کے مطابق ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔
  - ۷۔ یہ شکل مذکورہ بالا سے متناقض ہے، لیکن چونکہ بر کے بجائے بحر کا معاملہ ہے اس وجہ سے دستاویزات کے تبادلے کو قبضہ کا قائم مقام سمجھا جاسکتا ہے پھر بھی چونکہ اس میں تلتی جلب کی صورت پائی جاتی ہے اس لئے کراہیت سے خالی نہیں۔

☆☆☆

## شریعت میں قبضہ کا مفہوم و مصداق

مولانا محمد ابراہیم گجیا فلاحی ع

قبضہ کی حقیقت؟

اس سلسلہ میں ایضاح المسائل میں ”بدائع“ کے حوالہ سے بہت ہی اچھی وضاحت فرمائی گئی ہے، ایضاح کی عبارت ملاحظہ ہو: کسی شے پر قبضہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہاتھ سے قبضہ کر کے لایا جائے، یا بائع کے یہاں سے حقیقی طور پر منتقل کر دیا جائے، بلکہ قبضہ کے مفہوم میں داخل ہونے کیلئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ بائع بیع کو اپنے مال سے اس طرح الگ کر کے رکھ دے کہ خریدار جب چاہے اپنی مرضی سے اپنی چیز اٹھا کر لیجاسکے، اور اس طرح اٹھا کر لیجانے میں اس پر کوئی رکاوٹ اور پابندی پیش نہ آئے، لہذا اگر بائع نے بیع کو اپنے مال سے اس طرح الگ کر دیا ہے کہ خریدار جب چاہے لے جاسکتا ہے، اور اس درمیان اگر بیع بائع کی طرف سے بغیر کسی تعدی کے ہلاک ہو جائے، یا ضائع ہو جائے تو بائع پر کوئی تاوان نہ ہوگا، بلکہ خریدار کی ملکیت میں سے اس کے گھر میں ہلاک ہو جانے کے حکم میں ہوگا۔

”بدائع“ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں: ”ولا يشترط القبض بالبراجم، لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة وحقيقة الخ“۔

قبضہ حاصل ہونے کے لئے ہاتھ سے قبضہ کر کے لانا شرط نہیں ہے، اس لئے کہ قبضہ کا معنی صرف قبضہ کرنے پر قادر ہونا ہے، اور بائع کا مشتری کے سامنے سامان چھوڑ دینا ہے، اور لوگوں کے عرف میں قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ صحیح معنی میں قبضہ رکاوٹ دور ہو جانے کو کہتے ہیں۔

صاحب ”بدائع“ نے آگے چل کر مزید وضاحت فرمائی ہے:

”ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلي في سائر الأموال“۔ حضرات فقہاء احناف کے مابین اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اصل قبضہ تمام اموال میں بائع کی طرف سے محض اختیار دینے اور سامنے رکھ دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔

آگے صاحب ”بدائع“ کی اور وضاحت ملاحظہ فرمائیں: ”تفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلي والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع، والمشتري قابضاً له“۔ خریدار کو مال بیع سوچنے اور اس کے قبضہ کرنے کی تفصیلی وضاحت ہمارے علماء احناف کے نزدیک یہ یہی ہے کہ خریدار کے لئے تخلیہ کر لیا جائے اور تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع کو خریدار کے لئے اس طرح پیش کر دے کہ درمیان سے رکاوٹ اس طرح دور ہو جائے کہ مشتری کو اس پر تصرف کرنے کی پوری طرح قدرت حاصل ہو جائے تو کہا جائے گا بائع نے بیع کو سونپ دیا اور مشتری نے قبضہ کر لیا۔

اشیاء منقولہ میں قبضہ کی حقیقت:

جو اشیاء منتقل کی جاسکتی ہیں اس کی کل چار قسمیں ہیں:

- ۱۔ کیلی اشیاء: جیسے دودھ، تیل وغیرہ جو کم اکثر ممالک میں کیلی کر کے فروخت کیا جاتا ہے، ایسی اشیاء کو کیلی کر کے الگ کر دینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جاتا ہے۔
- ۲۔ وزنی اشیاء: جیسے دھات، سونا، چاندی وغیرہ، اور اس زمانہ میں چاول وغیرہ بھی وزن کر کے فروخت کیا جاتا ہے، ایسی اشیاء کو وزن کر کے علاحدہ کر دینے سے قبضہ ثابت ہو جاتا ہے۔

ع جامعہ دارالاحسان، بارڈولی، سورت، گجرات۔



۳۔ ذریعہ اور پیمائشی اشیاء: جیسے کپڑے وغیرہ جو پیمائش سے فروخت کیا جاتا ہے، لہذا ایسی اشیاء کو پیمائش کر کے الگ کر دینے سے قبضہ ثابت ہو جائے گا۔  
 ۴۔ عددی اشیاء: جس کو گنتی اور شمار سے فروخت کیا جاتا ہے، جیسے انڈے، جانور، گاڑی وغیرہ، تو ایسی اشیاء کو شمار کر کے الگ کر دینے سے قبضہ ثابت ہو جاتا ہے۔  
 اور ان چاروں اقسام کی اشیاء کو الگ کر دینے کے بعد ثبوت قبضہ کیلئے آزادانہ قدرت حاصل ہونا بھی شرط ہے، علامہ کا سانی علیہ الرحمہ نے بدائع میں ان مسائل کو اس طرح نقل فرمایا ہے۔

”وان باء مکایلة أو موزونة فی المکیل والموزون فلا خلاف فی أن المبیع ینخرج عن ضمان البائع ویدخل فی ضمان المشتري“ (بدائع المنائع)۔ (اور اگر کیلی چیز کو کیل کر کے اور وزنی چیز کو وزن کر کے الگ کر دیا ہے تو اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ شئی بائع کے قبضہ سے نکل کر خریدار کے ذمہ میں داخل ہو جاتی ہے)۔

”فإن کان مما لا مثل له من المذروعات والمعدودات المتقاربة فالتخلية فیها قبض تام بلا خلاف“ (حوالہ سابق)۔ (اگر اشیاء مثلی نہ ہوں، بلکہ ذریعہ اور عددی ہوں تو انہیں الگ کر کے اختیار دینے سے بالاتفاق مکمل قبضہ حاصل ہو جاتا ہے)۔

غیر منقولہ اشیاء کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت:

غیر منقولہ اشیاء، جیسے زمین، مکان، پلاٹ وغیرہ جائداد کا صرف سود اور معاملہ طے ہو جانے کے بعد خریدار کیلئے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینا جائز اور درست ہے۔

صاحب ”ہدایہ“ فرماتے ہیں: ”ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف“۔

اور ”الفقہ علی المذاهب الاربعہ“ میں ہے: ”أما بیع الأعیان غیر المنقولة قبل القبض کبیع الأرض والنخيل والدور ونحو

ذلك“

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث کا معلول بالعلتہ ہونا:

شامی میں ہے: ”(ولعدم الغرر) أي غرر انفساخ العقد علی تقرير الهلاك، وعلله بقوله لندرة هلاك العقار حتی لو كان علواً أو علی شط نهر ونحوه كان كمنقول فلا یصح اتفاقاً“۔ معلوم ہوا کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت والی حدیث کی نص کی علت ”غرر انفساخ العقد علی تقرير الهلاك“ ہے۔

کیونکہ جب بیع قبضہ سے پہلے ہلاک ہو جائے گی تو بیع فسخ ہو کر اصل مالک بائع کی طرف عود کرے گی، اور گویا کہ مشتری بائع کی ملکیت کو فروخت کرنے والا شمار ہوگا۔

”تخریج زیلعی علی احادیث الہدایۃ“ میں ہے: ”عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: قلت: یا رسول اللہ إن رجلاً ابتاع هذه البیوع وأبیعها فما یحل لی منها وما یحرم، قال لا تبعن شیئاً حتی تقبضه“۔

”وأما تأیده بالمعقول كما فی الهدایة غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاك؛ لأنه إذا هلك قبل القبض ینفسخ البیوع وعاد إلى قديم ملك البائع، فیکون المشتري بائعاً ملك غیره“۔

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی جو ممانعت ہے اس کے عام ہونے نہ ہونے میں ائمہ فقہ کے مختلف اقوال ہیں، علامہ عبدالحی صاحب فرنگی محلی علیہ الرحمہ نے اپنے ”موطأ امام محمد“ کے حاشیہ میں اس اختلاف کو تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

”اختلفوا فی هذه المسئلة فقال مالك: یجوز جمیع التصرفات فی غیر الطعام قبل القبض، لورود التخصیص فی الأحادیث بالطعام، وقال أحمد: إن كان المبیع مکیلاً أو موزوناً أو معدوداً لم یجز بیعه قبل القبض، وفی غیره یجوز، وقال زفر ومحمد والشافعی: لا یجوز بیع شیء قبل القبض طعاماً كان أو غیره، لإطلاق الأحادیث وذهب

أبو حنيفة وأبو يوسف إلى جواز بيع غير المنقول قبل القبض، لأن النهي معلول بغير انفساخ العقد بخوف الهلاك، وهو في العقار وغيره نادر، وفي المنقولات غير نادر كذا في البناية (التعليق المسجد)۔

(اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے نزدیک احادیث میں طعام کی قید کی وجہ سے طعام کے علاوہ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز رہے گی، اور حضرت امام احمد علیہ الرحمہ کے یہاں مکملات، موزونات اور معدودات میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، اور امام محمدؒ، امام شافعیؒ، امام زفرؒ کے نزدیک طعام اور غیر طعام ہر ایک میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، کیونکہ احادیث میں نہ طعام کی قید ہے نہ غیر طعام کی، اور شیخین علیہما الرحمہ کے نزدیک عقار میں جائز ہے، کیونکہ عقار میں ”غرر انفساخ العقد“ نادر ہے، اور منقولات میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، کیونکہ اس میں ”غرر انفساخ العقد“ نادر نہیں ہے۔

۷۔ وہ صورت جس میں بین الاقوامی تجارت میں شیپنگ کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا، اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے جب کہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دے، اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں دوسرا شخص اس کا ضامن نہیں ہوگا، بلکہ تیسرا شخص ضامن ہوگا تو اس صورت کے جواز کی ایک شکل یہ ہے جس کو مفتی العصر صاحب ”احسن الفتاویٰ“ نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر مال پہنچانے کا کرایہ خریدار نمبر ایک ادا کرتا ہے تو اس کے اذن سے بائع کا کسی بھی مال بردار کمپنی کی تحویل میں مال دیدینا مشتری کا قبضہ شمار ہوگا، اگرچہ مشتری نے کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو، کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہے۔

☆☆☆

## خرید و فروخت میں استیلاء اور قبضہ کا مفہوم

مولانا سلطان احمد اصلاحی

۱۔ فقہ اسلامی میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے سلسلہ میں تقسیم ہے، حضرات حنفیہ کے یہاں ہر وہ چیز جسے ایک جگہ سے ہٹایا اور منتقل کیا جاسکتا ہو، کسی خریدنے والے کیلئے ایسی چیز کا بیچنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ اس کے قبضہ میں نہ آجائے، حدیث میں اس کی ممانعت کے علاوہ اس کی دوسری وجہ اس کے ہلاک یا ضائع ہو جانے پر اس عقد کے ختم ہونے کا دھوکہ ہے، ”ومن اشتری شیئاً مما ینقل ویحول لہ یجز لہ بیعہ حتی یقبضہ لآنہ نھی عن بیعہ ما لہ یقبض ولا ن فیہ غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک“ (ہدایۃ ۲، ۵۸)، البتہ مکان اور دکان جیسی غیر منقولہ چیزوں (عقار) کی بیع قبضہ سے پہلے حضرات سنیین امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے، امام محمد کے نزدیک البتہ یہ بھی جائز نہیں ہے (حوالہ سابق)، دیگر فقہاء کے مسالک کی تفصیل میں حضرات مالکیہ کے یہاں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ دوسری تمام چیزوں کی قبضہ سے پہلے بیع جائز ہے، اس میں ان کے یہاں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

”وأما بیع ما سوی الطعام قبل القبض فلا خلاف فی مذہب مالک فی إجازتہ“ (بدایۃ المجتہد ۲، ۱۳۳)، کھانے پینے کی چیزوں کی ممانعت میں ان حضرات کی بنائے استدلال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ: جو کوئی کھانے پینے کی چیز خریدے تو اسے اس وقت تک نہ بیچے جب تک کہ اس پر اس کا قبضہ نہ ہو جائے: ”من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یقبضہ“ (حوالہ سابق)، البتہ حضرت امام شافعی کے نزدیک کسی فرق کے بغیر جو چیز بھی بیچی جائے اس سے پہلے قبضہ اس کیلئے شرط ہے، یہی رائے امام ثوری کی ہے، حضرات صحابہ میں اس کی روایت حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی کی گئی ہے، ہاں ابو عبید اور اسحاق کا یہ ضرور کہنا ہے کہ تمام وہ چیزیں جنہیں ناپ کر کے یا تول کر کے نہ بیچا جاتا ہو تو قبضہ ہونے سے پہلے ان کے بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے (حوالہ مذکور)، قبضہ سے پہلے بیع کی ممانعت کے سلسلہ میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: ”لا یحل بیعہ وسلف ولا ربح ما لہ یضمن ولا بیعہ ما لیس عندک“ (بدایۃ المجتہد ۲، ۱۳۵)، حضرت حکیم بن حزام کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ”یا ابن اخی اذا اشتریت بیعاً فلا تبعہ حتی یقبضہ“ (حوالہ سابق)، اوپر حضرات سنیین کی مکان اور دوکان وغیرہ کے سلسلہ میں جو اس سے ہٹ کر رائے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ احادیث مطلق نہیں، بلکہ ”معلول بالعلۃ“ ہیں، یعنی کہ سامان کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں عقد کے فسخ ہو جانے کا دھوکہ، لیکن چونکہ اشیاء غیر منقولہ میں اس کا امکان نادر ہے اس لئے ان حضرات کے یہاں اس کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے (ہدایۃ ۲، ۵۸)۔

دوسری توجیہ کے مطابق دریں صورت حضرت امام اعظم کے نزدیک مکان و دوکان کا خالی ہو جانا ہی قبضہ کے قائم مقام ہے، ”لأن ما لا ینقل القبض عنده فیہ التخلیة“ (بدایۃ المجتہد ۲، ۱۳۵)۔

(مسئلہ کی اس تفصیل سے جبکہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا مطلق عدم جواز ہی محل نظر ہو، اس کے باطل، فاسد یا مکروہ ہونے کی بحث کوئی خاص معنویت نہیں رکھتی، تاہم ماخذ میں اس کو فاسد اور باطل دونوں (نیل الاوطار ۳، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۸۰)، نیز مکروہ (المغنی لابن قدامہ ۴، ۲۲۳، مجلہ بالا) اسی طرح اس کے دوسرے نظائر کو بھی فاسد اور باطل کہا گیا ہے (نیل الاوطار ۳، ۱۷۴، ہدایۃ ۳، ۳۴، المغنی ۴، ۲۳۸، ۲۵۰) بنا بریں بالخصوص حضرات حنفیہ کے مطابق اشیاء غیر منقولہ کی قبل القبض بیع میں معاملہ کی نوعیت اور اس کی خفت اور غلظت کے پہلو سے اس میں باطل، فاسد اور بیع مکروہ تینوں کے احکام وارد کئے جاسکتے ہیں)۔

۲۔ اشیاء غیر منقولہ میں قبضہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ چیز خریدنے والے کی تحویل میں اس طرح آجائے کہ کسی اور سے معاملہ کرنے کی صورت میں اسے اس کو حوالہ کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، لیکن مسئلہ کی تمام تفصیلات اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر حال میں اس قبضہ کا یہ مطلب



نہیں کہ چیز لازماً آدمی کے ہاتھ اور اس کے دکان میں آجائے، عرف کا اس میں دخل ہونا چاہئے، اور جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو عرف میں قبضہ تصور کیا جائے شریعت اسلامی کی رو سے بھی اسے ہی جائز قبضہ تصور کیا جائے گا۔

۳۔ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت میں فرق ہے جس کی تفصیل جواب (۱) میں آچکی ہے۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق احادیث ”معلول بالعلتہ“ ہیں، اور علت نہیں یہی ہے کہ چیز کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں عقد کا فسخ کرنا لازم آئے گا جس سے اس میں دھوکہ پیدا ہو جائے گا، جبکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے، جواب (۱) میں اس کی تفصیل بھی آچکی ہے۔

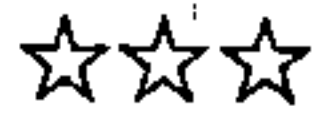
۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام نہیں، بلکہ اس میں استثناءات اور تخصیصات ہیں، اس کی تفصیل بھی جواب نمبر (۱) میں کی جا چکی ہے۔

۶۔ فیکٹری سے مال خریدنے والے خریدار نمبر (۱) کی ضمان کو قبضہ حسی کے قائم مقام مان کر اس کیلئے خریدار نمبر (۲) کے لئے اس مال کا فروخت کرنا جائز ہوگا۔ ضمان کو نظر انداز کر کے صرف قبضہ حسی پر اصرار کرنا درست نہ ہوگا۔

۷۔ جہاز پر مال چڑھ جانے کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جانے سے جو مشتری اس مال کا ضامن ہو جاتا ہے، اس کیلئے حسی قبضہ کے بجائے اسی ضمان کی بنیاد پر اس مال کا تیسرے شخص کیلئے بیچنا جائز ہوگا، گوکہ اس سودے کے بعد اس کا ضامن تیسرے خریدار کا ہو جائے اور بیچ کے دوسرے خریدار کا کوئی ضمان باقی نہ رہے، دراصل اس مسئلہ کی تھوڑی سی مزید تفصیل کی ضرورت ہے۔

آج کی بین الاقوامی تجارت میں اشیاء غیر منقولہ میں بیچ کی صحت کیلئے اگر ہر حال میں قبضہ حسی کو شرط قرار دیا جائے تو یہ چیز عام الناس کیلئے زحمت اور تنگی کا باعث ہوگی، آج کے بڑھتے ہوئے ذرائع ابلاغ کی قوت سے اپنے کارندوں کے ذریعہ سفر کی کسی بھی منزل میں مال کی نوعیت اور کیفیت کا اطمینان کر لینا دشوار نہیں، جہاں تک نقصان اور دھوکے کا سوال ہے وہ سامنے کی تھوک خریداری کی صورت میں بھی اسی طرح برابر بنا رہتا ہے، ایک ہزار کونٹنٹل گیہوں، چاول کا سودا کرنے والا کاروباری اس کی ہر بوری اور اس کے ایک ایک دانے کو پرکھنے کا اطمینان نہیں کر سکتا، جس درجہ کا اطمینان آدمی سامنے کی اس طرح کی تھوک خریداری میں کرتا ہے، اس سے کم اطمینان وہ اپنے معتبر پیشہ ور کارندوں کے ذریعہ شیپنگ کے سامان کا نہیں کرتا، اس کے باوجود ہر حال میں یہ اصرار کہ سامان اتر کر پہلا خریدار کے گودام میں آجائے، اس کے بعد ہی اس کیلئے دوسرے خریدار سے اس کا سودا کرنا ممکن ہو سکے بوجہ دشواری اور نقصان کا موجب ہے، اس میں خواہ مخواہ کی مشقت کا مالی خسارہ اور کام کا پھیلاؤ ہوگا، اسلامی شریعت جو مصلحتوں کی محافظ اور نقصان اور غم سے بچنے کے لئے حالات میں ان نصوص میں اس کی رویت سخت گیر اور بالکل بے لچک نہیں ہو سکتا۔

پس غیر ضروری توسع سے بچتے ہوئے جدید شیپنگ کی اس طرح کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہوگی۔



## کتاب وسنت کی روشنی میں قبضہ کی حقیقت

مفتی انور علی اعظمی

۱۔ بیع قبل القبض:..... شرع اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض درست نہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک باطل ہے اور احناف کے نزدیک فاسد ہے، نتیجہ اور مال ایک ہے، اس لئے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک فساد اور بطلان ایک ہی معنی میں مستعمل ہے۔

۲۔ قبضہ کی حقیقت:

صاحب ”بدائع“ نے اس مسئلہ پر مبسوط کلام کیا ہے، ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تسلیم اور قبض کی تفسیر تخلیہ اور تخلی ہے اور تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع اور مشتری کے درمیان موانع دور کرنے اور مشتری کو بیع میں تصرف کا پورا موقع فراہم کر دے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک گھر، زمین اور درخت میں قبضہ تخلیہ سے ہوگا اور درہم و دنانیر میں ہاتھ میں لینے سے ہوگا، اور کپڑا وغیرہ میں منتقل کرنے سے اور ایسے ہی قبضہ غلہ میں ہوگا، جبکہ وہ اندازہ سے بیچا گیا ہو اور اگر ناپ تول کر بیچا گیا ہے تو قبضہ ناپنے اور تولنے سے ہوگا، اور غلام و جانور میں ان کی جگہ سے منتقل کر دینے سے ہوگا، الغرض کتاب وسنت نے اصل قبضہ کی حقیقت متعین کر دی ہے، اور وہ تخلیہ ہے، لیکن تخلیہ کی نوعیت عرف و عادت پر چھوڑ دی گئی ہے، چنانچہ جہاں جس چیز کے بارے میں جس طرح استیلاء لوگوں کے عرف میں قبضہ متصور ہوتا ہو، وہی شرعی قبضہ مانا جائے گا (دیکھئے: بدائع الصنائع ۱/۲۳۳)۔

”قال فی الشامی (۲،۵۹) و تمامہ فی البحر و حاصلہ أن التخلية قبض حکما، لو مع القدرة علیہ بلا کلفة لکن ذلک یختلف بحسب حال المبیع ففی نحو حنطة فی بیت، مثلاً فدفع المفتاح إذا أمکنه الفتح بلا کلفة قبض، و فی نحو دار فالقدرة علی إغلاقها قبض، أی بأن تكون فی البلد فی ما یظهر، و فی نحو بقرة فی مرعى، فکونه بحیث یری و یشار إلیہ قبض، و فی نحو ثوب، فکونه بحیث لو مد یدہ تصل إلیہ قبض، و فی نحو فرس أو طیر فی بیت إمكان أخذہ منه بلا معین قبض، و قال فی موضع آخر: لو اشترى دهنًا و دفعه قارورة یزنه فیها فوزنه فیها بحضرة المشتري فهو قبض، و کذا بنیئته فی الأضح و کذا کل مکیل و موزون إذا دفع له الوعاء فکاله أو وزنه فیہ بأمره“ (شامی ۲،۵۸)۔

ان ساری مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قبضہ کی نوعیت کا مدار عرف و عادت ہی پر ہے۔

”وقال ابن قدامه: فی ”المغنی“ ولأن القبض مطلق فی الشرع فیجب الرجوع فیہ إلی العرف“ (مغنی ۲،۲۰۰)۔

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت:

اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت میں احناف کے یہاں کوئی فرق نہیں، اس لئے کہ اصل قبضہ تمام اموال میں تخلیہ سے حاصل ہوتا ہے۔

”قال فی البدائع: ثم لا خلاف بین أصحابنا فی أن أصل القبض یحصل بالتخلية فی سائر الأموال“ (۵،۲۲۲)۔  
البتہ قبضہ کی تکمیل میں منقولات میں تفصیل الگ ہے اور غیر منقولہ اشیاء کی الگ۔

منقولات کی دو قسمیں ہیں: ایک مثلی، دوسرے غیر مثلی، منقولات میں تخلیہ سے ہی قبضہ تام ہو جاتا ہے، اسی طرح مثلیات میں اگر بیع مجازتہ ہو تو

تخلیہ سے قبضہ تام ہو جائے گا، اس لئے کہ بیع مجازفہ میں مقدار کی جانکاری کا اعتبار دلحاظ نہیں ہوتا ہے، اور اگر ان کی بیع ناپ تول کے ذریعہ سے ہو تو بائع کی ناپ تول اور تخلیہ سے مشتری کا قبضہ تام ہوگا، کیونکہ یہ بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں داخل ہوگئی، غیر منقولہ اشیاء میں بھی قبضہ کی بنیاد تخلیہ ہی ہے۔

اگر وہ زمین و جائیداد قریب ہے تو نفس تخلیہ سے قبضہ مکمل ہو جائیگا، اور اگر دور ہے تو تخلیہ کے ساتھ اتنی مدت گذرنا بھی ضروری ہوگا جس مدت میں وہ مکان بیع تک پہنچ سکے۔

”فی الخانیة: إذا كان قريباً (العقار) يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض أما إذا كان بعيداً لا يتصور القبض في الحال، فتقام التخلية مقام القبض.....“ (شامی ۳۰۵۹)۔

۴۔ بیع قبل القبض سے متعلق نہیں کی احادیث معلول بعلت ہیں یا نہیں؟

بیع قبل القبض سے متعلق نہیں کی احادیث معلول بعلت ہیں۔

احناف کے نزدیک علت غرر انفساخ عقد ہے، ہدایہ (۵۸،۳) میں ہے: ”ومن اشترى شيئاً مما ينقل و يحول لم يجز بيعه حتى يقبضه؛ لأنه نهي عن بيع ما لم يقبض ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك، والغرر منهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث محمول به عملاً بدلائل الجواز“ (۳۰۵۹)۔

امام مالک کے نزدیک منفعہ عمال کا ضیاع ہے۔

”وقد قيل في علة النهي: إن في قبضه منفعة للعمال إذ ينتفعون بكيه و حمله و وزنه و غير ذلك بخلاف ما إذا بيع وهو عند صاحبه، فإن ذلك يضيع تلك المنفعة، وقيل إنه أمر تعبدى“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۲، ۲۲۵)۔

مالکیہ کے نزدیک ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ ”بیع قبل القبض“ سے متعلق نہیں امر تعبدی ہے (علت معلوم نہیں)۔

۵۔ بیع قبل القبض کی ممانعت کے عموم و خصوص کے بارے میں ائمہ کی آراء:

جمہور احناف کے نزدیک شی منقول کی بیع قبضہ سے پہلے درست نہیں، اور عقار کی بیع قبضہ سے پہلے امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے، اور امام محمد کے نزدیک ناجائز ہے (الفقه على المذاهب الأربعة ۲، ۲۳۳، ہدایہ ۵۸، ۳)۔

مالکیہ کے نزدیک اس نہی کا تعلق مطعومات کے ساتھ خاص ہے، چنانچہ ان کے یہاں غلہ اور پھل کی بیع قبضہ سے پہلے درست نہیں ہے (الفقه على المذاهب الأربعة ۲، ۳۵)۔

شوافع کے نزدیک نہی عام ہے، قبضہ سے پہلے ان کے یہاں منقول اور غیر منقول سب کی بیع ناجائز ہے، البتہ تین صورتیں استثناء ہیں

۱۔ أن يبيعه قبل قبضه لمن اشتراه بنفس الثمن الذي اشتراه بدون زيادة۔

۲۔ أن يتلف المبيع عند البائع فإن للمشتري أن يبيعه له بمثله بأن يعطى البائع للمشتري ثمناً مثل التألف۔

۳۔ أن يشتري شيئاً يقبضه وكان ثمناً ديناً في ذمته كان اشتري جملاً بعشرة ولم يقبضه ولم يدفع ثمنه، فإنه يصح في هذه الحالة أن يبيعه لمن اشتراه منه بعشرة في ذمة البائع الأول أو يشتري الجملة بعشرة ويدفعها للبائع ولم يقبض الجملة، فإنه يصح أن يبيعه بعشرة في ذمة البائع۔

والبيع في أحوال الثلاثة يكون إقالة بلفظ البيع، فليس بيعاً حقيقة (الفقه على المذاهب الأربعة ۲، ۲۲۲)۔



حنابلہ کے نزدیک:

جب بیع کیل، موزون، یا معدود، یا مذروع نہ ہو تو قبضہ سے پہلے اس کی بیع جائز ہے، اور اگر بیع مذکورہ بالا انواع سے ہو تو قبضہ سے پہلے اس میں بیع کے ذریعہ تصرف درست نہیں (معنی ۲۱۷/۳، حوالہ الفقہ علی المذاہب لأربعہ ۲۳۶/۳)۔

اور معنی میں ابن عبداللہ سے منقول ہے کہ امام احمد کے اصح قول میں نبی کا تعلق صرف طعام سے ہے (معنی ۲۱۸/۳)۔

مالکیہ کی دلیل:

(۱) قوله ﷺ "من ابتاع طعاما فلا يبيعه حتى يستوفيه، فمفهومه إباحة بيعه ما سواه قبل قبضه"۔

(۲) "وقول ابن عمر رأيت الذين يشترون الطعام مجازفة يضربون على عهد رسول الله ﷺ أن يبيعوه حتى يؤوه إلى رحالهم"۔

دلیل حنابلہ: احادیث مذکورہ۔

"ووجه قول الخرق أن الطعام المنهي عنه عن بيعه قبل قبضه لا يكاد يخلو من كونه مكيلا أو موزونا أو معدودا متعلق الحكم بذلك" (معنی ۳۰۲/۱۸)۔

حنفیہ وشافعیہ کی دلیل:

عن حكيم ابن حزام: "لا تبع ما ليس عندك" (ترمذی)۔

"قال: سألت رسول الله ﷺ فقلت يأتيني الرجل فيسألني من البيع ما ليس عندى أبتاع له من السوق ثم أبيعه قال لا تبع ما ليس عندك" (ترمذی ۱۰۱۳۸)۔

مارواه أبو داؤد: "أن النبي ﷺ نهي أن تبايع السلع حيث تبتاع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم، وماروى ابن ماجه: أن النبي ﷺ نهي عن شراء الصدقات حتى تقبض، وروى: أن النبي ﷺ لما بعث عتاب بن أسيد إلى مكة قال: إنهم عن بيع ما لم يقبضوه وعن ربح ما لم يضمنوه" (معنی ۳۰۲/۱۳)۔

احناف نے منقول اور غیر منقول کے درمیان جو تفریق کی ہے اس کی بنیاد احادیث مذکورہ میں نہیں کی علت کو بتانا ہے، اور وہ علت: "غرر انفساخذ عقد على اعتبار الهلاك" ہے، یہ علت منقولات میں قبضہ سے پہلے موجود ہوا کرتی ہے، اور غیر منقولات میں ہلاکت نادر ہے، اسی لئے ایسی زمین جو دریا اور سمندر کے کنارے پر ہے ان کی بیع بھی قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہوگی، اسلئے کہ وہاں ہلاکت کا خطرہ موجود ہے (یعنی ۱۳۷، ۳)۔

امام احمد کے نزدیک غیر منقول کی بیع بھی قبضہ سے پہلے ناجائز ہے، اس کی دلیل حکیم ابن حزام کی مذکورہ روایت ہے، اس میں کلمہ "ما" مذکور ہے اور وہ تعمیم پر دال ہے۔

امام محمد نے بیع کو اجارہ پر قیاس کیا ہے، چونکہ عقار کا اجارہ قبل القبض درست نہیں، اس لئے بیع بھی درست نہیں ہوگی "والجامع اشتمالهما

على ربح ما لم يضمن فإن المقصود من المبيع الربح، والربح ما لم يضمن منه غنه شرعا" (عینی ۳۰۱/۴)۔

۶۔ ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ مال فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار (۲) کو روانہ کر دیتا ہے اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آتی ہے نہ خریدار (۲) پر، بلکہ یہ اسی شخص خریدار (۱) کا نقصان قرار پاتا ہے، اس صورت معاملہ میں فیکٹری سے خریداری کرنے والے کی طرف سے قبضہ حسی نہ پائے جانے کے باوجود ضمان کو قبضہ حسی کے قائم مقام مان

کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا، لیکن اس صورت میں خریدار (۱) کیلئے ضروری ہوگا کہ پہلے فیکٹری سے معاملہ طے کرے پھر اس کے بعد میں خریدار (۲) سے معاملہ کرے تاکہ "لا تتبع مالیس عندک" کا مصداق نہ بنے۔

مذکورہ صورت معاملہ کے درست ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خریدار (۱) کا بیع پر اصل قبضہ ثابت ہے اور وہ تخلیہ ہے اور قبضہ تام بھی ہے۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت میں شیپنگ:

(جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو بائع ضامن نہیں ہوگا، اس صورت حال میں مشتری اور بائع کے درمیان بیع و شراء درست ہے، لیکن مال کے سمندر میں رہتے ہوئے مشتری اول کا دوسرے کے ہاتھ بیچنا درست نہیں، جبکہ وہ مال کے اپنے پاس پہنچنے تک کا ضمان قبول نہیں کرتا، اسلئے کہ وہ بیچ کر نفع تو لینا چاہتا ہے، لیکن مال کے مشتری ثانی کے پاس پہنچنے تک نقصان کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا، لہذا اس صورت میں اس کا نفع غیر مضمون شی سے نفع ہے، اور غیر مضمون شی کا رخ منہی عنہ ہے، اور حدیث میں اس کی صراحتاً نہیں موجود ہے: "ذکر عبد اللہ بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: لا یحل سلف و بیع و لا شرطان فی بیع و لا ربح مالہ یضمن و لا تتبع مالیس عندک" (ترمذی ۱۲۸)۔

اور یہی فساد عقد کی متقاضی ہے، علامہ عینی ہدایہ کی شرح میں فرماتے ہیں: "وربح مالہ یضمن منہی عنہ شرعاً والنہی یقتضی الفساد، فیکون البیع فاسداً قبل القبض لأنه لم یدخل فی ضمانہ" (عینی ۳، ۱۲۷)۔

لہذا جہاز پر مال کے رہتے ہوئے مشتری اول کا ضمان لئے بغیر کسی دوسرے کے ہاتھ بیچنا درست نہیں ہوگا۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

### اور اس کے چند احکام

مفتی عزیز الرحمن بجنوریؒ

- ۱۔ بیوعات فاسدہ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بھی ہے جو حدیث شریف سے ثابت ہے، اور جو بجز الراقی کی عبارت کے مطابق ”العجز عن التسليم الا بضرر“ اور ”عدم القدرة على التسليم“ میں داخل ہے، اس لئے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت بیع مکروہ میں داخل ہے، اور بیع مکروہ کو بھی بیع فاسد میں شمار کیا ہے۔
- ۲۔ قبضہ کے بارے میں ہمارے فقہاء نے لکھا ہے:

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل الخ“ (درمختار (۳،۲۶)

”وقال الشامي: و حاصله أن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“ (۳،۲۶)۔

علامہ شامی نے حال بیع کی قید سے حنفی مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے، ہمارے ائمہ قبضہ کی یہ تشریح صرف اشیائے منقولہ کے لئے خاص کرتے ہیں، لیکن اشیائے غیر منقولہ مثلاً زمین، مکانات وغیرہ کے بارے میں یہ شرط نہیں ہے۔

”وذهب أبو حنيفة و أبو يوسف إلى جواز بيع غير المنقول قبل القبض، لأن النهي معلول بغير انفساخ العقد لخوف الهلاك، وهو في العقار نادر وفي غيره غير نادر“ (اوجز ۵،۶۶)۔

قبضہ کی تعریف میں حال بیع کی قید سے یہ دلالت ہے کہ عرف اور حالات کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت بدل جاتی ہے جس کو قبضہ حکمی کہنا چاہئے، لہذا کمپنیوں کی شرائط چونکہ واضح ہوتی ہیں کہ مال کو ٹرانسپورٹ کے سپرد کرنے کے بعد اور سامان کا انشورنس ہونے کے بعد کمپنی کا ذمہ ساقط ہو جاتا ہے اور مشتری کا قبضہ ثابت ہو جاتا ہے جبکہ ٹرانسپورٹ بیچ میں انشورنس کی وجہ سے ضامن ہوتا ہے، اس لئے مشتری اول کا مشتری ثانی کو مال فروخت کرنا جائز ہے، البتہ مشتری ثانی ثالث کو فروخت نہیں کر سکتا، کیونکہ مال ابھی مشتری اول کے قبضہ اور اسی کی ضمان میں ہے جو توسط ٹرانسپورٹ۔

۳۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت والی حدیث معلول بعلت ”انفساخ العقد لخوف الهلاك“ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا جس کا مطلب یہ ہے کہ حتی الامکان ”بیع قبل القبض“ نہیں ہونا چاہئے، بعض خصوصی حالات ضرر اور منازعت کی وجہ سے جائز ہے۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو حضرت ابن عباسؓ کے قول کی بنا پر امام شافعی، امام مالک اور امام احمد نے عام رکھا ہے، صرف احناف نے علت انفساخ لخوف الهلاك کی وجہ سے جو مفضی الی المنازعت ہے زمین اور مکانات کو مستثنیٰ کیا ہے۔

☆☆☆

۶۔ جواب نمبر (۳) میں آچکا ہے۔

سابق مفتی مدنی دارالافتاء، بجنور۔



## اسلام میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا اعتبار

مولانا خورشید احمد اعظمی ؒ

۱۔ شرع اسلامی کے اعتبار سے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت فی الجملہ ناجائز ہے ان تفصیلات کے ساتھ جو آئندہ ائمہ کے اقوال سے نقل کی جائیں گی بسبب ان احادیث کے جو اس سلسلہ میں حضور ﷺ سے منقول و ثابت ہیں۔

اور بصورت عدم جواز اس کا شمار بیع فاسد میں ہوگا کیونکہ حقیقت بیع کا وجود پایا جا رہا ہے، اور جو نقص ہے وہ وصف کی جہت سے ہے لہذا اس پر بطلان کا حکم نہیں لگایا جائے گا، شامی میں ہے:

”وہو (أى البيع الفاسد) ما كان مشروعاً بأصله لا بوصفه و مرادهم من مشروعية أصله كونه مالا متقوماً، لا جوازه و صحته؛ لأن فساده يمنع صحته أو أطلقوا المشروعية عليه نظراً إلى أنه لو خلا عن الوصف لكان مشروعاً“ (شامی ۴، ۹۹، نیز البحر الرائق ۶، ۶۸)۔

۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت:

قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ بائع بیع اور مشتری کے درمیان موانع کو دور کر دے اور مشتری کو بیع میں تصرف کا پورا موقع فراہم کر دے، اسی چیز کو احناف نے تخلیہ سے تعبیر کیا ہے:

”فالتسليم و القبض عندنا هو التخلية و التخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع و بين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلماً للمبيع و المشتري قابضاً له، وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع“ (البدائع ۵، ۲۲۲)۔

در مختار میں ہے: ”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع و لا حائل“ (در مختار ۴، ۴۳)۔

اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کا ذکر فائدہ سے خالی نہیں ہوگا: ”قال كنا مع النبي ﷺ في سفر فكنت على بكر صعب لعمر، فكان يغلبني فيتقدم أمام القوم فيزجره عمر و يرد ثم يتقدم فيزجره عمر و يرد، فقال النبي ﷺ لعمر: بعنيه قال: هو لك يا رسول الله قال رسول الله ﷺ: بعنيه، فباعه من رسول الله ﷺ، فقال النبي ﷺ: هو لك يا عبد الله بن عمر تصنع به ما شئت“۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے تحت فرمایا: ”وقد احتج به للمالكية و الحنفية في أن القبض في جميع الأشياء بالتخلية و إليه مال البخاري“ (فتح الباری ۴، ۲۲۲)۔

البتہ تخلیہ کی نوعیت بیع کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے، اور اس کا مدار عرف و عادت کے اوپر ہو سکتا ہے، کہا فی الشامی نقلاً عن البحر:

”و حاصله أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع“ (شامی ۴، ۴۳)۔

ابن قدامہ نے معنی ۱۲۵، ۴ میں اس کے متعلق تفصیلات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ”ولأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى العرف“۔

۱۔ محلہ رگھوناتھ پورہ، منڈو (یو پی)۔

امام شافعیؒ کے نزدیک بھی قبضہ کا اعتبار تقریباً عرف کے اوپر ہی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں ذکر کیا ہے:

”وفي صفة القبض عن الشافعي تفصيل، فما يتناول باليد كالدرهم والدنانير والشوب، فقبضه بالتناول، وما لا ينقل كالعقار والشجر فقبضه بالتخلية، وما ينقل في العادة كالأخشاب والحبوب والحيوان فقبضه بالنقل إلى مكان لا اختصاص للبائع به، وفيه قول: أنه يكفي فيه التخلية“ (فتح الباری ۴۰۲۵۰)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ کتاب و سنت نے قبضہ کی کوئی خاص نوعیت متعین نہیں کی ہے، البتہ قبضہ کی جو صورتیں مذکور ہیں وہ فی الجملہ تخلیہ کو متضمن ہیں، اسلئے تقریباً تمام ہی اشیاء میں اس کی حقیقت تخلیہ ہے، نوعیت کا مدار عرف اور عادت پر ہے، جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی شرعاً اس کے حق میں قبضہ ہوگا بشرطیکہ وہ صورت تخلیہ کو متضمن ہو۔

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت:

جیسا کہ پچھلی میں گذر چکا ہے کہ احناف کے نزدیک قبضہ کی حقیقت تخلیہ سے حاصل ہو جاتی ہے اور اس میں منقولہ و غیر منقولہ اشیاء کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے: ”ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال“ (البدائع ۵۰۲۲۲)۔

البتہ قبضہ کے تمام ہونے کے اعتبار سے منقولات و غیر منقولات میں تفصیل ہے، ایسی اشیاء منقولہ جو غیر مثلی ہیں یا مثلی ہوں اور انہیں مجازتہ بیچا گیا ہو تو ان دونوں صورتوں میں محض تخلیہ سے ہی قبضہ تام ہو جائے گا، البتہ اگر اشیاء منقولہ مثلیہ کو کیل یا وزن کے ذریعہ بیچا گیا ہو تو اس میں قبضہ کی تکمیل کیل یا وزن کے بعد ہی ہوگی، ”ولهذا كانت التخلية تسليماً وقبضاً فيما لا مثل له وفيما له مثل إذا بيع مجازفة“ (البدائع ۵۰۲۲۲)۔

اشیاء غیر منقولہ مثلاً عقار وغیرہ اگر قریب ہیں تو نفس تخلیہ سے ہی قبضہ تام ہو جائے گا، اور اگر دور ہے تو صرف نفس تخلیہ سے قبضہ تام نہیں ہوگا۔

”والصحيح ما ذكر في ظاهر الرواية؛ لأنه إذا كان قريباً يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض أما إذا كان بعيداً لا يتصور القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض“ (شامی ۴۰۲۲۳)۔

۴۔ احادیث النبی عن البیع قبل القبض اور ان کی علت:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے ممانعت اور نہی مختلف احادیث میں وارد ہے، ان میں سے چند ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ ”عن ابن عباسؓ أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً، فلا يبيعه حتى يستوفيه، قال ابن عباس: وأحسب كل شيء مثله“ (مسلم)۔

۲۔ ”عن ابن عمرؓ قال كُنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاء الطعام فيبعث علينا من يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه فيه إلى مكان سواه قبل أن يبيعه“ (مسلم)۔

نیز حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ اور حکیم بن حزامؓ سے بھی اس مضمون کی حدیثیں مروی ہیں۔

یہ ساری احادیث جن میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے نہی وارد ہے، امام مالکؒ سے مروی ایک قول کے مطابق یہ نہی تعبدی ہے اس کی علت نہیں معلوم (لفقہ علی المذاهب لأربعة ۲۳۵۲)۔

لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ احادیث معلول بالعلتہ ہیں، چنانچہ ابن حجر نے اس کی تشریح کی ہے: ”وفي رواية سفيان عن ابن طاؤس عند مسلم قال طاؤس: قلت لابن عباس: لِمَ فقال: ألا تراهم يتبايعون بالذهب والطعام مرجأ، أي فإذا اشترى طعاماً بمائة دينار مثلاً ودفعها للبائع ولم يقبض منه الطعام، ثم باع الطعام لآخر بمائة و عشرين ديناراً و قبضها و الطعام في يد البائع فكانه باع مائة دينار بمائة و عشرين ديناراً“ (فتح الباری ۴۰۲۲۹)۔

اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں بھی اس کی علت کا ذکر موجود ہے، انہوں نے حضرت مروانؓ سے کہا: ”أحللت بيع الربا فقال: ما فعلت“

؟ فقال أبو هريرة؛ أحللت بيع السكاك، وقد نهي رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يستوفي“ (صحیح مسلم ۱۰، ۱۶۲)

امام شافعیؒ کے نزدیک ان احادیث میں نہیں کی علت ”ربح مالہ یضمن“ کا لازم آتا ہے، واحتج الشافعي بحديث عبد الله بن عمر قال:

نهي رسول الله ﷺ عن ربح مالہ یضمن أخرجه الترمذی“ (فتح الباری ۴، ۲۵۰)۔

امام مالکؒ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ ان احادیث میں نہیں عن البیع قبل القبض کی علت منفعۃ عمال کا ضیاع ہے، کیونکہ قبضہ کی صورت میں ناپنے، تو لے یا منتقل کرنے کی اجرت عمال کو ملے گی اگر قبضہ سے قبل بیع جائز قرار دی جائے تو اس میں ان کا نقصان ہوگا، ”وقد قيل في علة النهي أن في قبضه منفعة للعمال إذ ينتفعون بكيهله وحملة ووزنه وغير ذلك بخلاف ما إذا بيع وهو عند صاحبه فإن ذلك يضيع تلك المنفعة“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۲، ۲۲۵)۔

احناف کے نزدیک ان احادیث کی علت غرر انفساخ عقد ہے جیسا کہ اس کی تفصیل ”ہدایہ“ اور اس کی شرح ”فتح القدير“ میں اس طرح ہے:

”ومن اشترى شيئاً مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه؛ لأنه عليه السلام نهي عن بيع ما لم يقبض، و لأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“۔

اس کی شرح میں علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں: ”ثم علل الحديث (لأن فيه غرر انفساخ العقد) الأول (على اعتبار هلاك المبيع) قبل القبض فيتبين حينئذ أنه باع ملك الغير بخير إذنه، وذلك مفسد للعقد، وفي الصحاح أنه ﷺ نهي عن بيع الغرر“ (فتح القدير ۶، ۱۲۵)۔

نیز ”البحر الرائق“ میں ہے: ”والغرر المنهي غرر انفساخ العقد، والحديث معلول به عملاً بدلائل الجواز“ (البحر الرائق ۶، ۱۱۲)

## ۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے عموم و خصوص کے متعلق ائمہ کی آراء:

۱۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ نہیں خاص ہے مکملات و موزونات کے ساتھ اور وہ اشیاء جو مکمل یا موزون نہیں ہیں ان کی بیع قبضہ سے پہلے درست ہے۔

”يجوز مطلقاً إلا المكيل والموزون وهو قول الأوزاعي وأحمد وإسحق“ (فتح الباری ۴، ۲۲۲)۔

نیز الفقہ علی المذاهب الاربعہ میں مذروعات و معدودات بھی مکملات و موزونات کے ساتھ مذکور ہیں (۲۳۶/۲)۔

دلیل: ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں طعام کا ذکر موجود ہے اور اس کی وضاحت بقول صاحب معنی اس طرح ہے کہ وہ طعام جن کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے منع کیا گیا ہے یا تو مکمل و موزون ہوں گے یا معدود و مذروع، اس لئے یہ نہیں انہیں میں منحصر ہوگی اور ان کے علاوہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست ہوگی۔

”إن الطعام المنهي عنه عن بيعه قبل قبضه لا يكاد يخلو من كونه مكيلاً أو موزوناً أو معدوداً فيتعلق الحكم بذلك“ (المغنی ۴، ۲۲۸)۔

۲۔ امام شافعیؒ کے نزدیک قبضہ سے پہلے بیع سے ممانعت عام ہے، خواہ اشیاء منقولہ ہوں یا غیر منقولہ۔

”لا يجوز بيع شيء قبل قبضه مطلقاً وهو قول الشافعي ومحمد بن الحسن“ (فتح الباری ۴، ۲۲۵) ”وقال الشافعي: لا

يصح بيع المبيع قبل قبضه سواء كان طعاماً أو عقاراً أو منقولاً أو نقداً أو غيره“ (الامام النووي في شرح صحیح مسلم ۱۰، ۱۶۹)

دلیل: امام شافعیؒ نے تمام ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو نہی عن البیع قبل القبض سے متعلق ہیں، نیز عبد اللہ بن عباسؓ کے قول و أحسب كل شيء

مثل الطعام، اور ان احادیث سے جو ”بیع مالیس عندک“ اور ”ربح مالہ یضمن“ کے متعلق ہیں، ”وأما عمدة الشافعي في تعميم ذلك في كل

مبيع فعموم قوله عليه السلام: لا يحل بيع ولا سلف ولا ربح مالہ یضمن ولا بيع مالیس عندك وهذا من باب بيع

أنه یضمن وهذا مبني على مذهبه من أن القبض شرط في دخول المبيع في ضمان المشتري“ (بداية المجتهد ۲، ۱۸۳)۔



امام شافعی نے اس حکم سے تین صورتوں کا استثناء کیا ہے جو حقیقتہً بیع نہیں ہیں، بلکہ ان کی صورت اقالہ کی ہے (تفصیل کیلئے دیکھئے: الفقہ علی المذہب الاربعہ ۲/۲۳۳)۔  
۳۔ امام مالک کے نزدیک یہ نہیں صرف مطعومات کے ساتھ خاص ہے، لہذا ان کے نزدیک غیر مطعومات کو قبضہ سے پہلے بیچنا درست ہے۔

”يجوز مطلقا إلا المأكول والمشروب وهو قول مالك وأبي ثور واختيار ابن المنذر“ (فتح الباری ۲/۲۳۵)۔

”وقال في البداية: وأما بيع ما سوى الطعام قبل القبض فلا خلاف في مذهب مالك في إجازته“ (بداية المجتهد ۲/۱۸۲)  
دلیل: امام مالک نے انہیں احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں نبی عن بیع الطعام قبل الاستيفاء والقبض وارد ہے، اور جن کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ وہ اشیاء جو طعام کی جنس سے نہ ہوں، حکم نبی ان سے متعلق نہ ہو، اور ان کا قبل القبض بیچنا درست ہو۔

”أما عمدة مالك في منعه ما عدا المنصوص عليه فذليل الخطاب في الحديث المتقدم“ (بداية المجتهد ۲/۱۸۲)۔

۳۔ احناف کے نزدیک قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں تفصیل ہے، ان کے یہاں اشیاء منقولہ کی بیع قبضہ سے پہلے درست نہیں، بلکہ امام محمد کے نزدیک غیر منقولہ کی بیع بھی قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، لیکن امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف کے نزدیک اشیاء غیر منقولہ کی بیع قبضہ سے پہلے درست ہے، ”وأما أبو حنيفة فالقبض عنده شرط في كل مبيع ما عدا المبيعات التي لا تنقل ولا تحول من الدور والعقار“ (بداية المجتهد ۲/۱۸۲، ۱۸۳)۔

”وقال في الكنز: صح بيع العقار قبل قبضه لا يبيع المنقول“ (کنز مع شرح البحر ۶/۱۱۶)۔

دلیل: احناف کا استدلال بھی وہی احادیث ہیں جن میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے نبی وارد ہے یا جن میں ”نهی عن بيع ما ليس عندك“ یا ”نهی عن بيع الغرر“ وارد ہے۔

”قال في البحر: (صح بيع العقار قبل قبضه) أي عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد لا يجوز لإطلاق الحديث وهو النهي عن بيع ما لم يقبض وقياسا على المنقول وعلى الإجارة، ولهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول، والغرر المنهي غرر انفساخ العقد والحديث معلول بدلائل الجواز... إلى أن قال: (لا يبيع المنقول) أي لا يصح لنهيه ﷺ عن البيع ما لم يقبض ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“ (البحر الرائق ۶/۱۱۶)۔

یعنی احناف نے جو اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں فرق کیا ہے اس کی وجہ علت احادیث ہے، یعنی غرر انفساخ عقد کا اندیشہ، اور یہ علت منقولات میں موجود ہے، جبکہ اشیاء غیر منقولہ میں اس علت کا وجود نادر ہے۔

اس لئے جہاں اشیاء غیر منقولہ میں بھی اس علت کا احتمال ہوگا، جیسے ایسی زمینیں جو دریا یا تالاب کے کنارے اور کٹاؤ پر ہوں ان زمینوں کا قبضہ سے پہلے بیچنا درست نہیں ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: البنایہ فی شرح الہدایۃ للعینی ۳/۱۳)۔

۶۔ ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال بظاہر اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار نمبر (۲) کو روانہ کر دیتا ہے، اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری نہ فیکٹری پر آئے گی اور نہ خریدار نمبر (۲) پر بلکہ یہ خریدار نمبر (۱) کا نقصان قرار پائے گا۔

اس صورت میں اگرچہ خریدار نمبر (۱) کا حسی قبضہ اس مال پر نہیں پایا گیا، لیکن چونکہ وہ مال کے نقصان کی ذمہ داری قبول کر رہا ہے، اسلئے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے ایسی چیز سے فائدہ اٹھایا جس کا وہ ضامن نہیں ہوا، اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی چیز بیچ رہا ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے کیونکہ جب بائع کی طرف سے تخلیہ ہو گیا اور اس کے نقصان کا ضامن یہ ہو گیا تو یہ خریدار نمبر (۱) اس فیکٹری کے مال پر قابض مانا جائے گا اور اب اس کے بعد خریدار نمبر (۲) کو بیچنا درست ہوگا، کیونکہ اس بیع کا عاقد خود خریدار نمبر (۱) ہے نہ کہ فیکٹری کا مالک، بلکہ فیکٹری کا مالک اس کے امر سے اس مال کو خریدار نمبر (۲) کے پاس بھیج رہا ہے، گویا خود خریدار نمبر (۱) اس مال کا بھیجنے والا ہوا۔

”وكذلك لو فعل البائع شيئا من ذلك بأمر المشتري؛ لأن فعله بأمر المشتري بمنزلة فعل المشتري بنفسه“

”قال محمد: كل تصرف يجوز من غير قبض إذا فعله المشتري قبل القبض لا يجوز وكل ما لا يجوز إلا بالقبض كالهبة إذا فعله المشتري قبل القبض جاز ويصير المشتري قابضاً“ (شامی ۴، ۲۳۲)۔

اور چونکہ صرف تخلیہ سے ہی قبضہ کا وجود ہو جاتا ہے اور بیع مشتری کی ضمان میں داخل ہو جاتی ہے اسلئے ضامن ہونے کے بعد اس شخص کا خریدار نمبر (۲) کو بیچنا درست ہوگا (بدائع الصنائع ۵ / ۲۳۲)۔

۷۔ ایسی صورت میں جبکہ جہاز پر مال چڑھانے کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو بائع اس کا ضامن نہیں ہوتا، اور پھر یہ مشتری مال کی وصولی سے پہلے، جبکہ مال سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کر دیتا ہے اور مال کے ضائع ہونے کی صورت میں اس کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ تیسرا خریدار ضامن ہوتا ہے۔

اس صورت میں یہ بیع درست نہیں ہے کیونکہ مشتری اول کا قبضہ نہیں پایا جا رہا ہے، مال ابھی راستہ میں ہے اور اس کی بیع ایک تیسرے شخص کے ہاتھ ہو رہی ہے اور مشتری اول مال کی ہلاکت کی صورت میں اس کا ضمان بھی نہیں قبول کرتا، اس لئے علت نہی عن البیع قبل القبض، نیز احتمال غرر کی بنیاد پر یہ درست نہیں ہوگی۔

نیز اس صورت میں بیع میں ایک اور خرابی بھی موجود ہے جس کا ذکر مولانا تقی عثمانی صاحب نے ”تکملة فتح الملهم شرح مسلم“ (۱ / ۳۵۴) میں کیا ہے کہ اس طرح سے معمولی قیمتوں کا سامان راستے میں مختلف بیوع اور کئی منافع کی وجہ سے عوام تک سیکڑوں روپے کی قیمت تک گراں ہو کر عوام تک پہنچتا ہے، ”لأن كل تاجر يشتريها قبل الوصول يبيعها بربح إلى غيره و تصير الأرباح كلها بأیدی تجرة معدودین و يصير الغلاء نصيب العامة“

لہذا ان مذکورہ بالا خرابیوں کے پیش نظر بیع کی یہ صورت درست نہیں ہے۔



## بیع پر قبضہ سے پہلے اس کی فروختگی کا حکم

مفتی اسماعیل بھد کو دروی علی

عام طور پر جو چیزیں خرید و فروخت کے معاملہ میں بیع بنتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں: پہلی قسم اشیاء منقولہ ہیں، یعنی ایسی چیزیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی ہیں، جیسے جانور، غلہ، کپڑا اور گھریلو استعمال کی چیزیں وغیرہ۔ دوسری قسم کی اشیاء غیر منقولہ یعنی وہ چیزیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جاتیں بلکہ استعمال کرنے والا ان چیزوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کئے بغیر ان کو استعمال کرتا ہے، اور ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا مشکل بھی ہوتا ہے، جیسے کھیت، دوکان، مکان وغیرہ۔

جو شخص کسی غیر منقول چیز کو خریدتا ہے تو خریدار کے لیے اس چیز پر قبضہ کرنے سے قبل اس کا بیچنا امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام مالک اور امام احمد کے نزدیک جائز ہے، اور امام شافعی و امام محمد کے نزدیک خریدار کے بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کا بیچنا ناجائز ہے۔

اور جو شخص کسی منقول چیز کو خریدتا ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک خریدار کے لئے اس بیع منقول کو قبل القبض بیچنا ناجائز اور عقد فاسد ہے، چاہے وہ بیع منقول از قبیل طعام وغیر طعام ہو، یا مکمل و موزون و معدود ہو، یا اسکے علاوہ، اور یہی مسلک امام محمد و امام شافعی کا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اگر بیع منقول از قبیل طعام ہو تو اس کی قبل القبض بیع ناجائز ہے، اور اگر بیع منقول از قبیل غیر طعام ہو تو اس کی بیع خریدار کے لئے قبل القبض بھی جائز ہے امام مالک فرماتے ہیں کہ بیع منقول اگر مکمل یا موزون طعام ہو تو خریدار کے لئے قبل القبض اس کی بیع ناجائز ہے اور اگر بیع منقول کیلی یا وزنی طعام نہ ہو تو قبل القبض اس کی بیع جائز ہے، اگر بیع منقول غیر طعام ہو تو بھی قبل القبض جائز ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے اقوال مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی شرح مسلم کی عبارت ذیل سے ماخوذ ہیں:

وفي المسئلة أقوال تالية:

الأول: قال عثمان البتي: يجوز بيع كل شيء قبل قبضه ' وقال ابن عبد البر: هذا قول مردود بالسنة والحجة المجمع على الطعام ' وأظنه لم يبلغه هذا الحديث ' ومثل هذا لا يلتفت إليه، كذا في المغني لابن قدامة (۴، ۱۱۳)۔

الثاني: قال الشافعي ومحمد بن الحسن من الحنفية: يحرم بيع كل شيء قبل قبضه ' طعاما كان أو غيره، منقولا كان أو غير منقول وهو ظاهر قول ابن عباس رضي الله عنهما وهو رواية ابن عقيل عن أحمد كما في المغني۔

الثالث: قال أحمد بن حنبل في أظهر روايته: إنما يختص النهي بالطعام ' فلا يجوز بيعه قبل قبضه ويجوز فيما سواه كما حققه ابن قدامة۔

الرابع: قال مالك رحمه الله: إنما يمتنع البيع قبل القبض في المكيل و الموزون، من الطعام خاصة وقال سحنون وابن حبيب من المالكية: إنه ممتنع في كل مكيل أو موزون أو معدود ثم هل يختص بالطعام أو بالربويات؟ فيه قولان حكاهما الأبي۔

الخامس: قال أبو حنيفة وأبو يوسف يمتنع البيع قبل القبض في سائر المنقولات ويجوز في العقار الذي لا يخشى هلاكه

مفتی دارالعلوم کتھاریہ، گجرات۔



‘کسافی فتح القدیر (۵/۲۶۶) و تکملة فتح الملهم (۱۰۲۵۰)۔

بیع قبل القبض کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں، اور وہ علت معقود علیہ کے ہلاک ہونے کے احتمال کی وجہ سے عقد اول کے فسخ کا غرر ہے، جیسا کہ ”الفقہ الاسلامی“ میں یہ علت مذکور ہے جس میں حنفیہ کا مسلک ذکر کیا گیا ہے اور اس علت کو صاحب ہدایہ نے بھی مندرجہ ذیل عبارت میں ذکر کیا ہے:

”ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة و أبي يوسف و قال محمد: لا يجوز رجوعا إلى إطلاق الحديث و اعتبار المنقول و صار كالإجارة و لهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله و لا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول و الغرر المنهى عنه غرر انفساخ العقد و الحديث معلول به عملا بدلائل الجواز“ (مدایہ اخیرین ۴۲)

یہاں پر قبل القبض بیع کی نہی کی حکمتوں کا ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے، لہذا ان حکمتوں کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) بیع کے قبل القبض بیچنے کی صورت میں اگر عقد ثانی مشتری کے حق میں زیادہ نفع بخش ثابت ہو تو بائع اول عقد اول کو فسخ کرنے کی طمع نہ کرنے لگے اور بیع کو سپرد کرنے میں ٹال مٹول نہ کرے۔

(۲) اگر اشیاء منقولہ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے تو عام بازار میں بہت سی اشیاء کی قیمتیں حد سے بڑھ جائیں گی۔ لہذا جو چیزیں ایک ملک سے دوسرے ملک میں بین الاقوامی تجارت کی صورت میں برآمد درآمد ہوتی ہیں وہ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے سے پہلے اس پر مختلف اور متعدد تاجروں کے سودے واقع ہوتے ہیں اور ہر تاجر دوسرے تاجر کو اپنا نفع چڑھا کر بیچتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداءً چند روپیوں میں بکی ہوئی چیز عام بازار میں سیکڑوں کی بن کر پہنچتی ہے، اگر نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایسی چیزوں کے بیچنے میں بائع کا قبضہ شرط قرار دیا جائے گا تو عام بازار میں اشیاء کی قیمتیں سستی اور معتدل رہیں گی (دیکھئے: تکملة فتح الملهم ۱/۳۵۴)۔

(۳) حضرت ابن عباسؓ نے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو بیع صرف کے مشابہ قرار دیکر اسکے نفع کو ربوا کے مشابہ قرار دیا ہے۔

”عن ابن طاؤس عن أبيه عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ نهي أن يبيع الرجل طعاما حتى يستوفيه قلت لابن عباس: كيف ذلك؟ قال: ذلك دراهم بدراهم و الطعام مرجأ“ (بخاری شریف ۱۰۲۸۶)۔

بیع پر قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ بائع بیع سے اپنے مالکانہ تعلقات ختم کر دے اور مشتری کو اس میں ہر طرح کے تصرف کرنے کی قدرت دیدے، ہر قسم کی بیع کے مذکورہ حالت میں ہونے کو قبضہ کہتے ہیں، قبضہ بیع کی مختلف جزئیات جو فقہاء کرام نے کتب فقہ میں ذکر فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیہ بیع کی کوئی ایک شکل اور نوعیت متعین نہیں ہے اور اس کا مدار عرف و عادت پر ہے۔

”وأما تفسير التسليم و القبض فالتسليم و القبض عندنا هو التخليه و التخلي و هو أن يخلى البائع بين المبيع و بين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع و المشتري قابضا له، وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع و قال الشافعي: القبض في الدار و العقار و الشجر بالتخليه، و أما في الدراهم و الدنانير فتناولهما بالبراجم و في الثياب بالنقل و كذا في الطعام إذا اشتراه مجازفة فإذا اشتراه مكيلا فبالكيل و في العبد و البهيمه بالسير من مكانه“ (بدائع الصنائع ۵/۲۳۳)۔

۶۔ خریدار اول کے لئے بیع منقول کو دوسرے کے ہاتھ بیچ کے جواز کے لئے بائع کی جانب سے خریدار اول کے سامنے یا اسکے نائب کے سامنے بیع کا ایسا تخلیہ کہ وہ اس میں اصلتہ، یا نیابتہ ہر قسم کے تصرف پر قادر ہو یہ ضروری ہے، لہذا صورت مسئلہ میں خریدار اول کا مال فیکٹری سے لے کر خریدار ثانی تک پہنچانے والا اگر خریدار اول کا اجیر و وکیل ہے، تو خریدار اول کی جانب سے مال مذکور کی فروختگی کو بعد القبض ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا جائیگا، اور اگر خریدار ثانی تک مال پہنچانے والا شخص فیکٹری کا ملازم و اجیر ہے تو اس صورت میں خریدار اول کے محض ضمان قبول کر لینے کو اس کا قبضہ

نہیں سمجھا جائے گا، اور یہ عقد ثانی قبل القبض ہونے کی وجہ سے ناجائز شمار ہوگا اور خریدار اول کے قبضہ سے پہلے بیع کے نقصان کی ذمہ داری خریدار اول پر ڈالنے کی شرط طے کرنا بھی جائز نہ ہوگا، بلکہ فیکٹری کے خریدار تک مال پہنچنے سے پہلے ہونے والے نقصان کا ذمہ دار فیکٹری کے مال کا بائع شمار ہوگا، جیسا کہ مشتری کے قبضہ سے پہلے بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں بائع کے ذمہ ضمان عائد ہونے کے جزئیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے (فتاویٰ ہندیہ جلد ۳)۔

۷۔ اگر خریدار اول نے اصل بائع کو مال بردار کمپنی کے ذریعہ خرید کر دہ مال بھیجنے کے لئے کہا اور مال برداری کا کرایہ خریدار اول کے ذمہ طے ہوا تو خریدار اول کا مال مذکور کو خریدار ثانی کے ہاتھ فروخت کرنا تو جائز ہے، مگر مال کے ضائع ہونے کی صورت میں خریدار ثانی کو ضامن بنانا شرعاً جائز نہیں ہے، اور خریدار ثانی تک مال پہنچنے سے پہلے مال کے ضائع ہونے کی صورت میں خریدار اول ہی ضامن رہے گا، کیونکہ مال اس کے وکیل کے ضمان میں ضائع ہوا ہے، ابھی اس مال پر خریدار ثانی کا قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ضمان میں داخل نہیں ہوا، لہذا اس کو ضامن بنانا جائز نہیں ہے (عالگیری ۱۹۳، احسن الفتاویٰ ۵۲۶/۶)۔



## قبضہ سے پہلے بیع و شراء کا شرعی حکم

مولانا عبدالقیوم پالنپوری

۱۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک مشتری کا قبل القبض بیع منقول کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ بیع فاسد ہے، اور بیع غیر منقول کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، ”قال أبو حنيفة و أبو يوسف: يمتنع البيع قبل القبض في سائر المنقولات ويجوز في العقار الذي لا يخشى هلاكه كما في“ (فتح القدیر ۵، ۲۶۱، تکملة فتح الملہم ۱، ۲۵۱) ”صح بیع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه... لعدم الضرر لندرة هلاك العقار... بخلاف بيعه (المنقول) قبله فإنه باطل مطلقاً قلت في المواهب وفسد بيع المنقول قبل قبضه انتهى، ونفي الصحة يحتملها“ الدر المختار“ (قوله نفي الصحة) أي الواقع في المتن يحتملها أي يحتمل البطلان و الفساد، والظاهر الثاني لأن علة الفساد الضرر كما مر مع وجود ركني البيع، وكثيراً ما يطلق الباطل على الفساد، أفاده“ (رد المحتار مع الدر ۲، ۲۲۵-۲۲۶)۔

۲، ۳۔ قبضہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک حسی اور دوسرا حکمی، اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں حسی قبضہ ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ حکمی قبضہ بھی کافی ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ بیع کرنے کے بعد بیع کے سامنے، یا قریب ہونے کی حالت میں بائع مشتری کو کہہ دے کہ اس کو لے لو، پھر چاہے مشتری اس بیع کو اٹھائے، یا نہ اٹھائے (یا تصرف میں لائے، یا نہ لائے) حکمی قبضہ ہو جائے گا اور بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے گی، اشیاء منقولہ یا غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ در مختار اور رد المحتار میں ہے۔

ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے، یعنی عرف میں جس کو قبضہ تصور کیا جائے گا وہی شرعاً قبضہ مانا جائے گا بشرطیکہ بیع مقدوراً تسلیم ہو اور دور نہ ہو، حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنوی لکھتے ہیں: ”پھر اس امر میں کہ قبضہ معتبر کس طور کا ہے، فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، جن سب کا مرجع عرف پر ہے اور ہے بھی یہی بات کہ قبضہ کوئی شرعی ایجاد نہیں، جسے لوگ قبضہ سمجھتے آئے وہی شرع میں بھی قبضہ سمجھا گیا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں اعتبار قبض کو وسعت دینے کی سخت ضرورت ہے، مثلاً چھکڑے مالوں سے بھرے آتے ہیں اور کھڑے کھڑے کئی بار پک کر آخر کار مال اتارا جاتا ہے، تو ہر بار کسی قسم کی نقل و حرکت میں غالباً مصارف اصل کے قریب، یا زیادہ بڑھ جائیں گے، پس ضروری ہے (۱) بلٹی (۲) قول قبضہ سمجھ لیا جائے، مثلاً مال کی بلٹی پر دستخط کر کے حوالے کر دے، یا بیچ کر کہہ دیا کہ تم لے لو، یہ قبضہ ہے، کیونکہ عرف موجودہ میں یہ تمام امور قبضہ جائز تصور ہوتے ہیں، اور ان سے مشتری کو باقاعدہ تصرف کا اختیار ہو جاتا ہے“ (عطر الہدیہ ۳۸)۔

اور مفتی محمد تقی صاحب عثمانی لکھتے ہیں: ”ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے“ (اسلام اور جدید معیشت و تجارت ۹۲)۔

۳۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بالعلۃ“ ہیں، اور اس بیع کی ممانعت کا مدار دو علتوں پر ہے، ایک یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع مقدوراً تسلیم نہیں ہوتی، لہذا یہ بات یقینی نہیں کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کر دے گا، یہ غرر ہے جس کی وجہ سے جائز نہیں، اور دوسری علت ممانعت یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں نہیں آتی، اور ”بیع مالہ یضمن“ جائز نہیں ہے، جیسا کہ مفتی تقی صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کا مدار دو وجہوں پر ہے (۱) قبضہ سے پہلے بیع مقدوراً تسلیم نہیں ہوتی۔

لہذا یہ بات یقینی نہیں کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کر دے گا، یہ غرر ہے جس کی بناء پر جائز نہیں، بیع کی بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان میں یہ غرر کی وجہ نہیں پائی جاتی، باوجود اس کے بیع حساً مقبوض نہیں، لیکن حکماً وہ مشتری کے تصرف میں آ جاتی ہے، لہذا ایسی صورتوں میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت نہیں پائی جائے گی۔

(۲) قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں نہیں آتی اور ”بیع مالہ یضمن“ جائز نہیں (اسلام اور



حدید معیشت و تجارت ۹۱۔

اور حضور ﷺ کی احادیث: ”لا یحل سلف و بیع و لا شرطان فی بیع و لا ربح ما لم یضمن و لا بیع ما لیس عندک“ (أخرجه الترمذی) اور ”إن النبی ﷺ نھی عن بیع الحصة و عن بیع الخمر“ رواه الجماعة إلا البخاری (إعلاء السنن ۱۳۰۱۶)۔  
دالت کرتی ہیں کہ قبل القبض بیع کی نہیں علت یہ ہے کہ یہ بیع غرر، یا ”ربح ما لم یضمن“ کو مستلزم ہے، ”وإنما العلة المنصوصة فی ذلك ما رویناه فی حدیث عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما وهو أن البیع قبل القبض یتضمن ربح ما لم یضمن“ (تکملة فتح الملهم ۱۰۳۵۲)۔  
”وقال ابن الهمام: والحدیث معلول به أى بغير الانفساخ، والدلیل علیه أن التصرف الذی لا یمتنع بالغرر نافذ فی البیع قبل القبض وهو العتق و التزوج علیه“ (فتح ۵۰۲۶۶ عن تکملة فتح الملهم ۱۰۳۵۲)۔

۵۔ (۱) امام احمد کی اظہر روایت یہ ہے کہ نہیں صرف طعام کے ساتھ خاص ہے، لہذا طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، اور اس کے علاوہ جائز ہے، (۲) اور امام مالک فرماتے ہیں کہ صرف طعام میں سے مکملات و موزونات میں قبل القبض ناجائز ہے، مالکیہ میں سے سخون و ابن حبیب فرماتے ہیں کہ ہر مکملی و موزونی اور عدوی میں ناجائز ہے، پھر کیا وہ طعام کے ساتھ خاص ہے ان کے یہاں یاربویات کے ساتھ؟ تو اس میں دو قول ہیں جن کو ابی نے بیان کیا ہے (تکملہ ۳۵۰/۱)۔

ان حضرات نے حضور ﷺ کے ارشاد: ”من ابتاع طعاما فلا یبعه حتی یتوفیه“ (رواہ مسلم) سے استدلال کیا ہے کہ اس میں ممانعت طعام ہی پر منحصر ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے اس میں طعام کی صراحت کی ہے (تکملہ ۳۵۱/۱)۔  
(۳) امام شافعی اور امام محمد کے نزدیک ہر چیز کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت (خواہ وہ طعام ہو، یا غیر طعام، منقول ہو، یا غیر منقول) حرام ہے اور یہی امام احمد کی ایک روایت ہے۔

ان حضرات نے حضور ﷺ کی حدیث: ”فإن رسول الله ﷺ نھی أن تباع السلع حیث تباع، حتی یجوزها التجار إلى رحالهم“ (رواہ ابو داؤد) اور حکیم ابن حزام کے جواب میں منقول حضور ﷺ کا ارشاد ”یا ابن أخی، لا تبیعن شیئا حتی تقبضه“ وفی روایة أبان: إذا اشتريت بیعا فلا تبعه حتی تقبضه“ (رواہ البیهقی، وابن حیان و احمد فی مسندہ) سے استدلال کیا ہے، کہ ان دونوں حدیثوں میں حکم، طعام اور منقول کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر چیز میں حکم عام ہے اور حضرت عبد اللہ بن عمرو کی حدیث: ”لا یحل سلف و بیع و لا شرطان فی بیع و لا ربح ما لم یضمن و لا بیع ما لیس عندک“ سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اس میں حضور ﷺ نے اس میں ”ربح ما لم یضمن“ سے منع کیا ہے اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اس کو متضمن ہے، اور یہ علت طعام اور غیر طعام کو عام ہے (تکملہ ۳۵۲/۱)۔

(۴) امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ تمام منقولات میں قبل القبض بیع ناجائز ہے، اور اس عقار میں جس میں ہلاکت کا اندیشہ نہیں ہے جائز ہے (فتح القدیر ۲۶۶/۵)۔

شبیخین انہی تین احادیث سے استدلال کرتے ہیں (جن سے امام شافعی اور امام محمد استدلال کرتے ہیں)، لیکن عقار وغیر منقول کو عموم نہیں سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، اسلئے کہ نہیں کی علت اس میں مستثنیٰ ہے، اس لئے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو کی حدیث دالت کرتی ہے کہ قبل القبض بیع کی بیع سے نہیں علت یہ ہے کہ یہ بیع ”ربح ما لم یضمن“ کو مستلزم ہے، اور انسان صرف اس چیز کا ضامن ہوتا ہے جس میں ہلاکت کا خوف ہو اور عقار میں اس کا خوف نہیں ہے مگر نادر حتیٰ، کہ اگر اس میں ہلاکت ہونے کا خوف ہو تو قبل القبض بیع ناجائز نہیں، جیسے سمندر کے کنارے پر جو عقار ہو اس میں قبل القبض بیع ناجائز نہیں، جیسا کہ ”فتح القدیر“ میں ہے (تکملہ فتح الملہم ۳۵۰-۳۵۳ شیخ محمد تقی عثمانی)۔

۶۔ ایک شخص کسی فیکٹری سے فون، یا فیکس کے ذریعہ مال خرید کر اپنے قبضہ میں لئے بغیر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور مال براہ راست فیکٹری سے مشتری ثانی کے یہاں روانہ کر دیتا ہے، اس صورت میں اس شخص کا دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینا قبل القبض ناجائز نہیں ہے (۱)، چاہے تجارتی اصول کے مطابق وہ مال اس شخص کے ضمان میں سمجھا جاتا ہو، اس لئے کہ اس صورت میں قبضہ حسی اور حکمی، یعنی تخلیہ سے قبل بیچنا ہے، کیونکہ قبضہ حکمی کیلئے بھی بیع کا

عاقدين سے اتنا قریب ہونا ضروری ہے کہ قبضہ حسی کا تحقق ہو سکے، جیسا کہ علامہ شامی اور حصکفی کی ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے، جو سوال (۲، ۳) کے جواب میں تحریر کی جا چکی ہیں، ”فی البحر والخانیة: ... لأن إذا كان قریباً يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال، فتقام التخلية مقام القبض، أما إذا كان بعيداً لا يتصور فيه القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض اب؛ لأن المعتبر فيها القرب الذي يتصور معه حقيقة القبض كما علمته من كلام الخانیة“ (رد المحتار ۴۰۵۹-۲۰)۔

۷۔ یہ صورت بھی سوال نمبر (۶) میں مذکور صورت کی طرح ناجائز ہے، مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نے اس جیسی صورتوں کے جواز کی دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

(۱) جہاں مال خریدا ہے، وہاں کسی کو، یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے، اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے (۲) (جس شخص کے یہاں مال پہنچ رہا ہے اس کو وکیل بالقبض بنا دے اور مال پہنچنے سے پہلے بیع نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کرے، بیع مال پہنچنے کے بعد کرنے، اس صورت میں جانبین سے کوئی انکار کر دے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، اگرچہ مشتری نے کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو، کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہوگی۔

”قال في الهندية: إذا قال المشتري للبائع: ابعث إلى ابني واستاجر البائع رجلاً يحمله إلى ابنه، فهذا ليس بقبض، إلا أن يقول: استاجر من يحمله، فقبض الأجير يكون قبض المشتري، إن صدقه أنه استأجره و دفع إليه وإن أنكر استيجاره و الدفع إليه، فالقول قوله، كذا في التتارخانية“ (عالمگیریہ ۲۰۱۹، احسن الفتاویٰ ۶۰۵۲۶)۔

☆☆☆

## اشیاء منقولہ کی بیع قبضہ سے پہلے

مولانا منظور احمد قاسمی

۴، ۱۔ قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنے کی ممانعت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو مختلف احادیث مروی ہیں، ان کے پیش نظر جمہور فقہاء کے نزدیک اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض ناجائز تو ضرور ہے، لیکن آیا اس کا شمار بیع باطل میں ہے یا بیع فاسد میں یا بیع مکروہ میں؟ اس سلسلہ میں بعض فقہی عبارات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اشیاء منقولہ میں ”بیع قبل القبض“ باطل ہے، جیسا کہ ”فتح القدیر“ میں ہے: ”وقبل القبض في المنقول لا ينعقد أصلاً“ (۶، ۲۲) کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ سے پہلے بیع اصلاً منعقد ہوتی ہی نہیں۔ چنانچہ بیع باطل کی تعریف فقہاء بھی یہی کرتے ہیں کہ جو بیع اصل و وصف کے اعتبار سے درست نہ ہو۔ ”الباطل هو ما لا يكون صحيحاً أصلاً ووصفاً“ (عناية على الفتح ۶، ۲۲) اور صاحب ”البحر الرائق“ لکھتے ہیں: ”هو ما لا يكون مشروعاً لا بأصله ولا بوصفه“ (۶، ۶۹) اور کفایہ میں ہے: ”وقبل القبض لا يدرى أتم البيع فيصير بائعاً ملك نفسه أم يفسخ بائعاً ملك غيره، فلا يصح فتمكن فيه غرر فكان باطلاً“ (كفایہ على الفتح ۶، ۱۳۶) کفایہ کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیع قبل القبض باطل ہے۔

نیز یہ تو مسلم بات ہے کہ جن کے نزدیک اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض درست نہیں ہے وہ انفساخ عقد کے غرر کی وجہ سے ہے یعنی اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض میں یہ اندیشہ ہے کہ بیع کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے اول عقد بیع ہی فسخ ہو جائے، گویا ”بیع قبل القبض“ غرر ہے۔ اور جس طرح سے آپ ﷺ سے ”بیع قبل القبض“ کے متعلق نہیں وارد ہے، اسی طرح سے بیع غرر کے متعلق بھی نہیں وارد ہے اور التعریفات الفقہیہ میں بیع غرر کی تعریف کرتے ہوئے بہت سے معانی کو بیع غرر میں شمار کیا ہے، مثلاً آبق کی بیع، مجہول و معدوم کی بیع، غیر مقدور التسلیم کی بیع اور اس چیز کی بیع جس پر ابھی بائع کی ملکیت تام نہ ہوئی ہو، پھر اس کے بعد صراحت ہے کہ ”فكل هذا بيعه باطل“ (قواعد الفقہ ۲۱۴) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیع قبل القبض بیع باطل میں شمار ہوتی ہے۔

رہی بات اشیاء غیر منقولہ میں بیع قبل القبض کی تو یہ ائمہ احناف میں سے امام صاحب اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے، اور امام محمد کے نزدیک درست نہیں ہے۔ دراصل امام محمد ”بیع قبل القبض“ کی نہی مالم یقبض“ والی حدیث کو اپنے اطلاق پر رکھتے ہیں، اور وہ فرماتے ہیں کہ غیر مقبوضہ کی بیع مطلقاً ممنوع ہے خواہ وہ اشیاء منقولہ میں ہو یا غیر منقولہ میں..... اور شیخین ”بیع قبل القبض“ کی نہی سے متعلق احادیث کو ”معلول بالعلتہ“ کہتے ہیں کہ اصل میں ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت بیع کے ہلاک ہو جانے سے عقد اول کے فسخ ہو جانے کے اندیشے اور غرر کی وجہ سے ہے اور اشیاء منقولہ کی ہلاکت بہت ممکن ہے، اس لئے انفساخ عقد اور غرر کی علت کی وجہ سے اس میں ”بیع قبل القبض“ ممنوع ہے۔ اور چونکہ غیر منقولہ کی ہلاکت نادر ہے اور النادر کالمعدوم ہے، اس لئے اس میں انفساخ عقد اور غرر کی علت معدوم ہونے کی وجہ سے ”بیع قبل القبض“ درست ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں اس کی صراحت ہے: ”ویجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف“ (هدایہ ۲، ۵۸)۔

”وصح بيع العقار لا يخشى بلاكه قبل قبضه من بائعه لعدم الغرر وندرة بلاك العقار“ (در مختار على الشامي ۵، ۱۳۷)۔

۵۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت امام محمد اور امام شافعی کے نزدیک عام ہے، اس ممانعت میں اشیاء منقولہ وغیر منقولہ سب داخل ہیں اس دلیل کی بنیاد پر جو اوپر مذکور ہوئی ہے، یعنی اطلاق حدیث اور وہ حدیث یہ ہے، جس کو صاحب فتح القدیر نے بیان کیا ہے: ”لا تبیعن شیئاً حتی تقبضه“۔

اور شیخین کے نزدیک ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت میں صرف اشیاء منقولہ داخل ہیں، ان حضرات کی دلیل بھی گذشتہ صفحہ پر مذکور ہو چکی ہے۔

اس باب میں امام مالک کا مذہب صاحب ”فتح القدیر“ نے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک صرف کھانے کی اشیاء میں ”بیع قبل القبض“ جائز نہیں ہے، بقیہ تمام اشیاء میں خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ ہر طرح کا تصرف قبل القبض درست ہے۔ اور امام مالک کی دلیل صاحب ”فتح القدیر“ نے یہ ذکر کی ہے کہ: ”لأنه ﷺ خص الطعام بالنهي في حديث زواہ مالك عن نافع عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه“



حتی یتوفیہ، اخرجہ الشیخان وفي لفظ حتی یقبضہ“ (۶۰۱۳۶)۔

شریعت اسلامی میں قبضہ کی کیا حقیقت ہے؟ اس سلسلہ میں کتاب وسنت نے قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین کی ہے یا نہیں؟ بندہ کو ایسی کوئی صراحت کتاب وسنت میں نہیں مل سکی ہے، البتہ فقہاء کی عبارات اس سلسلہ میں خصوصاً علامہ شامی کی تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قبضہ کی کوئی خاص صورت متعین نہیں ہے، بلکہ مختلف چیزوں کے قبضہ کی مختلف صورتیں ہیں، لیکن اتنی بات تو ضرور ہر چیز کے قبضہ کی حقیقت میں قدرے مشترک ہے کہ بائع بیع کو ایسے طور پر فارغ کر دے اور بیع کو ایسی پوزیشن میں کر دے کہ مشتری کو اس پر قبضہ کرنا بغیر کسی اڑچن و تردد کے ممکن ہو اور وہ بیع بائع کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، جیسا کہ ”در مختار علی الشامی“ (۵۶۱/۳) میں ہے:

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل“۔

چنانچہ علامہ شامی نے اس عبارت کی شرح میں کئی چیزوں پر قبضہ کے تحقق کی مختلف صورتیں لکھی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قبضہ کی کوئی خاص صورت متعین نہیں ہے اور نہ ہی ہر چیز میں قبضہ کسی شرط ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس وجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے۔ البتہ اتنی بات تو بہر حال ہر شے کے قبضہ کے سلسلہ میں ملحوظ رکھے گی کہ بیع کے بعد وہ شے ایسی حالت میں ہو کہ مشتری اس پر قبضہ بغیر کسی تکلف کے کر لے اور وہ بیع بائع کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، کیونکہ اگر قبضہ کی بابت اتنی بات بھی ملحوظ نہ ہو تو قبضہ و تسلیم کا معنی ہی متحقق نہ ہوگا۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ خواہ اشیاء منقولہ ہوں یا غیر منقولہ دونوں میں ایک معنی مشترک ہوگا جو قبضہ و تسلیم کی تعریف ہے۔ اب اس قبضہ کا تحقق اشیاء منقولہ میں کب ہوگا، اور اشیاء غیر منقولہ میں کب ہوگا؟ تو اس کا تعلق عرف سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا جس کے بارے میں عرف ہوگا اسی کو اس شے کے متعلق قبضہ شمار کریں گے، اتنی بات بدیہی ہے کہ ساری چیزوں میں قبضہ کسی شرط نہیں ہے۔

۶۔ مذکورہ صورت میں جبکہ خریدار (۱) فیکٹری سے مال خرید کر اس پر قبضہ حسی کرنے سے پہلے خریدار (۲) کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو اگر بیع خریدار (۲) کے ہاتھ فروخت کرنے سے پہلے خریدار (۱) کے ضمان میں آجاتی ہے تو گویا اس نے مال مضمون کی بیع خریدار (۲) سے کی ہے، اور مال مضمون پر نفع لیا ہے۔ اب یہاں پر گو کہ مال بیع پر خریدار (۱) کا قبضہ حسی نہیں ہوا ہے لیکن آج کل تجارت کے درمیان یہ عرف ہے کہ یہ بیع خریدار (۱) کے ضمان میں پہنچ جاتی ہے، اس لئے ضمان کو قبضہ حسی سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دینا چاہئے۔ چنانچہ خرید و فروخت کے سلسلہ میں تجارت کے درمیان کوئی عرف ہو تو اس کا اعتبار بھی ہوتا ہے، جیسا کہ عرف خاص کی مثال دیتے ہوئے صاحب ”المدخل“ نے لکھا ہے: ”وذلك كعرف التجار فما بعد عيبا ينقص الثمن في البضاعة المباعة أولا بعد عيبا“ (۲۰۸۴)۔

تجارت کے درمیان کا عرف گو کہ عرف خاص ہے عرف عام نہیں ہے، پھر بھی آج کل مذکورہ صورت میں عرف خاص کا دائرہ بہت وسیع ہے اور دن بدن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اس لئے اس عرف خاص پر قیاس کرنا درست ہے، جیسا کہ آٹھویں فقہی سمینار میں یہ بات علماء کے درمیان تجویز ہو چکی ہے کہ اگر عرف خاص کا دائرہ بہت وسیع ہے تو اس کی بنا پر قیاس درست ہے۔ مزید یہ کہ اس صورت کو اگر جائز نہ قرار دیا جائے تو امت مسلمہ کو ضرر لاحق ہوگا، کیونکہ آج کل خرید و فروخت کی کچھ صورت حال ایسی ہوتی جا رہی ہے کہ اس میں قبضہ حسی کو لازم قرار دینا ضرر کے مرادف ہے، مثلاً آج کل بھاری اور بڑی تجارتیں اور متعاقدین کے درمیان بہت دور دراز کا فاصلہ ہونا۔ اس لئے ”الضرر يزال“ اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے پیش نظر بھی یہ صورت جائز ہونی چاہئے۔

۷۔ وہ صورت جس میں بین الاقوامی تجارت شپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے اور مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا وہ ضامن نہیں ہوتا ہے، تو اگر یہ مال بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں آجاتا ہے تجارت کے عرف میں، تو پھر اس مال مضمون کی فروخت مشتری کے لئے جائز ہونی چاہئے، اس دلیل کی وجہ سے جو چھ نمبر کے سوال کے جواب میں گزری۔ اور اگر اس مشتری نے جبکہ مال ابھی سمندر میں ہے تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ فروخت کرنا تو درست ہے، لیکن چونکہ تیسرے شخص کے ضمان میں اس مال کے پہنچنے کی کوئی علامت نہیں ہے، اس لئے اس مال کے ضائع ہو جانے پر تیسرے شخص کا ضامن ہونا درست نہیں معلوم ہوتا..... البتہ اگر وہ مال بیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے

ضمان میں نہیں آیا ہے تو ایسی صورت میں مشتری اول نے مشتری ثانی کو بیع دیا ہے تو یہ بیع درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس نے گویا قبضہ سے پہلے بیع فروخت کر دیا ہے اور ایسی چیز سے نفع حاصل کیا ہے جس کا ضامن نہیں ہوا تھا، اور حدیث میں ربح الم یضمن کی ممانعت ہے۔

☆☆☆

## قبضہ سے پہلے کسی چیز کا فروخت کرنا

مولانا احمد حسن

- ۱۔ رسول اللہ ﷺ نے بیع پر قبضہ کئے بغیر فروخت کرنے سے روکا اور منع فرمایا ہے:
 

”کنا نشتری الطعام من الركبان جزا فافنہانا رسول اللہ ﷺ أن نیبعہ حتی ننقلہ من مکانہ (أی قبضہ)“ (ابن ماجہ ۱۶۲)۔

”لا تبع قبل أن تستوفیہ“

”بعث علینا (رسول اللہ ﷺ) من یأمرنا بانتقالہ من المکان الذی نبتاعہ فیہ إلی مکان سواہ قبل أن نیبعہ“ (موطا امام محمد ۲۲۲)۔

”لا تبع ما لیس عندک“ (ترمذی ۲۱۰)۔

”فماہم عن بیعہ فی مکانہ حتی ینقلوہ“ (ابوداؤد نقلاً عن مشکوٰۃ ۲۲۷)۔

بیع منقول قبل القبض باطل بیع ہے، بعض فقہاء نے اسی کیلئے فاسد بیع کے الفاظ لکھے ہیں، ”بخلاف بیعہ قبلہ (أی قبل قبضہ) فإنہ باطل مطلقاً (جوہرۃ)“ قلت: وفي المواہب وفسد بیع المنقول قبل قبضہ انتہی، وفي الصحۃ فی قوله لم یصح یحتملہا فتنبہ، ترمذی میں ”باب ما جاء فی کرہیۃ بیع ما لیس عندک“ کے الفاظ سے ”ترجمۃ الباب“ لکھ کر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے مکروہ ہونے کو بتایا ہے۔
  - ۲۔ اسلام نے جب کسی چیز کی حقیقت واضح اور متعین فرمادی ہو تو اسے لوگوں کے عرف و عادت پر نہیں چھوڑا جاسکتا، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ”حتی ننقلہ من مکانہ“ سے حسی و حقیقی قبضہ ہی متعین ہوتا ہے۔
  - ۳۔ اشیاء منقولہ کا قبضہ تو وہی ہے جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے واضح ہوتا ہے، لیکن اشیاء غیر منقولہ (مکان وغیرہ) کا قبضہ بیع کے مشتری کی تحویل میں آجانے، یا وثیقہ تحریر، یا تکمیل شہادت بیع سے تسلیم کیا جائے گا۔
  - ۴۔ منع قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی علت ہلاکت و تلف بیع کا خطرہ اور غرر و خدع ہے (در مختار ۴۷۹)۔
  - ۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت سے اشیاء غیر منقولہ (بقول مفتی بہ) مستثنیٰ ہیں۔
- عتق عبد و امہ، تدبیر، ہبہ، تصدق، رہن، عاریت کو بھی قبل القبض جائز لکھا ہے (الابواب والترجم للشیخ زکریا ۲۳۶)۔
- قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق ائمہ مجتہدین اور حنفیہ کی آراء:
- امام مالکؒ نے غیر طعام میں ہر چیز کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی اجازت دی ہے۔
  - امام احمد بن حنبلؒ نے نکیل، موزون اور معدوثی کے علاوہ ہر چیز کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جائز فرمایا ہے۔
  - امام شافعیؒ نے طعام ہو، یا غیر طعام کسی بھی شے کے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جائز قرار نہیں دیا ہے۔
  - امام اعظم ابو حنیفہؒ نے غیر منقولہ اشیاء کی بیع ”من غیر قبض“ کے جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، اور منقولات کی بیع کو قبضہ سے پہلے منہ کیا ہے، امام ابو یوسفؒ

نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے، اور امام احمد بن حنبل کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے (بنایہ نقلاً من التعلیق مجدد ۳۳۱)۔

حنفیہ کے مسلک میں امام صاحب کا ارشاد ہی مفتی بہ ہے: ”صح بیع عقار لا یخشی ہلاکہ قبل قبضہ، فلا یصح اتفاقاً ککتابہ وإجارة ویبع قبل قبضہ“ (شرح تنویر الأبصار ملتقطاً ۲۰۲۵)۔

”لا یصح بیع منقول قبل قبضہ“ (فتاویٰ حامدیہ ۱۰۲۶)۔

امام مالک کے مسلک کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا غیر طعام میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کو جائز فرمادینا ہے، لفظ طعام کا خصوصی طور پر منع میں ذکر غیر طعام کی اجازت کو واضح کرتا ہے۔

امام شافعی کی دلیل ارشاد رسول علیہ السلام میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے منع فرمادینا ہے۔

امام اعظم کے فتویٰ کی دلیل غیر منقولہ اشیاء کے تلف و ہلاک ہونے کا امکان، بلکہ ضائع ہونے کا وقوع ہے اور غیر منقولہ جائداد میں بالعموم ایسا نہیں ہوتا ہے (تعلیق مجدد ۳۳۱)۔

بیع کا معاملہ اس شخص کی جانب سے ہو رہا ہے جسے بیع کی شرعاً اجازت ہے (لمعات بر حاشیہ مشکوٰۃ ۲۳۷)۔

۶۔ جب منقولہ اشیاء میں قول مفتی بہ کے پیش نظر من غیر قبضہ فرد خفگی جائز ہی نہیں ہے تو درمیان کے یہ معاملات اور ضمان کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

۷۔ منقولہ اشیاء میں کیا جانے والا یہ معاملہ (بیع من غیر قبضہ) بھی جائز نہیں، تیسرے خریدار کا ضامن و ذمہ دار ہونا بھی صحیح نہیں۔

(نوٹ) ان ہر دو سوال کے دلائل اوپر کے نمبرات میں درج ہیں۔





## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق مسائل

مولانا عبداللطیف پالنپوری

۱۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت شرعاً ناجائز ہے اور یہ بیع فاسد ہوگی، ”ومن اشترى شيئاً ما ينقل ويحول لم يجز له يبعه حتى يقبضه لأنه عليه السلام نهي عن بيع مالٍ يقبض (هداية) والنهي يقتضي الفساد، فيكون البيع فاسداً قبل القبض“ (عناية على هامش الفتح ۵۰۲۶۵)۔

۲۔ قبضہ کی دو قسمیں ہیں (۱) حسی (۲) حکمی، حسی قبضہ یہ ہے کہ بیع حقیقہ مشتری کے قبضہ و تصرف میں آجائے، اور حکمی قبضہ کی صورت تخلیہ ہے، اور ”تخلیہ“ یہ ہے کہ بائع مشتری کو بیع اس طرح سپرد کرے کہ مشتری اس کے قبضہ پر بغیر کسی حائل و مانع کے قادر ہو، یعنی بیع سامنے حاضر ہو اور غیر کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، اور بائع مشتری کو اس کے قبضہ کی اجازت دیدے، پس اگر مشتری کو قبضہ کی اجازت نہیں دی، یا اجازت دی لیکن وہ بیع دور تھی تو بھی قبضہ صحیح نہ ہوگا۔

”ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل و شرط في الأجناس شرطاً ثالثاً وهو أن يخلت بينك وبين المبيع فلو لم يقله أو كان بعيداً لم يصر قابضاً، والناس عنه غافلون، فإنهم يشتررون قرية ويقرون بالتسليم والقبض وهو لا يصح به القبض على الصحيح“ (در مختار علی رد المحتار ۴، ۴۳)۔

شریعت میں قبضہ کی کوئی صورت متعین نہیں، بلکہ قبضہ کا مدار عرف پر ہے، لیکن یہ عرفی قبضہ اس وقت معتبر ہوگا جب کہ قبضہ حسی، یا حکمی کے دائرے میں آتا ہو، بیع کا صرف مشتری کے ضمان میں آجانا قبضہ کیلئے کافی نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی ایسی چیز ہو کہ اس میں حسی یا حکمی قبضہ ممکن نہ ہو تو ضمان میں آنے سے بھی قبضہ شمار کیا جائے گا۔

۳۔ اشیاء منقولہ و غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہوگا، دونوں میں حسی اور حکمی قبضہ معتبر ہوگا۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بالعلتہ“ ہیں، اور نہی کی دو علتیں ہیں، (۱) قبضہ سے پہلے بیع کا مقدر اور تسلیم نہ ہونا، کیونکہ ممکن ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع ہلاک ہو جائے جس کی بناء پر بائع مشتری کو قبضہ نہ کرا سکے اور یہ غرر ہے جس کی بنا پر بیع جائز نہیں ہے (۲) دوسری علت یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں نہیں آتی اور ”رجالم یضمن“ جائز نہیں، ”والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد، والحديث معلول به (هداية) فإن الحديث الأخير حديث عبدالله بن عمرو دل على أن العلة في النهي عن بيع البيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح مالٍ يضمن“ (تكملة فتح الملهم ۱۰۲۵۲)۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کے بارے میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں (۱) امام احمد کی ظاہر روایت یہ ہے کہ طعام (غله) کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع ہے، اور اس کے علاوہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے (۲) امام مالک فرماتے ہیں کہ طعام (غله) میں سے مکلی اور موزونی چیزوں کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع ہے (۳) امام شافعی اور حنفیہ میں سے امام محمد فرماتے ہیں کہ طعام اور غیر طعام، منقول اور غیر منقول ہر ایک کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت حرام ہے (۴) امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ تمام منقولات کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ممنوع ہے، اور وہ عقار جس کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو اس کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز ہے، اور اگر عقار کی ہلاکت کا اندیشہ ہو، مثلاً سمندر کے کنارے ہو تو اس کی بیع بھی قبل القبض جائز نہیں ہے (مکملہ فتح الملہم ۳۵۰/۱)۔

علا جامعہ نذیریہ، کاکوسی، گجرات۔

دلائل:

امام احمدؒ کی دلیل: ”عن ابن عباسؓ أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يستوفيه“ (تكملة فتح الملهم، ۱، ۳۵۰) امام مالکؒ کی دلیل: ”ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يكتاله“ (تكملة فتح الملهم، ۱، ۳۵۳) امام شافعی اور امام محمدؒ کی دلیل: (۱) ”أخرج أبو داود“ عن ابن عمرؓ قال: ... فإن رسول الله ﷺ نهى أن تبايع السلع حيث تبايع حتى يجوزها التجار إلى رحالهم“ فقد عمر هذا الحديث الحكم في سائر السلع“۔

(۲) ”عن حكيم بن حزام قال: قلت: يا رسول الله إني أبتاع هذه البيوع، فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال: يا ابن أخي لا تبين شيئاً حتى تقبضه“۔

(۳) ”عن عبد الله بن عمرو أن رسول الله ﷺ قال: ”لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا يبيع ما ليس عندك“ فنهى فيه رسول الله ﷺ عن ربح ما لم يضمن، والبيع قبل القبض يتضمنه؛ لأن المبيع لا يأتي في ضمان المشتري حتى تقبضه فإن باعه قبل ذلك بالربح كان ذلك ربحاً لم يضمنه“ (تكملة فتح الملهم، ۱، ۳۵۲)۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی دلیل: ”وبعين هذه الدلائل الثلاثة يستدل أبو حنيفة وأبو يوسف غير أنهما يستثنيان العقار من عموم النهي؛ لأن علة النهي منتفية فيه، فإن الحديث الأخير، حديث عبد الله بن عمرو، دل على أن العلة في النهي عن بيع المبيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح ما لم يضمن وإنما يضمن الإنسان ما يخاف فيه الهلاك، وأما العقار فلا يخشى فيه ذلك إلا نادراً حتى لو كان العقار على شط البحر أو كان المبيع علواً لا يجوز بيعه قبل القبض كما في فتح القدير؛ لأن الهلاك فيه غير نادر“ (تكملة فتح الملهم، ۱، ۳۵۲)۔

۶۔ فیکٹری سے خرید کردہ مال براہ راست دوسرے خریدار کے ہاتھ بیچنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مال پر حسی، یا حکمی قبضہ سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں ہے، جب حسی یا حکمی قبضہ ممکن ہو تو ضمان کو قبضہ کے قائم مقام نہیں سمجھا جائے گا، البتہ اس بیع کے جواز کی دو صورتیں ہیں (۱) مال پہنچنے سے پہلے بیع نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کرے اور بیع مال پہنچنے کے بعد کرے، اس صورت میں جانبدار میں سے کوئی انکار کر دے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جہاں مال خریدتا ہے وہاں کسی مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے، اسی طرح اگر مال پہنچانے کا کرایہ خریدار ادا کرتا ہے تو اس کی اجازت سے بائع کا کسی بھی مال بردار کمپنی کی تحویل میں مال دیدینا مشتری کا قبضہ شمار ہوگا، اگرچہ کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو، کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہے۔

”قال في الهندية: إذا قال المشتري للبائع ابعت إلى ابني واستأجر البائع رجلاً يحمله إلى ابنة فهذا ليس بقبض والأجر على البائع إلا أن يقول استأجر من يحمله فقبض الأجير يكون قبض المشتري إن صدقه أنه استأجره ودفع إليه وإن أنكر استيجاره والدفع إليه، فالقول قوله كذا في التتارخانية“ (عالمگیری، ۲، ۱۹، احسن الفتاویٰ، ۶، ۵۲۶)۔

۷۔ اس صورت میں بھی چونکہ قبل القبض بیع کرنا پایا جاتا ہے اس لئے جائز نہیں ہے، ”قال العبد الضعيف عفا الله عنه: وقد ظهرت في زماننا حكمة أخرى لهذا الحكم وهي أن البيع قبل القبض في زماننا يحدث غلاء في السوق وكثيراً ما يفعله تجار زماننا في التجارة الدولية فنشاهد اليوم أن الباخرة تجرى بالبضائع من اليابان، مثلاً فيبيعه الذي يصدره إلى غيره ثم هو إلى ثاب والثاني إلى ثالث وهكذا فتجری على البضاعة الواحدة بیاعات ربما تجاوز عشرة وكل ذلك قبل وصول الباخرة إلى الميناء وينتج ذلك أن البضاعة التي كانت قيمتها بضع ربيات في اليابان لا تصل إلى سوق بلادنا إلا بعد ما تصير قيمته مائة أو أكثر؛ لأن كل تاجر يشتريها قبل الوصول يبيعها بربح إلى غيره وتصير الأرباح كلها بأيدي تجرة معدودين ويصير الغلاء نصيب العامة ولا حول ولا قوة إلا بالله“ (تكملة فتح الملهم، ۱، ۳۵۲) ☆☆☆

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

مفتی شکیل احمد سیتا پوری

”عن زید بن ثابت أن النبی ﷺ فھی أن تباع السلع حیث ینتاع حتی یجوزها التجار إلی رحالهم“ (ابوداؤد، الدارقطنی)۔

”عن ابن عباس أن النبی ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یتوفیه قال ابن عباس: ولا أحسب کل شیء إلا مثله“ (رواه الجماعة إلا الترمذی، نیل الأوطار جلد ۵)۔

(حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ سامان جس جگہ خریداجائے اسی جگہ بیچ لیا جائے، تا وقتیکہ خریدار اس کو اپنی قیام گاہ تک نہ لائے)۔

(حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کھانے کی چیز یا غلہ خریدے تو جب تک اس پر قبضہ نہ کر لے اس کو فروخت نہ کرے، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں قبضہ کا حکم طعام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر چیز کیلئے یہی حکم ہے)۔  
نہی بیع کی علت:

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ اس میں وبال لازم آتا ہے، اس لئے کہ بیع پر قبضہ ہونے سے پہلے جب اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے تو یہ درپردہ بیع الاثمان بالاثمان تقاضاً ہے، یعنی جب بیع قبضہ میں نہیں آئی ہے اور وہ فروخت کر دی گئی ہے تو گویا بائع ثانی نے بیع کے بجائے اپنے ثمن کو مشتری ثانی کے ہاتھ زیادہ ثمن کے بدلے فروخت کر دیا، امام شوکانی لکھتے ہیں:

”أخرج البخاری عن طاؤس قال: قلت لابن عباس: کیف ذلک؟ قال: دراهم بدرامہ والطعام مرجأ، استفهمه عن سبب النهی فأجابہ فإنه إذا باعه المشتري قبل القبض وتأخر المبیع فی ید البائع فکأنه باع دراهم بدرامہ ویبین ذلک ما أخرجه مسلم عن ابن عباس أنه قال: لما سأله طاؤس ألا تراهم یتاعون بالذهب والطعام مرجأ، وذلک لأنه إذا اشتری طعاماً بمائة دینار ودفعها للبائع ولم یقبض منه الطعام، ثم باع الطعام إلی آخر بمائة وعشرین مثلاً فکأنه اشتری بذهبه ذهباً أكثر منه“ (نیل الاوطار ۵، ۱۶۰)۔

امام سرخسی نے حنفیہ کی جو ترجمانی کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ بیع پر جب تک قبضہ نہ کر لیا جائے نہ اس کی بیع کی جائے نہ اس میں شرکت کا عقد کیا جائے، نہ عقد تولیہ کیا جائے، نیز امام سرخسی اس جانب مائل نظر آتے ہیں کہ حنفیہ منقول اور غیر منقول کسی بھی شیء کی ”بیع قبل القبض“ کے قائل نہیں ہیں، جس طرح منقول کی بیع کیلئے اس پر قبضہ ضروری ہے اسی طرح غیر منقول کیلئے بھی قبضہ ضروری ہے۔

ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ منقول پر قبضہ یہ ہے کہ اس کو اس جگہ سے منتقل کر کے اپنی جگہ اور اپنی حفاظت میں لے لیا جائے، اور غیر منقول پر قبضہ یہ ہے کہ بائع اول اس کا تخلیہ کر دے ”ومن اشتری شیئاً فلا یجوز له أن یشبعه قبل أن یقبضه ولا یولیہ أحداً ولا یشرك فیہ“ (المبسوط ۸، ۱۲)۔

ابن رشد کہتے ہیں کہ اشتراط قبضہ اور عدم اشتراط قبضہ میں سات مسلک سامنے آتے ہیں: ”الأول فی الطعام الربوی فقط، والثانی فی الطعام باطلاق، الثالث فی الطعام النکیل والموزون، الرابع فی کل شیء ینقل، الخامس فی کل شیء، السادس فی



المکیل والموزون، السابع في المکیل والموزون والمعدود۔ پہلا منسلک یہ ہے کہ ان مطعومات و ما کولات کی بیع میں قبضہ شرط ہے جن کے باہم تبادلہ میں ربا کا تحقق ممکن ہے، دوسرا منسلک یہ ہے کہ ہر مطعوم و ما کول کی بیع کیلئے قبضہ شرط ہے خواہ ربوی ہو خواہ غیر ربوی، تیسرا منسلک یہ ہے کہ طعام مکیل اور طعام موزون کیلئے قبضہ ضروری ہے، چوتھا منسلک یہ ہے کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ شرط ہے، پانچواں منسلک یہ ہے کہ ہر شی میں قبضہ ضروری ہے، چھٹا منسلک یہ ہے کہ مکیلات و موزونات میں قبضہ ضروری ہے، ساتواں منسلک یہ ہے کہ مکیلات و موزونات اور معدودات میں قبضہ ضروری ہے۔ ابن رشد نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک بیع مشتری کے ضمان میں اسی وقت آتی ہے جب پہلے اس پر قبضہ ہو جائے (بدایۃ المجتہد ۱۳۵)۔

### بعض اسلاف کا منسلک:

سوالنامے میں اٹھائے گئے سوالات، یعنی فیکٹریوں سے نکلے ہوئے مال کی بیع اور سامان سے لدے ہوئے بحری جہاز کی اشیاء طریق میں فروختگی، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے منسلک کے مطابق درست نہیں معلوم ہوتی، اس لئے کہ وہ بیع غیر مقبوض بھی ہے اور بیع غیر مضمون بھی، اور یہ کہنا کہ فیکٹری کا مال یا جہاز کا سامان مشتری کے ضمان میں ہوتا ہے، خواہ وہ قبضہ نہ کرے، شریعت میں معتبر نہیں، اس لئے کہ شریعت میں ضمان قبضہ کے بعد ہوتا ہے خواہ لوگوں کا معمول اس کے خلاف ہو اور خواہ لوگ کوئی نئی اصطلاح قائم کر لیں، امام مالک اور امام احمد کے یہاں مطعومات مکیلہ و موزونہ کے علاوہ کی بیع قبضہ سے پہلے درست ہے، بیع غیر مقبوض اور بیع غیر مضمون کے سلسلہ میں احادیث اور ان کی شروح، نیز ائمہ اعلام کے مسالک اور ان کے استدلالات کا مطالعہ کرنے کے بعد تاثر عموماً عدم جواز ہی کا پیدا ہوتا ہے، لیکن موجودہ حالات میں اگر اس سے کاروبار کی راہیں مسدود ہو رہی ہیں اور امت مسلمہ حرج میں پڑ رہی ہے تو امام مالک اور امام احمد کے منسلک پر عمل کرنے میں غور کیا جاسکتا ہے، ان کے نزدیک قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت اشیاء خوردنی کے ساتھ مخصوص ہے، اور ابن قدامہ کے مطابق اشیاء خوردنی بھی اگر کیل اور وزن کے عنوان سے نہیں فروخت کی گئی ہیں تو ان کی بیع بھی قبضہ سے پہلے جائز ہے، چنانچہ بائع نے اگر غلہ کا پورا ڈھیر یا پوری گاڑی تاپ اور تول متعین کئے بغیر فروخت کر دی اور مشتری نے خرید لی تو وہ پورا ڈھیر اور پوری گاڑی قبضہ کے بغیر مشتری کے ضمان میں آگئی، ابن قدامہ نے امام احمد کے حوالہ سے دو جزئیے نقل کئے ہیں: ”رجل اشتری طعاماً فطلب من یحمله فرجع وقد احترق الطعام فهو من مال المشتري“، ایک شخص نے غلہ خریدا، اور جمال کو ڈھونڈنے نکلا اور جب واپس ہوا تو غلہ جل کر خاک ہو چکا تھا تو یہ احراق مشتری کے ضمان میں ہوا۔ ”من اشتری ما فی السفینة صبرة ولم یسر کیلاً فلا بأس ان یشترک فیها ویبیع ما شاء“، جس نے پوری کشتی کا اناج خریدا اور تاپ اور تول کا کوئی ذکر نہیں آیا تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ بغیر قبضہ کئے دوسرے کو فروخت کر دے (مغنی ابن قدامہ ۱۲۱/۳)۔

امام احمد کی ترجمانی کرتے ہوئے ابن قدامہ نے کہا ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت ان اشیاء خوردنی کے ساتھ خاص ہے جو کیلا یا وزن یا فروخت کی گئی ہوں، کیونکہ اس ممانعت کا پس منظر یہ ہے کہ لوگ اندازہ اور تخمینہ لگا کر انکل سے غلہ اور اناج کی بیع کر دیتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے اس سے منع فرمایا اور حکم فرمایا کہ اس کو تاپ تول لیا کرو اور بغیر تاپ تولے دوسرے سے اس کی بیع نہ کرو، لہذا دیگر اشیاء کی بیع بغیر قبضہ کے ہو سکتی ہے، بلکہ اشیاء خوردنی بھی اگر کیل و وزن کے عنوان سے نہیں خریدی گئی ہیں تو قبل القبض ان کی بیع بھی درست ہے، ابن قدامہ کی تحقیق کے مطابق یہی منسلک حضرت عثمان بن عفان، حسن بصری، سعید بن مسیب اور حماد بن ابی سلیمان کا بھی ہے۔

### قبضہ کے معنی:

”وقبض کل شیء بحسبہ فان کان مکیلاً وموزوناً فقبضه بکیله ووزنه وبهذا قال الشافعی، وقال ابو حنیفة: التخلية فی ذلک قبض وروی عن أحمد أن القبض فی کل شیء بالتخلية مع التمییز؛ لأنه خلط بینہ و بین المبیع من غیر حائل فكان قبضاً له کالعقار“ (المغنی ۳، ۱۲۵)۔ ہر چیز کا قبضہ اس کے حسب حال ہوتا ہے، مکیل و موزون کا قبضہ امام شافعی کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا کیل اور وزن کر لیا جائے، اور امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک تخلیہ اور تمییز ہے یعنی بیع کو الگ ممتاز کر کے رکھ لینا اور بائع کے تصرف سے اس کو علیحدہ کر لینا۔

اگر قبضہ کے ان معانی پر نظر مرکوز کی جائے تو فیکٹری سے حاصل کئے ہوئے مال اور بحری جہاز کے مال پر اس طرح کا قبضہ متحقق ہو جاتا ہے، الغرض اس ملک میں جہاں اقتدار اور وسائل معاش پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے، اگر دو برحق اماموں کے منسلک پر غور و خوض کر کے مسلمانوں کیلئے کوئی راہ نکال لی جائے تو امید ہے کہ منشاء شرع کے خلاف نہ ہوگا۔



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور اس کا حکم

مولانا عبدالرحمن پالنپوری ؒ

۱۔ اشیاء منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے اور اس کا شمار بیع فاسد میں ہوگا۔ اور اشیاء غیر منقولہ کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت شیخین کے نزدیک جائز ہے بشرطیکہ بیع کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو۔ ”مجمع لا نہر فی شرح ملتقى لأبحر“ میں ہے: ”لا یصح بیع المنقول قبل قبضہ لنہیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام عن بیع ما لم یقبض، ولأن فیہ غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک... ویصح فی العقار أى یصح بیع عقار لا یجشی ہلاکہ قبل قبضہ عند الشیخین، خلافاً لمحمد وهو قول زفر والشافعی عملاً بإطلاق الحدیث، ولہما أن رکن البیع صدر عن أهله فی محله ولا غرر فیہ؛ لأن الهلاک بالعقار نادر حتی إذا تصور ہلاکہ قبل القبض لا یجوز بیعہ“ (۴۹،۸۰)

اور ”رد المحتار“ میں ہے: ”(قوله ونفی الصحة) أى الواقع فی المتن یحتملہما أى یحتمل البطلان والفساد والظاهر الثانی، لأن علة الفساد الغرر كما مر مع وجود رکنی البیع، وكثیرا ما یطلق الباطل علی الفساد، أفاده“ (شامی مصری ۵،۱۲۸)

۲۔ قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ بیع قریب میں ہو اور بائع مشتری اور بیع کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دے کہ بغیر کسی مانع و حائل کے مشتری کیلئے بیع پر قبضہ کرنا ممکن ہو اور بائع مشتری کو بیع لے لینے کا حکم دیدے، تو بیع مشتری کے قبضہ میں شمار ہوگی، چاہے مشتری بیع کو اپنے تصرف و عمل میں نہ لے، درمختار میں ہے: ”ثم التسليم یكون بالتخلية علی وجه یتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل و شرط فی الأجناس شرطاً ثالثاً: وهو أن یقول: خلیت بینک و بین المبیع فلو لم یقله أو کان بعیدا لم یصر قابضاً“ (۵۶۲-۲۰،۵۶۱)

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، دونوں میں قبضہ کی ایک ہی صورت ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بالعلتہ“ ہیں، قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی کا مدار دو وجہوں پر ہے، (۱) قبضہ سے پہلے بیع مقدوراً تسلیم نہیں ہوتی، لہذا یہ بات یقینی نہیں کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کرادے گا، یہ غرر ہے جس کی بناء پر جائز نہیں (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں نہیں آتی اور ”رجع مالم یضمن“ جائز نہیں (مستفاد از اسلام اور جدید معیشت و تجارت ۹۱)۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام ہے یا خاص اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی آراء درج ذیل ہیں: طعام کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت پر علماء کا اجماع ہے، طعام کے علاوہ میں چار مذاہب ہیں (۱) امام شافعی اور امام محمد کے نزدیک کسی چیز کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں ہے (۲) اور امام احمد بن حنبل کی زیادہ ظاہر روایت میں صرف طعام کو قبل القبض بیچنا جائز نہیں، طعام کے علاوہ جائز ہے، (۳) امام مالک کے نزدیک صرف طعام میں سے مکملات و موزونات میں قبل القبض بیع ناجائز ہے اور (۴) امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک تمام منقولات میں قبل القبض بیع ناجائز اور غیر منقولات میں سے جس میں ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو ان میں قبل القبض بیع جائز ہے (إعلاء السنن ۵۰/۱۳، مکملہ فتح الملہم ۱/۳۵۱)۔

امام احمد بن حنبل اور امام مالک کے دلائل: حدیث ابن عمر، رضی اللہ عنہما أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ”من ابتاع طعاماً فلا یبعہ حتی یقبضہ“ رواہ البخاری و مسلم، اور حدیث جابر: ”عن جابر قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إذا ابتعت طعاماً فلا تبعہ حتی تستوفیہ“ رواہ مسلم، اور حضرت ابن عباس کا فرمان: ”أما الذی نہی عنہ النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فهو الطعام أن یباع حتی یقبض“ (إعلاء السنن ۱۲، ۲۲۷-۲۲۸) وغیرہ مذکورہ احادیث ہے، جن میں بھی طعام ہی پر مقصور ہے، لہذا امام احمد بن حنبل اور امام مالک نے بھی کوطعام

چھاپی، گجرات۔



کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔

اور امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے دلائل: حضرت ابن عمرؓ کی حدیث: ”فإن رسول الله ﷺ فہی أن تباع السلع حیث تباع، حتی یوزھا التجار إلی رحالھم“ رواہ ابوداؤد، اور حکیم ابن حزام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ”یا ابن أختی، لا تبیعن شیئاً حتی تقبضه“، اور ابان کی روایت میں ہے: ”إذا اشتریت بیعاً فلا تبعه حتی تقبضه“ ان احادیث میں نہیں کا حکم طعام و منقول کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ نبی کا حکم ہر چیز میں عام ہے، اور امام شافعیؒ و امام محمدؒ حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت کردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ”لا بیع مالہ یضمن“ سے استدلال کرتے ہیں، وجہ استدلال اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”بیع مالہ یضمن“ سے منع فرمایا ہے، اور: ”بیع قبل القبض بیع مالہ یضمن“ کو متضمن ہے، اس لئے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت مشتری کے ضمان میں آتی ہی نہیں، پس اگر قبل القبض بالربح بیچے گا تو وہ ”بیع مالہ یضمن“ ہوگا اور یہ علت طعام وغیر طعام ہر ایک کو عام ہے، لہذا تمام اشیاء طعام، یا غیر طعام، منقول، یا غیر منقول سب کی قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہوگی (المستفاد من مکملہ فتح الملہم ۱۱/۳۵۲-۳۵۳)۔

امام ابوحنیفہؒ و امام ابو یوسفؒ مذکورہ امام شافعیؒ و امام محمدؒ کے مستدلات ہی سے استدلال کرتے ہیں، مگر عقار، غیر منقول کو عموم نہیں سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ نبی کی علت عقار میں مستثنیٰ ہے، اس لئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نبی کی علت ”بیع مالہ یضمن“ کا لزوم ہے، اور انسان صرف اسی چیز کا ضامن ہوتا ہے جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو اور عقار میں ہلاکت کا خوف نہیں ہے مگر نادار حتیٰ کہ اگر عقار میں ہلاکت کا خوف ہو تو شیخیں کے نزدیک قبل القبض اس کی بیع جائز نہیں ہے، جیسے سمندر کے کنارے پر جو عقار ہو اس میں قبل القبض بیع جائز نہیں ہے (اعلاء السنن ۱۳/۲۲۷-۲۳۱ و مکملہ فتح الملہم ۱۱/۲۵۰-۲۵۳)۔

۶۔ صورت مسئلہ میں بیع خریدار سے قریب نہ ہونے کی وجہ سے خریدار کا نہ کسی قبضہ پایا گیا اور نہ حکمی قبضہ، اس لئے خریدار اول کے لئے دوسرے خریدار کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، شامی میں ہے:

”لأن إذا كان قریباً یتصور فیہ القبض الحقیقی فتقام التخلیة مقام القبض، أما إذا كان بعیدا لا یتصور فیہ القبض فی الحال فلا تقام التخلیة مقام القبض... لأن المعتبر فیہا القرب الذی یتصور معہ حقیقة القبض كما علمتہ من کلام“ (الخانیة ۲، ۵۶۲-۵۶۳)۔

۷۔ اس صورت میں بھی قبل القبض بیع کرنا ہے، لہذا یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے (حوالہ سابق)۔

سوال (۶) اور (۷) میں مذکور دونوں صورتوں کے جواز کیلئے وہ صورتیں اختیار کی جائیں جو حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نے ”احسن الفتاویٰ“ میں تحریر فرمائی ہیں کہ (۱) جہاں مال خریدتا ہے وہاں کسی کو، یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنا دے، اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے (۲) خریدار کو وکیل بالقبض بنا دے اور مال پہنچنے سے پہلے بیع نہ کرے، بلکہ وعدہ بیع کرے، بیع مال پہنچنے کے بعد کرے، اس صورت میں جانبن میں سے کوئی انکار کر دے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا، اگر خریدار (اول) مال پہنچانے کا کرایہ ادا کرتا ہے تو اس کے اذن سے بائع کا کسی بھی مال بردار کمپنی کی تحویل میں مال دیدینا مشتری کا قبضہ شمار ہوگا، اگرچہ مشتری نے کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو، کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہوگی۔

”قال فی الہندیة: إذا قال المشتري للبائع: أبعث ابني واستأجر البائع رجلاً یحملہ إلی ابنہ، فہذا لیس بقبض والأجر علی البائع، إلا أن یقول: استأجر من یحملہ، فقبض الأجير یكون قبض المشتري إن صدقہ أنه استأجره ودفع إلیہ، وإن أنکر استیجاره والدفع إلیہ، فالقول قوله، کذا فی التتارخانیة“ (عالمگیریہ ۲، ۱۹، احسن الفتاویٰ ۶، ۵۲۶)۔

☆☆☆



## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اور فقہاء کی تشریحات

مولانا عبدالرشید قاسمی

۱۔ شریعت اسلامیہ اور حضرات فقہاء و ائمہ کی تشریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ”بیع قبل القبض“ ناجائز ہے اور شریعت نے اس کا شمار بیع فاسد میں کیا ہے۔

”صح بیع عقار لا یخشی ہلاکہ قبل قبضہ ولا یصح قبل قبضہ بیع منقول أفسد بیع المنقول قبل قبضہ“ (درمختار ۲، ۱۲۲-۱۲۳)

۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ کی بنیاد عرف اور عادت پر ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ نے قبضہ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے، بلکہ اسے لوگوں کے عرف اور عادت پر چھوڑ دیا ہے کہ جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے استیلاء اور عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا، کیونکہ قبضہ کا مقصود کسی چیز کا ضمان میں آنا اور ضمان سے نکلنا ہے یعنی کسی شے پر مشتری کا قبضہ ہو جائے تو بائع کے ضمان سے وہ چیز نکل جائے اور مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے، بہر حال کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ نے قبضہ کی کوئی خاص حقیقت متعین نہیں کی ہے، بلکہ لوگوں کے تعامل پر چھوڑ دیا ہے، اسی لئے حضرات علماء، فقہاء اور ائمہ میں قبضہ کی حقیقت کے سلسلہ میں اختلاف ہوا ہے ورنہ اختلاف کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

۳۔ بالاتفاق جمہور علماء کے نزدیک اشیاء غیر منقولہ میں صرف تخلیہ قبضہ ہے اور حضرات علماء کے نزدیک اشیاء منقولہ میں قبضہ کی حقیقت کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے، حضرات حنفیہ کے نزدیک بالاتفاق کل چیزوں میں صرف تخلیہ قبضہ ہے یعنی بائع مشتری اور بیع کے درمیان سے اپنا کنٹرول ختم کر دے اور بیع پر مشتری کا کنٹرول ہو جائے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ارتقاع موانع سے تعبیر کیا جاتا ہے، البتہ حضرات حنفیہ اشیاء مثلیہ مشتری بالکلیل والوزن میں صرف تخلیہ کو قبضہ ناقص مانتے ہیں، اور حضرات شوافع کے یہاں قبضہ کیلئے قبضہ بالید کی شرط ہے جس کی تفصیل مع دلائل بیان ہو چکی ہے، حنفیہ اشیاء مثلیہ مشتری بالکلیل والوزن اور عددیہ متقار بہ مختلف فیہا کے علاوہ تمام منقولات اور غیر منقولات میں تخلیہ کو قبضہ مانتے ہیں، البتہ عدویات متقار بہ میں صاحبین اور امام اعظم کا اختلاف ہے۔

۴۔ ”بیع قبل القبض“ کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بعلتہ“ ہیں، یہ اور بات ہے کہ حضرات ائمہ نے الگ الگ علتیں نکالی ہیں، حضرات شیخین فرماتے ہیں کہ بیع قبل القبض کی علت نہی غرر انفساخ عقد ثانی ہے، ”عن أبي هريرة رضي الله عنه قال نهي رسول الله ﷺ عن بيع الحصة وعن بيع الغرر“ (مسلم شریف تکملہ فتح الملہم ۱، ۲۵۰)۔

یہی حدیث حضرات شیخین کے نزدیک علت نہی ہے، اور حضرت امام محمد اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ علت نہی ربح مال لم یضمن ہے،

”نهی رسول اللہ ﷺ عن ربح مال لم یضمن والبیع ما لیس عندک“، ان ائمہ کے نزدیک یہی حدیث علت نہی ہے۔

۵۔ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت حضرات شیخین کے نزدیک منقولات کے ساتھ خاص ہے اور ان مجتہدین کے نزدیک غیر منقولات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

”بیع قبل القبض“ کی علت نہی دو ہو سکتی ہیں: ایک ”ربح مال لم یضمن“، دوسرے غرر انفساخ عقد۔ اور دونوں علتیں حدیث سے مستنبط ہیں،

یہ اور بات ہے کہ حضرات ائمہ نے دونوں حدیثوں کی ترجیح میں اختلاف کیا ہے، حضرات شیخین نے "تہی عن بیع الغرر" والی روایت سے "ربح مالہ یضمن" میں تخصیص پیدا کی ہے، اور غرر انفساخ عقد والی حدیث کو مخصوص نہ ہونے کی بنا پر ترجیح دی ہے، چونکہ "ربح مالہ یضمن" والی روایت میں تخصیص بالاتفاق جائز ہے، مثلاً اخذ شفعہ قبل قبض المبیع اور تصرف فی المہر و بدل الخلع وغیرہ سے، اور حضرت امام محمد اور امام شافعی نے علت نہی حدیث "ربح مالہ یضمن" صرف منقولات کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، بلکہ غیر منقولات کو بھی لفظاً شامل ہونے کی بنا پر اسی معنی میں داخل کر لیا، اور ان ائمہ کے نزدیک منقولات اور غیر منقولات دونوں میں "بیع قبل القبض" ناجائز ہے۔

۶۔ واضح رہے کہ قبضہ کی اسلامی شریعت میں کوئی خاص حقیقت متعین نہیں ہے، بلکہ قبضہ لوگوں کے عرف اور تعامل پر محمول کیا جائے گا اور قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ بائع کے ضمان سے نکل کر بیع مشتری کے ضمان میں داخل ہو جائے، لہذا جب مشتری کا ضمان پالیا جاتا ہے اس کی بیع کرنا جائز ہے اور اس سے حاصل شدہ منافع حلال ہے۔

۷۔ یہ بات واضح ہے کہ مشتری کے ضمان میں بیع داخل ہی نہیں ہوتی ہے، اس لئے بغیر قبضہ کے اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے، بیع فاسد ہوگی، اسی لئے اس کا فسخ واجب ہے اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا صدقہ کرنا واجب ہے

”وقال مشائخنا: لا یطیب لہ بکل حال وهو المختار وإطلاق الجواب یدل علی ذلك“ (البحر الرائق ۸، ۱۱۳)۔



## اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کا حکم

مفتی محمد ارشد فاروقی قاسمی ؒ

۱۔ شرع اسلامی کے اعتبار سے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے۔ اور کبھی باطل ہوتی ہے تو کبھی فاسد۔  
بیع باطل:..... اگر بیع ملکیت میں نہ ہو اور بیع کی جائے تو بیع باطل ہوگی۔ ”بیع مالیس فی ملکہ باطل“ (رد المحتار ۱۱۹/۳) بقول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”لا تبع

مالیس عندک“ (مرقاۃ المفاتیح ۴۰۸۱)۔

بیع فاسد:..... اگر بیع ملکیت میں ہو، لیکن قبضہ میں نہ ہو تو بیع فاسد ہوگی۔ ”وفی معنی ما لیس عنده فی الفساد بیع العبد الآبق و بیع المبیع قبل القبض“ (حوالہ سابق)۔

۲۔ فقہاء کی عبارتوں کو بہ نظر غائر پڑھنے سے حاصل مطالعہ یہ ہے کہ ”قبضہ“ جو ”عرف“ میں تسلیم کیا جائے وہی معتبر ہے۔ امام کاسانی کی ایک جامع عبارت بطور ذکر رقم ہے:

”فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع والمشتري قابضاً له، وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع...“ ایک دوسری عبارت ہے: ”لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“ (بدائع الصنائع ۲۲۸، ۲۲۴، ۵۰)۔

۳۔ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں قبضہ وہی معتبر ہوگا جو ”عرف“ میں قبضہ تسلیم کیا جائے۔ علامہ کاسانی کی عبارت بالا سے یہی واضح ہوتا ہے (ایضاً)۔ اشیاء غیر منقولہ قبضہ سے پہلے امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے یہاں جائز ہے۔ امام محمدؒ کے یہاں ناجائز ہے۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث معلول بالعلۃ ہیں۔ ”علت نہی“ غرر و دھوکہ ہے۔

”والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد والحديث معلول به“ (ہدایہ ۳۰۵۸)، قبضہ سے قبل بیع کا ضائع ہونا ممکن ہے، یہ ہے ”غرر انفساخ“، یہی علت نہی ہے۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت امام محمدؒ کے نزدیک عام ہے۔ اور حضرات شیخین (امام ابوحنیفہؒ و امام ابو یوسفؒ) کے یہاں اشیاء غیر منقولہ کا استثناء ہے: ”ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وعند أبي يوسف، وقال محمد: لا يجوز رجوعاً إلى إطلاق الحديث واعتباراً بالمنقول“۔

امام محمد فرماتے ہیں اس سلسلہ میں احادیث مطلق ہیں اس لئے اطلاق کو باقی رکھتے ہوئے عمل ہوگا۔

”ولهما أن ركن البيع صدر من أهله ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر“ (حوالہ سابق)۔

شیخین فرماتے ہیں کہ بیع کارکن، بیع کا اہل موجود ہے، اس لئے عقار میں بیع ہو جائے گی قبضہ سے پہلے، اور ”غرر“ ہی حدیث میں علت ہے۔ اور شیخین فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ سے ثابت شدہ بیع کو جز واحد سے خاص نہیں کیا جاتا۔ ”ولهما عموم البياعات من الكتاب العزيز ولا يجوز

جامعہ معہد امام انور، دیوبند، سہارنپور (یو پی)۔



تخصیص بیع الكتاب بخبر واحد عندنا“ (بدائع الصنائع ۱۸۱، ۲)۔

لیکن اگر اشیاء غیر منقولہ میں ”غرر انفساخ“ پایا جائے تو شیخین کے یہاں بھی قبضہ سے پہلے بیع ناجائز ہوگی، مثلاً عقد سمندر کے کنارے ہو، یا ریتیلی زمین ہو۔  
 ”قال بعض المشائخ أن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن يصير بحراً أو يغلب عليه الرمال“ (فتح القدير ۱۲۷، ۶)  
 ۶۔ بیع کی صورت مسئلہ جائز ہوگی، البتہ بائع اول کی دو حیثیت تسلیم کی جائیگی۔ پہلی حیثیت بائع کی اور دوسری حیثیت خریدار نمبر ایک کے وکیل کی، اب خریدار نمبر ۲ کے بدست بیع بحیثیت وکیل کے بائع نمبر اکہ لے گا، اس لئے بیع ناجائز ہوگی۔ اور یہ بیع اقتضائی جائز ہوگی، اصول فقہ کی کتابوں میں اس صورت کی نظیر موجود ہے:

”وإذا قال أعتق عبدك عنى بألف درهم، فقال: أعتقت، يقع العتق عن الأمر؛ لأن قوله أعتقه عنى بألف درهم يقتضى معنى قوله بعه بألف ثم كن وكيلى بالإعتاق، فأعتقه عنى فيثبت البيع بطريق الاقتضاء و يثبت القبول كذلك“ (اصول الشاشی ۳۲، نور الانوار، حسامی وغیرہ)۔

۷۔ بیع کی یہ صورت ناجائز ہوگی اور یہ بیع فاسد ہوگی۔ حدیث ہے: ”ولا ربح مالا يضمن“ حدیث بالا کی تشریح بایں الفاظ کی گئی ہے: ”یرید بہ الربح الحاصل من بیع ما اشتراه قبل أن يقبضه وينتقل من ضمان البائع إلى ضمانه فإن بيعه فاسد“ (مرقاة المفاتیح)۔  
 صورت مسئلہ میں مشتری کے قبضہ سے پہلے بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، اس لئے یہ صورت ناجائز ہوگی۔ اور اس طریقہ تجارت میں بے حد نقصانات ہیں، مثلاً ایک چیز جدہ بندر گاہ سے ایک کروڑ میں چلی اور پہنچنے سے پہلے دسیوں بیسیوں ہاتھوں فروخت ہوتی رہی، ہندوستان آتے آتے وہ چیز دو کروڑ کی ہو جائے گی اور یہ سارا بار عوام پر پڑے گا، یہ دولت اور نفع چند سرمایہ داروں کو حاصل ہوگا اور لاکھوں عوام پر بوجھ پڑے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین میں کس قدر حکم ہیں سبحان اللہ اس لئے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے۔  
 مولانا تقی عثمانی نے ”تکملہ فتح الملہم“ شرح صحیح مسلم میں اس موضوع پر بہت تفصیل سے لکھا ہے (دیکھئے: تکملہ فتح الملہم)۔

☆☆☆

## شرعی اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض

مولانا ابراہیم بن محمد بڑودوی

۱۔ شرع اسلامی کے اعتبار سے بیع قبل القبض ناجائز ہے، اس ناجائز بیع کا شمار بیع فاسد میں ہے۔

”ما روى أن النبي ﷺ نهي عن بيع ما لم يقبض والنهي يوجب فساد المنهي عنه“ (احكام المعاملات الماليه ۲۹۱)۔  
 ”اشترى دارا أو عبدا أو عرضا أو تركها في يد البائع فباعها وربح فالبيع باطل، فإن أجازته المشتري ففساد أيضا؛ لأنه بيع المبيع قبل القبض ويجب فسخه“ (البحر الرائق ۸۰۱۱۷)۔

۲۔ قبضہ کی حقیقت تخلیہ ہے، یہ متفق علیہ بات ہے کہ اصل قبضہ تمام قسم کے اموال میں تخلیہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، جس چیز کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو تخلیہ تصور کیا جائے گا وہی قبضہ ہوگا۔

”لا خلاف أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال“۔

کون سی چیز پر کیسے قبضہ تصور کیا جائے گا اس کی بہترین صورتیں (التنوير والدررورد المحتار ۴۸۸، اور بدائع الصنائع ۲۴۴/۵) میں مذکور ہیں جو عام طور پر مشہور ہیں۔

۳۔ حنفیہ کے نزدیک اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

”التسليم في اللغة عبارة عن جعله سالما خالصا يقال: سلم فلان لفلان اي خلص له، قال الله تعالى: (ورجلا سلما لرجل) أي سالما خالصا لا يشركه فيه أحد، فتسليم المبيع إلى المشتري هو جعل المبيع سالما للمشتري اي خالصا له بحيث لا ينازعه فيه غيره وهذا يحصل بالتخلية فكانت التخلية تسليما من البائع والتخلي قبضا من المشتري“ (احكام المعاملات الماليه ۲۹۱)۔

۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہیں سے متعلق احادیث معلول بالعلتہ ہیں، اور علت نہی ہلاکت کا اعتبار کرتے ہوئے عقد کے فسخ ہونے کا غرر ہے، ”لا يصح بيع المنقول له من قبله عن النبي ﷺ عن بيع ما لم يقبض؛ ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“ (البحر الرائق ۸۰۱۱۸)۔  
 ۵۔ قبضہ سے پہلے اشیاء منقولہ کی بیع بالاتفاق ناجائز ہے، کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے، لیکن اشیاء غیر منقولہ، یعنی زمین کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، امام محمد، امام زفر، امام مالک کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ حدیث نہی مطلق ہے، جس میں منقول وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں، شیخین کے نزدیک جائز ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں نہی کی علت یہ ہے کہ ہلاکت بیع کی صورت میں انفساخ بیع کا احتمال ہے، اور زمین کی ہلاکت نادر الوجود ہے، اور نادر کا اعتبار نہیں ہوتا، پس جب بیع عقار میں علت مذکورہ نہ پائی جائے تو بیع جائز ہوگی، اور علت مذکورہ پائی جائے، مثلاً زمین دریا کے کنارہ پر واقع ہو اور اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، تو شیخین بھی اس کی اجازت نہیں دیتے (البحر الرائق ۱۱۸/۸، معدن الحقائق ۳۹۲)۔

۶۔ فیکٹری سے مال خرید کر اس کو دوسرے آدمی کے ہاتھ قبضہ سے پہلے فروخت کرنا اور خریدار (۱) کا مال کی ہلاکت کی صورت میں ضامن بننا اگرچہ ”بیع ما لم يقبض“ کی صورت میں داخل نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی قبضہ تام کے مفقود ہونے کی وجہ سے یہ صورت معاملہ ناجائز رہے گی، لہذا ضمان قبضہ حسی کا قائم مقام نہیں سمجھا جائے گا قبضہ تام کا معنی یہ ہے کہ بائع کے ضمان سے نکلنے کا مرتب ہو۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت میں جہاز پر مال چڑھانے کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوتا۔

”ومن اشترى شيئاً مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه“۔ خریدار اول اگر منقولہ اور محولہ چیز کو خریدنے کے بعد قبضہ سے پہلے بیچے تو جائز نہیں، کیونکہ جب قبضہ سے پہلے ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ ہو جائے گی، اس صورت میں مشتری غیر کی ملک کو بیچنے والا شمار کیا جائے گا، البتہ قبضہ کر لیا تو اپنی ملکیت کا بیچنے والا سمجھا جائے گا، قبضہ سے پہلے معلوم نہ ہوگا کہ بیع تام ہوگی یا نہیں، اس میں غرر کا امکان ہے، لہذا باطل ہوگی (شرح فتح القدير ۱۳۸/۸)۔ ☆☆☆

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

### اور اس کے چند اہم پہلو

مولانا اخلاق الرحمن قاسمی

۱۔ بیع پر قبضہ ہونے سے قبل دوسرے کے ہاتھ اس کی فروختگی شریعت میں جائز نہیں ہے، "بیع قبل القبض" کے بارے میں فرمایا کہ: "ومنها بیع ما هو مملوك له، لكن قبل القبض"۔ اور بیع فاسد کے مختلف انواع و اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ بیع جو مشتری کی ملک ہے قبل القبض فروخت کیا جائے (تحفة الفقہاء ۳۸۳) اور بیع فاسد کے عدم جواز کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ علامہ سمرقندی (۵۳۹ھ) رقم طراز ہیں کہ:

"ومنها أن المبيع إذا كان لا يقدر على تسليمه وقت العقد، مثل الطير الذي طار عن يده... يكون البيع فاسداً، ولو قدر على التسليم في المجلس، لا يعود إلى الجواز، لأنه وقع فاسداً" (تحفة الفقہاء ۴۰۸)۔

من جملہ بیع فاسد میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بیع کہ عقد کے وقت قبضہ کرانے پر قدرت نہ ہو، مثلاً ایک پرندہ جو بائع کے ہاتھ سے فرار ہو چکا اس کی فروختگی تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر مجلس عقد ہی میں بائع تسلیم پر قادر بھی ہو جائے تو جائز نہ ہوگا، کیونکہ عقد کا وقوع فساد پر مبنی ہے۔

۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ صاحب مال، یعنی مشتری وغیرہ اس پر قابض ہو جائے اور اس پر ہر طرح سے تصرف کر سکتا ہو، چنانچہ حدیث شریف میں اس کی عمدہ وضاحت پائی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يقبضه وفي رواية: حتى يستوفيه، وفي رواية: التفصيل هكذا، عن ابن عمر قال: كنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاع الطعام فيبعث علينا من يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه فيه إلى مكان سواه قبل أن نبيعه، وعنه هكذا: وكنا نشترى الطعام من الركبان جزافاً فنهانا رسول الله ﷺ أن نبيعه حتى ننقله من مكانه" (مسلم شریف ۵۰۲)۔

"والمعروف أن القبض والاستيفاء بمعنى واحد، والقبض فهو أن يأق الشيء بجزءه وضمانه" (تكملة فتح

الملمع ۱، ۳۵، قواعد الفقه ۴۲۲)۔

جس نے کھانے کی اشیاء خریدی تو تا وقتیکہ اس پر قابض نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی فروختگی کی اجازت نہیں ہے، ایک روایت میں "يقبضه" کے بجائے "يستوفيه" کا لفظ آیا ہے، اور تفصیلی روایت اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہم غلہ خریدتے (اور بیچتے تھے) چنانچہ آنحضرت ﷺ ہمارے پاس اپنا قاصد بھیجتے جو آنحضرت ﷺ کی طرف سے یہ حکم ہمیں سناتے کہ جس غلہ کو ہم نے جہاں خریدا ہے وہاں سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے بعد ہی ہم اس کی فروختگی کریں، اور حضرت عبداللہ بن عمر ہی سے اس طرح بھی مروی ہے: ہم سواریوں سے غلے جزافاً (کیل دوزن کے بغیر) خریدا کرتے تھے، پھر حضور ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرما دیا کہ جب تک ہم بیع کو مقام بیع سے منتقل نہ کر لیں، نہ فروخت کریں (مسلم ۵۰۲)، اور حدیث شریف میں جو قبض و استيفاء کے دو لفظ آئے ہیں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی کسی شے کا اپنی حرز و ضمان اور ملکیت میں کر لینا۔

متذکرہ عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ قبضہ کے معنی، جو حدیث شریف کے لفظ "يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه فيه إلى مكان سواه قبل أن نبيعه" میں موجود ہے، کیونکہ انسان مملوکہ شے ہی کے فروخت کرنے یا دینے کا حق رکھتا ہے، اور بیع پر آدمی کا مکمل قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب بیع بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کے



ہاتھ میں اور مکان میں پہنچ جائے، معلوم ہوا کہ قبضہ اسی وقت سمجھا جائے جب کہ انسان پر اس کے تصرف میں کوئی مانع پیش نہیں آئے، اور اس کی صورت یہی ہے کہ اس کے ہاتھ اور مکان میں پہنچ جائے، ورنہ تو ملک کے باوجود ”قبض ضعیف“ کی وجہ سے آدمی تصرف سے بہرہ مند نہیں ہوتا ہے، اور یہی ”قبض ضعیف“ فساد کی وجہ ہے جو بیع قبل القبض کے بیع کی صورت میں پیدا ہوتی ہے، غرض کہ ”قبضہ“ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کا فلاں کی ملکیت اور تصرف میں ہونا، قواعد الفقہ میں ہے کہ ”قبض الشيء أخذها وهذا الشيء في قبضة فلان أي في ملكه وتصرفه“ شئی کے قبضہ کے معنی ہیں شئی کا لینا، اور کہا جاتا ہے کہ یہ چیز فلاں کے قبضہ میں ہے، یعنی اس کی ملکیت میں اور تصرف میں ہے۔

۲۔ دوسری چیز جو حدیث مذکورہ سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ قبضہ کی شریعت نے ایک خاص حد مقرر کر دی ہے جو مذکورہ حدیث میں مذکور ہے، نمبر ایک کے تحت بھی اس قبضہ شرعی کی پوری پوری وضاحت موجود ہے، اور یہی صحیح بات ہے، کیونکہ اگر لوگوں کے عرف و عادت پر قبضہ کی حد کو باقی رکھنا شریعت کے پیش نظر ہوتا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اپنے زمانہ کا عمل بتلا رہے ہیں کہ ”ہم غلہ خرید کرتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر قبضہ سے قبل فروخت کرنے سے منع فرمادیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بین التجار اس طرح کا عمل رائج تھا، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو منع فرمایا، معلوم ہوا کہ قبضہ کے باب اور حد میں عرف و عادت کو دخل و اثر نہیں، باقی رہا یہ مسئلہ کہ یہ حدیث شریف ہر قسم کی بیع سے متعلق ہے یا اس سے کوئی خاص بھی ہے کہ جس میں قبل القبض تصرف جائز ہو، سو اس بارے میں پوری تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔

۳۔ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ میں قبضہ کی نوعیت میں فرق ہے، چنانچہ منقولی اشیاء میں بیع قبل القبض باطل ہے، اور غیر منقولی اشیاء میں احناف میں سے حضرات شیخین کے یہاں اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ عقار کے ہلاک ہونے کا خوف نہ ہو، تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت امام شافعیؒ اور حضرات احناف میں سے حضرت امام محمدؒ کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ جملہ اشیاء کی بیع قبل القبض جائز نہیں ہے، خواہ طعام ہو یا غیر طعام، منقولی ہو کہ غیر منقولی، ان کے قول کا متدل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے، جو بظاہر ان کے قول کی دلیل بن رہا ہے، روایت یہ ہے کہ: ”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يستوفيه، قال ابن عباس: وأحسب كل شيء مثله“ (تكملة فتح الملهم ۱۰۲۵۰)۔

”حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی غلہ خریدے تو قبل القبض اس کی بیع نہ کرے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس پر فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ معاملہ جملہ اشیاء میں ہے، یہی وہ بات ہے جس سے امام شافعیؒ استدلال کرتے ہیں، مزید تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔

۲۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے یہاں منقولی اشیاء میں بیع قبل القبض جائز نہیں، لیکن غیر منقولی اشیاء میں جس کے ہلاک ہونے کا خوف نہ ہو ایسی اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہے (تكملة فتح الملهم ۳۵۱/۱ بحوالہ فتح القدير ۲۲۶/۵)، مزید تفصیل ادلہ کے تحت آ رہی ہے۔

۳۔ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک سوائے طعام کے دوسری جملہ اشیاء خواہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ قبل القبض بیع کی بیع جائز ہے (تكملة فتح الملهم ۳۵۱/۱، کتاب الفقه ۲۳۵/۲) مزید تفصیل ادلہ کے ضمن میں آ رہی ہے۔

۴۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی سب سے زیادہ ظاہر روایت یہ ہے کہ ”بیع قبل القبض“ کی ممانعت صرف طعام سے متعلق ہے، باقی اس کے سوا جملہ اشیاء منقولہ ہو کہ غیر منقولہ ہر ایک کی قبل القبض بیع جائز ہے، جیسا کہ مذہب حنبلی کے سب سے بڑے ترجمان ابن قدامہ نے مغنی میں اس کی وضاحت فرمائی ہے (تكملة فتح الملهم ۳۵۰/۱)۔

ادلہ مذاہب اربعہ:

حضرت امام شافعیؒ کی دلیل ذیل کی تین روایتیں ہیں:

۱۔ ”عن ابن عمر قال: ابتعت زيتا في السوق فلما استوجبت له لقيني رجل فأعطاني به رجلاً حسناً، فأردت أن أضرب على يده، فأخذ رجل من خلفي بذراعي، فالتفت، فإذا زيد بن ثابت، فقال: لا تبعه حيث ابتعته، حتى تحوزه إلى رحلك، فإن رسول الله ﷺ نهي أن تبايع السلع حيث تبتاع، حتى يحوزها التجار إلى رحالهم (فقد عمم هذا

الحديث الحكم في سائر السلع)۔“

۲۔ ”عن حكيم بن حزام قال: قلت: يا رسول الله! إني أبتاع هذه البيوع، فما يحل لي منها وما يحرم علي؟ قال: يا ابن أخي لا تبعن شيئاً حتى تقبضه، وفي رواية ابان: إذا اشتريت بيعاً فلا تبعه حتى تقبضه“۔

۳۔ ”عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح ما لم يضمّن، ولا بيع ما ليس عندك، أخرجه الترمذی فی باب كراهية بيع ما ليس عنده، وقال هذا حديث حسن“۔

۱۔ (حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ میں نے بازار میں زیت خریدی اور جب مکمل طور پر میں اس کا مستحق ہو گیا تو ایک شخص سے ہماری ملاقات ہو گئی جو مجھ سے زیادتی منافع کے ساتھ اس کی قیمت دے کر لینا چاہا، اور میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ اس کے ہاتھ ہی فروخت کر دوں، اسی اثناء میں جانب خلف سے ایک شخص نے میرے بازو پکڑ لئے، میں نے جو دیکھا تو وہ حضرت زید بن ثابت تھے، انہوں نے فرمایا جس چیز کی تم نے جہاں خریدی ہے وہاں فروخت نہ کرو تا آنکہ وہ تیری ملکیت میں نہ آجائے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ جہاں تم سامان خریدو وہیں بیجو، مگر یہ کہ وہ تیرے پاس منتقل ہو جائے اور تیری ملکیت میں آجائے)۔

اس حدیث شریف سے استدلال اس طور پر ہے کہ یہ حدیث شریف تمام اشیاء و سامان کو عام اور شامل ہے، طعام پر انحصار نہیں، لہذا تمام اشیاء کی بیع قبل القبض جائز نہ ہوگی، خواہ وہ شیء عقار اور غیر منقول ہو یا غیر عقار اور منقول ہو۔

۲۔ (حضرت حکیم بن حزام سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اس طرح سے خرید و فروخت کرتا ہوں، سو اس میں کوئی صورت حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: او میرے بھتیجے! کسی بھی شیء کی بیع قبل القبض نہ کیا کرو، اور حضرت ابان کی روایت میں ہے کہ جب تو کسی چیز کو خریدے تو قبل القبض اس کی بیع نہ کرو)۔

اس حدیث شریف میں بھی قبل القبض کی ممانعت تمام ہی اشیاء کو شامل ہے، جیسا کہ حدیث کا ظاہر کسی سے مخفی نہیں ہے۔

۳۔ (حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کوئی بیع اور سلف حلال نہیں، اور نہ ہی بیع میں دو شرطیں، اور نہ ہی ایسا منافع جائز ہے جس کا ضمان نہ ہو، اور نہ ہی ایسی شیء کی بیع جو تیرے پاس نہ ہو، ترمذی کی روایت میں بیع کی کراہت کے باب میں یہ ہے کہ ایسی چیزوں کی بیع درست نہیں جو اس کے پاس نہ ہو)۔

اس حدیث شریف سے استدلال اس طور پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ربح ما لم يضمّن“ سے منع فرمایا ہے، اور ”بیع قبل القبض، ربح ما لم يضمّن“ کو شامل ہے، کیونکہ بیع مشتری کے ضمان میں بعد القبض ہی ہو سکتا ہے، لیکن اگر منافع کے ساتھ قبل القبض فروخت کر دیا تو یہ ”ربح ما لم يضمّن“ ہو جائے گا، یعنی ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضمان نہ ہو، اور یہ علت قبل القبض کی صورت میں ہر ایک کو عام ہے خواہ طعام ہو یا غیر طعام ہو، لہذا منقولی اشیاء ہو یا غیر منقولی اشیاء، بیع قبل القبض کسی حال میں درست نہیں (تکملہ فتح الملہم: ۱/۲۵۲، ۲۵۳)۔

حنفیہ کے دلائل:

حضرات حنفیہ کے دلائل بعینہ وہی ہیں جو حضرات شوافع کے ہیں، الا یہ کہ حضرات احناف نے عقار کو نبی کے عموم سے مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ نبی کی علت عقار میں مشغول ہے، کیونکہ متذکرہ تین حدیثوں میں اخیر حدیث جو حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے وہ اس بات پر دال ہے کہ بیع کے بیچنے کی ممانعت قبل القبض ”ربح ما لم يضمّن“ (یعنی ایسی چیز سے نفع حاصل کرنا جس کا ضمان نہ ہو) کو مستلزم ہے (جو علت نبی ہے) اور انسان پر ہلاکت کی صورت میں ضمان ایسی چیزوں ہی میں تو ہو سکتا ہے جس کے بارے میں ہلاکت کا خطرہ ہو، اور عقار اور اراضی وغیرہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن اگر کوئی عقار کی قسم ایسی نکل گئی جو خطرہ کے دہانے پر ہے، جیسے سمندر کے کنارے جس کے کٹ کر سمندر میں مل جانے کا خطرہ ہے، تو اس صورت میں پھر یہ عقار جو اس صفت مذکورہ کے ساتھ ہو قبل القبض جائز نہیں ہے (تکملہ فتح الملہم: ۱/۳۵۳، بحوالہ فتح القدیر ۵/۲۶۶)۔

## مالکیہ کی دلیل:

حضرت امام مالک کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں بیع ناپنے سے قبل کی ممانعت ہے، اور وہ حدیث شریف یہ ہے: ”من اشتری طعاما

فلا یبعہ حتی یکتالہ“ (تکملہ فتح الملہم ۱، ۲۵۷، کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ۲، ۲۳۵)۔

## حنابلہ کی دلیل:

حضرات حنابلہ نے اپنی دلیل میں حدیث باب کو پیش کیا ہے جو اولاً مذکور ہوئی اس طور پر کہ اس میں نہیں مقصود علی الطعام ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طعام کی

صراحت خود اس بات پر واضح دلیل ہے کہ غیر طعام خواہ منقولی ہو یا غیر منقولی بیع قبل القبض ہے (تکملہ فتح الملہم ۱، ۲۵۱، کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ۲، ۲۳۶)۔

۵، ۴۔ ان دونوں سوالوں کے جوابات نمبر ۳ کے تحت تفصیلاً مذکور ہو چکے ہیں اس لئے اعادہ کی حاجت نہیں۔

۶۔ مذکورہ بیع کا طریقہ درست نہیں ہے، اور اگرچہ بائع بعد والے مشتری کیلئے بصورت ہلاکت اشیاء دوران راہ اپنی ضمانت کے بموجب اس کا بدلہ پیش کرتا

ہے، لیکن ضمانت کو قبضہ حسی کے قائم مقام بوجہ قبضہ کی تعریف کے جو مذکور ہوئی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ راہ چلتے اشیاء، یعنی بیع کے ساتھ حادثہ کا پیش آجانا یہ ایک اتفاقی

امر ہے، جس کو قبضہ کے قائم مقام کسی صورت میں نہیں کیا جاسکتا، لہذا فیکٹری سے خریداری کرنے والے کی طرف سے قبضہ حسی نہ پائے جانے کی وجہ سے ضمان کو قبضہ

حسی نہیں قرار دیا جائے گا (بعض لوگوں نے اس کو قبضہ حکمی قرار دے کر جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، سو راقم کا اس سے اتفاق نہیں ہے، جب کہ قبضہ حسی پایا

جانا بہت حد تک ممکن ہے، ہاں اگر دشواری کی صورت ہے تو گنجائش ہے) اور دوسرے شخص کے ہاتھ اس کی فروختگی کو ناجائز قرار دیا جائے گا، لیکن یہ بات حضرات

شوافع اور احناف کے یہاں ہے، دوسرے مذاہب میں اس کی گنجائش ہے اور معاملات میں ناگوارشی کو بھی گوارا کر لیا جاتا ہے اس لئے حضرات احناف کے

یہاں بھی اس کی گنجائش ملتی ہے، لہذا اس وقت جب کہ اس کا خاصا رواج ہو چکا ہے، جائز قرار دینا چاہئے۔

۷۔ ظاہر ہے کہ بحث منقولی اشیاء سے ہے، لہذا اگر طعام کے قبیل سے ہے تو بالاتفاق ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں جائز نہیں ہے طعام کے علاوہ ہے لیکن

منقولی ہی ہے، حضرات احناف و حضرات شوافع کے یہاں بالکل جائز نہیں ہے، کیونکہ علت نبی ”رجح مالہ یضمن“ پائی جا رہی ہے، باقی دوسرے مذاہب میں

اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ پوری پوری وضاحت نمبر ۳ کے تحت آچکی ہے، اب جہاں تک موجودہ دور میں اس کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ بیع

کے بازار میں پہنچنے سے قبل ہی متعدد مشتریوں کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے اشیاء میں گرانی حساب سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

باوجود اس کے معاملات کے باب میں ناگوارشی کو بھی گوارا کر لیا جاتا ہے، اس لئے فتویٰ جائز کا ہونا چاہئے۔





## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت

مولانا تنویر احمد قاسمی

۱- شرعاً قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اگر اشیائے مملوکہ میں ہے تو یہ بیع غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ”بیع فاسد“ میں داخل ہے۔ ”ہو کل بیع فاتہ شرط من شرائط الصحة“ (بدائع ۵، ۲۹۹، مطبوعہ رشیدیہ پاکستان) لیکن اگر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت اشیائے مملوکہ میں نہیں ہے تو اس وقت بیع مال محقوم کے علاوہ مباح الاصل ہے، تو ایسی شکل میں شرائط انعقاد میں سے ”شرط محلّیہ“ مفقود ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہوگی، ”وأما البیع الباطل فهو کل بیع فاتہ شرط من شرائط الانعقاد من الأهلیة والمحلّیة وغیرها“ (بدائع ۴، ۲۰۵)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: ”(قوله لبطلان بیع المعدوم) إذ من شرط المعقود علیہ أن یکون موجوداً ما لا متقوماً مملوکہ فی نفسه وأن یکون ملک البائع فیما بیعه لنفسه“ (شامی ۲، ۱۰۵ مطبوعہ بیروت)۔

۲- قبضہ کی حقیقت:

قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ بائع مشتری کو بیع پر قابو دیدے اور بیع پر قابو پانے کیلئے جو موانع من جانب البائع ہو سکتے ہوں اسے دور کر دیا جائے، گرفتگی کے سلسلہ میں یہ رفع موانع عرفاً اور عادتاً جس طریقہ سے متصور ہوں سبھی صورتوں میں قبضہ شرعی محقق ہوگا، قبضہ کی حقیقت صرف قبضہ حسی ہی نہیں ہے، بلکہ بیع اس طرح ہو کہ دوسرے کے حق میں مشغول نہ ہو، بلکہ وہ بیع مفرز یعنی علاحدہ اور جدا ہو۔

”ولا یشرط القبض بالبراجم؛ لأن معنی القبض هو التمکین والتخلی، وارتفاع الموانع عرفاً وعادۃ“ (بدائع ۵، ۱۳۸)۔ وقوله: بلا مانع، بأن یکون مفرزاً غیر مشغول بحق غیرہ وفي الملتقط ولو باع داراً وسلمها إلى المشتري وله فیها متاع قليل أو كثير لا یکون تسلیماً حتی یسلمها فارغة وكذا لو باع أرضاً وفيها زرع“ (شامی ۲، ۲۳)۔

۳- بیع دو طرح کے ہوتے ہیں: اشیاء منقولہ، اور غیر منقولہ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قبضہ کی نوعیت اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں جدا جدا ہے یا ایک ہی ہے؟ اس سلسلہ میں باوجود تنبیح و تلاش کے کوئی صریح نص فقہی پر واقفیت اور کامیابی نہیں مل سکی، تاہم علامہ شامی نے درمختار کی عبارت ”شر التسلیم یکون بالتخلیة علی وجه یتمکن من القبض بلا مانع وحائل“ کے تحت قبضہ کی حقیقت و ماہیت کی وضاحت و صراحت میں اشیائے منقولہ وغیر منقولہ دونوں طرح کی مثال تحریر فرمائی ہیں، جس سے بطریقہ ظن غالب کہا جاسکتا ہے کہ قبضہ کی نوعیت منقولہ وغیر منقولہ دونوں میں یکساں ہیں، مثلاً:

بیع پر قبضہ شرعی اس وقت ہوگا جبکہ وہ بیع جدا اور علاحدہ اس طور پر ہو کہ دوسرے کا حق مشغول نہ ہو، بلکہ وہ بیع دوسرے کے حق سے خالی و عاری ہو، لہذا اشیاء غیر منقولہ میں صاحب مکان، یا صاحب ارض بیع دار یا بیع ارض کو مشتری کے حوالہ اس طور پر کیا کہ اس مکان میں بائع کا یا کسی اور کا، کسی قسم کا نجی سامان (خواہ وہ قلیل ہو، یا کثیر) موجود اور رکھا ہوا ہے، یا اس زمین میں بائع کی فصل آباد اور لگی ہوئی ہے، تو اس طرح کی بیع غیر کے حق سے جدا نہ ہونے اور غیر کے حق میں مشغول ہونے کی وجہ سے اسے تسلیم بیع اور قبضہ علی البیع نہیں کہہ سکتے۔

”قوله بلا مانع) بأن یکون مفرزاً غیر مشغول بحق غیرہ، وفي الملتقط: ولو باع داراً و یسلمها إلى المشتري وله فیها متاع قليل أو كثير لا یکون تسلیماً حتی یسلمها فارغة وكذا لو باع أرضاً وفيها زرع“ (شامی ۲، ۲۳)۔

ایسا ہی اشیاء منقولہ میں پرندہ یا گھوڑا وغیرہ، بائع نے اس طرح فروخت کیا کہ وہ بیع بند دروازہ میں ہے، مشتری نے بائع کی طرف سے قبضہ کی اجازت مل جانے پر دروازہ کھولا، دروازہ کھولنے کے بعد بغیر دوسرے کی معونت کے اور بغیر کلفت و تکلیف، یعنی حیلہ کے مشتری بذات خود بیع کو پکڑ سکتا ہے تو اس اجازت کو شرعی حیثیت سے قبضہ شرعی قرار دیا جائے گا، لیکن اگر دروازہ کھولنے کے بعد باسانی خود نہیں پکڑ سکتے، بلکہ حیلہ و تدبیر یا دوسرے شخص کی معونت پر گرفتگی موقوف ہو تو اس طرح کی اجازت کو قبضہ شرعی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

”ولو اشتری طیرا أو فرسا فی بیت وأمره البائع بقبضه ففتح الباب فذهب إن أمكنه أخذه بلا عون كان قبضا وتماہ فی البحر، وحاصله أن التخلية قبض حکما لو مع القدرة عليه بلا كلفة“ (شامی ۴، ۲۳)۔

۳۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نبی سے متعلق جو احادیث و آثار صحابہ ہیں وہ معلول بالعلت ہیں، وہ علت ”غرر اور خطر“ ہے، کیونکہ مشتری کا قبل القبض فروختگی عین ممکن ہے کہ معقود علیہ کے تلف و اتلاف کے موجب عقد اول فسخ ہو جائے اور وہ بیع پر قبضہ دلانے سے عاجز رہ جائے، تو پھر مشتری کا یہ تصرف ”غرر اور خطر“ کے علاوہ چہ معنی دارد۔

صاحب ”فتح القدير“ نے ہدایہ کی عبارت ”قوله ولا يجوز بيع السمك في الماء“ کے سلسلہ میں مختلف شکل یعنی سمک مملوک اور غیر مملوک قبل القبض اور اس کا حکم تحریر فرمانے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کر کے علت ”غرر اور خطر“ ہی کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”وقال أبو يوسف في كتاب الخراج: رخص في بيع السمك في الآجام أقوام فكان الصواب عندنا في قول من كره، حدثنا العلاء ابن المسيب بن رافع عن الحرث العكلي عن عمر بن الخطابؓ قال: لا تباعوا السمك في الماء فإنه غرر، وأخرج مثله عن ابن مسعودؓ. ومعلوم أن الأجمة قد يؤخذ منها السمك باليد، والنحرر الخطر، وغير المملوك على خطر ثبوت الملك وعدمه فلذا جعل من بيع الخطر“ (فتح القدير ۶، ۱۹، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

چنانچہ علامہ کاسانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

” (ومنها) القبض في بيع المشتري المنقول فلا يصح بيعه قبل القبض كما روى أن النبي عليه السلام نهي عن بيع ما لم يقبض، والنهي يوجب فساد المنهي، ولأنه يبيع فيه غرر الإنفساخ بهلاك المعقود عليه؛ لأنه إذا هلك المعقود عليه قبل القبض يبطل البيع الأول فينفسخ الثاني؛ لأنه بناء على الأول وقد نهي رسول الله ﷺ عن بيعه فيه غرر، وسواء باعه من غير بائعه أو من بائعه، لأن النهي مطلق لا يوجب الفصل بين البيع من غير بائعه وبين البيع من بائعه وكذا معنى الغرر لا يفصل بينهما فلا يصح الثاني“ (بدائع ۵، ۱۸۰)۔

۵۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت عام نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ استثناءات اور تخصیصات بھی ہیں جس میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی صرف ”صحت“ کا حکم ہوگا، نہ کہ نفاذ بیع اور لزوم بیع کا۔

وہ اشیاء مستثنیٰ یہ ہیں: عقار یعنی اشیاء غیر منقولہ، مہر، بدل، خلع، بدل عتق، بدل صلح عن دم العمد، میراث، عتق، تدبیر، استیلاء، وصیت۔

مشتری کا قبل القبض عقار فروخت کرنا امام شیخینؒ کے نزدیک جائز اور صحیح ہے، جبکہ امام محمدؒ، زفرؒ اور امام شافعیؒ علیہم الرحمۃ کے نزدیک ناجائز ہے، ائمہ ثلاثہ کی دلیل: ”روی أن النبي عليه الصلوة والسلام نهي عن بيع ما لم يقبض، وقد نهي رسول الله ﷺ عن بيع فيه غرر“ اور اس جیسی روایتیں ہیں۔

امام شیخینؒ علیہم الرحمۃ کی دلیل: ”أحل الله البيع“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵) اور ”إذا قضيت الصلوة فانتشر وافي الأرض“ (سورہ جمعہ: ۱۰) وغیرہ جیسی آیتوں کی تعلیم ہے، جس تعلیم کو خبر واحد کے ذریعہ تخصیص و تقييد نہیں کر سکتے، یا خبر واحد اور آیتوں کے درمیان یوں تطبیق دی جائے کہ خبر واحد سے قبضہ سے

پہلے خرید و فروخت کی نہی کو اشیاء منقولہ پر، اور آیتوں کی تعیم کو اشیاء غیر منقولہ پر حمل کر کے دفع تعارض کر لیا جائے۔

ان تمام باتوں کے باوجود امام شیخین علیہما الرحمۃ بھی مشتری کا قبل القبض عقار فروخت کرنا استحساناً یعنی قیاس خفی کی بنیاد پر جائز فرماتے ہیں، ورنہ قیاس جلی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس طرح کی بیع کو یہ دونوں حضرات بھی ائمہ ثلاثہ کی طرح ناجائز کہتے ہیں، وجہ استحسان یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت بر بنائے ”غرر“ ہے، وہ غرر یہ ہے کہ معقود علیہ کی ہلاکت کی وجہ سے انفساخ عقد کا احتمال ہے، اور یہ اشیاء منقولہ ہی میں متصور ہے، اسلئے اشیاء منقولہ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، اور جبکہ اشیاء غیر منقولہ میں اس قسم کا احتمال غرر متصور ہے ہی نہیں، ”فثبت أن بیع المشتري العقار قبل القبض جائز“ (بدائع ۱۸۱/۵)۔

ایسا عقد جو احتمال نقض و فساد رکھتا ہے یعنی اگر بائع نقض بیع کرے تو وہ معاملہ و عقد ٹوٹ سکتا ہے، خواہ یہ نقض و فساد اس وقت ہو جبکہ مشتری قبل القبض بیع میں تصرف وغیرہ کرے، یا بعد القبض تصرف کرے، لیکن یہ قبضہ بدون اذن البائع ہو، تو اس قسم کے عقود میں مشتری کے تصرفات کے سلسلہ میں امام شیخین اور محمد و زفر وغیرہ کا باہم اختلاف ہوا ہے۔

لیکن وہ عقود اگر اس طرح کے ہیں کہ مشتری کی طرف سے کئے گئے تصرفات احتمال نقض رکھتے ہی نہیں، جیسے تصرف عتق، تدبیر، استیلاء وغیرہ، تو ایسی صورت میں بالاتفاق مشتری کے یہ تصرفات صحیح اور درست قرار پائیں گے، خواہ یہ تصرف قبل القبض ہو، یا بعد القبض بدون اذن البائع ہو، ہمارے اس دعویٰ کی دلیل علامہ شامیؒ کی یہ عبارت ہے:

”قوله صح بیع عقار) ای عندہما وقال محمد لا یجوز... الخ إلى أن قال۔ وكذا كل تصرف يقبل النقص إذا فعله المشتري قبل القبض أو بعده بخير إذن البائع فللبائع إبطاله بخلاف ما لا يقبل النقص كالعق والتدبير والاستيلاء، بجر“ (شامی ۲، ۱۶۲، مطبوعہ بیروت)۔

ہر وہ عقد جو عوض کی ہلاکت کے سبب عقد ٹوٹ سکتا ہے، تو اس قسم کے عوض میں مالک کو قبضہ سے پہلے کسی قسم کے تصرف کا حق و جواز نہیں، لیکن تمام وہ عقود جو عوض کی ہلاکت سے نفس عقد باطل اور زائل نہیں ہو پاتا، تو اس قسم کے عوض میں قبل القبض مالک کو تصرف کا حق جملہ حاصل ہے، بشرطیکہ ان عقود کا عوض متعین فی الخارج ہو، جیسے مہر، بدل خلع، عتق علی مال، بدل صلح عن دم العمد۔

ان دونوں شکلوں (ہلاکت عوض سے فسخ عقد اور عدم فسخ عقد) میں سے پہلی شکل میں قبضہ سے پہلے تصرف کی ممانعت اور دوسری شکل میں تصرف کی اجازت، ان سبھی امور میں امام ابو یوسف اور امام محمد علیہما الرحمۃ متفق اور متحد ہیں، لیکن امام محمدؒ پہلی شکل میں صرف صدقہ، رہن، قرض، ان تصرفات کے جواز کے قائل ہیں جو تصرفات قبضہ کے بعد ہی تام اور مکمل ہوتے ہیں، جبکہ امام ابو یوسفؒ پہلی شکل میں مطلقاً بشمول تمام تصرفات کو حتیٰ کے ہبہ کو بھی ناجائز ہی قرار دیتے ہیں، معلوم نہیں اس مقام پر دیگر ائمہ کرام کا کیا مسلک و مذہب ہے، ملاحظہ ہو شامیؒ کی پوری تفصیلی عبارت:

”قال في الفتح الأصل أن كل عقد يفسخ بهلاك العوض قبل القبض لم يجز التصرف في ذلك العوض فالتصرف فيه قبل القبض جائز كالمهر وإذا كان عيناً يجوز بيعه وهبته وإجارته قبل قبضه وسائر التصرفات في قول أبي يوسف ثم قال محمد: كل تصرف لا يتم إلا بالقبض كالهبة والصدقة والرهن والقرض فهو جائز قلت: وحيث مشي المصنف على قول محمد كان ينبغي للشارح ذكر الأصل الثاني أيضاً؛ لأنه يظهر مما ذكرنا أن الأصل الأول غير خاص بقول أبي يوسف إلا أن الشق الأول منه وهو ما يفسخ بهلاك العوض قبل القبض كالبيع والإجارة لا يجوز التصرف قبل القبض في عوضه المعين عند أبي يوسف مطلقاً وأجاز محمد فيه كل تصرف لا يتم إلا بالقبض كالهبة ونحوها لأن الهبة لما كانت لا تتم إلا بالقبض صار الموهوب له نائباً عن الواهب“ (شامی ۲، ۱۶۲-۱۶۳)۔

قبضہ سے پہلے ملک موروث میں وارث اور مال موصل بہ میں موصلیٰ نہ تصرفات کا مکمل اختیار رکھتا ہے اور اس کے تصرفات صحیح ہوں گے، بدائع



میں ہے:

”و كذلك الميراث يجوز التصرف فيه قبل القبض؛ لأن معنى الغرر لا يتقرر فيه؛ ولأن الوارث خلف الميت في ملك الموروث وكذلك الموصى به بأن أوصى إلى إنسان بشئ ثم مات الموصى؛ فللموصى له أن يتصرف قبل القبض؛ لأن الوصية أخت الميراث ويجوز التصرف في الميراث قبل القبض فكذا في الموصى به“ (بدائع ۵۰۱۸۱، مطبوعہ پاکستان)۔

۶۔ ایک شخص کسی فیکٹری سے مال خرید کر کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، لیکن فیکٹری سے خریدا ہوا مال اپنے قبضہ میں نہیں لیتا، بلکہ براہ راست فیکٹری سے خریدار نمبر (۲) کو روانہ کر دیتا ہے، اور معاملہ یہ طے پاتا ہے کہ فیکٹری سے مال روانہ ہونے کے بعد خریدار نمبر (۲) کے پاس پہنچنے سے پہلے اگر درمیان میں مال ہلاک ہو جائے تو اس نقصان کی ذمہ داری اسی شخص (خریدار) نمبر (۱) کا نقصان قرار پاتا ہے، یہ صورت معاملہ اگرچہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے شخص کا اس مال پر حقیقی قبضہ نہیں ہوا، لیکن وہ مال خریدار نمبر (۲) تک پہنچنے سے پہلے اس کی ضمانت میں رہا، سوال یہ ہے کہ فیکٹری سے خریداری کرنے والے کی طرف سے قبضہ حسی نہ پائے جانے کی وجہ سے دوسرے شخص کے ہاتھ اس فروختگی کو ناجائز قرار دیا جائے، یا ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا؟

سوال مذکور میں جب بائع نے مشتری سے مال فروخت کر دیا، اور بائع نے یا وکیل بائع یا ولی بائع نے براہ راست خرید شدہ مال کو مشتری آخر کے پاس بھیج دیا، یہ پتہ دے رہا ہے کہ بائع نے تمام موانع اور رکاوٹ کو دور کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں مشتری خرید کردہ مال کو مشتری ثانی کے پاس بھیج رہا ہے، جو عین قبضہ پر دال ہے، مشتری اول کا مشتری ثانی کے پاس مال بھیج کر بیع میں تصرف کرنا بعد القبض ہے نہ کہ قبل القبض، جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر مال راستہ ہی میں ہلاک ہو جائے تو اس مال کا ضمان مشتری اول پر عائد ہوتا ہے، خرید و فروخت کے باب میں حسی قبضہ لازم نہیں ہے، بلکہ دراصل وہی قبضہ معتبر ہے جسے عرف عام میں قبضہ کہا جاتا ہو، جس کی تشریح پیچھے گزر چکی ہے۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت میں جب یہی عرف و شرط ہو کہ جہاز پر مال چڑھانے کے بعد، وہ مال بائع کے قبضہ سے نکل کر مشتری کے قبضہ و احراز میں چلا آتا ہے، اگر وہ مال دریا میں غرق ہو جائے تو مال کا خسارہ صرف مشتری کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے باوجود جبکہ وہ مال سمندر میں ہے، مشتری اول اس مال کو مشتری ثانی کی معرفت فروخت کر دیتا ہے، اور یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ اگر مال ہلاک ہو جائے تو ضمان مشتری ثانی کو برداشت کرنا پڑے گا، تو یہ معاملہ مشتری اول کا مشتری ثانی سے کرنافی نفسہ جائز ہے، کیونکہ مشتری اول کیلئے بیع مقبوض ہے، لیکن ابھی اس مال پر مشتری ثانی کا قبضہ متحقق نہیں ہے، اس لئے ہلاکت کی صورت میں مال مذکور کا ضمان مشتری ثانی پر ہرگز عائد نہیں ہوگا۔

☆☆☆

## قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کا شرعی حکم

مولانا خلیل احمد قاسمی ع

قبضہ سے پہلے خرید و فروخت سے متعلق موصول شدہ سوالنامہ میں سات سوالات ہیں، ان کے جوابات اختصار کے ساتھ پیش کرنے سے پہلے چند اصولی تمہیدی سطور عرض ہیں، جن کی روشنی میں تمام سوالات کے جوابات انشاء اللہ آسان ہوں گے، فقہاء کرام کے یہاں کچھ اصول ایسے مسلمہ ہوتے ہیں، کہ جن میں کسی کا اختلاف نہیں ہوتا ہے، اسی لئے تعریفات کے لئے جو الفاظ ذکر کئے جاتے ہیں وہ بہت محدود ہوتے ہیں، یعنی نہ ان میں ایسی وسعت ہوتی ہے کہ غیر معرف بھی داخل ہو جاتے اور نہ ایسا اختصار ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے معرف کے کچھ افراد تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں، البتہ کچھ جزئیات ایسے ہوتے ہیں جن میں حکم بیان کرتے وقت مسلمہ اصول کے الفاظ جو مقید ہوتے ہیں ان کی تشریح میں اختلاف ہونے کی وجہ سے کچھ اختلافات پیدا ہوتے ہیں، لیکن انہیں اختلاف میں ایک بات غور طلب ہے کہ کسی قید کی جب کہیں تشریح موجود ہوتی ہے تو وہ اکثر شرح عبارت، یا مسئلہ کے مقابلہ میں اصولاً زیادہ راجح قرار پائے گی یعنی وہ اختلاف جس میں استدلال قید شرح سے کیا جائے وہ راجح ہوگا، اس قول پر جس میں استدلال قید غیر شرح سے کیا جا رہا ہو، یہ بات اس لئے تحریر کی گئی ہے کہ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کے مسئلہ پر قبضہ کی جو مسلمہ تعریف ہے، اس میں جو قیود لگائی گئی ہیں ان سے زیر بحث مسئلہ پر حکم کے اعتبار سے ضرور روشنی پڑے گی۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نفس بیع کے انعقاد میں قبضہ کی کیا حیثیت ہے، کیا قبضہ اگر نہ ہو تو بیع بھی منعقد نہ ہوگی، یا بیع تو منعقد ہوگی، لیکن مشتری کو بیع کا اختیار ہوگا؟

”بدائع الصنائع“ کی عبارت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ بیع مطلق کے صحیح ہونے کیلئے قبضہ ضروری نہیں ہے:

”لأن التقابض في البيع المطلق ليس بشرط لصحة العقد“ (۵۲۱۶)۔

لیکن یہ مسئلہ الگ ہے کہ کسی شے کے بیع و شراء کا معاملہ ہوا، ابھی مشتری نے بیع پر قبضہ نہیں کیا لیکن مشتری بیع غیر مقبوض میں تصرف کرے، یعنی کسی اور کے ہاتھ فروخت کرے تو کیا اس کیلئے یہ فعل درست ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کی وضاحت سے پہلے قبضہ کی تعریف جو مسلم ہے اس کو بیان کرنا ضروری ہے اور اس میں جو قیود لگائی گئی ہیں ان سے پیش کردہ سوالات کے جوابات میں کافی مدد ملے گی، صاحب ”بدائع الصنائع“ نے نفس قبضہ کی تعریف یہ کی ہے:

”ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقيقة“۔

یعنی حصول قبضہ کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ”یداً بیداً“ یا مکمل طور پر حسی گرفت ہو، جیسا کہ لفظ براجم سے سمجھا جا رہا ہے، بلکہ مفہوم یہ ہے کہ بائع کا مشتری کے سامنے رکھ دینا یا، اپنی حفاظتی گرفت سے خارج کرنا کہ جس پر مشتری اپنا تصرف کر سکے، یعنی مشتری کی گرفت اس بیع پر جس حیثیت سے ہو اسی حیثیت سے ان کا قبضہ عرفاً مانا جاتا ہو، اور عادتاً لوگوں میں مشتری کا قبضہ منظور ہو، البتہ یہ تصور حقیقتہً ہونہ کہ مجازاً، یعنی لوگوں میں مثلاً عادتاً جس حیثیت سے قبضہ مانا جاتا ہو اسی حیثیت سے ہونا ضروری ہے، نہ تاویلاً، یا ارادہ وغیرہ، اور مشتری اس پر تصرف کرنے پر قادر ہو، نیز مشتری کے تصرفات میں کسی طرح کی بائع کی طرف سے رکاوٹ نہ ہو، اور مکمل تخلیہ ہو، مراد اس سے یہ ہے کہ بائع کا حق تصرف اس سے ختم ہو گیا ہو اور مشتری کی اس پر

تمکین ہو چاہے یہ تمکین "من حیث الأخذ بالید" ہو، یا رفع حائل وموانع سے ہو، جو بھی عرف میں معتبر مانا جاتا ہو یہ حقیقت ہو، یا حکماً، درحقیقت بات یہ ہے کہ ایسے تخلیہ کو شرعاً قبضہ کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے کہ علامہ شامی نے شرائط التخلیہ کو بیان کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے، البتہ یہ بیع کی حالت کے اعتبار سے مختلف بھی ہوتا ہے، عبارت یہ ہے:

"وحاصله أن التخلية قبض حکما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع" (۴، ۵۶۲)

مگر تخلیہ کے اندر یہ بات ملحوظ ہونی چاہئے کہ بیع اتنی قریب ہو کہ اس پر اگر قبضہ حقیقی کرنا چاہے تو کوئی دشواری پیش نہ آئے اور اگر فی الحال بیع اتنی دوری پر ہو کہ اگر اس پر قبضہ حقیقی کرنا چاہے تو بہت مشکل ہو، یعنی قبضہ حقیقی دوری کی وجہ سے غیر متصور ہو، تو ایسی صورت میں تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہ ہوگا، چونکہ خانہ کے حوالہ سے علامہ شامی نے یہ ذکر کیا ہے جس کا ابھی ترجمہ ہوا عبارت یہ ہے:

"وفي الخاتمة: والصحيح ما ذكر في ظاهر الرواية لأنه إذا كان قريبا يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال فتقام التخلية مقام القبض، أما إذا كان بعيدا لا يتصور القبض في الحال فلا تقام التخلية مقام القبض" (۴، ۵۶۲)۔

لیکن علامہ شامی نے اس مذکورہ عبارت کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: "قلت: لكن نقل ابن المصنف في زواهر الجواهر عن يوع فتاوى قارى الهداية أنه متى مضى مدة يتمكن من الذهاب إليها والدخول فيها كان قابضا وإلا فلا قنية"۔

یعنی اوپر کی عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ دوری اگر ایسی ہے کہ اس میں فی الحال قبضہ حقیقی غیر متصور ہے تو تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہ ہوگا، اس کی تشریح یہ کی ہے کہ دوری اگر ایسی ہے کہ وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے، اس پر قدرت ممکن ہے تو ایسی دوری بھی تخلیہ کو قبضہ حقیقی کے قائم مقام ہونے سے نہیں روکے گی، اور قبضہ کا حاصل ہونا تخلیہ کے ذریعہ یہ تمام اموال کے اندر ہے، کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے:

"ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال" (بدائۃ الصنائع ۵، ۲۴۴)۔

اور قبضہ کی جو تعریف کی گئی ہے اور تفصیل گزر چکی ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے حکم کو بیان فرمایا گیا ہے کہ قبضہ وہ تخلیہ ہی ہے، لہذا بائع اگر مال بیع کو بخلی کر دے تو اسے مسلم یعنی سونپ دینے والا کہا جائے گا، اور مشتری کو قابض، یعنی قبضہ کرنے والا کہا جائے گا:

"فالتسليم والقبض عندنا سوا التخلية والتخلي وهوان يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له" (بدائۃ الصنائع ۵، ۲۴۴)۔

اب بات یہ رہ جاتی ہے کہ اشیاء منقولہ اور غیر منقولہ کے اعتبار سے قبضہ سے پہلے خرید و فروخت میں کوئی فرق ہے، یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں بات یہ ہے کہ اشیاء غیر منقولہ کے اندر قبضہ سے پہلے خرید و فروخت درست ہے، یعنی زمین، جائداد، مکان، دوکان وغیرہ کی بیع ہونے کے بعد ہی بغیر کسی طرح کے قبضہ کے اس میں تصرف چاہے بیعاً ہو، یا ہبہ ہو وغیرہ، درست ہے، اور یہ قول طرفین رحمہما اللہ کا ہے، اگرچہ اس میں امام محمد کا اختلاف ہے، لیکن فتویٰ طرفین کے قول پر ہے طرفین کی دلیل یہ ہے کہ بیع کا صدور اہل بیع، یعنی عاقل، بالغ ہونا اور محل یعنی مال مملوک میں ہوا ہے، اور اس میں کوئی غرر بھی نہیں ہے، اس لئے کہ زمین وغیرہ کی ہلاکت بہت نادر ہوتی ہے، البتہ اشیاء منقولہ کا حکم اس سے جداگانہ ہے۔

اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی ممانعت والی حدیث معلول بالعلۃ ہے، یعنی غرر کی وجہ سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے، لہذا جہاں غرر کا امکان ہے وہاں یہ ممانعت ہوگی، اور جہاں غرر نہیں ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے، اور زمین میں غرر نہیں ہے اگرچہ بھی تو نادر ہے، اور نو اور عام حکم کا مدار نہیں ہوتے ہیں:

"ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد: لا يجوز رجوعاً إلى إطلاق الحديث واعتباراً بالمنقول، ولهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه، لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول والغرر المنهى عنه غرر إنفساخ العقد والحديث معلول به عملاً بدلائل الجواز" (هداية ۴، ۵۹)۔



البتہ اشیاء منقولہ کے اندر بیع پر قبضہ کا ہونا جواز بیع کیلئے ضروری ہے، اور یہ حکم بالا جماع ہے:

”ولا يجوز التصرف في المبيع المنقول قبل القبض بالإجماع“ (بدائع الصنائع ۶: ۲۲۴، ۵)۔

لہذا قبضہ کی جو تفصیل اوپر گزری ہے اگر اس کے مطابق قبضہ نہ ہو تو ایسی صورت میں بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے بیع کرنا جائز نہیں ہے اور یہ عدم جواز کا تعلق نہ بیع باطل سے ہے اور نہ فاسد سے، البتہ اس کا تعلق کراہت سے ہے، چونکہ احتمال غرر کا ہے اور ایسا احتمال جہاں ہوتا ہے وہاں کراہت کا اطلاق ہوگا نہ کہ فساد کا، اس لئے کہ فساد کا تعلق عموماً قطعیت کے ساتھ ہوتا ہے لیکن احتمال ناشی عن دلیل ہے تو اس کا بھی شمار فساد میں ہوتا ہے۔

خلاصہ:

مذکورہ بالا تحریرات و عبارات کی روشنی میں نمبردار سوالات کے اختصار کے ساتھ جوابات عرض ہیں:

- ۱۔ اشیاء منقولہ میں قبضہ سے پہلے خرید و فروخت جائز نہیں اور اس کا شمار بیع مکروہ میں ہے۔
- ۲۔ جس عرف میں قبضہ کا جو بھی تصور متصور ہے وہی قبضہ شرعاً بھی معتبر ہے۔
- ۳۔ فرق ہے مختصراً یہ کہ اشیاء منقولہ میں تخلیہ عرفی کا اعتبار ہے۔
- ۴۔ احادیث انہی عن القبضہ سے پہلے خرید و فروخت معلول بالعلتہ ہیں اور علت نہی احتمال غرر ہے۔
- ۵۔ تخصیصات ہیں، آراء ائمہ مذکورہ بالا تحریر میں ہیں۔
- ۶۔ جائز قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ دلیل ضمان علامت قبضہ ہے۔
- ۷۔ مشتری جب فروخت کرنے سے پہلے ضامن تھا بعد میں البتہ نہیں رہا تو یہ صورت شرعاً جائز ہے۔

☆☆☆

## قبضہ سے پہلے متعلق اجادیت کی حیثیت

### اور غرر کے احکام

مولانا محمد اختر قاسمی

- ۱۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت ناجائز ہے، حدیث میں اس کی ممانعت موجود ہے، ”لقولہ علیہ السلام: نھی عن بیع مالہ یقبض“، خرید شدہ مال پر قبضہ حاصل کرنے سے پہلے اس کا سودا کرنا بحیثیت مالکانہ بیع فاسد ہے، اصول فقہ کے مشہور ضابطہ کے تحت اس کا شمار بیع فاسد میں ہونا چاہئے، ضابطہ یہ ہے کہ نہی افعال شرعیہ میں بیع لغیرہ وصفی پر محمول ہوتی ہے، اور تمام بیوع فاسدہ اور اموال ربویہ وغیرہ پر یہی حکم لگتا ہے۔
- ۲۔ اسلامی شریعت میں قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، قبضہ ہر شئی کا اس کے مناسب حال ہوتا ہے، قبضہ کبھی قانوناً ہوتا ہے، کبھی حسی معتبر ہوتا ہے اور کبھی حکمی، یعنی جب وہ چیز ضمان میں آجائے تو اس کو آگے فروخت کرنا جائز ہو جائے گا۔
- ۳۔ منقولات میں سے جو چیز خریدے، جب تک وہ اپنے قبضہ میں نہ آجائے (یعنی اپنے تصرف میں) مالکانہ تصرف جائز نہیں، ہاں جب ضمان و تصرف میں آجائے تو اب مالکانہ تصرف کا حق حاصل ہو گیا، جیسے چاہے کرے، اور اشیاء غیر منقولہ میں کاغذی کارروائی مکمل ہو جانے کے بعد ہی حق تصرف حاصل ہوتا ہے، پس حسی قبضہ کرنے سے پہلے بھی تصرف کرنا جائز ہے۔
- ۴۔ قبضہ سے پہلے خرید و فروخت کی نہی سے متعلق احادیث ”معلول بالعلت“ ہیں ”لقولہ علیہ السلام: نہی عن بیع الغرر الخ؛ لأن فیہ غرر انفساخ العقد“ غرر اور ہلاکت بیع کے اندیشہ پر ممانعت ہے۔
- ۵۔ ”کل عوض ملکت بعقد ینفسخ بہ لاکہ قبل قبضہ فالتصرف فیہ غیر جائز فما لا فجانز۔“ (البحر الرائق ۶، ۱۲۷) امام مالک کے نزدیک بیع اور غیر بیع میں تصرف کرنا قبضہ سے پہلے جائز ہے، امام مالک کے نزدیک طعام کا استثناء ہے، اور امام محمد کے نزدیک ہبہ اور صدقہ میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے اور ائمہ حنفیہ کے نزدیک منقولات میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز نہیں، شیخین کے نزدیک زمین کی بیع حسی قبضہ سے پہلے بھی جائز ہے، کیونکہ زمین کی ہلاکت نادر ہے۔
- ۶۔ ضمان کو قبضہ حسی کا قائم مقام سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے گا۔
- ۷۔ بائع کی ذمہ داری عرف میں جہاں تک ہے وہاں تک بیع بائع کے ضمان میں متصور ہوگی، اور وہی ہلاکت پر ضامن ہوگا، اور جب اس کے عرفی ضمان و ذمہ داری سے نکل جائے گی تو مشتری کا ضمان شروع ہوگا، اب اگر وہ سامان ضائع و ہلاک ہوتا ہے تو مشتری ضامن ہوگا، یہی حال مشتری ثانی و ثالث وغیرہ کا ہوگا۔

☆☆☆





عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# حقوق کی بیع

(مال کی حقیقت حقوق کی خرید و فروخت)

ایک علمی جائزہ

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی، پاکستان



## پہلا باب تمہیدی امور

### پیش لفظ

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو شریعت انسانیت کے لئے بھیجی گئی ہے، وہ قیامت تک کے لئے ہے، اسی لئے قرآن و حدیث میں بعض اصطلاحی الفاظ کو اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے مصداق و مفہوم کو پوری طرح متعین نہیں کیا گیا ہے اور ایک حد تک ابہام کو باقی رکھا گیا ہے، تاکہ وہ قیامت تک ہونے والی تبدیلیوں کا احاطہ کرے، ایسے ہی الفاظ میں ایک مال بھی ہے۔ مال کا لفظ قرآن و حدیث میں بہت سے مواقع پر استعمال ہوا ہے، لیکن نصوص میں کہیں مال کی تعریف نہیں کی گئی ہے، کیونکہ جس دور میں قرآن نازل ہوا، اگر اس دور کے عرف کے اعتبار سے مال کی حقیقت متعین کر دی جاتی، تو مال کی بہت سی وہ صورتیں جو بعد میں پیدا ہوئیں، اس میں شامل نہ ہو پاتیں۔ موجودہ دور میں بہت سی ان دیکھی اور مادی اعتبار سے ناقابل ذخیرہ اشیاء بھی مال کہلاتی ہیں، ان ہی میں ایک وہ حقوق ہیں جنہیں صرف قانونی طور پر محفوظ کیا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ ان کی حیثیت مال کی ہے یا نہیں؟ اور یہ قابل عوض شمار کئے جائیں گے یا نہیں؟

اس مجموعہ میں قارئین کو اس موضوع پر تفصیلی مقالات اور اہل علم کے باہمی مناقشات ملیں گے، اسی طرح اس میں دوسرا موضوع مراہجہ کا ہے، مراہجہ سے مراد کسی چیز کو خرید کرنے کے بعد نفع کے ساتھ اس طرح فروخت کرنا ہے کہ خریدار پر سابقہ قیمت اور اس پر لیا جانے والا نفع واضح کر دیا جائے۔ موجودہ دور میں اسلامک بینک سرمایہ کاری کے جو طریقے اختیار کرتے ہیں ان میں مراہجہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور چونکہ اس میں نقصان کا خطرہ بہت کم رہتا ہے، اس لئے زیادہ تر اسلامک بینک اسی طریقہ کو استعمال کرتے ہیں۔ مراہجہ کے درست ہونے کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ بیچنے والے کا قبضہ کچھ دیر کے لئے سہی، اس شے پر ثابت ہو جائے، تاکہ چند لمحوں کے لئے سہی اسے نقصان کا خطرہ قبول کرنے والا سمجھا جائے۔

ان دونوں موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے تیسرے سمینار منعقدہ بنگلور میں ان کو بحث کا موضوع بنایا تھا۔ یہ مجموعہ ان ہی مضامین پر مشتمل ہے، جس کا نیا ایڈیشن کتب خانہ نعیمیہ دیوبند کے ذریعہ شائع ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز گرامی مولوی صفدر زبیر ندوی، رفیق شعبہ علمی امور کو کہ انہوں نے اس مجموعہ کی ایڈیٹنگ کی اور اس کا پروف پڑھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اسے لوگوں کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکرٹری)

۴ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ / ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء

☆☆☆



## ابتدائیہ

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

زندگی حرکت و تغیر سے عبارت ہے، یہ جتنی صحیح ہے حقیقت ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کی اصل فطرت ایک ثبات پذیر شئی ہے جو تاریخ کے ہر دور میں یکساں رہی ہے، دنیا کے اکثر مذاہب و قوانین میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت نہیں کی جاسکتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک عہد کے بعد دوسرے عہد اور ایک علاقہ و ماحول سے نکل کر دوسرے علاقہ و ماحول اور سماج میں ناقابل عمل ہو کر رہ گئے، اور اس جمود نے آخر زندگی سے ان کا رشتہ کاٹ دیا، اس کے بالمقابل ایک طبقہ وہ ہے جس نے انسانی فطرت کے بجائے زندگی کے وسائل و اسباب ہی کو قانون کی اساس بنا لیا ہے۔ اور آئے دن نظام زندگی میں اسی تبدیلی کو گوارا کرتے چلے گئے جو انسانی خواہشات اور نفسانی مرغوبات کے عین مطابق ہو کہ کہیں اس کی وجہ سے انسان کی چاہتوں میں کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے۔

اسلام جو دنیا میں واحد محفوظ الہامی مذہب اور قانون حیات ہے۔ اس نے ان دونوں کے درمیان توازن اور اعتدال قائم رکھا ہے، انسانی فطرت کے تقاضے ہمیشہ یکساں رہے ہیں اور خیر و شر کی طرف میلان اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ پس اسلام انسانی میلانات و رجحانات اور اس کی خواہشات و مرغوبات کی تہذیب کرتا ہے اور صحیح و غلط کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے، کتاب و سنت کے نصوص اور دین کے بنیادی اصول و قواعد کا اصل مقصود یہی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جاہد عدل کی رہنمائی کر دی جائے اور حلال و حرام کے درمیان خط امتیاز کھینچ دی جائے۔ دوسری طرف کتاب و سنت میں بہت سی جزئیات ایسی ہیں جن سے خاموشی اختیار کی گئی ہے، ہر زمانہ کے بالغ نظر اور بلند پایہ فقہاء نے شریعت کے مقاصد، اس کے مزاج و مذاق، احکام شرع کے مدارج اور دین کے بنیادی اصول و قواعد کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں فیصلے کئے ہیں، اگر بدلتے ہوئے حالات میں ایسا محسوس ہو کہ شریعت کے مقاصد و مصالح کی اس طرح تکمیل نہیں ہو سکتی، تو ضروری ہوگا کہ نصوص کی حدود و اربعہ میں رہتے ہوئے، اور شریعت کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے ان پر نظر ثانی کی جائے، یہ اجتہاد نہیں بلکہ ائمہ مجتہدین کی آراء کی بدلتے ہوئے حالات میں تطبیق ہے، اور یہ دلیل و برہان کا اختلاف نہیں بلکہ عہد و زمان کا اختلاف ہے، اسی کی طرف فقہاء نے ”من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل“ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

پس جہاں دین کے مسلمات کے دائرہ سے نکلنا، اور سلف صالحین کے اجتہادات کو نظر انداز کر دینا ناقابل عفو گمراہی ہے، وہیں فقہی جزئیات پر جمود جو کسی خاص زمانہ اور عرف پر مبنی تھے۔ شریعت کی مصالح سے بے خبری اور اس کے مقاصد اور روح سے بے اعتنائی ہے، اور اگر اصحاب افتاء اور مخلص علماء اس کے لئے آگے نہیں بڑھے اور انہوں نے جرأت کا ثبوت نہیں دیا تو اندیشہ ہے کہ نا اہل اور دین کے معاملہ میں غیر مخلص، اور مغربی تہذیب و تمدن سے مرعوب، تجدد پسند طبقہ کو دین سے کھلواڑ کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔

اسی مقصد کے پیش نظر چند سال قبل راقم السطور نے کچھ نوجوان علماء کی رفاقت میں مرکز البعث<sup>لعلمی</sup> کی بنیاد رکھی، جس نے ماہ اپریل ۱۹۸۹ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اسٹڈیز کے تعاون سے دہلی میں پہلا سیمینار منعقد کیا، جس نے باہم تبادلہ خیال اور اجتماعی غور و فکر کی ایک نئی طرح ڈالی، اسی سے حوصلہ پا کر مرکز البعث<sup>لعلمی</sup> کو مزید وسعت دی گئی، اور اسلامک فقہ اکیڈمی کی تشکیل عمل میں آئی، اور اس نے دوسرا

فقہی سمینار دہلی ہی میں دو اہم مسائل کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت، اور بینک انٹرسٹ اور سودی قرض پر منعقد کیا، ان دونوں سمینار کے مقالات کے مجموعے شائع ہو کر قارئین کے سامنے آچکے ہیں، اور اکثر اہل علم کا احساس ہے کہ اردو زبان میں اب تک ان موضوعات پر اتنی وسعت اور عمق کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے اور نہ تبادلہ خیال عمل میں آیا ہے۔

اسی سلسلہ کا تیسرا سمینار اکیڈمی کے زیر اہتمام دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور میں منعقد ہوا، جس میں پورے ملک سے علماء و ماہرین معاشیات نے شرکت کی، ہندوستان کے علاوہ پاکستان سے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور عراق سے ڈاکٹر محمد محروس المدرس نے بھی شرکت کی۔ اس سمینار میں دو اہم مسائل زیر بحث تھے، ایک حقوق کی خرید و فروخت کا مسئلہ، دوسرے غیر سودی بینک کاری کے نظام کا، غیر سودی بینک کاری کے سلسلہ میں چونکہ ابھی صرف رہنما خطوط مقرر کئے جانے تھے، اس لئے مسئلہ زیر بحث کے بعض گوشوں پر ہی شرکاء کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی، چنانچہ اس مسئلے سے متعلق مقالات آئے، جن میں بعض بینکنگ کے فنی پہلو سے متعلق تھے، اور بعض اس کے فقہی پہلو پر لکھے گئے تھے۔ حقوق کی خرید و فروخت کے مسئلہ پر بڑی تعداد میں مقالات موصول ہوئے اور مجھے اس امر پر مسرت ہے کہ خصوصیت سے ہمارے نوجوان فضلاء اور تازہ دم اہل قلم نے اس موضوع پر توقع سے زیادہ محنت کی ہے، اور نہایت قیمتی مواد جمع کر دیا ہے، جو قارئین کی نذر ہے، امید ہے کہ گذشتہ مجلات کی طرح اسے بھی شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا۔

اس فقہی اجتماع نے جہاں وسعت و عمق کے ساتھ جدید مسائل پر سوچنے کا ایک منہج عطا کیا ہے، مختلف آراء کو سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے، نیز مختلف مذاہب فقہ اور مکاتب فکر کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے، وہیں یہ نہایت خوش آئند حقیقت ہے کہ اس اجتماع نے اعتراف اور قوت دلیل کی بنا پر اپنی رائے سے بے تکلف رجوع کی سنت (جو سلف صالحین کا طرہ امتیاز رہا ہے) کی مثالیں زندہ کی ہیں، نیز ان سمیناروں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے کبھی بھی فیصلہ میں عجلت اور جلد بازی کو راہ نہیں دی ہے، بلکہ قابل اطمینان حد تک بحث و مناقشہ اور تبادلہ خیال کے بعد ہی فیصلے کئے ہیں، چاہے ایک مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کے بجائے دوسرے سمینار تک توقف کیوں نہ کرنا پڑے۔

چنانچہ اس سمینار میں بھی اسلامی طرز کی بینک کاری کے مسئلہ پر بحث غیر مختتم رہی، اور توقع ہے کہ آئندہ سمینار ہی میں اس سلسلہ میں کسی آخری فیصلہ تک پہنچا جاسکے گا۔

زیر نظر مجلہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں خطبہ استقبالیہ، خطبہ افتتاحیہ، خطبہ صدارت، ڈاکٹر محمد محروس المدرس عراقی کا کلیدی خطاب اور اس سمینار کی مختصر رپورٹ اور منظور شدہ تجاویز شامل ہیں۔ دوسرے حصہ میں حقوق کی خرید و فروخت سے متعلق مقالات اور زبانی مباحثے شریک اشاعت ہیں۔

تیسرا حصہ مزاحمہ سے متعلق تحریروں پر مشتمل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو ثبات و دوام عطا فرمائے، ایسے فیصلے کرائے جن سے وہ راضی ہو، اور ہمیں اس ملک میں شریعت اسلامی کی حفاظت اور کسی مداخلت کے بغیر اس کی تطبیق کا فریضہ انجام دینے کا اہل بنائے۔

واللہ الموفق و هو المستعان

مجاہد الاسلام قاسمی

۱۱ جون ۱۹۹۰ء

☆☆☆

## خطبہ استقبالیہ

مفتی اشرف علی صاحب، کنوینر سمینار

اس عظیم مبارک شہر میں خوش آمدید کہہ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس سمینار کے لئے ہم لوگوں کو توفیق عطا فرمائی۔ قاضی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ مجھ نا کارہ علم کو جو ہر طرح چھوٹا اور کھوٹا ہے، آغاز کرنے کا موقع دیا، میں اس موقع پر آپ تمام حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں، خوش آمدید کہتا ہوں۔ اہلاً و سہلاً و مرحباً کہتا ہوں۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ میرا علم اور میری ہدایت جو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا ہوں، اس کی مثال موسلا دھار بارش کی ہے۔

”مثل ما بعثنی اللہ بہ من الہدی والعلم کمثل الغیث الکثیر... الخ“

(البخاری: کتاب العلم، باب فضل من علم وعلما)

تشبیہ اس اعتبار سے بھی ہے کہ بارش اوپر سے نازل ہوتی ہے، میں جو علم لایا ہوں اس کا تعلق بھی عالم بالا سے ہے، میں جو علم لایا ہوں وہ بھی بارش کی طرح شفاف ہے، لیکن یہ علم و ہدایت کی بارش قلوب انسانی پر ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسانی قلوب کی تین قسمیں ہیں، جس طرح زمین تین طرح کی ہوتی ہے: ایک حصہ زرخیز ہوتا ہے، وہ بارش کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، پانی پینے کے بعد وہ زمین اپنے خزانوں کو باہر اگلنے لگتی ہے۔ دوسرا حصہ نشیب کا ہوتا ہے، یہاں پانی جمع تو ہوتا ہے لیکن خود نہیں پیتا، جذب نہیں کرتا لیکن دوسرے لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیسرا قطعہ ارض وہ ہے جو نہ نرم ہے اور نہ نشیب ہے۔ نہ وہ پانی اپنے اندر جذب کرتا ہے اور نہ وہاں جمع ہوتا ہے کہ لوگ پانی پی سکیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے علم کی بارش جب قلوب پر ہوتی ہے تو اسی طرح ان کی بھی تین قسمیں ہیں: ایک وہ لوگ ہیں کہ حدیث جب سیکھتے ہیں تو اس کو اپنے سینہ میں اتار کر اس سے ان گنت مسائل و معارف دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو احادیث کو صرف محفوظ رکھتے ہیں اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، پہلی قسم سے مراد مجتہدین ہیں، دوسری قسم سے مراد حضرات محدثین اور اصحاب حدیث ہیں، تیسری قسم زمین کی طرح ہے، جو نہ سنتی ہے، نہ سمجھتی ہے اور نہ غور کرتی ہے۔ حضرات مجتہدین کا زمانہ گزرا، ان کے زمانہ میں جو نیا مسئلہ پیدا ہوا انہوں نے اس کا حل پیش کیا۔ ہر دور کے علماء کا فریضہ منصبی ہے کہ جب بھی کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو تو وہ اس کا حل امت کے سامنے پیش کریں۔

شہر بنگلور خصوصیت سے ٹیپو سلطان سے خصوصی تعلق رکھتا ہے۔ ایسے شہر میں ہم سب آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسلامی فقہ اکیڈمی کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ ہمیں اس قابل سمجھا گیا۔ میں تمام حضرات کی خدمت میں ارکان استقبالیہ کی طرف سے شکریہ پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆



## عرض داعی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم!

حضرت صدر محترم، باہر سے آئے ہوئے معزز مہمانان خصوصی ڈاکٹر محروس المدرس، مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، اکیڈمی کے دوسرے سرپرست حضرت امیر شریعت مولانا ابوالسعود صاحب، ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے حضرات علماء، فضلاء، ماہرین علوم جدیدہ، اور دین کا درد رکھنے والے، اور ہمارے عزیز طلبہ، استقبال کے ارکان، اس شہر کے ہمارے عزیز نوجوان، جو اس امت کے لئے مستقبل کا ایک بڑا سہارا ہیں، اس وقت میں اکیڈمی کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اور آپ سب کا تہ دل سے انتہائی شکر گزار بھی ہوں، قبل اس کے کہ آگے کی کارروائی جاری ہو، بحیثیت داعی میرا فرض ہے کہ میں چند باتوں کی وضاحت کر دوں، میں اس یقین کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اسلام کی علمی تاریخ میں جب بھی، جس عہد میں بھی جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، اور جو نیا چیلنج سامنے آیا ہے، چاہے وہ چیلنج کسی رخ پر ہو۔ ہمارے سلف نے اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہر اس چیلنج کا سامنا کیا ہے۔ اور ہر دور کے اٹھنے والے سوالات کا شافی جواب دیا ہے۔ علم اور قانون کی دنیا میں فقہ اسلامی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فقہ اسلامی اور خاص کر فقہ اسلامی کے جو مصادر SOURCE OF LAW ہیں، جو سرچشمہ قانون ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ اور کتاب و سنت کی روشنی میں ہر عہد میں مسائل پر فقہاء اور علماء کا اجماع، اور صحیح عقلی اصولوں کی روشنی میں کتاب و سنت سے نئے احکام کا استنباط کے اصول، اس کے مناج، اس کے قواعد، جس کو ہمارے فقہاء نے اصول شرع میں، قواعد میں، اشیاء و نظائر میں، اور حکمت اسلامی کے عنوان سے ہر دور میں جمع کر دیا ہے، کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قیاس اور اجماع، استحسان، استصلاح، سد ذرائع، قوانین شرعیہ کے اصول ہوں یا دوسرے اصول، متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ، ان تمام بنیادی سرچشموں اور اجتہاد کے طریقوں اور استنباط کے مناج کو اتنی تفصیل کے ساتھ مرتب کر دیا گیا ہے کہ قیامت تک آنے والے زمانے میں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوگا، اپنے وقت کا عالم جوان سرچشموں پر نگاہ رکھتا ہو، جو سلف کے اقوال سے آشنا ہو، جو ”ما أجمعوا علیہ و ما اختلفوا فیہ“ (اجماعی احکام اور مختلف فیہ احکام) سے واقف ہو، جو احکام کے مدارج سے واقف ہو، جو شریعت کی روح پر نگاہ رکھتا ہو، جو طرق استنباط پر نظر رکھتا ہو، شرع کے قواعد کو شاذ، اور نادر رائے کی روشنی میں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو، جو شواذ و نوادر کی تلاش میں نہیں بلکہ قواعد اور دین کے بنیادی اصول کے تحت دین کے تحفظ کا کام کرتا ہو، ورنہ کوئی باب ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نادر قول آپ کو نہ مل جائے۔ لیکن نوادر اور شواذ اقوال کبھی حجت نہیں رہے ہیں، پس موقعہ ہے اس بات کا کہ ہر عہد میں پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا جائے۔ ہمیں اس پر پورا اطمینان ہے، ورع و تقویٰ اور ہوی اور عقل سلیم کے درمیان فرق، اور دور نبوت سے اور نور نبوت سے کسب کرنے کی استعداد، ایک طرف مسائل کو علم کی روشنی میں یقین کے ساتھ حل کرنے کا عزم اور دوسری طرف اپنے اوپر اتنا بڑا جرم لادنے کا خطرہ۔ دونوں باتیں جب ساتھ ہوں گی تو کام بڑھے گا۔ شریعت اسلامی کی سب سے پہلی خاص بات یہ ہے کہ جزئیات کا نام شریعت نہیں، بلکہ اصول اور کلیات کا نام شریعت ہے، جزئیات ادوار کے مطابق بدلتی رہ سکتی ہیں، اصول اور کلیات ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اور جس قانون کی بنیاد اصول اور کلیات پر ہوگی وہ قانون کبھی مردہ نہیں ہو سکتا، اس کو ہمیشہ زندہ رہنا ہے، اس لئے کہ اصول و کلیات کی تطبیق ہر عہد میں کی جاسکتی ہے۔ جزئیات میں اپنے وقت، اپنے زمانے، اپنے شہر، اپنے خاندان، اپنے قبیلہ کی چھاپ ہو کرتی ہے۔ اصول وہ روح ہے جو ہر جگہ سرایت کرتا رہتا ہے۔ پچھلی پوری صدی میں سائنس، ٹیکنالوجی کی ترقی میں یورپ کی نئی تہذیب نے ہمارے بدلتے ہوئے حالات کو معاشرت میں آنے والی تبدیلیوں میں نہ جانے کتنے مسائل پیدا کئے ہیں، بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ علماء چپ چاپ بیٹھے رہے، جواب نہیں دیا۔ یہ اللہ کے وہ معصوم بندے ہیں جنہوں نے پڑھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی، اور بغیر پڑھے اپنی بات کہنے کی عادت پڑ گئی۔ ورنہ پچھلی صدی کے اندر ہندستان میں جو محقق علماء پیدا ہوئے، جو صاحب حکمت علماء پیدا ہوئے، دین کا عمیق علم رکھتے تھے، میں کم از کم حضرت تھانویؒ کا نام، حضرت عبدالحی فرنگی مہلیؒ کا نام، حضرت مفتی کفایت اللہ کا نام اور بہت سے بزرگوں کا نام گنوا سکتا ہوں۔ جنہوں نے اپنے وقت کے نازک مسئلوں کو حل کرنے میں کبھی ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا، لیکن لوگ جو چاہتے ہیں وہ انہوں نے

۱۔ بانی و سرپرست جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

نہیں کیا، شریعت جو چاہتی ہے وہ انہوں نے ضرور کیا، ہم ان کے وارثین ہیں۔ ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کے وارث کی حیثیت سے چاہے اس سمینار میں بیٹھیں یا افتاء کی مسند پر بیٹھیں یا قضا کی کرسی پر بیٹھیں یا کسی علم و تحقیق کی محفل میں بیٹھیں، ہمیں اتباع اہواء الناس نہیں کرنا ہے۔ ہمیں اتباع امر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرنا ہے۔ جب نبی کو صاف یہ کہہ دیا گیا کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس کتاب کی جگہ آپ دوسری کتاب لاکر دے دیں۔ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ بدل دیجئے اس قرآن کو، اور کوئی دوسرا قرآن لاکر دے دیجئے۔ کہہ دیا گیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ ”مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي إِنَّهُ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُؤْتِي إِلَيَّ“ (یونس ۱۵)۔ مجھے اس کا حق کہاں سے آگیا کہ میں اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کی شریعت، اس کی کتاب اور اس کے قانون کو بدل ڈالوں۔ اللہ کی طرف سے جو وحی آئی ہے میں تو اس کا پابند ہوں، اس کے خلاف میں نہیں کر سکتا۔ پس جو وارثان رسول ہیں، ایک طرف تو ان کو اپنے عہد کو پڑھنا ہوگا۔ اپنے زمانہ کے تقاضے کو جاننا ہوگا۔ اصول شریعت کی روشنی میں انسانوں کے مسائل، ان کی دشواریاں، معاشرے کی مشکلات، حرج اور ضرر کو دور کرنے کے سلسلہ میں محض ادہام کا شکار ہو کر امت کو دشواریوں میں نہیں ڈالنا ہوگا، اور دوسری طرف محض لوگوں کی خواہشات پر چل کر شریعت کو ترک نہیں کرنا ہوگا، یہی ہے سچ کا معتدل راستہ، جو ہم کو ہمارے بزرگوں سے ملا ہے، جو کتاب و سنت سے ملا ہے۔ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو اسی راستہ پر چلانا ہے۔ بہت عرصہ سے ہم لوگ فکر مند تھے، یہ ساری چیزیں دراصل مسلم پرسنل لاء کی تحریک کا اثر کہا جاسکتا ہے۔ ہم نے بھی پڑھا پڑھایا مدرسوں میں بیٹھ کر، لیکن پرسنل لاء کی تحریک کے سلسلہ میں ملک کے گوشے گوشے میں جانے، لوگوں اور ان کی دشواریاں اور جدید و قدیم طبقہ سے ملنے کا موقع ملا۔ ایک دوسرے کو ہم نے پہچانا، انہوں نے اپنی دشواریاں ہمیں بتائیں۔ تو اس کے نتیجہ میں بہت شدت سے احساس ہوا کہ جلد سے جلد کوئی ایسی اجتماعیت وجود میں آنی چاہئے، جو منظم طریقہ پر جدید مسائل پر غور کر کے فقہ اسلامی کی روشنی میں صحیح فیصلہ دے سکے، یا کم از کم صحیح سمت متعین کر سکے۔ ورنہ اگر علماء حق نے اپنا فریضہ ادا نہیں کیا تو جو آزاد و فکر ہے وہ ہے تو یورپی فکر کی غلام، لیکن یہاں آ کر اپنے کو بہت آزاد کہتی ہے، اس کی فکری آزادی امت کی اس کشتی کو ڈبو لے جائے گی، اور وہ امت کو غلط راستے پر لے جائے گی۔ اگر مسائل کا حل نہیں ہوگا تو لوگ غلط سلط سوچ کر غلط راستے پر لوگوں کو لے جائیں گے۔ میں بھی ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ اس عہد کے علماء کا فریضہ ہے کہ وہ آج کے اٹھنے والے سوالات کو حل کریں۔ یہ وہ بات تھی دوستو! جسے ہم نے اپنے بڑوں کے سامنے بھی رکھا تھا۔ بہر حال حیدرآباد میں چند بہت ہی ہم جیسے چھوٹے درجہ کے لوگ اکٹھا ہوئے، جب پرسنل لاء کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اور ہم نے ایک چھوٹی سی مجلس بنائی تھی مرکز الحجت العلمی کے نام سے، بڑا اضطراب تھا ہماری طبیعتوں میں کہ کچھ کرنا ہے۔ جو ایک نوجوانی کا جوش ہوتا ہے۔ بڑھتے بڑھتے کچھ قدم آگے بڑھے، پھر کچھ قدم پیچھے ہٹے۔ اس کے بعد بحث و نظر کا اجراء ہوا، اس رسالہ نے ملک میں مختلف مدارس، علماء اور اصحاب فکر اور دانشوروں میں پہنچ کر ایک نئی تحریک پیدا کی۔ پھر میں بہت شکر گزار ہوں اپنے بہت ہی عزیز دوست ڈاکٹر منظور عالم چیرمین انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اسٹڈیز کا کہ میں نے جوان کے سامنے بات رکھی تو انہوں نے بہت ہی تیزی کے ساتھ اور بلا کسی بوجھ کے مکمل تعاون کا وعدہ فرمایا، اور اس طرح پہلا فقہی سمینار ہوا، دوسرا فقہی سمینار ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ اب ملک کے کسی گوشہ میں یہ فقہی اور علمی جدوجہد جو ہو رہی ہے نامانوس نہیں رہی ہے۔ ہر جگہ لوگ اس کو جاننے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے کاموں میں کچھ باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ غیر مقلد ہوتا جا رہا ہے، اور کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ حقیقت کی اشاعت چاہ رہا ہے۔ جیسے دل ویسی ان کی فکر، اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو کر علم اور مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ آ کر بیٹھئے، ایک دوسرے کے آراء اور خیالات کو سمجھئے۔ اور کوئی بھی رائے کثرت رائے یا جبر کے ساتھ یا مجریٹی کے ساتھ نہیں ہوگی۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجئے، پوری دیانت داری کے ساتھ۔ فتویٰ کا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں کی جاسکتی ہے، موقعہ اس کا موجود ہے کہ آپ کے ساتھ، آپ کے عہد کے مختلف علوم کے جاننے والے فضلاء اور دانشور بھی یہاں موجود ہوں۔ یہ خلیج بہر حال پٹی چاہئے، اور امت کے درمیان مسکوں میں فرق اور امت کے درمیان مختلف صلاحیتوں کا اپنے کو اپنے خول میں بند رکھنا، یہ اتنا عظیم فتنہ ہے کہ اگر ہم اس پر قابو نہیں پاسکے تو اس امت کو ہم ترقی کی اس راہ پر نہیں لے جاسکتے جو اس کا حق ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ میں سے ہر شخص، ہمارے یونیورسٹی کے دانشور، مختلف علوم کے ماہرین بیٹھیں علماء کے سامنے، شریعت کے احکام اور اس کے مصادر سے براہ راست استفادہ کریں۔ آج جو سائنس اور ٹکنالوجی میں جدید ترقیاں ہوئی ہیں، نئے مسائل آئے ہیں، نئے نظریات آئے ہیں۔ ان میں ہم اپنے عزیز دوستوں سے جنہوں نے یونیورسٹی میں پڑھ کر اس فن میں کمال حاصل کیا ہے، ہم علماء ان سے براہ راست استفادہ کریں، اور آپس میں مسالک کے فرق کو بھول کر شریعت کے عام اصولوں کو سامنے رکھ کر ایک ساتھ جمع ہو کر مسائل کو سوچنے کی کوشش کریں۔

گروہ بندی اور تفریق اسلام میں لعنت ہے، دوستو! کچھ بھی یہ موجب رحمت نہیں ہو سکتا، ہندوستان میں اگر اس امت کا تحفظ کرنا ہے تو ہر محاذ پر آپ کو کلمہ کی بنیاد پر اکٹھا ہونا پڑے گا۔

☆☆☆



## خطبہ افتتاحیہ

مولانا ابوالسعود احمد علی

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ساری تعریفیں اس وحدہ لا شریک کے لئے ہیں جو ہر دور میں عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھیجتا رہا اور سلسلہ ختم ہوا خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور فرمایا: ”مَا كَانَتْ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ“ (احزاب، ۴۰) کہ آپ ہادی عالم ہیں، عربی ہو یا عجمی مشرقی ہو یا مغربی ہر جگہ اور ہر خطے والے کے لئے آپ ہی رہبر مطلق ہیں، اور فرمایا: ”الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“ (مائدہ، ۳) کہ جو ”الکتاب لا ریب فیہ“ آپ لائے ہیں وہی ضابطہ حیات ہے ساری انسانیت کے لئے، پتھر کے زمانے والوں کے لئے بھی اور آج کے اس دور کے لئے بھی جو کمپیوٹر لیزر اور آٹم والا زمانہ کہلاتا ہے، بلکہ قیامت تک نہ جانے اور کیسے کیسے حالات آئیں گے۔ غرض ہر زمانے کے لئے یہی ”الکتاب“ واحد راستہ ہے جس پر چل کر آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے، کہ جو بھی، جہاں کہیں بھی ہو، جس زمانے میں بھی ہو جب تک اس ”الکتاب“ اور اس کے لانے والے صلی اللہ علیہ وسلم کو تھامے رہے گا کامیاب رہے گا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قرآن مجید کو سمجھانے کے لئے آئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ”وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي كُرِّرْتُم بِهِ لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ يَلْمِئُونَكَ بِمَا لَهُمْ يَدٌ عَلَيْهَا لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ اللَّهِ عَذَابٌ أَلِيمٌ“ (نحل، ۴۴)۔

چوں کہ قرآن مجید اصول و کلیات بیان کرتا ہے، لہذا فروع و جزئیات کی تفصیل سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ”تبیین“ ہی سے ہو سکتی تھی جس کو ”سنت“ اور ”حدیث“ کہتے ہیں: ”السنة تطلق على قول الرسول و فعله أو سكوته و على أقوال الصحابة و أفعالهم“، یہی سنت شریعت اسلام کا دوسرا ماخذ ہے جو پہلے ماخذ ”الکتاب“ سے جدا نہیں ہے، جس کی عظمت کی دلیل کلام پاک کی آیت ہے: ”مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا“ (حشر، ۷)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، غصہ کی حالت میں بہت سی باتیں فرمادیتے ہوں گے، اس لئے حدیث (سنت) نہ لکھا کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قریش کے کہنے سے میں نے لکھنا بند کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا: تم لکھا کرو، اور اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے (میری زبان سے) حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلتی (ابوداؤد: کتاب العلم)۔

اسی بات کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے:

”وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ (نجم، ۳)۔

غرض یہ کتاب اور ”إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ“ وہ اساس ہیں جن پر دین اور شریعت مطہرہ قائم ہیں۔ اور رہتی دنیا تک قائم رہیں گے کہ جو کچھ پانا ہے انہی دونوں سے پانا ہے۔

لیکن یہ دونوں تورات کی طرح ”تَبْيَانًا لِّلْكُلِّ شَيْءٍ“ نہیں ہیں ورنہ ان کی سینوں میں حفاظت بلکہ ہاتھوں میں اٹھانا مشکل ہو جاتا۔

چوں کہ جزئیات لامتناہی ہوتے ہیں بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے حکم دے دیا گیا کہ قرآن و سنت کو ہی اصل سمجھو اور مانو اور جو کچھ پاؤ انہی سے پاؤ۔



اور امت مسلمہ کی رہنمائی کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت تیار کی گئی کہ دیکھو زمانے والو، بدلتی دنیا والو، نا سمجھو اور سمجھ والو، ان کو پڑھو اور دیکھو کہ وہ کس طرح ڈھونڈتے ہیں نکالتے ہیں اور انہی ”الکتاب“ اور ”السنة“ سے پاتے ہیں جو کچھ کہ پانا ہے۔ اور حکم دے دیا گیا: ”فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ“ (حشر ۲) (کہ اسے سمجھ والو سمجھو، اپنی عقل کو استعمال کرو)۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک کلمہ گو کو جو نبی کے فیصلے سے غیر مطمئن تھا قتل کر دیا۔ آیت نازل ہوئی:

”فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ“ (نساء ۶۵)۔

کہ عمر فاروق کا اعتبار معتبر ہے، ہمیں منظور ہے۔ اور اس رضی اللہ عنہم اجمعین والی جماعت کو اعتبار جسے فقہاء قیاس کہتے ہیں، سکھانے کے لئے خاتم النبیین سے کہا گیا ہے: ”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“۔ (اس جماعت کی رائے لیا کیجئے)۔ تاکہ وہ آئندہ فاقد الزوج اور اس جیسے ہزاروں لاکھوں مسائل کا حل تلاش کریں اور نکالیں، اسی لئے کہا گیا: ”القياس مظهر لا مثبت“۔

اور قدرت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے مواقع فراہم کئے تاکہ آنے والی امت کو نمونہ ملے، انتظام کیا گیا ہے، ضرورتیں مہیا کی گئیں، کہ ایسا ہی ہونا تھا اور قدرت کو بھی یہی منظور تھا۔

ورنہ ”حفاة عراة يتطاولون في البنيان“، ”كاسيات عاريات“ اور ”لا يبقى فيه بيت مدر“، جیسی پیشین گوئی کرنے والا آقا اگر قیامت تک آنے والے سارے مسائل کے حل پیش کر دیتے تو ”الراسخون في العلم“ اور کائنات بنی اسرائیل والی جماعت کیسے وجود میں آتی، اور ان کا کام ہی کیا رہ جاتا، ”خیر امة“ کیسے کہلاتی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“ (نحل ۴۳)۔ اہل ذکر کا وجود نہ ہوتا تو ”لا تعلمون“ کس سے سوال کرتے۔

ایک جگہ ارشاد باری ہے: ”لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ“ (ملک ۱۰)۔

صرف ”نسمع“ رہ جاتے ”نعقل“ والی جماعت کہاں پائی جاتی؟ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: ”فليبلغ الشاهد الغائب۔ فرب حامل فقه إلى من هو أفقه منه“ (دارمی، ابن ماجہ)۔

افقہ کیسے دنیا میں آتے اور کیوں آتے؟ الغرض سکھایا گیا کہ بوجھو پوچھو، سوچ کر پوچھو، بے ضرورت مت پوچھو: ”لا تسئلوا عن أشياء“ کیا ہے، کس سے بنا ہے؟ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، جو تمہارے لئے ضروری ہے حالات جیسے جیسے پیش آتے رہیں اس کے مطابق تحقیق کرو، تلاش کرو کہ تم ہی نمونہ ہو، تم ہی النجوم ہو۔

حضرت معاذ بن جبلؓ میں عہدہ قضا سنبھالنے کے لئے روانہ ہونے سے پہلے دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو سرکارِ دو عالم ﷺ نے دریافت فرمایا: معاذ فیصلہ کس طرح کرو گے؟ عرض کیا: کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ پھر ارشاد ہوا: اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے؟ جواب دیا: تو پھر ”سنت الرسول“ سے فیصلہ کروں گا۔ پھر ارشاد ہوا: سنت میں بھی اگر وہ فیصلہ نہ ملے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا: تو پھر اجتہاد کروں گا، یعنی قیاس سے فیصلہ کروں گا۔ حضرت معاذؓ کے اس جواب پر دربار رسالت سے شاباشی ملی، ارشاد ہوا:

”الحمد لله الذي وفق رسول الله لما يرضى رسول الله“ (ابوداؤد: کتاب الأفضية؛ باب اجتہاد الرأي في القضاء)۔

وارث نے وارث ہونے کا حق ادا کر دیا۔ پھر نئے نئے حالات پیش آتے رہے۔ اور صحابہ کرامؓ وراثت نبوت کو استعمال کرتے رہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا موقع آیا تو صحابہ کرام نے قیاس کیا کہ ”رضیہ الرسول لدیننا أفلا رضاه لدنيانا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِنِّي سَيِّئِلٌ مِّنْ أَنَابِ إِلَيَّ“ (لقمان ۱۵)۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: ”عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين“ (ابوداؤد: کتاب السنن؛ باب لزوم السنة)۔

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

”أقول فيها برأبي فإن كان صواباً فمن الله وإن كان خطأ فمني ومن الشيطان“ (دارمی: کتاب الفرائض؛ باب الكلاله)۔

خليفة دوم حضرت عمر بن الخطاب فرماتے ہیں: ”أقضي فيه برأبي، ذكر سفیان بن عیینة عن عبيد الله بن يزيد قال: سمعت ابن عباس رضي الله عنه إذا سئل عن شيء فإن كان في كتاب الله قال به، وإن لم يكن في كتاب الله وكان عند رسول الله ﷺ قال به، فإن لم يكن في كتاب الله ولا عن رسول الله ﷺ ولا عن أبي بكر و عمر اجتهد“ (سنن دارمی، ۵۵، ۱، قدرے تغیر کے ساتھ)۔

بہر حال اس قسم کے حالات خیر القرون میں ہوئے۔ جو آئندہ والوں کے لئے رہنمائی کرتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی ابدی ہدایت سے قیامت تک استفادہ کرنے کی راہ قیاس و اجتہاد ہے، جس کے حقدار الراسخون فی العلم اور ورثة الانبياء ہیں۔

اکابرین امت! ہم بڑی مسرت کے ساتھ آپ کا یہ کہتے ہوئے استقبال کرتے ہیں:

کس قدر شاد ہیں سب خورد و کلاں پیر و جوان  
 ہر طرف عید کا منظر ہے مسرت کا سماں  
 خیر مقدم کو ہے ٹیپو کی زمیں وجد کناں  
 مرجبا کہتی ہے مہمانوں سے ہر ایک زباں  
 آج بنگلور میں وہ شمس و قمر آئے ہیں  
 پیشوایان حرم بن کے خضر آئے ہیں

آپ حضرات اسی احساس کو لے کر یہاں جمع ہوئے ہیں کہ امت پر جو نئے نئے حالات آرہے ہیں ان کا حل قرآن و سنت اور آثار صحابہؓ میں تلاش کریں، آپ کا جمع ہونا مبارک کہ آپ ہی کے سلسلے میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

”فَلَوْ لَا نَفَرْنَا مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَيَفْتَقَهُوا فِي الدِّينِ“ (توبہ، ۱۲۲)۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: ”من يرد الله به خيراً يفقهه في الدين“ (بخاری: کتاب العلم؛ باب من يرد الله به خيراً۔۔۔)۔

آپ جیسی ایک جماعت ہونی ہی چاہئے جیسا کہ ہر دور میں اس کی ضرورت محسوس کی گئی، امام اعظم فرماتے ہیں:

”يا معشر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصيادلة (جامع بيان العلم)۔“

”خیر القرون“ میں خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ نے ایسی ہی مجلس مرتب فرمائی جس میں خود خلیفہ دوم حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جمع تھے، بعد میں ایک دوسری مجلس قائم ہوئی جس میں حضرت علی، ابی بن کعب رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تھے، ثم الذین یلوونہم میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے لائق ترین شاگردوں کی ایک جماعت ایسی تیار فرمائی جن کے سامنے پیش آمدہ نیز امکانی مسائل پیش ہوتے اور ان پر کھلی بحث ہوتی، ہر وارث نبی اپنے نکتہ نظر کو دلائل کے ساتھ پیش کرتا اور امام صاحبؒ کے زیر سرپرستی مسائل حل ہوتے۔

شام و بحر یہی ان کا مشغلہ تھا، پیچیدہ مسائل ہوتے تو نعرے بکسیر بلند ہوتے۔ انہی کے لئے آقائے دو عالم ﷺ کی ید اللہ علی الجملة والی بشارت ہے۔ ایک موقع پر ارشاد ہوا: ”إن الله لا يجمع أمتي على ضلالة“ (ترمذی: کتاب الفتن؛ باب ما جاء في لزوم الجملة) اور کہیں ”عليكم بالسواد الاعظم“ فرمایا گیا۔

اللہ کرے یہ سلسلہ چلے جب تک سورج چلے اور سارے عالم کو اس کا نفع پہنچتا رہے۔ آمین، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔

## خطابات

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے تیسرا فقہی سمینار شروع ہو رہا ہے، بڑی مسرت ہے کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم اس اجلاس کی صدارت فرمائیں گے۔ حضرت کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ مجھ میں جرأت ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ کہہ سکوں، اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ بزرگوں کی سرپرستی کی بھرپور دولت کا خزانہ ہمیں نصیب ہے، اللہ تعالیٰ دیر تک ان کو سلامت رکھے۔

جب یہ طے کیا گیا کہ تیسرا فقہی سمینار بنگلور میں منعقد ہو تو کام کی زیادتی اور عظیم ذمہ داری ہونے کی وجہ سے لوگوں میں فکر اور تشویش تھی، ہم سب نے متفقہ طور پر حضرت مفتی اشرف علی صاحب کو کنوینر منتخب کیا۔ ہم درمیان میں بنگلور آئے تو دیکھا کہ بنگلور کے نوجوان حضرت امیر شریعت کرناٹک مدظلہ کی سرپرستی میں کاموں کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ بہر حال ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب

عزت مآب حضرات علمائے کرام، بزرگان محترم اور معزز حاضرین! مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کے لئے یہ عظیم سعادت ہے کہ اس فاضل اجتماع میں حاضری کا موقع ملا۔ آج کے اس اجلاس میں، افتتاحی اجلاس میں میرے کسی خطاب کا پہلے سے کوئی پروگرام تو نہیں تھا، لیکن بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل کے طور پر چند کلمات عرض کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، فقہی اکیڈمی کی طرف سے ماشاء اللہ یہ تیسرا سمینار ہے جو امت کو درپیش جدید ترین، انتہائی پیچیدہ اور نازک مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے منعقد ہوا ہے، پچھلے سمینار میں جو فقہ اکیڈمی کا دوسرا سمینار تھا، اور دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں بھی مجھے حاضری کا موقع ملا تھا، یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فقہ اکیڈمی کی طرف سے اجتماعی غورو فکر اور مسائل کی جستجو اور تلاش کا جو راستہ یہاں ہندوستان میں اختیار کیا گیا وہ ہم اہل پاکستان کے لئے قابل رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی، میں آپ سے عرض کروں کہ اس قسم کی مجلس جس میں ملک بھر کے جید علماء اور فقہاء اور اہل فتویٰ جمع ہوں اور اختلاف مکاتب فکر سے بالا ہو کر محض تحقیق کے لئے اور شرعی مسائل کو شرعی حدود اور ان کے مطابق حل کرنے کے لئے ایک ایسی علمی مجلس کی شدت سے ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ میرے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے اور ان کے دیگر جلیل القدر رفقاء نے ساہا سال کی بھرپور کوشش کی کہ پاکستان کی اس نئی مملکت اسلامی کو قرآن و سنت کے راستہ رواں دواں کرنے کے لئے فرقہ واریت اور مسالک کا اختلاف کہیں سد راہ نہ بن جائے، اس کے لئے انہوں نے یہ کوشش کی اور اس حد تک وہ کامیاب ہوئے کہ جب تک یہ بزرگ بقید حیات رہے، الحمد للہ پاکستان میں مسالک کا اختلاف علمی حلقوں تک ہی رہا، عوامی سطح تک نہیں آیا۔ میرے والد ماجد کی برسوں کی یہ کوشش رہی کہ پاکستان میں کوئی ایسی مرکزی مجلس علماء قائم ہو جائے جو امت کو درپیش جدید ترین مسائل کا حل کرنے کے لئے اور تمام مسالک کے اختلاف سے بالاتر ہو کر محض اللہ کی رضا مندی کے لئے کام کرے، لیکن افسوس ہے کہ اس میں وہ اس حد تک کامیاب نہ ہو سکے کہ تمام مکاتب فکر کے علماء پر مشتمل کوئی علمی مجلس قائم ہو جائے، البتہ انہوں نے اور علامہ یوسف بنوری نے مل کر ایک مجلس ”مجلس تحقیق مسائل حاضرہ“ کے نام سے قائم فرمایا تھا، اور اسی مجلس میں متعدد جدید مسائل میں تحقیق کی تھی، اور ان کے نتائج تحقیق شائع بھی ہوئے، بزرگوں کا یہ طبقہ ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہوا۔ اب مجھ جیسے کم عمر اور کم تجربہ کار لوگوں کا دور ہے، افسوس ہے کہ ہم پاکستان میں ایسی کوئی مجلس قائم نہیں کر سکے، یہ طرہ امتیاز مسلمانان ہند کا ہے اور یہاں کے اکابر علمائے کرام کی کاوشوں کا مبارک نتیجہ ہے کہ یہ ایک ایسی سطح قائم ہو گئی ہے، ایک ایسا مرکز قائم ہو گیا



ہے کہ جہاں محض تحقیق مسائل کے لئے ہر مکتبہ فکر کے علمائے کرام اور جید علمائے کرام کا اجتماع ہوتا ہے، خاص کر محترم دوست، قاضی شریعت، کرم فرما حضرت مولانا مجاہد الاسلام کی روز و شب جدوجہد کا یہ ایک خوشگوار نتیجہ ہمارے سامنے ہے، ایک باوقار تیسرا سمینار یہاں منعقد ہو رہا ہے، اس سمینار کی اور فقہ اکیڈمی کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم، اور حضرت مولانا ابوالسعود صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ اس کام کو زیادہ سے زیادہ بار آور فرمائے اور اس کام میں جو حضرات علماء عملی حصہ لے رہے ہیں غیب سے ان کی نصرت فرمائے ان کو سداد اور اعتدال کی توفیق عطا فرمائے۔

آج افراط اور تفریط کا دور ہے، کچھ لوگ تقلید جامد ہی کو سرمایہ نجات سمجھتے ہیں کہ کچھ بھی دنیا میں ہوتا رہے، مسلمانوں پر کچھ بھی بیت جائے، مسلمان مرتد ہونے لگیں، العیاذ باللہ، اور بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہونے لگیں، دین سے مایوس ہونے لگیں، تب بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہیں ریگتی اور تقلید جامد پر وہ جمے رہتے ہیں، ایسے افراد بھی ہیں۔ اور ایک طبقہ ان آزاد منش محققین کا ہے جو بزرگان دین اور سلف صالحین کی تحقیقوں سے بے نیاز ہو کر اور شریعت کے بہت سے مسلمات کو نظر انداز کر کے اپنا اجتہاد مسلط کرنا چاہتے ہیں، ایک عام خیال جو عام لوگوں میں اچھا خاصا پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اجتہاد اس بات کا نام ہے کہ اپنے اس زمانہ کے علماء محض اپنی عقل سے جو کچھ ان کی سمجھ میں آئے لوگوں کی مرضی کے مطابق کچھ مسئلہ نکال کر داد تحسین حاصل کریں، اجتہاد اس کا نام نہیں ہے، اجتہاد نئے مسائل بنانے کا نام نہیں ہے۔ میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ مفتی مسئلہ بنانا نہیں ہے بلکہ بتانا ہے۔ مجتہد کا کام بھی مسئلہ بنانا نہیں ہے مسئلہ بتانا ہے۔ مجتہد کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ شریعت کے جو چار مصادر ہیں، کتاب اللہ، سنت نبویہ، اجماع امت اور قیاس۔ ان چاروں دلائل میں شریعت کے متعین کردہ اصول و حدود میں رہتے ہوئے غور و فکر کر کے اللہ کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے؟ اور اس کے معلوم کرنے میں اگر اتفاق ہو جاتا ہے کسی زمانہ کے علماء کا تو وہی اجماع کہلاتا ہے، اور اتفاق نہ ہو، ایک مجتہد کا بھی اختلاف ہو جائے تو پھر وہ اجماع نہیں رہتا، وہ مسئلہ مختلف فیہ ہو جاتا ہے، اس زمانہ میں ایک اور افتاد بھی آئی ہے کہ چونکہ لوگوں کو حقیقت اختلاف علماء معلوم نہیں وہ محض اختلاف رائے کو ہی برا سمجھتے ہیں، حالانکہ میرے والد ماجد فرماتے تھے کہ جہاں عقل مند اور دیانت دار لوگوں کا اجتماع ہو گا کسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے وہاں اکثر و بیشتر اختلاف ضرور رونما ہوگا۔

شیخ محمد محروس المدرس بغداد

بعد حمد و صلاة!

حاضرین کرام، سماجہ العلماءہ الشیخ المجاہد ابوالحسن علی الندوی، علماء عظام اور ہندوستان کے مومن بھائیو! میری طرف سے اور اس شہر بغداد کے بھائیوں کی طرف سے بھی ہدیہ سلام قبول کیجئے، جو سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ النعمان الکوئی کا مسکن، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کا مرقد، علماء و فقہاء مجتہدین، اقطاب و صوفیاء کا مولد ہے۔

حضرات! جو کچھ میں نے یہاں دیکھا اس سے بے حد مسرت ہوئی، میرے کان ان چیزوں سے آشنا تھے، اسی لئے آنکھ دیکھنے کو ترس رہی تھی، اس دیرینہ خواہش کی تکمیل سے دل باغ باغ ہے، مجھے اس مبارک سمینار میں بھی حاضری کا بہت شوق تھا، لیکن اس کی ذمہ داری اور بارگراں سے میں بوجھل تھا، میں نے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے رات دن ایک کر دیا تا کہ آپ کے سامنے اس وقت اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکوں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اپنے محبوب بھائیوں، کھلتے ہوئے چہروں اور آبادیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، امام شافعی نے سچ فرمایا ہے:

سفر کرو، جن سے جدا ہو رہے ہو ان کا بدل پالو گے، تکلیف اٹھایا کرو، اس لئے کہ زندگی کی لذت تکلیف اٹھانے میں ہے، میں دیکھتا ہوں کہ پانی اگر رک جائے تو خراب ہو جاتا ہے، اگر بے ہو تو خشکوار رہتا ہے، نہ بے ہو تو بے لذت ہو جاتا ہے، شیر اگر جنگل سے جدا نہ ہو تو شکار نہیں کرے گا، تیرا اگر کمان سے نہ نکلے تو نشانہ پر نہیں پہنچے گا، سونا اپنی کان میں مٹی کی طرح ہے، چندن اپنے جنگل میں ایک لکڑی کی طرح ہے۔

بخدا مجھے آپ کی ملاقات سے بڑی سرخروئی اور کامیابی حاصل ہوئی ہے، میں اپنا معمولی سودا آپ کے سامنے کیا رکھوں، میں تو ایک معمولی طالب علم ہوں، استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں، ملک ہندوستان تو بڑے بڑے علماء، بلند پایہ شخصیات، محققین، مصنفین، اور مورخین کا ملک ہے، یہ خصوصیات تو ابھی بھی میں پارہا ہوں، جو خود علم و تحقیق کی دنیا میں سیرابی کا کام کر رہے ہوں انہیں کیا سیراب کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ میرے عزیز بھائی شیخ قاضی مجاہد الاسلام کو مجھ سے بہت زیادہ حسن ظن ہے، انہوں نے مجھے بڑے بڑے علماء کے سامنے پیش کر دیا ہے، حالانکہ میں اس مقام کا اہل نہیں، لہذا اللہ جل جلالہ سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری زبان پر مفید باتیں جاری کر دے۔

حضرات! اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں ارشاد فرمایا ہے: ”وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً. فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ“ (توبہ ۱۲۲)۔

(تمام مسلمانوں کو یہ نہیں چاہئے کہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل پڑیں، بلکہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتے ہیں کہ ان میں سے بڑی جماعت میں کچھ لوگ رک جایا کریں تاکہ دین میں تفقہ اور گہرائی حاصل کریں، اور جب اپنی قوم میں لوٹیں تو انہیں اللہ کی گرفت سے ڈرائیں، امید کہ لوگ ڈرجائیں)۔

یہ وہ آیت ہے جو بتاتی ہے کہ علم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے، یہی وہ فریضہ تھا، جس کی ادائیگی کے لئے وقت کے علماء اٹھے اور انہوں نے اس فریضہ اور ذمہ داری کو ہر دور میں پوری طرح سے انجام دیا، یہی وہ جذبہ اور فریضہ تھا جس کی وجہ سے الحمد للہ آپ کے ملک ہندوستان میں بے شمار اللہ کے بندے اٹھے اور انہوں نے علوم شریعت کو حاصل کیا، خاص طور پر علم فقہ پر پوری توجہ فرمائی، اور زمانہ اور حالات، اور لوگوں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا، شریعت اسلامی کے آنے کا منشاء بھی یہی ہے کہ حالات اور ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ مسائل کو شریعت اسلامی کی روشنی میں حل کیا جائے اور اس کی صحیح تطبیق دی جائے، مسائل پر شریعت کی صحیح تطبیق اور مشکلات کا حل اسی وقت ہو سکے گا جبکہ لوگوں کی ضروریات اور معاشرے کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے، ابتدائے اسلام سے ایسا ہی ہوا ہے، قرآن کے نزول اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی ایسا ہوا ہے۔

محترم حضرات! اس وقت ایک حقیقت بلکہ عظیم حکمت کو تازہ کر لیا جائے کہ بہت سے احکام ہیں جو ہم سے پوشیدہ ہیں، ان احکام کے پوشیدہ ہونے میں وجہ یہ نہیں ہے کہ شریعت اسلامی میں کوئی نقص اور کمی ہے، حاشا للہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ شریعت اسلامی اور دین محمدی میں کوئی کمی اور نقص ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرما دیا ہے کہ دین اسلام ایک مکمل دین ہے، ارشاد باری ہے: ”الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“ (مائدہ ۳) (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے، اور میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کر دی، میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا ہے) لیکن یاد رکھیے! قرآن اتنا ہی ہے جو مصحف میں موجود ہے اس کے حروف و کلمات متعین ہیں، اور ہمیشہ اتنے ہی رہیں گے لیکن واقعات و حوادث غیر محدود ہیں، جس کا لامتناہی سلسلہ جاری ہی رہے گا، روزانہ ایسے نئے نئے مسائل، حوادث و واقعات پیش آتے ہیں جو ہمارے فقہاء کرام کے خیال میں نہ آیا ہوگا، قرآن و احادیث کا محدود و متعین ہونا اور واقعات کا لامحدود اور غیر متناہی ہونا، یہ وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے اجتہاد جائز قرار دیا گیا۔

چنانچہ بہت سے لوگوں نے یہ کہا بھی ہے کہ جو چیزیں محدود ہوں وہ غیر محدود کو منضبط نہیں کر سکتی ہیں، آج روز بروز واقعات و حوادث آرہے ہیں، نئی نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں، جس نے بڑی مشکلات پیدا کر دیئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم سب ایک جگہ جمع ہوئے، جس کی سابقہ زمانہ میں ضرورت بھی نہیں تھی، گویا ہم نے ایک نیا طرز پایا ہے جو پہلے معروف و مشہور نہیں تھا، آجکل کی کانفرنسیں اور سمینار جو بڑی تعداد میں ہمیں آپ کے ملک، مسلم اور غیر مسلم ممالک میں نظر آتے ہیں، خدا کرے اگر تمام مسائل و واقعات جو ان دنوں درپیش ہیں ان کا احاطہ کر لے اور ان کا حل تلاش کر لے تو یہ بہت ہی خوشگوار اور مبارک کام ہو جائے گا، اور یہ اللہ کی ذات اور اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے، لیکن اس میں ہمارے لئے بڑی محنت و مشقت اور غیر معمولی جدوجہد درکار ہے، مسئلہ کے ہر جز کو ہر ہر مکلف پر منطبق کرنا ایک ایسا طویل کام اور ایسا عظیم سرمایہ ہے کہ بے شمار ضخیم جلدوں کی ضرورت ہو جائے گی اور اس کی فہرست بھی اتنی ہی طویل ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے اجتہاد جائز ہے، اور بعض احکام جو ہم سے پوشیدہ ہیں یہ عین حکمت کا تقاضا ہے، بعض لوگ ہم پر یہ اعتراض کرتے ہیں، اور الزام لگا رہے ہیں کہ



بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو قرآن میں اور تمہارے دین میں ہم نہیں پاتے دراصل یہ دشمنان اسلام کی باتیں ہیں، بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بعض جاہل اور ان پڑھ مسلمان بھی اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں اور وہی کہنے لگتے ہیں جو معاندین اور دشمنان اسلام اعتراض اور الزام کے طور پر کہتے ہیں، ہم ان سے یہ صاف کہنا دینا چاہتے ہیں کہ بعض احکام کا پوشیدہ ہونا نعوذ باللہ یہ دین اسلام کی کمی نہیں، بلکہ عین حکمت کا تقاضہ ہے، یہ کوئی بھول چوک اور کوئی غفلت نہیں ہے، العیاذ باللہ ایسا ہو بھی نہیں سکتا ہے، مثال کے طور پر غور کر لیجئے کہ لیلۃ القدر کی تعیین ہم سے پوشیدہ ہے، کیا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ تیس، یا پچیس، یا ستائیس کو ہے، لیکن اس میں ہمارے لئے بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں مضمحل ہیں، کہ ہم آخری عشرہ میں اس کی جستجو کرتے رہیں تو اس طرح ہمارے اعمال کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔ اسی طرح دوسری مثال پر غور کر لیجئے! قمری مہینے کا ابتدائی حصہ کا پوشیدہ ہونا، یہ بھی حکمت پر مبنی ہے، ورنہ شمسی مہینے کا اعتبار کر لیا جاتا، اور ایک ایک منٹ و سکند کا حساب رہتا جیسا کہ دو ہزار سال سے لے کر اب تک ہو رہا ہے، لیکن اسلام نے اس طریقہ کو چھوڑ دیا ہے، اور ایک ایسا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے جس میں مسلمانوں پر ہر مہینے میں بڑی دقتیں پیش آتی رہتی ہیں، ایک دوسرے سے اس کی تحقیق کرتے ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی ہوتی رہتی ہے، اور انہیں اس وقت تک اطمینان و سکون نہیں ملتا جب تک کہ چاند کے اگنے کی خبر اور اس کا ثبوت نہ مل جائے، اور اہتمام کرنے والے ہر مہینہ میں اس طرح اہتمام کرتے رہتے ہیں، اس میں بھی حکمت ہے، جیسا کہ شب قدر میں ہے، کسی شاعر نے کہا ہے:

لیس الخفا بعار علی امر ذی جلال      فلیلة القدر تخفی وهو خیر الیالی

(کسی اہم کام اور معاملہ کی وجہ سے کسی چیز کا پوشیدہ رہنا کوئی عیب اور شرمندگی کی بات نہیں کیونکہ شب قدر پوشیدہ ہوا کرتی ہے، جب کہ وہ سب سے بہتر بات ہو کرتی ہے)۔

لہذا یاد رکھئے! کسی چیز کا صیغہ راز میں رکھنا اور اس کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا نہ کوئی توہین ہے اور نہ کمی، نہ عیب ہے نہ غفلت، اور نہ ہی کوئی اور نقص کی بات ہے، ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو مراد اور منشاء ہو ہماری ذمہ داری ہے کہ اسی کے مطابق احکام کو تلاش کریں اور شریعت و فقہ کے درمیان فرق کریں، فقہاء کی رائے کو اللہ کی شریعت کی طرف منسوب نہ کریں، اس لئے کہ اصولیوں کے نزدیک حکم شرعی اللہ کا خطاب ہے اور آراء کے متعدد ہونے کی جو حکمتیں ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ہم اخذ و استنباط اور تقلید میں عام انداز سے کسی خاص فقہی کتب کی روشنی میں تغیر و تبدل کریں کیوں کہ ہم لوگ کوئی مجتہد نہیں، اس لئے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس فقہ و مجتہد کی طرف رجوع کریں جن پر اجماع ہو چکا ہے، اور وہ ایسے عادل اور معتمد حضرات میں سے ہیں جن کا اجتہاد قوی اور صحیح ترین ہوا کرتا ہے، اور غلطیوں کا امکان کم رہتا ہے، اور جن سے امت کو حسن ظن بھی ہے، لہذا اس طرح سے آراء میں تعدد ہو جایا کرتا ہے جو شارع کے منشاء کے مطابق ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جو مسائل و احکام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے صحیح اور درست ہوں گے وہ ممکن ہے کہ عرب کے لوگوں کے لئے درست نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کوفہ کے عرف و عادت کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے جس میں مکلفین کے حالات کی رعایت کی جاتی تھی، اور یہ رعایت شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق ہوا کرتی تھی جو ضرورت مندوں کے حالات کے پیش نظر ہوا کرتی تھی، زمانہ کے مطابق تبدیلی انہی امور میں ہو سکتی ہے جو قطعاً نہ ہوا اور جن پر امت کا اجماع بھی نہ ہوا ہو، کیونکہ جن چیزوں میں اجماع ہو جاتا ہے اگر وہ ظنی ہوں، قطعاً بن جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء اور مفتیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجماع اور اختلاف کے اسباب اور وجوہات سے پوری طرح سے باخبر ہوں۔

یہ فقہی سمینار جو مسلمانوں کے شہروں اور ملکوں میں آج کل منعقد ہو رہے ہیں بہت ہی خیر و برکت کا ذریعہ ہیں، جو امت کے حق میں بہت ہی نافع ہیں، مسلم ممالک وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوتا جا رہا ہے، ان کی ضرورتیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں، اور ایک دوسرے سے ربط و تعلق، اور ملاقات بہت سے امور کے حل کرنے میں کار گزار بھی ہوتی ہے، کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اجماع ممکن ہے، ہماری حقیر رائے ہے کہ ایسا ممکن نہیں، اس لئے کہ اجماع تو ایسے علم پر مبنی ہے جس میں مخالفت نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ مخالفت کا علم ہی نہ ہو۔



## خطبہ صدارت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ: مولانا نور الحق رحمانی

میرے لئے بڑی خوشی و مسرت کی بات ہے کہ اسلامی علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھنے والے علماء اور اصحاب تحقیق نے عصر حاضر کے فقہی و اجتہادی مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کر دی ہے، آج کا یہ اجلاس اس کی کھلی دلیل ہے۔

علوم و فنون کے خزانوں پر کسی خاص طبقے کا تسلط کبھی نہیں رہا ہے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ دین اسلام میں کوئی ایسا مذہبی طبقہ نہیں ہے جو نسلاً بعد نسل مذہبی امور کا وارث ہو، مذہبی جاگیر داری کے مفہوم نے نصرانیت کے کھوکھ سے جنم لیا ہے۔ لیکن دنیائے اسلام کے لئے یہ لفظ غریب اور غیر مانوس ہے، اگر بعض اہل علم کی عبارتوں میں اس طرح کی کوئی تعبیر پائی جاتی ہے تو اس کی بنیاد مغرب کی اندھی تقلید پر ہے۔ ہمارے اس دور میں مذہبی پروہت، رجال دین کی ایسی تعبیر بہت عام ہے حتیٰ کہ عرب ادباء و اہل قلم کے درمیان بھی، یہ لوگ لفظ کو ٹھیک اسی مفہوم میں استعمال کرنے لگے ہیں جس مفہوم پر لفظ ”کہنہ“ عالم نصرانیت میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ایسے محتاط اہل قلم جو دین پر مضبوطی سے قائم ہیں اور جو اسلامی فکر اور اسلامی روح کا صحیح تعارف کرنا چاہتے ہیں وہ حضرات سختی کے ساتھ ایسی عبارتوں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔

اسلامی علوم، اسلامی فقہ اور عصر حاضر کے اسلامی مسائل کی طرف علمی مدارس و مراکز کے خصوصی توجہ مبذول کرنے پر اپنے رشک و مسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام میں قسیمیست اور مذہبی جاگیر داری کی گنجائش بھی نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ ایسے علماء کی ایسی جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے جنہیں اپنے فن میں پوری مہارت و بصیرت اور کامل درجہ کا اختصاص حاصل رہا ہے، لیکن اس دور میں جب کہ علم کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی ہوئی ہے اور علوم و فنون کا دائرہ غیر معمولی وسعت اختیار کر گیا ہے اور کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں رہی کہ وہ علم کے جملہ اقسام سے واقف اور ہر فن کا ماہر ہو، یورپ میں ترقی اس وقت شروع ہوئی جبکہ وہاں لوگوں نے علم کی مختلف فنون میں سے کسی خاص فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور وہاں کے علماء نے بیک وقت جملہ علوم و فنون پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی، میرا خیال ہے اس اصول پر اس وقت بھی مشرق سے زیادہ یورپ میں عمل ہو رہا ہے، رہا ہر شعبے کا ماہر اپنے پیشے اور میدان اختصاص کے متعلق بلا تردد اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اسے دوسرے شعبوں اور دوسرے فنون کے ماہر کے میدان اختصاص میں کوئی دخل نہیں ہے، اب ہمارے لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس بات کی پوری کوشش کریں کہ اپنی علمی و فکری کاوشوں کو کسی خاص موضوع اور علم و تحقیق کی بہت سی شاخوں میں سے کسی مخصوص شاخ تک محدود رکھیں۔

## معیار ثقافت:

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں بھی اس علمی قافلے کا ہم سفر ہوں اور اس وقت کو ٹھیک خیال کرتے ہوئے بعض تجاویز پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، آپ ہماری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے حلقے میں ثقافت کا معیار پست ہونا چاہا ہے، میں نے یہ چیز مغرب میں بھی محسوس کی اور مجھ سے وہاں کے بعض علماء نے کہا کہ مشرقی علوم کے مطالعہ و تحقیق میں بھی فساد پھیل گیا ہے، ضرورت ہے کہ علماء کی نئی نسل صبر و استقلال، اور پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ بحث و تحقیق میں لگے، اس انحطاط کے متعدد اسباب ہیں جن میں کچھ سیاسی ہیں اور کچھ اقتصادی و معاشی۔

## استشراق کی ترقی کا راز:

وہاں علم کی مختلف شاخوں میں سے ہر شاخ کے پیچھے شروع سے اب تک کچھ ایسے اشیاء و عوامل کار فرما رہے ہیں۔ انہیں عوامل نے استشراق کو اس بام عروج تک پہنچا دیا۔ اس میں بعض طبیعیاتی علوم کا استثناء کیا جاسکتا ہے۔

مستشرقین کی تحقیقات کو ہم مقام حاصل تھا اور مستشرقین اپنی کتابوں کے ذریعہ بڑی ہیست اور نمایاں حیثیت حاصل کر رہے تھے، کیونکہ اس کے پیچھے جو سب سے بڑا عامل کارفرما تھا وہ امپریلیزم (IMPERIALISM) (اس کا مقصد ہے کہ پنیوں اور اقتصادی اداروں اور سیاسی نفوذ کے ذریعہ اپنے تاثرات پھیلاتا) تھا، اور ہمیں خوشی ہے کہ وہ عامل اب مؤثر نہیں رہا، چنانچہ مشرق کا سب سے مالدار ملک مسلمانوں کے زیر حکومت تھا، اور مغرب ان مسلمانوں کو ان برکات و ثمرات کی وجہ سے جو ان کے پاس تھا غیرت اور حسد کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

مغربی امپریلیزم نے نوآبادیات قائم کرنی چاہی اس لئے اس کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ان ممالک کی قومی خصوصیات کا جائزہ لے، اور وہاں کی عوام کے علمی و دینی مصادر میں شکوک و شبہات اور بد اعتمادی پیدا کرے، اور ان ممالک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اسکالروں کے دل میں احساس کمتری پیدا کرے تاکہ یہ چیزیں ان ممالک میں بیرونی اثر و رسوخ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوں، کیونکہ تہذیبی و ثقافتی اثرات، اور عقلی اور علمی مراقلندگی، سیاسی تفوق اور برتری سے زیادہ مؤثر ہوا کرتی ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ سیاسی نفوذ کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں اور اس کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔

یہ مستشرقین سامراجیوں کے ہر اول دستہ تھے، چنانچہ انہیں سرکاری حلقوں کا بھرپور تعاون ملا، اور ڈھیر سا مال ان کے تصرف میں دیدیا گیا، بادشاہوں کے دربار اور حکمرانوں کی قلمرو میں ان کا پر جوش خیر مقدم کیا جاتا اور بھرپور اعزاز و اکرام ہوتا تھا۔

اس عامل کا وجود اب ختم ہو گیا، رہا دوسرا عامل یعنی اقتصادی تو اس نے بھی اپنی تاثیر کھودی، اور اقتصادی اساس تو وہ انقلاب کا شکار ہو گئی، یہاں تک کہ مشرقی علوم کے مطالعہ و تحقیق کا جاری رکھنا پہلے کی طرح مادی نفع کا باعث نہیں رہا۔

### علمی و تحقیقی یکسوئی:

اس دور کے علماء اور تعلیم یافتہ افراد میں محنت اور جانفشانی کی روح کمزور پڑ گئی جس کی وجہ سے علم کا شوق بھی کم ہو گیا اور اس کے ساتھ جدوجہد کی قدرت کا چشمہ خشک ہو گیا، میرا اشارہ کسی خاص مدرسے یا علمی مرکز کی طرف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عام بات ہے جسے تقریباً ہر جگہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ حصول علم و کمال کے لئے وہ مکمل یکسوئی اور جان توڑ کوشش جو ماضی کے علماء کا طرہ امتیاز تھا اور حاضر میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا، اس کے اسباب کا تعلق کسی خاص چیز سے نہیں بلکہ سیاست، اقتصاد و معیشت اور ادب و اخلاق سب سے اس کا مساویانہ تعلق ہے۔ اس کے اسباب سے بحث کرنا ناممکن ہے اور نہ یہاں اس کی ضرورت ہے، بہت واضح سی بات ہے کہ علم کا شوق جو ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے اور انسان کو اس درجہ بے قرار کر دیتا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لباس و پوشاک کی بھی پروا نہیں کرتا، وہ شوق اگر ختم نہیں ہوا ہے تو نادر و نایاب ضرور ہو گیا ہے۔

### علم برائے علم:

ماضی میں ایک تنہا عالم متعدد اکیڈمی کا کام انجام دیتا تھا۔ اب صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ بڑی بڑی اکیڈمیاں اور علمی و تحقیقی ادارے قائم ہیں۔ لیکن اسکے باوجود نتائج اور کارکردگی تشفی بخش نہیں ہے اور کوئی اہم اور نئی تحقیق کم ہی سامنے آتی ہے۔

اس وقت ہمیں اس کی شدید ضرورت ہے کہ ثقافتی معیار بلند ہو، رسوخ فی العلم اور فقہی بصیرت میں ترقی ہو، علم میں ایک طرف محنت ہے پھر اس کا ثمرہ ہے۔ پہلے پیاس ہے پھر آسودگی ہے، بھوک ہے پھر شکم سیری ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ علم و جستجو کی راہ میں پوری دیانتداری کے ساتھ محنت کرے اور اس کو وہ اپنے عمل کا بدلہ اور مکافات تصور کرے، اور اس محنت اور تخصص کو کسی یونیورسٹی میں اوپنٹی پوسٹ کا ذریعہ نہ بنائے۔

اس دور کا ایک المیہ یہ ہے کہ اہل علم اپنی محنت کا ثمرہ نقد و وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی زیادہ توجہ شہرت و ناموری، عہدہ کی ترقی اور زیادہ معاوضہ حاصل کرنے پر مرکوز رہتی ہے، اور ان کی طاقت و صلاحیت کا حصہ ان مقاصد کے حصول کی راہ میں صرف ہوتا ہے، گویا مادی منفعت ہی ان کی نگاہ میں اصل معیار ہے، آپ نے بہت سے اصول کے بارے میں سنا ہوگا، اور نیا اصول جو ہمارے ثقافتی اداروں میں عام ہے وہ ہے کیریئرزم (CAREERISM)۔

### علم کی پیاس وقتی نہیں ہونی چاہئے:

دوسری چیز یہ ہے کہ ثقافتی سرگرمیوں کی طرف نظر اور توجہ سرسری نہیں ہونی چاہئے کہ ہم غور و فکر کے لئے ایک موضوع کا انتخاب کریں، پھر فوراً ہی جگالی کر کے اسے باہر ڈال دیں جیسا کہ جانور جگالی کیا کرتا ہے، پس ایسا نہ ہو کہ ہمیں نہ موضوع کا زیادہ اہتمام و التزام ہو، اور نہ اس سے کوئی گہرا ربط و تعلق ہو کہ جب



اس موضوع پر بحث ختم ہو جائے تو ہم ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو جائیں، اس موقع پر اقبال کا یہ شعر ہمارے پیش نظر ہے:

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے  
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

اسلامی تحقیق کے سرچشمے ایمان میں پوشیدہ ہیں:

اسلامی علوم اور عصر حاضر کے دینی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت کا تذکرہ آپ علمی و دینی مقالات میں ضرور پڑھتے ہوں گے، اور ہم میں سے ہر شخص کو اس ضرورت کا احساس اور اس فکر سے اتفاق ہوگا، لیکن سوچنا یہ ہے کہ باب اجتہاد بند کیوں ہو گیا؟ اس کے اسباب کیا ہیں اور اس دعویٰ میں کس درجہ صحت ہے؟ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے اور عنقریب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کروں گا کہ علوم اسلامیہ کے اصول دین میں پوشیدہ ہیں، اور دین ہی ان اصول کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہمارا موقف مستشرقین سے جدا گانہ ہو، اور یہ کہ ہمارا موقف کسی اکیڈمی جیسا نہ ہو کہ ہم کسی التزام اور احساس ذمہ داری کے بغیر مسائل پر بحث کریں بلکہ ان کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہونا چاہئے کہ یہ چیزیں ارکان ایمان کے ساتھ مربوط اور ہماری علمی زندگی میں جاری و ساری ہوں، میں نے بچپن میں مقولہ سنا تھا: ”برائے یک من علم رادہ من عقل باید“، اگر ایسا نہ ہو تو انسان علم کا حقیقی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔ اور نہ مناسب صورت میں اس کا استعمال کر سکے گا۔ میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہوئے کہوں گا کہ بحث و تحقیق کے ساتھ مناسب مقدار میں تقویٰ کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی علوم کا ہے جس کا دین سے گہرا ربط ہے۔ لہذا ان دینی اصول کو بحث و تحقیق کے سامنے اس طرح پیش نہیں کر سکتے جس طرح کسی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے پیش کیا جاتا ہے، جی ہاں! انصاف کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ایسا ہو، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بحث میں نقد و اعتراض، استہزا اور تحقیر و تذلیل سے خالی ہو۔ جن حضرات کو بحث و تحقیق کی ذمہ داریوں کا شعور اور افکار و نظریات کی تبدیلی کا احساس ہے انہیں چاہئے کہ وہ اپنی آراء و احکام کو قطعی اور یقینی شکل میں پیش نہ کریں اور اپنے کسی نظریے کی توجیہ اس انداز میں نہ کریں کہ گویا وہ اس موضوع پر حرف آخر ہو، اور مزید غور و فکر کی اس میں مطلق کوئی گنجائش موجود نہ ہو، بلکہ ان کا موقف اور پیش کرنے کا انداز ایسا ہو جیسے کوئی کسی نتیجے تک پہنچا اور اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہو کہ وہ صحیح ہے، ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم غور و فکر اور بحث و مباحثے میں صبر و تحمل کا اصول اختیار کریں، اور علم اور ان حالیین کا اعتراف کرنا سیکھیں جنہوں نے اپنی زندگی اور اپنی تمام تر طاقتیں اور صلاحیتیں اس راہ میں صرف کر دی ہیں۔

انتشار پیدا کرنے سے اجتناب:

کچھ لوگ اپنی رائے کے اظہار میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں، پھر فوراً ہی اس سے رجوع بھی کر لیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں، لیکن پھر ان لوگوں کا کیا ہوگا جو ان کے فتوؤں کی اتباع کر کے اور غلطی پر عمل کر کے اس دنیا سے چل بے؟ اور مسئلہ اس وقت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب ان آراء کا تعلق دین اور عقیدے سے ہو، لہذا ضروری ہے کہ رائے کے اظہار میں صبر کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے، خاص طور پر جب کہ مسئلہ کا تعلق عالم دین سے ہو، تو ہمیں چاہئے کہ تھوڑی دیر سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور و فکر کریں، اور اس فن کے ماہرین کے سامنے اسے پیش کریں اور ان کے فیصلوں کا انتظار کریں۔ ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی فتویٰ کی اشاعت ہو اور اسے منظر عام پر لایا جائے، یہ دور انتشار ہے، اور انسان ست و کابل واقع ہوا ہے، فطری طور پر لا پرواہی کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے، اس زمانہ کی تہذیب علمی ترقی کی تیز رفتاری اور معیاری زندگی میں مسلسل ترقی، یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے انسان کو آرام و آسائش کا دلدادہ اور اختلاف و انتشار کا جلد شکار ہو جانے والا بنا دیا ہے، جب یہ صورت حال ہے تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسی چیزوں کے اظہار سے باز رہیں جو لوگوں میں فکری اضطراب پیدا کر سکتی ہوں یا اس میں اضافے کا سبب بن سکتی ہوں۔

زمانہ میں تغیر اور ثبات:

عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ زمانہ میں ثبات اور دوام نہیں ہے، بلکہ تغیر اور انقلاب ہی کا دوسرا نام زمانہ ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، زمانہ دو عناصر سے مرکب ہے، تغیر اور استمرار، اگر زمانہ میں ان دونوں کا توازن برقرار نہ رہے، اس طور پر کہ استمرار و دوام، تغیر اور تبدیلی پر غالب آجائے یا تغیر اور انقلاب ثبات اور دوام پر حاوی و مستولی ہو جائے تو معاشرہ اور تہذیب و تمدن پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے، انسانی معاشرے کے لئے ان دو عناصر کا توازن و اعتدال کسی بھی کیمپائی مرکب سے زیادہ ضروری ہے۔ زمانہ میں انقلاب کی قدرت و صلاحیت اور اس میں انقلاب کارونما ہونا ضروری ہے، اور یہ کسی ضعف یا نقص کی علامت



جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن اسی کے ساتھ زمانے میں انقلابات و تغیرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی بھرپور ہے، تغیر و انقلاب کے آثار و مظاہر واضح طور پر ہمارے سامنے ہیں اور ہم میں سے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ کتنے وسیع پیمانے پر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

عام اور مادی امور میں ہمیں اس کشمکش کا پوری طرح احساس نہیں ہو سکتا جو زمانہ اپنی عمدہ خصوصیات اور اپنی طبیعت اور حقیقی صفت کی حفاظت کے لئے کر رہا ہے، اس کے لئے ایک خاص خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک ندی کو لے لیجئے جو حرکت کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے اس کی دو موجیں بالکل ایک جیسی نہیں ہوتیں، اور اپنی گزر جانے والی موجوں کے باوجود وہ اپنے نام اور تمام خصوصیات کے ساتھ ہزاروں سال سے اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ دجلہ و فرات، دریائے نیل، گنگا اور جمنا کل پچھلی صدیوں کی طرح آج بھی انہیں خصوصیات کی حامل ہیں۔

اسی طرح زمانہ متحرک ہونے کے ساتھ ساکن بھی ہے، زمانہ کی یہ دونوں جوہری صفتیں ہیں، اسی طرح زمانہ اپنی دونوں بنیادی صفتوں میں سے کسی ایک کے بغیر اپنی افادیت باقی نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مثبت اور منفی قوتیں عالم میں موجود تمام زندہ و مردہ چیزوں میں قوت و نمود پیدا کرتی ہیں، اور اپنے عمل اور رد عمل کے نتیجہ میں یہ چیزیں اپنی قدر و قیمت کو باقی رکھتی ہیں۔

دین زندگی کا محافظ ہے:

میں اپنے اس عقیدے کے ساتھ کہ یہ دین دائمی و ابدی ہے کبھی اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ یہ دین کسی حال میں بھی ہر تغیر کو قبول کر سکتا ہے اور آپ لوگ بھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ دین کوئی تھرما میٹر نہیں ہے جس کا کام صرف درجہ حرارت کو ناپنا ہوتا ہے اور نہ وہ مرغ باد پیمانہ ہے جس کے ذمہ صرف ہوا کے رخ کو متعین کرنے کا کام ہو۔

ایسی عبارتوں کے ذریعے دین کی تعریف نہیں کی جاسکتی، اور ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو دین کا یہ مطلب سمجھے کہ اس کا کام ایک رجسٹر کی طرح ہے جو حوادث زمانہ کو بتلاتا ہے، کوئی نام نہاد وضعی دین اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو پھر اللہ کا نازل کردہ وہ سچا دین جو قیامت تک کے لئے ہے وہ کس طرح اس صورت حال کا تحمل کر سکتا ہے۔ دین تغیر و تبدیلی کو ایک حقیقت واقعہ کی طرح تسلیم کرتا ہے، اور صحیح سالم انقلاب کی بنا پر امور و معاملات کے فروغ کے لئے ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے، دین زندگی کے ساتھ شانہ بشانہ چلتا ہے، وہ اس کی جلو میں ایک خادم یا تابع کی حیثیت سے صرف چلنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ بتلائے کہ فلاں انقلاب انسانیت کے لئے یا اس کے پیروکاروں کے لئے مفید ہے یا مضر۔ دین اگر زندگی کے ساتھ ایک طرف چلتا ہے تو دوسری طرف وہ اس کا محافظ، گارڈ اور اتالیق بھی ہے، اس پر اس کی پاسبانی و نگرانی کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، ایک مربی اور سرپرست کا یہ کام نہیں کہ اس کی سرپرستی میں جو بچہ ہے اس کے ہر عمل کو جائز قرار دے، اور اس کے تمام برے میلانات و رجحانات کی تائید و تصویب کرے۔ اور وہ جس چیز کے پیچھے بھی دوڑ رہا ہے اس پر تائیدی مہر لگائے، اس کے پاس تو صرف ایک مہر ہے اور ایک سیاہی اور ایک ہاتھ ہے، اس کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اپنی مہر کسی بھی دستاویز یا چک پر لگا دے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ صحیح غلط کے درمیان امتیاز کرے، پہلے وہ دستاویز کی تفتیش کرے، پھر اپنا حکم صادر کرے، اگر اس میں کوئی غلطی و ضرر پائے تو دین اس کی کوشش کرے کہ نرمی کے ساتھ اسے چھوڑ دے اگر ایسا ممکن ہو، یا اگر ضرورت ہو تو اس سلسلے میں قوت کا استعمال کرے، اور اگر اس کے سامنے کوئی نسخہ پیش کیا جائے اور وہ اسے نسل انسانی کے لئے مضر سمجھتا ہے تو محض اس کی تصدیق و تائید اور مہر لگانے ہی سے باز نہیں رہتا بلکہ اس کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، یہیں سے دین و اخلاق کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے، دین اپنی ڈیوٹی اور ذمہ داری سمجھتا ہے کہ غلط خیالات اور غلط کام کو روکے، اور اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے، جب کہ اخلاق اس کے جائز و ناجائز اور اس کے ممدوح یا مذموم ہونے کی طرف محض اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہے۔ ہمارے بالبصیرت فقہاء اور راہنما علماء کرام کی ذہانت و عمق پریت، زمانے کی ترقیات، عرف و پیمانہ کے بدل جانے، نئے آلات و وسائل کے وجود میں آجانے، حوادث و مشکلات کے پیدا ہونے، نئے تجربات کے سامنے آنے اور نئی تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں پوری طرح ظاہر ہوئی، اسی طرح فتاویٰ اور شرعی احکام میں حالات زمانہ کی رعایت کرنے، روح شریعت اور مقاصد شریعت کی حفاظت کرنے میں دین اسلام کی ابدیت اور اس کے وہ آخری اور پسندیدہ دین ہونے کا

اعتقاد رکھنے اور اللہ رب العزت کے فرمان: ”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“ (المائدہ ۳) پر کامل یقین رکھنے پر بھی ان کی ذہانت و صلاحیت کا پورا اظہار ہوا۔

اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں اس عالمی فقہی کتب خانے کا وسیع تاریخی جائزہ لینا ہوگا جو اسلام کی طویل تاریخ اور عالم اسلام کی وسیع مساحت پر پھیلی ہوئی ہے، اگر یہ کام پوری امانت و دیانت، ہمسر و محمل اور غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ انجام دیا جائے تو علمی و دینی ذہانت و عمق پرستی اور قانون سازی کی بے مثال صلاحیت کا اندازہ ہوگا جو سب کے لئے باعث حیرت و تعجب ہیں، اور یہ چیز اس اجتہاد اور فقہی بحث و تحقیق کے حق میں بھی مفید ہوگی جس کی ضرورت اس دور اور وسیع اسلامی معاشرے کو ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس برصغیر کے اندر ماضی قریب میں افتاء اور فقہی تحقیقات کا جو کام ہوا ہے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال لی جائے، اور جہاں تک علمی و فقہی تصنیفات فتاویٰ کے مجموعوں اور حدیث و فقہ کی بحثوں کا تعلق ہے تو اس مختصر سے مقالہ میں ان کا نام شمار کرنا بھی مشکل ہے، اس کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہمارے والد ماجد حضرت علامہ عبدالحی حسنی کی تصنیف ”الثقلان الاسلامیہ فی الہند“ کی طرف رجوع کیا جائے، جسے مجمع اللغۃ العربیہ دمشق نے شائع کیا ہے۔ یہاں پر میں فقہ الحدیث پر علامہ ظفر احمد عثمانی کی تالیف اعلاء السنن کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا جو انہوں نے مرثیہ جلیل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر تالیف کی ہے، یہ عظیم تصنیفی کام اکیس ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔

اسی طرح معاشرتی و ازدواجی زندگی سے متعلق بعض پیچیدہ مسائل کا شرعی و فقہی حل تلاش کرنے میں بھی کچھ مفید اور قابل قدر علمی کاوشیں ہوئی ہیں، مثال کے طور پر مرثیہ کبیر عالم جلیل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ”الجمالیۃ الناجزۃ للحلیۃ العاجزۃ“ اور ”بوادیر النواذر“ کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب دیوبندی مفتی اعظم پاکستان کی ”جواہر الفقہ“ تین جلدوں میں اور ان کی ”احکام القرآن“ اور عظیم مصلح مولانا عبدالشکور لکھنوی کی ”علم الفقہ“، اور اس کے علاوہ فتاویٰ کے مجموعے ہیں، مثلاً مفتی عزیز الرحمن سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کی ”عزیز الفتاویٰ“ بارہ جلدوں میں، اور حضرت تھانوی کی ”امداد الفتاویٰ“ چھ ضخیم جلدوں میں، اور مفتی عبدالرحیم لاچپوری کی ”فتاویٰ رحیمیہ“ چھ جلدوں میں۔

اس باہر کتب تاریخی موقع پر میں اسلامک فکس اکیڈمی انڈیا کے قیام کا خوشی و مسرت اور احترام و عقیدت کے ساتھ تذکرہ کروں گا، یہ ایک نہایت مبارک اور برکت آمیز اقدام تھا جو اپنے وقت پر اٹھایا گیا، اور یہ مفید تعمیری علمی و فقہی نظریے کے حق میں فتح شمار کی جائے گی، جس نے جدید فقہی کتب خانہ تیار کرنے، اور اس ترقی یافتہ اور روز افزوں ترقی پذیر دور میں علمی کام کے میدان میں نئے گوشے کھولے، اور یہ اقدام ان لوگوں کے خلاف بھی ایک دلیل ہے جو فقہی موضوعات پر اختصاص کرنے والوں پرستی اور کاہلی، اور باہم علمی تعاون نہ کرنے اور ایک ساتھ مل کر نہ بیٹھنے کا الزام لگاتے ہیں۔

الحمد للہ اس اکیڈمی کے متعدد کامیاب اور نتیجہ خیز اجتماعات ہو چکے ہیں، امید کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک سلسلے کو قائم و دائم رکھے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل فخر و اطمینان کے ساتھ اس اجتماعی فقہی کام کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جسے فقہ اسلامی کے ممتاز علماء کی ایک کمیٹی انجام دے رہی ہے اور وہ ہے مسلم پرسنل لا پر مشتمل ایک ایسی جامع کتاب کی تدوین جو اس ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک دستور ہو، اور حکومت کی عدالتوں میں مقدمات کا فیصلہ کرنے اور نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل میں شرعی حکم نافذ کرنے میں حجت اور وجہ ترجیح ثابت ہو۔

یہ مثبت تصنیفی کام مسلم پرسنل لا بورڈ کی زیر نگرانی اور حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب جنرل سکرٹری بورڈ کی سرپرستی میں انجام پا رہا ہے، اور اس طرح اب ان لوگوں کے خلاف حجت قائم ہو جائے گی اور ان لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی جو احتجاج کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا بورڈ میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جو قابل اعتماد اور متفق علیہ ہو۔

☆☆☆



## اختتامی کلمات

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

آپ نے یہ قیمتی خطبہ سنا۔ اس پورے خطبہ کو سننے کے بعد میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ شکر، بجالاتا ہوں اور اس پر اپنے پورے اطمینان کا اظہار کرتا ہوں کہ جب تک ہمارے ایسے بزرگوں کی سرپرستی قائم ہو، انشاء اللہ ہم علم و تحقیق کی دنیا میں اور اسلام کی خدمت میں اور جدید حالات و مسائل پر فقہی حیثیت سے غور کرنے میں کبھی بھی راہ حق سے منحرف نہیں ہوں گے۔ شخص کی بھی اور کسی ملت کی بھی بڑی سعادت ہے کہ اس کی ہمت افزائی کریں اور اس کے غلط کاموں پر ان کے ہاتھ پکڑ لیں یہ بہت بڑی سعادت ہے کسی گھر کے لئے کسی شخص کے لئے کسی خاندان کے لئے اور کسی ملک کے لئے، حضرت نے جس عظیم الشان خدمت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہمارے سلف نے اسلام کے ثابت اصولوں اور بدلے ہوئے حالات میں شریعت کی تطبیق کے درمیان کس طرح کا متوازن کام کیا ہے وہ تاریخی تحقیق کے ساتھ ہمارے بزرگوں کے سامنے آنا چاہئے، بیشک یہ بڑا قیمتی مشورہ ہے اس پر انشاء اللہ یہ اکیڈمی آئندہ پروگرام بنائے گی۔

مجھے بہت خوشی ہے کہ اس وقت ہمارے نقذ اکبر محمد محروس المدرس موجود ہیں۔ یہ بڑے عالم ہیں، ان کے علم کا اندازہ آپ کو ان کے خطاب سے ہوا ہوگا، میں نے جو ان کو جانا ہے ان کی ایک کتاب سے جانا ہے، اس کتاب کا نام سن کر میں اتنا مشتاق ہوا کہ مکہ، مدینہ اور جدہ کی گلی گلی میں پھیلے ہوئے کتب خانوں میں اس کی تلاش میں گھومتا رہا، اس کتاب کی بنیاد اس پر ہے کہ مشائخ بلخ نے بدلے ہوئے حالات اور زمانے میں کن اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے سابق آراء سے عدول کیا، "مشائخ بلخ وما انفردوا من المسائل الفقہیہ" یہ وہ کتاب ہے جس نے ہمارا اور انکار شدہ مضبوط کیا ہے، حضرت نے جس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشائخ بلخ، جن کو کچھ فقہی تہذیب، نئی ثقافت اور نئے حالات سے دوچار ہونا پڑا، انہوں نے سابق کے فیصلوں یا آراء سے عدول کرتے ہوئے کس طرح نئے حالات کی رعایت کی اور اسلام کے ثابت اور راسخ اصولوں کو بھی اپنی جگہ باقی رکھا، میں امید کرتا ہوں کہ ہماری اکیڈمی اور اس اکیڈمی کے صاحب تحقیق ارکان اس موضوع پر آئندہ سوچیں گے۔

پوری دنیا میں اور خاص کر اندلس میں ہمارے پاس ۱۲، ۱۵ جلدوں میں وہ فتاویٰ ہیں جو علمائے اندلس، مراکش اور علمائے مغرب کے مختلف حالات میں دیئے ہیں، خاص کر ان حالات میں جبکہ اندلس میں ایک نیا انقلاب آچکا تھا اور مسلمانوں کا زوال ہو چکا تھا، ان حالات میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے جو ہمارے آج کے حالات سے بہت زیادہ قریب ہیں، اور بہت سے مسائل تشابہ ہیں، ہمیں ان تمام تحقیقات کو جمع کر کے اور اسلام کے ثابت اور راسخ اصولوں کو اپنی جگہ برقرار رکھتے ہوئے شریعت کی ہدایت کے مطابق نئے حالات کی رعایت کا حوصلہ ملے گا۔

☆☆☆



## اکیڈمی کا فیصلہ

یہ سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء مطابق ۱۳ تا ۱۷ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ حقوق کی خرید و فروخت کے مسئلہ پر کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ:

- ۱- بیع میں مال کی شرط جوہری ہے۔
- ۲- مال کی حقیقت نصوص شرعیہ نے متعین نہیں کی ہے۔ پس اس کا اصل مدار ہر عہد کے اس عرف و رواج پر ہے جو شریعت سے متصادم نہ ہو۔
- ۳- وہ تمام حقوق جن کی مشروعیت اصالتاً نہیں بلکہ صاحب حق سے کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے، ایسے حقوق پر عوض لینا جائز نہیں ہے جیسے حق شفیعہ۔
- ۴- جو حقوق نصوص شرعیہ سے ثابت ہوں، البتہ ان سے مالی منفعت متعلق ہوگی اور عرف میں ان کا عوض لینا مروج اور معروف ہو چکا ہو، نیز ان کی حیثیت محض دفع ضرر کی نہ ہو، اور وہ شریعت کے عمومی مقاصد و مصالح سے متصادم نہ ہوں، ایسے حقوق پر عوض حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔
- ۵- کون سے حقوق کس نوع میں داخل ہیں، اور اس تفصیل کے مطابق عصر حاضر میں مروج کون سے حقوق قابل عوض ہیں، اور کون قابل عوض نہیں ہیں، اس کی تعیین و تطبیق کے لئے مستند دارالافتاء اور اصحاب فتاویٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہ سمینار عربی مدارس کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ:

- ۱- طلبہ کو جدید حالات پر احکام شرعیہ کے انطباق کا اہل بنانے کے لئے فقہی سمینار میں آنے والے مسائل اور دوسرے جدید مسائل پر طلبہ کا بین المدارس مذاکرہ منعقد کرائیں اور اگر مدارس خواہش کریں تو اسلامک فقہ اکیڈمی ایسے مذاکروں میں تعاون کے لئے علماء میں سے کسی صاحب سے ایسے موقع پر شرکت کے لئے درخواست کر سکتی ہے۔
- ۲- دینی مدارس کے طلبہ کے لئے سمینار یہ بھی مناسب سمجھتا ہے کہ معاشیات اور مختلف عصری علوم کے ماہرین کے محاضرات کا نظم کیا جائے تاکہ طلبہ ان علوم کی مبادیات اور اس کی بنیادی فکر کو سمجھ سکیں اور احکام شرعیہ کو ان سے مربوط کر سکیں، اور "اسلامک فقہ اکیڈمی" اس سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کے لئے تیار ہے۔
- یہ سمینار اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ عصری درس گاہوں کے طلباء و فضلاء کے لئے ایسے محاضرات اور کمپس کا نظم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ ان کو اسلام کے مختلف شعبوں کی بنیادی تعلیمات، اسلام کے بنیادی اصول قانون، اسلامی قانون کی تاریخ اور اس کی ہر عہد میں انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت اور ضروری اصطلاحات سے واقف کرایا جائے۔ سمینار کی خواہش ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں مناسب اقدام کرے۔



## بیع حقوق

### مسئلہ کا تعارف اور چند سوالات

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

بہت سی ایسی چیزیں جن کی خرید و فروخت کا کوئی تصور پچھلے زمانہ میں نہیں تھا، آج وہ چیزیں دولت اور قیمتی سرمایہ تصور کی جاتی ہیں، اور ان کی خرید و فروخت کا عام رواج دنیا کے سبھی ملکوں میں ہو گیا ہے۔ عام طور پر فقہاء احناف بیع کی تعریف میں مال کی قید لگاتے ہیں، یعنی خرید و فروخت انہی چیزوں کی کی جاسکتی ہے جو مال ہوں، اور کسی شے کے مال قرار دیئے جانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شے ایسی ہو جس کو محفوظ کر لینا اور جس پر قبضہ ممکن ہو۔ اس لئے جو معنوی امور مثلاً علم، فنی مہارت یا فضا اور سورج کی کرنیں وغیرہ ہیں یہ مال میں داخل نہیں۔ شامی نے مال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

المراد بالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والماليه تثبت بتمول الناس كافه أو بعضهم (رد

المختار ۴۰۲)۔

اسی ذیل میں شامی نے بحوالہ تلویح یہ لکھا ہے کہ: ”منافع“ ملک تو ہیں ”مال“ نہیں، اور ملک و مال کے درمیان جو ہری فرق ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

”لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص والمال ما من شأنه أن يدخر للانتفاع لوقت

الحاجة“۔

یعنی مال کا قابل ذخیرہ ہونا تا کہ بوقت ضرورت اس سے نفع اٹھایا جاسکے۔ اور بحر نے حاوی قدسی کا یہ قول نقل کیا ہے:

المال اسم لغير الآدمي خلق لمصالح الآدمي وأمكن إحرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار (رد المختار ۴۰۲)۔

صاحب در مختار نے بیع کی تعریف میں لفظ ”مال“ کے بجائے ”شے مرغوب فیہ“ کا استعمال کیا ہے، اور شامی نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

”ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال“۔

اور آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ تراب (مٹی) مہیہ (مردار) اور دم (خون) مال نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے فقہاء کی وہ تعریف جس میں بیع کو

”مبادلة المال بالمال“ کہا گیا ہے، اس تفسیر کے بعد صاحب تنویر الابصار کی تعریف کے ہم معنی قرار پاتی ہے۔

دیگر فقہاء کے یہاں مال کا ”مادی شے“ ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ حقوق و منافع جیسی چیزوں کو بھی مال تسلیم کرتے ہیں۔ امام شافعی کا قول سیوطی نے

اشباہ و نظائر میں نقل کیا ہے کہ ”ہر وہ شے جس کی کچھ قیمت ہو اور اس کو ضائع کر دینے پر ضمان لازم آتا ہو“ مال“ ہے۔

قال الإمام الشافعي رضي الله عنه لا يقع اسم مال إلا على ما له قيمة يباع بها ويلزم متلفه وإن قلت وما لا

يطرحة الناس مثل الفلس وما اشبه ذلك (الاشباہ والنظائر للسيوطي، ص ۲۵۸)۔

ابن القاسم الغزلی نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: فأحسن ما قيل في تعريفه أنه تملك عين مالية بمعاوضة بإذن

شرعي أو تملك منفعة مباحة على التأييد بضمن مالي (حاشية الباجوري على شرح الغزلي، ۲، ۲۲)۔

قاضی بیضاوی نے الغایۃ القصویٰ میں لکھا ہے: ”البيع تملك عين أو منفعة على التأييد بعوض مالي“ (۱، ۲۵۵)۔

اسی طرح آگے چل کر معقود علیہ یعنی کوئی شئی بیع ہو سکتی ہے اس کے ضمن میں پانی کی گذرگاہ، اور چھت پر حق تعمیر کو بھی قابل فروخت اشیاء میں شمار کیا

ہے۔

حاصل یہ ٹھہرا کہ فقہاء شافعیہ کے نزدیک بیع کے لئے فروخت کی جانے والی شئی کا شئی مادی اور اعیان میں سے ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ منافع بھی محل بیع ہو سکتے ہیں۔

فقہاء حنابلہ بھی اعیان اور منافع دونوں کے مبادلہ کو بیع قرار دیتے ہیں۔ ”الانصاف“ میں مرداوی نے لکھا ہے کہ بیع کی تعریف میں عین یا منفعت مباحہ کا تہاول اس طرح کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہو ضروری ہے۔ (الانصاف ۲۶۰/۳)۔

اسی وجہ سے دوسروں کی مملوکہ اراضی میں گزرگاہ بنانا، دروازہ کھولنا، یا کسی شخص کا اپنے مکان کی چھت پر مکان تعمیر کرنے کا حق فروخت کرنا وغیرہ ایسی چیزوں کو بیع قرار دیا گیا ہے (کشاف القناع للہوتی ۳۹۹/۳)۔

مالکیہ نے بیع کی تعریف میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بیع کو مادی اشیاء کے ساتھ خاص کرتے ہیں اگرچہ وہ حق تعلق وغیرہ کی بیع کو جائز کہتے ہیں، اور زرقانی نے شرح مؤطا میں بیع کی تین قسمیں بیان کی ہیں: بیع عین، بیع دین اور بیع منفعت۔ مالکیہ کی ان تصریحات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی منافع مؤبدہ کو محل بیع قرار دیتے ہیں۔

مذکورہ صدر آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو اہم سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ بیع کی تعریف میں مال کی شرط ضروری اور جوہری ہے، یا ہر وہ شئی جس کا حاصل کرنا انسان کو مرغوب ہو، چاہے وہ چیز عین مادی ہوں یا نہیں، خرید و فروخت کا محل ہو سکتی ہیں۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اگر مال کی قید کو ضروری قرار دیا جائے تو کیا مال کا مادی اعیان میں سے ہونا ضروری ہے، یا حقوق و منافع کو بھی مال قرار دیا جاسکتا ہے؟

۳۔ اسی ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کی حقیقت کیا شرع اور لغت نے متعین کر دی ہے، یا اس کا تعلق ہر عہد کے عرف سے ہے، بہت سی ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جو کسی زمانہ میں نہ ذریعہ تمول تھیں اور نہ ان کی کوئی حاجت اور اہمیت تھی، لیکن بعد کے زمانہ میں وہی شئی ضروری ہو گئی ہے اور ذریعہ تمول بھی، مثلاً ریت اور مٹی، جس کے مال ہونے کا تصور سلف میں نہیں تھا، لیکن آج وہ ذریعہ تمول بھی ہے اور انسانی حاجت بھی۔

فقہاء نے مٹی کو مال نہیں قرار دیا لیکن آج وہ قیمتی مال ہے۔ ریت سمینٹ میں ملا کر مکانات کی تعمیر میں کام کرتی ہے، اور مٹی شہروں ہی میں نہیں اب تو دیہاتوں میں بھی خریدی جاتی ہے۔

اسی طرح فضا یعنی کسی مکان کی چھت پر دوسرا مکان تعمیر کرنا اور اس کام کے لئے زمین کے مالک کا گراؤنڈ فلور اور اس کے اوپر پہلی، دوسری اور تیسری منزل کی تعمیر کا حق مختلف اصحاب سے فروخت کرنا ایک عام بات ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور خاص کر قصبہ، شہروں اور بڑی آبادیوں میں رہائش کے لائق اراضی کا کم ہونا جانا، اور قیمتوں کا بڑھتا جانا ایک بڑا سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ رواج تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے کہ مالک اراضی یا تو کوئی منزلہ فلینس بنا کر اس طرح فروخت کرتے ہیں کہ ہر منزل کی مکانیت اور جس حد تک فضا پر وہ مکان حاوی ہے جملہ حقوق کے ساتھ مختلف افراد کے ہاتھوں فروخت کر دی جاتی ہے، یا پھلی منزل بنانے کا حق ایک شخص کے ہاتھ، اس کے اوپر مکان بنانے کا حق دوسرے شخص کے ہاتھ، اور اس کے اوپر تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ اس طرح خاص کر متوسط طبقات کے لئے ”کم خرچ بلائشیں“ کا مصداق یہ طریق کار رہائشی دشواریوں کے عالمگیر مسئلہ کا حل بن کر ابھرا ہے۔

اسی طرح انسانوں کی ذہنی، فکری اور دماغی صلاحیتوں سے جوئی وجود میں آتی ہے اگرچہ وہ اشیاء مادی نہیں ہوتیں، لیکن قابل انتفاع اور خرید و فروخت کا محل بنتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص پر سہا برس کی محنت کے بعد کینسر کی ایک دوا ایجاد کرتا ہے، یا مختلف صنعتی آلات کے نمونے ایجاد کرتا ہے، مختلف سائنسی انکشافات اور فارمولے ایجاد کرتا ہے۔ تحقیقی کتابیں لکھتا ہے، ایک مصور اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں خرچ کر کے ایسی تصویریں تیار کرتا ہے جنکی بازار میں



قیمت ہے، ان تمام ہی صورتوں میں یہ کہا جانا چاہئے کہ موجد، مصنف اور فن کار کو تحقیق پر ایک ایسا خصوصی اختیار حاصل رہتا ہے جسے اس کی ملک کہا جاسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اشیاء مادی نہیں ہیں اس لئے مال کی عام تعریف میں داخل نہیں۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

۱۔ مال کی تعریف میں مذکور یہ شرط کہ اس کو قابل ذخیرہ ہونا چاہئے کیا یہ شرط جوہری ہے؟

۲۔ اور اگر اس کو جوہری جز مال کی تعریف کا تسلیم کر لیا جائے تو کیا ہر شئی کو ذخیرہ کرنے اور قبض و دخل کی ہر شئی کے لائق علاحدہ صورتیں ہوں گی، یا وہی صورت متعین ہے جو عام طور پر معروف ہے، یعنی مادی شئی کسی الماری میں بند کی جاسکتی ہے۔ سبزیاں (خضر اوات) چند گھنٹوں کے بعد خراب ہونے لگتی تھیں، اب کولڈ اسٹورز میں سالہا سال بھی محفوظ رکھی جاتی ہیں، اسی طرح مختلف چیزوں کو محفوظ کرنے اور ذخیرہ کرنے کی مختلف صورتیں اس شئی کی شان کے مناسب ہو سکتی ہے۔ اس ذیل میں شامی کی اس صراحت کو سامنے رکھنا چاہئے کہ مال کے قابل تصرف اور قابل انتفاع ہونے کی شرط پر جب یہ اعتراض ہوا کہ غلام کو حقیقت مال نہیں کہا جاسکتا کہ کسی غلام کو ہلاک کر دینا اور قتل کر دینا جائز نہیں ہے تو شامی گو یہ اعتراض پسند نہیں آیا اور انہوں نے جواب دیتے ہوئے ایک اصول کی طرف اشارہ کیا، یعنی ”ہر شئے سے انتفاع کی صورت اس شئی کی خاص نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔“

ولأن الانتفاع بالمال يعتبر في كل شيء بما يصلح له۔

کیا اسی طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مالیت کے لئے قابل ادخار ہونے کی جو شرط ہے وہ مختلف اشیاء کے اعتبار سے ہر ایک کی حالت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہوگی؟

مثلاً کوئی ایجاد، فارمولا، نام اور ٹریڈ مارک اگر کسی سرکاری قانون کے ذریعہ رجسٹرڈ کرائے جائیں تو یہ سمجھا جائے کہ یہ مال وقت ضرورت کے لئے ذخیرہ کر لیا گیا ہے یا کوئی اور صورت؟

## حقوق کا مسئلہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حق کی کیفیت کیا ہے، اہل لغت نے جتنے معانی بھی بتائے ہیں ان میں بنیادی طور پر ثبوت اور وجود کا مفہوم موجود ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ“ (یس ۷۷)۔ ”لِيُحَقِّقَ الْحَقُّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ“ (انفال ۸)۔

متعین حصہ کو بھی حق کہتے ہیں: ”فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا كَسَبُوا مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْمَحْرُومِ“۔ مولانا عبدالحلیم بکھڑی نے ”نور الانوار“ کے حاشیہ ”قمر الاقمار“ میں حق کی فقہی تعریف ”الحکم الثابت شرعاً“ نقل کی ہے۔ شیخ مصطفیٰ الزرقانی نے ”المدخل الفقہی العام“ میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کر کے حق کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں متعین کی ہے: ”الحق هو اختصاص بقرره الشرع سلطة وتكليفاً“ یعنی حق ایک خصوصی تعلق کا نام ہے، جس کی وجہ سے شریعت کسی اختیار یا ذمہ داری کو تسلیم کرتی ہے مثلاً نابالغ لڑکی کے نکاح کا اختیار ولی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا اختصاص ہے جس کی وجہ سے شریعت ولی کا اپنے زیر ولایت افراد پر اختیار تسلیم کرتی ہے، یا بائع کو مشتری سے ثمن کے مطالبہ کا اختیار ایک حق ہے جس کی وجہ سے مشتری پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسی طرح وارث کا حق مورث کے ترکہ پر، پس حق ایک خصوصی تعلق ہے جس کا محل مالی ہو سکتا ہے، جیسے دین واجب فی الذمہ کا استحقاق، اور غیر مالی بھی ہو سکتا ہے، جیسے ولی کا اور وکیل کا استحقاق۔ اس اختصاص کی قید سے وہ عام مباحث جن کی حیثیت محض رخصت کی ہے خارج ہو جاتی ہیں، جیسے کسی دریا میں مچھلی کا شکار کوئی بھی شخص کر سکتا ہے، یا ”ارض الموات“ پر تصرف یا ٹرین کے عام کمپارٹمنٹ اور مسجد کی صفوں میں کہیں بھی بیٹھ جانا ہر شخص کے لئے جائز ہے۔ مگر کسی بھی ایسی عام مباح چیز پر اگر کوئی شخص قبضہ کر لیتا ہے تو اسے اختصاص حاصل ہو جاتا ہے جسے ”حق اسبقیت“ کہہ سکتے ہیں۔

حق کی تعریف میں جس اختیار و تسلط کا ذکر کیا گیا ہے یہ اختیار کسی بھی شخص پر بھی ہو سکتا ہے، اور کسی شئی معین پر بھی، جیسے حق ولایت میں شخص پر حق حضانت میں بچہ پر، اور حق ملکیت میں کسی شئی معین پر، ذمہ داری (تکلیف) کسی انسان کے ذمہ ہی ہو سکتی ہے، لیکن وہ شخص جس پر ذمہ داری عائد ہو اسے

ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں: شخص حقیقی اور شخص اعتباری۔

شخص اعتباری وہ ادارے، کمپنیاں، اوقاف اور مساجد و مدارس وغیرہ ہیں جو اپنی اجتماعی ہیئت میں ایک شخص کا درجہ رکھتے ہیں، اور ان کے کچھ اختیارات بھی ہوتے ہیں، اور ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، اگر شرع کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس کی نظیریں بھی مل سکتی ہیں، جن کی تعریف ان حقوق کو بھی شامل ہے جو اللہ کے حقوق ہیں جیسے عبادات یا جن سے اخلاقی ذمہ داریاں پیدا ہوتی ہیں جیسے والدین اور اولاد کے باہمی حقوق، یا زوجین کے ایک دوسرے پر باہمی حقوق۔ اسی طرح حکومت اور شہریوں کے درمیان باہمی حقوق وغیرہ۔ حقوق کی اس تعریف پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اعیان اور مادی اشیاء کو حقوق کے ذیل میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شاید اسی لئے فقہاء احناف حقوق کو مال کے برابر میں ذکر کرتے ہیں۔

## حقوق کی قسمیں:

حقوق مالی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مالی بھی، پھر حق مالی یا حق شخصی ہوگا، جو دو شخصوں کے درمیان ایسے شرعی تعلق کو کہیں گے جس کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کے لئے ایسا عمل کرنے کا ذمہ دار ہوگا جس میں دوسرے شخص کا کوئی مفاد ہو، جیسے بائع کو مشتری کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ حق عینی سے مراد وہ حق ہے جو کسی شخص پر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک شخص اور کسی مادی متعین شے کے درمیان آتا ہے، جیسے کسی شخص کے لئے اپنے مملوکہ مکان میں رہائش یا اسے فروخت کرنے کا حق، اسی طرح کسی خاص زمین پر گزرنے یا پانی بہانے کا حق وغیرہ۔

اسی ذیل میں حق کی ایک تیسری قسم وہ ہے جسے اس عہد کی پیداوار کہا جاسکتا ہے جو موجودہ تمدنی، اقتصادی اور سماجی حالات نے پیدا کیا ہے، اور جنہیں آج کے زمانہ میں مختلف عصری قانون سازوں کے ذریعہ منظم کیا گیا ہے، اس عہد کا قانون انہیں ”حقوق ادبیہ“ (INTELLECTUAL PROPERTY) کا نام دیتا ہے، جیسے ہر موجد، مصنف اور محقق کے فکری نتائج چاہے وہ کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں، یا صنعت و حرفت سے، آج کے دور میں ایسا سمجھا جاتا ہے کہ ایسے اصحاب کو اپنی ایجادات اور اپنے فکری نتائج پر ایسا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی نشر و اشاعت کو ذریعہ آمدنی بنا سکتے ہیں، اسی ذیل میں مختلف تجارتی اداروں کے ٹریڈ مارک، مختلف مصنوعات کی خاص علامتیں، رسائل و اخبارات، تصنیفات و فارمولے، اور ایجادات داخل ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ حقوق نہ کسی شخص پر ہیں اور نہ کسی مادی متعین شے پر، ان حقوق کو تسلیم کئے جانے کی بنیاد یہ ہے کہ کسی شخص کی ذہنی صلاحیت اور اس کی محنت کا ثمرہ اسے ملنا چاہئے اور غیر مادی ہونے کے باوجود یہ ذریعہ تمول ہے، اس لئے اس کو مال کا درجہ ملنا چاہئے۔ یا کسی شخص نے اگر اپنی تجارت کی ایسی ساکھ قائم کر لی ہے کہ اس نام کی ایک قیمت ہو گئی ہے۔ اور دوسرا شخص اس نام اور شہرت کے ذریعہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ اس کی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے۔

پھر حقوق کی دوسری تقسیم یہ کی جانی چاہئے کہ کسی شخص کو کوئی حق شریعت محض اس لئے دیتی ہے کہ اس کو ضرر اور نقصان سے بچایا جاسکے، جیسے حق شفعہ کی مشروعیت محض اس لئے ہے کہ ضرر جو اس سے وہ شخص محفوظ رہے، اور بعض حقوق ایسے ہیں جن کی مشروعیت اصالتاً ہے، مثلاً ایک شخص اوقاف کے مصارف میں وظیفہ پانے کا مستحق ہے کہ وہ واقف کی صراحتوں کے ذیل میں ہے، پس یہ حق ضرر کے لئے نہیں بلکہ بذات خود مشروع ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے حق کی ایک اور تقسیم کی ہے، وہ کہتے ہیں: حقوق شرعیہ وہ ہیں جن کا ثبوت نص سے ہو، اور حقوق عرفیہ جن کا مدار ثبوت محض عرف و تعامل ہو، اس لئے کہ بعض ایسے حقوق ہیں جن کا ثبوت نصوص شرعیہ سے تو نہیں ہوتا لیکن عرف و تعامل کی وجہ سے شرع انہیں حق تسلیم کرتی ہے، جیسے راستہ پر چلنے کا حق، پانی لینے کا حق، پانی بہانے کا حق وغیرہ۔ ان حقوق عرفیہ کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وہ حقوق جن کا تعلق ان منافع سے استفادہ کرنا ہے جو مادی اشیاء کی ذات سے متعلق ہے جیسے حق مرور، حق تعلی، حق تسبیل، حق شرب وغیرہ۔ ان حقوق کو فقہاء احناف حقوق مجردہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔



۲۔ حقوق عرفیہ کی دوسری صورت وہ ہے جسے حق اسبقیت کہنا چاہئے یعنی ایک عام مباح چیز پر جب ایک شخص پہلے قبضہ کر لیتا ہے تو اس اولیت کی وجہ سے اس شئی پر اسے ایسا اختصاص حاصل ہو جاتا ہے جو شرعاً اس کو ایک اختیار عطا کرتا ہے مثلاً کسی غیر مزدور عہد زمین پر کسی شخص نے جھونپڑی بنالی یا قابل زراعت بنا لیا یا اس کا احاطہ کر کے قبضہ و دخل میں لے لیا وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی صورتیں ہیں جن کو سامنے رکھ کر حقوق کی مختلف اقسام متعین کی جاسکتی ہیں، اور ہر قسم کے لئے شرعی احکام کا متعین کرنا بھی ضروری ہے، مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے مقالہ میں حقوق کی جو تقسیم کی ہے اس کا حاصل یہ ہے ”حقوق شرعیہ اور حقوق عرفیہ“۔

اور دونوں ہی قسم کے حقوق یا اصالتاً ثابت ہوں گے یا دفع ضرر کے لئے۔ اس ذیل میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی حق کا معاوضہ حاصل کرنے کی بھی دو صورتیں ہیں: یا حقوق فروخت کر دیئے جائیں اور ان کی قیمت وصول کی جائے، یا کوئی شخص کوئی عوض لے کر دوسرے شخص کے حق میں اپنے حق سے دستبردار ہو جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں مختلف قسم کے حقوق کی بیع کا جو رواج اور تعامل ہے اور جنہیں موجودہ عہد کے سماجی، تمدنی اور معاشی حالات نے پیدا کیا ہے، انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا جائے کہ:

۱۔ بیع کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ مال کی حقیقت کیا ہے؟

۳۔ قابل ادخار ہونے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟

۴۔ حقوق کی بیع جائز ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس قسم کے حقوق کی بیع جائز ہے، اور کس قسم کے حقوق کی بیع جائز نہیں ہے؟

۵۔ حق سے دستبرداری (تنازل عن الحق) کا معاوضہ لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر ہاں تو کس قسم کے حقوق کا ہے، یہ اور اس طرح کے مختلف سوالات اور متعین طور پر ان حقوق کے بارے میں حکم شرعی کی تعیین جو آج کے عرف و رواج میں پہنچے اور خریدے جا رہے ہیں بے حد ضروری ہے۔

براہ کرم مندرجہ بالا سوالات پر اپنے تحقیقی جوابات سے مستفید فرمائیں۔ نیز ایک ایسا اصولی ضابطہ مرتب فرمائیں جس کے ذریعہ یہ امر واضح ہو کر سامنے آجائے کہ کون سی قسم کے حقوق کا معاوضہ بصورت تنازل عن الحق (دستبرداری) وصول کیا جاسکتا ہے اور کس قسم کے حقوق کی خرید و فروخت اور معاوضہ لینا بہر حال درست نہیں ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ جناب والا اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر اس اصولی مسئلہ پر اپنی قیمتی تحریر سے شرکاء کو مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

☆☆☆



## بیع حقوق

اسرار عالم ریڈینس دہلی

اسلام ایک جامع اور مستقل دین ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (آل عمران ۱۹)۔

(بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔

صرف یہی نہیں بلکہ اسلام جامع اور مستقل بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے علاوہ لقیہ ہر دین قابل رد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ (آل عمران ۸۵)۔

(اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں ہوگا)۔

اور اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شریعت اسلامی کے ساتھ زمین پر خلافت کبریٰ قائم فرمائی ہے، جو ملت صحیحہ پر مشتمل ہے، جن کے مابین ارتقا قات صحیحہ قائم ہیں، اور ان میں وہ تمام امور، ان کی مخصوص صورت حال، تقدیر، ہیئت، ترجیحات اور تلازمات شامل ہیں، جن کا ذکر شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ (۱۲۸/۱) میں بالتفصیل فرمایا ہے۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”بعثت بالملۃ السمحة الحنیفیۃ البیضاء“۔

ملت صحیحہ میں ارتقا قات صحیحہ پر قائم خلافت کبریٰ کی اصولیات میں داخل صفات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) الطہارۃ (۲) الاخبات (۳) السامۃ اور (۴) العدلۃ۔

طہارہ عبارت ہے اشراج، سرور اور انس سے، الاخبات عبارت ہے حیرت، خشوع، و خضوع اور تجلیات الہیہ سے، السامۃ عبارت ہے عفت، جدوجہد، صبر، عفو، سخاوت، تقاعد اور تقویٰ سے، اور العدلۃ عبارت ہے ادب، کفایت، حریت، سیاست مدنیہ اور حسن معاشرت سے۔

اس اعتبار سے ایمان کے دو شعبے قرار پاتے ہیں، ایمان کا پہلا شعبہ وہ ہے جس کے چاروں طرف دنیا کے احکام گھومتے ہیں جو جان اور مال کی عصمت سے متعلق ہیں اور ظاہر میں انقیاد سے متعلق ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله ويقيموا الصلوة ويؤتوا الزکوة فإذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم وأموالهم إلا بحق الإسلام وحسابهم على الله“ (بخاری: کتاب الایمان؛ باب فبأن تابوا وأقاموا الصلاة۔۔۔)۔

ایمان کا دوسرا شعبہ وہ ہے جس کے چاروں طرف نجات، فوز، درجات کے احکام جو آخرت سے متعلق ہیں، گھومتے ہیں، جس میں اعتقادات حق، عمل صالح اور عادات فاضلہ سب داخل ہیں، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لا إيمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لا عهد له“ (مسند احمد: کتاب مسند الکشرین؛ باب مسند انس بن مالک)۔

اور اس مجموعہ کو الایمان سے تعبیر کیا گیا، اور تمام چیزوں اور امور کو اس کے شعبے قرار دیئے گئے:

”الإيمان بضع وسبعون شعبة وأفضلها قول لا إله إلا الله وأدناها إمطة الأذى عن الطريق، والحياء شعبة من

الایمان“ (مسئلہ: کتاب الایمان؛ باب بیان عدد شعب الایمان۔۔۔۔۔)۔

مذکورہ امور سے الگ ہٹ کر نہ تو اسلام کو دیکھا جاسکتا ہے نہ شریعت کے قوانین مستنبط کئے جاسکتے ہیں، اور نہ ان قوانین کا انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نفاذ کیا جاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مسائل میں کیوں غور و فکر کر رہے ہیں؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بہ حیثیت انسان اس زمین پر رہتا ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی گزارے، ساتھ ہی ساتھ وہ معاملات میں اپنے ماحول سے متعلق ہے لہذا ایسی حالت میں اسے شریعت کے مطابق مسائل کا احصاء کرنا پڑتا ہے، اور اسے سمجھنے اور حلال و حرام کی تمیز کر کے چلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ آج حاملین قرآن و سنت عام طور پر جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں ان میں مندرجہ ذیل باتیں پائی جاتی ہیں:

- ۱۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پھیل کر ساری دنیا کو محیط ہے۔ اور اب اس کی زندگی پر عالمگیر حادثات کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔
- ۲۔ معاملات کے شعبے میں اکثر و بیشتر حصوں پر وہ نظام عصر نافذ و رائج ہے جس کی بنیاد اسلام کے بجائے کفر ہے، جس کے سبب زمانے میں اجتماعی و انفرادی سطحوں پر غیر عادلانہ نظام اور قدریں رائج ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں شریعت میں غور و فکر اور مسائل و احکام مستنبط کرنے کا رخ کیا ہونا چاہئے اور ہمارے لئے احسن راہ کون سی ہے؟

یہاں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ اسلام جامع، اور مستقل دین ہے اور اس کی کوئی بھی تعبیر و تعمیل فساد کا موجب ہو سکتی ہے جو اس کی جامعیت، کلیت، قطعیت اور استقلال کو مجروح کرتی ہو۔

ایسی حالت میں مسائل شرعیہ میں غور و فکر اور تعبیر و تنقید کا رخ کیا ہو؟ توسیع یا تطبیق، توسیع سے مراد ہے زندگی کی انفرادی اور اجتماعی شعبوں کے بعض حصوں میں باقی اور رائج احکامات و قوانین شرعیہ کو ممکنہ حد تک توسیع دینا اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں شریعت کو اس کی اپنی روح، معنویت اور ترجیحات کے عین مطابق رائج و نافذ کرنا۔ اور تطبیق سے مراد ہے شعبہ ہائے زندگی میں جہاں اسلام کا نظام قوانین رائج نہیں ہے وہاں اس میں اور شریعت میں غور و فکر کر کے ایسی راہ تجویز کرنا اور ایسے طریقے وضع کرنا جو ایک طرف حلال یا کمال درجہ میں مکروہ ہوں اور دوسری طرف عصری نظام میں چلنے کی گنجائش پیدا کرتے ہوں، اور عدم ارتقاات میں مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرتے ہوں یا عصری نظام میں زندگی بسر کرنے کے لئے مطابقت پیدا کرتے ہوں۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ سوچنے کا صحیح رخ تو وہی ہے جسے یہاں توسیع سے تعبیر کیا گیا ہے، بلاشبہ اس میں وقتی طور پر اور ضرورتاً اس کی گنجائش ہے کہ عصری غیر عادلانہ نظام کی بعض صورتوں کے لئے عامۃ المسلمین کے لئے ایسی تجاویز پیش کی جائیں تاکہ وقتی طور پر مسلمان ضرورتاً ہوں یا کمتر برائی کو اختیار کریں، یا ایسی وقتی شکل نکال لیں جو غیر عادلانہ نظام میں زندگی گزارنے کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ہو سکے۔ لیکن شریعت کا رجحان اس باب میں اپنی جگہ واضح ہے کہ وہ بندوں کے لئے تنگی کے بجائے آسانی پسند کرنے کے باوجود اس طرف زیادہ مائل ہے کہ عند الضرورت اباحت و مندورات میں توسیع کی بجائے ضرورت کی تعیین و تحدید میں سختی کی جائے۔ اس حدیث نبوی کا رجحان کہ۔

”العبادة في الهرج كحجرة الى.....“

یادہ حدیث نبوی: ”فدور و امع الكتاب حيث دار“ غالباً اسی جانب ہے۔

مسئلہ زیر بحث کے مطابق۔ ”ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں مختلف قسم کے حقوق کی بیع کا جو رواج اور تعامل ہے اور جنہیں موجودہ عہد کے سماجی، تمدنی، اور معاشی حالات نے پیدا کیا ہے، انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا جائے کہ:

۱۔ بیع کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ مال کی حقیقت کیا ہے؟

۳۔ قابل ادخار ہونے کا مفہوم کیا ہے؟

۴۔ حقوق کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس قسم کے حقوق کی بیع جائز نہیں ہے؟

۵۔ حق سے دست برداری (تنازل عن الحقوق) کا معاوضہ لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر ہاں تو کس قسم کے حقوق کا؟

ان امور پر بحث کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل چند تنقیحات ضروری ہیں:

۱۔ غور و فکر کا صحیح طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ اصولیات و فروعات اور ان میں Macro اور Micro ہر دو سطحوں پر غور ہو اور نقطہ نظر Comprehensive Holistic ہو۔ لہذا مسئلہ مذکورہ میں اسلام کی اصولیات و فروعات اور شریعت میں موجود ہر نکتہ کا احصاء ہونا چاہئے۔

۲۔ مذکورہ عصری الفاظ و اصطلاحات اور شرعی و معروف اصطلاحات کے اشتباہ (Confusion) اور ان کی باہم آمیزش کو ملحوظ رکھنا اور دونوں کو واضح طور پر الگ الگ رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ مذکورہ مسائل کو خالص اسلامی فضا اور ترجیحات کی روشنی میں دیکھا جائے۔

ان تنقیحات کے مطابق کئی باتیں غور طلب ہیں:

۱۔ سوالات کی ترتیب اور ان کا Emphasis اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ عصری، معاشیاتی نظام کی اصطلاحات Transaction, Price, Economic goods, Wealth اور اس سے ملتے جلتے شرعی اصطلاحات میں زبردست confusion کام کر رہا ہے۔

۲۔ (معذرت کے ساتھ) بعض چیزوں مثلاً Trade Mark, Transaction of services, Copy Right کے بارے میں شرعی حکم معلوم کرنے کی بجائے اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ ان کی گنجائش نکالی جائے۔

ورنہ سوالات کا انداز اور ترتیب مختلف ہوتی۔

لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ہم شکل الفاظ و اصطلاحات، جو عصر حاضر کے معاشی نظام میں مستعمل ہیں، اور شریعت و فقہ میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن جو اپنی معنویت کے اعتبار سے بالکل الگ ہیں، کی توضیح ہو۔ بحث کو مختصر رکھنے کے لئے صرف دو الفاظ زیر بحث لائے جاتے ہیں: مال اور اشیاء مانعہ جس کے تحت حقوق اور صلاحیت وغیر ہم بھی آتے ہیں۔

## نظام عصر

### تعریف مال:

نظام عصر کے تصورات کے تحت مال کے لئے کئی الفاظ رائج ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ مثلاً Wealth, Desirable Things, Economy Goods, Goods

wealth کی تعریف ہے۔ مارشل کا قول ہے:

"All wealth consist of disirable things"  
(Principles of Economics P. 45)

Goods کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"Things which satisfy human wants directly or inderectly " (Principles of Economics. P.45)

لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہر Wealth, Desirable things نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسے Desirable thing کو جو Wealth ہے ایک اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں اور وہ ہے Goods۔

اب وہ Desirable things of Goods کی تقسیم فرماتے ہوئے کہتے ہیں:



"Desirable things of Goods are material or Personal and immaterial of non material"  
(P.45)

Material things کے ذیل میں فرماتے ہیں:

Material goods Consists of useful material things and of all Rights to hold, or use, or derive benefits from material things, or is receive them at a future time. Thus they include the physical gifts of nature, land and water, air and climate the product of agriculture, mining, fishing, and manufacture, buildings, machinery and implements; mortgages and other bounds; shares in public and private companies; all kinds of monopolies patent Rights, Copyrights, also Rights of way and other rights of usage, lastly opportunities of travel, access to good scenery, diments of material facilities, external to a man; though the faculty to appreciate them is internal and perssonal".

Material Things\_Non کے ذیل میں لکھتے ہیں:

Non-material things "A man's non-material goods fall into two classes. One consists of his own qualities and faculties for action and for enjoyment; such for instance as business ability, Professional skill, or the faculty of deriving recreation from reading or music. All these lie with in himself and are called internal. The second class are called external because they consist of relation, beneficial to jim with other peoples. Such, for instance, were the labour dues and personal services of various kinds which the ruling classes used to require from their serfs and other dependents. But these have passed away; and the chief instances of such relations beneficial to their owner now \_a\_ days are to be found in the goodwill and business connections of traders and professional men" (P.45\_46).

اس طرح Wealth Goods کی جو جامع تعریف اپنی کیفیات کے اعتبار سے ہو سکتی ہے وہ اس طرح ہے:

Wealth goods "A stock of goods existing at a certain time that conform to the following requirements: (i) they must possess utility, that is they must have hield satisfaction, (ii) they must have a monye value (iii) they must be limited in supply; and (iv) it must be possible to transfer their ownership from one person to another. All wealth must be owned by soweoul, either by individuals or by groups or by the community as a whole".

(A Dictionary of Economics and Commerce)

## نظام عصر کا تصور مال

ان تعریفات سے روئے ارضی اور اس کی فضا میں پائی جانے والی ہر نافع چیز مال شمار ہوتی ہے۔ یہ دراصل عکس ہے اس تصور کا جس پر یہ نظام قائم ہے۔ ان تصورات کو اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ساری زمین اور اس پر پائے جانے والے تمام وسائل کا مالک کل حقیقی انسان ہے۔

۲۔ زیادہ سے زیادہ فلاح زیادہ سے زیادہ اشیاء پر ملکیت پر منحصر ہے۔

۳۔ ملکیت سے انتفاع کیا جانا چاہئے۔

۴۔ انتفاع کی شکل زر کی شکل میں معاوضہ ہے۔

۵۔ لہذا زیادہ سے زیادہ فلاح یا ب ہونے کے لئے ہر شے کو اپنے لئے قابل انتفاع بنایا جائے یعنی اس کا commercialisation

یعنی pricing ہو۔

۶۔ کسی کی ملکیت سے دوسروں کے لئے انتفاع کی صرف ایک شکل ہے، اور وہ ہے قیمتاً مبادلہ، یعنی ہر شے کی selling and buying۔

۷۔ لہذا دنیا میں ہر شے صرف قابل فروخت اور قابل خرید ہے۔

ان تصورات کا بنیادی مآخذ تصور توحید کا انکار ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ذاتیہ (الحیاء، والقدرة، والعلم، والكلام، والسمع، والبصر، والإرادة) اور صفات فعلیہ (التخلیق، التریق، الانشاء، والابداع، والصنع) کا انکار لازم آتا ہے، یہی سبب ہے کہ اس بنیاد پر ارتقاء پانے والے نظام ہر سطح پر ربانی نظام کے خلاف ہے۔

اسلام میں مال اور تصور مال:

اسلام کا تصور مال نظام عصر کے تصور مال سے بالکل الٹا اور مخالف ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مال کی تعریف کرنے سے قبل اسلام کے تصور مال کی وضاحت کر دی جائے جس سے خود بخود فقہاء کے ذریعہ مال کی تعریف متعین کرنے کا مفہوم اور مال میں پائی جانے والی صفات اور اس سے متعلق احکام کی علت واضح ہو جائے۔

اسلام کے تصور مال کے پیچھے مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ بدیع، خالق اور مدبر ہے، اس ذیل میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اعلم أن الله تعالى بالنسبة إلى إيجاد العالم ثلاث صفات مترتبة، إحداها الإبداع، وهو إيجاد شيء لا من شيء، فيخرج الشيء من كتم العدم بغير مادة، والثانية: الخلق، وهو إيجاد الشيء من شيء والثالثة تدبير العالم الموالي و مرجعه إلى تغيير حوادثها موافقة للنظام الذي ترضيه حكمة مفضية إلى المصلحة التي اقتضاها جوده (حجة الله البالغة)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے زمین پر معاش بنایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَجَعَلْنَا فِيهَا مَعَايِشَ“ (اعراف ۱۰)۔

”وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ“ (الحجر ۲۰)۔

”لَنْحْنُ قَسَبْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا“ (زخرف ۳۲)۔

۳۔ زمین اور اس میں موجود سارے معاش کی حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ...“ (البقرہ ۲۸۴)۔

۴۔ معاش میں فرق اللہ کی حکمت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حُرْبِيًّا“ (زخرف ۳۲)۔

۵۔ ان معاش کا انسان کیلئے انتفاع مباح کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ“ (البقرہ ۲۶، الاعراف ۳۲)۔

اور اس میں ان کے لئے اختصاص مقرر کیا گیا ہے جسے عام طور پر ملکیت کہتے ہیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”من أحيأ أرضاً ميتة فهي له“ (بخاری: كتاب المزارعة؛ باب من أحيأ أرضاً مواتاً)۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی اصل وہ ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ سب خدائے تعالیٰ کا مال ہے۔ اور فی الحقیقت اس میں کسی کا حق نہیں ہے مگر خدا تعالیٰ نے زمین اور زمین کی چیزوں سے نفع کرنے کو مباح کیا ہے۔

۶۔ یہ معاش اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق قابل انتفاع ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”فَمَا أَوْتَيْنَاهُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا“ (الشوریٰ ۳۶)۔

۷۔ معاش کے لئے حیاۃ اموال مباحہ اور اس میں استثناء کے لئے معاونت ضروری ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے واجب قرار دیا ہے، ہاں شرط ہے کہ ایک دوسرے پر تنگی نہ کریں جس سے تمدن کا فساد لازم آئے۔

۸۔ اس لئے استثناء خلاف ضابطہ ممنوع ہے مثلاً استثناء بغیر معاونت جیسے قمار، اور رضامندی بجز مثلاً سود۔

۹۔ عام انتفاع کی اشیاء پر ملکیت ویسی نہیں ہے، کیونکہ ضرر عام کا موجب ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ”لا حمی الا للہ ورسولہ“۔ گھاس، ہوا، پانی، مٹی اسی ذیل میں ہیں۔

۱۰۔ معاش میں فرق اور ان کے تحت پیدا ہونے والی صورت حال خواہ ضروراً ہو یا حرص یا کسی اور سبب سے، کو رفع کرنے کے لئے (۱) مزاحمت کو ممنوع اور (۲) ایک دوسرے کی ملکیت سے انتفاع کے لئے مبادلہ و رضاعت اور تبرع اور تعاون کا حکم من اللہ وضع کیا گیا۔

۱۱۔ زمین پر پائی جانے والی اشیاء دو اقسام کی ہیں: حلال اور حرام۔ تمام حلال متاع معاش ہیں، اور حرام کی دو قسمیں ہیں: حرام لعینہ اور حرام لغیرہ۔ تمام حرام لعینہ اپنی اس شکل میں معاش نہیں، خون اور سوراہی میں داخل ہیں۔

۱۲۔ انتفاع اور نمو کے اعتبار سے تمام معاش چار قسموں کی ہیں:

(۱) الاموال النامیہ جس میں (الف) اموال المناسلہ السائمۃ (ب) اموال زروع، اور (ج) اموال تجارت آتے ہیں۔ (۲) اموال الدثور والکنوز، (۳) الاموال النافعہ، (۴) ردوس کا سین۔

۱۳۔ ملکیت قابل انتفاع معاش دو شکلوں میں پائے جاتے ہیں: (۱) بصورت عین، اور (۲) بصورت غیر عین۔

۱۴۔ ایک دوسرے کی بصورت عین زیر ملکیت قابل انتفاع معاش سے انتفاع کی شکل مبادلہ اور اس کے تحت تمام امور مثلاً بیع وغیرہ، اور اس کے تحت تمام امور مثلاً صدقہ، ہدیہ، وصیت، ہبہ، عاریت کے ذریعے ہے۔

۱۵۔ ایک دوسرے کی بصورت غیر عین زیر ملکیت قابل انتفاع معاش یا ایسے انتفاع جس میں معاش بصورت مال وغیر مال دونوں پائے جاتے ہوں، کی شکل معاونت یا تعاون اور اس کے تحت تمام امور مثلاً مضاربت، مفاوضہ، عنان، شرکتہ الصناع، مساقاۃ، مزارعت، مخابرہ اور اجارہ (خواہ غالب مبادلہ یا غالب معاونت) ہے۔

۱۶۔ مندرجہ ذیل کو مال کی شکلوں میں شمار کیا جاسکتا ہے:

(الف) بحیثیت معیار یعنی (۱) ذوات الامثال (سونا، چاندی، گیہوں) اور (۲) ذوات القیم (گائے، بیل وغیرہ)۔

(ب) بحیثیت شمینت یعنی (۱) ثمن خلقی (سونا چاندی)، (۲) بیع (ثیاب و دواب)، (۳) من وجہ ثمن من وجہ بیع (مکیلات، موزونات، عدویات متقاربہ) اور اثمان مصطلحہ۔

اب ہم ذیل میں فقہاء امت کی آراء اور اس کے مفاہیم سے بحث کرتے ہیں: دنیا میں پائے جانے والے تمام زیر ملکیت معاش میں غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ دو قسموں کی ہیں یا دو شکلوں میں پائی جاتی ہیں:

۱۔ عین کی شکل میں مثلاً گیہوں، سونا وغیرہ۔



۲۔ مطلق مباح منفعت اور صلاحیت کی شکل میں مثلاً مرور طریق، قوت بازو، مزدوری وغیرہ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال یعنی اعیان اور منفعت خواہ مطلق مباح منفعت ہو یا صلاحیت میں الگ الگ علتیں پائی جاتی ہیں۔

اعیان میں پائی جانے والی علتیں:

- ۱۔ اعیان میں پائی جانے والی پہلی علت یہ ہے کہ وہ مکلف نہیں (غلام یا لونڈی اگرچہ اس معیار پر نہیں لیکن غالباً وہاں موانع تکلیف یا عوارض کے اعتبار سے غیر اختیاری موانع کا پایا جانا ثابت ہے۔
- ۲۔ اعیان میں عینیت پائی جاتی ہے اور اس عینیت کی ہلاکت عین کی ہلاکت ہے۔
- ۳۔ عینیت پر گرفت اور قبضہ ممکن ہے۔
- ۴۔ اعیان کے مبادلہ پر ہمیشگی کا حکم لگ سکتا ہے یعنی اعیان کی ملکیت ہمیشہ کے لئے منتقل کی جاسکتی ہے، ایسا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔
- ۵۔ اعیان کا تبادلہ فعل تبادلہ کی حد تک آزاد اور کسی دوسری شے سے کلیتہً منتقلی ممکن ہے۔

منفعت یا صلاحیت میں پائی جانے والی علتیں:

- ۱۔ بعض منفعت مکلف ہو سکتے ہیں مثلاً صلاحیت انسان کہ خود انسان اپنی جگہ مکلف ہے، خواہ وہ صلاحیت کا مفید استعمال کرے یا نہ کرے۔
- ۲۔ منفعت میں عینیت پائی جاسکتی ہے، مگر منفعت اس کا عرض ہو جو غیریت کا حامل ہے۔ لہذا وہاں دو صورت واقع ہو سکتی ہے۔ عین کے ہلاک ہونے اور بظاہر منفعت و صلاحیت کے ہلاک نہ ہونے سے بھی منفعت و صلاحیت ہلاک ہو سکتی ہے۔
- ۳۔ جب بھی منفعت و صلاحیت کے تبادلہ کا معاملہ ہوگا منفعت کے ساتھ ساتھ عینیت بھی چلی جائے گی، یا متاثر ہوگی۔
- ۴۔ منفعت و صلاحیت پر گرفت و قبضہ ممکن نہیں، اور جو کچھ ممکن ہے وہ اس منفعت و صلاحیت سے منسلک عینیت پر ہے۔
- ۵۔ منفعت یا صلاحیت کے مبادلہ پر ہمیشگی کا حکم نہیں لگ سکتا۔ یا تو غرر لازم آئے گا یا علمی اور جہل۔
- ۶۔ منفعت و صلاحیت کا تبادلہ فعل تبادلہ کی حد تک آزاد نہیں بلکہ دوسرے امور و اشیاء سے منسلک ہے، مثلاً Trade Mark کہ حکومت کی نگرانی اور قانون سے قائم ہے۔

اس اعتبار سے مال میں مندرجہ ذیل باتیں پائی جاسکتی ہیں:

- ۱۔ اس کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو، یعنی وہ مرغوب ہے۔
  - ۲۔ بوقت ضرورت مفید ہو یعنی قابل ادخار ہو، خواہ مواد کی شکل میں ہو خواہ نقد کی شکل میں۔
  - ۳۔ شرع کی نگاہ میں وہ چیز قیمت رکھتی ہو، یعنی اس میں دو باتیں پائی جاتی ہوں۔ یعنی وہ ایسی شے ہو کہ بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھانا شرعاً روا ہو۔
- اس طرح مطلق مباح منفعت یا صلاحیت میں مندرجہ ذیل باتیں پائی جاسکتی ہیں:
- ۱۔ یا مرغوب نہ ہو یا ضرورتاً مرغوب ہو۔
  - ۲۔ مستقل یعنی تنہا قابل ادخار نہ ہو۔
  - ۳۔ اس اعتبار سے قیمتی تو ہو کہ بوقت ضرورت فائدہ اٹھایا جاسکے مگر قابل ادخار و قبض نہ ہو۔
  - ۴۔ وہ شے قیمتی تو ہو مگر بوقت ضرورت فائدہ اٹھانا اس سے ممکن اس لئے نہ ہو کہ وہ قابل ادخار نہ ہو۔ یا قابل قبض نہ ہو تو پھر اس سے فائدہ اٹھانا شرعاً کیسے روا ہو سکتا ہے لہذا یہ کہ رو ابنانے کی شکل پیدا کی جائے یعنی معاونت کا اجراء ہو۔

اس کے مطابق احناف کے یہاں مال کی جو تعریف کی گئی ہے وہ نقل اور عقل کے مطابق ہے، مال سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور وقت ضرورت کے لئے اس کو ذخیرہ کرنا ممکن ہو۔ اور مالیت تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتا ہے، اور تقویم اس سے بھی ثابت ہوتا ہے، اور شرعاً اس سے انتفاع جائز کرنے سے بھی ہوتا ہے (رد المحتار لابن عابدین ۴/۳)۔

”مال اس غیر انسان کا نام ہے جو انسان کے مصالح کے لئے پیدا کیا گیا ہو، اور اپنے قبضہ میں لے لینا اور اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا ممکن ہو“ (حاوی قدسی، البحر الرائق ۲۵۷/۵)۔

”مال سے مراد وہ عین (مادی اور محسوس چیز) ہے جس کے بارے میں لوگوں میں تنافس ہوتا ہے اور اس کا استعمال کیا جاتا ہو“ (الدر المنقہ بیہامش مجمع الانہر ۳/۲)۔

”مال ہر وہ عین ہے جو لوگوں کے درمیان مادی قیمت رکھتا ہو“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ڈاکٹر وہبہ زحیلی ۳/۳۵۵)۔

### مذکورہ علل کی مصلحتیں:

- ۱۔ انسان میں معاش کی ملکیت کی رغبت ہے لہذا مال کی تعیین سے اس جذبہ کی تسکین ہوتی ہے۔
- ۲۔ معاش کی غیر محدود ملکیت اس کے لئے نافع یا ایک کے لئے غیر ضروری اور دوسروں کے لئے باعث ضرر ہے، اس لئے اس کی تحدید اس کے لئے بھلائی اور بہتری کا موجب ہے۔
- ۳۔ معاش کی تحدید مال کا ایسا تصور اور ایسی تعریف ہے جو اسے اعیان، مال متقوم میں محدود کرتی ہے اور غیر اعیان، غیر مال متقوم اور معاش نافعہ مثلاً مٹی، پانی، ہوا، ریت کو اس سے خارج کرتی ہے۔
- ۴۔ انسان کے اندر محض ملکیت کی رغبت نہیں پائی جاتی بلکہ وہ بلا تعیین مدت ملکیت چاہتا ہے، جو بعض معاملات میں نافع، قابل عمل اور بعض معاملوں میں غیر نافع اور غیر قابل عمل ہے، لہذا معاش میں ان معاملوں میں اس کی ملکیت بلا تعیین مدت تسلیم کی گئی یا اس کی اجازت دی گئی جس حد تک اس کے لئے نافع تھی۔ اور وہ تحدید مال سے ہوتی ہے۔ یعنی اعیان، مال متقوم میں۔
- ۵۔ اور اس کے حصول کی صورت بیع یا تبرع میں محدود رکھی گئی ہے۔
- ۶۔ ایسے معاش جن کی ملکیت بلا تعیین مدت نہ ممکن تھی نہ واضح تھی نہ نافع، انہیں تعیین مدت کے ساتھ استفادہ کی اجازت دے کر مال کی تعریف سے خارج کر دیا گیا۔ مثلاً منفعت وصلاحیت اور حقوق مجرودہ وغیرہ، اور اس کے حصول کی صورت معاونت میں محدود رکھی گئی۔
- ۷۔ اگر مال محدود نہ رکھا جاتا یا بیع کو غیر مال میں محصور کیا جاتا تو تبرع اور معاونت کا خاتمہ ہو جاتا اور ہر معیشت بیع ہوتی اور ہر شے کا حصول بیع سے ہو سکتا۔
- ۸۔ مال کے اس تصور سے انسانوں کو ہمہ گیر غلامی سے محفوظ رکھا گیا۔ اگر سارے اعیان وغیر اعیان، حقوق وصلاحیت اور منفعت کو مال شمار کر لیا جاتا جن میں بیع روا ہوتی تو ممکن تھا کہ روئے ارضی پر پائی جانے والی ہر ایسی شے تا ابد کسی ایک فرد میں مجتمع ہو جاتی۔
- ۹۔ بعض منفعت وصلاحیت کا تعلق اہلیت سے ہے جس پر تقدیر و تکلف کا حکم جاری ہوتا ہے۔ پھر ایسی شے مال کیسے قرار دی جاسکتی ہے، اور دوسری بات یہ کہ ان کی بیع کیسے ہو سکتی ہے اور اگر ہو تو اہلیت میں خلل واقع ہوگا۔ اور دوسری طرف: بیع کے شرائط پورے نہیں ہوں گے۔ مثلاً اہلیت پر امور معترضہ خواہ وہ ساوی ہوں یا مکتسب اس سے غرر اور مجہول ہونا لازم آئے گا۔

### بیع:

حصول معاش کی تین بڑی شکلوں یعنی (۱) مبادلہ (۲) تبرع اور (۳) معاونت میں سے بیع معروف معنوں میں کس ذیل میں آتا ہے۔ بیع کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ عاقدین یکساں ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک عملاً بائع اور مشتری ہوتا ہے، شاید یہی سبب ہے کہ بیع دونوں معنوں میں مستعمل ہے اور دونوں عاقدین کے ساتھ ساتھ عوضین بھی ہوتے ہیں۔ یہ عوضین ہر ایک کے لئے عوض ہوتا ہے۔

دیکھنا چاہئے کہ یہ دونوں صفت بیع کو حصول معاش کی کس قسم میں داخل کرتی ہے۔ بیع یقیناً تبرع نہیں ہے کہ تبرع میں ایک فریق حسن سلوک کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا آخذ۔ اور معاونت بھی نہیں اس لئے کہ اس میں عوضین نہیں پائے جاتے ہیں، اور پھر معاملہ ہونے پر بات ختم ہونے کی بجائے شروع ہوتی ہے۔ اور دونوں الگ ہونے کی بجائے عملاً مل جاتے ہیں، اور تیسری بات یہ کہ اس میں معاہدہ کی صفت پائی جاتی ہے اور عاقدین اپنے اپنے عوضین پر قبضہ نہیں کر سکتے۔

لہذا الاحوال یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ بیع نہ تبرع ہے نہ معاونت بلکہ مبادلہ ہے۔

اور اگر بیع مبادلہ ہے تو اس میں درج ذیل چیزیں پائی جانی چاہئیں:

- ۱۔ عوضین
  - ۲۔ عاقدین
  - ۳۔ وہ چیز جو عاقدین کے اس مبادلہ پر راضی ہونے پر ظاہری دلیل ہو یعنی (مظنہ ظاہرہ برضاء العاقدین بالمبادلۃ) یعنی وہ شے جو عاقدین کے مابین منازعت کو قطع کرنے والی اور عاقدین پر عقد کو لازم کرنے والی ہوتی ہے۔
  - ۴۔ عاقدین میں شرط یہ ہے کہ دونوں آزاد و عاقل و نفع و نقصان کو پہنچانے والے اور عقد کو بصیرت و ثبات سے کرنے والے ہوں۔
  - ۵۔ عوضین میں شرط یہ پائی جائے کہ دونوں قابل انتفاع اور قابل رغبت ہوں۔
  - ۶۔ عوضین ان اموال سے نہ ہو جو ہر شخص کے لئے مباح ہے۔
  - ۷۔ اور نہ اس قسم کا مال ہو کہ لوگوں کو اس میں قابل اعتبار فائدہ نہ ہوتا ہو۔
- اس اعتبار سے بیع کی وہی تعریف قرار پاتی ہے جو احناف نے کی ہے یعنی ”مال کا تبادلہ مال سے“ (المحررات ۱/۲۵۶، فتح القدیر ۵/۷۳)۔
- ”ایک مرغوب چیز کا دوسری مرغوب چیز سے“ (بدائع الصنائع، الدر المختار)۔
- ”بیع مال سے مال کے تبادلہ کا نام ہے“ (بدائع الصنائع)۔

صرف یہی نہیں بلکہ دو عاقدوں کے ذریعہ دو مالوں کے بیچ بیع کا معاملہ ہوتا ہے تو اس کا ایک ہی رکن ہو سکتا ہے یعنی ایجاب و قبول۔ اور یہی احناف کا مسلک ہے، لیکن دین تو مظنہ کے اظہار کا عملی نتیجہ ہے، جہاں تک بیع کا معاملہ ہے تو ایجاب و قبول سے پورا ہو جاتا ہے، اگر غور کیا جائے تو دوسرے ارکان بیع جس کا لوگ تذکرہ کرتے ہیں، یعنی عاقد، معقود علیہ اور ان کی دو قسمیں، یہ سب مال کا تبادلہ مال میں داخل ہیں جس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ اس طرح مال کی مذکورہ تشریح کو سامنے رکھ کر بیع کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں:

- ۱۔ مقایضہ یعنی تبادلہ مال بمال۔
  - ۲۔ صرف یعنی نقدی بہ نقدی۔
  - ۳۔ سلم یعنی نقدی کو کسی شے سے فروخت کرنا۔
  - ۴۔ بیع مطلق، اگر کوئی شے نقدی سے دست بدست یا ادھار فروخت کی جائے۔
- مال اور اشیائے نافعہ (بشمول صلاحیت و منفعت) کے بعد ایک لفظ اور ہے جو نظام عصر میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اتفاقاً ایک ہم شکل لفظ شریعت اسلامی میں بھی رائج ہے جس سے confusion ہوا کرتا ہے، وہ لفظ ہے حق یا Right۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے عصری نظام میں Right کی اصطلاح کو سمجھیں، جہاں تک اس کے مفہوم کا تعلق ہے تو اس کا لغوی مطلب ہے:

"Justification, Fair Claim being entitled to Priviledge or immunity thing one is entitled to" (COD).



لیکن نظام عصر میں جب ان امور کا جائزہ بغور لیا جائے جہاں ان Rights اور ان کے تحت Entitlement پایا جاتا ہے تو اس کی معنویت دوسری نظر آتی ہے۔

یہاں ذیل میں Copy Right, Trade Mark اور Patent Right کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ Copy Right کی تعریف ہے:  
"The sole right to reproduce a literary work or a musical composition, it gives the owner a monopoly of a particular piece of property, which like other property can be assigned in return for Payment to another person or persons".  
(Dictionary of Economics and commerce London)

ادبی کاپی رائٹ مصنف کے مرنے کے بعد ۵۰ سالوں تک قائم رہتا ہے۔ اور موسیقی کاپی رائٹ اشاعت سے ۵۰ سال تک۔ (Beme 1886, Paris 1972, Stockholm 1958, 1911)

Trade Mark کی تعریف ہے:

"Distingshing marks attached to goods which have been registered under the Trade Marks acts and which then can not be used by any other producer thus giving the proprietor of the trade mark some degree of monopoly power" (ibid)

ٹریڈ مارک کارجسٹریشن پہلے سات سالوں کے لئے ہوتا ہے پھر قابل تجدید ہے۔

Patent Rights کی تعریف ہے۔

"The granting by the crown of the exclusive eights to a new machine or process for a period of sixteen years with the possibility of renewal for a further five or ten years. The possession of patent rights gives the owner some degree of monopoly power and so is one of the causes of competition being in perfect " (ibid).

اب جہاں تک Trade Mark کا تعلق ہے عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ:

۱۔ یہ تجارت یا مصنوعات کی نیک نامی کی علامت ہے۔

۲۔ گاہکوں کی رغبت و بے رغبتی کا سبب ہو جاتا ہے۔

۳۔ نقال ان نشانوں کا استعمال کرنے لگتے ہیں۔

۴۔ تاجروں کے عرف میں ناموں کے رجسٹریشن کی مادی قیمت ہو گئی ہے۔

غالباً یہ باتیں اصل حقائق پر مبنی نہیں اور نہ Trade Mark کی ترویج کا اصلی سبب اور اصلی ترتیب ہے۔

اس لئے کہ Trade Mark کی اصل غایت مصنوعات کی خوبی اور اس کی طلب کو محفوظ رکھنا ہے۔ تو یہ اصل غایت Trade Mark سے پوری کہاں ہوتی ہے؟ اس لئے کہ نقال جو اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ اس کی نقل کر سکیں وہ اس Trade Mark کا غیر قانونی استعمال کر کے اپنی بظاہر نقالی کو مزید سندنیک نامی عطا کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ بازار میں کوئی Trade Mark رائج نہیں۔ اور ایک شئی دس لوگوں کے ذریعہ تیار کر کے بازار میں بھیجی جاتی ہے جن میں مثلاً زید کی مصنوعات سب سے عمدہ، بکر کی اس سے کمتر اور عمر کی اس سے کمتر ہے۔ اب کوئی نشان نہیں۔ لہذا لوگ خود سامان کی خوبی و صفت کے لحاظ سے اس کی طلب اور قیمت طے کریں گے، جو زیادہ عمدہ ہوگی زیادہ فروخت ہوگی، درجہ بدرجہ نقالی کا امکان نہیں ہوگا۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ نظام عصر کے معاشی رویہ میں اس کے معرض وجود میں آنے کی یہ ترتیب اور غایت نہیں۔

جیسا کہ ماقبل عرض کیا جا چکا ہے کہ نظام عصر میں مال یا دولت Goods or Wealth شامل ہے دیگر چیزوں کے ساتھ زراعتی، معدنی، آبی اور مصنوعات کی پیداوار کو، ہر طرح کی Monopolies کو Copy right, Patent Rights کو، گذرگاہ اور دوسرے استعمالات کے Rights کو، اس طرح یہ چیزیں مال ہوں، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ نظام عصر کے تصور مال میں دیگر امور کے ساتھ یہ امور بھی شامل ہیں یعنی:-

۱- زیادہ سے زیادہ فلاح زیادہ سے زیادہ اشیاء کی ملکیت کی توسیع پر منحصر ہے۔

۲- ملکیت سے انتفاع کیا جانا چاہئے۔

۳- انتفاع کی شکل میں زر کی شکل میں معاوضہ ہے۔

لہذا زیادہ سے زیادہ فلاح کے حصول کے لئے ہر شے کو اپنے لئے قابل انتفاع بنایا جائے، یعنی اس کا commercialisation ہو یعنی Pricing ہو۔

لہذا انتفاع کی سب سے عمدہ شکل Monopolisation ہے۔

اب یہاں شخص مذکور نے حکومت سے (سازباز) معاہدہ کر کے اس بات کی کوشش کی کہ جہاں اس کی مصنوعات کی طرح بہت سی دیگر مصنوعات ہیں، لہذا اپنی مصنوعات میں monopoly کا مادہ پیدا کیا جائے۔ لہذا حکومت نے اس باب کر اس کی مصنوعات میں Monopoly کا حق عطا کر دیا۔ جس کی طرف خود مذکورہ تعریف اشارہ کرتی ہے۔

اس سلسلے میں کئی اور باتیں قابل ذکر ہیں:

۱- عموماً یہ عمل ایسی مصنوعات میں ہوتا ہے جو Momopolistic حتی کہ Perfect Competition تک میں ہوتا ہے، monopoly تو پھر monopoly ہی ہے۔

۲- مخصوص Trade mark اور اس میں مخصوص اور الگ الگ Colour یا Wrapper کا استعمال گا ہوں کو فریب دینے کے لئے ہوتا ہے۔

یہ فریب کئی اعتبار سے ہوتا ہے:

۱- Price competition کے ذریعے۔

۲- Non Price competition کے ذریعے۔ اس میں Non price competition کے ذریعے جو فریب دیا جاتا ہے اس کا زیادہ انحصار Trade mark پر ہوتا ہے۔ اس میں Product Variation (Sales Promotion activities) Selling Advertising, Satisfies، اہم ہیں۔

اس میں Product variation کے تحت ایک ہی شے برائے نام فرق کے ساتھ کئی قیمتوں پر ایک ہی Trade mark کے تحت لائے جاتے ہیں، جن میں کھلا فریب ہوتا ہے، Selling activity میں advertising بھی ایک طرح کا فریب ہوتا ہے۔

لہذا Trade mark نہ مشابہ حق و وظائف کی ثابت علی وجہ الاصلہ ہو، نہ اس حق کے مثل جو مادی چیز میں مستقر ہو بلکہ یہ ظلم اور فریب کے ذرائع میں سے اہم ترین ذریعہ ہے۔

مزید ازیں اس میں یک گونہ وہ کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو اس حدیث میں ہے کہ:

”الحلف منفقة للسلمة لمحقة للبركة“ (بخاری: کتاب البیوع؛ باب یحق اللہ الربا۔۔۔)۔

جہاں تک Right Patent کا معاملہ ہے تو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ:

اگرچہ نظام اپنے یہاں رائج Patent Right کو wealth اور goods تصور کرتا ہے اور اس پر ان سارے امور کو جاری کرتا ہے جس کا تذکرہ Trade Mark کے ذیل میں کیا گیا ہے، لیکن ہمارے یہاں اسے لفظوں کی بنیاد پر حقوق سے مشابہ قرار دے کر اس میں حق اسبقیت ثابت کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں بھی Momopolisation کو جاری کرنا ہے، اور یہ اس طرح ہوتا ہے جس طرح Trade marks کے معاملے میں ہوتا ہے۔

اگرچہ فی الواقع حق اسبقیت ہے تو سولہ سالوں کی یا اس طرح کی مدت کی تحدید و تعیین کیا معنی رکھتی ہے، جو شخص حق اسبقیت رکھتا ہے اگر وہ حق سے دست بردار نہ ہو تو تاحیات اس پر قائم رہ سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مال میں صفت مرضیہ کی ایجاد سے اصلاح ایک صفت ہے اور اسے کرنے کا ہر شخص حقدار اور مجاز ہے اگر وہ کر سکتا ہے، خواہ کسی مخصوص صفت سے بہتر کرے یا کمتر کرے، جس ایجاد کردہ مشین یا process کے مثل مشین یا پروسیس تیار کر لیا اس نے صفت پیدا کر لی۔

لہذا یہاں اسبقیت سے کیا مراد ہے؟

Patent Rights دراصل Monopoly کی کوشش ہے جس میں ظلم اور فریب ہے، اور اس کی مثال اس طرح ہے کہ دوسرے کو اس

صفت اور کام کے حق سے روکنا، یہی سبب ہے کہ Patent Rights کی تعریف میں درج ہے:

"The position of patent rights gives the owner some degree of monopoly power and so is one of the causes of competition being imperfect" (ibid).

دوسری طرف گاہکوں کو بیع کے لئے مجبور کرنا ہے اور اس میں ایسی قیمت کا تعیین ہے جس میں اختکار کا معاملہ پایا جاتا ہو ظلم صریح ہے۔

اسی طرح Copy Rights بھی نظام عصر کے مطابق Buying و selling of goods کے مثل ہے، لیکن ہمارے یہاں اسے حق کے

ذیل میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

اول تو حق نہیں بلکہ اسلام کے تصور انتفاع، فلاح اور تصور علم سے یکسر ٹکراتی ہوئی چیز ہے۔

دوسری بات یہ کہ حق کی بیع یا حق سے دست برداری کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ تو خود حق کے قائم رہنے کا ہے۔ کیا اس حق کا قائم رہنا دوامی طور پر

ہے۔ پچاس سال کی تحدید و تعیین کیا معنی رکھتی ہے؟

علم کے معاملے میں Monopoly کتم علم کے زمرے میں نہیں؟

☆☆☆



## بیع کی تعریف

مولانا مفتی نظام الدینؒ

بیع کی تعریف (مبادلة المال بالمال بالتراضی) میں احقر کے نزدیک کتاب و سنت سے مال کی فقہی تعبیر یہ سمجھ میں آتی ہے:

المال ما یمیل الیہ الطبع للأخذ والانتفاع، سواء كان عینا ای وجودہ مستقل بنفسه غیر محتاج فی وجودہ الی وجود شیء آخر كالجدار والثياب وغيرهما من الموجودات الخارجية وسواء كان عرضا ای وجودہ غیر مستقل بنفسه بل وجودہ محتاج فی تشخصه وتحققه الی وجود شیء آخر كألوان الجدار وألوان الثياب وغيرهما من ألوان الموجودات الخارجية۔

اسی طرح حق کی فقہی تعبیر کتاب و سنت سے یوں سمجھ میں آتی ہے:

الحق ما هو ذریعة لدفع الضرر المعترف عند الشرع كحق الشفعة وحق إهدام الجدار المائل القريب للهدم ولو بواسطة القاضي أو الحكومة أو ذریعة لجلب النفع المعترف شرعاً كحق المرور فی الطريق العام ومثل حق مرافق البيت والدار والشرب وحميرها وهكذا المراد بالحق ثمرة السعي لرجل معين سواء كانت عینا أو غیر عین حسب ما مر تعریفهما آنفاً وسواء كانت عوضاً عن تنازل الحق وغير ذلك۔۔۔۔۔

اور امید ہے کہ اس شرعی تعبیر سے بہت سے مباحث ختم ہو جائیں گے یا ختم ہونے کے لئے مخلص و مخرج شرعی مل جائے گا۔

☆☆☆

## مال کی حقیقت اور حقوق کی خرید و فروخت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ع

حقوق کی خرید و فروخت کے جائز ہونے اور نہ ہونے، اور جائز ہوتوان صورتوں کی تعیین کرنے کے لئے جن کی فروخت جائز قرار دی جاسکتی ہے، تین امور پر گفتگو کی جانی ضروری ہے، اول یہ کہ مال کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا مفہوم شارع نے متعین کر دیا ہے یا ہر زمانہ کے عرف و عادت کے مطابق اس کی تعیین کی جائے گی۔ دوسرے خرید و فروخت کے جواز کے اعتبار سے حق کی تقسیم کیوں کر ہوگی۔ اور تیسرے موجودہ زمانہ میں جن حقوق کی خرید و فروخت مروج ہے، ان پر حکم شرعی کی تطبیق۔

### مال کی حقیقت:

مال کی حقیقت کے سلسلہ میں عرض ہے کہ شرعی اعتبار سے کسی لفظ کی حقیقت معلوم کرنے کے تین ہی ماخذ ہیں، شارع کی صراحت، جیسا کہ شارع نے بتفصیل صوم و صلوة اور نکاح و طلاق کا مفہوم متعین کر دیا ہے۔ دوسرے لغت، اکثر اسلامی اصطلاحات کی بنیاد "لغت" اور عربی زبان ہی پر ہے، وضو و تیمم میں وجہ وید اور رجل و رأس کا مفہوم لغت ہی سے متعین کیا گیا ہے، اور امام ابوحنیفہ نے لغت ہی کی بنا پر "خمر" کو انگوری شراب کے ساتھ خاص مانا ہے۔ تیسرا ماخذ "عرف و عادت" ہے۔ ایسی اصطلاحات کہ جن کی تعیین عرف کے ذریعہ ہوتی ہے بے شمار ہیں۔

جہاں تک کتاب و سنت کی بات ہے تو مال کا لفظ نصوص میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، حدیث میں تو کیا شمار خود قرآن مجید میں ۹۶ سے زیادہ مواقع پر یہ لفظ وارد ہوا ہے، لیکن غالباً کہیں بھی "مال" کی حدود اور بعمہ بیان نہیں کی گئی ہے، کہ مال کا مفہوم لوگوں کے ذہن میں اس طرح موجود تھا کہ اس کی توضیح کی ضرورت نہ تھی۔ لغت میں مال کے سلسلے میں دو احتمال موجود ہے، اول یہ کہ اس کا ماخذ "م، ی، ل" ہو، ایسی شکل میں مال سے مراد ہر وہ چیز ہوگی جس کی طرف طبیعت مائل ہو، "ما یمیل الیہ الطبع"۔ اسی کو بعض فقہاء نے "شئ مرغوب" سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ماخذ "م، و، ل" ہو، ایسی صورت میں اس کے معنی "ذخیرہ کی جانے والی چیز" کے ہوں گے، اسی کو فقہاء نے "ما من شأنہ أن یدخر للانتفاع وقت الحاجة" کہا ہے۔ اگر لغت کے اعتبار سے مال کے پہلے مادہ اشتقاق کو صحیح مانا جائے تو "مال" کا مفہوم بہت وسیع ہو جاتا ہے اور دوسرے مادہ اشتقاق کو قبول کیا جائے تو مال کے مفہوم میں خاصی تنگی پیدا ہو جاتی ہے، تاہم واضح ہو کہ اکثر اصحاب لغت، مرتضیٰ زبیدی اور رازی وغیرہ نے اس کا ماخذ "م، و، ل" ہی کو قرار دیا ہے (تاج العروس ۵۳/۱۹، مختار الصحاح ۶۳۹)۔

تیسرا ماخذ عرف ہے، جہاں نص میں صراحت موجود نہ ہو اور لغت کے ذریعہ کسی لفظ کا بے غبار مفہوم متعین نہ ہو پاتا ہو، وہاں بس یہی ایک ذریعہ کام آتا ہے، اسی لئے فقہاء کے یہاں قاعدہ مسلمہ ہے کہ:

"کل ما ورد به الشرع مطلقاً ولا ضابطاً له فيه ولا في اللغة يرجع فيه إلى العرف" (الاشباه للسيوطی ۱۹۶)۔

(شریعت میں جو چیز مطلقاً وارد ہو اور شریعت میں اس کے لئے کوئی ضابطہ نہ ہو اور نہ لغت میں تو ایسی صورت میں عرف کی طرف لوٹا جائے گا)۔

یہاں تک کہ اگر کسی لفظ کے لغوی مفہوم اور عربی مفہوم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو امام لغوی اور امام غزالی کے نزدیک اس کا عربی مفہوم مقدم ہوگا اور لغوی معنی کو نظر انداز کر دیا جائے گا (الاشباه للسيوطی ۱۹۶، فصل فی تعارض العرف مع اللغۃ)۔

راقم کا خیال ہے کہ "مال" کے مفہوم کو متعین کرنے میں بنیادی کردار یہی عرف ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ آگے ذکر ہوگا، مختلف ادوار میں فقہاء کے یہاں مال کی تعریف اور بعض اشیاء کے مال ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف رائے رہا ہے، اور ایک "مال" ہی پر موقوف نہیں، معاملات کی اکثر اصطلاحات وہ

ہیں کہ عرف ہی ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، اسی لئے امام مالک سے مروی ہے کہ جس کو لوگ بیع کہیں وہ بیع ہے "البيع ما يعدة الناس بيعاً" (حلیۃ العلماء ۴: ۱۳). مال کے بارے میں بھی اکثر اہل لغت نے صرف "معروف" (جانی پہچانی چیز) لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

فقہاء کی رائیں:

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود فقہاء کا نقطہ نظر اس باب میں کیا ہے؟ انسان جن چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ تین طرح کی ہیں: اول "اعیان" یعنی وہ مادی اشیاء جن کا مستقل وجود ہے۔ دوسرے "منافع" جن کا مستقل وجود نہیں بلکہ وہ اعیان ہی سے متعلق ہوتی ہے، جیسے مکان میں سکونت، سواریوں پر سواری وغیرہ۔ تیسرے "حقوق" یعنی وہ مصالح انسانی جن کا شریعت نے اعتبار کیا ہے۔ یہ حقوق دو طرح کے ہیں: بعض وہ ہیں جو اعیان سے متعلق ہیں، جیسے گزرنے کا حق، شرب کا حق۔ اور بعض وہ ہیں جن کا تعلق مال سے نہ ہو، جیسے ماں کو بچہ کا حق پرورش یا بیوی پر شوہر کا حق اطاعت وغیرہ۔

"اعیان" کے بارے میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ وہ مال ہیں اور ان کی خرید و فروخت درست ہے، غیر مالی حقوق مثلاً ماں کا حق پرورش وغیرہ، کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ مال نہیں ہے، منافع اور وہ حقوق جو مالی نوعیت کے ہیں ان پر مال کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ احناف کا قول مشہور یہی ہے کہ یہ مال نہیں ہے، اور چونکہ بیع کے لئے مال ہونا ضروری ہے اس لئے ان کی خرید و فروخت بھی درست نہیں ہے جبکہ جمہور کے نزدیک منافع اور مالی حقوق بھی مال ہیں۔ قاضی ابو زید دہلوی نے شوافع اور احناف کے درمیان اس اصولی اختلاف کو اس طرح ذکر کیا ہے:

"الاصل عند الامام القرشي أبي عبد الله محمد بن إدريس الشافعي قدس الله سره و نور ضريحه أن المنافع بمنزلة الأعيان القائمة، وعندنا بمنزلة الأعيان في حق جواز العقد عليها لا غير" (تأسيس النظر ۶۳)۔  
(امام شافعی کے نزدیک اصل یہ ہے کہ منافع اعیان کے درجہ میں ہیں اور ہمارے نزدیک صرف اجارہ درست ہونے میں اعیان کے حکم میں ہیں، دوسرے احکام میں نہیں)۔

آگے قاضی دہلوی نے ان مختلف احکام کی تخریج کی ہے جن میں اسی اصول میں اختلاف کی بنا پر احناف و شوافع میں اختلاف رائے ہے (تأسيس النظر ۶۳)۔ ابن ہمام نے شوافع کے لئے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ انسان کے علاوہ جو کچھ بھی انسانی مصلحت کے لئے پیدا کی گئی ہے، مال ہے۔

"المال اسم لما هو غيرنا مخلوق لمصالحنا" (فتح القدير ۸: ۲۸۱)۔

مال کے سلسلہ میں فقہاء کے نقاط نظر کو جاننے کے لئے خاص طور پر "بیع" اور "مہر" کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ "بیع" مال کا مال سے تبادلہ کا نام ہے اور "تبتغوا بأموالكم" کے تحت اس پر بھی اتفاق ہے کہ مہر کا مال ہونا ضروری ہے، پس فقہاء بیع میں "سامان فروخت" کی جو تشریح کریں اور جن چیزوں کا مہر ہونا قبول کریں، سمجھنا چاہئے کہ ان کی نگاہ میں مال ہے۔

شوافع کی رائے:

اس طرح غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شوافع کے نزدیک "مال" کے لئے مادی شئی کا موجود ہونا ضروری نہیں، فقہ شافعی کی مشہور کتاب "تحفة المحتاج" میں ہے:

"البيع عقد معاوضة مالية تفيد ملك عين أو منفعة على التأييد" (تحفة المحتاج ۴: ۲۱۵)۔

(بیع وہ مالی عقد معاوضہ ہے جو ملک یا دائمی ملکیت کا فائدہ دے)۔

سیوطی لکھتے ہیں: لا يقع اسم مال إلا على ما له قيمة يباع بها و تلزم متلفه وإن قلت و ما لا يطرحه الناس مثل الفلس و ما اشبه ذلك" (الاشياء ۵۳۳)۔

مال کا اطلاق ایسی چیز پر ہوگا جو قیمت والی ہو، اس کو بیچا جائے، تلف کرنے والے پر اس کا ضمان لازم ہو، گو وہ کم ہو، اور جسے لوگ چھوڑ نہ دیتے ہوں جیسے پیسہ وغیرہ۔



سیوطی کی تعریف سے صاف عیاں ہے کہ کسی چیز کے مال ہونے اور نہ ہونے میں اصل عرف و رواج ہے، جہاں کے عرف میں جو چیز قابل قیمت شمار ہوتی ہو اور جس کے ضائع کرنے کو قابل تاوان تصور کیا جاتا ہو وہ ”مال“ کہلائے گا، گو بعض شوائع اہل لغت نے بھی مال کے لئے عین کی شرط رکھی ہے، ابن اثیر کا بیان ہے:

”أطلق على كل ما يقتنى من الأعيان“ (النهاية ۴، ۲، ۴)۔ (ہر اس عین پر مال کا اطلاق ہوگا جو جمع کی جائے)۔

حنابلہ کی رائے:

حنابلہ کے نزدیک بھی ”مال“ کے لئے ”اعیان“ میں سے ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ ”الرائع“ میں ”مباح منفعہ“ کو دائمی طور پر فروخت کر دینے کو بھی ”بیع“ قرار دیا گیا ہے:

”أو منفعة مباحة كممر الدار بمثل أحدهما على التأيد“ (الرائع ۲، ۵۶)۔

ابن قدامہ نے مال کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

”إن المال ما فيه منفعة مباحة أو ضررة كحقار وجمل و دود القز وديدان الصيد كالحشرات وما فيه نفع محرم كالخمر وما لا يباح إلا لضرورة كالميتة وما لا يباح اقتنائه إلا لحاجة فليس مالاً“ (المغنی ۵، ۲۳۹)۔

(مال وہ ہے جس میں ایسی منفعہ ہو جو بغیر حاجت و ضرورت کے بھی مباح ہو جیسے زمین، اونٹ، ریشمی کیڑے اور شکار کے چارے جیسے کیڑے وغیرہ، اور جن چیزوں میں ایسا نفع ہو کہ وہ حرام ہو جیسے شراب، یا ضررنا ہی وہ مباح ہوتے ہوں جیسے مردار، یا بر بناء حاجت مباح ہوتے ہوں تو وہ مال نہیں ہے)۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ مال ہی مہربن سکتا ہے: ”إن الصداق لا يكون إلا مالاً“ پھر یہ بھی کہتے ہیں:

”ومنافع الحر والعبد وغيرهما جاز أن يكون صداقاً“ (المغنی ۲، ۱۶۲)۔

پس گویا حنابلہ کے یہاں بھی ”مال“ ہونے کے لئے عرف ہی اساس قرار پایا کہ جو شئی عرف و رواج کے لحاظ سے قابل انتفاع ہوگی، ہو وہ مال ہوگی۔

مالکیہ کی رائے:

مالکیہ کے اقوال گو اس میں مضطرب ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی عمل اسی پر ہے کہ مال ہونے کے لئے عین کا ہونا ضروری نہیں، چنانچہ مشہور مالکی فقیہ ابن قاسم منافع کے مہربانے کو جائز قرار دیتے ہیں، دوسرے فقہائے مالکیہ کے نزدیک منافع کو مہرباننا مکروہ ہے لیکن اگر ایسا مہربان مقرر کر لیا جائے تو مہربان کی تعیین درست ہو جائے گی اور عورت اس کی حقدار ہوگی۔

إن المنافع من تعليم القرآن ونحوه أو سكنى الدار أو خدمة ففيها خلاف. قال مالك إنها لا تصلح مهراً ابتدائياً أن يسمها مهراً، وقال ابن القاسم بها تصلح مهراً مع الكراهة وبعض أئمة المالكية يجيزها بلا كراهة... ولكن إذا سمى شخص منفعة من هذه المنافع مهراً فإن العقد يصح على المعتمد ويثبت للمرأة المنفعة التي سميت لها وهذا هو المشهور“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۲، ۱۰۶)۔

صاحب الشرح الصغير نے بھی یہی لکھا ہے کہ جس کا مالک ہو جا سکے وہ مال ہے۔

”كل ما تملك شرعاً ولو قل“ (الشرح الصغير ۲، ۹۸)۔ امام ابواسحاق شاطبی نے ان الفاظ میں مال کی تعریف کی ہے:

”المال ما يقنع عليه المملك ويستبد به المالك“ (الموافقات ۲، ۱۴)۔

یہاں شاطبی نے اس چیز کو مال قرار دیا ہے جس پر ملکیت واقع ہو اور جس کے مالک کو اختیار و استبداد کی نسبت حاصل ہو جائے، ملکیت ایک معنوی چیز ہے جو مالک اور مملوک کے درمیان پائے جانے والے رشتہ اور نسبت سے عبارت ہے، اس کے لئے کسی مادی چیز اور عین کا وجود ضروری نہیں، اسی لئے منافع اور حقوق سے صاحب نفع اور صاحب حق کو جو نسبت حاصل ہوتی ہے، اسے بھی ملکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غرض جمہور فقہاء کے نزدیک مال ہونے کے لئے ”مادہ“ کا وجود ضروری نہیں، اسی لئے ”بیع“ کی حقیقت ذکر کرتے ہوئے شیخ عبدالرحمن الجزیری نے

جمہور کے مسلک کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

”الغرض منه أمران، الأول أن يكون ذلك العقد مفيد الملك المعين أو لملك المنفعة على التأييد كحق المرور“ (الفقه على المذاهب الاربعه ۲۰۵)۔

حنفیہ کی رائے:

احناف کے یہاں مال کی تعریف میں خاصا اضطراب پایا جاتا ہے۔ حنفی کی تعریف کا خلاصہ یہ ہے:

”ما من شأنه أن ترغب إليه النفس“ (رد المحتار ۴۰۲)۔

مگر شامی نے اس پر نوٹ لکھا ہے کہ شئی مرغوب فیہ سے مراد مال عین ہی ہے منفعت نہیں۔ شامی کا بیان ہے:

”ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة“ (رد المحتار ۴۰۲)۔

اور شامی ہی نے تلوح کے حوالے سے نقل کیا ہے:

”والمال ما من شأنه أن يدخر لانتفاء وقت الحاجة“ (رد المحتار ۴۰۲)۔

پھر شامی ہی نے بحر کے واسطے سے حاوی قدسی سے ان الفاظ میں مال کی تعریف نقل کی ہے:

”المال اسم لغير الآدمي خلق لمصالح الآدمي وأمكن إحرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار“ (رد المحتار ۴۰۲)۔

صاحب ہدایہ کا بھی بیان ہے: ”والمال ما يمكن إحرازه“ (ہدایہ)۔

در شرح غرر میں ہے: ”ما يميل إليه الطبع ويجرى فيه البذل والمنع“ (در شرح غرر)۔

مجمع الانہر میں ہے: ”والمراد بالمال عين يجرى فيه التناقص والابتذال“ (مجمع الانہر ۲۰۲)۔

شامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی چیز کے تمام یا بعض لوگوں کے بطور مال استعمال کرنے سے اس میں مالیت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے:

”المالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم“ (رد المحتار ۴۰۲)۔

غالباً چونکہ اکثر علماء نے مال کے لئے ادخار و احراز کی شرط لگائی ہے اور اس زمانہ میں ”عین“ کے سوا کسی اور شئی میں یہ کیفیت نہ پائی جاتی تھی اس لئے عین کی شرط لگادی گئی۔ شیخ مصطفیٰ زرقاء نے صحیح کہا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک مال کی سب سے جامع تعریف یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ذی قیمت مادی عین کا نام ہے۔

”المال هو كل عين ذات قيمة مادية بين الناس“ (المدخل الفقهي العام ۳۰۱۱)۔

بعض احناف کی رائے:

ہر چند کہ احناف کے یہاں مال کی مشہور تعریف یہی ہے، مگر غور کیا جائے تو متقدمین اور متاخرین دونوں ہی کے یہاں جا بجا اس تعریف سے انحراف بھی پایا جاتا ہے، صاحب ہدایہ ناقل ہیں کہ امام محمد کے نزدیک خدمت کا شمار بھی مال ہی میں ہے، چنانچہ اگر کوئی شوہر بیوی کی خدمت کو مہر بنائے تو امام محمد کے نزدیک مہر کی تعیین فی نفسہ درست ہوگی، مگر چونکہ فرق مراتب کے خلاف ہے اس لئے اس کی قیمت واجب ہوگی۔

”ثم على قول محمد تجب قيمة الخدمة لأن المسمى مال إلا أنه عجز عن التسليم لمكان المناقضة“

(ہدایہ ۲۰۲۸)۔

تعلیم قرآن محض ایک منفعت ہے، فقہائے احناف نے اس کے ذریعہ تعیین مہر کو منع کیا ہے، مگر ضرور جا اس پر اجرت لینے کی اجازت دی گئی، تو تعلیم قرآن کے مہر مقرر کرنے کو بھی صحیح قرار دیا۔

”فكذا نقول يلزم على المفتي به صحة تسميته صداقاً“ (رد المحتار ۴۰۲۳)۔

کاسانی نے تمام ہی منافع کو مہربانے کی اجازت دی ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ منافع یا تو ”مال“ ہیں یا مال کے حکم میں ہیں۔

”لأن هذه المنافع أموال أو التحقت بالأموال“ (بدائع الصنائع ۲۲۸۶)۔

ٹھیک یہی بات الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ابن نجیم نے کہی ہے:

”لو تزوجها على منافع سائر الأعيان في سكنى داره وخدمة عبده وركوب دابته والحمل عليها وزراعة أرضه ونحو ذلك في منافع الأعيان مدة معلومة صحت التسمية لأن هذه المنافع أموال أو ألحقت بالأموال“ (الرائق ۲۰۱۵۶)۔

ملک العلماء کاسانی جن کا شمار فقہ حنفی کے بلند پایہ ناقلین میں ہے، ”وصیت“ کے باب میں بھی منافع کو صریحاً مال تسلیم کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

”منها أن يكون مالا... سواء كان المال عيناً أو منفعة عند العلماء كافة“ (بدائع الصنائع ۴۰۲۵۲، بیان

شرائط الموصی بہ)۔

دوسری جگہ رقم طراز ہیں: ”أما الوصية بالمال فحكمها ثبوت الملك في المال الموصى به للموصى له والمال قد

يكون عيناً وقد يكون منفعة“ (بدائع الصنائع ۴۰۲۸۵، بیان حکم الوصیة)۔

اسی طرح فقہاء نے جہاں حقوق کی خرید و فروخت کو منع کیا ہے وہیں ایسی نظیریں بھی موجود ہیں کہ بعض مشائخ نے بعض حقوق کی خرید و فروخت کو جائز سمجھا

ہے، مثلاً صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ راستہ کو فروخت کرنا جائز ہے، اور اس پر اتفاق ہے، اور ایک قول کے مطابق راستہ سے گزرنے کا حق بیچنا بھی جائز ہے۔

”وان كان الثاني ففي بيع حق المرور روايتان“ (هدایہ ۲۰۲۰)۔

اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ فقہاء نے جب حقوق کی بیع کو منع کیا ہے، ان کی ممانعت کو اس دلیل پر محمول کرنا کہ فقہاء ان حقوق کو مال نہیں کہتے

تھے، محض قیاس و استنباط کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ بعض فقہاء نے ”معمود علیہ“ کی جہالت کی وجہ سے بھی اس کی بیع کو منع کیا ہے، چنانچہ حق شرب کے سلسلہ میں بارتی کی عبارت کس قدر صریح ہے:

”إنما لم يجز بيع الشرب وحده في ظاهر الرواية للجهالة لا باعتبار أنه ليس بمال“ (عناہ ۵۰۲۰۲)۔

پھر جن فقہاء نے مال کی تعریف میں سختی برتی ہے، جب عرف و رواج کے تحت بعض حقوق کی بیع نے ان کو اس میں توسع کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، تو

ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ بعض حقوق کے اعتیاض یا بعض حقوق سے ”تنازل بالعوض“ کو جائز قرار دیں، فقہاء کے یہاں ایسی جزئیات کی کمی نہیں، عوض

لے کر حق و وظیفہ سے سبکدوش ہونے کی عینی اور بعض علماء نے اجازت دی ہے (دیکھئے: الاشباه: القاعدة السادسة، رد المحتار ۱۳/۱۴)۔ حموی کے بیان کے مطابق شیخ

نور الدین علی مقدسی نے حق تولیت سے دستبرداری کا عوض لینے کو جائز قرار دیا ہے (رد المحتار ۱۵/۱۴)۔ متوفی نے ایک شخص کے لئے غلام کی ملکیت اور دوسرے کے

لئے اس سے خدمت لینے کی وصیت کی تو یہ دوسرا شخص مالک غلام سے حق خدمت کا عوض لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو سکتا ہے (حموی علی الاشباه ۱۶۳،

دیوبند)۔ حق خلو کو محمد بن بلال حنفی اور تقی الدین بن معروف زاہد اور مفتی دار السلطنہ اسلامیہ مولانا ابوالسعود نے بھی جائز قرار دیا ہے، (رد المحتار ۱۶/۱۴، حموی ۱۶۲)۔

حالانکہ فقہائے احناف کی یہ تمام رائیں ان کے اس کلیہ کے خلاف تھیں کہ:

”التقويم يستلزم المالية عند الامام والملک عند الشافعي“ (رد المحتار ۲۰۲)۔

اور علامہ شامی کو کہنا پڑا کہ: ”إن عدم جواز الاعتیاض عن الحق ليس على إطلاقه ورأيت بخط بعض العلماء عن المفتي

أبي سعود أنه أفتى بجواز أخذ العوض في حق القرار والتصرف وعدم صحة الرجوع، وبالجملة فالمسألة ظنية والنظائر

متشابهة وللبحث فيه مجال“ (رد المحتار ۲۰۱۵)۔

ان تکلفات اور موقع بہ موقع تضادات کی نوبت اس لئے آئی کہ کسی شے کے مال قرار پانے کے لئے عین ہونے کی شرط جو محض ایک اتفاق کا درجہ رکھتی تھی

اور کسی خاص زمانہ و ماحول کے پیش نظر مقرر کی گئی تھی کو ”مال“ ہونے اور نہ ہونے کے لئے مدار و اساس بنا دیا گیا، حالانکہ غالباً فقہاء نے یہ شرط محض اس لئے لگائی تھی



کہ کسی شئی کے تمول و ادخار کے لئے اس مسئلہ میں ”عین“ ہونے کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی۔ غیر مرئی اشیاء برقی، ہوا، گیس، وغیرہ کی حفاظت اور معنوی اشیاء کا آئینی طریقوں پر احراز مثلاً لائسنس، نام، ایجادات کا رجسٹریشن وغیرہ اس زمانہ میں متصور بھی نہ تھا، اب جب کہ مال کی بہت سی ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں، جو بالکل غیر مرئی ہیں، اور ہمارے فقہاء احراز و ادخار کی جن صورتوں سے آشنا تھے ان سے بالکل جداگانہ صورتوں میں اس کا احراز و تحفظ ہوا کرتا ہے، ”عین“ کی شرط پر اصرار صحیح نظر نہیں آتا۔

مال ہونے کے لئے تین بنیادی عناصر:

راقم کا خیال ہے کہ کسی شئی کے قابل قیمت مال ہونے کے لئے تین بنیادی عناصر ہیں: اول یہ کہ وہ شرعاً مباح ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء مردار کو مال نہیں مانتے، شراب کے بھی مسلمانوں کے حق میں مال نہ ہونے پر اتفاق ہے، دوسرے یہ کہ وہ شئی قابل انتفاع ہو، ریشمی کیڑے اور انڈے کی خرید و فروخت کو امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف منع کرتے ہیں، امام محمد اجازت دیتے ہیں، فتویٰ امام محمد کے قول پر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ قابل انتفاع شئی ہے: ”لکونہ منتفعاً بہ“ (البحر الرائق ۶، ۷۸)۔ یہی بات زلیعی نے بھی ہے:

”لأن الدود ينتفع به وكذا بيضة في المال“ (تبیین الحقائق ۶، ۴۹)۔

شہد کی مکھی کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں بھی اختلاف ہے، اس موقع پر صاحب مجمع الانہر نے لکھا ہے:

”والشئ إنما يصير مالاً لكونه منتفعاً به“ (مجمع الأئمة ۲، ۵۷)۔

نووی نے بھی دوسرے حشرات الارض کی خرید و فروخت کو منع کیا ہے، مگر شہد کی مکھی کی اجازت دی ہے، اس لئے کہ ”انہ حیوان منتفع بہ“ (شرح مہذب ۳۲۲، ۹)۔ زہریلے پودوں کے بارے میں صاحب اقتناع کا بیان ہے کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا نہ جاسکتا ہو، تو اس کی خرید و فروخت بھی درست نہ ہوگی، اور اگر علاج وغیرہ کے کام آسکتا ہو تو جائز ہوگی:

”فأما السم من الحشائش والنبات فان كان لا ينتفع به أو كان يقتل قليله لم يجز بيعه وإن انتفع به أو أمكن التداوى بيسير كالسقمونيا ونحوها جاز بيعه“ (الاقناع ۲، ۶۰)۔

تیسرا عنصر ہے عرف و عادت، عرف میں جس شئی کی خرید و فروخت مروج ہو جائے وہ مال ہے، اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فقہ کے چاروں دبستان اس پر متفق ہیں، گذر چکا ہے کہ سیوطی نے مال کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

”وتلزم متلفه وإن قلت وما لا يطرحه الناس“ (الاشباہ ۵۲۳)۔

(اس کے اتلاف پر تاوان لازم کیا جاتا ہو اور لوگ اسے پھینکتے نہ ہوں)

شامی کا بیان بھی گذر چکا ہے: ”المالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم“ (شامی ۴، ۲)۔

بعض اشیاء کہ فقہاء ان کو مال نہیں مانتے تھے اور ان کی خرید و فروخت کو منع کرتے تھے، بعد کو ان کی خرید و فروخت کی اجازت دے دی کہ لوگ اس کو مال جانتے تھے۔ ایسی ہی اشیاء میں ”جونک“ (حلق) ہے، ابن نجیم کہتے ہیں:

”ولكن في الذخيرة إذا اشترى العلق الذي يقال له بالفارسية ”مرعل“ يجوز وبه أخذ الصدر الشهيد لحاجة الناس إليه بتمول الناس“ (البحر الرائق ۶، ۷۸)۔

شہد کی مکھی کی خرید و فروخت کے جواز پر بحث کرتے ہوئے شلمی نے لکھا ہے: ”لأنه معتاد فيجوز للحاجة“ (شلمی علی التبیین ۳، ۴۹)۔

اب موجودہ زمانہ کے عرف میں چونکہ حقوق کی بعض صورتیں بھی مال کا درجہ اختیار کر چکی ہیں، وہ قابل انتفاع بھی ہیں اور بظاہر ان کے مباح نہ ہونے کے لئے بھی کوئی بنیاد موجود نہیں، اس لئے وہ از قبیل مال ہوں گی، اور ان کی خرید و فروخت جائز ہوگی، یہ اختلاف ”اختلاف برہان“ نہیں بلکہ ”اختلاف زمان“ کے قبیل سے ہے، اور جیسا کہ مذکورہ ہوا کہ امام محمد اور دوسرے فقہاء احناف کا سانی وغیرہ سے بھی غیر مادی اشیاء کو مال تسلیم کرنا ثابت ہے، اس لئے یہ نہ صرف جمہور کے

مسلك کے مطابق ہے بلکہ خود فقہ حنفی کے خلاف نہیں، خود اس پر غور کرنا چاہئے کہ فقہاء نے جہاں حقوق کی بیع سے منع کیا ہے، وہاں ”حقوق مجردہ“ کی قید لگائی ہے، اس پر بھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ کلام میں مفہوم مخالف کا بھی اعتبار ہے، اس سے از خود یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حقوق غیر مجردہ کی بیع درست ہے، اور حقوق کی بعض صورتیں ”مال“ ہیں یا مال کے حکم میں ہیں۔

جمہور کے دلائل:

اس مسئلہ میں ان دونوں گروہوں کے دلائل پر ایک نظر ڈالنا چاہئے جو مال کے لئے ”مادہ“ اور ”عین“ کو ضروری قرار دیتے ہیں، یا ضروری قرار نہیں دیتے، جن حضرات نے مال کے لئے ”عین و مادہ“ کے وجود کو ضروری نہیں مانا ہے ان کی دلیلیں حسب ذیل ہیں:

الف۔ نافع وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل اور راغب ہوتی ہو، اس کے حصول کے لئے آدمی حسب ضرورت نفیس اور کم تر اشیاء خرچ کرتا ہے، مادی اشیاء سے بھی انسانی مصلحتوں کی تکمیل اس کی ذات اور محض اس کے وجود سے نہیں ہوتی بلکہ اس سے حاصل ہونے والے نفع ہی سے ہوتی ہے، ان اعیان کا کبھی اصل مقصود نافع ہی ہیں پس جب اعیان کو مال تسلیم کیا جاتا ہے تو نافع کو بدرجہ اولیٰ مال تسلیم کیا جانا چاہئے، یہی بات عز الدین بن عبد السلام نے کہی ہے (قواعد الاحکام ۱۷۲)۔

ب۔ بازار اور مالی معاملات میں نافع کو مالی اغراض اور تجارت کے لئے استعمال کیا جانا عام اور مروج ہے، چنانچہ دکان، مارکٹ، سرائے اور مکانات وغیرہ جو کرایہ پر لگائے جاتے ہیں ان میں دراصل نافع ہی کی تجارت ہو کر رہتی ہے۔

ج۔ شریعت نے بھی نافع کو ”مال“ تسلیم کیا ہے، چنانچہ مہر کے لئے مال ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ ”وَأُجِّلَ لَكُمْ مَا وَرَأَىٰ ذَلِكُمْ أَتَّيْتُوا بِأَمْوَالِكُمْ“ (نساء ۲۴) جبکہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ نافع کو بھی مہر بنایا جاسکتا ہے۔

د۔ نافع پر معاملہ ہوتا ہے اور چاہے معاملہ فاسد ہو یا صحیح، اس کا تاوان بھی واجب ہوتا ہے، (احناف بھی اوقاف اور یتامی کے منسوبہ نافع کو قابل تاوان قرار دیتے ہیں)۔ یہ بھی اس کے مال ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ وہ فی نفسہ مال نہیں ہوتا بلکہ معاملہ کی صورت میں مال کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، اس لئے کہ معاملات کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کو بدلتے نہیں بلکہ اس کے اثرات و نتائج اور احکام کو مزید ثابت اور مؤکد کر دیتے ہیں (مخص از الملکیۃ و نظریۃ العقید فی الشریعۃ الاسلامیۃ لابن زہرہ ۵۷)۔

یہ چار باتیں ابو زہرہ نے نلکھی ہیں، راقم سطور اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ:

ھ۔ نافع کو مال تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے احناف کو بہت سے معاملات، اجارہ وغیرہ کو خلاف قیاس قرار دینا پڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکم شرعی کو خلاف قیاس قرار دینا خلاف اصل ہے، اور بدرجہ مجبوری ہی ایسا تسلیم کیا جاتا ہے، ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر حقوق و نافع کو بھی مال مان لیا جائے تو پھر ان معاملات کو خلاف قیاس ماننے کی حاجت نہیں رہتی۔

احناف کی دلیل:

جن حضرات نے مادہ و عین کی قید لگائی ہے انہوں نے اس مسئلہ میں لغت سے استدلال کیا ہے کہ ”مال“ تمول سے ماخوذ ہے، تمول کے معنی صیانت و حفاظت کے ہیں، نافع کا حال یہ ہے کہ وجود سے پہلے وہ معدوم ہوتا ہے، اور وجود میں آنے کے بعد بھی محفوظ و جمع نہیں رہتا، اس لئے اس کو مال نہیں کہا جاسکتا، مثلاً کھانے کا عمل ایک منفعت ہے، اگر کوئی شخص کھانا کھائے اور اس کو استعمال کرتا جائے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ مال کا تمول کر رہا ہے: ”یتمول ذلك الما کول“

کسی چیز کے محفوظ اور جمع رہنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عین ہو، مادی شئی ہو، اور محسوس ہو، اس لئے، ”مال“ کا اطلاق اعیان ہی پر ہوگا، نافع و حقوق پر نہ ہوگا۔ راقم سطور کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ فی زمانہ احراز و ادخار کی بعض اور صورتیں بھی ممکن ہو گئی ہیں جیسا کہ مذکور ہوا، یہ استدلال محل نظر ہے، شریعت میں کثرت سے ایسی نظیریں موجود ہیں کہ ایک لفظ اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے عام ہے یا خاص، اور عرف عام یا عرف شرع کی بنا پر اس کے مفہوم میں تخصیص یا عموم پیدا کر دیا گیا ہے، عرف میں اگر کسی لفظ کے مفہوم میں عموم پیدا ہو جائے تو ضروری نہیں کہ لغت میں اس کے مفہوم میں جو تحدید ہے اس سے سرموتجاوز نہ کیا جائے، عرف کا درجہ لغت سے بڑھ کر ہے، اس لئے فقہاء نے کہا کہ: ”الحقائق العرفیۃ مقدمۃ علی الحقائق اللغویۃ“۔ اور یہ کہ عرف کی بنا پر لغوی معنی

میں تخصیص بھی ہو سکتی ہے، اور تقیید بھی، اور اس کو بالکل نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے: العرف اللغوی مؤثر فی اللفظ اللغوی تخصیصاً و تقییداً و ابطالاً۔  
حقوق کی تقسیم:

اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ کون سے حقوق ”مجرد“ ہیں اور ناقابل فروخت ہیں، اور کون سے حقوق غیر مجرد ہیں اور ان کی خرید و فروخت کی جاسکتی ہے۔  
اڈل یہ کہ وہ حقوق جو کسی ایسے محل سے متعلق نہ ہوں جس کا احساس کے ذریعہ ادراک کیا جاسکے، جیسے حق مشورہ حقوق مجردہ میں سے ہے، اور جو حق کسی ایسے محل سے متعلق ہو جو محسوس ہو اور جس کا مادی وجود ہو وہ غیر مجرد حقوق میں سے ہے، مثلاً حق قصاص کہ یہ قاتل کی ذات میں ثابت ہے اور مقتول کا وارث اس سے دستبردار ہو سکتا ہے (حق الابتکار فی الفقہ الاسلامی القارن ۵۶۱-۵۷۰)۔ اس تقسیم پر بعض فقہی تصریحات بھی شاہد ہیں، صاحب ہدایہ نے ایک روایت کے مطابق ”حق مرور“ کی بیع کو درست قرار دینے کی وجہ یہ قرار دی ہے:

”أما حق المرور فمتعلق بعین تبقى وهو الأرض فأشبهه الأعيان“ (ہدایہ ۳۰۰)۔

حقوق کی دوسری تقسیم وہ ہے جو مولانا محمد تقی عثمانی نے کی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بعض حقوق محض دفع ضرر کے لئے دئے گئے ہیں، حالانکہ اصل انسان کو یہ حقوق حاصل نہ ہونے چاہئے تھے مثلاً حق شفعہ، حق حضانت و پرورش، شوہر پر عورت کا حق عدل وغیرہ، یہ حقوق ضرورۃً انسان کو دیئے جاتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص ان حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ ان حقوق کا ضرورت مند نہیں ہے، لہذا اب وہ ان حقوق کے باب میں حقدار ہی باقی نہ رہا، ایسے حقوق کی نہ خرید و فروخت درست ہے نہ کسی اور طور اس کا عوض وصول کرنا جائز ہے۔ شامی نے موصی لہ کے حق خدمت اور شفعہ کے درمیان فرق کرتے ہوئے اس نکتہ پر روشنی ڈالی ہے:

”وحاصله أن ثبوت حق الشفعة للشفيع و حق القسم للزوجة وكذلك حق الخيار في النكاح للمخيرة إنما هو لدفع الضرر عن الشفع والمرأة وما ثبت لذلك لا يصح الصلح عنه... ما حق الموصي له بالخدمة فليس كذلك بل ثبت له على وجه البر والصلة فيكون ثابتاً له أصالة فيصح الصلح عنه إذا نزل عنه لغيره“ (رد المحتار ۳۱۶)۔

دوسری قسم کے حقوق وہ ہیں جو حکم شرعی یا ایسے عرف کی بنا پر جو شریعت کے عمومی مصالح سے مطابقت رکھتے ہوں، اصلہ کسی شخص کے لئے ثابت ہوں، یہ بھی دو طرح کے ہیں، بعض وہ ہیں جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کئے جاسکتے ہیں، دوسرے وہ جن کا ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف انتقال نہیں ہو سکتا، ان کی خرید و فروخت بھی نہیں ہو سکتی کہ بیع کے لئے انتقال ملک ضروری ہے، اور یہ حقوق قابل انتقال نہیں ہیں، ہاں بطریق صلح و تنازل اس کا عوض وصول کیا جاسکتا ہے، ان حقوق کی بیع کے جائز نہ ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ نے حق ولاء کے خرید و فروخت اور اس کے ہبہ سے منع فرمایا ہے (بخاری: باب بیع الولاء و ہبتہ) اور تنازل بائع کے ذریعہ عوض وصول کرنے کی دلیل قصاص و خلع ہے، جس میں مقتول کا وارث حق قصاص اور شوہر بیوی پر ”حق ملکیت نکاح“ سے باہم طے شدہ معاوضہ کے بدلہ دست کش ہو سکتا ہے، اور یہ شریعت کے مسلمات اور فقہاء کے متفقہات میں سے ہے۔

رہ گئے وہ حقوق جن کا انتقال ممکن ہے ”مال“ کے حکم میں ہے اور ان کی خرید و فروخت درست ہے، ہر چند کہ مولانا موصوف نے حقوق کی چھ قسمیں کی ہیں مگر حکم کے لحاظ سے ان کا حاصل یہی تین قسمیں ہیں: حقوق ضروریہ، حقوق اصلیہ قابل انتقال، اور حقوق اصلیہ ناقابل انتقال۔

بیع حقوق کی مروجہ صورتیں:..... حقوق و منافع کی بیع کی جو صورتیں فی زمانہ رائج ہو گئی ہیں وہ یہ ہیں: خلو یعنی حق اجارہ کی بیع، جس کو پگڑی سے تعبیر کیا جاتا ہے، حق ایجاد حق تالیف، رجسٹرڈ ٹریڈ مارک اور ناموں کی بیع، فضا کی بیع، تجارتی لائسنس کے موقع سے استفادہ کرنا۔

پگڑی:..... پگڑی کا مسئلہ گذشتہ فقہی سمینار میں زیر بحث رہا ہے اور اس پر تجاویز بھی آچکی ہیں، تاہم راقم سطور کا خیال ہے کہ اگر شوائع و حنا بلہ کے مسلک پر اس کو اجارہ کی ”منفعۃ مؤبدہ“ کی بیع مان لیا جائے اور من جملہ مال کے شمار کر لیا جائے تو بہت سے فقہی اشکالات اور تاویلات سے بچا جاسکتا ہے۔



## حق تالیف و ایجاد و حق طباعت:

حق تالیف، حق طباعت اور حق ایجاد کی خرید و فروخت آئینی طور بھی درست قرار دی گئی ہے، اور پوری دنیا میں اس نے ایک عرف عام کی حیثیت بھی اختیار کر لی ہے، مولانا تفتی عثمانی نے ابوداؤد کی اس روایت سے اس کی اصل شرعی ثابت کی ہے کہ جو مسلمان پہل کر کے جس چیز کو حاصل کرنے لے وہ اس کی ملکیت ہے۔ ”من سبق إلى مال لم يسبقه مسلم فهو له“ (ابوداؤد: باب فی الخراج قبیل احياء الموات)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حقوق شرعاً مباح بھی ہیں، قابل انتفاع بھی ہیں اور عرف میں بھی ان کی خرید و فروخت جاری ہے، لہذا ان کی خرید و فروخت کو درست ہونا چاہئے، معاصر بزرگوں اور اہل فقہ کا عام رجحان بھی اس کے جواز کی طرف ہے، جن میں مفتی کفایت اللہ صاحب، مفتی عبدالرحیم لاچپوری اور مفتی نظام الدین صاحب کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

جن حضرات نے حق تالیف وغیرہ کی بیع کو منع کیا ہے، ان کی حسب ذیل دلیلیں ہیں:

۱۔ یہ حقوق عینی نہیں ہیں، اس لئے حقوق مجردہ کے قبیل سے ہیں اور ان کی بیع درست نہیں۔

۲۔ کتاب یا کسی شے کے خریدار کو ہر طرح اس سے استفادہ کا حق حاصل ہے، اور منجملہ اس کے یہ بھی کہ وہ اس کا ٹخن بنا لے یا اسے پھر سے طبع کر دے۔

۳۔ کتابوں کی طباعت کو روکنا کتمان علم کے مترادف ہے۔

۴۔ ”نهی النبی علیہ السلام عن بیع الولاء و ہبته“ کے خلاف ہے۔

۵۔ آپ ﷺ نے ”بیع صکاک“ سے منع فرمایا ہے (مسلم ۵/۲)۔ صکاک سے مراد وہ اجازت نامے ہیں جو حکومت کی طرف سے لوگوں کو اشیاء خوردنی کی بابت دیئے جاتے تھے جس کو در مختار اور شامی وغیرہ میں ”بیع براءات“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۶۔ محدثین نے روایت حدیث پر اجرت لینے سے منع کیا ہے، دینی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر اجرت لینا بھی اسی قبیل سے ہے۔

۷۔ ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ کتاب و سامان جو کسی کی ملک میں آگئی وہ مباح الاصل ہے، اس لئے وہ جس طور چاہے اسے استعمال کر سکتا ہے۔

مگر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بھی دلیل ایسی نہیں جو ان حضرات کے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہو۔

۱۔ یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ ”عین“ کی قید لگانے سے فقہاء کا مقصود کسی چیز کا قابل ادخار ہونا ہے نہ یہ کہ اس کا مادی ہونا ضروری ہے، اور حقوق کا احراز و تحفظ بھی قانونی رجسٹریشن کے ذریعہ ہو جایا کرتا ہے۔

۲۔ کتاب یا سامان کی ملکیت سے انسان کو اس شے میں ہر طرح کے استفادہ کی گنجائش رہتی ہے، مگر اسی طرح کی دوسری اشیاء کی پیدائش اور اس کی نقل جو اصل بائع کے لئے مضر ہو جائز نہیں ہوگی، مولانا عثمانی نے خوب کہا ہے کہ سکتے کا انسان مالک بن سکتا ہے لیکن کوئی شخص اس کا مجاز نہیں کہ وہ اسی کو اصل بنا کر سکتے ڈھالنا یا چھاپنا شروع کر دے، اسی طرح کسی خاص شخص یا ادارہ کی ”ممبر“ یا حکومت کے پوسٹل یا ریلوے کے ٹکٹ کی جس کی طباعت کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ یہ موجب ضرر ہے۔

۳۔ کتاب کی طباعت پر پابندی ہو یا اس کی فروخت روک دی جائے یہ کتمان علم ہے، کتمان علم یہ نہیں کہ ہر کسی کو طباعت کی اجازت نہ دی جائے، ہماری درس گاہیں اشاعت علم کا فریضہ ادا کرتی ہیں، لیکن کیا کتمان علم سے بچنے کے لئے اس بات کی پابندی ہے کہ جو شخص بھی مدرسے میں جس کتاب کی تدریس کرنا چاہے اسے اجازت دے دے یا جو طالب علم درس گاہ میں آجائے خواہ اس کا داخلہ ہو یا نہ ہو اس کو ضرور ہی پڑھایا جائے۔

۴۔ ”حق ولاء“ ایک ایسا حق ہے جس کو ”نسبی حق“ کا درجہ شریعت نے دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ نسب قرابت کی طرح ”ولاء“ کو منجملہ اسباب وراثت کے مانا گیا ہے، اس لئے حق ولاء کی خرید و فروخت کی ممانعت پر دوسرے حقوق کو قیاس کرنا صحیح نظر نہیں آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں:

”علیہ اهل العلم ان الولاء لا یباع ولا یوہب انما سبب یورث کالنسب“ (المسوی ۲۰۲۱۹)۔

۵۔ بیع صکاک اور بیع براءات کی ممانعت، علاوہ اس کے کہ خود فقہاء کے یہاں مختلف فیہ ہے، شوافع اس کو اسی وقت ناجائز کہتے ہیں جب اصل صاحب حق سے خرید کرنے والا کسی اور تیسرے شخص سے فروخت کر دے، باوصف اس کے کہ اس طرح بعض معاملات جیسے ”حظوظ ائمہ“ کی بیع کو خود حصکفی جائز قرار دیتے ہیں، سے حق تالیف اور حق ایجاد وغیرہ کی ممانعت پر استدلال کسی طور صحیح نظر نہیں آتا، محدثین نے اس روایت سے جس روایت پر استدلال کیا ہے وہ یہ ہے کہ ”بیع

صکاک“ بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو فروخت کرنا ہے اور یہ جائز نہیں۔ امام مسلم نے اس کو انہی احادیث کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں قبضہ سے پہلے یا معدوم کی بیع کی ممانعت کی ہے۔ امام مالک کی روایت میں خود حضرت ابو ہریرہؓ سے صراحتاً اس کی ممانعت کی وجہ یہی منقول ہے کہ: ”ثم باعوا قبل أن يقوماها“ (موطا امام مالک، ۲۶۴)، امام نوویؒ نے بھی اسکی وجہ بیع قبل القبض ہی کو قرار دیا ہے: ”ثم يبيعها المشترون قبل قبضها فنهوا عن ذلك“ (نووی علی مسلم، ۴/۶)۔ امام محمد نے اس ممانعت کی وجہ دھوکہ کے امکان (غرر) کو قرار دیا ہے، اس لئے کہ نہ معلوم اس اجازت نامہ پر مقررہ سامان مل بھی سکے یا نہ مل سکے۔ ”لأنه غرر فلا يدري أين يخرج أم لا يخرج“ (موطا امام محمد، ۳۵۵)۔

یہاں مصنف یا موجد ایک حق کو فروخت کرتا ہے جس کو وہ وجود میں لایا ہے اور ایک ناشر یا صانع کے پاس جب یہ تالیف یا ایجاد شدہ سامان موجود ہے، وہ اصحاب حق سے اجازت پالیتا ہے، گویا اس حق پر قبضہ بھی حاصل کر لیتا ہے، اس لئے بظاہر اسے بیع قبل القبض قرار دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اور اگر بالفرض اس کو ”بیع قبل القبض“ ہی مانا جائے تو اہل علم کے لئے اس سے انکار مشکل ہے کہ ان حقوق کا استعمال بھی از قبیل ”استصناع“ ہے جو بالاجماع بیع معدوم اور بیع غیر مقبوض کی نہی سے مستثنیٰ ہے۔

اب جب کہ یہ حق مال کے حکم میں ہو گیا، مؤلف و موجد اور ناشر و صانع دونوں کے لئے اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی، اور جو استحقاق کے بغیر ایسا عمل کرے گا وہ دراصل ایک ”حق مالی“ کا غاصب ہوگا، اور چونکہ غصب کی یہ ایسی صورت ہے کہ یہاں ”غاصب“ کو اس کے غاصبانہ تصرف سے روکنا آسان نہیں، ایسی صورت میں علاوہ دوسرے فقہاء کے خود فقہاء احناف بھی مال منصوب سے انتفاع کو قابل ضمان قرار دیتے ہیں جیسا کہ اموال یتامی اور اموال اوقاف کے غاصب کو ضمان قرار دیا گیا (جامع المفصلین، ۱۷۶) اس لئے اس پر ضمان عاید کرنا بھی درست ہوگا۔

۶۔ اس میں شبہ نہیں کہ حدیث کی روایت و تعلیم پر عوض لینے کو اکثر سلف صالحین نادرست سمجھتے تھے، حسن بصری، حماد بن سلمہ، سلمہ بن شیبہ، سلیمان بن حرب، ابو حاتم رازی، شعبہ اور امام احمد بن حنبل، ان سبھوں سے نہ صرف یہ کہ اس کا ناجائز ہونا نقل کیا گیا ہے، بلکہ یہ حضرات ایسے شخص کی روایت قبول بھی نہیں کرتے تھے (الکفایہ فی علم الروایہ، ۲۰۶، باب کرہۃ أخذ الأجر علی التحدیث)، لیکن بعض حضرات روایت حدیث پر اجرت لینے کو درست بھی سمجھتے تھے، یعقوب کے بارے میں مروی ہے کہ وہ حدیث پر اجرت لینے کو درست بھی سمجھتے تھے۔ یعقوب کے بارے میں مروی ہے کہ وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث: لا یبولن أحدکم فی الماء الدائم“ (حوالہ سابق) کو نقل کرنے کی اجرت ایک دینار لیا کرتے تھے۔ ابو نعیم اور علی بن عبدالعزیز سے بھی روایت پر اجرت لینا منقول ہے۔ طاؤس اور مجاہد جن کا شمار اجدہ تابعین میں ہے اور بڑا اونچا علمی اور دینی مقام رکھتے ہیں وہ بھی بلا تکلف روایت حدیث پر اجرت لیا کرتے (الکفایہ، ۲۰۷، ذکر بعض أخبار من کان مأخذ العوض علی التحدیث)۔

دوسرے فی زمانہ تصنیف و تالیف کے لئے قیاس کا زیادہ صحیح محل تعلیم قرآن اور امامت و اذان پر اجرت ہے، کہ دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے تصنیف و تالیف کے سلسلہ کا جاری رہنا تعلیم قرآن سے کم ضروری نہیں، اور اسی ضرورت کی بنا پر فقہاء نے تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت کو جائز قرار دیا (رسائل ابن عابدین، ۱۱۱-۱۱۲)۔

۷۔ جو لوگ کتابوں کی طباعت اور اس کی نشر و اشاعت کو مباح الاصل قرار دیتے ہیں انہیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کسی چیز کے اصل مباح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو، ہر تاجر کے لئے مباح ہے کہ وہ اپنی اشیاء فروختنی کا ہک کے سامنے پیش کرے اور ہر گاہک کو اختیار ہے کہ وہ تاجر سے کوئی شئی اپنے لئے خرید کرے، لیکن اگر ایک تاجر کسی کے سامنے کوئی مال پیش کر چکا ہے تو دوسرے کو منع کر دیا گیا کہ وہ پیش کش سے باز رہے، یا ایک گاہک کسی چیز کی قیمت طے کر رہا ہو تو دوسرے گاہک کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھ کر خود لینے کی کوشش کرے، حدیث میں اس کو ”سوم علی سوم أخیه“ کہا گیا ہے (مسلم عن ابی ہریرہ و ابن عمر)۔

اسی طرح ”خطبة علی خطبة أخیه“ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرہ) سے منع کیا گیا ہے کہ ایک شخص کا پیغام نکاح دینے کے بعد پھر کوئی پیغام نہ دے، حالانکہ فی نفسہ ہر ایک کے لئے نکاح کا پیغام دینے کی گنجائش ہے۔

بلکہ بعض ایسے مسائل میں بھی جس میں واضح نص موجود ہے شریعت کی مجموعی حکمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض استثنائی صورتیں پیدا کی گئی ہیں، مثلاً ہر شخص اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ جس قیمت پر چاہے اپنی اشیاء فروخت کر دے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ممانعت فرمائی ہے کہ تاجر کے اس شخص حق میں دخل دیا جائے (ابوداؤد عن انس، ۴۸۹۲)، لیکن اگر کوئی شخص اس اباحت کا غلط فائدہ اٹھانے لگے، قیمتیں بہت گراں کر دے تو فقہاء نے حکومت کے لئے ایسی گنجائش پیدا کی ہے کہ وہ قیمتوں کا تعین کر دے۔



فإن كان أرباب الطعام يتحكمون ويعتدون من القيمة تعدياً فاحشاً وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين إلا بالتسخير فحينئذ لا بأس به إذا كان من أهل الرأي والبصيرة“ (تكملة فتح الملهم ۲۰۲۴)۔

(اگر غذائی اشیاء کے مالک حکم برتیں اور قیمتیں حد سے زیادہ بڑھ جائیں، قاضی مسلمانوں کے تحفظ سے عاجز ہو جائے اور قیمت کے تعین کے بغیر یہ ممکن نہ رہ سکے تو اہل رائے اور ارباب بصیرت سے مشورہ کر کے نرخ کی تعین میں کوئی مضائقہ نہیں)۔

اسی پر حق تصنیف کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح ”سوم علی سوم احیہ“ اور ”خطبہ علی خطبہ احیہ“ میں اور گراں فروشی کی صورت میں، من چاہی قیمت کو مباح ہونے کے باوجود ممنوع قرار دیا گیا، اس لئے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو ضرر اور نقصان پہنچ سکتا ہے، اسی طرح یہاں بھی مصنف اور ناشرین کو اس کا پابند کیا جائے گا۔

رجسٹرڈ ناموں اور نشانات کی بیع:

آج کل ٹریڈ مارک اور ناموں کا بھی رجسٹریشن ہوتا ہے۔ اگر دوسرے لوگ اس نام کا استعمال کریں تو کاروباری اعتبار سے یہ بہت بڑا ”غرر“ اور ”خدع“ ہے اور خریداروں کے ساتھ دھوکہ ہے۔ شریعت کے قانونی معاملات میں ایک اہم اصل یہ ہے کہ ایسا کوئی بھی کام نہ کیا جائے جو دوسروں کے لئے دھوکہ دہی کا باعث ہو، اس لئے اگر کوئی شخص نام یا تجارتی نشانات کو اپنے حق میں محفوظ کر لیتا ہے تو یہ عین مطابق شرع ہے، اور دوسرے شخص یا ادارہ کا اس کو استعمال کرنا دھوکہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، ایک شخص کے نام کی مہر کوئی اور شخص بنا لے، اس کی ممانعت کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے؟

پھر چونکہ یہ اس کا ایک حق محفوظ اور اس نام کی شہرت کی وجہ سے اس سے معاشی مفاد بھی متعلق ہو گیا ہے، اس لئے یہ مال کے حکم میں ہے، اور اس کی خرید و فروخت بھی درست ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں حضرت مولانا شرف علی تھانویؒ کا یہ فتویٰ نہایت چشم کشا ہے:

”اپنے کاروبار کے کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام ”عطرستان“ یا گلشن ادب“ رکھ لیا اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو گیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا، اور جبکہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارت مقصود ہے تو گڈول کا معاوضہ لینا جائز ہے“ (حوادث الفتاویٰ، حصہ چہارم، بحوالہ نظام الفتاویٰ ۱۳۲۱)۔

## فضا کی بیع:

فضا کی بیع کے سلسلہ میں احناف متفق ہیں کہ درست نہیں، البتہ بیع درست نہ ہونے کے اسباب کی وضاحت میں اہل علم کے درمیان اختلاف محسوس ہوتا ہے، گذرنے کے حق کو بیچنا درست ہے، یہ ایک قول حنفیہ کے یہاں موجود ہے، پھر بقول حنفی اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے۔ ”وبہ أخذ عامة المشائخ“۔ اور بقول شامی ساجانی نے کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے: ”وہو صحیح و علیہ الفتویٰ“ (رد المحتار ۲۰۱۱۸)۔ اب سوال یہ ہے کہ جب حق ہونے میں ”فضا“ اور ”علو“ اور ”مرور“ مشترک ہے تو ایک کی بیع جائز اور دوسرے کی ناجائز کیوں کر ہے؟ اس کا ایک جواب صاحب ہدایہ نے یہ دیا ہے کہ ”مرور“ کا تعلق زمین سے ہے جو باقی رہنے والی عین ہے، اور فضا کا تعلق تھمائی عمارت سے ہے جو غیر باقی عین ہے:

”إن حق التعلیٰ يتعلق بعین لا تبقیٰ وهو البناء فأشبهه المنافع أما حق المرور فیتعلق بعین تبقیٰ وهو الأرض فأشبهه الأعیان“ (ہدایہ ۳۰۳۰)۔

لیکن ظاہر ہے کہ صاحب ہدایہ کی یہ تفریق اس وقت درست ہو سکتی ہے جبکہ عقار باقی اور غیر باقی کے درمیان بیع کے درست ہونے اور نہ ہونے میں کچھ فرق ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اسی لئے شامی وغیرہ نے اس کو ترجیح دیا ہے کہ ”حق مرور“ زمین سے متعلق ہے اور وہ مال ہے، اور ”حق تعلیٰ“ نہ اس سے متعلق ہے اور وہ مال نہیں۔

”والفرق بینہ وبين حق التعلیٰ حیث لا یجوز، إن حق المرور حق یتعلق برقبۃ الأرض وہی مال... أما حق التعلیٰ فمتعلق بالدار وهو لیس بعین مال“ (رد المحتار ۲۰۱۱۸)۔

مگر غور کیا جائے تو شامی کے اس استدلال میں بھی کوئی وزن نہیں ہے۔ حق مرور جس طرح زمین کی سطح سے متعلق ہے ٹھیک اسی طرح حق تعلیٰ تعمیر شدہ مکان سے متعلق ہے، زمین کی سطح بھی ہو اسے پڑے اور مکان کی بالائی سطح بھی، اس لئے قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ ”بیع علو“ کی اجازت ہونی چاہئے۔ ☆☆☆



## حقوق و منافع کی خرید و فروخت

حنفی نقطہ نظر سے

ڈاکٹر محمد محروس المدرس

مجھے بڑی مسرت ہے کہ چند مہینہ قبل میں بمبئی حاضر ہوا تو مجھے عزیز الرحمن صاحب مدظلہ فتحپوری کے ذریعہ نئی دہلی میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا علم ہوا، میں نے اس کے مدیر محترم علامہ شیخ مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہ سے مراسلت کی، اس طرح ہمارے درمیان تعارف ہوا، حالانکہ اس سے پہلے بھی مراسلت کے ذریعہ اور مؤخر الذکر کی جو کچھ مطبوعات سامنے آئی تھیں باہم متعارف تھے، مجھے قاضی صاحب موصوف نے (جزاہ اللہ خیراً) فقہ اکیڈمی کے اس اجلاس کی دعوت دی، جو شہر بنگلور میں ۱۲ تا ۱۷ ارزی قعدہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء منعقد ہونے والا تھا، میں اللہ تعالیٰ عزاسمہ سے توفیق مانگتا ہوں کہ وہ مجھے نفع بخش چیزیں پیش کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

میں اولاً گفتگو کروں گا شئی، مال، ملک اور منفعت کے متعلق لغت اور اصطلاح کی روشنی میں، اور پھر اس سلسلہ میں گفتگو کروں گا کہ مذکورہ بالا اصطلاحات یا ان میں سے بعض کے مفاہیم میں کہاں تک وسعت پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔

میں اپنی بحث علماء احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کی فقہ تک محدود رکھوں گا جس کے مندرجہ ذیل دو اسباب ہیں:

- ۱۔ اول یہ کہ اگرچہ جملہ مذاہب فقہاء کے سلسلہ میں میری معلومات بہت معمولی ہیں لیکن ان میں نسبتاً فقہ حنفی کے سلسلہ میں کچھ زیادہ واقفیت ہے۔
- ۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں پوری قوت سے اس امر کا داعی اور محرک رہا ہوں کہ بحث و تحقیق کرنے والوں کو اپنے ریسرچ میں کسی ایک فقہی مکتب فکر کا پابند رہنا چاہئے۔ اور اس کی راہوں اور طریقوں پر عبور حاصل کر کے اس کے اسلوب اور اس کی اساس کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ استنباط اور اخذ نتائج کا درجہ حاصل کیا جاسکے۔ ممکن ہے کہ ممالک اسلامیہ اور علماء اسلام کے درمیان اجتہاد مطلق اور اجتہاد منتسب کی غیر موجودگی میں یہ طریقہ مفید اور کارآمد ہو سکے۔

علاوہ ازیں جو شخص کسی ایسے قانون کی تیاری میں مصروف ہو جس کا نفاذ بندگان خدا پر ہو سکے، اس کو تقابلی مطالعہ کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ وہ اپنے ملک اور زمانہ کے لئے زیادہ سے زیادہ مناسب اور مفید قانون کو اختیار کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ گفتگو میں اتنا پھیلاؤ ہو جائے کہ جس سے قانون ایک (مرقعہ) پیوندوں کا مجموعہ ہو کر رہ جائے، جو اپنے ملک اور حالات کے لحاظ سے بھی موافق نہ پڑے۔ لہذا قانون سازی میں وحدت مطلوب ہے، کیونکہ ایک ہی قانون ہمہ جہت ڈھانچہ ہوتا ہے، جبکہ اس میں ایک موضوع سے بحث کی گئی ہو۔ اس سلسلہ میں مثالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اصل مقصود کا آغاز کرتا ہوں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ایک مختصر بحث ”اصطلاح“ کے معنی، اصطلاح سازی کا طریقہ، اور حقیقت و مجاز سے متعلق کردی جائے، اس کے بعد ان اصطلاحات کے معانی ذکر کر دیئے جائیں جو ہمارے لئے اہم ہیں۔ یعنی شئی، ملک، مال، اور منفعت، یہ تو ہو گئے باب اول کے مباحث۔

دوسرے باب میں ان امور سے بحث کی جائے گی جن سے مذکورہ بالا چاروں اصطلاحات کے معنی اور مفہوم کی توسیع میں مدد لی جاسکتی ہے۔

## باب اول

اس باب میں چند بحثیں ہیں:

### پہلی بحث

یہ لفظ ”اصطلاح“ کے معنی اور اس کے ماخذ کے بیان میں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ لغوی معنی سے مراد وہ معنی ہے جو عربی زبان میں ہو۔ کیونکہ عربی ہی اسلامی قانون کی زبان ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔

”اصطلاح“ کے لغوی معنی ہیں کسی امر پر لوگوں کا متفق ہو جانا۔ ”اصطلاح“ کے اصطلاحی معنی کے سلسلہ میں کئی اقوال ہیں:

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصطلاح کا معنی ہے کسی جماعت کا کسی شے کا ایسا نام رکھنے پر متفق ہو جانا جو اسے اس کے پہلے مفہوم سے ہٹا دے۔

بعض حضرات کے نزدیک اصطلاح کی تعریف ہے لفظ کو اس کے لغوی معنی سے نکال کر بیان مراد کی خاطر کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنا۔

بعض حضرات نے اصطلاح کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ”اصطلاح“ کسی معین لفظ کا نام ہے جو معین قوم کے درمیان رائج ہو (التعاریف ۲۲)۔

مذکورہ بالا تعریفات کے مقابلہ میں زیادہ واضح تعریف یہ ہے کہ کسی متعین جماعت کا کسی مخصوص لفظ کو اس کے لغوی معنی سے دوسرے معنی کی جانب منتقل کرنا اور اس نئے معنی کے ساتھ مخصوص کر دینا۔ (در احکام شرح مجلہ الاحکام ۹۰)۔

ان تعریفات کے ذریعہ اصطلاح کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ کسی لفظ کو اس کے معنی وضعی سے جو وضع لغوی کے ذریعہ متعین ہوئے تھے نقل اتفاتی (متفق علیہ) کے ذریعہ معنی مجازی کی جانب منتقل کر دینا۔ اور اس طرح لفظ کا انتقال حقیقت اصطلاحیہ کی جانب ہو جائے گا جسے ادیب حضرات حقیقت عرفیہ کہتے ہیں (الکشاف ۳۱۴)۔

حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ حقیقت عرفیہ اور حقیقت اصطلاحیہ میں کئی اعتبار سے فرق ہے:

- ۱۔ اصطلاح کا وضع (وضع کنندہ) عام طور پر معلوم ہوتا ہے جبکہ عرف کا وضع بالعموم غیر معروف ہوتا ہے۔
- ۲۔ اکثر و بیشتر اصطلاح کا مبداء اور ماخذ معلوم ہوتا ہے جبکہ عرف کا ظہور بتدریج ہوتا ہے۔ پس اگر اصطلاح شائع و ذائع ہو جائے اور اسے قرار حاصل ہو جائے تو پھر وہ ”حقیقت اصطلاحیہ“ سے ”حقیقت عرفیہ“ کی جانب منتقل ہو جائے گی۔
- یہ بات بھی معلوم ہے کہ جملہ اقسام میں حقیقت کی علامت یہی ہے کہ مطلق طور پر قرآن کے بغیر بولے جانے کی صورت میں ذہن اس کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں جب کوئی لفظ لغت، عرف یا شریعت کے لحاظ سے کسی معنی کے لئے وضع کیا جائے اور ہر وضع میں اس سے مراد اس کی ذات ہی ہوتی ہو تو وہ ”حقیقت مطلقہ“ ہے۔

ہاں اگر کسی لفظ کا وضع لغوی میں اور معنی ہو، وضع اصطلاحی میں کوئی اور معنی، اور وضع عرفی میں کوئی تیسرا معنی تو اس کو ”حقیقت مقیدہ“ کہتے ہیں۔ یعنی کوئی لفظ لغت میں کسی معنی کے لئے حقیقتاً وضع کیا گیا ہو تو وہ ”حقیقت لغویہ“ ہے، اور اسی لفظ کا حسین کی اصطلاح میں کوئی اور معنی ہے جس کی جانب اول و ہلہ میں ذہن منتقل نہیں ہوتا تو وہ لفظ اس لحاظ سے ”مجاز“ ہے، کبھی اہل اصطلاح کی باہمی گفتگو میں وہ لفظ بولا جاتا ہے تو بغیر کسی قرینہ کے اس معنی اصطلاحی کی جانب ذہن منتقل ہو جاتا ہے تو وہ ان اہل اصطلاح کے حق میں ”حقیقت“ ہو جاتا ہے اور وضع لغوی کے ذریعہ جو اس لفظ کا معنی لغوی ہو وہ مجاز بن جاتا ہے، اور کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لفظ مجازی معنی میں مستعمل ہوتا ہے بغیر اس کے کہ وہ کسی حقیقی معنی کے وجود کو مستلزم ہو، اس وقت لفظ غیر معنی

موضوع لہ میں استعمال نہ ہوگا (الکشاف ۱/۳۱۳)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد یہ لفظ حقیقت نہیں کہلائے گا اور مجاز کے دائرے سے خارج نہیں ہو جائے گا؟ اس موقع پر ہم ایک اور سوال بھی کر سکتے ہیں کہ آیا حقیقت عرفیہ اور حقیقت اصطلاحیہ میں تغیر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب درست ہے۔ اور ہم دیکھیں گے کہ ہمارے علماء سے جو تصریحات منقول ہیں ان سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ معلوم ہوا کہ کسی جماعت میں کسی اصطلاح کی کوئی تعریف متعارف ہو تو دوسرے معنی کی اصطلاح قائم کرنا بھی جائز ہوگا۔ اور جب ان کی اصطلاح عام ہو جائے تو وہ معنی حقیقت اصطلاحیہ سے حقیقت عرفیہ کی جانب منتقل ہو جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معنی وضعی میں کوئی پابندی نہ ہوگی۔

خواہ یہ وضع لغوی ہو خواہ اصطلاحی یا عرفی۔ ہاں وضع شرعی میں پابندی ہو سکتی ہے، اس کے باوجود جو شخص غیر شرعی معاملات میں شرعی اصطلاح کا استعمال کرے تو اسے حقیقتاً وضع لغوی پر محمول کریں گے، کیونکہ متکلم کو شرعی استعمال سے بعد ہے، معلوم ہوا کہ شارع نے معانی لغویہ کو حقائق شرعیہ کی جانب منتقل کرنے کے بعد ان کو غیر معتبر نہیں قرار دیا ہے۔

اب اس کے بعد ہم اپنی بحث سے متعلق اصطلاحات کے اصطلاحی اور لغوی معنی بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔

## دوسری بحث

### ”شے“ کا مفہوم

لفظ ”شے“ لغت میں ہر موجود پر بولا جاتا ہے اور ہر اس چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تصور کیا جاسکتا ہو، جس کے بارے میں کچھ جانا جاسکتا ہو اور کچھ خبر دی جاسکتی ہو، یہ سیبویہ کا مذہب ہے (روح المعانی ۱/۱۷۸، الوسيط ۱/۵۰۳)۔

اور شیء کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نام ہے تمام موجودات کا چاہے وہ جواہر کے قبیل سے ہوں یا اعراض کے، اور ان کے بارے میں کچھ جانا اور خبر دینا بھی درست ہو، بعض لوگوں نے شے کی درج ذیل تعریف کی ہے، اور یہی تعریف زیادہ صحیح ہے، لفظ شے معدوم، موجود، واجب، ممکن سب کو شامل ہے، ان سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، البتہ قرآن سے مصداق متعین ہوگا۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ شے بول کر اس کے تمام افراد مراد لئے جائیں جیسا کہ قرآن کی آیت ”وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ (نور ۳۵) میں ہے، شے کے اس معنی پر قرینہ یہ ہے کہ علم الہی واجب، ممکن، معدوم، موجود، محال سب کو محیط ہے۔ کہیں لفظ شے بول کر صرف ممکن مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ”إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (البقرہ ۲۰) میں ہے۔ یہاں پر قرینہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کا تعلق ممکنات ہی سے ہے۔

کہیں لفظ شے بول کر ایسے ممکن کو مراد لیا جاتا ہے جو صرف ذہن میں موجود ہو جیسا کہ قرآن کی آیت: ”وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا“ (الأنعام ۲۳) میں ہے، یہاں پر شے سے مراد وہ چیز ہے جس کی صورت ذہن میں ہے اور جس کو کل کرنے کا ارادہ ہے۔

اور کبھی لفظ شے بول کر ایسے معدوم ممکن کو بھی مراد لیا جاتا ہے جو نفس الامر میں ثابت ہو جیسا کہ اللہ رب العزت کے قول: ”إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاہُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ (نحل ۴۰) میں مراد ہے، یہاں پر قرینہ وہ تکوین ہے جو معدوم کے ساتھ خاص ہے۔

اور کبھی لفظ شے بول کر موجود خارجی بھی مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کی آیت: ”وَلَقَدْ خَلَقْنَاكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُنْ شَيْئًا“ (مریم ۹) میں ہے، یہاں شے سے مراد موجود خارجی ہے، کیونکہ شے کو عام معنی میں رکھ کر نفی کرنا ممنوع ہے، اس لئے ہر مخلوق ازل میں شے بمعنی معدوم ہے اور ہر شے ازل میں شے بمعنی ثابت فی نفس الامر ہے، اور لفظ شے کا اس معنی پر اطلاق گذر چکا ہے، اور استعمال میں اصل یہی ہے کہ لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جائے اور بغیر کسی قرینہ صارفہ کے حقیقت سے عدول نہ کیا جائے، اور لفظ شے کا موجود کے معنی میں کثرت استعمال اسے معنی حقیقی سے ہٹانے کا قرینہ نہیں بن سکتا (روح المعانی ۱/۱۷۸)۔

پھر علامہ محمود آلوسی ان لوگوں کا تفصیلی رد فرماتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ لفظ شے کا معدوم پر اطلاق ممکن نہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لفظ شے کا اطلاق لغت اور محاورہ دونوں میں معدوم اور موجود پر درست ہے کیونکہ یہ سب شے ہیں اور اس کی تائید وہ ساری آیات کر رہی ہیں جو ہم نے ذکر کیں۔ ان کی کثرت اس بات پر بھی



دلالت کرتی ہے کہ یہ شئی کا حقیقی معنی ہے، قرآن کریم کی آیتیں: ”إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ“ اور ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ اللہ رب العزت کے ساری مخلوق کے احاطہ علمی پر دلالت کرتی ہیں، چاہے وہ جو ہر ممکن ہو یا عرض موجود یا اس کے علاوہ اور کسی قسم کی چیز جسے ہم جانتے ہیں، لہذا لفظ شئی کا استعمال اس نام معنی پر بغیر کسی نزاع کے درست ہے۔ جہاں تک اصطلاح لغت کا تعلق ہے اس میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:

الشیء: ایسی موجود کا نام جو خارج میں موجود ہو (المغرب ۲۶۰، التعریفات ۲۱۳)۔

پس لفظ شئی ہر موجود پر بولا جاتا ہے چاہے وہ مس کی جانے والی چیز ہو یا دوسرے محسوسات کے قبیل سے ہو یا اس کے علاوہ ہو۔ اس کی تائید حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت کرتی ہے جو بیچ صرف کے بارے میں آتی ہے:

”لا بأس فیما إذا افتقرت ما و لیس بینکما شیء“ (المغرب ۲۶۰)۔

یہاں شئی سے مراد تصرف یا عمل ہے۔ حضرت ابن عمر نے اسی کا نام شئی رکھ دیا۔

مجلد احکام عدلیہ کی دفعہ ۱۲۵ میں ہے: ”الملک ما ملکہ الإنسان سواء كان أعياناً أو منافع“۔

(یعنی ملک وہ چیز ہے جس پر ایسا مالکانہ حق حاصل ہو کہ اس میں خصوصی تصرف کرنا ممکن ہو)۔

لہذا لفظ شئی عام ہے اور ملک خاص ہے، ملک وہی شئی ہے جو کسی انسان کے ساتھ خاص ہو، وملکنا الماء: اروانا یعنی ہمیں سیراب کیا۔

وهذا ملک یمینی ”مثله“ وملکہ یمینی وأعطانی من ملکہ ”مثله“ مما یقدر علیہ۔

یعنی ایسی چیز جس پر انسان قادر ہو۔ (القاموس للفریوز آبادی ۳۰۳، مختار الصحاح ۶۳۳)

اور الوسیط میں ہے: ملک الشیء ملکا، کسی چیز کو حاصل کیا اور اس میں تصرف کیا۔

الملک: ایسی چیز جس کا مالک ہوا جائے اور جس میں تصرف کیا جائے۔ مذکورہ مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ”وَلِلّٰهِ مُلْكُ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (آل عمران، ۱۸۹) (القاموس الوسیط ۸۸۶، اللسان لابن منظور ۱۰، ۴۹۲)

اور اصطلاح میں الملک:

۱۔ مجلد احکام عدلیہ نے دفعہ ۱۲۵ میں لفظ ”ملک“ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”الملک ما ملکہ الإنسان سواء كان أعياناً أو منافع“ یعنی ملک وہ شئی ہے جو کسی انسان کی مملوک ہو اور جس میں اسے تصرف کا خصوصی حق حاصل ہو۔ اس تعریف میں ایک طرح کی کمزوری ہے، اس تعریف سے تکرار لازم آتا ہے، کیونکہ معرف بھی تعریف میں موجود ہے اور تعریف میں اس کا تکرار ہے، تعریف کا خلاصہ یہ ہے: کسی شئی میں خصوصی تصرف کا امکان چاہے وہ اعیان کے قبیل سے ہو یا منافع کے۔ لہذا ملک وہ چیز ہے جس کی شان یہ ہو کہ اس پر آدمی خصوصی تصرف کا حق رکھتا ہو (الدستور ۱۸۸)۔

ابن نجیم اور ابن عابدین نے حاوی قدسی سے ملک کی یہ تعریف نقل کی ہے:

الاختصاص الحاجز۔ ایسا خصوصی حق تصرف جو دوسروں کو تصرف سے روک دے (الاشباہ ۳۳۶، ابن عابدین ۵۰۱)۔

۲۔ ہمارے فقہاء کا ایک دوسرا نقطہ نظر بھی ہے، اکمل الدین بابر ترقی اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”القدرة علی التصرف فی المحل شرعاً“ (العناہة نقلاً عن فتح القدیر ۵۰۴) (شرعاً کسی محل میں تصرف کی قدرت کا نام ملک ہے)۔

اسی جانب ابن ہمام کا میلان بھی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

”الملک قدرة یثبتها الشارع ابتداء علی التصرف“ (فتح القدیر ۵۰۴) (ملک تصرف کے ایسے اختیار کا نام جسے ابتدائی شریعت نے ثابت کیا ہو)۔

ابن نجیم نے یہ تعریف نقل کرنے کے بعد ”الإلمانہ“ کا اضافہ کیا ہے (الاشباہ ۳۳۶)۔ گویا کہ انہوں نے یہ قید لگا کر ان لوگوں سے احتراز کیا ہے جو

مالک ہو سکتے ہیں لیکن تصرف نہیں کر سکتے جیسے مجنون، سفیہ، مجبور، صبی۔

۳۔ سید شریف کی تعریفات میں ہے، فرماتے ہیں:

”الملک: اتصال شرعی بین الإنسان و بین شیء یکون مطلقاً لتصرفه فيه و حاجزاً عن تصرف غیره فيه“  
(التعریفات ۱۵۵) (ملک انسان اور شے کے ایسے تعلق کا نام ہے جو اس شخص کو تصرف کی اجازت دے اور غیر کو تصرف سے روکے)۔

اور صدر الشریعہ کی ”وقایہ“ میں ہے، فرماتے ہیں: ”الملک اتصال شرعی بین الانسان و الشیء تطلق تصرفه و یمنع غیره فيه“۔  
پس گویا کہ شریعت نے جن چیزوں میں مالک ہونے کی اجازت دی اور تملک کی گنجائش رکھی وہ ملک ہے ورنہ نہیں۔ اور ملک انسان اور شے کے درمیان علاقہ اور اتصال کا نام ہے، پس ہر موجود اور ممکن الوجود جبکہ اس کے بارے میں خبر دی جاسکتی ہو وہ شے ہے، چاہے وہ منفعت ہو، حق ہو یا اس کے علاوہ، پھر منفعت ملک ہی کے قبیل سے ہوگی اس کے خلاف نہیں ہوگی، اور منفعت شے ہوگی اس کے علاوہ نہیں ہوگی، لہذا لغوی معنی اصطلاح میں ملحوظ ہے، پھر جس چیز میں تصرف کا خصوصی حق حاصل ہو وہ ملک ہے اور جو اس کے علاوہ ہو وہ ملک نہیں، ہاں اس کا مالک ہو جاسکتا ہے۔ اور اس بنیاد پر ہمارے اصحاب کاشی کے عموم کے بارے میں مذہب یہ ہے کہ لفظ شے ہر موجود پر بولا جائے گا معدوم پر نہیں، یہ حقیقت اصطلاحیہ ہے، اس جانب انہیں علم کلام کی مشہور بحث لے گئی ہے، پس اگر علم کلام سے الگ ہو کر بحث کریں اور اصطلاحی معنی کی دونوں صورتیں نکالیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، معاملات کی بحث میں شے کو الگ رکھیں اور عقائد اور کلام کی بحثوں میں الگ (اصول البرزوی ۱/۳۵)۔

## تیسری بحث

### ”معنی ملک“

لغت میں: ملکہ یملکہ ملکا حرکات کے ساتھ، اور ملکہ لام کے فتح کے ساتھ، ”ملکہ“ لام کے ضمہ یا لام پر تینوں حرکات کے ساتھ۔ احتواء قادراً علی الاستبداد بہ۔

و ملکہ ملکا حرکات ثلاثہ کے ساتھ اور دونوں کے ضمہ کے ساتھ، ایسی چیز جس کا مالک ہو۔

ولی فی الوادی ملکا حرکات ثلاثہ کے ساتھ، یعنی چراگاہ یا چشمہ یا مال یا وہ ایسا کنواں ہے جسے کوئی شخص کھودے اور وہی اس کا تہا مالک ہو، قولہم: الماء ملک امر حرکت کے ساتھ، کیونکہ جب ان کے ساتھ پانی ہوتا تھا تو وہ اپنے معاملہ کے ملک ہوتے تھے، ولیس لہم ملک تینوں حرکات کے ساتھ۔ ماء عام ہے ہر موجود اور ممکن الوجود کو شامل ہے جیسا کہ شے کے معنی میں جان چکے ہیں۔ لہذا یہ تمام چیزیں ملک ہوں گی چاہے اعیان ہوں یا منافع، یہی جملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

### چوتھی بحث

#### منفعت کا معنی:

لغت میں ”نفع“ ضد ہے ”ضرر“ کی۔ کہا جاتا ہے: نفعته نفعاً و انتفعت بكذا (العین للفرامیدی ۲۰۱۵۸)۔

و نفعه نفعاً: أفاده و أوصل إليه خيراً، فهو نافع و نفاء۔

النفع: الخیر، ہر وہ چیز جس کے ذریعہ انسان مطلوب تک پہنچ سکے (الوسیط ۲/۹۳۲)۔

المنفعة: اسم ہے (مختار الصحاح ۶/۶۷۳، مفیر و آبادی ۳/۹۲)۔

اور منفعت: ہر اس خیر کو کہتے ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اس کی جمع ”منافع“ ہے (الوسیط ۲/۹۳۲)۔

میں کہتا ہوں کہ گویا منفعت نفع بخش شے کی ذات ہوئی نہ کہ خود نفع، لیکن ہم ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ نفع کے معنی میں ”خیر“ اور ہر وہ چیز جس کے ذریعہ آدمی اپنے مطلوب تک پہنچ سکے تو اب ”نفع“ دونوں معنی پر مشتمل ہوا، اور گویا اس کے معنی کے متعلق دورائیں پائی گئیں۔

بہر صورت اس کا اطلاق ”نافع“ کی ذات پر بھی ہوتا ہے اور اس کے نتیجے اور فائدے پر بھی۔

اور اصطلاح میں منفعت کہتے ہیں اس کو کہ جو کسی فعل کے نتیجے میں ظاہر ہو اور اس کے بغیر کسی فعل کے صدور کا کوئی محرک نہ ہو، یہی ”منفعت“ ہے، یہی ”فائدہ“ ہے اور یہی ”غایۃ“ ہے (دستور العلماء، ۲۳)۔

میں کہتا ہوں کہ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ”فعل“ کے ذریعہ جو کچھ حاصل ہو یا جو فعل کا منتہی ہو وہی ”منفعت“ کہلاتی ہے۔

اگرچہ اس میں کسی دوسرے کے ضرر کا پہلو بھی ہو اس طور پر کہ اس فاعل کی فعل سے وابستگی میں کوئی حاجت اس ضرر رسانی کی نہیں ہے اور بذات خود اس کی سعی اس ضرر رسانی کی غرض سے نہیں ہے بلکہ (غیر ارادی طور پر) وہ غیر کے ضرر کا سبب بن گیا ہے۔

یہ ضرر کبھی تاوان کا باعث بھی ہو جاتا ہے، اس طرح ”نفع“ قابل عوض اور لائق بدل چیز ہو گیا۔

البتہ افعال الہی کا جہاں تک تعلق ہے اس میں منافع، مصالح اور غایات (منتہی) سب ہوتی ہیں لیکن ان سے (فاعل کی اپنی) غرض کوئی نہیں ہوتی، اس لحاظ سے وہ ذات خداوندی کی کسی ضرورت کی تکمیل کرنے کے لحاظ سے غیر مقصود ہیں (یعنی اس لحاظ سے ان میں کوئی منفعت نہیں سوچی گئی ہے) (دستور العلماء، ۲۳)۔

حاصل یہ کہ منافع ہی اصل مقصود ہوتے ہیں نہ کہ وہ افعال جن کے نتیجے میں منافع ظاہر ہوتے ہیں، اور یہی حال اشیاء کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شارع کبھی کبھی سبب کو مسبب کا قائم مقام بنا دیتا ہے اور عین کو محل قرار دیتا ہے، اور مقصود منفعت ہوتی ہے اور ارادہ درست ہوتا ہے۔ اور جب محل بدل گیا تو منفعت بھی بدل گئی۔ اور اس کے فعل کا مسبب ہونے کی وجہ سے انضباط و تعین مشکل ہے، اس لئے جس چیز کی تعین و انضباط ممکن ہے اسی کو اس کا قائم مقام بنا دیا جاتا ہے۔ یہ چیز شریعت میں بہت عام ہے، مثلاً نیت کے قائم مقام الفاظ اور آلہ کو کر دیا جاتا ہے، اسی طرح سفر اور مرض ہیں کہ ان کو مشقت کا قائم مقام کر دیا گیا (کیونکہ مشقت کی مقدار کا طے کرنا مشکل ہے اس لئے مثلاً سفر کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا، کیونکہ اس کی تعین و انضباط آسان ہے)، یہی حال دیگر معاملات کا ہے۔

اور اس کی تائید کے لئے ابن الہمام کے کلام میں غور کیجئے، وہ اپنی کتاب ”التحریر“ میں لکھتے ہیں: ”کسی حکم کی حقیقی علت وہ امر مخفی ہے جس کو ”حکمت“ کہتے ہیں، اور اس کا وصف ظاہری علت کا مظنہ ہے نفس علت نہیں، لیکن اصطلاح یہی بن گئی ہے کہ اسی کے اوپر علت کا اطلاق کر دیا جاتا ہے“ (نقلاً عن اصول الفقہ الاسلامی: محمد مصطفیٰ شلبی، ۲۳۰)۔

جیسا کہ بعض محققین احناف نے صراحت کی ہے یعنی خود ابن ہمام نے لکھا ہے کہ ”اصحاب مذاہب نے حکم کو وصف ظاہری کے ساتھ معلل کیا ہے نہ کہ علت حقیقی کے ساتھ، اس اندیشے کے تحت کہ اس علت پر فروع مذہب میں سے کسی فرع کے ذریعہ اعتراض نہ وارد کر دیا جائے (فتح القدر للکمال ابن الہمام، ۲۷۸)۔

یہی وجہ ہے کہ استہلاک مال کی صورت میں محض اس کی ذات کی وجہ سے ضمان نہیں آتا بلکہ اس کے تمام منافع کے فوت ہو جانے کے باعث ضمان آتا ہے، یہاں عین کو ان منافع کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ کتاب ”درراہ حکام شرح مجلۃ الاحکام“ لعلی حیدر میں ہے کہ:

”منافع“ منفعت کی جمع ہے، اور یہ وہ فائدہ ہے جو کسی عین کے استعمال سے حاصل ہوتا ہے، پس جس طرح مکان سے منفعت اس میں رہائش کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح چوپایوں سے منفعت ان پر سوار ہو کر حاصل ہوتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ:

منفعت ”حرکت“ (وسکون) کی طرح زائل ہو جانے والے اعراض میں سے ہے جو کہ معدوم ہیں، اس لئے قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عقد اور معاملات کا محل قرار نہ پائیں، لیکن شارع نے ان کو ضرورۃً موجود کا (اور اعراض کو اعیان کا) حکم دیدیا ہے اور یہ بات جائز قرار دیدی ہے کہ وہ عقود و معاملات کا محل قرار پائیں، اسی لئے ”منفعت“ عقود کے سلسلے میں ”عین“ کے قائم مقام ہو گئی ہے (درراہ حکام)۔

پس منفعت ایک عرض ہے جو لگا تار دو زمانوں میں قائم نہیں رہ سکتی۔



اس سے ظاہر ہوا کہ منفعت کے دو لغوی معنی میں سے ایک معنی کی رو سے کسی شے کے فائدہ پر اکتفاء کرنا اس کی ”منفعت“ پر اکتفا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ”منفعت“ کا اطلاق شے نافع کی ذات پر بھی ہوتا ہے، اور اس کے فائدے اور اس سے جو غرض مطلوب ہے اس پر بھی ہوتا ہے۔ اور اس اکتفاء پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے دلائل بھی موجود ہیں جن کی رو سے منفعت کا ایک ظاہری وجود ثابت ہوتا ہے اور ان کے لئے ایک بدل متعین قرار دیا جاتا ہے، اس کی طرف قرآن مجید کی آیت میں اشارہ ہے:

”آبَائِكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمُ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا“ (النساء: ۱۱)

امام آلوسی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے:

”اللہ تعالیٰ گویا یہ فرما رہا ہے کہ تمہاری عقلیں تمہاری مصالح کا احاطہ نہیں کر سکتیں، اس لئے تم نہیں جانتے کہ تمہارے اصول و فروع میں سے تمہارے وارث ہونے والوں میں کون تمہارے لئے زیادہ نافع ہے، اس لئے میراث کی تقسیم کے معاملے میں اپنی عقول کے پسند یا ناپسند کو چھوڑ دو اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے یا ایک کو محروم کرنے کا ارادہ نہ کرو۔

اس صورت میں علامہ آلوسی کے بقول:

”نفع“ عام ہے خواہ دنیوی ہو یا اخروی، اور ایک کا دوسرے سے فائدہ اٹھانا ہے، مثال کے طور پر اس پر خرچ کرنے اور اس کی تربیت کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے، اور آخرت میں ان کو انتفاع شفاعت کے ذریعہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ اس طرح ”منفعت“ قرآنی تعبیر اور قرآنی استعمال کے لحاظ سے ”قابل عوض بالمال“ اور ”نا قابل عوض بالمال“ دونوں پر مشتمل ہے۔ لہذا اشیاء کا تصور کبھی بھی محض ان کی ذات کی وجہ سے نہیں کیا گیا بلکہ ان کے منافع ہی کی وجہ سے کیا گیا ہے، اور منافع قابل عوض ہیں ان چیزوں کے ذریعہ جو ان کے قائم مقام ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول: ”وَإِنَّهُمْ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا...“، نفع محض ملکیت خمر پر مرتب نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے پینے پر مرتب ہوتا ہے جیسے سرخی، چڑے کی صفائی اور قوت باہ وغیرہ کا حصول۔ اور یہی حال ہے تمام چیزوں کا اس لئے کہ وہ چیزیں اپنے منافع ہی کی وجہ سے حاصل کی جاتی ہیں، اور ان منافع ہی کے لحاظ سے ان کی قیمتیں رکھی گئی ہیں۔

لیکن نظری اور عقلی طریقے پر غور کریں تو سمجھ میں آتا ہے کہ:

جب منافع اپنی اہمیت کے لحاظ سے اور ایک انسان سے دوسرے انسان کے مقابلے میں مختلف ہیں تو لازماً ان کی ثمنیت بھی غیر منضبط ہوگی لہذا منافع کو تملک (ملکیت) کا سبب اور علت نہیں قرار دیا جاسکتا اور نہ عدم انضباط کی وجہ سے ان کو عوض کا محل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اقلہ السبب مقام المسبب کے اصول پر نفع جہالت کی غرض سے منضبط (قابل انضباط) کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے تاکہ جملہ احکام ایک ہی میدان میں جاری رہ سکیں اور ایک لڑی میں پروئے جاسکیں۔

پس جس طرح بلاشبہ یہ بات معلوم ہے کہ شارع نے نیت کا اعتبار کیا ہے، اور اسی پر احکام کا مدار رکھا ہے، اور اس تک پہنچنا ضروری قرار دیا ہے، حالانکہ وہ غیر ظاہری (یعنی غیر محسوس) ہے جس کا نتیجہ عدم انضباط حکم ہے اس لئے ظاہر کو جو کہ منضبط (قابل انضباط) ہے نیت کا قائم مقام بنا دیا گیا۔ اس طرح ہم نیت کے الغاء (یعنی اس کو ناقابل اعتناء) قرار دینے کے لئے مجبور نہیں ہیں، بلکہ اس کے قائم مقام کا اعتبار کرنا عین اسی کا اعتبار کرنا ہے۔

پس جبکہ متعاقدین کے درمیان عقود کے الفاظ ان کی نیتوں کا رخ بتانے کے لئے نیت کے قائم مقام ہوتے ہیں، اور فاعل کی نیت بتانے کے لئے نیت کا آلہ قائم مقام ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ خطا اور عمد کے درمیان تفریق کی جاتی ہے اور اصل فعل اور اس کے سبب کے درمیان الفاظ کے ذریعہ تفریق ہوتی ہے تو یقیناً ان دلائل کی روشنی میں ایک شے کو دوسری شے کا قائم مقام بنا دیا جائے گا۔

یہی حال اہلیت کی تکمیل کا ہے یعنی ”اہلیۃ الاداء“ کا کہ اس میں ۷ سال کی عمر کو کم عمری کے قریب مانا گیا ہے، اور بلوغ کو کمال کا سبب مانا گیا ہے کمال عقل کی علامت کے طور پر، اور بلوغ کو جسمانی علامات کے ظواہر کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے، اگر علامات کے ظہور میں دیر ہو تو عمر کو علامات بلوغ کا قائم مقام قرار دیا گیا

ہے، اور عدول کرنا ہے ظاہر منضبط سے اظہر کی طرف، اور اس کی مقدار فقہاء نے الگ الگ علاقوں اور خطوں کے لحاظ سے الگ الگ رکھی ہے (یعنی بلوغ کی عمر کا تناسب ہر علاقے کا الگ الگ ہے)۔

لہذا "منفعة" نص کتاب سے بھی متقوم ہے اور لوگوں کے تعامل سے بھی، اور اشیاء سے جو اصل مطلوب منفعت ہے اس سے بھی ان کی یہی غرض ہے۔ لہذا اگر ہم یہ کہیں کہ شئی کی منفعت ہی اصل شئی ہے تو اس پر کوئی اشکال نہیں، اور از روئے لغت اس کی گنجائش نکلتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن یہاں ایک فقہی باریکی غور طلب ہے، ہمارے فقہاء متقدمین منفعت کو مال تسلیم نہ کرنے کی طرف گئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اس کو قابل ضمان نہیں مانتا ہے، اس لئے کہ منفعت کا کوئی مثل نہیں ہے نہ صورت نہ معنی۔

جہاں تک صورت عدم مماثلت ہے تو یہ واضح ہے، البتہ معنی بھی اس کا مثل نہ ہونا یعنی اس کی متبادل شئی کا متعین نہ ہو سکتا یہ تسلیم نہیں ہے۔ امام زفر نے اس کو مال قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تمییز الحقائق ۱۲/۱۵، البدائع ۶/۲۶۳، حاشیۃ النانوٹوی علی الکنز ۳۶۳، شرح الکنز للعبینی ۱۹۶/۲، درر الاحکام شرح مجلۃ الاحکام ۱/۴۴۰، حاشیۃ الشلبی علی شرح الکنز ۱۲۱۔

اور عدم مماثلت صورتہ معنی کے لئے دیکھئے: اصول الشاشی ۱/۴۱۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ فقہ کی بہت زیادہ باریکیوں کا التزام بسا اوقات اصل مقصود کی خلاف ورزی کی طرف لے جاتا ہے حالانکہ وسائل سے قبل مقاصد کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اور مبدأ (بنیاد) کا نظر انداز کر دینا ہی بسا اوقات عین بنیاد ہوتا ہے اور قاعدے سے خروج کرنا ہی عین قاعدہ ہوتا ہے چنانچہ میثہ اور دم اور لحم خنزیر کو حلال قرار دے دیا جاتا ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "غیلہ" کی اجازت دی، ضرورتہ بعض لوگوں کا خون مباح قرار دیا ایک زیادہ اہم مقصد کی خاطر۔ اس لئے علمۃ الناس کے حقوق کی حفاظت کی خاطر فقہی باریکیوں سے علیحدہ ہو جانا پڑتا ہے، کیونکہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی مصالح کی تکمیل ہی شارع کا اصل مقصود ہے۔

اور مصلحت میں عرف کی اور حاجت کی رعایت (حاجت عموماً یا کبھی کبھی ضرورت کی جگہ لے لیتی ہے) (مجلۃ الاحکام اعدایہ، دفعہ: ۳۳، الاشیاء والنظار) کا تقاضا یہ ہے کہ فقہ کا اعلیٰ ذوق رکھنے والا متقدمین کے مقررہ قاعدوں اور ضابطوں سے نکلے (اور مقصد شرع پر نگاہ رکھے)، اس کے متعلق مزید آگے کچھ ذکر کریں گے۔

## پانچویں بحث:

مال کا معنی لغت میں: مال ہر وہ شئی ہے جس کے تم مالک ہو۔ اور اس کی جمع "اموال" ہے، القاموس میں ہے: "رجل مال" یعنی کثیر المال شخص۔ اور "تمول الرجل" مالدار ہو گیا، اور "مولہ غیرہ تمویلاً" اس کو اس کے غیر نے مالدار بنا دیا (مختار الصحاح ۶۳۹)۔ اور مال کو مال اس لئے کہا گیا کہ اس نے لوگوں کو اللہ کی اطاعت سے مائل کر لیا (دستور العلماء ۱۸۸/۳)، اور کہا گیا کہ مال حیوان ہے، اور عرب کے لوگ اکثر و بیشتر مال کو اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی مال کا اطلاق ہر اس چیز پر کرتے ہیں جس کا انسان مالک ہو حیوان ہو یا غیر حیوان، جاندار ہو یا غیر جاندار۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ" اور "وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّغْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ" مال ان دونوں آیتوں میں ہر مملوک شئی کو شامل ہے کسی شئی کے ساتھ خاص نہیں ہے (الاتقصاد ۱۰۹)۔

اور مال کا معنی اصطلاح میں: مال وہ شئی ہے جس کی طرف انسانی طبیعت کا میلان ہو اور اس کا ذخیرہ کرنا وقت ضرورت ممکن ہو، چاہے شئی منقول ہو یا غیر منقول (مجلۃ الاحکام ۱/۱۳۶)۔ مال کی تعریف میں احناف نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور ان کے نزدیک یہی شائع ہے اور اسی پر ان کے فقہاء قائم ہیں، پھر وہ لوگ اپنی مختلف تعریفات میں اعمیان اور قابل ذخیرہ اور طبع انسانی کیلئے جاذب اور موجود شئی کو مال کہتے ہیں۔ حاشیہ ابن عابدین ۵۰۱/۳ میں حاوی قدسی سے مال کی تعریف منقول ہے کہ انسان کے علاوہ انسان کے مصالح کے لئے پیدا کی ہوئی شئی جس کا ذخیرہ کرنا اور بالاختیار اس میں تصرف کرنا ممکن ہو، مال ہے۔ اور ابن عابدین کے حاشیہ میں الدرر سے مال کی تعریف میں تحریر ہے کہ مال وہ شئی ہے جس میں خرچ کرنا اور اس خرچ کو روکنا پایا جائے۔ یا وہ شئی موجود جس کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو، اس میں خرچ اور عدم خرچ جاری ہو (رد المحتار ۵۰۱/۵)، یا وہ شئی ہے جس کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہوتی ہے اور اس کا ذخیرہ کرنا وقت ضرورت کے لئے ممکن ہو (رد المحتار ۵۰۱/۳)۔

اور مجمع الانہر میں مال کی تعریف یہ ہے: مال وہ عین ہے جس میں تنافس اور ابتذال جاری ہوتا ہے (رد المحتار ۵۰۱/۳)۔ احمد نگری نے اپنے دستور میں اس کی



تائید کی ہے کہ مال کی شان میں سے ہے کہ وقت ضرورت پر فائدہ حاصل کرنے کے لئے ذخیرہ کیا جائے۔ فائدہ حاصل کرنا شرعاً مباح ہو جیسا کہ ظاہر ہے، یا مباح نہ ہو جیسے خمر اور خنزیر۔ اگر اس سے انتفاع شرعاً جائز ہے تو وہ مال مستقوم ہے، اور اگر شرعاً انتفاع جائز نہیں ہے تو وہ مال غیر مستقوم ہے، پھر منفعت ملک ہے مال نہیں ہے۔ اور منافع مال مستقوم نہیں ہیں کیونکہ تقوم احراز کے بغیر حاصل نہیں، اور احراز بغیر بقا کے نہیں، اور بقا اعراض سے نہیں۔ اور اگر اعتراض کیا جائے کہ منافع مال مستقوم نہیں ہیں تو عقد اجارہ منافع پر کیسے صحیح ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "إقامة العين مقامها" عین کو منافع کی جگہ رکھنے کی وجہ سے (الدستور ۱۸۸)۔ علاوہ اس کے یہ مشہور تعریف و توجیہ تمام فقہاء احناف کے نزدیک نہیں ہے بلکہ فقہاء متقدمین احناف سے اس کے علاوہ تعریف منقول ہے۔ امام محمد بن الحسن اشیبانی مال کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ مال ہر وہ شئی ہے جس کا انسان مالک ہوتا ہے، چاہے وہ شئی دراہم یا دانایر یا گیہوں یا جو یا اس کے علاوہ ہو (العنایہ بہامش فتح القدیر ۱/۵۱۹، الطحاوی ۳۰۶)، اور الدرر میں ابن عابدین سے منقول ہے کہ مال وہ شئی ہے جس کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہوتی ہو اور اس میں بذل و منع جاری ہوتا ہو (رد المحتار ۵/۵۰)۔ مال کی یہ دونوں تعریضیں احراز اور عینیت وغیرہ کو مالیت کے لئے شرط نہیں بناتی ہیں۔ اور محمد بن الحسن نے مال کی تعریف میں مثال ذکر کرتے ہوئے "غیر ذلک" کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس میں بڑی گنجائش ہے، اور اس کا اطلاق ہر اس شئی پر ہوگا جو انسان کی ملک بنتی ہو، اور منافع ان اشیاء میں سے ہے جن پر ملک کا ثبوت ہوتا ہے یعنی شئی مملوک سے ہے۔ اس لئے یہ تعریف وسعت پیدا کرتی ہے اور الدرر کی تعریف بہت واضح ہے۔ اور شئی مذکور میں سے کوئی مالیت کے لئے شرط نہیں۔

اور منافع کو اموال ماننا امام زفر بن ابہذیل کا قول ہے، اور امام شافعی نے اسی کو لیا ہے۔ (تمییز الحقائق ۵/۱۳۱، حاشیہ النانوتوی علی الکنز ۳۶۳، بدائع الصنائع ۶/۶۶۶، شرح الکنز للعینی، درر احکام شرح مجلۃ الاحکام ۱/۴۴۰، حاشیہ اشلبی علی شرح ۱۳۱)۔

اور منافع کو مال نہ ماننے والے اپنے موقف پر مصر رہنے کے باوجود (کہ منافع ذخیرہ نہیں بنتے، دو وقت میں باقی نہیں رہتے، اور محرز نہیں ہوتے) کہتے ہیں کہ شئی کی مالیت اور تقوم میں فرق پایا جاتا ہے۔ مالیت کا ثبوت تو تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے مال قرار دینے کی وجہ سے ہوتا ہے اور تقوم کا ثبوت لوگوں کے مال قرار دینے اور شارع کے مباح للانتفاع بنانے سے ہوتا ہے (درر احکام ۱/۱۰۰، انقل عن الحموی)۔ مال میں تنافس اور ابتداء جاری ہوتا ہے۔ اور شئی کی صفت مالیت کا ثبوت تمام لوگوں کے مال قرار دینے سے ہوتا ہے یا بعض لوگوں کے مال قرار دینے سے ہوتا ہے، اور شئی کی قیمت کا ثبوت شریعت کی اجازت انتفاع سے ہوتا ہے، تو خمر مال ہے لیکن مستقوم نہیں ہے (حاشیہ النانوتوی علی الکنز ۳۴۷)۔

ان کے قول سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ لوگوں کا کسی چیز کو مال قرار دینا معتبر ہے۔ اور اس کی قیمت شریعت کی ہی جہت سے ہو سکتی ہے نہ کہ کسی اور جہت سے۔

## پہلی فرع

### مال کے لغوی معنی کی تحقیق:

اگر ہم مال کے لغوی معنی کی طرف نظر ڈالیں گے تو ہم اس حقیقت تک پہنچیں گے کہ اہل لغت ہر اس شئی کو "مال" کہتے ہیں جس کا انسان مالک بنے۔

شئی: اس کا معنی پہلے گذر چکا ہے۔ لغت میں اس کا اطلاق موجود، ممکن اور واجب پر ہوتا ہے۔

پس ہر چیز جس کے بارے میں خبر دی جائے "شئی" ہے، اور وہ معدوم و موجود دونوں کو شامل ہے، اور وہ شئی جس کا تو مالک بنے اس کا موجود ہونا ضروری ہے، یا معدوم کا بھی مالک بن سکتا ہے۔ دونوں قول ہے۔

منفعت: اور منفعت پر بالاتفاق ملکیت ثابت ہوتی ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، جیسا کہ ماقبل میں اس کی بحث گزر چکی ہے۔ اس لحاظ سے منفعت مال ہے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ "شئی" اپنے استعمال عرفی اور وضع عرفی کے اعتبار سے صرف "موجود" ہی کو شامل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا لغوی معنی معدوم کو بھی نام ہے، اور اصطلاح تو معنی لغوی میں زیادتی یا کمی کے ذریعہ بنائی جاتی ہے۔ لیکن اس جگہ ہم نے نہ تو لغوی معنی میں اضافہ کیا ہے اور نہ ہی کمی کیا ہے بلکہ لفظ کو اس کی حقیقت لغویہ میں استعمال کیا ہے نہ کہ حقیقت حرفیہ میں..... اگر یہ کہا جائے کہ فقہاء کا مال کو اس معنی میں استعمال کرنا اسے حقیقت عرفیہ یا حقیقت اصطلاحیہ کی شکل دیدیتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ:



یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ”حقیقت“ استعمال و عادت کی دلالت سے ترک کر دی جاتی ہے، اور تعین بالعرف تعین بالنص ہی کے مثل ہوتی ہے۔ اور استعمال ناس صحیح ہے، اس پر عمل واجب ہے (دیکھئے: الاشبہ لابن نجیم ۳۷۷-۳۸۰، مجلۃ الاحکام، شرح منظومہ، رسم الفتی، رسائل ابن عابدین ۱۴۳-۱۴۴)۔ علاوہ ازیں ہمارے علماء سابقین نے مال کی جو تحدید - محوز، محرز لوقت الحلیۃ جیسی قیودات سے کی ہیں، میرا خیال ہے کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور ان کی تحدیدات سے لازم آئیگا کہ جو شئی وقت حاجت کے لئے محرز نہ ہو سکے اسے مال قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ نیز ہر وہ مالیت جس میں فساد جلدی سرایت کر جائے مال کی تعریف سے خارج ہوگی، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

نیز ان کا مال کے معنی کی تحدید کرنا وقت و معقولیت پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ اعراض ہیں۔ اس لئے کہ دوزمانوں میں اس کا قائم رہنا نہیں ہوتا ہے۔

نیز معاملہ کرتے وقت ”منافع“ انسان کے پاس موجود نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وقفہ وقفہ سے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ ان فقہاء کے دلائل میں سے ایک دلیل وہ حدیث ہے جسے امام سرخسی نے مبسوط میں حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ سے نقل کی ہے۔ کہ ان دونوں حضرات نے ولد معرور کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ قیمت کے ذریعہ آزادی پائے گا، اور انھوں نے معرور پر ”عقر“ کے ساتھ باندی کی واپسی کو واجب قرار دیا۔ اور ان دونوں حضرات نے اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود کہ معرور نے اس باندی سے خدمت لی تھی، اور بدعی نے اپنے جملہ حقوق کا مطالبہ بھی کیا تھا مگر پھر بھی منفعت کی قیمت واجب نہیں کی، اگر منفعت کی قیمت بھی معرور پر واجب ہوتی تو ان حضرات کے لئے اس کے بیان سے سکوت کرنا جائز نہ ہوتا۔

اور عقر کا بیان خدمت کی قیمت کا بیان اس وجہ سے ہو پائے گا کہ مستوفی بالوطی (وطی کے ذریعہ حاصل کی جانے والی چیز) عین کے جز کے حکم میں ہوتا ہے (یعنی اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے عین ہی سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ منفعت سے اس کا تعلق نہیں) اور اسی بنیاد پر شبہہ کے وقت وطی کو مستقوم قرار دیا جاتا ہے نہ کہ منفعت کو۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ منفعت مال مستقوم نہیں ہے کہ اتلاف کی صورت میں اس کا ضمان واجب ہو۔ جیسے خمر اور مینہ کہ اتلاف کی صورت میں وجوب ضمان نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی شئی کے لئے صفت - مالیت ”تمول“ کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

تمول: اور تمول صیانت شئی اور وقت حاجت کے لئے اسے ذخیرہ کرنے کا نام ہے۔ اور منافع دو وقتوں میں باقی نہیں رہتے، لیکن وہ اعراض ہیں جیسے ہی وہ عدم سے وجود میں آئیں، اس لحاظ سے ان میں تمول کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اور اس بنیاد پر منافع غرماء اور ورثہ کے حق میں ”مستقوم“ نہیں ہوں گے، مثلاً اگر کسی مریض نے اپنے ہاتھ سے کسی انسان کی اعانت کر دی، یا عاریت کے طور پر کوئی چیز دیدی اور اس نے اس سے انتفاع کیا تو اس صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس منفعت کی قیمت ثلث مال میں منہا کر دی جائے گی..... اس کی علت یہ ہے کہ کسی شئی کا مستقوم ہونا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جبکہ وہ شئی موجود ہو، کیونکہ معدوم کو ”مستقوم“ سے موصوف نہیں کیا جاتا ہے، اس لئے کہ معدوم ”شئی“ ہی نہیں ہوتی، اور کسی شئی کے موجود ہونے کے بعد بھی اس کا ”تقوم“ اسی وقت ثابت ہوگا جبکہ اس کا احراز بھی ممکن ہو۔ اور وجود کے بعد احراز اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ دو وقتوں میں وہ شئی باقی رہ سکے، اور منفعت میں اگر وجود ہو بھی جائے تو اس کا احراز ممکن نہیں۔ اس لئے منفعت مستقوم قرار نہیں پائے گی۔ اور اسی اصول کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ منفعت میں ”اتلاف“ بھی متصور نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اتلاف کا عمل معدوم پر اثر انداز نہیں ہوتا، اور منفعت کے موجود ہونے کی صورت میں اس کا محل اتلاف ہونا باقی نہیں رہے گا، اور اثبات حکم تحقق سبب کے بغیر جائز نہیں ہوتا۔

عقد اجارہ کی صورت میں منفعت کو احراز و تقوم کے حکم میں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ خلاف قیاس ہے، اور حاجت و ضرورت کی بنیاد پر ”عین منتفع بہ“ کو منفعت کے قائم مقام کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کی حاجت عدوان و تلف کی صورت میں نہیں پائی جاتی اس لئے حقیقت معتبرہ باقی رہے گی، اور اس کے اعتبار سے تقوم و اتلاف معدوم ہوگا (مبسوط سرخسی ۷۹/۱۱)۔ مولانا محمد عبدالحلیم بن محمد امین لکھنوی نے نور الانوار علی کشف الاسرار کے حاشیہ قمر الاقمار میں اس سلسلہ میں حسب ذیل بحث کی ہے:

”منافع عرض ہیں۔ اور ہر عرض دوزمانے میں باقی رہتا۔ پس منافع دوزمانے میں باقی نہیں رہیں گے، اور جو چیز باقی نہیں رہتی وہ محرز بھی نہیں ہوتی۔ لہذا منافع محرز نہیں ہوں گے۔ اور جو چیز محرز نہیں ہوتی وہ مستقوم بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے منافع مستقوم نہیں ہوں گے۔ اس کے برخلاف مال جو ہر ہے، باقی رہنے والا ہے اور مستقوم ہے۔ اس لحاظ سے مال اور منافع میں کوئی مماثلت نہیں ہے (قمر الاقمار ۶۳)۔“

اور علامہ زنجانی شافعی نے ”تخریج الفروع علی الاصول“ میں تحریر کیا ہے:

امام ابوحنیفہؒ نے اس سے انکار کیا ہے کہ منافع اپنی ذات کے لحاظ سے مال ہیں، جو اعیان کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اور علمائے احناف بہ سیال ہے کہ منافع

کا حاصل وہ افعال ہیں جو اعیان میں شخص منتفع (فائدہ اٹھانے والا شخص) کے ذریعہ ان کے ساتھ مقصود کے مربوط ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا اتلاف محال ہوتا ہے۔ اور وہ افعال جیسے وجود پذیر ہوتے ہیں ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اتلاف ”بقا“ کے ختم کر دینے کا نام ہے۔ پس جس چیز کے لئے بقا ہی نہ ہو اس کا اتلاف بھی متصور نہیں ہوگا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ شریعت نے جواز عقد کے حق میں منافع کو اعیان کے درجے میں تسلیم کیا ہے (تخریج الفروع علی الاصول ۲۲۶)۔

مگر اس کا رد کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ جب ہم حقائق کی طرف نظر ڈالیں گے اور غور و فکر کی راہ اختیار کریں گے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن احکام شرعیہ حقائق عقلیہ پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ان کا مدار اعتقادات عرفیہ پر ہوتا ہے۔ اور وہ معدوم جس کا ان حضرات نے تذکرہ کیا ہے وہ شرعاً مال ہے۔ اور احکام میں شرع و عرف کا حکم غالب ہوتا ہے (تخریج الفروع علی الاصول ۲۲۶)۔

## دوسری فرع

منفعت کو ”مال“ تسلیم کرنے کے سلسلہ میں قواعد اصولیہ کی وسعت پذیری:

اصحاب متون نے بیع معدوم کے عدم جواز پر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی خرید و فروخت سے منع کیا ہے جو انسان کے پاس نہ ہو اور بیع مسلم کی اجازت دی۔

اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عقد کرتے وقت منفعت انسان کے پاس نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے مذکورہ حدیث کی رو سے بیع منفعت ممنوع ہوگی، اور نتیجہً منفعت مال نہیں ہوگا۔

مگر علماء نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ یہ حدیث مرکب ہے۔ حدیث: ”النہی عن بیع مال یس عند الإنسان“ کی تخریج اصحاب سنن اربعہ (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے کی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لا یحل سلف و بیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح مال لم یضمن، ولا بیع مال یس عندک“۔

ترمذی نے اس حدیث کو ”حسن صحیح“ قرار دیا ہے۔

اور رخصت فی السلم والے جز کی تخریج امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کے واسطے سے کی ہے، انہوں نے فرمایا:

ہم لوگ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے زمانہ میں گندم، جو کھجور اور کشمش میں سلم کا معاملہ کرتے تھے (تعلیقات لکھنوی علی الہدایہ ۷۶، ۷۷)، اور اسی کے قریب حاشیہ الشرنبلالی علی الدرر میں ہے۔ لیکن انہوں نے کہا ہے کہ حدیث کا یہ ٹکڑا ”ورخص فی السلم“ حضرت ابن عباس کی اس حدیث سے ماخوذ ہے کہ جو شخص سلم کا معاملہ کرے اسے چاہیے کہ کیل و وزن اور مدت کی تعیین کرے۔

ان دونوں احتمالات ”بیع مال یس عند الإنسان“ کی نہی کا عموم حدیث سلم اور استصناع کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ سلم اور استصناع کا جواز ”بیع مال یس عند الإنسان“ والی حدیث سے متصل ہے، اس لئے کہ بیان صریح سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت فرمانا خود ہمارے ائمہ احناف کے نزدیک بیان ضرورت کے اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ پس آپ کا سکوت فرمانا اقرار و بیان سمجھا جائیگا۔ اور اس اعتبار سے آپ ﷺ کا دونوں عقود کو متصل ذکر کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اقرار سکوتی کے لئے تاکید لفظی سمجھا جائے گا۔

اور جب اس کا علم نہ ہو کہ نہی عن بیع مال یس عندہ، اور جواز سلم میں سے کون مقدم ہے اور کون مؤخر، تو ہم مقارنت کا فیصلہ کریں گے، اور یہ کہنا کہ بیع مال یس عند الإنسان کی ممانعت کا عموم عقد سلم اور استصناع کے جواز کے لئے ناخ ہے، صحیح نہیں ہے، کہ ان دونوں کا جواز عموم نہی کے بعد ہے تو اس طرح بیع مال یس عند الإنسان کی نہی کا عموم سلم و استصناع کے ساتھ خاص ہو جائے گا۔ اور اس طرح حدیث تخصیص کے بعد ظنی ہو جائے گی۔

اور ظنی ہونے کی بنا پر بار بار اس کی تخصیص جائز ہوگی جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اور اس کی تخصیص عرف خاص و اصطلاحی اور کسی معین شہر والوں کے عرف خاص کی وجہ سے ہوگی جیسا کہ ابن عابدین نے اپنے رسالہ ”نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف“ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اور اس کی نظیر وہ مثال بھی بن سکتی ہے جسے ابن عابدین نے اپنے مذکورہ بالا رسالہ (صفحہ ۱۱۹، ۱۲۱) میں ذکر کیا ہے کہ فقہاء نے اس بات کی صراحت کر دی



ہے کہ اگر کسی نے ”عقد“ میں ایسی شرط لگا دی جو مقتضائے عقد کے خلاف ہے اور اس میں متعاقدین میں سے کسی ایک کا فائدہ ہے تو اس شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہو جائے گی۔ اور اس پر ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آپ نے بیع اور شرط سے ممانعت فرمائی ہے، نیز قیاس کو بھی اپنا مستدل بنایا ہے۔ البتہ اس سے ان چیزوں کا استثناء کیا ہے جس کی خرید و فروخت کا شرط کے ساتھ عرف جاری ہو، جیسے جوتے کا اس شرط پر خریدنا کہ بائع اسے درست کر دیا کرے گا۔

سخ الغفار میں لکھا ہے کہ اگر اس پر کوئی اعتراض کرے کہ جب شرط متعارف فساد بیع کا سبب نہیں ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ عرف حدیث کے لئے فیصل ہو، تو عرض ہے کہ عرف حدیث کے لئے فیصل نہیں ہے، بلکہ قیاس کے مقابلہ میں اسے برتری حاصل ہے، کیونکہ حدیث کا مفاد یہ ہے کہ چونکہ شرط کے ساتھ بیع کرنے کی صورت میں عموماً فریقین کے درمیان نزاع پیدا ہو جاتا ہے، اس نزاع کو دور کرنے کے لئے شرط کے ساتھ بیع کرنے سے روک دیا گیا۔ لیکن شرط متعارف کی صورت میں نزاع کا اندیشہ باقی نہیں رہتا تو گویا کہ عرف نے اس احتمال نزاع کو ختم کر دیا جو بیع الشرط کی صورت میں پیدا ہوتا۔ اس لحاظ سے عرف حدیث کے مفہوم کے موافق ہو گیا اور اب قیاس کے سوا کوئی مانع باقی نہیں رہا۔ اور قیاس کے مقابلہ میں عرف کو برتری حاصل ہے۔ اس لئے شرط متعارف فساد بیع کا سبب نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں مذکورہ نص سے جو مفہوم متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں اس موجود کی بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے جو عند العقد بائع کے پاس موجود نہ ہو، نہ کہ معدوم کی بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ معدوم کے بارے میں نہیں کہا جاتا ہے ”لیس عندی“ بلکہ اس کی تعبیر ”لم یحدث“ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے معدوم کو نص کے عموم میں داخل کرنا قیاس والحق کے ذریعہ تو ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نص کا عموم اور اس کا لفظ معدوم کو بھی شامل ہے۔

اور جب اس معدوم کو نص کے عموم میں داخل کیا گیا تو قیاس کو عرف عام کی وجہ سے بالاتفاق اور عرف خاص کی بنا پر بعض اصحاب کے نزدیک ترک کرنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ بنائی کی اجرت بنائی میں سے دینے کا مسئلہ ہے۔ مشائخ بلخ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ اس کی حرمت قیاس سے ثابت ہے نہ کہ نص سے، اور عرف کی وجہ سے قیاس کا ترک کرنا جائز ہے (ملاحظہ کریں: مقالہ نگار کی تصنیف ”مشائخ بلخ“، اور ابن عابدین کا رسالہ ”نشر العرف“ جو رسالہ ابن عابدین ۱۱۳/۲-۱۱۵ پر مذکور ہے)۔

امام طحاوی کی شرح معانی الآثار میں بھی ”حدیث النہی عن بیع مالہ یقبض“ پر گفتگو کی گئی ہے۔ بعض علماء نے اسے غلہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے اور بعض نے اسے عام رکھا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ اور صاحبین کی یہی رائے ہے۔ البتہ حضرت امام ابو حنیفہ نے مکانات و اراضی کی بیع کا مشتری کے قبضہ کرنے سے پہلے کا استثناء کیا ہے کیونکہ اراضی و مکانات منتقل نہیں کئے جاتے ہیں، اس لئے انھوں نے عدم جواز کی علت ضمان پر نظر رکھتے ہوئے یہ حکم صادر فرمایا۔ پس منافع کی بیع کے جواز کے مسئلہ کو بعد قرار نہیں دیا جاسکتا اگرچہ منافع نہ تو مقبوض ہوتے ہیں اور نہ اصحاب منافع کے پاس موجود ہوتے ہیں (معانی الآثار ۲/۲۱۸، ۲۱۹)۔

## تیسری فرع

عرفی احکام کے لحاظ سے مذہب کے اصول میں وسعت پذیری:

ابن عابدین اپنے منظومہ ”رسم المفتی“ میں فرماتے ہیں:

والعرف فی الشرع له اعتبار، لذا علیہ الحكم یدار۔

(یعنی شریعت میں عرف کا اعتبار کیا گیا ہے، اسی بنا پر کبھی کبھی عرف پر حکم کا مدار رکھا جاتا ہے)۔

ابن عابدین فرماتے ہیں: ”المستصفی“ میں ہے کہ عرف و عادت اس چیز کا نام ہے جو عقل کی جہت سے نفوس میں جاگزیں ہو جائے اور فطرت سلیمہ اسے

قبول کرے۔

”شرح تحریر“ میں ہے: کہ عادت اس بار بار پیش آنے والی چیز کا نام ہے جس میں عقل کا واسطہ نہ ہو۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: چھٹا قاعدہ ہے ”العادة محكمة“ (عادت فیصلہ کن ہے)، اور اس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ”ما رآہ

المسلمون حسناً فهو عند الله حسن“ کہ جس چیز کو عام مسلمان بہتر جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔



معلوم ہونا چاہیے کہ عادت کا اعتبار بہت سے مسائل میں کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ فقہاء نے اسے ایک مستقل اصل قرار دیا ہے، چنانچہ فقہاء فرماتے ہیں:

”تترک الحقیقة بدلالة الاستعمال والعادة“۔

(استعمال اور عادت کے قرینہ سے حقیقی معنی کو ترک کیا جاتا ہے)۔

اس کے بعد ایشیا میں ذکر کیا ہے کہ: عادت کا اعتبار اس وقت ہوتا ہے جب وہ بالکل عام ہو جائے یا کم از کم غالب ہو۔ اسی بنا پر بیچ کے بارے میں فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی ایسے شہر میں درہم یا دانیر کے عوض میں بیچ کی گئی جہاں مختلف سکہ رائج ہوں اور ان کی مالیت میں بھی فرق ہو تو وہ بیچ شہر میں سب سے زیادہ مروج سکہ سے متعلق قرار دی جائے گی۔

ہدایہ میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی متعارف ہے، لہذا جب مطلق بولا جائے یعنی بغیر قرینہ کے تو اسی متعارف کی جانب راجع ہوگا۔

علامہ بیرونی کی شرح مبسوط میں ہے: الثابت بالعرف كالثابت بالنص، یعنی عرف سے ثابت شدہ چیز نص سے ثابت شدہ امر کی طرح ہے۔

جاننا چاہیے کہ بہت سے ایسے مسائل جن کی صاحب مذہب مجتہد نے اپنے زمانہ اور عرف کی بنیاد پر صراحت کی تھی بعد میں اہل زمانہ کے فساد یا عموم ضرورت کی بنا پر ان میں تبدیلی پیدا ہو گئی جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ متاخرین نے تعلیم قرآن پر اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کی صرف ظاہری عدالت پر اکتفا نہ کرنے پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ باتیں امام ابوحنیفہ کی تصریحات کے خلاف ہیں۔

اسی قبیل سے یہ مسئلہ بھی ہے کہ حاکم وقت کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف سے اکراہ و جبر پایا جائے تو اس کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ حالانکہ یہ بھی امام صاحب کے قول کے خلاف ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ان کے زمانہ میں غیر سلطان کے لئے اکراہ کا امکان ہی نہیں تھا، پھر فساد بڑھتا گیا اور غیر سلطان کی طرف سے بھی اکراہ کا تحقق کثرت سے ہونے لگا۔ اسی بنا پر امام محمد نے اس کا اعتبار کیا اور متاخرین نے اس کے مطابق فتویٰ دیا۔ اور اسی سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ساعی کو ضامن قرار دیا جائے۔ حالانکہ یہ مذہب کے اصول کے خلاف ہے۔ کیونکہ ضامن مباشر پر ہوتا ہے نہ کہ مستنب پر۔ لیکن فقہاء نے اہل زمانہ کے فساد کے پیش نظر ساعی کو ضامن قرار دینے پر فتویٰ دیا ہے۔ بلکہ زمانہ فترہ میں اس کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔

اس سلسلہ کا ایک مسئلہ اجیر مشترک کو ضامن قرار دینے کا ہے۔

اور فقہاء کے یہ اقوال بھی اس زمرہ میں آتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں وصی کے لئے یتیم کے مال میں مضاربت جائز نہیں۔ اور یہ کہ یتیم کی جائداد اور وقف کی جائداد غصب کرنے والے کو ضامن قرار دیا جائے گا۔ اور اس کو ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے مکان میں کرایہ دار نہیں بنایا جائے گا۔ اور زمینوں میں تین سال سے زیادہ کے لئے کرایہ داری نہیں کی جائے گی۔ حالانکہ یہ امور امام صاحب کے اصل مذہب کے خلاف ہیں۔ اصل مذہب میں نہ ضمان ہے نہ اجارہ میں مدت کی تحدید ہے۔

انہیں مسائل میں یہ اصول بھی شامل ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور فقہاء کا یہ فتویٰ بھی ہے کہ شوہر کو اپنی زوجہ کو سفر میں لے جانے سے روکا جاسکتا ہے، اگر چہ وہ عورت کا مہر معجل ادا کر چکا ہو۔ اور اس کی وجہ وہی فساد زمانہ ہے۔

یہ مسئلہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص عورت کے طلاق کی قسم کھانے کے بعد یہ کہے کہ میں نے انشاء اللہ کہہ لیا تھا تو اس کا قول بغیر بینہ کے نا قابل قبول ہوگا۔ حالانکہ یہ ظاہر روایت کے خلاف ہے۔ اور وجہ اس کی وہی فساد زمانہ ہے۔

انہیں مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ اگر عورت دخول کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ ابھی اس کو مہر معجل کا وہ حصہ نہیں ملا ہے جس کی تعجیل بطور شرط طے شدہ تھی تو عورت کا قول معتبر نہیں ہوگا۔ حالانکہ عورت قبضہ کا انکار کر رہی ہے، اور مذہب کا قاعدہ یہ ہے کہ ”القول للمنکر“ یعنی قول منکر کا معتبر ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عادت عورت مشروط مہر معجل کی وصولیابی سے پہلے خود سپردگی نہیں کرتی اس لئے اس جگہ اس کا انکار نا قابل سماع ہوگا۔ ایسے ہی فقہاء فرماتے ہیں کہ شوہریوں کہے کہ ”کل حل علی حرام“، ہر حلال چیز میرے اوپر حرام ہے، تو عرف کی بنیاد پر اس لفظ سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ مشائخ بلخ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں امام محمد نے اپنے دیار کے عرف کی بنا پر یہ فرمایا کہ بغیر نیت کے طلاق نہیں پڑے گی۔ لیکن ہمارے عرف میں اس جملہ سے لوگ اپنی منکوہہ کی تحریم مراد لیتے ہیں اس لئے

طلاق واقع ہو جائے گی۔

علامہ قاسم نے مختارات النوازل سے نقل کیا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے کیونکہ عرف کا استعمال غالب ہے۔ اسی طرح اگر باپ دعویٰ کرے کہ اس نے جہیز کا سامان لڑکی کو بطور ملکیت نہیں دیا تھا تو فقہاء نے اس کا مدار عرف پر رکھا ہے۔ حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ تملیک اور عدم تملیک کے باب میں مالک بنانے والے کا قول معتبر ہوتا ہے۔

عورت کے مہر مؤجل کے بارے میں عورت کا قول معتبر ہوتا ہے۔ حالانکہ منکر کے قول کا اعتبار ہونا چاہیے۔ مزارعت کے معاملہ اور وقف کے مسائل میں ضرورت اور عموم بلویٰ کی بنیاد پر ہمارے زمانہ میں صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر شفیق ایک مہینہ تک مطالبہ ملکیت کو موخر کر دے تو حق شفعہ ساقط ہو جائے گی۔ اور مقصد یہ ہے کہ مشتری ضرر کا شکار نہ ہو۔

امام حسن بن زیاد کی روایت ہے کہ حر، عاقلہ بالغہ اگر غیر کفو میں خود سے نکاح کر لے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ علماء نے ضرورت کی بنا پر راستے کے کچھڑ کو معاف قرار دیا ہے۔ بیع بالوفاء، آرڈر دے کر کسی چیز کا بنوانا، پانی کے مقدار کی تعیین کئے بغیر مشکیزہ سے پانی پینے، حمام میں رہنے کی مدت اور استعمال کئے جانے والے پانی کی مقدار بیان کئے بغیر حمام میں جانے، آنا اور روٹی بغیر وزن کئے ہوئے قرض لینے اور اس جیسے بہت سے مسائل کا فتویٰ دیا ہے اور سب کی بنیاد عرف پر ہے۔ ایشاہ میں اس قبیل کے بہت سے مسائل کا ذکر موجود ہے۔

علامہ ابن عابدین نے اس کے بعد فرمایا کہ ان تمام مسائل کے اصل احکام میں تغیر رونما ہوا۔ اور اس تغیر کی وجہ یا تغیر زمانہ ہے یا ضرورت یا عرف یا حالات کے قرآن کی وجہ سے ایسا ہوا۔ حالانکہ یہ سب خارج عن المذہب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر صاحب مذہب اس زمانہ میں خود موجود ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے۔ اسی طرح اگر ان کے زمانہ میں یہ تغیرات رونما ہو چکے ہوتے تو وہ ان کے خلاف تصریح نہ کرتے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے مجتہدین فی المذہب اور متاخرین میں سے صحیح نظر رکھنے والے علماء کو اس بات کی جرأت پیدا ہوئی کہ وہ صاحب مذہب کے ان اقوال کے خلاف رائے اختیار کر سکیں جو انھوں نے اپنے زمانہ کے عرف کی بنیاد پر اختیار کئے، اور جن کی تصریح ظاہر روایت میں موجود ہے۔ جیسا کہ ”کل حل علی حرام“ کے بارے میں امام محمد کا قول اور مشائخ بلخ کا قول نقل کیا جا چکا ہے۔

اگر اس میں یہ اشکال کیا جائے کہ عرف میں تو بار بار تبدیلی ہو سکتی ہے۔ تو اگر کوئی نیا عرف وجود پذیر ہو جو پچھلے زمانہ میں نہ تھا تو کیا مفتی کے لئے منصوص کی مخالفت کر کے نئے عرف کی بنیاد پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہوگی۔

میں عرض کروں گا کہ جی ہاں۔ گذشتہ مسائل میں متاخرین نے جو منصوص مسائل کی مخالفت کی ہے اس کی وجہ یہی تو ہے کہ امام صاحب کے بعد کے زمانہ میں جو عرف ظاہر ہوا اس کا تقاضا یہی تھا۔ لہذا مفتی کو الفاظ عرفیہ میں جدید عرف کی پیروی کرنے کی گنجائش رہے گی۔ یہی حال ان تمام مسائل کا ہوگا جس کی بنیاد امام مجتہد نے اپنے زمانہ کے عرف پر رکھی اور بعد میں اس عرف کے مقابلہ میں دوسرا عرف ظہور پذیر ہو گیا۔ لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ مفتی بھی ایسا ہو جو صاحب رائے اور صاحب بصیرت ہو۔ اور اس کو قواعد شرع پر عبور حاصل ہونا کہ وہ اس عرف کے درمیان جو احکام کا مبنی بن سکتا ہو اور جو عرف احکام کا مبنی نہیں بن سکتا دونوں کے درمیان امتیاز کر سکے۔ کیونکہ متقدمین نے تو مفتی کے لئے اجتہاد کی شرط لگائی تھی، آج کے دور میں جبکہ اجتہاد مفقود ہے کم از کم اتنی شرط تو ہونی چاہیے کہ مفتی مسائل سے پوری واقفیت رکھتا ہو، اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ان شروط اور قیود سے بھی واقف ہو جن کو بعض اوقات فقہاء کرام (متفقہ) طالب فقہ کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے ترک کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مفتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے دور کے عرف اور اہل زمانہ کے حالات سے واقف ہو اور اس کی تعلیم کسی ماہر استاذ سے حاصل کی ہو۔ اس بنا پر ”منیۃ المفتی“ کے آخر میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے اصحاب کی جملہ کتب کا حافظ ہو جائے جب بھی فتویٰ دینے کے لئے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا ضروری ہے، کیونکہ بہت سے مسائل میں اہل زمانہ کی عادت کی بنیاد پر جواب دیدیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ پڑے۔

”قنیۃ“ میں ہے کہ مفتی اور قاضی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ عرف کو نظر انداز کرتے ہوئے محض ظاہر مذہب کے مطابق فیصلہ صادر کر دیں۔

ایشاہ میں بزاز یہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ مفتی کو چاہیے کہ جو بات مصلحت کے مطابق ثابت ہو اس پر فتویٰ دے۔

ابن عابدین فرماتے ہیں: میں نے رد المحتار کے باب القسامۃ میں لکھا ہے کہ اگر ولی غیر اہل محلہ میں سے کسی شخص کے خلاف دعویٰ کرے اور انھیں میں



سے وہ شخص اس کے خلاف شہادت بھی دیدے تو امام صاحب کے نزدیک وہ شہادت مقبول نہ ہوگی، اور صاحبین کے نزدیک مقبول ہوگی۔

سید حموی نے علامہ مقدسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے امام صاحب کے اس قول پر فتویٰ دینے سے خود بھی توقف کیا اور اس کی اشاعت پر بھی روک لگادی کیونکہ اس سے ضرر عام کا اندیشہ تھا۔ اس لئے کہ سرکشوں کو اگر اس قول کا علم ہو گیا تو وہ ایسے مخلوں میں اقدام قتل پر جری ہو جائیں گے جو غیر اہل محلہ سے خالی ہوں، کیونکہ انھیں یہ اطمینان ہوگا کہ ان کی گواہی اس کے خلاف مقبول نہ ہوگی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ صاحبین ہی کے قول پر فتویٰ دینا چاہیے، بالخصوص اس لئے کہ حالات کے اور زمانہ کے تغیر سے احکام بدل جاتے ہیں۔

ہدایہ کی کتاب الصوم میں "ما یوجب القضاء والکفارة" کے ذیل میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص دانستوں میں پھنسے ہوئے گوشت کو کھالے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اور اگر وہ گوشت مقدار میں زیادہ ہو تو روزہ ٹوٹ جائیگا۔ اور امام زفر فرماتے ہیں کہ دونوں حال میں روزہ ٹوٹ جائے گا۔

صاحب فتح القدیر ہدایہ کے اس قول کے تحت فرماتے ہیں کہ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیش آمدہ واقعات کے اندر ایک گونہ اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو، اور لوگوں کے حالات سے واقفیت رکھتا ہو۔ یہ معلوم ہے کہ وجوب کفارہ کے لئے کمال جنایت کا پایا جانا ضروری ہے۔ اب یہ دیکھا جائے گا کہ دانستوں سے گوشت نکال کر کھانے والا کیسا شخص ہے، اگر اس کی طبیعت کو اس عمل سے گھن آتی ہو تو (اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا) امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کیا جائے گا اور اگر ایسا شخص ہے کہ اس پر اس عمل کا کوئی اثر نہیں پڑتا تو امام زفر کا قول اختیار کیا جائے گا۔

"تصحیح العلامة قاسم" میں ہے کہ اگر تم یہ اشکال کرو کہ کبھی کبھی بغیر ترجیح کے بھی اقوال نقل کر دیتے ہیں اور کبھی تصحیح کے باب میں اختلاف بھی کرتے ہیں (ایسی صورت میں کیا کہا جائے)؟ میں عرض کروں گا کہ ایسی صورت میں فقہاء کے معمول کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ یعنی تغیر عرف، لوگوں کے حالات اور ارتقا بالناس کا اعتبار کیا جائے گا۔ ایسے ہی جس چیز کا تعامل جاری ہو یا جس کی دلیل قوی ہو اس کو اختیار کیا جائے گا۔ اور اس طرح کے اعتبار سے زمانہ خالی نہیں رہتا۔ جس میں اس امتیاز کی صلاحیت نہ ہو وہ بری الذمہ ہونے کے لئے کسی صاحب تمیز کی جانب رجوع کرے۔

علامہ قاسم کا یہ قول اور ابن عابدین کا یہ قول ہمارے اس دعویٰ کی صریح دلیل ہے کہ عرف جب تک مخالف شریعت نہ ہو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ مخالف شرع عرف کی مثال میں ٹیکس اور سود کو پیش کیا جاسکتا ہے، لہذا مفتی قاضی بلکہ مجتہد کے لئے بھی لوگوں کے حالات سے واقفیت ضروری ہے۔ اس بنا پر فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اہل زمانہ کے حالات سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔ اور ہم پہلے فقہاء کرام کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ قضاء سے متعلق امور میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ ان کو قضاء کا عملی تجربہ تھا اور لوگوں کے حالات سے واقفیت حاصل تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عرف عام کا اس وقت اعتبار نہیں کیا جائے گا جب اس سے کسی حکم منصوص کا ترک لازم آئے۔ ہاں اس وقت عرف عام کا اعتبار کیا جائے جب اس نص کی تخصیص لازم آئے۔ اور عرف خاص کا اعتبار ان دونوں موقعوں پر نہ ہوگا۔ عرف خاص کا اعتبار صرف اہل عرف کے حق میں ہو، بشرطیکہ اس سے نہ کسی کا ترک لازم آئے نہ نص کی تخصیص، اگرچہ وہ ظاہر الروایۃ کے خلاف ہو۔ اس کی مثال وہ الفاظ ہیں جو یمین کے سلسلہ میں رائج ہیں، یا بیع و اجارہ وغیرہ کے معاملات میں جو عادت رائج ہے۔ یہ الفاظ اور معاملات ہر شہر میں اس شہر کی عادت اور عرف کے مطابق جاری ہوتے ہیں۔ اور ان الفاظ و معاملات سے وہی مراد لیا جاتا ہے جو عادت میں جاری ہے۔ عرفی الفاظ اصطلاحی حقیقت میں اس کی وجہ سے معنی اصلی مجاز لغوی کی طرح ہو جاتا ہے (شرح منظومہ رسم المفتی ۱/ ۳۳-۳۸ عن مجموعہ رسائل ابن عابدین)۔

پھر ابن عابدین نے اپنے رسالہ "نشر العرف" میں کہا کہ عادہ متکررہ کی تین قسمیں ہیں:

۱- عرفی عامہ، ۲- عرفی خاصہ جیسے ہر جماعت کی اپنی اپنی اصطلاح، ۳- عرفی شرعیہ جیسے وہ اصطلاحات جن کے لغوی معانی شرعی معانی کی وجہ سے متروک ہو چکے ہیں۔

عرف کی بھی دو قسمیں ہیں: ۱- عملی، ۲- قولی۔

قولی بالاتفاق عام کے لئے مخصوص ہے۔

پھر کہا کہ عرف کی دونوں قسمیں ہیں: عام و خاص۔ اور ان میں سے ہر ایک دلیل شرعی کے یا کتب ظاہر روایت کی نصوص کے موافق ہوگا یا نہیں، اگر موافق ہو



کوئی بات نہیں در نہ پھر دو صورت ہے، یا تو عرف دلیل شرعی کے خلاف ہوگا یا مذہب حنفی کی نصوص کے۔ اگر عرف دلیل شرعی کے خلاف ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ عرف دلیل شرعی کے ہر اعتبار سے مخالف ہو، عرف کی وجہ سے نص شرعی کا ترک لازم آتا ہو، ایسی صورت میں عرف کو رد کرنے میں کوئی شک نہیں، جیسے لوگوں کا عرف صریح محرمات میں مثلاً سود میں، شراب پینے اور ریشم پہننے میں، اور اگر عرف دلیل شرعی کے خلاف ہو لیکن بالکل نہیں، دلیل شرعی عام ہو اور عرف اس کے بعض افراد کے خلاف ہو، یا یہ کہ دلیل قیاس ہو تو عرف معتبر ہوگا بشرطیکہ عام ہو۔ کیونکہ عرف شخص بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ فقہاء نے استصناع، دخول حمام، اور شرب من السقاء کے مسائل میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ اور اگر عرف خاص ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا یہی مذہب حنفی ہے۔ لیکن بہت سارے لوگوں نے عرف خاص کے اعتبار کا فتویٰ بھی دیا ہے، پھر ابن عابدین فرماتے ہیں کہ استصناع کو جائز کرنا: "نہی عن بیع ما لیس عند الانسان" والی حدیث کا تخصیص ہے، یہ اس نص کا بالکل ترک نہیں، کیونکہ استصناع کے علاوہ دوسرے معاملات میں ہم اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ پھر علامہ شامی نے ایک شہر کے عرف خاص کے بارے میں گفتگو کی جیسے بنکر کی اجرت، اور جیسے اہل بخاری کا تعامل، قرض دینے والے کا استیجار کے باوجود قرض، مگر اتنا ہی قرض جس سے حاجت پوری ہو جائے، اور وہ اجرت کی مقدار سے بڑھنے نہ پائے، اور کہا: یہ چیز عرف نہ ہونے کی وجہ سے اپنی اصل پر باقی رہے گی۔ پھر کہا: اگر تم اعتراض کرو کہ امام ابو یوسف سے تو اشیاء منصوصہ میں بھی عرف کا اعتبار منقول ہے اور اس کی مثال ربا الفضل میں اصناف ستہ سے دی جائے یہاں تک کہ سونے میں تساوی بالکلیل کو اور گہیوں میں تساوی بالوزن کو جائز قرار دیا لوگوں کے عرف کے وقت، یہ تو ایسے عرف کی اتباع ہے جس سے نص کا ترک لازم آتا ہے، لہذا امام ابو یوسف کے نزدیک بعض ایسی چیزیں بھی جائز ہوں گی جو ربا کو جائز کرنے کے مشابہ ہو، اگرچہ نص کے مخالف ہوں، اس اعتراض کے جواب میں میں (ابن عابدین) کہوں گا:

امام ابو یوسف کی یہ مراد ہرگز نہیں، وہ تو صرف نص کی علت عادت کو قرار دینا چاہتے ہیں، ان کی مراد صرف یہ ہے کہ گہیوں، جو، کھجور، نمک کو کیلی اور سونے چاندی کے وزنی ہونے کی صراحت حدیث میں اس لئے کی گئی کہ یہ چیزیں اس زمانہ میں ایسی ہی تھیں، تو یا اس وقت کی نص کا مدار بھی عادت ہی پر ہے، یعنی اگر اس وقت سونے کے ناپنے اور گہیوں کے تولنے کا رواج رہا ہوتا تو نص اسی کے موافق وارد ہوتی۔ چونکہ بعض کے کیلی اور بعض کے وزنی ہونے کا مدار عادت ہی پر ہے لہذا عادت ہی منظور الیہ ہے، پس جب عادت بدل جائے گی تو حکم بدل جائے گا، لہذا نئی تغیر پذیر عادت کا اعتبار کرنے میں نص کی مخالفت نہیں بلکہ نص کی اتباع ہے۔ ابن ہمام کا ظاہر کلام بھی اسی روایت کو ترجیح دیتا ہے اور اسی بنیاد پر ابن عابدین کی بات بھی ہے، لہذا اگر درہم کی درہم سے بیع ہونے لگے اور عدد کے ساتھ اس کا قرض چلنے لگے، اور یہی لوگوں کا عرف ہو جائے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں ہے تو نص کے خلاف نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ امام ابو یوسف کو جزاء خیر دے، اس زمانہ کے لوگوں کی طرف سے کہ انہوں نے ربا کا ایک بڑا دروازہ ان کے حق میں بند کر دیا۔ اور ابن عابدین نے صاحب کتاب "آخر الطریقة المحمدیة" سے ان کا قول نقل کیا ہے: "ولا حيلة فيه إلا التمسك بالرواية الضعيفة عن أبي يوسف" یعنی اس باب میں ابو یوسف کی ایک کمزور روایت کو اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ پھر ابن عابدین نے کہا کہ طرفین کے قول کو اپنانے میں اس زمانہ میں بڑا حرج واقع ہوگا، پھر کچھ گزری ہوئی فروع کا اور کچھ ان کے علاوہ کا ذکر کیا۔ ان میں ایک یہ ہے کہ اس شخص کے مال کا دعویٰ اپنے ماتحت امرد کے بارے میں نہیں سنا جائے گا جو امردوں کی محبت میں مشہور ہو، جیسا کہ مولیٰ ابوالسعود، ترمذی اور طبری نے فتویٰ دیا ہے، اور علامات کے پائے جانے کے وقت قتل وغیرہ میں متہم شخص کو قید رکھا جائے گا۔ اور لڑکوں اور غلاموں کے ہاتھوں سے ہدیہ قبول کیا جائے گا۔

پھر کہا کہ یہ تمام اور اس کے مثل اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ مفتی کے لئے جمود نہیں ہے، منقول پر ظاہر روایت کی کتب میں زمانہ اور اہل زمانہ کی رعایت کے بغیر۔ در نہ بہت سے حقوق ضائع ہو جاتے اور اس کا نقصان نفع سے بڑھ جاتا۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص حکم شرعی کے بارے میں سوال کرتا ہے اور اس کی مراد مقصد ہوتا ہے اس سوال کے در یعہ نقصان پہنچانا۔ اگر ہم اس کے سوال کا جواب دیدیں جیسا کہ اس کا سوال ہے تو ہم بھی گناہ میں اس کے ہم شریک ہو جائیں گے، اس لئے کہ وہ اپنے مقصد کو پانے میں ہماری وجہ سے کامیاب ہوا ہے۔

پھر کہا کہ ہمارے پیش کردہ دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اشباہ نے عرف خاص کے ماننے سے جو انکار کیا ہے وہ ایسا عرف ہے جو نص شرعی سے متعارض ہے۔ لہذا اس وجہ سے قیاس کو ترک نہیں کیا جائے گا اور نہ اثر کو خاص کیا جائے گا، بخلاف عرف عام کے، اور عرف خاص جب صاحب مذہب سے منقول نص مذہبی سے متعارض ہو تو اس کا اعتبار ہے، جیسا کہ اصحاب متون و شروح و فتاویٰ نے مذکورہ اور غیر مذکورہ فروعات میں اس پر عمل کیا ہے۔

اور عرف خاص قدیم اور حادث دونوں کو شامل ہوتا ہے عرف عام کی طرح۔ اور جو کچھ ہم نے دلائل میں پیش کیا ہے (یعنی ابن عابدین نے) اس سے قنہ

میں مذکورہ عبارت کی وضاحت ہو جاتی ہے، اور اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ مفتی اور قاضی کو مناسب نہیں ہے کہ ظاہر روایت پر فیصلہ کریں اور عرف کو چھوڑ دیں۔ پھر ذکر کیا کہ ہمارے علماء نے ایسے پھلوں کی بیج کو جائز قرار دیا عرف کی وجہ سے، کہ ابھی کچھ ظاہر ہیں اور کچھ ظاہر نہیں، یعنی کچھ پھل آگے اور کچھ پھل نہیں آئے۔ جب کہ ظاہر مذہب میں عدم جواز ہے۔ اور شمس الائمہ الحلو انی نے پھلوں اور بیگن، تربوز وغیرہ میں جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ اصحاب مذہب سے منقول ہے، اور امام ابو بکر محمد بن الفضل بھی یہی فتویٰ دیتے تھے اور کہتے ہیں کہ میں موجود کو اصل مانتا ہوں اس عقد میں، اور جو اس موجود کے بعد پیدا ہوگا وہ اسی کے تابع ہوگا۔ اسی وجہ سے شرط لگاتے ہیں کہ موجود غیر موجود سے زیادہ ہونا چاہیے کیونکہ قلیل کثیر کے تابع ہوتا ہے۔

امام محمد سے مروی ہے کہ پھلوں کی بیج درخت میں جائز ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ تمام پھول ایک ہی مرتبہ یکبارگی نہیں کھلتے بلکہ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ اور شمس الائمہ السرخسی نے کہا کہ میرے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ یہ بیج جائز نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ طریقہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ ضرورت ہو۔ اور یہاں اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ پھر ابن عابدین نے کہا: میں کہوں گا کہ ہمارے زمانہ میں ضرورت کا تحقق یقینی ہے کیونکہ اکثر بائع مسائل سے ناواقف ہیں ہمارے زمانہ میں اور شاید کہ کوئی ایسا تاجر مل جائے، اور ممکن بھی نہیں کہ عالم ان کو بتا سکے کہ اس کو ضبط کرنا ان کے فہم سے باہر ہے۔ اور اگر اس کو سیکھ لیں تب بھی اس پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ ان کا عمل مروجہ اور مؤردنی طریقہ پر رہے گا۔ امام فضیلی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اس میں ان کی ایک عادت کا بدلنا ممکن نہیں ہے لہذا ضرورت ثابت ہوگئی۔

اور امام سرخسی کا نظریہ یہ ہے کہ عادت کا بدلنا عقلاً ممکن ہے مذکورہ حیلہ کی روشنی میں لہذا ضرورت کا ثبوت نہیں ہوتا ہے، اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جو چیز عام طور پر ناممکن ہو اس کا کوئی حکم نہیں اگرچہ عقلاً ممکن ہو۔ اور امام فضیلی نے جو ذکر کیا وہ لوگوں پر آسانی پیدا کرتا ہے۔ البتہ جو اس حکم کا جانکار ہو اس کے لئے یہ عقیدہ جائز نہیں اس کے حق میں ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے (دیکھئے: نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ۱۱۷-۱۲۰ ملخصاً من رسائل ابن عابدین)۔ پھر ہم رجوع کرتے ہیں اس بات کی طرف کہ ان کے اہل زمانہ کے عرف میں منافع کو مال نہیں مانا جاتا تھا۔ اور نص کے عموم کی تخصیص عرف عام سے جائز ہے، اور لوگوں کے معمول کی تصحیح کی رعایت میں فتویٰ دینا ظاہر روایت کو چھوڑ کر جائز ہے۔

اور روایت ضعیفہ جو امام زفر سے منقول ہے، اس کو راجح قرار دینا گذشتہ مباحث کی روشنی میں مناسب ہے، کیونکہ مذہب کے اصول و قواعد اس کی گنجائش رکھتے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

## چوتھی فرع

بغیر امام کے قول اور بغیر ظاہر روایت کے فتویٰ دینے کے لئے مذہب کے قواعد کی گنجائش:

ہمارے سامنے سابق فرع سے یہ بات تفصیل سے واضح ہو چکی ہے، اور اس سلسلے میں کچھ قاعدے ابن عابدین نے رسم المفتی میں بھی تحریر فرمائے ہیں اور ردالمحتار کے شروع میں بھی، اور میں نے ان میں سے بعض کو اپنی کتاب ”مشارح بلخ من الحنفیہ“ میں بھی ذکر کیا ہے۔ ابن عابدین کی ”نشر العرف“ میں ہے، فرماتے ہیں: ”اور یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ اس زمانہ میں طرفین کے قول میں بڑا حرج ہے جیسا کہ آپ کو ان محظورات کے لازم آنے کا علم ہو چکا ہے۔ آج عرف لوگوں کی عقلوں میں جاگزیں ہو چکا ہے، چاہے عالم ہوں یا جاہل، نیک ہوں یا بد، لہذا اس سے تمام اہل زمانہ کا فاسق بنانا لازم آئے گا، پس فتویٰ ابو یوسف کی روایت پر متعین ہے، پس عند اللہ جواز اور گناہ سے چھٹکارا ہی ہونا چاہیے۔ یا عمل بالعرف پر بنا کرتے ہوئے یا ضرورت کی وجہ سے فقہاء کرام نے تو اس سے کم درجہ کی چیزوں کو بھی ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، پس اس طور پر جو چیز عامۃ الناس کے ذہن و عقل میں بیٹھ چکی ہے اور جس میں عالم و جاہل اور نیک و بد میں کوئی تفریق نہیں ہے، وہ یہ کہ منافع مال ہیں اور مستقوم بھی ہیں۔ اور منافع کا لین دین میں اعتبار بھی ہے اور علی العموم اس کا معاوضہ لیا جاتا ہے، لہذا لوگوں کے افعال کو صحیح بنانا بھی ضروری ہے، اور جہاں تک ممکن ہو لوگوں کے افعال کو صحت اور درستگی پر محمول کرنا بھی ضروری ہے، لوگوں کے حالات اور ان



ضروریات کا ساتھ دینے کے لئے۔ اور اسے اصول کی خلاف ورزی نہیں کہیں گے بلکہ یہی اصل الاصول ہے، اور فرغ سابق میں اس کا بیان آچکا ہے۔ پس فتویٰ زفر کے قول پر ہمارے زمانہ میں متعین نہیں، یعنی کہ منافع کو اموال تسلیم کر لیا جائے اور اسی پر فتویٰ دیا جائے غیر مذہب کو ترجیح دینے کے مقابلہ میں اسی کو اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ سید علی حیدر صاحب درالاجکام کی خواہش ہے۔

اور یہ عرف عالم و جاہل، نیک و بد سب کے ذہنوں میں بالکل راسخ ہو چکا ہے لہذا اس کا اعتبار نہ کرنے میں پورے زمانہ کی تفسیق لازم آئے گی، اس لئے امام ابو یوسف کی اسی روایت پر فتویٰ متعین ہے (اختصار عن شرف لابن عابدین ۱۱۴ ر ۱۱۳ من مجموع رسائل)۔

بہر حال جب عرف ظاہر روایت کے خلاف ہو تو ہم کہیں گے کہ بات ابن عابدین ہی کی بات ہے۔ جاننا چاہیے کہ مسائل فقہیہ کا ثبوت یا تو صریح نص سے ہوگا جیسا کہ گذر چکا، یا رائے اور اجتہاد سے ہوگا، دوسری قسم کے اکثر مسائل کی بنیاد مجتہد اپنے زمانہ کے عرف پر رکھتا ہے، اگر ان کے زمانہ کا عرف اس کے خلاف ہوتا تو ان کا قول بھی برعکس ہوتا۔

اسی لئے فقہاء نے کہا کہ اجتہاد کی شرطوں میں ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ مجتہد لوگوں کی عادت سے اچھی طرح واقف ہو کیونکہ بہت سے احکام زمانہ کے اختلاف سے بھی بدلتے رہتے ہیں، اہل زمانہ کا عرف بدلنے کی وجہ سے یا نئی ضرورتوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے یا اہل زمانہ کے فساد کی وجہ سے، کیونکہ اگر حکم پہلے ہی حال پر باقی رہے تو اس سے مشقت اور ضرر لازم آئے گا، اور یہ شریعت کے بنیادی قواعد تخفیف، تیسیر، دفع ضرر و فساد کے خلاف ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے تاکہ عالم مکمل نظام بہترین احکام پر باقی رہے، اسی لئے تم مشائخ کو دیکھو گے کہ انھوں نے بہت سی جگہوں پر مجتہد کی ان نصوص کی مخالفت کی ہے جس کی بنیاد زمانہ کے عرف پر تھی، اور ان کی یہ مخالفت اس یقین کے ساتھ ہے کہ یہ فقہاء مجتہدین اگر اس زمانہ میں ہوتے تو یہ بھی وہی کہتے جو ہم کہہ رہے ہیں، فقہی قواعد کو سامنے رکھ کر۔ اسی قبیل سے تعلیم قرآن کے استیجار کے جواز کا فتویٰ ہے اور اس جیسے دوسرے فتاویٰ ہیں، کیونکہ معلمین کو جو وظائف صدر اول میں بیت المال سے ملا کرتے تھے وہ بند ہو گئے، اگر معلمین بلا اجرت تعلیم میں مشغول ہوتے تو اس سے ان کا اور ان کے بال بچوں کا ضیاع لازم آتا، اور اگر کسی پیشہ اور صنعت میں لگ جاتے تو اس سے دین اور قرآن کا ضیاع لازم آتا، اسی لئے قرآن کی تعلیم پر اجرت کا فتویٰ دیا اور اسی طرح امامت اور اذان پر بھی، حالانکہ امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد کا متفق علیہ مذہب عدم اجرت ہی ہے، تاکہ قاضیوں کا فیصلہ بھی فتوے سے مل جائے، لیکن ہمیں سلطان اور قاضی کی ضرورت نہیں، لہذا علماء کی مبارک جماعت کی طرف سے اس کی ترجیح اور اس کی قبولیت کافی ہے، تمہارے اندر اس دور کے بڑے بڑے حنفی علماء موجود ہیں لہذا اس کی ترجیح کافی ہے، لوگوں کے عرف کی وجہ سے، ضرورت شرعیہ کی وجہ سے، حاجت کی وجہ سے اور تعامل کی وجہ سے، اور ان میں سے ہر ایک سے ظاہر مذہب کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ ظاہر عین نص نہ ہو بلکہ ان مسائل کے قبیل سے ہو جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے، اور ہمارا مسئلہ مجموعہ غنہا اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، اس کا بیان آچکا ہے، لیکن ان حالات میں یہ فتویٰ عین مذہب کو اختیار کرنے کے مرادف ہے کیونکہ صاحبین کے قول کو مزارعت کے باب میں حاجت ہی کی وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے اور سترہ مسائل میں امام زفر کی رائے پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح فقہاء نے بیع شرب میں اہل بلخ کے قول کو مستقلاً راجح قرار دیا ہے، پھر یہ کہ کسی ایک شہر کے عرف خاص کا اعتبار کرنا بھی مذہب حنفی کا ایک قول ہے، اور قول ضعیف پر ضرورت کے وقت عمل کرنا جائز ہے (شذذ العرف ۲۰/۱۳۳)، پس تمہارا عرف عام کے بارے میں کیا خیال ہے، اس کے قائل ہمارے بعض اصحاب ہیں، ابن عابدین اپنے رسالہ رسم الفتی کی نظم میں فرماتے ہیں:

ولا يجوز بالضعيف العمل ولا به يجاب من جاء يسئل

إلا لعامل له ضرورة او من له معرفة مشهورة

یعنی قول ضعیف پر نہ تو خود عمل کرنا جائز ہے اور نہ ہی مسائل کو اس کے ساتھ جواب دینا جائز ہے البتہ کسی عامل کے لئے جائز ہے اور ضرورت شرعیہ پیش آجائے یا اس شخص کے لئے اختیار کرنا جائز ہے جس کو معرفت مشہورہ حاصل ہو۔ لہذا امام زفر کی رائے پر فتویٰ کا تقاضا ضرورت بھی کرتی ہے، لوگوں کے اعمال کو صحیح کرنا، لغو ہونے سے بچانا بھی یہی چاہتا ہے، اور قواعد میں گنجائش بھی ہے۔ اور اس لئے بھی تاکہ مذہب حنفی لوگوں کی ضرورتوں کا ساتھ دے سکے اور حالات زمانہ سے دور نہ ہو، اور ہم اپنی مراد کی تائید میں بہت ساری فروع کا ذکر بالتفصیل کر چکے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ جیسے لوگوں کی طرف سے امام زفر کی رائے کو ترجیح دینا قابل قبول ہوگا، اور آپ حضرات کو معرفت مشہورہ حاصل ہے۔



## فرع خامس

بعض فقہی تصریحات جن میں منافع کو مال تسلیم کیا گیا ہے:

ہم نے جو منافع کو مال ماننے کا قول اختیار کیا ہے، تو ہم نئے سرے سے مذہب میں شامل نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ فقہاء نے اپنے اپنے مواقع میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اس عرف کی بنیاد پر ہے جو منفعت کو مال نہیں مانتا، لیکن دوسرے موقعوں پر منافع کے لئے بدل کی تعیین بھی کی گئی ہے۔

اگر ایک طرف فقہاء نے منفعت کی معرفت کے مواقع کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ اجارہ میں منافع کا عوض حاصل کیا جاسکے، اور مندرجہ ذیل امور کے ذریعہ ان کی تحدید کی ہے:

الف: مدت اجارہ کی تعیین، مثلاً رہائش اور زراعت۔

ب: عمل کی تعیین و نامزدگی، مثلاً کسی کپڑے کی سلانی اور رنگائی۔

ج: اشارہ، مثلاً اس غلہ کو فلاں مقام تک منتقل کرنا۔ (الاختیار ۱۵۲، الکنز بشرح العینی ۱۹۱۲)

تو دوسری طرف ایسے منافع بھی ہیں جن کا عوض بغیر اجارہ کے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اور جنایت کی شکل میں ان کا ضمان دلا یا جاتا ہے۔ اور ان کی تحدید مذکورہ طریقوں کے بغیر کی گئی ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کا دانت توڑ دے تو اس کے قصاص کا مسئلہ۔

اس میں دانت کے چھوٹے بڑے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ سب کی منفعت یکساں ہے، مدار حکم دانت کی منفعت پر رکھا گیا ہے، اور ہر طرح کے دانت کی دیت بھی یکساں قرار دی گئی ہے، اور وجہ وہی ہے کہ ان کے منافع میں بھی یکسانیت ہے، اس لئے منافع ہی کو مدار بنایا گیا اور عوض دینے دلانے میں منافع ہی کا لحاظ رکھا گیا۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی کے ایسے ہاتھ کو ظلماً کاٹ دے جو پہلے سے ناکارہ یا کٹا ہوا تھا تو اس پر کسی طرح تاوان واجب نہیں ہوگا کیونکہ مقطوع الید کا حق اس صورت میں بشکل قصاص متعین ہے۔ اور یہ حق قصاص مال میں اس وقت بدل جائے گا جب کہ وہ اپنا حق قصاص چھوڑ کر مال پر مصالحت کر لے۔ اگر وہ مال کے ذریعہ مصالحت نہیں کرتا ہے تو پھر اس کا مال ہونا ساقط ہو جائے گا (الاختیار ۳۲/۵)۔

میں کہتا ہوں کہ قصاص مقتنص کے اختیار کرنے کی صورت میں ”مال“ بن جاتا ہے۔ اور اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جو لوگ منفعت کو مال مانتے ہیں ان کا یہ عمل شریعت کی نظر میں اور مذہب کی تصریحات میں مقبول ہے۔ کیونکہ یہ مذہب میں موجود ہے اور مذہب کی تصریحات سے ماخوذ ہے۔

اگر کسی خاتون کی دونوں چھاتیاں کسی نے کاٹ دیں تو اس میں پوری دیت واجب قرار دی گئی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ بتلائی گئی کہ شد بین کے بغیر دودھ نہیں رک سکتا۔ تو ان کے نہ ہونے سے ارضاع (شیر خورانی) کی منفعت یکسر فوت ہوگئی (الاختیار ۳۸/۵)۔ ایسے ہی دونوں آنکھ ضائع کر دینے کی صورت میں پوری دیت کا وجوب اسی بنیاد پر ہے کہ دونوں آنکھوں کے نہ ہونے سے منفعت مکمل فوت ہوگئی یا جمال مکمل طور پر ضائع ہو گیا۔ (الاختیار ۳۸/۵)

نیز فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کے خصیتین اور ذکر کو کاٹ دے۔ یا پہلے ذکر کو کاٹے پھر خصیتین کو قطع کر دے تو اس پر دوہری دیت واجب ہوگی۔ کیونکہ قطع ذکر کے بعد بھی خصیتین کی منفعت باقی تھی اور وہ تھی منی اور پیشاب کا امساک۔

اور اگر پہلے خصیتین کو کاٹ دیا پھر ذکر کو تو خصیتین کے عوض میں دیت واجب ہوگی اور ذکر کے عوض میں کسی عادل شخص کا فیصلہ معتبر ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ خصیتین کے کاٹ دینے سے وہ خصی ہو گیا۔ اور خصی کا ذکر قطع کرنے کی صورت میں ”حکومت عدل“ کا اعتبار ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خصیتین کٹ جانے کی وجہ سے اس کی منفعت تولید مختل ہوگئی۔ تو وہ شل ہاتھ کے حکم میں ہو گیا۔

فرمایا کہ: جو اعضاء چار اجزاء پر مشتمل ہیں ان میں سے ایک ضائع کر دینے سے رُبع دیت واجب ہوتی ہے اور وہ اعضاء ہیں آنکھوں کی پلکیں اور بردنی ہیں۔ کیونکہ ان کے ضائع ہونے سے جمال بھی پورے طور پر فوت ہو جاتا ہے، اور جنس منفعت بھی، بردنی کی منفعت آنکھ کو تنکوں وغیرہ سے بچاتا ہے اگر پلکوں کو

کانا ہے اور ان میں بردنی (بال) نہیں ہے تو اس میں پوری دیت واجب ہوتی ہے، اور ایک پلک کاٹنے کی صورت میں رُبع دیت واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں مل کر ایک عضو کے حکم میں ہیں جیسے ناک اور مارن (ناک کا اگلا ملائم حصہ) مل کر ایک عضو ہے۔ ہر دانت میں دیت کا بیسواں ۲۰ حصہ واجب ہوگا۔ اور اگر اکھڑا ہوا دانت اپنی جگہ پر دوبارہ جمادیا اور وہ آگ آیا تو صرف مالی تاوان واجب ہوگا۔ یہی حال کان کا ہے، کیونکہ وہ بھی منفعت اور جمال کے لحاظ سے اپنی پچھلی حالت پر لوٹ آتا ہے۔ لیکن اکھڑا ہوا کان دوبارہ جم نہیں سکتا، کیونکہ وہ رگوں اور پٹھوں کے ساتھ جڑ نہیں سکتا۔ تو اس کا اگنانہ اگنادونوں برابر ہے۔ حتیٰ کہ اس دوبارہ جمے ہوئے کان کو کوئی شخص اکھاڑ دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔

اگر کسی شخص کے مار کی وجہ سے کسی کا دانت سیاہ پڑ جائے یا سُرخ یا پیلا ہو جائے تو اس میں پورا تاوان واجب ہوگا کیونکہ سیاہ پڑ جانے کے بعد اس کی منفعت فوت ہوگئی۔ کیونکہ اب وہ جھڑ جائے گا اور اس سے اس کا جمال پورے طور پر فوت ہو جائے گا۔

اور اگر دانت پیلا پڑ جائے تو امام ابوحنیفہؒ سے اس سلسلہ میں ”حکومت عدل“ کا قول منقول ہے۔ کیونکہ پیلا پڑ جانا دانت کی منفعت کو بالکل زائل نہیں کرتا، ہاں منفعت میں نقص ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا ”حکومت عدل“ (کسی عادل شخص کا فیصلہ) معتبر ہوگا۔

داڑھی سے بھی کامل جمال حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سماء دنیا کے ملائکہ یوں کہتے ہیں: ”سبحان من زین الرجال باللحی والنساء بالذوائب“ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھیوں سے اور عورتوں کو زلفوں سے مزین کیا۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے سر مونڈ دینے کی صورت میں جبکہ دوبارہ بال نہیں نکلا پوری دیت واجب قرار دی۔ امام ابو جعفر ہندوانی داڑھی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ داڑھی مونڈ دینے کی صورت میں دیت اس وقت واجب ہوگی جبکہ داڑھی بھری ہوئی ہو اور اس سے جمال پیدا ہوتا ہو۔ لیکن اگر داڑھی میں صرف لٹیس ہوں اور ان سے جمال نہ پیدا ہوتا ہو تو کچھ واجب نہیں۔ اور اگر داڑھی اتنی بکھری ہوئی نہ ہو کہ نہ اس سے جمال پیدا ہوتا ہو نہ عیب پیدا ہو تو اس میں ”حکومت عدل“ کا اعتبار ہوگا۔ (الاختیار ۳۸۵-۳۹)

## مبحث دوم

### بیع حقوق

”حق“ کے اصطلاحی معنی بیان کرتے ہوئے یہ کہا جا چکا ہے کہ حقوق کی چند قسمیں ہیں: حقوق مالی، اور حقوق غیر مالی، اور کچھ حقوق کو مال قرار دینا اور دوسرے حقوق کو مال قرار نہ دینا، ہم نے جہاں تک غور کیا ہے یہی نصوص شارع کا تقاضا ہے اور یہی عام لوگوں کا عرف اور تعامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حق دین کو مالی حق مانا گیا ہے کیونکہ شارع نے اس کو یہی حیثیت دی ہے (بقرہ: ۲۸۲)۔

اور یہی حال عرف اور تعامل کا ہے (بلکہ) اس پر ان کا اجماع ہے اور عقل کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اسی طرح متاخرین نے ذیل کے حقوق کا اعتبار کیا ہے جیسے: حق تصرف فی الاراضی الامیریہ (امیر کی طرف سے بطور جاگیر عطا کی ہوئی اراضی) اس کو بھی ایسا حق مانا گیا ہے کہ جس کا عوض لینا جائز ہے، اسی طرح تنازل وغیرہ ہے۔

اسی طرح وظیفہ عامہ سے تنازل کو قابل بدل حق تسلیم کیا ہے اور اسے جائز مانا ہے۔ تو یہ تمام چیزیں اور اس جیسی دیگر چیزیں عمل میں آچکی ہیں، اس لئے کہ عرف، حاجت اور ضرورت نے ان کو جائز قرار دیا ہے، اور اس کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

اور جہاں اہل علم کی اس تقسیم کا تعلق ہے کہ وہ حقوق کو مجردہ اور غیر مجردہ میں تقسیم کرتے ہیں اور حقوق مجردہ کو بلا بدل ساقط کر دیتے ہیں اور دوسرے کو ساقط نہیں کرتے بلکہ اسے منتقل کر دیتے ہیں تو یہ تقسیم اعتباری ہے، اور اس کو کہاں تک اور کب تک ”مجردہ“ کا نام دیا جائے گا حقیقت میں تو یہ منتقل ہوتے ہیں، جب وہ زمین جس پر حق مرتب ہو رہا تھا اس کے مالک کے حوالے کر دی گئی اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہ تھا تو گویا زمین پورے طور پر اس کی ہوگئی اور اس کے تمام حقوق بھی اس کی طرف منتقل ہو گئے اور ساقط کرنے سے (دوسرے سے) یہ حقوق ساقط بھی ہو گئے، لیکن حق کا اسقاط بذات خود نہیں ہوا (زمین کے تابع ہو کر ہوا ہے)، ورنہ (اگر ہم یہ تسلیم کریں) تو وہ حق موجود ہے زائل نہیں ہوا ہے، اور نہ ساقط کرنے سے ساقط ہوگا۔

اس سلسلے میں نہ نصوص مذہب مانع ہیں اور نہ اس کے قواعد جیسا کہ ہم منافع کے بیان میں ثابت کر چکے ہیں کہ حقوق کو مال تسلیم کرنا جائز ہے اور آمدنی کی



غرض سے اس کو فروخت کرنا یا اس سے مسلسل نفع کمانا یا اسے کسی مالی مطالبے کے عوض دوسرے کی طرف منتقل کرنا بھی۔

اس کے علاوہ حقوق کا سمیٹنا اور جمع کرنا، کبھی سمیٹنے کے مستند طریقوں سے بھی ہوتا ہے۔ اور کوئی فکر جب مدون ہو جائے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ فکر بذات خود فروخت ہو رہی ہے بلکہ جب وہ فکر قائم بند کر لی جاتی ہے اور مدون ہو جاتی ہے تو اس کا کاغذ پر مدون ہو جانا مدون کے حسب مسما فروخت کرنے کا جواز پیدا کر دیتا ہے۔

اب آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ اجرت ہے اس کے عمل اور اس کی محنت کشی کی، اور معاوضہ ہے اس کے اس گھرے رہنے اور اس نتیجے تک پہنچنے کی خاطر خود کو پابند رکھنے کا، جیسا کہ مدرس قرآن مجید کی اجرت کا جواز متاخرین اسی اصول سے نکالتے ہیں، اسی طرح عام لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کی خدمت پر مامور شخص کا معاوضہ یا مفتی اور قاضی کی اجرت کا معاملہ ہے کہ مفتی فتاویٰ لکھنے کی خاطر ایک مقام پر بیٹھے رہنے کا پابند ہے اور قاضی بھی محکمہ کے تقاضوں کی وجہ سے پابند ہے، اور یہی حال مفکرین و موجدین کا ہے کہ ان کو بھی اپنے افکار و خیالات کو مدون کر کے انھیں حسب منشاء فروخت کرنے کا حق حاصل ہے۔

اگر یہ لوگ (اپنے مدونہ مجموعے کے) متعدد نسخے تیار کریں گے (اور انھیں فروخت کریں گے تو یہ فروخت (درحقیقت) ان نسخوں کی ہوگی اور اس پر زمانہ قدیم سے بلا واسطہ میں عمل ہے۔

لیکن جہاں تک مؤلف و مصنف کے حق کا تعلق ہے اس کے افکار اور اس کے دلائل کے لحاظ سے اور ان کو محفوظ نہ کرنے کی صورت میں جو نقصان اسے لاحق ہو سکتا ہے تو یہ اس کا قابل ضمان حق ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں تا وقتیکہ عرف اس طور پر قائم ہے جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اصول اور قواعد میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ بلکہ مذہب کی بعض نصوص اس پر صراحتاً بھی دلالت کرتی ہیں، مثال کے طور پر:

الف۔ کسی کے زنان خانے میں جھانکنا آدمی کی عدالت کو ساقط کر دیتا ہے، اس لئے کہ عام حالات میں آدمی کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے گھر میں محفوظ رہے خاص طور پر اس کی مستورات پردے میں رہیں، اسی حق کے ضائع کرنے کو شریعت نے ایک دوسری چیز کے بالمقابل قرار دیا ہے، کہ مسلمان کے حقوق میں سے ایک حق اس کے عوض میں ساقط کر دیا یعنی اس کی ”عدالت“ ساقط کر دی۔

یہ واضح دلیل ہے حقوق کا اعتبار کرنے اور اسے دیگر حقوق کے مقابلے میں رکھنے کی۔

ب۔ شریعت نے طلاق قبل الدخول کی صورت میں نصف مہر لازم کی ہے، یہ اس حق کی قیمت ہے جو اس کے لئے اب سے پہلے جائز نہیں تھا اور اب نکاح کے ذریعہ حاصل ہو گیا تھا، اور عورت کی اس ناگواری کا عوض ہے جو اسے اس خبر سے پہنچی ہے۔

ج۔ متاخرین نے ”بدل الخلو“ (پگڑی) کو اوقاف میں جائز قرار دیا ہے اور اسے دوسرے کو فروخت کرنا جائز قرار دیا ہے اور اس کو آپ کے اس فقہی ادارے نے بھی جائز رکھا ہے۔

د۔ جنین جو کسی ماں کے پیٹ سے کسی ضرب کے نتیجے میں ضائع ہو جائے تو ضارب کی عاقلہ پر اس کا حق آتا ہے۔ اس لئے کہ ولایت تک بچے کو پیٹ میں رکھنا عورت کا شرعی اور ثابت حق ہے اس کے ساتھ جب زیادتی ہوئی تو شریعت نے اس کا ایک مقابل اور بدل تجویز فرمایا جو کہ خلاف قیاس اور خلاف معمول اہل جاہلیت ہے۔ (قاعدہ یہ ہے کہ) جس نے کسی (حاملہ) عورت کو مارا اور اس سے مردہ بچہ ساقط ہوا اس کی وجہ سے ضارب کی عاقلہ پر پچاس دینار ادا کرنا لازم ہوگا، بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر کچھ بھی واجب نہ کیا جاتا کیونکہ اس ضرب سے قبل بچہ کی زندگی یا موت کے متعلق کوئی علم نہیں اور ظاہر کے تقاضے سے کسی پر کچھ لازم نہیں کیا جاسکتا (یعنی یہ کہنا کہ ظاہر یہی ہے کہ وہ اس تعدی سے قبل زندہ ہوگا کسی کے ذمہ کوئی تاوان واجب کرنے کے لئے کافی نہیں) لیکن یہاں قیاس کو ترک کر دیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک عورت نے اپنی سوکن کو ایک لکڑی ماری تھی، نتیجہً اس کے پیٹ سے مردہ بچہ ساقط ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضاربہ کی عاقلہ پر ایک غلام یا باندی یا اس کی قیمت ادا کرنا لازم قرار دیا جو کہ پانچ سو ہوئی تھی، اس واقعہ میں یہ وضاحت نہیں طلب کی گئی تھی کہ بچہ لڑکا تھا یا لڑکی۔ دوسرے یہ کہ جنین کے متعلق ذکر یا نشی کا پتہ لگانا دشوار بھی ہوتا ہے، اس لئے دفع حرج کی خاطر اس کا اعتبار ختم کر دیا گیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ اس (مضروبہ) عورت نے مرد جنین ساقط کیا اور پھر خود بھی مر گئی، اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضاربہ کی عاقلہ پر دیت اور بچہ کا مالی عوض لازم فرمایا۔ یہ واقعہ المغنی (لابن قدامہ) میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ جنین کے چپانے یہ عرض کیا کہ اس کے (سر پر) بال آچکے تھے۔ پھر



ضاربہ کے والد کھڑے ہوئے، اور ایک روایت کے مطابق اس کے بھائی عمران بن عویمر سلمی کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم کیسے پتہ لگا سکتے ہیں ایسے جنین کے متعلق جس نے نہ کچھ کھایا نہ پیانا وہ چیخانہ رویا، ایسے (جنین) کا خون تو رازگاں جانا چاہیے۔ (اصل عربی عبارت ایک خاص انداز سے مستخرج ہے) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ تو کاہنوں کا سامع ہے، پھر مقدمہ کا فیصلہ دیا کہ اس میں ایک غلام یا ایک باندی دینا ہوگی۔ یہ روایت اسی طرح محمد بن مسلمہ نے بھی روایت کی ہے۔

۵۔ اسی طرح جب کوئی شخص شارع عام کی طرف کوئی روشن دان یا پرنا لہ جاری کرتا ہے تو اس کا ہٹانا جائز ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک مشترک حق ہے۔ اور اگر وہ کسی کے اوپر گر گیا اور اس کی موت ہوگئی تو اس کی دیت اس (پرنا لہ وغیرہ نکالنے والے) کی عاقلہ پر آئے گی، اس لئے کہ اس نے ایک ایسے عام راستے کو اپنے لئے مشغول کیا تھا کہ اس کا اسے حق نہ تھا (الاختیار ۵/۴۵)۔

۶۔ اسی طرح ہم فقہاء کی تصریحات میں یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کی دیوار شارع عام کی طرف جھکی ہوئی تھی اور ایک مسلمان یا ذمی نے اسے گرا دینے کا مطالبہ کیا اور اس (صاحب دیوار) نے اتنی مدت تک اسے نہ گرایا کہ اتنی مدت میں گراناممکن تھا حتیٰ کہ وہ دیوار گر گئی تو (اگر اس سے کسی کو نقصان ہوا ہے تو) یہ ضمان کا ذمہ دار ہوگا۔ حالانکہ قیاس یہ کہتا ہے کہ ضمان اس پر نہ آئے، کیونکہ دیوار کا جھکاؤ یا فضا کو مشغول کرنا اس کے کسی فعل کا نتیجہ نہیں، لہذا نہ وہ قاتل ہے اور نہ وہ قتل کا سبب بنا ہے تو اس پر ضمان بھی نہ آنا چاہیے۔

۷۔ استحسان یہ کہتا ہے کہ فضا اس کی دیوار کی وجہ سے مشغول ہوئی ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس میں سب لوگ حصہ دار ہیں (الاختیار ۵/۴۶)۔  
۸۔ جیسا کہ مبسوط میں ہے کہ سلطان کے لئے یہ جائز ہے کہ ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے سے مال وصول کرنے کے علاوہ اس کو تعزیر بھی کرے جیسا کہ اضرائر تاخیر پر ضمان وصول کیا جاتا ہے (المبسوط ۳/۱۷۸)۔

اور یہ یعنی صاحب مال کا حق اس کا حق وصول کرنے کے بارے میں قابل عوض ہے یعنی اس کا عوض لینا جائز ہے۔

۹۔ امام محمد بن حسن شیبانی سے مروی ہے کہ قابل اندمال زخموں میں زخمی کو جس قدر تکلیف پہنچی ہے اسی کے بقدر حکومت عدل (زخم دینے والے کے ذمے رقم) واجب ہوگی (المبسوط ۲۶/۸۱)۔

۱۰۔ اور انسان کا حق ہے کہ وہ امن و اطمینان کے ساتھ زندہ رہے، اور کوئی شخص اس کی تکلیف اور ایذا رسانی کا ذریعہ نہ بنے، اس کا بدل ایک مالی حق تجویز کیا گیا اور تعزیری عقوبات اس کے علاوہ ہیں (ان کا معاملہ اس سے آگے ہے)۔

۱۱۔ اور حکومت عدل کے اکثر احکام کا بدل مال کی شکل میں ہی واجب کیا جاتا ہے، بلکہ ایک دوسری حیثیت سے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان جو منفعت امن و راحت کی دیتا ہے اس کے مقابل (کوئی نہ کوئی) مال تجویز کیا جاتا ہے اور یہ جائز ہے، اور یہ دونوں شکلیں جائز ہیں۔

۱۲۔ اور انسان کو زندگی کا جو حق حاصل ہے اس کا عوض مالی زکاۃ ہے اور جو زکاۃ سے زائد ہے محتاجوں کے لئے اس کا بھی مطالبہ ہے۔ اور یہ ایک واضح بات ہے، اس کیلئے نصوص و دلائل نقل کرنے کی حاجت نہیں۔

۱۳۔ اسی طرح مہمان کا حق مہمانی ہے، اور آثار میں آتا ہے کہ وہ اس کے حصول کے لئے مقابلہ کر سکتا ہے، اس کے لئے بھی نصوص نقل کرنے کی حاجت نہیں، یہ بات معلوم و معروف ہے۔

۱۴۔ اگر اس طرح کے شواہد تلاش کرنے کے لئے ہم اہل علم کے بیانات تلاش کریں تو بے شمار چیزیں ملیں گی۔

۱۵۔ لہذا اہل علم کے فتاویٰ کے ذریعہ مذہب کا دائرہ وسیع کرنے میں پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے، حقوق کو جب عرف نے مال اور مال مستقیم قرار دیا ہے تو ہمیں بھی اس کو خوش آمدید کہنا چاہیے (اس لئے کہ عرف کی رہنمائی بہت سے معاملات میں مقبول ہوتی ہے) بالخصوص جبکہ شریعت کی کوئی نص اس کی مخالفت بھی نہیں کر رہی ہے اور قواعد میں وسعت موجود ہے۔

۱۶۔ ہم قانون دانوں کی طرح یہاں کوئی فیصلہ کرنے کے درپے نہیں ہیں بلکہ ہم اہل اسلام کا طریقہ تحقیق مسائل کا ہے، اگر ہم اپنی تحقیق کے نتیجے میں جواز تک پہنچتے ہیں تو کافی ہے، اور تفریح و تفریح میں غلو سے کام لینا بے فائدہ ہے۔ اگر حاضرین اسی مسئلے پر مزید گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو وہ باہم گفتگو جاری رکھیں۔

## حقوق کی بیع

### ایک علمی جائزہ

مولانا محمد صدر الحسن ندوی علیہ

بیع کے انعقاد کی شرط کے ضمن میں فتاویٰ عالمگیری میں حسب ذیل صراحت ملتی ہے:

ومنها فی البدلین وهو قیام المالیتۃ حتی لا ینعقد متی عدمت المالیتۃ هكذا فی محیط السرخسی (فتاویٰ عالمگیری ۳۰۲)۔  
(بدلین کا مال ہونا ضروری ہے اگر مالیت نہ پائی گئی تو بیع صحیح نہ ہوگی)۔

حقوق کی بیع پر بحث سے پہلے تحقیق و جستجو کے دوران ہمارے سامنے کئی ایسے مسائل آتے ہیں کہ اگر ان پر غور و خوض نہ کیا جائے تو حقوق کی بیع کے سلسلہ میں ہمیں کسی اہم نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری ہوگی۔ اس لئے آئندہ صفحات میں میں ان قابل توجہ مسائل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل امور قابل تحقیق ہیں:

مال:

فقہائے احناف کی تصریح کے مطابق بیع میں بدلین کا مال ہونا شرط ہے۔ اس لئے عدم مالیت کی صورت میں بیع صحیح نہ ہوگی۔ جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری کی درج بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات تحقیق طلب ہے کہ مال کا اطلاق فقہاء احناف کے یہاں کن چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کتب فقہ میں حسب ذیل صراحتیں ملتی ہیں:

الف۔ المال ما یمیل الیہ الطبع و یجری فیہ البدل والمنع (رد المحتار ۵۰۵۲)۔

(مال وہ ہے جس کی طرف میلان طبع ہو اور جس کے بذل و منع کاروان ہو)۔

ب۔ المال ما یمیل الیہ الطبع و یمکن ادخاره لوقت الحاجة “ (رد المحتار ۵۰۵۱، نقلاً عن التلویح والبحر الرائق ۵۰۲۵۶)۔

(مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو اور جس کو وقت ضرورت کے لئے محفوظ بھی کیا جاسکتا ہو)۔

ج۔ المال موجود یمیل الیہ الطبع و یجری فیہ البدل والمنع فإنه ینخرج بالموجود المنفعة (رد المحتار ۵۰۵۱، نقلاً عن الدرر شرح الغرر) (مال وہ ہے جو موجود ہو اور اس کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو اور اس میں بذل و منع کاروان ہو، موجود کی شرط سے منفعت پر مال کا اطلاق نہ ہوگا)۔

د۔ وحق التعلی لیس بمال لأن المال عین یمکن إحرازها وإمساکها (رد المحتار ۵۰۵۲)۔

(حق تعلی مال نہیں ہے، اس لئے کہ مال وہ ہے جو عین (وہ مادی شے جس کا خارج میں وجود ہو) اور اس کا احراز و امساک ممکن ہو)۔

هـ۔ والمالیتۃ انما تثبت بتمول الناس كافة أو بتقوم البعض، والتقوم یثبت بها ویباحۃ الانتفاع له شرعاً فما

یکون مباح الانتفاع بدون تمول الناس لا یکون مالا کحبة حنطة، و ما یکون مالا بین الناس ولا

یکون مباح الانتفاع لا یکون متقوماً كالخمر (البحر الرائق ۵۰۲۵۶-۲۵۷)۔

جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم، اورنگ آباد (مہاراشٹر)۔

(مالیت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب تمام انسان یا بعض افراد اس کو وقت ضرورت کے لئے محفوظ رکھیں، اور تقوم کے لئے اس کے ساتھ ساتھ دوسری شرط بھی ہے، اور وہ یہ کہ شرعاً اس سے انتفاع جائز ہو، تو جو چیز مباح الانتفاع ہو لیکن لوگوں کے نزدیک قابل ادخار نہ ہو تو وہ مال نہ ہوگا جیسے گہیوں کا ایک دانہ، اور جو چیز لوگوں کے نزدیک مال ہو اور شرعاً اس سے انتفاع جائز نہ ہو تو وہ چیز مستقوم نہ ہوگی جیسے شراب)۔

د۔ والمتقوم ما يباح الانتفاع به شرعاً وغير المتقوم ما لا يباح الانتفاع به شرعاً (الدر المختار: باب البيع المفسد)۔  
(مستقوم وہ ہے جو شرعاً مباح الانتفاع ہو، اور غیر مستقوم وہ ہے جس سے شرعاً انتفاع جائز نہ ہو)۔

ز۔ إذا حلف إنسان أنه لا مال له ولم يكن له إلا ديون لا يعتبر حانثاً في يمينه سوائاً كان مدينه مفلساً أو غنياً  
مليئاً (الدر المختار: كتاب الايمان ۳۰۱۳۸)۔

(اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ اس کے پاس مال نہیں ہے، اور اس کے پاس صرف وہ دین ہو جو لوگوں کے ذمہ ہے تو وہ حانث نہیں ہوگا چاہے قرضدار مفلس ہو یا مالدار)۔

مال کے اوپر مختلف تعریفیں ذکر کی گئی ہیں۔ ان تعریفات پر غور کرنے سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

فقہ (الف) کی تعریف سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) میلان طبع، اور (۲) بذل و منع کارواج۔

فقہ (ب) کی تعریف سے بھی دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) میلان طبع، اور (۲) ادخار۔

فقہ (ج) کی تعریف سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) موجود ہونا، (۲) میلان طبع، اور (۳) بذل و منع کارواج۔

فقہ (د) کی تعریف سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) عین مادی شے ہونا، (۲) اور قابل احراز و امساک ہونا۔

فقہ (ه) کی صراحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مال میں مالیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دو شرطیں پائی جاتی ہیں: (۱) پوری نوع انسانی یا اس کے بعض افراد اس شے کو وقت ضرورت کے لئے محفوظ رکھیں، اور (۲) وہ چیز شرعاً قابل انتفاع ہو۔

فقہ (ز) سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ دین کی رقم دین کے ذمہ واجب ہوتی ہے جس کا خارج میں وجود نہیں ہوتا اس لئے اس پر مال کا اطلاق نہ ہوگا۔

درج بالا تمام تعریفات کی روشنی میں فقرات (الف) تا (ز) کے پس منظر میں یہ بات صاف طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ فقہاء احناف نے مال کے سلسلہ میں (۱) میلان طبع اور (ب) عینیت (یعنی مادی شے ہونا اور قابل ادخار و امساک ہونا) کا اعتبار کیا ہے اور عرف کو اس کا مدار بنایا ہے، گویا مال نام ہے میلان طبع، عینیت اور عرف کے مجموعہ کا، یعنی ہر وہ مادی شے جس کا خارج میں وجود ہو، یعنی مادی شے ہو اور عرفاً قابل ادخار ہو اور اسکی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو، اس پر مال کا اطلاق ہوگا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ فقہاء احناف نے مال کے سلسلہ میں میلان طبع اور عینیت (ادخار) کی شرط کیوں رکھی ہے۔ کیا اس سلسلہ میں قرآن و حدیث میں کچھ ایسی صراحتیں ملتی ہیں یا عرف کو انہوں نے مدار بنایا ہے۔

قرآن کریم، احادیث نبویہ اور اشعار عرب کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تینوں مصادر میں جہاں بھی مال کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد مادی چیز ہی لی گئی ہے، غیر مادی شے پر مال کا اطلاق نہیں کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ نے بھی مال کے سلسلہ میں عرف کا اعتبار کیا ہے، یعنی جن چیزوں پر اس زمانہ میں مال کا اطلاق ہوتا تھا ان ہی چیزوں پر شریعت اسلامیہ نے مال کا اطلاق کیا ہے اگرچہ چند استثناءات ہیں جن کی ہم آئندہ صفحات میں صراحت کریں گے۔

اہل لغت نے اس کی صراحت کی ہے کہ اہل بادیہ کے نزدیک مال کا اطلاق جو پایوں پر ہوتا ہے، اسی طرح جب وہ کہتے تھے کہ "فلان ذہب الی مالہ" تو اس سے یہ مراد لیتے تھے کہ وہ اپنی جائیداد یا اپنے اونٹوں کی طرف گیا۔

اس سے پہلے یہ بات معلوم ہوئی کہ اہل بادیہ اور عرب مال کا اطلاق مادی اور قابل ادخار شے پر کرتے تھے۔



ایک جاہلی شاعر کہتا ہے: ”وَلِلْمَالِ عِنْدِي الْيَوْمَ رَاعٍ وَكَاسِبٌ“ (آج میرے مال کے چرانے والے اور خادم موجود ہیں)۔

اس شعر سے بھی واضح ہے کہ شاعر نے مال کا اطلاق مادی شے ہی پر کیا ہے اس لئے کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرے جانوروں کے چرانے کے لئے راہی موجود ہیں اور میری جائیداد غیر منقولہ کھیتی، باغات وغیرہ میں کام کرنے والے خادم موجود ہیں۔

اب قرآن کریم کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔ ارشاد خداوندی ہے:

”وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ“ (سورہ ہنزہ)۔

(تباہی ہے ہر عیب جو نکتہ چیں کے لئے جو اپنا مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے۔ گمان کرتا ہے کہ یہ مال اسے سدا زندہ رکھے گا)۔

قرآن کریم میں کم و بیش چھبیس مقامات پر لفظ مال کا ذکر آیا ہے، اور سیاق و سباق سے عینی چیزوں پر ہی مفسرین نے مال کا اطلاق کیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت مادی قابل ادخار چیزوں پر ہی مال کا اطلاق ہوتا تھا اس لئے قرآن نے ان ہی معانی میں مال کا استعمال کیا۔

اب ہم دیکھیں گے کہ احادیث میں کن معانی میں مال استعمال ہوا ہے: عن سعد بن أبي وقاص قال جاء النبي ﷺ يعودني وأنا بمكة وهو يكره أن يموت بالأرض التي هاجر منها فقال يرحم الله ابن عفرأء، قلت يا رسول الله! أوصي بمالي كله قال: لا، قلت: فالشطر؟ قال: لا، قلت: فالثلث، قال: الثلث، والثلث كثير، إنك إن بدع ورثتك أغنياء خيراً من أن تدعهم عالية يتكفون الناس (بخاری: کتاب الوصایا)۔

(سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ انہیں (سعد بن ابی وقاص) یہ بات ناپسند تھی کہ وہ اس جگہ وفات پائیں جہاں سے انہوں نے ہجرت کی تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اللہ ابن عفرأء پر رحم فرمائے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اپنے سارے مال کے سلسلہ میں وصیت کر جاؤں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: پھر نصف مال کی حد تک؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: پھر ایک تہائی مال کی؟ آپ نے فرمایا: ہاں، ایک تہائی کی حد تک، اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تو اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جائے یہ بات اس سے بہتر ہے کہ انہیں محتاج چھوڑے کہ وہ لوگوں سے مانگتے پھریں)۔

عن عبد الله بن عمرو قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من قتل دون ماله فهو شهيد (بخاری: أبواب العظام والقصاص، باب من قتل دون ماله، مسلم: کتاب الایمان)۔ (عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جو شخص اپنی مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے)۔

درج بالا احادیث اور ان کے علاوہ مال سے متعلق دوسری احادیث پر بھی غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں جہاں بھی مال کا ذکر آیا ہے ان کا اطلاق مادی چیزوں پر ہی کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ احادیث کے ذخیرہ میں بعض ایسی بھی حدیثیں ملتی ہیں جن میں مال کا اطلاق غیر مادی شے یعنی معنوی شے پر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی شادی ان کے حفظ قرآن کے عوض کی یعنی حفظ قرآن کو مہر بنایا۔ حالانکہ نکاح میں مہر کے سلسلہ میں ”أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ“ کی صراحت ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زوجتكها بما معك من القرآن“ (روائع البیان فی تفسیر آیات القرآن ۱۰۴۵) (تمہارے قرآن کے بدلہ میں نے اس سے تمہاری شادی کی)۔

اس طویل گفتگو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فقہاء احناف نے مال کے لئے عینیت (مادی اور قابل ادخار ہونا) کی جو شرط لگائی ہے وہ قرآن کریم، احادیث نبویہ اور عربی دوادین ولغت کے اطلاق کی روشنی میں لگائی ہے۔

اس اصول کے پیش نظر غیر مادی چیزوں پر مال کا اطلاق نہ ہوگا۔ چنانچہ فقہاء احناف کی درج ذیل صراحتوں سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے:

الف۔ منفعت:

منافع غیر مادی ہوتے ہیں اس لئے منافع پر مال کا اطلاق نہ ہوگا، اور منافع کی بیع جائز نہ ہوگی، جیسا کہ شامی میں اس کی صراحت ہے:

ولا يرد أن المنفعة تملك بالإجارة لأن ذلك تملك لا يبيع حقيقة ولذا قالوا إن الإجارة يبيع المنفعة

حکماً ای أن فیہا حکم البیع وهو التملیک لا حقیقة (رد المحتار ۵۰۵)۔

ب۔ دین:

دین پر مال کا اطلاق نہ ہوگا اس لئے کہ دین کی رقم دین کے ذمہ واجب الادا ہوتی ہے جس کا خارج میں مادی وجود نہیں ہوتا۔ ذریعہ ذیل عبارت اس پر شاہد عدل ہے:

”وإذا حلف إنسان أنه لا مال له ولم یکن له إلا دیون لا یعتبر حائشاً“ (الدر المختار: کتاب الایمان ۳۰۱۲۸)۔

ج۔ اسی طرح حقوق مجردہ پر مال کا اطلاق نہ ہوگا جیسے حق تعلی، حق شفیع، حق مرور وغیرہ۔

۱۔ حق تعلی

حق تعلی کے بارے میں علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ”وإذا كان السفل لرجل وعلوه لآخر فسقطا أو سقط العلو وحده فباع صاحب العلو علوه لم یجز لأن المبیع حیثئذ لیس إلا حق التعلی، وحق التعلی لیس بمال لأن المال عین یسکن إحرازها وإساکها ولا هو حق متعلق بالمال بل هو حق متعلق بالهواء و لیس الهواء ما لا یباع“ (رد المحتار ۵۰۵۲ بحوالہ فتح القدیر)۔

۲۔ حق شفیع:

اسی طرح حق شفیع پر بھی مال کا اطلاق نہ ہوگا۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں: ”وان صالح من شفیع علی عوض بطلت الشفیعة ورد العوض لأن حق الشفیعة لیس بحق متقرر فی المحل بل مجرد حق التملک فلا یصح الاعتیاض عنه“ (فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی ۳۶۰)۔

”قال فی العنایة: حق الشفیعة حق أنه یتملک و ذلك لیس بحق فی المحل قبل التملک فأخذ البذل فی مقابلة ما لیس بشیء ثابت فی المحل و ذلك رشوة و حرام“ (عنایہ)۔

۳۔ حق مرور:

اسی طرح حق مرور پر بھی مال کا اطلاق نہیں ہوگا:

”وإذا كان لرجل ظلة علی طریق أو میزابه فخاصمه رجل وأراد أن یطره فصالحه علی مال فهذا لا یخلو من وجهین، إما أن یتكون الطريق نافذاً وأما أن لا یتكون نافذاً، فإذا كان نافذاً فخاصمه رجل من المسلمین وأراد طرعه فصالحه علی مال فالصلح باطل لأن ربة الطريق النافذ لا تكون ملكاً لأحد من المسلمین وإنما لهم حق المرور وإنه لیس بحق ثابت فی ربة الطريق بل هو عبارة عن ولاية المرور وإنه صفة المار فلا یجوز الصلح عنه“ (بدائع الصنائع ۶۰۲۹۶)۔

منفعت:

منفعت کی بحث بہت ہی دلچسپ اور معرکہ الآرا بحث ہے۔ فقہاء احناف منفعت پر مال کا اطلاق نہیں کرتے ہیں، کیونکہ منفعت کوئی ایسی مادی شے نہیں جس کا خارج میں وجود ہو، بلکہ یہ ایک غیر مادی شے ہے جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج انسان کو حاصل ہوتی ہے (بدائع الصنائع ۱۳۵۷)۔ اس لئے فقہاء احناف منفعت کو ملک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے اس جگہ میری کوشش ہوگی کہ ملک کے مفہوم کو فقہاء احناف کے اقوال کی روشنی میں متعین کیا جائے۔

اس سلسلہ میں ملک کی متعدد تعریفیں ملتی ہیں۔ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں:

۱۔ الملک قدرة یثبتها الشارع ابتداءً علی التصرف إلا لمانع (الاشباه والنظائر ۲۰۵)۔  
(ملکیت تصرف کر سکنے کا اختیار ہے جس کا منفع شارع کا اذن ہے الا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو)۔

علامہ عبدالنبی احمد نگری فرماتے ہیں:

ب۔ الملک اتصال شرعی بین الإنسان و بین شیء یکون سبباً لتصرفه و مانعاً عن تصرف غیره (جامع العلوم المعروف بدستور العلماء ۳۰۲۲)۔

علامہ مصطفیٰ الزرقاء شامی فرماتے ہیں:

ج۔ الملک هو اختصاص حاجز شرعاً یسوغ لصاحبه التصرف إلا لمانع (المدخل الفقہی العام ۲۰۲۳)۔

(ملکیت اس طرح مخصوص کر لینے کا نام ہے جو شریعت کی رو سے تصرف غیر سے محفوظ کر دے، ایسا کرنے والا خود تصرف کا مجاز ہوتا ہے الا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو)۔

درج بالا تعریفات کے مطابق ملکیت کا اطلاق ”اعیان“، ”منافع“ اور ”حقوق“ پر یکساں ہوگا۔ اس لئے کہ ان تینوں چیزوں پر شریعت نے انسان کو تصرف کا اختیار دیا ہے الا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو۔

اسی طرح ”اعیان“ پر ”مال“ اور ”ملکیت“ دونوں کا اطلاق ہوگا، کیونکہ اعیان کا مادی خارجی وجود بھی ہے اور اس پر شریعت نے انسان کو تصرف کا اختیار بھی دیا ہے۔

اور ”منافع“ اور ”حقوق“ پر ملکیت کا اطلاق ہوگا مال کا اطلاق نہ ہوگا، کیونکہ ان کا خارجی مادی وجود نہیں ہوتا۔ ہاں شریعت نے ان پر انسان کو تصرف کا اختیار دیا ہے۔ اس اصول کی بنا پر منفعت اور حقوق کی بیع جائز نہ ہوگی۔

کیا منفعت پر مال کا اطلاق کیا جاسکتا ہے؟

اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ فقہاء احناف کے اقوال کی روشنی میں منافع پر مال کا اطلاق کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں متقدمین احناف کے نزدیک صرف عقد اجارہ کی حد تک منفعت پر اعیان کا اطلاق ہوگا۔ اس لئے کہ عقد اجارہ خلاف قیاس ثابت ہے، اور جو چیز خلاف قیاس ثابت ہوتی ہے اس پر دوسری چیز کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ”ان ما ورد علی خلاف القیاس فغیرہ لا یقاس علیہ“۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

”الإجارة جائزة عند عامة العلماء وقال أبو بكر ابن الأصم أنها لا تجوز والقياس ما قاله لأن الإجارة بیع المنفعة والمنافع للحال معدومة والمعدوم لا یحتمل البیع فلا یجوز إضافة البیع إلى ما یؤخذ فی المستقبل“ (بدائع الصنائع ۴۰۱۴۳)۔

اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قیاس کی روشنی میں عقد اجارہ کے جواز کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقد اجارہ میں منفعت عقد اجارہ کے وقت معدوم ہے اور شے معدوم کی بیع جائز نہیں، اور چونکہ منفعت پر مال کا اطلاق درست نہیں اس لئے بھی عقد اجارہ جائز نہ ہوگا۔ یعنی عدم وجود منفعت وقت عقد اجارہ اور عدم مالیت دو چیزیں ایسی ہیں جن کی بنا پر قیاساً عقد اجارہ کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ کاسانی نے فرمایا: ”فاذن لا سبیل إلى تجویزها لا باعتبار الحال ولا باعتبار المال“ (ایضاً)۔

لیکن اس کے باوجود عقد اجارہ مشروع ہے۔ امام ابو یزید عبداللہ بن عمرو بوسی فرماتے ہیں:

”الأصل عند الامام الشافعی أن المنافع بمنزلة الأعیان القائمة وعندنا بمنزلة الأعیان فی حق جواز العقد علیها لا غیر، ای عقد الإجارة“ (تاسیس النظر ۶۲)۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ مصطفیٰ الزرقاء فرماتے ہیں: ”إن المنافع لیست ذات قيمة فی نفسها و إنما ورد تقویمها بعقد



الإجارة على خلاف القياس للحاجة“ (المدخل الفقهي العام ۲۰۵)۔

اس نظریہ کی بنیاد پر شیئ منصوب کے منافع کے ضمان اور عدم ضمان کا ایک اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک شیئ منصوب کے منافع کے اجر مثل کا غاصب ضامن نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ مال مستقوم نہیں ہے (صرف عقد اجارہ اس کی استثنائی شکل ہے) اور غاصب اور منصوب منہ کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے (دیکھئے: تاسیس النظر للددبوسی ۶۲)۔

متاخرین احناف اور منفعت پر اعیان کے اطلاق کی گنجائش:

لیکن متاخرین احناف نے اس قاعدہ کو علی الاطلاق تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ اس قاعدہ کو نبھانے کی شکل میں بعض ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جن کی تلافی کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی کہ اس قاعدہ کے اطلاق کو محدود کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ شیئ منصوب کے منافع کے اجر مثل کا غاصب ضامن نہ ہوگا، مگر درج ذیل صورتوں میں غاصب ضامن ہوگا۔ جبکہ وہ ”مال یتیم“ ہو یا ”موقوفہ جائیداد“ ہو یا ”وہ اموال جو نفع اندوزی کے لئے مخصوص ہوں“۔ اب ان چیزوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی شکل میں غاصب اجر مثل کا ضامن ہوگا (مجلد الاحکام ۵۹۶، المدخل الفقہی العام للرزق ۲۰۹)۔

گویا ان تین استثنائی شکلوں میں متاخرین احناف کے نزدیک منافع، اعیان کی طرح مال مستقوم مضمون بالغصب ہیں۔ اس نظیر سے منافع پر اعیان کے اطلاق کے دائرہ کو وسیع کرنے کی گنجائش فراہم ہوتی ہے۔

عیین کو منفعت کے قائم مقام سمجھ کر اجارہ کی گنجائش:

علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع (۱۷۵/۳) میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اجارہ نام ہے منفعت کی بیع کا تو اعیان کا استجارہ جائز نہ ہوگا۔ اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ دایہ کا استجارہ جائز ہے، حالانکہ وہ استجارہ علی العین ہے تو اس کے جواز کی کیا دلیل ہوگی؟ اس سلسلہ میں امام محمد اور مشائخ حنفیہ نے اس کے جواز کی علیحدہ علیحدہ دلیلیں دی ہیں۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ اصل معقود علیہ خدمت ہے جو منفعت ہے اور لبن تابع ہے اس لئے اس پر استجارہ علی العین کا شبہ وارد نہیں ہوتا۔ لیکن امام محمد کی توجیہ کے مقابلہ میں مشائخ حنفیہ کی یہ بات زیادہ دل کو لگتی ہے کہ اصل معقود علیہ لبن ہی ہے کیونکہ لبن پر ہی بچہ کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ بچہ کی خدمت تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے لیکن یہاں پر عین (لبن) کو منفعت کے قائم مقام سمجھ کر اجارہ کیا گیا تو گویا استجارہ علی المنفعة ہوا۔

اس لمبی گفتگو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ضرورتاً عین پر بھی منفعت کا اطلاق ہو سکتا ہے، اور اس طرح یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ منفعت کو بھی ضرورتاً عین کا حکم دیا جاسکتا ہے جیسا کہ متاخرین احناف نے استثنائی شکلوں میں منفعت کو عین کا حکم دیا ہے۔

منفعت غیر حنفی مذاہب فقہیہ کی روشنی میں:

شوافع، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک منفعت کی بیع جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک منافع اعیان کی طرح ہیں: قال الشافعی إن الإجارة لا تفسخ بالأعذار لأن المنافع بمنزلة الأعيان القائمة ولو باء عينا ليس له أن ينقض البيع بالعدر فكذلك هنا (تاسیس النظر للددبوسی ۶۲)۔

وقال الامام الشافعی رضی اللہ عنہ لا یقع اسم مال إلا علی مالہ قيمة یباع بها وإلا یلزم متلفه وإن قلت وما لا یطرحة الناس مثل الغلس وما أشبه ذلك (الاشباه والنظائر للسیوطی ۲۵۸)۔

ابن القاسم الغزلی بیع کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: أنه تمليك عين مالیه بمعاوضة یاذن شرعی أو تمليك منفعة مباحة علی التأیید بضمن مالی (حاشیة الباجوری علی شرح الغزلی ۲۲۰)۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں: البیع تمليك عين أو منفعة علی التأیید بعوض مالی (الغایة القسوی ۱۰۲۵۵)۔

اسی طرح پانی کی گذرگاہ اور چھت پر حق تعمیر کو بھی قابل فروخت اشیاء میں شمار کیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ فقہاء شافعیہ کے نزدیک بیع کے لئے فروخت کی

جانے والی شے کا مادی اور اعیان میں سے ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ منافع بھی محل بیع ہو سکتے ہیں یعنی منافع اعیان کی طرح ہیں۔

فقہاء حنابلہ بھی اعیان اور منافع دونوں کے مبادلہ کو بیع قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دوسرے کی مملوکہ اراضی میں گزرگاہ بنانا، دروازہ کھولنا یا کسی شخص کا اپنے مکان کی چھت پر مکان تعمیر کرنے کا حق فروخت کرنا وغیرہ ایسی چیزوں کو بیع قرار دیا گیا ہے (کشاف القناع علیہ سبوتی ۳۹۱/۳)۔

اسی طرح فقہیہ مرداوی نے لکھا ہے کہ بیع میں عین یا منفعت کا تبادلہ اس طرح ہو کہ وہ مؤبدہ ہو (الانصاف ۲۶۰/۳)۔

مالکیہ نے بیع کی تعریف میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بیع کو مادی اشیاء کے ساتھ خاص کرتے ہیں اگرچہ وہ بھی حق تعالیٰ وغیرہ کی بیع کو جائز کہتے ہیں، اور زرقانی نے شرح مؤطا میں بیع کی تین قسمیں بیان کی ہیں: بیع عین، بیع دین اور بیع منفعت، مالکیہ کی ان تصریحات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی منافع مؤبدہ کو محل بیع قرار دیتے ہیں (ائمہ ثلاثہ کے آراء سوال نامہ سے ماخوذ ہیں)۔

گذشتہ تفصیلات کی روشنی میں ائمہ ثلاثہ اور متاخرین احناف کے نقطہ نظر میں اس بات میں واضح طور پر یکسانیت معلوم ہوتی ہے کہ ائمہ ثلاثہ اور متاخرین احناف دونوں منافع کو اعیان کے مماثل قرار دیتے ہیں، صرف فرق یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے یہاں یہ دائرہ وسیع ہے اور متاخرین احناف کے یہاں محدود۔ اور جس طرح متاخرین احناف نے حالات کے پیش نظر منافع پر اعیان کے اطلاق میں وسعت پیدا کی ہے اسی طرح آج زمانہ کے حالات کے پیش نظر اس نظیر سے مزید اس بات کی گنجائش فراہم ہوتی ہے کہ منافع پر اعیان کے اطلاق کو وسیع تر کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ کے اس نقطہ نظر میں کہ منافع اعیان کی طرح ہیں، اور متاخرین احناف کے اس نقطہ نظر میں کہ منافع اعیان کی طرح تو نہیں ہیں لیکن حالات کے پیش نظر بعض منافع کو اعیان کا حکم دیا جاسکتا ہے، صرف لفظی فرق ہے، معنوی اعتبار سے دونوں نقطہ نظر میں یکسانیت ہے۔

اس وضاحت کے بعد ایک اور اہم مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ بیع کی تعریف میں مال کی شرط جوہری شرط ہے یا غیر ضروری؟ تو اس سلسلہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ مال کی شرط بیع کی تعریف میں ضروری اور جوہری ہے۔

اس نقطہ نظر کے مطابق بیع میں مال کی شرط جوہری اور ضروری قرار دینے کے بعد کیا مال کا اطلاق صرف اعیان پر ہوگا یا غیر اعیان پر بھی اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے؟ تو میرے نزدیک گذشتہ بحث و تحقیق کی روشنی میں غیر اعیان پر مال کے اطلاق کی گنجائش ہے۔

یہ سوال کہ کیا شریعت اور لغت نے مال کی حقیقت متعین کر دی ہے؟ تو اس سلسلہ میں میرا اپنا نقطہ نظر یہ ہے کہ شریعت یا لغت نے مال کی حقیقت متعین نہیں کی ہے بلکہ اس سلسلہ میں شریعت اور لغت نے عرف ہی کا اعتبار کیا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں میں نے تفصیلی طور پر اس کا جائزہ لیا ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لئے کہ مال کی حقیقت شریعت یا لغت نے متعین نہیں کی ہے بلکہ اس کا مدار عرف ہے۔ فقہی ذخیرہ سے صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

مسئلہ یہ ہے کہ شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑے کی بیع جائز ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ سے سوال کیا گیا، آپ نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑے کی بیع جائز نہیں، کیونکہ ان پر مال کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی سوال امام محمد سے کیا گیا تو آپ نے ان دونوں چیزوں کی بیع کی اجازت مرحمت فرمائی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز کو ابوحنیفہ نے ناجائز کہا تھا اسے ان کے شاگرد رشید امام محمد نے کیوں جائز قرار دے دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے زمانے میں اس کی خرید و فروخت کا عرف نہیں تھا جب کہ امام محمد کے زمانہ میں عرف و تعامل بدل گیا، اور لوگوں کے درمیان اس کی خرید و فروخت عام ہو گئی تو آپ نے عرف و تعامل کا اعتبار کرتے ہوئے اس کی اجازت دے دی (دیکھئے: المدخل الفقہی العام ۲/۶۱۳، رد المحتار ۵/۵۱)۔

اس سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ شریعت اور لغت نے مال کی حقیقت متعین نہیں کی ہے بلکہ اس کا دار و مدار عرف پر ہے، علامہ عبدالغنی النابلسی نے جس چیز کی بیع کے بطلان کا فتویٰ دیا تھا۔ علامہ ابن عابدین شامی نے عرف کا اعتبار کرتے ہوئے اس کے جواز کی اجازت دی۔ اسی حقیقت کو فقہاء ائمہ اہل اختلاف عرف و زمان لا اختلاف نظر و برہان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان دونوں مثالوں سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانہ میں مال نہ ہو اور دوسرے زمانہ میں وہ قیمتی چیز سمجھی جانے لگے۔ اس لئے کسی چیز کی مالیت یا عدم مالیت کا اعتبار عرف و تعامل کی روشنی میں کیا جائے گا اور کسی عام قاعدہ کے تحت مال کی حیثیت متعین کرنا فقہاء ائمہ اہل اصول "عرف"

سلسلہ جدید فقہی مباحث جلد نمبر ۹ / حقوق کی خرید و فروخت  
کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہوگا، کیونکہ یہ ایک نازک مسئلہ ہے جس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

حقوق:

حق کے حقیقی مفہوم کی توضیح کے لئے لغت، قرآن پاک، احادیث نبویہ اور فقہاء امت کے اقوال کا ایک مختصر جائزہ پیش ہے:

صاحب قاموس المحیط لکھتے ہیں: الحق من أسماء الله تعالى أو من صفاته، والقرآن وضد الباطل والأمر المقضي، والعدل والإسلام والمال والملك والموجود الثابت والصدق، وحق يحق حقة: وجب ووقع بلا شك، والجمع حُق وحقوق وحُقُق (القاموس المحيط للفيروز آبادي ۲، ۲۲۱ فصل الحاء باب القاف)۔

قرآن کریم میں لفظ ”حق“ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے جس کی تعداد تقریباً تین سو تک پہنچتی ہے۔ لیکن ہر جگہ تقریباً لغوی ہی معنی میں استعمال ہوا ہے، ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ارشاد خداوندی ہے: إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ (یونس: ۹۶)۔

وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعُ دَابِرَ الْكَافِرِينَ (الانفال: ۷)۔

اسی طرح احادیث نبویہ میں بھی حق لغوی ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

عن شرحبیل بن مسلم قال سمعت أبا أمامة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول إن الله أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث (ابوداؤد: كتاب الوصايا؛ باب ما جاء في الوصية لوارث)۔

(شرحبیل بن مسلم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ابوامامہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے ہر حقدار کے لئے اس کا حق مقرر کر دیا ہے۔ لہذا کسی وارث کے حق میں وصیت نہ کی جائے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: عن فاطمة بنت قيس قالت: سمعت النبي ﷺ يقول إن في أموالكم حقا سوى الزكوة وجاء في بعض الروايات إن في المال حقا سوى الزكوة (مسند الدارمی: كتاب الزكاة، ترمذی: كتاب الزكاة؛ باب ما جاء أن في الأموال حقا سوى الزكوة)۔ (فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تمہارے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے)۔

احادیث نبویہ کے مطالعہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ حق کا استعمال لغوی مفہوم ہی میں کیا گیا ہے اور ہمیں حق کے شرعی مفہوم کی ضرورت ہے اس لئے فقہاء کرام کے اقوال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

حق کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔

علامہ مصطفیٰ زرقاء حق کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الحق هو اختصاص يقرر به الشرع سلطة أو تكليفاً (المدخل الفقهي العام ۳، ۱۰)۔

(حق ایک خصوصی تعلق کا نام ہے جس کی وجہ سے شریعت کسی اختیار یا ذمہ داری کو تسلیم کرتی ہے)۔

شیخ علی خفیف مصری نے حق کی تعریف یوں کی ہے:

الحق هو مصلحة مستحقة شرعاً (كتاب الحق والذمة ۲، المدخل ۳، ۱۰)۔

حق کی بنیادی دو قسمیں ہیں: مالی اور غیر مالی۔



حق مالی:..... حق مالی کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق جو مال سے متعلق ہو جیسے اعیان، دیون اور منافع کی ملکیت۔

حق غیر مالی:..... ایسا حق جس کا تعلق مال سے نہ ہو جیسے صیغہ پرولی کے تصرف کا حق، یا بنیادی حقوق جیسے انتخاب کا حق، آزادی کا حق۔ اسی طرح حق مالی کی دو اہم قسمیں ہیں: حق شخصی اور حق عینی۔

حق شخصی:..... حق شخصی وہ قانونی ربط ہے جو دو شخصوں کے درمیان ہو جس کی بنیاد پر ایک شخص (فریق اول) دوسرے شخص (فریق ثانی) کے سلسلہ میں مکلف ہو، جس کی رو سے وہ ہر ایسے تصرف سے احتراز کرنے کا پابند ہوگا جو فریق ثانی کے مفاد کے خلاف ہو۔ جیسے بائع اور مشتری کے حقوق ایک دوسرے پر ثمن اور بیع کے سلسلہ میں، مشتری کے ذمہ ثمن کی ادائیگی اور بائع کے ذمہ تسلیم بیع ضروری ہے۔

حق عینی:..... حق عینی وہ حق ہے جس کا تعلق اعیان سے ہو اس طور پر کہ شے معین پر اسے تصرف کا پورا اختیار ہو، جیسے حق ملکیت اور حق ارتفاق وغیرہ۔

الف۔ حق ملکیت:

حق ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ قانوناً مالک کو اپنی ملکیت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ تصرف کا اختیار رہتا ہے اور دوسرے شخص کے وجود پر اس تصرف کا انحصار نہیں ہوتا۔

ب۔ حق ارتفاق

حق ارتفاق کسی غیر منقولہ جائداد پر دوسرے شخص کی غیر منقولہ جائداد کے فائدہ کے لئے ایک مقرر حق کا نام ہے۔

فقہاء احناف نے ان حقوق کی پانچ قسمیں کی ہیں، لیکن مالکیہ کے نزدیک حقوق ارتفاق غیر محصور ہیں، اور اس کا تعلق انسان کے ارادہ اور التزامات سے ہے۔

۱۔ حق شرب:..... پانی کی جو نہریں کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں ہوں ان سے دوسرے افراد کو خود پانی پینے اور اپنے جانوروں کو پلانے کا حق حاصل ہے، البتہ چھوٹے چھوٹے چشموں، حوضوں، اور کنوؤں سے دوسرے افراد کو خود پانی پینے کا حق تو حاصل ہے لیکن جانوروں کو پانی پلانے کا حق نہیں (الاموال و نظریہ العقد فی الفقہ الاسلامی: یوسف موسیٰ/ ۷۴، نیز اسلام کا نظریہ ملکیت/ ۲۸۷)۔

۲۔ حق مجری:..... اس کا مطلب ہے دوسرے کی مملو کہ زمین پر سے پانی کی نالی گزارنے کا حق، اگر کسی کا کھیت پانی کے ذخیرہ، تالاب، نہر یا دریا سے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کھیت تک پانی پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے دوسرے کی مملو کہ زمین پر سے گزارا جائے تو اس فرد کو ایسا کرنے کا حق ہوگا (ملاحظہ ہو: موطا امام مالک: باب القضاء فی الفرق؛ باب الشرب و قسمۃ الماء، و کتاب الخراج: یحییٰ بن آدم القرشی/ ۱۱۲)۔

۳۔ حق سیل:..... گھروں کا گندہ پانی یا بارش کا پانی باہر بہانے کے حق کو حق سیل (بہنے کی جگہ کا حق) کہتے ہیں (اسلام کا نظریہ ملکیت/ ۲۸۸)۔

۴۔ حق مرور:..... حق مرور، اگر ایک شخص کے اپنے مکان یا زمین تک پہنچنے کا راستہ دوسرے فرد کی زمین سے ہو کر گذرتا ہے تو اس دوسرے فرد کو یہ حق نہیں کہ اس کو اپنی زمین پر سے گذرنے سے روک دے، اس اصول کا اطلاق اسی صورت میں ہوتا ہے جب کوئی متبادل راستہ نہ ہو (مرشد الخیر ان رقدری پاشا، دفعہ: ۳۹، نیز اسلام کا نظریہ ملکیت)۔

۵۔ حق جوار:

وہ پڑوسی جس کا مکان کسی دوسرے فرد کے مکان سے متصل واقع ہو، اس فرد پر یہ حق رکھتا ہے کہ وہ خود اپنی ملکیت میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو پڑوسی کے حق میں ضرر فاحش ہو، اس کے علاوہ اسے پڑوسی کو اپنے مملو کہ مکان سے ایسے فائدے اٹھانے سے نہیں روکنا چاہیے جن سے خود اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہو۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لا یمنعن جار جارہ ان ینخرز خشبہ فی جدارہ (بخاری: ابواب المظالم والقصاص)۔

حق مال کی تقسیم کے ضمن میں یہ بات اوپر آچکی ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں: حق شخصی اور حق عینی، لیکن حق مال کی بحث کے ضمن میں بعض ایسی چیزیں آتی ہیں جن پر نہ حق شخصی کی تعریف صادق آتی ہے اور نہ اس پر حق عینی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، جیسے حق تالیف و تصنیف، حق ایجاد و اختراع، حق طبع و نشر۔

مال پر بحث کے ضمن میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منفعہ پر ائمہ ثلاثہ مال کا اطلاق کرتے ہیں اور متاخرین احناف کے نزدیک منفعہ پر مال کے اطلاق کی گنجائش ہے جیسا کہ متاخرین نے ”مال یتیم“، ”موقوفہ جائداد“ اور ”نفع اندوزی کے لئے مخصوص مال“ کے منافع کے مضمون بالغصب کی استثنائی شکلوں میں مال کے لئے عینیت کی شرط کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح علامہ کاسانی نے وصیت بالمال کے ضمن میں منفعہ پر مال کا اطلاق کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

والمال قد یکون عیناً وقد یکون منفعة (البدائع للکاسانی ۴۰۳۸۵)۔ (مال کبھی عین ہوتا ہے اور کبھی منفعہ)

علامہ کاسانی کی عبارت سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کو بھی مال کے لئے عینیت کی شرط پر چنداں اصرار نہیں ہے۔

گویا مال کے لئے عرف کی شرط ہی اہم شرط ہے، اس لئے میرے نزدیک حقوق کی بیع جائز ہوگی، یا تو اس لئے کہ عرف میں حق کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یا اس لئے کہ منفعہ پر مال کا اطلاق درست ہے اور حق بھی ایک قسم کی منفعہ ہے۔

ترکی خلافت تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے نتیجہ میں جب اس قسم کے مسائل سے دوچار ہوئی تو اس نے ۱۵ جمادی الآخرہ ۱۳۲۲ھ کو قانون پاس کیا ہے۔

إن کل ما تعورف تداوله من أعیان و منافع و حقوق یعتبر محلاً صالحاً للتعاقد علیہ ککل مال متقوم و كذلك الأشياء التي ستوجد (المدخل الفقہی العام ۲۰۷۱۲)۔

درج بالا عبارت مطلق ہے، اس لئے اس کو درج ذیل عبارت سے مقید کیا جانا ضروری ہے: وأن لا یخالف العرف نصاً ولا إجماعاً (اور ضروری ہے کہ عرف نص اور اجماع کے خلاف نہ ہو)۔

اس لئے میری اپنی ذاتی رائے میں ہر وہ حق جس کی بیع و شراء کا رواج ہو، اور وہ عرف نص اور اجماع کے خلاف نہ ہو اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی۔

☆☆☆

## حقوق کی خرید و فروخت

مولانا جنید عالم ندوی قاسمی

آج بڑی تیزی کے ساتھ حالات بدل رہے ہیں اور وقت کروٹیں لے رہا ہے۔ زمانہ کی اس تیز رفتاری، لوگوں کی تجدید پسندی اور مادی ترقیات سے نئے نئے مسائل کھڑے ہو رہے ہیں۔ خصوصاً معاملات میں، بیع و شراء، آپسی لین دین اور خرید و فروخت ایک ایسا اہم اور وسیع ترین باب ہے جس کا دائرہ کار کبھی محدود نہیں ہوا، جس کا نتیجہ ہے کہ فقہ اسلامی کا یہ اہم ترین باب حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقیات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے اور جن چیزوں کو ہمارے فقہاء کرام نے اب تک مال سے خارج قرار دے کر اس کی بیع و شراء کو ناجائز قرار دیا تھا ان اشیاء کی بیع آج کثرت سے ہو رہی ہے، اور حالات کے پیش نظر ان کی خرید و فروخت لوگوں کی مجبوری اور ضرورت بن گئی ہے۔ جن چیزوں کو لوگ مال نہیں سمجھتے تھے آج مال سمجھ کر ان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ مٹی، ریت، حق تصنیف، مکان کے اوپر کے حصہ کا فروخت کرنا وغیرہ، یہ اور اس قسم کی بہت ساری چیزوں اور حقوق کی خرید و فروخت بہت کثرت سے ہو رہی ہے، جو لوگوں کی ضرورت بن گئی ہے تو کیا کتاب و سنت کی روشنی میں ان اشیاء کی بیع کے جواز کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

آج کے اس تیسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء کا ایک موضوع ”حقوق کی بیع“ ہے، جو اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی اور ان موجودہ اہم مسائل کا ایک نازک ترین باب ہے، جس میں چند باتیں قابل ذکر اور لائق بحث ہیں:

- ۱۔ بیع کی حقیقت کیا ہے؟
  - ۲۔ مال کسے کہتے ہیں؟
  - ۳۔ مال کی تعریف میں قابل اذکار ہونے کی شرط ہے یا نہیں؟
  - ۴۔ کسی چیز کے مال ہونے میں عرف اور تعامل ناس کا کوئی دخل ہے یا نہیں؟
  - ۵۔ حقوق کی بیع جائز ہے یا نہیں؟
  - ۶۔ اگر جائز ہے تو کس قسم کے حقوق کی؟
  - ۷۔ اگر ناجائز ہے تو متعینہ رقم لے کر اپنے حق سے دست برداری پر مصالحت کر سکتے ہیں یا نہیں؟
- یہ چند سوالات ہیں جن پر انشاء اللہ تعالیٰ قدرے تفصیل سے بحث ہوگی۔

### شواہح کے نزدیک بیع کی تعریف:

حضرات شواہح کے نزدیک بیع کا مادی شئی اور اعیان میں سے ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ منافع بھی محل بیع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علامہ قاضی بیضاوی نے الغایۃ القصویٰ میں لکھا ہے: البیع تملیک عین أو منفعة علی تأیید بعوض مالی (الغایۃ القصویٰ ۱۰۲۵۵)۔

(کسی مال کے عوض کسی عین یا منفعت کا ہمیشہ کے لئے مالک بنادینا بیع کہلاتا ہے)۔

علامہ ابن حجر پیشی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفۃ المحتاج علی شرح المنہاج میں بیع کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے: عقد یتضمن مقابله مال بمال



بشرطہ الآتی لاستفادة ملكت عين أو منفعة مؤبدة (تحفة المحتاج علی شرح المنهاج ۲۰۲۱۵)۔

(بیع ایک ایسا عقد ہے جس میں مال کا تبادلہ مال سے ہو، آنے والی شرطوں کے ساتھ، تاکہ کسی عین یا دائمی منفعت کی ملکیت حاصل ہو جائے)۔

صاحب تحفة المحتاج کی مذکورہ تعریف پر چند اعتراضات کرنے کے بعد اس کے محشی شیخ عبدالحمید شروانی بیع کی تعریف کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد سلم من هذه الإيرادات قول بعضهم عقد معاوضة مالية تفيد ملكة عين أو منفعة على التأييد (حواشی الشروانی علی تحفة المحتاج ۲۰۲۱۵)۔ (ان اعتراضات کی وجہ سے بعض لوگوں کا قول تسلیم کر لیا گیا کہ بیع مالی معاوضہ کا عقد ہے جو کسی متعین مادی شئی یا دائمی منفعت کی ملکیت کا فائدہ دے)۔

حاصل یہ ٹھہرا کہ شوافع کے نزدیک بیع کا مادی شئی اور اعیان میں سے ہونا ضروری نہیں بلکہ منافع کی بیع بھی جائز و درست ہے، اس لئے وہ حقوق کی بیع کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ شروانی نے ابن حجر عسقلانی کے قول ”مؤبدہ“ کے تحت لکھا ہے: كحق الممر إذا عقد عليه بلفظ البيع (ایضاً ۲۰۲۱۵)، جیسے گزرنے کا حق جبکہ اس پر لفظ بیع کے ذریعہ معاملہ طے کیا جائے)۔

ابن حجر تحریر فرماتے ہیں: ”من المنافع شرعاً حق الممر بأرض أو على سطح جاز كما يأتي في الصلح تملكه بالعوض على التأييد بلفظ البيع مع أنه محض منفعة إذ لا تملك به عين للحاجة إليه على التأييد“ (تحفة المحتاج ۲۰۲۲۹)۔ (شرعاً منافع میں سے زمین یا چھت پر سے گزرنے کا حق ہے، عوض لے کر ہمیشہ کے لئے اس کا مالک بنانا جائز ہے، جیسا کہ کتاب الصلح میں آئے گا، جب کہ لفظ بیع کے ذریعہ معاملہ طے کیا جائے باوجودیکہ یہ محض منفعت ہے، کیونکہ بیع کے ذریعہ کسی مادی شئی کا مالک نہیں بنایا جاتا، پھر بھی ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا گیا)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بیوع کے اندر لوگوں کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔

شاطری نے الياقوت النفيس میں بیع کی لغوی اور شرعی تعریف کے بعد لکھا ہے: كما في بيع حق الممر ووضع الأخشاب على الجدار وحق البناء على السطح (الياقوت النفيس في مذهب ابن ادریس ۴۲)۔

جیسا کہ گزرنے، دیوار پر لکڑیاں رکھنے اور چھت پر عمارت بنانے کا حق، کہ اس کی بیع جائز ہے۔

### حنابلہ کے نزدیک بیع کی تعریف:

حضرات حنابلہ بھی حضرات شوافع کی طرح بیع کی تعریف میں مال کی شرط نہیں لگاتے بلکہ منافع کی بیع کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ شیخ منصور بن یونس البہوتی احسنی شرح المنتہی میں بیع کی تعریف ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

مبادلة عين مالية..... أو منفعة مباحة مطلقاً بأن لا تختص بإباحتها بمال دون آخر یا حداهما أي عين مالية أو منفعة مباحة مطلقاً (شرح المنہج علی هامش كشاف القناع عن متن الإقناع ۲۰۲۲۶)۔ (کسی مالیت رکھنے والی شئی یا مطلق مباح منفعت کا تبادلہ کسی دوسری مالیت رکھنے والی شئی یا مطلق مباح منفعت سے) (جس کی اباحت کسی چیز کے ساتھ خاص نہ ہو) بیع کہلاتا ہے)۔

اور چونکہ منافع کی بیع بھی جائز ہے اس لئے آگے فرماتے ہیں: یعنی کسی کتاب کی بیع کتاب سے، یا کتاب کی بیع گھر کے حق مرور سے، یا حق مرور کی بیع کتاب سے، یا کسی دار کے حق مرور کی بیع دوسرے دار کے حق مرور سے جائز ہے (حوالہ سابق)۔

كشاف القناع عن متن الاقناع میں ہے: کسی دوسرے کی ملکیت میں گزرگاہ خریدنا یا کسی کی دیوار میں مخصوص حصہ کا خریدنا تاکہ اس میں دروازہ کھول سکے یا کسی کی زمین میں کنواں کھودنے کے لیے مخصوص حصہ خریدنا، یا کسی کے مکان کے اوپر والے حصہ کو خریدنا تاکہ وہ اپنا مکان بنا سکے یا اس پر لکڑی رکھ سکے، ان سب کی خرید و فروخت جائز ہے۔ بشرطیکہ یہ تمام معلوم و متعین ہوں اور جہالت باقی نہ رہے۔ جائز اس لیے ہے کہ یہ بائع کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت فروخت کرنے کا حق ہے (كشاف القناع عن متن الاقناع)۔

خلاصہ یہ کہ حنابلہ کے نزدیک بھی اعیان کی طرح منافع مال ہیں اور ان کی بیع جائز ہے۔

## مالکیہ کے نزدیک بیع کی تعریف:

مالکیہ کے نزدیک بیع کی سب سے مشہور تعریف وہ ہے جس کو ابن عرفہ نے نقل کی ہے:

عقد معاوضة على غير منافع ولا متعة لذّة۔ (بیع ایک ایسا عقد معاوضہ ہے جو نہ تو منافع پر کیا جائے اور نہ ہی لذت حاصل کرنے کے لئے)۔ ابن عرفہ کی مذکورہ بالا تعریف اور دیگر تعریفات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مالکیہ کے نزدیک بیع کا مادی اشیاء میں سے ہونا ضروری ہے۔ منافع کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن جب ہم مالکیہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مالکیہ کے نزدیک بھی منافع اور حقوق کی بیع جائز ہے۔

چنانچہ زرقانی نے مؤطا کی مشہور شرح میں بیع کی جملہ اقسام میں سے ایک قسم منفعت کی بیع کو بھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو زرقانی کی عبارت:

البيوع جمع بيع، وجمع لا اختلاف أنواعه كبيع العين، وبيع الدين، وبيع المنفعة (شرح الزرقانی علی المؤطا ۲۰۲۵)۔ (بیوع جمع ہے بیع کی، اس کی جمع اس لیے لائی گئی ہے کہ اس کی مختلف قسمیں ہیں جیسے کہ عین کی بیع، دین کی بیع اور منفعت کی بیع)۔

المدونة الكبرى میں ہے، جس میں امام سخون بن سعید تنوخی نے عبدالرحمن بن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کی ہے:

(قلت) رأيت ابن اشتریت طریقا في دار رجل۔ أيجوز هذا في قول مالك (قال) نعم (قلت) وكذلك لو باعه موضع جذوع له من حائطه۔ يحمل عليها جذوعاً له (قال) نعم هو أيضاً قوله إذا وصف الجذوع التي تحمل على الحائط (المدونة الكبرى ۴۰۲۱۸)۔ (امام سخون بن سعید تنوخی نے عبدالرحمن بن القاسم سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے اگر میں کسی شخص کے گھر میں راستہ خریدوں تو کیا یہ امام مالک کے نزدیک جائز ہے، انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، پھر پوچھا کہ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی دیوار کی کڑی کی جگہ فروخت کرے تاکہ خریدنے والا شخص اپنی کڑی اس پر رکھ سکے تو کیا یہ جائز ہے؟ جواب دیا کہ ہاں، یہ بھی امام مالک کا قول ہے بشرطیکہ اس کڑی کا وصف بیان کر دے جو دیوار پر رکھی جائے گی)۔

اسی کے اگلے صفحہ پر ہے: ”میں نے پوچھا کہ آپ کیا فرماتے ہیں اگر کوئی شخص اپنی فضا میں سے دس ذراع کے اوپر کی دس ذراع فضا فروخت کرے تو کیا یہ حضرت امام مالک کے قول کے مطابق جائز ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ میرے نزدیک جائز نہیں ہے، اور نہ ہی امام مالک سے اس کے متعلق کچھ سنا ہے، البتہ اگر اس پر عمارت بنانے کی شرط لگا دے تاکہ اس کے اوپر سے وہ اپنی عمارت بنا سکے تو اس کے خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے پوچھا آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اپنی چھت کے اوپر دس ذراع یا اس سے زائد فروخت کروں جبکہ میری چھت کے اوپر کوئی عمارت نہ ہو تو کیا یہ جائز ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ میرے نزدیک جائز ہے۔“

المدونة الكبرى کی مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ معلوم ہوا کہ مالکیہ کے نزدیک کسی کے مکان کے اندر راستہ خریدنا، کسی کی دیوار سے کڑی رکھنے کی جگہ خریدنا تاکہ اپنی کڑی رکھ سکے۔ فضا کے اوپر کی فضا خریدنا بشرطیکہ تعمیر کی شرط لگا دی ہوتی ہے اس پر اپنے مکان کی تعمیر کر سکے، اسی طرح اپنی چھت کے اوپر کے حصہ کو فروخت کرنا جائز ہے۔

اسی طرح المدونة الكبرى کے اندر یہ بھی ہے کہ امام مالک کے نزدیک حق شرب کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ابن عرفہ نے جن منافع کو بیع کی تعریف سے خارج کیا ہے وہ منافع موقتہ ہیں۔ اور جہاں تک منافع مؤبدہ کا سوال ہے تو اس کی بیع مالکیہ کے نزدیک جائز ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل کے نزدیک بیع کا مادی اشیاء میں سے ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ منافع اور حقوق کی بیع بھی جائز ہے۔ گویا کہ ان حضرات کے نزدیک مال کی شرط جو ہری شرط نہیں ہے۔

## احناف کے نزدیک بیع کی تعریف:

فقہ حنفی کی عام کتابوں میں بیع کی تعریف ”مبادلة المال بالمال“ سے کی گئی ہے۔ البتہ صاحب درمختار علامہ علاء الدین الحسکفی اور صاحب بدائع الصنائع حضرت علامہ کاسانی اور دیگر فقہاء احناف نے بیع کی تعریف ”مبادلة شيء مرغوب فيه بمثلته“ سے کی ہے (درمختار علی الشامی ۴/۳)۔

جس پر حضرت علامہ رشید احمد الطحاوی الحنفی نے حاشیۃ الطحاوی میں نقض کرتے ہوئے صاحب کنز کی تعریف: مبادلة المال بالمال کو اولی قرار دیا



ہے۔ نقض یہ کیا ہے کہ شراب مرغوب فیہ ہے لیکن اس کی بیع کسی مسلم کے لیے جائز نہیں ہے۔ حالانکہ مذکورہ تعریف کے مطابق شراب کی بیع جائز ہونی چاہیے۔ اس وجہ سے حضرت علامہ شامی نے درمختار کی مذکورہ عبارت (مرغوب فیہ) کے تحت یہ صراحت کر دی ہے کہ اس سے مراد بھی مال ہی ہے۔ اور اس سے بھی وہی تعریف مراد ہے جو صاحب کنز اور صاحب ملتقی نے کی ہے۔ چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

أى ما من شأنه أن ترغب إليها النفس وهو المال ولذا احترز به الشارع عن التراب والميتة والدمر فإنها ليست بمال فرجع إلى قول الكنز والملتقى مبادلة المال بالمال (شامی ۴، ۲)۔ ”مرغوب فیہ“ سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور وہ مال ہے، اس وجہ سے شارح نے مٹی، مردار، اور خون سے احتراز کیا ہے اس لئے کہ یہ مال نہیں ہیں، لہذا کنز اور ملتقی کی تعریف مبادلة المال بالمال کو اولیٰ اور اصح قرار دیا اور پسند کیا۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ صاحب کنز نے مبادلة المال بالمال کے ساتھ ”تراضی“ کی قید بھی لگائی ہے، لیکن اس تعریف سے مکرہ کی بیع خارج ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مکرہ کی بیع باطل نہیں ہوتی بلکہ فاسد ہوتی ہے، اور بیع پر قبضہ کے بعد مشتری کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے۔ لہذا بیع کی تعریف اس طرح کی جائے کہ بیوع کی تمام قسموں پر شامل ہو۔ چنانچہ حضرت علامہ شامی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

فلاینما سبب ذکر التراضی فی التعریف (در مختار علی هامش رد المحتار ۴، ۲) یعنی تعریف کے اندر تراضی کا ذکر مناسب نہیں ہے۔ حضرت علامہ ابن نجیم مصری صاحب بحر نے شرح وقایہ اور شرح نقایہ، دونوں کی عبارت نقل کی ہے..... شرح وقایہ میں ہے کہ تراضی کی قید اس لیے نہیں لگائی ہے تاکہ یہ تعریف اس صورت کو بھی شامل ہو جائے جو بغیر تراضی ہوتی ہے، مثلاً مکرہ کی بیع کہ یہ منعقد ہو جاتی ہے۔

صاحب شرح نقایہ اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ جس نے تراضی کی قید لگائی ہے اس نے اس بیع کی تعریف مراد لی ہے جو نافذ ہو اور جس نے تراضی کی قید نہیں لگائی ہے اس نے مطلق بیع کی تعریف مراد لی ہے خواہ وہ نافذ ہو یا غیر نافذ (البحر الرائق ۵، ۲۷۷)۔

شرح نقایہ کے جواب سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ اختلاف لفظی ہے۔ تراضی کی قید ہو یا نہ ہو دونوں طرح صحیح ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس تعریف میں تراضی کی قید نہیں ہے وہ زیادہ عام ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ: احناف کے نزدیک بیع کی تعریف میں مال کی شرط بنیادی اور جوہری شرط ہے۔ البتہ اب سب سے اہم بحث یہ ہے کہ مال کی صحیح تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ اور جب یہ واضح ہو جائے تو حقوق اور منافع کی بیع کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

## مال کی تعریف:

صاحب بحر حضرت علامہ ابن نجیم مصری نے مال کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے: والمال فی اللغة ما ملکتہ من شیء والجمیع أموال کذا فی القاموس، وفي الكشف الكبير المال ما يميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة (البحر الرائق ۵، ۲۷۷)۔

(مال لغت میں وہ شئی ہے جس کا تو مالک بنے، اور اس کی جمع اموال آتی ہے، اسی طرح قاموس میں ہے، اور کشف کبیر میں ہے کہ مال وہ شئی ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور اس کی ذخیرہ اندوزی ممکن ہوتا کہ بوقت ضرورت کام آسکے)۔

علامہ شامی نے بھی بحر کے حوالہ سے مال کی یہی تعریف نقل کی ہے کہ مال وہ شئی ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور وقت ضرورت کے لیے اس کی ذخیرہ اندوزی ممکن ہو۔ علامہ شامی نے مال کی اس تعریف کے بعد تلویح کے حوالہ سے منفعت کو مال سے خارج کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ منفعت بلکہ مال نہیں، اور بلکہ مال میں جوہری فرق یہ بتلایا ہے: لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص، والمال ما من شأنه أن يدخر لانتفاع وقت الحاجة (شامی ۴، ۲)۔ (بلکہ کی حقیقت یہ ہے کہ علی وجہ الاختصاص اس کے اندر تصرف کیا جاسکے۔ اور مال وہ ہے جس کو بوقت ضرورت انتفاع کے لیے ذخیرہ کیا جاسکے)۔

صاحب بحر اور علامہ شامی کی مذکورہ بالا تعریف میں دو بنیادی چیزیں ہیں:

۱۔ جس چیز کی طرف طبیعت کا میلان ہو۔



۲۔ جس کی ذخیرہ اندوزی ممکن ہوتا کہ بوقت ضرورت کام آسکے۔

اس تعریف کی بنیاد پر بہت ساری چیزیں مال سے خارج ہو جاتی ہیں حالانکہ لوگ اس کو مال سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں جیسے سبزیاں مال ہیں۔ فقہاء کے دور میں اس کی خرید و فروخت ہوتی رہی ہے اور کسی نے بھی اس کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار نہیں دیا ہے، جبکہ بوقت ضرورت اس کو ذخیرہ کر لینا ممکن نہیں۔ گرچہ اس ترقی یافتہ دور میں عارضی طور پر کولڈ اسٹورز میں رکھ کر کچھ دنوں تک محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور ایسا ہوتا بھی ہے لیکن زمانہ قدیم میں اس کی ذخیرہ اندوزی ممکن نہیں تھی۔ اسی طرح کڑوی دوائیں مال ہونے کے باوجود اس کی طرف طبیعت کا میلان نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو مال نہیں ہیں، لیکن وہ مال کی تعریف میں داخل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شراب کہ اس کی طرف طبیعت کا میلان بھی ہے اور ذخیرہ اندوزی بھی ممکن ہے لیکن اس کو مال نہیں کہتے۔ اس لیے مذکورہ بالا تعریف میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

شاید اسی وجہ سے صاحب بحر نے حاوی قدسی کے حوالہ سے اور علامہ شامی نے بحرین حاوی القدسی کے حوالہ سے ایک دوسری تعریف نقل کی ہے جو پہلی تعریف سے کچھ واضح ہے: وفي الحاوی القدسی المال اسم لغیر الآدمی، خلق لمصالح الآدمی وأمكن إجرأه والتصرف فيه علی وجه الاختیار (البحر الرائق ۵۰۲۲)۔ (اور حاوی القدسی میں ہے کہ مال نام ہے انسان کے علاوہ کسی دوسری چیز کا جس کی تخلیق مصالح انسانی کے لیے ہو اور اس کو جمع کر لینا ممکن ہو اور اس میں تصرف کا اختیار حاصل ہو)۔

تقریباً یہی تعریف علامہ یوسف قرضاوی نے فقہ الزکوٰۃ اور وہبہ الزبیلی نے الفقہ الاسلامی وادلتہ میں حنفیہ سے نقل کی ہے۔

فعند فقہاء الحنفیة المال ما يمكن حيازته والانتفاء به علی وجه معتاد (فقہ الزکاۃ ۱۰۱۲۵) ومثله فی الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۰۲۰)۔ (اور حنفیہ کے نزدیک مال ہر وہ شئی ہے جس کو جمع کر لینا ممکن ہو اور معتاد طریقہ پر اس سے انتفاع جائز ہو)۔

اس تعریف میں دو بنیادی چیزیں ہیں:

۱۔ اس کو جمع کر لینا ممکن ہو۔ ۲۔ اس سے معتاد طریقہ پر انتفاع جائز ہو۔

اگر جمع کرنا ممکن نہیں مثلاً سورج کی روشنی، یا جمع کرنا ممکن ہے لیکن انتفاع جائز نہیں مثلاً شراب، مردار اور خون، یا جمع کرنا ممکن بھی ہے اور انتفاع جائز بھی ہے لیکن معتاد طریقہ پر نہیں مثلاً ایک دانہ گندم یا ایک گھونٹ پانی، یا لپ بھرٹی، اسی طرح عورت کا دودھ، یہ سب مال نہیں ہیں۔

یہ تعریف پہلی تعریف سے کچھ واضح ہے لیکن اس میں ذخیرہ اندوزی کا مفہوم موجود ہے جس کی وجہ سے سبزی کی بیج پر ہونے والا اشکل یہاں بھی وارد ہو سکتا ہے۔

مال کی سب سے اچھی عمدہ تعریف صاحب بدائع علامہ کاسانی نے کی ہے کہ ہر وہ چیز جس سے انتفاع حقیقہ کیا جاتا ہو اور انتفاع شرعاً جائز ہو وہ مال ہے..... چنانچہ کتے کی بیج کے جواز کی دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اور ہماری دلیل یہ ہے کہ کتا مال ہے، لہذا محل بیع ہے، جیسا کہ شکرہ اور باز، اور اس کے مال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس سے حقیقہ انتفاع کیا جاتا ہے، اور تمام حالات میں شرعاً اس سے انتفاع مباح ہے۔ لہذا مال ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس سے حقیقہ انتفاع کیا جاتا ہے، اور شرعاً اس کے مباح الانتفاع ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس سے شکار کیا جاتا ہے اور تمام مال کی حفاظت کا کام اس سے لیا جاتا ہے لہذا یہ محل بیع قرار پایا“ (بدائع الصنائع ۶/۳۰۰۶)۔

علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع میں متعدد جزئیات نقل کیا ہے جن سے یہ واضح کیا ہے کہ اگر شرعاً انتفاع جائز ہے تو مال ہونے کی وجہ سے بیع بھی جائز ہے، اور اگر شرعاً انتفاع جائز نہیں ہے تو مال نہ ہونے کی وجہ سے بیع بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

”اور پھانڈ کھانے والے جانوروں کے گوشت کی بیع جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے انتفاع شرعاً مباح نہیں ہے، لہذا مال نہیں ہے، اور امام ابوحنیفہ سے یہ مروی ہے کہ جب اس کو (شرعی طور) پر ذبح کر دیا جائے تو اس کی بیع جائز ہوگی، اس لئے کہ ذبح کر دینے کی وجہ سے وہ پاک ہو جائے گا، اور درندے، گدھے اور خچر کی کھال کو اگر شرعی طور پر دباغت دیدی جائے یا ان کو شرعی طور پر ذبح کر دیا جائے تو اس کی بیع جائز ہوگی، اس لیے کہ شرعاً اس سے انتفاع جائز ہے لہذا وہ مال ہے۔ اور اگر دباغت نہ دی جائے یا ان کو ذبح نہ کیا جائے تو اس کی بیع منعقد نہ ہوگی، اس لئے کہ جب دباغت نہ دی جائے اور ذبح نہ کیا جائے تو اس کے اندر مردار کی رطوبتیں باقی رہیں گی، لہذا کھال کا حکم بھی مردار ہی کا حکم ہوگا“ (بدائع الصنائع ۶/۳۰۰۴)۔

چند صفحے کے بعد لکھتے ہیں: ”اور ہاتھی کی بیع بالاجماع جائز ہے اس لیے کہ اس سے حقیقۃً انتفاع ممکن ہے۔ اور ہر حال میں اس سے شرعاً انتفاع جائز ہے لہذا مال ہے، اور سانپ، بچھو اور تمام حشرات الارض مثلاً چھپکلی، گوہ، کچھوا، چوہا اور ان جیسے دوسرے جانوروں کی بیع منعقد نہیں ہوگی، اس لئے کہ ان سے انتفاع شرعاً حرام ہے کیونکہ یہ خیانت میں سے ہیں۔ لہذا مال نہیں ہیں، اور جب مال نہیں تو ان کی بیع جائز نہیں“ (بدائع الصنائع ۶/۳۰۰۸)۔

اس طرح گوہر اور لید کی بیع جائز ہے کیونکہ ہر حال میں ان سے انتفاع شرعاً جائز ہے اس لیے یہ مال ہیں۔ صاحب بدائع الصنائع کی مذکورہ تعریف بہت ہی اچھی اور عمدہ ہے اس سے میں پورے طور پر متفق ہوں، اور میرے نزدیک اس کے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، اس سے مسلمانوں کے بے شمار مسائل حل ہو جائیں گے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ صاحب بدائع کی مذکورہ بالا تعریف کی تائید دیگر فقہاء کرام کی تعریف سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ منصور بن یونس البہوتی الحسنبلی شرح السنہی میں تحریر فرماتے ہیں:

”اور وہ یعنی شرعاً مال ہر وہ شئی ہے جس سے انتفاع تمام حالات میں جائز ہو۔ (اس سے وہ چیزیں نکل گئیں جن میں نفع نہیں جیسے حشرات الارض، اور وہ چیزیں جن میں نفع ہے لیکن حرام ہے۔ جیسے شراب، اسی طرح وہ چیزیں بھی نکل گئیں جو ضرورت کے وقت مباح ہوتی ہیں جیسے مردار) جیسے فخر اور گدھا، اس لئے کہ ہر زمانہ میں لوگ ان دونوں سے نفع اٹھاتے رہے ہیں اور ان دونوں کی بیع کرتے رہے ہیں اور کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمائی“ (شرح السنہی ۲/۴۲)۔

کشاف القناع عن متن الإقناع (۲، ۷) میں بھی مال کی تعریف اس کے ہم معنی کی گئی ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

مال کی تعریف کے سلسلہ میں امام سیوطی نے الاشباہ والنظائر میں حضرت امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ مال ہر وہ شئی ہے جس کی کچھ قیمت ہو، وہ فروخت کی جاتی ہو۔ اور اس کے ضائع کر دینے پر ضمان لازم آتا ہو۔ ملاحظہ ہو الاشباہ کی عبارت:

قال الإمام الشافعي رضي الله عنه لا يقع اسم المال إلا على ما له قيمة يباع بها ويلزم متلفه وإن قلت وما لا يطرحة الناس مثل الفلوس وما أشبه ذلك (الاشباہ والنظائر للسيوطي ۲۵۸)۔ (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مال کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس کی کچھ قیمت ہو جس کے ذریعہ اس کو فروخت کیا جاتا ہو، اور اس کو ضائع کر دینے والے پر ضمان لازم ہو، گرچہ اس کی قیمت کم ہی کیوں نہ ہو، اور جسے لوگ بچینک نہ دیتے ہوں مثلاً پیسہ یا اس جیسی دوسری چیزیں)۔

وہب الزحلی نے حنفیہ کے علاوہ دیگر جمہور فقہاء کے نزدیک مال کی تعریف نقل کی ہے کہ: ”مال ہر وہ شئی ہے جس کی کوئی قیمت ہو، اس کے ضائع کر دینے والے پر ضمان لازم آئے“ (الفقہ الاسلامی وأدلته ۳/۴۲)۔

وہب الزحلی نے اس موقع سے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ حنفیہ منافع اور حقوق محضہ کو مال نہیں سمجھتے ہیں، اور حنفیہ کے علاوہ دیگر جمہور فقہاء اس کو مال مقنوم سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اعیان سے مقصود منافع ہی ہوتے ہیں، خود ذات مقصود نہیں۔ موصوف نے جمہور کی تعریف کو راجح اور قانون، عرف اور لوگوں کے معاملات میں اسی کو معمول بہ قرار دیا ہے (حوالہ سابق)۔

مذکورہ بالا تعریف سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دیگر فقہاء کے نزدیک مال کی تعریف میں ادخار وغیرہ کی شرط ضروری نہیں ہے بلکہ ہر وہ شئی جس کی کچھ قیمت ہے جس کی وجہ سے حقیقۃً انتفاع ممکن ہے اور شرعاً انتفاع جائز ہے وہ مال ہے۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ احناف میں صاحب بدائع الصنائع کی تعریف زیادہ راجح ہے جس کی تائید دیگر فقہاء کرام کی تعریفات سے بھی ہوتی ہے۔

مال ہونے میں عرف کا اعتبار:

یہاں پر ایک اہم اور قابل ذکر بحث یہ ہے کہ آیا کسی چیز کے مال ہونے میں عرف اور تعامل ناس کا دخل ہے یا نہیں؟ ایک چیز جو زمانہ قدیم میں مال نہیں تھی لیکن اب اس کو لوگ مال سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں تو کیا اس کو مال قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس موقع پر یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ عرف اور عادات الناس شریعت اسلامیہ کا ایک ایسا اہم ضابطہ ہے جس پر بے شمار فقہی مسائل کی بنیاد ہے۔



الاشباه والنظائر میں ہے: واعلم ان اعتبار العادة والعرف ترجع إليه في الفقه في مسائل كثيرة حتى جعلوا ذلك أصلاً فقالوا في الأصول باب ما تترك به الحقيقة بدلالة الاستعمال (الاشباه والنظائر لابن نجيم المصري ۱۵۰)۔ (فقہ کے اندر بے شمار مسائل میں عرف و عادت کا اعتبار ہے۔ یہاں تک کہ فقہاء نے اس کو اصل قرار دیا ہے۔ چنانچہ اصول فقہ میں ”باب ما تترك به الحقيقة“ کے تحت فرماتے ہیں کہ دلالت استعمال کی وجہ سے حقیقت چھوڑ دی جاتی ہے)۔

اصول فقہ کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ ”الثابت بالعرف كالثابت بالنص“ (یعنی عرف سے ثابت شدہ چیز کا حکم بھی وہی ہے جو نص سے ثابت شدہ کا ہے)۔ اس اصل اور ضابطہ پر فقہاء نے بے شمار جزئیات متفرع کئے ہیں جن کے احاطہ کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی ممکن۔ صرف تائید کے لیے چند جزئیات نقل کرتا ہوں:

کسی نے کسی کو جو تائیٹیاٹوپنی یا برتن بنانے کا حکم دیا اور اس کی قیمت بھی اس وقت طے پاگئی، اس کو اصطلاح فقہ میں ”استصناع“ کہتے ہیں۔ اس طرح کی بیع کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ بیع معدوم ہونے کی وجہ سے یہ بیع جائز نہ ہو لیکن عرف اور تعامل ناس کی وجہ سے اس قیاس کو ترک کر دیا گیا۔ اسی طرح اجرت دے کر حمام میں داخل ہونا عرف کی وجہ سے جائز ہے۔ حالانکہ اس میں ٹھہرنے اور پانی بہانے کی مقدار معلوم نہیں۔ اسی طرح اجرت دیکر مشکیزہ سے پانی پینا اور پچھنا لگوانا اگرچہ مقدار معلوم نہیں لیکن تعامل کی وجہ سے جائز ہے۔

شمس الائمہ سرخسی نے اس پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں: ”لیکن اس میں تعامل ناس کی وجہ سے قیاس کو ہم نے چھوڑ دیا، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک لوگوں کا تعامل اس پر رہا ہے اور کسی نے کوئی سخت نکیر نہیں فرمائی، اور بغیر کسی سخت نکیر کے لوگوں کا تعامل ایک بہت بڑی اصل ہے، اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان جس چیز کو حسن سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی حسن ہے، نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کسی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی ہے۔ اور یہ نظیر ہے اجرت دے کر حمام میں داخل ہونے کی کہ تعامل ناس کی وجہ سے یہ جائز ہے گرچہ اس میں ٹھہرنے اور پانی بہانے کی مقدار مجہول ہے۔ اسی طرح پیسہ دے کر مشکیزہ سے پانی پینا اور اجرت دے کر پچھنا لگوانا تعامل ناس کی وجہ سے جائز ہے گرچہ اس کی مقدار معلوم نہیں“ (بسوط السرخسی ۱۲/۱۳۸، ۱۳۹)۔

کون سی چیزیں بلا صراحت بیع کے اندر داخل ہوتی ہیں اور کون سی چیزیں داخل نہیں اس سلسلہ میں صاحب تبیین الحقائق ایک ضابطہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ثم الأصل فيه في جنس هذه المسائل أن الشيء إذا كان متصلاً بالمبيع اتصال قرار دخل في المبيع تبعاً وإلا فلا إلا إذا أجرى العرف بالدخول فيه (تبیین الحقائق شرح كنز الدقائق ۴۱۰)۔ (ان جیسے مسائل میں اصل یہ ہے کہ جن چیزوں کا تعلق اصل بیع کے ساتھ پائیدار ہے وہ بیع کے اندر تبعاً داخل ہوں گے، اور اگر تعلق ناپائیدار ہے تو وہ بیع کے اندر تبعاً داخل نہ ہوں گے الا یہ کہ اس میں داخل ہونے کا عرف جاری ہو جائے)۔

صاحب تبیین الحقائق نے متعدد جزئیات نقل کیا ہے جن کے اندر اشیاء کا تعلق اصل بیع کے ساتھ ناپائیدار ہے لیکن عرف کی وجہ سے وہ بھی بلا صراحت اصل بیع کے اندر داخل ہوتی ہیں۔

صاحب تبیین الحقائق نے عرف کے اعتبار کے سلسلہ میں بہت اچھی بات لکھی ہے کہ اگر عرف کے اعتبار سے کسی معاملہ کی تصحیح ہو رہی ہو تو وہاں پر خاص طور سے عرف کا اعتبار ہوگا۔ چنانچہ جہاں پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ کسی شہر میں مختلف سکے رائج ہوں اور نمن مطلق رکھا ہو وہاں پر غالب نقد کا اعتبار ہوگا۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: لأن المعلوم بالعرف كالمعلوم بالنص لاسيما إذا كان فيه تصحيح تصريفه (حوالہ سابق ۴۰۵)۔ (اس لئے کہ وہ چیز جو عرف سے معلوم ہو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے نص سے معلوم ہو خاص طور سے جبکہ اس میں اسکے تصريف کی تصحیح ہو)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ واضح ہو گیا کہ عرف اور تعامل ناس کا شرعاً اعتبار ہے۔ خاص طور سے جبکہ اس کے اعتبار سے کسی معاملہ کی تصحیح ہو، البتہ یہ شرط ہے کہ اس کے خلاف کوئی صریح نص موجود نہ ہو جس میں کوئی سخت نکیر کی گئی ہو۔ لہذا کسی چیز کے مال ہونے اور نہ ہونے میں بھی عرف کا اعتبار ہوگا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز زمانہ قدیم میں مال شمار نہیں ہوتی تھی لیکن آج عرف کی وجہ سے اس کو مال شمار کیا جائے، اور اس کی بیع جائز ہو۔ اس باب میں فقہاء کی عباراتیں بھی صراحتاً موجود ہیں۔

عورت کے دودھ کی بیع کے سلسلہ میں فقہاء احناف اور شوافع کا اختلاف ہے۔ شوافع جواز کے قائل ہیں اور احناف عدم جواز کے۔ صاحب بدائع احناف کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:



”ہماری دلیل یہ ہے کہ عورت کا دودھ مال نہیں ہے اس لیے اس کی بیع جائز نہیں۔ اور اس کے مال نہ ہونے کی دلیل اجماع صحابہ اور معقول ہے۔۔۔۔۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ اس سے ہر حال میں انتفاع شرعاً جائز نہیں ہے بلکہ ایک ضرورت کی وجہ سے جائز ہے اور وہ بچہ کو غذا دینے کی ہے اور جو چیز ضرورت کے علاوہ حرام الانتفاع ہو وہ مال نہیں، جیسا کہ شراب اور خنزیر۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لوگ اس کو مال نہیں سمجھتے ہیں اور وہ کسی بازار میں فروخت بھی نہیں ہوتا۔ جس سے یہ پتہ چلا کہ وہ مال نہیں لہذا اس کی بیع جائز نہیں“ (بدائع الصنائع ۳۰۱/۶)۔

اس کے الفاظ یہ بتلا رہے ہیں کہ کسی چیز کے مال ہونے میں عرف اور تعامل ناس کا بھی دخل ہے۔ اگر لوگ اس کو مال سمجھ کر خرید و فروخت کرتے ہیں تو اس کو شرعاً مال سمجھا جائے گا۔ البحر الرائق اور شامی کی عبارت بھی اس باب میں بہت واضح ہے۔

ملاحظہ ہو ان دونوں کی عبارت: والمالية إنما تثبت بتمول الناس كافة أو بتقوم البعض۔ (البحر الرائق ۵۰۲/۴، شامی ۲۰۲) (اور مالیت ثابت ہوتی ہے تمام لوگوں کے مال سمجھنے یا بعض لوگوں کے متقوم قرار دینے سے)۔

صاحب بحر نے قنیہ کے حوالہ سے متقوم کی تعریف یہ نقل کی ہے: وفي القنية أدنى القيمة التي تشترط لجواز البيع فلس ولو كان كسرة خبز لا يجوز (البحر الرائق ۵۰۲/۸)۔ (اور قنیہ میں ہے کہ متقوم ہر وہ شئی ہے جس کی قیمت کم از کم ایک پیسہ ہو، اگر روٹی کا ایک ٹکڑا ہے تو اس کی بیع جائز نہیں)۔

چونکہ روٹی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی کوئی قیمت نہیں اس لیے وہ مال متقوم نہیں، اور اس کی بیع جائز نہیں۔ اسی وجہ سے فقہاء نے گیہوں کے ایک دانہ، ایک گھونٹ پانی اور لپ بھر مٹی کو مال سے خارج کرتے ہوئے ان کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن فقہاء نے مطلق مٹی کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے اس سے مراد مٹی کی وہ مقدار ہے جس کی کوئی قیمت نہیں، اور اگر اتنی مقدار ہے کہ اس کی کوئی قیمت ہے تو وہ مال متقوم ہے۔ اس کی بیع بلاشبہ جائز ہے۔ چنانچہ جہاں پر صاحب درمختار نے مال کی تعریف کرتے ہوئے مٹی کو مال سے خارج کیا ہے وہیں پر علامہ شامی نے یہ صراحت کر دی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ مٹی کم مقدار میں ہو اور وہ اپنی جگہ میں ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ زیادہ مقدار میں ہو یا کم ہو لیکن اپنی جگہ سے منتقل کر دی جائے تو بسا اوقات وہ مال بن جاتی ہے۔

(قوله فخرج التراب) ای القليل ما دام في محله والا فقد يعرض له بالنقل ما يصير به ما لا معتبراً (أيضاً)۔

(شراح کا قول کہ مٹی مال سے نکل گئی) یعنی جبکہ قلیل ہو اور اپنی جگہ میں ہو، ورنہ منتقل کر دینے کی وجہ سے بعض حالات میں معتبر مال بھی بن جاتی ہے)۔

نیز خالص انسانی گندگی کے ساتھ مٹی مل جائے اور وہ غالب ہو تو اس کی وجہ سے گندگی کی بیع جائز ہو جاتی ہے، تو خالص مٹی جس کی کوئی قیمت ہو اور وہ قابل انتفاع ہو تو پھر اس کی بیع بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی۔ لہذا اس زمانہ میں مٹی اور ریت کی بیع جائز ہے کیونکہ وہ قابل انتفاع ہے اور لوگوں کی ضرورت بن گئی ہے۔

حاصل یہ ٹھہرا کہ احناف کے نزدیک بیع کی تعریف میں مال کی شرط بنیادی شرط ہے، اور مال ہر وہ شئی ہے جس سے انتفاع حقیقہً ممکن ہو اور شرعاً انتفاع جائز ہو۔

اور کسی چیز کے مال ہونے میں عرف اور عادات الناس کا بھی اعتبار ہوگا اور اس کی بیع جائز قرار پائے گی۔ مال کی مذکورہ بالا تعریف اور کسی چیز کے مال ہونے میں عرف و عادات کا اعتبار بہت سے حقوق اور منافع کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک وہ تمام حقوق و منافع مال ہیں اور ان کی بیع جائز ہے جن سے حقیقہً انتفاع کیا جاتا ہے اور شرعاً انتفاع جائز ہے، اور لوگ مال سمجھ کر ان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

## حقوق کی بیع

### حق تصنیف و تالیف کی بیع:

حق تصنیف و تالیف کی بیع کے جواز اور عدم جواز کا مسئلہ اجتہادی اور قیاسی ہے، اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں کے فتاویٰ مختلف نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے وہ اس کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں: ایک تو یہ کہ یہ مباح الاصل اشیاء میں سے ہے۔ اور مباح الاصل اشیاء میں دوسروں کو تصرف سے روکنا جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ غیر مال ہے جس کا فروخت کرنا شرعاً جائز و درست نہیں۔

جن حضرات نے جواز کا فتویٰ دیا ہے ان کے پاس بھی دلائل موجود ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت جب کہ اس مسئلہ میں بلوی ہو چکا ہے، اس لیے مصلحت

کا تقاضہ یہی ہے کہ جواز کا فتویٰ دیا جائے، کسی مسئلہ میں عموم بلوی جبکہ نص کے معارض نہ ہو، اس کے لئے وجہ جواز ہے، اور اس مسئلہ میں کوئی نص معارض نہیں ہے۔ نیز تصنیف و تالیف میں مشغول ہونے والوں کے لیے عام طور پر کوئی دوسرا ذریعہ معاش بھی نہیں ہوتا ہے، اس لیے جس طرح سے فقہاء متاخرین نے حالات کے پیش نظر قرآن و حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح سے اس کو بھی جائز ہونا چاہیے، ورنہ تصنیف و تالیف کا دائرہ محدود و تنگ ہو کر رہ جائے گا۔

### عدم جواز کی دلیل کی تردید:

رہی یہ بات کہ جب یہ مباح الاصل اشیاء میں سے ہے تو دوسرے کو تصرف سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ یہ بات کوئی زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس لیے کہ علامہ شامی نے تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کی ہے کہ مباح چیز کے ساتھ جب کسی کا حق متعلق ہو جائے تو وہ دوسروں کے لیے مباح نہیں رہتی جیسا کہ مسجد میں ہر جگہ ہر شخص کے لیے بیٹھنا مباح ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنا رومال رکھ کر وضو کرنے چلا جائے تو دوسروں کے لیے وہاں بیٹھنا جائز نہیں۔

اسی طرح پیغام پر پیغام دینے کو شریعت نے منع کیا ہے باوجودیکہ ہر مسلمان کیلئے ایک مسلم ہم کفو لڑکی کو پیغام دینے کا حق ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ مال نہیں ہے، تو گو یہ مال نہیں لیکن فی الواقع نفع تو ہے، اور نفع پر معاوضہ لینا جائز ہے۔ جیسا کہ اجارہ میں نفع پر اجرت لی جاتی ہے اور محنت پر بھی معاوضہ لینا جائز ہے۔ جیسا کہ عقد مضاربت میں کہ ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور دوسرے کی محنت، دوسرا شخص اپنی محنت کا معاوضہ لیتا ہے۔

راقم الحروف دوسری رائے (حق تصنیف و تالیف کی بیع کے جواز کی رائے) سے متفق ہے۔ اس کے نزدیک بھی حق تصنیف و تالیف کی بیع جائز ہے۔ حق تصنیف و تالیف ایک ایسا حق ہے جس سے اس زمانہ میں انتفاع ہوتا ہے اور شرعاً اس سے انتفاع جائز بھی ہے۔ نیز لوگ اس زمانہ میں اس کو مال سمجھ کر اس کی خرید و فروخت بھی کرتے ہیں، اس لیے اس پر مال کی تعریف صادق آتی ہے اور اس کی بیع جائز ہے۔

### حق ایجاد کی بیع:

حق ایجاد سے مراد وہ حق ہے جو کسی شخص کو نئی چیز یا کسی چیز کی نئی شکل ایجاد کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ جس شخص نے کوئی نئی چیز یا نئی شکل ایجاد کی، تنہا اس کو اپنی ایجاد کردہ چیز بنانے اور منڈی میں پیش کرنے کا حق ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنے اس حق کو دوسروں کے ہاتھ میں فروخت کر دیتا ہے۔ اس کی خرید و فروخت بڑے بڑے تاجروں کے یہاں عام ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حق کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں بھی وہی تفصیل ہے جو اوپر حق تصنیف و تالیف کی بیع کے سلسلہ میں گذر چکی۔ اگر غور کیا جائے تو اس پر بھی مال کی تعریف صادق آتی ہے۔ کیونکہ اس حق سے حقیقہً انتفاع کیا جاتا ہے۔ اور شرعاً انتفاع جائز بھی ہے۔ نیز یہ حق تاجروں کے نزدیک ایک قیمتی شے بن گیا ہے، عرف میں اس کو مال سمجھ کر اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اور اوپر یہ لکھا جا چکا ہے کہ کسی چیز کے مال ہونے میں عرف کا بھی دخل ہے، لہذا حق ایجاد کی بیع کے سلسلہ میں بھی میری رائے جواز کی ہے۔

### ٹریڈ مارک (تجارتی نام اور تجارتی علامت) کی بیع:

موجودہ دور میں تجارتی مسئلوں میں سب سے اہم مسئلہ تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کی خرید و فروخت کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ تجارتی افراد اپنے تیار کردہ مال پر اپنا نام (ٹریڈ مارک) لگا لگاتے ہیں جس سے یہ پہچانا جاتا ہے کہ فلاں مال فلاں کمپنی یا فلاں شخص کا تیار کردہ ہے۔ بعض تجارتی کمپنیاں مال تیار کرنے میں اپنا ایک مقام اور حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ عمدہ اور اچھا مال تیار کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا تیار کردہ مال زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ بازاروں اور منڈیوں میں جس مال پر ان کمپنیوں کا نام اور ٹریڈ مارک ہوتا ہے اس کی طرف خریداروں کی رغبت اور جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے بنسبت دوسری کمپنیوں کے۔ اس طرح کے ناموں اور ٹریڈ مارکوں کا سرکاری رجسٹریشن بھی ہے جس کی وجہ سے نہ تو کوئی دوسری کمپنی اس ٹریڈ مارک پر کوئی مال تیار کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس پر کوئی کمپنی یا ادارہ کھول سکتا ہے۔ اس سے لوگ بھی دھوکہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اس طرح یہ تجارتی نام اور ٹریڈ مارک تاجروں کے نزدیک ایک قیمتی شے بن گیا ہے، اور اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کی بیع و شراہ جائز ہے یا نہیں؟



تجارتی نام یا ٹریڈ مارک چونکہ مادی اشیاء میں سے نہیں ہے بلکہ ایک حق مجرد ہے، جس کی وجہ سے علامہ شامی وغیرہ نے مال کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق یہ مال سے خارج ہے اور اس کی بیع جائز نہیں۔ لیکن مال کی بحث کے تحت میں نے صاحب بدائع اور احناف کے علاوہ دیگر جمہور علماء کی تعریف کو راجح قرار دیا ہے، اس تعریف کے مطابق اس پر بھی مال کی تعریف صادق آتی ہے، کیونکہ اس حق سے انتفاع حقیقہ کیا جاتا ہے اور شرعاً جائز بھی ہے۔ نیز عرف میں اس کو مال سمجھ کر اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے لہذا اس کی بیع بھی جائز ہے۔

البتہ ایک مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ ٹریڈ مارک کی بیع و شراء میں صارفین کے حق میں دھوکہ اور التباس ہے جو شرعاً حرام ہے۔ دھوکہ اس لیے ہے کہ ممکن ہے کہ ٹریڈ مارک خریدنے والا پہلے کے اعتبار سے گھٹیا مال تیار کرے اور ٹریڈ مارک کی شہرت کی وجہ سے پہلی قیمت پر فروخت کرے۔ اور لوگ تو یہ سمجھ کر اس مال کو خرید لیں گے کہ اس کو تیار کرنے والی فلاں کمپنی ہے۔

اس لیے ٹریڈ مارک کے خریدار کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کے خریدنے کے بعد یہ اعلان کر دے کہ میں نے فلاں ٹریڈ مارک خرید لیا ہے۔ اور اس نام سے جو سامان فلاں فرد یا فلاں کمپنی تیار کرتی تھی اب وہ تیار نہیں کرتی ہے بلکہ اس کا تیار کرنے والا فلاں فرد یا فلاں کمپنی ہے۔ نیز اس کی ذمہ داری یہ بھی ہوگی کہ پہلے کے معیار سے بہتر، یا پہلے کے معیار پر سامان تیار کرے۔

### تجارتی لائسنس کی بیع:

تجارتی لائسنس کی صورت یہ ہے کہ موجودہ دور میں اکثر ممالک حکومتی لائسنس کے بغیر مال درآمد یا برآمد کرنے کی اجازت نہیں دیتے، جس کی وجہ سے تاجر حضرات اپنی تجارت کا لائسنس کراتے ہیں۔ اور بسا اوقات اس لائسنس کو دوسروں کے ہاتھ فروخت بھی کر دیتے ہیں۔ اب یہاں پر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حق کی بیع و شراء جائز ہے یا نہیں؟

چونکہ اس حق سے انتفاع کیا جاتا ہے، اور شرعاً انتفاع جائز بھی ہے، نیز تاجروں کے نزدیک یہ ایک قیمتی شے بن گیا ہے۔ اس لیے راقم الحروف کی رائے اس کی بیع کے جواز کی ہے، بشرطیکہ دیگر کوئی شرعی قباحت لازم نہ آئے۔

نوٹ:- مولانا تقی عثمانی صاحب پاکستان نے اپنے عربی مقالہ میں حق تصنیف و تالیف، حق ایجاد، تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں، اسی طرح تجارتی لائسنس کا سرکاری رجسٹریشن کرانے سے قبل ایک متعین رقم لے کر اپنے حق سے دست برداری کو جائز قرار دیا ہے۔ اور ان کے سرکاری رجسٹریشن کرانے کے بعد عرف کی بنیاد پر ان کو مال کے دائرہ میں شمار کرتے ہوئے ان کی بیع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

### حق تعلی کی بیع:

ہر شخص کو اپنے مکان کی چھت پر عمارت بنانے کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے اس حق کو اصل مکان کے ساتھ فروخت کرتا ہے۔ یا کسی شخص کا دو منزلہ مکان ہے، وہ اوپر والی منزل کو فروخت کرتا ہے تو یہ شرعاً جائز ہے۔ حتیٰ کہ اگر اوپر والی عمارت منہدم ہو جائے تو خریدنے والے کو پہلی عمارت کے مثل دوسری عمارت بنانے کا حق ہے۔ شامی میں ہے:

”اگر اوپر کا مکان نیچے والے کا ہے اور اس نے یہ کہا کہ اس کے اوپر کو تم سے اتنے میں فروخت کیا تو یہ صحیح ہوگا۔ اور نیچے کی چھت نیچے والے کی ہوگی اور مشتری کو حق قرار حاصل ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر اوپر والا مکان منہدم ہو جائے تو اس کو اس پر پہلے کی طرح دوسرا مکان بنانے کا حق ہوگا“ (رد المحتار ۱۰۱/۴)۔

البتہ اگر تہا حق تعلی کو فروخت کیا جائے تو اس کے عدم جواز کی صراحت کتب فقہ میں موجود ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

”اگر دو منزلہ مکان ہے اور دونوں منزلیں دو شخصوں کی الگ الگ ہیں، دونوں منزلیں یا صرف اوپر والی منزل گر گئی تو اوپر کی منزل والے کو اپنا حق فروخت کرنا جائز نہ ہوگا“۔

اس کی دلیل دیتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ”لأن حق التعلی لیس بمال، لأن المال ما یمكن إحرازه والمال هو المحل“ (ہدایہ ۲۰۵۶)۔ (اس لئے کہ حق تعلی مال نہیں ہے، کیونکہ مال وہ شے ہے جس کا احراز ممکن ہو اور مال ہی محل بیع ہوتا ہے)۔

علامہ شامی نے فتح القدر کے حوالہ سے حق تعلی کی بیع جائز نہ ہونے کی دلیل ان الفاظ میں دی ہے کہ حق تعلی نہ تو مال ہے اور نہ ہی مال سے کوئی تعلق ہے،



مال اس لیے نہیں ہے کہ مال وہ عین ہے جس کو جمع کرنا اور روک رکھنا ممکن ہو اور مال سے تعلق اس لیے نہیں ہے کہ اس کا تعلق فضا سے ہے، اور فضا مال نہیں ہے، اور بیع کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے (رد المحتار ۱۰۱۴)۔

حق تعلی کے جائز نہ ہونے کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ یہ مال نہیں۔ اور مال کی وہ تعریف کی گئی ہے جس کی تردید میں مال کی بحث میں کر چکا ہوں۔ اور علامہ شامی کا فتح القدیر کے حوالہ سے یہ کہنا کہ اس کا تعلق مال سے نہیں ہے، یہ بات اس صورت میں تو تسلیم کی جاسکتی ہے جبکہ دونوں منزلیں منہدم ہو گئی ہوں اور فضا کی بیع کر رہا ہو۔ لیکن اپنے مکان کی چھت پر مکان بنانے یا اس پر رہنے کا جو حق ہے اس کو فروخت کرنے کی صورت میں بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق مال سے ہے، کیونکہ اس کا تعلق پہلی منزل سے ہے نہ کہ فضا سے، اور اس کے مال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اگر غور کیا جائے تو صاحب بدائع کے حوالہ سے مال کی جو تعریف میں نے نقل کی ہے وہ تعریف حق تعلی پر بھی صادق آتی ہے، کیونکہ اس حق سے انتفاع ممکن بھی ہے اور شرعاً جائز بھی۔ نیز اس دور میں اس کو مال سمجھ کر اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اس کی بیع لوگوں کی ضرورت بن گئی ہے، اس کے عدم جواز کا فتویٰ دینا امت مسلمہ کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔ خاص طور سے بڑے بڑے شہروں میں آبادی کے لحاظ سے شہروں کا رقبہ تنگ ہونے کی وجہ سے ایک ایک مکان پر کئی کئی منزلیں بنائی جاتی ہیں، اور اس حق تعلی کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اس لیے عرف اور تعامل ناس کی وجہ سے حق تعلی کی بیع میرے نزدیک جائز ہے۔

پھر یہ کہ ائمہ ثلاثہ حق تعلی کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں اور عموم بلوی کی صورت میں ائمہ ثلاثہ کا قول اختیار کر لینے کی گنجائش ہے۔

### حق مرور کی بیع:

اپنی زمین پر یا مکان کی چھت سے گزرنے، یا دوسرے کی زمین سے گزر کر اپنی زمین میں جانے کا جو حق حاصل ہے اس کو فروخت کرنا بلا کسی اختلاف کے جائز ہے، البتہ صرف حق مرور کی بیع میں اختلاف ہے۔ زیادات کی روایت یہ ہے کہ تنہا حق مرور کی بیع ناجائز ہے۔ فقہ ابو اللیث نے اسی روایت کو راجح قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ حق ہے اور تنہا حق کی بیع جائز نہیں ہے۔ صاحب در مختار نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کرنے کے بعد جواز کے قول کے سلسلہ میں "وبہ أخذ عامة المشائخ" کہا ہے، یعنی عام مشائخ نے جواز کے قول کو اختیار کیا ہے۔ علامہ شامی نے اس کے تحت سماحانی کا قول نقل کیا ہے کہ "وهو الصحيح وعليه الفتوى" اور یہی قول صحیح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (پوری تفصیل کے لیے دیکھئے: در مختار مع الشامی ۱۱۸/۴)۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ فقہاء متاخرین حق مرور کی بیع کے جواز کے قائل ہیں۔ ائمہ ثلاثہ نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ راقم الحروف بھی اس رائے سے متفق ہے۔

### حق شرب کی بیع:

حق شرب کی بیع کے سلسلہ میں بھی فقہاء احناف کی رائیں مختلف نظر آتی ہیں۔ ظاہر روایت یہ ہے کہ اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ لیکن بہت سے مشائخ نے عرف کی وجہ سے اس کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ خاص طور سے یہ عرف ہے دیار نسف کا۔

اما سرخسی تحریر فرماتے ہیں: "بعض مشائخ متاخرین نے بعض شہروں میں عرف ظاہری کی وجہ سے تنہا شرب کی بیع کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، گرچہ اس کے ساتھ زمین نہ ہو۔ اور یہ دیار نسف کا عرف ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ استصناع کی بیع کا جواز تعامل ناس کی وجہ سے ہے، گرچہ قیاس کا تقاضہ جواز کا نہیں ہے۔ اسی طرح بلا زمین محض شرب کی بیع (خلاف قیاس ہونے کے باوجود تعامل کی وجہ سے جائز ہے)" (مبسوط السرخسی ۱۷۱/۲۳)۔

جن فقہاء نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے اس کی علت غرر و جہالت بیان کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرب کا تعین کر کے غرر و جہالت دور کر دی جائے تو پھر اس کی بیع جائز ہوگی۔ میری رائے یہی ہے۔

حق تسبیل کی بیع:..... حق تسبیل کی بیع بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس کی تعین کر کے غرر و جہالت دور کر دی جائے۔ حقوق کی اس بحث کا حاصل یہ ٹھہرا کہ ان تمام حقوق و منافع کی بیع جائز ہے جن سے حقیقۃً انتفاع کیا جاتا ہے، اور شرعاً انتفاع جائز ہے، اور لوگ ان کو مال سمجھ کر ان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

بعض وہ حقوق جن پر مال کی تعریف صادق نہیں آتی:

البتہ بعض وہ حقوق ہیں جن پر فی الحال ملکیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ حق کا استحقاق ہوتا ہے، صاحب حق کو اپنے حق پر مالکانہ تصرف کا حق نہیں ہوتا مثلاً حق شفعہ، زوجہ کا حق قسم اور مخیرہ کا اختیار وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے دیگر حقوق وہ ہیں جن پر فی الحال صاحب حق کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور صاحب حق کو ان پر مالکانہ تصرف کا اختیار نہیں رہتا۔ یہ مال کے دائرہ میں نہیں آتے، ان کی بیع جائز نہیں، البتہ ایک متعینہ رقم لے کر اپنے حق سے دست برداری درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں تفصیل درج ذیل ہے:

اس طرح کے حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں: بعض وہ حقوق ہیں جو رفع ضرر کی بنیاد پر ثابت ہوتے ہیں، مثلاً شفعہ کے لئے حق شفعہ یا کسی کی زائد بیویاں ہوں تو ہر ایک کے درمیان کھانے، پینے اور شب گزاری میں عدل و مساوات، اسی طرح مخیرہ کے لیے حق خیار وغیر ذلک۔ اس قسم کے حقوق پر عوض لے کر مصالحت کرنا اور اپنے حق سے دست بردار ہونا صحیح نہیں ہے، بلکہ مصالحت سے یہ حقوق بھی ساقط ہو جائیں گے اور کوئی رقم بھی نہیں ملے گی۔ اس لیے کہ جب صاحب حق اپنے حق کے ساقط کرنے پر راضی ہو گیا تو معلوم ہوا کہ اسے کوئی ضرر نہیں ہے۔

دوسرے وہ حقوق ہوتے ہیں جو اصلۃً نیکی، صلہ رحمی یا دیگر وجوہ خیر کی بنیاد پر ثابت ہوتے ہیں، مثلاً کسی شخص نے دو شخصوں کے حق میں اپنے غلام کی وصیت کی، ایک کے لئے آزادی کی اور دوسرے کے لیے خدمت کی، تو اس غلام میں دونوں کا حق ثابت ہو گیا لیکن یہ ثبوت رفع ضرر کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اصلۃً نیکی یا صلہ رحمی کی بنیاد پر ہے۔

اسی طرح حق قصاص اور حق نکاح بھی ہے۔ اسی قسم کے حقوق پر عوض لے کر مصالحت اور اپنے حق سے دست برداری شرعاً جائز و درست ہے (دیکھئے: شامی ۱۵/۴)۔

فقہاء نے اسی پر نزول عن الوظائف کو بھی متفرع کیا ہے یعنی قاضی نے کسی کیلئے اوقاف سے وظیفہ مقرر کر دیا تو یہ حق اس کے لئے اصلۃً ثابت ہو گیا۔ اس کو شرعاً یہ اختیار ہوگا کہ عوض لے کر مصالحت کر لے اور اپنے حق سے دست بردار ہو جائے (ایضاً)۔ علامہ شامی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: نزول عن الوظائف کے جواز پر بعض فقہاء نے حضرت حسن بن علی کے واقعہ سے استدلال کیا ہے جس میں انہوں نے حضرت معاویہ سے ایک متعین رقم لے کر خلافت سے مصالحت کر لی تھی۔

ملاحظہ ہو شامی کی عبارت: ”واستدل بعضهم للجواز بنزول سيدنا علي رضي الله تعالى عنه عن الخلافة لمعاوية على عوض وهو ظاهر أيضاً“ (شامی ۲۰/۱۵)۔

والله تعالى أعلم۔

☆☆☆



## بیع حقوق و منافع

مولانا عبید اللہ الاسعدی

۱: بیع کی حقیقت کیا ہے؟

بالاتفاق بیع کی حقیقت شرعیہ "مبادلة المال بالمال" ہے یعنی آپس میں مال کے لین دین کا معاملہ کرنا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بیع میں محل عقد یعنی وہ شئی جس سے متعلق باہمی معاملہ ہوتا ہے وہ مال ہونا چاہیے۔ یعنی اگر غیر مال سے متعلق اس قسم کا معاملہ کیا جائے تو اسے بیع نہ کہیں گے۔ اس لئے بالاتفاق کسی آزاد شخص یا مردار جانور کے بیچنے کا معاملہ شرعاً یا عرفاً بیع نہیں قرار پاتا، اور فقہ کی اصطلاح میں اسے بیع باطل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ مال کی حقیقت کیا ہے۔

۲: مال کی حقیقت کیا ہے؟

مال کی حقیقت کے سلسلہ میں یاہوں کہیے کہ بیع کے محل عقد و معقود علیہ کے سلسلہ میں جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں ان کے مطابق:

الف۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ مال وہی شئی کہلائے گی کہ جس کے اندر انتفاع یعنی اس سے نفع اندوز ہونے کی کوئی جہت پائی جاتی ہو، اس طور پر کہ عرف اسے تسلیم کرتا ہو اور شریعت اسے قبول کرتی ہو، اور اس بنیاد پر عرف اس کو باقیمت قرار دیتا ہو۔

اس شئی کے اندر پائی جانے والی انتفاع کی جہت سے شریعت قبول کرتی ہو، ضروری نہیں ہے کہ عام ہو، بایں معنی کہ مسلمانوں کو بھی اس انتفاع کی اجازت ہو بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شریعت مسلمانوں کے حق میں تو انتفاع کو منع کر کے مال نہ قرار دیتی ہو مگر غیر مسلموں کے لئے نفع و مالیت کو تسلیم کرتی ہو جیسے کہ خمر و خنزیر، اس لئے فقہاء اسلام نے عامۃً اموال کی دو اقسام ذکر کی ہیں۔ اور فقہ کا ہر طالب علم اس سے واقف ہے کہ مال کی دو اقسام ہیں: (۱) مال معقوم، (۲) مال غیر معقوم۔ معقوم وہ مال کہلاتا ہے جس کا انتفاع شریعت نے عام قرار دے کر مسلمانوں کو بھی اس سے انتفاع اور اس کا معاملہ کرنے کی اجازت دی ہو۔ اور غیر معقوم وہ مال کہلاتا ہے جس کا معاملہ صرف غیر مسلم کر سکتے ہیں۔

اوپر جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ مالیت کے لئے نافعیت و تقوم (باقیات ہونا) ضروری ہے اسے اگرچہ مال کی تعریف میں اتفاقی طور پر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مگر مذاہب اربعہ کی تفصیلات و جزئیات کی بنیاد پر یہ بات اتفاقی قرار پاتی ہے جس کی واضح دلیل ان حیوانات کی بیع کا جواز ہے جن کی بیع سے عموماً متقدمین نے منع کیا ہے بلکہ بعض کی بیع کی ممانعت بعض نصوص میں بھی آئی ہے۔ مگر فقہاء نے مختلف حشرات الارض و حیوانات میں نافعیت کی معقول جہت متحقق ہونے پر جواز معاملہ کو ذکر کیا ہے (فتح القدیر ۶/۳۴۵-۳۴۶، المغنی ۴/۲۸۳، الکافی ۴/۲۲۹، شرح المہذب ۹/۲۳۵، ۲۳۰، وغیرہ)۔

اور ایسا نہیں کہ مال کی تعریف میں اس قید کو ذکر نہ کیا گیا ہو بلکہ اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے شواہح و حنابلہ نے مالیت کو نافعیت و تقوم (باقیمت ہونے) میں ہی محصور قرار دیا ہے (حق الابتکار فی الفقہ الاسلامی ۲۳-۲۶)، شواہح میں سے زرکشی نے تعریف کی ہے: "إن المال ما كان منتفعاً به" (قواعد الزرکشی ۲۲۲)۔ امام شافعی سے منقول ہے: "لا يقع اسم المال إلا على ما له قيمة يباع بها وتلزم متلفه وإن قلت" (الاشباه للسيوطی ۱۹۷)۔ حنابلہ سے منقول ہے: "إن المال ما فيه منفعة مباحة لغير حاجة أو ضرورة" (المغنی مع الشرح الكبير ۵/۵۳۹)۔ اور ہمارے فقہاء حنفیہ نے اگرچہ مال کی تعریف کرتے ہوئے مالیت کو اس میں محصور نہیں قرار دیا ہے۔ مگر ان کی تصریحات و تعریفات میں یہ قید ملحوظ ضرور ہے۔ صاحب البحر نے تو الحاوی القدسی سے صاف صاف نقل کیا ہے: "إن المال اسم لغير الآدمی مما خلق لمصالح الآدمی۔ الخ (البحر



الرافق، ۵۰، ۲۵۵، رد المحتار، ۲۰۲۲۔ اور صاحب درمختار سے نقل کیا گیا ہے: ویطلق المال علی قیمۃ وہی ما یدخل تحت تقویم مقوم من الدراہم والدنانیر (حق الابتکار فی الفقہ الاسلامی، ۹)۔ صاحب بدائع درندوں وغیرہ کی بیع کے جواز پر کلام کرتے ہوئے کتے کی مالیت کو ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والدلیل علی أنه مال أنه منتفع به حقيقة مباح الانتفاع به شرعاً علی الاطلاق (بدائع الصنائع، ۵۰، ۱۵۳)۔ اسی طرح انسانی دودھ کی بیع کے جواز کی نفی کرتے ہوئے اس کی ملکیت کے انکار میں فرماتے ہیں: لأنه لا یباح الانتفاع به شرعاً علی الاطلاق بل لضرورة تغذیة الطفل وما کاحرام الانتفاع به شرعاً إلا لضرورة لا یكون مالاً (ایضاً)۔ نیز ہمارے فقہاء کی ذکر کردہ تعریفات میں وقت ضرورت کے لئے جمع کر کے رکھنے یا اس کے حق میں بذل و منع کے جاری ہونے و پائے جانے کا جو تذکرہ آتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد مال قرار پائی جانے والی شئی کے اندر نافعیت اور اس کی بنیاد پر تقوم کا پایا جانا ہی ہو سکتا ہے (صاحب درمختار نے تعریف کی ہے: "أنه موجود یمیل إلیه الطبع و یجری فیہ البذل والمنع" شامی نے اسی تعریف کو اختیار کیا ہے اور خود شامی نے یہ تعریف نقل کی ہے: ما یمیل إلیه الطبع و یمکن ادخاره لوقت الحاجة" (رد المحتار، ۵۱، ۵۰۵، مجلۃ الاحکام میں اسی تعریف کو لیا گیا ہے)۔ شامی نے مال کی تعریف کرنے کے بعد ذکر کیا ہے۔ تقوم (یعنی شرعاً مال ہونا)، تمول اور اباحت انتفاع دونوں کے مجموعے کی بنا پر ثابت ہوتا ہے، اور تلوک سے نقل کیا ہے: التقویم یستلزم المالیة عند الإمام (رد المحتار، ۲۰۲۲)۔

اس لئے 'مال و مالیت' کی حقیقت کے سلسلہ میں حنفیہ کی ذکر کردہ مختلف تعریفات و تصریحات کو سامنے رکھ کر شیخ مصطفیٰ الزرقاء نے یہ تعریف پسندی کی ہے: المال هو کل عین ذات قیمۃ مادیة بین الناس (المدخل الفقہی العام، ۲، ۱۱۸) اور شیخ علی الخفیف نے أنه کل ما یمکن حیازتہ والانتفاع به علی وجه معتاد (مذکرات فی المعاملات، ۲)۔

حاصل یہ کہ کسی شئی کے مال قرار پانے کے لئے اس کے اندر ایسی نافعیت کا پایا جا: ضروری ہے کہ جسے عرف و شرع کی طرف سے مقبولیت و معصومیت حاصل ہو، اور یہ اس لئے کہ منفعت و نفع کی بنا پر ہی کسی چیز کی اہمیت ہوتی ہے۔ پھر لوگوں کی اس کی طرف رغبت اور ان کو اس کی طلب ہوتی ہے اسی لئے کہا گیا ہے: سارے اموال کا اصل مقصود و منافع ہی ہیں (قواعد الاحکام لعز بن عبدالسلام، ۱۷، ۲)۔

ب۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اسی مذکورہ وصف میں مالیت کا انحصار ہے یا یہ کہ اس کے ساتھ ایک قید اور بھی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یا یوں کہتے کہ مذاہب ثلاثہ میں تو انحصار ہے۔ شواہح و حنابلہ کی تعریفات کا تذکرہ گذر چکا ہے، مالکیہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اس لئے کہ بقول امام شاطبی، ہر شئی مملوک مال ہے (الموافقات، ۱۷، ۲)۔ اور القاموس و لسان العرب میں بھی مال کی تعریف اسی مفہوم میں کی گئی ہے: المال ما ملکته من کل شیء أو من جمیع الأشياء (القاموس، ۱۳۶۸، لسان العرب، ۱۳، ۱۵۸)۔

مگر حنفیہ اس بات کے قائل ہیں۔ تقوم و نافعیت کی قید کے ساتھ ایک قید اور ہے، جس پر مالیت کا مدار ہے، یا یوں کہتے کہ جو مال کی حقیقت میں شامل ہے، اور وہ ہے مال قرار پانے والی شئی کی "عمیئیت" یعنی اس کا اعیان کے قبیل سے ہونا، جس کا مطلب ہے کہ مال وہی شئی ہوگی کہ ہاتھوں سے اس کا چھونا اور پکڑنا ممکن ہو، اور کسی طرح بھی اس پر قبضہ و تسلط ممکن ہو، اس کو فقہاء حنفیہ نے اس سے تعبیر کیا ہے کہ وقت ضرورت کے لئے اس کا "ادخار یا احراز" ممکن ہو۔

اس اختلاف کی وجہ سے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اعیان کی طرح منافع و حقوق بھی اموال ہیں کہ نافعیت و ملکیت سب میں مشترک ہے، جبکہ حنفیہ کے نزدیک اعیان کے علاوہ کوئی دوسری چیز مال نہیں ہے۔

جمہور نے اس سلسلہ میں اس کا لحاظ کیا ہے کہ اصل و مقصوداً عظیم اموال کا ان سے نفع اٹھانا ہے اور نافعیت "مالیت" کا بنیادی عنصر ہے، اس لئے کوئی بھی شئی اگرچہ معنوی کیوں نہ ہو جب نافعیت کی حامل ہوگی تو مال قرار پائے گی۔

نیز اس کا کہ اجارہ کا مدار منافع پر معاملہ ہے، اور اجارہ بالاتفاق بغیر کسی قباحت کے جائز ہے۔ گذر چکا ہے کہ صاحب القاموس وغیرہ نے ہر مملوک کو مال قرار دیا ہے۔

حنفیہ کے پیش نظر یہ بات ہے کہ 'محل بیع' کے سلسلہ میں نصوص کے اندر جو تصریحات آئی ہیں ان کی روشنی میں ہی مال کے لئے یہ قید بھی متعین ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بالاتفاق ہر وہ چیز جو قبضہ میں ہو، بلکہ اس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہو اس کو بیچا نہیں جاسکتا اور نہ اسے مال قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً مردار جانور پر ایک آدمی

نے قبضہ کر لیا، کھانا چاہے تو کھا سکتا ہے اور کھانے والے کھاتے ہیں۔ مگر بالاتفاق اس پر بیع کا معاملہ درست نہیں ہے۔ اسی طرح ہر مملوک بیچا نہیں جاسکتا۔ مثلاً بھاگا ہوا غلام، اڑ جانے والا پرندہ، یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں کہ نصوص کی رو سے 'محل بیع' کے تحت میں نہ صرف یہ کہ خارج میں موجود ہونا ضروری ہے بلکہ بائع کے پاس بھی موجود ہونا ضروری ہے، اور جو صورتیں اس کے خلاف منقول ہیں اور ثابت و جائز ہیں سب استثنائی ہیں۔ تعال و عرف یا حرج و ضرورت پر مبنی ہیں، مثلاً بیع سلم (نقد قیمت کیساتھ ادھار خرید)، استصناع (آرڈر دے کر کسی چیز کا بنوانا)، ان پھلوں و سبزیوں کی بیع جو کہ بتدریج وجود میں آتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ منافع معدومات کے قبیل سے ہیں، جس وقت آدمی ان کا معاملہ کرتا ہے وہ موجود نہیں ہوتے بلکہ آئندہ مستاجر کے عمل پر مرتب ہوتے ہیں۔

مزید یہ کہ وہ لغویین کہ جنہوں نے کتاب و سنت و فقہ کی رو سے الفاظ کے مفہیم بیان کئے ہیں یعنی لغات القرآن والحديث والفقہ کے علماء کی تصریحات بھی ان کی موید ہیں۔ ابن الاثیر اور الازہری دونوں کی تصریحات اسی قسم کی ہیں۔ النہایہ میں ہے: المال فی الأصل ما یملک من الذهب والفضة ثم أطلق علی کل ما یقتنی و یملک من الأعیان (نہایہ ابن اثیر ۱۲۱، ۴)۔ اور المصباح المنیر میں ہے: تمول ما لا ای اتخذہ قنیۃ فقول الفقہاء ما یتمول ای ما یعد ما لا فی العرف (المصباح المنیر ۱۶۱، ۲)۔ علامہ طاہر پٹنی نے بھی النہایہ کی تصریح ذکر کی ہے اور القاموس واللسان میں بھی اس کو نقل کیا گیا ہے (مجمع بحار الانوار ۳۲۳، ۳ لسان العرب ۱۵۵، ۱۴ والقاموس)۔ المغرب میں ہے: عن محمد المال کل ما یتملکہ الناس من دراهم أو دنانیر أو ذهب أو فضة أو حنطة أو خبز أو حیوان أو ثیاب أو سلاح أو غیر ذلك (المغرب ۳۳۶)۔ امام محمد کے الفاظ "کل ما یتملک الناس" اگرچہ عام ہیں۔ مگر بعد کی تصریح و تمثیل یہ متعین کر دیتی ہے کہ مراد خاص ہے یعنی اعیان مملوکہ مراد ہیں۔ "مجمع اللغة العربیۃ" میں ہے: "یعرفه الفقہاء بأنه ما یجری فیہ البذل والمنع وبأنه ما یمکن ادخاره لوقت الحاجة" (مجمع اللغة العربیہ ۴۷)۔

کہا جاتا ہے کہ مال کے مفہوم میں ادخار و احراز کا اعتبار جو کہ عینیت کے لوازم میں سے ہے، یہ حکم شرعی کے اندر مفہوم لغوی کا اعتبار ہے (اور یہ درست نہیں ہے) اس لئے کہ مال تمول سے ماخوذ ہے اور تمول کے مفہوم میں ادخار و احراز شامل ہے جیسا کہ مبسوط وغیرہ میں تقریر آئی ہے (مبسوط السرخسی ۷۸/۱)۔ جواب یہ ہے کہ شرعی حقائق میں الفاظ مستعملہ کے لغوی حقائق کا کلی طور پر ترک بھی تو نہیں ہوتا بلکہ لغوی حقیقت شامل و ملحوظ رہتی ہے جس پر شریعت اضافے کر دیا کرتی ہے، انہیں اضافوں و تغیرات و تفسیحات کے ساتھ کسی لفظ کی شرعی حقیقت و مفہوم کا تعین ہوتا ہے۔ کتب حدیث اور متون فقہ کے شارحین تمام ابواب کے شروع میں لفظ کے لغوی معنی ذکر کرنے کے بعد شرعی مفہوم اور دونوں کے درمیان مناسبت کو ذکر کرتے ہیں، بعض حضرات کی تصریح کے مطابق بیع کے لغوی معنی مبادلة المال بالمال ہی تو ہیں جیسا کہ عینی وابن الہمام وغیرہ نے تصریحات کی ہیں۔ شریعت نے اس پر تراویح کا اضافہ کر دیا ہے (فتح القدیر ۵/۲۳، ۱۹۱، عمدة القاری ۲/۳۳۷) اگرچہ شامی نے اس پر نقد کیا ہے اور لغتہ مقابلہ و مبادلہ کو عام قرار دیا ہے (رد المحتار ۳/۳۰۳) مگر کہا جاسکتا ہے کہ نفس مبادلہ جو بہر حال اتفاقی طور پر لغتہ اس مفہوم میں شامل ہے۔ نیز بعض دوسری قیدوں کا، جیسے کہ مال محل بیع، کو مطلق نہ رکھ کر مقید قرار دیا ہے۔ صاحب القاموس و صاحب اللسان نے جو مفہوم ذکر کیا ہے۔ مالکیہ کے نزدیک وہی مال کی شرعی حقیقت ہے۔ جبکہ یہ خالص لغات عرب کی کتابیں ہیں۔ اور گذر چکا ہے کہ شرعی لغویین نے مال کے مفہوم میں عینیت کا ذکر کیا ہے، اور ائمہ مذاہب میں امام محمد سے بھی اسی انداز کی تصریح منقول ہے۔ اور امام محمد ان فقہاء میں سے ہیں کہ جن کو لغات عرب میں بھی امامت و سیادت کا منصب حاصل ہے۔

تیسری بات یہ کہ شاید (یہ لفظ احتیاطاً لایا گیا ہے) نصوص میں کہیں بھی مال کے مندرجات و مشمولات کے ضمن میں 'منافع' کے قبیل کی کسی چیز کا تذکرہ نہیں آیا ہے، اور نہ نصوص میں آنے والی خرید و فروخت کی صورتوں میں کسی موقع پر 'منافع' پر دائمی معاوضہ کی کسی صورت کا بیان آیا ہے جو کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بیع کے تحت شامل و داخل ہے۔ اور اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مال کی عینیت کی قید کے لزوم پر کتاب و سنت کی رو سے کوئی دلیل موجود نہیں ہے تو 'منفعت' کے مال ہونے پر بھی کوئی نص موجود نہیں۔ مسئلہ صرف استیناس کا رہ جاتا ہے۔ حنفیہ نے شارع کی تصریحات کی بنا پر اس قید کو اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ المدخل الفقہی العام (۲۰۸، ۲۰۹) اور حق الابکار (ص ۲۱۸-۲۱۹) کے تحت گذر چکا ہے۔

ان حضرات کے دعویٰ کی بنا (۱) اجارہ کے جواز پر ہے اور (۲) یہ کہ قرآن کریم نے مہر کا مال ہونا ضروری قرار دیا ہے، اور منفعت کو مہر قرار دینے کے حنفیہ بھی قائل ہیں، اور (۳) بعض صورتوں میں منافع کے اتلاف پر ضمان بھی دلاتے ہیں (المدخل الفقہی العام ۲۰۸، ۲۰۹، حق الابکار ۲۱۸، ۲۱۹)۔



جواب یہ ہے اور پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے اس انداز کی صورتیں استثنائی ہیں، ضرورت اور رفع حرج و دفع مشقت وغیرہ جیسے امور اس کی بنیاد ہیں۔ پہلے بیع کی بعض صورتوں کا تذکرہ آیا ہے۔

مہر کے طور پر منفعت کا بھی قبول کر لیا جانا اس لئے نہیں ہے کہ وہ مال ہے، بلکہ اس لئے کہ عرف میں یہ حصول مال کا ایک ذریعہ ہے، اس کے ذریعہ مال کو حاصل کیا جاتا ہے یعنی کوئی منفعت براہ راست مہر نہیں بنتی اور نہ بن سکتی ہے، اس لئے کہ وہ مال نہیں ہے بلکہ بالواسطہ اس کے حق میں اس کو گوارہ کیا گیا ہے۔

رہا چند مخصوص صورتوں میں منافع کے ضمان کا دلایا جانا، جو کہ متاخرین حنفیہ کا قول ہے، تو یہ انہیں جگہوں میں ہے جہاں کہ کسی جہت سے منافع کو اسامی حیثیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے کہ منافع کی آمدنی پر ہی معاش و انتفاع کا مدار ہے، اور یہ کہ کسی طرح بھی اصل کو باقی رکھ کر اس سے منافع کا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، وقت کی املاک، کرایہ کی صورت میں اموال کو حاصل کرنے کے لئے اپنائی جانے والی اشیاء میں تو یہ بات واضح ہے، یتیم کی املاک کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کے بلوغ تک اس کی املاک کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اس کوشش کے ساتھ کہ اس کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں، اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اصل املاک کو باقی رکھ کر اس کے منافع سے اس کی ضرورت پوری کی جائے۔

۳: قابل ادخار ہونے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے:

ادخار کا یہ مفہوم تو بہر حال نہیں لیا جاسکتا کہ حاصل شدہ شے کو بند کر کے رکھا جاسکے، جو بھی شے ہو اور اس کے بعد جب بھی آدمی کا جی چاہے تو اس کو استعمال کر لے۔ جس پر شیخ زرقاء وغیرہ نے سبزیوں سے متعلق اعتراض کیا ہے۔ جیسے کہ ان حضرات نے مال کی تعریف میں 'میلان اور رغبت' کے لفظ کی بنیاد پر بھی نقد کیا ہے۔ حالانکہ جواب واضح ہے کہ میلان وغیرہ کا مطلب یہاں یہ نہیں ہے کہ مالیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی اس کو پسند کرتا ہو، وہ اس کو اچھی لگتی ہو، اور اگر کھانے پینے کی چیز ہو تو پوری رضا و رغبت کے ساتھ اس کو کھائے یا کسی طرح استعمال میں لائے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی پیش آمدہ یا متوقع کسی بھی قسم کی ضرورت کے لئے اس کا حاصل کرنا پسند کرتا ہو۔ بدمزہ دو اداؤں، زہر کے قسم کی چیزوں یا نجاست کے ساتھ آلودہ اشیاء کا یہی معاملہ ہے۔

اسی طرح 'ادخار' کا مفہوم بند کر کے رکھنا و محفوظ کرنا نہیں کہ سبزی جیسی چیزیں دو چار دن سے زیادہ نہیں رکھی جاسکتیں اور آج مال کی نہ جانے کتنی انواع ہیں کہ جن کو اپنے اختیار سے بند کرنا یا اپنے ہاتھ و منہ میں لینا یا کسی ظرف و برتن میں رکھنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ شامی نے ذکر کیا ہے: ولا الانتفاء بالمال یعتبر فی کل شیء بما یصلح له (رد المحتار) اور اسی طرح ہمارے فقہاء نے محل بیع پر قبضہ کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔ شامی میں ایک موقع پر اس سلسلہ میں آتا ہے: لکن ذلک یختلف باختلاف حال المبیع (رد المحتار ۴۲) اور اسی طرح چوری میں 'حرز' کے متعلق بھی ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس پر کلام ہے: حرز کل شیء معتبر بجز مثلہ (رد المحتار ۲۰۲، ۲۰۳) ویسے ظاہر روایت اور اصل مذہب تو ہے: کل ما کان حرز النوع فہو حرز الانواع کل ما۔

'ادخار' کا مفہوم عام اور وسیع ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مال وہ شے ہے کہ کوئی انسان جب اس کو حاصل کرنے کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کر لے تو وہ اس کے زیر دست و زیر تسلط آجائے کہ وہ جب چاہے اس کو اس کی شان و حال کے مطابق استعمال کر سکے۔ اس زیر دستی و تسلط کی اشیاء کے مطابق بہت سی شکلیں نکلیں گی۔ ہاتھ میں لینا یا پکڑنا، جیب میں رکھنا، بکس میں رکھنا، گھر اور باڑے و اصطبل میں رکھنا، رہائش و زراعت میں استعمال کرنا 'ادخار' کے مفہوم میں اس توسیع کے بعد اس عہد کی بہت سی وہ نو پیدا اشیاء اس کے تحت آجائیں گی جو کہ باس معنی عین نہیں ہیں کہ آدمی کسی دوکان میں جا کر اس کو حاصل کرے۔ اور ہاتھ میں لے کر یا جھولے میں رکھ کر لے آئے بلکہ نہ اس کو پکڑ سکتا ہے اور نہ ہی دیکھ سکتا ہے ہاں محسوس کر سکتا ہے، اور یہ کہ مخصوص ظرف میں ان کو بند کر کے حسب ضرورت استعمال میں آدمی با اختیار ہو جاتا ہے، جیسے "گیس" جس کی مختلف شکلیں اس وقت موجود رائج ہیں۔ اور مواقع استعمال بھی الگ الگ ہیں۔

اسی طرح وہ اشیاء جن کے حق میں استعمال و انتفاع پر قدرت کے لئے مخصوص تدبیریں کرنی پڑتی ہیں اور پھر آدمی حسب ارادہ ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مثلاً پانی کا کنکشن، گیس کا کنکشن، بجلی کا کنکشن۔ ظاہر ہے کہ ان سب کی خرید و فروخت ہی ہوتی ہے اور گھروں میں لگائے گئے میٹر حاصل کردہ یا صرف کردہ مقدار کی نشاندہی و تعیین کرتے ہیں۔

اسی طرح کسی صنعت وغیرہ سے متعلق اگر کوئی کاغذی سرکاری کارروائی اس طرح ہو جائے کہ سرکاری طرف سے عطا کردہ مخصوص کاغذ کے ساتھ اس کا تعلق ہو جائے اور اس کو حاصل کرنے والا اس سے مادی منافع حاصل کرنے کے سلسلہ میں با اختیار ہو جائے تو مولانا تفتی صاحب کی تصریح کے مطابق اس کو بھی ادخار و



احراز کے تحت شمار کیا جائے گا۔

بعض حضرات نے حنفیہ کے رد میں یہ کہا ہے کہ یہ استثناءات حنفیہ کے موقف کی کمزوری کی دلیل ہیں اور اس کے ضعف کی وجہ سے وہ اس انداز کے استثناءات کو گوارا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں (حق الابتناء ۳۱، احکام المعاملات ۱۸)۔

مگر کہا جاسکتا ہے کہ فقہیات میں استثناءات عام ہیں اور اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ بطور قاعدہ کہا جاتا ہے کہ فقہ اور اسی طرح عربیت کا کوئی قاعدہ کلمی نہیں ہوتا بلکہ سارے قواعد اکثری ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ جزئیات ہر قاعدہ سے الگ ضرور پائے جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ مالیت کے باب میں باقی مذاہب بھی استثناءات کے قائل ہیں، خود صاحب حق الابتناء جنہوں نے یہ رد کر کیا ہے، مالکیہ کی طرف سے امام شاطبی کی ذکر کردہ مال کی تعریف کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے یہ ذکر اور ثابت کیا ہے کہ یہ امر عام کلمی نہیں ہے کہ ”ہر مملوک مال ہے“۔ بعض حقوق مملوک ہونے کے باوجود بالاتفاق اور بالخصوص مالکیہ کے نزدیک مال نہیں ہیں۔ حالانکہ اس مسئلہ میں سب سے زیادہ توسع انھیں کے یہاں ہے۔ مثلاً ایسا حق کہ جس کا محل و متعلق مال نہیں ہیں۔ (حق الابتناء ۳۸)۔ اسی طرح شوائع و حنابلہ جو حقوق و منافع کو عموماً اموال میں شمار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بیع کا محل چونکہ مال ہوتا ہے۔ لہذا ان اشیاء کی بھی بیع درست ہے۔ خود وہ ہر قسم کے حقوق کی بیع کے جواز پر متفق نہیں اور نہ ہر حق پر معاوضہ کو درست قرار دیتے ہیں، مولانا تقی صاحب نے حقوق شرعیہ و حقوق اسبقیہ کے متعلق جو تفصیلات ذکر کی ہیں وہ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

## حقوق اور ان کی ملک کو منتقل کرنے کا معاملہ

الف۔ حق کی تعریف:

مولانا تقی صاحب نے اپنی بحث میں اگرچہ ”حق“ کی انواع و صورتوں کا احاطہ فرمایا ہے اور از روئے حکم کافی دوائی تفصیل فرمائی ہے مگر نفس حق کی ابتدائی تعریف و تعیین نہیں فرمائی ہے۔ ممکن ہے اس لئے کہ عموماً متقدمین نے اس کی تعریف سے تعرض نہیں کیا ہے۔ بلکہ عصری محققین و باحثین نے کچھ زیادہ ہی اس کا اہتمام کیا ہے۔ یا اس لئے کہ بقول شیخ الزرقاء عموماً جو تعریفات کی گئی ہیں وہ سقم سے خالی نہیں ہیں (ملاحظہ ہو: شیخ الزرقاء کا حق کی بعض تعریفات پر نقد، حاشیہ المدخل الفقہی العام ۱۲/۱۳)۔

علامہ شامی نے عینی کی شرح ہدایہ سے نقل کیا ہے: الحق ما يستحقه الرجل (رد المحتار ۱۸۸، البحر الرائق ۱۳۸)۔ لیکن یہ ایک عام تعریف ہے اور اس کو محض حق اصطلاحی میں محصور نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جس کی توجیح الموسوعة الفقہیہ الکویتیہ کی اس عبارت سے ہوتی ہے: المحل الذی یجری علیہ التصرف یسعی حقاً۔ اور اس کے بعد مذکور ہے کہ اس اطلاق کی بنیاد پر حق اعیان و منافع اور دیون و حقوق مطلقہ سب کو شامل ہے (الموسوعة الفقہیہ ۲۳/۲۴ بحوالہ البدائع ۲۲۳) اور ایک دوسرے موقع پر اسی میں حق کی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے: ما یثبت للإنسان بمقتضى الشرع من أجل مصالحه (ایضاً ۱۰)۔

شیخ مصطفیٰ الزرقاء نے تعریف کی ہے: الحق هو اختصاص یقرر به الشرع سلطة أو تکلیفاً (المدخل الفقہی العام ۱۰/۱۲)۔ شیخ کے نزدیک اس کا مصداق کسی انسان کا کسی شئی سے خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی خاص تعلق ہے، جسے شریعت قبول کرتی ہو۔ آگے ”سلطه أو تکلیفاً“ کا لفظ اس کی جملہ انواع کو سمیٹنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہے۔

اور شیخ محمد مصطفیٰ شلبی کے نزدیک یہ ہے کہ حق ایک ایسا خصوصی امر ہے کہ جس کا متعلق و مصداق بہت عام ہے، مادی منفعت، والدین وغیرہ کی اطاعت و خدمت، انسانی جان کی حفاظت، جماعتی نظم و انتظام کی نگہداشت اور دین کی بقا و نشر و اشاعت سب کو یہ شامل و حاوی ہیں، اور بطور مثال ان مواقع کی نسبت سے اس کی شکلیں و صورتیں بھی ذکر کر دی گئی ہیں شیخ الزرقاء نے بھی اپنی پسندیدہ تعریف کی توجیح کرتے ہوئے اس قسم کی چیزوں کو ذکر فرمایا ہے (دیکھئے: المدخل للمفہم الاسلامی ۱۶۵، المدخل لدراسة افقه الاسلامی ۲۱۸)۔

اس کے بعد شیخ شلبی فرماتے ہیں: ”شریعت کی نگاہ میں حق وہی امر کہلائے گا کہ جس کا شریعت اقرار و اعتراف کرتی ہو اس لئے شریعت اور شرعی ماخذ کے ذریعہ ہی کسی شرعی حق کو جاننا اور پہچانا جاسکتا ہے“ (ایضاً)۔

اور یہ واضح رہے کہ مذکورہ تفصیل کے مطابق حق نہ تو عین ہوتا ہے اور نہ منفعت بلکہ دونوں سے الگ، اس لئے کہ عین مادیات کے قبیل سے ہوتا ہے، اور 'حق' مادیات سے تعلق رکھتے ہوئے بھی مادی نہیں ہوتا (المدخل الفقہی العام ۱۳۳۳) اور منفعت اس لئے نہیں کہ اکثر منافع کا تعلق مادیات سے ہوتا ہے، اور انہیں کے ذریعہ اس کا حصول ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں یعنی عین و منفعت 'حق' کا متعلق محل ہوتے ہیں۔ اس لئے دونوں کی طرف سے حق کی نسبت و اضافت کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس گھر کا میں حقدار ہوں، یا یہ کہ اس گھر کے منافع کا میں حقدار ہوں۔ اس لئے املاک کے بیان میں اس کو الگ شمار کیا جاتا ہے، موسوعہ کی ایک عبارت گذر چکی ہے۔ شیخ الزرقاء نے املاک کی چار اقسام بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: من حیث المحل ینقسم المثلث إلى أربعة أنواع: مملک العین و مملک المنفعة و مملک الدین و مملک الحقوق (ایضاً ۱۰۲۲) مگر اسی کے ساتھ بعض مواقع پر "عین منفعت" کو ہی 'حق' کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض نے تو حق کی تعریف میں "مصلحت" کی تفسیر ہی 'منفعت' سے کی ہے (ایضاً ۱۳۳۳)، مولانا تقی صاحب نے حقوق کی تفصیل کرتے ہوئے حقوق عرفیہ کے تحت "حق الانتفاع بذوات لأشیاء" کے عنوان سے کی جانے والی بحث میں یہ ذکر کیا ہے کہ اعیان مادیہ کے منافع پر معاوضہ کے دائمی معاملہ کو فقہاء حنفیہ نے بیع الحقوق المجردہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور اس کے تحت انہوں نے حقوق کے قبیل کی معروف چیزوں کو ذکر کیا ہے۔ مثلاً حق مرور اور حق شرب وغیرہ، ظاہر ہے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کی زمین کا کوئی حصہ خریدے تاکہ اس سے پانی بہا سکے یا نکال سکے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ معاملہ کرے کہ زمین کا استعمال میں آنے والا حصہ خریدے بغیر اس سے پانی گزارے و بہائے گا، اس کو حق شرب یا حق تسبیل کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ صورت دوسرے کی زمین سے انتفاع کی اور محض اس کی منفعت پر معاملہ کی ہے۔

اور حق الابتکار فی الفقہ الاسلامی المقارن، جس کا موضوع 'حق تالیف' کی مالیت کو ثابت کرنا ہے۔ اس کے اولین مقالہ نگار نے پُر زور طریقہ پر یہی ثابت کیا ہے کہ اس قسم کا ذہنی کام ایک قسم کی منفعت ہی ہے اور منفعت مالیت رکھتی ہے۔ بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے بھی انہوں نے ایسی چیزوں کا منافع کے قبیل سے ہونا نقل کیا ہے۔ اور ایک موقع پر انہوں نے صاف صاف فرمایا ہے: الحقوق المالیة المتقررة فی محل هو مال ہی فی ذاتها منافع ایضاً (حق الابتکار ۲۳)۔

## ب۔ حقوق مجردہ:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'حق' کی مالیت و حقیقت کے بیان میں "حقوق مجردہ وغیر مجردہ" سے متعلق جو حاصل مطالعہ ہے اس کو بھی ذکر کر دیا جائے، اس لئے کہ ہمارے یہاں یہ بحث بکثرت آتی ہے کہ "حقوق مجردہ کی بیع درست نہیں ہے۔" حق کے تجرذ کے سلسلہ میں مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر فتحی الدربینی کہتے ہیں:

حق مجرد وہ حق ہے کہ جس کا تعلق کسی ایسے محل سے نہ ہو کہ جس کا ادراک حس کے ذریعہ کیا جاسکے۔ جیسے کہ حق شوری، حق ملازمت، اور عہدہ کا حق، اسی طرح حق تملک، اس کے مقابلہ میں 'حق مقررہ' ہے کہ جس کا تعلق مال سے اور کسی ایسے محل سے ہوتا ہے کہ جس کا ادراک حس سے کیا جاسکتا ہے۔

دونوں میں ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ 'حق مقررہ' کے محل کا حکم تنازل یا حق کو ساقط کرنے کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ جیسے حق قصاص کی وجہ سے قاتل مباح الدم ہوتا ہے۔ مگر اس پر تنازل یا اس کی معافی کے بعد وہ غیر مباح القتل اور معصوم الدم ہو جاتا ہے، اور 'حق مجرد' میں اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی وجہ سے حق مجرد پر مالی معاملہ نہیں ہو سکتا (ایضاً ص ۵۶، ۵۷)۔

۲۔ ڈاکٹر نواف کنعان اپنی کتاب "حق المؤلف" میں ذکر کرتے ہیں:

حقوق مجردہ..... وہ حقوق ہیں کہ جن کا ثبوت ان کے حقداروں کے لئے اصلتہ اور ابتداء ہوتا ہے۔ جیسے کہ رشتہ زوجیت کو باقی رکھنے کے لئے شوہر کا حق، اور غلام کی ملکیت کو باقی رکھنے کے لئے آقا کا حق، ایسے حقوق پر معاوضہ کا معاملہ درست ہے۔

حقوق مقررہ..... تو یہ وہ حقوق ہیں کہ جن کا ثبوت صاحب حق سے ضرر کو دفع کرنے کے لئے ہوتا ہے ان پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے (حق المؤلف ۲۴)۔

یعنی انہوں نے ڈاکٹر فتحی کی تقریر کے برعکس تقریر کی ہے، اور عمومی بات یہی معروف ہے کہ 'حقوق مجردہ' پر معاوضہ صحیح نہیں ہے۔ 'الموسوعة الفقہیہ' میں بھی ایک موقع پر آیا ہے:



جو حقوق دفع ضرر کے لئے مشروع کئے گئے ہیں، جن کو حنفیہ 'حقوق مجردہ' کہتے ہیں۔ جمہور فقہاء ان پر معاوضہ کو جائز قرار نہیں دیتے، البتہ مالکیہ کا اختلاف ہے (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۲۳۲/۵)۔

۳۔ مولانا تقی صاحب نے "حق الانتفاع بذوات الاشیاء" کے تحت حق مرور وغیرہ کو حقوق مجردہ کا مصداق قرار دیا ہے جبکہ محض انھیں منافع کا معاملہ کیا جائے اور اس خطہ زمین و عمارت کا معاملہ نہ کیا جائے کہ جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے، اور ہمارے فقہاء کی تفصیلات اسی کو متعین کرتی ہیں۔ وہ جہاں یہ کہتے ہیں کہ حقوق مجردہ کی بیع جائز نہیں تو مراد یہ لیتے ہیں کہ صرف حق ہی حق کی بیع یا منفعت ہی کی بیع درست نہیں ہے، لیکن فقہاء کی تعبیرات میں اور مولانا تقی صاحب کے مضمون میں بھی اس انداز کی تصریح آئی ہے کہ جس سے حق مجرد کا وہی مفہوم متعین ہوتا ہے جو کہ ڈاکٹر فتحی نے ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے گا کہ:

'حق مجرد' کا مصداق ہر وہ حق ہے جس کے ساتھ عین ملحوظ نہ ہو، خواہ اس کا تعلق کسی درجہ میں بھی کسی عین سے ہو یا نہ ہو، اس طرح خواہ اس کی مشروعیت اصلانہ ہو جیسے کہ حق مرور وغیرہ، یا یہ کہ دفع ضرر کے لئے یعنی 'مجرد نہ عین سے بالکل بے تعلق ہونے میں محصور ہے اور نہ ہی اس میں کہ اس کی مشروعیت دفع ضرر کے لئے ہو، جیسا کہ ہمارے بعض فقہاء کی تصریحات سے سمجھا جاتا ہے، اور الموسوعۃ الفقہیہ میں اسی پر بنا کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے۔

جو حقوق دفع ضرر کے لئے مشروع کئے گئے ہیں جن کو حنفیہ 'حقوق مجردہ' کہتے ہیں انہیں نیز یہ کہ ہمارے یہاں جو یہ معروف ہے کہ "حقوق مجردہ" کی بیع درست نہیں ہے، یہ حکم مطلقاً نہیں ہے۔ جیسا کہ تفصیل آرہی ہے، اور مولانا تقی صاحب نے بھی توضیح فرمائی ہے۔ علامہ شامی نے بھی ایک موقع پر فرمایا ہے:

عدم جواز الاعتیاض عن الحق لیس علی اطلاقہ (رد المحتار ۴۰۱)۔

جیسے کہ شامی میں یہ بھی آیا ہے: قال فی البدائع الحقوق المفردة لا تحمل التملیک ولا يجوز الصلح عنها أقول وكذا لا تضمن بالإتلاف قال فی شرح الزيادات للسرخسی وإتلاف مجرد الحق لا یوجب الضمان لأن الاعتیاض عن مجرد الحق باطل إلا إذا فوت حقاً مؤكداً (رد المحتار ۴۰۱۵)۔

اسی عبارت میں "الحقوق المفردة" کے لفظ سے 'حقوق مجردہ' کا مفہوم واضح و متعین ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف حق ہی حق ہے۔ جیسے کہ یہ بات بھی اس عبارت سے سامنے آتی ہے کہ محض حق کے طور پر کسی چیز کا کسی کے لئے ثابت ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس میں کچھ قوت نہ پائی جائے۔ رہی یہ بات کہ یہ قوت کن بنیادوں پر پیدا ہوگی تو اس کی وضاحت حقوق پر معاوضہ کے تحت آنے والی تفصیلات سے ہو جائے گی۔

حقوق۔ ایک فہرست و تعارف:

- ۱۔ حق:- ہو اختصاص یقرّر به الشرع سلطه أو تکلیفاً۔
- ۲۔ حق اللہ:- وہ امر و حکم جس کا نفع عام ہو، یوں بھی کہا جاتا ہے: اللہ کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا۔
- ۳۔ حق عبد:- وہ امر و حکم جس کا نفع خاص ہو، یا مصالح العبد المقررة بمقتضى الشریعة۔
- ۴۔ حق شرعی:- شارع کی طرف سے ثابت ہونے والا حق۔
- ۵۔ حق عرفی:- عرف کی بنا پر مگر شریعت کی تائید کے ساتھ ثابت ہونے والا حق۔
- ۶۔ حق ضروری:- محض دفع مضرت کی بنیاد پر ثابت ہونے والا حق۔
- ۷۔ حق اصلی:- اصلانہ و ابتداء یعنی دفع مضرت کو ملحوظ رکھے بغیر ثابت ہونے والا حق۔
- ۸۔ حق مجرد:- ایسا حق جو کہ عین سے بے تعلق ہو یا جس میں کسی قسم کی قوت نہ پائی جاتی ہو۔
- ۹۔ حق مفرد:- خالص یا تنہا حق یا حق مجرد۔
- ۱۰۔ حق مقرر:- ایسا حق جو کہ مال سے یا کسی ایسے محل سے متعلق ہو کہ جس کا حس سے ادراک کیا جاسکتا ہو۔
- ۱۱۔ حق شخصی:- دو شخصوں کے درمیان ایسا شرعی تعلق و معاملہ کہ جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے لئے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا پابند ہو۔



۱۲۔ حق عینی:۔ کسی شخص و شے کے درمیان پایا جانے والا وہ شرعی ربط و تعلق کہ جس کی وجہ سے وہ اس شے میں تصرف کر سکتا ہے۔

۱۳۔ حق مالی:۔ مال سے متعلق حق۔

۱۴۔ حق غیر مالی:۔ ایسا حق کہ جس کا مال سے کوئی تعلق نہ ہو۔

۱۵۔ حق ملکیت:۔ کسی شے پر مالکانہ تسلط و تصرف کا حق۔ جیسے حق وراثت، حق ولاء، حق وصیت وغیرہ۔

۱۶۔ حق تملک:۔ کسی مباح الاصل شے کو اپنی ملکیت میں داخل کرنے کا حق یا مملوک شے کو ملک کے مشروع ذرائع کے واسطے سے اپنی ملکیت میں داخل کرنے کا حق، یعنی حق ملکیت اور حق تملک میں فرق ہے، اول کا تعلق جس چیز سے ہوتا ہے وہ بوقت تعلق صاحب حق کی ملک میں داخل ہو چکی ہوتی ہے، اور ثانی کا متعلق بوقت تعلق صاحب حق کی ملک میں نہیں ہوتا بلکہ ہر ملک سے آزاد یا کسی دوسرے کی ملک میں ہوتا ہے۔ اول جیسے مملوک غلام کہ آقا کو اس پر ملکیت حاصل ہوتی ہے جسے باقی رکھنے و ختم کرنے کا اس کو پورا حق ہوتا ہے، اور دوم جیسے شکار سے پہلے کہ وہ اس حال میں کسی انسان کی ملک میں نہیں ہوتا۔ 'حق شفیعہ' کو بھی اسی کے تحت شمار کیا جائے گا جیسا کہ بدائع میں ہے: "لأن الثابت للشفیع حق التملک" (۲۱/۵، ۲۱/۶، ۲۱/۷)، اسی طرح 'حق غنیمت مال غنیمت کے احراز مدارالاسلام سے پہلے۔

۱۷۔ حق انتفاع:۔ کسی شے سے کام لینے و فائدہ اٹھانے کا حق۔

'حق ملکیت اور حق انتفاع' کے درمیان فرق یہ ہے کہ اول کا مطلب ہے شے مملوک کی ملک میں تصرف کرتے ہوئے اس کو ہبہ کرنا، بیچنا، یا ضائع کرنا وغیرہ، اور دوم کا مصداق ہے ملک کو باقی رکھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر کرنا، خود اسے استعمال کرنا یا کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرنا۔

۱۸۔ حق احتباس:۔ اپنی کسی ضرورت و حق کی وجہ سے دوسرے کے مال کو اپنے پاس رکھ لینے و روک لینے کا حق۔

۱۹۔ حق قرار بروقف:۔ موقوفہ جائیداد کو اپنے پاس و استعمال میں روک رکھنے کا حق۔

۲۰۔ حق ارتفاق:۔ اپنی زمین و جائیداد سے مطلوبہ فائدہ اٹھانے کا حق یا اپنی مملوکہ زمین سے استفادے کے لئے دوسرے کی زمین سے متعلق و متصل حق کہ جب تک دوسرے کی زمین سے متعلق و متصل حق سے کام نہ لیا جائے اپنی زمین سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ حنفیہ نے اس کی تعریف یوں کی ہے: حق مقرر علی عقار لمنفعة عقار آخر (الموسوعة الفقهیہ ۲۰۱۰، بحوالہ البحر الرائق ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۹)۔ شیخ الزرقاء کے الفاظ اس کو زیادہ واضح کرتے ہیں: الارتفاق منفعة مقررة لعقار علی عقار آخر مملوک لغیر الأول (الدخل الفقہی العام ۳۰۲۵)۔ دوسروں کے نزدیک تعریف ہے: "تحصیل منافع متعلق بالعقار" اسی لئے دوسرے کے یہاں اس میں عموم ہے (الموسوعة الفقهیہ ۱۰۳)۔ شیخ الزرقاء کی تصریح کے مطابق مالکیہ اور بعض کے نزدیک اس میں توسع ہے، اپنے اختیار و معاملہ سے بھی ان کو طے کیا جاسکتا ہے، جبکہ اکثر نے اس کی انواع کو محصور قرار دیا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) حق الشرب، (۲) حق الشفہ، (۳) حق الحجری، (۴) حق التسمیل یا حق المسیل، (۵) حق المرور یا حق الطریق، (۶) حق التعلی، (۷) حق الجوار۔

۲۱۔ حق شرب:۔ ضرورت کا پانی لانے و حاصل کرنے کا حق یا حصہ۔

۲۲۔ حق شفہ:۔ پینے کا پانی لینے لانے و حاصل کرنے کا حق۔

۲۳۔ حق مجری:۔ زمین کو سینچنے کے لئے پانی کے لانے کا حق۔

بعض نے ان میں سے کسی ایک کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اکثر حق شرب کو ذکر کیا جاتا ہے، بعض حضرات نے "حق شرب" کو زمین کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، اکثر کی رائے میں شرب عام ہے اور باقی دونوں خاص ہیں۔ شفہ پینے سے متعلق ہے اور مجری سینچائی سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۴۔ حق مسیل:۔ گھریا کھیت کی ضرورت سے زائد یا مستعمل یا بارش کا پانی بہانے کا حق۔

۲۵۔ حق مرور:۔ اپنے گھریا زمین تک پہنچنے کے لئے گزرنے کا حق۔

۲۶۔ حق تعلی:۔ گھر کی ایک منزل پر دوسری منزل بنانے کا حق۔

۲۷۔ حق جوار:- اپنے گھر کے اندر کے تصرفات میں پڑوس کی رعایت کا حق، یا پڑوس کے مکان اور حق سے استفادہ کا حق۔

مثلاً: پڑوس کی دیوار پر اپنے چھپر و چھت کار کھنا، یا کیل وغیرہ کا لگانا، یا پڑوس کے صحن کی طرف روشن دان و کھڑکی لگانا و بنانا، اسی طرح دروازہ کا کھولنا۔

۲۸۔ حق الانتفاع بذوات الاشياء:- حق ارتفاق

۲۹۔ حق اسبقیت:- کسی چیز کی طرف سبقت کی وجہ سے اس سے انتفاع کا خصوصی حق یا اس کے ساتھ حق اختصاص، اس حق کا دائمی ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسے مسجد یا مجلس میں کسی جگہ کی طرف سبقت، اسی طرح بازار میں کسی جگہ کا اختیار کر لینا، بنجر زمین کے کسی حصہ کی حد بندی اس کی آبادی کے بغیر۔

۳۰۔ حق اختصاص:- حق اسبقیت۔

۳۱۔ حق تجارت:- کاروبار و تجارت سے متعلق اختیار کئے جانے والے وہ اسباب جو کہ کاروبار کے اعتماد اور ترقی و فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں جیسے گڈول، یعنی کارو بار کمپنی کا مخصوص تجارتی نام، ٹریڈ مارک، یعنی مخصوص تجارتی نشان و علامت، تجارتی لائسنس، یعنی تجارتی سامان کی فراہمی یا نقل و ارسال یا درآمد و برآمد کے لئے حاصل کئے جانے والے مخصوص سرکاری اجازت نامے، اشیاء کی فراہمی کے لئے ٹھیکیداری کے معاملات و کاغذات۔

۳۲۔ حق عقد:- عقد کی وجہ سے حاصل ہونے والا حق یا عقد سے متعلق حق۔

اڈل سے عقد کے بعد حاصل ہونے والے حقوق مراد ہیں، خواہ وہ معنوی ہوں یا مادی، معنوی جیسے زوجیت کو باقی رکھنے یا زوجیت کی وجہ سے عورت سے استمتاع کا حق، جو کہ شوہر کو عقد نکاح کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔

مادی جیسے حق نفقہ، یعنی بیوی کی واجبی ضروریات کی کفالت کا حق جو کہ شوہر پر واجب ہوتا ہے۔ اور بیوی کو یہ حق عقد نکاح کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے تحت 'حق وظیفہ' بھی داخل ہے، اسی طرح وہ ٹھیکیداری جس کا تعلق کسی تعمیری یا اس انداز کے کام انجام دینے سے ہو، اشیاء کی فراہمی سے نہیں۔ اور عقد سے متعلق حقوق سے مراد عقد کرنے اور عقد کو باقی رکھنے و ختم کرنے کا حق ہے جس کے تحت 'خلو دار' کے حق کو ذکر کیا جاتا ہے کہ اپنی مملو کہ اراضی و جائداد کے حق میں مالک کسی سے نیا عقد کرنے اور پرانے کو ختم کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح کرایہ دار اس کو باقی رکھنے کا حق رکھتا ہے۔

۳۳۔ حق تمتع بالزوجہ:- بیوی سے مخصوص استمتاع و انتفاع کا حق۔

۳۴۔ حق نفقہ:- کسی انسان یا حیوان یا خصوصیت سے بیوی کی واجبی ضروریات کی کفالت کا حق۔

۳۵۔ حق طلاق:- عقد نکاح کو ختم کرنے کا حق۔

۳۶۔ حق قسم الزوج:- ایک سے زائد بیویاں رہنے کی صورت میں حقوق زوجیت کی ادائیگی کے لئے باری کا حق جس کا تعلق محض شب گذاری سے ہوتا ہے۔

۳۷۔ حق وظیفہ:- کسی خصوصیت کی بنیاد پر حکومت یا اوقاف کی طرف سے مستقل حاصل ہونے والی آمدنی کا حق، خواہ کسی مقدار میں ہو، کسی حیثیت سے ہو اور جتنے وقفہ سے ہو، مثلاً قضاء، افتاء، تدریس، امامت و خطابت، مؤذنی و فراشی وغیرہ کے وظائف، عصری رعایتی، امدادی و تشجیحی وظائف۔

۳۸۔ حق خیار مخیرہ:- شادی شدہ عورت کو کسی وجہ و بنیاد پر عقد نکاح کو ختم و فسخ کرنے کے لئے حاصل ہونے والا حق۔

۳۹۔ حق نسب:- پیدا ہونے والے بچے کی صاحب نطفہ اور اس کے خاندان یا یوں کہیے کہ واطی کی طرف نسبت کا حق۔

۴۰۔ حق حضانت:- بچے کی پرورش و نگہداشت کا حق (شیر خواری کے زمانہ میں اور اس کے بعد اپنی ضروریات کی ادائیگی میں خود کفیل ہونے تک)۔

۴۱۔ حق ولایت:- نابالغ و یتیم کے معاملات و املاک کی نگہداشت اور ان کی کفالت کا حق۔

۴۲۔ حق وراثت:- قریبی قرابتداری کی موت پر اس کی چھوڑی ہوئی املاک کا حق۔

۴۳۔ حق ولاء:- آزاد شدہ غلام کے مرنے پر وارث ہونے والے اعزہ کے نہ ہونے کی وجہ سے آقا کی وراثت کا حق۔

۴۴۔ حق شفعہ:- پڑوسی یا شریک کو، پڑوس یا شرکت کی وجہ سے پڑوس یا شرکت کی جائداد کو خریدنے کا حق۔



۴۵۔ حق عقوبت و انتقام:- ایسے حقوق جو کہ کسی انسانی جسم پر بیجا دست درازی کرنے والے پر خود مظلوم یا اس کے ورثہ کو حاصل ہوتے ہیں جیسے کہ حق قصاص جو کہ مقتول کے اولیاء کو قاتل پر حاصل ہوتا ہے یا خود زخمی کو حاصل ہوتا ہے۔ ایسے ہی قتل یا زخم پر دیت کا حق تعزیر کے طور پر سزا دلانے کا حق۔

۴۶۔ حق قصاص:- عمدتاً قتل کرنے یا زخمی کرنے کی صورت میں مجرم سے بصورت جرم بدلہ لینے کا حق۔

۴۷۔ حق خصومت و دعوی:- کوئی نزاعی معاملہ پیدا کرنے پر نزاع و دعوی کو ختم کرنے یا باقی رکھنے و آگے بڑھانے کا حق۔ اسی طرح کسی معاملہ کو عدالت میں لے جانے و پیش کر کے آگے بڑھانے کا حق۔

۴۸۔ حق ابتکار:- ایجاد کا حق یعنی اپنی ایجاد سے فائدہ اٹھانے کا حق۔

۴۹۔ حق تالیف و طباعت:- تالیف و طباعت کا حق، یعنی تالیف و تصنیف سے مادی فائدہ اٹھانے کا حق۔

نوٹ: حقوق سے متعلق اس چارٹ و تفصیل میں زیادہ تر مولانا تقی صاحب کے مضمون اور شیخ مصطفی الزرقاء کی المدخل الفقہی العام جلد ۳ کی حقوق سے متعلق بحث سے استفادہ کیا گیا ہے۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں بھی اسقاط، امتیاض، ارتفاق، وغیرہ عناوین کے تحت کافی تفصیل آئی ہے۔ رد المحتار سے بھی بہت کچھ ملا ہے۔ مزید حق الابتکار اور المدخل لدراسۃ الفقہ الاسلامی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، مجلۃ الاحکام سے بھی مدد ملی ہے۔

(۲) و (۵) حقوق پر معاوضہ کا کیا حکم ہے؟

جن حضرات کے نزدیک 'حقوق و منافع' بھی محض املاک میں سے نہیں بلکہ 'اموال' کی اقسام ہیں، ان کے نزدیک تو حقوق پر معاوضہ اور ان کی بیع کا مسئلہ واضح ہے کہ وہ جائز کہتے ہیں۔ اگرچہ جیسا کہ پہلے آچکا ہے کہ اپنے اس ضابطہ کے باوجود کہ 'منفعت و حق' بھی 'اموال' میں سے ہیں۔ یہ حضرات استثناء کے قائل ہیں، مثلاً جو حقوق محض معنویت کے قبیل کے ہیں انسانی عقل و صلاحیت پر مبنی ہو کر ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے حق ابتکار و حق تالیف و حق وظیفہ، ان میں نہ تو وراثت کا سوال ہے نہ ہی نقل ملک کا، اسی طرح مولانا تقی صاحب نے 'حقوق ضروریہ' کے عنوان سے جن حقوق کو ذکر کیا ہے بظاہر ان پر معاوضہ کسی کے نزدیک درست نہیں ہے۔ 'حق اسبقیت و حق تملک' کی بابت بھی اسی انداز کی بحث ہے۔

حنفیہ چونکہ 'حقوق' کو املاک میں سے تو مانتے ہیں مگر 'اموال' میں سے نہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک حقوق کی بیع کے جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور عدم جواز معروف ہے، مگر فقہاء حنفیہ کی تصریحات و تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی اس بیع کے عدم جواز کا حکم مطلقاً نہیں ہے۔ تفصیل ہے، جیسے کہ یہ حکم مطلق نہیں ہے کہ حقوق پر معاوضہ نہیں لیا جاسکتا، حاصل یہ کہ بعض پر معاوضہ کا جواز حتیٰ کہ بصورت بیع بھی، ذکر کیا گیا ہے، اور بعض پر کسی طرح بھی اجازت نہیں، ائمہ مذاہب اور علماء مذاہب کے اقوال کی نسبت سے یہ جواز و عدم جواز کہیں اتفاتی ہے اور کہیں اختلافی۔

الف۔ جواز و عدم جواز کا ضابطہ:

'الموسوعۃ الفقہیہ' کی نقل و تصریح کے مطابق مذاہب ثلاثہ نے تو اس سلسلہ میں کوئی ضابطہ نہیں ذکر کیا ہے۔ البتہ حنفیہ نے دو ضابطے و قاعدے ذکر کئے ہیں، اور بظاہر دونوں کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں نکلتا، بلکہ حاصل ایک نکلتا ہے، اس لئے کہ بیان ضابطہ میں اختلاف کے باوجود امثلہ و جزئیات مشترک ذکر کئے گئے ہیں۔

ایک ضابطہ تو یہ کہ "الحق إذا كان مجرداً عن الملك فإنه لا يجوز الاعتياض عنه، وإن كان حقاً متقدراً في المحل الذي تعلق به صح الاعتياض عنه" اکثر نے اسی کو ذکر کیا ہے۔

دوسرا ضابطہ تو یہ ہے کہ "الحق إذا كان شرعاً لدفع الضرر فلا يجوز الاعتياض عنه، وإذا كان ثبت على وجه البر والصلة فيكون ثابتاً له إصالة فيصح الاعتياض عنه" بہت سے حضرات نے اس کا تذکرہ کیا ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۴۳/۳)۔ شامی وغیرہ نے اسی دوسرے قاعدے کو ذکر کیا ہے اور یہی زیادہ معروف ہے۔ اگرچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'دفع مضرت' کا پہلو کسی نہ کسی درجہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے اور بایں معنی ہر حق کا ثبوت اصالتاً ہے کہ وہ شارع کی نص یا تائید شرع سے ثابت ہوتا ہے۔ البتہ فرق اس کا ہے کہ بنیادی طور پر دفع مضرت مقصود و ملحوظ ہے، یا صاحب حق کی منفعت و مصلحت و ضرورت، اور اس سلسلہ کی تفصیلات کو دیکھنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ جس حق پر عرض لیا جاسکتا ہے اس میں دونوں باتیں پائی جانی چاہئیں یعنی 'اصالت ثبوت' اور 'ثبوت فی المحل' بھی یعنی کسی عین سے متعلق ہو کر، اور اس سے مرتبط ہو کر۔ چنانچہ صاحب بدائع کا موقف یہی ہے کہ انہوں نے یہ ذکر کرنے



کے بعد کہ ایسے حق کے لئے حق عبد ہونا، اور خود صاحب معاملہ کا حق ہونا شرط ہے۔ تیسری شرط ذکر کی ہے: اُن یکون حقاً ثابتاً له فی المحل (بدائع ۶۰۶)۔ اور حق شفعہ پر تنازل بالعوض کے عدم جواز میں عدم ثبوت فی المحل، کو یعنی محض حق تملک ہونا ذکر کیا ہے، اور حق تملک، اور ثبوت ملک دونوں میں فرق ہے۔

ب۔ وہ حقوق جن پر معاوضہ لیا جاسکتا ہے:

گذر چکا ہے کہ حنفیہ نے یہ اصل ذکر کی ہے کہ جو حقوق اصلہ وابتداءً ثابت ہوتے ہیں ان پر معاوضہ درست ہے۔ (تفصیل کے ساتھ آگے آ رہا ہے)۔ کہا جاسکتا ہے کہ اصولی طور پر ایسے حقوق حسب ذیل ہیں:

(۱) حقوق ارتفاق، (۲) حقوق عقد، (۳) حقوق ابتکار و تالیف، (۴) حقوق اسبقیت و اختصاص، (۵) حقوق عقوبت و انتقام، (۶) حقوق خصومت و دعویٰ، (۷) حقوق ملکیت، (۸) حقوق تجارت۔

مذکورہ حقوق سے متعلق تعریفات و توضیحات گذر چکی ہیں۔

ج۔ حقوق پر معاوضہ کی صورتیں:

اپنے مملوک کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کے مقابلہ میں اس کے عوض لینے کی معروف صورت 'بیع' کی ہے۔ اور دوسری صورت 'اجارہ' کی ہے۔ جبکہ آدمی کسی منفعت پر وقتی تملیک کا معاملہ کرے، دائمی معاملہ حنفیہ کے نزدیک درست نہیں ہے۔ دوسرے حضرات کے یہاں ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی بیع کہلائے گا، تفصیل گذر چکی ہے۔ عوض لے کر ملک کو ختم کرنے یا منتقل کرنے کی تیسری صورت 'تنازل و تصالح' کی ہے یعنی عوض لے کر اپنے حق سے دست بردار ہونا جس کے لئے دوسری تعبیرات بھی استعمال ہوتی ہیں، عام بھی جیسے اسقاط، اور خاص بھی جیسے 'خلع و کتابت'، اس صورت میں بیع و اجارہ کی معروف شکل و معاملہ کے مطابق بھاؤ تاؤ اور ایک دوسرے کے بالمقابل دونوں اشیاء کی مادی و مالی حیثیت کی پوری رعایت کی بھرپور کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ ایک شے کی واقعی حیثیت، نافیعت اور مادیت و مالیت سے الگ ہٹ کر یہ سوچ لیا جاتا ہے کہ اچھالاؤ، یہ دے کر یہ معاملہ کر لو، یعنی فقہاء کی تعبیر میں جس طرح بیع و اجارہ کی بنا 'مماطلہ' (مال مٹول اور کھینچ تان) پر ہوتی ہے، اس طرح اس کی بنا اس پر نہیں بلکہ مسامحتہ یعنی چشم پوشی و درگزر پر ہوتی ہے، جیسے کہ مہر کے طے کرنے اور لینے و دینے میں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوتا ہے، دو لڑکے وارث ہوتے ہیں۔ ایک لڑکا اپنا واقعی حق و حصہ نہ لے کر جو کہ باپ کی چھوڑی املاک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ دوسرے بھائی سے یہ معاملہ کر لیتا ہے کہ تم متروکہ و موروثہ اشیاء میں سے، بس فلاں چیز مجھ کو دیدو باقی سب تم لے لو، جبکہ اس کا واقعی حق جیسے متفرق چیزوں میں ہوتا ہے ویسے ہی بسا اوقات جو چیز وہ لے رہا ہے اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

فقہاء نے حقوق پر معاوضہ کی بحث کرتے ہوئے بیع و تنازل دونوں ہی صورتیں ذکر کی ہیں اور زیادہ تر تیسری صورت کے جواز کو ذکر کیا ہے اور اختیار کیا ہے (تنازل کی بحث عموماً کتاب الف میں آئی ہے، اور بعض دوسرے مواقع پر بھی آجاتی ہے، اس سلسلہ میں صاحب بدائع نے بڑی اچھی بحث کی ہے جو کہ اصولی بھی ہے اور فرعی بھی، ملاحظہ ہو: ۶۰۶/۴۲-۵۳)۔ وہ حقوق جن پر معاوضہ لیا جاسکتا ہے جن کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، اوپر آئی ہوئی ان کی ترتیب کے مطابق معاوضہ کی صورتوں و تفصیل کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

د۔ حقوق پر معاوضہ کی تفصیل:

۱۔ حقوق ارتفاق:

یعنی..... ۱۔ حق شرب، ۲۔ حق مجری، ۳۔ حق تسبیل، ۴۔ حق مرور، ۵۔ حق علو، ۶۔ حق جواز۔

الف۔ حقوق ارتفاق پر عوض لینا تصالحوماً و تنازلاً بالاتفاق جائز ہے، شرح مجلۃ الاحکام میں اس طور پر معاوضہ کا علی الاطلاق جواز ذکر کیا گیا ہے (شرح الجلد ۱۲۱)۔

ب۔ حقوق ارتفاق پر عوض لینا بصورت بیع، بشرطیکہ تبعاً ہو، بالاتفاق جائز ہے، اس کی چابغ صغیر میں خود امام محمد نے تصریح کی ہے۔ (الجامع الصغیر ۳۵۶)

ج۔ حقوق ارتفاق پر عوض، جبکہ استقلالاً ان کی بیع ہو یعنی اس طرح کہ محض ان حقوق کو بیچا و خریدا جائے نہ کہ وہ جائیداد بیچی و خریدی جائے جس کا نفع ان سے

متعلق اور ان پر مبنی ہے، اور نہ وہ جائداد زمین کہ جو ان حقوق کا محل ہوتی ہے۔ یعنی جس کو اپنی زمین کے نفع اور ان حقوق کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مذاہب ثلاثہ میں یہ بیع بھی درست ہے، اور فی الجملہ حنفیہ کے یہاں بھی جواز منقول ہے۔ 'حق شرب'، (جو کہ حق شرفہ و حق مجری کو بھی شامل ہے) اور 'حق مرور' کے متعلق جواز منقول ہے۔ 'حق مرور' کا جواز تو ظاہر روایت کے مطابق اور علمۃ المشائخ کا مختار ہے، اور 'حق شرب' کا جواز بھی بہت سے حضرات نے اختیار کیا ہے۔ بلکہ بعض اس میں اطلاق پر ضمان کے بھی قائل ہیں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ایک کھیت کے حصہ کا پانی دوسرا استعمال کر لے (رد المحتار ۴/۱۳۲-۱۳۳)۔

حنفیہ کے یہاں جواز اس تفصیل و تنقیح پر مبنی قرار دیا جائے گا۔ جیسے مولانا تفتی صاحب نے فقہاء حنفیہ کی ذکر کردہ تفصیلات و دلائل کا جائزہ لینے کے بعد ذکر کیا ہے جس کے ضمن میں خاص طور سے 'حقوق ارتفاق' سے متعلق یہ بات آئی ہے:

”وہ حق جس کا تعلق کسی عین سے بائیں معنی ہو کہ عین اس کا محل ہو یعنی اس کے لئے عین کو استعمال کرنا پڑے۔ اس کا بیچنا بشرط تعیین و عدم جہالت اور بشرط عدم ضرر و ضرر، جائز ہے۔“

اس لئے ان کے یہاں اس سے متعلق ہونے اور دوسرے عین کے اس کا محل ہونے کی وجہ سے خود یہ حق عین کی حیثیت و حکم رکھتا ہے۔ جیسا کہ صاحب فتح القدر وغیرہ نے صراحت کی ہے (ایضاً ۱۳۲)۔ اس تفصیل کے پیش نظر حدود کی تعیین و تمیز کی بنیاد پر صاحب فتح القدر نے 'حق مسیل و تسیل' کے جواز کی بھی تصریح کی ہے (حوالہ سابق)۔

احقر کہتا ہے کہ ہمارے فقہاء نے 'حق تعلی و علو' کی بیع کو یہ کہہ کر منع فرمایا ہے کہ 'علو' کا حاصل ہو و فضا ہے تو حق علو عین سے متعلق نہیں، لہذا بیچنا منع ہے۔ (بدائع الصنائع ۶۶/۵، رد المحتار ۴/۱۳۳) تو کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اس وقت ہے جبکہ 'علو' کا معاملہ کسی زمین کے حصہ سے متعلق اس صورت میں ہو کہ وہاں کوئی عمارت نہ پائی جاتی ہو کہ اس صورت میں علو کا تعلق سرے سے کسی عین سے نہیں ہوتا کہ 'علو' اور زمین کے بیچ میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا، لیکن اگر زمین پر ایک عمارت موجود ہے اس کے اوپری حصے کا معاملہ کیا جائے تو یہاں تو علو بہر حال ایک عین یعنی موجودہ عمارت کی چھت سے متعلق ہوگا اور وہ چھت اس کا محل بنے گی جس میں تعیین اور رفع جہالت نہایت آسان ہے۔ مذاہب ثلاثہ میں علو کے جواز کا جو تذکرہ آیا ہے وہ زمین اگر عمارت کی ٹخلی منزل سے خالی ہو تو مقید ہے کہ خریدار بیچنے والے کے درمیان یہ معاملہ و شرط ہو کہ تم یہاں عمارت بناؤ گے تاکہ میں (خریدار) اس پر عمارت بنا سکوں، یا اپنی ضرورت کے مطابق اوپری حصہ کو اپنے کام میں لے سکوں، اور عمارت موجود ہو اور معاملہ چھت و سطح کا ہو تو اس کی ضرورت نہیں (ملاحظہ ہو: مضمون مولانا تفتی صاحب، شائع شدہ: مجلہ بحث و نظر ص ۹)۔

## ۲۔ حقوق عقد:

'حقوق کے تعارف' کے ذیل میں 'حق عقد' کی دو شقیں ذکر کی گئی ہیں:

اول: عقد کی وجہ سے حاصل ہونے والا حق، دوم: عقد سے متعلق۔

الف۔ عقد کی وجہ سے حاصل ہونے والے حقوق کے تحت حق نفقہ، حق تمتع بالزوجہ، حق وظیفہ جیسے حقوق آتے ہیں۔

## حق نفقہ:

عقد نکاح کی وجہ سے شوہر پر بیوی کا جو نفقہ (واجبی ضرورتوں کی کفالت و اخراجات کا) واجب ہوتا ہے۔ اس پر باہم 'تنازل و تصالح' کی بنیاد پر یہ معاملہ ہو سکتا ہے کہ عقد کی وجہ سے جس طرح اس کا وجوب ہوتا ہے اور ادائیگی لازم ہوتی ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ جبکہ شوہر بیوی کو طے شدہ شے یا مال کی مقدار دیدے۔ زوجین کے درمیان نفقہ کے سلسلہ میں تصالح کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یومیہ یا ماہانہ ایک مقدار پر معاملہ کر لیں (رد المحتار ۲/۶۵۳-۶۵۸)، البتہ دونوں صورتوں میں بحیثیت حکم، ایک فرق تو یہ ہے کہ پہلی صورت میں ایک طے شدہ شے یا مقدار کے لین دین پر معاملہ و مطالبہ ختم ہو جاتا ہے، اور پھر بیوی بطور نفقہ شوہر سے کچھ نہیں مانگ سکتی، جبکہ دوسری صورت میں زوجیت کے باقی رہنے تک طے شدہ مقدار کی ادائیگی برابر ہوتی رہتی ہے اور لازم ہوتی ہے، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں حالات کے بدل جانے کی وجہ سے طے شدہ مقدار میں کمی و زیادتی کی جائیگی۔ جبکہ پہلی صورت میں آئندہ جو بھی حالات ہوں اور جتنی طویل مدت باہمی رفاقت و زوجیت کے رشتے کے ساتھ گزرے جو کچھ طے کر کے لے لیا گیا اور دید یا گیا اس پر مزید کچھ دیئے جانے یا اس میں سے واپسی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

حق تمتع بالزوجہ:..... یعنی عقد کے بعد شوہر کو زوجیت کو باقی رکھتے ہوئے عورت سے انتفاع و استعمال کا حق ہے۔ شوہر بیوی سے عوض لے کر اس سے دست



بردار ہو سکتا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے 'خلع' کہتے ہیں، اور اس صورت کے لئے طلاق علی المال کی بھی تعبیر آتی ہے، اگرچہ دونوں کے درمیان ازروئے احکام کچھ فرق کیا جاتا ہے۔

### حق وظیفہ:

یعنی حقوق عہدہ و ملازمت یا خصوصیت، اصحاب حقوق ایسے حقوق پر بطور تنازل و دست برداری عرض لے سکتے ہیں۔

اگرچہ اس میں تفصیل ہے کہ محض 'صرف زر' کی وجہ سے معاملہ کرنے والے کی طرف مطلوبہ حق منتقل ہوگا یا نہیں، اور یہ کہ اگر حاصل نہ ہو سکے تو اصل صاحب حق سے ادا کردہ معاوضہ واپس لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جیسے کہ بعض حضرات شوائع وغیرہ نے یہ قید لگائی ہے کہ ایسا معاملہ انھیں وظائف پر کیا جاسکتا ہے جو کدائی ہوتے ہیں اور جن میں حاصل شدہ مناصب و وظیفہ سے علیحدگی کا سوال نہیں پیدا ہوتا اور عموماً ان کا تعلق اوقاف سے ملنے والے وظائف سے ہوتا ہے۔

احقر کے خیال میں ادا کردہ معاوضہ کی واپسی کے سلسلہ میں مولانا تقی صاحب کی رائے مناسب ہے کہ اگر صاحب حق اپنی جگہ وظیفہ پر حسب سابق باقی رہے اور ذمہ داران اس کی ذمہ داری کو ختم نہ کریں تو معاوضہ کی واپسی ہوگی، ورنہ نہیں، اگرچہ اس معاملہ کرنے والے اور عوض دینے والے کو وہ وظیفہ و منصب حاصل نہ ہو سکے۔ اسی طرح یہ بات بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ دائمی وظائف میں ہی درست ہوگا۔ الایہ کہ معاملہ موقفاً کیا گیا ہو۔

اس موقع پر سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی کے بعد ملنے والی 'پنشن'، اسی طرح مخصوص بنیادوں پر ملنے والے سرکاری وظائف وغیرہ کا ذہن میں خیال آتا ہے کہ کیا ان پر عوض لیا جاسکتا ہے۔ بظاہر تو وظائف سے دست برداری کے مسئلہ کو دیکھتے ہوئے بطور دست برداری اس کا جواز سمجھ میں آتا ہے، اور اگر مولانا تقی صاحب کی تحریر و تنقیح کے مطابق اس کو دیکھا جائے کہ ایسی کسی بھی صورت میں متعینہ حق کو حاصل کرنے کے لئے عموماً بھاگ دوڑ اور اخراجات سے کام لینا پڑتا ہے اور کاغذات بنوانے پڑتے ہیں پھر انھیں کاغذات کی بنیاد پر حق کی وصولیابی ہوتی رہتی ہے اور ان کے بغیر وصولیابی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے صاحب حق سے معاملہ کرنے والا بھی ان کاغذات کے لینے پر مجبور ہے، کہ وہ ان کے ذریعہ ہی وہ مطلوبہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اشیاء کے لئے حاصل کردہ لائسنس کی طرح اس مخصوص کاغذ و سرٹیفکیٹ کی حیثیت عرفی طور پر مال کی ہوگی۔ لہذا اس پر بیع کا معاملہ کیا جاسکتا ہے، البتہ ایسے کاغذات کی ایک مدت کے بعد تجدید ہوتی ہے۔ اور اس پر اخراجات ہوتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا کہ معاملہ کرنے والے نے کاغذ میں درج مدت کے لئے معاملہ کیا ہے یا مطلق۔ اول صورت میں مدت پوری ہونے پر اصل صاحب حق کی طرف حق لوٹ جائے گا اور وہ کاغذ بنوائے گا، اور اگر معاملہ مطلق و دائمی ہے تو پھر معاملہ کرنے والا ہی چونکہ اب اس سے فائدہ اٹھائے گا اس لئے تجدید کاغذات کے اخراجات وہی برداشت کرے گا۔

اسی طرح آج کل مختلف صورتوں میں حکومتوں کی طرف سے ٹھیکے ملتے ہیں۔ ان میں بھی ایک قسم کا عقد ہی ہوتا ہے۔ لہذا ٹھیکیداری کو بھی اسی قسم کے ذیل میں شمار کر کے اس پر عوض لینے کے جواز کو 'پنشن' سے متعلق مذکور تفصیل کے مطابق اس پر عوض لینے کے جواز کو سوچا جاسکتا ہے، دست برداری کی حیثیت سے بھی اور ٹھیکیداری کے اسناد وغیرہ کا معاملہ ہو تو بیع کے طور پر بھی۔

نوٹ: الف۔ حق نفقہ، حق تمتع و حق وظیفہ پر عوض لینے کا جواز دست برداری کے طور پر ہی ہے۔ بیع درست نہیں ہے، البتہ جیسا کہ ذکر کیا گیا متعلقہ معاملہ سے متعلق اگر کچھ کاغذات ضروری درکار ہوں اور صاحب حق کے پاس موجود ہوں تو ان پر بیع کا معاملہ ہو سکتا ہے۔

ب۔ 'وظیفہ' کا جو عرفی مفہوم ہے کہ کسی ادارے، حکومت یا وقف کی طرف سے بغیر کسی عقد کے کسی دوسری بنیاد پر، کسی شخص کو کچھ دینا طے کر دیا جائے، اس کے مفہوم کے مطابق ایسے وظائف کو 'حقوق عقد' کے تحت شمار نہیں کیا جاسکتا، میں نے محض مناسبتاً ذکر کر دیا ہے۔

### ب۔ عقد سے متعلق حق:

یعنی 'حق خلودار' اور عرفی زبان میں پگڑی گذشتہ سیمینار میں اس کے متعلق تجویز پاس ہو چکی ہے کہ اپنے حق سے دست برداری کی حیثیت سے اس کا جواز ہے، خواہ مالک مکان و دکان کرایہ دار سے لے یا کرایہ دار ابتداء معاملہ میں اس کے دینے کی وجہ سے دوسرے کرایہ دار یا خود مالک سے لے۔

### ۳۔ حق ابتکار و تالیف:

یعنی اپنی کسی ذہنی کوشش و کاوش سے دوسروں کو مادی فائدہ حاصل کرنے کا موقع دینے کے مقابلہ میں عوض لینا، خواہ وہ کسی ضرورت کی چیز کی ایجاد ہو جیسے



دوائیں، سائنسی اور آسائشی و آرائشی آلات و اسباب یا کوئی تالیف و تصنیف۔

آج کل عام رجحان ان حقوق پر عوض لینے کے جواز کا ہے حتیٰ کہ ہمارے اکابر علماء ہندوپاک میں بھی ایک طبقہ اس کا قائل ہے، اور بہت سے قائلین حرمت نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ مولانا تقی صاحب کے مضمون میں اس سلسلہ کے دلائل بھی آگے ہیں اور شبہات کے جوابات بھی میری نظر میں اس سلسلہ کی سب سے مبسوط چیز حق الایجاد و تالیف الفقہ الاسلامی المقارن نامی کتاب ہے جس میں اسی عنوان سے سب سے مفصل، مبسوط اور مضبوط مقالہ شامل ہے جس کے حوالہ سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ایجاد و تالیف ایک قسم کی منفعت ہے اور اس کی حیثیت درخت کے پھل کی سی ہے۔ متقدمین اہل علم میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی اس کا منفعت ہونا تسلیم کیا ہے، اور منافع پر معاوضہ بالاتفاق درست و جائز ہے۔ امام قرانی نے بھی اس کا حق ہونا ذکر کیا ہے، اور عموماً کم از کم مذاہب ثلاثہ کے علماء حقوق پر بھی معاوضہ کے جواز کے قائل ہیں۔ اگرچہ خود امام قرانی نے حق ہونا تو تسلیم کیا ہے مگر حق مالی ہونے سے انکار کیا ہے۔ صاحب حق الایجاد نے ان کا تحقیقی جواب دیا ہے۔

مولانا تقی صاحب کے مضمون میں موجود یہ تفصیل و تصریح بھی اس سلسلہ میں لائق توجہ ہے کہ موجودہ مؤلف کو اپنی ایجاد و تالیف کے بارے میں جو سبقت حاصل ہوتی ہے، شوائع و حنا بلہ کے یہاں ایسی سبقت کے مقابلے میں اگرچہ دینیات سے اس کا تعلق کیوں نہ ہو، عوض لیا جاسکتا ہے تنازلاً و تصالحاً تو وہ اس پر متفق ہیں، اور دونوں مذاہب کے بعض حضرات بیع کو بھی درست قرار دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی کی تصریح کے مطابق وظائف سے نزول کے جواز کی بنیاد وظائف کا حصول مال کے لئے ذریعہ بننا ہے، کیوں نہ اسے یہاں بھی گوارا کر لیا جائے۔ جبکہ وظائف کا خارج میں کسی عین سے تعلق نہیں ہوتا، اور ان حقوق کا تعلق اعیان سے اتنا گہرا ہے کہ اعیان کے ذریعہ ہی ان کا علم اور دوسروں کو ان سے واقفیت ہوتی ہے اور اعیان کے واسطے سے ہی ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے حتیٰ کہ خود صاحب حق بھی اعیان کو واسطہ بنائے بغیر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، خواہ جس صورت و شکل میں واسطہ بنانا پڑے۔

رہی یہ بات کہ یہ عوض بطور بیع ہوگا یا حق سے دست برداری کے طور پر، عمومی خیال تو اس سلسلہ میں بیع یا اجارہ کے انداز کا ہے۔ بالخصوص جبکہ حقوق ایجاد و تالیف، منفعت قرار دے کر حکم متعین کیا جائے۔ مذاہب ثلاثہ میں منافع کی بیع درست ہے اور اجارہ تو ہو ہی سکتا ہے۔ احقر کے خیال میں ان حقوق پر معاوضہ حق سے دست برداری کی حیثیت سے ہی درست ہے۔

اگر موجودہ مؤلف کاغذ پر قلمبند کئے گئے ذہنی خاکہ پر معاملہ کرنے یا اس سلسلہ کے آلات و متعلقات اور سرکاری کاغذات کا تو بلاشبہ بطور بیع، بھی عوض لینا درست ہوگا، بشرطیکہ بیع کی صحت کی قیود و شرائط کی رعایت کی جائے۔

## ۴۔ حقوق اسبقیت و اختصاص:

ایسا کوئی حق دوسرے کی طرف بلا معاوضہ تو بالاتفاق منتقل کیا جاسکتا ہے۔ رہا معاوضہ کے ساتھ معاملہ، تو بطور دست برداری اس کے جواز کی شوائع و حنا بلہ نے تصریح کی ہے۔ اور بظاہر حنفیہ و مالکیہ کے یہاں بھی اس کی گنجائش نکلے گی، اس لئے کہ دست برداری اگرچہ عوض لے کر ہو سب کے یہاں توسع رکھتی ہے، بعض حنا بلہ و شوائع نے بیع کے جواز کو بھی ذکر کیا ہے، مگر راجح عدم جواز ہے۔

## ۵۔ حقوق عقوبت و انتقام:

یعنی کسی شخص کے کسی جرم کی بنا پر جرم کے مطابق اس سے بدلہ لینے اور شریعت کی طرف سے اس کو سزا دلوانے کا حق، جبکہ اس کا جرم ثابت و ظاہر ہو چکا ہو اور سزا متعین ہو چکی ہو۔

ایسے حقوق پر بطور دست برداری معاوضہ کا معاملہ درست ہے۔ بشرطیکہ حقوق العباد سے ان کا تعلق ہو اور اسی جہت کا غلبہ ہو، اس کے تحت حق قصاص، حق دیت اور حق تعزیر کو شمار کیا جاتا ہے اور قصاص و دیت عام ہے کہ جان سے متعلق ہو یا یہ کہ اعضاء سے، بشرطیکہ اس میں قصاص کی اجازت ہو۔

ان حقوق پر بطور دست برداری عوض کا لینا درست ہے کہ آدمی طے شدہ عوض کے مقابلے میں اصل حق کو چھوڑ دے جو کہ قصاص ہوتا ہے اور تعزیر کی صورت میں سزا تجویز کی جائے (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۲۴۴/۲، الذخیرہ ۶۸، رد المحتار ۵/۶۷۵)۔

## ۶۔ حقوق خصوصیت و دعویٰ:

یعنی کسی شخص کی کسی حرکت کی بنا پر صاحب حق کو اسے عدالت میں لے جانے اور سزا دلوانے کا حق، اسی طرح کسی امر کے دعویٰ کا حق۔ شق اول کے تحت چوری کا معاملہ عدالت میں لے جا کر سزا دلانا آتا ہے، اور شق دوم عام ہے۔ ان حقوق پر دست برداری کی حیثیت سے عوض لیا جاسکتا ہے، شق اول میں اس معاملہ کے تحت کہ صاحب حق عوض لے کر معاملہ کو عدالت میں نہ لے جائے، اور شق دوم میں اس بنیاد پر کہ مدعی لے کر خاموش ہو جائے۔ بات کو آگے نہ بڑھائے یا یہ کہ مدعا علیہ سے قسم نہ کھلائے (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۲۳۳/۳، مجلہ الاحکام ۲۱۹، رد المحتار ۵/۸۷۸)۔

اوپر شق دوم کو جو عام کہا گیا ہے تو مطلب اس عموم کا یہ ہے کہ یہ ان امور کو بھی شامل ہے جن کی بیع جائز نہیں ہے۔ اور اصلاً اس دفعہ کا حاصل کسی دعویٰ کے حق پر عوض کا معاملہ کرنا ہے جو کہ دونوں شقوں کو شامل ہے، بایں معنی کہ مدعا علیہ بننے والا شخص یہ کہے کہ مجھ سے اتنا مال لے کر اس دعویٰ سے باز آ جاؤ۔

## ۷۔ حقوق ملکیت:

اس کے تحت حق وراثت، حق ولاء، حق وصیت (جس کا تعلق کسی غلام کی خدمت یا کسی جانور کی کسی منفعت سے ہو)، حق رقیب (غلام کو غلام باقی رکھنے یا یوں کہیے کہ اپنی ملک میں باقی رکھنے کا حق) جیسے حقوق آتے ہیں۔ ان جیسے حقوق پر بطور تنازل و دست برداری عوض لینے کا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

آخری صورت کے حق میں تو اس قسم کا معاملہ معروف بلکہ منصوص ہے جسے اصطلاح شریعت میں کتابت و مکاتبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پہلی تینوں صورتوں کے متعلق فقہاء نے تصریح کی ہے۔ جیسے کہ ولاء کے حق میں بیع و ہبہ کی نص میں ممانعت آئی ہے، اسی پر حق وراثت کو قیاس کر لیا گیا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں بطور تنازل کیا جانے والا معاملہ اسی وقت درست ہوگا جبکہ حق ثابت و مؤکد ہو چکا ہو یعنی حق محض یا حق مجرد نہ ہو، یعنی اسی وقت جبکہ اس سے وراثت ملنی ہے یا جس آزاد کردہ غلام کا ولاء حاصل ہونا ہے اس آزاد شخص یا غلام موصوف کی موت ہو چکی ہو۔ اسی طرح جس شخص نے اپنے غلام یا جانور کی منفعت کے لئے کسی خاص شخص کے حق میں وصیت کی ہے جبکہ اس غلام و جانور کی رقبہ و ذات کا مالک کوئی دوسرا ہوگا خواہ اس کا وارث یا جس کے لئے اس نے اس کی وصیت کی ہو تو اس وصیت کرنے والے شخص کی موت کے بعد ہی صاحب حق ایسا معاملہ کر سکے گا۔

## ۸۔ حقوق تجارت:

یعنی گڈول، ٹریڈ مارک، تجارتی لائسنس خواہ جس پیمانہ کا ہو۔

ایسی اشیاء پر عوض کے معاملہ کی مولانا تقی صاحب نے کافی تفصیل فرمائی ہے۔ ان پر عوض کا معاملہ بطور تنازل درست ہے، اور اس کے عصری لوازم، جدوجہد، اخراجات اور اس کے بعد سندت کی بنیاد پر ان اشیاء سے استفادہ کو دیکھا جائے تو مولانا کی تصریح کے مطابق بطور بیع بھی معاملہ درست ہوگا۔

## ۹۔ دیگر حقوق:

گذر چکا ہے کہ مذاہب ثلاثہ میں حقوق پر معاوضہ لینے میں کافی توسع ہے بالخصوص حضرات مالکیہ کے نزدیک، اور یہ کہ اس کے باوجود سب کے یہاں استثناءات ہیں، پیچھے جو حقوق ذکر کئے گئے ان کے علاوہ بھی بعض حقوق پر معاوضہ کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ الموسوعۃ الفقہیہ میں تو آیا ہے کہ مالکیہ تمام حقوق مجردہ پر عوض لینے کو جائز قرار دیتے ہیں (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۳۲/۵ بحوالہ فتح العلی الممالک ۱/۳۰۷، ۳۱۳)۔ ایک موقع پر مذکور ہے کہ حق شفعہ، اسی طرح بیوی کے لئے باری کا حق، ان کے نزدیک اس پر عوض لیا جاسکتا ہے (ایضاً بحوالہ فتح العلی الممالک ۱/۳۰۷، ۳۱۳، مسخ الجلیل ۳/۰۹۱، ۱۷۴)۔ اسی طرح مالکیہ و حنفیہ کے نزدیک حق حضانہ پر عوض لیا جاسکتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ یہ بچے کا نہیں بلکہ حاضنین یعنی پرورش کرنے والے کا حق ہے۔ موسوعہ میں ہی یہ بھی منقول ہے کہ حق شفعہ پر عوض کے جواز کی ایک روایت امام احمد سے بھی منقول ہے، اور یہ کہ ابن تیمیہ سے منقول ہے: قیاس المذہب جواز أخذ العوض عن سائر حقوقها من القسمة وغیره (ایضاً بحوالہ شرح منہج الارادات ۲/۲۶۱، ۱۰۲)۔

۵۔ وہ حقوق جن پر عوض نہیں لیا جاسکتا:

گذر چکا ہے کہ کم از کم حنفیہ کے یہاں اس سلسلہ میں یہ ضابطہ معروف ہے کہ جن حقوق کی مشروعیت و اعتبار میں ضرر و مضرت کا دفعیہ مقصود ہے، جن کو



حقوق مجردہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اور مولانا تقی صاحب نے ان کو حقوق ضروریہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

ان پر بیع یا تانزل، کسی حیثیت سے عوض کا لینا درست نہیں ہے۔ ایسے حقوق حسب ذیل ہیں:

۱۔ حق شفعہ، ۲۔ قسم الزوج (بیوی کے لئے باری کا حق)، ۳۔ حق طلاق، ۴۔ خیار مخیرہ، ۵۔ حق حضانت، ۶۔ حق ولایت، ۷۔ حق نسب، ۸۔ خالص حقوق اللہ کے قبیل کے امور جیسے حد زنا، شراب نوشی یا قذف کی حد وغیرہ۔

بعض تصریحات گذر چکی ہیں، الموسوعۃ الفقہیہ میں ایک موقع پر آیا ہے: لا یجوز الاعتیاض عن حق اللہ سبحانہ و تعالیٰ کحد الزنی و شرب الخمر (الموسوعۃ الفقہیہ ۵، ۲۳۱ بحوالہ ہدایہ ۲، ۱۹۴، کشاف القناع ۲، ۴۰۱، ۴۰۰)۔ ولا یجوز الاعتیاض عن حق الغیر کنسب الصغیر (حوالہ بالا، البدائع ۶، ۲۸، ۲۹۶)۔ نمبر ۳ سے ۴ تک کی بنا محض دفع ضرر پر ہے، اور ۵ تا ۷ میں اس کے ساتھ اس کی رعایت ہے کہ حق غیر کا یعنی بچہ کا ہوتا ہے جس میں اس قسم کے کسی معاملہ کی اہلیت نہیں ہوتی۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ ۱۔ حقوق اللہ، ۲۔ حقوق غیر، ۳۔ حقوق دفع مضرت، نیز حقوق تملک پر عوض نہیں لیا جاسکتا۔ صاحب بدائع نے حق شفعہ پر عوض کے عدم جواز کی یہی بنا ذکر کی ہے (بدائع ۲، ۱۵)۔ ان حقوق کا باہم مختلف ہونا ضروری نہیں محض تعبیر کا فرق بھی ہوتا ہے۔

لیکن پیچھے گذر چکا ہے کہ مالکیہ کے یہاں شفعہ وغیرہ جیسے حقوق مجردہ پر عوض لیا جاسکتا ہے، اور حضانت پر حنفیہ کے یہاں بھی گنجائش ہے۔ اس لئے کہ حضانت بچہ کا نہیں بلکہ اس عورت کا حق ہے جس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ شامی نے حضانت کس کا حق ہے؟ اس کی کچھ تفصیل کی ہے۔ اور اس میں دو قول اور ترجیح میں اختلاف کے ذکر کے ساتھ تطبیق و توفیق بھی اختیار کی ہے (رد المحتار ۲، ۶۳۶)۔

نوٹ: الف۔ گذشتہ تفصیل کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ کم از کم حنفیہ کے نزدیک بیع تو انہیں حقوق کی جائز ہے کہ جن کا محل کوئی عین ہے، بایں طور کہ وہ عین اس کا ظرف ہے۔ اسی کے واسطے سے حق کا حصول یا استفادہ ہوتا ہے، اور ظرف بننے والے عین کو بیچا جاسکتا ہے، اور اس کے ساتھ ان حقوق کو بھی تبعاً بالاتفاق بیچا جاسکتا ہے۔

ب۔ تنازلاً معاوضہ مذکورہ بالا حقوق کے علاوہ ایسے حقوق پر بھی لیا جاسکتا ہے جو فی الجملہ حصول عین و مال کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جیسے تمام حقوق ملکیت (ملکیت کے ثبوت کے بعد) حقوق عقد، حقوق تجارت، حقوق ایجاد و تالیف، حقوق ودیت و قصاص، اسی طرح ان حقوق پر کہ جن کے لئے کوئی عین محل و ظرف ہو (اگرچہ اس عین کا بیچنا بالکل فی الوقت درست نہ ہو)، یا یہ کہ صاحب حق اس کو نہ بیچ سکتا ہو، جیسے حقوق اسبقیت، اور ایسے حقوق کہ کسی عین کے واسطے سے ان کا حصول ہو مگر مادی صورت میں، بلکہ یہیں بطور انتفاع فعلاً جیسے حق تمتع بالزوجہ۔ اوپر مذکور حقوق کے تحت فی الجملہ کی قید حق قصاص کے پیش نظر لگائی ہے، کہ قصاص کے مواقع پر شریعت نے اس کے ساتھ ساتھ استقلالاً مال کی ایک خاص مقدار کے لینے و دینے کی صورتیں مشروع کی ہیں۔ صاحب حق قصاص کی جگہ اس متعین مقدار کو بھی لے سکتا ہے کہ جس حق پر عوض کا لینا درست ہو۔ عوض لے لینے پر وہ عوض دینے والے کی طرف منتقل ہو جاتے ہوں۔ بعض مواقع پر وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ جیسے حق قصاص و حق تمتع بالزوجہ میں، اور بعض صورتوں میں منتقل بھی ہوتے ہیں جیسے کہ حقوق ارتفاق وغیرہ۔

و۔ حقوق اور معاوضہ ایک جائزہ:

۱۔ وہ حقوق جن پر معاوضہ مطلقاً اور (بظاہر) بالاتفاق جائز نہیں: ۱۔ حق نسب، ۲۔ حق طلاق، ۳۔ حق ولایت، ۴۔ خیار مخیرہ۔

۲۔ وہ حقوق جن پر معاوضہ کے جواز کو ذکر کیا گیا ہے: ۱۔ حق ولاء، ۲۔ حق وراثت، ۳۔ حق وصیت، ۴۔ حق قصاص و ودیت، ۵۔ حق تمتع بالزوجہ، ۶۔ حق قسم الزوج، ۷۔ حق مرور، ۸۔ حق شرب، ۹۔ حق مجری، ۱۰۔ حق مسیل، ۱۱۔ حق جوار، ۱۲۔ حق تعلی و علو، ۱۳۔ حق اسبقیت، ۱۴۔ حق وظیفہ، ۱۵۔ حق نفقہ، ۱۶۔ حق خلو، ۱۷۔ حق تجارت، ۱۸۔ حق ایجاد، ۱۹۔ حق تالیف، ۲۰۔ حق حضانت، ۲۱۔ حق شفعہ، ۲۲۔ حق ارتفاق (غلام کو غلام و مملوک باقی رکھنے کا حق)۔

۳۔ وہ حقوق جن پر عوض کا جواز اتفاتی ہے بشرطیکہ بطور تنازل ہو: ۱۔ حق ولاء، ۲۔ حق وراثت، ۳۔ حق قصاص، ۴۔ حق تمتع بالزوجہ۔

۴۔ وہ حقوق جن کی بیع کو جائز کہا گیا ہے: ۱۔ حق مرور، ۲۔ حق شرب، ۳۔ حق مجری، ۴۔ حق مسیل، ۵۔ حق علو، ۶۔ حق جوار، ۷۔ حق اسبقیت، ۸۔ حق تجارت، ۹۔ حق ایجاد، ۱۰۔ حق تالیف۔



ان حقوق پر تنازل و دستبرداری کے طور پر معاوضہ کو جائز قرار دینے پر اب تقریباً اتفاق ہے جیسے کہ حق و طیفہ وغیرہ میں تنازل کے جواز کو مختار قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ وہ حقوق جن پر معاوضہ منصوص ہے:

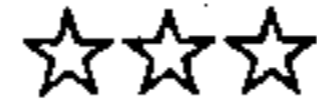
۱۔ حق قصاص، ۲۔ حق تمتع بالزوجہ، ۳۔ حق ارقاق ورق،

(سورہ بقرہ آیت ۱۷۸) (سورہ بقرہ آیت ۲۲۹) (سورہ نور آیت ۳۳)

مذکورہ مواقع پر منصوص معاوضہ کی حیثیت تنازل کی ہے بیع کی نہیں، اسی لئے تنازل کے لئے اصل و بنیاد کے طور پر انہیں مسائل و مواقع کو ذکر کیا جاتا ہے۔

۶۔ وہ حقوق جن پر جواز معاوضہ کو حنفیہ نے اختیار کیا ہے اتفاقاً یا ترجیحاً یا اختلافاً:..... فقرہ نمبر ۲ کے تحت مذکورہ حقوق میں سے نمبر ۱۶ اور نمبر

۲۱ کے علاوہ، البتہ حق اسبقیت کے حق میں جواز کو مولانا تقی صاحب نے اقتضاء ذکر کیا ہے، اور حقوق تجارت و حقوق ایجاد و تالیف عصری امور میں سے ہیں، اور عصری فقہاء نے ہی اس کے جواز کی تصریح کی ہے۔



## بیع حقوق

مولانا محمد نظام الدین رضوی <sup>ط</sup>

بیع حقوق کے جواز، وعدم جواز کا مدار اس امر پر ہے کہ بیع کے تحقق کے لئے ”مال“ کا وجود ضروری و لابدی ہے یا نہیں۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ جستجو کرنا چاہیے کہ شریعت میں ”بیع“ کی حقیقت کیا ہے۔

### بیع کی حقیقت:

ایک مال متقوم کے بدلے دوسرے مال متقوم کے لین دین کا وہ معاملہ جو فریقین کی باہمی رضامندی سے تجارت کی غرض سے وجود میں آئے بیع ہے۔ فقہائے حنفیہ نے علمہ کتب فقہ میں مبادلة المال بالمال یا اس کے ہم معنی الفاظ سے بیع کی حقیقت کا تعارف کرایا ہے، ہم نے اس کے ساتھ ”متقوم“ کے لفظ کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے مال غیر متقوم کی بیع صحیح نہیں۔ وبطل بیع مال غیر متقوم ای غیر مباح الانتفاع بہ کخمر و خنزیر (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۴۰۱۰۳)۔

ہدایہ میں ہے: رکن البیع هو مبادلة المال بالمال... حقيقة البیع هو مبادلة المال بالمال... اھ ملخصاً۔ یعنی مال کا مال سے تبادلہ بیع کارکن اور اس کی حقیقت ہے (۳۳/۳۳ باب البیع الفاسد)۔

یہاں سے واضح ہوا کہ بیع کے لئے مال کی شرط جوہری ہے، اور یہ اس کی حقیقت میں رکن کی حیثیت سے داخل ہے۔

### مال:

کتب فقہ کے ذخائر میں مال کی دو طرح کی تعریفوں کا سراغ ملتا ہے۔

مال وہ عین یا جوہر ہے جسے وقت حاجت کے لئے جمع کر کے رکھا جاسکے، جو لائق رغبت و قابل انتفاع ہو، اور ساتھ ہی اس کے استعمال سے دوسروں کو روکا جاسکے۔

بحر و کشف کبیر میں ہے: المال ما یمیل إلیہ الطبع، و یمکن ادخاره لوقت الحاجة (رد المحتار ۴، ۳)۔ فتح القدر میں ہے: المال عین یمکن إحرازها وإمساکها (فتح مع الکفایة وغیرھا ج ۶، ص ۶۳) لدرر، نیز در مختار میں ہے: المال ما یمجری فیہ البذل والمنع (الدر علی هامش الشامی ۴، ۱۰۰، باب البیع الفاسد)۔

فقہائے حنفیہ کے نزدیک مال کی یہی تعریف راجح و مختار ہے، جو بہت مشہور اور علمہ کتب میں مذکور ہے۔ لیکن ”عین“ یعنی مادی چیز ہی کے ساتھ مال کا انحصار نہیں، بلکہ وہ حق بھی مال ہے جو ”عین مذکور“ سے متعلق ہو، چنانچہ فقہائے کرام نے مال کی تعریف کے ساتھ یہ اضافہ بغیر کسی انکار و تردید کے درج کیا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ اضافہ مذہب راجح کے موافق اور لائق قبول ہے۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے: إن محل البیع إما الأعیان التي هی أموال، أو حق یتعلق بها (عنایہ علی هامش الفتح و الکفایة ۶، ۶۶)۔

فتح القدر میں ہے: والمبیع لا بد أن یمکن أحدهما... أي مالا، أو حقا متعلقا بالمال (۶، ۶۳) وکذا فی رد المحتار، ناقلاً عن الفتح من غیر انکار (۴، ۱۰۱، باب البیع الفاسد)۔

اس تعریف کے لحاظ سے مال صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو ”مادی“ ہو یا ”مادی شی“ سے متعلق ہو۔ ظاہر ہے کہ حقوق و منافع مادی شے نہیں، اب اگر وہ مادی

شے سے متعلق بھی نہ ہوں تو انھیں مال، یا محل بیع نہیں قرار دیا جاسکتا، جیسے حق تعلی، حق قصاص، حق تصنیف، اور ان کے نظائر۔

اس کے علاوہ ایک اور تعریف محرر مذہب امام محمد بن حسن شیبانی سے منقول ہے جو حقوق و منافع سب کو عام ہے، چنانچہ جامع الرموز میں ہے:

المال ما ملکتہ من کل شیء کما فی القاموس، وکذا فی المغرب علی ما روی عن محمد (مال ہر وہ چیز ہے جس کا آدمی مالک ہو سکے۔ ایسا ہی قاموس اور مغرب میں ہے۔ یہ تعریف امام محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے)۔

”ملک“ کا لفظ، عین اور منفعت دونوں کو عام ہے، اسی لئے علامہ قہستانی نے اس تعریف کے بعد یہ صراحت کی:

وفیہ اشعار بأن المنفعة مال والتحقیق علی ما فی الأصول أنها لیست بمال فإنه ما یدخر لوقت الحاجة (جامع الرموز المعروف بقہستانی ۲۰۲)۔ اس تعریف میں یہ اشارہ ہے کہ منفعت بھی مال ہے۔ ہاں تحقیق یہ ہے کہ وہ مال نہیں، کیونکہ وقت حاجت کے لئے اسے جمع کر کے نہیں رکھا جاتا۔

یہ تعریف حقوق و منافع کو بھی مال قرار دیتی ہے لیکن اس وسعت پہنائی کے باوجود خود یہ روایت کے لحاظ سے ضعیف ہے، اس لئے عام حالات میں اس کا کوئی ثمرہ نہ ظاہر ہوگا۔ ہاں اگر کسی حق یا منفعت کی بیع عام طور سے کسی ایک علاقے، صوبے، یا پورے ملک کی ضرورت بن جائے کہ جواز بیع کا حکم نہ دینے میں حرج و تنگی لازم آئے تو اس وقت ضرورت کے پورے دائرہ اثر میں اس ضعیف روایت پر عمل جائز ہوگا، اور ایسے حق یا منفعت کی بیع کی صحت کا فیصلہ سنا کر آسانی فراہم کی جائے گی، جیسا کہ ”دین یسر و سہل“ کا یہی تقاضہ ہے۔ ہم اس کی مثال میں، بجا طور پر ”حق تعلی“ کو پیش کر سکتے ہیں یعنی مکان کی چھت پر فضا میں مکان تعمیر کرنے، اور فضا سے انتفاع کا حق کہ بڑے شہروں میں جگہ کی تنگی کے باعث اس کی خرید و فروخت عام طور سے لوگوں کی ضرورت بن کر رہ گئی ہے اور اسے ناجائز قرار دینے میں بڑا حرج واقع ہوگا، لہذا اس تعریف کی بنیاد پر حق تعلی، یا چھت کی فضاؤں کی منفعت کی بیع جائز ہوگی، اور اس پر عمل فی الواقع مذہب کے حکم ضروری اور امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول معنوی پر عمل ہوگا، اس بحث کی پوری تفصیل احقر کی کتاب ”لاؤڈ اسپیکر کا شرعی حکم“ میں ہے۔

ادّخار:

اس لفظ کا معنی ہے جمع کرنا، باقی رکھنا، ذخیرہ کرنا۔ قربانی کے گوشت کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا: کلووا وادخروا۔ قرآن حکیم میں ہے: تَدَخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ۔ اصحابِ ماندہ کے متعلق فرمایا گیا: اُمِرُوا أَنْ لَا يَدَخِرُوا فَاذْخَرُوا۔ ان نصوص میں ”ادّخار“ کا لفظ انھیں معانی میں مستعمل ہے جو اوپر درج ہیں۔

ہر شے کے لئے ادّخار اس حال کے مناسب ہوگا لیکن بہر حال مال وہی چیز ہوگی جو مادی ہو، یا مادی سے متعلق ہو کہ یہی ظاہر مذہب ہے، اور مذہب سے عدول بغیر ضرورت داعیہ یا عرف شائع کے جائز نہیں، حقوق ادبیہ و تجارتیہ نہ مال ہیں نہ مال سے متعلق ہیں، اور انھیں مال تسلیم کئے بغیر بھی ان کے عوض میں مال حاصل کیا جاسکتا ہے جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آ رہی ہے، اس لئے انھیں مال نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہاں اگر عرف شائع کا تحقق ہو جائے تو ان کی بیع جائز ہوگی۔

حق کے اقسام:

حق کے مختلف اقسام ہیں جن میں بعض تو وہ ہیں جن کی بیع بھی جائز ہے اور عوض لے کر ان سے دستبرداری بھی جائز ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کی بیع بھی ناجائز ہے، اور عوض لے کر ان سے دستبرداری بھی ناجائز ہے، اور بعض وہ ہیں جن کی بیع تو ناجائز ہے لیکن عوض لے کر ان سے دستبرداری جائز ہے۔ ان اقسام کا ایک اجمالی خاکہ یہ ہے:

حق اصل کے لحاظ سے ثابت و متحقق ہو، یا اصل کے لحاظ سے وہ ثابت نہ ہو بلکہ محض کسی سے ضرور دور کرنے کے لئے ثابت ہو، پھر پہلی قسم کے حق کا تعلق یا تو مال عین سے ہوگا یا نہیں ہوگا، اور مال عین سے تعلق کی صورت میں ایک ملک سے دوسری ملک میں منتقل ہونے کے قابل ہوگا یا نہیں ہوگا۔ بظاہر یہ چھ اقسام ہیں۔ جنہیں اور اختصار کے ساتھ صرف چار قسموں میں منحصر کیا جاسکتا ہے:

۱۔ حق اصلی ہو، مال عین سے متعلق ہو، اور انتقال ملک کے قابل ہو۔

۲۔ حق اصلی ہو، مال عین سے متعلق بھی ہو لیکن انتقال ملک کے قابل نہ ہو۔



۳۔ حق اصلی ہو، لیکن مال عین سے متعلق نہ ہو۔

۴۔ حق کا ثبوت محض دفع ضرر کے لئے ہو، اصلۃً اس کا تحقق نہ ہو۔ ان کی قدرے وضاحت یہ ہے۔

### حق کی پہلی قسم:

حق اصلۃً ثابت ہو، مال عین سے متعلق ہو اور ساتھ ہی انتقال ملک کے قابل بھی ہو۔ جیسے حق مرور، حق شرب، حق تسبیل۔

”حق مرور“ یعنی راستے پر چلنے کا حق، ”حق شرب“ یعنی نالے سے پانی لینے کا حق، ”حق تسبیل“ یعنی پانی بہانے کا حق۔ یہ حقوق انسان کے لئے اصلۃً ثابت ہیں جن کا تعلق دو مثالوں میں زمین سے اور ایک مثال میں پانی سے ہے، اور زمین و پانی دونوں مال عین ہیں اور ساتھ ہی انتقال ملک کے صالح بھی ہیں۔ ان حقوق کی بیع اصلۃً جائز ہے (یہ الگ بات ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے کہیں عدم جواز کا حکم ہو جائے)، اور ان کے بدلے میں مال لے کر ان سے دستبرداری بھی جائز ہے۔

حق مرور کی بیع ایک روایت میں جائز ہے، اور ایک روایت میں ناجائز ہے۔ لیکن فقہائے متاخرین نے جواز کو اختیار فرمایا (دیکھئے: رد المحتار ۱۱۸/۴، مکتبہ نعمانیہ)۔

حق شرب کی بیع کے متعلق بھی دو طرح کی روایتیں ملتی ہیں، مشائخ بلخ جواز کے قائل ہیں اور ان کے برخلاف مشائخ بخارا اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

اس روایت کی توجیہ صاحب در مختار نے یہ فرمائی کہ حق شرب مال مستقوم نہیں، لیکن مشائخ بخارا اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پانی کی مقدار مجہول ہے، اور حق شرب اسی مجہول سے متعلق ہے، امام ابن الہمام اور علامہ اکمل الدین بابر ترقی بھی اسی توجیہ کے قائل نظر آتے ہیں، اور یہی بات قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حق شرب گو کہ حقیقت میں مال مستقوم نہیں مگر مال مستقوم سے متعلق ہونے کی وجہ سے اس کے حکم میں ضرور ہے، حتیٰ کہ مشائخ بلخ بھی اسی توجیہ کے حامی ہیں، لیکن تعامل کی وجہ سے وہ جہالت کو بے اثر قرار دیتے ہیں اور بیع کو جائز مانتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۱۱۸/۴، باب البیع الفاسد، فتح مع کفایہ ۶/۶۵، ۶۴، عنایہ علی ہاشم الفتح ۶/۶۳)۔

محولہ بالا سے بخوبی عیاں ہے کہ حق شرب مال ہے، لیکن اس کی بیع اس وجہ سے ناجائز ہے کہ بیع کی مقدار مجہول ہے جیسا کہ دوسرے اموال میں بھی اس جہالت کے باعث بیع ناجائز ہوتی ہے۔

حق تسبیل کی بیع کے متعلق بھی یہی تقریر جاری ہوگی کہ وہ مال ہے مگر بوجہ جہالت اس کی بیع ناجائز ہے۔

### حق کی دوسری قسم:

حق اصلی مال عین سے متعلق ہو مگر انتقال ملک کے قابل نہ ہو۔ جیسے حق ارث، کہ یہ اصلۃً ثابت ہے جس کا تعلق بالعموم مال عین سے ہے (بالعموم کی قید اس لئے لگائی کہ اس حق کا تعلق بسا اوقات مال غیر عین سے بھی ہوتا ہے جیسے حق خیارتعین، یہ حق عین کا ضرر دور کرنے کے لئے ثابت ہوتا ہے)۔ مگر یہ حق مخصوص افراد کو مخصوص صفت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے جسے خرید کر حاصل نہیں کیا جاسکتا، یا بیع کے ذریعہ یہ حق دوسرے کو منتقل نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کی بیع ناجائز ہے۔ اور جیسے حق ولاء کہ اس کا تعلق آزاد کردہ غلام کے مال عین سے ہے، لیکن یہ انتقال ملک کے قابل نہیں اس لئے اس کی بیع ناجائز ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں اس حق کی بیع سے منع فرمایا گیا: **أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَعَنْ هَبْتِهِ** (مسلم: کتاب العتق؛ باب النہی عن بیع الولاء و ہبتہ)۔

البتہ ورثہ سے کچھ مال لے کر اس حق سے دستبرداری جائز ہے، اسے فقہ کی اصطلاح میں تخارج کہا جاتا ہے۔

### حق کی تیسری قسم:

حق اصلی ہو، مگر مال عین سے متعلق نہ ہو۔ جیسے حق قصاص، حق تعلی، حق تصنیف، حق طباعت، حق ایجاد وغیرہ۔ یہ حقوق اصلۃً ثابت ہیں، ایسا نہیں کہ محض کسی سے ضرر دور کرنے کے لئے ان کو ثابت مان لیا گیا ہو، ان کی بیع ناجائز ہے مگر عوض لے کر ان سے دستبرداری جائز ہے۔ خود قرآن حکیم نے حق قصاص کے بدلے میں مال لے کر اس سے دستبرداری کی اجازت دی ہے۔ **فَمَنْ عَفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْئًا فَاتَّبِعْهُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَّاهُ إِلَيْهِ بِإِحْسَابٍ**

(سورۃ البقرہ: ۱۶۸)۔

ان حقوق کی بیع اس لئے ناجائز ہے کہ یہ نہ مال ہیں اور نہ ہی مال عین سے متعلق۔ البتہ ان کی بیع کے سلسلے میں مسلمانوں کا تعامل ہو جائے تو جواز کا حکم ہوگا جیسے حق تعلیٰ (یعنی چھت پر دوسری، تیسری منزل بنانے کا حق) کہ بڑے شہروں میں اس کی بیع کا عام رواج ہو گیا ہے، جس میں عوام و خواص سبھی شامل ہیں، اور یہ آج انسانی معاشرہ کی اہم ترین ضرورت بھی ہے، اس لئے اس حقیر کی رائے میں اب اس کی بیع کے جواز کا حکم ہونا چاہیے، خاص کر اس صورت میں کہ بیع کی ایک تعریف (گو وہ ضعیف ہی) اسے شامل ہے۔

والقول الضعیف یجوز العمل به عند الضرورة (رسائل ابن عابدین ۲: ۱۲۵)، لا یفتی ولا یعمل إلا بقول الإمام الأعظم ولا یعدل عنه إلى قولهما، أو قول أحدهما إلا للضرورة من ضعف دلیل، أو تعامل بخلافه كالمزارعة (بحر)۔

عرف کی وجہ سے ظاہر الروایہ سے عدول جائز ہے:..... یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ ظاہر مذہب سے عدول کے لئے تعامل عام ضروری نہیں ہے بلکہ تعامل خاص بھی کافی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اگر تعامل عام ہوگا تو سب کے لئے عدول جائز ہوگا ورنہ جہاں جہاں کا تعامل ہوگا صرف وہیں کے لوگوں کے لئے عدول جائز ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: رسائل ابن عابدین ۲: ۱۳۱-۱۳۲)۔

### حقوق ادبیہ:

حقوق ادبیہ کے مال قرار دیئے جانے کا مسئلہ محل نظر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اچھے کمپنیوں کے نام، مختلف مصنوعات کی خاص علامتیں، ٹریڈ مارک یہ سب آمدنی کا بہترین ذریعہ ہیں، اور ان ناموں، و مخصوص علامتوں کے سبب اشیاء کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اور اسی فائدہ کے لئے ان ناموں اور علامتوں کو رجسٹرڈ کرا کے اپنے لئے محفوظ بھی کرا لیا جاتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود ان ناموں، علامتوں، ٹریڈ مارک، یا بلفظ دیگر مختلف اشخاص اور اداروں کے حقوق کو مال کی حیثیت دینے میں تاہل ہے، کیونکہ مال کی حقیقت مذہب میں متعین کر دی گئی ہے کہ وہ مادی ہے، یا مادی سے متعلق۔ اور یہ حقوق نہ مادی ہیں اور نہ ہی مادی سے ان کا تعلق ہے۔

ان حقوق کی دو چیزوں سے مشابہت ہے:

ایک تو مال سے، کہ ذریعہ آمدنی ہونے میں یہ مال کے جیسے ہیں۔ معمولی گھڑی کا نام ایچ، ایم، ٹی رکھ دیا جائے تو اس کی قیمت بڑھ کر ایچ ایم ٹی کے مساوی ہو جائے گی، اچھی کمپنی کے نام پر کوئی چیز تیار کی جائے تو وہ فوراً بازار میں اپنا مقام بنا لے گی، بلاشبہ یہ نام ہی کا کرشمہ ہے جس نے مثلاً پچاس روپے کی چیز کو سو روپے کی بنا دیا، یا نہ پوچھے جانے والے سامان کو بازار میں عمدہ سامانوں کے ہم دوش وہم پلہ کر دیا۔

ان حقوق کی دوسری مشابہت اوصاف سے ہے، کہ اوصاف بھی آمدنی کا ذریعہ اور قیمت میں اضافہ کا سبب ہوتے ہیں۔ ہم اس کی وضاحت کے لئے یہاں فتاویٰ رضویہ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

(ترجمہ) ”ہر شخص کہ شرع مطہرہ یا عقل سلیم کے گھاٹ گذرا ہے اگر چہ راہ چلتا ہو، اس پر روشن ہے کہ ایک نہایت حقیر چیز میں کوئی ایسا وصف لگ جاتا ہے جو اسے اس جیسی ہزاروں چیزوں سے بیش بہا کر دیتا ہے، اور بارہا ایک کمیز دو لاکھ روپے اور اس سے زائد کو خریدی گئی، اور دوسری کو کوئی تیس روپے کو نہیں پوچھتا حالانکہ اوصاف کے لئے ثمن میں سے کوئی حصہ نہیں یہاں تک کہ ہاتھ پاؤں جب تک کہ بالقصد نہ ہلاک کیے جائیں ان کے لئے بھی ثمن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تو وہ ذات ہی کا ثمن ہے جسے رغبتیں بڑھنے کے سبب اوصاف نے بڑھا دیا۔ بھلا بتاؤ تو کہ ایک ورق کاغذ ہو جس میں ایک علم نفیس، و عجیب و غریب و نادر ہو اور ایک شخص اس علم کا طلب گار ہو اور اس کی قدر جانتا ہو وہ اس ورق کو دس ہزار میں خرید لے تو کیا اس میں کوئی خلاف ہے، ہرگز نہیں، بلکہ حلال و طیب ہے۔ اس پر قرآن عظیم کا نص اور بلا انکار و منازعت اجماع قائم ہے۔ رب عزوجل فرماتا ہے: ”مگر یہ کہ کوئی سودا تمہارے آپس کی خوشی کا ہو“، اور یہ دس ہزار اس لکھے ہوئے علم کی قیمت نہیں کہ وہ تو مال کے قبیل سے ہی نہیں جیسا کہ ہدایہ اور باقی ان تمام کتب میں تصریح ہے جن میں مسائل مع دلائل مذکور ہیں۔ اور یہ ہدایہ کی عبارت ہے: ”قرآن مجید چرانے میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا اگر چہ اس پر سونا چڑھا ہو، اس لئے کہ لکھے ہوئے کے اعتبار سے تو وہ از قبیل مال ہی نہیں۔ اور اس کا محفوظ رکھنا اس مکتوب ہی کی غرض سے ہے نہ کہ جلد اور ورقوں، اور نقوش زر کے لئے، یہ چیزیں تو تابع ہیں۔ اور کسی قسم کے دفتر کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا کہ ان سے مقصود وہ ہے جو ان میں لکھا ہے اور وہ مال نہیں۔ مگر حساب کی بہیاں، کہ ان میں جو لکھا ہے وہ دوسرے کے کام کا نہیں ہوتا جو اس کا لینا مقصود ہو، تو ضرور کاغذ ہی



مقصود ہے..... تو واضح ہو گیا کہ ایک ورق کاغذ ہی کی قیمت اس کی تحریر کے باعث دس ہزار کو پہنچ گئی“ (فتاویٰ رضویہ ۷/۱۳۱، ۱۳۲، رسالہ کفیل الفقہ الفہم)۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ یہ حقوق ”اموال“ اور ”اوصاف“ میں مشابہت کے لحاظ سے کس سے زیادہ قریب ہیں تاکہ ان کی شرعی حیثیت متعین کی جاسکے۔

ظاہر ہے کہ ان حقوق اور اموال میں حقیقت کے لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ مال تو مادی چیز کو کہتے ہیں اور یہ حقوق خالص غیر مادی ہیں۔ اس کے برخلاف ان حقوق کا اوصاف سے بڑا گہرا ربط ہے کہ اوصاف حقیقت کے لحاظ سے اشیاء کے توابع ہوتے ہیں اور یہ حقوق بھی توابع ہی ہیں (شامی ۲/۲۹۲) تو اموال کے بہ نسبت اوصاف سے ان کی مشابہت بہت زیادہ قریب ہے لہذا یہ حقوق مال نہ ہونے میں اوصاف کے ہم جنس قرار پائیں گے اور ان کی خرید و فروخت ناجائز و نادرست ہوگی۔ اور اموال سے ظاہری مشابہت کی وجہ سے یہ حکم ہوگا کہ ان حقوق میں دوسرے اشخاص کو بے اجازت تصرف ناجائز، اور اس سے احتراز واجب ہے جیسا کہ دوسرے کے مال میں بے اجازت تصرف ناجائز اور اس سے احتراز واجب ہوتا ہے۔ والتصرف فی مال الخیر حرام فیجب التحرز عنہ (ہدایہ ۲، ۵۹، باب المراجہ)۔

اس بحث کا حاصل یہ نکلا کہ حقوق کی یہ قسم جو عین سے متعلق نہیں، شرعی نقطہ نظر سے مال کے زمرے میں نہیں آتی اس لئے ان کی خرید و فروخت ناجائز ہے، مگر یہ حقوق سورج کی کرن یا ہوا کا جھونکا نہیں کہ اس سے جو چاہے فائدہ اٹھائے بلکہ معنوی طور پر یہ کچھ اشخاص اور اداروں کے ساتھ ملک کی حیثیت سے وابستہ ہیں لہذا بغیر حقداروں کی اجازت کے دوسروں کو ان حقوق میں تصرف کرنا حرام و گناہ ہے تو ایک مصنف کی کتاب دوسرے کو چھاپنے کی اور مخصوص تجارتی اداروں کی علامتیں دوسروں کو اپنی تجارت میں استعمال کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ البتہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ کسی فرد، یا ادارہ کے لئے ان حقوق کا محفوظ ہونا ظاہر کر دیا گیا ہو۔ اب خواہ رجسٹرڈ بھی کرایا گیا ہو، یا نہ کرایا گیا ہو بہر حال غیر کا تصرف ناجائز ہوگا۔ رجسٹرڈ ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر قانونی چارہ جوئی میں مدد ملے گی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حق والے، حقوق کو اپنے استعمال میں لانے کے سوا ان سے اب کوئی فائدہ اٹھا ہی نہیں سکتے، بلکہ اب بھی ان کے لئے انتفاع کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ یہ کہ بالخصوص مصنف اپنی تصنیف کا مسودہ اور موجود اپنی ایجاد کردہ چیز دوسرے کے ہاتھ بیچ دے یہ صورت جائز ہے کہ دام کے عوض میں مال کی بیع ہے۔  
ب۔ یہ کہ یہ تمام حق والے خریدار سے بیچنے کے بجائے جتنا چاہیں دام وصول کر لیں اور اپنے لینے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ حقوق ادبیہ، وعلامات تجارتیہ کی خرید و فروخت پر عوام و خواص کا تعامل ہو چکا ہے تو ان حقوق کی بھی بیع جائز ہوگی۔

### مال کے بدلے حق سے دستبرداری کا ضابطہ:

اوپر جن حقوق اصل میں کا ذکر ہوا ہے خواہ ان کی بیع جائز ہو یا ناجائز، ان سب کے عوض میں مال لے کر ان سے دستبرداری جائز و درست ہے۔ اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جو حق اصل میں ثابت ہوں ان کے بدلے میں مال لے کر ان سے دستبرداری جائز ہے، اور جو حق محض کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ثابت ہوں ان کے بدلے میں مال لے کر دستبرداری جائز نہیں ہے، کیونکہ جب صاحب حق مال لے کر ان سے دستبرداری پر راضی ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اسے حق نہ ملنے پر کوئی ضرر نہیں ہے، چونکہ اس کو یہ حق ضرر ہی کی وجہ سے ملا تھا، جب وہی یہاں معدوم ہے تو اس کے لئے حق ثابت ہی نہیں ہوا، پھر یہ مال لے کر کس چیز سے دستبردار ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص اپنا مکان کسی اجنبی کے ہاتھ بیچ رہا ہے تو پڑوسی کو اصل میں اس معاملہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ مالک مکان اپنی ملک میں جائز تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے تو اس میں کسی کو بھی مداخلت کا کیا حق۔ لیکن یہ ہونے والا دنیا مالک مکان پڑوسی کے لئے برا ثابت ہو سکتا ہے، تو شریعت نے اسی ضرر کو دور کرنے کے لئے پڑوسی کو یہ حق دیا کہ وہ اجنبی کے ہاتھ بیچ کا معاملہ ختم کرا کے اسی طے شدہ دام پر مکان کو خود ہی خرید لے، فقہ کی اصطلاح میں اسے ”حق شفیعہ“ کہا جاتا ہے۔ اب یہ شخص خریدار کی پیشکش پر، یا خود سے کچھ مال لے کر اجنبی کے ہاتھ مکان کی فروختگی پر رضامند ہو جائے تو بجا طور پر یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اجنبی اس کے لئے ضرر کا باعث نہیں، لہذا اس کے لئے حق شفیعہ ثابت نہ ہوگا تو اس دستبرداری کا بہانہ کر کے مال لینا بھی جائز نہ ہوگا۔ یہی حال خیار مخیرہ و خیار بلوغ کا بھی ہے کہ شوہر نے عورت کو اپنے آپ کو طلاق دے کر نکاح کی پابندی سے رہا کر لینے کا اختیار دیا تو اسے شوہر کی طرف سے پائے جانے والے ضرر کو دور کرنے کے لئے یہ حق ملا۔ یا نابالغ نابالغہ کا نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی ولی نے کر دیا تو اس کی شفقت کی کمی کے سبب غیر مناسب رشتے کے انتخاب کا ضرر دور کرنے کے لئے بالغ ہونے کے وقت اسے رد کر دینے کا حق انھیں ملا، تو اگر یہ مال لے کر صلح کرنا چاہیں تو ناجائز ہوگا۔ ہاں جو حق اصل میں ثابت ہیں



جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ان کی بہت سی مثالیں گزریں، تو وہ حق دستبرداری کے لئے رضا مندی کا مظاہرہ کرنے سے کالعدم نہ ہوں گے بلکہ حسب سابق باقی ہی رہیں گے، لہذا ان سے دست برداری کے عوض میں مال لینا جائز ہوگا، اس مسئلے کی پوری تفصیل شامی (۱۵/۳، باب البیع) میں ہے۔

”مسئلہ احتیاض عن الوطائف میں ہر چند علماء کو اختلاف ہے اور یہ بحث معرکہ الآراء ہے مگر مرضی و مختار جماہیر فحول، بخاری، عدول صحت و قبول ہے، اور وہی ہنگام اعتبار و ملاحظہ نظر ان شاء اللہ تعالیٰ اظہر ہے، اگرچہ دوسرا پہلہ بھی بہت ثقیل و گراں ہے“ (فتاویٰ رضویہ ۱۳/۷)۔

### حق کی چوتھی قسم:

حق کا ثبوت محض دفع ضرر کے لئے ہو، اصلۃً اس کا ثبوت نہ ہو۔ اس حق کی نہ بیع جائز ہے اور نہ ہی اس سے دستبرداری کے لئے مال لینا جائز ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم عنقریب بیان کر آئے کہ اس حق سے مال لے کر دستبرداری دلیل رضا ہے، اور اس صورت میں دستبرد ہونے والے کے لئے قطعی طور پر یہ حق ثابت ہی نہیں ہوتا۔ اور بیع کی صحت کے لئے تو رضا مندی لازمی شرط ہے: ”إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ“ (نساء، ۲۹)۔ تو بیع کی صورت میں بھی یہ حق ثابت نہ ہوگا، بلفظ دیگر حق معدوم رہے گا، اور معدوم کی بیع باطل ہے۔

علاوہ ازیں یہ حق بھی دیگر حقوق کی طرح سے مال نہیں، اور ساتھ ہی یہ مال عین سے متعلق بھی نہیں کیونکہ ”دفع ضرر“ شرعاً عرفاً کسی بھی طرح مال کی فہرست میں نہیں آتا، پس اگر شفیق، مخیر، بالغ، بالغہ وغیرہ کے لئے رضا مندی کی صورت میں بھی بالفرض یہ حق ثابت رہتا تو بھی اس کی بیع صحیح ہونے کے لئے جواز کی قطعی کوئی راہ نہ تھی۔ واللہ أعلم بالصواب۔



## مال کی حقیقت اور منافع کی مالیت کا مختصر جائزہ

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

مال کی حقیقت اور اس کی تعریف کے بارے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ شریعت نے کتاب و سنت میں مال کی کوئی متعین تعریف نہیں کی ہے، بلکہ عربی زبان میں استعمال ہونے والے بہت سے الفاظ کی طرح کتاب و سنت میں لفظ مال کو بھی اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے جو مفہوم عربی زبان و ادب میں مروج تھا، دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مال اصطلاحات شرعیہ میں سے نہیں ہے، یعنی قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں لفظ مال کو کسی ایسے مفہوم کے لئے مخصوص طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے جو اس کے لغوی مفہوم سے علاحدہ ہو، بلکہ نزول قرآن کے زمانہ میں مال جس معنی اور مفہوم میں استعمال ہو رہا تھا کتاب و سنت میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

”مال“ ایک ایسا لفظ ہے جس کا استعمال ہر انسان روزمرہ بار بار کرتا ہے اور اس کے ذہن میں اس کا ایک واضح تصور پایا جاتا ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مال بد یہی حقیقتوں میں سے ہے، اور تمام بد یہی حقیقتوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جب انھیں علمی اور فنی اصطلاحات کی زنجیروں میں جکڑ کر اصحاب فن ایک خاص دائرہ میں محدود کرنا چاہتے ہیں تو وہ بد یہی حقیقت نظری معلوم ہونے لگتی ہے۔ سورج جو ایک واضح ترین بد یہی حقیقت ہے اور جس کا مشاہدہ ہر شخص روزانہ مسلسل کرتا ہے، اگر اس کی اصطلاحی اور فنی تعریف کا مسئلہ اٹھایا جائے تو شاید سب سے بڑا اختلافی مسئلہ بن جائے اور کسی بھی ایک تعریف پر اہل علم متفق نہ ہو سکیں، کچھ اسی سے ملتا جلتا معاملہ ”مال“ کا بھی ہے، مال بھی اس دنیا کی ایک بد یہی حقیقت ہے، کس بچوں اور کم عقل انسانوں کے دماغوں میں بھی اس کا تصور موجود ہے، لیکن جب ہم مال کی حقیقت کو اصطلاحی الفاظ کی زنجیروں میں اسیر کرنا چاہتے ہیں تو مختلف تعریفات سامنے آتی ہیں، اگر ہم لفظ ”مال“ کی لغوی حقیقت پر غور کریں تو اس سے اس مسئلہ کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

مال کی لغوی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ”المال ما یمیل الیہ الطبع“ (رد المحتار) (مال وہ شے ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو) طبیعت کے میلان سے یہ مراد نہیں ہے کہ طبیعت میں اسے کھانے یا اسے استعمال کرنے کا رجحان پایا جاتا ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی طبیعت اپنے ذاتی استعمال کے لئے یا کسی بھی طور سے اس سے نفع حاصل ہونے کی امید کی بنا پر اس کی طرف راغب ہو اور اس پر اپنا قبضہ قائم کرنا چاہتی ہو، مثلاً بہت سی دوائیں اور بے مزہ چیزیں اس معنی میں تو انسان کو مرغوب نہیں ہیں کہ انسان ان کے استعمال کی طرف راغب ہو بلکہ اس اعتبار سے انسان کو ان سے سخت نفرت اور وحشت ہوتی ہے لیکن چونکہ انسان کو اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ انھیں فروخت کر کے وہ قیمت حاصل کر سکتا ہے، اور اس قیمت سے اپنی ضروریات اور مطلوبہ چیزیں مہیا کر سکتا ہے اس لئے انسان ان تلخ اور بے مزہ دواؤں کو مال تصور کر کے اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔

بہر حال مال ہونے کے لئے میلان طبع کا پایا جانا ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس سلسلہ میں ہر شخص کے انفرادی میلان طبع کا اعتبار ہوگا یا سماج کے عمومی میلان طبع کا، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص کے انفرادی میلان طبع کا اعتبار کیا جائے تو ہر انسان کے نزدیک مال کی فہرست دوسرے سے مختلف ہوگی، اس لئے علامہ شامی کا یہ بیان بہت ہی حقیقت پسندانہ معلوم ہوتا ہے کہ ”المالیۃ تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم“ (رد المحتار ۴۰۵) (مالیت تمام لوگوں کے مال بنانے سے یا بعض لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے)۔ علامہ شامی کے اس بیان میں بعض لوگوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایک دو افراد جس چیز کو مال سمجھنے لگیں وہ مال ہو جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سماج کے کسی مخصوص طبقے یا مخصوص گروہ کے مال بنانے سے بھی مالیت ثابت ہو جاتی ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کے مال ہونے کا دار و مدار تمام تر عرف پر ہے۔ یعنی پورا سماج یا سماج کا کوئی مخصوص طبقہ جس چیز کو مال گردانتا ہو اور اس کی طرف میلان رکھتا ہو وہ چیز مال کہلاتی ہے، مختلف مذاہب فقہیہ سے تعلق رکھنے والے فقہاء کی عبارتوں سے یہ بات منکشف



ہوتی ہے۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

”لا یقع اسم المال الاعلیٰ ما له قيمة یباع بها و تلزم متلفه وان قلت و ما لا یطرحة الناس“ (الاشیاء والنظائر، ۱۹)  
(مال ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جس کی قیمت ہو، قیمت کے بدلے اس کی فرد خستگی ہوتی ہو، اور اسے تلف کرنے والے کے ذمہ قیمت لازم ہوتی ہو، اگرچہ قیمت معمولی ہو، اور جسے لوگ پھینکانہ کرتے ہوں)۔

علامہ شامی ردالمحتار میں لکھتے ہیں: ”المراد بالمال ما یمیل الیہ الطبع و یمکن ادخاره لوقت الحاجة و المالیت تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم“ (ردالمحتار، ۲۰، ۵۰۱)۔ (مال سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو اور اسے وقت ضرورت کے لئے اندوختہ کیا جاسکتا ہو، مالیت تمام لوگوں یا بعض افراد کے مال بنانے سے ثابت ہو جاتی ہے)۔

کسی بھی چیز کی طرف انسان کی طبیعت کا میلان اس کے منافع کی بنا پر ہوتا ہے، اس لئے جس چیز میں بھی منفعت پائی جاتی ہے اور اس منفعت کا ادراک انسانوں کو ہو جاتا ہے، اس کی طرف طبیعتوں کا میلان بھی ہو جاتا ہے، اشیاء دراصل اپنے منافع ہی کی وجہ سے انسانوں کو مطلوب ہوا کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں امام عزالدین بن عبدالسلام کا یہ جملہ بہت ہی فکر انگیز ہے ”ان المنافع ہی المقصود الاظہر فی جمیع الاموال“ (منافع ہی تمام اموال سے اصل مقصود ہوا کرتے ہیں)۔ بہت سے فقہاء نے مالیت کا دار و مدار ہی منفعت پر رکھا ہے، بعض فقہاء حنابلہ نے مال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”المال ما فیہ منفعة مباحة لغير حاجة ذو ضرورة“ (الاقناع، ۲، ۵۹)۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ مالیت کا دار و مدار سماج میں اس چیز کے مال قرار دیئے جانے پر ہے، اور سماج میں مال قرار دیا جانا اس چیز کی منفعت کی بنا پر ہوتا ہے، جب معاشرہ کسی چیز میں منفعت محسوس کرتا ہے، لوگوں میں اس کی طلب بڑھ جاتی ہے، اور لوگ اسے حاصل کرنے اور اپنے قبضہ میں لانے کے لئے سرمایہ خرچ کرتے ہیں، اس طرح اس چیز کی لین دین اور خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے۔

جب مالیت کا دار و مدار عرف پر ٹھہرا تو یہ بات یقینی ہو گئی کہ مال کی فہرست ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے۔ ایک زمانہ میں کوئی چیز غیر منفعت بخش تصور کی جاتی ہو، یا فراوانی کے ساتھ اس کے فراہم ہونے کی وجہ سے قیمت دے کر لوگ اسے خریدنے پر تیار نہیں ہوتے، لیکن وہی چیز دوسرے وقت میں یا دوسرے ملک میں انتہائی قیمتی تصور کی جاتی ہے، اور روپیہ پیسہ دے کر اسے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جاتا ہے، مثلاً قدیم زمانہ میں لکڑیاں اتنی فراوانی کے ساتھ مہیا تھیں کہ انسان جب چاہتا جس مقدار میں چاہتا لکڑیاں مہیا کر لیتا، لکڑی حاصل کرنے کے لئے نہ تو سرمایہ خرچ کرنے کی ضرورت تھی، اور نہ ہی لوگ معمولی قسم کی لکڑیاں ایک دوسرے کو مفت دینے میں بخل سے کام لیتے تھے، لیکن آج کل معمولی لکڑی انتہائی قیمتی ہو گئی ہے، اور کوئی شخص مفت میں کسی کو لکڑی دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسی طرح ابھی ماضی قریب تک مٹی کی خرید و فروخت کا تصور بھی کیا جانا ممکن نہیں تھا، لیکن اب مٹی قیمتی مال تصور کی جاتی ہے اور لوگ بڑی بڑی رقمیں دے کر مختلف مقاصد سے مٹی حاصل کرتے ہیں، اس لئے آج کے عرف میں مٹی بھی گراں قیمت مال بن چکی ہے، اس لئے مال کی کوئی ایسی فہرست تیار کرنا جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں یکساں ہو ممکن نہیں۔

فقہاء حنفیہ نے مال کی جو تعریفات کی ہیں ان کا جائزہ لینے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے یہاں حقیقت مال میں دو بنیادی عناصر شامل ہیں: (۱) اس چیز کی طرف میلان طبع کا پایا جانا اور اس کا قابل انتفاع ہونا۔ (۲) اس کا قابل ادخار ہونا، یعنی اس چیز کا اس حال میں ہونا کہ انسان وقت ضرورت کے لئے اسے ذخیرہ کر سکے، اور منتفع ہو سکے، فقہاء حنفیہ کی مختلف تعریفات کو دیکھ کر مال کے یہ دو عناصر سمجھ میں آتے ہیں، صاحب کشاف اصطلاحات الفنون لکھتے ہیں: ”المال عند الفقہاء موجود یمیل الیہ الطبع و یجری فیہ البذل والمنع“ (۳، ۱۳۵۱) (فقہاء کے نزدیک مال وہ موجود چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور اس میں بذل و منع (دینا نہ دینا) جاری ہو۔ علامہ شامی نے مال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”المراد بالمال ما یمیل الیہ الطبع و یمکن ادخاره لوقت الحاجة“ (ردالمحتار، ۲۰، ۵۰۱)۔

حنفیہ کے نزدیک مال کے جو یہ دو عناصر بیان کیے گئے ہیں ان میں سے پہلا عنصر تو دوسرے فقہاء کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہے، مالیت کے لئے اس چیز کا قابل انتفاع ہونا اور قابل انتفاع ہونے کی وجہ سے اس چیز کی طرف میلان طبع کا پایا جانا تعبیر اور اصطلاح کے فرق کے ساتھ تمام فقہاء کے یہاں موجود ہے، لیکن جہاں تک دوسرے عنصر کا سوال ہے وہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے، جمہور فقہاء کے نزدیک قابل ادخار ہونا مال کے لئے بنیادی شرط نہیں ہے، بلکہ منافع بھی ان حضرات کے نزدیک بظاہر قابل ادخار نہ ہونے کے باوجود مال قرار دیئے جاتے ہیں، قابل ادخار ہونے کی شرط کی بنا پر فقہاء حنفیہ کے نزدیک مال کے لئے



عینیت یعنی اس کا مادی اور محسوس ہونے کی شرط پیدا ہوتی ہے، اسی شرط کی بنا پر فقہاء حنفیہ منافع اور حقوق کو مال نہیں قرار دیتے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں غیر محسوس اور معنوی ہیں، اجارہ میں منافع کی جو بیع ہوتی ہے اسے بھی فقہاء حنفیہ استحسان کی بنا پر جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ قیاس کے اعتبار سے اسے جائز نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ ملک العلماء کا سانی لکھتے ہیں:

”اجارہ عام فقہاء کے نزدیک جائز ہے، ابو بکر اصم کے نزدیک جائز نہیں ہے، قیاس کا تقاضا وہی ہے جو ابو بکر اصم نے کہا ہے، کیونکہ اجارہ منفعہ کی بیع ہے اور منافع فی الحال معدوم ہیں اور معدوم چیز قابل بیع نہیں ہوتی، اس لئے مستقبل میں جو منافع حاصل ہوں گے ان کی طرف بیع کی نسبت جائز نہیں ہونی چاہیے، جس طرح ان محسوس مادی اشیاء کی طرف بیع کی نسبت درست نہیں ہوتی جو آئندہ حاصل ہوں گی، اس لئے حال اور مال کسی اعتبار سے منافع کی بیع کو جائز قرار دینے کی کوئی سبیل نہیں ہے، لیکن ہم نے کتاب، سنت، اجماع کی بنا پر استحساناً اجارہ کو جائز کہا“ (۱۷۳/۳)۔

مال کی حقیقت میں عینیت یعنی محسوس مادی چیز کا ہونا شامل ہے یا نہیں، یہ ہمیشہ سے ایک مختلف فیہ مسئلہ رہا ہے، اس سلسلہ میں کسی فریق کے پاس کتاب و سنت کے ایسے واضح دلائل نہیں ہیں جن کی بنا پر اس اختلاف کا قطعی فیصلہ ہو سکے، فقہاء حنفیہ نے اس سلسلہ میں زیادہ تر عربی زبان کے استعمالات سے استدلال کیا ہے، لیکن اہل لغت کی تصریحات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے یہاں بھی اس باب میں اختلاف پایا جاتا ہے، اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ اس مسئلہ پر ہمیں فقہ حنفی کی روشنی میں ایک دوسرے زاویہ نظر سے غور و خوض کرنا چاہیے۔ حقوق و منافع کا مال اور قابل بیع ہونا ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے، اس کا شمار مخصوص فیہ مسائل میں نہیں ہے، اور مجتہد فیہ مسائل میں فقہاء حنفیہ کے نزدیک عرف کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے، یعنی اگر عرف کا مقابلہ قیاس سے ہو تو قیاس کو ترک کر کے عرف کو اختیار کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ علامہ شامی نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر عرف ظاہر روایت کے خلاف ہو تو ظاہر روایت کو ترک کر دیا جائے گا۔

”فقہی مسائل یا تو صریح نص (قرآن و سنت) سے ثابت ہوں گے، یہ پہلی صورت ہے، یا فقہی مسائل قیاس و اجتہاد سے ثابت ہوں گے، اس دوسری قسم کے مسائل میں سے بہت سے مسائل کی بنیاد مجتہد اپنے زمانہ کے عرف پر رکھتا ہے، اگر وہ مجتہد اس نئے عرف کے زمانہ میں موجود ہوتا تو اس کی رائے اپنی رائے کے برخلاف ہوتی، اسی لئے فقہاء نے اجتہاد کی ایک شرط یہ بتائی ہے کہ انسان لوگوں کی عادات کی واقفیت رکھتا ہو، کیونکہ بہت سے احکام زمانہ کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں، اس لئے کہ اس زمانہ کے لوگوں کا عرف تبدیل ہو چکا ہوتا ہے، یا کوئی ”ضرورت“ پیدا ہو جاتی ہے، اس دور کے لوگوں میں بگاڑ آچکا ہوتا ہے، اور پہلا حکم باقی رکھنے میں لوگوں کے لئے مشقت اور ضرر لازم آتا ہے اور شریعت کے ان قواعد کی مخالفت ہوتی ہے جو تخفیف و تیسیر اور دفع ضرر و فساد پر مبنی ہیں، تاکہ دنیا کا نظام کامل صورت میں اور مستحکم طور پر باقی رہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ مسلک حنفی کے فقہاء نے بہت سے مسائل میں مسلک حنفی کے قواعد کی روشنی میں امام صاحب کی تصریحات سے اختلاف کیا ہے، کیونکہ امام و مجتہد نے اپنے دور کے عرف کی بنیاد پر وہ احکام بیان کیے تھے، لہذا امام صاحب اگر اس زمانہ میں ہوتے تو وہی بات فرماتے جو بعد کے فقہاء نے کہی ہے“ (مجموعہ رسائل ابن عابدین ۱۲۳/۲)۔

فقہ حنفی کے اس اصول کے اعتبار سے میرا خیال یہ ہے کہ جن منافع اور حقوق کو پورا سماج یا سماج کا کوئی خاص حصہ دولت تصور کر کے اس کا لین دین کرتا ہے اور معاشرہ میں اس کی خرید و فروخت کا رواج ہے، اسے مال قرار دے کر خرید و فروخت اور دستبرداری کے قابل قرار دینا چاہیے، بشرطیکہ اس میں نہ تو کھلا ہوا استحصال ہو، نہ جہالت مفضی الی النزاع ہو، اور نہ ہی غرر پایا جاتا ہو۔

ان تفصیلات کی روشنی میں میری رائے یہ ہے کہ مال کی تعریف میں عینیت کی شرط لازمی شرط نہیں ہے، اگر عرف میں کسی غیر مادی چیز یا منفعہ کو مال گردانا جاتا ہے اور بالمعاوضہ اس کا لین دین معاشرہ میں رائج ہو تو اگر اس میں دوسرے شرعی مفسد نہ ہوں تو اسے مال قرار دے کر شرعاً اس کی بیع جائز قرار دی جانی چاہیے۔ جہاں تک مال کے لئے قابل ذخیرہ ہونے کی شرط کا تعلق ہے اسے فقہاء حنفیہ کے نزدیک شرط قرار دیا جانا اسی بنیاد پر ہے کہ خریدار کے لئے اس پر قبضہ کرنا اور اس سے نفع اٹھانا ممکن ہو سکے، لہذا اس شرط کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اشیاء کے قابل ذخیرہ ہونے کا مطلب اس کی اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے لیا جائے گا۔ قابل ذخیرہ ہونے کی کوئی مخصوص صورت متعین نہیں ہے، بلکہ عرف میں اس چیز کے ذخیرہ کرنے کا جو طریقہ مروج ہو اسی کا اعتبار ہوگا، عہد حاضر کے سائنسی ترقیات کی بنا پر بہت سی وہ چیزیں اور بہت سے وہ منافع اور حقوق جو زمانہ ماضی میں ذخیرہ کرنے کے قابل نہیں تھے اور ان پر قبضہ و دخل کا تصور بھی ذہنوں میں نہیں آتا تھا وہ اس دور میں قابل ذخیرہ ہو گئے ہیں، اس دور میں جس چیز کو ادبی حقوق یا حق ایجاد و اختراع کہا جاتا ہے وہ سب کے سب کسی نہ کسی شکل میں قابل ذخیرہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے باقاعدہ ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور انہیں انتہائی قیمتی مال تصور کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

## مال کی حقیقت اور بیع حقوق کا مسئلہ

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوری<sup>۱</sup>

فقہ اسلامی اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے تمام شعبہ ہائے حیات کو شامل اور حاوی ہے، حیات انسانی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے اسلام کی ہدایات موجود نہ ہوں، عبادات ہوں یا معاملات، اخلاقیات ہوں یا سماجیات، اقتصادیات ہوں یا معاشیات، ہر میدان اور ہر شعبہ میں فقہ اسلامی انسانوں کی قیادت و سیادت کے فرائض انجام دیتا آ رہا ہے۔

موجودہ دور میں سائنس و ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی، نئی نئی ایجادات و اختراعات نے لامحدود مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا ماضی میں تصور بھی نہیں تھا۔ وقت اور بدلتے ہوئے حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ علماء و فقہاء سر جوڑ کر بیٹھیں اور بدلتے ہوئے حالات میں فقہ اسلامی کی تطبیق و تشکیل کا فریضہ انجام دے کر امت مسلمہ کو موجودہ بحران سے نجات دیں۔ اسی کی ایک کامیاب کوشش موجودہ فقہی سمینار ہے جس میں نئے مسائل و اختراعات کا شرعی حل تلاش کرنے کے لئے علماء، فقہاء اور دانشور حضرات ایک ساتھ بیٹھ کر غور و خوض کرتے ہیں۔

اس تیسرے فقہی سمینار میں ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ:

تبادلہ اور خرید و فروخت کی حقیقت شرعی و عرفی کیا ہے؟ مال کسے کہا جاتا ہے؟ مال کا اطلاق صرف مادی اشیاء اور اعیان پر ہوتا ہے یا مال حقوق و منافع کو بھی شامل ہے، خرید و فروخت صرف مادی اشیاء کی ہو سکتی ہے یا حقوق و منافع کی بیع بھی درست ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شئی ماضی میں ”مستقوم“ اور ”مال“ نہ سمجھی جاتی رہی ہو، مگر اس دور میں وہی شئی مستقوم اور مال ہو۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سوالات کو اپنی فکر و نظر کا مرکز بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بیع کی حقیقت اور مال کی اصلیت پر غائرانہ نظر ڈالیں۔

### بیع کی لغوی تحقیق:

لغت میں ایک شئی سے دوسری شئی کے تبادلہ کو ”بیع“ کہا جاتا ہے، چاہے مال کا تبادلہ مال سے ہو یا غیر مال سے۔ عبداللہ بن محمود الموصلی الحنفی (م ۶۸۳ھ) نے بیع کی لغوی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”البيع في اللغة: مطلق المبادلة، وكذلك الشراء، سواء كانت في مال أو غيره“ (الاختیار لتعلیل المختار ۲۰۲)۔

در مختار میں ہے: ”هو لغة: مقابلة شيء بشيء مالا أو لا“ (در مختار علی هامش رد المحتار ۳۰۵۰۲)۔ اور در المنقحی میں لکھا ہے: ”تملیک شیء بشيء سواء كان مالا أو لا“ (در منقحی علی هامش مجمع الاثر ۲۰۲) یعنی ایک چیز کے ذریعہ دوسری چیز کا مالک بنانا لفظ بیع ہے، چاہے یہ تملیک مال کی ہو یا غیر مال کی۔

علامہ ابن اہمام نے فخر الاسلام کے حوالہ سے نقل کیا ہے: لغت میں ”مبادلة المال بالمال“ کو بیع کہا جاتا ہے (الاختیار لتعلیل المختار ۲۰۲)، المجموع شرح المہذب للنووی میں ”مقابلة المال بالمال“ کو لفظ مال قرار دیا ہے (المجموع ۱۳۹۹)۔ ابن شہاب الربلی نے ”مقابلة شيء بشيء“ کو لفظ مال کہا ہے (نہایۃ المحتاج ۳۶۱، ۳)۔

بیع کی لغوی حقیقت میں بھی علماء مختلف انخیال ہیں، جیسا کہ اوپر گذرا۔ بعض علماء مطلق ”تبادلہ“ کو لفظ بیع کہتے ہیں۔ چاہے مال کا مال کے ساتھ تبادلہ ہو یا غیر مال کے ساتھ۔ اور بعض علماء تبادلہ کو مال کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ یعنی اگر ایک مال دے کر دوسرے مال کا تبادلہ کیا جائے (بیع اور شمن دونوں مال ہوں) تو



اسے لغوی اعتبار سے بیع کہا جائے گا۔ اگر غیر مال کا تبادلہ کیا جائے تو اسے بیع نہیں کہا جائے گا۔

بیع کی شرعی حقیقت:..... بیع کی لغوی حقیقت ہی کی طرح بیع کی شرعی اور اصطلاحی حقیقت کے بارے میں بھی علماء کی آراء اور ان کے اقوال مختلف ہیں، ایک ہی مسلک کے علماء کے درمیان بھی بیع کی حقیقت کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

بیع کی حقیقت کے بارے میں حنفی نقطہ نظر:

۱۔ بعض فقہائے حنفیہ نے بیع کی تعریف میں ”شئی مرغوب فیہ“ کا ذکر کیا ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک ”شئی مرغوب فیہ“ کے ذریعہ ”شئی مرغوب فیہ“ کے تبادلہ کا نام بیع ہے، صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی اور صاحب درمختار علماء الدین حصکشی سے بیع کی یہی تعریف منقول ہے۔ چنانچہ صاحب درمختار نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وشرعاً مبادلة شیئ مرغوب فیہ بمثلہ علی وجه مفید (درمختار علی هامش رد المحتار ۴، ۵۰۲) (شئی مرغوب فیہ کا شئی مرغوب فیہ کے ذریعہ مفید طریقہ پر تبادلہ کو شرعاً بیع کہا جاتا ہے)۔“

علامہ کاسانی سے بیع کی تعریف میں یہ الفاظ منقول ہیں: ”وہی مبادلة شیئ مرغوب بشیئ مرغوب“ (بدائع الصنائع ۶، ۲۹۸ ط: مطبعة الامام قاہرہ) (شئی مرغوب کے ذریعہ شئی مرغوب کا تبادلہ بیع ہے)۔

شئی مرغوب سے کیا مراد ہے؟ بیع کی تعریف میں سب سے پہلے علامہ کاسانی ہی نے ”شئی مرغوب“ کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر ان کی تقلید میں صاحب درمختار نے اس لفظ کو ذکر کیا ہے۔ دیگر علماء حنفیہ نے شئی مرغوب فیہ کے تبادلہ کے بجائے ”مبادلة المال بالمال“ کو بیع قرار دیا ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا علامہ کاسانی اور صاحب درمختار کے نزدیک بیع میں مال کی شرط ضروری نہیں ہے بلکہ ہر وہ شئی جو مرغوب فیہ ہو اس کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں بیع کی تعریف حقوق و منافع کو بھی شامل ہوگی، مگر ایسا نہیں ہے۔ جن حضرات نے بیع کی تعریف ”مبادلة شیئ مرغوب بشیئ مرغوب“ کے ذریعہ کی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بھی ”شئی مرغوب“ سے مراد مال ہی ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانی جن سے مذکورہ بالا تعریف منقول ہے۔ بدائع الصنائع ہی میں شرائط معقود علیہ کے ذیل میں بیع کی تعریف اس طرح کی ہے: لأن البیع مبادلة المال بالمال (حوالہ بالا ۶، ۳۰۰)۔

اسی طرح صاحب درمختار نے شرح ملتقی الابحر میں صراحت کی ہے کہ ”شئی مرغوب“ سے مراد مال ہے (عربی مقالہ مولانا تاقی عثمانی ۱۵) اور علامہ ابن عابدین شامی نے صاحب درمختار کے قول ”مرغوب فیہ“ کے تحت لکھا ہے:

”ای ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال“ (رد المحتار ۴، ۵۰۲)۔

لیکن ان حضرات کے نزدیک شئی مرغوب سے مال مراد ہے۔ لہذا یہ تعریف ان فقہاء کی تعریف کے موافق ہوگئی جنہوں نے بیع کی تعریف میں مال کی شرط لگائی ہے۔

مذکورہ بالا تعریف پر نقد:

مذکورہ بالا تعریف میں شئی مرغوب فیہ کے ذریعہ شئی مرغوب فیہ کے تبادلہ کو شرعاً بیع قرار دیا گیا ہے اور ”مرغوب فیہ“ سے مراد وہ شئی ہے جس کی طرف کل یا بعض لوگوں کا میلان قلب اور ان کی رغبت ہو۔ خواہ وہ شئی شرعاً مباح الانشاع ہو یا نہ ہو۔ اس تعریف کے لحاظ سے اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ خمر (شراب) کی بیع کرے تو اسے جائز ہونا چاہیے کیونکہ بہر حال خمر شئی مرغوب فیہ ہے۔ ایک طبقہ کا اس کی طرف میلان قلب ہے۔ مگر اس کے باوجود فقہاء اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ”خمر“ مال نہیں ہے۔ اگر اس کی بیع کسی مسلمان کے ہاتھ کی گئی تو جائز نہ ہوگا۔ چنانچہ علامہ السید احمد الطحطاوی صاحب درمختار کی تعریف ”مبادلة شیئ مرغوب فیہ بمثلہ“ پر نقض کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”ویرد علی هذا التعریف بیع الخمر من متعاطیہ المسلم وقد صرح فی المحيط أنه لیس بمال وأنه لا ینعقد علیہ العقد“۔

اور صاحب کنز کی تعریف کو راجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: ”فالاولی ما ذکرہ حافظ الدین فی الكنز من قوله: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی“ (حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار ۳، ۲)۔



بعض فقہاء نے "تملیک المال بالمال" کو شرعاً بیع قرار دیا ہے۔ صاحب درالمنشی اور صاحب مجمع الانہر کی یہی رائے ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بیع کی تعریف میں "تراضی" کی قید ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب درالمنشی نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وشرعاً (مبادلة مال) ای تملیک المال کما فی الدراية (بمال) (درالمنشی علی هامش مجمع الانہر ۲،۲)۔  
(یعنی مال کے ذریعہ مال کی تملیک کو شرعاً بیع کہا جاتا ہے)۔

اسی طرح مجمع الانہر شرح ملتقى الابحر میں بھی (مبادلہ مال بمال) کو شرعاً بیع قرار دیا ہے (مجمع الانہر ۳/۲)۔

### ۳۔ تراضی کی قید:

علامہ ابن الہمام صاحب فتح القدير، صاحب کفایہ، صاحب شرح عنایہ اور صاحب کنز نے بیع کی تعریف میں "مبادلة المال بالمال" کے ساتھ "تراضی" کی قید بھی لگائی ہے۔ چنانچہ صاحب شرح عنایہ نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے:

"والبيع في اللغة: تملیک المال بالمال وزید علیہ فی الشرع فقيل هو: مبادلة المال بالمال بالتراضی بطریق الاکتساب" (شرح عنایہ علی هامش فتح القدير ۵،۲۵۵)۔ (بیع لغت میں تملیک المال بالمال کا نام ہے۔ اور شریعت میں اس پر اضافہ کر کے کہا گیا کہ رضامندی کے ساتھ بطریق اکتساب مال کا تبادلہ مال کے ذریعہ بیع ہے)۔

اور صاحب کفایہ نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "البيع مبادلة المال بالمال بالتراضی" (کفایہ مع فتح القدير ۵،۲۵۲)۔

محقق ابن الہمام کہتے ہیں کہ باعتبار لغت بھی بیع کی تعریف میں "تراضی" کی قید ملحوظ ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ زید نے اپنے غلام کو فروخت کیا تو باعتبار لغت و عرف بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اپنی رضامندی سے غلام کا "شمن" سے تبادلہ کیا ہے۔ غصب کے ذریعہ کسی کے مال کو لینے اور کسی شخص کو بغیر رضامندی کے کوئی چیز دینے کو اہل لغت "بیع" سے تعبیر نہیں کرتے ہیں (فتح القدير ۵،۲۵۵)۔

شارح کنز علامہ فخر الدین الزیلعی کا خیال ہے کہ بیع کی تعریف میں "تراضی" کی قید کا لحاظ ضروری ہے، اور تراضی کی قید کے ساتھ بیع کا مقید ہونا خود آیت قرآنی: "إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ" سے ثابت ہے، چنانچہ علامہ زیلعی صاحب کنز کی عبارت (مبادلة المال بالمال بالتراضی) کے تحت رقمطراز ہیں: "هذا في الشرع وفي اللغة هو مطلق المبادلة من غير تقييد بالتراضی، وكونه مقيداً به ثبت شرعاً لقوله تعالى: إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ" (تمبین الحقائق ۲،۲، طمکتبہ امدادیہ ملتان)۔

### بیع کی راجح تعریف:

راقم الحروف کے نزدیک بیع کی مذکورہ بالا جملہ تعریفات جامع اور مانع نہیں ہیں۔ یہ تمام تعریفات ہر قسم کے مال کو شامل و عام ہیں۔ چاہے وہ شرعاً مباح الانقاع ہو یا نہ ہو، اور چاہے وہ مال متقوم ہو یا غیر متقوم، نیز ان تعریفات کی رو سے ایک ذمی (دارالاسلام کا غیر مسلم باشندہ) کے لئے مسلمان سے خمر کی بیع درست قرار پائے گی۔ حالانکہ شریعت اسلامی صرف ان ہی اموال کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیتی ہے جو متقوم اور شرعاً مباح الانقاع ہیں۔ ان تعریفات کے مقابلہ میں "صاحب الاختیار لتعلیل المختار" کی تعریف زیادہ جامع اور ہر قسم کے نقص و اعتراض سے محفوظ ہے۔

چنانچہ بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مبادلة المال المتقوم بالمال المتقوم تملیکاً و تملکاً" (الاختیار لتعلیل المختار

لابن محمود الموصلی ۲،۲)۔

### کیا بیع کی تعریف میں مال کی شرط جوہری ہے:

بیع کی مذکورہ بالا تعریف فقہائے حنفیہ سے منقول ہیں۔ یہ حضرات بیع کی تعریف میں مال کی شرط کو ضروری اور جوہری قرار دیتے ہیں۔ اور انہیں چیزوں کی خرید و فروخت کے جواز کے قائل ہیں جو شرعاً "مال" ہیں۔ غیر اموال کی بیع ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی نے در مختار کی عبارت "مرغوب فیہ" کے تحت لکھا ہے:

”ای ما من شأنه أن ترغب إليه النفس، وهو المال، ولهذا اجتزأ به الشارح عن التراب والميتة والدم فإنها ليست بمال“ (رد المحتار ۴۰۵۲)۔ (یعنی مرغوب فیہ سے مراد وہ شئی ہے جس کی طرف نفس کی رغبت ہو اور وہ مال ہے، اور اسی وجہ سے شارح نے تراب (مٹی)، میتہ (مردہ)، دم (خون) سے احتراز کیا ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں مال نہیں ہیں)۔

نیز حنفیہ کے نزدیک مال صرف اعیان اور مادی اشیاء کے ساتھ خاص ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ بھی بیع کی تعریف میں ”مال“ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک مال عام ہے اعیان و منافع کو۔ شافعیہ کے نزدیک بیع کی تعریف ”بیع منفعۃ علی سبیل التایید“ کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح حنابلہ کے نزدیک بھی بیع اعیان و منافع دونوں کے تبادلہ کا نام ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ابن عرفہ کی تعریف کے مطابق بیع صرف مادی اشیاء کے ساتھ خاص ہے۔ منافع کو شامل نہیں ہے، البتہ بعض حقوق و منافع کی بیع کا جواز مالکیہ سے ثابت ہے۔ ائمہ ثلاثہ کا مسلک اس سلسلہ میں حسب ذیل ہے:

بیع کی حقیقت کے بارے میں شافعیہ کا نقطہ نظر:

شافعیہ کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ نووی نے ”المجموع شرح المہذب“ میں بیع کی تعریف اس طرح کی ہے: ”وأما حقيقة البيع في اللغة فهو مقابلة المال بالمال أو نحوه تمليكاً“ (المجموع شرح المہذب ۹۱۳۹) یعنی لغت میں ”تبادلہ مال بالمال“ کو بیع کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں تبادلہ مال بالمال یا اس کے مثل کے تبادلہ کو تملیک کا بیع کہا جاتا ہے۔ اس تعریف میں ”نحوہ“ کا لفظ غیر مال مثلاً منفعۃ اور حق وغیرہ کو شامل ہے۔

ابن شہاب الرطبی نے بیع کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”ولغة مقابلة شيء بشيء وشرعاً عقد يتضمن مقابلة مالي بمال بشرطه الآتي لاستفادة ملك عين أو منفعة مؤبدة“ (نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج ۲۰۳۱ ط: المكتبة الاسلامیہ)۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے عربی مقالہ بیع الحقوق الجردہ ۸ میں بیع کی مذکورہ بالا تعریف ابن حجر عسقلانی سے بھی نقل کی ہے) (لغت میں ایک شئی کے تبادلہ کو دوسری شئی کے ذریعہ بیع کہتے ہیں اور شرعاً بیع ایسا عقد ہے جو (آنے والی شرطوں کے ساتھ) تبادلہ مال بالمال کو شامل ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ملک عین یا منفعۃ مؤبدہ سے استفادہ کیا جائے)۔

یعنی اگر مادی اور عینی شئی سے تبادلہ کیا جائے تو اس صورت میں اس عین پر بیع کے ذریعہ ملکیت ثابت ہوتی ہے اور اگر منفعۃ مؤبدہ کی بیع کی جائے تو اس پر ملکیت ثابت ہوتی ہے اور اس ملکیت کے نتیجہ میں اس سے استفادہ و انتفاع کا حق حاصل ہوتا ہے۔

علامہ شریب نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:-

”عقد معاوضة مالية يفيد ملك عين أو منفعة على التأييد“ (مغنی المحتاج للشریبینی ۲۰۲ بحوالہ عربی مقالہ مولانا تقی عثمانی)۔

(یعنی بیع ایک ایسے مالی معاوضہ کا نام ہے جو ملک عین یا منفعۃ علی التایید کا فائدہ دیتا ہے)۔

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ شافعیہ کے نزدیک اگرچہ بیع کی تعریف میں مال کی قید ذکر کی گئی ہے مگر ان حضرات کے نزدیک مال صرف مادی اشیاء اور اعیان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اعیان و منافع دونوں کو شامل ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک جیسے مادی اشیاء کی بیع درست ہے حقوق و منافع کی بیع بھی درست ہے۔

حنابلہ کا نقطہ نظر:

حنابلہ کے نزدیک بھی بیع کی تعریف تبادلہ عین بالعين اور تبادلہ منفعۃ مؤبدہ کو شامل ہے۔ چنانچہ فقہ حنبلی کے ترجمان امام علاء الدین المرادوی الحنبلی نے ”الانصاف“ میں بیع کی مختلف تعریفات ذکر کرنے اور ہر ایک پر نقض وارد کرنے کے بعد لکھا ہے: ”وقال في الوجيز: هو عبارة عن تملك عين مالية ومنفعة مباحة على التأييد بعوض مالي“ (الانصاف للمرادوی ۲۰۲۰ ط: دار احیاء التراث العربی بیروت۔ نیز دیکھئے: نیل المآرب بشرح دلیل الطالب للشیخ عبد القادر ابن عمر الشیبانی الحنبلی ۱۰۸۲ ط: مطبعہ خیریہ ۵۱۳۲۲)۔

(یعنی عوض مالی کے ذریعہ عین مالی یا منفعۃ مباحہ علی التایید کی تملیک کا نام بیع ہے)۔



## مالکیہ کا نقطہ نظر:

مالکیہ کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے ابن عرفہ نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے:

”عقد معاوضة على غير منافع ولا متعة لذّة“ (شرح مختصر الشيخ خليل ۲، ۲۲۲)۔

(یعنی بیع ایسا عقد معاوضہ ہے جو نہ منافع پر واقع ہوتا ہے اور نہ متعہ لذت پر)۔

اس تعریف کی رو سے منافع اور نکاح بیع کی تعریف سے خارج قرار پائیں گے۔ اور اس تعریف کے لحاظ سے بیع صرف مادی اشیاء کے ساتھ خاص ہوگی۔ مگر مالکیہ کی بعض فروع سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض حقوق کی خرید و فروخت جائز ہے، مثلاً حق تعلی، دیوار پر لکڑی گاڑنے کا حق (تفصیل کے لئے دیکھئے: الدسوقی علی الشرح الکبیر ۱۳، ۱۳)۔

## مال کی حقیقت:

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ بیع کی تعریف میں تقریباً ہر مسلک کے علماء و فقہاء نے ”مال“ کی قید لگائی ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود مال کی شرعاً و عرفاً کیا حقیقت ہے۔ کیا مال مادی اشیاء اور اعیان کے ساتھ خاص ہے یا اعیان و منافع دونوں کو شامل ہے؟ کیا مال کی تحدید عرف و لغت اور شریعت نے کر دی ہے یا اس کا مدار عرف و رواج پر ہے۔ یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شے کسی دور میں ذریعہ تمول نہ رہی ہو اور نہ اس کی کوئی ضرورت و حاجت رہی ہو مگر اس دور میں وہی شے ضروری ہو گئی اور لوگوں کے درمیان ذریعہ تمول بھی بن گئی، تو کیا اسے مال کا درجہ دیا جائے گا اور اس کے ساتھ مال جیسا سلوک کیا جائے گا؟

## مال کی لغوی تحقیق:

سب سے پہلے ہم جب لغت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لغت میں مال ہر وہ شے ہے جس کا انسان مالک بنے، اس سلسلہ میں ابن منظور کا بیان بڑی وقعت رکھتا ہے۔ موصوف اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ”لسان العرب“ میں مال کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”المال معروف، ما ملکتہ من جمیع الأشياء“۔

اور علامہ ابن الاثیر کے حوالہ سے لکھا ہے: ”المال فی الاصل ما یملک من الذهب والفضة ثم اطلق علی کل ما یقتنی ویملک من الاعیان و اکثر ما یطلق المال عند العرب علی الإبل لأنها کانت اکثر أموالهم“ (لسان العرب لابن منظور ۶، ۲۲۰۰، ط دار المعارف)۔ (مال اصل میں سونا اور چاندی ہے جس کا انسان مالک بنے۔ پھر اس کا اطلاق ہر اس شے پر ہونے لگا جسے انسان محفوظ کرتا ہے اور جس کا انسان مادی اشیاء میں سے مالک بنتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک مال کا اطلاق زیادہ تر اذیوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے اموال کا زیادہ تر حصہ اذیوں ہی کی شکل میں ہوتا ہے)۔

علامہ راغب اصفہانی صاحب مفردات القرآن نے مال کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”مال کو مال اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک شخص کے پاس سے دوسرے شخص کی طرف مائل اور منتقل ہوتا رہتا ہے اور ایک ملکیت سے دوسرے کی ملکیت میں جاتا رہتا ہے“ (المفردات فی غریب القرآن ۱، ۷۸)۔

علامہ یوسف القرضاوی مال کی لغوی حقیقت پر محققانہ بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”مال اہل عرب کے نزدیک جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہر اس چیز کو شامل ہے جس کے جمع کرنے اور مالک بننے کی طرف انسان کی رغبت ہو۔ لہذا اونٹ مال ہے۔ بکری مال ہے۔ جائیداد مال ہے۔ سونا اور چاندی مال ہے۔ اور اسی بنیاد پر معاجم عربیہ قاموس اور لسان العرب میں کہا گیا ہے کہ مال ہر وہ شے ہے جس کا تو مالک بنے، اور ابن الاثیر نے کہا ہے کہ اصل میں مال سونے چاندی کا وہ حصہ ہے جس کا انسان مالک بنے پھر اس کا اطلاق ہر اس مادی اور عینی شے پر ہونے لگا جسے انسان جمع کرتا ہے اور اس کا مالک بنتا ہے“ (فتاویٰ الزکاة: یوسف القرضاوی ۱، ۱۲۳)۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے ”مال“ کی لغوی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: ”مال لغت میں ہر وہ چیز ہے جسے بالفعل انسان محفوظ اور جمع کرتا ہے، چاہے وہ اعیان کے قبیل سے ہو جیسے سونا، چاندی، جانور، پودا۔ یا منافع کے قبیل سے جیسے رکوب (سواری کرنا)، لبس (پہننا)، سکنی (رہائش اختیار کرنا)۔ لیکن وہ



چیزیں جنہیں انسان محفوظ نہیں کرتا ہے ان پر لغوی اعتبار سے مال کا اطلاق نہیں ہوتا ہے جیسے فضا میں پرواز کرنے والا پرندہ، پانی کی مچھلی، جنگلات کے درخت اور وہ معاون جو زمین کے اندر ہیں، یہ سب مال نہیں ہیں۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳/۱۳۰ طاردار الفکر)۔

علامہ قرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) نے ابو عمر کے حوالہ سے مال کی لغوی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”والمعروف من كلام العرب: إن كل ما تمول وتملك هو مال لقوله عليه السلام: يقول ابن آدم مالي مالي وإنما له ما أكل فأفني أو لبس فأبلى أو تصدق فأمضى“ (الجامع لأحكام القرآن ۶۳۵ جوالہ اقتصادیات النقود فی اطار الفكر الاسلامی لابی بكر الصديق: عمر متولى وشوقى اسماعيل ۱۳ ط: مکتبہ وہبہ قاہرہ)۔ (کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ذریعہ تمول و ملکیت ہو مال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کہتا ہے: میرا مال، میرا مال۔ حالانکہ اس کے لئے صرف وہ حصہ ہے جو اس نے کھا کر ختم کر دیا اور پہن کر بوسیدہ کر دیا یا جسے اس نے راہ خدا میں صدقہ کر دیا)۔

مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اہل لغت مال کا اطلاق اعیان و منافع دونوں پر کرتے ہیں یعنی لغت میں مادی اشیاء مثلاً سونا، چاندی، جانور اور منافع اشیاء مثلاً رکوب، سکنی سب کو ”مال“ کہا جاتا ہے۔

### مال کی حقیقت میں علماء کا اختلاف:

بیچ ہی کی طرح مال کی شرعی تحدید و تعریف میں علماء کی آراء اور ان کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مال اعیان و منافع دونوں کو شامل ہے۔ اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ مال اعیان کے ساتھ خاص ہے۔ حنفیہ نے جو مال کی تعریف کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مال کا اطلاق صرف اعیان پر ہوتا ہے۔ اس طرح مال کی حقیقت کے بارے میں دو نقطہ نظر پایا جاتا ہے: ایک حنفیہ کا اور دوسرا ائمہ ثلاثہ کا۔

میں اولاً فقہائے حنفیہ کا نقطہ نظر پیش کرتا ہوں پھر دوسرے نقطہ نظر پر بحث کروں گا۔

### حنفیہ کا نقطہ نظر:

مال کی تعریف میں خود حنفی علماء و فقہاء کے اقوال بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں:-

علامہ ابن نجیم مصری (م ۹۰۷ھ) مال کی شرعی و لغوی حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”مال باعتبار لغت ہر وہ شئی ہے جس کا تو مالک بنے، اور مال کی جمع اموال ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ اور کشف الکبیر میں لکھا ہے کہ مال ہر وہ شئی ہے جس کی طرف میلان طبع ہو اور وقت حاجت کے لئے اس کا ذخیرہ کرنا ممکن ہو، اور مالیت کل یا بعض لوگوں کے تمول سے ثابت ہوتی ہے“ (البحر الرائق ۵/۲۵۶، نیز دیکھئے: رد المحتار ۳/۵۰۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳/۴۱)۔

### مذکورہ تعریف پر نقد:

مال کی مذکورہ بالا تعریف جو ابن نجیم اور ابن عابدین سے منقول ہے۔ میرے نزدیک مال کی یہ تعریف جامع اور مانع نہیں ہے۔ اس تعریف کے دو بنیادی عناصر ہیں۔

۱۔ اس کی طرف انسانی طبیعت کا میلان ہو۔ ۲۔ اس کا ذخیرہ اندوزی کے قابل ہونا۔

اب جب ہم عنصر اول پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی چیزیں مال کی تعریف سے خارج ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ چیزیں جو شرعاً مال نہیں ہیں۔ مگر اس تعریف کے لحاظ سے مال میں داخل ہیں۔ مثلاً بعض ادویات جو کڑوی اور ترش ہوتی ہیں ان کی طرف میلان طبع نہیں ہوتا۔ مگر بلاشبہ وہ مال ہیں۔ اور خمر (شراب) کی طرف بعض طبائع انسانی کا میلان ہے مگر وہ شرعاً مال نہیں ہے۔ اس لئے میرے نزدیک اس میں ”طباع“ کو حکم بنانا درست نہیں ہے۔ عنصر ثانی پر نظر ڈالئے تو سبزیاں اور ترکاریاں مال کی تعریف میں داخل نہیں ہوں گی، کیونکہ وقت حاجت کے لئے اس کا ذخیرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ حضرات (سبزیاں) بلاشبہ مال ہیں اور انسانوں کے لئے ذریعہ تمول و ثروت ہیں۔ ان دو وجوہ کی بناء پر مذکورہ تعریف میرے نزدیک راجح نہیں ہے۔

## مال کی راجح تعریف:

میرے نزدیک مال کی وہ تعریف راجح ہے جسے ابن نجیم مصری اور ابن عابدین شامی نے حاوی القدسی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

”المال اسم لغير الأدمى خلق لمصالح الأدمى، وأمكن إحرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار“ (البحر الرائق ۵، ۲۵۷، رد المختار ۴، ۵۰۲)۔ یعنی مال غیر انسانی کا نام ہے، جو مصالح انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور اسے محفوظ کرنا اور اس میں اختیاری طور پر تصرف کرنا ممکن ہو۔ اسی طرح کی تعریف یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے بھی الفاظ کے فرق کے ساتھ حنفیہ سے نقل کی ہے۔ یوسف القرضاوی حنفیہ کی ترجمانی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ”ف عند فقهاء الحنفية: كل ما يمكن حيازته والانتفاع به على وجه معتاد“ (فقه الزكاة ۱، ۱۲۵) (مال ہر وہ شئی ہے جس کا جمع کرنا اور اس سے متعاد طریقہ پر انتفاع ممکن ہو)۔

اور ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے لکھا ہے: ”عند الحنفية: المال: هو كل ما يمكن حيازته وإحرازه وينتفع به عادة“ (الفقه الاسلامي وادلتہ ۴، ۴۰)۔ (مال وہ شئی ہے جس کا جمع و احراز ممکن ہو اور اس سے عادی انتفاع کیا جاتا ہو)۔

## مال کی تعریف کے عناصر ترکیبی:

مذکورہ بالا تعریف میں، دو عناصر و اجزاء بیان کئے گئے ہیں۔ جب کسی شئی میں وہ دونوں عناصر پائے جائیں گے تو وہ شئی ”مال“ قرار پائے گی۔

۱۔ عنصر اول یہ ہے کہ اس شئی کا احراز اور اسے محفوظ کرنا ممکن ہو۔ ۲۔ عنصر ثانی یہ ہے کہ اس سے انتفاع متعاد طریقہ پر ممکن ہو۔ یہی دونوں مال کی تعریف کے اجزائے ترکیبی ہیں، جب کسی شئی کا جمع کرنا اور اس سے انتفاع بطریق متعاد ممکن ہوگا اسے ”مال“ قرار دیا جائے گا۔ جیسے وہ تمام اشیاء جن کے ہم مالک ہوتے ہیں۔ مثلاً زمین، سامان، اور نقد وغیرہ۔

عنصر اول کے لحاظ سے وہ اشیاء ”مال“ قرار نہیں پائیں گے جن کا احراز ممکن نہیں ہے، جیسے امور معنویہ علم، صحت، شرف و ذکاء۔ اور نہ وہ شئی مال متصور ہوگی جس پر قبضہ و تسلط ممکن نہیں ہے، جیسے ہوا، سورج کی حرارت، اور چاند کی روشنی وغیرہ۔ نیز اس عنصر کے لحاظ سے حقوق و منافع بھی مال کی تعریف سے خارج ہوں گے، کیونکہ تنہا حقوق و منافع کا احراز ممکن نہیں ہے، اسی طرح انسانوں کی ذہنی، فکری اور دماغی صلاحیتوں سے جو اشیاء وجود میں آتی ہیں وہ اشیاء مادی نہیں ہوتی ہیں، اس لئے ان کا احراز بھی ممکن نہیں، احراز تو اعمیان ہی میں ممکن ہے، اس لئے یہ چیزیں بھی مال کی تعریف سے خارج ہوں گی، عنصر ثانی کے لحاظ سے ہر وہ شئی ”مال“ کی تعریف سے خارج ہوگی جس سے اصلاً انتفاع ممکن ہی نہ ہو جیسے لحم میتہ، زہر آلود کھانا، یا اس سے نفع تو کیا جائے مگر وہ انتفاع عند الناس معتاد نہ ہو، جیسے گیہوں کا ایک دانہ، پانی کا ایک قطرہ یا ایک مٹھی مٹی، ان چیزوں کو مال قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ ان سے عادی انتفاع نہیں کیا جاتا ہے۔

## کیا مال مادی اعمیان کے ساتھ خاص ہے:

یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے حنفیہ سے مال کی جو تعریف نقل کی ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ مال مادی اشیاء اور اعمیان کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ اعمیان ہی کا احراز ممکن ہے۔ اس تعریف کے علاوہ مال کی جو تعریفات فقہاء حنفیہ سے نقل کی گئیں ان میں سے کسی میں صراحتہً مال کو اعمیان کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ علاؤ الدین الحسینی صاحب درمختار نے ملتقی البحر کی شرح میں مال کی جو تعریف کی ہے اس میں انہوں نے مال کو اعمیان میں منحصر کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”والمراد بالمال عين بيجرى فيه التنافس والابتذال۔“ مال سے مراد وہ عین ہے جس میں تنافس و ابتذال جاری ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ مال کی تعریف دوسرے فقہاء سے منقول نہیں ہے مگر متاخرین فقہائے حنفیہ کے کلام اور ان کی تعریفات سے جو مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی مال کی تعریف میں ”عینیت“ ملحوظ ہے۔ اسی بنیاد پر مصطفیٰ زرقاء نے ان تعریفات پر نقض کرتے ہوئے مال کی تعریف اس طرح کی ہے:

”المال: هو كل عين ذات قيمة مادية بين الناس“ (الفقه الاسلامي وادلتہ: وہبہ الزحیلی ۴، ۲۳۵)۔

ان دونوں تعریفات کا مقتضی یہ ہے کہ مال حنفیہ کے نزدیک مادی اعمیان کے ساتھ خاص ہے۔ منافع اعمیان جیسے سکنی (رہائش)، گاڑیوں پر سوار ہونا،



کپڑے پہننا، یہ مال شمار نہ ہوگا۔ اسی طرح حقوق مثلاً حق حضانت، حق ولایت مال نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے فقہائے حنفیہ نے حقوق مجردہ و منافع کی بیع کے عدم جواز کی صراحت کی ہے، اور واضح کیا ہے کہ حق تعلی کی بیع جائز نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۲/۳) تفصیل حقوق کی بحث میں ذکر کی جائے گی۔

دوسرا نقطہ نظر:

مال کی تعریف اور اس کی حقیقت کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر علماء کا ہے۔ یہ حضرات مال کو مادی اشیاء اور اعیان کے ساتھ خاص نہیں کرتے ہیں بلکہ ہر وہ شئی جو اپنی ذات میں قیمت رکھتی ہے اور اس کے ضائع کر دینے سے تاوان واجب ہوتا ہو، اور لوگ اس کے ساتھ مال جیسا برتاؤ کرتے ہوں وہ مال ہے، چاہے وہ مادی شے ہو یا غیر مادی۔ چنانچہ دکتور وہب الزحیلی جمہور فقہاء کی ترجمانی کرتے ہوئے مال کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

”وأما المال عند جمهور الفقهاء غير الحنفية فهو كل ما له قيمة يلزم متلفه بزمانه“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۲/۳)۔

سیوطی نے امام شافعی سے الاشباہ والنظائر میں مال کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے:

”لا يقع اسم مال إلا على ما له قيمة يباع بها ويلزم متلفه، وإن قلت، وما لا يطرحة الناس مثل الفلوس وما

أشبه ذلك“ (الاشباہ والنظائر للسيوطی ۲۵۸)۔

(مال کا اطلاق اسی شئی پر ہوتا ہے جس کی قیمت ہو، اس کے عوض وہ فروخت کی جائے، اور اس کے ضائع کرنے والے پر اس کی قیمت کی ادائیگی لازم ہو، اگرچہ وہ کم ہو، البتہ وہ چیز جسے لوگ (بے اعتنائی سے) پھینک دیتے ہیں مثلاً فلس (پیسہ) اور اس طرح کی چیز تو وہ مال قرار نہیں پائے گی)۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف کے نزدیک جمہور فقہاء کی رائے راجح اور حالات زمانہ کے مناسب ہے، یعنی مال ہر وہ شئی ہے جو اپنی ذاتی قیمت رکھتی ہو اور عرف و عادت میں اسے مال تصور کیا جاتا ہو اور وہ لوگوں کے درمیان ذریعہ تمول و ثروت ہو، چاہے وہ مادی اور محسوس کی جانے والی اشیاء ہوں یا حقوق و منافع ہوں۔

منافع کی بیع:..... حنفیہ مال کو مادی اشیاء اور اعیان کے ساتھ خاص کرتے ہیں، اس لئے منافع کی بیع ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ فقہائے حنفیہ منافع کو ملک قرار دیتے ہیں مال نہیں۔

مال اور ملک میں فرق:..... شامی نے مال کی تعریف سے منافع کو خارج کرتے ہوئے مال اور ملک کے مابین اس طرح فرق کیا ہے:

”والتحقيق أن المنفعة ملك لا مال لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص، والمال ما من شأنه أن يدخر للانتفاع لوقت الحاجة“ (رد المحتار ۴۰۵۲، نیز دیکھئے: حاشیہ طحطاوی ۴۰۳)۔

(اور تحقیق یہ ہے کہ منفعت ملک ہے، مال نہیں۔ اس لئے کہ ملک کی شان یہ ہے کہ اس میں وصف اختصاص کے ساتھ تصرف کیا جائے اور مال کی شان یہ ہے کہ اسے حاجت کے وقت انتفاع کے لئے ذخیرہ کیا جاسکے)، یعنی جب کوئی آدمی کسی شئی کو خریدتا ہے تو اس شئی کی ذات سے نفع اٹھانا اور اس میں تصرف کرنے کا حق اس مالک کے ساتھ مختص ہو جاتا ہے۔ مگر اس شئی کے نفع کو علیحدہ سے ذخیرہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف مال کو ضرورت و حاجت کے وقت انتفاع کے لئے ذخیرہ کرنا ممکن ہوتا ہے، اور جب منافع مال نہیں ہوئے تو ان کی بیع بھی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ بیع مبادلۃ المال بالمال کا نام ہے۔

”وأفاد تعريفنا لمال بعين: أن المنفعة ليست بمال فإنه مما يدخر لوقت الحاجة وهذا هو التحقيق“ (در المنتقى على هامش مجمع الأثر ۲۰۳)۔

اور ہم نے مال کی تعریف جو ”عين“ کے ساتھ کی ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ منفعت مال نہیں ہے، کیونکہ مال وہ شئی ہے جسے وقت حاجت کے لئے ذخیرہ کیا جاسکے اور یہی تحقیق ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی بیع منافع میں حنفیہ کا مسلک ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”ويترتب على ذلك أن منافع الأعيان كسكنى المنازل، وركوب السيارات، ولبس الثياب لا تعد مالا“ (فقہ الزکاۃ: یوسف القرضاوی ۱۰۱۲۵)۔

(اور اس تعریف پر منافع اعیان کا حکم مرتب ہے، جیسے مکانات میں رہائش، گاڑیوں پر سوار ہونا، کپڑے پہننا، مال شمار نہیں کیا جاتا ہے) اور جب منافع



اعیان مال نہیں ہیں تو ان کی بیع کے جواز کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ان سب عبارات کا حاصل یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک صحت بیع کے لئے مال کی شرط جوہری ہے اور مال اعیان کے ساتھ خاص ہے، منافع اعیان مال نہیں ہیں اس لئے ان کی بیع درست نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک:

حضرت امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اگرچہ بیع کی تعریف میں ”مال“ کا تذکرہ کیا گیا ہے مگر ان کے نزدیک مال اعیان اور مادی اشیاء کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اعیان و منافع دونوں کو شامل و عام ہے۔ اور بلکہ بعض تعریفات میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ بیع کے ذریعہ ملک عین حاصل ہوتا ہے یا منفعت موبدہ پر ملکیت حاصل ہوتی ہے۔ امام مالک کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے ابن عرفہ نے بیع کی جو تعریف کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیع صرف اشیاء کے ساتھ خاص ہوگی منافع کو شامل نہ ہوگی، مگر مالکیہ کی بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض حقوق کی بیع جائز ہے مثلاً حق تعلی وغیرہ، یوسف القرضاوی اور وہبتہ الزحیلی نے ذکر کیا ہے کہ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک منافع بھی مال ہیں۔ اس لئے کہ ان حضرات کے نزدیک مال ہونے کے لئے اس شے کا ممکن الاحراز ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے اصل کے احراز کے ساتھ اس کا ممکن الاحراز ہونا کافی ہے (دیکھئے: فقہ الزکاۃ ۱۲۵/۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ)۔ یہ حقیقت ہے کہ اعیان بذات خود مقصود نہیں ہوتی بلکہ اعیان سے منافع مقصود ہوتے ہیں، مثلاً ایک شخص گائے یا بھینس خریدتا ہے تو گائے یا بھینس کی ذات مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کے منافع یعنی اس سے دودھ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی گاڑی خریدتا ہے تو گاڑی کی ذات مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس سے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور بلاشبہ یہ حقیقت سے روگردانی ہوگی کہ جو مقصود مطلوب ہو اسے تو مال سے خارج کر دیا جائے، اور جو بذات خود مقصود نہ ہو اسے ہی مال تصور کیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہی راجح اور مزاج شرع کے موافق و مناسب ہے۔

کیا مال کی حقیقت شریعت و لغت نے متعین کر دی ہے یا اس کا مدار عرف پر ہے؟

اس جگہ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مال کی حقیقت شریعت و لغت نے متعین کر دی ہے یا اس کا مدار ہر عہد اور ہر دور کے عرف پر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مال کی حقیقت شریعت و لغت نے متعین کر دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مال صرف وہی شے قرار پائے گی جسے شریعت و لغت نے مال قرار دیا ہے۔ اور اگر اس کا مدار عرف پر رکھا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ مال ہر وہ شے ہوگی جسے عرف میں مال تصور کیا جاتا ہو۔

جب ہم شریعت کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے مال کی حقیقت خود متعین نہیں کی ہے، نہ تو قرآن میں کسی جگہ مال کی تحدید آئی ہے اور نہ کسی حدیث میں۔ بلکہ نزول قرآن کے وقت اہل عرب کے نزدیک مال کا جو تصور تھا اسی کو برقرار رکھا۔ اہل عرب کے نزدیک مال کا تصور کیا تھا۔ محقق یوسف القرضاوی کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں:

”مال اہل عرب کے نزدیک (جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا) ہر اس چیز کو شامل ہے جس کے جمع کرنے اور مالک بننے کی طرف انسانی رغبت ہو“ (فقہ الزکاۃ ۱۲۳/۱)، اور جب ہم لغت کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو اہل لغت ہر اس شے کو مال قرار دیتے ہیں جو لوگوں کے درمیان ذریعہ تمول، اور سبب ملکیت ہو (دیکھئے: لسان العرب ۶/۱، ۴۳۰، فقہ الزکاۃ ۱۲۳/۱، الجامع لأحكام القرآن ۶۳۵) بلکہ اس سلسلہ میں ابن نجیم اور شامی کا بیان بالکل واضح ہے کہ مالیت کل یا بعض لوگوں کے تمول سے ثابت ہوتی ہے (المحرر الرائق ۵/۲۵۶، رد المحتار ۴/۵۰۲) یعنی جس چیز کو لوگ مال تصور کرنے لگیں اس میں مالیت آجاتی ہے۔

مٹی اور ریت کی خرید و فروخت:

مٹی کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں علمائے حنفیہ کے دو متضاد اقوال ملتے ہیں: ایک قول تو یہ ہے کہ مٹی کی خرید و فروخت درست نہیں ہے۔ کیونکہ مٹی مال نہیں ہے، اور محل خرید و فروخت وہی شے بنتی ہے جو مال ہو۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ایک مٹی سے چونکہ عادتاً انتقال نہیں کیا جاتا ہے اس لئے ایک مٹی کی خرید و فروخت تو درست نہیں ہے، اس سے زائد کی درست ہے۔ کثر علماء سے تو یہ منقول ہے کہ مٹی کی بیع جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ”مرغوب فیہ“ کے تحت علامہ شامی نے تحریر کیا ہے: ”أی ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال“۔ اور آگے مٹی کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ولهذا احترز به الشارح عن التراب والمیتة والدم فإنها لیست بمال“ یعنی مرغوب فیہ کی قید سے شارح نے مٹی، مُردار اور خون

سے احتراز کیا ہے۔ در مختار میں مرغوب فیہ کی قید سے تراب (مٹی)، میتہ (مردار)، اور دم (خون) کو خارج کرتے ہوئے لکھا ہے: ”خرج غیر مرغوب کتراب و میتہ و دم۔“ (در مختار علی هامش الطحطاوی ۲۰۲)۔ ان عبارات فقہیہ کا مفاد یہ ہے کہ مٹی اور ریت کی خرید و فروخت درست نہیں ہے۔ مگر صاحب درالمنقی نے مال کی تعریف ”عین یجری فیہ لتنافس والا ابتذال“ کرنے کے بعد لکھا ہے:

”فیخرج ما لیس بمال کحبة نحو شعیر و کف تراب و شربة ماء کما یخرج المیتة و الدم“ (ذر المنتقی علی هامش مجمع الاغیر ۲۰۲)۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ایک لپ مٹی مال نہیں ہے اس لئے اس کی بیع درست نہیں۔ مگر ایک لپ سے زیادہ مٹی جو قابل انتفاع ہو اس کی بیع درست ہوگی۔ علامہ کاسانی صاحب بدائع الصنائع نے گوبر کی بیع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”گوبر اور مینگنی کی خرید و فروخت جائز ہے اس لئے کہ مطلقاً یہ شرعی طور پر مباح الانتفاع ہے لہذا مال قرار پائے گی۔ اور خالص ”گندگی“ کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے اس لئے کہ اس سے کسی بھی حال میں انتفاع نہیں کیا جاتا ہے لہذا مال قرار نہیں پائے گا۔ لیکن اگر وہ مٹی کے ساتھ مخلوط ہو جائے اور مٹی کا حصہ غالب ہو تو اس کی بیع درست ہوگی کیونکہ اس صورت میں اس سے انتفاع جائز ہے۔“

علامہ کاسانی نے مذکورہ بالا عبارت میں ایک اصول کی طرف رہنمائی کی ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ جس چیز سے شرعاً انتفاع مباح ہے اس کی خرید و فروخت درست ہے اور جو مباح الانتفاع نہیں ہے اس کی بیع درست نہیں ہے، اور چونکہ گوبر اور مینگنی سے ہر دور میں انسانوں نے انتفاع کیا ہے اس لئے وہ مال قرار پائے گی، اور اس کی بیع درست ہوگی۔ اس کے برخلاف خالص انسانی پائخانہ سے انتفاع متعلق نہیں ہوتا ہے اس لئے مال نہیں ہے۔ مگر جب یہی پائخانہ مٹی میں مخلوط ہو جاتا ہے تو انسان اسے اپنے کھیتوں میں ڈالتا ہے اور یک گوندہ اس سے انتفاع ہوتا ہے اس لئے اس کی بیع درست ہوگی۔ اس اصول کی روشنی میں مٹی اور ریت کی خرید و فروخت کے جواز میں کسی بھی طرح کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ مٹی اور ریت عرفاً شرعاً مباح الانتفاع ہے اور مباح الانتفاع ہونے کی بنا پر اس کا مال ہونا واضح ہے، لہذا اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

اب تک کی بحث سے خرید و فروخت اور مال کی حقیقت واضح ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح اور ثابت ہو چکی ہے کہ بیع کی تعریف میں مال کی شرط جوہری ہے۔ مگر خود مال کا مفہوم و معنی بہت وسیع ہے، اور مال صرف مادی اشیاء و اعیان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ حقوق و منافع کو بھی شامل ہے۔

## حقوق کا مسئلہ

### حق کی لغوی تحقیق:

حق عربی زبان کا لفظ ہے جو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حق ثبوت اور وجود کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں ”حق“ کا استعمال اس معنی میں سورہ یسین میں ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ“ (یس،) (یعنی ان کفار میں سے اکثر پر قول باری تعالیٰ ثابت اور واجب ہو چکا ہے اس لئے اب وہ ایمان قبول نہیں کریں گے)۔ اور دوسری جگہ فرمایا گیا: ”لِيُحَقِّقَ الْحَقُّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ“ (الانفال ۸) (تاکہ وہ حق کا اثبات کرے اور باطل کا ابطال)۔ اسی طرح فرمایا گیا: ”جَاءَ الْحَقُّ وَرَهَقَ الْبَاطِلُ“ (الاسراء ۸۱)۔ اس آیت میں بھی حق سے مراد امر موجود اور ثابت ہے۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا: ”وَلِلْمُطَلِّقَاتِ مِمَّا بِالنِّسَاءِ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ“ (البقرہ ۲۲۱) (یعنی مطلقہ عورتوں کے لئے متاع بالمعروف ہے جو متقین پر واجب ہے)۔ حق کا استعمال متعین حصہ پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ“ (المعارج ۲۴)۔ اگر ظلم کے مقابلہ میں حق کا استعمال ہو تو اس وقت حق عدل کے معنی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَاللَّهُ يَفْضِلُ بِالْحَقِّ“ (غافر ۲۰)۔

### حق کی شرعی تحقیق:

حق کی تعریف اور اس کی حقیقت کے بارے میں علماء سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ متاخرین فقہاء میں سے علامہ عبدالحلیم لکھنوی نے حاشیہ قمر الاقمار علیٰ



شرح المنار میں ”حق“ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

”الحق: هو الحكم الثابت شرعاً“ (حاشیہ قمر الاقمار علی شرح المنار) حق وہ حکم ہے جو شرعاً ثابت ہو۔ مگر ڈاکٹر وہب الزحلی نے مولانا لکھنوی کی اس تعریف پر نقض کیا ہے اور کہا ہے کہ حق کی یہ تعریف جامع نہیں ہے اور نہ یہ تعریف ہر اس شئی کو شامل ہے جس پر فقہاء لفظ حق کا اطلاق کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مذکورہ بالا تعریف پر نقض کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

”لیکن یہ تعریف جامع نہیں ہے اور نہ ہر اس شئی کو شامل ہے جس پر فقہاء لفظ حق کا اطلاق کرتے ہیں۔ مثلاً فقہاء مال مملوک پر ”حق“ کا اطلاق کرتے ہیں حالانکہ مال مملوک حکم نہیں ہے۔ اسی طرح فقہاء نفس ملک اور وصف شرعی (جیسے حق ولایت، حق حضانت اور حق خیاب) پر حق کا اطلاق کرتے ہیں۔ ایسے ہی مرافق عقار، حق طریق، حق مسیل، حق مجری پر بھی ”حق“ کا اطلاق ہوتا ہے، اور عقود (بیع و شراء) پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں (جیسے بیع اور ثمن کی حوالگی کا التزام) ان پر بھی فقہاء ”حق“ کا اطلاق کرتے ہیں“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸/۴)۔

ڈاکٹر وہب الزحلی کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ مولانا لکھنوی نے حق کی تعریف میں ”حکم“ کی قید لگائی ہے یعنی حق وہی شئی قرار پائے گی جو حکم ہے۔ حالانکہ بہت ساری چیزیں جن پر فقہائے امت حق کا اطلاق کرتے ہیں، وہ ”حکم“ نہیں ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے بعض معاصرین اساتذہ سے ”حق“ کی تعریف نقل کی ہے۔ اپنے استاذ شیخ علی الخفیف سے ”حق“ کی تعریف اس طرح نقل کی ہے:

الحق هو مصلحة مستحقة شرعاً (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۰۹)۔ (یعنی حق وہ مصلحت ہے جس کا انسان شرعاً مستحق قرار پاتا ہے)۔

ڈاکٹر صاحب نے اس تعریف پر بھی نقض کیا ہے کہ اس تعریف میں حق کی حقیقت، اس کی اصلیت اور اس کے ذاتی وصف کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ حق سے جو مقصود و مطلوب اور جو غایت ہوتی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تعریف کی گئی ہے، اس لئے کہ حق وہ علاقہ اختصاص ہے جو صاحب حق اور حق سے مستفاد مصلحت کے مابین قائم ہوتا ہے۔ ان دونوں تعریفات پر نقض کرنے کے بعد مصطفیٰ زرقاء سے حق کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے:

الحق: هو اختصاص يقرر به الشرع سلطة أو تكليفاً (المدخل الفقہی العام اور الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ۲۰۱۰، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۰۹) (یعنی حق ایک خصوصی تعلق کا نام ہے جس کی وجہ سے شریعت کسی اختیار یا ذمہ داری کو تسلیم کرتی ہے) مثلاً نابالغ لڑکی کے نکاح کی ولایت اس کے ولی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا اختصاص ہے جس کی وجہ سے شریعت اسلامی ولی کا اپنے زیر ولایت افراد پر ولایت و اختیار تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح بائع کو مشتری سے ثمن کے مطالبہ کا اختیار ایک حق ہے، جس کی وجہ سے مشتری پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایسے ہی وارث کا حق اپنے مورث کے اعیان متروکہ پر (تفصیل کے لئے دیکھئے: المدخل الفقہی العام ۱۰۳-۱۲، نیز دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹۴-۱۰)۔

علامہ مصطفیٰ زرقاء نے المدخل الفقہی العام کے حاشیہ میں مختلف علماء سے حق کی تعریف نقل کی ہے اور ہر ایک پر نقض وارد کیا ہے (دیکھئے: حاشیہ المدخل الفقہی العام ۱۲-۱۳)۔

## حقوق کی قسمیں:

ڈاکٹر وہب الزحلی نے حق کی تین تقسیم کی ہے: ایک تقسیم صاحب حق کے اعتبار سے۔ اور دوسری تقسیم محل حق کے اعتبار سے۔ اور تیسری موید قضائی کے اعتبار سے کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صاحب حق کے اعتبار سے حق کی تین قسمیں بیان کی ہیں: ۱- حق اللہ ۲- حق الانسان ۳- حق مشترک۔ جس میں دونوں حق (حق اللہ وحق الانسان جمع ہوں، اور کبھی حق اللہ غالب ہو تو کبھی حق الانسان)۔ پہلے کی مثال میں انھوں نے عبادات فرائض۔ نماز، روزے، زکوٰۃ و حج کو پیش کیا ہے، اور دوسرے کی مثال میں کف عن الجرائم اور حدود میں سے عقوبات کی تطبیق ذکر کی ہے جیسے حد زنا، حد قذف و سرقة وغیرہ۔

## احکام حق اللہ:

حق اللہ کو کسی بھی طرح ساقط نہیں کیا جاسکتا ہے نہ عفو و صلح کے ذریعہ اور نہ دستبرداری کے ذریعہ اور نہ اس میں تغیر و تبدل جائز ہے۔ اس طرح کے حق میں وراثت بھی جاری نہیں ہوتی ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۳/۴)

ڈاکٹر صاحب نے حق کی دوسری تقسیم باعتبار محل کی ہے اور اس میں حق مالی، حق غیر مالی، حق شخصی، حق عینی، حق مجرد اور حق غیر مجرد کی بحث کی ہے اور ان میں



سے ہر ایک کے احکام تفصیل سے ذکر کیے ہیں (حوالہ بالا ۱۸/۲۱)، اور تیسری تقسیم موید قضائی کے وجود و عدم کے لحاظ سے کی ہے۔ اور اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (۱) حق دیانی اور (۲) حق قضائی (حوالہ بالا ۲۲/۲۳)۔

علامہ مصطفیٰ احمد الزرقاء نے بنیادی طور پر حق کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ۱۔ حق مالی اور ۲۔ حق غیر مالی، پھر حق مالی کی شخصی اور عینی کی طرف تقسیم کی ہے (المدخل الفقہی العام ۱۵/۱۳)۔ حقوق کے مفہوم میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ جملہ حقوق پر بحث کرنا بہت مشکل ہے اس لئے ہم اپنی بحث کا موضوع صرف ان حقوق کو بناتے ہیں جن کا عوض لینے کے بارے میں فقہائے امت نے بحث کی ہے۔ عالم اسلام کی معروف شخصیت مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے عربی مقالہ ”بیع الحقوق المجرده“ میں اس نوع کے حقوق کے بارے میں بڑی وقیع اور لاجواب گفتگو کی ہے اور بڑی تفصیل سے ان کے اقسام بیان کیے ہیں۔ ہم اختصاراً اسے ذکر کرتے ہیں:

جن حقوق کا عوض لینے کے بارے میں فقہاء نے گفتگو کی ہے ان کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کے حقوق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ حقوق شرعیہ: یہ وہ حقوق ہیں جو شارع کی طرف سے ثابت ہیں ان کے ثبوت میں قیاس و رائے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۲۔ حقوق عرفیہ: یہ وہ حقوق ہیں جو عرف و عادت کی بنا پر ثابت ہیں اور شریعت نے بھی ان حقوق کو تسلیم کیا ہے۔

پھر ان دونوں حقوق میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

اول۔ وہ حقوق جن کی مشروعیت محض اصحاب حق سے ضرر دفع کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ دوم۔ وہ حقوق جن کی اصالة مشروعیت ہوتی ہے۔ پھر حقوق اصلیہ و ثابۃ کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ وہ حقوق جو اشیاء میں دائمی منافع سے عبارت ہے مثلاً حق مرور، حق شرب، حق تسبیل وغیرہ۔

۲۔ وہ حقوق جو کسی مباح شئی پر سبقت حاصل کرنے اور قبضہ کرنے کی وجہ سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح کے حقوق کو حق اسبقیت یا حق اختصاص سے موسوم کرتے ہیں۔

۳۔ وہ حقوق جو کسی شخص کے ساتھ کوئی عقد کرنے یا موجود عقد کو باقی رکھنے کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں، مثلاً زمین، مکان یا دوکان کو کرایہ پر دینے کا حق۔ یا وقف کے وظائف میں سے کسی وظیفہ کو باقی رکھنے کا حق (بیع الحقوق المجرده: مولانا محمد تقی عثمانی ۲/۲)۔

اعتیاض عن الحقوق کی صورتیں:۔ حقوق کا عوض لینا دو طرح سے ممکن ہوتا ہے:

۱۔ فروختگی کے ذریعہ کسی حق کا عوض لینا۔ اس صورت میں فروخت کرنے والا اپنی ملکیت مکمل طور پر خریدار کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

۲۔ صلح اور دست برداری کے ذریعہ عوض لینا۔ اس صورت میں دست بردار ہونے والے شخص کا تو حق ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن محض اس کی دست برداری سے اس شخص کی طرف انتقال حق نہیں ہوتا جس کے حق میں دست بردار ہوا۔ البتہ جس شخص کے حق میں دست برداری ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں دست بردار ہونے والے شخص کی مزاحمت ختم ہو جاتی ہے (حوالہ سابق ۳/۳)۔ اس وضاحت کے بعد اب ہم ہر نوع کے حقوق کا عوض لینے کے بارے میں عرض کرتے ہیں۔

### حقوق شرعیہ:

حقوق شرعیہ سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی مشروعیت شارع کی طرف سے ہوتی ہے، ان کی مشروعیت و اثبات میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہے، یعنی ان کا اثبات اصحاب حقوق کے لئے شارع کی طرف سے ”نص جلی“ یا ”نص خفی“ کی بنا پر ہوا ہے۔ اگر نص وارد نہ ہوتی تو وہ حق ثابت نہ ہوتا۔ مثلاً حق شفعہ، حق وراثت، حق نسب وغیرہ۔ ان حقوق کی دو قسمیں ہیں:

اول۔ وہ حقوق جو اصالة ثابت نہیں ہوتے ہیں بلکہ اصحاب حق سے دفع ضرر کے لئے ان کی مشروعیت ہوتی ہے۔ اس طرح کے حقوق کو مولانا محمد تقی نے ”حقوق ضروریہ“ کا نام دیا ہے۔

دوم۔ وہ حقوق جو اصحاب حقوق کے لئے اصالة مشروع ہوتے ہیں۔ دفع ضرر کے لئے ان کی مشروعیت نہیں ہوتی۔ انھیں ”حقوق اصلیہ“ کہا جاسکتا ہے۔

## حقوق ضروریہ کا عوض لینا:

حقوق ضروریہ کی تعبیر دیگر فقہاء نے ”حقوق مجردہ“ سے کی ہے اور اس کی مثال میں حق شفیعہ کو پیش کیا ہے۔ یہ حق اصلۃً ثابت ہونے والا حق نہیں ہے۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ بائع و مشتری نے جب باہمی رضامندی سے کسی چیز کی بیع کی تو اب کسی تیسرے شخص کو ان دونوں کے درمیان مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، لیکن شریعت اسلامی نے شریک جائداد اور شریک حقوق جائداد اور پڑوسی کو دفع ضرر کے لئے حق شفیعہ دیا ہے۔ اسی طرح بیوی کا حق شوہر کے بارے میں دفع ضرر کے لئے ہے۔ حقوق ضروریہ (حقوق مجردہ) کا حکم یہ ہے کہ کسی طور سے ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے، نہ تو فروختگی کے ذریعہ اور نہ دست برداری اور صلح کے ذریعہ۔ حنفیہ کی یہی رائے ہے، مگر حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہاء حقوق مجردہ کا عوض لینے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں (دیکھئے: رد المحتار ۴/۵۱۸، الفقه الاسلامی وادلتہ ۲۱/۴، بیع الحقوق الجردہ ۴)۔

## حقوق اصلیہ:

حقوق شرعیہ کی دوسری قسم حقوق اصلیہ ہے، جس کی تعبیر فقہاء حقوق غیر مجردہ سے کرتے ہیں، یہ حقوق اصلۃً ثابت ہوتے ہیں۔ دفع ضرر کے لئے ان کی مشروعیت نہیں ہوتی ہے، جیسے حق قصاص، حق میراث، نکاح کو باقی رکھتے ہوئے بیوی سے متمتع ہونے کا حق۔

حکم: حقوق اصلیہ یا حقوق غیر مجردہ کا حکم یہ ہے کہ فروختگی کے ذریعہ ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس کی گنجائش نہیں ہے کہ خریدار کی طرف وہ حق منتقل ہو، اور بائع کو جو استحقاق تھا وہی خریدار کو حاصل ہو جائے۔ لہذا ولی مقتول اپنا حق قصاص فروخت نہیں کر سکتا۔ البتہ صلح اور دست برداری کے ذریعہ حقوق اصلیہ کا عوض لینا جائز ہے۔ یعنی ولی مقتول کو شرعاً اس کا حق ہے کہ عوض لے کر اپنے حق قصاص سے دست بردار ہو جائے (دیکھئے: الفقه الاسلامی وادلتہ ۲۱/۴)۔

حق غیر مجرد کا عوض مالی جائز ہے۔ جیسے حق قصاص اور حق زوجہ، ولی مقتول اور زوج کے لئے صلح کر کے اپنے حق سے دست برداری کا عوض مالی لینا جائز ہے (دیکھئے: رد المحتار ۴/۵۲۰، بیع الحقوق الجردہ ۵)۔

## حقوق عرفیہ:

حقوق کی دوسری قسم حقوق عرفیہ ہے۔ حقوق عرفیہ سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی مشروعیت عرف و عادت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور یہ حقوق اس اعتبار سے مشروع ہیں کہ اسلامی شریعت نے عرف و عادت اور تعامل کی بنا پر انھیں تسلیم کیا ہے۔ لیکن ان حقوق کا اصل ماخذ عرف و تعامل ہے نہ کہ شریعت جیسے حق مرور، حق شرب وغیرہ۔

حقوق عرفیہ کے ذیل میں فقہاء نے حق مرور، حق شرب، حق تسبیل، حق تعلی، دیوار پر لکڑی رکھنے کا حق، دروازہ کھولنے کا حق وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

حکم: حنفیہ کا مذہب: فقہائے حنفیہ کے یہاں مشہور و معروف یہ ہے کہ یہ سارے حقوق، حقوق مجردہ ہیں جن کی فروختگی جائز نہیں ہے، ائمہ ثلاثہ کا معروف مذہب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا عوض لینا جائز ہے۔ اس اختلاف کا اصل مبنی ومدار بیع کی تعریف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک صرف اعیان اور مادی اشیاء کی بیع درست ہے۔ حقوق و منافع کی نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک: مگر فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ ہر اس شئی کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں جس کی کوئی قیمت ہو اور اس کے تلف کرنے پر وجوب ضمان ہوتا ہو۔ اس لئے ان کے نزدیک حقوق و منافع کی بیع بھی درست ہے۔ بعض حنفیہ نے بھی حقوق مجردہ کا عوض لینے کو جائز قرار دیا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۴/۵۲۰)۔

وہ حقوق جن کا تعلق اعیان کے ساتھ ہوتا ہے ان کی بیع بھی عند الحنفیہ جائز ہے، چنانچہ حق مرور کی بیع کے بارے میں حنفیہ کا ایک قول جواز بھی ہے، صاحب ہدایہ نے جواز ہی کا ذکر کیا ہے۔ اور ابن ہمام نے حق مرور کی بیع کے جواز کی توجیہ کرتے ہوئے ایک قاعدہ کلیہ کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

”ان حق المرور حق يتعلق برقبۃ الأرض، وہی مال هو عين، فما يتعلق به له حكم العين“ (فتح القدیر ۵/۲۰۶)۔

یعنی ہر وہ شئی جس کا تعلق عین کے ساتھ ہوگا اس کا حکم بھی عین ہوگا، اسی طرح بعض متاخرین حنفیہ نے ذکر کیا ہے کہ جن حقوق کی بیع جائز نہیں ہے مثلاً حق تعلی، حق تسبیل، حق شرب، ان کا عوض لینا بطریق بیع تو جائز نہیں، لیکن صلح کے طریقہ پر ان کا عوض لینا جائز ہے (دیکھئے: علامہ تاجی کی شرح المجلد ۱۲/۲، ماہ: ۲۱۷، ص: ۲۱۷ سے پہلے)۔



حق سے دست برداری کا عوض لینا (تنازل عن الحق بالمال):

اسی ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مال لے کر اپنے حق سے دست بردار ہونا جائز ہے یا نہیں۔ اور اگر جائز ہے تو کس طرح کے حقوق کا۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ:

اگر کسی شخص کا وقف میں مستقل حق ہو جیسے اس میں اس کی مستقل ملازمت ہو جس کی اسے تنخواہ ملتی ہو مثلاً مسجد کا امام، مؤذن، اور شرائط وقف کی بنیاد پر یہ ملازمت دائمی ہو تو اس طرح کے حق سے مال لے کر دست برداری کے بارے میں فقہاء نے بحث کی ہے، فروختگی کے ذریعہ اس کا عوض لینے کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا ہے (رد المحتار ۴/۵۱۸) لیکن دست برداری اور صلح کے ذریعہ عوض لینے کے بارے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، کچھ فقہاء نے اس طور پر بھی عوض لینے کو ناجائز کہا ہے اور کچھ فقہاء نے اس کے جواز کی صراحت کی ہے۔

حنفیہ کا مذہب: متاخرین فقہاء حنفیہ کی ایک جماعت نے مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کی صراحت کی ہے۔ چنانچہ در مختار میں ہے۔

لکن أفتی کثیر باعتبارہ وعلیہ یفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال (حوالہ بالا ۴، ۵۱۹، مطلب فی العرف الخاص والعام)۔  
(یعنی بہت سے فقہاء نے عرف خاص کے معتبر ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ اور اس کی بنیاد پر مال کے بدلہ وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے)۔

شامی نے اس ذیل میں بڑی محققانہ بحث کی ہے، اور بحث کے آخر میں مفتی ابوسعود کے حوالہ سے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے (حوالہ بالا ۴/۵۲۰)۔

شافعیہ کا مسلک: فقہاء شافعیہ نے بھی عوض مالی کے ذریعہ وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ربلی شافعیہ کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”والد بزرگوار نے مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا تھا، کیونکہ یہ بھی ”جعل“ کی ایک قسم ہے۔ لہذا دست بردار ہونے والا شخص مال کا مستحق ہوگا اور اس کا حق ساقط ہو جائے گا (نہایۃ المحتاج ۸/۴۷۸)۔ حنابلہ کے نزدیک بھی جواز ہے (دیکھئے: الانصاف للمرداوی ۶/۶۶۷، شرح منہجی الارادات ۲/۴۶۳)۔

حق تصنیف کی بیع:

حق تصنیف اور حق ایجاد وغیرہ کی خرید و فروخت جائز ہے، کیونکہ جب کوئی آدمی دماغ سوزی کے بعد کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے، یا کوئی فارمولہ ایجاد کرتا ہے تو اسے شرعاً اس کا حق ہے کہ اس کی نشر و اشاعت کر کے فائدہ حاصل کرے، یا کسی ناشر کے ہاتھ سے فروخت کر کے مالی فائدہ حاصل کرے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے بھی اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

وقد أخذ علماء التشريع الوضعی بهذا الرأي فاعتبروا المنافع من الأموال كما اعتبروا حقوق المؤلفین وشهادات الاختراع وامثالها مالا (فقہ الزکاة ۱۲۵)۔

☆☆☆



## مسئلہ بیع حقوق و منافع

مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی <sup>۱</sup>

یہ طے ہے کہ اسلام تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آیا ہے، اور رہتی دنیا تک کی رہنمائی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ چودہ سو سال گزرے، اس عرصہ میں مختلف حالات سے انسان دوچار ہوتا رہا۔ اور وقت کے ائمہ و مشائخ اور علماء و فقہاء نے امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، اور قوانین اسلام کی نشاندہی کرتے رہے، اور خواص و عوام ان سے مستفید ہوتے رہے۔ یہ کام کسی منزل پر نہڑکا اور نہ اس کا دروازہ بند ہوا، زمانہ کے انقلابات سے نئے مسائل پیدا ہوتے رہے اور فقہاء امت ان مسائل کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں فقہ و فتاویٰ کی کتابیں اور ان کے حواشی و شروح شائع ہوتے رہے۔

نئی ایجادات اور زمانہ کے تقاضوں نے بے شمار سوالات پیدا کئے، مگر الحمد للہ، ہر دور میں ان کے جوابات لکھے جاتے رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ زمانہ کی گردشوں سے نئے سوالات سامنے آئے ہوں اور علمائے امت نے ان کے جوابات کتاب و سنت کی روشنی میں نہ دیئے ہوں۔ فتاویٰ کی کتابوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو برابر جاری ہے۔ اس اخیر دور میں عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ ہندیہ کے نام سے ایک بڑا ذخیرہ اپنے دور حکومت میں جمع کرایا اور اس کی اشاعت کے ذریعہ امت کے لئے سہولت کا دروازہ کھولا، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، حضرت تھانوی، مفتی کفایت اللہ، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، میاں نذیر حسین اور دوسرے علمائے کرام نے بحیثیت مفتی اس خدمت کو انجام دیا، اور ان کے ماننے والوں نے ان کے قیمتی فتاویٰ کو کتابی صورت میں شائع کیا، جن سے عوام و خواص نے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا۔

اب جب کہ پندرہویں صدی ہجری شروع ہوئی تو کہنا چاہیے کہ دنیا ایسے نئے انقلاب سے دوچار ہے جس کا پہلے تصور نہیں تھا۔ اور کچھ ایسے نئے مسائل پیدا ہو چکے ہیں کہ جن کا حل تلاش کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ کی ضرورت پیش آئی، جو ہندو پاک کے تمام مفتیان کرام اور فقہیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے اور نئے مسائل ان کے سامنے پیش کرے، اور بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیالات کا موقع فراہم کرے، اور ان کو سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے پر مجبور کرے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے ہمارے قاضی شریعت بہار و اڑیسہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب اور ڈاکٹر منظور عالم صاحب کو کہ ان حضرات نے خدا کا نام لے کر اسلامی فقہ اکیڈمی کی داغ بیل ڈالی، اور فقہی سمینار کا ایک سلسلہ شروع کیا، جہاں تک خاکسار کے مطالعہ کا تعلق ہے یہ اس صدی کی سب سے پہلی خدمت و سعادت ہے، جو ان حضرات کے حصہ میں آئی۔ انھوں نے جس فراخ حوصلگی، محنت اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے اس کی زمانہ قریب میں کوئی مثال نہیں ہے۔

دو فقہی سمینار کر کے کئی اہم مسائل متفقہ طور سے طے کرا چکے ہیں، اور ان کی اشاعت بھی ہو چکی ہے۔ اب یہ تیسرا فقہی سمینار اس موضوع پر ہو رہا ہے کہ حقوق کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اور ان حقوق کی تفصیلات کیا ہیں؟ فقہ اکیڈمی ہم سب مفتیوں کی طرف سے مستحق ہدیہ تبریک و تہنیت ہے کہ اس نے تمام مسائل کی طرح اس مسئلہ پر بھی مواد فراہم کیا، اور اسے طبع کرا کر ہم سب کے پاس بھیجا۔ کتابوں کے حوالے بھی ہیں اور ائمہ اربعہ کے مذاہب کے دلائل بھی۔ عرض یہ کرنا ہے کہ روشنی خود اکیڈمی دے رہی ہے محنت وہ خود کر رہی ہے۔ فقہ کی کتابوں کی طرف رہنمائی اور بہری کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ ہم لوگوں کا کام بہت سہل کر دیا گیا ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر ہمارا فرض ہے کہ اپنی اپنی رائیں پیش کریں، اور اپنی تشفی کے لئے مزید مطالعہ کی زحمت گوارا کریں، اگر ضرورت محسوس کریں۔

یہی وجہ ہے کہ خاکسار نے مزید لمبے مقالہ کی ضرورت محسوس نہیں کی، مواد یہی سب ہیں جو تقریباً اکیڈمی نے فراہم کر دیئے ہیں۔ اس لئے اختصار کے ساتھ اپنی رائے پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

حقوق مجردہ کی خرید و فروخت پر دو مقالے بھیجے گئے۔ ایک قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام صاحب زید مجدہ کا، دوسرا مولانا تقی عثمانی زید مجدہ کا۔ ان

دونوں حضرات نے اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے۔ خصوصیت سے مولانا تقی عثمانی صاحب نے اپنے مقالہ کے مرتب کرنے میں کافی محنت کی ہے۔ اور ائمہ اربعہ کے مذاہب دلیل کے ساتھ یکجا کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ دور حاضر میں بعض ایسے حقوق کی بیع و شراء ہونے لگی ہے جس کا پہلے تصور نہیں تھا جیسے مکانوں اور دوکانوں کی پگڑی یا اس کی اسلامی، تجارتی مشہور ناموں کی بکری و خریداری، اسی طرح حق تصنیف و تالیف کی خرید و فروخت، یا نئی ایجادات کا معاملہ، دنیا میں یہ سارے معاملات و کاروبار رائج ہیں، حکومتوں پر تسلط دیندار مسلمانوں کا نہیں رہا۔ پھر عوام و خواص میں وہ غیرت و حمیت بھی باقی نہیں رہی کہ وہ اپنی حکومتوں کو ناجائز قوانین بنانے اور اس کے رائج کرنے سے روکیں، یا اس کے خلاف مضبوط احتجاج کریں۔ لہذا اس دور خدا بیزاری میں علمائے کرام پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نئے مسائل، نئے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ شریعت کس حد تک سہولت دے سکتی ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ”بشرا ولا تنفرا“، دوسری طرف ارشاد ہے کہ ”الذین یسر“، اسی کے ساتھ یہ بھی ہدایت ہے: ”قولاً لیناً“۔

اس لئے ذمہ دار علماء کا فرض ہوتا ہے کہ اس زیر بحث مسئلہ پر بھی پوری سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھ غور و فکر کریں، اس طرح کہ ہمارے ہاتھوں میں دین کا دامن بھی مضبوطی سے باقی رہے، اور امت کی ضرورتیں بھی پوری ہوں، اور وہ محسوس کریں کہ دین اسلام تمام زمانوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اور ہر دور کے علماء اپنے دور کے پیش آمدہ مسائل پر پوری بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

حقوق کی کئی تقسیمیں کی گئی ہیں، اور بڑی حد تک وہ صحیح ہیں، حقوق شرعیہ ہوں یا حقوق ضروریہ۔ حقوق شرعیہ کی مثال میں حق شفقت، حق ولاء، حق وراثت و حضانت، حق ولایت نکاح وغیرہ کا نام لیا گیا ہے۔ ان حقوق کی بیع قطعاً جائز نہیں ہے اور نہ بطور صلح ان کا معاوضہ قبول کرنا درست ہے، اس طرح کہ یہ حقوق صاحب حق سے منتقل ہو کر دوسرے کو حاصل ہو جائے اور وہ اس کا قائم مقام بن جائے۔ البتہ وہ حقوق جن کا تعلق عرف و عادت سے ہے اور جن کی تعبیر حقوق عرفیہ سے کی گئی ہے، مثلاً راستہ میں چلنے کا حق، پانی لینے کا حق وغیرہ۔ یہ حقوق اگر بطور انتفاع ہو کہ کوئی متعین حالات کے لئے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے تو بطور اجارہ اس کی اجازت ہوگی، مگر غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ مال کی تعریف میں صرف اعیان اور مادی اشیاء داخل ہیں۔ فقہائے حنفیہ اس میں حقوق مجردہ کو داخل نہیں کرتے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ حقوق مجردہ کی بیع کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ صاحب بدائع علامہ کاسانی نے ایک جزئیہ نقل کیا ہے کہ اگر ایک آدمی نیچے کی منزل کا مالک ہے اور دوسرا اوپر کی منزل کا اور دونوں منزلیں منہدم ہو گئیں، اب اس کے اوپر کے مالک نے اپنا حق علو فروخت کیا تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ علو جو فضا میں ہے وہ مال نہیں ہے۔ اسی طرح حق تسبیح کے سلسلہ میں صراحت کی ہے کہ اس کی بیع جائز نہیں ہے۔

فقہاء حنفیہ نے حقوق مجردہ کی بیع کو ایک جگہ جائز لکھا ہے۔ گو دوسری روایت ناجائز ہونے کی بھی ہے۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ عند الحنفیہ حقوق مجردہ کی بیع جائز نہیں ہے اور مفتیان کرام اسی کے مطابق برابر فتویٰ دیتے رہے۔ حق تصنیف کے بیچنے کے جواز کا ہمارے پُرانے علماء کرام نے اب تک فتویٰ نہیں دیا ہے، گو بعد کے زمانے میں بعض علماء اس کی بیع کو جائز منوانے کی سعی میں ہیں، مگر یہ قول مفتی بہ نہیں ہے، اس لئے یہ فیصلہ کر لینا مناسب ہوگا کہ حنفیہ کے یہاں حقوق مجردہ کی بیع جائز نہیں ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ حنفیہ کے علاوہ دوسرے ائمہ ثلاثہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام مالک کے یہاں مال کی تعریف میں حقوق مجردہ کو بھی داخل کرتے ہیں اور اس کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان ائمہ ثلاثہ کے یہاں حقوق عرفیہ کی بیع کی صراحت ملتی ہے۔ لہذا ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ان ائمہ ثلاثہ اور بعض علماء حنفیہ کی رائے کی بنیاد پر حقوق عرفیہ کی بیع کے جواز کا فتویٰ دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

خاکسار کی اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر حقوق مجردہ کی بیع کا موجودہ حالات میں رواج ہو چکا ہے، اور بڑی حد تک یہ ضروری ہو گیا ہے تو جس طرح بہت سے دوسرے مسائل میں ہم نے امام مالک کے مذہب کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے اور اس پر ہمارا عمل بھی ہے، حقوق عرفیہ کی بیع کے مسئلہ میں بھی گنجائش دی جانی چاہیے، تاکہ عوام و خواص جن کو ان مسائل سے دن رات کا واسطہ پڑتا ہے وہ تنگی سے نکل سکیں۔

یہ تو ہمیں اعتراف ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب حق ہیں اور سب کتاب و سنت کے مطابق ہیں۔ لہذا ضرورت کے وقت میں ائمہ ثلاثہ کے بعض مسائل میں اتباع سے کوئی حرج نہیں ہے۔ یہاں ایک بات اور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فقہاء امت نے اپنے دور کے حالات اور عرف عام کا بڑا لحاظ رکھا ہے اور انہوں نے اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ ہمیں بھی اپنے دور کے عرف و عادت سے صرف نظر کرنا درست نہ ہوگا۔

حقوق عرفیہ کی بیع کی ضرورت و اہمیت کا بہت ممکن ہے کہ ان کے دور میں احساس نہ ہو، اور لوگ اس کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں۔ مگر اب زمانہ کی رفتار نے دنیا کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں شدت اختیار کرنے میں دین کا خسارہ ہے۔ البتہ جواز کی جو شرطیں ہیں ان کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔



## حقوق کی بیع

مولانا معاذ الاسلام سنبھلی

حقوق کی بیع کے بارے میں آپ کا سوال نامہ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کا تفصیلی مقالہ پڑھا۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے نہایت بسط کے ساتھ ائمہ اربعہ کے مذاہب اور جزئیات کو ضبط فرمادیا ہے اور مسئلہ کے ہر پہلو کا احصاء فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ کے سوال نامے میں بھی موضوع سے متعلق کافی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ائمہ اربعہ کے مذاہب و جزئیات کے ذکر کی حاجت نہیں ہے۔ البتہ مشائخ و ائمہ حنفیہ کی آراء اور ارشادات میں غور و فکر کے بعد جو رائے سامنے آتی ہے اس کو تحریر کیا جاتا ہے۔

تنویر الابصار میں بیع کی تعریف اس طرح کی ہے: هو لغة مقابلة شئ بشئ مالا أو لا وشرعاً مبادلة شئ مرغوب فيه بمشله۔ (بیع باعتبار لغت کے ایک چیز کا دوسری چیز سے تبادلہ کرنا ہے خواہ وہ مال ہو یا مال نہ ہو۔ اور شرعاً مرغوب فیہ شے کا اس کے مثل کے ساتھ تبادلہ کرنا ہے)۔ شامی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ای ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال (یعنی وہ چیز جس کی طرف نفس رغبت کرے اور وہ مال ہے)۔

شامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تعریف بھی مبادلة المال بالمال کی طرف لوٹی ہے۔ الجوهرة النيرة میں یوں ذکر کیا ہے: "لغت میں بیع تملیک مال بمال آخر کو کہا جاتا ہے۔ اور شرعاً بھی یہی ہے، لیکن اس میں باہمی رضامندی کی قید زیادہ کی گئی ہے اس لئے کہ تغالب میں فساد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ شرعاً ایسے دو مالوں میں ایجاب و قبول کو کہتے ہیں جن میں تبرع کے معنی نہ ہوں اور یہ عراقیوں کا قول ہے جیسے شیخ اور ان کے اصحاب۔ اور بعض نے اس طرح کہا ہے کہ وہ مال کا مال سے اس طرح تبادلہ کرنا ہے جو تبرع کے طریقہ پر نہ ہو اور یہ خراسانیوں کا قول ہے جیسے صاحب ہدایہ اور ان کے اصحاب" (الجوهرة النيرة ۱۶۲)۔

مال کے متعلق اگرچہ سب جانتے ہیں کہ کسے کہا جاتا ہے مگر چونکہ بیع کی تعریف میں مال کا لفظ آیا تو ضرورت ہوئی کہ اس کی بھی تعریف کی جائے۔ بعض حضرات نے اس کی اس طرح تعریف کی: المراد بالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والمالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم (شامی ۴، ۳)۔ (مال سے مراد وہ ہے کہ اس کی طرف طبیعت مائل ہو اور ضرورت کے وقت کے لئے اس کا ذخیرہ کرنا ممکن ہو، اور مالیت تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے تمول سے ثابت ہوتی ہے)۔

التلوتح میں ہے: "مال وہ ہے جس کی شان یہ ہو کہ اس کو وقت حاجت انتفاع کے لئے ذخیرہ کیا جائے۔ اور بحر میں حادی القدسی سے ذکر کیا ہے: مال غیر آدمی کا نام ہے جو آدمی کے مصالح کے لئے پیدا کیا گیا ہو اور اس کا ذخیرہ اور اس میں اختیار سے تصرف کرنا ممکن ہو" (شامی ۳، ۳)۔

المال ما يميل إليه الطبع ويجرى فيه البذل والمنع (شامی ۱۰۰، ۴) (مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور اس میں بذل و منع جاری ہو)

## اجارہ

دوسرا عقد، عقد اجارہ ہے، اس میں بھی ایک شے کا دوسری شے سے تبادلہ ہوتا ہے اور بیع کی جو مختلف تعریفیں کی گئی ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جو اجارہ پر بھی صادق آرہی ہیں۔ مثلاً در مختار میں بیع کی جو تعریف کی گئی ہے کہ هو لغة مقابلة شئ بشئ مالا أو لا وشرعاً مبادلة شئ مرغوب فيه بمشله لکھتے ہیں:



ظاہرہ شمول الإجارة لأن المنفعة شيء باعتبار الشرع انما موجودة حتى صح الاعتياض عنها بالمال وكذا باعتبار اللغة (شامی ۴۰۲)۔ (بظاہر یہ اجارہ کو شامل ہے اس لئے کہ منفعت بھی شے ہے اور وہ شرعاً موجود بھی ہے اسی لئے مال کے ساتھ اس کا عوض لینا صحیح ہے اور اسی طرح لغت میں بھی ہے)۔

اس لئے بعض فقہاء نے اس کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی کہ بیع کی تعریف ایسی ہو کہ وہ اجارہ پر صادق نہ آئے اور دونوں میں فرق ہو جائے۔

فقہاء کی تعریفات اور تصریحات کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیع میں بیع مال ہوتا ہے۔ اور اجارہ میں معقود علیہ مال نہیں بلکہ منفعت ہوتی ہے، اور منفعت مال نہیں ہے، منفعت ایک حق ہے اور مال عین کو کہا جاتا ہے۔

الجوهرة النيرة میں ہے: ”تملیکات دو نوع کی ہیں: ایک تملیک عین، دوسری تملیک منفعت۔ پھر تملیک عین بھی دو قسم کی ہیں: عوض کے ساتھ جیسے کہ بیع، اور بغیر عوض کے جیسے کہ ہبہ، اور تملیک منفعت کی بھی دو قسم ہیں: بالعوض جیسے اجارہ، اور بغیر عوض جیسے عاریت اور منافع کی وصیت“ (الجوهرة النيرة، ۱، ۱۶۳)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ”ہم نے اول بیوع میں مال کی تعریف یہ کی ہے کہ جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور حاجت کے وقت کے لئے اس کا ادخار ممکن ہو، اور ادخار کی قید سے منفعت نکل گئی، پس وہ ملک ہے مال نہیں، اس لئے ملک وہ ہے جس کی شان یہ ہو کہ اس میں اختصاص کے ساتھ تصرف کیا جائے، جیسا کہ تلوح میں ہے۔ پس زیادہ بہتر وہ تعریف ہے جو درر میں ہے کہ مال وہ موجود ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو، پس موجود کی قید سے منفعت نکل گئی۔ اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اجارہ سے منفعت کی تملیک ہوتی ہے اس لئے کہ اجارہ حکماً منافع کی بیع ہے، یعنی اس میں بیع کا حکم ہے اور بیع کا حکم تملیک ہے، بیع کی حقیقت نہیں“ (شامی ۱۰۰۳، ۱۰۰۴)۔

اس لئے کہ بیع تملیک عین کے لئے مشروع ہے نہ کہ منفعت کی تملیک کے لئے، اس دلیل سے کہ گدھے اور گھوڑے کے چھوٹے بچے اور شورز مین کا خریدنا صحیح ہے اور ان کا اجارہ صحیح نہیں ہے، اور اسی طرح اگر غلو کو کرایہ پر لیا اور راستہ کا استثنیٰ کیا تو اجارہ فاسد ہے اور بیع صحیح ہے (البحر الرائق ج ۶)۔

بہر حال فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع کا مال اور عین ہونا ضروری ہے، اگر بیع مال نہ ہو تو بیع باطل ہوگی۔

وبطل بیع ما لیس بمال ای ما لیس بمال فی سائر الأديان (شامی ۱۰۰، ۴)۔

(اور جو مال نہ ہو اس کی بیع باطل ہے یعنی کسی بھی آسمانی دین میں وہ مال نہ ہو)۔

اور صرف مال ہونا بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا متقوم ہونا بھی ضروری ہے ورنہ شرعاً وہ بیع باطل ہوگی۔

در مختار میں ہے: وبطل بیع مال غیر متقوم ای غیر مباح الانتفاع به۔ متقوم کا مطلب ہے کہ شرعاً اس سے انتفاع مباح ہو۔

تلوح میں ہے: تقوم دو طرح کا ہوتا ہے: ایک عرفی، دوسرا شرعی۔ تقوم عرفی تو احراز سے ہوتا ہے، پس جو غیر محرز ہوگا مثلاً شکار اور حشیش، وہ متقوم نہیں ہے۔ اور تقوم شرعی اس کے ساتھ انتفاع کے مباح ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔

شامی میں مال اور متقوم میں فرق اس طرح سمجھایا ہے مثلاً گیہوں کا دانہ متقوم ہے مال نہیں ہے، اور خرما مال ہے مگر متقوم نہیں ہے، اور دم، مینہ وغیرہ نہ مال ہیں اور نہ متقوم ہیں۔

شامی نے شرح مسکین سے بیع باطل اور فاسد کے پہچاننے کا ایک ضابطہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عوضین میں سے جب کوئی کسی بھی آسمانی دین میں مال نہ ہو تو بیع باطل ہے۔ خواہ وہ بیع ہو یا شمن، اور اگر وہ بعض ادیان میں مال ہو اور بعض میں نہ ہو تو اگر اس کو شمن اعتبار کرنا ممکن ہو تو بیع فاسد ہوگی، اور اگر اس کا بیع ہونا متعین ہو تو بیع باطل ہوگی۔

عرف و عادات کے اعتبار میں:

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کے احکامات میں عرف و عادات اور لوگوں کی حاجات اور ضروریات کو بہت بڑا دخل ہے۔

عرف و عادات اور حاجات و ضروریات کی بنیاد پر احکام بدل جاتے ہیں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

منافع اور معدوم کی بیع جائز نہیں ہے لیکن اجارہ تعال ناس، ہی کی وجہ سے جائز رکھا گیا ہے:

”اجارہ خلاف قیاس مشروع ہے، اس لئے کہ وہ عقد کے وقت منافع معدومہ کی بیع ہے، لیکن وہ تعارف ناس کی وجہ سے جائز ہے اس لئے کہ اس کی طرف عام لوگوں کو احتیاج ہے، اور وہ اس کو سلفاً اور خلفاً پہچانتے آئے ہیں، پس وہ خلاف قیاس جائز ہے اور ذخیرہ میں ذکر کیا ہے کہ اجارہ تعال ناس کی وجہ سے جائز ہوا ہے (نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف)۔“

سیدی عبدالغنی نابلسی نے دودۃ القز کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی بیع باطل ہے، اس لئے کہ وہ مال نہیں ہے، اس پر علامہ شامی لکھتے ہیں:

”تحقیق وہ اس زمانہ میں عزیز ترین اموال میں سے ہے، اور اس پر پہلے گذری ہوئی مال کی تعریف صادق آتی ہے، اور لوگ رنگ وغیرہ میں اس کے کثرت سے محتاج ہیں لہذا مناسب ہے کہ اس کی بیع جائز ہو۔“

اور آگے آئے گا کہ بیع کا جواز انتفاع کے حلال ہونے سے وابستہ ہے اور چونکہ کی بیع حاجت کی وجہ سے جائز ہے حالانکہ وہ ہوام میں سے ہے اور ان کی بیع باطل ہے، اسی طرح سانپوں کی بیع کا حکم ہے دوا کے لئے (شامی ۱۰۱/۳)۔

بحر میں ذخیرہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ جب چونکہ کو خریدے تو جائز ہے اور اس کی طرف حاجت ناس کی وجہ سے صدر الشہید بھی اسی کے قائل ہیں، اس لئے کہ لوگ اس کو مال سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ چونکہ آج کل اس کی طرف حاجت تداوی کے لئے ہے کہ اس کے خون چوسنے کی وجہ سے، تو جب وہ محض اتنی بات سے مال ہوگئی تو یہ دودۃ القز کی بیع کے جواز پر دال ہے، اس لئے کہ اس کا مال ہونا چونکہ سے بڑھ کر ہے، اس لئے کہ وہ تو عزیز ترین اموال میں سے ہے“ (شامی ۱۱۱/۳)۔

حدیث میں سونے چاندی کو وزنی اور گہوں، جو وغیرہ کو کیلی فرمایا گیا، اور سونے چاندی کی بیع میں ربا سے بچنے کے لئے باعتبار وزن کے اور گہوں وغیرہ میں باعتبار کیل کے تساوی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ان میں اگر عرف بدل جائے یعنی گہوں اور جو وغیرہ وزنی ہو جائیں اور سونا چاندی کیلی، تو سونے چاندی میں کیل تساوی ضروری ہوگی اور گہوں وغیرہ میں وزناً۔

”ان اشیاء منصوصہ میں عرف کے معتبر ہونے کے بارے میں امام ابو یوسف سے روایت کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ سونے میں کیل کے ساتھ اور گہوں میں وزن کے ساتھ تساوی کو جائز بتلایا ہے جب لوگوں میں یہ متعارف ہو جائے، پس اس میں عرف کا اتباع ہے جس سے نص کا ترک لازم آتا ہے، پس لازم آئے گا کہ ان کے نزدیک عرف کی وجہ سے ربا وغیرہ کی تجویز جائز ہو اگرچہ وہ نص کے خلاف ہو، میں کہوں گا کہ یہ بات بہت بعید ہے کہ امام ابو یوسف کی مراد یہ ہو بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ان کے نزدیک نص کی علت عادت ہے اس معنی کے اعتبار سے کہ گہوں، جو، تمر اور نمک کو نص میں جو کیلی بتلایا ہے اور سونے چاندی کو وزنی یہ اس وجہ سے ہے کہ اس وقت ایسا ہی تھا۔ پس نص اس وقت عادت کے مطابق تھی یہاں تک کہ اگر اس وقت گہوں کے وزن اور سونے کے کیل کی عادت ہوتی تو نص اسی کے موافق آتی لہذا کیلی اور وزنی ہونے میں منظور ایہا عادت ہی ہوگی۔ جب عادت بدل جائے گی تو حکم بھی بدل جائے گا، پس بدلنے والی نئی عادت میں نص کی مخالفت نہیں ہے بلکہ اس میں نص کی اتباع ہے۔ محقق ابن ہمام کے ظاہری کلام سے اسی روایت کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔“

اور اس بنیاد پر اگر دراہم کے ساتھ بیع میں اور ان کے قرض لینے میں گنتی کے ساتھ تعارف ہو جائے جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے تو وہ نص کے خلاف نہیں ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ امام ابو یوسف کو اس زمانہ کے لوگوں کی طرف سے بہترین جزا دے کہ انہوں نے ان کی طرف سے ربا کے ایک بڑے دروازے کو بند کر دیا“ (نشر العرف)۔

وفی شرح الاشباہ للبیری الثابت بالعرف ثابت بدلیل شرعی۔

(بیری کی شرح اشباہ میں ہے کہ جو عرف سے ثابت ہو تو وہ دلیل شرعی سے ثابت ہے)۔

وفی المبسوط الثابت بالعرف کالثابت بالنص (مبسوط میں ہے کہ عرف سے ثابت، نص سے ثابت کی مانند ہے)۔

عرف کے معتبر ہونے کے بارے میں ابن عابدین نے ایک ضابطہ لکھا ہے، اور فرماتے ہیں:

”جب عرف دلیل شرعی کے مخالف ہو پس اگر وہ من کل وجہ مخالف ہو یا اس طور کہ اس سے نص کا ترک لازم آئے تب تو اس کے رد میں کوئی شک نہیں جیسا



کہ لوگوں میں بہت سے محرمات کا متعارف ہونا یعنی ربا، شرب خمر اور ریشم پہننا اور سونا وغیرہ جن کی تحریم نص میں آئی ہے، اور اگر من کل وجہ مخالف نہ ہو بایں طور کے دلیل عام وارد ہو اور عرف اس کے بعض افراد میں خلاف ہو، یا دلیل قیاس ہو تو اگر عرف عام ہو تو وہ معتبر ہے اس لئے کہ عرف عام شخص بن سکتا ہے جیسا کہ تحریر سے گذرا، اور اس کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا جیسا کہ استصناع کے مسئلہ میں اس کی تصریح کی ہے اور حمام میں داخل ہونے میں اور مشکیزہ سے پانی پینے میں، اور اگر عرف خاص ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہے اور یہی مذہب ہے۔

اور تعامل کے ساتھ نص کی تخصیص جائز ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کہ ہم نے تعامل کی وجہ سے استصناع کو جائز کہا ہے حالانکہ استصناع اس چیز کی بیع ہے جو اس کے پاس نہیں ہے، حالانکہ وہ منہی عنہ ہے، اور تعامل کے ساتھ استصناع کی تجویز ہماری طرف سے نص کی تخصیص ہے، وہ نص جو انسان کے پاس غیر موجود چیز کی بیع کی نہیں میں وارد ہوتی ہے بالکل نص کا ترک نہیں ہے، اس لئے کہ ہم نے غیر استصناع میں نص پر عمل کیا ہے۔ اور تعامل سے بالکل نص کا ترک جائز نہیں اور اس کی تخصیص جائز ہے“ (نثر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف)۔

اسی کی تائید میں ابن عابدین لکھتے ہیں: ”اور نبی کریم ﷺ سے خمیری روٹی کے بارے میں سوال کیا گیا جس کے پڑوسی آپس میں تعاطی کرتے ہیں کیا وہ ربا ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جس کو مسلمان اچھا جانیں وہ اچھا ہے اور جس کو مسلمان برا خیال کریں وہ برا ہے۔ اور بزار یہ میں ذکر کیا ہے بیع وفا کے بارے میں کہ وہ صحیح ہے ربا سے بچنے کے لئے حاجت ناس کی وجہ سے“ (نثر العرف)۔

عرف عام کے معتبر ہونے کی وجہ و دلیل بیان کرتے ہوئے ابن عابدین لکھتے ہیں: ”ایسی چیز کا بدلنا جس کے اکثر بلاد اسلام میں اکثر اہل زمانہ عادی ہوں اس سے بڑھ کر کوئی حرج نہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اس حرج سے بڑھ کر ہے جس کی وجہ سے بعض ایسی نجاستوں سے درگزر کیا گیا ہے جن کی نص میں نہیں آئی ہے جیسے کہ بڑک کی مٹی جس پر نجاست غالب ہو، اور کپڑوں میں بلی کا پیشاب اور دودھ کے برتن اور کنوؤں میں قلیل مینگنی، لیکن یہ اولہ نجاست کی تخصیص کے ساتھ ہے“۔

مزید فرماتے ہیں: ”اور اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے تصریح کی ہے کہ ایسی شرط سے جس کو عقد نہ چاہتا ہو اور اس میں احد المتعاقدين کا نفع ہو تو وہ بیع فاسد ہے، اور انہوں نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے اور قیاس کے ساتھ اور انہوں نے اس سے اس کا استثناء کیا ہے جس کے ساتھ عرف جاری ہو جیسے کہ نعل کی بیع اس شرط سے کہ بائع اس کو برابر کاٹے گا۔ فتح الغفار میں کہا ہے: پس اگر تو کہے کہ جب شرط متعارف عقد کو فاسد نہ کرے تو لازم آئے گا کہ عرف حدیث پر قاضی ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ حدیث پر نہیں بلکہ قیاس پر ہے، اس لئے کہ علت نزاع کا واقع ہونا ہے جو عقد کو معقود بہ سے نکالنے والا ہے اور وہ منازعت کو ختم کرنا ہے اور عرف نزاع کو ختم کرے گا لہذا وہ حدیث کے معنی کے موافق ہوگا، اور اب موانع میں صرف قیاس باقی رہا اور عرف اس پر قاضی ہے“ (نثر العرف)۔

”پس یہ سب اور اس کے مثل اس کی واضح دلیلیں ہیں کہ مفتی کو ظاہر الروایت کی کتابوں میں منقول پر جمود نہیں چاہیے، زمانہ اور اہل زمانہ کی رعایت کے بغیر، ورنہ وہ بہت سے حقوق کو ضائع کر دے گا اور اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہوگا“ (نثر العرف)۔

## حق کی تعریف

علامہ شامی نے حق کی تعریف اس طرح کی ہے: اعلم ان الحق فی العادة ینذکر فیما هو تبع للمبیع ولا بد له منه ولا یقصد الا لأجلہ كالطریق والشرب للأرض (شامی ۲، ۱۹۸)۔ (جان لو کہ حق عام طور سے ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو بیع کے تابع ہوں اور اس کے لئے ان کا ہونا ضروری ہو اور اس کا اسی کی وجہ سے قصد کیا جائے جیسے راستہ اور زمین کے لئے پانی کا حق)۔

## حقوق مجردہ کی بیع

یعنی حق مرور، حق شرب، اور حق تسبیل الماء، یہ حقوق ہیں ان کی زمین کے ساتھ بیع کی جائے تو جائز ہے، اور اگر بغیر زمین کے تنہا ان کی بیع کی جائے تو یہ حقوق مجردہ کی بیع ہوگی، اور حقوق مجردہ کی بیع کے بارے میں فقہاء حنفیہ کی جو آراء کتابوں میں مذکور ہیں ان میں کوئی ایسا ضابطہ معلوم نہیں ہوتا جو کلی ہو اور تمام



جزئیات کو شامل ہو، اس لئے اس سلسلہ میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔

مثلاً حق مرور کی بیع ظاہر الروایت میں جائز نہیں، امام کرنی، فقیہ ابواللیث وغیرہ نے اسی کی تصحیح کی ہے، اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ حق مجرد کی بیع ہے اور تنہا حقوق کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن ابن سماعہ کی ایک روایت میں جائز ہے اور اکثر مشائخ نے اسی کو اپنایا ہے۔

”زمین کے تابع ہو کر حق مرور کی بیع بغیر اختلاف کے صحیح ہے، اور بالقصد تنہا اس کی بیع ایک روایت میں صحیح ہے اور مشائخ نے اسی کو لیا ہے۔ درمیں کہا ہے کہ زیادات کی روایت میں جائز نہیں، اور فقیہ ابواللیث نے اسی کی تصحیح کی ہے، اس لئے کہ یہ حقوق میں سے ایک حق ہے اور تنہا حقوق کی بیع جائز نہیں“ (شامی ۱۱۸/۳)۔

ایک جگہ یوں فرمایا: لأن بیع الحقوق المجردة لا يجوز كالتسبيل وحق المرور (فتح القدیر ۶/۲۶)۔ (اس لئے کہ حقوق مجردہ کی بیع جائز نہیں جیسے کہ پانی بہانے اور گزرنے کا حق)۔

حق مرور کی بیع میں دو روایتیں ہوئیں ایک میں جائز ایک میں ناجائز، مگر حق تعلی کی بیع میں سب متفق ہیں کہ وہ جائز نہیں، اس پر سوال پیدا ہوا کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے، جب کہ حق ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ تو اس کا جواب یہ دیا کہ حق مرور کا تعلق عین سے ہے اس لئے اس کا حکم عین کا حکم ہوگا لہذا وہ محل بیع ہو سکتا ہے، برخلاف حق تعلی کے، اس لئے کہ اس کا تعلق ہوا سے ہے اور ہوا عین اور مال نہیں ہے، اس لئے اس کی بیع ناجائز ہے۔

”اور مال ہی محل بیع ہے، پس تحقیق بیع کا محل وہ مال ہے یا وہ حق ہے جو عین سے تعلق رکھے، اور حق تعلی ہوا سے متعلق ہے اور ہوا مال نہیں ہے، اس لئے کہ مال وہ ہے جس پر قبضہ اور اس کا احراز ممکن ہو“ (نشر العرف)۔

”اور فرق کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے حق تعلی میں منع کی علت یہ بتلائی کہ وہ مال نہیں ہے، تو اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حق مرور بھی ایسا ہی ہے لیکن اس کی بیع ایک روایت میں جائز ہے حالانکہ دونوں میں سے ہر ایک میں حق کی بیع ہے نہ عین کی بیع، اور وہ یہ ہے کہ مرور کا حق ایسا حق ہے جو قبضہ اور مال سے متعلق ہے اور وہ مال ہے جو عین ہے، پس جو اس سے متعلق ہوگا تو اس کے لئے عین کا حکم ہوگا، لیکن حق تعلی ایسا حق ہے جو ہوا سے متعلق ہے اور ہوا عین اور مال نہیں ہے“ (فتح القدیر ۶/۲۶)۔

اسی طرح حق شرب کی بیع مشائخ بلخ کے نزدیک جائز ہے، اس لئے کہ وہ پانی کے ایک حصہ کی بیع ہے۔

”اور اسی طرح شرب کی بیع یعنی وہ تبا للارض تو بالاجماع جائز ہے، اور ایک روایت میں تنہا بھی، اور مشائخ بلخ کا مختار یہی ہے، اس لئے کہ وہ پانی کا ایک حصہ ہے“ (شامی ۱۱۸/۳)۔

ایک حق تسبیل ہے، اس کی بیع کو بالاتفاق ناجائز کہتے ہیں۔ لا یصح بیع حق التسبیل الخ ای باتفاق المشائخ (شامی ۱۱۸/۴)۔

اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر حق تسبیل سطح پر ہو تب تو یہ حق تعلی کی نظیر ہے، مگر اس پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ یہ اس کی نظیر اس وقت ہوگا کہ علو کے سقوط کے بعد علو کی بیع ہو، اسی طرح سطح نہ ہو، اور سطح پر حق تسبیل کی بیع ہو لیکن سطح موجود ہو تو اس وقت یہ نظیر نہیں بن سکتا۔ اور اگر حق تسبیل علی الارض کی بیع ہو تو جہالت کی وجہ سے جائز نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی وجہ سے یہ جہالت ختم ہو جائے اور نزاع کا امکان باقی نہ رہے تو اس کی بیع بھی جائز ہوگی۔ بہر حال حق مرور وغیرہ کے جواز اور حق تعلی کے عدم جواز کے فرق کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ محل بیع مال ہوتا ہے یا وہ حق ہوتا ہے جو عین سے متعلق ہو۔ حق مرور وغیرہ کا تعلق عین اور مال سے ہے اس لئے ان کی بیع جائز ہے، اور حق تعلی کا تعلق عین سے نہیں ہے اس لئے اس کی بیع جائز نہیں۔ فرق کی اس وجہ پر عنایہ میں سخت اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ دار کا سکنی بھی ایسا حق ہے جس کا تعلق عین سے ہے مگر اس کی بیع جائز نہیں ہے۔

وفیه نظر لأن السکنی من الدار مثلاً حق یتعلق بعین تبقى هو مال ولا يجوز بیعه (عنایہ، فتح القدیر ۶/۲۶)۔

(اس میں نظر ہے، اس لئے کہ مثلاً دار کا سکنی بھی ایسا حق ہے جو باقی رہنے والے عین سے متعلق ہے اور وہ مال ہے)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوا کہ بعض حضرات حقوق مجردہ کی بیع کو مطلقاً منع کرتے ہیں، مگر بہت سے حضرات بعض حقوق مجردہ کی بیع کے جواز کے قائل ہیں سب کے نہیں۔ مثلاً یہ حضرات حق مرور اور حق شرب کی بیع کو جائز کہتے ہیں اور حق تعلی کی بیع کو ناجائز، اور دونوں میں فرق کی وجہ بیان کی گئی ہے، اس پر

اعتراض وارد ہوتا ہے، اس لئے وہ کوئی مضبوط وجہ معلوم نہیں ہوتی، پھر حق تعلی کے بارے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسری منزل بنی ہوئی ہو تو اس کی بیع جائز ہے، اور اگر صرف نیچے کی منزل ہو اور پر والی منزل نہ ہو تو علو کی بیع جائز نہیں۔ دوسری منزل خریدنے کے بعد اگر وہ منہدم ہو جائے تو مشتری دوبارہ اس کی تعمیر کر سکتا ہے، اسی طرح اگر دونوں منزلیں منہدم ہو جائیں اور سفلی والا سفلی کی تعمیر نہ کرے تو علو والے کو حق ہے کہ خود دونوں منزلوں کی تعمیر کرائے اور سفلی کا صرفہ صاحب سفلی سے وصول کر لے۔

حق تعلی کی ان صورتوں میں فرق کی بھی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ حقوق مجردہ کی بیع کے جواز و عدم جواز کا حکم لوگوں کی عادت اور تعامل اور ضرورت و حاجت کے ساتھ وابستہ ہے۔

احکامات شرعیہ میں عرف و عادت، ضرورت و حاجت کو بہت بڑا دخل ہے۔

ابن عابدین لکھتے ہیں: ”متون وغیرہ میں باب حقوق میں ذکر کیا ہے کہ بیت کو بکل حق ہولہ کے ساتھ خریدنے میں علو داخل نہیں ہوگا، اور منزل خریدنے میں بکل حق ہولہ اور ہرافقہ کے ساتھ علو داخل ہوگا اور دار میں مطلقاً داخل ہوگا۔ کافی سے نقل کرتے ہوئے بحر میں کہا ہے کہ یہ تفصیل کوفہ کے عرف پر مبنی ہے اور ہمارے عرف میں علو سب میں داخل ہوگا اور احکام عرف پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس ہر اقلیم اور ہر زمانے میں اس کے اہل کے عرف کا اعتبار ہوگا“ (نشر العرف)۔

حق تعلی کی بیع کو فقہاء ناجائز لکھتے ہیں لیکن آج کے زمانے میں ساری دنیا میں اس کی بیع کا رواج اور عرف ہو گیا ہے، اور خاص طور سے بڑے شہروں میں ایسی حاجت و ضرورت ہو گئی ہے کہ بغیر اس کے چارہ کار نہیں ہے، اس لئے فقہاء ہی کی تصریحات کی روشنی میں یہ بیع جائز ہونی چاہیے (تفصیل کے لئے دیکھئے: نشر العرف)۔

حاصل کلام:..... فقہاء حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حقوق جن کا تعلق کسی عین سے ہو ان کی بیع جائز ہے، اور جن کا تعلق عین سے نہ ہو ان کی بیع جائز نہیں۔ مثلاً حق مرور، حق شرب حق تسبیل الماء، ان کا تعلق چونکہ عین سے ہے اس لئے ان کی بیع جائز ہے، اگرچہ جہالت کی وجہ سے حق تسبیل کی بیع منع کرتے ہیں مگر فی نفسہ اس کی بیع جائز ہے۔

حق تعلی:..... حق تعلی کی بیع کو فقہاء منع کرتے ہیں اس لئے کہ اس کا تعلق ہوا سے ہے، اور وہ عین یا مال نہیں ہے، مگر میری رائے ناقص میں اس کا تعلق بھی عین سے ہے۔

زمین پر مکان بنانے کا معاوضہ لے کر نیچے کی منزل بنانے کا حق دیدیا جائے تو اس کا تعلق زمین سے ہے جو عین ہے۔ پہلی منزل کے اوپر عمارت بنانے کا حق فروخت کیا جائے تو دوسری منزل پہلی منزل کے اوپر ہی تعمیر ہوگی خواہ اس وقت نیچے منزل موجود ہو یا نہ ہو اس لئے اس کا تعلق بھی عین ہی سے ہوگا، اس لئے کہ دوسری منزل کا اعتماد پہلی منزل ہی پر ہوگا جو عین ہے، یہ نہیں کہ وہ ہوا پر معلق ہوگی۔

ضرورت اور عرف و عادت بھی اس کی بیع کے جواز کے متقاضی ہیں۔

## حقوق ادبیہ

موجد، مصنف، محقق کے فکری نتائج اور ٹریڈ مارک وغیرہ کو حقوق اسبقیت میں داخل کر کے ان کی بیع کے جواز کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کو احياء موات پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مباح زمین کی تجیر وغیرہ سے جو حق ملتا ہے تو اس کا تعلق عین سے ہے، اور ایسی زمین کے احياء سے کاشتکار اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ زمین عین ہونے کی وجہ سے محل بلک ہے۔ اور اس حق کے دینے میں شریعت نے جہاں کاشت کار کی منفعت کا لحاظ کیا ہے وہاں عوام کے فائدے کو بھی پیش نظر رکھا ہے، ظاہر ہے ایسی زمین کے احياء سے جہاں کاشتکار کو فائدہ ہوگا وہاں اس کی پیداوار سے عوام کا فائدہ بھی ہوگا، بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کاشتکار کے بجائے عوام ہی کا فائدہ شریعت کے پیش نظر ہے۔

اسی لئے اگر زمین کو گھیرنے کے بعد تین سال تک کاشت نہیں کی تو یہ حق ختم ہو جائے گا اور حاکم کو اختیار ہوگا کہ یہ زمین دوسرے کو دیدے۔

اس کے برخلاف حق تصنیف و ایجاد میں شخصی و ذاتی نفع ہے، اور دوسروں کو اس کے نفع سے مستفید ہونے سے روکنا ہے، اور ایسی صورت کو شریعت پسند نہیں



کرتی، اسی بنیاد پر احتکار اور بیع الحاضر للبادی کی ممانعت آئی ہے۔

حق تصنیف و ایجاد کوئی ایسی چیز نہیں جس کو شریعت مانتی ہو، اسی طرح عرف عام کی بنیاد پر بھی اس کو حق نہیں کہا جاسکتا۔ مصنفین و موجدین کی تعداد بہت محدود اور کم ہے، پھر حکومتوں کے ضابطوں کی بنیاد پر حکومت کی طرف سے یہ حق پیدا کیا گیا ہے کہ کوئی اپنی تصنیف و ایجاد کو رجسٹرڈ کرائے تو پھر کوئی دوسرا تصنیف کو شائع اور اس ایجاد کو بنا نہیں سکتا۔ اگر مصنف و موجد تصنیف و ایجاد کو رجسٹرڈ نہ کرائے تو پھر کوئی بھی اس کو ایسا حق نہیں مانتا کہ دوسرا اس کی نقل نہ کر سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شرعاً کسی کو کسی مباح تصرف سے روکنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ اس کا یہ تصرف کسی غیر کی ملک میں بلا اس کی اجازت کے ہو، دوسرے یہ کہ اس تصرف سے کسی شخص یا جماعت کا ضرر ہوتا ہے۔ یہاں یہ دونوں وجہ مفقود ہیں۔

حق تصنیف و ایجاد نہ کوئی مال ہیں اور نہ ان میں ملکیت کی صلاحیت ہے، اس لئے کہ وہ کوئی عین یا عین سے متعلق کوئی چیز نہیں ہے، تو جس کا آدمی خود مالک نہیں ہے وہ دوسروں کو اس سے روکنے یا اس کی بیع کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہر مباح چیز کو اپنانے میں حق اسبقیت کی بنیاد پر دوسروں پر پابندی لگانے کا جواز ہو جائے تو لازم آئے گا کہ اگر کسی جگہ کسی نے پرچون کی ایک دکان کھولی تو حق اسبقیت کی وجہ سے اب کسی دوسرے کے لئے اجازت نہ ہو کہ وہ اس کے قریب دوسری پرچون کی دکان کھولے، حالانکہ اس کو سب جائز کہتے ہیں۔

ان حقوق کی بیع کے عدم جواز کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ حق یعنی دوسرے کو نقل بنانے کی عدم اجازت حکومت کے قانون اور رجسٹرڈ کرانے کی وجہ سے پیدا ہوگا، گویا حکومت نے قانون کے ذریعہ اس مصنف اور موجد کے نفع اور عدم ضرر کا تحفظ کیا تو اوّل تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ دوسرے کے نقل بنانے میں اس کا کوئی ضرر نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ تقلیل نفع ہو سکتا ہے اور اس کو ضرر نہیں کہا جاتا، ورنہ ضروری ہوگا کہ کسی چیز کی ایک دکان کھلنے کے بعد دوسری دکان کھولنا منع ہو، اس لئے کہ پہلے دکاندار کا نفع کم ہو جائے گا۔

اور اگر ضرر ہی تسلیم کر لیا جائے تو یہ قانونی حق دفع ضرر کے لئے ہوا، اور دفع ضرر کے لئے جو حق ملتا ہے اس کی بیع جائز نہیں جس طرح کہ حق شفعہ کی بیع جائز نہیں۔ یہی معاملہ ٹریڈ مارک کا بھی ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

☆☆☆



## مسئلہ بیع حقوق

مولانا محمد طیب الرحمن ؒ

فقہائے حنفیہ نے بیع کی تعریف میں عام طور پر ”مبادلة المال بالمال“ کے لفظ کو استعمال کیا، البتہ ”کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ“ (جلد ۲ ص ۱۳۷) میں ”هو مبادلة السلعة بالنقد“ کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔ صاحب الدر المختار نے ”مبادلة شیء مرغوب بمثلہ“ کے لفظ کو استعمال کیا، لیکن صاحب رد المحتار نے ”شیء مرغوب فیہ“ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: ”ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال“۔ کتاب بدائع الصنائع جلد ۵ ص ۱۳۳ میں لکھا گیا ہے: ”هو مبادلة شیء مرغوب بشیء مرغوب“۔ پھر صاحب بدائع الصنائع ملک العلماء علامہ کاسانی نے شرائط معقود علیہ کے تحت میں ذکر کیا: ”ومنها أن یکون مالاً لأن البیعة مبادلة المال بالمال“۔ نیز عام طور پر فقہائے حنفیہ معقود علیہ کے شرائط کے تحت میں قیام مالیت کو شرط قرار دیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری (ج ۳ ص ۲) میں مرقوم ہے: ”ومنها فی البدلین وهو قیام المالیه حتی لا ینعقد متى عدمت المالیه هکذا فی محیط السرخسی“۔ مذکورہ عبارات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بیع کے لئے مالیت شرط ہے، اور اس میں علماء حنفیہ متفق الآراء ہیں۔ الفاظ کو ادا کرنے میں بظاہر گرچہ کچھ اختلاف ظاہر ہوتا ہے لیکن مرجع اور مال ہر ایک کا ایک ہی ہے۔

اب مال کی تعریف کرتے ہوئے فقہاء حنفیہ نے تصریح کیا ہے: ”المراد بالمال ما یمیل إليه الطبع ویمکن ادخاره لوقت الحاجة والمالیه تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم (رد المحتار ۴۰۲)۔ دوسرے بہت سارے فقہاء کرام نے بھی مال کی تعریف میں تقریباً اسی لفظ کو استعمال کیا۔

فتح القدیر ج ۳ ص ۹۷ میں مرقوم ہے: ”إن المال عین یمکن إحرازها وإمساکها“۔ حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۳۸۹ میں مرقوم ہے: ”والمال ما یتمول أو یدخر للحاجة وهو خاص بالأعیان“۔ مذکورہ عبارات میں بالتصریح موجود ہے کہ مال کا اعیان میں سے ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قابل ذخیرہ ہوتا کہ بوقت ضرورت اس سے نفع اٹھایا جاسکے۔

فقہائے کرام نے بعض چیزوں کو قابل انتفاع اور قابل ادخار ہونے کی وجہ سے مال میں شمار نہیں کیا، پھر اسی چیز میں جب انتفاع اور ادخار کی قابلیت آ جاتی ہے تو اس کو مال کے تحت میں شمار کیا جس سے صریح طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مالیت کے ثبوت میں عرف اور تعامل کا دخل ہے، لہذا کوئی شیء کسی زمانہ میں قابل انتفاع اور قابل ادخار نہ ہو، لیکن بعد میں قابل انتفاع اور قابل ادخار ہو جائے تو وہ مالیت کے تحت میں داخل ہو جائے گی جیسے گیسوں کے ایک دانہ کو فقہائے کرام نے مال میں شمار نہیں کیا، کیونکہ لوگ اس کو قابل انتفاع اور قابل ادخار نہیں سمجھتے۔ جامع الرموز جلد ۳ ص ۳۰۶ میں ہے: ”إن المال یتثبت بالتمول ای بادخار کل الناس أو بعضهم“ لہذا مٹی اور ریت کو قدیم زمانہ میں گرچہ مال میں شمار نہیں کیا گیا لیکن موجودہ زمانہ میں ان کو مال میں شمار کیا جائے گا۔ کیونکہ آج لوگ اس کو قیمتی مال سمجھتے ہیں، اور قابل ادخار اور قابل انتفاع بھی ہے۔ مال کی تعریف میں فقہاء کرام نے تصریح کیا کہ وہ قابل ادخار ہو، جیسے ”إن المال عین یمکن إحرازها وإمساکها“ (فتح القدیر ۴۰۹)۔

”والمراد بالمال ما یمیل إليه الطبع ویمکن ادخاره لوقت الحاجة (رد المحتار ۴۰۲)۔ إن المال هو ما یمیل إليه الطبع ویدخر للانتفاع به وقت الحاجة (کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ۴۰۱۳۸)۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ثبوت مالیت کے لئے قابل ادخار ہونا ضروری ہے، البتہ عقلاً بھی یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شیء کو ذخیرہ کرنے کی ایک ہی کیفیت متعین ہو بلکہ مختلف چیزوں کو ذخیرہ، احراز اور قبض کے لئے ان کی شان کے مطابق مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ فقہائے کرام نے بھی ہر ایک شیء کو ذخیرہ کرنے کی ایک ہی صورت متعین نہیں کی بلکہ ان کی عبارات

ع امیر شریعت، آسام۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل ادخار کے معنی شئی کو ایسی کیفیت سے محفوظ کرنا کہ مالک کو بذل اور منع کی قدرت ہو اور بوقت ضرورت اس سے نفع حاصل کریں۔ الدر المختار ۱۳۹/۴ میں ہے: ”والمال ما یصل إلیہ الطبع و یجری فیہ البذل والمنع الخ“۔ بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جن کو زمانہ قدیم میں قابل ادخار تصور نہیں کیا جاتا تھا، لیکن موجودہ زمانہ میں وہ قابل ادخار ہو گیا ہے جن کو مخصوص کیفیت سے ذخیرہ کیا جاتا ہے، اور ان کو قیمتی مالوں میں شمار کیا جاتا ہے جیسے ہوا اور بجلی۔ موجودہ زمانہ میں ہوا کو کمپریشر (COMPRESSOR) میں اور بجلی کو کنڈینسر (CONDENSER) میں ذخیرہ کرتے ہوئے قابل ادخار بنا دیا گیا ہے، اور ساری دنیا میں اس کی خرید و فروخت ہو رہی ہیں۔

حقوق اور منافع اعیان کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے فقہائے حنفیہ کے نزدیک ان کی بیع صحیح نہیں ہوتی، البتہ بعض حقوق کی بیع متعلق بالاعیان ہونے کی وجہ سے اعیان کے حکم میں اعتبار کرتے ہوئے انہوں نے جائز رکھا، جیسے بیع حق المرور وغیرہ کما فی الدر المختار ۴۰۱/۳۔

فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حقوق گرچہ قابل بیع نہیں ہوتے، پھر بھی اس سے بطریق صلح یا تنازل امتیاض صحیح ہے، اور وہ ایسا حق ہے جو دفع ضرر کے لئے نہیں بلکہ صاحب حق کے لئے اصلۃً ثابت ہے (دیکھئے: رد المحتار ۲۰۴/۳)۔

مالک اراضی کئی منزله فلیبیس بنا کر ہر منزل کی مکانیت اور جس حد تک فضا پر وہ مکانات حاوی ہیں جملہ حقوق کے ساتھ اگر مختلف افراد کے ہاتھوں فروخت کرے تو یہ بیع صحیح ہوگی کیونکہ ان پر مالیت صادق ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی بیع کی صحت پر فقہاء کرام کی تصریحات موجود ہیں۔ فتاویٰ قاضی خاں ۳۸۳/۲ میں ہے: ”رجل له علو وسفل فقال الرجل بعث منک علو هذا السفل بكذا جاز البیع“۔

لیکن فضا پر مکان تعمیر کرنے کے لئے زمین کا مالک گراؤنڈ فلور کے اوپر پہلے، دوسرے تیسرے، چوتھے منزل کی تعمیر کا حق اگر فروخت کرنا چاہے تو یہ فقہائے حنفیہ کی تصریحات کے بنا پر جائز نہیں ہوگا کیونکہ وہ مال نہیں ہے (دیکھئے: فتاویٰ عالمگیری ۱۷۳، فتح القدیر ۸۹/۳)، البتہ مالک زمین کے لئے ہوا پر بھی ملکیت ثابت ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں ۱۹۰/۳ کتاب ارض میں ہے: ”رجل له نخلة فی ملکہ و خرج سعفا إلی أرض جاره کان للجار أن یقطع و یفرغ هو ملکہ لأن من ملک أرضاً ملک ما تحته من الثرى و ما فوقه إلی السماء“۔

مالک زمین کے لئے فضا پر ملکیت ثابت ہونے کی وجہ سے فضا پر ان کا حق اصلۃً ثابت ہے، بناءً علیہ فضا پر مکان تعمیر کرنے کے لئے گراؤنڈ فلور کے اوپر پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی منزل کی تعمیر کے حق کے مقابلہ میں مختلف اشخاص سے بطریق صلح یا تنازل کے عوض لینا جائز ہوگا۔ البتہ اس میں یہ شرط ہوگی کہ معاملہ ایسی کیفیت سے ہو کہ اس میں غرر کا احتمال نہ ہو کیونکہ غرر ناجائز اور حرام ہے۔

مباحات پر جو شخص پہلے قبضہ کرتا ہے اس پر اس شخص کی ملکیت اور حق ثابت ہو جاتا ہے، دوسرے کسی کو اس میں تصرف کا اختیار نہیں رہتا۔ وہ مباحات اعیان کے قبیل سے ہوں یا منافع کے قبیل سے، کیونکہ ملکیت احراز سے ثابت ہوتی ہے، اور ہر شئی کی احراز اس کی حیثیت سے ہوتی ہے، اور اس کے لئے اعیان میں سے ہونا شرط نہیں ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۱۳۹/۴، عینی شرح الکنز ۸۸، ۸۵/۳، فتاویٰ قاضی خاں ۲۳۵/۳)۔

فضا سے ہوا یا پرندے، دریا سے پانی، جنگل سے لکڑی وغیرہ امور مباحہ کو اخذ اور ذخیرہ کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے، اور ان میں سے مختلف چیزوں کو ذخیرہ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ کوئی شخص ان امور مباحہ کے کسی حصہ کو اگر قبض اور احراز کر لے تو وہ شخص اس کا مالک ہو جائے گا اور دوسرے کسی کا اس پر حق نہ رہے گا۔

علوم اور فنون، صنعت و حرفت کا جو سمندر انسان کی دماغی اور فکری قابلیت اور صلاحیت کے سامنے موجود ہے اس میں غوطہ لگا کر تحقیقی تصنیفات کرنا۔ سائنسی انکشافات اور فارمولے ایجاد کرنا، مختلف کیفیت کی صنعتوں اور حرفتوں کا ایجاد کرنا وغیرہ کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لگا کر رات دن محنت کرتے ہوئے کوئی تحقیقی تصنیف کرے، یا صنعتی، حرفتی یا سائنسی ایجاد کرتے ہوئے اس کو قابل قیمت بنا دے تو اس نے علوم، فنون، صنعت یا حرفت کے سمندر سے ایک حصہ کو علیحدہ کرتے ہوئے مقید اور متعین کر لیا تو اس کے منافع کی ملکیت اسی کو ہوگی۔ موجد، مصنف یا فنکار کی اجازت صریحی یا ضمنی کے علاوہ ان تصنیفات یا ایجادات کو ذریعہ تجارت بنا کر کسی کو نفع حاصل کرنے کا حق نہ رہے گا۔ سرکاری قانون کے ذریعہ سے اس کو محفوظ کرایا جائے یا نہ کرایا جائے۔ موجد، مصنف یا فنکار کو چونکہ حق اصلۃً ثابت ہے اس لئے اس کا معاوضہ بطریق صلح یا تنازل جائز ہوگا۔ یہ حق سرکاری قانون کے ذریعہ سے رجسٹری کرایا جائے یا نہ کرایا جائے، دونوں حالت میں چونکہ مادی اور اعیان کے قبیل سے نہیں ہے اس لئے بطریق بیع عوض لینے میں گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

☆☆☆

هذا ما ظهر لی واللہ اعلم بالصواب۔



## مسئلہ بیع الحقوق

مولانا زبیر احمد قاسمی

اس مسئلہ کے متعلق تفصیل میں جائے بغیر اور مختلف مقالات میں مذکورہ دلائل کا استیعاب و اعادہ کئے بغیر مختصراً کچھ نقاط کو سامنے لاتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۔ فقہاء حنفیہ عموماً حقوق کو مال کے مقابلہ میں ذکر کرتے ہیں، اور اسی طرح کا استعمال ہم حدیث رسول اللہ ﷺ میں بھی پاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: من ترک مالاً أو حقاً فلورثته۔ اس حدیث میں مال اور حق کا تقابل بتلا رہا ہے کہ حق مال سے الگ کوئی چیز ہے۔ لیکن مال ہو یا حق دونوں قابل انتقال ہیں۔ مورث کے متروکہ مال کی ملکیت جیسے وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے ویسے مورث کا حق ثابت بھی اس کے وارثوں کا حق ثابت بن جاتا ہے۔

۲۔ بیع کی تعریف کے سلسلے میں جو بھی تعبیریں فقہائے حنفیہ کے یہاں ملتی ہیں ان میں لفظاً یا معنماً مال کی حیثیت ایک شرط ضروری اور جوہری کی معلوم ہوتی ہے، جس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ بیع و شراء کا معاملہ مال کے بغیر موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ گو دیگر ائمہ کے یہاں مال کے علاوہ منافع وغیرہ کی بیع و شراء کے جواز کی روایتیں بھی ملتی ہیں۔

۳۔ جہاں تک مال کی تعریف کا تعلق ہے اس میں بھی اچھا خاصہ اضطراب پایا جاتا ہے اور اس کی مختلف تعبیریں ملتی ہیں۔ لیکن حنفیہ کی اکثر تعبیروں میں ”ما یمیل الیہ الطبع“ اور ”یسکن ادخارہ“ بطور قدر مشترک پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف زمانی کے نتیجے میں بہت سی ایسی چیزیں یقیناً سامنے آجائیں گی جو ماضی میں غیر مرغوب اور ناممکن الادخار ہونے کے سبب مال شمار نہیں ہوتی تھیں اور اس کی بیع و شراء کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مگر آج وسائل و اسباب کی وسعت و تنوع کے سبب وہ قابل ادخار بن چکی ہیں۔ ان سے انتفاع و استفادہ کی صورتیں عام ہو جانے کے سبب وہ مرغوب طبع بھی بن چکی ہیں۔ اس لئے آج انھیں مال میں یقیناً شمار کیا جانا چاہیے، جس کے بیع و شراء کو ناجائز کہنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہ پاتی۔

۴۔ انسانی حقوق کسے کہتے ہیں؟ عجیب بات ہے کہ اس کی تعریف میں مختلف تعبیریں پائی جاتی ہیں۔ ہم نے بعض فقہی عبارتوں میں یوں دیکھا ہے: حق لراسان مایتولی اثباتہ اوردہ۔ گو یہاں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دراصل حق کی فقہی تعریف تو وہی ہے جسے ”الحکمہ الثابت شرعاً“ (حاشیہ قمر الاقمار) یا ”الحق هو اختصاص یقر بہ الشرع سلطه أو تکلیفاً“ (الدخل الفقہی العام) وغیرہ جیسے الفاظ سے بیان کی جاتی ہے۔ مگر چونکہ شرعی طور پر ثابت شدہ اختیارات اور ذمہ داریاں ہی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے متعلق عند القضاء دعویٰ مسوع ہو سکتا ہے اور وہی عند القضاء لائق اثبات یا قابل رد ہوا کرتی ہے۔ اس لئے بعض فقہاء نے ”حق الإنسان ما یتولی اثباتہ اوردہ“ سے کی ہے، اور اس طرح یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ محض الفاظ و تعبیر کا اختلاف ہے حقیقت وہی رہی کہ انسانی حقوق ہر ان ذمہ داریوں اور اختیاروں کو تسلط کو کہا جائے گا جو شریعت نے اسے بخشا ہے، اور جو اپنے مواقع و محل کے اعتبار سے مختلف نوعیتوں کے ہو سکتے ہیں مثلاً حق شفیعہ، حق مخیرہ، حق ولایت علی الصغیر، حق شرب و علو، حق تسبیل و مرور اور حق اسبقیت وغیرہ۔

۵۔ جہاں تک ہم نے غور اور فقہی تعبیروں کا تتبع کیا اس سے یہی بات سمجھ میں آئی کہ متقدمین فقہائے حنفیہ بعض حقوق کو مجرد کہتے ہوئے اس کی بیع و شراء کے عدم جواز پر متفق ہیں۔ جیسے حق شفیعہ، حق مخیرہ وغیرہ۔ اور بعض حقوق کے بارے میں مختلف الروایت ہیں۔ مثلاً حق تسبیل و مرور اور حق علو وغیرہ۔ اور بعض ایسے حقوق ہیں جن کی بیع و شراء کو ناجائز کہتے ہوئے بطور صلح اس حق کے اسقاط اور دست برداری کے عوض لینے کو جائز کہتے ہیں۔ چنانچہ حق قصاص کی بیع جائز نہیں۔ کوئی بھی فقہی اس کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم اپنے حق قصاص کو کسی اجنبی کے ہاتھ فروخت کر لیں اور وہ اجنبی قاتل سے قصاص لے لے۔ مگر ولی مقتول کو قاتل سے اپنے حق قصاص کا بطور صلح عوض لینا تصماً جائز ہے، وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ شیخ الجامعہ اشرف العلوم شمسی کہواں، بیٹا مڑھی۔



۶۔ امام بخاری و مسلم علیہما الرحمۃ کی متفق علیہ روایت ہے: نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع الولاء وعن هبته (بخاری: کتاب العتق، باب بیع الولاء و هبته، مسلم: کتاب العتق؛ باب النھی عن بیع الولاء و هبته)۔ ولاء گرچہ مولیٰ معتق کا ایک حق ہے لیکن یہ بھی ثابت نہیں بلکہ محض متوقع ہے۔ شارع علیہ السلام اس متوقع حق کی بیع و شراء اور ہبہ کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو حق ابھی ثابت نہ ہو اور مستقبل میں اس کا ثبوت متوقع ہو اس کی نہ تو بیع جائز ہے اور نہ بطور صلح اخذ عوض ہی جائز ہوگا، اور نہ مفت اس کی ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنا ہی جائز ہوگا۔

ان مذکورہ بالا نقاط اور دیگر فقہی جزئیات جو بین العلماء معلوم و معروف ہیں ان کی روشنی میں بیع الحقوق سے متعلقہ سوالوں کے بارے میں میری رائے حسب ذیل ہے:

الف۔ بیع کی حقیقت میں گو مبادلتہ المال بالمال داخل ہے، لیکن مال کے مصداق میں اختلاف زمانہ کے سبب بہت وسعت ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ آج بعض خالص غیر مادی چیزیں بھی مثلاً گیس، بجلی وغیرہ قابل ادخار ہو چکی ہیں۔ اور مٹی، بریت، سمنٹ وغیرہ اپنی نافعیت و افادیت کی بنا پر مرغوب فیہ بن کر مال کا مصداق بن چکی ہیں۔ اور ان سب چیزوں میں ان کے شایان شان تبادلہ و تقابض کا تحقق بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان چیزوں کی بیع و شراء کے جواز میں میرا خیال ہے کہ کوئی اشکال نہیں۔

(ب) وہ حقوق جو دفع ضرر کے لئے کسی انسان کو شرعاً ملتے ہیں اور جنہیں فقہاء حقوق مجردہ سے تعبیر کرتے ہیں ان کی نہ تو بیع ہی جائز ہونی چاہیے اور نہ بطور صلح ان کا امتیاض ہی جائز کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایسے حقوق مجردہ کی بیع یا بطور صلح اخذ عوض کے جواز کے متعلق سلف و خلف میں کسی کا کوئی قول میرے علم میں نہیں۔ اور اس کے عدم جواز کی جو توجیہ عقلی ہمارے فقہاء بیان کرتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ انتہائی وزن دار ہے۔ صغیر و صغیرہ کے اوپر حق ولایت یہ بھی اصلاً ضرر عار کو دفع کرنے ہی کے لئے شرعاً ملتا ہے، اس لئے اس کا بھی حکم حقوق مجردہ ہی کا ہوگا۔

(ج) وہ حقوق جو کسی عین باقی سے متعلق ہوں ان کی بیع کے جواز کے متعلق فقہائے حنفیہ کی روایتیں بھی موجود ہیں، اور ایسے حقوق ہمارے فقہاء کی توجیہ کے مطابق متعلق بالاعیان ہونے کے سبب مشابہ بالاعیان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے دور حاضر کے حالات و ضرورت پر نظر رکھتے ہوئے ایسے حقوق کی بیع کے جواز پر اتفاق کیا جانا چاہیے، جیسے حق مرور، حق تسبیل اور خصوصاً حق علو۔

(د) وہ حقوق جو نہ کسی عین سے متعلق ہوں اور نہ ان کا کوئی بظاہر وجود حسی ہی ہو مگر ان سے مالی انتفاع کا امکان اغلب ہو، گویا وہ حقوق متضمن للمنفعت ہوں تو ایسے حقوق کی بیع کو بھی جائز کہا جانا چاہیے۔ کیونکہ فقہاء لکھتے ہیں: ما کان بصدد الوجود کالموجود۔ اور جب حقوق سے مالی استفادہ اغلب ہے تو وہ بصدد الوجود ہونے کی بنیاد پر حکماً مال موجود کہے جاسکتے ہیں۔ شریعت میں اس کی نظیر عقد سلم میں مسلم فیہ ملتی ہے جو معدوم ہوتے ہوئے حکماً موجود تسلیم کی جاتی ہے، اور اس عقد کو بیع المعدوم نہیں بلکہ بیع الموجود کہہ کر جائز مانا جاتا ہے۔

ہاں ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ ایسے حقوق اپنا کوئی وجود حسی نہیں رکھتے ہیں اور بیع میں تبادلہ عوضین ہوا کرتا ہے جو یہاں متحقق نہیں پھر اس کی بیع کیسے صحیح قرار دی جاسکتی ہے؟ تو اس کا دفاع یوں ہو سکتا ہے کہ ہم اسے بیع نہ کہیں بلکہ ایک حق ثابت کے اسقاط کا معاوضہ اور بطور صلح اخذ عوض کا معاملہ قرار دے دیں۔ ہمارے خیال میں حق اسبقیت، حق تصنیف و تالیف اور گڈول وغیرہ سارے ہی حقوق اس طرح اخذ عوض کے قابل قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کا وہ فتویٰ تو ہم سبھوں کے علم میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کاروبار کا کوئی خاص نام رکھ لے اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو جائے تو کسی دوسرے کے لئے اس نام کا استعمال کرنا جائز نہیں، اور چونکہ اس خاص نام سے مستقبل میں تحصیل مال اور تجارتی منفعت وابستہ ہے تو اس نام کا معاوضہ لینا جائز ہے۔

اس فتویٰ سے اس کی تائید تو واضح طور پر ہو رہی ہے کہ جس حق سے مالی منفعت وابستہ ہو اس کا معاوضہ لینا جائز ہے۔ ہماری سمجھ میں اس فتویٰ کے باوجود گڈول اور حق تصنیف و تالیف کے حکم میں خود حضرت تھانویؒ کا مختلف الرائے ہونا کسی قوی بنیاد پر مبنی نہیں، سب کا حکم یکساں ہونا ہی زیادہ قرین صواب ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر مختلف تحریریں آج سے پہلے بھی آچکی ہیں جس میں ان بنیادوں کے بارے میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس لئے ہماری رائے تو یہی ہے کہ اس طرح کے سارے حقوق کا اخذ عوض جائز ہونا چاہیے۔

☆☆☆

هذا ما عندي والعلم عند الله۔

## بیع حقوق کا مسئلہ

مولانا رفیق المنان القاسمی

اصل جواب سے پہلے بہتر ہے کہ حقوق و منافع غیر مادی اور معنوی اشیاء کے متعلق یہ غور کیا جائے کہ اس سے متعلق شریعت اسلامی کا نقطہ نظر کیا ہے اور کیا غیر اعمیانی منافع حقوق کو مال متقوم کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟

منافع و حقوق جو مصالح انسان کی رعایت، ضرورت یا رفع ضرر کے لئے انسان کو حاصل ہوتے ہیں (مثلاً حق رہائش، حق طریق، حق شفعہ، حق نکاح، حق حضانت وغیرہ) اصلاً مال متقوم کے دائرہ میں نہیں آتے اس لئے ان کی بیع و شراء بھی اصلاً جائز نہیں، کیونکہ بیع نام ہے "مبادلة المال بالمال" کا۔ اور یہ مفہوم پورے طور پر انہیں چیزوں میں صادق آتا ہے جو مادی اور اعمیانی کے قبیل سے ہوں۔

البيع مبادلة المال بالمال بالتراضي (كفایہ جوالہ حاشیہ ہدایہ ۳۰۲) البيع هو مبادلة المال بالمال لغرض التملیك (المقنن ۲۰۳) المال ما یميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والمالية تثبت بتمول الناس كافة او بعضهم والتقوم یثبت بها وباباحة الانتفاع بها شرعاً (رد المحتار ۲/۲۴، نیز دیکھئے: الاشباہ ۳۰۸)۔

یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء اجارہ تک کو ناجائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اجارہ میں معقود علیہ منافع ہوتے ہیں، اور اجارہ حقیقت میں منافع کی بیع ہے جو قابل تسلیم و اعزاز نہیں۔

فالإجارة جائزة عند عامة العلماء وقال أبو بكر الأصم إنها لا تجوز والقياس ما قاله لأن الإجارة بيع المنفعة والمنافع للحال معدومة والمعدوم لا يتحمل البيع... لكننا استحسنا الجواز بالكتاب والسنة والإجماع (بدائنة الصنائع ۲۰۱۵۳، نیز دیکھئے: ہدایہ ۲۰۲۷۷)۔

لیکن ایسا نہیں کہ حقوق و منافع کے قبیل کی تمام غیر اعمیانی چیزیں غیر متقوم اور ناقابل عوض ہیں جہاں ضرورت و مصلحت کا تقاضہ ہو، شریعت مطہرہ نے ایسی چیزوں کو بھی قابل عوض قرار دیا ہے جو غیر اعمیانی اور منافع و حقوق کے قبیل سے ہیں اور جن کا الگ سے کوئی مادی وحسی وجود نہیں، مثلاً اجارہ خود ہی منفعت کی بیع ہے جسے شریعت نے حاجت و ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہے۔

الأصل في جواز الإجارة الكتاب والسنة والإجماع (المغنی ۵۰۳۳) لكننا استحسنا الجواز بالكتاب والسنة والایجماع (بدائنة الصنائع ۲۰۱۵۳، نیز دیکھئے: المغنی ۵۰۳۳)۔

اسی طرح نکاح، خلع، اور صلح عن القصاص وغیرہ ایسے معاملات ہیں جن میں شریعت نے ضرورت و مصلحت کے تقاضے سے خالص غیر مادی اشیاء کو قابل عوض قرار دیا ہے۔ مہر حق استمتاع کا معاوضہ ہے، اور بدل خلع حقوق زوجیت سے دست برداری کا، اور دیت حق قصاص کا بدل ہے، اور یہ متفق علیہ اور منصوص معاملات ہیں۔

وخرج عنها القصاص وملكت النكاح وحق الرق فإنه يجوز الاعتياض عنها (رد المحتار ۲۰۱۳)۔

اس سے اتنی بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ حسب ضرورت و مصلحت حقوق و منافع بھی متقوم اور قابل عوض ہو سکتے ہیں اور ان کی بیع و شراء کی جاسکتی ہے، اس لئے جن حقوق کے قابل عوض ہونے یا نہ ہونے کی اصول شرع میں کوئی صراحت نہیں ہے ان پر دیا نندارانہ بحث و تحقیق کی بہر حال گنجائش ہے۔

خود بیع اور مال کے مفہوم میں بھی کافی وسعت موجود ہے۔ فقہائے حنفیہ کا غالب رجحان تو یہی ہے کہ بیع جس چیز کی ہو، وہی ہو اسے محسوس و معاین ہونا چاہیے



لیکن دوسرے مکاتب فقہ کے علماء کے نزدیک بیع کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ علامہ ابن القاسم الغزالی الشافعی بیع کا مفہوم متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فأحسن ما قيل في تعريفه إنه تمليك عين مالية بمعاوضة بإذن شرعي أو تمليك منفعة مباحة على التأييد بشمن مال (حاشية الباجوري على شرح الغزالي ۲۰۲۰)۔

علمائے شوافع میں سے علامہ ابن حجر عسقلانی، قاضی بیضاوی، شربینی الخطیب اور شاطری نے، اور حنابلہ میں سے مرداوی، بہوتی اور ابن قدامہ وغیرہ نے بھی بیع کی اسی طرح کی تعریف کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بیع میں معقود علیہ اعیان بھی ہو سکتے ہیں اور منافع بھی۔ اس تعریف کی رو سے بیع و اجارہ میں فرق تو قیوت و تائید کا ہے۔ منافع کی بیع اگر موقت ہو تو وہ عرفاً اجارہ ہے اور موبد ہو تو وہ بیع ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بیع و شراء اور مال و جائداد کو شریعت نے کسی خاص و متعین دائرہ میں محدود نہیں کیا ہے۔ صاحب شریعت سے ایسا کچھ بھی منقول نہیں جو کہ بیع و شراء کو صرف مادی اشیاء کے ساتھ خاص کرتا ہو یا مال کو صرف اعیان میں محدود اور معنوی اشیاء کو اس سے خارج کرتا ہو۔

کسی بھی چیز کو مال متقوم کا درجہ دینے میں عرف و تعامل کا بڑا دخل ہے۔ جو چیزیں بھی شرعاً مباح الانتفاع ہیں اور بوقت ضرورت ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے، عام اس سے کہ وہ اعیان کے قبیل سے ہوں یا منافع کے قبیل سے، حسی ہوں یا معنوی، اگر عرف عام میں وہ مال و جائداد کا درجہ حاصل کر لیں تو از روئے شرع وہ مال متقوم قرار پائیں گے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہ نے اپنے مجموع الفتاویٰ (۲۴۶/۲۰) میں بڑی صراحت کے ساتھ تفصیل فرمائی ہے۔ خود فقہائے حنفیہ نے بیع حقوق کو اصولاً جائز قرار دینے کے باوجود بعض معاملات میں ضرورت و حاجت اور عرف و تعامل کے پیش نظر حقوق کو بھی قابل عوض مانا ہے اور منافع و حقوق متعلقہ اعیان کو مال متقوم کے درجہ میں رکھا ہے۔ بعض فقہاء نے راستے سے گزرنے کے حق کو قابل عوض مانا ہے اور مشائخ بلخ نے حق شرب کی بیع کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا (رد المحتار ۱۱۷/۲)۔

صاحب درمختار کے مطابق یہی عام مشائخ کا اختیار کردہ مسلک ہے۔

وصح یبع حق المرور تبعاً للأرض بلا خلاف ومقصوداً وحده في رواية وبه أخذ عامة الشماخ (در مختار علی هامش رد المحتار ۲۰۱۱۸)۔

بیع شرب کو ظاہر روایت میں فاسد کہا گیا ہے مگر علامہ حاکم شہید نے الکافی میں نقل کیا ہے: وكان شيخنا الامام يحيى عن استاذه أنه كان يفتي بجواز بيع الشرب بدون الأرض ويقول فيه عرف ظاهر في ديارنا بنسف فإهم يبيعون الماء۔ اس پر علامہ سرخسی نے اگرچہ اعتراض کیا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ حق شرب مال نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں غرر ہے جو شرعاً ممنوع ہے (المبسوط ۱۳۶/۱۳)۔

علامہ بابر ترقی کی عبارت اس سلسلے میں بالکل واضح ہے: وإنما لم يجز بيع الشرب وحده في ظاهر الرواية للجهالة لا باعتبار أنه ليس بمال (العناية بهامش الفتح ۵۰۳۰۲)۔

بعض متاخرین حنفیہ نے حق مرور حق شرب کے علاوہ حق مسیل، حق تعلی وغیرہ کو بھی قابل عوض قرار دیا ہے (شرح المجملہ لآئسی ۱۲۱/۲)۔

اسی طرح مکان کی رہائش، جانور کی سواری اور اس پر بار برداری کے حق کو قابل عوض و مال متقوم مان کر ان کا مہر رکھنا صحیح قرار دیا گیا۔

ذكر في البدائع وغيره لو تزوجها الحر على سكنى داره أو ركوب دابته والحمل عليها أو على أن تزرع أرضه ونحو ذلك عن منافع الأعيان مدة معلومة صحت التسمية (رد المحتار ۲۰۲۲)۔

اس کی جو وجہ بتائی گئی وہ قابل لحاظ ہے: لأن هذه المنافع مال والحقت به للحاجة (أيضا)

اسی طرح اگر کسی نے اپنے غلام کی ملک رقبہ مثلاً زید کے لئے اور اس کی خدمت کی عمر کے لئے وصیت کی تو یہ وصیت صحیح اور نافذ ہوگی۔ اب اگر زید کے کسی



عمل کے نتیجے میں غلام کے اندر کوئی نقص پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اس کی خدمت و کارکردگی ناقص ہو جائے تو عمر و کو اس کا تاوان لینے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر زید عمر و کو حق خدمت کا معاوضہ دے کر اسے اپنے حق سے دستبرداری پر راضی کر لے تو یہ بھی جائز ہوگا، اور معاوضہ وصول کر لینے کے بعد اپنے حق خدمت سے محروم ہو جائے گا گویا اس نے اپنا حق فروخت کر دیا (دیکھئے: رد المحتار ۱۵/۳)۔

کن چیزوں کی بیع جائز ہے اور کن چیزوں کی ناجائز:

جو چیزیں مباحات عامہ کے قبیل سے ہیں اور جن پر کسی فرد کی ملکیت نہیں بلکہ یکساں طور پر سب کو ان سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے ان کی بیع شرعاً جائز نہیں ہے، مثلاً، دریا، سمندر، بارش اور چشمے کا پانی، دریا اور سمندر کی مچھلی، صحرا کی لکڑی، خود رو گھاس، آگ، ہوا، سورج سے حاصل ہونے والی روشنی، حرارت اور توانائی وغیرہ۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ الناس شركاء في ثلاث الماء والنار والكلأ وثمنه حرام (ابن ماجہ بحوالہ زاد المعاد ۴، ۲۵۸) وسأل رسول اللہ ﷺ رجل فقال: ما الشيء الذي لا يحل منعه؟ قال: الماء، قال: ما الشيء الذي لا يحل منعه؟ قال: الملح، قال: ثم ماذا؟ قال: النار، ثم سأله ﷺ: ما الشيء الذي لا يحل منعه؟ قال: إن تفعل الخير خير لك (ابو داؤد بحوالہ إعلام ۴، ۲۲۵)۔

احراز و ملک کے بعد البتہ وہ چیزیں بھی فروخت کی جاسکتی ہیں جو مباحات عامہ کے قبیل سے ہیں، برتن میں محفوظ کیے گئے پانی، جنگل سے کاٹ کر لائی گئی گھاس اور لکڑی کی بیع و شراء کرنے کی شریعت میں گنجائش ہے۔

فأما من حاز في تربته أو إنائه فذالك غير المذكور في الحديث وهو بمنزلة سائر المباحات إذا حازها إلى ملكه ثم أراد بيعها كالخشب والكلأ والملح (زاد المعاد ۴، ۲۵۹)۔

میرے خیال میں سورج کی شعاعیں اور اس سے حاصل ہونے والی توانائی، ہوا اور اس میں پائے جانے والے غیر مرئی عناصر مختلف قسم کی گیسوں اور برقی توانائی اور اس قسم کی تمام چیزیں بھی اسی ذیل میں آئیں گی، اس قسم کی چیزوں کو اگر محفوظ کیا جاسکے اور وقت ضرورت انھیں استعمال کیا جاسکتا ہو تو انہیں مال متقوم کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور ان کی بیع و شراء کی جاسکتی ہے۔ برقی توانائی اور مختلف قسم کی گیسوں کا استعمال اب عام ہے، آج کون انھیں غیر متقوم کہہ سکتا ہے۔ اگر بالفرض چاند کو زمینی نوآبادی بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا تو ہوا اور پانی وہاں کی سب سے زیادہ ناگزیر اور گراں قیمت چیزیں ہوں گی، سورج کی شعاعوں کو اگر گرفتار کر کے قابل استعمال بنایا جاسکے تو بھی بڑی قیمتی چیز ہوگی۔ اس قسم کی کتنی ہی چیزیں ہیں جن پر پہلے قابل احراز و قابل بیع ہونے کا کسی کو تصور بھی نہ ہوا ہوگا لیکن آج وہ یقینی طور پر مال متقوم اور قابل بیع ہیں۔

مال متقوم بننے کی بنیادی شرطیں:

مباحات عامہ کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں انھیں شرعاً مال متقوم کا درجہ دینے اور قابل بیع ہونے کے لئے چند شرطیں ناگزیر ہیں: (۱) وہ شئی مباح الانتفاع ہو، (۲) قابل انتفاع ہو قبضہ و دسترس سے باہر نہ ہو، (۳) ہر قسم کے غرر و قماریت سے خالی ہو۔

جو چیزیں شرعاً محرم الانتفاع ہوں ان کی بیع جائز نہیں۔ شریعت اسلامی اہل اسلام کے حق میں انھیں قطعاً بے قیمت و ناقابل اعتناء قرار دیتی ہیں۔

عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ انہ سمع النبی ﷺ يقول: إن الله ورسوله حرم بيع الميتة والخنزير والأصنام (بخاری، مسلم بحوالہ زاد المعاد ۴، ۲۳۹)۔

عن ابن عباس قال قال كات النبي ﷺ في المسجد يعني الحرام فرفع بصره إلى السماء فتبسم فقال: لعن الله اليهود، لعن الله اليهود حرم عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها إن الله إذا حرم على قوم أكل شئ حرم عليهم ثمنه (بيهقي، حاکم فی صحیحہ بحوالہ مذکور)۔

## نا قابل انتفاع اشیاء کی بیع:

اسی طرح جو چیزیں محرم الاستعمال نہیں لیکن ناقابل انتفاع ہوں یا تو اس لئے کہ وہ افادیت سے خالی ہوں یا ان کی افادیت معلوم نہ ہو یا وہ ہنوز معدوم ہوں یا موجود ہوں مگر وہ قبضہ و دسترس سے باہر ہوں، ایسی تمام چیزوں کی بیع درست نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بدو صلاح یعنی قابل استعمال ہونے سے پہلے پھلوں کی بیع و شراء سے ممانعت فرمائی۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: لا تبيعوا الشمر حتى يبدو صلاحها وفي رواية أن رسول الله ﷺ غي عن بيع الشمار حتى يبدو صلاحها ونهي البائع والمبتاع (بخاری، مسلم، أبو داؤد، ترمذی، نسائی، موطأ امام مالک جوالہ جامع الاصول لابن الاثیر الجزری ۱۰۲۶)۔

اسی طرح بذات خود کوئی چیز کتنی ہی مفید اور اہم ہو لیکن اگر اس کی افادیت یا طریق استفادہ معلوم نہ ہو تو وہ چیز بھی قابل بیع نہ ہوگی۔ ریت اور مٹی میں پہلے کوئی ایسی قابل لحاظ افادیت معلوم نہ تھی جو انھیں قابل بیع و شراء بنا سکے، اسی لئے فقہاء نے انھیں مال میں شامل نہیں کیا ہے، لیکن آج بے تکلف ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے کیونکہ آج ان سے بہت مفید کام لئے جاتے ہیں اور ان سے بیش قیمت سامان تیار کئے جاتے ہیں۔

جدید تحقیقات و تجربات سے نئی نئی چیزیں دریافت ہو رہی ہیں اور ان کے عجیب و غریب فوائد و خصوصیات سامنے آرہے ہیں جن کا پہلے تصور بھی کسی کو نہ تھا۔ ہیرے سے بدرجہا سخت "کار بورنڈم" اور جواہرات سے کہیں زیادہ بیش قیمت "آئیڈیم" اور ہوا میں بھاری مقدار میں پایا جانے والا "نائٹروجن" جیسی گراں قدر اشیاء کو پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا لیکن آج یہ انتہائی کارآمد اور بیش بہا چیزیں ہیں۔ اس قسم کی تمام ہی نو دریافت چیزیں آج قابل بیع قرار پائیں گی، جب کہ پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جو چیزیں ابھی وجود ہی میں نہ آئی ہوں یا وہ قبضہ و دسترس سے باہر ہوں ان کی بیع بھی شرعاً درست نہیں، چنانچہ جانور کے پیٹ سے آئندہ پیدا ہونے والے بچے کی غیر مملوک و مقبوض اشیاء اور اس جیسی متعدد چیزوں کی بیع سے حدیث میں صریحاً ممانعت وارد ہوئی ہے:

عن ابن عمر قال غي رسول الله ﷺ عن بيع جبل الحبله وكان يباع يبتاعه أهل الجاهلية كان الرجل يبتاع الجزور إلى أن تنتج الناقة ثم تنتج التي في بطنها متفق عليه (مشکوٰۃ ۲۲۷)۔

قيل هو بيع ولد الناقة في الحال وبه قال أحمد وإسحاق بن راهويه وهذا أقرب إلى اللغة (طیبی علی ہامش مشکوٰۃ ۲۲۷)۔

عن حكيم بن حزام قال: قلت: يا رسول الله إن الرجل ليأتيني فيريد مني البيع وليس عندي ما يطلب افاييع منه ثم ابتاعه من السوق؟ قال لا تبع ما ليس عندك (ترمذی، أبو داؤد، نسائی جوالہ جامع الاصول ۱۰۲۷)۔

ہواؤں میں آزادانہ والے پرند، دریا میں تیرنے والی مچھلیاں، صحرا میں پھرنے والے شکار، زمین کے اندر کانوں میں چھپے پڑے سونا اور چاندی اور دیگر معدنیات اور اسی جیسی دوسری چیزیں قبضہ و دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے ناقابل انتفاع ہیں، اس لئے ان کی بیع درست نہیں (دیکھئے: زاد المعاد لابن القیم ۳۳۳)۔ اسی طرح بیع کی وہ تمام صورتیں ممنوع و مخطور ہوں گی جن میں غرر و قماریت کی شکل پائی جائے۔

عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ غي عن بيع الغرر وبيع الحصة (مسلم، ترمذی، أبو داؤد، نسائی جوالہ جامع الاصول ۱۰۲۷)۔

وعنه أن رسول الله ﷺ غي عن الملامسة والمنابطة (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، موطأ جوالہ جامع الاصول ۱۰۲۶)۔ ان کے علاوہ وہ تمام چیزیں جو شرعاً جائز الاستعمال، قابل انتفاع اور غرر سے خالی ہوں مال مستقوم و قابل بیع قرار پاسکتی ہیں عام اس سے کہ وہ اعیان کے قبیل سے ہوں، یا منافع و حقوق کے قبیل سے بشرطیکہ وہاں کوئی اور مخطور شرعی موجود نہ ہو، اور عرف عام میں وہ مال اور ذریعہ تمول کا درجہ حاصل کر لیں۔



والمالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم، والتقويم يثبت بها وبإباحة الانتفاع به شرعاً۔

### حقوق و منافع:

فقہائے حنفیہ منافع و حقوق کو مال کا درجہ نہیں دیتے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان میں مالیت کی شان پائی جاتی ہے، مالیت کی شان یہ ہے کہ وقت ضرورت کے لئے اسے محفوظ کیا جاسکے۔

والتحقيق أن المنفعة ملك لا مال لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوجه الاحتصاص والمال ما من شأنه أن يدخر الانتفاع وقت الحاجة والتقويم يستلزم المالية (رد المحتار ۴۰۲)۔

اس تعلق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ منافع و حقوق کے قبیل کی چیزوں کو بھی اگر اس طرح محفوظ کیا جاسکے کہ بوقت ضرورت اس سے استفادہ ممکن ہو تو وہ بھی مال کا درجہ حاصل کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ عرف میں ذریعہ تمول بن جائیں۔ قابل انتفاع و ادخار ہونے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ وہ شئی تھیلے یا تجوری میں رکھی جاسکے بلکہ فقہاء کی تصریح کے مطابق ہر چیز کا افادہ و ادخار اس کی حیثیت و مناسبت سے ہوگا۔

لأن الانتفاع بالمال يعتبر في كل شئ بما يصلح له (حوالہ مذکور)

اس لئے حق تصنیف، تجارتی نام، کمپنیوں کے نام اور اس جیسی دوسری چیزیں جن سے صاحب حق کا مفاد وابستہ ہوتا ہے اور عرف میں جنہیں جائداد و پورا پرٹی تصور کیا جاتا ہے اور جنہیں قانونی تحفظ فراہم ہوتا ہے یقیناً مستقوم ہوں گی اور ان کی بیع درست ہوگی۔

لأن هذه المنافع مال أو ألحققت به للحاجة (رد المحتار ۴۰۲۲)۔

### حقوق و منافع کی قسمیں اور ان کے احکام:

حقوق کو بنیادی طور پر دو خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے: (۱) ضروریہ، (۲) اصلیہ۔

ضروریہ سے مراد وہ حقوق ہیں جو انسان کو اصل نہیں ہوتے، ان کا مقصد جلب منفعت نہیں بلکہ صرف رفع ضرر ہوتا ہے مثلاً حق شفیعہ، زوجہ کا حق قسم، مخیرہ کا اختیار حق حضانت وغیرہ۔

اس قسم کے حقوق کا واضح حکم یہ ہے کہ یہ کسی طرح اور کسی صورت میں بھی قابل عوض نہیں ہو سکتے۔ نہ ان کی بیع و شراء کی جاسکتی ہے نہ ہی بطور صلح ان سے دستبرداری کا کوئی مالی معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔

قوله كحق الشفعة قال في الأشباه فلو صالح عنها بمال بطلت ورجع ولو صالحت المخيرة بمال لتختاره بطل ولا شئ لها ولو صالح إحدى زوجتيه بمال لتترك نوبتها لا يلزم ولا شئ لها (رد المحتار ۴۰۱۳، الأشباه ۵۰۲۹۹)۔

اس قسم کے حقوق کے ناقابل عوض ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ حقوق صاحب حق کے رفع ضرر کے لئے من جانب شرع حاصل ہوتے ہیں، اس لئے اس سے دستبرداری کے لئے تیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ضرر لاحق نہ ہوگا، اور ضرر کے منقش ہونے سے حق بھی منقش ہو جائے گا، اور جو قیمت وہ حق سے دستبرداری کی وصول کرے گا وہ گویا بلا استحقاق ہوگا۔

### حقوق اصلیہ:

حقوق اصلیہ سے مراد وہ حقوق ہیں جو محض رفع ضرر کے لئے نہیں بلکہ اصل اور بروصلہ کے طور پر حاصل ہوتے ہیں اور صاحب حق کا مفاد ان سے وابستہ ہوتا ہے۔ ایسے حقوق کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں: ۱۔ منتقلہ۔ ۲۔ غیر منتقلہ۔

منتقلہ سے ہماری مراد وہ حقوق ہیں جنہیں ایک دوسرے کی جانب منتقل کیا جاسکے یعنی صاحب حق جس طرح خود اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بعینہ وہی حق استفادہ دوسرے کو منتقل کرنے سے شرعاً یا عرفاً کوئی مانع نہ ہو۔

اور غیر منتقلہ وہ ہیں جو اس کے برعکس ہوں یعنی صاحب حق خود تو اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہو اور اس سے دستبرداری بھی ہو سکتا ہو لیکن شرعاً یا عرفاً وہ حق دوسرے



کو منتقل کرنے پر اسے قدرت حاصل نہ ہو۔

### حقوق غیر منتقلہ:

حق قصاص، حق استمتاع للزوج، حق وراثت، حق ولاء، غلام سے حق مکاتبت وغیرہ حقوق غیر منتقلہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ سب ایسے حقوق ہیں جنہیں صاحب حق خود استعمال کر سکتا ہے، ان سے دستبردار بھی ہو سکتا ہے مگر دوسرے کو یہ حقوق بعینہ منتقل نہیں کر سکتا، قتل عمد کی صورت میں مقتول کا وارث قاتل سے قصاص کا حق رکھتا ہے لیکن اور کو دینے اور منتقل کرنے کا اسے شرعاً اختیار نہیں۔ اسی طرح شوہر کو زوجہ سے استمتاع کا حق حاصل ہوتا ہے مگر یہ حق وہ کسی اور کو نہیں دے سکتا، یہی حال حق وراثت و حق ولاء کا ہے، اسی طرح خاص مکاتبت کے معاملہ میں آقا غلام کو بعینہ وہ حق بالکل منتقل نہیں کرتا جو خود اسے حاصل ہے، نہ ہی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے، مکاتبت کی حقیقت بس اتنی ہے کہ آقا کچھ مال کے عوض اپنا حق رقبہ ساقط کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں غلام کی گردن غلامی کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔

اس قسم کے حقوق کا بھی حکم بالکل واضح ہے کہ ان کی بیع نہیں کی جاسکتی کیونکہ بیع کے لئے بیع کا قابل استبدال و انتقال ہونا ضروری ہے، اور ظاہر ہے کہ مذکورہ حقوق اس وصف سے خالی ہیں، اور جب بیع صحیح نہیں تو ان کا ہبہ و اعارہ بھی صحیح نہ ہوگا۔

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ نهي عن بيع الولاء وهبته (بخاری، مسند، أبو داؤد، ترمذی، نسائی، موطأ بجوالہ جامع الاصول ۱۰۴۸۳)۔

لیکن یہ حقوق اس معنی کر محقوم ہیں کہ بطور صلح ان سے دستبرداری کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے اور قریباً یہ متفق علیہ مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

وخرج عنها حق القصاص وملك النكاح وحق الرق فانه يجوز الاعتياض عنها (رد المحتار ۴۰۱۴)۔

اس قسم کے حقوق کے قابل عوض قرار دیئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ حقوق اصلہ اور بروصلہ کے طور پر حاصل ہوتے ہیں، اس لئے ان سے دستبرداری کا وہ معاوضہ لے سکتا ہے۔

ومثله ما مر عن الاشباه من حق القصاص والنكاح والرق حيث صح الاعتياض عنه لأنه ثابت إصالة لا على وجه رفع الضرر عن صاحبه (رد المحتار ۴۰۱۵)۔

نزول عن الوظائف کا مسئلہ بھی اسی قسم کے حقوق کے ذیل میں آتا ہے، بعض فقہاء نے اسے حق شفعہ پر قیاس کرتے ہوئے ناقابل عوض قرار دیا ہے۔

وفي الاشباه لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف (درمختار علی ہامش رد المحتار ۴۰۱۴)۔

لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اسے حق قصاص پر قیاس کیا جائے اور ناقابل بیع قرار دینے کے باوجود اسے قابل عوض قرار دیا جائے، فرق صرف یہ ہے کہ حق قصاص خاص شریعت کا عطا کردہ ہے جب کہ وظائف کا دار و مدار تقرر اور عرف و تعامل پر ہے، نیز حق قصاص کا قابل عوض ہونا قطعی اور نزول عن الوظائف کا قابل عوض ہونا ظنی ہوگا (دیکھئے: رد المحتار ۴۰۱۴)۔

سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے طرز عمل سے بھی نزول عن الوظائف بالعوض پر استدلال کیا گیا ہے۔

واستدل بعضهم للجواز بنزول سيدنا الحسن ابن سيدنا علي رضي الله عنهما عن الخلافة لمعاوية على عوض وهو ظاهر (رد المحتار ۴۰۱۵)۔

علامہ عینی فرماتے ہیں: وفيه جواز خلع الخليفة نفسه إذا رأى في ذلك صلاحاً للمسلمين وجواز أخذ المال على ذلك واعطاؤه بعد استيفاء شرائطه (عمدة القاری ۲۲، ۲۰۸)۔

رہ گیا ”عوض عن الحقوق المجردة“ کے عدم جواز کا فقہی ضابطہ تو نہ یہ عام ہے نہ علی الاطلاق، جن حقوق مجردہ کو شریعت نے واضح طور پر قابل عوض قرار دیا ہے وہ

قطعی طور سے اس ضابطے سے مستثنیٰ ہیں، اسی طرح ان کے نظائر کو نیز ان حقوق کو جو عرف و تعامل میں قابل عوض بن جائیں، اس ضابطہ عام سے مستثنیٰ قرار دینا اقرب الی الصواب ہے بشرطیکہ کوئی اور منظور شرعی موجود نہ ہو۔

### حقوق منتقلہ:

حقوق منتقلہ جو قابل استبدال و انتقال ہوتے ہیں اور جنہیں صاحب حق دوسروں کو منتقل کر سکتا ہے ان کی بھی متعدد اقسام ہو سکتی ہے:

۱۔ محنت یعنی جسمانی یا دماغی طاقت و توانائی ۲۔ حقوق متعلقہ اعیان ۳۔ حق اسبقیت و حق اختصاص۔

### محنت:

انسانی محنت و خدمت چاہے وہ جسمانی ہو یا ذہنی و فکری یقینی طور سے مستقوم ہے، ایک مزدور اپنی جسمانی محنت کا معاوضہ لیتا ہے، ایک مدرس اپنی تعلیمی خدمت کا صلہ پاتا ہے، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور بیرسٹر اپنی فکری توانائی، دماغی صلاحیت اور پیشہ ورانہ مہارت سے فائدہ پہنچا کر اس کی قیمت وصول کرتے ہیں۔

لیکن انسانی محنت کو بالکل فروخت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بیع کا معاملہ مؤبد ہوتا ہے اور خریدنے والا بیع کا مستقلاً اور بالکل مالک ہو جاتا ہے، اس لئے آزاد انسان کی محنت و خدمت کی بیع رقیقیت کے مترادف ہے جو شرعاً جائز نہیں ہو سکتی۔ ہاں موقت طور پر محنت کی بیع کی جاسکتی ہے جو اصطلاحاً اجارہ کے ذیل میں آئے گا۔ انسانی محنت کے مبادلہ بالمال کی بعض حدود و قیود کے ساتھ شریعت نے مکمل آزادی دی ہے۔

انسانی محنت و خدمت کو عام طور پر دولت شمار نہیں کیا جاتا، مگر فی الواقع یہ بڑی اہم دولت ہے، اور دنیا میں اکثریت ایسے ہی افراد کی ہے جن کی معاشی ضروریات کا انحصار اسی محنت پر ہے اور محنت و خدمت ہی کے مبادلہ سے وہ اسباب معیشت فراہم کرتے ہیں۔ محنت، معاشی جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے۔

محنت کا نتیجہ کبھی تو مادی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً بڑھتی ہوئی کرسی بنائی، معمار نے مکان تعمیر کیا، کبھار نے گھڑا بنایا، سنار نے زیور بنایا، لوہار نے پھاوڑا تیار کیا تو ان تمام صورتوں میں کاریگر کو اس کی محنت کی اجرت ملی اور آجر کو خدمت کے نتیجے میں مذکورہ سامان مادی شکل میں حاصل ہوئے۔ یہاں مبادلہ کی صورت بالکل واضح و مشاہد ہے۔ اور کبھی محنت کا نتیجہ مادی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا مثلاً ڈاکٹر نسخہ تجویز کرتا ہے، وکیل و بیرسٹر قانونی مشورے دیتے ہیں اور اپنے موکل کے حق میں بحث کرتے ہیں تو آجر کو تو ان کی فیس اپنی جیب سے ادا کرنی پڑتی ہے مگر خود اس کو مادی شکل میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ بظاہر یہاں مبادلہ یکطرفہ ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ آجر نے اپنی گاڑھی کمائی سے جو فیس ادا کی وہ اکارت گئی اور اسے بدلے میں کوئی فائدہ نہیں ہوا، یہاں مبادلہ معنوی ہونے کے باوجود افادہ بالکل واضح ہے۔

محنت و خدمت کے مبادلہ کی یہ سب وہ صورتیں ہیں جو زمانہ قدیم سے رائج ہیں اور ان میں نہ کوئی اشتباہ ہے نہ اختلاف کی کوئی گنجائش، رقیقہ جیسی خالص غیر مادی چیز پر اجرت کا جواز خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

### حق تصنیف و حق ایجاد:

محنت ہی کی آغوش سے پیدا ہونے والے بعض وہ حقوق و منافع بھی ہیں جو بالکل نئے اور دور جدید کی پیدا کردہ ہیں۔ نئے دور کی نئی ترقیات اور مشینی ایجادات نے بعض ایسے خالص غیر مادی حقوق و منافع کو مال کا درجہ دیدیا ہے جن کا پہلے کوئی تصور نہ تھا اور بلا جھجک یہ چیزیں بیچی اور خریدی جاتی ہیں اور ان کا مال کے ذریعہ مبادلہ ہوتا ہے۔

ایک شخص سوچتا ہے، تجربات کرتا ہے، نتائج نکالتا ہے اور پھر انسانی راحت کے لئے کوئی فارمولہ ایجاد کرتا ہے، اب اس فارمولہ کو اگر کسی صنعت کار کے حوالہ کر دیا جائے تو وہ اس فارمولہ کو عمل میں لا کر کوئی شئی بنائے گا، پھر فیکٹریوں سے یہ مال بازاروں میں جائے گا اور بازار سے صارفین تک پہنچے گا۔

ایک مصنف محنت کرتا ہے، اپنی فکر، اپنا وقت اور بسا اوقات اپنا سرمایہ بھی خرچ کرتا ہے، شہروں شہروں سفر کرتا ہے اور علم و تحقیق اور فکری محنت کے ذریعہ ایک کتاب تصنیف کرتا ہے، ادیب اپنی ادبی تخلیقات پیش کرتا ہے، اسے صنعت کار، کاغذ، روشنائی پریس اور دوسرے صنعتی آلات کے ذریعہ قابل استفادہ بناتا ہے، پھر وہ کتاب مارکیٹ میں آتی ہے اور بازار سے قارئین تک پہنچتی ہے (الفاظ قاضی مجاہد الاسلام صاحب، بحث و نظر، شمارہ ۳)۔



اس سلسلہ میں اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ مصنف، محقق اور موجد اگر کسی فرد یا ادارہ کے لئے معاہدہ کے تحت معاوضہ پر کام کریں تو یہ جائز ہوگا اور جس فرد یا ادارہ نے اجرت پر کام کرایا ہے وہ اس تصنیف، تحقیق اور ایجاد کے مالک ہوں گے اور اس سے حسب منشاء فائدہ اٹھانے کے قانوناً و شرعاً حقدار ہوں گے۔

یہاں جو چیز محل نزاع اور قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ مصنف و محقق جو علمی و فکری کارنامے انجام دیتے ہیں یا ادیب و فنکار جو ادبی و فنی تخلیقات پیش کرتے ہیں کیا انھیں یہ حق حاصل ہے کہ اپنی تخلیقات کی نشر و اشاعت اور تحقیقات کی اساس پر مصنوعات تیار کرانے کا حق اپنے لئے محفوظ کرالیں اور دوسروں کو اس حق سے محروم کر دیں، یا وہ حقوق کسی اشاعتی و صنعتی ادارہ کے لئے اس شرط پر محفوظ کر دیں کہ وہ ادارے ان کی تحقیق و تصنیف کی اساس پر حاصل ہونے والے منافع کا کچھ حصہ رائلٹی کے طور پر مصنف و محقق کو باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں۔

بعض اہل علم و فتویٰ اس قسم کے حق اور اس کے جواز کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک کسی خاص فرد یا ادارہ کے لئے اس قسم کا حق محفوظ کر لینا علم و حکمت کی اشاعت پر ایک بجا قدغن اور دوسروں کو ایک جائز حق اور مباح تصرف سے روکنے کی ناروا کوشش ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حق تصنیف کو ”حق ناحق“ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ:

”کسی شخص کو مباح تصرف سے روکنے کی دو وجہ ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کا یہ تصرف کسی غیر کی ملک میں بلا اس کی اجازت کے ہو، دوسرے یہ کہ اس تصرف سے کسی شخص یا جماعت کا ضرر ہوتا ہو اور مسئلہ زیر بحث میں یہ دونوں وجہ مفقود ہیں، اول تو اس لئے کہ تصنیف کو شائع کرنے والا ایجاد کو بنانے والا مصنف یا موجد کی کسی ملک میں تصرف نہیں کرتا بلکہ کتابت خود کرتا ہے، کاغذ خود فراہم کرتا ہے، طباعت وغیرہ کی اجرت خود دیتا ہے اور نقل کرنے کے لئے جو کتاب لیتا ہے وہ بھی خرید کر یا کسی دوسرے مباح طریقے سے ہی حاصل کرتا ہے، رہا حق تصنیف، سونہ وہ کوئی مال ہے نہ ملکیت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ البتہ موجودہ دور نے جس طرح اور بہت سی ناحق چیزوں کا نام حق رکھ دیا ہے اس میں یہ حق تصنیف و ایجاد بھی داخل ہے، اور وجہ ثانی اس لئے مفقود ہے کہ تصنیف کو شائع کرنے والا مصنف کو یا کسی دوسرے شخص کو شائع کرنے سے نہیں روکتا، جو موجب ضرر ہو، البتہ دوسری جگہ شائع ہو جانے سے مصنف یا موجد کی گراں فروشی کے غلو کا انسداد ہوتا ہے کہ اس کی من مانی منفعت پر لوگ مجبور نہیں ہو سکتے، سوا اول تو یہ ضرر نہیں عدم نفع بلکہ تقلیل نفع ہے، اور ضرر عدم نفع میں فرق ظاہر ہے (جوہر الفقہ ۳۲۹۲)۔

لیکن بہت سے اہل علم بلکہ اکثریت کار جہان مصنف و موجد کے حق تصنیف و حق ایجاد کو تسلیم کرنے کی طرف ہے، اور موجودہ حالات میں مسئلہ کے حقیقت پسندانہ جائزے اور مصالح و مفاسد کے مختلف پہلوؤں کا تجربہ کرنے کے بعد اسی رائے کو ترجیح دینا زیادہ درست اور قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔

پریس اور جدید طباعتی سہولیات اور صنعتی آلات کی ایجاد سے پہلے مسئلے کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ پہلے جو لوگ علمی و تخلیقی کارنامے انجام دیتے تھے ان کا مقصد صرف خدمتِ خلق و افادہ عام ہوتا تھا اور اس سے کوئی خاص تجارتی غرض وابستہ نہیں ہوتی تھی، پھر اس وقت موجودہ طباعتی و صنعتی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے حق اشاعت و صنعت کے محفوظ کیے جانے کی کوئی ضرورت تھی نہ اس کا کوئی فائدہ، لیکن آج صورت حال بالکل دگرگوں ہے۔ آج تخلیقی کاموں کا مقصد جہاں اشاعت علم و حکمت ہے وہیں ان سے مالی مفادات و تجارتی اغراض بھی وابستہ ہوتے ہیں، اگر ہر شخص کو ان کی اشاعت کی اجازت دیدی جائے تو اس طرح کے کام کرنے والوں کے مفادات مجروح ہوں گے، یہ قرین انصاف نہیں کہ اہل قلم و اہل تحقیق کی محنت و عرق ریزی کا تو کوئی صلہ نہ ملے اور دوسرے لوگ اس کی اساس پر مالامال ہو جائیں۔

ایک مصنف نے طویل جدوجہد کے بعد ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی کتاب تیار کی، اس راہ میں اس نے اپنی بہترین علمی و تحقیقی صلاحیت، ذہن و فکر کی توانائی اور قیمتی اوقات کو خرچ کیا اور تحقیق و تمحیص اور مواد کی فراہمی میں اسے مالی مصارف بھی برداشت کرنے پڑے، اب ظاہر ہے کہ اپنی تصنیف سے فائدہ اٹھانے اور نشر و اشاعت کے ذریعہ اس سے مالی منفعت حاصل کرنے کا اسے پورا حق حاصل ہے، اب اگر اسے محفوظ کر لینے کی اجازت نہ دی جائے اور ہر شخص کو اس میں مداخلت کی کھلی چھوٹ دیدی جائے تو اس میں مصنف کا سخت مالی نقصان اور خسارہ ہوگا اور اس طرح تحقیقی کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی بھی ہوگی جو مفادات عامہ کے حق میں سخت مضر ہے۔

بہر حال حق تصنیف و حق ایجاد آج عرف عام میں مال مستقوم کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور اب یہ حقوق قابل احراز بھی ہیں اور قابل استفادہ و استبدال بھی، اس لئے شرعاً بھی اسے مال مستقوم قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کا معاوضہ درست قرار دیا جاسکتا ہے، چاہے یہ معاوضہ بطریق اجارہ رائلٹی کی صورت میں ہو یا بطریق بیع ناشر کے حق میں طبع و نشر کے جملہ حقوق سے دستبرداری کی شکل میں، اور جب حق تصنیف قابل بیع ہے تو اس کا بیع، اجارہ اور اعارہ بھی صحیح ہوگا اور اس میں وراثت



بھی جاری ہوگی۔ ہاں جو کتابیں پرانی ہوں یا جن کے مصنفین نے انہیں وقف عام کر دیا ہو ایسی کتابیں مباحث عامہ کے قبیل سے شمار ہوں گی، اور ہر شخص ان کی طباعت و اشاعت اور ان کے منافع سے مستفید ہو سکتا ہے۔

### حقوق متعلقہ اعیان:

وہ حقوق جو اعیان مالیہ سے متعلق ہیں اور انہیں کے تابع ہو کر حاصل ہوتے ہیں، مثلاً مکان کی حق رہائش، دابہ پر حق رکوب، غلام کی حق خدمت، حق مرور، حق شرب، حق قرار وغیرہ، قابل عوض ہیں یا نہیں، اور ان کی بیع درست ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں اتنی بات تو طے ہے کہ بطور اجارہ ان کا معاوضہ لینا صحیح ہے، اسی طرح بطور صلح بھی ان کا معاوضہ لینا درست ہے کیونکہ جن چیزوں پر عقد اجارہ درست ہے ان پر صلح بھی جائز ہے۔

والصلح جائز عن دعوی الاموال لانه في معنى البيع على ما مر والمنافع لانها تملك بعقد الإجارة فكذا بالصلح والأصل أن الصلح يجب حمله على أقرب العقود إليه وأشبهها به احتيالا لتصحيح تصرف العاقد ما أمكن (مدایہ ۲۲۰)۔ لیکن فقہائے حنفیہ کے نزدیک اجارہ چونکہ عقد لازم نہیں ہے اور صلح عن المنافع بھی اجارہ ہی کے معنی میں ہے اس لئے اجارہ کی طرح صلح عن المنافع بھی انقضاء مدت یا فوت احد المتعاقدين کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

بطلان صلح کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے: منها هلاك أحد المتعاقدين في الصلح عن المنافع قبل انقضاء المدة لانه بمعنى الإجارة وانها تبطل بموت أحد المتعاقدين (بدائۃ ۶۵۲)۔

البتہ وہ صلح جس میں حق کا مبادلہ نہ ہو بلکہ صرف اسقاط حق کے طریق پر ہو اس میں فسخ کا احتمال نہیں ہے (ایضاً)۔

وہ منافع و حقوق جو قابل مبادلہ ہیں ان پر صلح کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں، اگر وہ موقت ہے تو وہ اجارہ ہوگا اور اگر موبد ہے تو بیع کے حکم میں ہوگا چاہے اسے جو بھی کہا جائے، یہی بات اجارہ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے کہ عقد اجارہ اگر دائمی منافع پر ہو تو یہ حقیقتاً اجارہ نہیں بلکہ بیع ہے، چاہے اسے عرف میں اجارہ ہی سے کیوں نہ موسوم کیا جائے۔

اس قسم کے منافع و حقوق کی بیع اعیان سے الگ کر کے جائز ہے یا نہیں، یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ شوافع و حنابلہ کے ہاں تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں کیونکہ ان کے نزدیک اعیان و منافع دونوں یکساں طور پر قابل بیع و شراء ہیں۔

يجوز أن يشتري ممرًا في دار وموضعاً في حائطه يفتحه باباً وبقعة يحفرها بئراً وعلو بيت يبنى عليه بنيانا موصوفاً فإن كان البيت غير مبني لم يجز في أحد الوجهين والآخر يجوز إذا وصف العلو والسفل (المقنع لابن قدامه المقدسی الحنبلی ۲۱۲۸)۔

فقہائے مالکیہ اگرچہ اصولاً بیع کو اعیان مالیہ کے ساتھ مقید کرتے ہیں مگر ان کے ہاں بھی اس میں کافی توسع نظر آتا ہے۔ بہت سی جزئیات و نظائر ان کے ہاں بھی ایسی موجود ہیں جن میں حقوق مجردہ کی بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

جاء بيع هواء أي فضاء فوق هواء بأن يقول شخص لصاحب أرض بعني عشرة أذرع مثلاً فوق ما تبنيه بأرضك إن وصف البناء الأسفل والأعلى لفظاً أو عادة للخروج من الجهالة والغرر و جاز عقد على غرز جذع في حائط الآخر بيعاً وإجارة (الدسوقي على الشرح الكبير ۲۱۴ بحوالہ مضمون مولانا محمد تقی عثمانی)۔

فقہائے حنفیہ کی رائے اس سلسلہ میں زیادہ واضح نہیں، وہ اصولی طور پر حقوق مجردہ کی بیع کو درست نہیں سمجھتے، تاہم وہ اسے کلی و حتمی ضابطہ کے طور پر تسلیم نہیں کرتے، بہت سے فقہاء نے بہت سے حقوق مجردہ کو بعض منصوص نظائر پر قیاس کرتے ہوئے اور عرف و تعامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے قابل عوض و قابل بیع قرار دیا ہے، چنانچہ حق مرور، حق شرب وغیرہ کے بیع کا جواز فقہائے حنفیہ کے اقوال میں مصرح ہے اگرچہ اختلاف کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

فقہائے حنفیہ کے مجموعی طرز عمل سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جو حقوق اصلہ ثابت و مقرر ہیں اگر وہ قابل استبدال ہوں اور ان کی بیع و شراء کا عام رواج ہو جائے اور ان میں مالیت کی شان پیدا ہو جائے تو ان کی بیع و شراء کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہاں کوئی اور منظور شرعی نہ پایا جائے یعنی کسی چیز کی بیع کو محض اس وجہ سے

کہ وہ اعیان کے قبیل سے نہیں بلکہ مجرد حق و منفعت ہے مطلقاً ممنوع و ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا (دیکھئے: رد المحتار ۴/۱۱۸، البسوط ۱۳/۱۳۶)۔

اس پر علامہ سرخسی نے اعتراض کیا ہے، مگر اس لئے نہیں کہ یہ مجرد حق و منفعت ہونے کی بنا پر ناقابل بیع ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے بقول اس میں غرر و جہالت ہے جو شرعاً محظور و ممنوع ہے، وہ لکھتے ہیں: فللعرف الظاهر كان يفتى بجوازه ولكن العرف انما يعتبر فيما لانص بخلافه والنهي عن بيع الغرر نص بخلاف هذا العرف فلا يعتبر (البسوط للسرخسی ۱۳، ۱۴)۔

علامہ بابر ترقی کی عبارت اس سلسلہ میں اور زیادہ واضح ہے: وانما لم يجز بيع الشرب وحده في ظاهر الرواية للجهالة لا باعتبار انه ليس بمال (العناية بهامش فتح القدير ۵، ۲۰۲)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: ورأيت بخط بعض العلماء عن المفتي أبي السعود أنه أفتى بجواز أخذ العوض في حق القرار والتصرف وعدم صحة الرجوع وبالجملة فالمسئلة ظنية والنظائر متشابهة وللبحث فيها مجال (رد المحتار ۴، ۱۵)۔

بدل خلو:

پگڑی کا مسئلہ بالکل نیا تو نہیں لیکن آج جس طرح اس کا عام رواج ہو گیا اور مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ایک ضرورت کی شکل اختیار کر لی ہے ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ علامہ ابن نجیم کے زمانے میں بلکہ اس سے پہلے بھی اس کا سراغ ملتا ہے لیکن اس کی حیثیت عرف عام کی نہیں تھی بلکہ صرف بعض شہروں میں اس کا رواج تھا اور اسی عرف خاص کی بنیاد پر علامہ ابن نجیم نے اس کے جواز کے فتوے کی سفارش کی:

الحاصل أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص ولكن أفتى كثير من المشائخ باعتباره فأقول على اعتباره ينبغى أن يفتى بأن ما وقع في بعض أسواق القاهرة من خلو الحوانيت لازم ويصير الخلو في الحانوت حقاله فلا يملك صاحب الحانوت إخراجه منها ولا إجارها لغيره (الأشباه والنظائر ۱۲۵)۔

دور حاضر میں پگڑی کے رواج نے عموم بلوئی کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اب یہ کسی خاص جگہ کا عرف نہیں بلکہ اس نے عرف عام کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اور دنیا کے بیشتر ملکوں اور شہروں کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، کرایہ داری کے موجودہ قوانین نے مسئلہ کی نزاکت و سنگینی کو اور بڑھا دیا ہے جس کی وجہ سے پگڑی کا طریقہ معاشرہ کی ایک ناگزیر ضرورت اور مجبوری بن گیا ہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنا مکان کرایہ پر دیتا ہے تو موجودہ قوانین کی وجہ سے وہ مکان مستقلاً اس کے قبضہ سے نکل کر کرایہ دار کے قبضہ میں چلا جاتا ہے، ایک مرتبہ مکان یا دوکان کرایہ پر دینے کے بعد دوبارہ اس پر قبضہ کرنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے، صاحب مکان نے پگڑی لی ہو یا نہ لی ہو کرایہ داری کی مرضی کے بغیر وہ مکان خالی نہیں کر سکتا۔

مروجہ پگڑی اسی نقصان کی تلافی کی گویا ایک شکل ہے، مکان کرایہ پر دیتے وقت صاحب مکان برضا و رغبت اپنے حق قبضہ سے مستقلاً دستبرداری کا معاوضہ پگڑی کی صورت میں وصول کر لیتا ہے، گویا صاحب مکان کرایہ دار کے ہاتھ اپنا حق قبضہ مستقلاً فروخت کر دیتا ہے اور پگڑی کی رقم اسی کا معاوضہ اور زرخشن ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں ضرورت، مصلحت اور عرف عام کے لحاظ سے بیع حقوق کی دیگر نظائر پر قیاس کرتے ہوئے مروجہ پگڑی کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کی مصالحت ہے جو باہمی رضامندی سے وجود میں آتی ہے، اور اس میں کسی نص شرعی یا واضح اصول شرعی کی مخالفت بھی نہیں، اور عرف و تعامل کی ضرورت کا تقاضہ بھی ہے، اس لئے ناجائز قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، اور کہا جاسکتا ہے کہ مروجہ پگڑی ”دائمی حق قبضہ“ کا بدلہ ہے اور ماہانہ کرایہ ”حق انتفاع“ کا معاوضہ۔ یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ”حق قبضہ“ اور ”حق انتفاع“ دونوں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، کیونکہ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ حق قبضہ حاصل ہونے کی صورت میں ضروری نہیں کہ حق انتفاع بھی حاصل ہو، اسی طرح حق انتفاع کے لئے حق قبضہ ضروری نہیں، مثال کے طور پر مرتبہ کو شئی مرہون پر قبضہ کا حق حاصل ہوتا ہے مگر حق انتفاع اسے حاصل نہیں ہوتا، اور باندی کے شوہر کو حق استمتاع حاصل ہوتا ہے مگر حق قبضہ اسے حاصل نہیں ہوتا۔

عام حالات میں اجارہ فقہ حنفی کی رو سے عقد لازم نہیں ہے مگر پگڑی والی خاص صورت میں فقہائے حنفیہ کے اصول پر بھی عقد اجارہ لازم قرار پائے گا۔ کیونکہ باہمی رضامندی سے کرایہ دار کا مستقل حق قبضہ اس مکان سے متعلق ہو چکا ہے اور صاحب مکان اس کا معاوضہ بھی لے چکا ہے۔ فقہائے حنفیہ نے



صراحت کی ہے کہ اگر کوئی کرایہ دار یا کاشتکار ناظر اوقاف کی اجازت سے وقف کی زمین پر کوئی عمارت بنائے یا درخت لگائے یا گہری کھائی والی زمین کو پاٹ کر برابر کرے تو وہ اس زمین پر مستقل قبضہ کا حقدار ہو جاتا ہے اور اسے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔

قد صرح علماء نا بأن لصاحب الكردار حق القرار وهو أن يحدث المزارع أو المستأجر في الأرض بنائاً أو غرساً أو كبساً بالتراب بإذن الواقف أو الناظر فيبقى في يده (رد المحتار ۴۰۱۶)۔

اسی طرح اگر صاحب زمین نے کرایہ کے مکان کی تعمیر کے لئے پگڑی کی رقم لی پھر بعد تعمیر وہ مکان کرایہ دار کو دیدیا تو اس صورت میں بھی اجارہ عقد لازم ہوگا اور کرایہ دار کو ”حق قبضہ“ یا ”حق قرار“ حاصل ہوگا، اور جب تک وہ مناسب کرایہ ادا کرتا رہے مکان سے اس کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔

وقد يقال إن الدراهم التي دفعها صاحب الخلو للواقف واستعان بها على بناء الوقف شبهة بكس الأرض بالتراب فيصير له حق القرار فلا يخرج عن يده إذا كان يدفع أجر المثل (رد المحتار ۴۰۱۷)۔

اسی طرح اگر کرایہ دار نے ناظر وقف کی اجازت سے دکان کی مرمت کرائی اور اس کے لوازم کو پورا کیا تو اسے بھی حق قرار حاصل ہوگا اور وہ مکان اس سے خالی نہیں کرایا جائے گا۔

ومثله ما لو كان يرمم دكان الوقف ويقوم بلوازمها من ماله بإذن الناظر (حوالہ مذکور)۔  
اس قسم کی مختلف صورتوں کے متعلق علامہ حموی واضح طور سے فرماتے ہیں:

وحيث أنه أخذ الخلو ويورث له وأما كونه إجارة لازمة فهذا لانزاع فيه (حموی علی الاشباہ ۱۲۶)۔  
اسی قیاس پر مروجہ پگڑی کے ساتھ عمل میں آنے والا اجارہ لازم، بدل خلو جائز اور حق خلو متوارث ہوگا۔ کیونکہ جب کرایہ دار نے پگڑی کی رقم کے عوض صاحب مکان سے مستقل حق قبضہ و حق قرار حاصل کر لیا تو اس کی حیثیت صاحب کردار کی ہی ہوگی اور اس طرح گویا پگڑی کی رقم دے کر مکان کی ملکیت میں ایک حد تک وہ بھی شریک ہو گیا، اور یہ معاملہ اور مستقل حق قبضہ کا تبادلہ بالمال چونکہ باہمی رضامندی سے ہوا ہے اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں، پگڑی کی رقم کو رشوت نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ یہ حق معاوضہ ہے، اور حق کے عوض میں جو مال ہو وہ رشوت نہیں ہے۔

وجه الاندفاع ما علمت من أنه صلح عن حق كما في نظائره والرشوة لا تكون بحق (رد المحتار ۴۰۱۵)۔

علویا مکان کے اوپر حق تعمیر کی بیع:

فقہائے حنفیہ کے ہاں حق تعلی کی بیع کے جواز کی صراحت نہیں بلکہ عام طور پر اسے ناجائز ہی کہا گیا ہے، البتہ علامہ خالد اتاسی نے حق تعلی کو بھی حق مرور و حق شرب کی طرح قابل عوض قرار دیا ہے، کیونکہ یہ سب ہی حقوق اصلہ ثابت ہیں اس لئے اس کا معاوضہ لینا درست ہے، لیکن یہ معاوضہ بطریق بیع نہیں بلکہ علی وجہ الفراع والاسقاط ہوگا (شرح الجملہ للاتاسی ۱۲۱/۳ بحوالہ مضمون مولانا محمد تقی عثمانی)۔

فقہائے حنفیہ نے عام طور پر حق مرور اور حق تعلی میں فرق کیا ہے اور پہلے کو جائز اور دوسرے کو ناجائز لکھا ہے۔ اسی طرح حق مرور اور حق مسیل میں بھی فرق کیا گیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۱۱۸/۴)۔

اس تعلیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پانی بہنے کا زمینی راستہ اگر معلوم و متعین ہو تو حق مرور کے قیاس پر حق مسیل کی بیع بھی جائز ہوگی۔  
لیکن اگر چھت کے اوپر سے پانی گزارنا ہو تو یہ حق تعلی کی نظیر ہے اور حق تعلی ان کے بقول چونکہ محل سے متعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق صرف فضا سے ہے جو اعیان مالیہ کے حکم میں نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی بیع ناجائز ہوگی، یہاں گویا بنیادی نکتہ یہ ہوا کہ جو حقوق اعیان مالیہ سے متعلق ہوں وہ اعیان کے حکم میں ہو کر قابل بیع قرار دیے جاسکتے ہیں لیکن جو حقوق ایسے نہ ہوں وہ قابل بیع نہ ہوں گے کیونکہ وہ اعیان مالیہ کا درجہ نہیں پاسکتے۔

حق تعلی کے سلسلہ میں یہ ہے حنفیہ کا طرز فکر و استدلال، اور یہ ہیں ان کے اقوال و تصریحات۔ جہاں تک دوسرے مکاتب فقہ کا تعلق ہے تو ان میں سے بیشتر کی رائے یہ ہے کہ مکان کے اوپر تعمیر کرنے کے لئے فضا کی بیع میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ تعمیر کی نوعیت اور اس کے حدود متعین ہوں، حنا بلکہ و شوائع کے نزدیک تو اس کے



جواز میں کلام ہی نہیں ہو سکتا، مالکیہ کے متعلق البتہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کے ہاں یہ بیع جائز ہوگی، لیکن مدونہ کبریٰ میں خود امام مالکؒ کے شاگرد ابن القاسم کا اس سلسلہ میں جو ارشاد نقل کیا گیا ہے وہ حق تعالیٰ کی بیع کے جواز کا واضح اعلان و اظہار ہے بلکہ اس میں صراحتہً فضا کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھئے: المدونہ الکبریٰ ۱۰/۱۲۱)۔

جو حضرات حق علویا فضا کو قابل عوض و معاوضہ سمجھتے ہیں اور اس کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ زمین و مکان کی فضا بھی زمین کی ملکیت ہے اور اس سے انتفاع و استفادہ کا اسے پورا استحقاق ہے۔ چنانچہ اگر کسی مملوکہ زمین کی فضا میں کسی کے درخت کی شاخیں بڑھ کر چلی جائیں تو ضروری ہے کہ صاحب درخت بڑھی ہوئی شاخوں کو کاٹ کر یا دوسری طرف پھیر کر صاحب زمین کی مملوکہ فضا کو خالی کر دے (دیکھئے: المغنی ۳/۵۳۹، ۵۴۰، ۵۵۳، کشاف القناع ۳/۳۹۱)۔

موجودہ حالات میں یہی رائے زیادہ قابل ترجیح ہے اور اس کی معقول بنیاد بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کی زمین ہے وہ اس کی فضا کا بھی مالک ہے اور اس سے انتفاع کا اس کو مکمل حق حاصل ہے، وہ اپنی زمین میں جتنی اونچائی تک چاہے اور جتنی منزلیں بھی چاہے بنا سکتا ہے، یہ حق اصالتہً ثابت و مقرر ہے اور قابل انتفاع بھی ہے کہ جس طرح آدمی خود اپنے مکان کی چھت پر مکان تعمیر کر سکتا ہے ایسے ہی حق دوسروں کو بھی منتقل کر سکتا ہے، پھر حاجت و ضرورت اور عرف و تعامل کا بھی تقاضہ ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ توسع سے کام لے کر حق تعالیٰ کی بیع کو جائز قرار دیا جائے۔ عدم جواز کی صرف یہ بنیاد کچھ زیادہ معقول نہیں کہ وہ عین ارض ہی سے متعلق نہیں بلکہ صرف فضا سے متعلق ہے کیونکہ حق تعالیٰ فضا سے متعلق سہی مگر خود فضا تو عین ارض ہی سے متعلق ہے، اس طرح حق تعالیٰ کا تعلق بھی گویا عین ارض ہی سے ہوا، اس لئے اسے بھی ضرورتاً عین کے درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

البتہ آج بڑے شہروں میں علویا فضا کی بیع کا جو عام رواج ہو چلا ہے شاید یہ پہلے نہیں تھا۔ پہلے مسئلہ کی سادہ سی صورت یہی رہی ہوگی کہ ایک آدمی اپنے مکان کی چھت پر دوسرے شخص کو کچھ معاوضہ لے کر مکان بنانے کی اجازت دیدے۔ کثیر منزلہ عمارتیں بنانا اور ہر ایک منزل یا اس کی متعینہ فضا ایک الگ شخص کے ہاتھ فروخت کرنا شاید موجودہ عہد کی پیداوار ہے، جو بڑے شہروں میں آبادی کی کثرت، جگہ کی قلت اور رہائش کی دشواری و تنگی کے باعث رواج پذیر ہوا ہے۔ اس میں ایک دشواری اور پیچیدگی یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص نے اپنے مکان کے اوپر پانچ منزلوں کے لئے دس دس فٹ بلندی کی فضا کو مختلف اشخاص کے ہاتھ فروخت کیا تو ظاہر ہے کہ ہر اوپر والی منزل نیچے والی کی چھت کے اوپر ہی تعمیر ہوگی، یہ دوسرے کے ملک میں تصرف ہے جو شرعاً بلا اس کی مرضی کے درست نہیں۔

یہ ایک طرح کا ضرر ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ ایسا قابل لحاظ ضرر نہیں جس کی بنا پر ضرورت و مصلحت عامہ کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ ایسی چیز ہے جو ہر ایک خریدار کی ضرورت و مجبوری ہے، اگر اوپر والے کا مکان نیچے والے کی چھت پر ہے تو اس کا مکان بھی کسی اور کی چھت پر ہوگا، پھر ہر شخص برضا و رغبت اسے قبول کرتا ہے، اس لئے مصالح عامہ کے پیش نظر اسے گوارا کر لیا جائے گا اور باہمی مصالحت سے طے پانے والے اس معاملے کو درست قرار دیا جائے گا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حق علوی کی بیع میں نہ کسی نص شرعی کی مخالفت ہے نہ کسی مصلحت شرعی کا ضیاع، اس لئے ضرورت و حاجت اور عرف و تعامل کے پیش نظر اسے جائز قرار دینے میں کوئی حرج نہیں۔

### حق اسبقیت:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص غیر مملوکہ بیکار و خراب پڑی ہوئی زمین کو زندہ کرنے اور اپنی محنت سے اسے قابل کاشت بنائے تو وہ زمین اس کی ہو جائے گی۔ عن عائشة رضی اللہ عنہا أن النبی ﷺ قال: من عمر أرضاً لیست لأحد فهو أحق (بخاری، ترمذی، ابو داؤد بحوالہ جامع الاصول ۱/۲۲۲)۔

اس سے یہاں اصول مستنبط ہوتا ہے کہ جو چیزیں مباحات عامہ کے قبیل سے ہیں اور ان پر کسی کی ملکیت نہیں، ایسی چیزوں پر اگر کوئی شخص مکمل قبضہ کر لے اور اسے کارآمد بنائے تو وہ شئی گویا اس کی ملک ہو جاتی ہے اور اس سے انتفاع و استفادہ کا وہ مکمل حقدار بن جاتا ہے، اور وہ چاہے تو اسے فروخت بھی کر سکتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص دریا کا پانی اپنے بزن میں محفوظ کر لے، یا اس کی مچھلی، یا فضا میں آزاد اڑنے والی چڑیا یا جنگلی شکار کو پکڑ کر اس پر قبضہ کر لے تو یہ چیزیں اس کی ملک ہو جاتی ہیں اور انہیں وہ بیچ بھی سکتا ہے۔ البتہ یہ چیزیں چونکہ اصلاً مباحات عامہ کے قبیل کی ہیں، مذکورہ صورتوں میں اگر کوئی شخص چرائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ حدود میں معمولی قسم کے شبہ کا بھی فائدہ مجرم کو ملتا ہے (ہدایہ ۲/۷۰۳)۔

احیاء موات کی صورت میں بھی آدمی زمین کا مالک ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ پہلے سے کسی کی ملک میں نہ ہو۔ احیاء آدمی کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اس کی تشریح

حضرات فقہاء کرام یوں فرماتے ہیں:

وإحياء الأرض أن يجوزها بجائط أو يجرى لها ماء... وقيل إحياء الأرض ما عد إحياء وهو عمارتها بما تتها به لما يراد منها من زرع أو بناء (المقنن ۲۰۲۸۸)۔

لیکن اگر کوئی ارض موات کی صرف حد بندی کر دے اور اسے کار آمد نہ بنائے تو یہ شخص اس زمین کا ابھی مالک نہ ہوگا، مگر اس زمین پر اس کا حق زیادہ ہے اور اس کے اس حق میں کسی اور کو مداخلت کا حق حاصل نہیں۔

ومن تحجر مواتا لم يملكه وهو احق به ووارثه بعده (حوالہ مذکور، نیز دیکھئے المغنی ۵۶۹، ۵۶۹، ۴، ۳۶۳)۔

صرف تحجر موات کی صورت میں آدمی رقبہ ارض کا مالک نہیں ہوتا لیکن اس کا حق اس سے متعلق ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من سبق إلى ما لم يسبق إليه مسلم فهو احق به (ابوداؤد، المغنی ۵۰۵۶۹)۔

سبقت ید کی وجہ سے جو حق حاصل ہوتا ہے کیا اس کی بیع کی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں فقہائے حنفیہ کی کوئی تصریح نہیں مل سکی۔ البتہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

ليس له بيعه وقيل له ذلك (المقنن ۲۰۲۸۸) فان باعه لم يصح بيعه لأنه لم يملك فلم يملك بيعه كحق الشفعة قبل

الأخذ به ولمن سبق إلى معدن أو مباح قبل أخذه قال أبو الخطاب ويحتمل جواز بيعه لأنه له (المغنی ۵۰۵۶۹)۔

تحجر موات کو چونکہ مکمل قبضہ نہیں مانا گیا اس لیے اس کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، ورنہ جس مباح چیز پر آدمی مکمل قبضہ کر لے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کی بیع وہ کر سکتا ہے۔

کمپنیوں کے اسماء وعلامہ:

آج کل مختلف مصنوعات تیار کرنے والی کمپنیاں جو اپنے نام اور ٹریڈ مارک رجسٹرڈ کراتی ہیں اور ان کا حق و مفاد ان سے متعلق و وابستہ ہو جاتا ہے، وہ سبق ید الی المباح کے ذیل میں آنا چاہیے۔ ہمارے متعدد علماء نے اسے مسئلہ نزول عن الوظائف کے قیاس پر قابل عوض قرار دیا اور بطریق صلح اسقاط حق کا معاوضہ جائز قرار دیا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

”اور کارخانہ کا نام بھی مشابہ حق و وظائف کے ہے کہ ثابت علی وجہ الاصلت ہے نہ کہ دفع ضرر کے لئے، اور دونوں بالفعل امور اضافیہ میں سے ہیں اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے، پس اس بنا پر اس کے عوض وینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے گولینے والے کے لئے خلاف تقویٰ ہے مگر ضرورت میں اس کی بھی گنجائش ہو جائے گی“ (حوادث الفتاویٰ ۷۱۴)۔

کمپنیوں کے نام اور تجارتی نشانات ظاہر ہے کہ کوئی مادی شئی نہیں بلکہ ان کی اہمیت و افادیت جو کچھ ہے وہ صرف معنوی اور اعتباری ہے بذات خود ان اسماء وعلامہ کی کوئی حیثیت اور کوئی قیمت نہیں، کوئی بھی شخص اپنی کمپنی کا جو چاہے نام رکھ سکتا ہے اور جو تجارتی نشان چاہے متعین کر سکتا ہے، مگر جب ایک شخص نے ایک خاص نام و نشان اپنے لئے متعین کر لیا اور اپنی محنت اور جدوجہد سے اس نام و نشان کے ذریعہ اس نے اپنی خاص شناخت اور ساکھ بنائی تو اب اس شخص کا مفاد اس سے وابستہ ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا شخص وہی نام یا نشان اختیار کرے تو اس میں ایک تو پہلے شخص کا ضرر و نقصان ہے، اور اس میں عام خریداروں کے ساتھ بھی ایک فریب و خداع ہے جو شرعاً جائز نہیں۔

بہر حال یہ دونوں چیزیں خالص معنوی ہونے کے باوجود عام عرف میں انھیں مال مستقوم سمجھا جاتا ہے اور رجسٹرڈ کر دینے کے بعد انھیں قانونی تحفظ بھی فراہم ہو جاتا ہے، اس لئے ان کے استعمال میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں اس لئے ضرورتاً ان کی بیع و شراء جائز ہوگی بشرطیکہ عام صارفین کو دھوکے اور اندھیرے میں نہ رکھا جائے، اور صاف صاف یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب مصنوعات اسی نام و نشان کے ساتھ دوسرا شخص تیار کر رہا ہے، اور مصنوعات بھی سابقہ معیار پر رکھنے کی پوری کوشش کی جائے۔

المال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والمالية تثبت بتمول الناس كلهم أو بعضهم والتقوم

☆☆☆

يثبت بها ويباحة الانتفاع بها شرعاً (رد المحتار ۴۰۳)۔ هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔



## بیع

ابو فرحان حنفی

اگر فقہ حنفی کی تعریف بیع میں کوئی ترمیم نہ ہو سکتی ہو تو پھر کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بیع اور معاوضہ میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے؟ اس طرح کہ ہر بیع تو معاوضہ ہے مگر ہر معاوضہ بیع نہیں۔ پس اس لئے منافع کا مبادلہ معاوضہ کی قبیل سے ہے بیع کی قسم سے نہیں ہے۔ بہر حال ذیل میں سوالات کے جوابات کو پیش کرنے کی سعی کی جا رہی ہے:

## ۱۔ بیع کی تعریف میں مال کی شرط:

بیع کی تعریف میں مال کی شرط ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر وہ چیز جس کا حاصل کرنا انسان کو مرغوب ہو چاہے وہ چیز مادی ہو یا نہ ہو خرید و فروخت کا محل ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَّهُمُ الْجَنَّةُ“ (سورہ توبہ: ۱۱۱) اس میں انفس غیر مادی اور اموال مادی چیزیں ہیں۔ اس آیت کے آخری حصہ میں فرمایا: ”فَاسْتَبَشِرُوا ببيعكم الذي بايعتكم به“ ای اظہر السرور بهذا البیع فقد رجتم فيه رجاء لم يرجه أحد من الناس إلا من فعل مثل فعلكم۔ اس آیت میں خرید و فروخت کو بیع کا لفظ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہاں اشتراء اور بیع کے الفاظ حقیقی معنی میں مستعمل ہیں۔ یہاں حقیقی معنی متعذریا مہجور نہیں ہے کہ مجازی معنی مراد لے سکیں۔

اسی طرح ”وَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ“ (بقرہ: ۱۰۲) دوسری آیت ہے، اگر انفس کے مادی یا غیر مادی ہونے میں شبہ ہو تو اس آیت پر غور کیا جائے: ”يَشْتَرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ“ (نساء: ۷۴)، اس سے زیادہ واضح یہ آیات بھی ہیں: ”أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى“ (بقرہ: ۱۶)، ”إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ“ (آل عمران: ۱۷۷)، ”اشْتَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا“ (توبہ: ۹)، ”وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ“ (لقمان: ۶)، اس جیسی اور کئی آیتیں ہیں جن میں اشتراء و بیع کے الفاظ حقیقی معنی میں مستعمل ہیں۔

## ۲۔ مال کی قید:

اگر مال کی قید ضروری قرار دیا جائے تو مال کا مادی اعیان میں سے ہونا ضروری ہے جیسا کہ قرآن پاک کی متعدد آیتوں اور متعدد حدیثوں میں مادی اعیان مراد لئے گئے ہیں۔ کہیں بھی ”مال“ کے لفظ سے حقوق و منافع کا معنی مراد نہیں لیا گیا۔ ”وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ“ (بقرہ: ۷۷)، ”وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ“ (الانعام: ۱۵۲)، ”الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا“ (کہف: ۳۶)، ”يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ“ (ہمزہ: ۳)، ”وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلْسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ“ (الذاریات: ۱۹)۔

حدیث شریف میں آتا ہے: ”نھی (رسول اللہ ﷺ) عن إضاعة المال“، ایک اعرابی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: ”هلكت المال وتقطعت السبل“، ایک اور روایت میں نیک عورت کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں: ”لا تخالفه في نفسها ولا مالها“، ایک اور حدیث میں غلام کے متعلق یہ الفاظ ہیں: ”من أعتق وله مال“، ایک اور روایت میں ہے: ”بعت مالا بالوادی“۔ بعض صحابہ کے متعلق جو حضور ﷺ کی صحبت میں دن رات نہیں رہ سکتے تھے وہ الفاظ مروی ہیں: ”يشغلهم القيام على أموالهم“، ایک روایت میں حلال مال کے متعلق یہ کہا گیا ہے: ”نعم المال الصالح للرجل الصالح“۔

## ۳۔ مال کی حقیقت کی تعیین:

مال ”مول“ سے اور بعض کے نزدیک ”میل“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بصلہ ”الی“ کسی کی طرف بڑھنا اور جھکنا اور بصلہ ”بعن“ کسی کو چھوڑنا اور اس



سے ہٹنا کے ہیں۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں مال وہ چیز ہے جس کا قابل احساس وجود خارجی دنیا میں پایا جائے۔ "الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" اور وہ ذخیرہ کیے جانے کے قابل ہو: "الَّذِي يَجْتَمِعُ مَالًا وَعَدَدًا"۔ ضرورت کے وقت وہ استعمال اور استفادہ کے قابل ہو: "مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ"۔ پس مال سے شریعت کی یہ مراد منقولات شرعیہ کے قبیل سے ہے۔ ہر عہد میں جو چیز بھی مذکورہ بالا خصائص کی حامل ہوگی وہ مال کہلائے گی۔ مثلاً کسی زمانہ میں ریت اور مٹی استعمال و استفادہ کے قابل نہیں تھی اس لئے وہ اس زمانہ میں مال بھی نہیں کہلاتی تھی مگر آج وہ استعمال و استفادہ کے قابل ہے اس لئے وہ مال کی تعریف میں شامل ہے۔

کئی منزلہ فلائس بھی مال کی تعریف میں شامل ہیں کیونکہ ان کا قابل احساس وجود خارجی پایا جاتا ہے۔ ذہنی، فکری اور دماغی صلاحیتوں سے جو چیز بھی وجود میں آتی ہے وہ بھی مادی ہے لہذا وہ مال کی تعریف میں شامل ہے۔ لیکن صلاحیتوں کے متعلق یہ سوال کہ کیا وہ بھی مال کی تعریف میں شامل ہیں؟ تو یہ سوال درحقیقت صلاحیتوں اور ان سے وجود میں آنے والی چیزوں کے درمیان فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو سراسر مغالطہ ہے۔

### ۴۔ قابل ذخیرہ کی شرط:

الف۔ مال کی تعریف میں شرط کہ اس کو قابل ذخیرہ ہونا چاہیے ضروری ہے، کیونکہ مال پر زکوٰۃ اسی وقت فرض ہوتی ہے جب کہ وہ ایک سال کے بعد بقدر نصاب ہوتا ہے اور بقدر نصاب اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مال ذخیرہ نہیں کیا جاتا۔ علاوہ اس کے قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ہے: "الَّذِي يَجْمَعُ مَالًا وَعَدَدًا" (ہمزہ ۲)۔ ایک روایت میں آتا ہے: "كَلُوا وَاذْخَرُوا" (اب قربانی کا گوشت کھاؤ اور اس کو ذخیرہ کرو)۔ اصحاب ماندہ کو یہ حکم ہوا تھا: "أَنْ لَا يَذْخَرُوا فَادْخَرُوا" (ترمذی: کتاب القرآن، باب ومن سورة المائدة) (یعنی یہ کہ وہ ذخیرہ نہ کریں لیکن انھوں نے ذخیرہ کیا)۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے: "لَا تَوْخَذُ كِرَائِمَ أَمْوَالِ النَّاسِ فِي الصَّدَقَةِ" (البخاری: کتاب الزکاة، باب لا تَوَاخِذُ كِرَائِمَ أَمْوَالِ النَّاسِ فِي الصَّدَقَةِ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کرائم اموال الناس" ذخیرہ کی صورت میں ہوتے ہیں۔

ب۔ ذخیرہ کرنے کی صورت مختلف اشیاء کے اعتبار سے ہر ایک کی حالت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ ان تمام صورتوں کا حکم "الأصل في الأشياء الإباحة" کے تحت ہوگا۔ اگر ایجاد، فارمولا اور ٹریڈ مارک کسی سرکاری قانون کے ذریعہ رجسٹرڈ کرائے جائیں تو اس کو شخصی حقوق میں سے حق بلک کا تحفظ کہا جائے گا ذخیرہ کرنا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ان چیزوں کا قابل احساس وجود خارجی دنیا میں نہیں پایا جاتا۔

۵۔ بیع کی حقیقت:..... بیع کی حقیقت یہ ہے کہ اعیان و منافع کا مبادلہ دوسرے اعیان و منافع کے عوض ایک مجلس کے ایجاب و قبول کے ساتھ یا ایسے ماضی و حال کے یکساں الفاظ کے ساتھ جو مالک کرنے یا مالک ہونے پر دلالت کرتے ہوں، عمل میں آئے۔

۶۔ مال کی حقیقت: مال وہ چیز ہے جس کا قابل احساس وجود خارجی دنیا میں پایا جاتا ہو، اس پر ملکیت قائم ہو سکتی ہو اور وہ ذخیرہ کیے جانے کے قابل ہو۔

حقوق کی قسمیں:..... حقوق کی کئی قسمیں ہیں: حق زوجیت، حق ولایت، حق اولاد و اقرباء و مساکین، حق خلافت و وراثت، حق تصرفات یعنی جائز افعال کرنے کا حق، حق بر بنائے معاہدات اور حق بلک وغیرہ۔ یہ اہم اور ابتدائی شخصی حقوق ہیں۔ ان میں سے ان حقوق کی بیع و تنازل جائز ہے جو ملکیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ واللہ أعلم وعلیہ اتم۔



## بیع حقوق

### سوالات کے جوابات

مولانا شمس پیرزادہ

۱۔ بیع کی حقیقت کیا ہے؟

بیع کی حقیقت مبادلہ ہے، خواہ وہ اعیان کا مبادلہ ہو یا منافع کا۔ اگرچہ بیع کی معروف شکل مال کے مبادلہ کی رہی ہے اسی لئے فقہاء اس کی تعریف ”مبادلة المال بالمال تمليکاً وتملکاً“ (الغنی ۲۰۵۲۰) کرتے رہے ہیں۔

لیکن اب عرف نے موجودہ تمدنی تقاضوں کے تحت بیع کے مفہوم میں وسعت پیدا کر دی ہے، چنانچہ منفعت کی قیمت وصول کرنے کو بھی بیع، چارجز CHARGES اور فیس FEES سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بجلی جس کو ذخیرہ کر کے رکھا نہیں جاسکتا اور نہ وہ دکھائی دینے والی چیز ہے۔ اس کی حیثیت محض منفعت کی ہے، جس پر فی یونٹ کے حساب سے چارجز ادا کرنے پڑتے ہیں۔ گویا الیکٹرک کمپنی صارفین کو بجلی جو محض منفعت ہے فروخت کرتی ہے اور وہ اس کے عوض مال ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح فلم دیکھنا محض منفعت ہے لیکن فلم دیکھنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ سرکاری انتظام کے تحت نشر کئے جانے والے پروگراموں کو ریڈیو پرسن لینے یا ٹی وی پر دیکھ لینے کی فیس حکومت کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ سب منفعتیں ہیں جن کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور عرفاً اس معاملہ کو صحیح سمجھا جاتا ہے، اور جہاں تک شرعی پہلو کا تعلق ہے معاملات میں اصل اباحت ہے اور عرف کا اعتبار کیا جائے گا، الا یہ کہ کوئی بات کسی شرعی حکم یا عدل و قسط کے خلاف ہو۔

۲۔ مال کی حقیقت کیا ہے؟..... مال کا اطلاق آج بھی عرفاً ان ہی چیزوں پر ہوتا ہے جن کو ذخیرہ کر کے رکھا جاسکتا ہو اور جن پر قبضہ کیا جاسکتا ہو۔ خالص منافع کو اگرچہ مال نہیں کہا جاتا لیکن اب کتنے ہی منافع ایسے ہیں جو مالیت رکھتے ہیں، اس لئے وہ مال کی حقیقت میں شامل ہیں۔

۳۔ قابل ادخار ہونے کا مفہوم: عرف کے لحاظ سے کسی مادی چیز ہی کو قابل ادخار کہا جاسکتا ہے کیونکہ ایسی چیزوں کو جمع کر کے اور محفوظ کر کے رکھا جاسکتا ہے۔

۴۔ حقوق کی بیع جائز ہے یا نہیں؟..... ہر قسم کے حقوق کی بیع تو جائز نہیں ہو سکتی، البتہ بعض وہ حقوق جنہوں نے واقعی اپنے اندر مالیت پیدا کر لی ہے اور جن کی فروخت عدل و قسط کے خلاف نہیں ہے ان کی بیع میں کوئی حرج نہیں ہے مثلاً ٹریڈ مارک، دوکان اور کمپنیوں کے گڈول (GOOD WILL)، اپنے مکان کی چھت پر منزل تعمیر کرنے کا حق وغیرہ۔ رہا حق تصنیف تو وہ مصنف کے لئے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو لگانے کی بنا پر جائز تو ضرور ہے مگر استحصال کی حد تک نہیں۔ پھر اگر کتاب علمی ضرورت کی ہے اور حق تصنیف اس کی اشاعت میں رکاوٹ بن رہا ہو تو رفع حرج کے لئے معروف طریقہ پر اس کی اشاعت کا انتظام کرنے کی اجازت لوگوں کو ہونی چاہیے، اور اگر کتاب دینی اصلاحی نوعیت کی ہے تو تصنیف کے حق سے زیادہ تمہین کی ذمہ داری مصنف پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ شہادت حق کا کتمان جائز ہے اور نہ علم دین کے پھیلاؤ اور اصلاح کے لئے مفید ہونے والی چیزوں میں رکاوٹ (مناع للخیر) بننا۔ اگر ایک ملک کی مطبوعات کی درآمد دوسرے ملک میں نہ ہو سکتی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ لوگ اپنے طور پر ایسے ملک میں اس کی طباعت و اشاعت کا مناسب انتظام کر لیں۔

## ۵۔ حق سے دستبرداری (تنازل عن الحق) کا معاوضہ:

وظائف سے دستبرداری پر معاوضہ لینا صحیح نہیں، کیونکہ اس کی حیثیت فریقین کے درمیان معاہدہ کی ہوتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں کہ انہوں نے خلافت کے منصب سے نزول کا معاوضہ امیر معاویہؓ سے لیا تھا۔ واقعہ کی یہ توجیہ بہت ہی غلط ہے کیونکہ خلافت کا منصب ذاتی منفعت کے لئے نہیں ہوتا کہ اس سے دستبرداری پر معاوضہ وصول کر لیا جائے۔

اسی طرح خلع کی مثال بھی صحیح نہیں کیونکہ وہ حق زوجیت سے نزول کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ مہر کو واپس کر دینے کی حد تک مصالحت کی ایک شکل ہے۔ اگر اس کو حق زوجیت سے نزول کا معاوضہ قرار دیا جائے تو یہ بھی سوال پیدا ہوگا کہ شوہر کس کے حق میں حق زوجیت سے دستبردار ہو رہا ہے۔ جبکہ یہ ضروری نہیں کہ عورت خلع کے بعد لازماً دوسرے سے شادی کر لے۔

دیت کو بھی قصاص کا معاوضہ قرار دینا درست نہیں بلکہ یہ مقتول کے در ثاء کے زخم کو مندمل کرنے اور ان کے نقصان کی تلافی کی ایک شکل ہے جو شریعت نے تجویز کی ہے۔





## بیع کی تعریف

مشقی محمد زید مظاہری

بیع کی تعریف اور اس کا حقیقی مفہوم وہی ہے جو اہل لغت و اہل لسان نے سمجھا، شریعت میں بھی وہی مفہوم مراد ہے اور فقہاء نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے جس کی حقیقت مختصر الفاظ میں ”مبادلة المال بالمال“ ہے۔

”لأن لفظ البيع موضوع لمعنى معقول في اللغة هو تملك المال بالمال بايجاب وقبول عن تراض منهما وهذا هو حقيقة البيع في مفهوم اللسان“ (احكام القرآن للجصاص ۱۰۴۶)۔

”وأما مفهوم البيع لغة وشرعاً فقال فخر الاسلام: البيع لغة مبادلة المال بالمال۔ وكذا في الشرع لكن زيد فيه قيد التراضي“ (مرقاۃ ۲۰۲۸۵)۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ بیع کے تحقق کے واسطے طرفین میں مالیت شرط ہے۔ غیر مال یعنی محض منافع محل بیع نہیں بن سکتے کیونکہ وہ مال نہیں۔

مسائل و مذاہب:

حنفیہ کے یہاں اس کی صاف تصریح تو موجود ہی ہے کہ بیع کے واسطے طرفین میں مالیت شرط ہے، اور منافع چونکہ مال نہیں ہوتے اس لئے ان کی بیع درست نہیں (رد المحتار ۴/۴۳، شرح التوضیح علی الخلوٰت ۱۷۱)۔

مالکیہ کے یہاں بھی طرفین میں مالیت شرط ہے اور منافع کو محل بیع نہیں بنایا جاسکتا (موقی ۲/۳)۔

”وهو عقد معاوضة على غير منافع ولا متعة لذة“ (الفقه على المذاهب الأربعة ۴/۱۵۰)۔

حنابلہ اور شافعیہ بھی بیع کی تعریف ”مبادلة المال بالمال“ سے فرماتے ہیں یعنی بیع کے تحقق کے واسطے طرفین میں مالیت ان کے نزدیک بھی شرط ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ اعیان کی بیع تو درست ہونا چاہیے لیکن منافع کی بیع درست نہیں ہونا چاہیے، چنانچہ منافع مقررہ (غیر مؤبدہ) کے عدم جواز کی تصریح ان کے یہاں بھی موجود ہے۔ اگر منافع محض مال ہوتے تو غیر مؤبدہ منافع کی بیع بھی ان کے نزدیک درست ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

البتہ منافع کی بیع اگر علی سبیل التابید ہو تو وہ بھی اعیان کے قائم مقام ہو کر محل بیع ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اصل ان کے نزدیک بھی یہی ہے کہ مال کا تقابل مال کے ساتھ شرط ہے۔ گویا حنابلہ و شافعیہ منافع کو اگرچہ مال نہیں کہتے لیکن جب منافع کا معاملہ علی سبیل التابید ہو تو وہ (منافع مؤبدہ) اعیان کے قائم مقام ہو کر مال کے حکم میں ہو جاتے ہیں (دیکھئے: المغنی ۳/۵۹۳، الغایۃ القصوی ۱/۴۶۰، الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲/۱۵۲، ۱۵۳، شرح المہذب للنووی ۲/۱۵۳)۔

لیکن فقہاء حنفیہ منافع مؤبدہ کو بھی اعیان (مال) کے قائم مقام نہیں مانتے اس لئے ان کے نزدیک منافع مؤبدہ کی بیع بھی درست نہیں۔ کیونکہ مال تو اس کو کہتے ہیں جو از قبیل اعیان ہونہ کہ وہ جواز قبیل اعراض ہو، اور منافع (گو منافع مؤبدہ ہوں) اعیان نہیں بلکہ اعراض ہیں اس لئے اس کو محل بیع بنانا درست نہیں۔

”لأن المنفعة عرض والعرض غير باق وغير الباقي غير محرز... والتحقق أن المنفعة ملك لا مال (شرح

التوضیح ۱۷۱، رد المحتار ۴/۴۳)۔

مال کی حقیقت اور قابل ادخار ہونے کا مفہوم:

ط استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مال کی تعریف ہر زمانہ کے عرف و اہل حرفہ نے خود متعین کر لی ہے یعنی یہ کہ وہ اشیاء جن کی بنا پر آدمی عرف میں مال والا سمجھا جاتا ہو اور جس کو لوگ مال کہتے اور سمجھتے ہوں، تا جبروں کے نزدیک جس کی قدر و قیمت ہو، اور عرف و رواج میں وہ قابل فروخت ہو، ایسی اشیاء ہر زمانہ میں مال اور ذریعہ تمول سمجھی جاتی ہیں۔ علامہ کا سنی بعض اشیاء کے مال میں داخل نہ ہونے کی جو دلیل اور اس کا معیار ذکر فرماتے ہیں وہ قابل غور ہے:

”والدلیل علیہ أن الناس لا یعدونہ مالا ولا یباع فی سوق من الأسواق دلّ أنه لیس بمال فلا یجوز بیعہ“ (بدائع الصنائع ۵، ۱۲۵)۔

صاحب بدائع کی تصریح کے مطابق کسی شئی کے مال ہونے نہ ہونے کا معیار وہی ہے جو قابل میں مذکور ہوا یعنی یہ کہ لوگ اس کو مال سمجھتے ہوں۔ البتہ اس مال کی خاصیت اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو شئی مال اور ذریعہ تمول ہوتی ہے وہ ایسی شئی ہوتی ہے جس پر قبضہ ممکن ہو، جو ضبط و حفاظت اور ذخیرہ بنانے کے قابل ہو، جس کی قدر و قیمت ہو، جس کو لوگ ذریعہ تمول سمجھتے ہوں اور جو وقت پر کام آسکے اور اس وجہ سے وہ طبائع کو مرغوب ہو۔ ہر زمانہ میں مال جس شکل میں بھی ہوگا اس میں یہ مذکورہ خواص و اوصاف ضرور پائے جائیں گے، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے مختلف انداز میں مال کی تعریف میں انہیں اوصاف و خواص کا ذکر فرمایا ہے۔

”المراد بالمال ما یمیل الیہ الطبع و یمکن ادخارہ لوقت الحاجة“ (شامی ۲، ۲، نیز دیکھئے: بدائع ۵، ۱۲۶)۔

”وأمکن إحرازہ والتصرف فیہ علی وجہ الاختیار“ (مجر ۵، ۲۵، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۵، ۲۰۲)۔

”لا یقع اسم مال إلا علی ما لہ قيمة“ (الاشیاء للسیوطی ۲۵۸)۔

”المال هو کل عین ذات قيمة مادیة بین الناس“ (الفقہ الاسلامی وأدلّته ۴، ۲۲۵)۔

”المراد بالمال عین یجری فیہ التنافس والابتذال“ (الدر المنقی ۲، ۲)۔

دراصل فقہاء کرام کی بیان کردہ مال کی تعریف میں کوئی اختلاف واضطراب نہیں ہے، حاصل سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مال وہ شئی کہلاتی ہے جو ذریعہ تمول ہو اور جس کی بنا پر آدمی عرفاً مالدار سمجھا جاتا ہو۔ فقہاء کرام نے جو کچھ بھی فرمایا ہے وہ دراصل مال کی حالت، اس کی شان اور اس کے خواص و اوصاف ذکر فرمائے ہیں اور انہیں خواص و علامت کے ذریعہ مال کی تعریف فرمادی۔ اور کسی شئی کی حقیقت کے پائے جانے میں زمانہ و عرف کے حالات کے لحاظ سے علامات میں تغیر و تبدل اور تخلف ممکن ہے۔

اعراض و معنویات بھی مال ہیں:

پہلے زمانہ میں مال وہی اشیاء ہوا کرتی تھیں جن کا تعلق اعیان و مادیت سے ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ انہیں اشیاء کو قبضہ کے بعد ذخیرہ بنا کر کام میں لانا ممکن ہوتا تھا اس واسطے اس عہد کے فقہاء نے اعیان کو تو مال میں شمار کیا اور اعراض و معنویات کو مال سے خارج فرمادیا۔

اور وجہ اس کی صرف یہ تھی کہ اعیان کا تو احراز و ادخار (یعنی قبضہ و حفاظت و ذخیرہ اندوزی) ممکن تھا، اعراض و معنویات کا ممکن نہ تھا۔ اعیان تو باقی رہنے والے اور اعراض غیر باقی غیر محفوظ رہنے والے تھے۔ اس لئے فقہاء نے اعراض و معنویات کو مال میں شامل نہ فرمایا بلکہ مال کو اعیان کے ساتھ مخصوص فرمادیا (دیکھئے: شرح التوضیح والخلو ت ۱، ۱۷۱، بحر الرائق ۵، ۲۵۷)۔

اس تفصیل و تصریح کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ دور میں بہت سی ایسی اشیاء جو مادیات اور اعیان کے قبیل سے نہیں بلکہ اعراض و معنویات کے قبیل کی ہیں اگرچہ پہلے زمانہ میں صیانہ، احراز، ادخار نہ ہونے کی وجہ سے مال نہ تھیں، لیکن انہیں معنویات و اعراض پر اب قبضہ بھی کیا جا چکا اس کا احراز و ادخار کیا جانے لگا اس لئے اب ان اشیاء کو بھی مال کہنا چاہیے۔ کیونکہ مال کی تعریف میں جن لوگوں نے اعیان کی قید لگائی ہے اس سے مقصود بالذات عینیت نہیں ہے بلکہ چونکہ اس زمانہ میں اعیان ہی کا ادخار ہو سکتا تھا اس لئے اس کی تصریح کر دی۔ ورنہ ہر وہ شئی جس پر بھی قبضہ و ادخار ممکن ہو اس کو بھی اعیان کے حکم میں شامل کر کے اس کو بھی مال کہا جائے گا۔



مثال کے طور پر برقی قوت جو کہ از قبیل معنویات ہے، گذشتہ زمانہ میں اس کو مال نہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس پر قبضہ کرنا یا اس کو ذریعہ تمول سمجھنا عاۓہ ممکن نہ تھا اس لئے اس کی بیع کے جواز کے کوئی معنی نہ تھے۔ لیکن اب قوت برقیہ کو قابل انتفاع اور ذخیرہ اندوزی و تمول کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اس لئے اب اس کو ایک قیمتی مال سمجھا جاتا ہے۔

اس کی اور موٹی مثال ہوا، گیس، انسانی آواز ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں ان کے محفوظ کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے ان اشیاء کو مال نہیں کہا جاتا تھا لیکن آج کے دور میں ان میں سے ہر ایک کو محفوظ کیا جانے لگا، ان کے ذریعہ ذخیرہ اندوزی بھی ہوتی ہے، یہ اشیاء ذریعہ تمول بھی سمجھی جاتی ہے اور عرف میں ان کو قیمتی مال سمجھا جاتا ہے اس لئے وہ قیمتی مال کے مصداق ہیں۔

### حقوق کی بیع کا مسئلہ:

حقوق کی ابتداء دو قسمیں ہیں: حقوق اللہ، حقوق العباد۔

حقوق اللہ کا مفہوم تو ظاہر ہے۔ حقوق اللہ خواہ بندوں سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کی ذات سے، کسی طرح بھی ان کا مبادلہ یا معاوضہ اس دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ مثلاً نماز پڑھنا یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے، بندوں پر اس کا پورا کرنا لازم ہے۔ اس حق کو فروخت کرنا یا کسی نوعیت کا معاوضہ کا معاملہ کرنا درست نہیں۔

اسی طرح وہ حقوق اللہ جو بندوں سے متعلق ہوں مثلاً حدود و قصاص کا اجراء، اس کا مبادلہ و معاوضہ بھی درست نہیں مثلاً مجرم یعنی چور، زانی، شارب خمر نہیں پر حد جاری کی جائے گی، کوئی دوسرا شخص عوض لے کر ان کی نیابت میں حد جاری کروالے اس کی گنجائش نہ ہوگی۔

البتہ قصاص قتل کی بابت خود اللہ تعالیٰ نے مقتول کے اولیاء کو صلح کرنے کی اجازت دی ہے۔ لہذا اس صورت میں تنازل عن الحق یعنی اپنے حق سے دستبردار ہو کر مال لے کر صلح کرنے کی اجازت ہے لیکن اصل حکم حدود و قصاص کا یہی ہے کہ اس کا مقابلہ و معاوضہ کسی طرح بھی درست نہیں (دیکھئے: اعلام الموقعین لابن القیم ۱۰۸/۱، الموافقات للشاطبی ۲/۲۶۲، المساکتہ التاسعہ)۔

### حقوق العباد کی تقسیم:

حقوق کی دوسری قسم جس کا تعلق بندوں سے ہے اس کی ابتداء دو قسمیں ہیں: حقوق شرعیہ، حقوق عرفیہ۔

حقوق شرعیہ سے وہ حقوق مراد ہیں جن کو شارع نے خود مقرر کیا ہو یعنی جن کا ثبوت شارع کی جانب سے ہو اور قیاس و رائے اور تعامل کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔

حقوق عرفیہ سے وہ حقوق مراد ہیں جن کا ثبوت عرف و تعامل کی بنا پر ہو لیکن شارع نے اس کو برقرار رکھا ہو یا اصول شرع سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہو۔

### حقوق شرعیہ کی تقسیم:

حقوق شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: حقوق اصلیہ، حقوق ضروریہ۔

حقوق ضروریہ کا حاصل یہ ہے کہ جن حقوق کو شارع نے محض دفع ضرر کے لئے ضرورت کی بنا پر دیا ہو۔ لہذا اگر کوئی شخص اس حق ضروری کو فروخت کرنا چاہے یا اپنے حق سے دستبردار ہو کر مال لے کر صلح کرنا چاہے تو اس کی اجازت نہیں کیونکہ یہ ضرورتاً دفع ضرر کے لئے دیا گیا ہے جس کی واضح مثال حق شفعہ ہے۔

”جعلہ اللہ حقاً للشریک علی شریکہ من استحقاق الشفعۃ دفعاً للضرر“ (اعلام الموقعین ۴/۲۹۶)۔

کہ اس کے عوض مال لینے کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ واقعۃً اس کو ضرر نہیں ہے۔ لہذا وہ حق جو محض ضرر کی وجہ سے حاصل تھا وہ بھی ساقط ہو جانا چاہیے۔

(شامی ۱۶/۳)۔

اور اگر کوئی شخص واقعی ضرر میں مبتلا ہے لیکن ضرر کو برداشت کر کے جلب منفعت کو ترجیح دیتا ہے تب بھی اس کی گنجائش نہ ہوگی، کیونکہ یہ حق شفعہ دفعہ ضرر کے واسطے ہے، اور حق دفع ضرر کو جلب منفعت و استحصال کا ذریعہ نہیں بنا سکتے۔ واللہ اعلم



## حقوقِ اصلیہ :

حقوقِ اصلیہ کا حاصل یہ ہے کہ شارع نے وہ حقِ اصلیت صاحبِ حق کو دیئے ہوں، دفعِ مضرت پر ان کا مدار نہ ہو۔ مثلاً شوہر کو اپنی بیوی سے متمتع ہونے کا حق، طلاق دینے کا حق، یا باپ کا اپنی بیٹی کے نکاح کی ولایت کا حق۔

اس قسم کے حقوق جو اصلیت حاصل ہوں ان کا فروخت کرنا تو یقیناً درست نہیں، البتہ تنازل عن الحق (حق سے دستبردار ہو کر) مال لے کر صلح کرنے میں قدرے تفصیل ہے۔ تمام حقوقِ اصلیہ کی بابت یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ حق سے دستبردار ہو کر صلح کر کے مال حاصل کرنا جائز ہو، بلکہ جہاں شارع سے اجازت ثابت ہوگی وہاں تو اس کی اجازت ہوگی، ورنہ یہ دیکھا جائے گا کہ یا تو یہ حق خاص اس کی ذات سے متعلق ہے اور اس میں منتقل ہونے کی شان نہیں پائی جاتی، تو ایسے حقوق میں تو صلح کے عوض مال حاصل کرنے کی گنجائش نہ ہوگی ورنہ ہوگی۔

مثال کے طور پر شوہر کا عورت سے متمتع ہونے کا حق، اگرچہ شوہر کو اصلیت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود شوہر بیوی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ باہم صلح کر کے غیر کو حق متمتع کی اجازت دیدیں، کیونکہ شارع نے اس کی اجازت نہیں دی، اور یہ حق متمتع خود شوہر کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے جس میں نیابت نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح مثلاً باپ نکاح میں بیٹی کے نکاح کی ولایت کا حق باپ کو اصلیت حاصل ہے، باپ اگر اپنے اس حق کو فروخت کرنا چاہے یا حق سے دستبردار ہو کر عوض لے کر برطرف ہونا چاہے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، کیونکہ یہ ایسا حق ہے جس میں منتقل ہونے کی شان نہیں پائی جاتی، کیونکہ اس کا مدار حقوقِ نسبیہ پر ہے، اور حسبِ نسب میں انتقال نہیں ہوا کرتا۔

اور مثلاً طلاق دینے کا اختیار شوہر کو اصلیت حاصل ہے، اس حق کو فروخت کرنا تو درست نہیں لیکن عورت سے مال لے کر صلح کر کے خود عورت کو طلاق کا اختیار دے دیا جائے جس کو طلاقِ علی مال کہتے ہیں تو اس کی اجازت ہے کیونکہ اس میں منتقل ہونے کی شان پائی جاتی ہے، لیکن اس انتقال کے بعد بھی شوہر کا حق بدستور باقی رہے گا کیونکہ یہ حق اصلیت اس کو حاصل ہے جس کا تقاضا ہے کہ وہ باقی رہے۔

البتہ اس طرح کے حقوقِ اصلیہ کو استعمال نہ کرنے کے عوض میں بطور صلح کے اس کا معاوضہ لینے کی گنجائش ہے لیکن وہ حق بدستور باقی رہتا ہے صرف استعمال نہ کرنے کا معاوضہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دینا چاہا تو حضرت سودہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، آپ مجھے طلاق نہ دیں، میں اپنی باری عائشہ کو ہبہ کرتی ہوں چنانچہ اس پر مصالحت ہو گئی۔

”لما عزم علی طلاق سودة رضیت بان تمب له لیتها وتبقى علی حقها من النفقة والكسوة فهذا اعدل الصلح فان الله سبحانه وتعالى اباح للرجل ان يطلق زوجته ويستبدل بها غيرها فاذا رضیت بترك بعض حقها — كان هذا من الصلح العادل“ (اعلام الموقعین ۱۰۹)۔

## حقوقِ عرفیہ کی تقسیم :

حقوقِ عرفیہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) حقوقِ مجردہ (۲) حقوقِ معاملہ (۳) حقوقِ اولویہ۔

حقوقِ مجردہ: حقوقِ مجردہ کا حاصل یہ ہے کہ کسی شئی کی ذات اور اس کے عین کے بقا کے ساتھ صرف اس سے انتفاع کے حق کو فروخت کر دیا جائے۔ مثلاً حقِ برور، حقِ تعلی، حقِ شرب، حقِ تسبیل، حقِ وضع الخشب علی الجدار وغیرہ۔

اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اس قسم کے حقوق کی بیع جائز نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ بیع کے تحقق کے واسطے طرفین میں مالیت شرط ہے اور حقوقِ مال نہیں ہیں۔

”لان حق التعلی لیس بمال لان الهواء لیس بمال“ (بدائع ۵۱۲۵، فتح القدیر ۵۰۲۰۲)۔

شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک چونکہ مؤبدہ بھی اعیان کے قائم مقام ہو کر مال کے حکم میں ہو جاتے ہیں اور محل بیع بھی بن جاتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک تو

ان حقوق کی بیع بہر حال درست ہونا چاہیے۔

البتہ مالکیہ کے نزدیک اگرچہ بیع کی تعریف میں مالیت شرط ہے اور منافع مال نہیں ہیں اس وجہ سے ان کی بیع درست نہیں۔ اس کا مقتضی یہ تھا کہ ان حقوق کی بیع بھی درست نہ ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود فقہ مالکی کی کتابوں میں اس قسم کے بیع کے جواز کی صاف تصریح موجود ہے (الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳، ۱۳، المدونہ ۱۰، ۵۱، ۱۲۱)۔

حاصل کلام یہ کہ شافعیہ، حنابلہ، مالکیہ کے نزدیک اس قسم کے حقوق کی بیع درست ہے، البتہ حنفیہ کے مسلک میں قدرے تفصیل ہے اور وہ یہ ہے: حنفیہ کے نزدیک چونکہ حقوق مال نہیں اس لئے ان کی بیع بھی درست نہ ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود حق مرور اور حق شرب وغیرہ میں اختلاف روایات موجود ہے، اور راجح و صحیح قول کے مطابق جواز ہی منقول ہے، البتہ حق تعلی کے عدم جواز کی صاف تصریح موجود ہے۔

”بیع الطريق وهبته جائز و بیع مسیل الماء وهبته باطل والمنثلة تحتل الوجہین بیع رقبۃ الطريق والمسیل و بیع حق المرور والتسیل... الی ان قال وان کان الثانی ففی بیع حق المرور روایتان الخ“ (فتح القدیر ۵، ۲۰۵)۔  
”وصح بیع حق المرور تبعاً للارض بلاخلاف، ومقصوداً وهو الصحیح وعلیہ الفتوی۔ مضمرات“ (در مختار شامی ۲، ۱۲۲)۔

حاصل کلام یہ کہ حق مرور کی بیع اگر زمین کے تابع ہو کر ہو تب تو بالاتفاق درست ہے ورنہ اگر بغیر زمین کے صرف حق مرور کی بیع ہو تو بھی راجح قول کے مطابق درست ہے۔  
حق شرب و حق تعلی:

اور یہی مسئلہ حق شرب کی بیع کا ہے کہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ ظاہر روایت میں اس کو بیع فاسد کہا گیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حق کی بیع ہے بلکہ جہالت و غرر کی بنا پر اس کو فاسد قرار دیا ہے (فتح القدیر و عنایہ ۲۰۴/۵)۔  
امام سرخسی کی تصریح کے مطابق حق شرب کی بیع عرف و تعامل کی بنا پر جائز ہے گو بغیر زمین کے ہو حالانکہ اصول کے مطابق جواز نہ ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

”بیع الشرب فاسد فانہ من حقوق البیع بمنزلة الأوصاف فلا یفرد بالبیع“ (مبسوط ۱۲، ۱۳۵)۔

لیکن اس کے باوجود امام سرخسی نے جواز نقل فرمایا ہے صرف عرف و عادت اور تعامل کی بنا پر، اگرچہ یہ جواز خلاف اصل و خلاف قیاس ہے، لیکن عرف و تعامل کی بنا پر قیاس کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ استصناع اس کی واضح مثال ہے، البتہ عرف و تعامل اگر کسی نص صریح سے متصادم ہو جس سے کہ اس کا ترک لازم آتا ہو تو ایسے عرف و تعامل کا اعتبار نہ کیا جائے گا (دیکھئے: رسائل ابن عابدین رسم الفتوی ۹۷)۔

حق تعلی کی بیع کا جواز:

اس تفصیل کے پیش نظر جب ہم حق تعلی کی بیع میں غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے تمام فقہاء نے حق تعلی کی بیع کے عدم جواز کی تصریح فرمائی ہے۔

”و بیع حق التعلی لا یجوز باتفاق الروایات و مژ وجہہ وهو لیس حقاً متعلقاً بما هو مال بل بالهواء“ (شامی ۲، ۱۲۲)۔

فتح القدیر ۵، ۲۰۶)۔

اس تصریح و تعلیل کے پیش نظر حق تعلی کی بیع کا جواز نہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن جس بنیاد و علت کے پیش نظر امام سرخسی نے اپنے شیخ اور بعض مشائخ سے بیع شرب کا جواز (خلاف قیاس بدون ارض) نقل فرمایا ہے، اسی بنیاد کے پیش نظر حق تعلی کی بیع کا جواز ہونا چاہیے، فقہاء کے زمانہ میں حق تعلی کی خرید و فروخت کا تعامل نہ تھا بلکہ صرف بعض علاقوں میں حق شرب کی بیع کا عرف تھا اس لئے اس عہد کے فقہاء نے صرف حق شرب کے جواز کا فتویٰ دے دیا، لیکن آج کے زمانہ



میں بکثرت علاقوں اور بڑے بڑے شہروں میں حق تعلی کی بیع کا عرف و رواج اور تعامل ہے۔ اس تعامل کا لحاظ کرتے ہوئے خلاف اصل اس کی بیع بھی جائز ہونا چاہیے۔ البتہ اگر یہ تعامل کسی نص شرعی سے مزاحم ہوتا جس سے کہ اس نص کا ترک لازم آتا تو اس کا اعتبار نہ کرتے، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ مسئلہ مجتہد فیہ اور ظنی ہے، بعض ائمہ مالکیہ وغیرہ (المدونہ ۵۱۱۰، الدسوقی ۱۳۳) کے یہاں صاف جواز کی تصریح موجود ہے۔ اور اگر کوئی نص ہو بھی تو اس میں (مذکورہ بالا تصریح کے پیش نظر) تخصیص کی گنجائش ہوگی۔ واللہ اعلم

ورنہ علی سبیل المتزل جب حق تعلی کی خرید و فروخت کا عرف اور بکثرت تعامل ہے اور یہ ابتلاء عام ہے تو اس ابتلاء عام کے پیش نظر ضرورت کی بنا پر توسع سے کام لے کر دوسرے مذاہب پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہونی چاہیے۔ اور بعض دیگر مذاہب میں جواز کی صاف تصریح موجود ہے۔ واللہ اعلم

### خلاصہ کلام:

- ۱۔ یہ کہ حقوق مجردہ کی بیع ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے۔
  - ۲۔ حنفیہ کے یہاں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ وہ حقوق جو اعیان سے متعلق ہوں، جیسے حق شرب، حق مرور وغیرہ ان کی بیع تو درست ہے جبکہ اس میں جہالت و غرر نہ ہو۔ اور وہ حقوق جو اعیان سے متعلق نہ ہوں جیسے حق تعلی، ان کی بیع جائز نہیں۔
  - ۳۔ لیکن عرف و تعامل کی وجہ سے اب حق تعلی کی بیع بھی جائز ہونی چاہیے۔
  - ۴۔ علی سبیل المتزل ابتلاء عام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کا سہارا لے کر حق تعلی کی بیع کے جواز کا حکم لگانا چاہیے۔ واللہ اعلم
- جن حضرات کے نزدیک اس کا جواز کسی صورت سے نہ ہوگا ان کے نزدیک حق تعلی و حق شرب صلح کر کے مال کے عوض حق سے دستبردار ہونے کی اجازت ہے (شرح الجملہ للآتاسی ۱۲۱، بیع الحقوق الجردہ ۲۲)۔

### حقوق المعاملہ:

حقوق عرفیہ کی دوسری قسم حقوق المعاملہ ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی عقد کیا اور اس کی بنا پر اس کو کچھ حقوق حاصل ہوئے۔ اور یہ عام ہے کہ خواہ کسی واقعی معاملہ کی بنا پر حاصل ہو یا آپسی معاہدہ کی بنا پر، مثال کے طور پر مسجد کا امام و مؤذن، نظامت و تولیت، اوقاف اور حکومت کے مناصب جلیلہ، یہ عہدے (اور اس عہدہ کی بنا پر حقوق) ایک معاملہ اور عقد کے واسطے سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں جس کو عقد اجارہ کہتے ہیں۔ اسی طرح آپسی معاہدہ کی بنا پر کچھ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر بعض بلاد ہند میں پرائیویٹ بسوں، ٹیکسیوں وغیرہ میں نمبر وار ہر ایک کے جانے کی باری مقرر ہوتی ہے ان سب کا آپس میں معاہدہ ہوتا ہے کہ ایک کی باری میں کوئی دوسرا نہیں جاسکتا، یا مثلاً بعض علاقوں میں چہاروں اور بھنگیوں میں باہم معاہدہ ہوتا ہے، نالیوں اور پاخانے صاف کرنے اور کمانے کی باری خود وہ لوگ مقرر کر لیتے ہیں، اسی کے قریب قریب ایام حج میں مطوفین کے مناصب و عہدے ہوتے ہیں کہ ان میں بھی اسی طرح کا معاہدہ ہوتا ہے۔

اصولی حیثیت سے اس قسم کے حقوق کی بیع و شراہ تو یقیناً جائز نہیں کیونکہ یہ حقوق مال نہیں اور نہ ہی ان پر مال کی تعریف صادق ہو سکتی ہے، اور نہ ہی عرف میں اس کو مال سمجھا جاتا ہے، اور اس قسم کے حقوق کی بیع کا تعامل بھی نہیں (بالعوض)۔ ائمہ اربعہ میں سے کسی مذہب میں اس کے جواز کی تصریح نہیں گذری۔

اس قسم کے بعض حقوق اور اس کے بیع و شراہ کے عدم جواز کی تصریح حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمائی ہے۔ (حسن العزیز ۴۳۰.....)

البتہ اس قسم کے حقوق سے دستبردار ہو کر مال کے ذریعہ صلح کرنے کی اجازت ہے جس کی واضح دلیل حضرت حسن و معاویہ رضی اللہ عنہما کا عمل ہے جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اسی عہدہ سے دستبردار ہو کر مال کے عوض صلح فرمائی تھی جس پر صحابہ نے سکوت فرمایا۔ گویا یہ جواز اجماعی شئی ہے۔ واللہ اعلم

علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں اس واقعہ اور حدیث کے تحت فرماتے ہیں: ”وفیہ جواز خلیفۃ الخلیفۃ نفسہ اذ ارأی فی ذلک صلاحاً للمسلمین، وجواز أخذ المال علی ذلک واعطائه بعد استیفاء شرائطہ الخ (عمدة القاری: ابواب الفتن ۲۰۲، ۲۰۳)۔“

فقہاء حنفیہ نے بھی اس قسم کے حقوق سے دستبردار ہو کر مال کے عوض صلح کرنے کی اجازت دی ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفی ”الاشباہ“ میں فرماتے ہیں:



”لکن أفتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال“ (در مختار شامی ۴۰۵۱)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں:

”رأیت بخط بعض العلماء عن المفتی أبی سعود أنه أفتی بجواز أخذ العوض فی حق القرار و التصرف و عدم

الرجوع“ (شامی ۴۰۵۱)۔

شافعیہ کے نزدیک بھی تنازل عن الحق کی وجہ سے صلح بالعوض کی گنجائش ہے (نہایۃ المحتاج ۵/۷۸۷)۔

خلاصہ کلام:..... یہ کہ معاملہ و معاہدہ کی بنا پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کی بیع و شراء جائز نہیں، البتہ تنازل عن الحق کی وجہ سے مال کے عوض میں صلح کرنے کی اجازت ہے، لہذا اگر اس قسم کے حقوق کی بیع کا تعال و عرف عام ہو جائے اور جہالت و غرر وغیرہ کوئی دوسرا مانع نہ پیش آئے تو اس وقت اس کے بیع کی بھی گنجائش ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم

ضروری تحقیق:

اتنی بات ابھی باقی رہ جاتی ہے کہ اگر تنازل عن الحق بالعوض کے علاوہ اگر کوئی شخص از خود اپنا حق ساقط کر دے، اور بغیر کسی عوض لئے ہوئے خود دستبردار ہو جائے تو آیا اس کا حق ساقط ہو جائے گا یا باقی رہے گا، یعنی ساقط کر دینے کے بعد بھی مطالبہ کا حق ہوگا؟ کتب فقہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے حقوق ساقط کرنے سے بھی ساقط نہیں ہوتے بلکہ باقی رہتے ہیں (رسائل ابن نجیم ۱۳۲، پندرہواں رسالہ)۔

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے، بہت سے مسائل میں اس کے خلاف بھی ہے۔ واللہ اعلم

حقوق الاولویت:

حقوق عرفیہ کی تیسری قسم حق اولویت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کسی عام اور مباح شئی پر قبضہ کر کے حق تملک اور حق تصرف و حق اختصاص حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی ایک ایسی شئی یا منفعت جس کو حاصل کرنے کا ہر ایک مجاز و مختار تھا لیکن ایک شخص نے کوشش کر کے اس کو اپنے لئے خاص کر لیا تو یہ اس کا حق ہے دوسرا کوئی شخص اس حق کو سلب نہیں کر سکتا۔

”قال النبی ﷺ: من سبق إلى ما لم يسبق إليه مسلم فهو أحق به“ (رواہ ابوداؤد)۔

مثال کے طور پر ارض موات (نا قابل کاشت بنجر زمین)، اگر کسی شخص نے اس زمین میں محنت کر کے اس کو قابل کاشت بنا لیا تو وہ اس کا مستحق و مالک ہے یا مثلاً جنگل سے لکڑیاں لانا، دریا یا کاپانی یہ سب مباح الاصل ہیں، جو شخص بھی اولاً قبضہ کر لے وہی اس کا مستحق ہوگا، دوسرا کوئی شخص اس کو سلب نہیں کر سکتا۔ یا مثلاً پانی پلانے کے گھاٹ پر جو پہلے پہنچ جائے وہی اس کا زیادہ مستحق ہے۔

اس قسم کے حقوق کی بیع کے جواز و عدم جواز کی بابت فقہاء حنفیہ کی تصریح نظر سے نہیں گذری، اور دیگر ائمہ کی دونوں قسم کی مختلف روایات ہیں، یہی حال تنازل عن الحق کا ہے۔

حقوق اولویت کی قسمیں:..... غور کرنے سے مسئلہ کی مزید تنقیح و تفصیل یوں سمجھ میں آتی ہے کہ حقوق اولویت کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا تعلق عبادات سے ہے۔ دوسرے وہ جن کا تعلق انسان کی ذاتی ضرورت و مصلحت اور حالات و معاملات سے ہے۔

پہلی قسم:

پہلی قسم جس کا تعلق عبادات سے ہے مثلاً کسی شخص کا صف اول میں جگہ حاصل کر لینا، یا تراویح میں قرآن پاک سنانے کے لئے پہلے کسی شخص کا اس منصب کو حاصل کر لینا وغیرہ وغیرہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کے حقوق اولویہ متعلقہ عبادات میں ایثار کرنا تو جائز ہے، گو افضلیت میں اختلاف ہے، لیکن ایسے حق اولیت کو فروخت کرنا یا بطور صلح کے عوض میں مال لینا درست نہیں، کیونکہ یہ از قبیل عبادات ہے جس کے ذریعہ کسی طرح کا معاوضہ لینا درست نہیں۔

البتہ وہ عبادات جن میں فقہاء کرام نے معاوضہ لینے کی اجازت دی ہے مثلاً امامت یا موذنی اور مدرسہ وغیرہ، تو اس میں وہ تفصیل ہوگی جو ماقبل میں گذری، یعنی یہ کہ بیع و شراء تو جائز نہیں البتہ تنازل عن الحق کا معاوضہ درست ہے۔ واللہ اعلم

دوسری قسم:..... حقوق اولویہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کی ذاتی ضروریات اور منافع سے ہے۔ یعنی ایسی ضرورت و منفعت کہ جس کے حاصل کرنے کا ہر شخص کو اختیار ہے لیکن ایک شخص نے جدوجہد اور محنت کے ذریعہ اس کو حاصل کیا اور اس بناء پر اس کو حق اسبقیت حاصل ہو گیا۔ اس قسم کے منافع اور حقوق کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

### پہلی صورت:

یا تو وہ منافع و حقوق ذریعہ تمول بھی ہیں اور عرف میں اس کی حیثیت مال کی سمجھی جانے لگی ہے، اور وہ ذخیرہ اندوزی اور وقت پر انتفاع کے قابل بھی ہیں، یعنی ان پر مال کی تعریف صادق آسکتی ہے۔ تو ایسے حقوق کی بیع و شراء بھی جائز ہے، کیونکہ یہ حقوق اعیان کے حکم میں ہو کر مال میں داخل ہو گئے۔

مثال کے طور پر حق طباعت، حق تصنیف و تالیف، کمپنیوں کے رجسٹرڈ ناموں کی خرید و فروخت یا نئی ایجادات، جدید تحقیقات، کسی مرض کے نئے نسخے اور مفید فارموں کی بیع و شراء۔

دراصل یہ حقوق و حقوق اولویت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شخص بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور اس نے ایسا اکتشاف یا جدید تحقیق کی جو ذریعہ تمول ہے یعنی عرف میں اس کی قدر و قیمت ہے، بازاروں میں اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اور نئی تحقیق، نسخہ، فارمولہ وغیرہ ایسا ہے کہ جس کو محفوظ رکھ کر کسی زمانہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یعنی اس کا اڈا خارجی ہو سکتا ہے۔

الغرض جو شان مال کی ہوتی ہے وہ اس میں بھی پائی جاتی ہے۔ تو ایسے حقوق کی بیع بلاشبہ درست ہے جس کے جواز کی تصریح بڑی تحقیق کے ساتھ مولانا محمد تقی صاحب نے بھی فرمائی ہے (بیع الحقوق الجردہ ۴۳، ۴۵)۔

### دوسری صورت:

یعنی وہ حقوق اولویہ جن کو کسی شخص نے محنت و مشقت سے حاصل کیا لیکن اس میں بقا اور ذخیرہ اندوزی کی شان نہ پائی جاتی ہو اور عرف میں بھی اس کو مال نہ کہا جاتا ہو۔

مثال کے طور پر ٹرینوں اور بسوں میں ہر سفر کرنے والے کو سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اب اگر کسی شخص نے پہلے آ کر یا جدوجہد کے بعد کوئی سیٹ حاصل کر لی تو اس کو حق اولیت حاصل ہو گیا، دوسرا کوئی شخص اس حق کو سلب نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہو سکتی ہیں۔

اس قسم کے حقوق اولیہ کو اگر صاحب حق فروخت کرنا چاہے تو اس کی اجازت نہیں کیونکہ یہ کوئی ایسا حق نہیں جو عرفاً مال سمجھا جاتا ہو اور جو ذخیرہ اندوزی کے قابل ہو، البتہ تنازل عن الحق کے نتیجہ میں صلح بالعوض کی اجازت ہوگی۔ واللہ اعلم





## بیع حقوق

مولانا عبداللہ طارق

حقوق کی بیع و شراء کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ قدیم زمانے میں اس کا تصور ہی نہ تھا، لیکن یہ درست ہے کہ اس وقت اس کا رواج کم تھا، اس لئے کتب فقہ میں اس کی تفصیلات بالخصوص اس کی جدید جزئیات کے احکام درج نہیں، قدیم زمانے میں بیع و شراء عموماً صرف مال کی ہوتی تھی، اور کم از کم فقہاء حنفیہ نے مال کی تعریف میں کسی چیز کا محفوظ ہو سکنا اور اس کا لائق قبضہ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ زمانہ قدیم میں حقوق کے تحفظ اور ان پر قبضے کا کوئی تصور نہ تھا اس لئے حقوق کو نہ مال کی تعریف میں شامل سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی بہت سے فقہاء کے یہاں ان کی خرید و فروخت کا کوئی تصور تھا۔ آج جدید بین الاقوامی قوانین کے وسیع پیمانے پر تعین و انضباط نے حقوق کے تحفظ کو بھی ممکن بنا دیا ہے اور ان کے قبضے کو بھی ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر قابل عمل بنا دیا ہے، اب ان کا قبضہ بھی ممکن ہو گیا ہے ان کی خرید و فروخت بھی، ان کا ہبہ بھی، اور ان کا کچھ مدت معینہ کے لئے کسی کو دے دینا اور پھر اس سے واپس لے لینا یہ سب کچھ ممکن ہو گیا ہے۔

مال کی تعریف میں بعض فقہاء نے اس کا قابل اذکار اور کچھ مدت کے بعد اس کا لائق انتفاع ہونا بھی بیان کیا ہے، اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کا تعلق ہر شئی کی اپنی طبعی کیفیت اور اس کے طریقہ اذکار سے ہے، خود علامہ شامی کے کلام میں یہ بات موجود ہے کہ ”ان الانتفاع بالمال یعتبر فی کل شیء بما یصلح له“ یعنی ہر چیز کا انتفاع اور اذکار اس کے حسب حال ہی ہوتا ہے۔ کل تک سبزیاں اور پھل قابل اذکار نہ تھے آج جدید وسائل نے ان کو قابل اذکار بنا دیا۔

یہ بات طے ہے کہ بیع کی مذکورہ بالا تعریف منصوص نہیں بلکہ لوگوں کے تعامل کی روشنی میں طے کی گئی ہے، اور فقہاء نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ کسی شئی کی مالیت ثابت ہونے کے لئے تمام لوگوں کا یا کچھ لوگوں کا عرف اور تعامل دیکھا جائے گا، علامہ شامی نے رد المحتار، جلد رابع کتاب البیوع کے شروع ہی میں کہا ہے کہ ”والمالیة تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم۔“ ابن قدامہ نے احیاء ارض میت کے متعلق لکھا ہے کہ ”الإحیاء ما تعارفه الناس إحياء (جلد ۵، ۵۹۱) پھر اس کے قبضے کے متعلق بھی انہوں نے عرف ہی کو دلیل بنایا ہے، لکھتے ہیں: ”لما ورد باعتبار القبض والحرز ولم یبدین کیفیتہ کان المرجع فیہ الی العرف (جلد ۵ ص ۵۹۱) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جن جن حقوق کو جدید حالات میں لوگوں نے مال کی حیثیت دیدی ہے جب تک کسی شرعی امر سے تصادم نہ ہو از روئے شرع بھی ان کو مال ہی تسلیم کیا جانا چاہیے، اور شریعت کی عام ہدایات کی روشنی میں ان کی خرید و فروخت کی بھی دیگر اموال ہی کی طرح اجازت ہونی چاہیے۔

اب تک یہ گفتگو بیشتر فقہ حنفی کی بنیاد پر تھی، شوافع میں قاضی بیضاوی کے حوالے سے، حنابلہ میں صاحب کشاف القناع جلد ۳ ص ۳۹۱ کے حوالے سے خود سوال نامے میں صفحہ ۲ پر یہ بات نقل کی گئی ہے کہ ان کے یہاں مکان کی چھت پر تعمیر کا حق بھی قابل فروخت اشیاء میں سے ہے، قریب قریب یہی حال فقہاء مالکیہ کا ہے۔

اسی ضمن میں کتاب یا کسی مخصوص ڈیزائن وغیرہ کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ بھی آتا ہے۔ اس بارے میں علماء ہند و پاکستان کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ میں نے جہاں تک تجزیہ کیا ہے علماء کرام میں جن حضرات کو دنیا نے نشر و اشاعت سے ذاتی طور پر براہ راست واسطہ رہا وہ بیشتر تحفظ حقوق کے جواز کی طرف گئے ہیں جیسے:



استاذ الکل مولانا احمد علی محدث سہارنپوری صحیح و صحیح بخاری۔ مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ صاحب۔ مفتی صاحب موصوف کے شاگرد مفتی عبد الغنی صاحب سابق مفتی مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی (تلمیذ مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی) (عطر الہدایہ ص ۱۹۲)

اور موجودہ دور کے مفتیان کرام میں جہاں تک میرے علم میں ہے: مفتی عبد الرحیم صاحب لاچپوری (فتاویٰ رحیمیہ، جلد ۳ ص ۲۲۳ تا ۲۲۵) مولانا نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند (نظام الفتاویٰ ص ۱۲۸) اور مولانا تقی عثمانی (پاکستان) بھی یہی رائے رکھتے ہیں، اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے اکثر ممالک اسلامیہ کے علماء کا عمل بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔

لیکن دوسرے حضرات جو تحفظ حقوق کو درست نہیں مانتے ان کے سامنے دو دلیلیں مشہور ہیں:

اول تو یہ کہ تحفظ حقوق سے علم کا دائرہ اور اس کی افادیت محدود ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ جب ایک شخص نے کسی کتاب کا ایک یا چند نسخے خرید لئے یا کسی ڈیزائن کی مطبوعہ یا مصنوعہ کا پی یا آئٹم خرید لیا تو وہ اس کا مالک ہو گیا، اور اسے اس میں ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہو گیا، اس کے اوپر کسی بھی نوع کی پابندی لگانا اس کے جائز حق سے باز رکھنا ہے۔

پہلی دلیل کا جواب تو یہ ہے کہ اگر ناشر اول مطلوبہ مقدار میں کتاب کے نسخے فراہم کرنے کے لئے تیار ہے تو جسے بھی ضرورت ہو وہاں سے خرید کر استفادہ کر سکتا ہے، تحفظ حقوق کے ذریعہ کتاب سے ”علمی انتفاع“ پر پابندی نہیں لگتی۔ اس کے برخلاف دوسری طرف حقوق محفوظ نہ ہو سکنے کی صورت میں ضرور اندیشہ ہے کہ مصنف اپنے علمی کارنامے سے مالی منفعت حاصل کر کے جو مزید علمی خدمات کے لئے فراغت و آسودگی پاسکتا تھا وہ نہ پاسکے گا اور اپنی معاش کے لئے کچھ اور کرنے پر مجبور ہوگا جو اسے علمی سفر سے روکنے کا ذریعہ بنے گا۔

ہاں اگر مصنف یا ناشر یا کوئی کمپنی جس کے پاس کتاب یا ڈیزائن وغیرہ کے حقوق ہیں وہ نہ کسی دوسرے کو اجازت دیتا ہے اور نہ خود بقدر ضرورت سپلائی کرتا ہے تو امام کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس سے اس قبضے کو لے لے اور عمومی نفع کے لئے اس کی تیاری کا کسی دوسرے کو مجاز بنا دے (دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۵۷۹/۵)۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اپنی مملوکہ شئی پر اسے ہر طرح کے تصرف کا حق ہے، اس کا عمدہ جواب مولانا تقی عثمانی صاحب نے دیا ہے کہ تصرف کے اس حق میں اس جیسی دوسری چیز تیار کرنے کا حق شامل نہیں ہے، ایک شخص ایک کرنسی نوٹ کا مالک ہوتا ہے اس پر اسے ہر طرح کا تصرف حاصل ہے لیکن اسے اسی جیسے دوسرے نوٹ چھاپ کر بیچنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس قسم کے حقوق کا مالکانہ اختیار و تحفظ کے لئے حضرت اسر بن مضر س الطائیؓ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو سنن ابی داؤد (کتاب الخراج، قبیل باب احياء الموات ۲/۴۳) میں نقل کی گئی ہے، اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ (۱/۴۱) میں اس کی سند کو حسن کہا ہے، اس میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”من سبق الی ما لم یسبقہ الیہ مسلم فهو له۔“

یہ ارشاد نبوی ﷺ اگرچہ احياء الموات کے سیاق میں ہے لیکن عام قاعدہ ہے: ”العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔“ اسی لئے اگرچہ امام بیہقی نے اس کو احياء الموات کے ساتھ مخصوص کیا ہے، لیکن علامہ عبدالرؤف المناوی فرماتے ہیں کہ دیگر اہل علم نے اس کے الفاظ کے عموم کی وجہ سے مختلف چشموں، کنوؤں اور معادن وغیرہ کے لئے بھی اس کو مستدل مانا ہے (فیض القدير ۶/۱۳۸)۔

ابن قدامہ نے اس کے قریب المعنی ایک اور روایت نقل کی ہے: ”من أحيى أرضاً ميتة في غير حق مسلم فهي له۔“ اس کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ اگر کسی زمین کے ساتھ کسی مسلمان کا حق وابستہ ہو گیا تو اب دوسرے کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں رہا۔

”إذا تعلق بها حق مسلم لم يجز إحياءها“ (المغنی جلد ۵ ص ۵۸۰)۔

”معاملہ رخلع“ بھی اس سلسلے میں ایک اچھا مستدل ہے، وہاں بھی ”حق فسخ نکاح“ جو مرد کا حق ہے وہ اسے عورت کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔

اس باب میں حدیث و سیرت کی کتابوں میں ایک اہم اثر بھی ملتا ہے جو میرے خیال میں بیع حقوق کے جواز کے بارے میں ہمارے لئے ایک اچھا استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت عاتکہ بنت عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہ بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اور یہ ان سے غایت درجہ محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ سے یہ معاملہ کیا کہ تم میرے بعد کسی سے شادی نہ کرنا اور اس کے عوض انہوں نے اپنی اہلیہ کو ایک باغ دیا، حضرت عبداللہ کے انتقال کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ: ”قد أعطانی حدیقة علی أن لا أتزوج بعده“

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ اس بارے میں فتویٰ لیں، چنانچہ حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فتویٰ پوچھا، انہوں نے فرمایا: ”رُذِيَ الْحَدِيقَةُ إِلَى أَهْلِهِ وَتَزَوَّجِي“ (کنز العمال، جلد ۲۲ ص ۱۱۷ بحوالہ وکیع، الاصابة جلد ۲ ص ۲۵۷ بحوالہ ابن سعد، قال الحافظ ابن حجر اسنادہ حسن)۔

عورت کو ایک شوہر کی وفات کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کا جو حق حاصل ہے یہی حق یہاں ایک باغ کے عوض فروخت کیا تھا۔

یہ معاملہ کرنے والے دونوں فریق شرف صحبت سے مشرف ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس معاملہ کو باطل قرار دینے کے بجائے اس پر فتویٰ حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اس بیع کو باطل نہیں قرار دیا بلکہ شمن واپس کرا کر معاملے کو فسخ کرایا ہے۔

خلاصہ بحث یہ کہ بنیادی طور پر حقوق کی بیع درست معلوم ہوتی ہے سوائے اس کے کہ کسی معاملے کی کسی خاص شکل میں کوئی شرعی قباحت پائی جائے تو اس کا حکم الگ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم



## بیع کی حقیقت اور حقوق کی بیع

مولانا محمد طاہر مدنی

بیع کے لغوی معنی کی وضاحت قرطبی نے ان الفاظ کے ذریعہ کی ہے:

”البيع في اللغة، مصدر بآء كذا بكذا، أي دفع عوضاً وأخذ معوضاً، وهو يقتضي بائعاً وهو المالك أو من ينزل منزلته ومتباعاً وهو الذي يبذل الثمن ومبيعاً وهو المشموت وهو الذي يبذل في مقابلة الثمن“ (الجامع لاحكام القرآن للقرطبي ۲، ۲۵۲)۔

بیع کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں سلف کے مختلف اقوال ہیں، ان میں چند کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

۱۔ عند الحنفية: مبادلة مال بمال على وجه مخصوص، أو هو مبادلة شيء مرغوب فيه بمثلته على وجه مفيد مخصوص بايجاب أو تعاط.

۲۔ وعرفه النووي في المجموع: البيع مقابلة مل بمال تملكاً.

۳۔ وعرفه ابن قدامة في المغني: مبادلة المال بالمال تملكاً ونقلًا عن الفقه الاسلامي وادلته ۴، ۲۲۳-۲۲۵)۔

۴۔ وعرفه ابن حجر: والبيع نقل ملك إلى الغير بثمن والشراء قبوله ويطلق كل منهما على الآخر (فتح الباري ۵، ۱۹۱)۔

ابتدائی تین تعریفوں میں اگرچہ ”مال“ کا لفظ قدر مشترک کے طور پر موجود ہے لیکن چونکہ مال کی تعریف میں حنفیہ اور جمہور کے درمیان اختلاف ہے، اس لئے اس ظاہری اشتراک کے باوجود بیع کی حقیقت کے تعین میں اختلاف موجود ہے جیسا کہ آگے مال کی تعریف کے سلسلے میں مختلف اقوال کی وضاحت آرہی ہے۔

بیع کی مذکورہ اصطلاحی تعریفوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابن حجر کی تعریف انتہائی جامع و مانع ہے۔ ”ملک“ کا لفظ مادی و معنوی ہر طرح کی اشیاء کو شامل ہے اور ”نقل ملک“ کی تعبیر ایجاب و قبول، تعاطی اور جو شکلیں بھی بیع کی ہو سکتی ہیں سب کے لئے اپنے اندر گنجائش رکھتی ہے۔ امام شافعی نے بیع کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ”اجارہ“ کی توضیح میں فرمایا:

”والإجارات صنف من البيوع، لأن البيوع كلها إنما هي تملك من كل واحد منهما لصاحبه، يملك بها المستأجر المنفعة التي في العبد والبيت والدابة إلى المدة التي اشترط حتى يكون أحق بالمنفعة التي ملك من مالها ويملك بها مالك الدابة والبيت العوض الذي أخذه عنه، وهذا البيع نفسه“ (الام ۲، ۲۵۱ نقلًا عن تخريج الفروع ۲۳۰۶)۔

قرآن مجید سے بیع و تجارت کے سلسلے میں بنیادی طور پر جس شرط کا پتہ چلتا ہے وہ باہمی رضامندی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالِكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ“ (النساء ۲۹)۔

لہذا اس شرط کے علاوہ بقیہ اشیاء میں عرف کا لحاظ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں یہ تصریح کی ہے: ”فكل ما عدّه الناس بيعاً فهو بيع“ (فتاویٰ ۸، ۲۹)۔

۱۔ استاذ جامعة الفلاح بلریانج۔



بیع کی تعریف کے ضمن میں چونکہ مال کا لفظ آیا ہے، لہذا مال کی حقیقت کے سلسلے میں علماء کے اقوال کا ذکر ضروری ہے۔

۱۔ عند الحنفیہ: ”ہو کل ما یمن حیازتہ وإحرازہ و ینتفع بہ عادة و تثبت المالیة بتمول الناس کلہم أو بعضہم“ (البحر الرائق، رد المحتار)۔

وعرفہ ابن عابدین: ”المان ہو ما یمیل إلیہ طبع الإنسان و یمکن ادخارہ إلی وقت الحاجة، منقولاً کان أو غیر منقول“ (رد المحتار) (نقلاً عن الفقه الاسلامی وادلتہ ۲، ۳۱-۳۰)۔

۲۔ عند الجمهور: ”ہو کل مالہ قیمۃ یلزم متلفہ بضمانہ۔“

ان دونوں تعریفوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حنفیہ نے مال کو مادی چیزوں میں محصور کر دیا ہے، معنوی اشیاء ان کی تعریف کی روشنی میں مال نہیں ہیں، جبکہ جمہور نے مال کی جو تعریف کی ہے وہ مادی و معنوی ہر طرح کی اشیاء کو شامل ہے۔ اور یہی تعریف قابل ترجیح ہے، کیونکہ اشیاء سے اصل مقصود تو منافع ہی ہیں۔ عرف عام میں بھی اسی کا رواج ہے۔

جمہور نے مال کی جو تعریف کی ہے اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سورہ نساء میں محرمات کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَأَجَلَ لَكُمْ مَا وَرَأَىٰ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ“ (النساء: ۲۴) گویا جواز نکاح کیلئے ابتغاء بالمال کی شرط لگائی۔ حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ کی روایت ہے کہ ایک صحابی نے اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، ان کا نکاح آپ نے ایک صحابی سے تعلیم القرآن کے عوض میں پڑھایا اور فرمایا: ”قد انکحتکھا بما معک من القرآن“ (موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد ترمذی)۔

سورہ نساء کی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم رسول اکرم ﷺ کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تعلیم القرآن کو جو ایک معنوی شے ہے ”ابتغاء بالأموال“ کے ضمن میں رکھا۔ اسی طرح بخاری و مسلم کی اس روایت: ”ان رسول اللہ ﷺ اعتق صفیة وجعل عتقھا صداقھا“ سے بھی اس سلسلے میں استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

حق کی تعریف اور اس کی بیع:

حق کے لغوی معنی ثبوت و وجوب کے ہیں۔ اور اصطلاحاً اس کی بہترین تعریف وہ ہے جو الشیخ مصطفیٰ الزرقاء نے ان الفاظ میں کی ہے: ”الحق هو اختصاص یقرر بہ الشرع سلطۃ أو تکلیفاً“ یعنی حق ایک ایسا خصوصی تعلق ہے جس کی وجہ سے شریعت کوئی اختیار یا ذمہ داری دیتی ہے۔ یہ تعریف بہت جامع تعریف ہے، اس میں جملہ شرعی حقوق آجاتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر، حقوق بدنہ جیسے حق ملکیت، حقوق ادبیہ جیسے حق طاعت، حقوق مالیہ جیسے حق نفقہ اور حقوق معنویہ جیسے ولایت علی النفس۔

وہ اختیارات جو شرعی دلائل کی روشنی میں حاصل ہوتے ہیں ان کی دو اقسام ہو سکتی ہیں: حقوق مجردہ اور حقوق مقررہ۔

۱۔ حقوق مجردہ وہ حقوق ہیں جو دفع ضرر کے لئے مشروع ہیں جیسے حق شفعہ، یہ حقوق نہ تو فروخت کئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی ان سے تنازل بالمال ہی جائز ہے، کیونکہ یہ مشروع ہی دفع مضرت کے لئے ہوتے ہیں۔ آدمی اگر ان کی بیع یا ان سے تنازل کے لئے تیار ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کوئی مضرت نہیں ہے، لہذا استحقاق ہی ختم ہو جائے گا۔

۲۔ حقوق مقررہ وہ حقوق ہیں جو مستحقین کے لئے اصلاً ثابت ہیں جیسے ولی کے لئے حق قصاص، شوہر کا حق استدائمہ عقد النکاح، اور غلام کے مالک کا حق اپنی ملکیت کو باقی رکھنے کے سلسلے میں۔ یہ وہ حقوق ہیں جن کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔

البتہ ان میں وہ حقوق جو خالص مادی نوعیت کے ہیں اور قابل انتقال ہیں، ان کے معاوضہ کی دونوں شکلیں جائز ہیں یعنی بیع اور تنازل بالمال، جیسے مالک رقیق کا حق استدائمہ الرق، رہے وہ حقوق جن کے اندر معنوی پہلو ہے اور وہ قابل انتقال نہیں ہیں، تو ان کی بیع تو جائز نہیں ہے، البتہ ان سے تنازل بالمال جائز ہے، جیسے ولی کا حق قصاص، شوہر کا حق استدائمہ عقد الزواج وغیرہ۔

## حق تالیف اور اس کی بیع:

موجودہ عہد میں ادبی و فکری حقوق کا جو تصور پیدا ہوا ہے اس سلسلے میں حق تالیف اور اس کی بیع کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر جواز اور عدم جواز کے قائلین دونوں نے بہت کچھ لکھا ہے، ذیل میں ہم بالاختصار دونوں طرح کے دلائل ذکر کرتے ہیں:

## مانعین جواز کے دلائل:

- ۱۔ تعبد بالعرض جائز نہیں ہے، اور علم ایک عبادت ہے، تصنیف و تالیف بھی عبادت ہے لہذا اس پر معاوضہ لینا جائز نہیں۔
- ۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”من کتم علماً یعلمہ أجمع یوم القیامة بلجام من النار“ (رواہ ابوداؤد والترمذی)۔

اور حق تالیف کے ذریعہ کتابوں کی اشاعت و ترویج پر قدغن لگانا یہ بھی کتمان علم میں داخل ہے۔

۳۔ حق تالیف کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو اس میں امت کا فائدہ ہے۔ کتابوں کی نشر و اشاعت اور ترویج کی عام شکل اس سے پیدا ہوگی۔

جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حالات و ظروف کے لحاظ سے بر بنائے ضرورت اس میں استثناء موجود ہے جیسا کہ تعلیم القرآن بالاجرة کے سلسلے میں عام فقہاء نے جواز تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح کتمان علم کی بات تو اس وقت ہوتی جب مؤلف اپنی تصنیف سے فائدہ اٹھانے اور اس کو پھیلانے سے روکے۔ یہاں تو صرف وہ دوسرے ناشرین کو اس کتاب کی اشاعت سے روک رہا ہے۔ اور یہی بات کہ یہ حق نہ تسلیم کرنے میں امت کا فائدہ ہے تو تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ اس میں نقصان زیادہ ہے۔ ناشرین صرف تجارتی نقطہ نظر سے نشر و اشاعت کا کام کرنے لگتے ہیں اور کتاب کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

## قائلین جواز کے دلائل:

۱۔ اپنی تالیف و تصنیف پر مؤلف کا حق ایک فطری حق ہے، ایک مصنف اپنے ذہن و دماغ کی صلاحیتوں کو لگاتا ہے اور اپنے نتائج فکر کو ایک تصنیف کی شکل دیتا ہے، تو ظاہر ہے وہ تصنیف اس کا خالص حق ہے جس کا معاوضہ لینے کا اسے پورا پورا حق ملنا چاہیے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے رقیہ کے سلسلے میں: ”إن أحق ما أخذتم علیه أجرأ کتاب اللہ“ جب قرآن کے سلسلے میں یہ بات ہے تو سنت کے بارے میں بدرجہ اولیٰ ہونا چاہئے۔ اور جب قرآن و سنت کے سلسلے میں یہ اجازت ہے تو ان سے مستنبط علوم و معارف پر مشتمل مولفات کے سلسلے میں بدرجہ اولیٰ یہ اجازت ملنی چاہیے۔

۲۔ سہل بن سعد الساعدیؓ کی مذکورہ حدیث جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن کو صدق بنایا، اس سے بھی حق تالیف کے سلسلے میں استدلال کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جب تعلیم قرآن استحلال البضاع کا عوض بن سکتی ہے تو قرآن کی تعلیم و اشاعت پر عوض لینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، اور مفید علوم پر مشتمل مصنفات پر عوض لینا اولیٰ تر ہوگا۔

۳۔ تصنیف و تالیف کا کام ذہن و دماغ اور ہاتھ اور قلم کے اشتراک سے عمل میں آتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”أطیب الکسب عمل الرجل بیدہ وکل یبع مبرور“ (أخرجہ أحمد)۔

چنانچہ ہر عمل مباح اطیب الکسب میں داخل ہے۔

۴۔ علماء متقدمین کے طرز عمل سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ اپنی مولفات کے ساتھ شئی مملوک کا برتاؤ کرتے تھے۔ چنانچہ الحافظ ابو نعیم الاصبہانی نے اپنی کتاب ”الخلیۃ“ اتنی قیمت میں فروخت کی جو صرف کاغذ اور نسخے کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ (ذکرہ اسخادی ۲/۳۸۷)

۵۔ مولفات بھی مال کی عمومی تعریف میں داخل ہیں۔ اور مال اصلاً اس کا حق ہونا ہے جو اس کے وجود پذیر ہونے کا ذریعہ بنے۔ اس اصول میں کوئی تخصیص بغیر کسی صریح دلیل کے مناسب نہیں ہے۔



۶۔ حق تالیف کے سلسلے میں مسلم اصول "درء المفسد مقدم علی جلب المنافع" سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ کتابوں کا حق طبع اگر محفوظ نہ کیا جائے تو مادہ پرست ناشرین ان کو صرف دولت سمیٹنے کا ذریعہ بنا لیں گے اور صحیح و اہتمام کے بغیر مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو نکالنے کی کوشش کریں گے، جبکہ حق طبع کو محفوظ کر کے ان مفسد کا انسداد ہو سکتا ہے۔

۷۔ جب تصنیف صاحب تصنیف کی ملکیت ہے تو اسے اپنی ملکیت پر مالکانہ تصرفات کا حق ملنا چاہیے۔

۸۔ بعض محدثین کے سلسلے میں یہ بات ملتی ہے کہ وہ تحدیث کی اجرت لیتے تھے یا اپنی روایت بیان کرنے کی اجازت بغیر عوض کے نہیں دیتے تھے، اس طرز عمل کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا کہ ان کا اعتبار کم ہوا ہو، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہل علم کے نزدیک ان کا یہ عمل جائز تھا۔

۹۔ حق تصنیف و تالیف کو تسلیم کرنے اور اس پر مالکانہ تصرفات کا حق مؤلف کو دینے سے مصنفین کی ہمت افزائی ہوتی ہے، اور یہ چیز علمی کاوشوں کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ خلفاء و ملوک مصنفین و مؤلفین کو جو انعامات سے نوازتے تھے وہ اسی قبیل کی چیز ہے۔ اور اس پر برابر عمل رہا، کسی نے کوئی نکیر نہیں کی۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ابتداء عہد نبوی سے ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن زہیر کو ان کے قصیدے پر خوش ہو کر اپنا بردہ بطور انعام دیا۔

۱۰۔ حق تالیف و تصنیف حقوق مقررہ میں سے ہے نہ کہ مجردہ میں سے۔ اس لئے اس میں استعاضہ جائز ہے۔

قائلین جواز کے مذکورہ دلائل پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں وزن زیادہ ہے اور یہی قول راجح ہے۔ اس سلسلے میں محدثین کے یہاں طرق تحمل کی جو روایت رہی ہے، اور جس کے بغیر روایت بیان کرنے کی اجازت کسی کو نہیں ملتی تھی اس سے بھی علوم و فنون کی کتابوں پر مصنفین کے مالکانہ حقوق کا پتہ چلتا ہے۔ اس ضمن میں امام شافعی کی مشہور کتاب "الرسالۃ" کے آخر میں ناخ الریح بن سلیمان صاحب الشافعی کے قلم سے اس کتاب کے نسخ و نقل کے سلسلے میں جو اجازت نامہ درج ہے اس کا مطالعہ بڑا اہم ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"أجاز الربیع بن سلیمان صاحب الشافعی، نسخ کتاب الرسالة وہی ثلاثة أجزاء فی ذی العقدہ سنة خمس و ستین و مأتین و کتب الربیع بخطه" (تحقیق النصوص ونشرها لعبد السلام ہارون ۲۶)۔

آخر میں ایک خدشہ جو بیان کیا جاتا ہے اس کا جائزہ بھی ضروری ہے، اندیشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ مؤلفین کو حق تالیف دینے کے نتیجے میں امت کا ان کا نتائج فکر سے مستفید ہونے کا دائرہ محدود ہوگا، اور اگر کوئی مؤلف اپنی تالیف کو شائع ہی نہ کرے تو بالکل محرومی ہوگی۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت کی جاسکتی ہے کہ تصنیفات و تالیفات پر دو طرح کے حقوق عائد ہوتے ہیں: ایک حق خاص، اور دوسرا حق عام۔

حق خاص سے مراد مؤلف کا اپنا ذاتی حق ہے۔ اس کے تحت دو قسمیں ہیں: ایک معنوی یعنی تصنیف کی نسبت کی ذمہ داری، اس میں پیش کردہ مباحث کی ذمہ داری وغیرہ آتی ہے۔ یہ وہ قسم ہے جس سے کسی طریقے سے بھی مؤلف دستبردار نہیں ہو سکتا۔ دوسری قسم مالی و اقتصادی ہے یعنی اپنی تصنیف کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں مالکانہ حقوق۔ اس قسم کی بیع بھی جائز ہے اور تنازل بھی۔

تصنیفات و تالیفات میں جو دوسرا حق عائد ہوتا ہے وہ حق عام ہے، یہ امت کا حق ہے، یعنی کسی مؤلف کی تالیف اور نتائج فکر سے استفادہ کا حق، اس میں کسی طرح بھی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ اور اس سلسلے میں درج ذیل ضمانتیں حاصل ہونی چاہیے:

۱۔ اقتباس کا حق

ب۔ ترجمہ کا حق

ج۔ اگر کوئی مصنف اپنی کسی ایسی کتاب کی اشاعت سے انکار کرے جو امت کے لئے مفید ہے تو حکومت کو یہ حق ملنا چاہیے کہ اس کتاب کی اشاعت کرے۔

اگر یہ ضمانتیں حاصل ہوں تو مذکورہ اندیشہ ختم ہو سکتا ہے، اور حق خاص اور حق عام دونوں توازن کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔

حق تصنیف و تالیف کے سلسلے میں یہاں جو باتیں عرض کی گئی ہیں انہیں کی روشنی میں تجارتی نام، ٹریڈ مارک، تجارتی لائسنس اور حق ایجاد وغیرہ کا حکم بھی متعین کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆



## بیع حقوق

مفتی محمد افضل حسین بستی

- ۱۔ بیع کی حقیقت ”مبادلة مال متقوم بمال متقوم تملیکاً و تملکاً بتراض“ ہے، شرح نقایہ للشیخ الیاس (۳/۲) میں ان ہی الفاظ سے بیع کی تعریف کی گئی ہے۔
- ۲۔ مال کی تعریف ملا مسکین شارح کنز الدقائق نے ان الفاظ سے کی ہے۔ ”المال ما یبیل الیہ الطبع و یسکن ادخاره لوقت الحاجة“ (کنز، ۲/۵۲۱)۔ اور شیخ الیاس شارح نقایہ نے ان الفاظ میں کی ہے: ”المال ما یجری فیہ التنافس والابتذال“ (شرح نقایہ للشیخ الیاس ۲/۲)۔ اور علامہ حسکفی نے اس طرح کی ہے: ”المراد بالمال عین یجری فیہ التنافس والابتذال۔“ (الدرالمنتقی، ص ۲۷، ۲) ان سب تعریفوں کا حاصل ایک ہی ہے، مال کی حقیقت میں عین ہونا داخل ہے۔ پس جو چیز عین نہ ہوگی اس کو مال نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے منافع اور حقوق مال کی حقیقت سے خارج ہیں۔
- ۳۔ ادخار کے معنی ذخیرہ کے اور محفوظ کرنے کے ہیں، پس کسی چیز کے قابل ادخار ہونے کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ چیز ذخیرہ کرنے اور محفوظ کرنے کے قابل ہو جیسے سونا، چاندی اور غلہ وغیرہ۔
- ۴۔ ۵۔ جو حقوق دفع مضرت کے لئے مشروع ہوتے ہیں (جیسے حق شفیعہ، زوجہ کے لئے حق قسم اور خیار مخیرہ وغیرہ) ان کی بیع جائز نہیں اور نہ ان کا معاوضہ لینا بطریق تنازل جائز ہے، اور جو حقوق اصلتہ ثابت ہوتے ہیں (جیسے حق قصاص، ملک نکاح اور ررق وغیرہ) ان کی بیع تو جائز نہیں، لیکن بطریق تنازل ان کا عوض لینا جائز ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۱۶/۴)۔
- حقوق متعلقہ بالاعیان (جیسے حق مرور اور حق شرب) کی بیع بہت سے متاخرین حنفیہ کے نزدیک جائز ہے بشرطیکہ جہالت وغیرہ نہ ہو، تو بطریق تنازل معاوضہ لینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، اور حقوق متعلقہ بالاعراض (جیسے حق تعلی) کی بیع جائز نہیں البتہ بطریق تنازل اس کا معاوضہ لینا جائز ہے (دیکھئے: فتح القدر ۶/۶، شرح الجملہ للآتاسی)۔
- ٹریڈ مارک اور حق طباعت وغیرہ کا حکم:..... آج کل حقوق کی بیع کا رواج ہو گیا ہے جیسے ٹریڈ مارک اور تجارتی نام، حق طباعت اور حق ایجاد وغیرہ کی بیع، ان حقوق کی بیع کا حکم معلوم ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اس کا حکم بیان کیا جاتا ہے۔
- ٹریڈ مارک اور تجارتی نام کا حکم:
- ٹریڈ مارک اور تجارتی نام کی بیع جائز نہیں، نہ رجسٹری کرانے سے پہلے اور نہ اس کے بعد، کیونکہ یہ نہ تو عین ہے اور نہ حق متعلق بالعیان ہے، اور جواز بیع کے لئے عین ہونا یا کم از کم حق متعلق بالعیان ہونا ضروری ہے، رجسٹری کرانے اور اس پر اچھا خاصا مال صرف کرنے سے یہ مال کے حکم میں نہیں ہو جائے گا۔ اس کا بجلی پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ بجلی اعیان میں سے ہے اور ٹریڈ مارک اور تجارتی نام اعیان میں سے نہیں ہے، پس لوگوں کے تمول کی بنا پر بجلی کو مال کہا جائے گا، اور ٹریڈ مارک اور تجارتی نام کو مال نہیں کہا جاسکتا۔
- البتہ بطریق تنازل اس کا عوض لینا جائز ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے ردالمحتار، جلد چہارم میں اس کو ثابت کیا ہے، پس بطریق تنازل اس کا بھی

عوض لینا جائز ہوگا۔ البتہ منقولہ کے لئے ضروری ہے کہ اس بات کی وضاحت اور اعلان کر دے کہ اس سامان کا تیار کرنے والا پہلا شخص نہیں ہے بلکہ دوسرا شخص ہے، اور ٹریڈ مارک اور تجارتی نام معاوضہ دے کر حاصل کر لیا گیا ہے، اور اسی جیسا یا اس سے اچھا سامان تیار کرے۔

ٹرسٹ:..... ٹرسٹ کا حکم بھی ٹریڈ مارک کی طرح ہے کہ بیع جائز نہیں لیکن بطریق تنازل معاوضہ لینا جائز ہے، بشرطیکہ حکومت کی طرف سے اس کی اجازت ہو، ورنہ جھوٹ اور دھوکہ کی وجہ سے تنازل بھی جائز نہ ہوگا۔

### حق ایجاد و حق طباعت:

حق ایجاد اور حق طباعت کی نہ تو بیع جائز ہے اور نہ بطریق تنازل معاوضہ لینا جائز ہے۔ کیونکہ ایجاد کردہ شئی کا مثل تیار کرنے کا ہر شخص کو حق ہے، اسی طرح کتاب کا مثل تیار کرنے کا ہر شخص کو حق ہے، حق اسبقیت اس شئی پر ثابت ہے اس کے مثل پر نہیں، مثل تیار کرنے کے حق میں سب برابر ہیں، جیسا کہ ارض موات میں کنواں کھودنے والا اس کنویں کا حقدار ہے، اور بعینہ اسی جیسا دوسرا کنواں تیار کرنے کا حق سب کو ہے اس کو بھی اور دوسروں کو بھی، بلکہ اس سلسلہ میں رکاوٹ پیدا کرنا اور حق محفوظ کرنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ یہ تطبیق علی العامہ ہوگی اور گرانی بدستور باقی رہے گی جو ان کے لئے تکلیف کا باعث ہے، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حق محفوظ نہ کرانے میں مصنف یا طابع اول کا ضرر ہے تو بھی یہ ممنوع ہی رہے گا، کیونکہ ضرر خاص ہے اور محفوظ کرانے میں ضرر عام ہے، اور ضرر عام کا ازالہ ضرر خاص سے زیادہ ضروری ہے، ضرر عام کو دفع کرنے کے لئے ضرر خاص کا تحمل کر لیا جاتا ہے۔

”یتحمل الضرر الخاص لأجل دفع الضرر العام“ (الاشباہ والنظائر ص ۸۷)۔

ڈھلے ہوئے پیسے کا مثل تیار کر کے اس سے خرید و فروخت کرنے میں اس کو قیاس کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اس کا مثل تیار کرنا بھی فی نفسہ منع ہے بلکہ اس کو حکومت کا ڈھالا ہوا پیسہ قرار دے کر استعمال کرنا منع ہے جس کا ارتکاب دوسرا ڈھالنے والا کرتا ہے۔ برخلاف طابع کے کہ وہ کتاب کا مثل تیار کرتا ہے اور طابع اول کی چھاپی ہوئی کتاب قرار دے کر استعمال نہیں کرتا، وہاں جھوٹ اور دھوکہ ہے یہاں نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔



## بیع حقوق کا مسئلہ

مولانا اختر امام عادل

عہد جدید نے ایسے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا تصور بھی پچھلے زمانوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پچھلے زمانے میں جس چیز کے اندر کسی مالیت کا تخیل تک نہ تھا۔ آج وہ بہترین سرمایہ حیات بن چکی ہے۔ پہلے ذخیرہ اندوزی کا بھی ایک خاص طریقہ تھا اور جب ادخار اور ذخیرہ اندوزی کی بات کی جاتی تھی تو ایک خاص قسم کا طریقہ کار ذہن میں رقص کرنے لگتا تھا، لیکن موجودہ دور میں ادخار کے ایسے نئے نئے طریقے پیدا ہو گئے ہیں کہ ایک وہ چیز جس کی حفاظت گذشتہ دنوں ایک دن بھی مشکل تھی۔ آج برسوں اس کو اپنی اصلی حالت میں رکھا جاسکتا ہے۔ وہ لطیف چیزیں جن کا ضبط و ادخار کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا، آج وہ آسانی محفوظ کی جا رہی ہیں۔

خرید و فروخت کا مفہوم پہلے محدود دائرہ اور محدود اشیاء میں جاری تھا۔ آج خرید و فروخت کے مفہوم میں جو عموم پیدا ہو گیا اس کا پچھلے دور سے کوئی تقابل ہی نہیں، اس عموم کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بیع کی اصطلاح تبدیل ہو گئی، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مبيعات اور قابل خرید و فروخت اشیاء کی بہت اب ہو گئی ہے، پہلے جن اشیاء کے اندر ثمنیت اور مالیت کا احساس تک نہیں تھا، آج وہ ثمنیت اور مالیت سے بھرپور نظر آتی ہیں، پھر آخر یہ کیونکر مناسب ہو گا کہ عرف جدید پر عرف قدیم کا حکم لگایا جائے، اور دونوں الگ الگ تقاضوں کو ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے خاص طور پر اس وقت جبکہ بیع کی اصطلاحی تعریف میں ائمہ کرام اور علماء متقدمین کے درمیان اختلاف ہو، مناسب ہے کہ بیع کی حقیقت ائمہ کے اختلافات کی روشنی میں سمجھ لی جائے، ائمہ کرام کے تمام اختلافات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ایک نقطہ نظریہ ہے کہ بیع "مبادلة المال بالمال" کا نام ہے، اور مال کا مطلب عین ہے، تو گویا بیع کی تعریف "مبادلة الأعيان بالأعيان" ٹھہری، منافع کی بیع اس نقطہ نظر سے جائز نہیں ہوگی۔

۲۔ دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ بیع کے مفہوم میں عموم ہے، اور منافع اور اعیان ہر ایک کی بیع جائز ہے۔

پہلا نقطہ نظر حنفیہ کی طرف منسوب ہے، اور دوسرا ائمہ ثلاثہ کی طرف، چاروں ائمہ کی کتابوں سے ان کے اپنے اپنے نقطہ نظر کا ثبوت صراحتاً یا اشارتاً ہوتا ہے۔ چاروں اماموں کی کتب فقہیہ سے ثبوت کے لئے صرف ایک ایک دو دو حوالہ ہم پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے جو غالب نقطہ نظر ائمہ ثلاثہ کا ہے، اس کے چند حوالے ہم پیش کرتے ہیں:

شافعیہ:

شوافع کے نزدیک جس طرح اعیان اور مادی اشیاء کی بیع ہو سکتی ہے اسی طرح منافع کی بھی بیع ہو سکتی ہے، بشرطیکہ تاہید کے طور پر منافع کا مشتری حقدار ہو جائے، اس نسبت کے استناد کے لئے ابن حجر پیشی اور ابن القاسم الغزالی کے حوالے کافی ہیں۔ ابن حجر پیشی بیع کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”عقد يتضمن مقابلة مال بمال بشرطه الآتي لاستفادة ملك عين أو منفعة مؤبدة“

علامہ شروانی اس کے حاشیہ میں مؤبدہ کی تشریح کرتے ہوئے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

”قوله، ”مؤبدة“ كحق الممّر إذا عقد عليه بلفظ البيع“ (حواشی الشروانی علی تحفة المحتاج ۲، ۲۱۵، نہایة المحتاج ۳، ۲۶۱)۔

حناہلہ کے نزدیک بھی بیع کی تعریف میں عین مالیت کے ساتھ منفعت مباحہ دونوں داخل ہیں جیسا کہ علامہ بہوتی کا بیان ہے:

”مبادلة عين مالیه... أو منفعة مباحة مطلقاً بأن لا تختص بإباحتها بحال دون آخر كممّر دار أو منفعة تحفر

بشراً بأحدهما أي عين مالیه أو منفعة مباحة مطلقاً... فيشمل نحو بيع كتاب بكتاب أو بممّر دار أو بيع نحو ممّر في دار



بکتاب او متمر فی دار آخری“ (شرح منہجی الارادات ۲، ۱۳۰ وکشاف القناع ۳، ۱۳۵)۔

مالکیہ:

مالکیہ کے نزدیک مشہور تعریف کی رو سے منافع بیع کے مفہوم میں داخل نہیں ہوتے، بیع کی ان کے نزدیک مشہور تعریف یہ ہے:

”عقد معاوضة علی غیر منافع، ولا متعة لذة“ (المنہج لابن قدامہ، جلد ۲ ص ۳۵)۔

اس تعریف کے رو سے اجارہ اور کرایہ کے معاملات اور نکاح کے امور خارج ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر منفعت اور لذت اندوزی کے معاوضے میں مال دیا جاتا ہے، لیکن مالکیہ کے یہاں بھی بعض روایات ایسی ملتی ہیں جن سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی بعض حقوق و منافع کی بیع درست ہے، مثلاً مالکیہ کے نزدیک حق تعلی، اور دیوار پر لکڑی گاڑنے کے حق کی بیع درست ہے۔ علامہ درویر کا قول ان کی شرح کبیر میں موجود ہے (دیکھئے: المدون علی الشرح الکبیر ۳، ۱۳)۔

یعنی یہی مسئلہ امام مالک کی المدونۃ الکبریٰ (۵۶/۱۰) میں بھی موجود ہے، اس طرح کی جزئیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیع کی مشہور تعریف میں اگرچہ غیر منفعت کی قید لگائی گئی ہے، لیکن یہ اپنے عموم پر باقی نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک بھی کسی نہ کسی شکل میں منافع و حقوق کی بیع کی گنجائش ہے۔

حنفیہ:

حنفیہ کے نزدیک مشہور تعریف بیع کی ”مبادلة المال بالمال“ (البحر الرائق جلد ۵ ص ۲۵۱ فتح القدیر جلد ۵ ص ۲، مجمع الانہر جلد ۲ ص ۲ وغیرہ من الکتب الفقہیہ) وغیرہ الفاظ سے کی گئی ہے۔ مال کا مفہوم تو قریب قریب تمام ائمہ کرام کی تعریفوں میں ملتا ہے لیکن مال کا وہ مفہوم جو منافع کے مقابلے میں مراد ہوتا ہے، کیا وہی مفہوم مالیت یہاں مراد ہے یا کچھ اور؟ اس کی تعیین کے لئے ہمیں مال کی تعریف میں فقہاء حنفیہ کی کتابوں میں جو عبارتیں ملتی ہیں ان عبارتوں کا جائزہ لینا پڑے گا اور دیکھنا پڑے گا کہ مال کا مفہوم ان کے نزدیک عام ہے، یا عین مالیت مراد ہے۔

اس سلسلے میں ہمارے یہاں مختلف قسم کی عبارات ملتی ہیں، علامہ ابن عابدین شامی مال کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”المراد بالمال ما یملک الیہ الطبع ویمکن ادخاره لوقت الحاجة والمالیت تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم والتقوم یثبت بها ویباحة الانتفاع به شرعاً“ (رد المحتار ۲، ۲)۔

اس تعریف کے اعتبار سے مال کے صرف دو عناصر کا ثبوت ہوتا ہے، ایک میلان طبع اور رغبت نفس، دوسرے قابل ادخار ہونا، البتہ مالیت کی علامت یہ ہے کہ لوگ جس چیز سے مالدار اور خوشحال ہو جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس شے کے اندر مالیت ہے۔

اس تعریف کے بعد علامہ شامی حاوی قدسی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”المال اسم لغیر الآدمی خلق لمصالح الآدمی وأمكن إحرازه و التصرف فیہ علی وجه الاختیار“ (حوالہ سابق، البحر الرائق ۵، ۲۵۴)۔

اس تعریف میں مال کے تین اجزاء کی خبر دی گئی ہے، ایک تو یہ کہ آدمی کے علاوہ ہر وہ چیز جو انسان کی مصلحتوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، اور ثانیاً اس کی حفاظت و ذخیرہ اندوزی ممکن ہو، ثالثاً اس میں تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار ہو، تو یہ چیز مال کہلاتی ہے۔ ان دونوں تعریفوں میں کوئی تصریح نہیں کہ مال اعیان کی حد تک محدود ہے، غیر اعیان پر مال کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ہاں علامہ علاء الدین حصکفی صاحب درمختار نے مال کی جو تعریف کی ہے۔ اس میں اعیان کی صراحت کی گئی ہے، علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

”والمراد بالمال عین یجری فیہ التنافس والابتذال“ (الدر المنقی بہامش مجمع الاثر ۲، ۲)۔

اس وضاحت کے ساتھ کسی اور فقیہ نے مال کو اعیان میں محصور نہیں کیا ہے، تاہم یہ کہنے میں بھی کچھ مبضاتقہ نہیں کہ مال سے مراد فقہاء حنفیہ نے وہی اعیان لیا ہے جو منافع کے مقابل بولا جاتا ہے، اس کا واضح تقاضا یہ ہے کہ منافع اور حقوق مجرد مال کے عموم میں داخل نہ ہوں، اسی لئے حنفیہ کے نزدیک حق تعلی کی بیع

درست نہیں ہے، اس لئے کہ وہ مال نہیں ہے، صاحب ہدایہ وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

”لأن حق التعلي ليس بمال لأن المال ما يمكن إحرازه“ (فتح القدير ۵۰۲۰۴)۔

حق تسبیل کے بارے میں بھی حنفیہ نے بیع کے عدم جواز ہی کا فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ ردالمحتار (۴، ۱۳۲) اور شرح المجملہ للاتاسی جلد ۱ ص ۱۱۷ میں بصراحت مذکور ہے۔

ان سب جزئیات سے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ مال کے اندر منافع و حقوق داخل نہیں ہیں، لیکن حنفیہ کی انہی مشہور زمانہ فقہی کتابوں میں بعض حقوق اور منافع کو مال کے ذیل میں شمار کیا ہے، اور بعض کو اعیان سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ شامی بدائع کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”ذكر في البدائع وغيره لو تزوجها الحر على سكنى داره أو ركوب دابته والحمل عليها أو على أن تزرع أرضه ونحو ذلك من منافع الأعيان مدة معلومة محت التسمية لأن هذه المنافع مال أو ألحقت به للحاجة“ (رد المحتار ۲۰۲۲۲)۔

اس پوری عبارت میں اخیر کے الفاظ قابل توجہ ہیں کہ گھر کی سکونت، جانور کی سواری یا بار برداری یا اس سے کاشت کاری وغیرہ جو منافع کی قبیل کی چیزیں ہیں، ان کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ منافع مال ہیں۔ ورنہ اس سے کم تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ یہ منافع مال کے حکم میں ضرور ہیں، ایک دوسری عبارت اور ملاحظہ کیجئے۔ صاحب ہدایہ حق مرور کی بیع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”أما حق المرور يتعلق بعين تبقى وهو الأرض فأشبه الأعيان“ (هدایہ ۲۰۲۰)۔

اس عبارت میں حق مرور کی بیع کو محض اس لئے جائز قرار دیا گیا کہ اعیان سے مشابہ ہے۔ غرض حنفیہ کے نزدیک مال کے مفہوم میں اگرچہ اولاً اعیان آتے ہیں لیکن اس کے باوجود بعض منافع اور حقوق بھی ان کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ اس طرح مال کا اعیان کے ساتھ انحصار باقی نہ رہا، بلکہ اس کا عموم بحال ہو گیا، وہ عموم تو نہ آسکا جو دیگر ائمہ کرام نے پیدا کیا ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ ان کے قریب تو پہنچ ہی گیا۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو گئی کہ مال کے مفہوم کے تحت ہر طرح کے منافع و حقوق نہیں تو کچھ نہ کچھ منافع و حقوق بالیقین آتے ہیں اس لئے بیع کی اصطلاح ان کو بھی شامل ہوگی۔ اور حنفیہ کے نقطہ نظر سے بھی یہ ماننے سے چارہ کار نہیں ہے کہ بعض حقوق اور منافع کی بیع درست ہے۔ البتہ ہمیں اس کی تعیین کرنی ہوگی کہ وہ کون سے حقوق اور منافع ہیں جن کی بیع درست ہے۔ اور کن حقوق و منافع کی بیع درست نہیں ہے۔

### حقوق کا مسئلہ:

اس کے لئے سب سے پہلے حقوق کی قسموں پر غور کرنا پڑے گا۔ بنیادی طور پر حقوق کی دو قسمیں بنتی ہیں: (۱) حقوق شرعیہ، (۲) حقوق عرفیہ۔

۱۔ حقوق شرعیہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ثبوت شارع کی جانب سے ہو، ان میں قیاس کا کوئی دخل نہ ہو۔

۲۔ حقوق عرفیہ سے مراد یہ ہے کہ جن کے ثبوت کی بنیاد عرف پر ہو، کہ عرف میں کوئی حق چل رہا تھا اور شریعت مطہرہ نے اس کو روکنے کے بجائے اس کو باقی رکھا، یہ حق عرفی ہے۔

پھر ان دونوں طرح کے حقوق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کچھ تو وہ حقوق ہوتے ہیں جو دفع ضرر کے لئے مشروع کئے جاتے ہیں۔

۲۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو دفع ضرر کے لئے مشروع نہیں ہوتے بلکہ مقصود بالذات ہو کر مشروع ہوتے ہیں، جن حقوق کا ثبوت اصلتہ اور مقصود ہوتا ہے، پھر ان کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ حقوق کی ایک قسم تو یہ ہے کہ اشیاء کی ذات سے ایسے منافع وابستہ ہوں جو ہمیشہ ہمیش کے لئے ان سے متعلق ہوں، یعنی جب تک وہ شئی پائی جائے گی اس کی منفعت بحال رہے گی، مثال کے طور پر حق مرور، حق شرب، حق تسبیل وغیرہ۔

۲۔ دوسری قسم کا نام ہم حق اسبقیت اور اختصاص رکھ سکتے ہیں کہ کوئی ایسی شئی ہے کہ جو کوئی پہلے اس پر قبضہ کرے گا اس پر اسے حق تصرف حاصل ہو جائے گا،



مثلاً جنگل کی گھاس، چشمہ کا پانی، ٹرین کی عام کمپارٹمنٹ کی سیٹیں۔

۳۔ حقوق کی تیسری قسم یہ ہے کہ انسان کو اس میں کسی کے ساتھ نئے معاملے کرنے یا اس کو برقرار رکھنے کا حق حاصل رہتا ہے مثلاً زمین، گھریا دکان وغیرہ کرایہ پر لگانا، اس سے کرایہ دار کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اسے اپنے لئے رکھے یا کسی دوسرے کے ساتھ اس کا معاملہ کرے، یہ تو حقوق کی قسمیں ہیں۔ حقوق کے معاوضہ کی بھی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ بیع کے طور پر اس کا معاوضہ کیا جائے، یعنی جس طرح بیع کے اندر بیع بائع سے مشتری کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اسی طرح یہ حق بھی منتقل ہو جائے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صلح اور دستبرداری کے طور پر ہو، یعنی معاوضہ کے بعد دستبردار شخص کا حق ساقط ہو جائے، لیکن یہ نہیں ہوگا کہ جس شخص کے لئے اس نے معاوضہ پر مصالحت کی ہے اس شخص کی طرف وہ حق منتقل ہو کر چلا جائے۔

امام قرافی نے دونوں صورتوں کے درمیان یہی فرق بیان کیا ہے (دیکھئے: الفرق للقرافی ۱۱۰۲/۲ فرق: ۷۹)۔

اس وقت جبکہ حقوق کی تقسیمیں بھی ہو گئیں اور معاوضہ اور مبادلہ کی صورتیں بھی معلوم ہو گئیں اب وقت آیا ہے کہ حقوق کی ہر قسم پر مناسب احکام صادر کئے جائیں۔

### حقوق شرعیہ:

حقوق شرعیہ کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس کے اندر قیاس و عرف کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ سراسر شریعت کی قائم کردہ چیز ہوتی ہے جیسے حق شفعہ، حق ولاء، حق وراثت، حق نسبت، حق قصاص، حق طلاق، حق حضانت اور حق ولدیت وغیرہ۔

حقوق کی تقسیم بھی پہلے کی جا چکی ہے۔ ایک وہ حقوق ہیں جو اصلۃً ثابت نہیں ہیں بلکہ دفع ضرر کے لئے ثابت ہیں، مثلاً حق شفعہ وغیرہ، ان کو حقوق ضروریہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کچھ وہ حقوق ہوتے ہیں جو اصحاب حق کے لئے اصلۃً ثابت ہوتے ہیں، ان کا نام ہم حقوق اصلیہ رکھ سکتے ہیں۔

فقہاء نے ان دونوں حقوق کے لئے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں۔

حقوق ضروریہ کا حکم یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کا مالی معاوضہ نہ بطور بیع کے درست ہے اور نہ صلح و تنازل کے طور پر درست ہے، اس لئے کہ حقوق ضروریہ دفع ضرر کے لئے مشروع ہوئے ہیں، اور جب صاحب حق مالی معاوضہ پر اس سے دستبردار ہونے یا فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا تو اس سے خود ثابت ہو گیا کہ اس کو ضرر نہیں تھا، اور جب ضرر کا ثبوت نہ ہو تو وہ حق اس کے لئے ثابت نہ رہا، اور معدوم چیز کی بیع درست نہیں ہے۔

رہا حقوق کا معاملہ جیسے حق قصاص، حق وراثت وغیرہ تو اس نوع کا حکم یہ ہے کہ بطور بیع کے تو اس کا تبادلہ درست نہیں ہے البتہ بطور صلح و تنازل کے درست ہے، یعنی مثلاً کسی انسان کو حق قصاص حاصل تھا اور پھر وہ حق قصاص سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہو گیا، تو حق قصاص منتقل ہو کر منزول لہ تک چلا جائے اور پھر وہ منزول لہ قاتل کو قتل کر دے ہرگز نہیں، دوسرے لفظوں میں اسے اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ حقوق اصلیہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کی طرف انتقال کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے نہ ان کی خرید و فروخت درست ہے اور نہ ان کے اندر ہبہ و وراثت جاری ہو سکتی ہے، اس حکم کی بنیاد نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے:

”إن النبی ﷺ نھی عن بیع الولاء“ (البخاری: کتاب العتق؛ باب بیع الولاء و ہبتہ)۔

حقوق ضروریہ اور حقوق اصلیہ کے درمیان حکم کا یہ فرق علامہ بیری نے اشباہ و نظائر کی شرح میں ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو (شرح الاشباہ و النظائر للبیری (مخطوط) ص ۶۲ و ۶۳)۔ اور اس کو علامہ ابن عابدین شامی نے نقل کیا ہے، دیکھئے رد المحتار جلد ۴ ص ۱۶، لیکن یہاں پر یہ شرط ملحوظ رہے کہ حقوق اصلیہ کا تنازل بالمال اسی وقت درست ہے جبکہ وہ حق معاملہ کے وقت موجود ہو، اگر اس وقت موجود نہیں ہے اور آئندہ ہونے کی امید ہو تو اس وقت تنازل صلح بھی درست نہ ہوگی۔



## حقوق عرفیہ:

حقوق عرفیہ کا ذکر بھی سابق میں ہو چکا ہے، اس سے مراد وہ حقوق ہیں جو اصحاب حق کے لئے عرف کی بنیاد پر ثابت ہوں نہ کہ شرع کی بنیاد پر، مثلاً راستہ پر چلنے کا حق، حق شرب اور حق تسبیح وغیرہ۔ جو عرف کے اندر پہلے ہی سے جاری تھا البتہ شریعت نے ان پر پابندی نہیں لگائی بلکہ اس کو باقی رکھا۔

حقوق عرفیہ کی متعدد قسمیں ہیں:

وہ حق انتفاع جو مادی چیزوں کی ذات سے متعلق ہو جیسے گھر کی ذات کے ساتھ سکونت متعلق ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ انتفاع ایک خاص معلوم مدت تک کے لئے ہے تب تو یہ اجارہ کے حکم میں ہے اور اس پر اجارہ ہی کے احکام جاری ہوں گے۔

لیکن اگر اس منفعت کو کسی دوسرے شخص کے لئے ہمیشہ ہمیش کے لئے خاص کر دیا جائے اور صاحب حق اپنا حق انتفاع دوسرے کی طرف علی سبیل التابید منتقل کر دے تو یہ اس منفعت کی بیع ہوگئی، اور یہی وہ بیع ہے جس کو فقہاء حنفیہ نے بیع حقوق مجردہ سے تعبیر کیا ہے، اس بیع کے جواز و عدم جواز کے بارے میں ائمہ کرام کے نظریات میں سخت اختلاف ہے، بعض لوگ جواز کے قائل ہیں اور بعض لوگ عدم جواز کے۔ حقوق مجردہ میں بہت سارے حقوق داخل ہیں مثلاً حق مرور، حق تعلی، حق تسبیح، حق شرب، دیوار پر لکڑی رکھنے کا حق، دروازہ کھولنے کا حق وغیرہ۔

حنفیہ کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ چونکہ یہ حقوق، حقوق مجردہ کی قبیل سے ہیں اس لئے ان کی بیع درست نہیں ہے، لیکن ائمہ ثلاثہ کی کتابوں میں ان کی بیع کا جواز معروف ہے، مگر حنفیہ کے نزدیک بھی مذکورہ حقوق کا عدم جواز بیع مطلقاً نہیں ہے بلکہ ان کی نصوص فقہیہ میں جو مختلف روایات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند شرطوں کے ساتھ ان کے نزدیک بھی حقوق مجردہ کی بیع درست ہے، تمام نصوص کا نقل کرنا مقالے کی تطویل کا باعث ہوگا، اس لئے ان عبارات کی روشنی میں جو شرائط ماخوذ ہوتے ہیں انہی کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شرط کے ذکر سے قبل ان نصوص سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں ان کا خلاصہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ان نتائج کو چار امور میں حصر کر سکتے ہیں:

- ۱۔ بیع کی تعریف ہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس میں فقہاء کا اختلاف ہوا ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک بیع کا عین ہونا شرط نہیں ہے بلکہ وہ ان منافع کی بیع کو بھی جائز قرار دیتے ہیں جو علی سبیل التابید فروخت کئے گئے ہوں، مالکیہ کی کتابوں کی بعض جزئیات سے بھی اسی قسم کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ عرض کیا گیا۔
- ۲۔ حنفیہ اگرچہ بیع میں بیع کے عین ہونے کی شرط لگاتے ہیں لیکن وہ حق مرور کے بیع کی اس تعلیل کے ساتھ اجازت دیتے ہیں کہ حق مرور ایک ایسا حق ہے جس کا تعلق عین سے ہے، اس لئے بیع کے معاملے میں اس کا حکم وہی ہوگا جو اعیان کا ہے۔

۳۔ یہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن حقوق کا تعلق کسی نہ کسی عین سے ہے ان کا حکم بیع کے باب میں وہی ہے جو اعیان کا ہے بشرطیکہ وہاں پر بیع کے جواز کے لئے کوئی مانع موجود نہ ہو، مثلاً دھوکہ، جہالت وغیرہ کے عناصر اگر اس میں مفقود ہیں تو اس بیع کے جواز میں حنفیہ کو کوئی تامل نہیں ہے۔

۴۔ البتہ جن حقوق کا تعلق اعیان سے نہیں ہے مثلاً حق تعلی وغیرہ، ان کی بیع حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، البتہ صلح کے طور پر اس کا معاوضہ لینا جائز ہے جیسا کہ بعض حنفیہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ان چار امور کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حقوق عرفیہ کی بیع علی شرط التابید ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے، لیکن حنفیہ ان کی بیع سے یہ کہہ کر روک دیتے ہیں کہ یہ حقوق مجردہ ہیں، مگر ان کا حکم اپنے عموم و اطلاق پر نہیں جیسا کہ بظاہر گمان ہوتا ہے، بلکہ فقہاء نے بعض ان حقوق کا استثناء کیا ہے جن کا تعلق اعیان سے ہو، اس کے علاوہ یہ بھی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب سارا مدار عرف پر ٹھہرا تو عرف کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، عرف کی تبدیلی بھی مسلم اور مشاہد ہے، عرف کو اتنی اجازت تو ملنی چاہیے کہ اگر وہ بعض چیزوں کو مال کے ذیل میں داخل کرنا چاہے تو داخل ہو جائیں، خصوصاً اس وقت جبکہ مالیت کا وہ پرانا تصور جو ابن عابدین شامی وغیرہ فقہاء کے یہاں ملتا ہے کہ جس چیز سے لوگ خوشحال ہونے لگیں وہ مال ہے، یہ اس میں موجود بھی ہو اور پھر عامۃ المسلمین کا تعامل اس کو قوت دے رہا ہو، اس وقت اس قسم کے حقوق عرفیہ کی بیع کے جواز کا فتویٰ چند شرطوں کے ساتھ دیا جاسکتا ہے، وہ شرطیں یہ ہیں:

- ۱۔ حق ابھی قائم ہو، مستقبل میں ہونے کی امید نہ ہو۔
- ۲۔ حق صاحب حق کے لئے اصلتہ ثابت ہو، دفع ضرر کے لئے اس کا ثبوت نہ ہو۔
- ۳۔ وہ حق اس قابل ہو کہ اس کو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کیا جاسکے۔

- ۴۔ حق کو باضابطہ طور پر رجسٹرڈ کرالیا جائے جس سے احراز و ادخار بھی حاصل ہو جائے اور دھوکہ و جہالت بھی لازم نہ آئے۔
- ۵۔ وہ حق تاجروں کے عرف میں اعیان اور مال کی طرح چل رہا ہو اور لوگ اس کی خرید و فروخت سے رغبت رکھتے ہوں۔
- حق اسبقیت:

حقوق عرفیہ کی دوسری قسم جسے ہم نے حق اختصاص اور حق اسبقیت سے تعبیر کیا تھا مثلاً کسی مباح زمین پر کوئی آدمی قبضہ کر کے اس میں کاشت شروع کر دے، یا مکان بنوائے یا اس کا احاطہ کر دے تو وہ زمین جس پر ہر کوئی بھی قبضہ تملک حاصل کر سکتا ہے اس شخص نے جب پیش قدمی کی تو اسے حق اسبقیت حاصل ہوگی۔

اس حق کی بیع کے بارے میں بہت کم فقہاء نے کچھ لکھا ہے۔ فقہاء شافعیہ کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ حق اسبقیت کی بیع درست ہے یا نا درست، علامہ ربلی نے نہایت محتاج میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ نہ ان کی بیع اور نہ ان کا ہبہ درست ہے، اس کے بالمقابل دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس کی بیع درست ہے (دیکھئے: نہایت محتاج ۳۳۶/۵، مشکلی زاد المحتاج کوہی ۲/۴۰۴، تحفۃ المحتاج مع الشروانی ۶/۲۱۳)۔

فقہاء حنابلہ سے بھی اس باب میں دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں، ایک جواز کا قول دوسرے عدم جواز کا، علامہ ابن قدامہ نے الکافی میں بغیر کسی اختلاف کو نقل کئے یہ لکھا ہے کہ حق اسبقیت کی بیع درست نہیں ہے، البتہ علامہ مرداوی نے الانصاف میں دونوں طرح کے اقوال نقل کئے ہیں اور نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ..... مذہب یہ ہے کہ بیع جائز نہیں ہے۔ ہاں علامہ بہوتی نے حنابلہ کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ ناجائز ہونے کی بات صرف بیع کے حق میں ہے، بطور صلح و دستبرداری اس کا معاوضہ درست ہے، انہوں نے اس مسئلہ کو خلع پر قیاس کیا ہے (دیکھئے شرح منتهی الارادات للبیہوتی ۲/۴۶۳)۔ حنفیہ سے اس بارے میں کوئی روایت نہیں ہے۔

### حق عقد:

حقوق عرفیہ کے ذیل میں ایک تیسری قسم حق عقد یا حق وظیفہ کی آتی ہے جس کا ذکر پہلے مجملاً ہو چکا ہے، اس سلسلے کی فقہی عبارات سے کتب فقہیہ بھری پڑی ہیں، ان کے اقتباسات بھی اگر نقل کئے جائیں تو کافی تطویل ہو جائے گی، ان کی فقہی عبارات کی روشنی میں جو مختار مسلک معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کے حقوق کی بیع درست نہیں، البتہ مالی معاوضہ کے ذریعہ ان سے دستبردار ہونے کی اجازت ہے۔

اب تک جو تحریر کیا گیا وہ اصولی طور پر کیا گیا اس کے تحت ان تمام حقوق کے احکام معلوم کئے جاسکتے ہیں جو ہمارے زمانے میں رائج ہیں۔ اس باب میں کسی فیصلہ کن نتیجہ تک آسانی کے ساتھ پہنچنے کے لئے چند امور کی وضاحت ضروری ہے، جب تک ان کے بارے میں ذہن کے اندر کوئی واضح تصور قائم نہ ہوگا مسائل کا حل مشکل ہے۔

۱۔ اولاً یہ کہ بیع کا اصطلاحی مفہوم کیا ہے۔

۲۔ مال کی حقیقت کیا ہے اور کیا اس کی اصطلاح پر عرف اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۳۔ ادخار اور احراز کی کیا شکلیں ہو سکتی ہیں اس بارے میں صرف ایک کلیہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہر شئی کے مناسب شان اس کا طریقہ ادخار ہوگا۔

یہ اور اس قسم کے چند اصول واضح طور پر ذہن میں اتر جانے کے بعد مسائل کا حل آسان ہے، اور بحمد اللہ ان اصولوں پر اب تک کی معروضات میں کافی بحث ہو چکی ہے۔

واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم۔

☆☆☆



## بیع حقوق

مولانا مفتی عبدالوہاب صاحب

الجواب هو الموفق للصواب: آپ کے استفتاء کا مقدمہ کان کذی الشئ ببینة وبرهان کے منزل میں ہے، بیع کی حقیقت ہے: مبادلة المال بالمال بالتراضي (فتاویٰ عالمگیریہ)۔ مبادلة المال بالمال (ہدایہ)۔

مال سے مال کا مبادلہ ہونا یہ صورت رضامندی سے ہی ہوا کرتی ہے، عبارت عالمگیریہ سے ظاہر ہے۔

المراد بالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة۔

والمالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم والتقوم بثبت بها وبإباحة الانتفاع به شرعاً (رد المحتار: کتاب البيوع)۔ (مال سے مراد جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو وقت حاجت ذخیرہ ممکن ہو)۔

بدائع میں یوں مکتوب ہے: المال اسم للمبادلة وهي مبادلة شئ مرغوب بشئ مرغوب بشئ مرغوب، خریدنے کی چیز مرغوب ہی ہوا کرتی ہے۔ صاحب رد المحتار نے خمر کو مال میں داخل کیا لیکن متقومہ کی قید سے اس کو خارج کر دیا۔ ادخار کی قید سے منفعت کی صورت کو خارج کر دیا کیونکہ منفعت ملک ہے مال نہیں، ملک کی صفت میں وصف اختصاص سے تصرف کی صورت ہو (رد المحتار ۱۰۰)۔

بہر حال ہر مصنف نے مال معترف کے لئے معترف بیان کیا، عبارت میں تفسیر ہے مطلب ایک ہی ہے۔

جمادات، نباتات میں سے ہر چیز مال میں داخل ہے۔ اگرچہ دروس سابق میں بعض چیزیں مال میں داخل نہ تھیں، اس زمانے میں ضرورت اور حاجت کے مد نظر مال میں داخل ہو گئی۔ گوبر کا گیس ادخار کرنا ممکن نہ تھا جس کی وجہ مال نہ تھا، اب ادخار کر کے استعمال ہونے لگا، ظاہر ہو گیا جس کا استعمال جائز ہے جیسا کہ رد المحتار میں کتاب الانجاس میں ہے: ما تغير فهو طاهر مکتوب ہے، جو اپنی اصلیت سے متغیر ہو گئی وہ ادخار طاهر ہے۔ ظاہر چیز کا فروخت کرنا جائز ہے، اس سے ادخار کا مطلب بھی واضح ہو گیا۔ ایک شخص نے مکان فروخت کیا دوسرے نے خرید تو حدود کے ساتھ ہی خریداجاتا ہے، تو اوپر کا حصہ اصل کے تابع ہے اور کنیف بھی داخل ہے، مجموعہ کی صورت ہی کو دار یا مکان کہا جاتا ہے۔ خرید و فروخت کی دستاویز میں بھی حدود تحریر کی جاتی ہے تاکہ مستقبل میں منازعت کی صورت نہ ہو۔

جیسا کہ کتب فقہ میں ہے: من اشترى داراً بحدودها فله العلو والكنيف اسم الدار ينتظم العلو لأنه اسم لما دیر عليه الحدود، والعلو من توابع الأصل وأجزائه فيدخل فيه۔

پس مکان خریدنے سے اس کے حقوق و منافع بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

ہاں ایک مکان میں مالک مکان نے اوپر کی منزل بنائی، ایک شخص نے اوپر کی منزل جس میں حجرہ ہے اس کو خریدنا چاہا تو خرید سکتا ہے جبکہ اس کی بھی حد بندی تحریر کی صورت میں ہو۔

جیسا کہ کتب فقہ میں ہے: من اشترى منزلاً فوقه منزل فليس الاعلى إلا أن يشترى به بكل حق هو له أو بمرافقه أو بكل قليل وكثير هو فيه أو منه۔ منزل میں اسباب ہوں تو اس کی بھی تحریر ہو جائے، خرید و فروخت میں یہ داخل ہے یا نہیں، اگرچہ کہ اسباب منزل میں داخل نہیں۔

☆☆☆



## حقوق کی خرید و فروخت

مولانا انور علی الاعظمی ؒ

- ۱۔ بیع کی تعریف میں مال کی شرط ضروری اور جوہری ہے۔ ہر مرغوب شے مال نہیں ہو سکتی ہے۔ بدائع میں بیع کی تعریف میں بجائے مال کے لفظ مرغوب کا استعمال کیا گیا ہے مگر اس مرغوب کا مصداق بھی مال ہی ہے۔ جیسا کہ علامہ شامیؒ نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔
- ۲۔ حقوق اور منافع مال نہیں ہیں۔ مال ایسی چیز کہلائے گی جو قابل ذخیرہ ہو، اس دور میں اگر مال کی تعیین و تحدید کے لئے اعیان کے مفہوم میں کچھ وسعت رکھی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی وسائل کے پھیلاؤ اور سائنسی ترقیات کے نتیجے میں آج بہت سی ایسی چیزیں وجود میں آچکی ہیں جن کی مالیت مسلم ہے لیکن انہیں مادی اعیان میں شمار کرنا مشکل ہے جیسے بجلی اور گیس وغیرہ۔
- ۳۔ فقہاء نے مال کی جو تعریف کی ہے اس تعریف کے اعتبار سے ایسی چیزیں بھی مال کی فہرست میں شامل ہو سکتی ہیں جو پچھلے زمانوں میں مال کی تعریف سے خارج تھیں۔

مال کی تعریف میں قابل ذخیرہ ہونے کی شرط بھی بنیادی اور جوہری شرط ہے۔ البتہ یہ بات حقیقت سے لگتی ہوئی ہے کہ ذخیرہ کرنے کی صورتیں چیزوں کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں۔ زمانہ اور حالات کے اعتبار سے بھی ان میں تبدیلی ممکن ہے مثلاً روپے اور سونے چاندی الماری اور تجوریوں میں بند رکھے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف عقار اور غیر منقولہ جائیدادوں کو بکس یا الماری میں ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا ذخیرہ اور ان کی حفاظت سرکاری رجسٹری کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ بجلی کا ذخیرہ پاور ہاؤس اور بجلی گھروں میں کیا جاتا ہے۔ مال کے لئے قابل ذخیرہ ہونا شرط ہے لیکن ہر قابل ذخیرہ چیز مال ہو ایسا نہیں۔ حق ایجاد، فارمولہ، ٹریڈ مارک اور فرموں کے نام سرکاری ناموں کے ذریعہ رجسٹرڈ کرائے جاتے ہیں مگر صرف اتنے ہی سے ان کا مال ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ ان کے رجسٹرڈ کرانے کو ذخیرہ سے تعبیر کرنے کے بجائے اپنے حق کی حفاظت سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ العالی نے اقسام حقوق کی تشریحات کے بعد بیع حقوق کے سلسلے میں جو ضابطے مرتب فرمائے ہیں ان میں سے اکثر قابل قبول ہیں۔

جن قواعد سے راقم السطور کو اتفاق ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱۔ وہ حقوق جن کی مشروعیت دفع ضرر کے لئے ہے اصلانہ نہیں ان کا معاوضہ کسی طرح درست نہیں، نہ تو بیع ہی کے طور پر نہ ہی صلح کے طور پر، جیسے حق شفیعہ، حق القسم للمرأة۔
- ۲۔ وہ حقوق جو فی الحال حاصل نہیں ہیں، مستقبل میں ان کے حصول کا امکان ہے۔ ان کا معاوضہ بیع یا صلح دونوں میں سے کسی طرح درست نہیں ہے، جیسے حق وراثت مورث کی زندگی میں۔
- ۳۔ وہ حقوق جو اصلانہ حاصل ہیں لیکن منتقل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کا بدل بھی بیع کی شکل میں لینا جائز نہیں۔ البتہ صلح اور تنازل کے طور پر لے سکتے ہیں جیسے حق قصاص، حق تمتع الزوج۔

۳۔ وہ دائمی منافع جن کا تعلق مادی اشیاء سے ہو جیسے حق مرور، حق تعلی، حق تسبیل، حق شرب، جنہیں فقہائے حنفیہ حقوق مجردہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی بیع امام شافعی، امام احمد بن حنبل کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، اور مالکی مذہب کی بعض جزئیات سے جواز کا پتہ چلتا ہے۔ حنفیہ کے مابین اختلاف ہے۔ متأخرین حنفیہ کے نزدیک وہ حقوق جو اعیان ثابتہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی بیع جائز ہے اور وہ مال کے حکم میں ہیں۔ متأخرین کے نزدیک یہی قول مختار اور پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ایسے حقوق کی بیع اس انداز پر ہو کہ اس میں کوئی دھوکہ اور جہالت نہ رہے، البتہ بیع تعلی جائز نہیں، کیونکہ اس کا تعلق کسی عین ثابت سے نہیں ہے لیکن اس حق سے صلح کے طور پر بدلہ لینا جائز ہے۔

فرم کے نام اور ٹریڈ مارک کی بیع:

فرم اور ٹریڈ مارک اولاً تو مال نہیں صرف ایک حق ہیں، اس لئے بھی ان کی بیع میں رکاوٹ ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی بیع میں دھوکہ اور خیانت کا دروازہ کھولتا ہے۔ بہت ساری کمپنیاں اپنی مصنوعات کے لئے مشہور اور معتمد ہیں۔ اگر ان کا نام اور ٹریڈ مارک بکنے لگے تو دوسرے بہت سے جعل ساز لوگ غلط مال تیار کر کر دھوکہ اور جعل سازی کا بازار گرم کریں گے۔ عوام الناس اونچے مال کا پیسہ دیں گے اور معمولی سامان حاصل کریں گے۔ علماء کی طرف سے جواز کا فتویٰ ملنا تجارت میں خیانت اور دھوکہ کے عموم کا سبب ہوگا، البتہ بعض صورتوں میں فرم اور ٹریڈ مارک کا بدلہ نزول عن الحق کے طور پر لینا درست ہوگا۔ مثلاً دو شریکوں میں سے ایک مشترکہ کاروبار سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ فرم اور ٹریڈ مارک کافی مشہور ہو چکے ہیں، اسی فرم کے نام سے کاروبار کرنے والا آدمی اب تک کی ساری گڈول سے فائدہ اٹھائے گا۔ ایسی صورت میں دوسرا شریک اپنی دستبرداری کی وجہ سے اس کا کچھ معاوضہ لے کر اپنے حق سے الگ ہو سکتا ہے۔

یا اسی طرح سے کوئی شخص فرم کے رجسٹریشن کے بعد کاروبار نہیں کرنا چاہتا۔ فرم کے رجسٹریشن کے لئے اس نے کافی رقم خرچ کی، بڑی محنت و مشقت کے بعد اپنے مقصد میں کامیابی ملی۔ اب اگر وہ اُسے یوں ہی بے کار چھوڑ دے تو ایک مفید چیز یوں ہی ضائع ہو جائے گی۔ اور اگر اپنا یہ حق دوسرے کو منتقل کر دے تو یہ اس کا اپنا روپیہ اور محنت ضائع ہونے سے بچ جائیں گے۔ اور دوسرے کو بھی اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہوگا، لیکن دوسرے کو منتقل کرنے کی سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا خیانت نہ ہو۔

حق اسبقیت:

اس کا معاوضہ تنازل عن الحق کے طور پر لینا درست ہے کیونکہ یہ بھی ایک حق ہے باقاعدہ مال نہیں۔ البتہ اس حق کو بالکل تسلیم نہ کرنا ایک حقیقت کا انکار ہے۔ نئی ایجاد، نئے فارمولے، نئی دو اور نئی کتابوں سے تجارتی ٹولہ کھول روپے کمائیں اور اصل موجد اور مبتکر بالکل محروم رہ جائے، یہ بڑی نا انصافی کی بات ہے، موجد اور مبتکر کو اس کی محنت کا معاوضہ ضرور ملنا چاہیے، اور ان چیزوں کے ذریعہ حاصل کی جانے والی آمدنی میں اس کا حصہ بھی ہونا چاہیے، لیکن میری ناقص رائے میں اس کے معاوضہ کو بیع کا نام دینے کے بجائے تنازل عن الحق کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا، گویا کہ اپنی ایجاد اور تصنیف کو قابل فروخت بنا کر بیچنے کا حق اسی کو تھا لیکن اپنی مجبوری کی وجہ سے یہ شخص ایسا نہ کر سکا اور اپنا حق دوسرے کو دے دیا، لہذا وہ اپنے حق کا معاوضہ شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً ہر طرح لینے کا حقدار ہے۔





## مناقشہ

۱۶ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۰ جون ۱۹۹۰ء

زیر صدارت ڈاکٹر شیخ محروس المدرس (بغداد)

جناب فیروز صاحب پونا:..... ہندستان میں تقریباً ۲۰ لاکھ فیکٹریاں ہیں۔ اور لگ بھگ ۲ لاکھ انڈسٹریاں ہیں، ۱۸ سال قبل ہم نے پونا میں تگاری بنانے کے لئے ایک انڈسٹری شروع کی۔ ابتداء میں ہمارے پاس صرف ۵ افراد تھے، اس وقت ۵۰ افراد ہیں، اس کے بعد نئی نئی فیکٹریاں وجود میں آئیں، شروع میں ہم نے بینک سے روپے لیے، کبھی گھانا کبھی نفع ہوتا تھا۔ دوسری دقتیں بھی آئیں۔ بینک کو سود دینا پڑتا تھا اس لئے بینک سے روپے لینا ہم نے چھوڑ دیا۔ اور لوگوں سے پیشگی رقم لے کر کام چالو رکھا۔ اس طرح سود سے نجات ہو گئی، جن لوگوں سے ہم نے ایڈوانس لئے تھے۔ ان کو ۲۰ فیصد ریٹرنس دیئے، حکومت نے ہماری فیکٹری کو سیک مانا تھا۔ ہم نے اپنے اخراجات امکانی حد تک کم کر دیئے۔ اس طرح چھوٹے پیمانے پر ہمارا کاروبار چالو ہو گیا۔

جناب پروفیسر منظور صاحب مظفر پوری:..... اس سے عام مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوا؟

جناب فیروز صاحب:..... ہم نے چھوٹے پیمانے پر قرض حسن دینے کی اسکیم چالو کی۔ اب ہر سال ہم ساڑھے چار پانچ لاکھ روپے قرض حسن دیتے ہیں۔ ایک آواز:..... زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کے لئے مستقل ادارہ یا ضمنی شعبہ قائم کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ حکومت قبضہ کر لے گی، جیسا کہ کرنا ٹک میں ہوا۔  
شیخ محروس مدرس:

ایک مرکزی ادارہ ہونا چاہیے۔ اور اس کے ماتحت ذیلی شاخیں اور ملک کے ذی اثر اور با اعتماد علماء کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔ کل میں نے مراجعہ کے سلسلہ میں شواہح کی رائے عرض کی ہے۔ اس رائے پر تمام اسلامی بینک عمل پیرا ہیں۔

آج کل بینک قرض دینا چاہتے یا بیع کر کے نفع اٹھانا چاہتے ہیں یا حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح بیک وقت تین امور پر غور کریں۔ فقہاء نے اپنے زمانہ کے حالات کے اعتبار سے فتوے دیئے ہیں اور ہم آج اپنے زمانہ کے اعتبار سے احکام شرعیہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم نصوص سے باہر نہیں جاتے۔

ایک ہے شے معین کا نام رکھنا مثلاً قلم کو قلم اور عصا کو عصا کہنا یہ اجتہاد کی سب سے قلیل ترین قسم ہے۔ اس قسم کے اجتہاد کا وجود کبھی ختم نہیں ہوا۔ دوسری چیز تخریج ہے۔ یہی نوازل اور واقعات کے مسائل ہیں۔ اور عند الاحناف مسائل کا طبقہ ثانیہ ہے۔ نوازل کے مسائل مکرر نہیں ہوتے۔ ورنہ مفتی کا کوئی کام باقی نہیں رہے گا۔ ہمارے زمانہ میں جو نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں کبھی وہ من کل الوجوہ جدید ہوتے ہیں۔  
نقود کے نقص کے مقابلہ میں سامان زیادہ ہو تو امام ابو یوسف فرماتے ہیں: "إن ما يدفع وقت التجديد يجب أن يساوي قيمة ما اقترض فقيمة الانخفاض تعوض".

ترکی میں امام ابو یوسف کے اسی قول پر عمل ہے، عراق میں بھی اسی پر عمل ہے۔ لیکن نقود کا انخفاض احتمالی شے ہے۔ اور احتمال پر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا، اس لئے ضروری ہے کہ ہم انخفاض کی تحدید کریں، لیکن تحدید مشکل ہے۔

اس لئے میری رائے ہے کہ اس مسئلہ کو عقد توریہ پر قیاس کیا جائے، کیونکہ عقد توریہ کو عرف نے جائز کر دیا ہے۔

میری یہ بھی رائے ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تجارت کے جو طریقے رائج ہو گئے ہیں ان کو بھی درست کہنا چاہیے، کیونکہ اگر اسے ناجائز کہا جائے تو اس



میں حرج عظیم ہوگا۔

جناب پروفیسر منظور عالم مظفر پوری:..... گڈول ایک طرف اعتماد قائم کرنے کا نام ہے تو دوسری طرف سازش سے بچنے اور جھوٹے پروپیگنڈہ کا نام ہے، اس لئے گزارش ہے کہ گڈول پر روشنی ڈالی جائے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی:

مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کے مقالہ نے چند سوالات پیدا کئے ہیں، ان کے اس مقالہ میں صرف عبارتیں نقل نہیں کی گئی ہیں، بلکہ اس مقالہ سے ایک نیا فکری رخ سامنے آیا ہے۔

جہاں تک تعلق ہے حقوق کی بحث کا تو شرع اور قانون کی اصطلاحات اس سلسلہ میں مختلف ہیں، اور اس پر اچھی بحث المدخل فی الفقہ الاسلامی میں ہے۔ قانون جدید میں اور فقہ اسلامی میں جو کچھ مال، حق اور ملک کے بارے میں لکھا گیا ہے اس پر ڈاکٹر وہبہ زہلی نے بھی اپنی کتاب الفقہ الاسلامی میں اچھا لکھا ہے۔ حضرات علماء کو پڑھنا چاہیے۔ فقہ میں عام طور پر جو چیزیں ہیں ان پر ہمارے علماء کی نگاہ تو ہے لیکن جدید قانون میں ملک کیا ہے؟ اور حقوق کیا ہیں؟ جن سے موجودہ عہد کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، ان پر بھی ہمارے علماء کی نظر ہونی چاہیے۔ انگریزی زبان میں جو لٹریچر ہیں ان سے استفادہ تو مشکل ہے۔ لیکن عرب علماء نے جدید قانون اور قدیم فقہ کو سامنے رکھ کر جو بحثیں کی ہیں ان سے ہم لوگوں کو عربی زبان کے ذریعہ براہ راست مدد مل سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شرع کے بہت سے احکام میں عرف کو اچھا خاصا دخل ہے، لیکن عرف کے اعتبار کو اگر ہم عام کر دیں تو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ثبوت عرف کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ عرف متواتر چلا آ رہا ہے یا نہیں؟ عہد نبوی سے کوئی چیز متواتر معروف چلی آ رہی ہے تو ایک طرح کا سند جواز اسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور تابعین سے حاصل ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عرف حادث ہے۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بعض احکام، تعریفات، اور لغت کی بعض تعبیرات وہ ہیں جن کی بنیاد ہی عرف پر ہے یا عادت اور احوال پر ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کی بنیاد شریعت کے ثابت، مستقل اور پائیدار اصولوں پر ہے، اس لئے کوئی بھی ایسا عرف جو ان منصوص، پختہ، پائیدار اصولوں کے خلاف ہو جائے گا وہ عرف باطل تسلیم کیا جائے گا، اور اس کی وجہ سے حکم شرع میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ لیکن وہ احکام و تعبیرات اور اصطلاحات جن کے لئے شرع میں کوئی نص وارد نہیں ہے، بلکہ وہ عادت اور احوال ناس پر مبنی ہیں۔ ان کے مفہوم کا تعین اور مصداق کا تعین، حالات اور عرف کی تبدیلی کے بعد جن پر وہ مبنی تھے لازمی طور پر نہیں رہے گا، بلکہ نئے عرف کے مطابق ان کا تعین کیا جائے گا۔ امام قرانی نے لکھا ہے:

”الأحكام التي تترتب على العوائد المجددة والأحوال المتغيرة. هل إذا تغيرت تلك العوائد وتغيرت تلك الأحوال يجوز للمفتي أن يفتي بما أفتوه أولاً“۔

امام قرانی کا سوال ہے کہ جن احکام کا مدار عرف و عادت اور احوال پر ہے تو کیا زمانہ، عرف، عادت اور احوال کی تبدیلی کے بعد بھی مفتی کے لئے جائز ہے کہ سابق میں جو فتویٰ ایک خاص حال، عرف اور عادت کو پیش نظر رکھ کر دیا گیا تھا، اسی کو دہراتا رہے۔ امام قرانی فرماتے ہیں کہ ہذا جہلۃ فی الدین، جب احوال متغیر ہو گئے تو شرع کے احکام میں بھی تغیر ہوگا۔

یہ شرع میں ترمیم نہیں ہے۔ ایک مثال سے سمجھئے۔ بخار کا ایک نسخہ ہوتا ہے، تو کیا بخار اترنے کے بعد بھی وہی بخار والا نسخہ استعمال کیا جائے گا۔ اور کیا یہ صحیح ہوگا؟ امام قرانی نے تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اجتہاد مصطلح کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ حالات کی تبدیلی کے بعد ان احکام کے بارے میں جن میں عرف اور عادت کا دخل ہوئے احکام کی تفریح کر سکتے ہیں۔

ہمیں بنیادی طور سے یہ دیکھنا ہے کہ ثروت اور تمول کن چیزوں سے حاصل ہوتا ہے، اور کن چیزوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ ایک شخص کی ذہنی اور جسمانی محنت اور سرمایہ خرچ کرنے کے بعد اس کی کوئی چیز وجود میں آتی ہے۔ اور دوسرے لوگ محض تجارتی نفع حاصل کرنے کے لئے اس شخص کی محنت و سرمایہ کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر اس کی اشاعت کرنے لگتے ہیں تو کیا درست ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ تاجروں کا استحصال ہے۔ کسی دینی مقصد کے لئے نہیں ہے۔ آپ ایک لاکھ قرآن کے نسخے شائع کریں کون روکتا ہے، ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہے اور کوئی فیصلہ کرنا ہے۔

پچھلے سیمینار میں کرنسی کے بارے میں کچھ فیصلے کئے گئے تھے۔ اس میں دو ملکوں کی کرنسیوں کو دو جنس مانا گیا تھا، اور کمی وزیادتی کے ساتھ اس کی بیع کو جائز قرار دیا گیا تھا۔

ایک ملک کی کرنسیوں کے تبادلہ کے بارے میں جو تجویز تھی اس میں یہ شرط ہے کہ نقد ہونا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا دو ملکوں کی کرنسیوں کے تبادلہ میں بھی نقد کی شرط ہونی چاہیے یا نہیں؟ گذشتہ سیمینار کی تجویز اس سلسلہ میں ساکت ہے۔ میں ممنون ہوں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی جدہ کا کہ انہوں نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس طرح سونے چاندی کا تبادلہ یاداً پیدا ہوتا ہے اسی طرح دو ملکوں کی کرنسیوں کا تبادلہ بھی یاداً پیدا ہونا چاہیے، ادھار نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس مولانا تفتی عثمانی کی یہ تحریر ہے کہ اس سلسلہ میں نقد اور یاداً پیدا ہونا ضروری نہیں ہے، ثمن خلقی میں ہی یہ قید ہے، ثمن اعتباری میں یہ قید نہیں ہے۔ (اس سلسلہ میں علماء کرام اور مفتیان عظام سے تحریری آراء طلب کی گئی ہیں جو علیحدہ سے شائع ہوں گی۔)

مولانا نظام الدین صاحب مبارکپور: (شیخ محروس المدرس کا مقالہ سننے کے بعد) اس تعریف کو صاحب جامع الرموز نے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ خلاف تحقیق ہے شیخ محروس المدرس:..... تحقیق کس کو کہتے ہیں؟ تحقیق تو واقعہ کو دلیل سے ثابت کرنے کا نام ہے۔

مولانا نظام الدین مبارکپور:..... عام فقہاء احناف نے جس تعریف کو قبول کیا ہے وہ ظاہر الروایت ہے، جیسا کہ رد المحتار سے سمجھ میں آتا ہے۔ شیخ محروس المدرس:..... یہ محض سمجھ میں آتا ہے، میں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔

مولانا نظام الدین مبارکپور:..... جس تعریف کو تمام فقہاء احناف نے قبول کیا ہے، ہم اس کو ضعیف یا غیر مختار کیسے کہہ سکتے ہیں؟ قاضی صاحب:..... فقہ میں ان کا مقام کیا ہے معلوم ہے؟

مولانا نظام الدین صاحب:..... معلوم ہے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ تمام فقہاء کی مقبول تعریف کو ہم ضعیف یا غیر مختار کیسے کہہ سکتے ہیں۔

قاضی صاحب:..... جب امام محمد سے ثابت ہے، اور قہستانی اس کو خلاف تحقیق کہتے ہیں تو قہستانی کی رائے محل نظر ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:..... صاحب ہدایہ نے مہر کے بیان میں لکھا ہے کہ خدمت امام محمدؐ کے نزدیک مال ہے۔

شیخ محروس المدرس:..... جامع الرموز کتب معتبرہ میں سے نہیں ہے۔

قاضی صاحب:..... صحیح ہے۔

مولانا نظام الدین صاحب:..... صاحب جامع الرموز نے لکھا ہے کہ اصول کے مطابق منافع مال نہیں۔

قاضی صاحب:..... شیخ محروس یہ فرما رہے ہیں کہ منافع کی مالیت کے بارے میں احناف کے متعدد اقوال ہیں، نیز ائمہ شوافع، حنابلہ اور مالکیہ کے بھی اقوال ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ائمہ احناف کے قول سے بلا ضرورت عدول کر کے امام شافعی کے مسلک کو اختیار کرے تو شیخ فرماتے ہیں کہ یہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ جب

فقہاء احناف کے یہاں دوسرا مقبول قول موجود ہے تو دوسری فقہ کی طرف عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

مولانا نظام الدین:..... یہ میں نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔

قاضی صاحب:..... یہ شیخ کی رائے ہے، ممکن ہے کہ آپ کی دوسری رائے ہو، اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

شیخ محروس:..... فقہاء اگرچہ منافع کو مال نہیں کہتے لیکن شے کی مالیت اور تقویم میں فرق کرتے ہیں۔ فقہاء کہتے ہیں کہ مالیت کا ثبوت شریعت کی طرف سے

نہیں ہے بلکہ لوگوں کے تمول کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور تقوم کا ثبوت لوگوں کے تقوم کی وجہ سے تو ہوتا ہی ہے اور اس امر سے ہوتا ہے کہ شریعت نے اسے مباح الانتفاع بنایا ہے۔

اس طرح مالیت کے ثبوت کے لئے ایک شرط ہے اور تقوم کے لئے دو شرطیں ہیں۔ پس شریعت کی طرف سے منافع کے تقوم کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور ہم اس کو مال سمجھتے ہیں، تو اس سے جواز کا پہلو کھل کر سامنے آ گیا۔

لغت میں حق کے معنی بہت زیادہ ہیں۔ مناطقہ اور متکلمین کے نزدیک حق کی تعریف یہ ہے: "هو الحكم الثابت المطابق للواقع"۔ حق کا اطلاق اقوال، عقائد اور ادیان پر بھی ہوتا ہے۔

اصولی حضرات حق کی دو قسمیں کرتے ہیں: حق اللہ، اور حق العباد۔

صاحب تلوح سے حق اللہ کی یہ تعریف منقول ہے:

"المراد بحق الله في قولهم ما يتعلق به النفع العام۔"

اس قول کی روشنی میں حق اللہ کی تعریف میں بنیادی جوہر "ما يقوم به النفع العام" ہے۔

حق العباد سے مراد وہ شے ہے جس میں کوئی خاص مصلحت ہو، مصلحت کیا ہے؟ منفعت کا دوسرا نام ہے۔

حق کبھی مالی ہوتا ہے اور کبھی غیر مالی، قرآن مجید کی آیت "يا أيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين" میں مال کو حق کہا گیا ہے۔ اس حق کا عوض لیا جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی کتابت کا حکم دیا ہے۔ حق غیر مالی کی ایک قسم وہ ہے جس کا عوض نہیں لیا جاتا جیسے جینے کا حق، گفتگو کرنے کا حق، مسجد میں بیٹھنے کا حق، کھانے کا حق، راستہ سے گزرنے کا حق، اور ہبہ، وقف، تبرع میں مالک کا حق، وغیرہ۔

ان میں سے بعض حقوق کبھی مالی بھی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مالکیہ کے یہاں مسجد میں بیٹھنے کے حق کا عوض لیا جانا درست ہے۔ اور احناف کے یہاں نزول عن الوظائف کا عوض جائز ہے۔ وظائف پر اجرت لینا اصلاً درست نہیں ہے، لیکن اجرت علی الطاعة کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

جو حقوق مالی نہیں ہیں ان میں سے بعض حق کا عوض لینا متاخرین فقہاء احناف نے درست قرار دیا ہے۔ جیسے وظیفہ سرکاری سے دستبرداری کا عوض جائز قرار دیا گیا ہے، حالانکہ وظائف سے دستبرداری کا عوض فی نفسہ درست نہیں۔ (شیخ کے خطاب کا کچھ حصہ نقل نہیں ہو سکا)۔







علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالات، جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# بیع مرابحہ اور اسلامی بنکاری

☆..... عقد مرابحہ سے متعلق اہم فقہی مباحث  
☆..... مرابحہ سے متعلق سوالات کے جوابات

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دائرۃ الاشاعت

اردو بازار، ایم لے جناح روڈ، کراچی، پاکستان





## اکیڈمی کا فیصلہ

یہ سیمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء، ۱۳ تا ۱۷ ازیقعدہ ۱۴۱۰ھ مرابحہ سے متعلق غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے:

- ۱۔ مرابحہ کا فقہاء کے نزدیک ایک متعین مفہوم ہے۔
- ۲۔ اسلامی بینکوں میں مرابحہ جن شکلوں میں رائج ہے وہی شکلیں اس سیمینار میں زیر بحث ہیں۔
- ۳۔ مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ عقود و معاملات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے محض الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا، لہذا مرابحہ کے نام پر جو معاملات مروج ہیں ان کی حقیقت کا اعتبار ہے محض ان کے ناموں کا اعتبار نہیں ہے۔
- ۴۔ اسلامی بینکوں میں استعمال ہونے والی مرابحہ کی شکلیں مرابحہ کی معروف شرطوں کے ساتھ اسی صورت میں جائز ہوں گی جب کہ:
  - الف۔ بینک کی طرف سے جاری کردہ مخصوص فارم (Quotation) میں بینک کے ذریعہ فروخت کی جانے والی اشیاء کی نوعیت، ان کی کیفیت Quality اور دوسری ضروری صفات واضح طور پر ذکر کی گئی ہوں تاکہ جہالت اور ابہام کی وجہ سے معاملہ کے ہر دو فریق کے درمیان کسی نزاع کا امکان باقی نہیں رہے، نیز اس قیمت خرید یا لاگت پر بینک کو ملنے والے نفع (قیمت)، اس کی ادائیگی کی مدت، اور اقساط کی صراحت کر دی گئی ہو۔
  - ب۔ یہ درست نہیں ہوگا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خرید جائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خرید جائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے۔
  - بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اس کی قیمت اتنی مدت میں اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی اور بینک کو اس کی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)۔

☆☆☆

## سوال نامہ:

## مرا بھہ

مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مرا بھہ کی سادہ شکل یہ ہے کہ فروخت کرنے والا اپنی قیمت خرید یا لاگت کو بتا کر یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے اس لاگت پر متعین فیصد منافع مطلوب ہے، اور خریدار اسے منظور کرتا ہے۔ مرا بھہ اپنی سادہ صورت میں جائز ہے، اور اس کی بنیاد امانت پر ہے، یعنی بائع کو ہر قیمت پر صحیح لاگت بتانی چاہیے۔ بعض خاص قسم کے اخراجات یعنی نقل و حمل Transportation کے اخراجات کو اصل قیمت کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے مثلاً دس ہزار روپے کا اصل مال ہے اور سو روپے اس کے لانے پر خرچ پڑے ہیں تو اصل قیمت دس ہزار اور لاگت دس ہزار ایک سو قرار پاتی ہے، ایسی صورت میں قیمت میں جوڑے جانے والے ان زائد اخراجات کو قیمت کا جز بنا کر ذکر نہیں کیا جانا چاہیے یعنی بائع کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اس مال کی قیمت دس ہزار ایک سو روپے ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس مال کی خرید پر لاگت دس ہزار ایک سو روپے آئی ہے۔

مرا بھہ سے متعلق ضروری تفصیلی احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھی جانی چاہیے کہ عام طور پر تھوک خریداری یا کسی ہول سیلر Whole Seller سے مسلسل معاملہ رکھنے کی صورت میں Discount یا Concession یا Commission وغیرہ کے نام سے اصل قیمت میں کچھ کمی کردی جاتی ہے۔ مثلاً اگر دس ہزار روپے کسی شئی کی قیمت ہے اور اس میں دس فیصد کمیشن ملتا ہے تو کل نو ہزار روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس صورت میں جو شخص بیع مرا بھہ کر رہا ہے اسے مال کی قیمت جس پر وہ منافع لے رہا ہے، دس ہزار نہیں بلکہ نو ہزار بتانی چاہیے، عقد مرا بھہ میں قیمت کے بیان کے سلسلہ میں جس امانت داری کی رعایت رکھی گئی ہے اس کا یہی تقاضا ہے۔

عقد مرا بھہ کو آج اسلامی بینکنگ میں جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ عام طور پر مرا بھہ نقد خرید و فروخت میں نہیں بلکہ ادھار کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ ادھار کی بھی دو صورتیں ہیں: یکمشت ادائیگی، یا بالاقساط ادائیگی۔ بہر دو صورت فروخت کرنے والا آج کے نرخ کے مقابلہ میں قیمت زیادہ رکھتا ہے، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدت ادائیگی کی کمی اور زیادتی کے مطابق مقررہ منافع میں بھی کمی اور زیادتی کی جاتی ہے، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بائع اس ادھار بیع میں تاخیر (مہلت دینے) کی قیمت وصول کر رہا ہے۔

۱۔ اس ذیل میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شئی کو نقد بیچنے کی قیمت علیحدہ اور ادھار بیچنے کی قیمت علیحدہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ ایک قسم کا استحصال اور اس شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے جو ضروری مطلوبہ سامان نقد نہیں خرید سکتا اس لئے اسے

ادھار خریدنا پڑ رہا ہے، اور آج کے نرخ کے مقابلے میں اسے اس شے کی زائد قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے؟ واضح رہے کہ ہو سکتا ہے کہ بائع کی قیمت خرید مزید کمیشن اور ڈسکاؤنڈ (Discount) ملنے کی وجہ سے عام بازار کے نرخ سے کم ہو اور مطلوبہ منافع جڑنے کے بعد اتنی قیمت بنتی ہو جو آج کے بازار میں اس شے کی ہے، یا معمولی مقدار میں زائد اور کم ہو، اور کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ منافع کی مقدار اتنی زائد رکھی جائے کہ آج وہ شے بازار میں جس نرخ پر دستیاب ہے اس سے غیر معمولی حد تک زائد رقم خریدار کو ادا کرنی پڑے۔

۲۔ مزید برآں اس ذیل میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ بائع جو ادھار فروخت کر رہا ہے اس کے روپے جب اسے دو سال بعد ملیں گے تو ان کی مالیت (Value) آج کے مقابلہ میں کم ہو جائے گی۔ پس وہ آج کے نرخ سے زائد رقم کی مالیت میں کمی ہو جانے کے پیش نظر منافع میں مناسب اضافہ بیع کی صورت میں کر رہا ہے اس لئے اسے جائز ہونا چاہیے؟

۳۔ مراہجہ کے ذیل میں ہی ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ مالیاتی ادارے اپنی کوئی دکان یا گودام نہیں رکھتے جس میں مطلوبہ سامان موجود ہو بلکہ جب کوئی ضرورت مند ان کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے ساتھ لاگت اور منافع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس ضرورت کے سامان کی خریداری بازار سے کرتے ہیں، اور پھر اس شخص کو وہ سامان حوالہ کرتے ہیں، تو کیا یہ اس شے کی بیع نہیں ہے جو بائع کی ملک میں موجود نہیں ہے؟ بیع مالایملک (اس شے کو بیچنا جو بائع کی ملکیت میں نہ ہو) ممنوع ہے، اس ذیل میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس وقت ایک ضرورت مند نے آکر ادارہ میں اپنی ضرورت کا اظہار کیا اور معاملات سے متعلق ضروری شرائط طے پائیں، یہ شخص بیع کا معاہدہ ہے یا بیع ہے؟ اگر اسے معاہدہ تسلیم کیا جائے تو بیع اس وقت قطعی ہوگی جب شے خرید کر ادارہ اسے حوالہ کرے گا۔ لیکن اس میں ایک سوال ضرور پیدا ہوگا کہ یہ بیع نہیں وعدہ بیع ہے، تو اس وعدہ کو پورا کرنا قانونی طور پر لازم ہوگا یا نہیں؟

۴۔ اس ذیل میں تیسری اہم بات یہ بھی ہے کہ ضرورت مند اور ادارہ کے درمیان مطلوبہ شے کی خریداری، اس کی لاگت اور اس پر مطلوبہ منافع طے ہو جانے کے بعد اگر ادارہ اسی شخص کو روپے دے کر سامان خریدنے کے لئے بازار بھیج دے، اور وہ شخص اپنی مطلوبہ شے بازار سے اس مالیاتی ادارہ سے ملنے والے روپے ادا کر کے خرید لے، اور پھر وہ رقم مع زائد منافع بالا قسط ادا کرتا رہے تو آیا یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ بعض لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ شخص دو حیثیت رکھتا ہے، جب وہ بازار سے خریدتا ہے تو وہ اس مالیاتی ادارہ کا وکیل بالشراء (Purchasing Agent) ہوگا، اور پھر وہ اس شے پر مالکانہ حیثیت سے قبضہ کرتا ہے تو وہ مالیاتی ادارہ کے سامنے خریدار ہوتا ہے، یعنی اس کا اولین قبضہ قبضہ وکالت ہے، اور دوسرا قبضہ قبضہ مشتری ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہوگی یا نہیں؟





## عقد مراہقہ

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

مراہقہ کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ ”مشتری اول کسی چیز کو مشتری ثانی کے ہاتھ اصل قیمت پر متعین نفع کے اضافہ کے ساتھ فروخت کرے۔“ ہدایہ میں مراہقہ کی تعریف یہ کی گئی ہے: (نقل ما ملکہ بالعقد الأول بالضمن الأول مع زیادة ربح) بشرطیکہ مشتری اول نے وہ چیز کسی مثلی چیز کے عوض حاصل کی ہو، البتہ اضافی چیز (نفع) کا مثلی ہونا ضروری نہیں، بلکہ وہ کوئی متعین ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے جو مثلی نہ ہو بلکہ ”قبضی“ ہو، جیسا کہ ”الدر المختار“ میں ہے:

”و شرط صحتہما (ای المراجعة والتولية) كون العوض مثلیاً... وكون الربح شیئاً معلوماً ولو قیمیاً مشاؤاً  
الیہ کہذا الشوب حتی لو باعه بربح ده یا زده ای العشرة بأحد عشر لم یجز (الدر المختار ۶۴ رد المحتار ۱۵۳، ۱۵۴)۔  
اس تعریف و تفصیل سے معلوم ہوا کہ سوالنامہ میں بیان کردہ شکل سے مراہقہ کی جو تعریف نکلتی ہے وہ محل نظر ہے، خاص طور سے اس کا یہ جزو ”کہ اسے متعین فیصد منافع مطلوب ہے“، کیونکہ اس عبارت کا بظاہر متبادر مفہوم وہی ہوتا ہے جسے در مختار میں ”دیازدہ“ کہا گیا ہے، اور اس کا حکم عدم جواز (جہالت کی وجہ سے) بتایا گیا ہے، اگر سوالنامہ کی اس عبارت کا کوئی صحیح محمل ایسا نکل بھی آتا ہو جس میں ”ربح“ کی جہالت رفع ہو جائے (جیسا کہ علامہ شامی نے بعض شکلوں کا ذکر کر کے ان کا جواز بتایا ہے) تو اس صورت میں اگرچہ ایسا عقد مراہقہ صحیح ہو جائے گا مگر یہ تعریف جامع تب بھی نہ ہوگی (اس لئے بہتر یہی ہے کہ ایسی تعریف اختیار کی جائے جو جامع و مانع ہو)۔

البتہ سوالنامہ میں یہ جو ہدایتیں اور صراحتیں کی گئی ہیں صحیح اور بر محل ہیں کہ اگر مشتری اول کے لئے بائع اول نے قیمت میں کمی کر دی (خواہ وہ کمی کمیشن کے نام سے ہو یا کسی اور نام سے) تو ضروری ہوگا کہ مشتری ثانی سے بھی اتنی قیمت کم وصول کی جائے، نیز مشتری اول کو کسی چیز کے خریدنے کے بعد اور مشتری ثانی تک پہنچنے کے درمیان ایسے مزید ضروری اخراجات برداشت کرنے پڑے ہوں کہ جو تاجروں میں معروف ہوں تو وہ بھی قیمت میں شامل کئے جاسکتے ہیں، لیکن ایسی صورت میں مشتری اول یہ نہ کہے کہ میں نے یہ چیز اتنے میں خریدی ہے بلکہ یہ کہے کہ مجھے اتنے میں پڑی ہے (یا اس جیسی کوئی اور تعبیر اختیار کرے جس سے جھوٹ کا احتمال رفع ہو جائے)۔

سوالنامہ میں کہا گیا ہے کہ ”عقد مراہقہ آج کل اسلامی بینکنگ میں جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ عام طور پر مراہقہ نقد خرید و فروخت میں نہیں بلکہ ادھار کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔“ اس عبارت کے کئی مفہوم نکل سکتے ہیں، ایک یہ کہ مشتری اول (جو کہ بینک ہوتا ہے وہ) مشتری ثانی سے یہ طے کر کے یا اس کے بارے میں صرف یہ اندازہ کر کے کہ وہ (مشتری ثانی) قیمت بعد میں مثلاً ایک سال بعد دے گا تو وہ بینک بائع اول سے ادھار مال خرید کر مشتری ثانی کے ہاتھ اسی قیمت پر مع متعین نفع کے اضافہ کے فروخت کرتا ہے، دوسرا یہ ہو سکتا ہے کہ بینک بائع اول سے تو نقد قیمت دے کر خرید لیتا ہے البتہ بائع ثانی کے ہاتھ ادھار فروخت کرتا ہے۔ دوسری صورت (کہ بینک نے بائع سے نقد خرید لیا لیکن بائع ثانی کے ہاتھ ادھار فروخت کیا) میں اگر بینک نے وہی قیمت متعین نفع کے اضافہ کے ساتھ مشتری ثانی سے لی جو بائع کو نقد دی تھی تو یہ عقد مراہقہ صحیح ہوگا۔ پہلی صورت یعنی بینک نے بائع اول کو قیمت نقد دینے کے بجائے اس سے ادھار پر معاملہ کیا تو اس شکل میں مراہقہ کا جواز اس وقت ہوگا جبکہ مشتری اول (بینک) مشتری ثانی کو صاف طور پر مطلع کر دے کہ میں نے فلاں چیز (جس میں عقد مراہقہ ہو رہا ہے) ادھار خریدی ہے، پھر اگر مشتری ثانی اس پر راضی ہوگا تو عقد صحیح ہو جائے گا ورنہ نہیں، جیسا کہ شامی میں ہے:

”من اشترى شيئاً بثمان نسيئة لا يجوز له أن يربح عليه... بأن الثمن مقابل بشئين أي بالمبيع وبالاجل فلم يصدق في أحدهما أنه بثمان سابق... ولجوازها إذا بين أنه اشتراه نسيئة“، اور درمختار میں ہے: ”أشتراه بألف نسيئة وباع بربح مائة بلا بيان خير المشتري“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳۰۱۵۸)۔

علامہ شامی کی اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ادھار خریدنے میں (جبکہ قیمت کا دیا جانا ادھار ہو) قیمت کا زیادہ ہونا ایک فطری ہی بات ہے جس کی ہر صورت شرعاً ممنوع نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس فطری بات کو شریعت نے جائز رکھا ہے، چنانچہ اسی موقع پر صاحب ہدایہ نے حسب ذیل جزئیہ: ”من اشترى غلاماً بألف درهم نسيئة فباعه بربح مائة ولم يبين فعلم المشتري فإن شاء ردها وإن شاء قبل“ کے تحت لکھا ہے: ”للأجل شبهاً بالمبيع ألا يرى أنه يزداد في الثمن لأجل الأجل (هدایہ آخرین ۳۰۵۸)۔“

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ سوالنامہ میں جس شبہ (استحصال کا شبہ، ادھار کی حالت میں قیمت زیادہ رکھنے پر) کی وجہ سے اس شکل کے عدم جواز کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے وہ شبہ یہاں شرعاً معتبر نہ ہوگا، اور محض اس شبہ کی بنیاد پر یہ معاملہ ناجائز نہیں قرار دیا جائے گا، اس کے علاوہ بھی کتب فقہ و فتاویٰ میں ایسے جزیات ملتے ہیں جن سے ادھار میں قیمت زیادہ رکھنے کے باوجود معاملہ جائز قرار دیا گیا، مثلاً ہندوستان کے ممتاز ترین فقیہ و مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) سے جب یہ سوال کیا گیا کہ: ”قرض میں زیادہ قیمت کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟“ تو مفتی صاحب موصوف نے جواب دیا کہ: ”قرض میں زیادہ قیمت کو فروخت کرنا درست ہے۔“ اور اس حکم کے لئے مفتی صاحب ”موصوف نے استدلال، ہدایہ کی مذکورہ عبارت سے ہی کیا ہے (یعنی لایری أنه يزداد في الثمن لأجل الأجل“ (دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم ۷۷، شائع کردہ کتب خانہ امدادیہ)۔

ایسے ہی متعدد فتاویٰ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے بھی ملتے ہیں، مثلاً ایک سائل نے سوال کیا کہ: ایک شخص اپنا مال نقد ایک روپے میں فروخت کرتا ہے اور ادھار سترہ آنہ (ایک روپے سے ایک آنہ زائد) کو بیچتا ہے یہ جائز ہے یا نہیں؟ اس پر حضرت تھانویؒ نے جواب دیا: اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ وقت بیع کے ثمن کی تعیین نہیں کی، بلکہ مشتری سے تردید کے ساتھ کہا کہ اس کی قیمت اگر اسی وقت دو گے تو ایک روپیہ لوں گا، ورنہ سترہ آنے لوں گا تو یہ بوجہ جہالت ثمن کے جائز نہیں (اور اس کے لئے عالمگیری سے یہ حوالہ پیش کیا ہے: رجل باع على أنه بالنقد بكذا وبالنسيئة بكذا أو إلى شهر بكذا وإلى شهرين بكذا لم يجز)۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اول مشتری سے طے کر لیا ہو کہ نقد لیتے ہو یا ادھار، اگر اس نے نقد لینے کو کہا تب تو ایک روپیہ قیمت ٹھہرائی، اگر ادھار لینے کو کہا تو سترہ آنے، یہ جائز ہے (امداد الفتاویٰ ۳۳۲ مطبوعہ کراچی ادارہ اشرف العلوم)۔ حضرت تھانوی کے اس فتویٰ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر زیادتی ممنوع نہیں ہے اور شرعاً جواز یا دتی (اضافہ) ممنوع نہ ہو اس پر استحصال کا لفظ حقیقی معنی میں صادق ہی نہیں آتا، یوں فیشن کے طور پر تو آج کل یہ لفظ (استحصال) بے موقعہ بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ہر وہ معاملہ جس پر عوام (غیر فقیہ) استحصال کا لفظ استعمال کرنے لگیں شرعاً ممنوع نہیں ہو جائے گا۔ اس تفصیل سے خاص طور سے حضرت تھانوی کے فتویٰ سے اس سوال کا جواب بھی نکل آتا ہے کہ: کسی شے کو نقد بیچنے کی قیمت علاحدہ اور ادھار بیچنے کی قیمت علاحدہ رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ وہ یہ کہ اگر کوئی شق عند المعاملہ متعین کر دی جائے تو جائز ہے، عدم تعیین کی شکل میں جہالت ثمن کی وجہ سے معاملہ جائز نہ ہوگا۔ اس بارے میں فتاویٰ دارالعلوم میں ایک بہت مفصل فتویٰ حضرت مفتی محمد شفیع کا ایسا بھی ملتا ہے جس میں بہت سے شبہات کے جوابات بھی دئے گئے ہیں (دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ص ۱۳۰-۱۹، کتب خانہ امدادیہ۔ دیوبند)۔

سوالنامہ میں مذکور عبارت کا ایک مفہوم یہ بھی نکل سکتا ہے کہ بینک (مشتری اول) نے بائع اول سے کوئی چیز نقد رقم دے کر خریدی مگر اس چیز کے (بیع کے) وصول کرنے کی مدت (مثلاً) ایک سال بعد مقرر کی اور پھر مشتری ثانی کے ہاتھ ایک سال کے بعد متعین نفع کے ساتھ اسی نوع کی چیز نقد فروخت کرنے کا معاملہ کیا، تو اس میں پہلی بیع (مشتری اول کے ہاتھ بیع) بیع سلم ہے، اس لئے اس عقد کے جواز میں ان تمام شرطوں کا لحاظ ضروری ہوگا جو بیع سلم کے لئے لازم ہیں، اس کی صحت کے بعد ہی دوسرا عقد صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اگر پہلا عقد صحیح نہیں ہوا تو اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی چیز پر تصرف ہی شرعاً جائز نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلم فیہ پر قبضہ سے پہلے اس کی بیع و شراء (مراعتہ یا بغیر مراجمہ) جائز نہیں (شامی ۲۰۹/۳)۔

سوال نامہ کی زیر بحث عبارت میں ایک احتمال اوپر کی صورت کے عکس کا بھی ہے، مگر وہ نتیجہ شروع میں بیان کردہ شکلوں میں سے ایک میں داخل ہے، اس لئے اس کا حکم الگ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔



سوالنامہ میں مذکور عبارت کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادھار اور نقد معاملہ میں قیمت کا تو فرق نہ ہو بلکہ ربح کی مقدار کا فرق ہو، یعنی اسلامی بینک عقد مراءجہ اس طرح کرتا ہے کہ نقد لینے والے مشتری (ثانی) سے قیمت تو وہی لینا طے کرتا ہے جو ادھار لینے والے سے، البتہ نقد لینے والے سے اپنا ربح کم لیتا ہے اور ادھار والے سے زیادہ، ان صورتوں کا حکم بھی مذکورہ بالا تفصیل سے آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ جہالت کی شکل میں معاملہ ناجائز ہوگا، اور تعیین کی شکل میں جائز ہوگا، خواہ بالاقساط قیمت ادا کی جائے، یا ادھار ایک مشت ادا کی جائے، بالاقساط ادا کرنے کی صورت میں جہالت ربح ہونے کی شکل میں ہوگی، کہ قسطوں کی مقدار، تعداد اور ادائیگی کا وقفہ طے ہو جائے، اب یہ طے شدہ رقم خواہ بازار کی قیمت کے مساوی ہو یا کم و بیش (نقد و ادھار دونوں شکلوں میں) معاملہ بہر صورت صحیح ہو جائے گا، ادھار قیمت میں اضافہ کی یہ توجیہ کہ مثلاً دو سال بعد روپے کی مالیت Value کم ہو کر اتنی ہو جائے گی کہ وہ معاملہ کرنے کے زمانہ کے برابر بن جائے گی، اس توجیہ کی عقد کی صحت کے لئے ضرورت نہیں، اور نہ یہ توجیہ صحیح ہے، بلکہ مضر ہے، کیونکہ اس طرز فکر سے اضافہ و کمی کی گنجائش دینے سے تو باب ربا کھل جائے گا، جو پھر بند کئے بند نہ ہوگا۔ قیمت میں اگر اثمان کا (درہم و دینار، یا اس کے قائم مقام، راج سگنوں کا) یا مثلی شئی کا دینا طے ہوا ہے تو مدت ادا کے لحاظ سے اس طے شدہ مقدار میں وصولیابی کے وقت کمی بیشی ربا ہوگی۔

جو چیز بائع کی ملکیت میں موجود نہیں ہے اس پر عقد مراءجہ کرنا بھی صحیح ہے بشرطیکہ بائع ثانی (مشتری اول) کی طرف سے یہ وضاحت صراحتاً یا دلالتاً یا عرفاً کر دی جائے کہ وہ شئی مطلوب دوسرے سے خرید کر مشتری ثانی کے ہاتھ متعین نفع کے اضافہ کے ساتھ فروخت کر رہا ہے، تو یہ معاملہ صحیح ہو جائے گا۔ اس بارے میں متعدد فتاویٰ اپنے اکابر کے ملتے ہیں، مثلاً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک سائل کے اس سوال پر کہ ”موجودہ وقت تجارت کا عام طور پر یہ قاعدہ ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے کوتا جرتلاتے ہیں اور کسی چیز کی تجارت بھی کر لیتے ہیں لیکن باقاعدہ دوکان وغیرہ نہیں رکھتے، جب کوئی فرمائش کسی شخص کی آتی ہے تو بازار سے مال خرید کر اس پر اپنا نفع قائم کر کے خریدار کو بھیج دیتے ہیں“ کیا یہ منافع جائز ہے؟ اس سوال کا جواب مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ”اگر اس میں دھوکا نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہاں بازار کا یہی نرخ ہے تو یہ منافع جائز ہے“ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ۷/۱۷۸)، حضرت تھانوی کے بھی بعض فتاویٰ سے یہی استفاد ہوتا ہے کہ اگر مشتری ثانی کو دھوکہ میں نہ رکھا جائے بلکہ پوری بات بتادی جائے تو یہ معاملہ صحیح ہو جائے گا (دیکھئے: امداد الفتاویٰ ۳/۳۳، ۳/۹۷)، البتہ ایسا معاملہ اس وقت قطعی ہوگا جبکہ مشتری ثانی اسے قبول کر لے، جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فی الوقت یہ وعدہ بیع ہے نہ کہ عقد بیع (چنانچہ حضرت تھانوی کے حوالہ بالا دونوں فتووں میں اس کی صراحت موجود ہے)، رہا یہ شبہ کہ اس عقد پر ”بیع مالین عندک“ کا گننہ ہوتا ہے لہذا صحیح نہ ہونا چاہیے، لیکن بیع سلم اور بیع فضولی وغیرہ کے جواز سے معلوم ہوتا ہے کہ ”بیع مالین عندک“ کی ہر شکل ممنوع نہیں ہے۔ علامہ شامی نے (۱۰۵/۳) میں لکھا ہے کہ حدیث کا محمل ”بیع ما سیملکہ قبل ملکہ“ ہے یعنی جس چیز کے اپنے ملک میں آنے کی توقع ہو (مثلاً وراثت میں کسی چیز کے ملنے کی توقع پر کوئی چیز فروخت کر دی جائے) اس چیز کی بیع محض توقع کی بنیاد پر کر دی جائے۔ اس قسم کی بیع کی حدیث میں ممانعت آئی ہے، پھر مسئلہ بالا صورت میں تو حقیقی بیع حکماً نہیں ہو رہی ہے بلکہ وعدہ بیع ہے، جس کا پورا کرنا قانوناً فی الوقت ضروری نہیں البتہ بیع پر قبضہ کر لینے یا مشتری اول کے خرید لینے کے بعد مشتری ثانی کے معاملہ کو منظور کر لینے سے عقد لازم ہوگا۔

سوالنامہ کے آخر میں ضرورت مند اور ادارہ کے درمیان جس قسم کے معاملہ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کی صحت کی بھی گنجائش ہے، لیکن ضرورت مند جس وقت بازار سے چیز خریدے گا اس وقت وہ صرف ادارہ کا وکیل ہوگا، لہذا اس کی خریدی ہوئی چیز ادارہ کی ملکیت میں آئے گی (نہ کہ اس ضرورت مند کی ملکیت میں)، البتہ بعد میں ادارہ وہ چیز حسب قرار و ضرورت مند کو اگر دیدیتا ہے تو پھر وہ اس ضرورت مند کی ملکیت میں آجائے گی، یعنی محض خرید لینے سے اس کی ملکیت میں نہیں آجائیگی بلکہ بعد میں ادارہ کی اجازت سے جب اس پر قبضہ کرے گا تب اس کی ملکیت میں آجائے گی، امداد الفتاویٰ (۳/۹۷-۹۸) میں مذکور اسی طرح کے ایک سوال اور حضرت تھانوی کے جواب سے بھی یہی استفاد ہوتا ہے اور قواعد کا بھی تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم





## مباحہ

مولانا شمس پیرزادہ <sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup>

۱۔ کیا کمیشن کو ظاہر کرنا ضروری ہے:..... بیع مباحہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قیمت خرید کو ظاہر کر دے۔ اب اگر اسے تھوک خریداری یا مستقل خریداری کی وجہ سے کمیشن یا ڈسکاؤنٹ مل رہا ہے اور وہ معاملہ طے کرتے وقت ہی یہ بتا دیتا ہے کہ اس پر جو بھی کمیشن یا کنسیشن یا ڈسکاؤنٹ ملے گا اس کا حقدار بائع ہوگا تو یہ صورت جائز ہوگی۔

۲۔ کیا ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ جائز ہے؟

یہ ایک اہم اور بنیادی سوال ہے جس کا تعلق نہ صرف مباحہ سے ہے بلکہ بیع کی اس صورت سے بھی ہے جس میں نقد اور ادھار کی قیمتیں الگ الگ متعین کی جاتی ہیں۔

ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کو عام طور سے فقہاء اور علماء جائز قرار دیتے ہیں:

امام ترمذی حدیث: ”نھی رسول اللہ ﷺ عن بیعتین فی بیعة“ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وقد فسر بعض أهل العلم قالوا: بیعتین فی بیعة أن یقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين فلا يفارقه على أحد البيعتين، فإذا فارقه على أحدهما فلا بأس إذا كانت العقدة على واحد منها“ (الترمذی باب ما جاء فی النحر عن بیعتین فی بیعة)۔

فقہ السنہ میں ہے: وإذا كان الثمن مؤجلا و زاد البائع فيه من أجل التأجيل جاز لأن للأجل حصة من الثمن. والی هذا ذهب الأحناف والشافعية و زيد بن علی والمؤید بالله وجمهور الفقهاء لعموم الأدلة القاضية بجوازہ ورجحه الشوكاني (فقہ السنہ: السيد سابق ۴/۲۰۴)۔

دوسرا قول عدم جواز کا ہے: یحرم بیع الشئ بأكثر من سعر يومه لأجل النساء وقد ذهب إلى ذلك زين العابدين علی بن الحسين والناصر والمنصور بالله والامام یحیی (تحفة الاحوذی ۴/۱۲۲۹، نیز دیکھئے: سبل السلام ۴/۱۶)۔

موجودہ زمانہ میں ادھار بیع کا رواج عام ہو گیا ہے اور اس میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے۔ جو چیزیں قسطوں میں ادائیگی کی شرط پر فروخت کی جاتی ہیں ان کی قیمتیں بھی نقد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لیے جس شدت کے ساتھ یہ مسئلہ اس زمانہ میں ابھر کر آیا ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر دلائل کی روشنی میں اور ربانیت کی حرمت کے مصالحوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے از سر نو غور کیا جائے اور کسی فقہی جزئیہ پر ایک بڑے کلیہ کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ ادھار کی بنیاد پر قیمت بڑھانے کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جو رقم مشتری کے ذمہ دین ہے اس پر فائدہ حاصل کیا جائے، اور یہ سود نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلام میں شرعی احکام کی تعمیل صحیح اسپرٹ میں اور حسن و خوبی کے ساتھ مطلوب ہے اور اس کے لیے بصیرت ضروری ہے۔ فقہ کو ایک فن بنا کر خالص فنی بحثیں کرنا اور جس طرح ایک وکیل قانونی مویشگافیاں کر کے قانونی جواز کی صورتیں پیدا کرتا ہے اسی طرح مویشگافیاں یا حیلے کر کے شریعت کے ایک حرام کو حلال یا ناجائز کو جائز قرار دینا صحیح نہ ہوگا، بلکہ سخت گناہ کا موجب ہوگا، اس لیے ہماری نظر الفاظ و اشکال سے زیادہ مقاصد و معانی پر ہونی چاہیے۔

علماء اور فقہاء نے کئی ایسی صورتوں کا ذکر کیا ہے جن پر بظاہر سود کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے سودی معاملات ہی ہوتے ہیں یا

ع بانی ادارہ دعوت القرآن ممبئی۔

سود ہی پر بیع ہوتے ہیں۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ زائد قیمت پر ادھار فروخت کو اسی طرح کا معاملہ نہ قرار دیا جائے۔ علماء و فقہاء نے جن صورتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

(قوله في بيع العينة) اختلف المشائخ في تفسير العينة التي ورد النهي عنها۔ قال بعضهم تفسيرها أن يأتي الرجل المحتاج إلى آخر ويستقرضه عشرة دراهم ولا يرغب المقرض في الاقراض طمعا في فضل لا يناله بالقرض فيقول لا أقرضك و لكن أبيعك هذا الثوب إن شئت باثني عشر درهما و قيمته في السوق عشرة لبيعه في السوق بعشرة فيرضى به المستقرض فيبيعه كذلك فيحصل لرب الثوب درهمان و للمشتري قرض عشرة... وقال محمد هذا البيع في قلبى كأمثال الجبال زميم اخترعه أكلة الرباء وقال عليه الصلاة والسلام إذا تبايعتم بالعين واتبعت أذنان البقر ذلتن وظهر عليكم عدوكم (رد المحتار ۴، ۲۴۲)۔

علامہ ابن تیمیہ سے پوچھا گیا: و سئل عن رجل عنده فرس شراء بمائة وثمانين درهماً فطلبه منه انسان بثلاث مائة درهما الى مدة ثلاثة شهور فهل يحل ذلك؟

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: إن كان الذي يشتريه لينتفع به أو يتجر به فلا بأس ببيعه إلى أجل لكن لا يرجح عليه إلا الربح المعتاد لا يزيد عليه لأجل ضرورته، وأما إن كان محتاجاً إلى دراهم فاشتره لبيعه في الحال ويأخذ ثمنه فهذا مكروه في أظهر قول العلماء۔ (مجموع فتاوى ابن تیمیہ ۵۰۱، ۲۹، نیز دیکھئے: ۱۶۲، ۳۰، ۴۳۳، ۲۹، ۷۶، ۲۸)۔

وفي لفظ لا يحل بيع و سلف و لأنه اشترط عقداً في عقد ففسد كبيعتين في بيعة و لأنه إذا اشترط القرض زاد في الثمن لأجله فتصير الزيادة في الثمن عوضاً عن القرض و رجاله و ذلك ربا محرماً ففسد كما لو صرح به (المغنى ۴، ۲۶۰)۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ کسی معاملہ کی حقیقت اس کو محض فقہی روپ دینے سے نہیں بدلتی، اس لیے نقد کے مقابلہ میں ادھار کی قیمت زیادہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ جو دین ہے اور جو ایک مدت کے بعد وصول ہونے والا ہے اس پر فائدہ حاصل کیا جائے۔ یہ صورت حقیقتاً ربا ہی کی ہوئی۔ اس کے باوجود اگر اس کو ربا کہنے میں تامل ہو تو اس سے ریبہ کہنا ہی پڑے گا۔

### ۳۔ معاملات سے متعلق ضروری شرائط کا طے پانا بیع کا معاہدہ ہے یا بیع ہے؟

معاملات سے متعلق ضروری شرائط کا طے ہو جانا عرف میں بیع نہیں بلکہ بیع کا معاہدہ ہے، اور یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی بیع نہیں ہے کیونکہ اس میں نہ مال سپرد کیا جاتا ہے اور نہ قیمت ادا کی جاتی ہے۔ اس معاہدہ کی پابندی لازم ہونی چاہیے۔

### ۴۔ کیا مشتری کے لیے دو حیثیتیں اختیار کرنا جائز ہے؟

کوئی مشتری جو کسی مالیاتی ادارہ سے کوئی چیز خریدنے کا معاہدہ کر چکا ہو اس مالیاتی ادارہ کا وکیل بن کر بازار سے وہ چیز اس ادارہ کے لیے نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ یہ صورت شہادت اور نزاع پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے، اور جب مشتری اس چیز کو اس ادارہ سے اپنے لیے خریدنے کا معاہدہ کر چکا ہے اور پھر اس کا وکیل بھی بنتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ادارہ اور مشتری کے درمیان اصلاً بیع و شراء کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ادارہ کا کام محض مالیات Finance فراہم کرنا ہے اور مشتری کو اس پر سود ادا کرنا ہے۔ وکالت سود کے لیے محض جیلہ ہے۔



## مراہجہ سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی <sup>ط</sup>

۱۔ ادھار بیچنے کی صورت میں قیمت زیادہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

قیمت کے ادھار ہونے کی صورت میں نقد قیمت کے مقابلہ میں قیمت کا زائد ہونا درست ہے، جیسا کہ سائل نے تصریح کی ہے، متعلقہ مسئلہ میں ادھار کی جانے والی زائد قیمت کا بازار کے عام نرخ سے زائد ہونا بہت زیادہ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ مساوی بھی ہو سکتی ہے اور کم بھی اور تھوڑی بہت زائد بھی۔ امام شوکانی کی تصریح کے مطابق چند حضرات کے علاوہ جمہور جواز کے ہی قائل ہیں جیسا کہ صاحب اعلاء السنن اور صاحب موقف الشریعۃ الاسلامیہ دونوں نے ان سے نقل کیا ہے، اور امام شوکانی کا اس مسئلہ سے متعلق ایک مستقل رسالہ بھی ہے۔ اس کے عدم جواز کے سلسلے میں ایک حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مگر شوکانی نے پچھند وجوہ اس استدلال کو مرجوح قرار دیا ہے (اعلاء السنن ۱۳/۱۷۳-۱۷۴، نیل الاوطار ۵/۱۷۱-۱۷۳)۔

ہمارے فقہاء میں سے صاحب ہدایہ، صاحب درمختار وغیرہ نے باب المراءجہ میں ایک مسئلہ ذکر کیا ہے جس کے تحت صاحب ہدایہ نے ”الا یرئی انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل“ سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اسے تمام شرح ہدایہ اور شامی وغیرہ نے بدون نقد نقل و قبول کیا ہے (ہدایہ مع الفتح والعمایہ والکفایہ ۶/۱۳۳، رد المحتار ۳/۱۵۸)۔

جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمارے عام فقہاء کے یہاں یہ جواز متعین ہے۔ اگرچہ مولانا تفتی صاحب نے مسئلہ سود میں قاضی خان سے ایسی تصریح نقل کی ہے کہ جس سے اس کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے مگر جواز مسئلہ کی جو توجیہ و تنقیح کی جاتی ہے اور خود مولانا تفتی صاحب نے بھی فرمائی ہے اس کے بعد جواز میں کوئی خفا نہیں رہ جاتا، احتیاط امر دیگر ہے۔

جہاں تک سوال اس شبہ کا ہے کہ ادھار خریدنے والا مجبور ہی ہوتا ہے اور یہ اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے لہذا یہ ”ضرر و ضرار“ کے تحت آ کر ممنوع ہوگا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے اس خریدار کو بمقابلہ نقد کچھ زائد قیمت کا بار برداشت کرنا پڑ رہا ہے بیچنے والا بھی تو اس کی ضرورت کے پیچھے ایک قسم کا نقصان برداشت کر رہا ہے، اس لئے کہ نقد بیچ کر کم از کم اصل پونجی ہی وہ وقتی طور پر حاصل کر کے اپنے سرمایہ کو دوبارہ کسی کام میں لگا سکتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جتنی مدت میں ادھار قیمت کو وصول کرے گا اتنی مدت میں کئی مرتبہ یہ سامان خرید کر بیچ کر کافی نفع کمالے۔

البتہ اس کی رعایت ضرور ہونی چاہیے کہ دونوں قیمتوں کے درمیان اتنا زیادہ فرق نہ ہو جسے ”غبن فاحش“ (کھلا ہوا نقصان) کی بنیاد پر ایک قسم کی زیادتی قرار دیا جائے۔

ایک شبہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قیمت کی زیادتی، ادائیگی میں مہلت اور مدت کی تاخیر کے مقابلے میں ہے، اور یوں اصل قیمت تو اصل سامان کے بالمقابل اور زائد حصہ بلا عوض اور بمقابلہ وقت و مدت ہے، اور یہی ”ربا“ ہے کہ ”ربا و سود“ کے طور پر لیا جانے والا دراصل وقت کی بنیاد پر اور اسی کے بالمقابل لیا جاتا ہے اور اسی کے حساب سے گھٹتا بڑھتا ہے۔ لیکن یہ اشکال و شبہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں یہ معاملہ نہیں ہے کہ اصل قیمت نو سو روپے ہے، نقد ادا کرو نو سو روپے اور ادھار کرو تو اس پر اتنا بڑھا دو، بلکہ یہ معاملہ اس بنیاد پر ہے کہ ایک آدمی کو حق ہے کہ اپنا سامان جتنی قیمت میں چاہے فروخت کرے، یہ آدمی اس کو ایک وقت میں دو حالتوں کے اعتبار سے الگ الگ دو قیمتیں رکھ کر بیچتا ہے۔ خریدنے والا جس حالت کو اختیار کرے اس کے مطابق قیمت ادا کرے۔ تو ایسا نہیں کہ اصل سامان کی ایک قیمت رکھ کر ادھار ہونے کی وجہ سے اس پر اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ”ربا و سود“ میں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک حصہ اصل واجب الادا رقم کا اور ایک اس پر اضافہ شدہ رقم کا ہوتا ہے۔ اگر یہی معاملہ یوں ہو کہ اس سامان کی قیمت ۱۰۰ روپے ہے اگر آپ ادھار قیمت ادا کرنا چاہیں تو اس حساب سے اتنا مزید ادا کرنا ہوگا یا اتنے دن پر اتنا

ط الجامعۃ العربیہ، تھورا، باندہ (یوپی)۔



اور اتنے پر اتنا تو یہ بے شک ”ربا“ کہلائے گا مگر جب معاملہ یکمشت دو حالتوں کے پیش نظر دو قیمتوں کا ہے تو یہ حکم نہیں لگے گا۔

نیز یہ کہ ربا کی اصل حقیقت ”وقت کا عوض و بالمقابل ہونا“ نہیں بلکہ جانین سے باہم مالی لین دین کے معاملہ میں ایک طرف کے مال کی مقدار کا اس انداز میں دوسرے سے زائد ہونا کہ اس کے مقابلے دوسری طرف کا مال یا اس کا کوئی حصہ نہ پڑ رہا ہو۔ یعنی ربا اصلاً وہ زیادتی ہے کہ جس کے مقابلے میں کوئی عوض نہ ہو، اس لئے اعلیٰ سنن میں مولانا ظفر احمد صاحب نے اور مسئلہ سود میں مولانا تقی صاحب نے اسی انداز کی توجیہ کی ہے (اعلاء سنن ۱۳/ ۱۲۴-۱۲۵، مسئلہ سود ۱۳۳-۱۳۴) ربا صرف ادھار کے معاملات میں ہی نہیں ہوتا بلکہ نقد میں بھی ہوتا ہے، کتب فقہ میں ”ربا الفضل“ معروف ہے، اس کا مدار نقد پر ہی ہے، اور مسئلہ صورت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جو قیمت طے کر کے لی جا رہی ہے وہ پورے سامان کی ہے، ایک مال کی ایک مقدار، دوسرے کی اس سے زائد، جیسے کہ اگر دو الگ الگ دنوں میں آدمی قیمت کو کم و بیش کر کے بیچے حالانکہ خرید ایک ہی وقت میں ہو۔ اسی طرح ایک دوکان میں ایک قیمت اور دوسری میں اس سے زائد، تیسری میں اور زائد ہو، حالانکہ سب نے ایک ہی جگہ سے اور ایک ہی وقت میں اس سامان کو حاصل کیا ہو۔ بلکہ ایک ہی آدمی یوں معاملہ کرے کہ آج لوگے تو کم اور کل لوگے تو اس سے زیادہ قیمت ہوگی اور قیمت کو متعین بھی کر دے تو یہ سب صورتیں درست ہیں ”اعلاء السنن“ (۱۳/ ۱۲۴، ۱۲۵) میں مولانا ظفر احمد تھانوی نے اور ”مسئلہ سود“ (ص ۱۳۳، ۱۳۴) میں مولانا تقی عثمانی نے اسی انداز کی توجیہ کی ہے۔

”کرنسی کی ویلو“ کا مسئلہ گذشتہ سیمینار کے موضوع کے ضمن میں ابھی زیر بحث وزیر غور ہے اور بظاہر اس پہلو کو اس معاملہ میں اجاگر کرنا مفاسد کا باعث ہوگا۔

۲۔ جو سامان بینک کے ذخیرہ میں موجود نہیں ہے کیا ضرورت مند سے اس کی فروخت کا معاملہ ”بیع ما لم یملک و بیع ما لیس عند البائع“ کے تحت داخل ہے؟

اگر بینک کے پاس مطلوبہ سامان موجود نہیں ہے، اور وہ ضرورت مند خریدار سے اس کی فروخت کا مکمل معاملہ کر لیتا ہے، تو وہ اس صورت کے تحت ہی داخل ہے جو کہ از روئے نص منع ہے۔ اس صورت میں باہم ہونے والے معاملہ کو بیع کا معاملہ نہیں کہیں گے۔ بلکہ خریدار کی طرف سے ضرورت کا اظہار ہونے پر جانین سے ایک قسم کا معاہدہ و مواعدہ ہے، جس کا ایفاء از روئے دیانت ہی لازم ہوگا، اس لئے کہ ایفاء وعدہ کا وجوب دیانت ہی ہے۔ اور بعض حضرات کی نقل کے مطابق امام شافعی تو دیانت بھی لازم نہیں قرار دیتے، اسی طرح بعض مؤتمرات کی تجاویز فقہ مالکی کی رو سے قضاء بھی اس کے وجوب کو بتاتی ہیں اور یہ بھی کہ مصالح کی بنا پر دیانتی وجوب، وجوب قضائی سے بدل سکتا ہے (موقف الشریعۃ الاسلامیہ ۲۶۰)۔

بہر حال اصلاً یہ ایک وعدہ و معاہدہ ہی ہے جس کا عمومی طور پر ایفاء واجب نہیں ہے، کتاب ”موقف الشریعۃ“ میں اسی حیثیت سے اس کو ذکر کیا گیا ہے اور اس کی تائید کی گئی ہے (ایضاً ۲۵۹-۲۶۱) جبکہ ”استصناء“ جسے تعامل کی وجہ سے بالاتفاق ”بیع ما لیس عند البائع“ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اس کے حق پر تصریح ہے کہ عام حالات پر کم از کم مشتری مطلوبہ سامان کے لینے پر مجبور نہیں ہے (رد المحتار ۴، ۲۳۷)۔

اور چونکہ اس کی حیثیت وعدہ و معاہدہ کی ہے اس لئے اس کی تصریح کی گئی ہے، معاہدہ ہو جانے پر بینک اپنے سرمایہ سے مطلوبہ سامان کو خریدے پھر حسب صواب دید نفع بڑھا کر ضرورت مند کے ہاتھ فروخت کرے، ضرورت مند کے ہاتھ فروخت کرنے اور اس کے سپرد کرنے سے پہلے وہی اس کے تمام نفع و نقصانات کا ذمہ دار ہوگا اور یوں اس کو ملنے والا نفع فقہ کی اصل ”بیع مالہ بیضن“ کا مصداق نہیں قرار پائے گا۔

۳۔ بینک سے معاملہ کر کے خریداری کرنے والے کا قبضہ کیا بائع کا قبضہ شمار ہو سکتا ہے؟

یہ صحیح ہے کہ بعض صورتوں پر ایک ہی قبضہ دو قبضوں کی کفایت کرتا ہے، ایک اصالتاً ہوتا ہے اور ایک نیابتاً، لیکن یہ ضابطہ عام نہیں ہے، بیع کے بارے میں صراحت موجود ہے کہ ایک وقت میں ایک شخص یا صرف خریدار بن سکتا ہے یا بیچنے والا، مگر بیک وقت دونوں جہتیں اس کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں، اگرچہ ایک نیابتاً و وکالتاً کیوں نہ ہو (ہدایہ فتح القدیر ۱۹۶/۳)۔ یہاں معاملہ کو ظاہر پر رکھیں تو یہی بات بنتی ہے کہ بازار سے سامان کو حاصل کرنے والا ادارہ کے لئے خریدار اور پھر ادارہ کی طرف سے فروخت کنندہ بھی ہے اور اپنے ہی ہاتھ بیچا اس لئے ادارہ سے خریدار بھی ہے، ہاں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ادارہ کے ساتھ ان کا خریداری کا معاملہ جو کہ مال کے بازار سے حاصل کرنے سے پہلے ہوا ہے وہ تو محض ایک وعدہ ہے اس لئے بازار سے لیتے وقت یہ شخص صرف ادارہ کا وکیل ہے خریداری کے لئے، اس کے بعد جب وہ سامان کو حاصل کر کے اپنے قبضے میں باقی رکھتا ہے اور اس پر مالکانہ تصرفات کرتا ہے تو سابق وعدہ

کے مطابق وہ ادارہ سے سامان مذکور کو خریدنے والا بن جاتا ہے، یوں اس سابق وکالتی و نیابتی قبضہ اب اصلتی یعنی اپنے لئے قبضہ بن جاتا ہے، جیسے کہ غاصب یا چور کے ہاتھ، ان کے پاس موجود غصب کردہ یا چرائے سامان کی بیع کی جائے تو ان کا سابق غلط موجب ضمان قبضہ صحیح اور اپنے لئے مالکانہ قبضہ سے بدل جاتا ہے، اور بالخصوص سابق گفتگو کے بعد اس طرح بھی بیع کا انعقاد و اعتبار ہوتا ہے، صاحب فتح القدیر کی تصریح کے مطابق ایجاب و قبول فعلاً بھی ہو سکتے ہیں اور بالخصوص قبول اور قاضی خان کی تصریح کے مطابق قبضہ بھی قبول کا کام کرتا ہے (رد المحتار ۶/۳۷۴-۷)۔

۳۔ کتاب "موقف الشریعة من المصارف الاسلامیة المعاصرة" میں مراہمہ کے ضمن میں ایک صورت معاملہ یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ ضرورت مند ادارہ کو اصل قیمت پر سامان خریدنے کے لئے اپنا وکیل بنائے اور قیمت کے ساتھ طے شدہ حدود کے مطابق ادارہ کو وکالت کا محتاتانہ دے۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ مطلوبہ رقم بعد میں ادا کرے بلکہ پہلے بھی دے سکتا ہے اور بعد میں بھی اور دو حصوں میں کر کے بھی (موقف الشریعة الاسلامیہ ۲۶۱، ۲۹۹ اور آگے)۔

۵۔ ہمارے آپسی مذاکرہ میں سوال نمبر ۳ کے تحت یہ بات آئی ہے کہ (الف) اگر ادارہ کی طرف سے نقد پیسے ضرورت مند کو بازار سے مطلوبہ سامان لینے کے لئے دیئے جائیں تو یہ کر لیا جائے کہ ضرورت مند کے ساتھ ادارہ کا ایک آدمی جائے، پیسے وہی لے جائے وہی ادا کرے اور بازار سے سامان کو حاصل کر کے ضرورت مند کے ہاتھ میں دیدے، یوں ضرورت مند کا قبضہ خود اپنے لئے بحیثیت ادارہ سے خریدار کے ہوگا اور بظاہر کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں ہوگا۔

ب۔ اسی طرح اگر ڈرافٹ کے واسطے سے معاملہ ہو تو صورت بدل جائے گی یعنی ادارہ کا آدمی ساتھ جائے اور وصول کر کے دیدے، اور غالباً بینکوں کے اس قسم کے معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان کا آدمی جاتا ہے، نیز ڈرافٹ لے کر اگر خود ضرورت مند جائے تو نقد لے جانے کی نسبت سے صورت معاملہ یوں مختلف و بدلی ہوئی سمجھ میں آتی ہے کہ بازار دوکاندار سے سارے معاملات ادارہ خود طے کرتا ہے، اس لئے ادارہ اسی کے مطابق کاغذات تیار کرتا ہے، اگرچہ خریدار کی حیثیت سے نام ضرورت مند کا ہی دیا جاتا ہے، یوں گویا ادارہ خود براہ راست متعلقہ دوکاندار کو قیمت ادا کر دیتا ہے، براہ راست کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت مند خریدار کو واسطہ بنائے بغیر، اس لئے کہ ڈرافٹ کی وجہ سے بینک میں جمع کردہ روپیہ براہ راست دوکاندار کے اکاؤنٹ میں جاتا ہے، رہ گیا ڈرافٹ تو اگرچہ اسے ضرورت مند اپنے ہاتھوں میں لے کر دوکاندار کے پاس جائے مگر اس کی حیثیت ایک سند و وثیقہ کی ہوتی ہے۔ بایں معنی کہ آپ کے مطلوبہ پیسے تو ہم نے فلاں آپ کے وکیل کے سپرد کر دیئے ہیں۔ یہ وصولیابی کی سند و رسید ہے اس کو دیکھ کر آپ مطلوبہ سامان اس رسید لانے والے کو دیدیں۔ اب ضرورت مند جب سامان پر قبضہ کرے گا تو وہ ادارہ کا "وکیل بالقبض" ہوگا۔ بمقابلہ نقد پیسہ لے جانے کے کہ اس صورت میں وہ ادارہ کے لئے خریداری کا وکیل ہوگا۔ جبکہ وہ خود اسی ادارہ سے اسی سامان کو خریدنے والا ہے۔ بلکہ وہ خریدار ہے تو کچھ اشکال ہوتا ہے۔ مگر اس صورت میں وہ محض قبضہ کا وکیل ہوگا اور پھر اپنے لئے قبضہ کرنے والا۔ حکماً دو قبضے ماننے کی صورت میں یعنی ابتداء ادارہ کے لئے پھر اپنے لئے، اگرچہ بعض تصریحات کی بنا پر اس بنیاد پر اشکال ہوتا ہے کہ پہلا قبضہ جو کہ وکالت ہے امانت کی حیثیت سے ہے، اور دوسرا قبضہ اپنے حساب میں اور قبضہ ضمان ہے۔ اور ایسا دوسرا قبضہ وہیں معتبر ہوتا ہے جہاں کہ پہلا بھی اسی قسم کا ہو۔ جیسے کہ کسی نے کوئی مال غصب کر رکھا ہو تو قبضہ ضمان ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تصریح موجود ہے کہ امانتی قبضہ کی صورت میں بیع کا معاملہ کر لینے کے بعد اگر آدمی اس مال تک پہنچ جاتا ہے یا اس میں کوئی مالکانہ تصرف کرتا ہے تو اب اس سامان پر اس کا اپنے حساب کا قبضہ ہو جائے گا، اور وہ مسئلہ کہ موجب اشکال ہے اس کی اصل یہ نکلتی ہے کہ اگر پہلا قبضہ امانتی ہے تو نفس بیع کی وجہ سے وہ قبضہ اپنے ضمانتی قبضہ سے نہیں بدلے گا، اور اگر پہلا قبضہ بھی ضمانتی ہے تو نفس بیع کی وجہ سے اپنا قبضہ ہو جائے گا (البحر الرائق ۸۶۶-۸۷۷، رد المحتار ۳/۱۱۲-۱۱۳)۔





## مراجہ

مولانا محمد نظام الدین رضوی رحمۃ اللہ علیہ

شریعت طاہرہ نے خرید و فروخت کے معاملے میں کچھ ارکان اور شرائط کی پابندی ضرور عائد کی ہے مگر اشیاء کی قیمتوں کے سلسلے میں کسی مخصوص مقدار کا تعین نہیں فرمایا ہے، وہ اسے ”باہمی رضامندی کا سودا“ گردانتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔  
(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، ہاں اگر باہمی رضامندی کا سودا ہو تو حرج نہیں)۔

لہذا بیچنے اور خریدنے والوں کو یہ حلال ہے کہ کسی بھی سامان کا کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ جتنا چاہیں دام طے کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ فتح القدر میں فرمایا:

لو باء كاغذة بألف ييجوز ولا يكره (كتاب الكفالة)

(اگر کاغذ کا ایک ٹکڑا ہزار روپے میں بیچا تو یہ جائز ہے، مکروہ بھی نہیں ہے)۔

حالانکہ کاغذ کے ایک ٹکڑے کا دام اس ہوش ربا گرانی کے دور میں بھی پانچ پیسے ہونا ضروری نہیں۔

میعاد کے باعث قیمت میں اضافہ:

اُدھار خرید و فروخت کی صورت میں شے کے زائد دام کو مہلت دینے کی قیمت کہا جاسکتا ہے، ہدایہ میں ہے:

لأن للأجل شها بالمبيع الأ يرضى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل (هدایہ ۲، ۵۸ باب المراجہ)۔

کیونکہ میعاد کو بیع سے یک گونہ مشابہت ہے لہذا اس کی وجہ سے قیمت زیادہ کی جاسکتی ہے۔

بیع عینہ سے استناد:

بیع عینہ جس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے مثلاً کسی تاجر سے دس روپے قرض مانگا اس نے قرض دینے کے بجائے اپنا دس روپے کا کپڑا بطور مراجمہ پندرہ روپے میں اس کے ہاتھ اُدھار بیچ دیا تاکہ یہ بازار میں اسے بیچ کر دس روپے حاصل کر لے اس طرح اسے دس روپے مل گئے اور تاجر نے اُدھار کی وجہ سے پانچ روپے کا نفع سود کی آلودگی کے بغیر اس سے حاصل کر لیا جس کی ادائیگی میعاد پوری ہونے کے وقت خریدار پر واجب ہوگی، یہ بیع بلا کراہت درست ہے (شامی ۲۷۹۶)۔

بیع عینہ میں بھی مہلت دینے کی وجہ سے قیمت میں زیادتی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس میں قرض دینے کی نیکی و حسن سلوک سے اعراض بھی ہوتا ہے، اس کے باوجود وہ بلا کراہت جائز ہے، تو مسئلہ دائرہ میں بیع مراجمہ ضرور جائز ہوگی کہ اس میں قرض دینے سے اعراض کا کوئی غیر مستحسن کام تو نہیں پایا جاتا۔ البتہ یہ بیع خلاف اولیٰ ہوگی کہ میعاد فی الواقع بیع نہیں ہے تو اس کی وجہ سے دام کا اضافہ کچھ اچھا نہیں۔

”بل خلاف الأولى فإن الأجل قابله قسط من الثمن۔ فتح“

بیع عینہ اب خلاف اولیٰ بھی نہیں:

دارالعلوم اشرفیہ اعظم گڑھ (یو پی)۔



مگر اس بیع کے ”بہتر نہ ہونے“ کا یہ حکم عام حالات میں ہے جبکہ بیچنے والے کو ادھار بیچنے میں کوئی ضرر نہ ہو، اور خریدار کو دوسری جگہ وہ سامان واجباً دام پر بغیر کسی منظور شرعی کار تکاب کے مل سکتا ہو۔ مگر آج عام طور سے زمانے کا حال اس سے مختلف ہے۔ حکومت کے بینکوں سے قرض کے طور پر یا ادھار کوئی سامان لیا جائے تو اسے اصل قرض یا دام کے علاوہ ایک معین فی صد کے حساب سے زائد رقم دینی پڑتی ہے۔ عموماً یہی حال مہاجنوں سے لین دین کا بھی ہے جو بلاشبہ ناجائز ہے۔

قال في فتح القدير: فالظاهر أن الإباحة يقيد نيل المسلم الزيادة، وقد التزم الأصحاب في الدرر أن مرادهم من حل الربا ما إذا حصلت الزيادة للمسلم نظراً إلى العلة (شامی، ص ۱۸۸، قبیل باب الحقوق)۔

دوسری طرف مسلم تاجر اور اسلامی بینک ہیں جو سودی لین دین کی زیاں کاری و معصیت سے بچنے اور ساتھ ہی تجارت کو خسارہ سے بچانے کے لئے ادھار بیچ کر سامان کا دام اس کی واجب قیمت سے زیادہ وصول کرتے ہیں، اگر ایسا نہ کریں تو آج کے ”دن دوئی رات چوگنی گرانی کی ترقی“ کے دور میں ان کا خسارہ ہو سکتا ہے، کیونکہ آج ایک سامان کی جو قیمت رائج ہے وہ چھ ماہ بعد اس سے زیادہ ہوگی۔ پس سال دو سال کی میعاد پر اگر کوئی تاجر آج کے نرخ پر اپنا سامان بیچ دے تو روز افزوں گرانی کے پیش نظر اس کا خسارہ لازمی ہے۔ اس طرح مسلمان دوسری اقوام عالم کے بہ نسبت اور بھی پیچھے ہوتا چلا جائے گا، اور اسلامی بینک اگر یہی طریق کار اپنالیں تو اس کا حشر کچھ اور ہی زیادہ بڑا ہوگا۔ پھر انجام کاریہ ہوگا کہ مسلم تاجر اور اسلامی بینک ادھار خرید و فروخت کا نام بھی کبھی نہ لیں گے اور کاروبار زیادہ تر حکومت کے بینکوں اور غیر مسلم مہاجنوں کے قبضے میں چلا جائے گا، اور ناجائز طور پر لوٹ کھسوٹ ہوگی۔

ایسے حالات میں اس بے بضاعت کے خیال میں بہتر یہی طریق کار ہے کہ اسلام کے حدود میں رہ کر مرابحہ کا جائز لین دین کیا جائے، غالباً اسی طرح کے حالات تھے جب صحابہ کرام نے بیع عینہ کو سراہا تھا بلکہ اس طرح کے کاروبار میں حصہ لیا تھا۔ فعله كثير من الصحابة وحمدوا على ذلك (فتح القدير ۶۲۲)۔

یوں ہی جب ایک زمانے میں بیع فاسد کارواج ہو چلا تھا۔ بلخ کے مشائخ کرام نے اسے ”خیر بیعات“ فرمایا تھا، اور امام ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہاں تک فرمایا کہ عینہ کے طور پر خرید و فروخت کرنے والا مستحق اجر و ثواب ہوگا۔ یعنی جب اس کی نیت سود اور ناجائز کاروبار سے احتراز کرنے کی ہو (دیکھئے: فتح القدير ۲۳۶، کتاب الکفالة، شامی ۲۷۹، کتاب الکفالة)۔

عن أبي يوسف: العينة جائزة مأجور من عمل بها كذا في مختار الفتاوى، هندیہ (شامی، ص ۲۲۲ جلد ۲، باب الصرف)۔ اس سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ ادھار خرید و فروخت کی صورت میں سامان کا دام اس کے موجودہ نرخ سے زیادہ لینا جائز ہے، اور اب یہ خلاف اولیٰ بھی نہیں، لیکن ساتھ ہی اسلامی بینکوں اور مسلم تاجروں کو اس امر کا لحاظ بھی اشد ضروری ہے کہ اصلی قیمت پر اتنا ہی دام بڑھائیں جو خریداروں کے لئے حرج کا باعث نہ ہو، اور مثلاً سال بھر کے لئے کسی کو ادھار سامان دے رہے ہیں تو یہ حساب کر لیں کہ ایسے سامان پر اس مدت میں حکومت کے بینک سود کے نام پر کتنی رقم وصول کریں گے وہ رقم جتنی بھی ہو اپنے یہاں نفع کی مقدار اس سے بہر حال کم رکھیں تاکہ قلوب اسی جائز خرید و فروخت کی طرف مائل ہوں۔

ادھار دام کی قسط و ادا کیگی:

ادھار دام کی ادائیگی یکمشت ہونا ہی ضروری نہیں، قسط و ادا کرنا بھی جائز ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ قسط کی رقم نیز ادائیگی کی مدت متعین ہو کہ مثلاً ہر ماہ اتنے روپے ادا کرنے ہیں، ورنہ قسط کی رقم یا ادائیگی کی مدت مجہول ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی۔ درمختار میں ہے: عليه ألف ثمن جعله ربه نجوماً ان أخل بنجم حل الباقي فالأمر كما شرطاً، ملتقط (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۲۰۲۳)۔ (کسی پر ہزار روپے دین ہیں، مالک دین نے اس کی ادائیگی کے لئے قسطیں مقرر کر دی ہیں، اور یہ بھی شرط کر دیا ہے کہ اگر ایک بھی قسط وقت پر وصول نہ ہوئی تو باقی کل دین فوراً وصول کیا جائے گا، تو ان کی باہمی قرارداد کے مطابق عمل ہوگا)۔

ردالمحتار میں ہے: من جهالة الأجل اشتراط أن يعطيه الثمن على التفاريق، أو كل أسبوع البعض (۲۰۲۳ مصری)۔

بیع کب مکمل ہوتی ہے:

مالیاتی ادارے اور خریدار کے درمیان مطلوبہ سامان کے لین دین سے پہلے سامان کی خریداری، اس کی لاگت، اس پر مطلوبہ منافع یا اور دوسرے ضروری یا

رہی شرائط کے متعلق جو کچھ طے ہوتا ہے وہ فی الواقع بیع نہیں، بلکہ وعدہ بیع ہے کیونکہ اس گفتگو کے الفاظ ایجاب و قبول نہیں ہوتے بلکہ اس قرارداد کے بعد جو بیع نامہ لکھا جاتا ہے وہ بھی ایجاب و قبول نہیں کہ وہ دراصل اس قرارداد کی توثیق ہوتی ہے تاکہ خریدار اپنے وعدے سے پھرنے نہ پائے۔ اور بیع تعاطی کے طور پر اس وقت مکمل ہوتی ہے جب یہ ادارہ اپنے خریدار کو مال حوالے کر دیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس حوالگی سے پہلے بیع کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ اسے غیر مملوک کی بیع ٹھہرا کر ناجائز گردانا جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے: الفتاویٰ الہندیہ)۔

سامان کے لین دین سے پہلے خریدنے اور بیچنے والے دونوں کو اپنے وعدے سے پھر جانے کا کلی اختیار حاصل ہوتا ہے، یہ تو اس مسئلے کی قانونی حیثیت ہے مگر ایسا کرنا جائز نہیں، ارشاد باری ہے: { يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ }

نیز ارشاد فرمایا ہے: { فَأَعْقِبْهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَقُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ } (سورہ توبہ ۹) خریدار کو وکیل بالشراء بنانا درست ہے:

اگر ادارہ ضرورت مند شخص کو روپے دے کر بازار بھیج دے کہ وہ اپنا مطلوبہ سامان خود ہی بازار سے خرید لے تو یہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ وہ سامان خرید کر ادارہ میں لائے اور اس کے سامنے اس سے خریداری کے لئے جدید قبضہ کرے کیونکہ پہلے وہ مالیاتی ادارہ کی طرف سے خریداری کا وکیل (وکیل بالشراء) تھا تو اس سامان پر اس کا قبضہ، امانت تھا جبکہ مشتری کا قبضہ قبضہ ضمانت ہوتا ہے، اور قبضہ امانت قبضہ ضمانت کے قائم مقام نہیں ہوتا، لہذا حاجت مند کے جدید قبضے سے پہلے اگر اس کے پاس سے وہ سامان ہلاک ہو جائے تو یہ ادارہ کا سامان ہلاک ہوگا اور مشتری پر اس کے بدلے میں کوئی تاوان نہیں لازم ہوگا۔

علاوہ ازیں جدید قبضہ نہ ہونے کی صورت میں بھی اگر اسے جدید بیع مان لیا جائے تو یہاں ایک فساد بھی لازم آئے گا کہ ادارہ نے جس چیز کے خریدنے کا اسے وکیل بنایا تھا اسے خرید کر اس نے خود ہی بیع دیا اور خود ہی اپنے لئے خرید بھی لیا یعنی وہ تنہا بیع بھی ہوا اور خریدار بھی، جو بلاشبہ ناجائز و باطل ہے۔ وان الواحد لا یتولی طرفی البیع کما ہو مصرح فی علمۃ الکتب، تو انعقاد بیع کے لئے بہر حال جدید قبضے کی ضرورت ہے (دیکھئے: عالمگیری ۳۳۳، الفصل الرابع فیما ینوب قبضہ عن قبضہ البیوع والایوب)۔

اچھی اور آسان راہ:

اس کی بہتر اور آسان راہ یہ ہے کہ مالیاتی ادارہ اپنے کسی آدمی کو خرید و فروخت دونوں کا وکیل بنا کر ضرورت مند کے ساتھ بازار بھیج دے، وہ وکیل سامان خرید کر اسے دے دے کہ اس صورت میں نہ سامان کو ادارہ میں لانے کی حاجت ہے اور نہ ہی ضرورت مند کو کسی جدید قبضے کی ضرورت۔ اس طرح مالیاتی ادارہ کے یہ دونوں مقاصد حاصل ہو جائیں گے کہ ضرورت مند شخص من پسند سامان پا کر مطمئن ہو جائے گا اور ادارہ خرید کر لانے پھر اس کی حفاظت کرنے کی زحمت سے بچ جائے گا، اور ساتھ ہی بیع بھی صحیح و درست ہوگی۔

واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ جلّ مجدہ اتم و احکم

☆☆☆

## بیع مراہجہ اور اسلامی بنک کاری

مولانا محمد شہاب الدین ندویؒ

تمہید

اسلامی شریعت کی رو سے تجارت کی جو جائز شکلیں ہیں ان میں سے ایک ”مراہجہ“ بھی ہے، جس کے معنی ہیں: ”کسی چیز کو اس کی اصل لاگت یعنی اس المال سے کچھ زیادہ نفع مقرر کر کے فروخت کرنا۔“ چنانچہ بیع مراہجہ کی تعریف علامہ ابن نجیم نے ”صحاح“ کے حوالے سے اس طرح کی ہے:

والمراجعة في اللغة كما في الصحاح يقال اذا بعته المتاع واشتريته منه مراجعة اذا سميت لكل قدر من الثمن رجحا  
(البحر الرائق ۶: ۱۰۷ مطبوعہ کراچی)۔

اس اعتبار سے مراہجہ کسی چیز کو اصل قیمت سے کچھ زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کرنے کا نام ہے۔ بیع مراہجہ پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی شریعت میں بیع کی جو دوسری شکلیں موجود ہیں ان کی بھی مختصر وضاحت کر دی جائے، تاکہ مراہجہ کی صحیح نوعیت سمجھنے میں آسانی رہے۔

بیع کی قسمیں:

اسلامی شریعت کی رو سے خرید و فروخت (بیع) میں بطور بدل یا قیمت (ثمن) جو چیز دی جاتی ہے اس کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں ہیں، اور مزید اسی طرح تجارتی نفع و نقصان کے اعتبار سے بھی اس کی مزید چار قسمیں ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کی مختصر تشریح اس طرح ہے:

۱۔ ایک چیز کے عوض میں دوسری چیز فروخت کرنا مثلاً اسکوٹر کے عوض فرنیچر یا فرنیچر فروخت کر دیا، اسے بیع لعین بالعین کہتے ہیں۔

۲۔ کسی چیز کو روپیہ یا ریال یا ڈالر کے عوض فروخت کرنا، اسے بیع السلع بالاثمان المطلقہ کہتے ہیں۔

۳۔ سونے چاندی یا کرنسی کا تبادلہ۔ اس کا نام بیع الصرف ہے۔

۴۔ کسی معاہدہ کے تحت پہلے روپیہ ادا کر کے کوئی متعین چیز مقررہ مدت کے بعد حاصل کرنا اسے بیع السلم کہا جاتا ہے (ماخوذ از بدائع الصنائع ۵/ ۱۳۳ مطبوعہ پاکستان، نیز فتح القدیر ۵/ ۵۵۵ مطبوعہ پاکستان)۔

اور قسم دوم کی چار قسمیں یہ ہیں:

۱۔ فروخت کی جانے والی چیز (بیع) کا تبادلہ بازاری قیمت سے کم و بیش یا کسی بھی قیمت پر عمل میں آنا، اسے ”بیع مساومہ“ کہا جاتا ہے۔

۲۔ فروخت کی جانے والی چیز (بیع) کو ثمن اول (بائع کی خریدی ہوئی قیمت) پر کچھ زیادہ نفع دے کر خریدنا، اسے ”بیع مراہجہ“ کہتے ہیں، اور زیر بحث مضمون کا تعلق اسی سے ہے۔

۳۔ کسی چیز کو بغیر کسی نفع یا نقصان کے ”ثمن اول“ پر خریدنا یا فروخت کرنا اس کا نام ”بیع تولیہ“ ہے۔

۴۔ کسی چیز کی اصل قیمت میں کمی کر کے بیچنا اسے ”بیع وضعیہ“ کہا جاتا ہے (ماخوذ از بدائع الصنائع ۵/ ۱۳۵)۔

مراہجہ کے بنیادی اصول:

۱۔ بانی فرقانیا کیڈمی بنگلور۔



بیع مراہجہ کے صحیح ہونے کے لئے چند بنیادی شرائط موجود ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ غالباً دور قدیم ہی سے مراہجہ اور تولیہ کا جواز ایک تمدنی اور معاشرتی ضرورت کے طور پر رہا ہے۔ کیونکہ تجارت میں ایک غبی یا کم عقل شخص اپنی سادہ لوحی کے باعث دھوکہ کھا سکتا ہے، لہذا اسے اپنی ضروریات کی اشیاء خریدنے کے لئے ایک ہوشیار اور تجربہ کار شخص پر اعتماد کرنے کی ضرورت رہتی ہے، جیسا کہ صاحب ہدایہ اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

والبیعان جائز ان لاستجماع شرائط الجواز، والحاجة ماسة إلى هذا من البيع لأن الغبی الذی لا یهتدی فی التجارة یحتاج إلى أن یعتمد علی فعل الذی المہتدی (ہدایہ آخرین، ص ۵۵، مطبوعہ دہلی)۔

اس اعتبار سے بیع مراہجہ کی بنیاد امانت داری پر ہے۔ لہذا اسے ہر قسم کی خیانت اور شبہات سے پاک ہونا ضروری ہے، جیسا کہ صاحب ہدایہ اس سلسلے میں مزید تحریر کرتے ہیں: ولہذا کان مبناهما علی الأمانة والاحتراز عن الخیانة وعن شبہتهما (ایضاً، ص ۵۵)۔

مراہجہ کے صحیح ہونے کا سب سے پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ فروخت کرنے والا (بائع) خریدنے والے (مشتري) کو بیچنی جارہی شے کی صحیح قیمت بتائے اور اس میں خریدار کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا یا خیانت نہ کرے، ورنہ خریدار کو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق اختیار ہوگا کہ یا تو طے شدہ پوری قیمت ادا کر کے اس بیع کو قبول کرے یا اسے کالعدم (فسخ) کر دے۔ مگر امام ابو یوسفؒ اور قاضی ابن ابی لیلیٰ کے قول کے مطابق اضافہ شدہ رقم بائع کے نفع میں ساقط کی جائے گی اور مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے صراحت کی ہے (دیکھئے: المبسوط للسرخسی ۸۶/۱۳، مطبوعہ کراچی)۔

اس سلسلے میں دوسرا اصول یہ ہے کہ فروخت کنندہ (بائع) بیچنی جارہی چیز اگر ادھار (سیئہ) خریدی ہے تو اسے خریدار کو حقیقت حال سے واقف کرائے بغیر بطور مراہجہ نقد فروخت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بات امانت داری کے خلاف ہے۔ لہذا ایسی صورت میں خریدار کو خریداری (بیع) فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ کیونکہ ادھار خریدی ہوئی چیز نقد خریدی ہوئی چیز سے عموماً زیادہ مہنگی ہوتی ہے چنانچہ امام سرخسی اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

وإذا اشترى شيئاً بنسيئة فليس له أن يبيعه مراجعة حتى يتبين أنه اشتراه نسيئة لأن بيع المراجعة بيع أمانة تنفی عن كل قهمة... ثم الإنسان في العادة يشترى الشيء بالنسيئة بأكثر مما يشترى بالنقد (المبسوط للسرخسی ۱۲، ۷۸)۔

اور صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں: ومن اشترى غلاماً بألف درهم نسيئة فباعه بربح مائة ولم يبين فعله المشتري فإن شاء ردّه وإن شاء قبل، لأن للأجل شبهاً بالمبيع الأيرى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل (ہدایہ آخرین ص ۵۸-۵۷)۔

اس سلسلے میں تیسرا اصول یہ ہے کہ بائع اول اگر قیمت میں کمی کر دے تو بائع ثانی کو بھی قیمت میں کمی کرنی پڑے گی۔ جیسا کہ امام سرخسی تحریر فرماتے ہیں:

وإذا باع المتاع مراجعة ثم حط البائع الأول منه شيئاً من الثمن فإنه يحط ذلك من المشتري الآخر وحصه من الربح (المبسوط ۱۳، ۸۲)۔

اس وضاحت سے زیر بحث مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ کسی تھوک فروش (Whole Seller) سے مسلسل رابطہ رکھنے کی صورت میں جو کمیشن یا ڈسکاؤنٹ وغیرہ ملتا ہے وہ اصول کے مطابق بائع کو اصل قیمت میں وضع کر کے دکھانا ہوگا ورنہ بیع مراہجہ کی صورت میں یہ خیانت ہوگی، کیونکہ بائع اس میں اپنا نفع الگ سے لیتا ہے۔

بیع مراہجہ میں بیچنی جارہی چیزوں کی قیمتوں میں ضمنی اخراجات جوڑے جاسکتے ہیں مثلاً دھوبی، رنگریزی اور کڑھائی کا معاوضہ، مزدور کی اجرت (کراء) نقل و حمل (ٹرانسپورٹ) کے اخراجات اور ایجنٹ کا کمیشن (اجرة السمسار) وغیرہ۔ لیکن اس صورت میں فروخت کرنے والا یہ نہیں کہے گا کہ میں نے اس کو اتنے میں خریدا ہے۔ بلکہ یوں کہے گا کہ اس چیز پر اتنی لاگت آئی ہے (خلاصہ از المبسوط ۸۰/۱۳، در مختار بر حاشیہ رد المحتار ۱۷۲/۲، ہدایہ مع فتح القدر ۱۲۵/۶، البحر الرائق ۱۰۹/۶-۱۱۰)۔

اور شمس الائمہ سرخسی نے ایک عام اصول یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مراہجہ میں ضمنی اخراجات کے سلسلے میں تاجروں کے عرف (رواج) کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی فروخت کی جارہی چیز کی قیمت (راس المال) میں کون کون سے اخراجات شامل ہو سکتے ہیں اس کا اعتبار تاجروں کے عرف و رواج پر ہوگا (المبسوط ۸۰/۱۳)۔

بیع مراہجہ اور جدید بینک کاری:

بیع مراہجہ پر یہ ایک اجمالی نظر تھی۔ اس بحث سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں مراہجہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اصول و مبادی کیا ہیں۔ اب رہا

مراہجہ کو بنک کاری یا اسلامی بینکنگ سے جوڑنے کا مسئلہ تو یہ ایک نئی شکل اور نئی صورت حال ہے۔ اور اسلامی بنک کاری کے نام سے مراہجہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ ایک طرف اسلام کے بیان کردہ سودی طریقوں سے پاک ہو اور دوسری طرف مراہجہ کے بنیادی اصولوں سے پوری طرح ہم آہنگ بھی ہو۔

واضح رہے کہ زیر بحث مسائل میں مراہجہ اور بنک کاری دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور بیع مراہجہ بعض صورتوں میں "بیع مساومہ" بن سکتی ہے جس کی تعریف اوپر گزر چکی ہے، چنانچہ زیر بحث مسائل میں ایک مسئلہ ادھار خرید و فروخت کا بھی ہے اور ادھار کی بھی دو صورتیں ہیں: یک مشت ادا ایگی یا بالاقساط ادا ایگی۔ بہر دو صورت فروخت کرنے والا آج کے نرخ کے مقابلے میں قیمت زیادہ رکھتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدت ادا ایگی کی کمی اور زیادتی کے مطابق مقررہ منافع میں بھی کمی اور زیادتی کی جاتی ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بائع اس ادھار بیع میں تا جیل (مہلت دینے) کی قیمت وصول کر رہا ہے۔ اس صورت حال کو مراہجہ کہنے کے بجائے شاید مساومہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ جس میں قیمتوں کی کمی بیشی کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ اس کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔ اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد فروخت کرنے کی بہ نسبت قیمت زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں ایک عام اصول یہ ہے کہ خرید و فروخت نقد نقد بھی ہو سکتی ہے اور ادھار بھی۔ جب کہ ادا ایگی کی مدت مقرر ہو۔ جیسا کہ صاحب ہدایہ نے قرآن کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: "و یجوز البیع بضمن حال و مؤجل إذا كان الأجل معلوماً، لإطلاق قوله تعالى وأحل الله البیع (ہدایہ مع فتح القدیر ۵، ۴۶۸، مطبوعہ پاکستان)۔"

چونکہ بیع کا اطلاق نقد اور ادھار دونوں صورتوں پر ہو سکتا ہے اس لئے دونوں صورتیں جائز ہیں، جب تک فقہی نقطہ نظر سے اس میں ربا کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک فقہی ضابطہ یہ ہے کہ جس بیع میں جنس اور قدر دونوں مختلف ہوں ان میں زیادہ (تفاضل) اور ادھار (تسبیہ) دونوں جائز ہیں۔ خصوصاً جب کوئی چیز روپیہ (شمن مطلق) کے ذریعہ خریدی جائے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں کہ نقدی اور سامان کے تبادلے میں سود نہیں ہوتا۔

ولا ربا بین الأثمان والعروض (الغنی ۴، ۱۰۲، مطبوعہ ریاض)۔

نیز موصوف نے مزید تحریر کیا ہے کہ کسی چیز کو ادھار فروخت کرنا بالاتفاق ناجائز نہیں ہے۔ البیع بنسیئۃ لیس بمحرر من اتفاقاً (ایضاً ۲، ۱۹۸)۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ ادھار بیع میں قیمتیں عموماً زیادہ لی جاتی ہیں مگر کسی نے اسے ناجائز نہیں کہا، چنانچہ شمس اللائمہ سرخسی تحریر کرتے ہیں: "ثم الإنسان في العادة يشتري الشيء بالنسيئة بأكثر مما يشتري بالنقد (المبسوط ۱۲، ۸۰)۔ اور صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں: "ألا يرى أنه يُزاد في الشمن لأجل الأجل (ہدایہ مع فتح القدیر ۶، ۱۱۳)۔ اور امام مالک کے نزدیک نقد قیمت مقرر کرنے کے بعد بھی کچھ اضافہ کے ساتھ ادا ایگی کے لئے مدت مقرر کرنا جائز ہے، جیسا کہ مالکی عالم امام حنون سے مروی ہے:

قلت: أرايت إن اشتريت سلعة بعشرة درهم نقداً، ثم أخزني البائع بالدارهم سنة، فأردت أن أبيع مراجة كيف أبيع في قول مالك... (المدونة الكبرى ۴، ۲۳۰، مطبوعہ مصر)۔

اس اعتبار سے ادھار فروخت میں زائد قیمت وصول کرنا ایک ایسا رواج ہے جو دور قدیم سے چلا آ رہا ہے مگر پھر بھی اس مسئلہ کے کچھ نشیب و فراز ہیں اور بعض متعین صورتوں کی ممانعت بھی ہے۔ جس کا بیان انشاء اللہ اگلے مباحث میں آئے گا۔

موجودہ دور میں بنک کاری کا جو عموماً ضابطہ پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بنک کوئی چیز خرید کر گاہک (مشرقی) کو دیتا ہے اور پھر اس کا متعین سود قسط وار وصول کرتا ہے، یا بنک کی ہدایت پر خریدار کوئی چیز خود خرید لیتا ہے اور اس کا بل بنک ادا کر کے متعین شرح سود کے ساتھ اسے مقررہ مدت میں وصول کرتا ہے۔ اب اگر کوئی اسلامی بنک اسلامی اصولوں کے تحت مراہجہ کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صارفین کا بل ادا کر کے سود وصول کرنے کے بجائے "طلوبہ اشیاء خود خرید کر مراہجہ کے اصولوں کے مطابق اس میں اپنا کمیشن شامل کر کے صارفین کو دے۔ اس طرح کمیشن کے نام سے شاید زیادہ وصول کرنے کی بھی نجائش نکل سکتی ہے جس کی وجہ سے ادھار دینے میں سال دو سال کے بعد مالیت (Value) کی کمی کا خطرہ بھی کسی حد تک ٹل سکتا ہے۔ مگر ہاں ایک مرتبہ کسی چیز کی قیمت مقرر کر دینے کے بعد مقررہ مدت کے بعد کسی وجہ سے عدم ادا ایگی کے باعث پھر دوبارہ قیمت بڑھانا یا اس المال میں اضافہ کرنا سود بن جائے گا۔ اس کی تفصیل آگے



آ رہی ہے۔

نیز اس سلسلے میں کمیشن کی شرح اتنی زیادہ بڑھا دینا کہ اس کے نتیجے میں اشیاء کی قیمت مجموعی اعتبار سے اتنی ہو جائے جتنی کہ عام طور پر غیر اسلامی بینک سود کے نام پر وصول کرتے ہیں، اسلامی بینک کاری کے نام سے شاید جائز نہ ہو، اگرچہ شرعی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نظر نہ آئے۔ کیونکہ اس سے عوام میں اسلامی بینک کاری کا تصور بگڑ جائے گا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ مجموعی اعتبار سے سودی اور غیر سودی کاروبار میں کوئی فرق نہیں ہے، لہذا جو بینک اسلام کے نام پر قائم ہوں انہیں اس میدان میں ایک اچھا نمونہ پیش کرنا چاہئے، بھلے ہی اس راہ میں تھوڑا سا مالی خسارہ برداشت کرنا پڑتے۔

بیع مراہجہ میں ایک عام اصول یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو اتنی گراں قیمت پر خریدے کہ عام طور پر لوگ اس میں دھوکا نہیں کھاتے تو اس میں بغیر کسی صراحت کے مراہجہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ جیسا کہ امام سرحسی تحریر کرتے ہیں:

إذا اشترى شيئاً بأكثر من ثمنه مما لا يتغابن الناس في مثله وهو يعلم ذلك - فليس له أن يبيعه مراجعة من غير بيان (المبسوط ۱۳۰۹۰)۔

یہ اصول جس طرح خریدنے کے سلسلے میں عائد ہوتا ہے اسی طرح شاید فروخت کرنے والے پر بھی عائد ہو سکے گا کہ وہ بھی اشیاء کو اتنی گراں قیمت پر فروخت نہ کرے جس کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں بازار کی قیمتوں سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہوں۔

اس سلسلے میں مالیاتی ادارہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشیاء کی اصل اور صحیح قیمت (ہر قسم کے کمیشن اور ڈسکاؤنٹ وغیرہ کو منہا کر کے) مشتری کو بتائے۔ پھر اس میں اپنا مقررہ کمیشن یا تجارتی نفع (رج) جوڑے۔ اگر کوئی ادارہ اشیاء کی اصل قیمت بتائے بغیر معاملہ کرے گا تو وہ بیع مراہجہ نہیں بلکہ بیع مسادمہ بن جائے گا۔  
غیر مملوکہ اشیاء کی فروخت:

اب رہا یہ مسئلہ کہ مالیاتی اداروں کے پاس چونکہ اپنی کوئی دوکان یا گودام نہیں ہوتا اس لئے وہ معاملہ طے ہونے کے بعد مطلوبہ سامان کھلے بازار سے خرید کر صارفین کے حوالے کرتے ہیں تو یہ صورت ”غیر مملوکہ اشیاء کی بیع“ یا ”بیع معدوم“ ہونے کی وجہ سے آیا شرعاً جائز ہے یا نہیں، تو اس مسئلہ میں کچھ تفصیل ہے اور فقہاء کا اختلاف بھی۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک منقولی (Movable) چیزوں میں ”بیع معدوم“ (یعنی اُس چیز کی بیع جو اپنی ملکیت میں موجود نہ ہو یا جس میں کوئی خطرہ موجود ہو) جائز نہیں ہے۔ البتہ ان دونوں کے نزدیک غیر منقولی (Immovable) چیزوں میں اس قسم کی بیع جائز ہو سکتی ہے۔ مگر امام محمد کے نزدیک ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز جائز نہیں ہے۔ (ہدایہ)

امام مالک کے نزدیک غیر مملوکہ اشیاء کی بیع صرف غلے میں ناجائز اور بقیہ تمام چیزوں میں جائز ہے: جیسا کہ حافظ ابن عبد البر کتاب الکافی فی فقہ اہل المدینہ (۲۳/۲ مطبوعہ مصر) میں امام مالک کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام مالک کے نزدیک ناپے جانے والے اناج کے سوا بقیہ تمام چیزوں (کپڑے، حیوانات اور جائیداد وغیرہ) کی بیع قبضہ کرنے سے پہلے جائز ہے مگر اس میں عجلت کرنی چاہیے اور تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ امام مالک کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی وہ حدیث ہے جسے انھوں نے اپنی موطا میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی اناج خریدا تو وہ اسے فروخت نہ کرے جب تک کہ وہ اس پر پوری طرح قابض نہ ہو جائے۔

عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يستوفيه (موطأ امام مالک: کتاب البيوع ۲۰۶، مطبوعہ بیروت)۔

اس سلسلے میں فقہائے احناف کی دو دلیلیں ہیں: پہلی دلیل یہ ہے کہ امام مالک نے اپنے مسلک کی بنیاد جس حدیث پر رکھی ہے وہ ایک خاص حکم سے متعلق ہے۔ جب کہ اس سلسلے میں دیگر عمومی حدیثیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ امام مالک نے حضرت ابن عمرؓ کی جس روایت سے استدلال کیا ہے وہی روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی بخاری و مسلم میں مروی ہے، جسے وہ ایک عام ضابطہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں غلے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يستوفيه۔ قال ابن عباس ولا أحسب كل شيء إلا مثله“ (بخاری: کتاب البيوع ۲۰۶، مطبوعہ استنبول، مسلم: کتاب البيوع ۱۱۵۹، ریاض)۔



نیز ابوداؤد میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا جس پر ابھی قبضہ نہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ اس کی تخریج امام زیلعی نے اس طرح کی ہے:

”روی أنه عليه السلام نهي عن بيع ما لم يقبض“ (نصب الراية ۴، ۲۲ ذابھیل)۔

سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو جو مکتوب بھیجا تھا وہ اس طرح تھا:

”لا يجوز شرطان في بيع واحد ولا بيع وسلف جميعا ولا بيع ما لم يضمن“ (نصب الراية ۴، ۱۹)۔

(یعنی ایک بیع میں دو شرطیں جائز نہیں۔ بیع اور سلف (سلم) دونوں بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے، اور وہ چیز قابل فروخت نہیں جو ضمان میں نہ ہو یعنی جو ابھی قبضہ میں نہ ہو)۔

اس حدیث کی شرح امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں اس طرح کی ہے کہ: سلف اور بیع دونوں کو جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ مثلاً کوئی یوں کہے کہ میں اپنا یہ غلام اتنے میں بیچنے کے لئے تیار ہوں، بشرطیکہ تم مجھے اتنا روپیہ ادھار (مزید) دے دو۔ ایک بیع میں دو شرطیں نافذ کرنا یہ ہے کہ: مثلاً کوئی یوں کہے کہ میں اس چیز کو نقد ایک ہزار میں فروخت کروں گا لیکن ادھار دو ہزار میں دوں گا، اب رہا معاملہ اس چیز سے نفع اندوزی کا جو اس کے ضمان میں نہ ہو تو یہ بات کسی چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اُسے نفع کے ساتھ فروخت کرنا ہے (ملاحظہ ہو: نصب الراية ۱۹/۴)۔

نیز ایک اور حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی چیز فروخت کرنے سے منع فرمایا جو انسان کے پاس موجود نہیں ہے اور بیع سلم کے بارے میں رخصت عطا فرمائی۔

”نهي عن بيع ما ليس عند الإنسان ورخص في السلم“ (نصب الراية ۴، ۴۵)۔

اور دوسری دلیل عقلی ہے کہ بغیر قبضہ کے کسی چیز کو فروخت کرنے میں اس چیز کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے بیع فسخ ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی بنا پر اسے ”بیع غرر“ بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی بیع جس میں کسی قسم کا خطرہ موجود ہو۔

”لأنه فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك“ (هدایہ ۵۸، بدائع ۵، ۱۸۰)۔

اس میں یہ صورت بھی پائی جاتی ہے کہ ایک شخص کسی چیز کا خود مالک بننے سے پہلے دوسرے کو مالک بنا رہا ہے، لہذا یہ صورت جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ امام سرخسی تحریر کرتے ہیں:

”ومن اشترى شيئاً فلا يجوز له أن يبيعه قبل أن يقبضه ولا يوليّه أحداً ولا يشترک فيه لأن التولية تملك ما مملک بمثل ما مملک“ (المبسوط ۱۴، ۸)۔

مگر اس ضابطہ کے تحت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نے غیر منقولی چیزوں یعنی مکان اور زمین وغیرہ کا استثناء کیا ہے، کیونکہ جائداد میں اتلاف شاذ و نادر ہی ہوتا ہے بخلاف منقولی چیزوں کے۔

لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول (هدایہ ۵۸)۔

مگر امام محمدؒ کے نزدیک حدیث کے الفاظ چونکہ عام ہیں اس لئے اس کا حکم بھی عام ہے، اور یہ دلیل بہت قوی معلوم ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ بھی اس کے قائل ہیں اور ایک دوسرے قول کے مطابق امام ابو یوسفؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ (ملاحظہ ہو: فتح القدير شرح ہدایہ ۱۳۷۶)۔

چنانچہ امام شافعیؒ نے کتاب ”لام“ میں حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کرتے ہوئے صراحت کی ہے کہ جس شخص نے کوئی بھی چیز خریدی تو اُسے قبضہ کئے بغیر بیچنا جائز نہیں ہے۔

قال الشافعي وبهذا نأخذ فمن ابتاع شيئاً كائناً ما كان فليس له ان يبيعه حتى يقبضه (الأم ۲، ۶۹-۷۰، دار المعرفه

بیروت)۔

حاصل یہ ہے کہ فقہاء کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ وہ چیزیں جو اپنی ملکیت میں موجود نہ ہوں ان پر قبضہ کئے بغیر انھیں فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں مختلف قسم کے خطرات اور جھگڑوں کا اندیشہ رہتا ہے۔ جو فتنہ و فساد کا باعث ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ دور میں ٹیلی فون وغیرہ پر جو خرید و فروخت ہوتی ہے اور ایک تاجر دوسرے تاجر سے قیمت طے کر کے تیسرے تاجر کو قبضہ کئے بغیر فروخت کر دیتا ہے وہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ان چیزوں کی بیع بھی صحیح نہیں ہو سکتی جن کا فی الحال کوئی وجود ہی نہ ہو جیسے حاملہ جانور کے بچے یا اُس کے بچے کی بیع کرنا وغیرہ۔ بہر حال فقہ حنفی کا ایک عمومی ضابطہ اس سلسلے میں وہ ہے جسے امام کاسانی اور علامہ ابن نجیم نے بیان کیا ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/۱۳۸، البحر الرائق ۵/۲۵۹)۔

اب رہا یہ سوال کہ معاہدہ بیع کے وقت جب شے مطلوبہ بائع کے پاس موجود نہ ہوگی تو بیع نامہ کی شکل کیا ہوگی؟ آیا یہ معاہدہ بیع ہے یا صرف وعدہ بیع؟ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مذکورہ بالا شرعی ضابطہ کی رو سے معاہدہ بیع نہیں ہو سکتا بلکہ اُسے وعدہ بیع قرار دینا ہوگا، اور چونکہ بازار کا نرخ عموماً گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اس لئے اس صورت میں اس معاہدہ کو پورا کرنے کی قانونی شکل یہ ہوگی کہ وعدہ بیع کے بعد بازار میں خریدی کے وقت شے مطلوب کی جو قیمت ہو اسی کے مطابق قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ اور یہ بات طرفین کی سلامتی کا باعث ہوگی، اس میں کسی کا بھی نقصان نہیں ہوگا۔

سود کی ایک عام شکل:

اب رہا یہ مسئلہ کہ مالیاتی ادارے اور صارف کے درمیان معاہدہ طے ہو جانے کے بعد آیا ادارہ خود صارف سے اُس کی مطلوبہ شے خریدوا سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی مطلوبہ شے کی قیمت صارف کو دے کر یہ کہہ دے کہ وہ خود مارکیٹ سے اپنی چیز خرید لے اور پھر مقررہ مدت تک ادارہ کو منافع کے ساتھ قسط وار ادا کرتا رہے، تو یہ صورت جائز نہیں، بلکہ اس کا نام اسلامی شریعت میں سود ہے۔ اور موجودہ دور میں سودی بنکوں کا تمام کاروبار اسی اصول کے مطابق ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو مقررہ مدت تک کے لئے قرض روپیہ دیتے ہیں اور اس پر زائد روپیہ منافع (انٹرسٹ) کے نام سے وصول کرتے ہیں۔ اسلام میں اس کا نام ربا (سود) ہے۔ یعنی وہ چیز جو اصل سے زائد اور بغیر کسی عوض کے ہو۔ اور نزول قرآن کے وقت اہل عرب کے ہاں جو رواج تھا اُس کی صورت حال بھی یہی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر اسلام میں ربا کی حقیقت اور اُس کے بعض ضوابط بھی پیش نظر رہنے چاہئیں تاکہ اس سلسلے کے تمام شبہات دور ہو جائیں۔

قاضی ابن العربی مالکی تحریر کرتے ہیں کہ لغت کے اعتبار سے ربا کی اصل زیادتی ہے: "والربا فی اللغة هو الزيادة" (احکام القرآن ۱/۲۴۲، مطبوعہ بیروت)۔ اور موصوف مزید تحریر کرتے ہیں کہ آیت قرآنی (بقرہ: ۲۷۵) میں ربا سے مراد ہر وہ زیادتی ہے جو بغیر کسی عوض کے ہو۔ واضح رہے کہ ربا (سود) عموماً ادھار معاملات ہوتا ہے جیسا کہ خود رسول اکرم کا ارشاد گرامی ہے:

"إنما الربا فی النسیئة" (بخاری: کتاب البیوع ۲، استنبول، مسلم: کتاب المساقاة ۱۲۱۸، مطبوعہ ریاض)۔

علامہ جصاص رازی تحریر کرتے ہیں کہ ربا کی جو صورت اہل عرب کے یہاں رائج تھی وہ یہ تھی کہ روپیہ (درہم یا دینار) ایک مدت تک کچھ زیادتی کے ساتھ بطور قرض دیتے تھے، جو باہم رضامندی سے طے ہوتا تھا۔ اور ان کے ہاں نقد بیع (صرف) کا رواج نہیں تھا، اس بنا پر کہا گیا: "وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَبَاٍ لِيَزْبُؤَا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَزْبُؤَا عِنْدَ اللّٰهِ" (روم ۳۹) یعنی جو کچھ تم سود کے طور پر دیتے ہو تو کہہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ مشروط زیادتی ربا (سود) ہے کیونکہ وہ بغیر کسی عوض کے ہے۔ نیز اس سلسلے میں مزید ارشاد ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" (آل عمران ۱۲۰)۔

(اے ایمان والو! گناہ گنا سود نہ کھاؤ) (احکام القرآن ۱/۳۶۵، مطبوعہ بیروت)۔

چنانچہ امام مالک نے اپنی موطا میں ایک حدیث روایت کی ہے جس سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں سود کا ضابطہ یہ تھا کہ ایک شخص کا روپیہ دوسرے شخص پر ایک مقررہ مدت کے لئے ہوتا اور جب مدت پوری ہو جاتی تو قرض خواہ قرضدار سے کہتا کہ تم میرا قرض ادا کرو گے یا کچھ بڑھاؤ گے۔ اگر وہ قرض ادا کر دیتا تو وہ اسے لے لیتا ورنہ اصل مال میں کچھ زیادتی کر کے اُسے مزید مہلت دے دیتا (دیکھئے: الموطا ۲/۶۷۲، ۶۷۳، مطبوعہ بیروت)۔

علامہ ابن تیمیہ نے صراحت کی ہے کہ یہ حکم اہل ثقیف کے بارے میں نازل ہوا ہے جن کے ہاں اس کا رواج تھا، اور موصوف نے مزید تصریح کی ہے کہ امت کے علماء سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ سود (ربا) کی یہ وہ شکل تھی جس کے بارے میں قرآن کا حکم نازل ہوا ہے (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۰/۳۳۹، طبع ریاض)۔



اور اس سلسلے میں علامہ ابن رشد قرطبی تحریر کرتے ہیں کہ جاہلی سود کے ممنوع ہونے پر امت کا اجماع ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی حرمت کا صاف و صریح الفاظ میں اعلان کر دیا تھا (دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۹۶/۲، مطبوعہ پاکستان)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں جس سود کی حرمت آئی ہے وہ یہی ہے اور سود کی عام شکل یہی ہے لہذا اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

سود کی بعض خاص صورتیں:

اوپر سود اور ربا کی جو عمومی شکل بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ اس کی چند خاص شکلیں بھی ہیں جن کو اسلامی شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے۔ تاکہ سود کا دروازہ ہر حیثیت سے بند ہو جائے جو تمدنی ظلم و استحصال کی ایک قابل نفیس شکل ہے اور جس کی بنیاد بجائے انسانی ہمدردی کے خود غرضی اور مفاد پرستی پر رکھی گئی ہے۔ اس موضوع پر بعض ایسی حدیثیں موجود ہیں جن سے اس سلسلے کے بعض اصول و ضوابط متعین کئے جاسکتے ہیں۔

مگر اس کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا باعث ہوگی اور اصل موضوع سے انحراف بھی۔ مگر اس موقع پر اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی شریعت کی رو سے جس طرح کچھ روپیہ دے کر زائد روپیہ وصول کرنا ربا ہے، اس مختلف اشیاء کے تبادلہ میں بھی ربا ہو سکتا ہے۔ اور یہ ربا کبھی ہم جنس اشیاء کی کمی بیشی کی بنا پر ہوتا ہے اور کبھی ادھار تبادلے کی بنا پر۔ مثلاً سونے کا تبادلہ سونے کے ساتھ اور چاندی کا تبادلہ چاندی کے ساتھ برابر ہونا چاہیے۔ ان میں کمی بیشی کے ساتھ یا ادھار کی شکل میں تبادلہ کرنا ربا ہے۔ لیکن جب جنس بدل جائے تو کمی بیشی جائز ہو سکتی ہے مگر ادھار جائز نہیں، چنانچہ سونے کا تبادلہ چاندی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ کرنا جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں۔ اسی طرح گہیوں کا تبادلہ گہیوں کے ساتھ کمی بیشی سے کرنا جائز نہیں لیکن گہیوں اور جو کے مقابلے میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اور نقدی کے عوض میں کوئی بھی چیز نقد یا ادھار خریدی جاسکتی ہے۔

خلاصہ بحث:

حاصل بحث یہ کہ کسی کو ایک ہزار روپے نقد دے کر کچھ مہلت کے ساتھ ایک ہزار ایک سو یا ایک ہزار دو سو روپے وصول کرنا سود ہے جو شرعی اعتبار سے ممنوع ہے۔ مگر ایک ہزار روپے کی چیز ایک ہزار سو یا ایک ہزار دو سو روپوں میں فروخت کرنا سود نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

”وَاحْتَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (بقرہ: ۲۷۵)۔

لہذا مالیاتی ادارہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ روپیہ دے کر روپیہ وصول کرنے کے ممنوع اور مذموم طریقے کے بجائے جائز اور مشروع طریقہ اختیار کرے، اور شے مطلوب کو خود خرید کر صارفین کو دے، اور اس سلسلے میں یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ مراجعہ صرف استعمالی اشیاء (عروض) ہی میں ہو سکتا ہے۔ نقدین یعنی سونے چاندی میں نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ درمختار میں اس کی صراحت موجود ہے۔

المراجعة: مصدر راجع، وشرعاً بیع ما ملکہ من العروض (ای) احترازاً عما ذکرنا من أنه لو شری دنانیر بدر اھم

لا یجوز بیعھا مراجعة (در مختار مع رد المحتار ۲، ۱۶۰-۱۶۱، مطبوعہ پاکستان)۔

☆☆☆



## مراحمہ سے متعلق مسائل

مولانا محمد صدرا الحسن ندوی

مراحمہ سے متعلق تنقیح طلب مسائل کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

۱۔ کسی چیز کے نقد بیچنے کی قیمت علیحدہ اور ادھار کی قیمت علیحدہ رکھنے کی شرعی حیثیت:

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ کسی چیز کے نقد بیچنے کی قیمت علیحدہ اور ادھار بیچنے کی قیمت علیحدہ رکھنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ بیع کے وقت ثمن کی تعیین نہیں کی بلکہ مشتری سے کہا کہ اگر اس کی قیمت اسی وقت دو گے تو ایک روپیہ لوں گا ورنہ سترہ آنے لوں گا، تو یہ صورت بوجہ جہالت ثمن جائز نہیں۔

اس قسم کے بیع کی حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ”عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه. نهي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة“ (رواه أحمد والنسائي وصححه الترمذی وابن حبان)۔

(حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع سے منع فرمایا)۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام شافعی فرماتے ہیں کہ: ”اس کے دو معانی ہیں: پہلا معنی یہ ہے کہ یوں کہے کہ میں تم سے ادھار کی شکل میں دو ہزار میں فروخت کرتا ہوں اور نقد کی شکل میں ایک ہزار میں، تمہارا جی جس کو چاہے اختیار کرو۔ اور یہ بیع صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس میں الہام اور تعلیق ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یوں کہے کہ میں تم سے اپنا غلام اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے اپنا گھوڑا فروخت کرو۔ امام صنعانی فرماتے ہیں کہ پہلی صورت میں نہی کی علت کسی متعین قیمت کا نہ پایا جانا ہے اور ربا کا بھی پایا جانا ہے، جن لوگوں کے نزدیک ادھار کی شکل میں اس دن کی قیمت سے زیادہ پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور دوسری شکل میں وہ چیز مستقبل کی ایسی شرط پر معلق ہے جس کا وقوع اور عدم وقوع دونوں ممکن ہے، تو ایسی صورت میں ملکیت نہیں پائی گئی“ (سبل السلام شرح بلوغ المرام ۸۰۹۳)۔

”وعن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده رضي الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: لا يجل سلف وبيع. ولا شرطان في بيع. ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك“ (حضرت عمرو بن شعيب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سلف اور بیع جائز نہیں ہے، اور نہ بیع میں دو شرطیں جائز ہیں، اور نہ ایسا نفع جو غیر مضمون ہو، اور ایسی چیز کے فروخت کرنے سے منع فرمایا جو اس کے پاس نہ ہو)۔

امام صنعانی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حدیث میں چار صورتیں بیان فرمائی گئی ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ سلف اور بیع ہو، اور اس کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص سامان کو ادھار ہونے کی شکل میں اس کی حقیقی قیمت سے زیادہ پر فروخت کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک بیع میں دو شرطیں ہوں، اس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ ایک شخص یوں کہے کہ نقد کی شکل میں اس قیمت میں اور ادھار کی صورت میں اس قیمت میں فروخت کرتا ہوں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائع مشتری سے اس بات کی شرط رکھے کہ وہ اس سامان کو خریدنے کے بعد نہ تو بیچے گا اور نہ کسی کو ہبہ کرے گا۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم بتایا کہ بائع یوں کہے کہ میں یہ چیز تم سے اتنے میں اس شرط پر فروخت کرتا

ہوں کہ تم فلاں سامان مجھ سے اتنی قیمت میں فروخت کرو۔ صاحب نہایت تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوں کہے کہ یہ غلام میں تم سے ایک ہزار میں اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ تم مجھے فلاں سامان ایک ہزار میں ادھار دو۔ یا یہ کہ مجھے ایک ہزار روپے قرض دو۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک بیع میں دو شرطیں جائز نہیں ہیں، صاحب نہایت اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یوں کہے کہ یہ کپڑا نقد کی شکل میں ایک دینار میں اور ادھار کی صورت میں دو دینار میں فروخت کرتا ہوں، اور وہ ایک بیع میں دو بیع کی طرح ہے (النہایہ نقلاً عن بل السلام ۱۰۳/۸۱)۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ایک بیع میں دو بیع کی تفسیر و تشریح دو طرح سے کی گئی ہے: پہلی صورت یہ ہے کہ بائع یوں کہے کہ میں تم سے یہ کپڑا دس روپے میں نقد کی شکل میں اور بیس روپے میں ادھار کی شکل میں ایک مہینہ کی مدت کیلئے فروخت کرتا ہوں۔ یہ صورت اکثر اہل علم کے نزدیک فاسد ہے، اس لئے کہ ایسی صورت میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں میں سے کس چیز کو اس نے شمن بنایا ہے (مرقاۃ المفاتیح ۱۸۶/۱۸)۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ بیعتین فی بیع کی دو طرح سے تشریح کی گئی ہے: پہلی صورت یہ ہے کہ بائع یوں کہے کہ میں تم سے یہ کپڑا نقد کی شکل میں دس روپے میں فروخت کرتا ہوں، اور ادھار کی شکل میں پندرہ روپے میں، تو یہ شکل جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں کسی ایک متعین شمن کا تعین نہیں ہوتا اور جب شمن میں جہالت پائی جائے تو بیع باطل ہو جاتی ہے (بذل الجہود فی حل ابی داؤد ۱۵/۱۳۵)۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اول مشتری سے طے کر لیا ہو کہ نقد لیتے ہو یا ادھار، اگر اس نے نقد لینے کو کہا تب تو ایک روپیہ قیمت ٹھہرائی، اگر ادھار لینے کو کہا تو سترہ آنے ٹھہرائے، یہ جائز ہے (امداد الفتاویٰ ۲۰۳/۲۰) برخلاف پہلی شکل کے، کہ اس میں قیمت کی تعیین نہیں پائی گئی، اس لئے جہالت شمن کے سبب بیع جائز نہ ہوگی۔

رجل باء علی أنه بالنقد بكذا وبالنسيئة بكذا وإلى شهر بكذا وإلى شهرين بكذا لم يجز (فتاویٰ عالمگیری ۱۵۳، ۳ مطبع نول کشور)۔ (اگر ایک شخص سے بیچا اس شرط پر کہ نقد کی قیمت یہ ہوگی اور ادھار کی قیمت یہ ہوگی اور ایک مہینہ کے ادھار کی شکل میں یہ قیمت اور دو مہینے کے لئے ادھار کی شکل میں یہ قیمت، تو یہ سب صورتیں ناجائز ہیں)۔

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادھار کی شکل میں بائع جو قیمت زیادتی کی شکل میں وصول کر رہا ہے، کیا وہ مدت کی قیمت نہیں ہے؟ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اگر براہ راست صرف مدت کی قیمت لی جائے اور مدت کی قیمت ہی مقصود حقیقی ہو، مقصود ضمنی نہ ہو تو ایسی صورت میں مدت کی قیمت ناجائز ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ”وذلك اعتیاض عن الأجل وهو حرام“ (ہدایہ باب الصلح فی الدین)۔

(اس لئے کہ یہ مدت کے بدلہ عوض لینا ہے اور یہ حرام ہے)۔

لیکن اگر مدت کی حیثیت ضمنی ہو اور مقصود اصلی کوئی دوسری چیز ہو تو ایسی شکل میں مدت کی وجہ سے اگر قیمت میں زیادتی کی جائے تو جائز ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ باب المزاجحہ میں فرماتے ہیں۔ ”الایری أنه یزاد فی الشمن لأجل الأجل“ (ہدایہ باب المزاجحہ)۔

(کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ قیمت میں مدت کی (ضمنی) رعایت سے اضافہ کیا جاتا ہے)۔

یہاں پر اس صورت میں مقصود بیع ہے اور ضمنی طور پر مدت کی رعایت سے قیمت بیع کی بڑھادی گئی ہے اور براہ راست صرف مدت کا معاوضہ مقصود نہیں ہے اس لئے یہ صورت جائز ہوگی۔

اگرچہ کہ اس مسئلہ میں بھی ایک بلند پایہ حنفی فقیہ قاضی خاں نے اختلاف کیا ہے اور اس کی تصریح کی ہے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

”لا یجوز بیع الحنطة بشمن النسيئة أقل من شعر البلد فإنه فاسد وأخذ ثمنه حرام“ (جواہر الفقہ ۱۵۱/۳)۔

(گیہوں کی بیع اگر ادھار ہونے کی بنا پر شہر کے عام نرخ سے کم قیمت پر کی جاتی ہے تو وہ فاسد ہے اور اس کی قیمت لینا حرام ہے)۔



محض مدت کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کی جائے اور یہ شکل کہ مقصود اصلی تو بیع ہو اور محض ضمنی طور پر مدت کی رعایت سے قیمت میں زیادتی کر دی جائے، دونوں کا فرق واضح کرتے ہوئے مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

جن حضرات کو فقہ سے کچھ بھی مناسبت ہوگی ان کو اس فرق کے سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس کی نظیریں بے شمار ہیں، بعض اوقات بعض چیزوں کا معاوضہ لینا براہ راست جائز نہیں ہوتا اور کسی دوسرے سامان کے ضمن میں جائز ہو جاتا ہے، اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ ہر مکان دوکان اور زمین کی قیمت پر اس کے محل وقوع اور پڑوس کا بڑا اثر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی قیمت میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے، ایک محلہ میں ایک مکان دس ہزار روپے کا ہے، تو وسط شہر میں بالکل اسی طرح کا اور اتنے ہی رقبہ کا مکان ایک لاکھ میں بھی سستا سمجھا جاتا ہے، یہ قیمت کی زیادتی ظاہر ہے کہ مکان کی ذات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کی خاص کیفیت اور محل وقوع کے اعتبار سے ہے، اور جب کوئی آدمی یہ مکان بیچتا یا خریدتا ہے تو اس کی یہ کیفیت بھی فروخت ہو جاتی ہے اور قیمت کی جتنی زیادتی ہے وہ اس کیفیت کے مقابلہ میں ہے، حالانکہ یہ کیفیت اور صفت کوئی مال نہیں جس کا معاوضہ لیا جائے، مگر مکان یا زمین کی بیع کے ضمن میں اس کی کیفیت و صفت کا معاوضہ بھی شامل ہو جاتا ہے (جواہر الفقہ ۱۵۱/۳، ۱۵۲)۔

۲۔ جس وقت ایک ضرورت مند آتا ہے اور وہ ادارہ میں اپنی ضرورت کا اظہار کرتا ہے اور معاملات سے متعلق ضروری شرائط طے پاتی ہیں تو یہ بیع نہیں ہے بلکہ یہ وعدہ بیع ہے، اور اس کا پورا کرنا قانونی طور پر لازم نہ ہوگا۔ چاہے یہ معاہدہ زبانی ہو یا تحریری شکل میں۔

مولانا تھانوی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ: عمرو نے زید سے کہا کہ تم مجھ کو ایک صد روپیہ کا مال جفت پاپوش منگا دو میں تم سے پانچ روپیہ کا منافع دے کر ادھار ایک ماہ کے واسطے خرید لوں گا، جس قدر مدت کے واسطے تم دو گے اسی حساب سے منافع دوں گا، یعنی پانچ روپے ایک صد روپیہ کا منافع ایک ماہ کے واسطے ہے، جب مال آجائے گا اس وقت مدت ادھار اور منافع کی مقدار متعین ہو جائے گی، اس کے جواب میں زید نے کہا کہ میں منگا دوں گا مگر اطمینان کے واسطے بجائے ایک صد کے دو صد کا رقعہ لکھاؤں گا تا کہ تم خلاف عہدی نہ کرو، عمرو نے منظور کر لیا۔

اس سوال کے جواب میں مولانا تھانوی نے فرمایا کہ: اس میں دو مقام قابل جواب ہیں: ایک یہ کہ زید و عمرو میں جو گفتگو ہوئی یہ وعدہ محضہ ہے کسی کے ذمہ بحکم عقد لازم نہیں، اگر زید کے منگانے کے بعد بھی عمرو انکار کر دے تو زید کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں، پس اگر عرف و عادت میں عمرو مجبور سمجھا جاتا ہو تو یہ معاملہ حرام ہے ورنہ حلال، اسی طرح عمرو کو بھی اور مثل عمرو کے زید کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وعدہ بیع پر قائم رہنے کی صورت میں منافع کی مقدار میں تغیر و تبدل کر دیں، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک ماہ کے ادھار کی صورت میں پانچ روپے سیکڑہ نفع کا ٹھہرا تھا، باقی زیادہ لکھانا یہ بیع "ہزل فی مقدار الثمن" ہے، اگر عمرو کی بد عہدی کی صورت میں بھی زید مقدار واقعی ثمن سے زیادہ وصول نہ کرے تو جائز ہے ورنہ حرام ہے (امداد الفتاویٰ ۴۰۳)۔

اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ زید نے اپنا مکان متصل مسجد متولیان مسجد کے ساتھ مسجد کے مصرف کے لئے بیع کرنے کا معاہدہ کر کے دس روپے پیشگی لے کر رسید لکھ دیا، مولانا تھانوی نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاہدہ جو فیما بین زید و متولیان مسجد کے ہوا یہ بیع شرعی نہیں محض وعدہ ہے، جس کا بلا وجہ خلاف کرنا عند اللہ موجب مواخذہ ہو سکتا ہے، لیکن قضائی اس میں مجبور نہیں کیا جاسکتا (امداد الفتاویٰ ۴۵/۳)۔

علامہ شام شیخ مصطفیٰ زرقاء فرماتے ہیں: ومن الواضح أنه إذا انتفت دلالة الصيغة على وقوع الارتباط والتعاقد فلا عقد ولا الزام وعلى هذا يقرر الفقهاء أن الوعد بالبيع لا ينعقد به البيع ولا يلزم صاحبه قضاء (المدخل الفقہی العام ۲۲۲)۔

(یہ بات واضح ہے کہ اگر صیغہ کی دلالت ارتباط اور تعاقد کے وقوع کے منافی ہو تو اس پر عقد کا اطلاق نہ ہوگا اور نہ پابند ہوگا، اس لئے کہ فقہاء نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ وعدہ بیع، بیع نہیں، اور نہ قضاء اس کا ایفاء لازم ہوگا)۔

۳۔ نفع میں پیسے کی مالیت کے کم ہونے کا اعتبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟



مسئلہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیسے کی مالیت کے کم ہونے کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس سے سودی لین دین کے جواز کی دلیل فراہم ہوگی، اور وہ اس طرح کہ اگر ایک شخص اپنی رقم بینک میں جمع کرتا ہے اور ایک مدت کے بعد اسے اس رقم پر سود ملتا ہے تو اس مدت میں اس کی رقم میں جس قدر کمی واقع ہوئی ہے اس قدر وہ سودی رقم اس کے لئے جائز ہو جائے گی، اسی طرح قرض دیتا ہے اور ایک مدت کے بعد وہ رقم وصول کرتا ہے تو اس مدت میں اس رقم میں جس قدر کمی واقع ہوئی ہے اس تناسب سے بینک کے لئے سود لینا جائز ہوگا اور حقیقتاً وہ سود نہ ہوگا بلکہ نقصان کی تلافی ہوگی جو اس مدت میں رقم میں واقع ہوئی ہے۔

ماہر معاشیات ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی غیر سودی بینک کاری میں قرض کھاتے کی تفصیلات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

بینک عوام کو دعوت دے گا کہ وہ آمدنیاں اور بچتیں، حفاظت اور ادائیگی میں سہولت کے لئے اسے قرض دیں..... قرض کھاتہ موجودہ بینکوں کے جاری حسابات (Current Account) یا عند الطلب قابل واپسی کھاتہ (Demand Deposit) کی طرح ہوگا۔

ان رقموں کے قرض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ بینک کے پاس رہیں گے، بینک ان پر تصرف کر سکے گا، اسے اس بات کی آزادی حاصل ہوگی کہ وہ ان رقموں کو نفع آور کاروبار میں لگائے، اگر بینک کو قرض کھاتہ کے سرمایہ کے کاروباری استعمال میں نقصان ہو تو یہ نقصان اسے خود برداشت کرنا ہوگا، کھاتہ داروں کو ان کی رقمیں بغیر کسی کمی کے واپس کرنا ہوگا، اگر بینک کو قرض سرمایہ کے کاروباری استعمال سے نفع ہو تو یہ نفع بھی اسی کو ملے گا، قرض کھاتہ میں رقمیں جمع کرنے والے کو اس میں سے کوئی حصہ پانے کا حق نہ ہوگا، کھاتہ داروں کو اتنی ہی رقم واپس ملے گی جتنی انھوں نے جمع کی ہو، نہ کم نہ زیادہ (غیر سودی بینک کاری ۶۶-۶۷)۔

درج بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگی کہ انھوں نے رقم کی مالیت میں کمی کا کوئی اعتبار نہیں کیا ہے، بلکہ صاف صاف دو ٹوک الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ کھاتہ داروں کو اتنی ہی رقم واپس ملے گی جتنی انھوں نے جمع کی ہو، نہ کم نہ زیادہ۔

۳۔ اگر ضرورت مند اور ادارہ کے درمیان مطلوبہ شئی کی خریداری، اصلی لاگت اور اس پر مطلوبہ منافع طے ہو جانے کے بعد اگر ادارہ اسی شخص کو روپے دے کر سامان خریدنے کے لئے بازار بھیج دے اور وہ شخص اپنی مطلوبہ شئی بازار سے اس مالیاتی ادارہ سے ملنے والے روپے ادا کر کے خریدے اور پھر وہ رقم مع زائد منافع بالاقساط ادا کرتا رہے تو آیا یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

مذکورہ استفسار پر غور و خوض کرنے سے اس صورت کے عدم جواز کا پہلو راجح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ:

ایسی صورت میں بینک ایسی چیز کی بیع کر رہا ہے جس پر اس کی ملکیت ثابت نہیں ہے، اور حدیث میں ”بیع مالایمک“ کی ممانعت آئی ہے، اس لئے کہ روپیہ دینے کے بعد بینک نے مشتری سے یہ کہا کہ وہ بازار جا کر مطلوبہ شئی خریدے، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مطلوبہ شئی کا بائع مالک نہیں ہے۔



## مرابحہ

مولانا عبدالجلیل قاسمی

۱۔ بیع نقد اور ادھار دونوں جائز ہیں۔ ویصح البیع بضمن حال و مؤجل بأجل معلوم (مجموع الاقوال ۸، ۲)۔

شریعت میں نفع کی کوئی حد متعین نہیں ہے کہ اس سے زائد لینا جائز نہ ہو۔ البتہ ادھار بیع کی صورت میں اجل کا معلوم ہونا ضروری ہے، اگر اجل مجہول ہو تو بیع فاسد ہو جائے گی چاہے نفع کم ہو یا زیادہ۔ اور جس طرح نقد بیع کی صورت میں نفع کم و بیش لینا جائز ہے اسی طرح ادھار میں بھی جائز ہے۔ اور نقد و ادھار میں بھی نفع کم و بیش لینا جائز ہوگا۔ ایک ہی دکاندار اپنی دکان کے مختلف سامانوں میں نفع مختلف رکھتا ہے۔ نفع کے تناسب کی تعیین میں عام طور پر اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ سامان جلد فروخت ہو جاتا ہے یا دیر سے، جو سامان جلد فروخت ہونے والا ہے اس میں نفع کم لیا جاتا ہے اور جو سامان دیر تک دکان میں پڑا رہتا ہے اس میں نفع کی مقدار زائد کر دی جاتی ہے، اس لئے کہ جو سامان جلد فروخت ہو جاتا ہے اس کا سرمایہ گردش میں رہتا ہے، اور بار بار نفع حاصل ہوتا ہے۔ اور جو سامان جلد فروخت نہیں ہوتا اس کا سرمایہ منجمد ہو جاتا ہے اور نفع کے مکرر ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ اس میں نفع زیادہ لیا جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت نقد و ادھار بیع میں بھی ہوتی ہے۔ نقد بیع کی صورت میں سرمایہ گردش میں رہتا ہے اور نفع بار بار حاصل ہوتا ہے اور ادھار بیع کی صورت میں سرمایہ منجمد ہو جاتا ہے، اور بار بار نفع کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے نقد کی قیمت علیحدہ اور ادھار کی قیمت علیحدہ رکھنے کو استحصال اور دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ بائع کو جو روپے دو سال کے بعد ملیں گے، اگر نقد مل جاتے اور گردش میں رہتے تو ممکن تھا کہ اس سے زائد نفع کما لیتا جتنا وہ ادھار کی صورت میں لے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ایسے بھی خریدار ہوتے ہیں جو کم نفع دے کر نقد سامان خریدنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی وہ زیادہ نفع دے کر ادھار خریداری کو ترجیح دیتے ہیں، اور ادھار کی مدت میں اس سرمایہ کو گردش دے کر اس نفع سے زائد کما لیتے ہیں جتنا وہ بائع کو دیتے ہیں۔ دوسری وجہ وہ بھی ہو سکتی ہے جو سوال میں مذکور ہے کہ دو سال کے بعد بائع کو جو روپے ملیں گے اس کی مالیت کم ہو جائے گی۔ بہر حال اجل کی کمی و زیادتی کی صورت میں نفع کی کمی و زیادتی کو نہ تو ناجائز کہا جاسکتا ہے اور نہ غیر اخلاقی۔

۲۔ مدت ادائیگی کی کمی و بیشی کی صورت میں منافع میں جو کمی و زیادتی ہوتی ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ مدت ادائیگی اور اس کا نفع دونوں الگ الگ متعین ہیں۔ مثلاً ایک سال کے لیے دس فی صد اور دو سال کے لیے ۲۵ فی صد وغیرہ۔ لیکن جس وقت معاملہ کیا گیا اس وقت متعین کر لیا گیا کہ ادائیگی ایک سال میں ہوگی یا دو سال میں یہ صورت جائز ہوگی۔ اس لیے کہ بیع ادھار ہے اور اجل معلوم ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مدت ادائیگی اور نفع تو الگ الگ متعین ہیں، لیکن جس وقت معاملہ کیا گیا اس وقت یہ طے نہیں کیا جاسکا کہ ادائیگی ایک سال میں ہوگی یا دو سال میں۔ بلکہ خریدار کو اختیار دیا گیا کہ وہ جب ادا کرے۔ البتہ یہ طے ہو گیا کہ جب ادا کرے گا اس مدت کے لیے جو نفع طے ہے وہی لیا جائے۔ مثلاً اگر ایک سال میں ادا کرے گا تو دس فی صد اور دو سال میں ادا کرے گا تو ۲۵ فی صد۔ تو یہ صورت جائز نہیں ہوگی۔ اس لیے نہیں کہ الگ الگ مدت کے لئے الگ الگ نفع طے ہوا ہے بلکہ اس لیے کہ بیع ادھار ہے اور اجل مجہول ہے۔ اور ادھار بیع اجل کی تعیین کے بغیر فاسد ہے۔

۳۔ جن مالیاتی اداروں کے پاس دکان یا گودام نہیں ہیں۔ وہ ضرورت مند کے ساتھ جو معاملات طے کرتے ہیں اگر ان کو بیع کہا جائے تو یہ بیع مالا

بیمک ہے اور ممنوع ہے، اس لیے اس کو بیع کا معاہدہ ہی کہنا انسب ہے۔ اور اس وقت بیع قطعی ہوگی جب ادارہ شے مطلوب خرید کر ضرورت مند کو حوالہ کرے گا۔ اور جب یہ وعدہ بیع ہے تو اس کا پورا کرنا اخلاقی طور پر تو ضروری ہوگا لیکن قانونی طور پر ضروری نہیں ہوگا۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اگر بائع کو اس وعدہ کی خلاف ورزی کی گنجائش ہوتی ہے تو کبھی خریدار کو بھی بیع کی تکمیل کے بعد جب کہ وہ سامان کو دیکھے بغیر خریداری کر رہا ہو بعض حالات میں اس کو فسخ کرنے کا حق اختیار رویت کی بنیاد پر ہو جاتا ہے۔ تو دونوں اپنی ساکھ قائم رکھنے اور اعتماد بحال رکھنے کے لیے کوشش کریں گے کہ بیع مکمل ہو جائے، بہر حال اس کو معاہدہ بیع قرار دینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ اگر مالیاتی ادارہ ضرورت مند کو مطلوبہ شے فراہم کرنے کے بجائے نقد روپے ادا کرتا ہے تو ایسی صورت میں صرف وہی رقم واپس لی جاسکتی ہے جو دی گئی ہے۔ اس سے نفع کے نام پر کوئی زائد رقم وصول کرنا سود ہوگا جو جائز ہرگز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ خریداری جو ضرورت مند بازار سے کر رہا ہے ایک ہی خریداری اور ایک ہی قبضہ ہے۔ اس کو دو خریداری اور دو قبضہ کہنا محکم ہے۔ مالیاتی ادارہ سے اس نے روپے لیا ہے اور خریداری اپنے لیے کر رہا ہے۔ اگر اس کو ادارہ کا وکیل بالشراء قرار دیا جائے تو اس صورت میں ادارہ اس شے کا مالک ہوگا، اور اس ضرورت مند کو اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، اگرچہ یہ فرض کر لیا جائے کہ جب ادارہ مالک ہو گیا تو اب پھر ادارہ کی طرف سے وکیل بالبیع ہو گیا اور خود خرید لیا۔ تو اولاً ادارہ نے شے مطلوب کی خریداری کے بعد اس کو وکیل بالبیع بنایا نہیں۔ اور اگر وکیل بالبیع فرض بھی کر لیا جائے تو بھی وکیل بالبیع خود مشتری نہیں ہو سکتا۔ ”ولیس للوکیل بالبیع أن یبیع من نفسه لأن الحقوق تتعلق بالعاقد فیؤدی إلى أن یکون الشخص الواحد فی زمان واحد مسلماً و مستلماً مطالباً و مطالباً وهذا محال، وكذا لا یبیع من نفسه وإن أمره المؤکل بذلك لما قلنا“ (بدائع الصنائع للکافی ۶۰۲۸)۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ جو رقم دی گئی ہے وہی وصول کی جائے، اور اس میں نفع کے نام پر کچھ نہ لیا جائے۔ یا ضرورت مند کو وکیل بالشراء بنا کر وہ شے ادارہ میں منگالیا جائے، اور قبضہ کر لیا جائے، اس کے بعد پھر ضرورت مند کے ہاتھ فروخت کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔





## مرابحہ

مولانا محفوظ الرحمن

- ۱۔ اسلامی بینکنگ میں عام طور پر ادھار خرید و فروخت کی صورت میں نقد خرید و فروخت کی قیمت سے زیادہ قیمت وصول کی جاتی ہے، اس زیادتی کا وصول کرنا جائز ہے لیکن مروت کے خلاف ہے۔ نقد اور ادھار کی قیمت علیحدہ علیحدہ بیان کرنا کسی ایک جہت کو متعین کر کے جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۲۰۳۳)
  - ۲۔ جو سامان کہ بازاروں میں ہر وقت موجود رہتا ہے اور اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے، مالیاتی ادارے ان سامانوں کو اپنی ملک بنائے بغیر اگر بیچتے ہیں تو یہ جائز نہیں۔ حکیم بن حزام سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے منع فرمایا کہ جو چیز میرے پاس نہ ہو اس کو بیچوں۔ (ترمذی ۱۳۸۱)
  - ۳۔ مالیاتی ادارے کا اس طرح کے سامانوں پر لاگت و منافع کا معاملہ طے کرنا معاہدہ بیع ہوگا اور ایفاء عہد لازمی ہے۔ ”وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَاتِبٌ مِّنْهُنَّ“۔
- مالیاتی ادارے نے جن سامانوں کی فروخت کا معاہدہ کیا ہے، اگر ان سامانوں کے خریدنے کا کام معاہدہ کے ذمہ سپرد کر دے اور معاہدہ اس سامان کو خریدنے اور پھر مالیاتی ادارے کے معاہدے کے تحت مع متعینہ حدود کے رقم ادا کرتا رہے تو اس کا یہ عمل جائز ہے، ایک حیثیت سے وہ وکیل ہوگا اور ایک حیثیت سے وہ مالک ہوگا (امداد الفتاویٰ ۲۲۳۳)۔



## مرابحہ کے بارے میں

عبدالعظیم اصلاحی

مضاربت کے معاملہ سے یہ بات واضح ہے کہ کسی چیز کی لاگت میں صرف سرمایہ ہی نہیں بلکہ محنت یا عمل بھی شامل ہے۔ اسی لئے یہ دونوں ہی عوامل ربح یا مکافاتہ کے حقدار ہوتے ہیں۔ مرابحہ میں بھی سرمایہ کے علاوہ عمل یا محنت کو بھی لاگت کا جز سمجھنا چاہیے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے سے بہت سے اشکال کو سمجھنے اور حل کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ مثلاً جہاں صرف سرمایہ لاگت ہو وہاں کوئی اور نفع ہوگا، اور جہاں محنت و سرمایہ دونوں موجود ہوں وہاں نفع کچھ اور ہوگا، البتہ دیانت کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں چیزیں الگ الگ بتائی جائیں، یعنی یہ کہ قیمت خرید اتنی ہے اور اس کی فراہمی پر مزید لاگت اتنی آئی ہے۔

نقد یا ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں کمی یا بیشی اکثر فقہاء کے نزدیک ایک مسلم حقیقت ہے لیکن مدت ادائیگی میں کمی اور زیادتی کے مطابق منافع میں کمی اور زیادتی ربا کو مستلزم ہوگی، اس لئے اس کے جواز میں تاہل ہے۔

کسی شے کو نقد بیچنے کی قیمت علیحدہ اور ادھار بیچنے کی قیمت علیحدہ رکھنا جائز ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ استحصال ہو۔ استحصال تو نقد بیچنے کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے، اسی لئے بیع المضطر کی ممانعت آئی ہے۔ مختلف وجوہ سے ادھار کو زیادہ قیمت پر بیچنے کی اجازت دینے میں بائع و مشتری دونوں کی مصلحتوں کی رعایت ہے۔

جامعہ عربیہ مفقح العلوم مونا تھ بھجن (یو پی)۔

اسلامک ڈولپمنٹ بینک جده۔

البتہ اس ضمن میں یہ دلیل دینا صحیح نہیں ہوگا کہ ”بائع جو ادھار فروخت کر رہا ہے اس کے روپے جب اسے دو سال بعد ملیں گے تو ان کی مالیت (Value) آج کے مقابلہ میں کم ہو جائے گی، پس وہ آج کے نرخ سے زائد رقم کی مالیت میں کمی ہو جائے۔“ کے پیش نظر منافع میں مناسب اضافہ ادھار بیع کی صورت میں کر رہا ہے، اسلئے یہ جائز ہونا چاہیے۔“

اصل میں یہ مسئلہ موخر مطالبوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنے کا ہے جس پر ابھی کوئی متفق علیہ رائے علماء کے درمیان نہیں قائم ہوئی ہے۔ گرچہ پھر کئی دہائیوں سے قیمتوں میں برابر اضافہ ہی دیکھا جا رہا ہے لیکن نظری اعتبار سے اس کا بھی امکان ہے کہ دو سال بعد اشیاء کی عام قیمتوں میں گراوٹ آجائے اور اس وقت بائع کو اس چیز کے کئی گنا واپس مل رہے ہوں جس پر وہ عام طور پر اس وقت بازار میں مل رہی ہو۔ اشاریہ اپنانے کا مسئلہ الگ سے طے ہونا چاہیے۔ اگر یہ چیز موخر مطالبوں کے سلسلہ میں تسلیم کر لی جاتی ہے تو ادھار قیمت سو کے دو سو بھی مانگے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اس عرصہ میں قیمتوں کے اشاریہ میں صد فیصد اضافہ ہو گیا ہو۔

مراہمت کے لئے بائع یا مالی ادارے اگر قیمت ادا کر دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں کاغذات کا تبادلہ ہو جاتا ہے تو حکماً ملک اور قبضہ کا تصور ہوگا۔ بیع سلم اور خود مراہمہ کے جواز سے یہ بات ثابت ہے کہ بیع مالایمک سے مراد ان چیزوں کا بیچنا ہے جو خود بائع کی ملکیت میں نہ ہوں، اور نہ ہو سکتی ہوں۔ مثلاً کسی دوسرے کا سامان اس کی مرضی کے خلاف بیچ دینا، مفروض غلام، ہوا کے پرندے یا سمندر کی مچھلیاں وغیرہ۔ بیع مالایمک میں وہ چیزیں نہیں شامل ہوں گی جن کی حصول یا بائع کے قبضہ و قدرت میں ہو، اور عملاً اس کے وسائل بھی فراہم ہوں۔ ترمذی اور بعض مجموعہ احادیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ فلاں مجھ سے کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ کیا میں بازار سے لا کر بیچ دوں تو آپ نے فرمایا کہ لا تبيع مالیس عندک۔ لیکن یہ چیز اس شخص کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ کوئی عام حکم نہیں معلوم ہوتا اور نہ بیع سلم و مراہمہ سب سے پہلے ممنوع ہوتے۔

مراہمہ کے معاملہ کو ابتداءً معاہدہ بیع بھی سمجھیں تو بھی اس وعدہ یا معاہدہ کو پورا کرنا قانوناً لازم ہوگا۔ ایفاء عہد پر قرآن نے جس شدت سے زور دیا ہے اس سے اس کا وجوب بالکل واضح ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

{ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَاتِبٌ مَسْئُولٌ } (الاسراء: ۳۴)۔

{ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ } (آل عمران)۔

{ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ } (المؤمنون: ۸، المعارف: ۳۳)۔

{ وَالْمُؤَفَّقُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا } (البقرہ: ۱۷۷)۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب کسی عہد و وعدہ کی خلاف ورزی سے کسی کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کے ایفاء پر قانوناً مجبور کیا جاسکتا ہے جو یہاں بالکل واضح ہے، اس معاہدہ کا خاتمہ طرفین کی رضامندی سے ہونا چاہیے۔ ورنہ ایجاب و قبول کی طرح یہاں بھی طرفین ایفاء عہد کے پابند ہوں گے الا یہ کہ کوئی شرعی عذر مانع آجائے۔

سوالنامہ کے آخر میں پیش کی گئی شکل کا عمل بالکل سہل و معقول ہے بشرطیکہ ہم سرمایہ عمل دونوں کو جزء لاگت تسلیم کریں۔ جیسا کہ اس تحریر کے بالکل آغاز میں نے اشارہ کیا ہے، موجودہ شکل میں سرمایہ صرف بائع کی طرف سے ہے اور عمل مشتری کی طرف سے، اس لئے اس عمل کے بقدر بائع اپنے منافع میں کمی کرے گا، اور ظاہر ہے یہ چیز بوقت معاہدہ طے ہوگی کہ خود بائع بازار سے خرید کر مشتری تک پہنچائے تو وہ کیا منافع لے گا اور اگر مشتری خود خرید لائے تو کیا منافع ہوگا۔ اس شکل کو ہم وکالت کے تحت درج کریں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، بعض حالات میں موخر الذکر شکل مشتری کے لئے زیادہ سہل و نفع انگیز ہو سکتی ہے۔ البتہ اس میں خیال رکھنا ہوگا کہ اس میں بائع کا کام صرف سرمایہ دے کر نفع طے کر لینے تک محدود نہ رہے ورنہ ربا کے در آنے کے امکانات ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

## مراہجاتی کاروبار

مفتی عزیز الرحمن مدنی علیہ

ابتدائیات:

موجودہ زمانہ میں کثرت آبادی اور کثرت رسل و رسائل، اور مصنوعات اور ایجادات کی کثرت، اور اس کی وجہ سے انسانی عادات کے تنوع سے اشیاء کے نقل و حمل اور پھیلاؤ سے بہت زیادہ وسعت اور ترقی ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سے طرہائے معاش و معیشت میں بھی بہت زیادہ تنوع ہوا ہے جن سے علیحدگی اور گریز ممکن نہیں ہے۔ اسلامی شرع میں ہم ان تمام چیزوں کو عرف اور عادات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ کس حد تک ان کو جائز یا ناجائز قرار دیا جائے۔

۱۔ واعلم أن اعتبار العادة والعرف يرجع إليه في الفقه في مسائل كثيرة حتى جعلوا ذلك أصلاً (اشباہ ص ۳۶)۔

۲۔ تترك الحقيقة بدلالة الاستعمال والعادة (اشباہ)۔

لیکن یہ عرف اور عادات اسی وقت تک معتبر ہیں جب تک نصوص کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ انما العرف غير معتبرة في النصوص عليه (اشباہ)۔

۴۔ لیکن ہمارے حضرات فقہاء نے حضرت امام ابو یوسفؒ کا یہ قول روایت کیا ہے: ”اعتبار العرف مطلقاً وإن كان خلاف النص“ (رد المحتار ۴۰۰)۔

امام ابو یوسفؒ کا دفاع کرتے ہوئے ابن کمال نے فرمایا ہے: ”ولو تغير العرف في حياته صلى الله عليه وسلم نص على تغير الحكم، ملخصه أن النص معلول بالعرف فيكون هو العرف في أي زمن كان“ (رد المحتار ۴۰۱)۔

”الأحكام تبتنى على العرف فيعتبر في كل إقليم وفي كل عصر أهله“ (رد المحتار ۴۰۹)۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عرف اور عادات اسی وقت تک بنیاد اور اصل قرار پاسکتے ہیں جب تک نص کے خلاف نہ ہوں۔ اگر اس کو وسعت دیدی جائے تو اسلام اور کوئی بھی مذہب کھلواڑ بن جائے گا۔ مشہور قاعدہ ہے:

”إذا اتسع الأمر ضاق وإذا ضاق اتسع“ (اشباہ)۔

اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ عرف کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے اور نص میں تخصیص پیدا ہو جائے، مثلاً مصنوعات کا آرڈر بک کراتے وقت صرف ایک نمونہ پر معاہدہ ہو جاتا ہے اور بقیہ اعداد میں تبعاً ہو جاتا ہے اگرچہ یہ بیع معدوم کی ہے لیکن عرف اور اہل صنعت اور تاجروں کے یہاں یہ طریقہ جاری ہے اور جائز ہے (رد المحتار ۴۰۵)۔

حاصل یہ کہ عرف اور عادات اسی وقت تک معتبر ہیں جب تک نصوص کے معارض نہ ہوں۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم نے بیان فرمایا ہے کہ عمال اور مزدور از ارزیر ناف باندھتے ہیں حالانکہ شعرعانه عورت ہیں، بعض حضرات نے اس کو عرف کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے یہ غلط ہے، کیونکہ یہ تعامل

دارالافتاء بجنورہ، یوپی۔



خلاف نص ہے (اشباہ ص ۳۷)۔

غرض عرف و عادت نص کے خلاف قابل اعتبار نہیں ہیں۔

### متفرعات:

موجودہ زمانہ میں روزانہ کی خوردہ فروش اشیاء کو چھوڑ کر بڑے کارخانوں، کمپنیوں، ملکوں اور حکومتوں اور حکومتوں کے مختلف شعبوں کے درمیان جو کاروبار ہوتا ہے وہ ہول سیل ڈیلروں، لائسنس دار غیر مالیاتی اداروں، ٹھیکیداروں اور ان کے ٹنڈروں اور ہنڈیوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ براہ راست مارکیٹ اور کارخانوں میں یہ لوگ نہیں جاتے ہیں۔ بلکہ ان غیر مالیاتی اداروں اور بینک کے ذریعہ کاروبار صرف چیک، ڈرافٹ، ہنڈیوں اور بلوں کے ذریعہ چلتا ہے۔ یہ ادارے سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ بینک کے ذریعہ منتقل کرتے ہیں اور رقوم کا اندراج ایک کھاتے سے دوسرے کھاتے میں ہوتا رہتا ہے۔ ان غیر مالیاتی اداروں کے بھی ایجنٹ ہوتے ہیں جو معاملہ اور شرائط طے کرتے ہیں، ہم ان سب اداروں اور ایجنٹوں اور بینکوں کو وکیل بالبیع و الشراء اور دلال و سمسار قرار دے سکتے ہیں۔ اکثر یہ کاروبار فون کے ذریعہ چلتا ہے اور رقومات کا لین دین دست بدست نہیں بلکہ کھاتوں کے ذریعہ چلتا ہے۔ اس طرح یہ نقد شمار کیا جائے گا، اور بالاقساط کاروبار حسب شرائط بھی چلتا ہے وہ ادھار شمار کیا جائے گا۔ اس طرح سے ہونے والے کاروبار کو جائز یا ناجائز کہنے میں چند امور کا لحاظ رکھیں گے:

۱۔ کسی معاملہ میں ربا اور سود کی صورت تو پیدا نہیں ہو رہی ہے۔

۲۔ شرائط تو ایسی نہیں کہ جن میں احد المتعاقدين کا فائدہ ہو۔

۳۔ اشیاء میں سے کسی میں جہالت تو نہیں ہے۔

۴۔ معاملہ میں صرف جلب منفعت مقصود ہے یا دفع مضرت مقصود ہے۔

و علیٰ ہذا دیگر بعض امور کو پیش نظر رکھ کر ہم جائز یا ناجائز کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

فقہ کی کتابوں میں دلالوں اور سمساروں، وزن کرنے والوں اور پرکھنے والوں اور وکیل بالبیع و الشراء کو اجرت لینا جائز ہے۔ مذکورہ ادارے جن میں سے بعض دلال کی صورت میں ہوتے ہیں اور بعض وکیل کی پوزیشن میں ان کو طرفین کی طرف سے شرح فی صد کے اعتبار سے کمیشن ملتا ہے اور یہ ادارے کمیشن وصول کرتے ہیں اور یہ ان کا مستقل کاروبار ہے۔ اہل فقہ نے کمیشن کی حد تک معاملہ کو جائز قرار دیا ہے۔

”وفی الحاوی سنل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال أرجو أنه لا بأس به إلى قوله فجوزوه لحاجة الناس إليه“ (رد المحتار ۵۰۴۳)۔

یہ غیر مالیاتی ادارے جب کسی سے کوئی معاملہ طے کرتے ہیں اس وقت مال نہ ان کی ملکیت میں ہوتا ہے اور نہ قبضہ میں ہوتا ہے اس سے بیع المعدوم لازم آتی ہے۔ لیکن یہ معلوم رہے کہ یہ غیر مالیاتی ادارے بڑے لمبے کاروبار محض اپنی ساکھ اور اعتبار کی بنا پر کرتے۔ اور ضرورت کی وجہ سے اس قدر عدم ملکیت اور عدم قبضہ جائز ہے۔ بیع سلم کے باب میں مذکور ہے:

”و منقطع لا يوجد في الأسواق من العقد إلى وقت الاستحقاق في إقليم دون آخر“ (در مختار ۳۰۰۹)۔

یعنی شہر کی مارکیٹ میں نہیں بلکہ ملک کی مارکیٹ میں اس کا پایا جانا ضروری ہے اس وجہ سے وہ حکماً معدوم نہیں ہے، اور بیع حقوق کے بیان میں اس سے زیادہ وسعت ہے۔

مارکیٹ میں بہت سی ایسی اشیاء ہیں جن کی قیمت گورنمنٹ مقرر کرتی ہے بعض دفعہ ان پر سیل ٹیکس کارخانے والے ادا کرتے ہیں اور بعض دفعہ خوردہ فروش دکاندار۔ میری رائے میں سیل ٹیکس بیع مراہجہ میں اصل قیمت کا جزو ہے اور اس پر دیگر اخراجات زوائد میں شمار ہوں گے، اس قسم کے

معاملہ کو ہم بیع تعاطلی قرار دے سکتے ہیں اور یہ جائز ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ شہروں میں کچھ مالیاتی ادارے ہوتے ہیں جن کو فنانس (روپے فراہم کرنے والا) کہا جاتا ہے یہ ادارے خریدار کو مال خریدواتے ہیں، لیکن اپنی رقم پر شرح فی صد کے اعتبار سے سود لیتے ہیں۔ ایسے ہی فروخت کنندہ اپنی ہنڈیاں بینکوں کے حوالے کر دیتے ہیں، اور بینک فروخت کنندہ اداروں سے اپنا کمیشن حاصل کرتے ہیں اور مشتری سے بھی شرح فی صد کے اعتبار سے اپنا کمیشن لیتے ہیں، فروخت کنندہ اس کمیشن کو بھی اور بینک کے مصارف کو خریدار کے ذمہ ڈال دیتا ہے اور یہ بھی خریدار سے وصول کیا جاتا ہے، یہ کھلا ہوا سودی کاروبار ہے اور ناجائز ہے۔

”کل قرض جز نفعاً فهو حرام“ (در مختار ۴، ۱۹۳، اشباہ)۔

رہا وہ معاملہ کہ کوئی چیز نقد کم قیمت میں اور ادھار زیادہ قیمت میں دی جاتی ہے، اس کو بھی ہمارے فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے۔

”ولو قال بعثت بألف حالاً أو بألفین نسيئة لا يجوز“ (بنایۃ ۲، ۱۶)۔

”فإن الأجل بنفسه ليس بمال فلا يقابله شيء حقيقة“ (در مختار ۴، ۱۴۵)۔

ہمارے زمانہ میں مسلم فنڈوں سے بھی کاروباری معاملات چلتے ہیں۔ یہ ادارے مسلمانوں کی رقومات امانت اپنے پاس رکھتے ہیں، اور پھر ان کو اپنے طور پر بینکوں میں جمع کر کے لاکھوں روپیہ کماتے ہیں جو بذات خود سودی کاروبار ہے اور حرام ہے، دوسروں کو قرض دینے کے لیے کچھ ایسی شرائط ہیں جو صرف جواز کے لیے حیلہ قرار دی جاسکتی ہیں اور حیلہ خود مکروہ تحریمی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۳، ۱۸۳، ۱۹۳)۔

حاصل یہ ہے کہ مسلم فنڈوں کا حیلہ مکروہ تحریمی ہے اور اس اعتبار سے ناجائز ہے کہ ان کی شرائط قرض دینے سے پہلے ہی ہوتی ہیں، مستقرض کو اختیار نہیں رہتا ہے۔ مسلم فنڈ ادارے اگر اس قسم کی غیر معقول و غیر شرعی شرائط ہٹالیں اور ان اداروں کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بعض دوسرے معاونتی ذرائع کو اختیار کر لیں تو یہ ادارے غیر سودی بینک کے لیے اچھا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

والله تعالى اعلم بالصواب۔

☆☆☆

## مراجحہ سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا جمیل احمد ندیری ناظم جامعہ عین العلوم، مبارک پور، اعظم گڑھ۔

۱۔ مراجحہ سے متعلق پیدا ہونے والے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی نقد اور ادھار کی الگ الگ قیمت متعین کرنا جائز ہے۔ اس طرح ادھار کی مدت کم و بیش ہونے کے اعتبار سے بھی الگ الگ کم و بیش قیمت رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن پہلے سے معلوم کر لے کہ خریدنے والا نقد خریدے گا یا ادھار۔ اور ادھار کی صورت میں کتنے دن کا ادھار رہے گا۔ اسی اعتبار سے قیمت بتادے مثلاً معلوم ہوا کہ نقد خریدے گا تو قیمت ایک ہزار بتادی، پتہ چلا کہ تین مہینہ کا ادھار خریدے گا تو قیمت بارہ سو بتادی، یا یہ معلوم ہوا کہ ایک سال کا ادھار رہے گا تو پندرہ سو بتادی، یہ صورت جائز ہے۔ البتہ خریدار پر لازم ہوگا کہ وہ اگر بطور مراجحہ اس سامان کو فروخت کرنا چاہے تو بتادے کہ میں نے اتنے دن کے ادھار پر خریدا تھا۔ لأن للأجل شہا بالمبیع الأیری أنه یزاد فی الشمن لأجل الأجل... فصار كأنه اشتری شیئین وباع أحدهما مرابحة بثمانہما والإقدام علی المرابحة یوجب السلامة عن مثل هذه الخیانة۔ (ہدایہ ۲۰۶۲، باب المرابحة)۔

لیکن اگر یوں کہے: اگر نقد خریدے تو یہ سامان ایک ہزار کا ملے گا۔ تین ماہ کے ادھار پر لوگے تو بارہ سو کا اور ایک سال کا ادھار رکھو گے تو پندرہ سو کا ملے گا، تو یہ صورت ناجائز ہے اور اس طرح نقد و ادھار میں کمی و بیشی کرنا درست نہ ہوگا۔ وذلك اعتیاض عن الأجل وهو حرام (ہدایہ ۲۰۲۵، باب الصلح فی الدین)۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: رجل باع علی أنه بالنقد بكذا وبالسیئة بكذا أو إلى شهر بكذا وإلى شهرین بكذا لم یجوز کذا فی الخلاصة (فتاویٰ عالمگیریہ ۲۰۶۲، الباب العاشر فی الشروط التي تفسد البیع والتي لا تفسده)۔

خلاصہ یہ ہے کہ خریدار کا عندیہ معلوم کر کے ایک دام بتائیے خواہ نقد والا یا ادھار والا، یہ نہ ہو کہ ایک ساتھ نقد اور ادھار دونوں طرح کے بتانے لگے۔

۲۔ جو سامان مالیاتی ادارہ کے پاس موجود نہیں ہے۔ کسی ضرورت مند کے اظہار ضرورت پر اس کی فروختگی کی بات چیت اور شرائط وغیرہ طے کرنا اور بعد میں سامان خرید کر خریدار کے حوالہ کرنا بیع نہیں ہے، معاہدہ بیع ہے۔ بیع اس وقت ہوگی جب سامان کی حوالگی پائی جائے، اس وقت ایجاب و قبول کی بھی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ پہلے سے طے شدہ معاملات و شرائط کے تحت جن کافر یقین کو علم ہو محض لین دین کر لینا کافی ہوگا۔ اور یہ بیع تعاطی کہلائے گی (دیکھئے: ہدایہ ۱۹۳۳، کتاب البیوع، فتح القدیر ۷/۵۷۷)۔

جہاں تک ممکن ہو اس معاہدہ کو پورا کرنا چاہیے، لیکن بعض صورتوں میں یہ معاہدہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے، مثلاً جس لاگت پر متعین نفع رکھ کر قیمت بتائی تھی لاگت اس سے زائد آ رہی ہے، اور مالیاتی ادارہ نقصان برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو خریدار کو اس بیع کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوگا، اور اگر لاگت کم آئی ہے تو اسے بتانا چاہیے اور اتنی مقدار کم کر کے فروخت کرنا چاہیے۔ اگر نہیں بتایا اور سابقہ بتائی گئی لاگت پر ہی فروخت کر دیا تو مطلع ہونے پر خریدار کو واپس کرنے کا اختیار ہوگا۔ فإن اطلع المشتري علی خیانة فی المرابحة فهو بالخیار (ہدایہ ۲۰۶۱)۔

۳۔ ظاہر ہے کہ جب بات روپے کی نہیں ہوئی بلکہ کسی سامان کی خریداری کی ہوئی ہے تو روپے دے کر سامان خریدنے کے لئے بھیجنا سوائے توکیل بالشراء کے کچھ اور نہیں، اور زائد نفع کا تعلق اس رقم سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس سامان کی لاگت سے ہوگا، کیونکہ روپے کا مالک بنایا ہی نہیں، نہ مالک بنانے کی بات ہوئی، مالک سامان کا بنے گا جو اس روپے سے خریدا جائے گا، لہذا ابتداءً وہ مالیاتی ادارہ کا وکیل بالشراء ہوگا اور بیع ہو جانے کے بعد وہ اس کا مالک بن جائے گا۔ گویا بیع ہوتے ہی اول و بلکہ کا قبضہ و کالت ہوگا۔ اور اس کے بعد کا قبضہ بطریق الاقتضاء قبضہ مالکانہ من حیث مشتری ہوگا۔

یہاں بھی مطلوبہ شے کی خریداری کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد بجائے خود خرید کر دینے کے مالیاتی ادارہ کا خریدار کو ہی رقم دے کر خریدنے کے لئے بھیج دینا بطریق الاقتضاء یہ مفہوم رکھے گا کہ جاؤ ہمارے یہ روپے لے کر ہمارے لئے فلاں سامان خرید لو۔ پھر ہماری تمہاری طے شدہ معاملت کے تحت تم بحیثیت مشتری مالکانہ قابض ہو جاؤ، اور طے شدہ معاملت کے مطابق لاگت مع زائد منافع بالاقساط ادا کرتے رہو۔ پھر خریدار کا روپیہ لے کر وہ سامان خریدنے کے لئے چلے جانا بطریق الاقتضاء اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس نے توکیل بالشراء اور قبضہ مشتری کی حیثیت کو قبول و منظور کر لیا ہے۔

☆☆☆



## مباحہ

مفتی محمد زید مظاہری ندوی

## ۱۔ کمیشن ملنے پر بیع مباحہ کی صورت اور مسئلہ کی تفصیل:

تاجروں سے زائد سامان لینے پر جو کمیشن ملتا ہے مثلاً دس ہزار کی قیمت میں کمیشن کے بعد ۹ ہزار ہی دینا پڑتے ہیں اس لحاظ سے امانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ بیع مباحہ کی صورت میں بیع کی قیمت نو ہزار بتائی جائے۔

لیکن تاجروں کے عرف میں اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: کچھ لوگ تو ایسا کرتے ہیں کہ زائد سامان لینے پر کمیشن دیتے ہیں، اس کا مقتضی یقیناً یہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ لیکن بعض تاجر اور بعض کمپنیاں ایسا بھی کرتی ہیں کہ زائد سامان لینے پر کمیشن نہیں دیتی یا کم دیتی ہیں، البتہ زائد سامان لینے کی وجہ سے وہ کچھ انعام دیا کرتی ہیں جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، کبھی تو انعام میں کوئی دوسری شے (جو غیر جنس بیع ہو) دی جاتی ہے مثلاً گھڑی، بالٹی وغیرہ۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے وہ انعام اسی سامان کی شکل میں دیا جاتا ہے جو بیع کی جنس سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک درجن صابن خریدنے پر ایک صابن بطور انعام کے مفت دیا جاتا ہے، اس قسم کی اور بھی صورتیں اعلیٰ پیمانہ پر ہو سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں اصل بیع کے ساتھ مزید سامان (جو جنس بیع ہی سے ہے) بطور انعام کے دیا گیا ہے، اگر اصل قیمت کو سب پر تقسیم کر دیا جائے تو یقیناً اصل بیع کی قیمت کم ہو جائے گی لیکن اس کی حیثیت کمیشن کی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہ تو انعام ہے، اس لیے ایسی صورت میں اگر کل قیمت (بیع مباحہ میں) بتلائی جائے اور انعام میں ملے ہوئے سامان میں اس کی قیمت نہ جوڑی جائے تو یہ امانت داری کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

## ۲۔ ادھار کی وجہ سے بیع کے ثمن میں زیادتی کا مسئلہ:

حقیقت یہ ہے کہ محض تا جیل (ادھار) مال نہیں ہے کہ جس کا مقابلہ ثمن سے کیا جائے۔

”لأن الأجل لا يقابله شيء من الثمن كذا في الهداية“ (بحر الرائق ۶۰۱۲۵)۔

لیکن بیع قائم ہونے کی صورت میں بیع کے ثمن کے ثمن میں تا جیل کی وجہ سے اگر ثمن میں زیادتی قصداً کر دی جائے یا اس کی شرط لگا دی جائے تو گنجائش ہے اور اس کے جواز کی تصریحات موجود ہیں۔

”قال و عند قيام المبيع يزداد الثمن بالأجل... إن الأجل في نفسه فليس بمال فلا يقابله شيء حقيقة إذا لم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصداً الخ“ (بحر ۶۰۱۲۵)۔

”الأثرى أنه يزداد في الثمن لأجل الأجل“ (هدایہ ۲۰۵۹، بحر ۶۰۱۲۲)۔

”في النسبة يزداد الثمن لأجل الأجل“ (شرح وقایہ)۔

مجموعۃ الفتاویٰ میں مولانا عبدالحی نے تا جیل کی وجہ سے ثمن میں زیادتی کے جواز کی تصریح کرتے ہوئے مختلف عبارتیں ذکر فرمائی ہیں (مجموعۃ الفتاویٰ ۱۲/۱۲۳)۔

محقق تھانوی نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کے جواز کی تصریح فرمائی ہے (امداد الفتاویٰ: کتاب المبیوع ۲۰۳)۔

البتہ اگر تا جیل کی بنا پر ثمن کی زیادتی تردید کے ساتھ ہو یعنی اس طرح کہ اگر نقد لو تو دس روپیہ کی، ادھار لو تو پندرہ کی، یہ صورت بلاشبہ ناجائز ہے۔ لیکن اس عدم جواز کی وجہ تا جیل کی وجہ سے ثمن میں زیادتی نہیں ہے بلکہ ایک ثمن کا متعین نہ ہونا یعنی جہالت ثمن، یہ وجہ ہے عدم جواز کی۔

”فی العالمگیریۃ رجل باء علی أنه بالنقد بكذا وبالنسیئة بكذا... لم یجز کذا فی الخلاصۃ“ (عالمگیری، ۱۵۲، مطبوعہ نول کشور)۔

”وأما البطلات فیما إذا قال بعتک بألف حالاً وبألفین إلى سنة فلجھالة الثمن“ (فتح القدیر، فتاویٰ عبد الحئی، ۲۷۶)۔

حاصل کلام یہ کہ ادھار کی وجہ سے ثمن میں زیادتی قصد و شرط کے ساتھ بھی جائز ہے بشرطیکہ مدت متعین ہو، اور ایک ہی قیمت متعین ہو، اور یہی مسلک جمہور علماء کا ہے۔

علامہ شوکانی نے جواز کی تصریح فرماتے ہوئے جمہور علماء کی طرف اس کی نسبت فرمائی ہے (نبیل الاوطار ۵/۱۳، اعلاء السنن ۱۳/۱۷۳)۔

### ۳۔ ملک اور قبضہ سے پہلے کسی شے کی بیع:

”بیع ما لا یملک“ اور ”بیع مالہ یقبض“ دونوں مسئلے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

بیع ما لا یملک (یعنی جس شے کا انسان مالک نہ ہوگا اس کے قبضہ میں ہو) اس کی بیع میں اختلاف ہے۔

شافعیہ کے نزدیک راجح قول کے مطابق جائز نہیں۔

حنابلہ کی دونوں قسم کی روایات ہیں۔

مالکیہ کے نزدیک بیع و شراء دونوں مالک کی اجازت پر موقوف ہوں گی۔

احناف کے نزدیک بیع تو صحیح اور مالک کی اجازت پر موقوف ہوگی برخلاف شراء کے (رحمۃ الامم فی اختلاف الائمہ ۱۶۸)۔

لیکن فقہ حنفی کی کتابوں میں جہاں یہ مسئلہ مذکور ہے اس کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں:

ایک صورت تو یہ کہ کسی شخص کا ایسی شے کو فروخت کرنا جو اس کی ملک میں نہیں ہے لیکن عنقریب اس کے ملک میں آجائے گی۔ یعنی مشتری کے معاملہ کر لینے کے بعد اب بیع کو خریدے گا اور خرید کر مشتری کے حوالہ کرے گا۔ یہ صورت تو ناجائز ہے، اور یہی مراد ہے ”بیع ما یملک“ سے اور یہی محل ہے حدیث ”لا تبع ما لیس عندک“ کا (دیکھئے: شامی ۱۰۵/۳، فتح القدیر ۱۸۸/۶، بدائع الصنائع ۵/۱۳۷)۔

دوسری صورت ملک غیر بیچنے کی یہ ہے کہ وہ شے اس کی ملک میں بھی نہیں ہے اور عنقریب اس کے مالک بننے کا ارادہ بھی نہیں ہے، محض فضولی بن کر دوسرے کی شے فروخت کر رہا ہے، یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہمارے فقہاء نے فضولی کے بیان میں ذکر فرمایا ہے۔ اور مندرجہ بالا اختلاف بین الائمہ میں یہی دوسری صورت مراد ہے۔

### غیر مقبوض شے کی بیع:

بیع مالہ یقبض کا مطلب یہ ہے کہ جو شے انسان کے قبضہ میں نہ ہو گو وہ اس کا مالک بن چکا ہو لیکن قبضہ میں آنے سے قبل اس کی بیع درست نہیں، اور اس میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔

شافعیہ کے نزدیک استقرار (قبضہ) سے قبل بیع درست نہیں، خواہ اشیاء منقولہ ہوں یا غیر منقولہ۔ امام محمد کا بھی یہی مسلک ہے۔

حنابلہ کے نزدیک مکسلی و موزونی اور معدودی اشیاء کی بیع قبل القبض جائز نہیں، اور اس کے علاوہ میں جائز ہے۔

مالکیہ کے نزدیک صرف طعام کی بیع قبل القبض جائز نہیں اور اس کے علاوہ میں جائز ہے۔

احناف: امام ابوحنیفہ کے نزدیک اشیاء منقولہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں، اور غیر منقولہ جائداد وغیرہ کی بیع قبل القبض جائز ہے (رحمۃ الامم فی اختلاف

الائمہ ۱۶۸، شرح مہذب للسنودی، اعلاء السنن ۱۳/۲۷۷)۔



قبضہ نہ ہونے کی دو صورتیں اور ان کا حکم:

لیکن قبضہ میں نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ ملک ہو جانے کے بعد ابھی قبضہ ہوا ہی نہیں ہے اور اس حال میں بیع کر رہا ہے۔

دوسری صورت یہ کہ قبضہ تام ہو چکا تھا لیکن پھر بعد میں قبضہ کسی دوسرے کا کسی سبب سے ہو گیا۔ مثلاً یہ کہ وہ شے بطور عاریت کے کسی کو دیدی، یا کسی نے غصب کر لی وغیرہ وغیرہ، فقہاء کرام کی تصریحات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں کا حکم جداگانہ ہے اور مسئلہ میں کسی قدر تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ:

اگر بیع پر مالک کا قبضہ ہوا ہی نہیں ہے تب تو اس کی بیع درست نہیں، اور یہی مطلب ہے "لا یصح قبل القبض" کا۔

دوسری صورت یہ کہ قبضہ پہلے تو تھا لیکن فی الحال (عند العقد) وہ شے کسی دوسرے کے قبضہ میں ہے۔ اس کا حکم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بیع مقدوراً تسلیم ہے تب تو اس کی بیع منعقد ہو جائے گی اور بیع کے تسلیم کر لینے کے بعد اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا۔

اور اگر بیع معجزاً تسلیم ہو تو درست نہیں، یعنی اگر بیع بائع کے علاوہ کسی دوسرے کے قبضہ میں ہے تو اگر بائع کو قبضہ و تسلیم پر قدرت حاصل ہے تب تو اس کی بیع درست ہے، اور اگر اس سے عاجز ہے یا احتمال ہے تو اس کی بیع درست نہیں، جس کی تفصیل بیع عبد آبق اور شے مغضوب کی بیع کے ضمن میں فقہاء کرام نے فرمائی ہے۔  
عبد آبق کی بیع:

بیع آبق کے بارے میں فقہاء نے جو کچھ ذکر فرمایا ہے اس کا حاصل یہی ہے کہ بیع کے مقدوراً تسلیم نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیع درست نہیں، اگر یہ مانع (عجز عن التسليم) مرتفع ہو جائے تو بیع درست ہو جائے گی۔

"لأن المانع هو العجز عن التسليم ولم يوجد في حقه وهذا البیع لا يدخل تحت النهی۔" (بدائع الصنائع ۵۱۳/۶)

چنانچہ اگر مشتری نے بائع سے کہا کہ تیرا عبد آبق فلاں کے قبضہ میں ہے، مجھ کو فروخت کر دو۔ اس نے فروخت کر دیا تو بیع منعقد ہو جائے گی، البتہ نفاذ اس وقت ہوگا جب کہ مشتری قبضہ کر لے گا (بدائع الصنائع ۱۳۷/۵)۔

شے مغضوب کی بیع:

یہی حال بیع مغضوب کا ہے، اگر غاصب سے بیچا تب تو جائز ہی ہے لیکن غیر غاصب سے بیچنے کی صورت میں بھی بیع منعقد ہو جائے گی، حالانکہ بیع پر بائع کو ملک تو حاصل ہے قبضہ حاصل نہیں ہے، اس کے باوجود اس غیر مقبوض شے کی بیع منعقد ہو جاتی ہے اور اس کا نفاذ بھی بعد القبض ہو جائے گا (دیکھئے: بحر الرائق ۸۶۶/۶، بدائع الصنائع ۱۳۷/۵)۔

سوال میں مندرجہ صورت اگر "بیع مالا یملک" کے قبیل سے ہے تب تو اس کا حکم ظاہر ہے یعنی عدم جواز، البتہ مالکیہ کے نزدیک طعام کے سوا دیگر اشیاء میں بیع قبل الملک کا جواز ثابت ہے۔

ضرورت داعیہ و حاجت عامہ کی صورت میں فقہ حنفی سے عدول کر کے مالکیہ کے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے، واللہ اعلم۔

۴۔ بیع کا معاملہ یا معاہدہ:

سوال میں جس صورت کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیع کا معاملہ ہے یا معاہدہ؟ دونوں ہی احتمال ہیں لیکن معاملہ بیع کہنے میں یہ خرابی لازم آتی ہے کہ "بیع مالا یملک" یا "بیع مالم یقبض" کا محدود لازم آتا ہے اس لیے بجائے معاملہ بیع کے معاہدہ بیع کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ مسلمانوں کے امور کا حتی الامکان صحیح اور حلت و جواز کا تحمل تلاش کرنا چاہیے۔

مذکورہ بالا صورت کے بجائے معاملہ کے معاہدہ بیع ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ استصناع کی حقیقت کو بعض مشائخ احناف نے معاہدہ بیع کہا ہے اور بعض لوگوں نے بیع کہا ہے، کیونکہ اس میں اختیار رویت وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ صورت کو بیع کا معاملہ نہیں بلکہ معاہدہ کہا جائے۔ قول اول کی بنیاد پر تو ظاہر ہے کیونکہ جب استصناع معاہدہ ہے تو مذکورہ صورت تو اس سے بھی کم درجہ کی ہے کما هو الظاہر۔



اور قول ثانی کی بنیاد پر بھی اس کو معاہدہ کہنا چاہیے کیونکہ استصناع کو جن لوگوں نے معاملہ بیع کہا ہے اس کی دلیل اور وجہ خیار رویت وغیرہ کا ہونا بتلایا گیا ہے (بدائع الصنائع ۲/۵)۔

جب خیار رویت کی بنا پر استصناع کو بیع کہا گیا ہے تو اس طرح کے خیارات صورت مسئلہ میں مؤکل (ادارہ کمپنی) کو حاصل نہیں ہوتے، اس لیے اس کو بجائے معاملہ کے معاہدہ بیع کہنا چاہیے (شامی ۶/۳)۔

اسی کے قریب قریب حضرت تھانویؒ کا ایک فتویٰ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے معاملہ کی حیثیت صرف معاہدہ کی ہے (دیکھئے: امداد الفتاویٰ ۳/۳۰)۔

اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے یا نہیں:

البتہ صورت مذکورہ کو معاہدہ بیع کہنے کی صورت میں اس وعدہ کا پورا کرنا لازم ہے یا نہیں؟ دیکھتے تو بہر حال لازم ہے اور بغیر مجبوری کے عدم ایفاء گناہ کبیرہ ہوگا۔ لقولہ تعالیٰ: وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَتْ مَسْئُولًا... وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ۔ البتہ قانونی طور سے یعنی قضاء اس کا ایفاء لازم و ضروری نہیں، یعنی کسی ایک کو بیع و شراء پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جب استصناع کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وہ غیر لازم ہوتا ہے تو محض معاہدہ بیع تو اس کے بہت کم درجہ کی چیز ہے اس کو کیونکر لازم کیا جاسکتا ہے۔

”وأما صفة الاستصناع فهي أنه عقد غير لازم قبل العمل في الجانبين جميعاً بلا خلاف“ (بدائع الصنائع ۵/۲۶)۔

شامی ۳/۲۱۳)۔ اس قسم کی صورتوں میں وعدہ کے مطابق عمل لازم نہ ہونے کی تصریح حضرت تھانویؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں فرمائی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۳/۳۰)۔

وکیل بالشراء کا مؤکل سے بیع خریدنے کی مختلف صورتیں:

سوال میں جو صورت مذکور ہے یعنی ایک شخص وکیل بالشراء ہو اور وکیل ہونے کی حیثیت سے بیع پر قبضہ کرے اور پھر مؤکل سے اسی بیع کو خرید لے، چونکہ شرعاً اس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا اس لیے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

محقق تھانویؒ نے اس کی مختلف صورتیں تحریر فرمائی ہیں جس سے جواز معلوم ہوتا ہے، مناسب ہے کہ پورا فتویٰ درج کر دیا جائے:

حضرت تھانویؒ کا فتویٰ:

سوال: زید اپنے اسامیوں سے کہتا ہے کہ قرب و جوار میں گائے بھینس، بیل وغیرہ تلاش کر لو، اپنی پسند کا جانور لے آؤ پھر ہم روپیہ لے کر چلیں گے نقداً خرید کر اپنی ملک کر لیں گے بعدہ فوراً فی صد پانچ فی صد نفع جوڑ کر ادھار ایک سال کے وعدہ سے تم کو دیدیں گے، اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: اس کی چند صورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم جدا ہے:

پہلی صورت: ایک صورت یہ کہ زید نے آسامیوں کو خریدنے کا وکیل بنایا اور اسامی نے زید کے لیے خریدا۔ اس صورت میں مواشی ملک زید ہوں گی اور زید کو اس کے بعد اختیار ہوگا خواہ زید سے خریدے یا نہ خریدے، کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اسامی اگر اپنی خوشی سے زید سے نفع پر خریدے تو جائز ہے اس میں سود وغیرہ کا کوئی شبہ نہیں۔

دوسری صورت: یہ کہ زید نے اسامی کو وکیل خریدنے کا نہیں بنایا صرف پسند کرنے کے لیے بھیجا اور اسامی نے مالک مواشی سے ایسی کوئی گفتگو نہیں کی جس سے خریداری سمجھی جائے یہاں تک کہ مالک مواشی بھی سمجھتا ہے کہ ابھی مجھ سے نہیں خریدا ہے، میں ابھی بیچنے نہ بیچنے کا مختار ہوں، اس کے بعد اگر زید نے خود خریدا اور پھر خرید کر نفع پر اسامی کو بیچ دیا۔ یہ صورت بھی جائز ہے کوئی شبہ نہیں۔

تیسری صورت: یہ کہ اسامی نے اپنے طور سے جا کر مواشی کو اپنے لیے خرید لیا اور زید نے صرف جا کر اس کی قیمت اسامیوں کے کہنے سے ادا کر دی۔ اس صورت میں ابتدا ہی سے وہ مواشی ملک اسامی ہوں گی اور زید کو ادائے ثمن کرنا یہ گویا اسامی کو روپیہ قرض دینا ہوگا جب قرض ہے تو ظاہر ہے کہ نفع لینا صریح سود اور

حرام ہے (امداد الفتاویٰ ۱۳۶/۳، سوال نمبر ۱۷۷)۔

سوال میں مندرجہ صورت یا تو پہلی صورت میں داخل ہے یا دوسری صورت میں، اس لیے حضرت تھانویؒ کے فتوے کے مطابق اس کا جواز ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم۔ اور اگر واقعہ مشتری کو وکیل نہیں بنایا جاتا بلکہ اصل خریدار یہی ہوتا ہے اور ادارہ اس کی طرف سے قیمت ادا کرتا ہے تو یہ صورت صورت ثالثہ میں داخل اور ناجائز ہے۔

### تجدید قبضہ کی بحث:

البتہ مذکورہ بالا صورت میں یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ وکیل بالشراء نے جب سامان خریدار اور موکل (ادارہ) کی طرف سے قبضہ بھی کر لیا تو ظاہر ہے کہ یہ قبضہ بر بناء وکالت موکل کی طرف سے ہوا، اور یہی وکیل جب اسی سامان کو ادارہ سے خریدے گا تو مشتری ہوگا اور ادارہ کی حیثیت بائع کی ہوگی۔ اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وکیل بالشراء کا بیع پر سابق قبضہ (جو بحیثیت وکیل تھا) حادث قبضہ کے لیے کافی ہوگا یا نہیں جو اب بحیثیت مشتری کے ہوگا۔

### قبضہ کے اقسام:

اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے جو ضابطہ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: قبضہ امانت، قبضہ ضمان۔ پھر قبضہ ضمان کی دو قسمیں ہیں: ضمان بنفسہ، ضمان لغيرہ، اور ہر ایک کا حکم جدا گانہ ہے۔

۱۔ مشتری کو اگر بیع پر پہلے سے قبضہ حاصل ہے اور وہ قبضہ ضمان بنفسہ کا ہے مثلاً غاصب کا قبضہ شے منصوب پر۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بیع موجود ہو یا نہیں بہر حال سابق قبضہ جدید قبضہ کے لیے کافی ہوگا اور تجدید قبضہ کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ غاصب کا قبضہ ضمان بنفسہ ہے، اور منصوب شے بہر صورت مضمون بنفسہ ہے۔

۲۔ اور اگر بیع پر مشتری کا قبضہ ضمان لغيرہ کا ہے مثلاً شے مرہون پر رہا، ہن کا قبضہ، کیونکہ درحقیقت رہن امانت ہوا کرتا ہے البتہ مضمون بالغير (یعنی قرض کی وجہ سے) ہوتا ہے گویا یہ مضمون بنفسہ نہیں بلکہ بالغير ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شے مرہون موجود ہو تب تو یہ قبضہ جدید قبضہ کی طرف سے کافی ہوگا ورنہ نہیں۔

۳۔ اور اگر بیع پر مشتری کا قبضہ قبضہ امانت ہے مثلاً عاریت، ودیعت، وکالت، اجارہ کا قبضہ، کہ یہ سارے قبضے قبضہ امانت کہلاتے ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ یہ امانت والے قبضے ضمان والے قبضے (یعنی بیع) کے لئے کافی نہ ہوں گے بلکہ تجدید قبضہ شرط ہے۔ یہ ساری تفصیل شرح و بسط کے ساتھ بدائع الصنائع (۲۴۴/۵) میں منقول ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل کے پیش نظر جب وکیل بالشراء کا قبضہ کرنا قبضہ امانت ہے نہ کہ قبضہ ضمان، اس کا مقتضی یہ ہے کہ یہ قبضہ (جو بحیثیت وکیل تھا) جدید قبضہ کے لیے کافی نہ ہو جو اب بحیثیت مشتری ہوگا بلکہ تجدید قبضہ شرط قرار دی جائے۔ واللہ اعلم۔

اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ادارہ خود بیع پر قبضہ کرے اور دوبارہ پھر یہ مشتری جدید معاملہ کر کے بحیثیت مشتری قبضہ کرے، واللہ اعلم۔



## مراہجہ

مولانا سراج احمد علیؒ

آج کے اس تیسرے فقہی سیمینار میں زیر بحث موضوعات میں سے ایک موضوع غیر سودی بنکاری کا منصوبہ ہے اور اس کے لیے بنیاد عقد مراہجہ کو بنا کر چند سوالات پیدا کئے گئے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آج اسلامی بینکنگ میں عام طور پر مراہجہ نقد خرید و فروخت میں نہیں بلکہ ادھار کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تیسیر اللناس اس میں کوئی حرج نہیں ہونی چاہیے کہ بینک والے کوئی شئی نقد خرید کر قیمت خرید اور خاص قسم کے اخراجات جوڑ کر مشتری کو بتلا دیں اور متعینہ نفع لے کر نقد یا ادھار دے دیں۔

مگر بینک والے کسی شئی کو ادھار خریدیں تو قیمت خرید اور خاص قسم کے اخراجات کے ساتھ ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ بینک والے کتنے ایام کی مہلت سے خریدے ہیں۔ اگر یہ تمام باتیں صراحتاً مشتری کو بتادی جائیں اور پھر متعینہ نفع لے کر نقد یا ادھار دیدیں تو درست ہے۔

ومن اشترى غلاماً بألف درهم نسيئة فباعه بربح مائة ولم يبين فعلم المشتري فإب شاء رده وإن شاء قبل لأن للأجل شبهة للمبيع الأيرى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل (هدایہ ۴۰۵۸)۔

اسی طرح ادھار کی جو دو صورتیں بنتی ہیں یکمشت ادائیگی اور بالاقساط ادائیگی دونوں میں بیج مراہجہ کی صورت میں نفع کی جو متعینہ شرح ہو اس میں تعجیل و تاخیل کی بنا پر کمی و زیادتی کی جاسکتی ہے۔

کسی ایک شئی کو نقد بیچنے کی قیمت علیحدہ (کم) اور ادھار بیچنے کی قیمت علیحدہ (زیادہ) رکھنا اس صورت میں جبکہ دونوں قیمتیں ایک ہی وقت میں ایک ساتھ نہ بتلائی جائیں بلکہ جن کے متعلق یہ گمان ہو کہ یہ نقد خریدے گا اس سے ابتداء ہی اس کی صراحت کرالے اور نقد کی قیمت بتلا دے، اور جس کے متعلق ادھار خریدنے کا گمان ہو اس سے بھی ابتداء ہی اس کی صراحت کرالے، اور اسے بعد تعیین اجل ادھار کی قیمت جو نقد کی قیمت سے زیادہ ہو لیکن غبن فاحش سے خالی ہو بتلا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کتب فتاویٰ میں اس کی متعدد نظیر موجود ہیں۔ کفایت المفتی (ص ۳۰ جلد ۸)، فتاویٰ محمودیہ (ص ۱۷۵، جلد ۴)، فتاویٰ نذیریہ (ص ۱۶۲، جلد ۲)، مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی (ص ۲۸۵ باب اربا) سے بھی من وجہ اس کی تائید ہوتی ہے۔

کفایت المفتی جلد ہشتم میں اس طرح کے کل پانچ فتاویٰ درج ہیں، ایک میں حضرت مفتی صاحب نے صراحت کی ہے کہ یہ بیع صحیح ہے لیکن زیادہ سختی کرنا جو غبن فاحش کی حد تک پہنچ جائے خلاف مروت ہے، البتہ مولانا عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ نے اسے جائز لیکن مکروہ تسلیم کیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تاخیل کی بنیاد پر قیمت میں زیادتی جائز ہے، کما قال صاحب الہدایہ (ص ۵۸، جلد ۳)، اسی طرح کا ایک فتویٰ احقر نے ۲۵ محرم ۱۴۰۷ء کو تحریر کیا تھا جس پر کچھ دیگر ارباب افتاء مثلاً حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، حضرت مولانا مفتی سبکی صاحب مدظلہ العالی مفتی دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور احقر کے استاذ حضرت مولانا عبد الاحد صاحب ازہری قاضی دارالقضاء مالگاوں و جناب مفتی قاری محمد حسین صاحب کے بھی دستخط مثبت ہیں۔ میرے خیال میں آج کے اس موضوع میں معاون ہو سکتی ہے۔

اگر اس زیادتی کو گوارہ نہ کیا جائے اور اس طرح کی بیوعات کی اجازت نہ دی جائے تو میرے خیال میں بہت کم ایسے تجار ہوں گے جو نقد و ادھار دونوں



طرح یکساں حالت پر ضرورت مندوں کو ان کی اشیاء ضروریہ فراہم کرنے پر مدعا مند ہوں۔ اور اگر لوگوں ہی کو اس کا پابند کرنے کی بات کی جائے کہ وہ اپنی ضرورت کی اشیاء کو نقد ہی خریدیں، تو یہ بھی حرج سے خالی نہیں ہوگا۔ اگر اتفاقاً کوئی تاجر ایسا مل بھی جائے جو نقد و ادھار دونوں صورتوں میں قیمت یکساں رکھے تو خریداروں میں یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب دو صورتوں میں قیمت یکساں ہے تو کیوں نہ اس شئی کو ادھار ہی خریدیں اور روپیہ کو کسی دوسری ضرورت میں صرف کریں، اس طرح لوگوں کے حقوق کے اتلاف کا باب کھل سکتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں نقد اور ادھار کی قیمت میں کمی بیشی نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ عین تقاضہ انصاف ہے۔

اگر منافع کی مقدار اتنی زائد رکھی جائے کہ آج وہ شئی بازار میں جس نرخ پر دستیاب ہے اس سے غیر معمولی حد تک زائد رقم خریدار کو ادا کرنی پڑے اور وہ زیادتی غبن فاحش کی حد کو چھو رہی ہو تب تو اسے خلاف مروت اور استحصال کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی یہ صورت جواز سے خارج نہیں ہوگی۔

یہ کہنا کہ بائع ادھار فروخت کر رہا ہے اس کے روپے جب اسے دو سال بعد ملیں گے تو ان کی مالیت آج کے مقابلہ میں کم ہو جائے گی پس وہ آج کے نرخ سے زائد رقم کی مالیت میں کمی ہو جانے کے پیش نظر منافع میں مناسب اضافہ ادھار بیع کی صورت میں کر رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ توجیہ غیر مناسب ہے۔ کیونکہ دو سال بعد رقم کی مالیت میں کتنی کمی ہوگی۔ آج دو سال قبل اس کا اندازہ کرنا از حد دشوار ہے۔ اگر بالفرض اس کا اندازہ کر بھی لیا جائے تو دیون مؤخرہ میں بھی یہی حکم لگانا پڑے گا کہ قرض لیتے وقت روپے کی جو مالیت و قیمت رہی ہو اتنی ہی مالیت و قیمت کے روپے ادا کئے جائیں، چاہے وہ عدد میں اس مقدار سے بڑھ ہی جائیں جو مقدار کہ قرض لی گئی ہے، اور پھر روپیوں کی قیمت کے گھٹنے کی جہاں بات کی جاتی ہے وہیں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اگر بالفرض حکومت کے محکمہ اقتصادیات و مالیات کی کسی پالیسی کے سبب روپیوں کی قیمت بجائے گھٹنے کے بڑھ جائے تو کیا بوقت ادائیگی بیع اور ادائیگی قرض کم روپے دیئے جائیں گے۔ یہ خیال ہے کہ اس کا جواب نفی میں دیا جائے گا۔ اگر روپیوں کی مالیت کو بنیاد بنا کر سوچا جائے تو پھر آخذین ربا کو بھی یہ بات کہنے کا موقع باسانی مل جائے گا کہ ہم جو روپیہ آج بطور قرض دے رہے ہیں۔ آئندہ چند ماہ یا سال میں جب بھی ہمیں ہمارا روپیہ واپس ملے گا اس کی قیمت گھٹ چکی ہوگی، اس لیے ہمارا نقصان نہ ہوا اور خیال سے ہم قرض دینے کے وقت ہی معاہدہ کر لیتے ہیں کہ اتنا زائد ادا کرنا ہوگا، گویا اس طرح کی سوچ سے حلت ربا کو راہ مل سکتی ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس معاملے میں جس طرح حضرت مفتی اعظم علیہ الرحمہ اور مفتی محمود حسن صاحب مدظلہ العالی وغیر ہم جس شرط کے ساتھ اس کے جواز کی جانب گئے ہیں وہی شرط باقی رکھ کر جائے، اور وہ شرط جواز کے لیے نہ صرف کافی بلکہ دیگر خرابیوں سے خالی ہے۔ مزید کسی دوسری توجیہ کے اختیار کرنے میں کچھ دیگر مفاسد آسکتے ہیں۔

ضرورت مندوں کی ضرورت کا مال نہ رکھنے والے ادارے بلکہ اپنی دوکان اور گودام تک نہ رکھنے والے ادارے بچند شرائط ضرورت مند سے معاملہ کریں اس طرح کے معاملہ کرنے میں حرج نہیں ہوگا:

(۱) اس امر کی صراحت کر دیں کہ ہمارے پاس مال نہیں ہے۔ (۲) ہم کسی دوسری جگہ سے خرید کر بصورت مراہجہ یا بصورت تولیہ دیں گے۔ (۳) آپ کی ضرورت کی چیز ہم کہیں اور سے خرید لیں تو آپ ہم سے خریدیں اس کے پابند نہ آپ ہیں اور نہ ہم، آپ سے فروخت کرنے کے پابند ہیں۔

اسی مسئلہ سے ملتا جلتا مسئلہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ نے امداد الفتاویٰ، جلد ۳، ص ۳۳ (مطبوعہ کراچی) پر درج فرمایا ہے اور انہیں شرائط کے ساتھ جواز کا حکم دیا ہے۔

تیسری اور آخری بات جو سوال نامہ میں درج ہے وہ یہ ہے کہ مالیاتی ادارہ اسی شخص کو روپیہ دیدے اور وہ شخص اپنی ضرورت کا سامان خرید کر استعمال کرے اور پہلے سے طے شدہ منافع اس ادارے کو دیتا رہے۔ اس مسئلہ کی دو صورتیں بنتی ہیں:

- ۱۔ ادارہ سے روپیہ لے کر کوئی شئی خریدے اور ادارہ کے حوالہ کر دے پھر ادارہ اس شخص کو دیدے اور اس پر وہ طے شدہ منافع ادا کرے، یہ صورت جائز ہوگی۔
- ۲۔ ادارہ سے روپیہ لے کر کوئی شئی خریدے اور ادارہ کے حوالہ مال نہ کرے، خرید کر خود ہی استعمال کرنے لگے اور اس پر وہ طے شدہ منافع ادارہ کو ادا کرے۔ صورت ناجائز ہوگی، کیونکہ ادارہ نے حقیقتاً اس شخص کو روپیہ دیا ہے، کوئی شئی نہیں دی ہے جس پر نفع لے، اگر ادارہ اس صورت میں نفع لیتا ہے تو حقیقتاً یہ روپیہ کا ہے جو ہمارا سود ہے۔

ہذا ما عندی والله أعلم بالصواب۔

☆☆☆

## مراجحہ

### اسلامی تجارت کا ایک اہم جز

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوریؒ

شریعت اسلامی تجارت کی ہمت افزائی کرتی ہے، اور اس کے فروغ کے لئے کی جانے والی کوششوں کو سراہتی ہے۔ اسلامی رو سے تجارت و بزنس کی جو جائز اور پسندیدہ شکلیں ہیں، ان میں سے ایک اہم شکل ”مراجحہ“ ہے۔

اس کی تعبیر ان الفاظ میں بھی کی جاسکتی ہے کہ اسلامی تجارت جن اصولوں اور بنیادوں پر استوار اور مستحکم ہوتی ہے، ان میں سے ایک اہم اصول مراجحہ بھی ہے۔ جب اسلامی اصولوں پر ”بینکنگ نظام“ قائم کیا جائے گا تو ”مراجحہ“ اس کا ایک اہم جزء ہوگا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے غیر سودی، اسلامی بینکنگ کے اسی مراجحہ والے جزء کو بنیاد بنا کر اس سے متعلق چند سوالات قائم کئے گئے ہیں۔ ہم سب سے پہلے مراجحہ کی شرعی حیثیت، اور اس کے بنیادی اصولوں پر اجمالی روشنی ڈالتے ہیں، پھر ان سوالات کے جوابات قلمبند کریں گے۔

### مراجحہ کی تعریف:

مراجحہ زمانہ قدیم سے رائج ہے، اسی لئے تمام فقہاء کے یہاں ”مراجحہ“ پر کافی دشانی بحث ملتی ہے۔ مشہور عالم دین ابن نجیم لغت کی مشہور کتاب ”صحاح“ کے حوالہ سے مراجحہ کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”والمراجعة في اللغة كما في الصحاح يقال إذا بعته المتاع واشترته منه مراجعة إذا سميت لكل قدر من الثمن رجاً“ (البحر الرائق ۶، ۱۰۷ مطبوعہ کراچی)۔ یعنی اصل قیمت پر نفع کے ساتھ فروخت کرنے کا نام مراجحہ ہے۔

عالمگیری کی تعریف بڑی واضح ہے: ”والمراجعة بمثل الثمن الأول و زيادة ربح“ (عالمگیری ۳، ۱۶۰ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔ یعنی پہلی قیمت پر نفع کی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنے کا نام مراجحہ ہے۔

اور در مختار میں لکھا ہے: ”المراجعة مصدر راجح و شرعاً ما ملكه بما قام عليه و بفضل مؤنة“ (در مختار علی ہاشم الرد ۳، ۱۷۱ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

یعنی مراجحہ راجح کا مصدر ہے، اور مراجحہ شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام ہے کہ خریدی ہوئی چیز جتنے دام میں پڑی ہو، اس پر کچھ نفع لے کر فروخت کر دی جائے۔

مراجحہ میں رأس المال میں حمل و نقل، رنگنے، دھو بی وغیرہ کے اخراجات اور ہر وہ خرچ جو تاجروں کے عرف میں رأس المال میں شامل کر دیا جاتا ہے اسے بائع رأس المال میں شامل کر سکتا ہے۔ مگر اس صورت میں وہ یہ نہیں کہے گا کہ میں نے اتنی قیمت میں اس چیز کو خریدا ہے، بلکہ اس طرح کہے گا کہ مجھے یہ چیز اتنے میں پڑی ہے (دیکھئے: فتاویٰ عالمگیری ۳، ۱۶۲، در مختار ہاشم رد المختار ۳، ۱۷۲، ۱۷۳)۔

### مراجحہ کا جواز:

مراجحہ کا رواج دور قدیم سے آرہا ہے، عقل و نقل دونوں طرح مراجحہ کا جواز ثابت ہے۔ اس کے جواز کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے قول: ”وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ“ سے اشارہ کیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جملہ اقسام کی بیوع کو حلال قرار دیا ہے جس میں سے مراجحہ بھی ہے، اس کی ضرورت یوں بھی پڑتی ہے کہ

سابق نائب ناظم امارت شرعیہ پٹنہ۔



بسا اوقات کم عقل اور غبی انسان اپنی ضرورت کی اشیاء خریدنے میں دھوکہ و فریب کے شکار ہو جاتے ہیں، ایسی صورت میں انہیں کسی ماہر اور تجربہ کار شخص پر اعتماد کرنا ضروری ہوتا ہے، وہ مراءجہ اپنی ضرورت کی اشیاء خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ صاحب ہدایہ مراءجہ کے جواز کی علت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”والبیعان جائز ان لاستجماع الجواز، والحاجة ماسة الى هذا النوع من البيع لأن الغبی الذی لا یهتدی فی التجارة یحتاج إلى أن یعمد فعل الذی المہتدی“ (ہدایہ ۲، ۵۵ دہلی)۔

یعنی مراءجہ اور تولیہ بیع کے جواز کی شرطوں کے پائے جانے کی وجہ سے جائز ہے۔ اور اس بیع کی حاجت یوں بھی پڑتی ہے کہ غبی شخص جو تجارت کے اصول سے واقف نہیں ہوتا وہ تجربہ کار شخص پر اعتماد کرنے کا محتاج ہوتا ہے۔

مراءجہ کا مدار دیانت پر ہے:

مراءجہ کا مدار دیانت و امانت پر ہے، یعنی بائع کو چاہیے کہ مراءجہ کی صورت میں خریدار کو اصل قیمت بتائے، اس میں خیانت اور مکر و فریب کو راہ نہ دے، چنانچہ صاحب ہدایہ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”ولهذا کان مبناهما علی الامانة والاحتراز عن الخيانة وعن شبهتها“ (حوالہ بالا)۔

اسی لئے فقہاء نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ اگر مراءجہ میں فروخت کنندہ نے خریدار کے ساتھ خیانت اور فریب کیا تو اسے اختیار حاصل ہوگا کہ اپنی ادا شدہ قیمت لے لے اور سامان لوٹا دے، شمس الائمه سرخسی نے بڑی وضاحت سے تحریر فرمایا ہے:

”اگر کسی نے بیع مراءجہ کیا، اور اس میں خیانت سے کام لیا، خریدار اگر اس کی خیانت پر آگاہ ہو جائے تو اسے اختیار ہوگا کہ چاہے تو پوری قیمت ادا کر کے وہ شئی خرید لے، اور اگر چاہے تو اس معاملہ کو ختم کر دے۔“ (مبسوط سرخسی ۸۶/۱۳)

اور فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے: ”وان خان فی المراجعة فهو بالخيار ان شاء أخذ بكل الشمن وان شاء ترك“ (عالمگیری ۲، ۱۶۲، در مختار علی هامش رد المحتار ۴، ۱۶۲)۔

یعنی اگر مراءجہ میں خیانت کی گئی تو خریدار کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو پوری قیمت ادا کر کے اس سامان کو حاصل کر لے، اور اگر چاہے تو اس معاملہ کو ختم کر دے۔ اگر ادھار خریدار ہے تو اس کی وضاحت کر دے:

مراءجہ کا معاملہ کرتے ہوئے دوسری بات یہ ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر بائع نے ”مراءجہ“ میں فروخت کی جانے والی چیز کو ادھار (سیبہ) خریدا ہو تو اس کی ضرورت وضاحت کر دے کہ میں نے یہ چیز اتنے دنوں کے ادھار پر اتنے روپے میں خریدی ہے۔ کیونکہ ادھار خریدی ہوئی چیز کی قیمت عام طور پر نقد خریدی ہوئی چیز کے مقابلہ زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اس وضاحت کے بعد اگر مشتری رضامند ہوگا تو مجوزہ قیمت پر خرید کرے گا یا اس معاملہ کو ختم کر دے گا (دیکھئے: مبسوط سرخسی ۷۸/۱۳، فتاویٰ عالمگیری ۱۶۳/۱۳)۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: ”اگر کسی نے ایک غلام ایک ہزار روپہ میں ادھار (سیبہ) خریدا، پھر اسے سو روپہ منافع لے کر فروخت کر دیا، اور خریدار سے اس کی وضاحت نہیں کی کہ اس نے غلام کو ادھار خریدا تھا۔ مگر مشتری کو اس کا علم ہو گیا تو اب اسے اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیع کا معاملہ ختم کر دے، اور چاہے تو اسے قبول کر لے۔ اسلئے کہ اجل (مدت) کو یک گونہ بیع کے ساتھ مشابہت حاصل ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر اجل (مدت) کی بنا پر شمن میں زیادتی کر دی جاتی ہے“ (ہدایہ ۵۷/۳)۔

نیز مراءجہ کی صورت میں بائع کو اس کی بھی وضاحت کرنی ہوگی کہ اسے اس مال کی خریداری پر کمیشن یا ڈسکاؤنٹ ملا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا نفع الگ سے اس میں متعین کرتا ہے، اگر وہ ڈسکاؤنٹ کی وضاحت نہیں کرے گا تو یہ بھی خیانت ہوگی۔

نفع کا متعین ہونا ضروری ہے:

فقہاء نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ بیع مراءجہ کے وقت بائع اپنے نفع (ربح) کی مقدار بھی متعین کر دے کہ مجھے یہ چیز اتنے میں پڑی ہے۔ میں



اس پر مثلاً بیس روپے کا نفع لے کر فروخت کروں گا۔ کیونکہ اگر نفع کی مقدار متعین نہیں کی جائے گی تو ثمن مجہول ہوگا اور جہالت ثمن کی وجہ سے بیع فاسد قرار پاتی ہے۔ صاحب درمختار نے لکھا ہے:

”كون الربح شيئاً معلوماً“ (در مختار علی هامش رد المحتار ۱۵۲، ۴)۔

مراہجہ پر اس اجمالی گفتگو کے بعد اب ہم اس سوالات کے جوابات قلمبند کرتے ہیں جنہیں اسلامک اکیڈمی کی طرف سے جاری کیا گیا ہے۔

کیا نقد اور ادھار کی قیمت علیحدہ علیحدہ رکھنا جائز ہے؟

خرید و فروخت جس طرح نقد جائز ہے، ادھار بھی جائز ہے، قرآنی حکم ”وَ اَحْلَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ“ کے اندر دونوں طرح کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ البتہ ادھار بیع کی صورت میں اجل (مدت) کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: ”ويجوز البيع بشمن حال ومؤجل إذا كان الأجل معلوماً، لإطلاق قوله تعالى: وَ اَحْلَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ“ (ہدایہ)۔

اس لئے مراہجہ کی صورت میں بائع کو شرعاً اس کا اختیار ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت علیحدہ علیحدہ رکھے، اور نقد کے مقابلہ میں ادھار کی صورت میں قیمت زیادہ رکھے۔ ادھار کی بھی دو صورتیں ہیں: یکمشت ادائیگی، قسطوں میں ادائیگی۔ دونوں صورتیں جائز ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ نقد کی صورت میں اس کی قیمت پچاس روپے ہوگی۔ اور ادھار کی صورت میں ساٹھ روپے، اس میں مدت کی کمی بیشی کے ساتھ قیمت میں تفاوت بھی ہو سکتا ہے، مثلاً ایک ماہ کے ادھار پر اس کی قیمت سو ۰۰ روپے ہوگی، تین ماہ کے ادھار پر ایک سو بیس روپے۔ نقد اور ادھار کی قیمت علیحدہ علیحدہ بتائی جائے نہ کہ ایک ساتھ۔ مثلاً اس طرح کہے کہ اگر تم نقد لیتے ہو تو اس کی قیمت سو روپے ہوگی اور ادھار کی صورت میں ایک سو پچیس روپے۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ خریدار سے دریافت کر لیا جائے کہ وہ نقد لینا چاہتا ہے یا ادھار۔ اگر نقد لینے کا خواہش مند ہے تو اس کو نقد والی قیمت بتائی جائے، اور اگر ادھار لینا چاہتا ہے تو ادھار والی قیمت بتائے۔ اجل (مدت) کی وجہ سے قیمت میں اضافہ معقول بات ہے۔ اگر نقد اور ادھار دونوں صورتوں میں قیمت یکساں رکھی جائے تو کوئی بھی انسان نقد لینا گوارا نہیں کرے گا، سوچے گا کہ روپے کسی دوسری ضرورت میں لگا دو اور ادھار خرید لو، انسان کی فطرت ہے کہ وہ نقد کے مقابلہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت ادا کرتا ہے۔ مبسوط میں ہے:

”ثم الإنسان في العادة يشترى الشيء بالنسيئة بأكثر مما يشترى بالنقد“ (مبسوط ۸۰، ۱۳)۔

صاحب ہدایہ بڑی عمدہ بات لکھتے ہیں: ”الأيدي أنه يُزاد في الثمن لأجل الأجل“ (ہدایہ ۵۷، ۳)۔

(کیا یہ بات نہیں دیکھی جاتی ہے کہ اجل (مدت) کی بنیاد پر ثمن میں زیادتی کر دی جاتی ہے)۔

البتہ اگر بائع نے یہ کہا کہ نقد لوگے تو ایک ہزار اس کی قیمت ہوگی، اور ادھار لوگے تو ایک ہزار ایک سو، تمہارا جی جس کو چاہے اختیار کر لو، تو اس صورت میں چونکہ ”ثمن“ متعین نہیں ہو سکا بلکہ مجہول رہا، اس لئے بیع جہالت ثمن کی بنا پر فاسد ہوگی نہ کہ ادھار کی قیمت زیادہ رکھنے سے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

رجل باء على أنه بالنقد بكذا وبالنسيئة بكذا أو إلى شهر بكذا أو إلى شهرين بكذا لم يجز كذا في الخلاصه

(عالمگیری ۴۲، ۳)۔

اس صورت میں چونکہ بائع ایک ساتھ نقد اور ادھار کی قیمت بتا کر مشتری کی رضامندی پر اسے چھوڑ دیتا ہے جس کی وجہ سے ثمن کی تعیین نہیں ہو پاتی، اس لئے جہالت ثمن کی بنا پر بیع کے فساد اور عدم جواز کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ ملا علی قاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ”نبی عن بیعتین فی بیعة“ کی تفسیر میں لکھا ہے:-

”بائع یوں کہے کہ میں تم سے یہ کپڑا اس روپے میں نقد کی صورت میں اور بیس روپے میں ادھار کی صورت میں ایک ماہ کی مدت کے لئے فروخت کرتا ہوں تو

یہ صورت اکثر اہل علم کے نزدیک فاسد ہے، اس لئے کہ ایسی صورت میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں میں سے کس چیز کو ثمن بنایا ہے (مرقاۃ ۶۱، ۸۱)۔

اسی طرح خطابی نے لکھا ہے: ”ایسی صورت میں کسی ایک متعین ثمن کا تعین نہیں ہوتا۔ اور جب ثمن میں جہالت پائی جائے تو بیع فاسد ہو جاتی ہے“ (بذل

الجہود ۱۵، ۱۳۵)۔

اس کے برخلاف اگر نقد کی قیمت علیحدہ متعین طور پر بتادی جائے اور ادھار کی علیحدہ تو پھر دونوں صورتوں میں ثمن متعین ہوگا، اس لئے بیع کے ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

معاملات سے متعلق ضروری شرائط کا طے پا جانا معاہدہ ہے یا بیع ہے؟

مراجحہ سے متعلق دوسرا سوال یہ کیا گیا کہ عموماً مراجحہ کی صورت مالیاتی ادارے میں یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس نہ تو مطلوبہ سامان ہوتا ہے اور نہ ہی اپنا ذاتی گودام، بلکہ جب کوئی ضرورت مند ان کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے ساتھ لاگت اور اپنے منافع کا معاملہ طے کر لینے کے بعد اس ضرورت کے سامان کی خریداری بازار سے کر کے ضرورت مند کے حوالہ کرتے ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض شرائط کا طے پا جانا بیع قرار دی جائے گی؟

اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ صورت صرف معاہدہ بیع کی ہوتی ہے بیع کی نہیں۔ بیع اس وقت تام اور لازم ہوگی جب ادارہ مطلوبہ شئی ضرورت مند کے حوالہ کر دے۔

معاہدہ بیع ہونے کی وجہ سے ادارہ اور خریدار دونوں قانوناً اس کے پابند نہیں ہوں گے، البتہ اخلاقاً اور یانہ اس معاہدہ کا ایفاء اس وقت تک لازم رہے گا جب تک کہ ادارہ اپنی سابقہ شرائط پر قائم رہے، اس معاملہ کو بیع قرار دینے کی صورت میں "بیع مالا یملک" لازم آئے گی جس سے حدیث میں صراحتاً منع کیا گیا ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس طرح کے معاملہ کو صرف "وعدہ محضتہ" قرار دیا ہے (امداد الفتاویٰ ۳۰۳)۔ ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

"یہ معاہدہ جو فیما بین زید و متولیان مسجد کے ہوا یہ بیع شرعی نہیں محض وعدہ ہے جس کا بلا وجہ خلاف کرنا عند اللہ موجب مواخذہ ہو سکتا ہے لیکن قضاء اس میں مجبور نہیں کیا جاسکتا" (امداد الفتاویٰ ۳۵۳)۔

کیا ایک شخص دو حیثیتیں اختیار کر سکتا ہے؟

مراجحہ کے سلسلہ کا آخری سوال یہ کیا گیا ہے کہ بسا اوقات جب ضرورت مند ادارے کے پاس اپنی مطلوبہ شئی خریدنے کے لئے جاتا ہے، تو ادارہ بذات خود اس شئی کی خریداری نہ کر کے اس کی قیمت ضرورت مند کے حوالہ کر دیتا ہے کہ وہ بازار جا کر اپنا مطلوبہ سامان خرید لے، اور پھر حسب شرائط سابقہ اس کی قیمت ادارہ کو ادا کرتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ہی شخص بیک وقت مشتری اور بائع بن سکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جب بازار جا کر ضرورت مند مطلوبہ شئی خریدے گا تو وہ ادارہ کا وکیل بالشراء ہوگا، اور اس کا قبضہ قبضہ وکالت ہوگا۔ پھر اس پر مالکانہ حیثیت سے قبضہ کرے گا۔ مگر اس سلسلہ میں بہتر یہ ہے کہ ادارہ اپنا ایک شخص اس کے ساتھ بھیجے، اور اسے مکمل اختیار دیدے، ضرورت مند شئی خرید کر ادارہ کے آدمی کے حوالہ کر دے، اور پھر وہ آدمی اس کے حوالہ کر دے، یا اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر یہ کیا جائے کہ ضرورت مند وہ چیز خرید کر ادارہ کے حوالہ کر دے پھر اس سے خرید لے تو اس طرح کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہے گا۔



## مناقشہ

۱۵ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۹ جون ۱۹۹۰ء

زیر صدارت: حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی

قاضی صاحب: سب سے پہلے قاضی صاحب نے تعارف مسئلہ کے عنوان سے ایک تحریر پڑھ کر سنائی یہ تحریر الگ سے شریک اشاعت ہے وہاں ملاحظہ کی جائے۔

ذکی نجیب آبادی صاحب:

میرا تعلق مسلم فنڈ نجیب آباد سے ہے، یہ فنڈ ۱۹۷۱ء میں نجیب سوسائٹی ایکٹ کے تحت قائم ہوا، اس کی ابتداء دیوبند کے مسلم فنڈ کو دیکھ کر کی گئی، جہاں تک فارم کی قیمت کا تعلق ہے تو قرض دیتے وقت اخراجات وصول کرنے کا ہمارا طریقہ کار ہے۔

ہمارے سامنے جو دشواریاں آتی ہیں ان میں سب سے بڑی اہم دشواری گورنمنٹ سے منظوری کی ہے چونکہ اس طرح کے ادارے بالکل بے سوچے سمجھے سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوتے چلے گئے لیکن ان میں کوئی ایسی صورت حال نہیں ہوئی کہ جس کے اندر I. B. R. کی منظوری ہو سکتی۔ ۱۹۸۳ء میں حکومت نے I. B. R. کے ذریعہ ایک گزٹ شائع کیا، حکومت نے ایک Amendment کیا، جو کمپنیوں پر عائد تھی، اب اس نے دوسری فرموں اور Corporet Bodies - In - Un پر قائم کر دی، ہم نے ایسے اداروں کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا تو ان لوگوں نے In - Un - Corboret کے اندر شامل ہونے سے انکار کر دیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ انکار شتر مرغ کی مثال کی طرح ہے۔

جتنی بھی سوسائٹیاں ہندوستان میں چل رہی ہیں بیشتر سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہیں، بہت کم سوسائٹیاں ایسی ہیں جو کوآپریٹ میں ہیں یا کمپنی لاکے تحت چل رہی ہیں۔ ریزرو بینک کی نوٹس آتی ہے کہ یا تو سوسائٹی بند کرو، یا ان کو Incorect کرو، یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ہم سب کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

اخراجات کے سلسلہ میں بھی ہمیں غور کرنا چاہئے کہ اسکی تکمیل کی کیا صورت ہو۔

جنوبی ہند میں ہوٹل بنیفٹ لمیٹڈ کا طریقہ ہے، جسے ”نجی“ کہا جاتا ہے، ابھی یہ طریقہ ملک میں ہر جگہ معروف نہیں ہو سکا ہے، اس طریقہ سے ادارے کیا بہت سے ماہرین بھی واقف نہیں ہیں، میں اس طریقہ پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سروس چارج اگر بقدر ضرورت لینا طے کیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ضروری اور غیر ضروری میں فرق کس طرح ہو سکے گا؟ اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ ہم ہر چیز کو اگر تناسب میں لاکر جمع اور خرچ کو برابر کر دیں گے تو نقصان کی صورت میں تلافی کی کیا راہ ہوگی؟ مثلاً ہمارے یہاں ڈیکیتی ہوئی، اور ۷۰ ستر ہزار روپے ضائع ہو گئے تو اس کو کیسے پورا کیا جائے؟

ایک آواز:..... ریزرو بینک اور حکومت کی طرف سے ان سوسائٹیوں کی منظوری کے سلسلہ میں رکاوٹ کیا ہے؟

ذکی صاحب:..... اس کے اندر یہ پابندی لگا دی ہے کہ دو سو پچاس ۲۵۰ افراد سے زیادہ کھاتے نہیں کھول سکتے۔

مفتی رفیع صاحب عثمانی:..... قرض داروں کی تعداد محدود ہے؟

ذکی صاحب:..... ہاں ۲۵ سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب:..... کیا وقت اور قرض دار کے لحاظ سے فارم کی قیمت مختلف ہوتی ہے یا ایک؟



ذکی صاحب:..... دو سو روپے تک کچھ نہیں لیتے، اسکے بعد ۲ فیصد مزید لیتے ہیں، ہر تین ماہ پر یہ فیصد بڑھتا چلا جائے گا۔

ایک آواز:..... تو آپ ۲ فیصد کے حساب سے فارم کی قیمت وصول کرتے ہیں؟

ذکی صاحب:..... جی ہاں! مثلاً تین سو روپے کا کوئی شخص قرض لے گا تو ہم تین مہینے کے لئے فارم کی قیمت ۶ روپے لیں گے۔

ایک آواز:..... اگر تین ماہ کے بعد قرض واپس نہ ہو تو کیا کرتے ہیں؟

ذکی صاحب:..... ہر تین ماہ کے بعد ۲ فیصد کے حساب سے رقم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

قاضی عبدالاحد ازہری:..... آپ نے کہا کہ آپ کی سوسائٹی کو ستر ہزار روپے کا خسارہ ہوا ہے؟ آپ نے یہ خسارہ کس طرح پورا کیا؟

ذکی صاحب:..... ابھی تک پورا نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا انیس الرحمن قاسمی:..... کن لوگوں کو آپ قرض دیتے ہیں؟

ذکی صاحب:..... ہم زراعت، تجارت اور شادی بیاہ اور گھریلو اخراجات کے لئے دیتے ہیں۔

ایک آواز:..... آر بی، آئی کیا چیز ہے؟

ذکی صاحب:..... ریزرو بینک آف انڈیا۔

ایک آواز:..... آپ نے سوسائٹی اور کمپنی کے نام سے دو ادارے بتائے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

ذکی صاحب:..... سوسائٹی کے تحت جو ادارے رجسٹرڈ ہوتے ہیں وہ رفاہ عام کے لئے ہوتے ہیں، خصوصاً لٹری، میڈیکل امداد وغیرہ، اس میں روپے دینے لینے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ایک آواز:..... کیا تاجروں سے اور لوگوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ رقم لیتے ہیں؟

ذکی صاحب:..... نہیں بلکہ ان سے قرض کے لحاظ سے لیتے ہیں، اور یہ سب کے لئے یکساں ہے۔

ایک آواز:..... آپ لوگوں سے عطیات بھی لیتے ہیں؟

ذکی صاحب:..... جی ہاں! لیتے ہیں، لیکن اسی برانچ میں لیتے ہیں جس میں کمی آتی ہے۔

نعیم اللہ صاحب ملی سوسائٹی بہرائچ:..... ۹ جولائی ۱۹۷۲ء کو یہ ادارہ قائم ہوا، کل چھ روپے سے اس کی شروعات کی گئی تھی، آٹھ مہینے کے بعد ایک رنگ اور ڈپازٹ دونوں کھاتے کھولے گئے، پہلے صرف چار ماہ کے لئے قرض دیتے تھے، اور سو روپے پر دو روپے مزید لیتے تھے، بعد میں فارم کی قیمت وہی رکھی اور

مدت ۴ ماہ سے بڑھا کر ۸ ماہ کر دی، یہ بھی کیا کہ تین سو روپے تک کوئی چارج نہیں لیا جائے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس وقت ہم تقریباً ساڑھے چار کروڑ روپے

چالیس ہزار مسلمانوں کو قرض دے چکے ہیں، اب ارادہ ہے کہ ایک ہزار روپے تک کوئی چارج نہیں لیا جائے گا، اس وقت مشرقی یوپی میں ایسے ۱۳۵،۳۰ ادارے

قائم ہیں، مجھ سے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے فرمایا کہ قوم کو سود سے بچانے کے لئے اور معاشی حالت درست کرنے کے لئے پورے ملک

میں ایسا ادارہ قائم کیا جانا چاہئے، اگر سرکار ہمارے کام میں مداخلت کرنا چاہتی ہے تو چونکہ یہ بھی ہمارے دین میں مداخلت ہے اس لئے ہم سب کو چاہئے کہ مسلم پرسنل لا کی طرح متحد ہو کر مطالبہ کریں۔

قاضی صاحب:..... ہم امید کرتے ہیں کہ دین کی تعلیمات کے مطابق اگر کوئی ادارہ چلایا جائے جو شبہ سے بالاتر ہو تو متحد ہو کر ہر آنے والی رکاوٹ کا مقابلہ کیا جائے گا۔

میرا سوال ہے کہ: ۱۔ فارم سے مجموعی آمدنی کیا ہوتی ہے؟ ۲۔ کیا زائد رقم کو آپ فلکسڈ پاژٹ کراتے ہیں؟

جناب نعیم اللہ صاحب:..... فارم کی قیمت فنڈ میں جمع نہیں ہے، اگر کبھی جمع ہوئی تو ہم ملازمین کو بونس کی شکل میں دے دیتے ہیں، فلکسڈ پاژٹ میں ہم اپنی امانتیں نہیں رکھتے۔

ذکی صاحب:..... کیا ایسے ادارے قائم ہوئے جو ضائع نہیں ہوئے؟

جناب نعیم اللہ صاحب:

ملک میں تین طرح کے ادارے چل رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ مغربی علاقے میں خود غرضی کی بنا پر قائم ہوں، جو ادارے برادری کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں وہ ۹۹ فیصد ضائع ہو جاتے ہیں۔ معیاری ادارہ ۲۵، ۳۰ سے زیادہ نہیں ہیں۔

مولانا شفیق احمد صاحب آسنسول:..... کیا کھاتے دار اور غیر کھاتے دار دونوں کو قرض دیتے ہیں؟

جناب نعیم اللہ صاحب:..... غیر کھاتے دار کو نہیں دیتے، ہم نے ایک کمپلکس بنایا ہے۔

قاضی صاحب:..... یہ کس کی ملک ہے؟ آپ سات لاکھ روپے لگاتے ہیں، یہ روپے کس کے ہیں؟

جناب نعیم اللہ صاحب:..... ملی سوسائٹی کے ہیں، ہمارے یہاں دو طرح کے کھاتے ہیں، ہمارے یہاں جو زیورات جمع ہوتے ہیں، تھوڑی رقم جمع کرتے کرتے جب پوری رقم جمع کر لیتے ہیں تو زیورات ہم واپس کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محروس مدرس:

جو حضرات ان قسم کے بینکوں میں اپنے پیسے جمع کرتے ہیں وہ غریبوں کو محدود مدت تک دینے کے لئے جمع کرتے ہیں تو کیا جمع کرنے والے جب چاہیں اپنی رقم لے سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو بینک ختم ہو جائے گا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا روپے جمع کرنے والے اجازت دیتے ہیں کہ بینک دوسرے شخص کو قرض دے سکتا ہے؟

ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب:..... ڈاکٹر محروس اور جناب نعیم اللہ صاحبان کے بیان سے خلط بحث ہو گیا ہے، جو روپے جمع ہوتے ہیں وہ امانت نہیں ہوتے، جناب نعیم اللہ صاحب نے کہا کہ سوسائٹی نے سوسائٹی کو قرض دیا، تو کیا یہ قانوناً درست ہے؟ اس کی انٹری کس طرح کرتے ہیں؟

جناب نعیم اللہ صاحب:..... مرکزی ملی سوسائٹی نے ملی سوسائٹی براچ کو قرض دیا ہے۔

مفتی رفیع صاحب عثمانی:..... یہ قرض نہیں ہے، مجازاً قرض کا لفظ کہہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی:..... یہ قرض بھی نہیں ہے۔

مفتی اشرف علی صاحب:..... جناب عبدالوہاب صاحب سے گزارش ہے کہ وہ بیت النصر کا تعارف کرائیں۔

جناب عبدالوہاب صاحب دلوی:

میرا تعلق بیت النصر ابن سوسائٹی بمبئی سے ہے، میں ریزرو بینک کا اعلیٰ افسر رہ چکا ہوں، ۱۹۷۶ء میں بیت النصر کا آغاز ہوا، بہت سے لوگوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ بلا سودی کاروبار والی سوسائٹی بمبئی جیسے شہر میں چل نہیں سکتی، یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ دو ملازمین اور بارہ ہزار روپے کے سرمایہ سے آغاز کیا۔ ۱۹۹۰ء میں ہمارا کل سرمایہ ایک کروڑ پینسٹھ سے متجاوز ہے۔ ممبران کی تعداد ۳۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ آغاز میں کام کے لئے جگہ بھی نہیں تھی، آج ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ۹ شاخیں ہیں، بیت النصر بلا سودی کاروبار کر رہا ہے، گذشتہ سالوں میں کئی ہزار ضرورت مندوں کے ہم نے آنسو پونچھے ہیں، عام طور پر زیورات لے کر قرضہ جات دیتے ہیں۔ آٹورکشا اور ٹیکسی کی ضمانت پر روپے دیتے ہیں، ایک شخص کو زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار روپے قرض دیتے ہیں۔

جن لوگوں کی امانت میرے پاس آتی ہے اس کو سمجھئے عام طور پر لوگ بینکوں میں جمع کرتے ہیں، اس کے برعکس ہم خود لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کی رقم جمع کرتے ہیں۔ ہر شخص ضرورت کے وقت رقم نکال سکتا ہے۔ F.D کے روپے ہمارے پاس زیادہ نہیں آئے، ایک رنگ کے روپے زیادہ آتے ہیں، یہ رقم نکال بھی لیتے ہیں اور ان کو ضمانت پر ہم قرض بھی دیتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ ۸۰ فیصد ڈپازٹ واپس لیتے ہیں۔ ۱۵، ۲۰ فیصد جمع رہتا ہے۔ ہم سروس خارج لیتے ہیں۔ ملازمین کو فیصد تناسب کے لحاظ سے تنخواہ دیتے ہیں، جو رقم جمع ہوتی ہے اس پر ہمیں ۳ سے ۷ فیصد تک تنخواہ خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہم یہ کمیشن نہ دیں تو لیبر کورٹ میں ملازم چلا جاتا ہے۔ رقم جمع کرنے کے لئے ہم کالج کے طلبہ کو رکھتے ہیں۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر جمع شدہ رقم ہمارے یہاں جمع کر دینا لازمی ہے، ہم اس کے لئے انشورنس کراتے ہیں۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی:..... آمدنی کے ذرائع بتائیں۔

دلوی صاحب:..... صبر سے کام لیں، میں سب کچھ بتاؤں گا، ہمارے کام امانتیں لینا اور قرض دینا ہے، بمبئی جیسے شہر میں اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب:..... طریقہ کار کی وضاحت کریں، کیا آپ انوسٹمنٹ نہیں کرتے؟

دلوی صاحب:..... جی ہاں! انوسٹمنٹ نہیں کرتے، ہمارے اخراجات ۳ سے ۴ فیصد تک ہوتے ہیں۔ آج تک ہم نے ایک شخص کا بھی زیور نہیں بیچا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی:..... آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ بینک میں رقم جمع کرتے ہیں یا نہیں؟

دلوی صاحب:..... بینک میں F.D میں رقم جمع نہیں کرتے، کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں، چونکہ چھ ماہ سے کاسٹنگ کرتے ہیں، اس لئے قرض داروں سے ۱۰ فیصد تک خرچ لیتے ہیں۔

قاضی صاحب:..... بیت النصر کاروبار میں روپے لگاتا ہے، اخراجات قرض لینے والوں سے وصول کئے جاتے ہیں، نان بینکنگ سروسز بھی بیت النصر کرتا ہے، اخراجات کی رقم اصل رقم کی ادائیگی کے بعد لوگ عام طور پر جمع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محروس صاحب:..... سوسائٹی کا مقصد کیا ہے؟ رضائے رب یا لوگوں کی امداد؟

قاضی صاحب:..... رضائے رب بھی مقصد ہے اور لوگوں کی امداد بھی، قرض بھی دیا جاتا ہے۔

محروس صاحب:..... رفاہی سوسائٹی، وقف اداروں کے مشابہ کیوں نہیں؟ اس کا مقصد حقیقی کیا ہے؟

ڈاکٹر فریدی صاحب:..... ان اداروں کے دو مقاصد ہیں: ایک یہ کہ حاجت مندوں کو قرض دیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے خود بچت کریں، خلط بحث اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ مانیں کہ یہ ادارے محض خیر یہ ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

قاضی صاحب:..... سوسائٹی کا مقصد اول عوام کی اعانت ہے، ثانوی مقصد یہ ہے کہ عوام اپنی آمدنی میں سے بچت کریں۔



ابتداء میں یہ ادارے کیف ما اتفاق بن گئے، بعد میں مسائل پیدا ہوئے فقہی بھی اور قانونی بھی۔

مفتی رفیع عثمانی صاحب:..... یہ معاملہ نہ تو مشارکت ہے اور نہ مضاربت، ان اداروں میں جو رقم جمع ہوتی ہے وہ ان اداروں کی قرض ہوتی ہے، پھر یہ ادارے محتاجوں کو قرض دیتے ہیں، اگر یہ قرض کی رقم ضائع ہو جاتی ہے تو ادارے ضامن ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر محروس صاحب:..... میرے خیال میں یہ طریقہ مناسب نہیں، قرض میں ایجاب و قبول کی ضرورت ہے۔

قاضی صاحب:..... شیخ محروس کی تفصیلات سے نئے سوالات اٹھتے ہیں، سو سائٹی میں لوگوں کے اکاؤنٹ کی حیثیت کیا ہے؟ ودیعت ہے یا قرض ہے؟ میرا خیال ہے کہ جس طرح محکمہ ٹیلیفون، پانی بجلی کے محکمے تمام شرائط قبول کرتے ہیں، اس کو جدید عربی میں معاہدہ اذعان کہتے ہیں، اگر اس کو امانت کہا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ امانت والے شخص نے تصرف کی اجازت دے دی اور ضیاع کا ضمان نہ ہوگا۔

مولانا برہان الدین سنہجلی:..... دو چیزیں ہیں: مثلی اور غیر مثلی، غیر مثلی میں ضمان نہیں، مثلی قرض کی طرح ہے، فقہ حنفی کے مطابق ضمان ہوگا۔

ڈاکٹر محروس مدرس:

جو نئے معاملات پیدا ہوئے ہیں ان کو پرانے سانچے میں زبردستی ڈھالنے کے بجائے اصول و کلیات کی روشنی میں نئے سرے سے غور کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح کے ادارے روپے جمع کرتے ہیں، اور واپس کرنے کے بھی ضامن اور پابند ہوتے ہیں، اپنے قواعد کے مطابق صرف کرنے کے بھی ماذون ہوتے ہیں۔

یہ مقصد اچھا ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جائے، لیکن سود سے بچانے کے نام پر سودی استحصال کی شکل پیدا ہو تو ہمیں ایسے کام کی ضرورت نہیں جس میں حرام کا ارتکاب کرنا پڑے۔ ادارے کیسے چلائے جائیں، خالص آمدنی کی کیا شکل ہے کہ اخراجات پورے ہوں، اگر کوئی شکل نہیں ہے تو بدرجہ مجبوری قرض داروں سے رقم لینے پر غور کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر فریدی صاحب:..... کیا یہ ادارے شرعاً ماذون التصرف ہوتے ہیں؟

جناب عبدالغفار صاحب:..... جمع شدہ رقم کو قرض کے مصرف میں لے سکتے ہیں۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری:..... ہندوستان میں ان اداروں کا قیام کس طرح عمل میں آیا، انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے ساتھ مشکلات پیش آئیں، ان کی املاک برباد ہو گئیں، اس طرح مسلمان سودی قرض لینے پر مجبور ہو گئے، اس مجبوری میں جبکہ یہاں کے مسلمانوں کو حکومت سے کوئی تعلق نہیں مولانا مدنی اور دوسرے کبار فقہاء نے اس طرح کے اداروں کے قیام کی اجازت دے دی۔

موجودہ نشست میں ان اداروں کے طریقہ کار کو دیکھنا ہے کہ کیا ہے؟ جواز کی بحث بعد میں ہوگی۔

قاضی صاحب:..... آپ جواز کے پہلو پر بحث کریں۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری:

قاضی صاحب کے ابتدائی مضمون سے میں متفق ہوں، امام اعظم نے اس شخص کے مکان کے سایہ میں بیٹھنا بھی گوارا نہیں کیا جس نے امام اعظم سے قرض لیا تھا، قرض دینے والوں کو کسی نفع کی امید نہیں، خرچ لینے کی بات حیلہ ہے، قانون نہیں ہے، حیلہ قانون کی لچک کا نام ہے، لوگوں کے نزدیک حیلہ عیب ہے میرے نزدیک عیب نہیں ہے، مضطر کی گلو خلاصی کے لئے ہے، حضرت ایوب نے قسم کھائی، قرآن نے اس کا حیلہ بتایا، حدیث میں ہے کہ ایک صحابی ناقص الخلق تھے، ان سے زنا ہو گیا، ان کے ساتھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے، حضور نے ان کو طلب کیا، ساتھی نے کہا کہ یہ یقین نہیں کہ وہ واپسی کے وقت زندہ ہوگا یا نہیں؟ چار پائی پر لانا بھی مشکل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ڈالی لا کر مارو، چنانچہ ڈالی سے اسے مارا گیا وہ مر گیا۔

یہ ادارے ضروری ہیں، لوگوں کی ضرورتوں میں امداد ضروری ہے، لیکن حیلے درست نہ ہوں گے، چاہے کتنے ہی بڑے نے اجازت دی ہو، واقعی اور غیر واقعی کے درمیان خط امتیاز کھینچنا مشکل ہے، شاید ہاؤس بھی یہ طے نہیں کر سکتا۔ لوگوں پر کس طرح کنٹرول کیا جائے اس کو طے کرنا ہے، میں قاضی مجاہد الاسلام صاحب کی اسکیم سے متفق ہوں، حیلہ اضطرار کی حالت میں ہوتا ہے، اسے عام قانون کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی:..... سوسائٹی کو بالکل ختم کرنا ملک و ملت کے لئے مضر ہوگا، اس لئے ایسی شکل پیدا کی جائے چاہے حیلے کے ذریعہ سہی کہ لوگوں کو سہولت مل سکے۔

جناب جلال الدین عمری صاحب:..... میں مفتی ظفر الدین صاحب مفتاحی کی رائے سے متفق ہوں، سوسائٹی جاری رہنی چاہئے، یہ سوچنا چاہئے کہ حیلہ سے کس طرح کام چلایا جاسکتا ہے؟

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی:..... مضطر و غیر مضطر دونوں کو جو ہم قرض دیتے ہیں تو مجھے یہ کہنا ہے کہ غیر مضطر کے سلسلہ میں میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں۔

مفتی رفیع عثمانی صاحب:..... شریعت نے درجات مقرر کئے ہیں، اضطرار ضرورت کے درجہ میں ہے۔

قاضی صاحب:..... لفظ اضطرار کو اس کے فقہی معنی میں مولانا سعید احمد پالنپوری صاحب نے استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ مجبوری کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔  
مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی:

شریعت نے مقصد اور ذریعہ دونوں کو بتایا ہے، صحیح مقصد کے لئے حرام ذریعہ اختیار نہیں کیا جاسکتا، قرآن نے سود کو سخت ممنوع قرار دیا ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ سود لینا دینا زیادہ غلط ہے یا قرض دینا، ہمیں اہون البلیتین کے اصول پر عمل کرنا چاہئے، ہر حیلہ اضطرار کی ہی حالت میں نہیں ہوتا، صحاح کی حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے ادنیٰ کھجور کو عمدہ کھجور سے بدل لیا اور کچھ زیادہ لے لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو درہم سے بیچ دیتے پھر کھجور لے لیتے۔ یہ اضطرار کی حالت نہیں تھی۔

جناب شمس پیرزادہ صاحب:

حیلہ کی بحث خطرناک ہے، غلط رخ پر ڈال سکتی ہے، لوگ حیلہ تلاش کرتے رہتے ہیں، لوگ ناجائز کو جائز کر لیں گے، جو مثالیں قرآن و حدیث سے پیش کی گئیں وہ تخفیف کے درجہ میں ہیں حیلہ نہیں ہیں، حیلہ کا مفہوم دوسرا ہے، ابن القیم کی اعلام الموقعین کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

موجودہ حالات کا تقاضہ کیا ہے؟ ہمیں جاننا چاہئے، پہلے قرض کے ادارے نہیں ہوتے تھے آج ان اداروں کو چلانے کا سوال ہے کہ اخراجات کس طرح پورے ہوں، بدرجہ مجبوری اخراجات کا بار قرض لینے والوں پر ڈالا جائے تو سود نہ ہوگا، اس کی مثالیں سامنے آچکی ہیں، مٹی آرڈر فیس وغیرہ سامنے ہے، جو چیزیں ہیں اسکو جائز کہہ دینا چاہئے، حیلوں کی ضرورت کیا ہے؟ سوسائٹی کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے، ان کو ختم کرنا مضر ہوگا، ان سوسائٹیوں نے اپنے کو الجھالیا ہے، مفلوک الحال لوگوں کی امداد کے لئے ان کا قیام ہونا چاہئے، اور خوش حال لوگوں کو قرض دینے کے لئے دوسرے ادارے ہونے چاہئیں۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

ملک کے موجودہ حالات اور مسلمانوں کے اقتصادی حالات کے اعتبار سے ایسے ادارے قائم کرنا اور اگر پہلے سے ہوں تو باقی رکھنا ضروری ہے، مفلوک الحال اور تجارت کے لئے قرض دینے والے اداروں کے الگ الگ ہونے پر غور کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسے اداروں کا ہونا ضروری ہے۔ اسلامی شریعت یہ ہے کہ کسی کے قرض کو حصول زر کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ حصول زر ہو رہا ہو تو وہ استحصال ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ جن اداروں کے پاس وسائل ہیں وہ فارم کی فروخت سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اور جن کے پاس وسائل نہیں وہ قرض داروں سے اخراجات کی رقم لے سکتے ہیں۔ واقعی اور غیر واقعی کے درمیان شناخت کرنا مشکل ہے، کس تناسب سے لیں؟ افراد سے لیں؟ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ تناسب



سے لینے میں شبہ رہا ہے، اور افراد پر تقسیم کر کے لینے میں ظلم محسوس ہو رہا ہے۔ واقعی اخراجات قرض کے تناسب سے لینے میں میرے نزدیک ربوا کی حقیقت صادق نہیں آتی، اس لئے یہ درست ہے۔

عبداللہ جو لم صاحب:..... کوشش کرنی چاہیے کہ قرض لینے والوں سے اخراجات نہ لیے جائیں۔ لیکن اگر ان سے خرچ لئے بغیر کام نہ چلے تو خرچ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

مولانا نظام الدین صاحب مبارکپور:

مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ قرض لینے والوں سے اخراجات لئے جائیں، کیونکہ قرض کا ادا کرنا تو لازم ہے لیکن رجسٹروں میں لکھنا لازم نہیں ہے۔ بالغ اگر غلہ بیچتا ہے تو بیع کے وزن کرنے کا خرچ اسی پر لازم ہے، یہ فقہ میں صراحت ہے۔ اس کے برخلاف رجسٹر میں لکھنا لازم نہیں ہے۔ اخراجات کی رقم قرض دہندہ کے حصہ میں نہیں جاتی، بینکوں کے اندر بینکوں کے حصہ میں آتی ہے۔ خارجی ضرورت کی بنا پر اگر اس زمانہ میں قرض کو لکھ لینا واجب ہے تو سوال یہ ہے کہ کس کے اوپر واجب ہے؟ کیا قرض دہندہ پر واجب ہے؟ یا مقروض پر لازم ہے؟ جب قرض دہندہ پر لازم ہے تو مقروض کیوں دے گا؟ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں: کیا مقروض کو بتایا گیا ہے کہ اخراجات ہم اپنے طور پر کریں گے اور رقم آپ سے لیں گے؟ یا مقروض سے طے ہوا ہے؟ اگر مقروض قرض دیتا ہے تو یہ اس کا تبرع ہے۔

قاضی صاحب:..... تو آپ کا منشا یہ ہے کہ اصحاب ثروت سے رقم جمع کر کے ادارے اگر محتاجوں کو قرض دیں تو اخراجات مقروض کے ذمہ نہ ہوں گے؟ مجھے یاد آتا ہے کہ خرچ من علیہ الحق پر ہے۔

مولانا برہان الدین سنہلی:..... من علیہ الحق پر ہے اجرت کتابت، آپ اس پر مزید غور فرمائیں۔

مولانا زبیر احمد صاحب قاسمی:

اس کے مالیاتی اداروں کے قیام کا احساس پورے ہاؤس کو ہے، صرف یہ ضرورت ہے کہ اخراجات کو پورا کئے جانے کی شکل پیدا کی جائے، میرا خیال یہ ہے کہ جب الغرم بالغنم ایک فقہی اور شرعی قاعدہ ہے، جس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ”ذمہ داری بقدر استفادہ“ تو اس کی روشنی میں بدرجہ مجبوری یعنی جب ادارہ کسی دوسرے بے خطر اور جائز طریقہ سے ضروری اور حقیقی اخراجات کے بقدر کوئی آمدنی پیدا نہ کر سکے تو ”لا امر اذا ضاق اتسع“ کے مطابق قرض خواہوں سے انتظامی امور کے اخراجات لینے کی گنجائش ہونی چاہیے۔

جب حدیث رسول ”خياركم أحسنكم قضاء“ سے یہ جائز قرار پاتا ہے کہ مستقرض از خود بلا عقد میں اشتراک کے بوقت ادائیگی قرض کچھ بڑھا کر دیوے، تو کیا الغنم بالغرم کے مطابق اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ ایسے مفید و ضروری ادارے کی بقاء اور محض بقاء کے ارادہ سے کچھ زیادہ لیا جائے۔ مقصد ادارہ کا یا کسی فرد کا اپنے مال و سرمایہ میں اضافہ کرنا مطلقاً نہیں، بلکہ ضروری و مفید ادارہ کو باقی رکھنے میں اس کو شریک کرنا ہے ”إنما الأعمال بالنیات“ کے تحت اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

اب لازمی اور حقیقی انتظامی اخراجات کے تعین میں خرص و تخمین کا کام کسی شخص واحد نہیں بلکہ متدین حضرات کی کمیٹی کے حوالہ ہو تو متوقع اور ممکنہ بہت سی خرابیوں کا سدباب بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ادارہ کا یہ ضابطہ بھی بن جائے کہ مکمل احتیاط کے ساتھ خرص و تخمین کے بعد جو رقم بنام اخراجات انتظامی امور لیا جائے، اور حسابی مدت کے بعد اس میں سے کچھ بچ جائے تو مستقرض حضرات اسے تبرعاً غریباً و مساکین پر خرچ کر دینے کی بھی اجازت دے دیں۔

اس تخمینی رقم کا رشتہ مدت قرض کی کمی بیشی سے نہ جوڑا جائے کہ اس طرح اس قدر زائد کے متعلق عوض اجل کا شبہ پیدا ہو سکے۔ بلکہ مقدار قرض کے ساتھ اسے مربوط رکھا جائے۔ جو ”الغرم بالغنم“ کا ایک تقاضہ معلوم ہوتا ہے، یہ میرا خیال ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مفتی محمد یحییٰ صاحب قاسمی:..... ایسے اداروں کے قیام میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میرا ذہن اس طرف نہیں ہے کہ قرض داروں سے اخراجات کی رقم



واجبی اخراجات یا کسی نام سے لی جائے۔ اس میں شبہ ربوا اور فتح باب ربوا ضرور ہے۔

مولانا احمد صاحب خانپوری:..... میں مفتی بیجی صاحب کی تائید کرتا ہوں۔

مفتی ابوالقاسم صاحب بنارسی:..... یہاں تین فریق ہیں: ایک ادارہ، دوسرا رقم جمع کرنے والا، تیسرا مقروض۔ جو اخراجات ادارہ لیتا ہے وہ سود کے ذیل میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ادارہ اخراجات لے سکتا ہے۔ ادارہ اصل میں قرض دہندہ نہیں ہے بلکہ کارندہ ہے۔ یہ اجرت عمل لے سکتا ہے اور زیادہ بھی لے سکتا ہے۔

قاضی صاحب:..... ادارہ کی حیثیت شخص اعتباری کی ہے۔

مفتی سرور دہلوی:..... اخراجات کا بار دیون پر ہونا منصوص ہے۔ ادارے اگر کام میں لگا کے اخراجات پورے کریں تو یہ بہتر شکل ہوگی۔

مولانا عبدالوہاب دہلوی:..... میں مسلم فنڈ کے طریقہ کار سے متفق ہوں۔

☆☆☆

## آخری اجلاس

۷ ارذیقعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۹۰ء

زیر صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم

جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:

میں دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کے اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان حضرات نے بڑی محنت اور تندہی کے ساتھ مندوبین کی خدمت کی ذمہ داری سنبھالی۔ سبیل الرشاد کے طلبہ اساتذہ اور منتظمین میں جو یکسوئی اور تواضع کی کیفیت ہے وہ کم جگہ دیکھنے میں آئی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام اور اس کے ذریعہ سمینار کا جو قدم اٹھایا گیا ہے، امید ہے کہ اس سے بہت سے خیر کے پہلو سامنے آئیں گے۔ محترم جناب ڈاکٹر منظور عالم صاحب اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے علمائے کرام کو ایک جگہ بیٹھنے اور مسائل پر غور کرنے کا موقع فراہم کیا۔ مختلف انخیال علماء کا ایک جگہ بیٹھ کر مسائل پر باہم غور و تبادلہ رائے کرنا بڑی سعادت کی بات ہے۔

جدید مسائل انگریزوں کے دور سے پیدا ہوتے رہے۔ اور انفرادی طور پر فتوے دیئے جاتے رہے۔ اجتماعی طور پر فتوے نہیں دیئے جاسکے۔ پہلا قدم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اٹھایا لیکن اسے قبول عام نہ مل سکا، پھر اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس خلاء کو اسلامک فقہ اکیڈمی نے پر کیا ہے۔ یہ فال نیک ہے۔ انفرادی اور اجتماعی فتوے میں بڑا فرق ہے۔ سوسائٹی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے انفرادی فتوے لئے گئے۔ اس میں تمام پہلو سامنے نہیں رہے۔ اجتماعی فتوے میں تمام نشیب و فراز سامنے آجاتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب فریدی:

ایسی مجلسیں جن میں عصر حاضر کے مسائل پر بحث کی جائے مبارک ہیں۔ احساس ہے کہ یہ مجالس جس مقصد کے لئے منعقد کی جا رہی ہیں وہ عصر حاضر کے تصورات اور تقاضے کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہیں۔ لیکن ان میں اولاً جدید ماہرین کی تعداد کم ہوتی ہے، ثانیاً دعوت دینے کے بعد وہ آتے نہیں ہیں۔ اس کمی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

فقہ کی ایک دو کتاب پڑھنے سے فقہ کے اسرار و رموز سے واقفیت نہیں ہوتی۔ ان مجالس کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی ضرورت ہے کہ جدید ماہرین کو مناسب تعداد میں بلایا جائے۔ بعض اصطلاحات اپنے وقت میں صحیح تھیں لیکن آج ان کے معانی پر غور کرنا چاہیے۔ آج جو چیزیں عرف بن گئی ہیں کیا ان سب کا اعتبار کرنا چاہیے۔ یا ایسا ہے کہ جن چیزوں سے مالی منفعت وابستہ ہو گئی ہے لوگ ان کے مقاصد سے واقف ہیں۔

مراہجہ کی جو شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں وہ سود سے مختلف نہیں ہیں۔ فقہ اسلامی صرف قانون کا نام نہیں ہے۔ آج کا قانون جزئیات کو سامنے رکھ کر بحث کرتا ہے۔ فقہ اسلامی جزئیات کو سامنے نہیں رکھتا۔ بلکہ اقدار، مقاصد، اصول اور غایتوں کو سامنے رکھتا ہے۔ ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے، ورنہ بڑا نقصان ہوگا۔

اعضاء کا انتقال ظالمانہ تجارت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ آپ اس پہلو کو بھی دیکھیں کہ آپ کی اجازت کا معاشرہ پر مجموعی طور سے کیا اثر پڑے گا۔

حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب:

یہ سمینار جس عظیم مقصد کے لئے منعقد کیا گیا۔ اور جو عظیم مباحث کئے گئے کنوینر کی ذمہ داری کی وجہ سے میں ان سے مکمل استفادہ نہ کر سکا۔ کیونکہ انتظامات بری طرح گھیرے رہے۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "الحلال بین والحرام بین"۔ وضاحت کے ساتھ شریعت نے حلال و حرام کو بتا دیا ہے۔ حلال اختیار کرنے اور حرام سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ "وبینہما مشتبہات" بھی کہا گیا ہے۔ ان پر حلت و حرمت کا حکم لگانا آسانی کے ساتھ ممکن نہیں، کیونکہ وہ پہلو ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر لوگ فیصلہ کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ لایعلمہا کثیر من الناس۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات كراء يبرعى حول الحمى يوشك أن يواقعہ" (بخاری: کتاب الایمان؛ باب فضل من استبرأ لدينه)۔ جو شخص اپنا وطیرہ یہ بنائے کہ شبہات کو اختیار کرتا چلا جائے اور غور و فکر نہ کرے تو اس کی مثال اس بیوقوف چرواہے کی ہے جو شاہی چراگاہ کے پاس جانوروں کو چراتا ہے اور اپنے جانوروں کو شاہی چراگاہ میں داخل کر کے عتاب شاہی کا مستحق بن جاتا ہے۔ جس چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو اختیار کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ محرمت سے جو چیز قریب ہو اس سے بھی بچنا چاہیے۔

یہ مسئلہ دل کی دنیا کا ہے۔ دل کی دنیا میں یا تو نور ہے یا ظلمت ہے۔ سرسبزی و شادابی ہے یا ویرانی ہے۔ دل آباد ہوگا تو انسان حرام اختیار نہیں کرے گا، بلکہ مشتبہات سے بھی بچے گا۔

ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے لوگ مشتبہات کی طرف بڑھنے کی جرأت کرنے لگیں۔

شیخ محروس المدرس:

مجھے ہندوستان کو دیکھنے اور یہاں کے علماء سے ملاقات کی دیرینہ خواہش تھی۔ میں یہاں آ کر خوش ہوں۔ اسلامک فک اکیڈمی کے کام قابل اطمینان ہیں۔ اور اس سیمینار میں شرکت میرے لئے مزید مسرت کی موجب ہے۔

حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی:

مجھے بے انتہا مسرت بھی ہے اور کسی قدر حسرت بھی۔ مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علماء کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے، اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانہ پر یہ کام شروع نہیں کر سکے۔

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے زمانہ میں سرکاری سطح پر اور بڑے پیمانہ پر یہ کام شروع ہوا تھا۔ اس لئے وہاں علماء نے اپنے طور پر اس کام کو انجام دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ میں یہ عزم لے کر جا رہا ہوں کہ میں وہاں بھی اس طرح کی اکیڈمی قائم کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائے۔ امید ہے کہ علمائے ہند بھی استفادہ کا موقع بخشیں گے۔

یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ اس میں نوجوان علماء بھی حصہ لے رہے ہیں۔ تحقیقی مطالعہ کرتے ہیں اور دلائل جمع کرتے ہیں۔ مقالات کا معیار اونچا ہے۔ یہاں تنقید برائے تنقید نہیں ہے۔ اسلوب اور انداز مجلس علماء کے شایان شان ہے۔

امید افزا بات یہ بھی ہے کہ تقلید اور اجتہاد کے بارے میں اہل علم میں نہ انفراط و تفریط ہے اور نہ جمود و آزادی ہے۔ بانیوں اور چلانے والوں کے اخلاص کے نتیجے میں یہ اکیڈمی اس سے پاک ہے۔ یہاں تقلید جامد نہیں کہ ان فتوؤں کو حرف بحرف سمجھا جائے جو صدیوں پہلے اکابر نے اپنے حالات اور عرف و رواج کے اعتبار سے دیئے تھے۔ آج حالات بدل چکے ہیں اور فقہ کا اصول ہے: من لم یعرف اهل زمانہ فهو جاهل۔

الحمد للہ! یہاں حالات زمانہ کی صحیح صورت حال سمجھی جا رہی ہے۔ جدید علوم کے ماہرین سے بات سمجھ کر متوازن اور معتدل فیصلے کئے جا رہے ہیں۔

یہاں بیا آزادی بھی نہیں ہے کہ سابق ائمہ کے جلیل القدر کاموں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ یہی طریقہ ہے سلف کا، اور یہی طریقہ ضامن ہے صراط مستقیم کا۔

اسلامک فک اکیڈمی نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے۔ مدت سے اس کا انتظار تھا۔ فکری کاوشوں پر اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کی نظر رہتی ہے۔ سودی نظام سے دنیا پریشان ہے۔ غیر مسلم بھی چاہتے ہیں کہ سرمایہ کاری کو بہتر طور پر منظم کیا جائے۔ حضرت قاضی مجاہد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس سمت میں بھی انہوں نے قدم اٹھایا ہے۔ ان میں سب کچھ ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت ہے۔ انشاء اللہ یہ تاریخ ساز کارنامہ ہوگا۔



جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ:

اسلام مکمل نظام حیات ہے۔ ہم سیاسی میدان میں اگر اسلام سے رہنمائی حاصل کریں گے تو پھر سیاست محمدی نہیں رہ سکے گی۔ عصر حاضر کے بے شمار مسائل ہیں۔ معاشی نظام میں استحصال کیا جا رہا ہے، ہم سب کو مل جل کر مسائل کا حل ڈھونڈنا چاہیے۔

مولانا سراج الحسن صاحب امیر جماعت اسلامی ہند:

اسلام دین کامل ہے۔ اور ہماری مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اس عقیدہ پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن محض عقیدہ سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اسلام کی رہنمائی کو سمجھیں اور زندگی میں اس پر عمل کریں۔

زندگی ایک متغیر اور متحرک چیز ہے۔ اور ارتقاء متغیر مزاج اور فطرت کا حامل ہے۔ اسلام رہنمائی کے لئے آیا ہے، نہ کہ ساتھ چلنے کے لئے آیا ہے۔ وہ رہنمائی کے لئے آیا ہے اس لئے رہنما کا رول انجام دینا ہوگا، علماء کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ متحرک اور متغیر زندگی کے لئے اسلام کی رہنمائی کو پیش کریں۔

یہ فقہ اکیڈمی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کی بنیاد جتنی وسیع ہوگی اچھی بات ہے۔ مکمل فکر، گہرائی، گیرائی اور بصیرت کے ساتھ علماء کو جمع کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ یہ احسن اور مبارک کوشش ہے۔ ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہم مکمل تعاون کریں گے۔ یہ کام اگرچہ ریاضت اور تفکر کا طالب ہے۔ لیکن امید ہے کہ علمائے کرام کتاب و سنت سے رہنمائی کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے گا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب:

میں سبیل الرشاد کے منتظمین، اساتذہ کرام، طلبہ، حضرات مندوبین اور سیمینار کے تمام شرکاء کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ابتدائی کام کا خاکہ بہت نازک تھا۔ احساس تھا کہ اس ذمہ داری کو ایک شخص نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ڈاکٹر منظور عالم صاحب تعاون نہ فرماتے تو تمہا میں نہیں کر سکتا تھا۔

ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں دین پر احسان نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کسی سے کوئی کام لیتا ہے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

مختلف الآراء اور مختلف انخیال حضرات کا مجمع میں کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ بات لائق تحسین، مبارک اور مسرت کی ہے کہ ہم اپنی ذاتی رائے کو عزت نفس کا مسئلہ نہیں بناتے۔ جب دلائل سامنے آتے ہیں تو سر جھکا لیتے ہیں۔

حرام و حلال کا مسئلہ بڑا دشوار مسئلہ ہے۔ اصحاب حیل چاہتے ہیں کہ اسلام کا لیبل بھی رہے اور غیر اسلامی طریقہ اور سودی نظام کے مفادات و منافع بھی حاصل ہوں۔ شرکاء کو تشویش ہے کہ جائز کے ساتھ ناجائز کا استعمال ہو جائے تو فتنہ ہوگا۔ یہ تیقظ و احتیاط مستقبل کے فتنوں کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سختی اور وسعت جو کچھ ہو محدود شرع کے اندر ہو۔ کوئی جائز ضرورت نکل رہی ہو تو بہر حال یہ احتیاط ہونی چاہیے کہ غلط کار لوگ غلط استعمال نہ کریں۔ یہ دوسری فکر ہے۔ دونوں فکر کے علماء نے مل کر تجاویز مرتب کیا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب:

میں حضرت امیر شریعت کرناٹک، اکیڈمی کے ذمہ داروں اور سیمینار کے انتظام کاروں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ سیمینار تو قریب سے زیادہ کامیاب رہا۔ مجھے فخر ہے کہ شرکاء نے فقہ اسلامی پر گہری نظر اور تندہی سے مطالعہ کیا۔

ایک زمانہ میں یمن کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اور اب ہندوستان کو سب سے بڑا مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا کارنامہ ہے۔

آئندہ سیمینار حدیث و فقہ کے تقابلی مطالعہ اور اس تقابلی مطالعہ سے پیدا شدہ مسائل پر منعقد ہو تو بڑی چیز ہوگی۔

پوری تاریخ میں ”حجۃ اللہ البالغہ“ کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

☆☆☆



علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ  
جدید فقہی مباحث

# دُکانِ مُکان کی پگڑی کا حکم

☆..... مکانات اور دکانوں کی پگڑی سے متعلق مسائل  
☆..... پگڑی کا تعارف اور اس کی وجوہات و اثرات

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دَارُالاشَاعِرَات

اُردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی پاکستان





## اکیڑی کا فیصلہ:

## پگڑی کا مسئلہ

پگڑی کے مسئلہ پر شرکاء سمینار نے درج ذیل تجاویز بالاتفاق منظور کیں:

اس اجتماع کا احساس یہ ہے کہ پگڑی کے موجودہ رواج کو پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن بڑے شہروں میں طویل عرصہ سے یہ رواج جاری ہے کہ مکانات اور دکانوں کو کرایہ پر دیتے وقت پگڑی کے نام پر رقم لی جاتی ہے اور کرایہ دار بطور خود یا مالک کی رضامندی کے ساتھ دکان دوسرے شخص کو کرایہ پر دیتا ہے۔ پھر یہ رواج پڑ گیا ہے کہ کرایہ داری کا یہ حق موروثی تسلیم کیا جاتا ہے اور عام طور پر یہ نساء بعد نسل جاری رہتا ہے۔ سرکاری قوانین پگڑی کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ ”رنٹ ریگولیشن ایکٹس“ کے ذریعہ کرایہ کے مقدار پر بھی حد بندیاں عائد کی گئی ہیں، اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کرایہ داری کے حقوق کو مالکانہ حقوق کی حیثیت دینے کا رجحان ان قانون سازیوں میں پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی مالک کرایہ پر مکان یا دکان دیتے وقت ہی زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ اگر مالکان کو کھلی چھوٹ دے دی جائے کہ وہ جب چاہیں کرایہ داروں سے مکانات اور دکانیں خالی کرالیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان بڑے شہروں میں لاکھوں افراد ٹپا تھ پر پھینک دیئے جائیں، اور لاکھوں افراد کی تجارتیں ختم ہو جائیں اور وہ وسائل معاش سے محروم ہو جائیں۔ اس اجتماع میں مالک کے مالکانہ حقوق اور کرایہ داروں کی دشواریوں اور پھر سماج پر اس کے پڑنے والے اثرات اور اس رواج کے تاریخی اور معاشی عوامل کا جائزہ لیا گیا۔ اور آج کے دور میں کرایہ داری کی مختلف رائج صورتوں پر بھی غور کیا گیا۔

مدت معینہ کے لئے مکان کرایہ پر دینا، مدت کے اندر مکان خالی کرانے کی کوشش، مدت گزرنے کے بعد مکان خالی کرنے کا مطالبہ، کرایہ دار کا دوسرے کرایہ دار کو مکان کرایہ پر لگا دینا، بغیر تعیین مدت پگڑی لے کر مکان کرایہ پر دینا، اور اس طرح کی دوسری صورتوں پر بھی غور کیا گیا۔



## پگڑی کا مسئلہ / وجوہات و اثرات

جناب طاہر بیگ

زمین، دوکان یا مکان وغیرہ پر وصول کی جانے والی پگڑی جسے لوگ سلامی بھی کہتے ہیں، ایک سماجی و معاشی مسئلہ ہے۔ جیسے جیسے ہمارا ملک صنعتی و تجارتی ترقی کی طرف گامزن ہوتا جا رہا ہے، پگڑی کے رواج میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں جہاں صنعتی و تجارتی سرگرمیاں تیز نہیں ہوتی ہیں، ابھی پگڑی کا مسئلہ نہیں ابھرا ہے۔ دیہاتوں اور پسماندہ قصبات نیز ترقی یافتہ شہروں کے بھی پسماندہ علاقوں میں زمین و عمارتیں یوں ہی عام کرائے کے عوض حاصل ہونے میں کوئی دشواری نہیں آتی۔ مگر جیسے جیسے ترقی پذیر قصبوں سے بڑے شہروں کی طرف رجوع کریں پگڑی دامن کو پکڑنے لگتی ہے۔ پگڑی کا رواج سب سے زیادہ ان شہروں میں ہے جو ملک کے اہم ترین شہر کہلاتے ہیں۔ یہاں پگڑی کی جیب پر پکڑ بھی بہت سخت ہے۔ یعنی شرح کے لحاظ سے دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس جیسے شہر میں پگڑی بہت اونچی وصول کی جاتی ہے۔ ان شہروں میں معمولی رقبہ کی زمین اور معمولی لاگت کی عمارت کی صرف پگڑی ہی اتنی ہوتی ہے کہ دوسرے چھوٹے شہروں میں وہی جائیداد اس سے بہت کم رقم میں خریدی جاسکتی ہے یا تعمیر کرائی جاسکتی ہے۔

پگڑی ایک اضافی رقم ہے جو کرایہ کے علاوہ وصول کی جاتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ پگڑی انسان کے سر سے کھسک کر جیب میں کب داخل ہوئی؟ مگر پگڑی کی اس ہجرت کو اردو ادب تسلیم ضرور کرتا ہے۔ فیروز اللغات میں پگڑی ایک قسم کے محصول اور ایک ناجائز رقم کے معنی میں تحریر ہے اور انگلش میں اس کو (Rent Premium) کہنا موزوں ہوگا، باوجود اس کے کہ مغرب کی ترقی یافتہ معیشتوں میں اس کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔

پگڑی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کے بطور ہم اس کی مندرجہ ذیل تعریف واضح کر سکتے ہیں۔

”پگڑی وہ اضافی اور ناقابل واپسی نوعیت کی رقم یا مالی فائدہ ہے جو کسی زمین یا عمارت کا مالک کرایہ دار سے قانونی یا روایتی شرح کرایہ کے علاوہ یکمشت یا قسط وار حاصل کرتا ہے اور جسے عام طور پر تحریر میں نہیں لایا جاتا اور نہ ہی حسابات میں درج کیا جاتا ہے“۔

پگڑی کی یہ تعریف ذرا محدود معلوم ہوتی ہے۔ دراصل اس محدود نوعیت کی تعریف کا انتخاب اس مقصد سے کیا گیا ہے تاکہ پگڑی کے مسئلہ کی جوہری خصوصیت گرفت میں آسکے۔ اس تعریف کے اہم نکتے یہ ہیں کہ پگڑی ایک مالی لین دین (Financial Transaction) ہے جو ابتدائی طور سے ایسے دو فریقوں کے درمیان واقع ہوتا ہے جن میں ایک جائیداد کا مالک اور دوسرا کرایہ دار ہے۔ دوئم یہ کہ رقم کا بہاؤ ابتدائی طور سے کرایہ دار سے مالک کی جانب ہے۔ تیسرا اور اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ پگڑی کی رقم ایک اضافی معاوضہ ہے جو زمین یا عمارت کے استعمال کے عوض ہی وصول کی جاتی ہے، جبکہ استعمال کا معاوضہ کرایہ کے شکل میں بھی ساتھ ہی ساتھ وصول کیا جاتا ہے؛ یعنی پگڑی الگ سے کسی خدمت کا صلہ نہیں ہے۔ پگڑی کی اس جوہری شکل کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شکلیں اور بھی رائج ہیں:

۱- وہ رقم جو جائیداد کا مالک اپنے کرایہ دار کو اس سے اپنی جائیداد کا دخل اور کرایہ داری واپس لینے کے صلہ کے بطور ادا کرتا ہے۔

۲- وہ رقم جو ایک کرایہ دار جائیداد کا دخل دوسرے کرایہ دار کو دینے کے عوض دوسرے کرایہ دار سے وصول کرتا ہے چاہے اس کے ساتھ جائیداد کے مالک کی مرضی کے تحت کرایہ داری بھی منتقل ہو یا نہ ہو۔

یہ دو شکلیں پگڑی کے بنیادی معاملہ سے تھوڑا سا مختلف ہیں۔ ان کا الگ سے تجزیہ کرنا مناسب ہوگا۔ ہم سب سے پہلے پگڑی کی بنیادی شکل کا تجزیہ کریں گے۔



یہ حقیقت ہے کہ پگڑی بظاہر ایک اضافی رقم ہے جو کرایہ سے الگ وصول کی جاتی ہے اور پگڑی کے عوض ایسی کوئی سہولت بھی مہیا نہیں ہوتی جسے یہ کہا جائے کہ پگڑی اس سہولت کا صلہ ہے۔ یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب زمین یا عمارت کی خدمات کا صلہ کرایہ کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے تو آخر اس اضافی رقم کا جواز کیا ہے؟

غور کریں تو اس جواز کی تلاش صرف دو امکانات میں کی جاسکتی ہے۔ پہلا امکان تو یہ ہے کہ مروج کرایہ (Prevalent Rent) زمین یا عمارت کے استعمال کے معاوضہ کی مکمل ادائیگی کرنے سے قاصر ہو۔ دوسرا امکان یہ ہو سکتا ہے کہ پگڑی کسی ایسی سہولت کا ذریعہ ہو جو بظاہر نظر نہیں آتی، لیکن حقیقت میں کرایہ دار اور مالک جائیداد دونوں ہی اس ”سہولت“ کا احساس ذہن میں رکھتے ہیں۔

پہلے امکان کے معنی یہ ہوں گے کہ زمین اور عمارت کے استعمال کا حقیقی معاوضہ (Real Reward) کچھ اور ہو اور قانونی مروجہ کرایہ (Legal Prevalent) کچھ اور ہو۔ یعنی حقیقی کرایہ بہت زیادہ اور قانونی مروجہ کرایہ بہت کم ہو۔ اگر صورت حال حقیقت میں یہی ہے تو پگڑی کا جواز فراہم ہو جاتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمین یا عمارت کے حقیقی کرایہ اور مروجہ کرایہ کی شرحوں میں جو فرق ہے، پگڑی کی رقم اس کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہمیں حقیقی کرایہ اور مروجہ کرایہ کی اصطلاحات کی وضاحت بھی کرنا چاہئے۔ حقیقی کرائے سے ہماری مراد وہ کرایہ ہے جو زمین یا عمارت کو معاشی شے تصور کرتے ہوئے خالص معاشی عوامل سے متعین کیا جائے، یعنی طلب و رسد کے اثرات سے جو کرایہ متعین ہوا ہے ہم حقیقی کرایہ کہیں گے۔ اس کے برعکس مروجہ کرایہ وہ کرایہ ہے جو اس علاقے میں جس میں زمین یا عمارت واقع ہے، پہلے سے مروج چلا آتا ہے یا قانونی طور سے متعین ہے۔ ایک عام مشاہدہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ معاشی و سماجی عوامل شرح کرایہ کو ہمیشہ اونچا اٹھانے کا رجحان رکھتے ہیں، جب کہ قانونی عوامل شرح کرایہ کو دبائے رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔

حقیقی شرح کرایہ اور سماجی و معاشی عوامل:

یہ حقیقت کہ معاشی و سماجی عوامل حقیقی شرح کرایہ کو اونچا اٹھانے کا رجحان رکھتے ہیں، مندرجہ ذیل مشاہدات پر مبنی ہے:

۱۔ صنعتی و سماجی ترقی:..... عاملین پیدائش (Factors of Production) میں بنیادی اہمیت کی حامل درحقیقت زمین ہی ہے، خواہ وہ کھیت کے بطور استعمال ہو یا فیکٹریوں، گوداموں، دفاتر کے بطور استعمال ہو۔ لہذا معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ زمین، رہائشی مکانات و تجارتی اغراض کی عمارتوں کی طلب میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ معاشی ترقی کے اثرات سے سماجی ترقی کا رجحان پیدا ہوتا ہے، جو زمین و عمارتوں کی طلب میں مزید اضافہ کا سبب بنتا ہے، اس کے علاوہ آبادی کی افزونی بھی زمین و عمارتوں کے طلبگاریوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ معاشی و سماجی ترقی اپنے ساتھ دیہی آبادی کی شہروں کی طرف مراجعت، نیز علاقوں کی شہر کاری جیسے مظاہر ساتھ لاتی ہے۔ ان سب عوامل کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ زمین و عمارتوں کی طلب میں لگاتار اضافی انتقال (Upward Shift in Demand) واقع ہوتا ہے۔ زمین کی رسد تو قدرتی طور سے محدود ہے اور اگر عمارتوں کی تعمیر اضافہ طلب کا ساتھ نہ دے تو اضافی طلب کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ زمین و عمارتوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا اور جب قیمتوں میں اضافہ ہوگا تو کرایہ میں بھی اضافہ ہونا قدرتی بات ہے۔

۲۔ افراط زر:..... افراط زر، جدید معیشتوں کا سلگتا ہوا مسئلہ ہے۔ افراط زر کی بدولت تمام ہی اشیاء و خدمات کی قیمتوں میں لگاتار اضافہ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جب افراط زر کی بیماری مستقل رہے تو کچھ اشیاء و خدمات کی قیمتوں میں کم شرح سے اضافہ ہوتا ہے، جب کہ کچھ دوسری اشیاء و خدمات کی قیمتیں زیادہ اونچی شرح سے اضافہ پذیر ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت لاگت و فروخت نسبتاً زیادہ تیزی سے اونچی ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح کی اشیاء میں زمین و عمارتیں بھی شامل ہیں۔ لہذا جب زمین و عمارتوں کی قیمتیں دوسری اشیاء کی بہ نسبت اونچی ہو جائیں تو ان کا کرایہ بھی اونچا ہونا غیر فطری بات نہیں ہے۔

۳۔ محل وقوع:..... وہ قطعاً اراضی و عمارتیں جو شہر کے اہم ترین تجارتی یا رہائشی علاقوں میں واقع ہوتی ہیں، ان کی قیمتیں دیگر عام علاقوں کی زمینوں

اور عمارتوں کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے بڑھتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہ زیر وضع جاتی سہولیات (Infra Structural Commercial Facilities) ہیں جو ان علاقوں میں بہ آسانی حاصل ہوتی ہیں، جب کہ پسماندہ علاقوں میں وہ مفقود ہوتی ہیں۔ دراصل ان سہولیات ہی کی خاطر لوگ زیادہ کرایہ کے باوجود بھی ترقی یافتہ علاقوں کی زمینوں اور عمارتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہذا زمینوں اور عمارتوں کا ایک اہم ترین علاقہ میں واقع ہونا بھی ان کی قیمت میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے۔ جب محل وقوع کے اعتبار سے کسی زمین و عمارت کی حقیقی قدر بہت اونچی ہو تو اس کا کرایہ بہت زیادہ ہونا ناگزیر ہے۔

ان عوامل کے ہوتے ہوئے، حقیقی کرایہ کی شرح بہت تیز رفتاری سے اونچی ہوتی جاتی ہے۔

مروجہ کرایہ اور قانونی عوامل:

یہ حقیقت کہ قانونی عوامل شرح کرایہ کو دبائے رکھنے کا باعث بنتے ہیں، مندرجہ ذیل مشاہدات پر مبنی ہے:

۱۔ قانون کرایہ داری:..... کرایہ داری کے قوانین اور کرایہ داری کے معاملات میں انصاف کا عمل اور عدالتی طریقہ کار بہت زیادہ ناقص ہے۔ شرح کرایہ کے سرکاری تخمینے مہنگائی کے اثرات کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائے جاتے۔ قوانین کرایہ کے تحت کسی زمین و عمارت کا کرایہ بڑھانے کی اجازت کچھ عرصہ پہلے تک نہیں تھی، مگر اب ہر تین سال کی مدت کے بعد کرایہ میں دس فیصد اضافہ قابل اجازت ہے۔ اس کے علاوہ اضافی تعمیر کی صورت میں بھی کرایہ میں معمولی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اضافہ دراصل مہنگائی کے اثرات کو بھی زائل نہیں کر پاتا۔ مثلاً اگر افراط زر کی سالانہ شرح پانچ فیصد بھی ہو تو تین سال کے بعد کرایہ کی حقیقی قدر ۱۵ فیصد گھٹ جائے گی۔ جبکہ قوانین کرایہ کے مطابق اس میں اضافہ محض دس فیصد ہی ہوگا۔ افراط زر کی شرح ۵ فیصد سے بھی اونچی ہو تو یہ فرق مزید بڑھ جائے گا۔ نتیجہ میں مروجہ کرایہ کی شرح بڑھتی نہیں بلکہ اس کی حقیقی (Real Value) لگا تار گھٹتی جاتی ہے۔ یعنی حقیقی قدر کے معنوں میں مروجہ کرایہ بڑھتا ہی نہیں بلکہ گھٹتا جاتا ہے۔

۲۔ ہاؤس ٹیکس:..... مروجہ کرایہ کو حقیقی کرایہ کی سطح تک بلند ہونے سے روکنے میں ہاؤس ٹیکس کو بھی کافی حد تک دخل ہے۔ دہلی میں کرایہ کا ۳۸/۴۰ فیصد تک ہاؤس ٹیکس کے بطور ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر مالک جائیداد حقیقی کرایہ اندراج میں لائے تو اس کو بہت نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ کرایہ کا ایک بڑا حصہ سرکاری مالیات میں جمع ہوگا اور اس کے اپنے پاس نہ آئے گا۔ اب اگر کرایہ دار نا دہندگی کا شعرا اختیار کر لے، تب تو مالک جائیداد کسی آمدنی کو حاصل کرنے کے بجائے خسارہ میں چلا جائے گا۔ اس کو کرایہ کا ۳۸/۴۰ فیصد حصہ سرکاری مالیات میں جمع کرنا ہی ہوگا، خواہ اسے کرایہ وصول ہو رہا ہو یا نہ ہو۔ لگ بھگ یہی صورت حال پورے ملک میں ہے، لہذا مروجہ کرایہ کم سے کم سطح تک رہتا ہے۔

۳۔ انکم ٹیکس:..... ہاؤس ٹیکس کے علاوہ، انکم ٹیکس بھی مروجہ کرایہ کی شرح کو دبائے رکھنے کا سبب ہے۔ ہاؤس ٹیکس کی ادائیگی کے بعد باقی بچنے والے کرایہ پر آمدنی ٹیکس لاگو ہوتا ہے، جو لگ بھگ ۵۲/۵۰ فیصد ہوتا ہے مروجہ کرایہ اگر حقیقی کرایہ کے مساوی درج کیا جائے تو کرایہ پر آمدنی کا بڑا حصہ ہاؤس ٹیکس کے بعد، انکم ٹیکس کی شکل میں نکل جائے گا۔ لہذا جائیدادوں کے مالک اس بات کو انتہائی نقصان دہ سمجھتے ہیں کہ کرایہ کا زیادہ اندراج کیا جائے۔ انکم ٹیکس کی صورت میں بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کرایہ جاتی آمدنی اگر حسابات میں کسی بھی سطح پر درج ہوگی تو محکمہ انکم ٹیکس اس میں کسی کٹوتی یا نا دہندگی کو منظور نہیں کر سکتا۔ خواہ کرایہ دار کرایہ دے یا نہ دے، جائیداد کے مالک کو کرایہ پر واجب الادا ٹیکس ہر حال میں جمع کرنا ہوگا۔

۴۔ دولت ٹیکس:..... انکم ٹیکس و ہاؤس ٹیکس کے ساتھ ہی جائیداد، جو کسی آمدنی کا ذریعہ ہے، دولت ٹیکس کی زد میں بھی آتی ہے۔ دولت ٹیکس، کرایہ جاتی آمدنی کی مقدار پر نہیں، بلکہ جائیداد کی اصل قیمت کے مطابق لگتا ہے اور محکمہ انکم ٹیکس جائیداد کی قیمت، اس سے حاصل ہونے والی کرایہ جاتی آمدنی سے متعین کرتا ہے۔ جو کرایہ جاتی آمدنی کے دس گنا سے بھی زیادہ لگائی جاتی ہے۔ اب اگر مروجہ کرایہ حقیقی کرایہ کے مساوی اندراج کیا جائے تو دولت ٹیکس کی جو رقم متعین ہوگی وہ اس قدر ہوگی کہ ہاؤس ٹیکس اور انکم ٹیکس کی ادائیگی کے بعد بچی کچھی آمد سے پوری نہ ہو سکے گی بلکہ جائیداد کا مالک کچھ اور رقم اپنی جیب سے ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔

یہ حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا تمام قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے زمینوں و عمارتوں کو حقیقی کرایہ کی شرح پر اٹھانا، حتمی طور سے ایک نقصان دہ تجارت ہے۔



یہ امکان کہ حقیقی شرح کرایہ اور مروجہ شرح کرایہ کے درمیان ایک خلیج پائی جاتی ہے، اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ ہم پورے وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پگڑی، حقیقی شرح کرایہ اور مروجہ شرح کرایہ کی خلیج کو پُر کرنے کا ذریعہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس خلیج کو پُر کرنے کا حق جائیداد کے مالک کو ہے یا نہیں، تو جائیداد کے مالک کا اپنی جائیداد سے منفعت حاصل کرنے کا حق چھیننا نہیں جاسکتا۔ اگر قوانین بلا واسطہ طور سے جائیداد کے مالکین کو اپنی جائیدادوں سے مالی استفادہ کرنے سے روکیں گے تو اس سے بہت سارے فتنے پیدا ہوں گے۔ پگڑی جو غیر اندراج شدہ آمدنی کی شکل کی وجہ سے سیاہ آمدنی (Black Income) کے زمرہ میں آتی ہے، وہ ایسا ہی ایک فتنہ ہے۔ لیکن اس کی پیدائش کا ذمہ دار نہ تو جائیداد کا مالک ہے اور نہ کرایہ دار۔ یہ تو غیر منصفانہ، استحصالی اور جاہلانہ نظم معیشت و مالیات کی ناجائز اولاد ہے، جسے معاشرہ مجبوراً پال پوس رہا ہے۔ حال کے سماجی، اقتصادی اور قانونی ڈھانچہ کی موجودگی میں پگڑی ایک سائنسی و منطقی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے تانے بانے جائیداد کے مالک اور کرایہ دار تک محدود نہیں ہیں، بلکہ حکومت کے مالیاتی، عدالتی اور معاشی نظاموں تک میں پیوست ہیں۔

اگر پگڑی کا مسئلہ ختم کرنا ہے، تو سماجی و معاشی عوامل جو حقیقی شرح کرایہ کو بہت زیادہ بلند کرنے کا سبب ہیں کنٹرول کئے جانے چاہئیں۔ اس کے لئے افراط زر کو محدود کرنا ہوگا۔ عمارتوں کی رسد بڑھانا ہوگی اور اقتصادی ترقی کو علاقوں اور شہروں میں حد سے زیادہ مرکوز ہونے سے روکنا ہوگا۔ اسی طرح وہ عوامل جو مروجہ شرح کرایہ کو دبائے رکھتے ہیں، ان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ کرایہ داری کے قوانین، ہاؤس ٹیکس، انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس کے نظام کی جاہریت ختم کرنا ہوگی، انہیں منصفانہ اور متوازن بنانا ہوگا۔

اب ہم پگڑی کے جواز کی تلاش میں دوسرے امکان کی طرف آتے ہیں جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ یعنی یہ امکان کہ پگڑی کسی ایسی ”سہولت“ کا ذریعہ ہو جو بظاہر نظر نہیں آتی لیکن حقیقت میں جائیداد کا مالک اور کرایہ دار دونوں ہی اس ”سہولت“ کا احساس ذہن میں رکھتے ہوں۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، کرایہ داری کے قوانین اور عدالتی نظام، انتہائی ناقص نوعیت کے ہیں۔ ان کے غیر متوازن ہونے کے بدولت، ایک کرایہ دار عملی طور سے جائیداد کا مالک سا ہو جاتا ہے۔ کرایہ دار کی نادہندگی کی وجہ سے یا جائیداد کو ذاتی استعمال میں لانے کی حاجت کی صورت میں اگر جائیداد کا مالک قانونی چارہ جوئی کرے تو یہ ایک انتہائی مہنگی اور لمبے عرصہ تک چلنے والی کارروائی ہوتی ہے، جس کا فائدہ کرایہ دار کو پہنچتا ہے۔ جائیداد کا مالک سراسر نقصان میں رہتا ہے۔ کرایہ داروں کے جارحانہ اور نقصان دہ ممکنہ اقدامات سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے بطور بھی پگڑی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں پگڑی، جائیداد کے مالک کو حفاظت کی سہولت مہیا کرتی ہے۔

دوسری طرف کرایہ دار کو یہ سہولت رہتی ہے کہ وہ جب زمین یا عمارت واپس کرے تو اس کو پگڑی کی رقم واپس مل جاتی ہے۔ خود جائیداد کا مالک اسے پگڑی کی پیشکش کرتا ہے، یا وہ چاہے تو کسی دوسرے کرایہ دار سے معاملہ کر لے۔ پگڑی کی ان دو شکلوں کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اس پہلو کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ وقت کے ساتھ پگڑی کی رقم میں اضافہ واقع ہوتا ہے۔ لہذا یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ کرایہ دار، جائیداد کا قبضہ، اس کے مالک کو لوٹاتے وقت، یا کسی دیگر کرایہ دار کو مالک کی مرضی کے خلاف دیتے وقت جو رقم پگڑی میں حاصل کرتا ہے، وہ اس کے اپنے ذریعہ دی گئی پگڑی کی رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کرایہ دار کو یہ اضافی پگڑی حاصل کرنے کا حق ہے؟ کرایہ دار کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ اس کا حق دار معلوم ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی زمین یا عمارت کہیں اور کرایہ پر لینا چاہے تو کچھ عرصہ قبل والی پگڑی کی شرح پر نہیں ملے گی۔ لہذا اسے اپنے پاس سے اضافی پگڑی کا انتظام کرنا ہوگا۔ جائیداد کے مالک کے نقطہ نظر سے بھی یہ سودا نقصان کا نہیں معلوم ہوتا۔ جائیداد کی کرایہ داری تبدیل ہوتے وقت جسے رسید بدلوانا بھی کہا جاتا ہے۔ جائیداد کے مالک کو کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر اضافی پگڑی کی ۲۰ سے ۵۰ فیصد کی رقم جائیداد کے مالک کو حاصل ہوتی ہے۔ بقایا رقم جانے والا کرایہ حاصل کرتا ہے۔ اس اضافی پگڑی کا سارا بوجھ آنے والے کرایہ دار پر پڑتا ہے۔ لیکن وہ بھی پُر امید ہوتا ہے کہ جب وہ جائے گا تو اسے اتنی پگڑی، اور مزید اضافی پگڑی مل جائے گی۔ اس طرح بظاہر اس میں ملوث کسی فریق کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

لیکن پگڑی کے وہ اثرات جو معاشرہ اور معیشت پر پڑتے ہیں، وہ بہت نقصان دہ ہیں اور اجتماعی مفاد کے خلاف ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو مد نظر رکھنا ہوگا کہ رہائش انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ عمارتوں کی پگڑی اتنی بڑھ چکی ہے کہ محنت کش اور متوسط طبقہ کے افراد کے لئے اپنے روزگار کی



جگہوں پر مناسب رہائش کا حصول نیز تجارتی سرگرمیوں میں شمولیت بہت بڑے مسائل کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ پگڑی کی بدولت ہی بڑے بڑے شہروں میں سلم علاقے، جھگی جھونپڑیاں وغیرہ وجود میں آتی ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ جو مسائل کے لحاظ سے کمزور ہیں، معاشی دوڑ میں شامل ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پگڑی، ارتکاز دولت کا ذریعہ بھی بن رہی ہے۔ وہ لوگ جن کے پاس سیاہ دولت کے انبار ہیں، زمینوں و عمارتوں کی تجارت کر کے اس میں زبردست اضافہ کر رہے ہیں۔ سیاہ دولت کا بہاؤ زمینوں و عمارتوں جیسی اشیاء کی طرف بہت زیادہ ہے۔ اس کے نتیجے میں فطری طلب و رسد متاثر ہو رہے ہیں۔ زمینوں و عمارتوں کی قیمت کے بجائے غیر فطری انتہائی اونچی قیمت متعین ہو رہی ہے۔ عام انسانوں کی رہائش جیسی اہم اور بنیادی ضرورت پر اس غیر فطری اونچی قیمت کے نہایت منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ لہذا مفاد عامہ کے نقطہ نظر سے پگڑی کے رواج کی توثیق نہیں کی جاسکتی۔

دہلی میں رائج پگڑی کی شکلیں:

۱۔ مالک جائیداد، کرایہ دار سے یکمشت ایک رقم حاصل کرتا ہے، جسے اندراج میں نہیں لایا جاتا، نہ حسابات میں دکھایا جاتا ہے۔ یہ رقم قابل واپسی (Refundable) نہیں ہوتی۔

۲۔ کرایہ دار، جائیداد کا قبضہ، جائیداد کے مالک کو واپس کرتے وقت ایک رقم حاصل کرتا ہے جو دی گئی پگڑی سے زیادہ ہوتی ہے۔

۳۔ کرایہ دار، جائیداد کا قبضہ بغیر مالک کی مرضی کے، کسی دیگر کرایہ دار کو دے دیتا ہے اور صلہ میں ایک رقم حاصل کر لیتا ہے۔

۴۔ کرایہ دار، مالک کی مرضی حاصل کر کے، جائیداد کا قبضہ کسی دیگر کرایہ دار کو دے دیتا ہے اور کرایہ داری منتقل ہو جاتی ہے۔ نئے کرایہ دار سے حاصل ہوئی اضافی پگڑی کی رقم، جائیداد کے مالک اور جانے والے کرایہ دار کے درمیان تقسیم ہو جاتی ہے۔

کلکتہ میں رائج پگڑی کی شکلیں:

کلکتہ میں مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ سیکوریٹی کی شکل میں بھی پگڑی رائج ہے۔ ایک رقم جو واپسی کے قابل ہوتی ہے، جائیداد کا مالک کرایہ دار سے حاصل کرتا ہے اور کرایہ دار سے قبضہ واپس لیتے وقت، اس کی یہ رقم واپس کر دیتا ہے۔ اس میں بھی پگڑی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ کرایہ داری کی مدت کے دوران، اس رقم سے جائیداد کا مالک مالی استفادہ کرتا رہتا ہے، جب کہ افراط زر کی بدولت واپسی کے وقت کرایہ دار کو اپنے ذریعہ ادا کی گئی سیکوریٹی کی رقم کی حقیقی قدر گھٹی ہوئی ملتی ہے۔ اس طرح مالی افادہ، کرایہ دار سے جائیداد کے مالک کی جانب منتقل ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ کرایہ دار اس گھٹی ہوئی حقیقی قدر کے عوض اتنی ہی زمین یا عمارت کو کرایہ پر حاصل نہیں کر پاتا۔



## کرایہ داری میں پگڑی یا اسلامی اور اسلام

مشتاق احمد

اسلام اس آمدنی یا کمائی کو سخت ناپسند کرتا ہے جو گھر بیٹھے بغیر محنت اور پسینہ کے حاصل ہو جائے اسلامی رو سے وہ رقم بھی ناجائز اور حرام ہے جو دوسروں کے استحصال سے حاصل کی گئی ہو۔ سود اس لئے حرام ہے کہ سود لینے والے کو بغیر محنت کے آمدنی آتی رہتی ہے، وہ کسی دوسرے کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا ہے اور سود دینے والا استحصال کی ایک ایسی عمیق گہرائی میں گر جاتا ہے جہاں سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ کسی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر دولت اکٹھا کرنا حرام ہے۔

ہمیں اس وسیع مناظر میں یہ دیکھنا ہے کہ مکان یا دکان کو کرایہ داری پر دیتے وقت مالک مکان جو رقم پگڑی یا اسلامی کے طور پر کرایہ دار سے وصول کرتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ پگڑی کی رقم کرایہ کی رقم کے علاوہ ہوتی ہے جس کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔

پگڑی یا پریمیم (Premium) کی رقم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں: ایک تو وہ قسم ہے جس کا اوپر تذکرہ ہوا ہے یعنی کرایہ پر دیتے وقت مکان مالک پگڑی یا اسلامی کے طور پر وصول کرتا ہے، جسے وہ کسی بھی حالت میں واپس کرنے کا مجاز نہیں اور جس کی کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوتی۔ یہاں کرایہ دار کی مجبوری اور ضرورت کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے، چونکہ وہ مجبور اور ضرورت مند ہے، اس لئے بادل نحو استہ مکان مالک کے شرط کو کسی بھی حالت میں پورا کرتا ہے۔

دوسری شکل وہ ہے جسے ضمانت (Security) یا ڈیپازٹ (Deposit) کہتے ہیں۔ جو عام طور سے بمبئی میں رائج ہے۔ اس کے تحت مکان مالک اور کرایہ دار میں معاہدہ ہوتا ہے اور طے شدہ کرایہ کے علاوہ ایک رقم دی جاتی ہے۔ (Commercialisation) نے اس سسٹم کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس کے خلاف قانون ہونے کے باوجود بھی پگڑی کی رقم لی اور دی جاتی ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ قانونی طور پر ہندوستان میں اس کو کوئی حیثیت حاصل ہے یا نہیں؟ کرایہ داری کے سلسلے میں ہندوستان میں یکساں قانون نہیں ہے۔ ہر صوبہ کا اس سلسلے میں الگ الگ قانون ہے۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام صوبوں کے قوانین کرایہ داری کی بنیاد قریب قریب ایک ہے۔ مختصر یہ کہ کلی طور پر ایک، اور جزوی باتوں میں مختلف۔ آئیے اس سلسلے میں کچھ صوبوں کے قانون کرایہ داری کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ پگڑی یا اسلامی کی رقم کو کیسے غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

### The Delhi Rent Control Act, 1958

دفعہ ۱۶ (۴):..... کوئی بھی مکان مالک کسی بھی طرح کا پریمیم پگڑی یا اور کوئی رقم کسی بھی نام سے نقد یا دوسری شکل میں حاصل کرنے کا مجاز نہیں ہوگا، صرف اس بات کے لئے کہ اپنے کرایہ دار کو دوسرے کرایہ دار (Subtenant) رکھنے کے لئے رضامندی دے۔

دفعہ ۵ (۲) الف:..... کوئی بھی آدمی کرایہ پر دینے، مدت ختم ہو جانے کے بعد پھر سے مدت بڑھانے اور کرایہ داری کو جاری رکھنے کے لئے کسی بھی طرح کا پریمیم یا پگڑی اور کوئی رقم کسی بھی نام پر نقد یا دوسری شکل میں لینے یا وصول کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ کرایہ کے علاوہ۔

دفعہ ۴۸ (۱) ب:..... چھ مہینے کی قید یا جرمانہ کی رقم غیر قانونی طریقے سے لی گئی رقم (پگڑی) کی رو سے پانچ ہزار روپے سے زائد ہو سکتی ہے۔

### The Bihar Building (Lease, Rent & Eviction) Control Act, 1982

دفعہ ۳ (۳):..... پریمیم، اسلامی اور پیشگی (ایک ماہ کے کرایہ سے زیادہ) مکان مالک کرایہ داری پر دینے کے لئے یا کرایہ داری کو پھر سے زندہ کرنے یا جاری رکھنے

ع ایزڈ کیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا۔



کے لئے کرایہ دار سے نہیں مانگ سکتا۔

دفعہ (۲۸):..... سزا بی اگر کوئی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پریمیم، سلامی یا پیشگی وغیرہ لیتا ہے تو اس کی دو سال تک کی سزا ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ مکان مالک کرایہ دار سے مکان یا دکان کی قیمت، اہمیت اور افادیت کے مطابق ایک رقم (Deposit) کے طور پر یا (Security) کے طور پر لیتا ہے۔ یہ سیکورٹی اس بات کی ہوتی ہے کہ کرایہ دار مکان خالی کر دے گا اور جب خالی کر دے گا تو ضمانت کی یہ رقم اسے واپس مل جائے گی۔ ایک طرح سے یہ سسٹم (Balance Check) کا کام کرتا ہے۔ مکان مالک کرایہ کے رقم کو تصرف میں لاتا ہے اور کرایہ دار مکان مالک کے مکان یا دکان کو۔ اس سسٹم میں کرایہ کی رقم عام طور سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مکان مالک اور کرایہ دار میں جو عام طور سے دو تین سال کے بعد جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور اختلافات بڑھتے بڑھتے فوجداری مقدمات اور قتل کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں وہ بہت حد تک ختم ہو جاتے ہیں۔

ڈیپازٹ یا ضمانت کی رقم کی لکھا پڑی ہوتی ہے۔ باضابطہ معاہدہ میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔

لیکن پگڑی یا سلامی کی اصل شکل وہ ہے جس کا کرایہ نامہ یا معاہدہ نامہ میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ یہ دراصل جاگیر دارانہ نظام کی دین ہے۔ جب غریب اور ضرورت مند آدمی جاگیر دار یا زمیندار کے پاس اس کا مکان یا دکان کرایہ پر لینے جاتا تھا تو سب سے پہلے اس کا مکان مالک کے جاگیر دارانہ حیثیت کو صرف ہاتھ کی سلامی سے ہی نہیں، بلکہ رقم کی سلامی سے بھی قبول کرنا پڑتا تھا، یا پگڑی کی رقم دے کر ساہوکار کی پگڑی کا احترام کرنا پڑتا تھا۔

چوں کہ یہ رقم ساہوکار کی پگڑی کے احترام میں اور جاگیر دار یا زمیندار کی سلامی کے طور پر دی جاتی تھی، اس لئے اس کا کوئی حساب ہی نہیں ہوتا تھا۔ واپس لینے یا دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ چاہے کرایہ دار مکان میں رہے یا تھوڑے دنوں کے بعد ہی چلا جائے۔

پگڑی یا سلامی کی یہ شکل نہایت استحالی اور غیر اسلامی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس رقم کا کوئی حساب کتاب نہیں اور جو رقم کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے حاصل کی جائے اسے اسلام جیسا منصف مذہب کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اسلام جس طرح کا مثالی نظام قائم کرنا چاہتا ہے، یہ سسٹم اس کے خلاف ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پگڑی یا سلامی کی یہ روایت کس حد تک ہندوستان میں رائج ہے۔

A.P. Buildings (Lease, Rent & Eviction) Control Act, 1960

دفعہ ۷:..... مکان مالک مناسب کرایہ کے علاوہ کوئی چیز کرایہ دار سے نہیں مانگ سکتا۔

سزا:..... دو ہزار روپے تک کا جرمانہ

The Haryana Urban (Control of Rent & Eviction) Act, 1923

دفعہ ۶ (الف):..... مکان مالک مناسب کرایہ کے علاوہ اور کوئی رقم کسی بھی شکل میں لینے کا مجاز نہیں ہوگا۔

(ب)..... اگر مناسب کرایہ کے علاوہ کوئی اور رقم جیسے پگڑی، پریمیم کے لئے معاہدہ ہوتا ہے تو ایسا معاہدہ باطل اور کالعدم قرار پائے گا۔

دفعہ ۲۲ سزا:..... دو سال قید کی سزا یا جرمانہ یا دونوں۔

The J&K Houses & Shops Rent Control Act, 1966

دفعہ:..... پریمیم پگڑی یا فائن مناسب کرایہ کے علاوہ مکان مالک کرایہ دار سے طلب نہیں کر سکتا۔

دفعہ ۲۲ سزا:..... اگر پہلی بار غلطی سرزد ہوئی ہے تو جتنی پگڑی کی رقم لی ہے، اس کا پانچ گنا جرمانہ اور اگر دوسری بار اسی مکان یا دوسرے مکان یا مکان کے سلسلے میں غلطی سرزد ہوتی ہے تو پریمیم کا دس گنا جرمانہ پڑے گا۔



## The Bombay Rents Hotels &amp; Lodging House Rates Control Act, 1947

دفعہ ۱۸:..... پریمیم، ڈیپازٹ

سزا:..... چھ ماہ یا جرمانہ کی رقم پریمیم سے کم نہ ہوگی، اگر مکان مالک سے غلطی سرزد ہوتی ہے جب (Ownership) اس کی تھی تو مکان قرق ہو جائے گا۔

## The Orissa House Rent Control Act, 1967

دفعہ ۳:..... مکان مالک اسلامی یا کسی طرح کا پریمیم مناسب کرایہ کے علاوہ کا مجاز نہیں ہوگا۔

دفعہ ۷:..... چھ ماہ کی سزا یا دو ہزار روپے کا جرمانہ یا دونوں۔

## The Tripura Buildings (Lease &amp; Rent Control) Act, 1975

دفعہ ۹:..... مکان مالک مناسب کرایہ کے علاوہ پریمیم یا پگڑی لینے کا مجاز نہیں ہوگا۔

دفعہ ۱۳:..... سزا: ایک ہزار روپے تک کا جرمانہ اور نہ ادا کرنے کی صورت میں ایک ماہ قید کی سزا۔

## W.B. Premises Tenancy Act, 1956

دفعہ ۵:..... کوئی بھی مکان مالک مناسب کرایہ کے علاوہ کرایہ دار سے پریمیم، پگڑی یا اسلامی نہیں مانگ سکتا۔

## The Tamil Nadu Buildings (Lease &amp; Rent Control) Act, 1960

دفعہ ۷:..... مکان مالک مناسب کرایہ کے علاوہ اور کوئی رقم کسی بھی نام پر طلب کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔

دفعہ ۳۳:..... دو ہزار روپے تک جرمانہ

## The U.P. Urban Buildings (Regulation of Letting Rent &amp; Eviction) Act, 1972

دفعہ ۴:..... مکان مالک مناسب کرایہ کے علاوہ پریمیم طلب کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔

دفعہ ۳۱:..... سزا: جو جرمانہ کی رقم ہوگی اس میں سے جو پریمیم اس نے لیا تھا، وہ واپس کر دیا جائے گا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صوبے کے قانون کرایہ داری نے پگڑی کی رقم یا اسلامی کی رقم کو غیر قانونی قرار دیا ہے اور اس کے ارتکاب کرنے والے کو سزا بھی مقرر کی گئی ہے۔ کسی صوبہ میں زیادہ اور کسی میں کم۔

☆☆☆

## پگڑی کا مسئلہ / ایک تعارف

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مکان اور دکان، کرایہ پر دینا اور لینا عقد اجارہ ہے۔ جس میں ایک معین مدت کے لئے، مقرر اجرت کے عوض مالک، مکان و دکان سے انتفاع کا حق کرایہ دار کو عطا کر دیتا ہے۔ اس طرح کرایہ دار مکان و دکان سے انتفاع کا مالک ہو جاتا ہے۔ یعنی اصل شئی (رقبہ) کی ملکیت مالک کے حق میں باقی رہتے ہوئے، منافع کی ملکیت کرایہ دار کو حاصل ہو جاتی ہے۔

اجرت روزانہ (میاومہ) ماہانہ (مشاہرہ) اور سالانہ (مساہتہ) یعنی مقررہ اقساط میں بھی ہو سکتی ہے، اور اجرت یک مشت بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔ ہونٹلوں میں ۱۰۰ روپے روزانہ اجرت ہوتی ہے۔ مکانات اور دوکانوں کا کرایہ عام طور پر ماہانہ مقرر ہوتا ہے۔ بعض اوقات کارخانے سالانہ دس ہزار، بیس ہزار کے عوض کرایہ پردے جاتے ہیں، اور کبھی کوئی اراضی، مکان یا کارخانہ، دس سال، پانچ سال کے لئے ۲۵ ہزار، ۵۰ ہزار روپے کے عوض (بلا لحاظ روز، مہینہ، یا سال) کرایہ پر دیا جاتا ہے۔ جس کی ادائیگی کبھی ایک مشت پیشگی ہو جاتی ہے اور کبھی قسطیں بھی باندھ دی جاتی ہیں۔

عقد اجارہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ”معتقود علیہ“ معلوم ہو اور اجرت متعین ہو۔ یعنی اس عقد کے ذریعہ جو منافع کرایہ دار کو حاصل ہونے ہیں وہ متعین اور معروف ہوں۔ ”کسی مکان میں سکونت اور کسی دکان میں تجارت“ وہ ”منافع“ ہے جو کرایہ دار کو حاصل ہوتا ہے اور روپے جو مالک مکان کو ملتے ہیں، اجرت ہے۔ منافع کی نوعیت تو متعین ہے کہ سکونت یا تجارت معلوم و معروف منافع ہے۔ لیکن اگر مدت ذکر نہیں کی جائے تو منافع کی مقدار معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر یوں کہا جائے کہ ”یہ مکان سو روپے کرایہ پر دیا“ تو معلوم نہیں ہوتا کہ کتنے دن کی رہائش کے لئے یہ سو روپے کی اجرت مقرر کی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ مدت واضح کر دی جائے اور بتا دیا جائے کہ سو روپے ایک ماہ کی رہائش کے لئے اجرت ہوگی۔ اس طرح مقدار نفع اور مقدار اجرت متعین ہو جاتی ہے اور ہر ایک ماہ کی رہائش کے عوض ایک سو روپے اجرت کرایہ دار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔ لیکن کیا اس مدت کا اظہار بھی ضروری ہے جتنی مدت کے لئے مکان کرایہ پر دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ ”ایک سال کے لئے مکان سو روپے ماہوار کے عوض کرایہ پر دیا“۔ جہاں تک سوال ”منافع کی مقدار اور اس کے مقابلہ میں واجب ہونے والی اجرت کے تعین“ کا ہے، اس کے لئے مدت اجارہ کا بیان ضروری نہیں۔ لیکن کتنی مدت کے لئے مکان کرایہ پر دیا گیا ہے۔ اس کے مجہول ہونے کی صورت میں آپسی تنازع کا خطرہ ہے کہ مالک مثلاً ایک سال گزرنے کے بعد مکان خالی کرنے کو کہتا ہے اور کرایہ دار اس کے بعد بھی مکان کو خالی کرنا نہیں چاہتا اور ہر وہ جہالت جس کی وجہ سے دو معاملہ کرنے والوں کے درمیان نزاع کا اندیشہ ہو، شرعاً ممنوع ہے۔

لیکن مدت اجارہ کے تعین کے لئے کیا معاملہ کرتے وقت صراحت ضروری ہے یا عرف اور دیگر عوامل کے ذریعہ بھی مدت کی تعیین کافی ہوگی؟ مثلاً دیہاتوں میں جو بازار ہفتہ میں ایک بار متعین دنوں میں لگتے ہیں، یا موسمی میلے جو سال میں ہفتہ دو ہفتہ کے لئے لگتے ہیں، یا شہروں میں مختلف نمائشیں دس پندرہ دنوں کے لئے لگتی ہیں اور ان مواقع پر تاجروں کو اپنی دکانوں کے لئے مثلاً زمین کا محدود حصہ، یا بنی ہوئی دکانیں کرایہ پر دی جاتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں اگرچہ مدت کا تعیین اصل معاملہ میں صراحت نہ ہو، لیکن عرفاً، جو مدت بازار، میلہ اور نمائش کی معین ہو، اس مدت کے لئے یہ کرایہ داری تصور کی جائے گی۔

مکانات اور دکانوں کے کرایہ پر دینے کی چند صورتیں معروف و مروج ہیں۔

پہلی صورت:

تو یہ ہے کہ محدود اور متعین مدت کے لئے مکان یا دکان کرایہ پر دی جائے۔ پھر اس مدت کے مکمل ہونے کے بعد مکان یا دکان خالی کرالی جائے، یا عقد



اجارہ کی تجدید (Renewal) کر لی جائے۔ عام طور پر اس صورت میں پگڑی لینے دینے کا رواج نہیں ہے، البتہ کرایہ کا ایک حصہ پیشگی (Advance) لے لیا جاتا ہے، جو کرایہ میں ماہ بمہا منھا ہوتا رہتا ہے یا آخری مہینہ میں منھا ہو جاتا ہے۔ ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ (Security Deposit) کے نام پر کچھ رقم لی جاتی ہے، جو مدت کرایہ کے پورا ہونے کے بعد مکان یا دکان خالی کرتے وقت کرایہ دار کو واپس کر دی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت بظاہر رہن کی ہے، جس کا مقصد شاید اطمینان حاصل کرنا ہوتا ہے کہ کرایہ دار ماہ بمہا کرایہ ادا کرتا رہے اور وقت متعین پر مکان خالی کر دے، اور رہن، دزائم و دینار (نقد روپیہ) کا جائز ہے۔ البتہ اس مال مرہونہ سے انتفاع مرتہن کے لئے جائز نہیں کہ یہ مال رہن اس کے پاس امانت ہے۔ البتہ یہ صورت اس لئے قابل غور ہے کہ یہاں رہن کسی قرض کے عوض نہیں کہ اسے کل قرض جز نفعاً فہو حرام کے ذیل میں داخل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عام اصول تو یہ ہے کہ امانات میں نقود و اثمان متعین ہوتے ہیں کہ جو درہم و دینار امانت رکھا ہے وہی واپس کرنے ہوں گے۔ لیکن موجودہ صورت حال میں ایک نوٹ اور دوسرے نوٹ کی مالی قدر میں فرق نہیں ہوتا۔ تو کیا مرتہن پر وہی نوٹ واپس کرنا واجب ہوگا جو اس نے راہن سے لیا ہے، یا کوئی بھی نوٹ جو رہن رکھے ہوئے نوٹ کے مساوی ہو اس کا ادا کرنا ضروری ہوگا۔ پھر یہ کہ اگر مرتہن کے کسی عمل اور غفلت کے بغیر وہ روپے ضائع ہو جائیں تو کیا امانت کے عام اصول کے تحت مرتہن اس کا ضامن نہیں ہوگا یا اسے ضامن قرار دیا جائے گا۔ تو ایسی صورت میں جو ہزار روپے اس کے بطور (Deposit) لئے ہیں، اسے بہر حال مدت پورا ہونے پر کرایہ دار کو واپس کرنا ہے، ایسی صورت میں ضامن قرار دیئے جانے کی وجہ سے الغرم بالغنم کے اصول کی روشنی میں کیا مالک مکان کے لئے کرایہ دار سے لی ہوئی (Deposit) کی رقم سے مصرف لینا جائز ہوگا؟؟

اس ذیل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات اس طرح سیکوریٹی یا ڈیپازٹ لے کر مکان یا دکان خود کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کو دیتا ہے۔ پس یہ صورت بھی اگر مدت کرایہ داری طے ہے، تو اسے جائز ہونا چاہئے کہ فقہاء نے ایک کرایہ دار کو یہ حق دیا ہے کہ وہ دوسرے کو کرایہ پر لگا دے، بشرطیکہ استعمال کی نوعیت مختلف اور مکان کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو۔

اس موقع پر اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ متعین مدت کے لئے متعین کرایہ پر مکان یا دکان دینے کی صورت میں مالک مکان و دکان ماہانہ کرایہ کے علاوہ بھی کچھ رقم وصول کرے، جسے اصطلاح میں پگڑی کہا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں مکان یا دکان خالی کرتے وقت جب کہ مدت پوری ہو چکی ہو، کرایہ دار کے لئے یہ جائز ہوگا یا نہیں کہ وہ پگڑی کی رقم یا اس سے زائد کا مالک سے مطالبہ کرے۔ اسی طرح کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کو اسی معین مدت کے لئے پگڑی اور ماہانہ کرایہ دے دے، تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟؟

### دوسری صورت:

مالک مکان و دکان نے کرایہ دار سے ماہانہ کرایہ طے کیا اور بغیر کسی مدت کی تعیین کے مکان و دکان کرایہ دار کے حوالہ کر دیا۔ قدیم معاملات زیادہ تر اسی نوعیت کے ہیں، اور چھوٹے شہروں اور قصبوں میں جہاں ابھی پگڑی کا فتنہ نہیں پہنچا ہے۔ اسی طرح مکانات کرایہ پر دیئے جاتے ہیں، درمیان میں مالک و کرایہ دار باہمی گفتگو کے ذریعہ کرایہ میں اضافہ بھی کر لیتے ہیں۔ اگر کبھی ضرورت ہوئی تو مالک مکان، کرایہ دار سے مکان خالی بھی کرا لیتا ہے۔ اس میں کچھ زیادہ نزاع بھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے کرایہ داروں کی کثرت اور مکانات کی قلت ہوتی جا رہی ہے اور کرایہ کا بازار بھاؤ پڑھتا جا رہا ہے، ہر کچھ دن پر کرایہ کی تبدیلی کے ذریعہ کرایہ میں اضافہ کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اس صورت میں مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان نزاع پیدا ہوتی ہے کہ مدت متعین نہیں اور مالک، مکان خالی کرانا چاہتے ہیں، کرایہ دار خالی نہیں کرنا چاہتے، کرایہ دار کی اپنی دشواریاں اور مالک مکان کی اپنی مشکلات۔

بہر حال مالک مکان اگر کرایہ پر مکان دیتے وقت مدت متعین نہیں کرتا تو اس کا دو مطلب ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ عندالطلب کرایہ دار کو مکان خالی کرنا ہوگا یا اس نے ہمیشہ کے لئے یہ مکان کرایہ پر دے دیا ہے، اگر عرف کی خاموش زبان کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو اس کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس مالک نے کرایہ پر لگاتے وقت پگڑی لی، اس نے گویا اپنا حق مالکانہ برقرار رکھتے ہوئے حق سکونت فروخت کر دیا، اور یہ حق کرایہ دار کا ایسا حق ہے جو اس سے مالک مکان چھین نہیں سکتا۔ کرایہ دار کے وارثوں میں بھی یہ حق منتقل ہوگا اور کرایہ دار اس حق کو فروخت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کرایہ دار سے پگڑی مالک مکان نے نہیں لی ہے تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ عندالطلب یہ مکان کرایہ دار کو خالی کرنا ہوگا۔ پس جن شہروں میں پگڑی لینے دینے کا رواج ہے وہاں پگڑی لے کر مکان کرایہ پر دینے کا مطلب ملک رقبہ کو باقی رکھتے ہوئے حق انتفاع کو ہمیشہ کے لئے فروخت کر دینا ہے، اس ذیل میں بعض ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ جب پگڑی کاروان نہیں تھا اس وقت جو مکان بغیر پگڑی لئے بغیر تعیین مدت کرایہ پر دیا گیا اور اب طویل مدت گزرنے کے بعد حق سکونی ایک قیمتی مالیت رکھتا ہے اس کرایہ دار



کا یہ قبضہ کیسا تصور کیا جائے گا اور اس کے لئے اس قبضہ کی فروخت کا کیا حکم ہوگا۔

مزید یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کرایہ دار مکان کی مرمت اور اس میں اضافہ کی مد میں جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کا کیا حکم ہوگا؟

پگڑی کا رواج:

کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پگڑی کا یہ رواج قدیم ہے، اور شہری آبادی کے اضافہ اور تہذیبی و معاشی ترقی کی وجہ سے دکان و مکان کی تعداد میں کمی کے نتیجہ میں یہ رجحان بہت پہلے شہروں میں پیدا ہو چکا تھا۔

علامہ زین العابدین ابراہیم ابن نجیم مصری نے جن کی ولادت ۹۲۶ھ اور وفات ۹۷۰ھ میں ہوئی، اپنی مشہور کتاب "الاشباہ والنظائر" میں عرف عام اور عرف خاص کی بحث کے ذیل میں یہ لکھا ہے کہ:

"بہت سے مشائخ نے عرف خاص کو بھی حجت تسلیم کیا ہے، اور اس بنیاد پر میری رائے میں قاہرہ کے بازاروں میں راج خلوا الحوانیت (دکان کی پگڑی) کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا جانا چاہئے اور خلوا کرایہ دار کا ایک حق ہونا چاہئے۔ دکان کے مالک کو اسے نکالنے کا حق نہیں ہونا چاہئے اور نہ دوسرے کو کرایہ پر لگانے کا، اگرچہ وہ دکان جائیداد وقف ہو۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں قاہرہ میں پگڑی کا رواج جڑ پکڑ چکا تھا۔ احمد بن محمد الحموی شارح اشباہ متوفی ۱۰۹۸ھ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن بلال حنفی متوفی ۹۵۷ھ نے اس کے جواز پر مستقل رسالہ لکھا اور حموی کے استاذ نے اس کی تردید میں ایک رسالہ "مفیدۃ الحسنی لدفع ظن الخلو بالسکنی" تحریر فرمایا۔ مالکیہ میں ناصر الدین لقانی مالکی، شہاب الدین احمد سنہوری کے یہاں اس مسئلہ پر بحث ملتی ہے۔ نور الدین علی الاجہوری المالکی المتوفی ۱۰۶۶ھ نے شرح مختصر خلیل باب العاریہ میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ جس سے گیارہویں صدی میں اس رواج کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔ علامہ ناصر الدین لقانی مالکی سے جو استفتاء کیا گیا ہے اس میں خلوا حوانیت کا مختلف شہروں میں معروف ہونا معلوم ہوتا ہے۔ احمد بن محمد بن احمد الدرریر ۱۱۲۷-۱۲۰۱ھ کے یہاں اس مسئلہ کا ذکر آیا ہے، (اقرّب المسالک لمذہب الامام مالک)۔ ابراہیم ریاحی (۱۱۸۰-۱۲۶۶ھ) شیخ محمد بیرم متوفی ۱۲۱۳ھ شیخ محمد سنوی قاضی تونس ۱۲۷۶ھ وغیرہ کئی علماء کے فتاویٰ اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ سلطان غوری کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے غوریہ میں جملوں کی دکان کی تعمیر کے وقت کرایہ داروں سے کچھ رقم لے کر انہیں سکونت دی اور حق خلوا حاصل ہونے کا تحریری وثیقہ دیا۔

پس کتب فقہ و فتاویٰ کے سرسری مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کم از کم دسویں صدی ہجری سے پگڑی کا رواج مختلف علاقوں میں پایا جاتا رہا اور پچھلی تین چار صدیوں میں یہ رواج بڑھتے بڑھتے اکثر اسلامی ممالک کے بڑے شہروں میں اس طرح پھیل گیا ہے کہ اب تمام بڑے شہروں میں بغیر پگڑی کی رقم ادا کئے ہوئے کسی مکان یا دکان کے حصول کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ان حالات میں علماء کے لئے یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ:

- ۱- کرایہ پر مکان یا دکان دیتے وقت طے شدہ ماہانہ کرایہ کے لئے کوئی زائد رقم لینا مالک مکان کے لئے جائز ہے یا نہیں؟
- ۲- اگر پگڑی لی گئی اور مدت اجارہ متعین ہے تو مدت پوری ہونے کے بعد یہ زائد رقم کرایہ دار کو واپس کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟
- ۳- اگر مدت اجارہ متعین نہیں اور پگڑی لے کر مکان کرایہ پر دیا گیا ہے تو مالک مکان کے لئے اس مکان کو خالی کرانے کا حق ہے یا نہیں؟ اور اس تخلیہ کے عوض کرایہ دار مالک سے معاوضہ لے سکتا ہے یا نہیں؟
- ۴- کرایہ دار اپنا یہ حق دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟

☆☆☆

## کرایہ کے مکانات اور دکانوں کی پگڑی کا مسئلہ

مولانا شمس پیرزادہؒ

پگڑی کا رواج بڑے بڑے شہروں میں عام ہو گیا ہے لیکن بمبئی میں تو یہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ یہاں ایک چھوٹے سے کمرہ کے حصول کے لئے بھی لاکھوں روپے پگڑی ادا کرنی پڑتی ہے۔ بغیر پگڑی کے سرچھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں مل سکتی، یہاں تک کہ جھونپڑی کو کرایہ پر حاصل کرنے کے لئے بھی اچھی خاصی رقم پہلے ادا کرنی پڑتی ہے۔ بمبئی کے مرکزی علاقہ میں پرانے مکانوں کے رہائشی کمروں کی پگڑی کاریٹ کم و بیش دو ہزار روپے فی مربع فٹ ہے اور دکانوں کی کاریٹ تو اس سے کہیں بڑھ کر۔

پگڑی قانوناً جائز نہیں:..... بمبئی ریٹ ایکٹ ۱۹۴۷ء کی دفعہ ۱۱۸ اس بات کو جرم قرار دیتی ہے کہ مالک مکان (Land Lord) اسٹینڈرڈ ریٹ (مناسب کرایہ) کے علاوہ کوئی رقم کرایہ داری (Tenancy) کو جاری رکھنے یا نئے کرایہ دار کے نام منتقل کرنے کے لئے وصول کرے۔ اس جرم کی سزا چھ ماہ تک کی قید ہو سکتی ہے، نیز جرمانہ بھی۔ دفعہ کا متن درج ذیل ہے:

2542 Bombay Rents, Hotel and Lodging House Rates (1947; Bom ..... L VII Control Act, 1947.

### Unlawful Charges by landlord

318. (1) If any landlord either himself or through any person acting or purporting to act on his behalf or if any person acting or purporting to act on behalf of the landlord receives any fine, premium or other like sum or deposit of any consideration other than the standard rent or the permitted increases, in respect of the grant, renewal or continuance of a lease of any premises, or for giving his consent to the transfer of a lease by sub-lease or otherwise, such landlord or person shall, on conviction, be punished with imprisonment for a term which may extend to six months and shall also be punished with fine which shall not be less than the amount of the fine, premium or sum or deposit or the value of the consideration received by him, and further where the offence is committed by a landlord in respect of premises which were of his owners on the date of the offence such premises shall be liable to confiscation.

رہا کرایہ دار کا قبضہ کے عوض نئے کرایہ دار سے پگڑی لینا تو قانون کرایہ دار کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ قبضہ کسی اور کرایہ دار کو دیدے، بلکہ مکان خالی کرنے کی صورت میں اسے چاہئے کہ اصل مالک کو لوٹا دے۔ اس لئے کہ کرایہ دار کا نئے کرایہ دار سے قبضہ کے عوض پگڑی وصول کرنا قانون کی نگاہ میں باطل ہے۔

مالکانہ حقوق:..... مروجہ قانون نے مالک مکان (Land Lord) کے مالکانہ حقوق کو محدود کر دیا ہے، چنانچہ اس کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی کرایہ دار کو خالی کرائے بجز بعض استثنائی صورتوں کے جس کے لئے اسے طویل عرصے تک مقدمہ لڑنا پڑتا ہے۔ مالک مکان کو کرایہ میں اضافہ کا بھی اختیار نہیں ہے، اس لئے سالہا

ط بانی ادارہ دعوت القرآن، ممبئی۔



سال سے جو پرانے کرائے چلے آ رہے ہیں وہی وہ وصول کر سکتا ہے، الا یہ کہ اضافہ شدہ ٹیکس اسے وصول کرنا پڑے۔ جہاں تک مکان کو رپیر (درست کرنے) کا تعلق ہے، قانون نے مالک کی ذمہ داری کو اس حد تک کم کر دیا ہے کہ اب عملاً اس کو کوئی ذمہ داری رہی نہیں ہے۔ مکان کے ڈھانچہ کی مرمت (Structural Repair) کی ذمہ داری رپیر بورڈ (Repair Bord) پر ڈال دی ہے، چنانچہ کرایہ دار سے ہر ماہ مخصوص ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور جب بورڈ کی طرف سے رپیر کا کام انجام پاتا ہے تو بورڈ آئندہ کے لئے ٹیکس میں مزید اضافہ کر دیتا ہے اور یہ ٹیکس کرایہ دار کو کرایہ کی رقم کے ساتھ مالک مکان کو ادا کرنا پڑتا ہے اور مالک مکان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ وصول شدہ ٹیکس بورڈ کو ادا کرے۔

رہی وہ چھوٹی بڑی مرمت جو رہائشی کمرہ یا دکان کے اندر کرنا پڑے، تو یہ کام کرایہ دار کو اپنے خرچ سے کرنا پڑتا ہے۔ گویا مالک مکان کو نہ مرمت پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور نہ وہ مرمت کا ذمہ دار ہے۔

کرایہ دار کی قانونی حیثیت:..... کرایہ دار (Tenant) کو دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک حق کرایہ داری (Tenancy Right) اور دوسرے قبضہ (Possession) یہ دونوں چیزیں کرایہ دار کو بلا تعین مدت حاصل ہوتی ہیں، یعنی نہ اس کی کرایہ داری ختم کی جاسکتی ہے اور نہ اس کو بے دخل کیا جاسکتا ہے، الا یہ کہ اس نے رینٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کی ہو اور مالک مکان کی شکایت پر عدالت اس کے خلاف فیصلہ دے۔ اس طرح قانون نے اسے عملاً مالک بر بنائے قبضہ (Occupant) کی حیثیت دی ہے، مگر قانون اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنا یہ حق دوسرے کو منتقل کر دے۔ اگر کرایہ دار معاوضہ لے کر کسی نئے کرایہ دار کو قبضہ دیتا ہے تو یہ قانون کی نگاہ میں جرم ہے اور اس کی سزا چھ ماہ تک کی قید ہو سکتی ہے، نیز جو رقم وصول کی گئی ہو اس کے بقدر جرمانہ، چنانچہ بمبئی رینٹ ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعہ ۱۹ میں کہا گیا ہے:

## 19. Unlawful Charges by tenant

(1) 1 [Save in cases provided for under the proviso to section 15,] it shall not be lawful for the tenant or any person acting or purporting to act on behalf of the tenant to claim or receive any sum or any consideration as a condition of the relinquishment 2 [transfer or assignment] of his tenancy of any premises.

(2) Any tenement or person who in contravention of the provisions of sub-section (1) receives any sum or consideration shall, on conviction, be punished with imprisonment for a term with fine which shall not be less than the sum or the value of the consideration received by him.

عملی مسئلہ:..... ایک طرف قانون ہے جو اس بات کو جرم قرار دیتا ہے کہ مالک مکان یا کرایہ دار نے کرایہ دار سے پگڑی وصول کرے، اور دوسری طرف پگڑی نے عام رواج کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کوئی کرایہ دار قبضہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو ایک مخصوص رقم نہ مل جائے، اور نہ کوئی مالک مکان کرایہ کابل نئے کرایہ دار کے نام منتقل کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے، جب تک کہ اسے پگڑی کی رقم میں حصہ دار نہ بنایا جائے؛ عام طور سے پگڑی میں مالک مکان کا حصہ ۲۵ فیصد ہوتا ہے۔

جب باہمی سمجھوتہ کے تحت یہ معاملہ تینوں فریق کے درمیان طے پاتا ہے اور لین دین ہو جاتا ہے تو قانون کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جو بے گھر ہے، اپنا سر چھپانے کے لئے کرایہ کی کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو پگڑی دیئے بغیر اس کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ بلکہ ایک جھونپڑی بھی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص مجبوری کی بنا پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا چاہتا ہو تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اپنے کمرہ کی پگڑی لے اور دوسرے کمرے کے لئے پگڑی دے۔

یہی صورت حال دوکانوں کے سلسلہ میں بھی ہے۔



مسجد اور ٹرسٹ کی جو بلڈنگیں ہوتی ہیں وہ بھی پگڑی سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مالک مکان کی جگہ ٹرسٹی پگڑی کا ایک حصہ عطیہ کے طور پر متعلقہ مسجد یا ٹرسٹ کے لئے وصول کرتا ہے اور اس کے بعد ہی بل نئے کرایہ کے نام منتقل کرتا ہے۔

پگڑی شرعی نقطہ نظر سے:..... پگڑی کے رواج پانے میں حالات کا بھی دخل ہے اور غیر واقعت پسندانہ قانون کا بھی۔ اس کے نتیجہ میں صورت حال نہایت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ لہذا پگڑی کے مروجہ طریقہ کو معقول اور مناسب (Fair) ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کی جگہ جو نیا طریقہ رائج ہو رہا ہے وہ البتہ صحیح ہے اور وہ ہے نئی تعمیر ہونے والی بلڈنگوں میں فلیٹوں کی خرید و فروخت کا طریقہ۔ فلیٹ کا خریدار قانوناً بھی فلیٹ کا مالک ہوتا ہے اور عملاً بھی۔ لیکن یہ سہولت وہیں میسر ہے جہاں نئی بلڈنگ تعمیر ہو رہی ہیں۔

شریعت لوگوں کی واقعتی مجبوریوں کا لحاظ کرتی ہے اور انہیں مشکلات میں ڈالنا نہیں چاہتی، اور اسی اصول کے پیش نظر فقہاء نے دفع مضرت کو ضروری قرار دیا ہے اور ان باتوں میں نرمی برتی ہے جو عموماً بلوئی کی نوعیت کے ہوں۔

پھر پگڑی نے تو موجودہ حالات میں ایک حق کے معاوضہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مکان کا قبضہ (Possession) گویا کرایہ دار کا حق ہے، جو اپنے اندر مالیت رکھتا ہے، اس لئے اس کا معاوضہ پگڑی کی صورت میں لیتا ہے اور کرایہ دار (Tenancy) منتقل کرنے کا حق مالک مکان کا جو اپنے اندر مالیت رکھتا ہے؛ اس لئے اس کا معاوضہ وہ پگڑی کے ایک حصہ کی شکل میں وصول کرتا ہے۔

کرایہ دار کے قبضہ کا حق اس لئے بھی مال کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے پگڑی دے کر ہی یہ حق حاصل کیا تھا؛ اس لئے اگر وہ اپنا یہ حق نئے کرایہ دار کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ علامہ سرخسی کرایہ دار کے دوسرے کرایہ دار سے زائد کرایہ وصول کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں:

”فان اجرہا باکثر مما استاجرہا بہ تصدق بالفضل الا ان یکون اصلح منها بناء اوزاد فیہا شیئاً فحنئذ یطیب لہ الفضل و علی قول الشافعی رحمہ اللہ یطیب لہ الفضل علی کل حال بناء علی اصلہ ان المنافع کالاعیان الموجودة حکماً فتصیر مملوكة لہ بالعقد مسلمة الیہ بتسليم الدار فکاب بمنزلة من اشتری شیئاً و قبضہ ثم باعہ و ربح فیہ فالربح یطیب لہ لانه ربح علی ملک حلال لہ ولکننا نقول المنافع لم تدخل فی ضمانہ و ان قبض الدار بدلیل انہا لو انهدمت لم یلزمہ الاجر فهذا ربح فضل لا علی ضمانہ ونھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ربح مال لم یضمن“ (المبسوط للسرخسی ج ۱۵ ص ۱۳۰)

پگڑی کی بعض صورتوں کو المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ نے بھی جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ اس قرارداد سے واضح ہے جو اس کے اجلاس منعقدہ ۶ / فروری ۱۹۸۸ء میں منظور ہوئی۔ اس قرارداد کا ایک اہم جزء یہ ہے:

”مالک اور کرایہ دار کے مابین مکان و دکان کرایہ پر لگاتے وقت طے پا جائے کہ ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ اتنی زائد رقم کرایہ دار مالک مکان کو بطور پگڑی (بدل خلو) ادا کرے تو ایسی صورت شرعاً ممنوع نہیں کہ یہ زائد رقم اصل کرایہ کا حصہ تسلیم کی جائے گی، اور اگر کسی وجہ سے کرایہ داری درمیان مدت منسوخ ہو تو جو حکم کرایہ کا ہوگا وہی اس زائد رقم کا ہوگا۔

”اگر اصل کرایہ دار اور نئے کرایہ دار کے مابین مدت کرایہ کے دوران باقی مدت کے لئے مکان یا دکان نئے کرایہ دار کو ماہانہ مقرر کرایہ کے علاوہ زائد رقم (پگڑی) کے عوض طے ہو جائے تو یہ جائز ہوگا۔ ان شرائط کی رعایت کے ساتھ جو مالک اور اصل کرایہ دار کے مابین طے پائی تھیں“۔ (بحوالہ النور کویت شوال ۱۳۰۸ھ)

اور سید سابق ”فقہ السنۃ“ میں لکھتے ہیں:

”ویجوز لہ ان یوجر العین المستاجرة اذا قبضہا بمثل ما اجرہا بہ او ازید او اقل ولہ ان یأخذ ما یسی بالخلو“۔ (فقہ السنۃ جلد ۳ ص ۱۹۵)

”اور کرایہ پر لینے والے کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کرایہ پر لی ہوئی چیز کو جب کہ وہ قبضہ میں آگئی ہو کسی کو اتنے ہی یا اس سے زیادہ یا اس سے کم کرایہ پردے، نیز اس کے لئے وہ رقم لینا بھی جائز ہے جس کو ”خلو“ (پگڑی) کہتے ہیں۔

جواز کی صورتیں:

صورتِ حال کے اس جائزہ اور مذکورہ دلائل کے پیش نظر مکانوں اور دکانوں کے ان معاوضوں کو جو پگڑی کی شکل میں وصول کئے جاتے ہیں شرعاً ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

درج ذیل صورتوں میں اس کا لین دین جائز ہوگا، بشرطیکہ یہ کام معروف طریقہ پر انجام دیا گیا ہو:

۱- مکان یا دکان کے کرایہ دار کا اپنے قبضہ (Possession) کے حق سے نئے کرایہ دار کے حق میں دست بردار ہو جانا۔

۲- مالک مکان کا نئے کرایہ دار کے نام کرایہ داری (Tenancy) کو منتقل کرنا۔

۳- اگر مکان رہائشی ہے تو کرایہ دار کے انتقال کی صورت میں ان لوگوں کو وہاں رہنے کا بدستور حق ہوگا جو متوفی کے ساتھ رہتے تھے، کیونکہ قانون کی رو سے کسی کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی کو فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ البتہ باہم رضا مندی سے کرایہ داری سے دست بردار ہو جاسکتا ہے اور نئے کرایہ دار سے قبضہ کا معاوضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ معاوضہ متبادل جگہ حاصل کرنے کی غرض سے لیا گیا ہے تو اس کو اسی میں صرف کرنا ہوگا اور وہاں ان تمام افراد کو رہنے کا حق ہوگا جو متوفی کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن اگر معاوضہ لینے کی غرض متبادل جگہ کا حصول نہیں ہے تو وصول شدہ رقم کو وراثت کے درمیان شرعی طریقہ پر تقسیم کرنا ہوگا۔ کسی ایک وارث کا قبضہ کے حق کی قیمت وصول کر کے اس کا مالک بن جانا اور دوسرے وارثوں کو اس سے محروم کرنا جائز نہ ہوگا۔

۴- اگر دکان ہے تو اس کے مالک کے انتقال کے بعد اس کے تمام وراثت اس کے مالک ہوں گے اور دکان کے قبضہ کا حق بھی ان سب کے درمیان مشترک ہوگا۔



## ہندوستان میں کرایہ کنٹرول قانون

ایڈووکیٹ مدد ریز

انگریزی سے اردو ترجمہ: جاوید اقبال

الف: کرایہ دار کو بے دخل کرنے کی بنیاد:

کرایہ کنٹرول قانون مالک مکان کے کرایہ دار کو بے دخل کرنے کے حق پر پابندیاں عائد کر رہا ہے۔ اس قانون کے نفاذ سے قبل کرایہ دار اور مالک جائداد کے درمیان تعلق ۱۸۸۲ء کے جائداد منتقلی قانون اور ملک کے جنرل لاء کے تحت عمل میں آتا تھا۔ مثلاً ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ (منتقلی جائداد قانون) کی دفعہ ۱۰۸ شق ۱۷ کے مطابق کرایہ دار (lessee) پر لازم تھا کہ کرایہ کے معاہدے (Lease Period) کی تکمیل یا اختتام کے بعد مالک جائداد (Lessor) کے قبضے میں جائداد پہنچا دے۔ لیکن اب مختلف کرایہ قوانین کے تعارف کے بعد ملک میں صورت حال پوری طرح بدل چکی ہے، کرایہ دار کے حقوق بڑھ گئے ہیں اور مالک جائداد کے حقوق میں کمی کر دی گئی ہے، کرایہ قوانین کے تحت کرایہ دار معاہدے کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی کرایہ دار رہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ پابندی سے وقت پر کرایہ ادا کرتا رہے۔ اس کی حیثیت معاہداتی (Contractual) کرایہ دار کے بجائے قانونی کرایہ دار (Statutory) کی ہو جاتی ہے۔

کرایہ دار اور مالک جائداد کے حقوق اور ان پر عائد ذمہ داریوں کی تفصیل منتقلی جائداد قانون کی دفعہ ۱۰۸ میں بیان کی گئی ہے، لیکن حقوق اور ذمہ داریاں کرایہ قوانین کے نفاذ کے بعد بڑی حد تک بدل گئی ہیں۔ ایک کرایہ دار اس وقت تک مالک مکان کے ذریعہ بے دخل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ کرایہ قوانین میں بیان کردہ اسباب و علل اس جانب اشارہ نہیں کرتے، کرایہ قوانین کے تحت بے دخلی کے اسباب درج ذیل ہیں:

- ۱۔ کرایہ کی عدم ادائیگی
- ۲۔ غیر قانونی طور پر کرایہ دار کے ذریعہ کسی دوسرے شخص کو جائداد کرایہ پر دینا یا اس کی منتقلی عارضی یا دائمی طور پر
- ۳۔ استعمال میں تبدیلی
- ۴۔ جائداد کا عدم استعمال
- ۵۔ جائداد کا غیر قانونی یا غیر اخلاقی کاموں کے لئے استعمال
- ۶۔ تکلیف یا پریشانی کا باعث بننا
- ۷۔ نقصان یا بربادی (جائداد)
- ۸۔ کرایہ دار کے ذریعہ اجازت حاصل کئے بغیر تعمیر یا جائداد کی شکل میں تبدیلی
- ۹۔ کرایہ دار کی ملازمت کا خاتمہ
- ۱۰۔ کرایہ دار کے ذریعہ متبادل رہائش حاصل کر لینا
- ۱۱۔ مالک جائداد کو مالک جائداد نہ ماننا



۱۲۔ تعمیراتی کاموں کی تکمیل کے لئے۔

۱۳۔ کرایہ دار کے ذریعہ خالی کرنے کا نوٹس

۱۴۔ مالک جائداد کی ضرورت کے لئے جائداد پر قبضہ ضروری ہونا

ب۔ کرایہ کنٹرول قوانین کے تحت مالک جائداد کی ذمہ داریاں:

کرایہ قوانین کے تحت بالعموم مالک جائداد کی درج ذیل ذمہ داریاں ہیں:

۱۔ جائداد کی مرمت کرا کے اس کو صحیح حالت میں رکھنا۔

۲۔ کرایہ دار کے ذریعہ حاصل کئے گئے کرایہ کی رسید دینا۔

۳۔ ضروری خدمات (بجلی، پانی وغیرہ) کی سہولت فراہم کرنا، ان کو برقرار رکھنا۔

۴۔ رہائشی جائداد کو غیر رہائشی جائداد میں تبدیل نہ کرنا۔

ج۔ غیر قانونی مالی منفعت، دعویٰ اور حصول پر پابندی:

کرایہ قانون کسی بھی قسم کی اضافی رقم یا پگڑی وغیرہ کی مانگ کرنے یا وصول کرنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔ مالک جائداد کرایہ دار یا ہونے والے کرایہ دار سے جائداد کرایہ پر دینے، معاہدے کی توسیع یا تجدید کے لئے کسی بھی قسم کی رقم کے مطالبے یا حصول کو غیر قانونی قرار دیتا ہے۔

اس سلسلے میں مختلف کرایہ قوانین کی درج ذیل شقوں میں تفصیلات درج ہیں:

۱۔ دی آندھرا پردیش بلڈنگس (لیز، کرایہ، بے دخلی) کنٹرول ایکٹ ۱۹۶۰-دفعہ ۷ (۱) ب

۲۔ دی بہار بلڈنگس (لیز، کرایہ، بے دخلی) کنٹرول ایکٹ ۱۹۷۷-دفعہ ۳

۳۔ دی دہلی رینٹ کنٹرول ایکٹ ۱۹۵۸-دفعہ ۵

۴۔ دی اڑیسہ ہاؤس رینٹ کنٹرول ایکٹ ۱۹۶۷-دفعہ ۳

۵۔ دی ویسٹ بنگال پرے میسر ٹینینسی ایکٹ ۱۹۶۷-دفعہ ۵

۶۔ دی ایسٹ پنجاب اربن رینٹ ریٹریکشن ایکٹ ۱۹۴۹-دفعہ ۷

۷۔ دی جموں اینڈ کشمیر ہاؤس اینڈ شاپس رینٹ کنٹرول ایکٹ ۱۹۶۶-دفعہ ۴

۸۔ دی ہماچل پردیش اربن رینٹ کنٹرول ایکٹ ۱۹۷۱-دفعہ ۸

۹۔ دی گوا، دمن اینڈ دیو بلڈنگ (لیز، کرایہ، بے دخلی) کنٹرول ایکٹ ۱۹۶۸-دفعہ ۱۶

۱۰۔ دی اتر پردیش اربن بلڈنگس (ریگولیشن آف لیٹنگ، کرایہ، بے دخلی) قانون ۱۹۷۲-دفعہ ۴

۱۱۔ دی راجستھان پرے میسر (کرایہ اور بے دخلی) کنٹرول ایکٹ ۱۹۵۰-دفعہ ۹

۱۲۔ دی میسور (کرناٹک) رینٹ کنٹرول ایکٹ ۱۹۶۱-دفعہ ۱۸

۱۳۔ دی مدھیہ پردیش اکوموڈیشن کنٹرول ایکٹ ۱۹۶۱-دفعہ ۶

☆☆☆

## مکانات اور دکانوں کی پگڑی کا مسئلہ

مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی ؒ

بڑے بڑے شہروں میں کرایہ کے مکانات اور دکانوں کی پگڑی کا مسئلہ شرعی نقطہ نظر سے ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے اور صورت حال کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ کوئی مکان یا کوئی دکان پگڑی لئے بغیر نہ تو مالک کرایہ دار کو دیتا ہے اور نہ کرایہ دار خالی کرتے وقت پگڑی لئے بغیر خالی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک کرایہ دار جب دوسرے کرایہ دار کو دیتا ہے تو پگڑی لئے بغیر اس کو بھی نہیں دیتا۔

غرض پگڑی کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ مالک مکان یا دکان اگر دس لاکھ کی رقم لگا کر ایک مکان یا دکان تیار کرتا ہے تو جس دن وہ کرایہ پر کرایہ دار کو دیتا ہے اسی دن سے وہ مکان یا دکان اس کے قبضہ تصرف سے نکل جاتی ہے، کاغذی طور پر صرف مالک کا نام ضرور باقی رہتا ہے، مگر مالک جب چاہے اپنا مالکانہ تصرف نہیں کر سکتا ہے؛ یعنی اپنی مملوکہ دکان یا مکان پر کسی قسم کا تصرف کرنے یا فائدہ اٹھانے سے بے دست و پا بن جاتا ہے۔

کبھی ایک کرایہ دار دوسرے نئے کرایہ دار کو مکان یا دکان کا قبضہ مالک کی اجازت کے بغیر منتقل کر دیتا ہے، کبھی نیا کرایہ دار مالک کو مزید رقم دے کر کرایہ داری اپنے نام منتقل کر لیتا ہے، کبھی مالک کرایہ دار سے زیادہ سے زیادہ کمائی کے لئے پریشان کرتا ہے، کبھی کرایہ دار مالک مکان و دکان کو مختلف طریقوں سے پریشان کرتا ہے، اس طرح دسیوں قسم کی الجھنیں اور پریشانیاں درپیش ہیں اور یہ سب کچھ پگڑی کی نسبت سے سامنے آرہی ہیں۔ اگر مالک نہ لے تو اس کی دس لاکھ کی پر اپنی ہاتھ سے جاتی ہے اور کرایہ دار نہ لے تو اس کی اقتصادی زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔

فقہی حیثیت سے دیکھا جائے تو پگڑی درحقیقت مکان یا دکان کے حق دخل کا معاوضہ ہے اور حق دخل شرعاً ایک معدوم چیز ہے۔ معدوم چیز بیع بننے کے قابل نہیں، فقہاء کرام نے معدوم کی بیع کو باطل قرار دیا ہے۔ صاحب اشباہ لکھتے ہیں: "بیع المعدوم باطل" (الاشباہ والنظائر صفحہ: ۲۲۹ الفن الثانی طبع دیوبند) یعنی شی معدوم کی بیع باطل ہے۔

مکان یا دکان کا حق دخل حقوق مجردہ میں سے ہے اور فقہاء کرام کے نزدیک حقوق مجردہ کا کوئی عوض ٹھہرانا ظاہر روایت میں اور رائج قول کے مطابق جائز نہیں۔ جس طرح مکان کا پڑوسی اپنے پڑوس کے مکان کی فروختگی پر حق شفعہ رکھتا ہے، اگر وہ اپنے حق شفعہ کو کسی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے تو اس کے لئے فروخت کرنا اور اپنے حق کا معاوضہ جائز نہیں ہے۔

اسی طرح مخیرہ عورت جس کو اس کے شوہر نے طلاق کا اختیار دے رکھا ہے اگر اختیار دینے کے بعد شوہر اسے کچھ مال دے کر اس بات پر مصالحت کرنا چاہتا ہے کہ عورت دئے گئے حق طلاق کو استعمال نہ کرے اور میری ہی زوجیت میں رہے تو فقہاء کرام نے اس معاوضہ کو بھی باطل قرار دیا ہے؛ کیونکہ یہ حق مجرد کا معاوضہ ہے جو شی معدوم ہے۔ صاحب اشباہ رقمطراز ہیں:

الحقوق المجردة لا يجوز الاعتياض عنها كحق الشفعة فلو صالح عنه بمالٍ بطلت و رجع به ولو صالح المخيرة بمالٍ تختاره بطل فلا شی لها، (الاشباہ ۲۹۹ ودرمختار مع شامی ۱۳/۲ کتاب البیوع) وعلی هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف (الاشباہ ص ۲۰۰ فن ثانی)۔

اسی طرح براءات یعنی تنخواہوں کی چھٹی، پنشن، ڈگری اور جامیکہ یعنی چوکیداروں اور سپاہیوں کی ماہانہ تنخواہ کی بیع کو یعنی معاوضہ لے کر اسے فروخت کرنے کو فقہاء کرام نے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

”افتی المصنف ببطلان بیع الجامکیہ لما فی الأشباه بیع الدین انما یجوز من المدیون“ (درمختار)

”بیع البراءات التي یکتبها الدیوان علی العتال لا یصح“ (درمختار)

ان سب چیزوں پر ناجائز اور غیر صحیح ہونے کا فتویٰ محض اسی علت کے پیش نظر ہے کہ یہ سب اشیاء معدوم اور غیر مملوک ہیں اور بالاتفاق تمام فقہاء کرام کے نزدیک معدوم اور غیر مملوک کی بیع باطل ہے۔ نیز یہ قواعد فقہیہ کے خلاف ہے؛ یعنی حقوق مجردہ کا معاوضہ ٹھہرانا جائز نہیں۔

ہر قاعدہ اور اصول سے Exeption مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ فقہاء کرام نے جہاں حقوق مجردہ کا لینا ناجائز بتایا ہے وہیں کچھ حقوق کو مستثنیٰ بھی فرمایا ہے؛ مثلاً حق قصاص، ملک نکاح اور حق عبدیت کو حقوق مجردہ سے خارج کیا ہے، یعنی اس کا معاوضہ لینے پر فقہاء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا ہے، حالانکہ یہ حقوق بھی حقوق مجردہ میں داخل ہیں۔ و ان عدم الاعتیاض عن الحق لیس علی اطلاقہ (درمختار)، صاحب اشباہ اور صاحب قنیہ نے حظوظ ائمہ یعنی امام کا حصہ اس کے قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنے کو جائز لکھا ہے جب کہ وہ بھی حق مجرد ہے، نیز صاحب درمختار نے لکھا ہے کہ مفتی ابوالسعود نے حق قرار اور تصرف کا معاوضہ لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

صاحب درمختار لکھتے ہیں:

”بخلاف بیع حظوظ الائمة لان مال الوقف قائم ثمة ولا كذلك هنا۔ اشباہ و قنیہ و مفادہ انہ یجوز للمستحق بیع خبزه قبل قبضہ من المشرف بخلاف الجندی یجوز عقبہ فی النہر۔“

دوسری جگہ یوں تحریر فرماتے ہیں:

”و رأیت بخط بعض العلماء عن المفتی ابی السعود انہ افتی یجوز اخذ العوض فی حق القرار والتصرف و عدم صحۃ الرجوع“ (درمختار مع شامی ۱۵/۴)

اسی طرح بعض علماء نے ”نزول عن الوظائف بمال“ یعنی مال کے عوض وظائف سے کنارہ کشی کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور استدلال میں یہ بات پیش کی ہے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا حضرت معاویہؓ سے نزول عن الخلافہ پر صلح کی تھی۔

مگر صاحب قنیہ و اشباہ کے قول کو نہر الفائق میں رد کر دیا ہے اور ان کے قول کو ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ فقہاء نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ ”بیع المعدوم باطل ہے“ اسی طرح غیر مملوک کی بیع بھی بالاتفاق باطل ہے۔ ائمہ کا حصہ قبل القبض مملوک نہیں لہذا شی منقول کا اپنے قبضہ میں آنے سے پہلے اس کا فروخت کرنا جائز نہیں۔ ابن وہبان نے کتاب ”الشرب“ میں لکھا ہے کہ صاحب قنیہ کی روایت قواعد کے خلاف ہے، جو قابل التفات نہیں، جب تک کہ دوسرے فقہاء کی نقل سے اس کی تائید نہ ہو جائے۔

مفتی ابوالسعود کے فتوے کو بھی ظاہر روایت کے خلاف گردانا گیا اور علامہ شامی نے اسے خلاف ظاہر اور خلاف اولیٰ قرار دیا ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

”وبالجملۃ فالمسئلۃ ظنیۃ والنظائر متشابهة وللبحث فیہا مجال و ان کان الاظہر فیہا ما قلنا

فالاولیٰ ما قالہ فی البحر من انہ ینبغی الابرأ العام بعدہ“ (شامی ۱۵/۴)

جواز نزول کے قائل صرف شیخ قاسم نظر آتے ہیں۔ مگر اسے بھی فقہاء کرام نے قواعد کے خلاف بتایا ہے اور علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اس کی قائل اعتماد کوئی بنیاد نہیں ہے؛ کچھ حکام اور علماء نے اپنے وقت میں بعض ناگزیر حالات سے متاثر ہو کر ایسا کیا ہے، اسے تشریحی حکم کی حیثیت دینا مشکل ہے۔

جن لوگوں نے مال کے عوض وظائف سے کنارہ کشی پر نزول عن الخلافہ سے استدلال کیا ہے، تاریخی حقائق کی روشنی میں غلط ہے۔ نواسہ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ جیسے باوقار، شریف الطبع اولوالعزم صحابی کی شان میں، اسی طرح کاتب وحی، امین بارگاہ نبوی ہادی و مہدی کی شان میں یہ



روایت تنقیص کی طرف غمازی کرتی ہے، اور ان مقدس حضرات کے مقام کو فروتر ہونا ظاہر کرتی ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ حقوق مجرودہ کو فقہاء کرام نے شیء معدوم اور شیء غیر مملوک قرار دیا ہے اور ظاہر روایت میں اس کی بیع کو یعنی اس کا معاوضہ لینے کو فقہاء کرام نے باطل اور ناجائز قرار دیا ہے۔ جن بعض فقہاء نے بعض حقوق مجرودہ کی بیع کو جائز قرار دیا تو اسے خلاف قاعدہ فقہیہ اور خلاف ظاہر روایت اور خلاف اولیٰ قرار دیا ہے۔ پگڑی کے باب میں یہی اصول و قاعدہ جاری ہوگا۔

اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ احکام کی بنیاد عرف عام پر ہوتی ہے نہ کہ عرف خاص پر۔ یہی ظاہر روایت ہے۔ عرف عام سے مراد تعاطل عام ہے جو سب لوگوں میں رائج ہو۔ عرف خاص کی وجہ سے جو بعض مسائل میں جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے، وہ قواعد فقہیہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفتی بہ اور رائج نہیں بن سکتا۔

مکانات اور دکانوں کی پگڑی کا جو سلسلہ چل رہا ہے اور عام ہے اس رقم کو عام طور پر دینے والا اور لینے والا دونوں ہی مذموم اور ایک طرح سے ناجائز رقم سمجھتے ہیں؛ چنانچہ اس رقم سے حج بیت اللہ کے لئے جانے یا اس رقم کو مسجد میں لگانے کو برا سمجھتے ہیں۔ یہ عرف عام اہل حق کا اور سلیم الطبع اہل علم کا نہیں ہے۔ صرف تاجروں میں عرف چل رہا ہے، دیندار تاجر بھی اس رقم کو مشکوک خیال کرتے ہیں۔ جب تک کہ فقہاء اور غیر فقہاء سب ہی میں جواز کا عرف نہ ہو جائے، ہمارے لئے بالکل پگڑی کے جواز کا حکم عام لگا دینا اور اس کا حتمی حکم دے دینا جائز نہ ہوگا۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اگر مالک کرایہ دار سے کرایہ اور پگڑی ایک ساتھ طے کرے اور بالاقساط دینے لینے کا معاملہ طے ہو، یا کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت کرایہ اور پگڑی کی رقم یکمشت دینا طے پا جائے، اسی طرح اصل کرایہ دار اگر نئے کرایہ دار کو کرایہ داری کی مدت کے دوران باقی مدت کے لئے کرایہ پر مالک کی اجازت سے دے اور اس نئے کرایہ دار سے مکان یا دکان کو کوئی ضرر نہ پہنچے تو ان صورتوں میں پگڑی کی شرعی گنجائش دی جاسکتی ہے۔ ان صورتوں میں وہ رقم کرایہ میں شمار کر لینا جائز ہوگا اور کرایہ داری کی مدت پوری ہونے کے بعد جو کچھ پگڑی کے لینے دینے کا معاملہ ہوتا ہے، یا سرکاری قانون سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جو کچھ لیا دیا جاتا ہے یہ شرعاً رشوت میں داخل ہوگا۔



## پگڑی لینا اور دینا

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

آج کل عام طور پر مکان یا دکان کو کرایہ پر لینے یا ان کو خالی کرانے کے لئے مالک کرایہ دار سے کچھ رقم لے کر جسے پگڑی کہا جاتا ہے، اپنا مکان یا دکان اسے کرایہ پر دیتا ہے، اسی طرح جب اسے خالی کرانا ہوتا ہے تو مالک کرایہ دار کو کچھ پگڑی کی رقم دے کر اسے خالی کراتا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ کرایہ دار مالک کی مرضی کے بغیر دوسرے کسی کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لے کر مکان خالی کر کے اسے حوالے کر دیتا ہے، اور یہ رقم نہ تو کرایہ میں محسوب ہوتی ہے اور نہ بعد میں ادا کی جاتی ہے؛ یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں اور پگڑی کی رقم لینے والے کے لئے حرام ہے اور دینے والا رشوت دینے کا مرتکب ہوا، اس طرح کا معاملہ کرنا صریح ظلم اور معصیت کا معاملہ ہے، قرآن پاک میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے:

{لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ} (سورہ بقرہ: ۲۸۹) (نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

اس کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے:

”لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ“ (نہ تو نقصان اٹھایا جائے اور نہ نقصان پہنچایا جائے)

دوسری حدیث میں ہے:

”معلون من ضارّ مومنًا او مکر به“ (مشکوٰۃ ۴۲۸)

(وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ دے کر فریب کرے)۔

ان ہی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی روشنی میں فقہاء نے یہ اصول بنا دیا ہے:

”لا يجوز لرجل من اهل الاسلام قبض مال احد بلا وجه شرعي“ (فتاویٰ عالمگیری ۴/۲۵۲)

(کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کا مال بغیر کسی شرعی سبب کے لے لے)۔

مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا مفتی عبدالرحیم مدظلہ دونوں حضرات نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، پگڑی کی رقم دو سبب سے ناجائز ہے: ایک تو غیر شرعی طریقہ پر کسی کا مال لے لینا۔ دوسرے اس پر رشوت کی تعریف بھی صادق آتی ہے اور رشوت کا حکم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

اگر مالک کرایہ دار سے کہتا ہے کہ مکان خالی کر دیجئے تو کچھ مہلت لے کر اسے خالی کر دینا چاہئے، البتہ اگر کرایہ دار کو دوسرا مکان نہیں مل رہا ہے، یا بہت گراں مل رہا ہے تو فوراً خالی کر دینے کی صورت میں اس کے لئے اور اس کے بال بچوں کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ہے تو اسلامی اخوت کا تقاضہ ہے کہ مالک مکان اسے دوسرا انتظام کرنے تک مہلت دے۔ اللہ تعالیٰ تقاضے میں مہلت دینے والے کو پسند کرتا ہے حدیث میں آتا ہے:

”جو کسی مسلمان کی تکلیف کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف کو دور کرے گا“ (ابوداؤد ترمذی)

البتہ اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ مالک مکان کے پاس دو مکان تھے؛ ایک میں وہ خود رہتا تھا اور ایک کرایہ پر دے رکھا تھا، اتفاق سے ایک مکان گر گیا اب اس مجبوری سے مکان خالی کرانا چاہتا ہے تو کرایہ دار کو کسی طرح مکان خالی کر دینا چاہئے یا اس کو کاروبار کے لئے دکان کی ضرورت ہے اور کوئی دوسری دکان کرایہ پر لینا اس کی قوت سے باہر ہے تو اس صورت میں کرایہ دار کو دکان خالی کر دینا چاہئے۔

☆☆☆

ط سابق ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ۔

## دوکان و مکان کی پگڑی کا حکم

مفتی جمیل احمد ندیری

دوکان و مکان کی پگڑی کی ایک صورت وہ ہے جو مالک اور کرایہ دار کے درمیان طے ہو، لہذا اگر کرایہ کا معاملہ کرتے وقت ہی مالک اور کرایہ دار کے مابین اصل ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ کچھ زائد رقم بطور پگڑی دینا طے پا جائے تو یہ جائز ہوگا اور یہ رقم بھی مجموعی ماہانہ اجرت میں شامل ہوگی۔ گویا پگڑی کی رقم اور ہر ماہ کا کرایہ سب اجرت مانا جائے گا۔ کیونکہ اجارہ کے وقت اجرت گھٹائی اور بڑھائی جاسکتی ہے، یعنی طے شدہ سے کم کرنا یا اس میں اضافہ کرنا دونوں کی گنجائش ہے۔

لیکن اصل اجرت کے علاوہ زائد رقم لینا چونکہ کرایہ دار کے حق میں ضرر ہے "والضرر یزال" اس لئے اگر دوکان یا مکان خالی کرنا ہو تو کرایہ دار پگڑی والی رقم مالک دوکان و مکان سے واپس لے سکتا ہے۔ لیکن اتنی ہی رقم لے، زائد نہ لے۔

اور اگر دوکان و مکان کے حوالگی اور کرایہ داری شروع ہو جانے کے بعد مالک، پگڑی کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ مطالبہ جائز نہ ہوگا اور مقررہ کرایہ کے علاوہ زائد رقم کی ادائیگی لازم نہ ہوگی۔ کیونکہ اب اسے اصل اجرت کے ساتھ لاحق نہیں کیا جاسکتا۔

اگر مالک نے بغیر پگڑی لئے ہوئے دوکان یا مکان کرایہ پر دیا ہو اور اب خالی کرنا چاہتا ہے تو کرایہ دار خالی کرنے کے لئے کسی رقم (پگڑی وغیرہ) کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ خواہ مدت اجارہ باقی ہو یا ختم ہو چکی ہو۔ کیونکہ مدت اجارہ باقی رہنے کی صورت میں اس دوکان و مکان سے مدت اجارہ تک انتفاع، کرایہ دار کا ایک جائز حق ضرور ہے، جو اسے عقد اجارہ سے حاصل ہوا ہے، مگر وہ اس جائز حق سے باز آنے کا کوئی معاوضہ نہیں لے سکتا، کیونکہ یہ حق "حقوق مجردہ" میں سے ہے، اور حقوق مجردہ کا عوض نہیں لیا جاسکتا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

"الحقوق المجردة لا يجوز الاعتياض عنها كحق الشفعة فلو صالح عنه بمال بطلت و رجع به ولو صالح

المخيرة بمال تختاره بطل ولا شى لها۔۔ الخ" (الاشباہ والنظائر/ ۱۲۷، ۱۲۹)

پگڑی کی دوسری صورت وہ ہے جو پرانے کرایہ دار اور نئے کرایہ دار کے مابین طے ہو، لہذا اگر مالک کی اجازت سے ہو تو اتنی ہی پگڑی لے سکتا ہے جتنی خود ادا کی تھی اور مالک کی اجازت کے بغیر کسی اور کو کرایہ پر دینا فی زمانہ درست نظر نہیں آتا؛ کیونکہ پتہ نہیں کیسا کرایہ دار ہو اور مالک کو ضرر پہنچے اور خالی کرنا دشوار ہو جائے۔

اگرچہ در مختار کی یہ عبارت جواز کو بتاتی ہے:

"وله السكنى بنفسه واسكان غيره باجارة وغيرها۔ وكذا كل ما لا يختلف بالمستعمل يبطل التقييد لانه

غير مفيد بخلاف ما يختلف به كما سيجيء ولو اجر باكثر تصدق بالفضل" (در مختار ۵/۱۸)

لیکن اس عبارت میں "وكذا كل ما لا يختلف بالمستعمل" کی قید نیز درج ذیل عبارت فی زمانہ عدم جواز کی طرف مشیر ہے۔

"(فله ان يسكنها غيره) اى ولو شرط ان يسكنها وحده منفرداً و هذا فى الدور والحوانيت الخ غير انه

مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، مبارک پور، اعظم گڑھ



لايسكن حدادا او قصارا من غير رضى المالك او اشتراطه ذلك في عقد الاجارة لانه يوهن البناء فيتوقف على الرضى (۵/۱۷)۔

ہدایہ میں ہے:

”وله ان يعمل كل شى الا انه لايسكن حدادا ولا قصارا ولا طعانا لانه فيه ضرراً ظاهراً لانه يوهن البناء فيتقيد العقد بما ورائها دلالة“ (ہدایہ ۲/۲۹۷)۔

فتاویٰ عالمگیری (۳/۵۱۳ الباب السابع فى اجارة المستاجر) سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے، لہذا چونکہ آج کے دور میں کرایہ دار، کرایہ دار میں بڑا فرق ہوتا ہے؛ اس لئے کرایہ دار کو کسی دوسرے کرایہ دار کو دینے کا حق نہ ہوگا۔

مالک مکان بہ یک جنبش قلم کرایہ دار کو نکال نہ دے اس کا حل یہ ہے کہ کرایہ داری طے کرتے وقت ہی خالی کرانے کے لئے مہلت کی مدت متعین کر لی جائے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اب یہ عرف ہو چکا ہے کہ ایک کرایہ دار، دوسرے کرایہ دار کو بغیر اصل مالک کی رضامندی کے کرایہ پر دے دیتا ہے اور پگڑی بھی وصول کرتا ہے۔ تو یہ عرف قابل اعتبار نہیں، اس پر جواز کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، کیونکہ یہ اگر عرف ہے تو صرف بڑے شہروں کا نہ کہ چھوٹے بڑے تمام شہروں کا، چھوٹے شہروں و قصبات میں بغیر پگڑی کے مکان و دکان اب بھی مل جاتی ہیں۔ اور ایک کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کو کرایہ داری از خود منتقل بھی نہیں کرتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ عرف خاص ہے۔ عرف عام نہیں اور عرف خاص مفتی بہ قول کے مطابق مدارج جواز نہیں بن سکتا۔

اشباہ میں ہے:

”والحاصل ان المذهب عدم اعتبار العرف الخاص ولكن افتى كثير من المشائخ باعتباره“ (اشباہ ۱۲۵/)

در مختار میں ہے:

”المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن افتى كثير من المشائخ باعتباره۔“ (در مختار ۴/۱۴)

☆☆☆

## پگڑی کا مسئلہ

مفتی افضل حسین ع

آج کل حب دنیا اور حرص مال و دولت کی وجہ سے جس طرح اس امت پر دوسری آفتیں آئی ہیں، اسی طرح اس پر یہ آفت بھی آئی ہے کہ جن لوگوں کے پاس ذاتی مکان یا دکان نہیں ہے، ان کو کرایہ کا مکان یا دکان حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے: ایک تو ماہوار کرایہ بہت زیادہ ہے، دوسرے ماہوار کرایہ کے علاوہ ایک بڑی رقم پگڑی کے نام سے لی جاتی ہے۔ اس طرح اغنیاء فقراء کو خوب چوستے ہیں، حالانکہ ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت روائی کریں۔ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لئے خوراک اور پوشاک کا نظم کریں اور ایسے مکانات کا انتظام کریں جن کے ذریعہ وہ سردی، گرمی اور بارش سے اپنا بچاؤ کر سکیں اور ان کے لئے ایسی دکانیں بھی مہیا کریں جن کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی گزر بسر کا نظم کر سکیں، چہ جائیکہ نہایت بے دردی سے ان کا خون چوسیں اور اپنی سنگدلی کا مظاہرہ کر کے غضب خداوندی کا مورد بنیں۔

دوسری طرف بہت سے کرایہ دار جب مکان یا دکان پر قبضہ کر لیتے ہیں تو اس سے اپنا قبضہ اس وقت تک نہیں ہٹاتے، جب تک کہ اس کے عوض میں ایک بڑی رقم مالک سے وصول نہ کر لیں، حالانکہ بسا اوقات مالک کو اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ کرایہ میں اضافہ کرنے پر راضی ہوتے ہیں، حالانکہ اس وقت کہ اعتبار سے وہ کرایہ بہت کم ہوتا ہے، اور بعض اوقات مالک کسی دوسرے ذریعہ معاش کے نہ ہونے کی وجہ سے کرایہ میں اضافہ کا سخت محتاج ہوتا ہے، بلکہ بعض کرایہ دار اپنا ذاتی مکان یا دکان بنا کر زیادہ کرایہ پر دے دیتے ہیں اور خود معمولی کرایہ دے کر کرایہ کا مکان یا دکان استعمال کرتے ہیں۔ اور بعض کرایہ دار مدت اجارہ کے بعد بلا اجازت مالک کسی دوسرے کرایہ دار کو وہ مکان یا دکان دے دیتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ لیتے ہیں، اور پگڑی کی رقم بھی اچھی خاصی لیتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ سب ظلم و تعدی ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ دور حاضر کے اہم مسائل میں سے ہے؛ اس لئے اس میں حدود شرعیہ کی تعیین ضروری ہے لیکن چونکہ یہ اس زمانہ کا پیدا شدہ مسئلہ ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں نصوص صریحہ اور روایات فقہیہ واضحہ کا ملنا از بس دشوار ہے، البتہ اصول شرعیہ اور قواعد فقہیہ جو فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ مرتب کئے ہیں، ان سے استفادہ کر کے حدود شرعیہ کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ ان ہی قواعد اور اصول کی روشنی میں تعیین حدود کے سلسلے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے، اور چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، اس لئے اس سلسلہ میں تیسیر علی الامتہ کا پہلو خاص طور پر ملحوظ رہے گا اور حتی الامکان گنجائش کی پوری کوشش کی جائے گی، علماء کرام سے درخواست ہے کہ اس کو تنقیدی نظر سے ملاحظہ فرمائیں اور غلطیوں کی تصحیح کر کے مسئلہ کو پورے طور پر منسج کریں تاکہ امت پوری بصیرت کے ساتھ اس پر عمل کر سکے۔

مسئلہ کی چند صورتیں اور ان کے احکام:

اس مسئلہ کی متعدد صورتیں ہیں، ان میں چند صورتیں اور ان کے احکام پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کی مدد سے انشاء اللہ غیر مذکورہ صورتوں کے احکام بھی معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ اگر کوئی شخص اپنا مکان کرایہ پر مثلاً دس سال کے لئے دے۔ کرایہ مثلاً دو سو روپے ماہوار ہو اور مزید پانچ ہزار روپے بطور پگڑی لے تو یہ صورت اصالتہ تو نادرست ہے۔ کیونکہ پگڑی کی رقم یا تو تسلیم مکان اور اس پر قبضہ دینے کے عوض میں لی جاتی ہے اور یہ درست نہیں، کیونکہ تسلیم مکان تو عقد اجارہ ہی کی وجہ سے واجب ہے، ”لان تسلیم المستأجر من مقتضیات العقد“ (بدائع الصنائع ۴/۱۹۵) یا بلا وجہ لی جاتی ہے اور اس کا نادرست ہونا محتاج بیان نہیں۔ لیکن اس میں یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہ رقم اصل کرایہ کا ایک جزو ہے گویا وہ مکان انتیس ہزار روپے کے عوض میں دس سال کے لئے بطور کرایہ دیا گیا ہے۔ کرایہ داروں کی بد معاہدگی کی وجہ سے ضرورتاً اس تاویل کے ساتھ اس کو جائز قرار دینا مناسب ہے۔

سابق استاذ، دارالعلوم اسلامیہ بستی۔



پھر اس صورت میں پگڑی والی رقم کا استعمال اسی وقت سے درست رہے گا۔

۲۔ اگر وہ تمام چیزیں ملحوظ ہوں جو صورت اولیٰ میں ملحوظ ہیں، لیکن پگڑی کی رقم (پانچ ہزار روپے) دس سال میں جو کرایہ، کرایہ دار کے اوپر واجب ہوگا اس میں سے پانچ ہزار روپے تک کچھ نہ وصول کرنے کے ارادہ سے لے تو یہ پگڑی والی رقم پیشگی کرایہ کی تاویل سے جائز ہے، پیشگی کرایہ کی شرط شرعاً درست ہے۔ "ولو أجز بشرط تعجيل الاجرة... جاز" (بدائع الصنائع ۴/۱۹۵)۔

اس صورت میں بھی اس رقم کا استعمال اسی وقت سے درست رہے گا۔

۳۔ اگر وہ تمام چیزیں ملحوظ ہوں جو صورت اولیٰ میں ملحوظ ہیں، لیکن پگڑی کی رقم (پانچ ہزار روپے) مدت اجارہ ختم ہونے پر واپسی کے ارادے سے لے تو یہ صورت اس تاویل سے جائز ہوگی کہ یہ پگڑی والی رقم کرایہ دار کے اوپر واجب ہونے والے کرایہ کے بدلہ میں رہن ہے۔ پورا کرایہ وصول ہو جانے کے بعد یہ رقم واپس ہو جائے گی، یا ادائیگی کرایہ کے وقت کرایہ میں وضع ہو جائے گی اور یہ رہن کی صورت شرعاً بے تکلف درست ہے؛ کیونکہ اجارہ منعقد کرنے کے بعد واجب ہونے والے کرایہ کے بدلہ میں رہن رکھنا درست ہے۔ "ولو استأجر داراً أو شيئاً و أعطى بالاجر رهنا جاز" (الفتاویٰ الہندیہ ۵/۴۳۵) اور روپوں کا رہن جائز ہے۔ "ویجوز رهن الدرہم و الدنانیر" (ہدایہ ۵/۵۱۵)۔

اس صورت میں اس رقم کا استعمال اسی وقت سے درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ انتفاع المرہن من المرہن خواہ مشروط ہو یا معروف نا درست ہے، اور یہاں دونوں صورتوں میں سے ایک ضرور ہوتی ہے۔ البتہ معاملہ کے وقت عدم انتفاع کی شرط کر لی جائے۔ پھر بعد میں راہن (کرایہ دار) مرہن (مالک مکان) کو انتفاع کی اجازت دے دے تو اجازت کے بعد اس کا استعمال درست ہوگا۔

۴۔ صورت اولیٰ میں مدت کرایہ داری ختم ہونے کے بعد کرایہ دار مالک مکان سے مکان واپس کرتے وقت پگڑی والی رقم واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ پگڑی والی رقم جو مالک نے کرایہ دار سے لی ہے، اس کو مالک کے حق میں جزو کرایہ تاویل کر کے ضرور ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اصلۃً تو وہ ناجائز ہی ہے، جو کرایہ دار سے ناجائز طور پر لی گئی ہے اور جو رقم کسی سے ناجائز طور پر لی گئی ہو اس کو واپس لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے اس کی اجازت دینا مناسب ہے۔

۵۔ صورت ثانیہ میں چونکہ کرایہ دار سے پگڑی کی رقم جائز طور پر لی گئی ہے، کیونکہ وہ رقم پیشگی کرایہ کے درجہ میں ہے، اس لئے مدت اجارہ پوری ہو جانے کے بعد مکان واپس کرنے کے وقت کرایہ دار مالک سے وہ رقم واپس نہیں لے سکتا۔

۶۔ صورت ثالثہ میں بھی چونکہ کرایہ دار سے پگڑی والی رقم جائز طور پر لی گئی ہے، کیونکہ وہ رقم شی مرہون کے درجہ میں ہے۔ جس کی واپسی کرایہ کی وصولیابی کے وقت ہوگئی ہے، یا وہ رقم کرایہ میں وضع ہوگئی ہے، اس لئے کرایہ دار مدت اجارہ ختم ہونے پر مکان کی واپسی کے وقت مالک مکان سے وہ رقم واپس نہیں لے سکتا۔

۷۔ مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد اصل کرایہ دار کسی نئے کرایہ دار کو وہ مکان کرایہ پر دینے کا حق دار نہیں ہے، بلکہ مکان، مالک کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر مالک مکان نے اصل کرایہ دار کو اجارہ مکان کا وکیل بنا دیا ہو تو وہ مکان مدت معینہ (مثلاً دس سال) کے لئے نئے کرایہ دار کو کرایہ پر دے سکتا ہے، کیونکہ توکیل بالاجارہ جائز ہے۔ "ویجوز (التوکیل) بالطلاق والعتاق والاجارۃ والاستجارۃ" (بدائع الصنائع ۶/۲۳) اور پگڑی کی رقم (مثلاً پانچ ہزار روپے) بھی لے سکتا ہے اور جواز کی وجہیں وہی ہوں گی جو پہلی تینوں صورتوں میں ذکر کی گئی ہیں۔

پھر نئے کرایہ دار سے حاصل ہونے والا کرایہ اور پگڑی کی رقم بہر صورت مالک مکان کی ہوگی، کیونکہ یہ ساری رقم اسی کے مکان کو کرایہ پر دینے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اصل کرایہ دار نے جو رقم مالک کو پگڑی کے طور پر دی ہے اگر وہ رقم ماہانہ کرایہ کے علاوہ دی ہے، پھر نہ تو واپس ہوئی ہے اور نہ کرایہ میں وضع ہوئی ہے۔ تو اصل کرایہ دار نے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم (پانچ ہزار روپے) وصول کر کے اپنی دی ہوئی رقم پگڑی کے عوض میں لے سکتا ہے، یہی حکم مناسب معلوم ہوتا ہے، اور احتیاطاً مالک کی رضامندی حاصل کر لینا بہتر ہے۔

۸۔ مدت اجارہ کے اندر اصل کرایہ دار کسی نئے کرایہ دار کو وہ مکان کرایہ پر دینے کا مجاز ہے، البتہ جو ماہانہ کرایہ اصل کرایہ دار اور مالک مکان کے درمیان طے ہوا تھا



وہی کرایہ یا اس سے کم وہ نئے کرایہ دار سے لے سکتا ہے۔ اگر زیادہ لے گا تو زائد کرایہ اس کے لئے حلال نہ ہوگا؛ اس کو صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ لیکن اگر اس نے مکان میں کچھ اضافہ کیا ہو۔ مثلاً دروازہ یا دیوار وغیرہ میں کچھ اصلاح کی ہو تو زائد کرایہ بھی اس کے لئے حلال ہوگا۔

”ولو استأجر داراً و قبضها ثم اجرها فانه يجوز ان اجرها بمثل ما استاجرها او اقل وان اجرها باكثر مما استاجرها فهي جائزة ايضاً الا انه ان كانت الاجرة الثانية من جنس الاجرة الاولى فان الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها وان كانت من خلاف جنسها طابت الزيادة ولو زاد في الدار زيادة كما لو وتدفيها وتدا او حفر فيها بئراً او طينا او اصلح ابوابها او شيئاً من حوائطها طابت له الزيادة“  
(الفتاوى الهندية ۳/۲۲۵)۔

اس صورت میں بھی وہ نئے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لے سکتا ہے، اس کے جواز کے لئے بعینہ وہی تاویلیں ہو سکتی ہیں جو پہلی تینوں صورتوں میں کی گئی ہیں۔ اس صورت میں ماہانہ کرایہ اور پگڑی کی رقم سب کچھ اصل کرایہ دار کا ہوگا۔ کیونکہ مدت اجارہ میں مکان سے نفع اٹھانے کا حق دار مالک نہیں ہے، بلکہ اصل کرایہ دار ہے۔ البتہ اصل کرایہ دار اور مالک کے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا وہ اس کو دینا ہوگا۔

۹۔ جن تصرفات کا اختیار اصل کرایہ دار کو ہے، ان ہی تصرفات کا اختیار نئے کرایہ دار کو بھی ہوگا اور جن تصرفات کا اختیار کرایہ دار کو نہیں ہے، ان کا اختیار نئے کرایہ دار کو بھی نہ ہوگا۔

مالک مکان اور کرایہ دار کے لئے مفید ہدایات:

اصل مسئلہ کی وضاحت اور احکام متعلقہ کے بیان کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مالک مکان اور کرایہ دار کے لئے کچھ مفید ہدایات پیش کر دی جائیں جو اصول صحیح پر مبنی ہیں تاکہ دونوں ان پر عمل کر کے فلاح و بہبود سے ہمکنار ہو سکیں۔

ہدایات برائے مالک:

مالک مکان کے لئے بہتر یہ ہے کہ حاجت مندوں کا خیال رکھے۔ کرایہ زیادہ مقرر نہ کرے۔ ماہانہ کرایہ ہی کے اوپر اکتفاء کرے۔ پگڑی لینے سے حتی الامکان اجتناب کرے۔ کرایہ وصول کرنے اور تقاضا کرنے میں سختی نہ برتے۔ کرایہ دار اگر کسی مہینے میں کرایہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس ماہ کا کرایہ معاف کر دے یا کم سے کم اس کو مہلت تو ضرور دے دے۔ مدت اجارہ پوری ہو جانے کے بعد کرایہ دار سے باآسانی و نرمی مکان خالی کرائے۔ تشدد ہرگز نہ کرے۔ بالخصوص جبکہ دوسرے مکان کا انتظام فی الفور مشکل ہو اور کرایہ دار عیال دار ہو اور اس کے چھوٹے چھوٹے دو چار بچے ہوں۔ ایسی حالت میں کرایہ دار کو مکان خالی کرنے پر مجبور کرنا بڑی بے دردی اور انتہائی سنگدلی کا مظاہرہ ہے۔

ہدایات برائے کرایہ دار:

کرایہ دار کے لئے بہتر یہ ہے کہ مکان اچھی طرح استعمال کرے، جس طرح اپنا مکان استعمال کیا جاتا ہے۔ کرایہ ہر ماہ کے ختم پر بغیر ٹال مٹول کے ادا کرتا رہے۔ اگر وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں مالک تقاضا میں سختی کرے تو لڑنے جھگڑنے کے بجائے صبر کرے۔ مدت اجارہ ختم ہونے پر جلد از جلد مکان خالی کر کے مالک کے حوالے کر دے، یا مالک مکان کی خوشدلی کے ساتھ از سر نو وہ مکان کرایہ پر لے لے۔ اگر مالک مکان کرایہ میں اضافہ کا مطالبہ کرے تو مناسب اضافہ پر راضی ہو جائے۔ وہ مکان تو شرعاً مالک ہی کا ہے۔ اس لئے حکومت کے قانون سے فائدہ اٹھا کر مالک مکان کو پریشان کرنا اور مکان واپس نہ کرنا، بالخصوص جب کہ دوسرے مکان کا بہسہولت انتظام ہو سکتا ہو بے انصافی ہے، اور اگر کرایہ دار اپنا ذاتی مکان بنوا چکا ہو، پھر تو مالک کو پریشان کرنا، قبضہ جمائے رکھنا اور مقدمہ بازی کے لئے تیار ہو جانا صریح ظلم ہے۔



## پگڑی کا مسئلہ

مفتی عزیز الرحمن، ممبئی

پگڑی کے لین دین کا چلن ہمہ گیر نوعیت حاصل کر گیا ہے، خصوصاً بڑے شہروں میں، اور اب تو اس کا رواج چھوٹے بڑے قصبات میں بھی ہو چلا ہے۔ جس حد تک اس کا رواج تقریباً عام ہو چکا ہے، علماء کرام، خصوصاً فقہ و فتاویٰ سے واقفیت اور وابستگی رکھنے والے حضرات کے لئے اتنا ہی توجہ طلب ہے، تا کہ اس کی شرعی حیثیت واضح ہو کر سامنے آجائے، اور امت مسلمہ کے سامنے ایک واضح ہدایت اس باب میں ہو، جس کے مطابق وہ عمل کر سکے، شریعت اسلامیہ نے زندگی کے ہر معاملے میں مسلمانوں کو پابند کیا ہے کہ آسمانی ہدایت اور احکام الہی کے مطابق کوئی قدم اٹھائیں۔

قرآن و سنت نے ہر معاملے میں رہنمائی کر دی، اور اس کے بعد ہمارے فقہاء کرام اور مجتہدین نے اس کی روشنی میں تمام جزئیات کو مرتب کر کے امت کے سامنے پیش کیا، یہاں تک کہ امکانی صورتوں کو بھی نہیں چھوڑا، لیکن جدید ترقیات کے نتیجے میں طرح طرح کی صورتیں ایسی سامنے آتی رہتی ہیں، جو بڑے غور و فکر کی متقاضی ہوتی ہیں اور انہیں کو فقہاء کرام کی اصطلاح میں حوادث الفتاویٰ کہا جاتا ہے، پگڑی کے مسئلے کا شمار بھی حوادث الفتاویٰ میں ہوتا ہے۔

شرع میں بیع اور عقد اجارہ کے واضح اور مفصل احکام ہیں، بیع کی تعریف فقہاء کے نزدیک یہ ہے "مبادلة المال بالمال بالتراضی" (کفایۃ مع فتح القدیر ۴/۲۵۳) اور اجارہ کی تعریف یوں کی گئی ہے: "ہی عقد علی المنافع بعوض" (عالمگیری ۳/۴۰۹) بیع میں ملکیت ایک سے دوسرے کو منتقل ہو جاتی ہے، جب کہ اجارہ میں مستاجر کو طے شدہ مدت تک منفعت کا استحقاق ہوتا ہے۔

پگڑی کی ظاہری شکل نہ تو بیع کی ہے، نہ اجارہ شرعیہ کی، میری معلومات اور مشاہدے کے مطابق اس کی صورتیں اس طرح ہیں: کبھی تو مالک مکان ابتداء ہی میں ایک مخصوص رقم وصول کر لیتا ہے، سابقہ کرایہ دار ہوتا ہی نہیں، جب کہ بیشتر یہ ہوتا ہے کہ سابقہ کرایہ دار نئے آنے والے سے قیمت کے نام پر ایک رقم طے کرتا ہے اور پھر اصل مالک بھی بل بدلنے وغیرہ کے عنوان سے طے شدہ قیمت کا ایک حصہ وصول کرتا ہے، جبکہ کرایہ بھی لاگور ہوتا ہے، اور کاغذی حد تک یہ شخص کرایہ دار ہی کہلاتا ہے، اگرچہ اس طرح سے فروخت کر دینے اور دوسرے مالکانہ تصرفات کا حق اسے حاصل ہو جاتا ہے، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث حقدار قرار پاتے ہیں، شرعی عقد اجارہ میں مدت کا تعین ضروری ہے، مگر اس معاملے میں مدت وغیرہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔ ایک بات اور خاص ہے کہ کرایہ برائے نام ہوتا ہے، ایسی ملکیت میں جو کرایہ واقعی مل سکتا ہے اس طرح کے معاملے میں اس کا دوسرا حصہ بھی بطور کرایہ وصول نہیں ہوتا۔

جو صورت حال ہے، اس کے مطابق یہ شخص نہ تو حقیقی مالک نظر آتا ہے نہ ہی شرعی کرایہ دار۔ سوال یہ ہے کہ اس کی واقعی حیثیت کیا ہے؟ پھر مرنے کے بعد عموماً تو یہ ہوتا ہے کہ لڑکے خود قبضہ کر لیتے ہیں، اور کرائے کی جگہ کا عذر کر کے لڑکیوں کو محروم کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لڑکا زیادہ ہوشیار ہے تو اس نے خود قبضہ کر لیا، اور دوسروں کو یہ کہہ کر محروم کرنا چاہا کہ یہ کرایہ کی جگہ ہے، آپ لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

مفتیان کرام کے پاس جو سوالات ایسے تنازعات میں بھیجے جاتے ہیں ان میں قابض گروہ کرائے کی جگہ ہونے کو سب سے پہلے ظاہر کرتا ہے، اور جو محروم ہیں وہ مطلق ملکیت کے بنوارے کا استفتاء پیش کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ مفتی کے سامنے جیسا سوال ہوگا جواب اسی کے مطابق دے گا، اس لئے پہلے سوال کے جواب میں اسے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کرائے کی جگہ کہیں وارثوں کا کوئی حق نہیں، اور دوسری نوعیت کے سوال کے جواب میں اسے تمام وارثوں کے حصے بتانے پڑتے ہیں، اس طرح ایک ہی معاملہ میں متضاد فتاویٰ جمع ہو جاتے ہیں، اور کبھی کبھی تو ایک ہی مفتی کے فتاویٰ میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے، جبکہ اس میں مفتی کا کوئی قصور نہیں ہوتا، سوال کی نوعیت کا فرق ہے، جو جواب میں فرق پیدا کر دیتا ہے، عام املاک سے ہٹ کر اوقاف کا مسئلہ اور نازک ہو جاتا ہے، چونکہ پگڑی کے لین دین کی صورت میں کرایہ دار سے خالی کرنا ناممکن نہیں رہ جاتا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وقف کی ملکیت کو اس طرح دیا جاسکتا ہے اور بل بدلنے کے نام پر جو رقم ملتی ہے کیا متولی کے لئے اسے لے کر وقف کے مصارف اور مساجد وغیرہ میں خرچ کرنا درست ہے؟



پیشتر اس کے کہ میں اس سلسلے میں اپنی کوئی رائے ظاہر کر دوں، مناسب یہ ہے کہ ہمارے اکابر نے اس سلسلے میں جو لکھا ہے، ان میں سے بعض کی تحریریں نقل کر دی جائیں۔

ایک نظریہ مطلقاً عدم جواز کا ہے، ہم اس نظریے کے نمائندہ کے طور پر محترم خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب جدید فقہی مسائل کا اقتباس پیش کرتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

”آج کل کرایہ داری کے نام پر پگڑی کا بھی رواج ہو گیا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مالک مکان جس شخص کو مکان کرایہ پر دیتا ہے وہ کرایہ دار سے ایک خطیر رقم ابتداء میں پگڑی کے نام پر لیتا ہے، اور ماہ ب ماہ کرایہ اس کے علاوہ پھر جب کرایہ داری کی تبدیلی ہوتی ہے تو یہ پہلا کرایہ دار سے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لے کر مکان اس کے حوالہ کر دیتا ہے، یہ صورت درست نہیں ہے، نہ مالک مکان کا پگڑی لینا، اس لئے کہ یہ عقد معاوضہ میں ایک ایسی رقم کا وصول کرنا ہے جس کا وہ کوئی عوض ادا نہیں کر رہا ہے، اور یہ سود اور رشوت میں داخل ہے، اور نہ پہلے کرایہ دار کا دوسرے کرایہ دار سے لینا کہ اس نے شخص سے اس کا تو کوئی معاملہ ہی نہیں ہے، اصل معاملہ تو نئے کرایہ اور مالک مکان میں ہے، وہ اس شخص سے یہ رقم وصول کر کے اصل مجرم کے بجائے ایک بے قصور شخص کو سزا دیتا ہے، اسے درحقیقت رقم کا خود مالک مکان ہی سے مطالبہ کرنا چاہئے“ (جدید فقہی مسائل / ۲۶۰)۔

دوسرا نظریہ کرایہ دار اور اصل مالک کے حکم میں فرق کا ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ کرایہ دار جو کہ مکان یا دکان میں آباد ہے، وہ کسی دوسرے شخص سے پگڑی کا روپیہ لے کر اپنی جگہ پر دوسرے شخص کو آباد کر دیتا ہے، یا مالک جائیداد سے پگڑی کا روپیہ لے کر جگہ خالی کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ یہ پگڑی کا روپیہ جائز ہے یا نہیں؟ حضرت مرحوم فرماتے ہیں کہ پگڑی کا روپیہ لینا خواہ دوسرے کرایہ دار سے یا مالک مکان سے ناجائز ہے، مالک جائیداد کو اپنی جائیداد کے واپس لینے کا حق ہے، اور کرایہ دار کو یہ جائز نہیں کہ وہ جائیداد دوسرے کرایہ دار کو دے اور اس پر پگڑی کی رقم بطور رشوت کے وصول کرے۔

ایک دوسرے جواب میں فرماتے ہیں یہ پگڑی کے نام سے جو رقم لی جاتی ہے ناجائز ہے، اور رشوت کے حکم میں ہے (کفایۃ المفتی ۱/ ۳۳۸، ۳۹۳)۔

مذکورہ جوابوں کا تعلق کرایہ دار کے پگڑی لینے سے تھا، مالک جو رقم لیتے ہیں اس کے متعلق کفایۃ المفتی میں ایک سوال و جواب یوں ہے:

سوال:..... یہاں پر لوگ دکانیں کرایہ پر دیتے ہیں، مگر علاوہ کرایہ کے ایک اور رقم جسے سلامی کہتے ہیں مستاجر سے لیتے ہیں، مستاجر اس وجہ سے کہ وہ دکان موقع کی ہوتی ہے، اس زائد رقم یعنی سلامی کا دینا بھی قبول کرتے ہیں، یہ سلامی ماہواری کرایہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، بلکہ ماہواری کرایہ سے ماہ ب ماہ علاحدہ دینا ہوگا۔ آیا یہ سلامی کا روپیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:..... یہ سلامی اگرچہ بظاہر کرایہ ماہواری سے علاحدہ معلوم ہوتی ہے، مگر جب کہ مالک جائیداد لیتا ہو تو منجملہ کرایہ ہی شمار ہوگی، اور جتنے دنوں کے لئے دکان کرایہ پر لی گئی ہے، اس کے کرایہ ماہواری کی مجموعی رقم کے ساتھ یہ بھی کرایہ میں داخل اور محسوب ہوگی، مثلاً دس روپے ماہوار کرایہ پر سال بھر بیکھولنے دکان دی اور سو روپے سلامی کے لئے، تو یوں سمجھا جائے گا کہ دوسو روپیہ سال بھر کرایا گیا ہے، اور اگر تمام مدت کرایہ پر دینے کی متعین نہ ہو تو اس صورت میں اگر صاحب جائیداد اس طرح کہے کہ میں یہ دکان ہر ماہ دس روپے ماہوار کرایہ پر دیتا ہوں، مگر پہلے مہینے کا کرایہ ایک سو دس روپے مقرر کرتا ہوں، اور اس کے بعد ہر مہینے دس روپے ماہوار کرایہ لوں گا تو یہ صورت جائز ہے، (کفایۃ المفتی ۱/ ۳۳۹)۔

حضرت مفتی صاحب نے مالک اور کرایہ دار کے حکم میں فرق کیا ہے جو منقولہ فتاویٰ سے ظاہر ہے۔

ایک تیسرا نظریہ اس طرح پگڑی کی رقم دینے والے کی ملکیت کا بھی ہے، حضرت تھانوی کے فتاویٰ میں ایک سوال ”ملک برہما“ کا اور اس کا جواب اس پر روشنی ڈالتا ہے، سوال کی نوعیت تقریباً یہی ہے جو پگڑی کے لین دین کی ہے، نام البتہ پگڑی کا نہیں ہے۔ خلاصہ سوال یہ ہے کہ ملک برہما میں حکومت نے ایک شخص کو جسے جو فرنگ کہا جاتا ہے، جس کے ماتحت چند گاؤں ہیں، ان دیہات کا مالک بنا دیا یا اس شرط کہ سالانہ اتنا روپیہ خزانہ سرکار میں دیتا رہے اور اسے یہ بھی حق ہے کہ یہ دیہات فروخت کر دے سرکار مانع نہ ہوگی، البتہ خریدار پر بھی یہی شرائط لاگو ہوں گی اور وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جو اسے حاصل ہیں، تیس برس کے بعد جو نیا حکم لاگو ہوگا اسے بھی ماننا پڑے گا۔ اب یہ شخص جسے سرکار نے دیہات کا مالک بنا دیا ہے، رعایا کو کچھ نذرانہ لے کر چند بگہر زمین اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ سالانہ مثلاً (للغۃ) خراج دینا پڑے گا اور یہ خراج گزاردہ ہر سال وغیرہ میں مختار ہوگا اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو بھی یہی اختیارات حاصل ہوں گے، لیکن



زمین فروخت کرنے پر جو قیمت حاصل ہوگی اس کا چوتھائی دینا پڑے گا اور خریدنے والوں کو بھی اس حساب سے خرچ دینا ہوگا اور تمام شرائط اس پر لاگو رہیں گی، اب اگر زمین دار ایک رعیت سے چھین کر دوسرے کو دے دے تو ان میں سے زمین کا مالک کون ہوگا؟ اہ ملخصاً

حضرت تھانویؒ جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ سرکار نے فرنگ کو جو دیا بوجہ ہبہ صحیحہ کے اس کی ملک ہو گیا، اس کے بعد جو فرنگ نے بشرط مذکور کسی اور کو دیا، ظاہر ہے یہ ہبہ بالعوض معلوم ہوتا ہے اور ہبہ بالعوض بحکم بیع ہے اور بیع ان شرائط سے ہو تو فاسد ہے اور بیع فاسد میں جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے قیمت متعارفہ واجب ہوتی ہے، نیز مشتری قبضہ کر لے تو مالک ہو جاتا ہے، اور اگر مشتری نے اس کو کسی اور کے ہاتھ بیع صحیح نہ کیا ہو، یا ہبہ کر کے تسلیم نہ کیا ہو، یا وقف نہ کر دیا ہو، یا رہن نہ کر دیا ہو تو اس وقت بائع کو حق فسخ و استرداد حاصل ہے، اور جو مشتری سے لیا ہے اس کا واپس کرنا بھی واجب ہے، اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ صورت مسئلہ میں جو فرنگ نے جس شخص کو زمین دی ہے وہ قبضہ کر لے گا تو مالک ہو جائے گا اور جو شرائط ٹھہرائے ہیں لغو ہوں گے۔ اہ ملخصاً (امداد الفتاویٰ ۳/۷۷۷)۔

یہ سوال و جواب پگڑی کے عین مطابق ہے، مالک زمین نے نذرانہ کے نام پر ایک رقم لے کر سالانہ کرایہ کی ادائیگی کی شرط کے ساتھ زمین رعایا کو دے دی، اور اس شرط کے ساتھ فروخت کا بھی حق دے دیا کہ قیمت کا چوتھائی حصہ مجھے دینا ہوگا، پگڑی کی نوعیت بھی تقریباً ایسی ہی ہے، مالک جب کرایہ دار سے رقم لیتا ہے تو اسے فروخت وغیرہ کا بھی حق دیتا ہے، اور اس میں بھی یہ شرط رہتی ہے کہ بیچنے کی صورت میں ایک حصہ اصل مالک کو بل بدلنے کے نام سے ملے گا، چاہے یہ خود دے یا دوسرا خریدنے والا دے، اسی صورت کو حضرت تھانویؒ نے ہبہ بالعوض بحکم بیع لیکن بوجہ شرائط مذکورہ بیع فاسدہ مانا اور قبضہ کو مفید ملک فرمایا ہے، حضرت تھانویؒ کی اس عبارت سے بھی پگڑی کا مسئلہ آسانی حل ہو سکتا ہے اور ملکیت بھی ثابت ہو جاتی ہے، فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں بھی اس کی نظیریں "خلو الحوانیت، سکنی، کردار، کدک" وغیرہ ناموں سے ملتی ہیں، پگڑی کے معاملے میں یہ تو واضح ہے کہ اصل مالک کوئی اور ہے جو پگڑی کے لین دین کے بعد بھی مالک کہلاتا ہے اور کرایہ وصول کرتا ہے، اگرچہ کرایہ برائے نام ہو، اور عرف میں پگڑی کے لین دین کو بھی خرید و فروخت کہا جاتا ہے، پگڑی دے کر لینے والے کو جو حق حاصل ہو جاتا ہے، اس کے نتیجے میں وہ بہت سے مالکانہ تصرفات بھی کرتے ہیں، اور اصل مالک مانع نہیں ہوتا۔ اس حق کو ہم حق رہائش سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، سرکاری کاغذات میں اس کا نام عموماً Tenancy Right ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حق کی نوعیت کیا ہے، آیا اسے مال کہا جاسکتا ہے، یا منفعت اور حق، اور حق ہے تو حقوق مجردہ میں سے مانیں یا مؤکدہ میں سے، مال کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے: "ما یمیل الیہ الطبع و یمکن ادخارہ لوقت الحاجة" ایک تعریف میں موجود کی قید بھی ہے، یعنی جس کا ظاہری وجود ہو (شامی ۳/۱۱۲) حق کی تعریف ہے: "ما یرتفعہ الرجل الخ" یعنی جس کا انسان حق دار قرار پائے، اور جو بیع کے تابع ہے، لیکن بیع کی جانب رغبت کا سبب ہے:

"واعلم ان الحق فی العادة یذکر فیما ہو تبع للمبیع ولا بدانہ لایقصد الا لاجلہ كالطریق والشرب" (شامی ۳/۱۱۰)

اس کا ہم مفہوم ایک لفظ مرافق ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مرافق دار سے مراد منافع دار ہے۔۔۔ ان تعریفات کی روشنی میں حق رہائشی کو مال نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ منافع اور حقوق میں شامل ہوگا۔

حقوق کے متعلق حکم یہ ہے کہ ان کا معاوضہ نہیں، درمختار میں ہے: "لا یموز الاعتیاض عن الحقوق المجرودة عن الملك" شامی اس کی تشریح میں کہتے ہیں:

"قال فی البدائع الحقوق المجرودة لا یحتمل التملیک الخ لان الاعتیاض عن مجرد الحق باطل"

یہ حکم تو حقوق مجردہ کا تھا۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حقوق مجردہ کے علاوہ بھی کوئی قسم ہے، ایسے حقوق کو مؤکدہ کہا جاتا ہے اور ان کا عوض بھی ہوتا ہے، گویا انہیں ایک گونہ ملکیت کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ علامہ شامی عبارت مندرجہ بالا کے معا بعد تحریر فرماتے ہیں:

"الا اذا قوت حقاً مؤکداً فانہ یلحق بتفویت حقیقة الملك فی حق الضمان کحق المرهقن . وفي بیع حق المرور"

روایات

اس عبارت سے حقوق غیر مجردہ اور ان کے بعض احکام کا علاحدہ ہونا ظاہر ہے۔ حقوق کی ان دونوں قسموں میں جو فرق ہے وہ شامی کے الفاظ میں اس طرح ہے، جو حقوق صرف دفع ضرر کی غرض سے ثابت ہوتے ہیں وہ مجردہ ہیں، اور جو اس کے علاوہ بروصلہ وغیرہ کے طریقے پر ثابت ہوں وہ مؤکدہ ہیں۔ اس کے بعد

لکھتے ہیں: حق کے عوض کا جائز نہ ہونا "علی الاطلاق" نہیں ہے؛ میں نے بعض علماء کی تحریر میں مفتی ابوالسعود کے حوالے سے یہ دیکھا ہے کہ موصوف نے حق قرار کے عوض لینے اور اس میں تصرف کے جواز کا فتویٰ دیا ہے:

”ان عدم جواز اخذ الاعتیاض عن الحق لیس علی اطلاقہ ورایت بخط بعض العلماء عن المفتی ابی

السعود انه افتی بجواز اخذ العوض فی حق القرار والتصرف فیہ“ (شامی ۳/۱۷)

پگڑی کا مسئلہ حقوق مجردہ میں کسی طرح نہیں آتا، اب دو ہی صورتیں ہیں: یا تو حضرت تھانویؒ کے فتوے کی روشنی میں ملکیت کی نوعیت مانی جائے، یا کم از کم حقوق مؤکدہ میں شامل کیا جائے، اس سلسلے میں سکنی اور خلوا الحوانیت کی بحث فیصلہ کن ثابت ہو سکتی ہے، یہ مسئلہ اگرچہ ہمارے لئے بظاہر نیا ہے، لیکن شامی کی تحریرات کی روشنی میں دیکھا جائے تو زمانہ قدیم سے اس کی مختلف شکلیں موجود ہیں، اور فقہاء نے ان کے احکام پر مشتمل بحثیں بھی کی ہیں، مثلاً خلوا اور سکنی کے مباحث، خلوا اور سکنی میں قدرے فرق ہے، سکنی کے متعلق فقہاء کی تصریح جو شامی نے نقل کی ہے یہ ہے:

”عین مرکبۃ فی الحانوت، عین قائمۃ فی الحانوت“

اور اسی کو کدک بھی کہا جاتا ہے:

”وان کان له فیہ شئی زائد علی الخلو من بناء ونحوہ مما یسمی فی عرفنا بالکدک وهو المراد من لفظ السکنی المار“  
خلو کی نوعیت یہ ہے کہ مستاجر اپنے پیسے سے عمارت تعمیر کرے، یا باغ لگائے، یا پھر زمین کا اصل مالک اس سے رقم لے کر یہ کرے تو مستاجر کو حق قرار حاصل ہوتا ہے، اس کو خلوا اور کردار کہتے ہیں:

”بنی المستاجر او غرس فی ارض الوقف صار له فیہا حق القرار وهو المسمی بالکردار له الاستبقاء باجر المثل الخ وقد یقال ان الدراہم التي دفعها صاحب الخلو للواقف، واستعان بها علی بناء الوقف شیئہ بکس الارض بالتراب فیصیر له حق القرار فلا یخرج من یدہ اذا کان یدفع اجر المثل و مثله لما لو کان یرم دکان الوقف یقوم بلوازاها من مالہ“۔

در مختار کے قول بلزوم خلوا الحوانیت کی تشریح میں ابتداء ہی میں شامی نے بتلادیا ہے کہ عرف خاص کے اعتبار کے مطابق یہ فتویٰ مناسب ہے کہ قاہرہ کے بازاروں میں خلوا الحوانیت کی جو صورت پائی جاتی ہے، وہ لازم ہے اور خلوا صاحب خلو کا حق ہے، صاحب حانوت اسے نکالنے یا علاحدہ کرنے کا مجاز نہیں، اسی طرح وہ دوسرے کو کرایہ پر بھی نہیں دے سکتا، اگرچہ اراضی وقف کی ہو، "اقول علی اعتبارہ ای اعتبار العرف الخاص ینبغی ان یفتی بان ما یقع فی بعض اسواق القاہرۃ من خلوا الحوانیت لازم و یصیر الخلو فی الحانوت حقالہ فلا یملک صاحب الحانوت اخراجه منها ولا اجارہا لغيرہ ولو کانت وقفاً" (۲۲/۱)، اس کے بعد ہی شامی نے سلطان غوری کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حوانیت الجملون کی تعمیر کے وقت اس نے تاجروں کو حق خلو کے ساتھ حوانیت سپرد کیا اور ان سے ایک مقررہ رقم لے کر وقف نامہ میں اس کا تذکرہ بھی کر دیا۔

”وقد وقع فی حوانیت الجملون فی الغوریۃ ان السلطان الغوری لما بناها اسکنها للتجار بالخلو

وجعل لكل حانوت قدرا اخذہ منهم وکتب ذلك بمکتوب الوقف (۳/۱۷)۔

یہ واقعہ شامی نے بغیر تکبیر کے نقل کیا ہے، اس کے بعد واقعات الضریری وغیرہ کے حوالہ سے یہ مسئلہ بھی درج کیا ہے کہ ایک شخص کے قبضہ میں دکان تھی، وہ غائب ہو گیا، متولی قاضی کے پاس معاملہ لے گیا اور قاضی نے اسے دوسرے کو کرایہ پر دینے کی اجازت دے دی اور اس نے اس کے مطابق عمل بھی کر لیا، اس کے بعد غائب شخص واپس آ گیا تو وہی زیادہ مستحق ہے، اور اگر اسے حق خلو حاصل ہے تو خلو کا بھی وہی حقدار ہے، اگر چاہے تو اجارہ کو فسخ کر کے اپنی دکان میں رہے اور اگر چاہے تو نئے مستاجر سے خلو کی قیمت وصول کر لے اور اسے بھی اس کی ادائیگی کا حکم کیا جائے گا۔

”کتاب الاجارۃ“ میں علامہ شامی نے اس مسئلہ کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے، جن امور میں حاجت مقتضی ہے اور مدت دراز سے عادت جاری و ساری ہے، اور خواص بھی بلا تکبیر کے اسے جانتے ہیں جیسے خلوا الحوانیت کا مسئلہ ہے یعنی متولی یا مالک یا واقف دکان کے لئے ایک خاص رقم لے کر اسے قانونی



تمسک دے دے، تو دکان والا اسے نکال نہیں سکتا ہے جسے حق خلو حاصل ہے، نہ ہی دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے تا وقتیکہ رقم اسے نہ دے دی جائے:

”نعم یفتی بہ فیما دعت الیہ الحاجة وجرت بہ فی المدة المدیة العادة وتعارفہ الاعیان بلا نکیح کا خلو المتعارف فی الحوانیت وهوان يجعل الواقف او المتولی او المملک علی الحانوت قدرأ معینا یوخذ من الساکن و یعطیہ بہ تمسکا شرعیاً فلا یملک صاحب الحانوت بعد ذالک اخراج الساکن الذی ثبت له الخلو ولا اجارتها لغيره مالم یدفع له المبلغ المرقوم فیفتی بجواز ذلک قیاساً علی بیع الوفاء الذی تعارفہ المتاخرون الخ ومن القواعد الکلیہ اذا ضاق الامر اتسع حکمہ فیندرج تحتها امثال ذلک مما دعت الیہ الضرورة (شامی ۵/۱۸)۔“

اس بحث میں علامہ شامی نے خلو کے متعلق علامہ عبدالرحمن آفندی العمادی مفتی دمشق کا یہ اصولی جواب بھی نقل کیا ہے، ”الحکم العام قد یثبت بالعرف الخاص“ اس سے بھی مسئلہ خلو کا جواز ظاہر ہے، نیز موصوف کے جواب کی بنیاد عرف خاص ہے، حکم عام کے اثبات پر ہے، اب جبکہ اسے (پگڑی کو) عرف عام کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے لہذا بدرجہ اولیٰ اس کا ثبوت ہونا چاہئے۔

ان تصریحات کی روشنی میں دکان کی ملکیت نہ ماننے کی صورت میں بھی حق خلو اور اس پر تملک ثابت ہے، اور ضرورت اور عرف عام کی بنیاد پر حکم میں وسعت کا قاعدہ کلیہ بھی اپنی جگہ موجود ہے؛ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ پگڑی کے مسئلے میں وہ فتویٰ نہ دیا جائے جو فقہاء کرام نے خلو الحوانیت اور سکنی وغیرہ میں دیا ہے۔

شامی نے کتاب البیوع مطلب لزوم خلو الحوانیت میں قدرے کلام بھی کیا ہے اور آخر میں علماء مالکیہ میں سے علامہ ناصر الدین اللقانی کے فتوے کا حوالہ دیتے ہوئے بدرالقرانی کی یہ رائے درج فرمائی ہے کہ علامہ ناصر الدین اللقانی اصحاب ترجیح میں سے ہیں؛ اس لئے ان کی تخریج معتبر ہے، اس کے بعد علامہ شامی نے فتاویٰ الکا زرونی کے حوالہ سے ان لفظوں میں ان کا فتویٰ نقل فرمایا ہے: ”لومات صاحب الخلو یوفی منه دیونہ ویورث عنہ وینتقل لبیت المال عنہ فقد البوارث“ (شامی ۲/۲۱)، یعنی صاحب خلو انتقال کر جائے تو خلو سے اس کے قرض کی ادائیگی کی جائے گی اور اس میں اس کی وراثت بھی جاری ہوگی، وارثوں کے نہ ہونے کی صورت میں یہ حق بیت المال کو منتقل ہوگا، اس کی روشنی میں وراثت کا مسئلہ بھی حل کیا جاسکتا ہے، البتہ جو صورتیں مذکور ہیں، ان میں خاص بات بطور قدر مشترک یہ ہے کہ اصل مالک یا متولی یا واقف کو علاوہ کرایہ کے ایک رقم مزید ملتی ہے یا پھر تعمیر وغیرہ کرایہ دار کے مصارف سے ہوتی ہے۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ کرایہ دار نے کوئی رقم اس طرح کی نہیں دی، معاملہ ابتداء سے محض کرایہ داری (عقد اجارہ) کے مطابق تھا، اور محض قبضہ مستاجرانہ یا حکومتی قوانین کی آڑ لے کر یہ حق اپنے لئے ثابت کرے، تو اس کی گنجائش نہیں۔

شامی نے اس بحث میں اس کی بھی تصریح کر دی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ دکان پر محض قبضہ وغیرہ اور کئی سالوں سے کرایہ دار ہونا بغیر ان صورتوں کے جن کا ذکر ہوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کا اعتبار نہیں اور مدت اجارہ گزر جانے کے بعد ایسی صورت میں مالک کو اسے علاحدہ کر دینے یا دوسرے کو کرایہ پر دے دینے کا اختیار حاصل ہے:

”اما مجرد وضع الید علی الدکان ونحوها و کونہ یستاجرہا عدة سنین بدون شیء مما ذکرنا فهو غیر معتبر فللمؤجر اخراجها من یدہ اذا مضت مدة اجارته و ایجارها لغيره“ (شامی ۳/۱۸)۔

ایک مسئلہ اجرت کا بھی محل غور ہے، عموماً ہوتا یہی ہے کہ پگڑی وغیرہ کی صورتوں میں اجرت بہت معمولی ہوتی ہے اور لادینی حکومتوں کے قوانین بھی اس کے مؤید ہوتے ہیں، جہاں جہاں خلو الحوانیت اور سکنی وغیرہ کو لازم اور بطور حق ثابت کیا گیا ہے، یہ بھی ساتھ ساتھ تصریح ہے کہ ہر کرایہ دار کو بھی اجرت مثل دینی پڑے گی، اور اس کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ اگر عمارت ہٹالی جائے تو اس سے زیادہ کرایہ نہ ملے۔ اگر یہ صورت حال ہے تو کرایہ دار جو دے رہا ہے وہ اجرت مثل مان لی جائے گی، اگرچہ موجودہ حالت میں اس کا کرایہ زیادہ کیوں نہ مل سکتا ہو، بالفاظ دیگر موجودہ عمارت کے ہٹالینے کے بعد دوسرا شخص جس قدر کرایہ دے کر لینا پسند کرے وہی یہاں اجرت مثل ہے:

”والواقع فی زماننا انه یستاجر بدون اجر المثل بکثیر ویدفع بعض الاجرة ویقتطع بعضها من العمارة وقد یقال: لجوازه وجه وذلك انه لو اراد اخراجه ویدفع لاول ما صرفه علی العمارة“



لا يستاجرہ الا بتلك الاجرة القليلة نعم لو استغنى الوقف دفع الناظر مال الاول فان كل احد يستاجرہ باجر مثله الان فما لم يدفع الناظر ذلك تبقى اجرة المثل تلك الاجرة القليلة فلا فرق حثيذ بين العمارة المملوكة للمستاجر وبين هذا — ومثل هذا يقال في الكدك وهو ما يبينه المستاجر في حانوت الوقف ولا يحسبه على الوقف فيقوم المستاجر بجميع لوازمه من عمارة وترميم و اغلاق ونحو ذلك ويبيعون بثمان كثير فباعتبار ما يدفعه المستاجر من هذا الثمن الكثير وما يصرف في المستقبل على ارض الوقف تكون اجرة المثل تلك الاجرة القليلة التي يدفعونها الخ“ (كتاب الاجاره ۵/۲۱)۔

ان تصریحات کی روشنی میں اجرت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان تمام اوقاف میں وقف کی منفعت کو لازماً مد نظر رکھا جانا چاہئے۔

غرضیکہ اوقاف کی اراضی میں اجرت مثل کا لحاظ پگڑی وغیرہ کی صورت میں کیا جائے تو یہ معاملہ ان میں بھی درست ہونا چاہئے۔ اجرت مثل کی معرفت کا شامی نے ایک طریقہ اور بتایا ہے جو یہ ہے کہ صاحب خلونے جو رقم واقف یا متولی کو دی ہے اور مرتب وغیرہ میں جو کچھ خرچ کرے گا، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دوسرے لوگ اکثر اتنی رقم دینے کے بعد بھی، مثلاً سو روپے کرایہ دے کر لینے پر رغبت رکھتے ہوں تو اجرت مثل اس میں سو روپیہ کو کہا جائے گا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ پگڑی کے مسئلے میں ہمارے سامنے دو صورتیں ہیں: ایک تو حضرت تھانویؒ کا فتویٰ ہے، اس کے مطابق اس لین دین کو بطریق بیع فاسد سہی انتقال ملک مان لیا جائے اور اس کے قرآن بھی موجود ہیں، لیکن اس میں چند الجھنیں ایسی رہ جاتی ہیں جن سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، مثلاً کرایہ دار پگڑی دے کر مالک بن چکا تو اس کے بعد اصل مالک کے لئے کرایہ کے نام پر کوئی رقم وصول کرنا صحیح نہ ہونا چاہئے، خواہ وہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔ نیز مالک کے لئے آئندہ کسی کرایہ دار سے مزید کچھ لینے کی گنجائش بھی نہ رہے گی، اس لئے کہ قبضہ کے بعد ملکیت منتقل ہو گئی اور کرایہ دار کے تصرف کے بعد اب اسے استرداد و فسخ کا حق بھی باقی نہ رہا، لہذا اب ایسا کوئی تعلق نہیں رہ گیا کہ اس کی بناء پر وہ کوئی رقم لے سکے، دوسری صورت خلوا الحوانیت کی ہے۔

پگڑی کا لین دین اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بہت قریب، بلکہ یکساں ہے، اور خلوا الحوانیت کے متعلق جو تصریحات آپ کے ملاحظہ میں آئیں، ان کے مطابق یہ معاملہ حقیقت ملک کے دائرہ میں آجاتا ہے، اور اسے حقوق مجردہ میں کسی طرح شمار نہیں کیا جاسکتا، پھر جس طرح خلوا الحوانیت قابل خرید و فروخت ہے، پگڑی کے لین دین کے نتیجے میں جو حق ملتا ہے، وہ بھی اسی طرح قابل خرید و فروخت ہوگا، اور علامہ ناصر الدین کے فتوے کے مطابق اس میں وراثت بھی جاری ہوگی، اس طرح اس سلسلے میں بیشتر تنازعات اور مورث کے انتقال کے بعد حرص و لالچ کی بناء پر پیدا شدہ کئی خاندانی جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے، اصل مالک بدستور اپنی زمین کا مالک رہے گا اور مناسب اجرت مثل کا بھی حقدار ہوگا۔

ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے، پگڑی کے لین دین میں اگر خلوی طرح یہاں بھی حق مان لیا جاتا ہے تو آئندہ بدل خلوصاحب خلو کا حق ہوگا نہ کہ ”صاحب حانوت والارض“ کا، لہذا وہ بدل خلو میں سے کچھ لینے کا مجاز بھی نہ ہوگا، صرف مقررہ کرایہ ہی اسے ملنا چاہئے، لہذا بدل بدلنے کے نام پر جو رقم مالکین ہر مرتبہ لیتے ہیں، چاہئے کہ وہ جائز نہ ہو، شامی نے ”لزوم خلوا الحوانیت“ کی بحث کے آخر میں یہ مسئلہ بھی ذکر کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: صاحب خلو جب معمولی کرایہ پر دکان حاصل کرتا ہے تو ناظر کو کچھ درہم پیش کرتا ہے جس کا نام خدمت رکھا جاتا ہے، اور جو در حقیقت اجرت مثل کا تحفہ ہے، اس طرح جب صاحب خلو کا انتقال ہو جاتا ہے، یا وہ اپنا خلو دوسرے کو سونپتا ہے تو وارث اور دوسرے شخص سے ناظر کو ایک رقم ملتی ہے، جسے تصدیق کہا جاتا ہے اسے بھی اجرت میں شمار کیا جائے گا۔

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتوے میں سلامی کے نام پر لی جانے والی جس رقم کو اجرت میں شمار کیا گیا ہے، وہ اس کے عین مطابق ہے، لہذا بدل بدلنے پر لی جانے والی رقم بھی تصدیق اور ”خدمت“ کی طرح اجرت ہی کا ایک حصہ شمار ہونی چاہئے۔

اس طرح کسی پہلو پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا اور ہمارے فقہاء کرام کی عبارتوں کی روشنی میں ہی ضرورت کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اور مزید کسی اجتہاد کی ضرورت بھی نہیں رہ جاتی۔

بندہ کار جحان خلاصہ گفتگو میں پیش کی گئی تفصیل کے مطابق پگڑی کے معاملات کو ”خلوا الحوانیت“ میں داخل کئے جانے کا ہے۔

## پگڑی کا مسئلہ

مولانا محمد زید علی

پگڑی کا مسئلہ معروف و مشہور ہے۔ ہمارے دیار میں پگڑی کے لین دین کے تین مواقع ہوتے ہیں:

(۱) کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت (۲) کرایہ داری کا معاملہ ختم ہوتے وقت (۳) کرایہ داری منتقل کرتے وقت۔

اس اعتبار سے پگڑی کی کل تین صورتیں ہوتیں، اور ہر صورت میں مختلف شقیں ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے:

پہلی صورت:..... مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان اصل کرایہ کے علاوہ مزید رقم یکمشت دینا طے پائے اور کرایہ دار خوشی سے دینے پر راضی ہو، جیسا مروج ہے۔

پھر اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ پگڑی کی رقم کا لین دین ہو اور اس میں اس رقم کی واپسی کی کوئی شرط نہ ہو، جیسا کہ اکثر بڑے شہروں میں ہوتا۔

دوسری صورت یہ کہ واپسی کی شرط بھی ہوتی ہے کہ کرایہ دار دکان یا مکان جب خالی کرے گا تو مالک مکان کو وہ پگڑی کی رقم (جو اس نے کرایہ دار سے لی تھی) واپس کرنا ضروری ہے۔ دونوں ہی صورتیں مروج ہیں۔

دوسری صورت:..... کرایہ داری کا معاملہ ختم ہوتے وقت پیش آتی ہے، یعنی مالک مکان کرایہ داری کا معاملہ ختم کرنے اور اپنے مکان کو خالی کرانے کے واسطے کافی رقم دیتا ہے، اور اس کے لئے گویا وہ مجبور ہوتا ہے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ یا تو کرایہ داری کی مدت ہوئی تھی یا نہیں۔

تیسری صورت:..... کرایہ داری کے منتقل کرتے وقت پیش آتی ہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اصل کرایہ دار نئے کرایہ دار کو اپنی جگہ مقرر کر دیتا ہے اور اس کے عوض میں اصل کرایہ دار نئے کرایہ دار سے کافی رقم کا مطالبہ کرتا ہے، اور مالک مکان اس میں کچھ دخل اندازی نہیں کر سکتا۔

اس کی بھی دو صورتیں ہیں: یا تو کرایہ داری کی مدت مقرر ہوئی تھی یا نہیں؟ اور مدت مقرر ہونے کی صورت میں ابھی مدت باقی ہوگی یا نہیں۔ یہ سب کل چھ صورتیں ہوتیں۔

تمام احکام انہیں مذکورہ صورتوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ضروری تمہید:..... ہر صورت کی تحقیق اور اصل حکم جاننے سے قبل ضروری ہے کہ ہر صورت کے بارے میں یہ تعین کیا جائے کہ یہ صورت شرعی معاملات میں سے کس معاملہ سے متعلق اور ابواب فقہیہ میں سے کس باب کے تحت داخل ہو سکتی ہے اور اس صورت اور معاملہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تحقیق و تنقیح کے بعد اصل مسئلہ اور اس کا حکم خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ایک فقہی اصول کو ذہن نشین کر لیا جائے۔

فقہی اصول:..... فقہاء کرام نے جا بجا قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ معاملات میں اعتبار محض الفاظ کا نہیں معنی کا ہوتا ہے، عبارات کا نہیں مقاصد کا ہوتا ہے، احکام ظاہری صورتوں سے نہیں حقائق سے متعلق ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر احکام عنوان سے نہیں معنوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اصولیین نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے:

العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للفاظ والمباني (قواعد الفقه ص ۱۳۹۱)

لان الاعتبار للمعاني دون الصور (بدایہ ۲/۱۸۵)

یہ مسئلہ معروف ہے اور اس کے لئے مزید دلائل کی حاجت نہیں۔



فقہاء کرام نے اس قاعدہ کا لحاظ فرمایا ہے۔ مثلاً رشوت کی حقیقت جب پائی جائے گی تو اس کو رشوت ہی کہا جائے گا، گور رشوت دینے والا ہدیہ اور دعوت کے نام سے کوئی چیز دے یا کھلائے۔ اجیر کو اجرت دیتے وقت جو رقم دی جائے گی وہ اجرت ہی ہوگی، گو اس کا نام انعام یا صدقہ رکھا جائے، حتیٰ کہ اجیر کو اجرت میں زکوٰۃ کی نیت سے جو رقم دی جائے گی اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی، سو دربو کی تعریف صادق آنے کی صورت میں اس کو سو ہی کہا جائے گا، گو اس کا نام کچھ بھی رکھ دیا جائے، شراب شراب ہی ہے، گو اس کا نام شربت رکھ دیا جائے۔ بعض فقہاء کی تصریح کے مطابق غنی کو صدقہ صدقہ نہیں، بلکہ ہبہ ہوتا ہے، گو اس کو صدقہ ہی کے نام سے دیا گیا ہو۔

الحاصل معاملات میں اعتبار محض الفاظ اور صورتوں کا نہیں، بلکہ حقائق اور مقاصد کا ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا قاعدہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد دیکھنا چاہئے کہ اجارہ داری میں پگڑی کے لین دین کی کیا حقیقت ہے؟ کیوں دی جاتی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اس کی تحقیق کے لئے معاملہ کرنے والوں کا تعاطل، عرف و رواج اور ان کی شہادت کافی ہے۔ جس سے کم از کم اتنی بات تو واضح ہو جائے گی کہ پگڑی کی یہ صورت شرعی معاملات میں سے کس معاملہ میں داخل ہے، اسی اعتبار سے اس پر احکام عائد ہوں گے۔

پہلی صورت کا حکم:..... پہلی صورت جو مالک مکان اور کرایہ دار کے مابین کرایہ داری کا معاملہ طے ہوتے وقت ہوتی ہے، یعنی کرایہ دار مالک مکان کو کافی رقم یکمشت ادا کرتا ہے، جس میں کہ واپسی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ صورت عموماً بڑے شہروں (کلکتہ، بمبئی) وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

اس صورت میں کافی مقدار میں پگڑی دینے کا مقصد اور اس کا نتیجہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کرایہ دار کے مکان پر قابض ہو جانے کے بعد مالک کی مجال نہیں کہ کرایہ دار کو برطرف کر سکے، یا اس کی جگہ کسی دوسرے کرایہ دار کو مقرر کر دے، اگر دوسرا نیا کرایہ دار آئے گا بھی تو اسی اصل کرایہ دار کی مرضی سے، مکان کے سائے حقوق بجائے مالک مکان کے کرایہ دار ہی سے متعلق ہوتے ہیں، اور مالک مکان اپنے مکان سے بے دخل سا ہو جاتا ہے، ہاں اس کو صرف کرایہ لینے کا اختیار رہتا ہے۔ شرکت سے بھی آگے مالک ہونے کی حیثیت اسی کرایہ دار کی ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ کرایہ دار کے انتقال کے بعد بھی مالک مکان اس مکان کو نہیں لے سکتا، بلکہ اس کے ورثاء ہی اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں اور جس طریقہ سے مالک مکان اصل کرایہ دار کو مکان سے نہیں ہٹا سکتا تھا اسی طرح اس کے ورثاء کو بھی نہیں ہٹا سکتا۔ پگڑی دیتے وقت کرایہ دار یہی سمجھتا ہے اور اسی وجہ سے دیتا ہے کہ اس رقم کے دینے کے بعد مجھ کو اس طرح کے مالکانہ و متصرفانہ اختیارات حاصل ہوں گے، اور اصل مالک بے دخل سا ہو جائے گا، اور مالک مکان بھی پگڑی کی کافی رقم کا مطالبہ اسی واسطے کرتا ہے کہ مجھے اپنے مکان سے بے دخل اور مالکانہ اختیار و حقوق تصرفات سے سبکدوش ہو جانا پڑے گا، گویا اس پگڑی کے عوض اس نے اپنی ملکیت ختم کر دی اور مالکانہ اختیار اس پگڑی کی وجہ سے بجائے مالک کے اب کرایہ دار کو حاصل ہو گئے، اور یہی حقیقت ہے بیع کی۔

مذکورہ بالا علامات اور عرفی شواہد و دلائل اس بات کے ہیں کہ کرایہ دار نے پگڑی کی رقم مالک مکان کو اصل عمارت کے عوض دی ہے اور اسی وجہ سے اس کو مالکانہ و متصرفانہ اختیارات حاصل ہوئے، اور اب عمارت کی ملکیت بجائے مالک مکان کے کرایہ دار کی طرف منتقل ہو گئی اور ماہانہ کرایہ جو بھی دیا جاتا ہے وہ عمارت کا نہیں بلکہ زمین کا ہے۔ اسی وجہ سے مالک کرایہ دار کو اس عمارت سے نہیں نکال سکتا۔ ہاں اگر عمارت منہدم ہو جائے صرف زمین باقی رہے تو کرایہ دار کا اس زمین پر کچھ حق نہیں رہتا، یہ واضح دلیل ہے اس بات کی پگڑی کی رقم بطور ثمن کے ہے اور عمارت بمنزلہ بیع کے ہے، اور اجارہ داری کا معاملہ عمارت سے نہیں بلکہ زمین سے متعلق ہے۔ گویا پگڑی نام کے اعتبار سے پگڑی اور حقیقت و احکام کے لحاظ سے بیع کا ثمن ہے۔ جیسا کہ عرف و رواج سے معلوم ہوتا ہے، جس کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ کبھی کرایہ دار پیشگی پگڑی دیتا ہے، حالانکہ دکان و مکان کا وجود بھی نہیں ہوتا، اور مالک مکان اسی پگڑی کی رقم سے دکان یا مکان کی تعمیر کرواتا ہے اور ماہانہ کرایہ وصول کرتا ہے، تو اصل عمارت کا وجود پگڑی کی رقم سے ہوا، اور زمین مالک کی باقی رہی، جس کا اس کو کرایہ ملتا ہے۔ گویا یہاں پر کرایہ دار نے مالک کو پگڑی کی رقم دے کر دیل بنایا کہ اپنی زمین میں میرے واسطے مکان تیار کر دو، اس لحاظ سے یہ عمارت کرایہ دار کی ہوتی ہے اور زمین اصل مالک کی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل جن حضرات کے نزدیک قابل قبول نہ ہو ان کے نزدیک پگڑی کے لین دین کی جواز کی صورت یہ ہے کہ مالک مکان کو اختیار ہے کہ شروع مہینہ میں جتنا کرایہ چاہے مقرر کر لے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں، اگر پگڑی میں جتنی رقم لینا منظور ہو اتنی رقم پہلے ماہ کے کرایہ میں مقرر کر دے یہ جواز کی بالکل بے غبار صورت ہے۔ بعض اکابر نے بھی اس کو ذکر فرمایا ہے۔

واپسی کی شرط کے ساتھ پگڑی میں دی ہوئی رقم کا حکم:..... دوسری صورت یہ کہ پگڑی کا لین دین اس طرح ہو کہ واپسی کی بھی شرط ہو۔ یعنی کرایہ دار جب



مکان خالی کرے گا تو مالک مکان پگڑی کی رقم بھی واپس کر دے گا۔

لیکن حقوق و تصرفات کے اعتبار سے جو حیثیت اس کرایہ دار کی تھی جس میں واپسی کی شرط نہیں تھی بعینہ وہی حقوق یہاں بھی کرایہ دار کو حاصل ہوتے ہیں؛ نہ تو مالک مکان اس سے خالی کروا سکتا ہے، اور نہ ہی اس مکان میں اس کا کچھ حق رہتا ہے۔ البتہ صرف کرایہ اس کو ملتا رہتا ہے۔

تو گویا یہ صورت بھی پہلی صورت کے حکم میں داخل ہے، اور واپسی کی شرط کی حیثیت اس معاہدہ کی سی ہوگی کہ مشتری بائع سے کہے کہ جب یہ بیع میں تم کو واپس کر دوں گا تو تم اتنا ہی ثمن (جتنا میں نے تم کو دیا ہے) مجھ کو واپس کر دینا۔ یہ صرف ایک معاہدہ ہے، جس کا پورا کرنا لازم نہیں، اور یہ ایسی شرط ہے جو کہ عقد کے مقتضی کے خلاف ہے، اس لئے ناقابل اعتبار ہے۔

گویا پہلی اور دوسری صورت احکام کے لحاظ سے ایک ہی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

پگڑی کی رقم اجرت نہیں بن سکتی:..... جن لوگوں کے نزدیک پگڑی کی حیثیت ثمن کی نہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ پیچیدہ اور غور طلب ہوگا کہ اس دی ہوئی پگڑی کی رقم کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟ اجرت تو اس کو کہہ نہیں سکتے، کیونکہ اجرت واپس نہیں ہوتی اور یہاں واپسی کی شرط ہے، اور اگر یوں کہا جائے کہ یہ رقم نہیں بلکہ اس رقم کی منفعت بطور اجرت کے ہے، یعنی ماہانہ کرایہ کے علاوہ اجرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کی رقم سے وہ انتفاع کرتا رہے گا اور رقم کا مالک کرایہ دار ہی رہے گا، چنانچہ مالک مکان اس رقم سے منتفع ہوتا ہے اور تخلیہ مکان کے بعد وہ رقم واپس کر دیتا ہے۔ لیکن اس کو بھی اجرت بنانا صحیح نہیں کیوں کہ اجرت وہی بن سکتی ہے جس میں بیع کا ثمن بننے کی صلاحیت ہو، اور محض منفعت میں ثمن بننے کی صلاحیت نہیں (مجمع الانہر ۲/۳۶۹)۔

نیز اس وجہ سے بھی صحیح نہیں کہ اجرت مجہول ہے، معلوم نہیں کتنی مدت تک ان روپیوں سے انتفاع کرے گا۔

پگڑی کی رقم یا تو قرض ہے یا رہن:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ (واپسی کی شرط کے ساتھ پگڑی میں دی ہوئی رقم کو) قرض کہا جائے لیکن یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ جو قرض مشروط بالمعاملہ ہو وہ سود اور ربوہ بن جاتا ہے "کل قرض جزّ نفعاً فهو حرام"۔

۲۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پگڑی کی رقم کو رہن کی حیثیت دی جائے، لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ امانات اور شیء موبج (جس شے کو اجرت میں لیا گیا ہے) اس کے عوض رہن رکھنا صحیح نہیں ہوتا، (ہدایہ ۳/۱۰۰، فتاویٰ قاضی خاں ۳/۵۹۶)۔

لیکن مذکورہ بالا صورتوں میں دو صورتیں حدود جواز میں آسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس رقم کو قرض کہا جائے دوسرے یہ کہ اس کو رہن کی حیثیت دی جائے۔

قرض کی صورت:..... قرض کی یہ صورت گونغلط ہے کیونکہ مشروط بالمعاملہ ہے، لیکن احکام کے لحاظ سے اس میں قرض کے احکام جاری ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ قرض کی تعریف اس پر صادق آجاتی ہے۔ "القرض عقد مخصوص ای بلفظ القرض ونحوہ یرد علی مال مثلی" (شامی فصل فی القرض ۳/۱۷۱)۔

یہاں پر اگرچہ معاملہ اصلاً قرض کا نہیں ہوا بلکہ قرضہ کا تذکرہ تک نہیں ہوا، لیکن حقیقت کے لحاظ سے اس کو قرض ہی شمار کیا جائے گا، کیونکہ واپسی کی شرط کے ساتھ مالک مکان کو پگڑی کی رقم سے منتفع ہونے کا پورا اختیار اور کرایہ دار کی طرف سے قلبی اجازت ہوتی ہے اور قرض میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے اور محض قرض کا تذکرہ نہ ہونے سے اس کو قرض کے حکم سے خارج نہیں کر سکتے۔

کتب فقہ میں اس کے نظائر موجود ہیں کہ اصل معاملہ کچھ بھی ہو اور کسی بھی لفظ کے ساتھ ہو قرض کا ذکر بھی نہ آیا ہو، لیکن مذکورہ بالا صورت (صاحب مال کی طرف سے دوسرے شخص کو منتفع ہونے کی قلبی اجازت اور واپسی کی شرط) کے پائے جانے کی صورت میں حقیقت و احکام کے لحاظ سے اس کو قرض ہی کہا جاتا ہے۔ مثلاً مضاربہ میں اگر یہ شرط طے قرار پاجائے کہ سارا نفع مضارب کو ملے گا رب المال کو کچھ بھی نہ ملے گا تو گو معاملہ مضاربہ کا ہوا ہے، قرض کا تذکرہ تک نہیں ہوا، لیکن حقیقت کے لحاظ سے اس کو قرض ہی کہا جائے گا اور اس میں قرض ہی کے احکام جاری ہوں گے، فقہاء کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے:

وان شرط کل الربح للمضارب فمستقرض فان استحقاق کل الربح لایکون الا بعد ان یصد

راس المال ملکا له لان الربح فرع المال۔ واشترطه له یوجب له تمکیله رأس المال اقتضاء۔۔۔۔۔

(شامی ۲/۲۸۲، مجمع الانہر ۲/۲۲۲ کتاب المضاربہ)

اسی طرح نقد و وثمن کے ساتھ اگر عاریہ کا معاملہ ہو تو اگرچہ معاملہ عاریہ کا ہے قرض کا ذکر تک نہیں، لیکن فقہاء کرام اس کو قرض ہی فرماتے ہیں۔

”وعاریة الثمنین۔۔۔ قرض“ (درمختار ۴/۵۰۳)

اس کی تائید اس مسئلہ سے ہوتی ہے جس کو محقق تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ بیاہ شادی کے موقع پر عموماً جو رسمی لین دین کا رواج ہمارے دیار بالخصوص یوپی میں پایا جاتا ہے وہ یہ کہ اعزاء و اقرباء شادی کے موقع پر جہیز یا ہدیہ کے نام سے کچھ سامان یا نقدی روپے دیتے ہیں، جس کو باقاعدہ رجسٹر میں درج کیا جاتا ہے، پھر جب دینے والے کے گھرانہ میں شادی ہوتی ہے تو اب یہ شخص اسی کے عوض کم از کم اتنی مالیت کا سامان یا رقم یا اس سے کچھ زیادہ ادا کرتا ہے۔ دینے والا بھی اسی نیت سے دیتا اور منتظر رہتا ہے کہ مجھ کو بھی کم از کم اتنا تو ضرور ہی ملے گا جتنا کہ میں نے دیا تھا، ورنہ شکوہ شکایت تک کہ نو بہت آجاتی ہے، صورت معروف ہے۔

محقق تھانویؒ فرماتے ہیں: ”اس کی حیثیت قرض کی ہے، گو اس کا نام ہدیہ و عطیہ ہے، اس میں قرض کے احکام جاری ہوں گے، حتیٰ کہ میراث بھی جاری ہوگی۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھنا چاہئے کہ پگڑی کی رقم خواہ کسی بھی نام سے دی گئی ہو، قرض کا ذکر تک نہ آیا ہو، لیکن جب واپسی کی شرط کے ساتھ ہے اور پگڑی لینے والے کو اس سے منفعہ ہونے کی اجازت بھی ہے، جیسا کہ قرض کے اندر ہوتا ہے، اس لحاظ سے اس کو قرض ہی کہنا چاہئے۔“

احکام و تفریعات:..... مذکورہ بالا تحقیق و تفصیل کے پیش نظر جب پگڑی کی رقم بمنزلہ قرض کے ہے، تو اس میں قرض کے مندرجہ ذیل احکام جاری ہوں گے:

۱۔ قرض کی تاویل لازم نہیں یعنی وقت مقررہ سے قبل بھی اگر دینے والا وصول کرنا چاہے تو شرعاً اس کو اختیار ہے۔ (ہدایہ ۲/۶۰)

اس لئے یہاں کرایہ دار کو حق ہے کہ مالک مکان سے پگڑی کی رقم جب چاہے وصولیابی کا مطالبہ کرے اور قانونی حیثیت سے گو وہ وصول نہ کر سکے۔ لیکن شرعی لحاظ سے مالک مکان کو واپس کرنا لازم ہے۔

۲۔ دیناً کرایہ دار پر لازم ہے کہ جب اس قرض (پگڑی) کی مدت مقرر ہو چکی ہے تو وقت مقررہ سے قبل بغیر مجبوری کے اس کا مطالبہ کرنا وعدہ خلافی ہے اس لئے اس کو اس سے احتراز لازم ہے گو قضاء اس کو حق مطالبہ حاصل ہے۔

۳۔ کرایہ دار کے مطالبہ کرنے کے بعد بھی مالک مکان کا پگڑی کی رقم واپس کرنے سے گریز کرنا زیادتی و ظلم ہے، بالخصوص جب کہ دینے پر قادر بھی ہو۔ ”مطل الغنی ظلم“۔

۴۔ وقت مقررہ آنے سے قبل (تخلیہ مکان سے قبل) اگر کرایہ دار کا انتقال ہو جائے تو اس قرض (پگڑی) کی رقم وصول کرنے کا حق بجائے کرایہ دار کے اب اس کے ورثاء کو ہوگا اور چونکہ قرض کی مدت کی شرط (تخلیہ مکان کے وقت) کرایہ دار سے ہوئی تھی نہ کہ اس کے ورثاء سے اس لئے ورثاء کو حق ہے کہ فوراً ہی اس رقم کی واپسی کا مطالبہ مالک مکان سے کر لیں۔

۵۔ حقیقت کے لحاظ سے یہ مال ضمار کے حکم میں ہے، کیونکہ کرایہ دار کی مجال نہیں کہ قانونی حیثیت سے (تخلیہ مکان کے بغیر) اپنے قرض کو وصول کر سکے۔ اس لئے اس میں مال ضمار کے احکام جاری ہوں گے، یعنی جب پگڑی کی رقم مل جائے گی، اسی وقت زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مال الضمار وهو مال تعذر الوصول اليه مع قيام الملك (طحطاوی ص ۲۹۰)

رہن کی صورت:..... دوسری صورت جو حدود و جواز میں آسکتی ہے وہ یہ کہ پگڑی کی رقم کو رہن کا درجہ دیا جائے اور اسی میں رہن کے تمام احکام جاری کئے جائیں، کیونکہ رہن کی تعریف اس پر بھی صادق آتی ہے۔

رہن کی تعریف:..... ”حبس شیء بحق یمكن استيفائه ای استيفاء الحق من ذلك الشيء“ (مجمع الانہر/ ۵۸۳)

ورنہ لغوی حیثیت سے تو پگڑی پر رہن کی تعریف صادق آہی جاتی ہے اور لغوی معنی مراد لینے میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

”الرهن هو لغة حبس الشيء مطلقاً باى سبب كان قال الله تعالى كل نفس بما كسبت رهينة ای محبوسة ای

بجزاء عملها۔ ذکر فی الاشباہ فی بحث الدين۔۔۔ ان حمل الرهن على المعنى اللغوى غير بعيد“ (شامی ۵/۲۱۷)

بہر حال مذکورہ بالا عبارات کے پیش نظر پگڑی (جس کی واپسی کی شرط طے ہو) کو رہن کا درجہ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ مالک مکان پگڑی کی رقم اسی وجہ سے لیتا



ہے تا کہ اس کو اپنے مکان کی طرف سے اطمینان رہے کہ اس میں اس کا قبضہ باقی رہے گا، کرایہ دار اس مکان پر غاصبانہ قبضہ نہ کر سکے گا اور اگر کر بھی لے، اور اس کا مکان اس کی ملکیت اور قبضہ سے نکل جائے تو ایسی صورت میں وہ اس پگڑی کی رقم سے اپنا حق وصول کر لے گا اور اسی واسطے اس رقم کا لین دین ہوتا ہے۔

اور غالباً پگڑی کی ابتداء اسی طرح ہوئی کہ مالک مکان نے اطمینان کے خاطر بطور وثیقہ کے اس کی رقم اپنے پاس جمع کر لی، بعد میں اسکی یہ صورت بن گئی۔ اور رہن جس طرح اشیاء کا ہوتا ہے، اسی طرح اثمان اور اموال نقدیہ کا بھی ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

”وصح رهن الحجرین والمکیل والموزون۔ المراد بالحجرین الذهب والفضہ۔ واما جاز رهن هذه الاشياء لامکان الاستيفاء منها فكانت محلاً للرهن۔۔“ (بحر الرائق ۸/۲۸۲)

امانات کے بدلہ میں رہن رکھنا:..... اب رہی یہ بات کہ امانات اور وہ شی جس کو اجرت میں لیا گیا ہو، خواہ مکان و دکان ہو یا اور کوئی سامان (گاڑی وغیرہ) ہو، اس کے عوض رہن رکھنا درست نہیں، اصل مذہب یہی ہے، کتب فقہ میں اسی طرح لکھا ہے، قاضی خاں میں صریحاً جزیئہ موجود ہے:

”ولا یصح الرهن بالامانات كالودائع والعواری“ الخ (ہدایہ ۳/۵۱۰)

”کذا لو رهن المستاجر بالعين الذی استاجرہ کان باطلا“ (قاضی خاں ۳/۵۹۶)

لیکن اس کے بعد بھی امانت اور اجرت میں لی ہوئی شی کے عوض دو وجہ سے رہن رکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ رہن کو لغوی معنی پر محمول کر لیا جائے جیسا کہ صاحب بحر الرائق علامہ ابن نجیم نے لغوی معنی پر بعض صورتوں میں محمول کرتے ہوئے امانت کے عوض رہن رکھنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ شامی اصل مسئلہ نقل فرماتے ہوئے اس کو بھی بایں الفاظ نقل فرماتے ہیں:

”لا یصح الرهن بالامانات۔۔۔ ان شرط واقف الکتب ان لا یخرج الابرهن، شرط باطل، لانه امانة فاذا املک لم یجب شیء۔“

اس کے بعد نقل فرماتے ہیں:

”وذكر فی الاشباه فی بحث الدین ان وجوب اتباع شرطه وحمل الرهن علی المعنی اللغوی غیر بعید“ (شامی ۵/۲۱۴)

جس طریقہ سے مذکورہ بالا صورت میں امانت کے عوض رہن رکھنے کی گنجائش ہے، اسی طریقہ سے شیء موجر (کرایہ کے مکان) کے عوض یہاں بھی رہن رکھنے کی گنجائش ہونی چاہئے کیونکہ وہ بھی امانت ہے۔

”ان العين المستاجر امانة فی ید المستاجر“ (ہدایہ ۲/۲۹۲)

دوسری وجہ جس کی بناء پر امانات کے عوض رہن رکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ اگرچہ اصل مذہب یہی ہے کہ امانات کے بدلہ میں رہن نہ رکھا جائے، لیکن حالات اور زمانہ کے لحاظ سے احکام میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، گذشتہ دور میں مالک کو مستاجر پر ہر طرح کا اطمینان رہتا تھا اور مکان کے خالی نہ ہونے اور سامان کے ضائع ہونے کا خطرہ کم تھا، لیکن اب اس زمانہ میں اطمینان کی کوئی صورت نظر نہیں آتی الا یہ کہ اس کے عوض کوئی سامان بطور رہن رکھ لیا جائے اور عرف و زمانہ اور حالات کے بگاڑ و فساد کے سبب سے اس قسم کے احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اصل مسلک و مذہب سے عدول بھی کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً اصل مذہب ہے کہ ساعی اور اجیر مشترک سے ضمان نہ لیا جائے، لیکن فساد زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے فقہاء کرام نے اصل مذہب کے خلاف وجوب ضمان کا حکم نقل فرمایا ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”ثم اعلم ان كثيراً من الاحکام التي نص عليها المجتهد صاحب المذهب بنائی علی ما کان فی عرفه وزمانه قد تغیرت بتغیر الأزمان بسبب فساد اهل الزمان أو عموم الضرورة۔۔۔ ومن ذلك تضمین الساعی مع مخالفته لقاعدة المذهب من ان الضمان علی المباشر دون المسبب ولكن افتو بضمانه زجراً لفساد الزمان۔۔۔ وتضمین الاجیر المشترك“ الخ (رسد المفتی ص/۶۹)۔



اسی فساد زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے اصل مذہب کے خلاف یہاں بھی امانات اور شئی مؤجر کے عوض رہن رکھنے، اور اس کے ضائع ہو جانے کی صورت میں ضمان لینے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عمارت کے وجود سے پہلے ہی پگڑی کی رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اسی رقم سے دکان یا مکان کی تعمیر ہوتی ہے۔۔۔ لیکن اس رقم کو بھی رہن کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں؛ کیونکہ حق و جوب سے پہلے رہن رکھنا گویا گرانہ کے یہاں درست نہیں لیکن فقہاء احناف کے نزدیک جائز ہے (رحمۃ اللامنی اختلاف الائمہ ص/ ۱۵۰)۔

احکام و تفریعات:..... واپسی کی شرط کے ساتھ دی ہوئی پگڑی کو رہن کہنے کی صورت میں یہ احکام ہوں گے:

۱۔ شئی مرہون (پگڑی) کی رقم مالک مکان ہی کے قبضہ میں رہے گی یہاں تک کہ کرایہ دار مکان خالی نہ کر دے۔  
۲۔ مالک مکان کو رہن (پگڑی) سے انتفاع کی اجازت نہ ہوگی البتہ اگر کرایہ دار خوشی سے اجازت دے دے تو گنجائش سمجھ میں آتی ہے (شامی میں اس کے خلاف صراحت موجود ہے، فلیراجع)۔

۳۔ اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر اسی وقت لازم ہوگی جبکہ اس کے قبضہ میں رقم آجائے اور گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ اس پر مال ضمان کی تعریف صادق آتی ہے۔

۴۔ مالک مکان یا کرایہ دار میں سے کسی کا انتقال ہو جانے کے بعد اجارہ کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے، احناف کا یہی مسلک ہے۔ لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک باقی رہتا ہے، (مجمع الانہر ۲/ ۴۰۱)۔

ضرورت اور ابتلا عام کی وجہ سے معاملات میں دیگر مسلک کو اختیار کر لینا چاہئے، جیسا کہ محقق تھانوی اور حضرت مفتی شفیع نے تحریر فرمایا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے جو معاملات اصل مالک اور کرایہ دار سے متعلق تھے وہی احکام اب مالک مکان اور کرایہ دار کے وراثت سے متعلق ہوں گے۔

واپسی کی شرط کے ساتھ دی ہوئی پگڑی کی رقم کو قرض کہا جائے یا رہن کا درجہ دیا جائے؟ بظاہر دونوں صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں۔ اہل علم غور فرمائیں۔ بندہ کے نزدیک بجائے رہن کے اس کو قرض کا درجہ دینا زیادہ بہتر ہے چند وجوہ سے جو یہ ہیں:

۱۔ قرض ماننے کی صورت میں اصل مذہب سے عدول لازم نہیں آتا، برخلاف رہن کے۔

۲۔ قرض ماننے کی صورت میں مالک مکان پگڑی کی رقم سے بے خطر منتفع ہو سکتا ہے، برخلاف اشیاء مرہونہ سے انتفاع کے کہ اجازت کے بعد بھی اس میں کلام ہے۔

۳۔ کرایہ دار یا مالک کے انتقال کے بعد (قرض ماننے کی صورت میں) کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی، البتہ رہن کہنے کی صورت میں بہت سی پیچیدگیاں سامنے آجاتی ہیں۔

پگڑی کے لین دین کی دوسری صورت:..... پگڑی کے پائے جانے کا دوسرا موقع اس وقت پیش آتا ہے، جب کرایہ داری کا معاملہ ختم ہوتا ہے اور تخلیہ مکان کے لئے مالک مکان کرایہ دار کو کافی رقم عطا کرتا ہے۔

اس کی دو صورتیں ہیں یا تو کرایہ داری کی مدت طے ہوئی تھی یا نہیں۔

پہلی صورت کا حکم:..... اگر کرایہ کی مدت طے نہیں ہوئی تھی اور مالک مکان کرایہ دار سے اپنا مکان خالی کرانا چاہتا ہے تو شرعاً اس کو یہ حق حاصل ہے ”لان لصاحب الحق حقا“ اور کرایہ دار کا مکان خالی نہ کرنا ظلم اور معصیت ہے۔

اگر مکان خالی کرنے کے عوض کرایہ دار مالک سے کچھ رقم کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ غلط درغلط ہے، کیونکہ اگر مال کے لین دین کا معاملہ نہ ہو، بلکہ جائز شرط کے ساتھ کرایہ دار مکان خالی کرنے کو کہے، مثلاً یوں کہے کہ ہم مکان اس شرط کے ساتھ خالی کر دیں گے جب کہ فلاں سامان ہمارے ہاتھ فروخت کر دو، یا ایسا کوئی بھی معاملہ کرے جو کہ شرعی نفسہ جائز ہو تب بھی یہ شرط باطل اور ناقابل اعتبار ہوگی، چہ جائیکہ ایسی شرط لگانا جو کہ فاسد یعنی مال کے لین دین کی شرط یہ تو ناجائز درنا جائز

”ولا يتعلق اسقاطه بالجائز من الشرط فبالفاسد اولى فيبطل الشرط ويصح الاسقاط“ (ہدایہ کتاب الشفعہ)۔  
اصل حکم یہی ہے کہ تخلیہ مکان کے واسطے کرایہ دار کو رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں، لیکن کرایہ دار اگر مکان خالی نہ کر رہا ہو تو مجبوری کی صورت میں مالک مکان کو اپنا مکان لینے کے واسطے رقم دینا جائز ہے، لیکن کرایہ دار کو لینا جائز نہیں۔ اگر کسی بہانے سے مالک مکان اپنا مکان خالی کر دالے، یا وعدہ کر کے رقم نہ دے، یا دے کر کسی طرح بھی وصول کر لے تو شرعاً اس کو حق ہے البتہ اگر جھوٹ اور دغا بازی کرے گا تو اس کا گناہ علاحدہ ہوگا۔  
دوسری صورت کا حکم: ..... دوسری صورت یہ ہے کہ مالک مکان اور کرایہ دار کے مابین کرایہ داری کی مدت مقرر تھی، اگر مدت مقرر ختم ہو چکی ہے تب تو اس کا وہی حکم ہے جو پہلی صورت کا ما قبل میں گزرا۔

اور اگر مدت باقی ہے اور مقررہ مدت سے قبل مالک مکان کرایہ دار سے مکان خالی کروانا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں تخلیہ مکان کے واسطے مالک مکان کو کچھ رقم دینا اور کرایہ دار کا مطالبہ کرنا سبب جائز ہے۔

کیونکہ یہاں پر محض حق تملک نہیں، جیسا کہ حق شفعہ کے اندر ہوتا ہے، جس میں کہ شفعہ کو صرف حق تملک کی ولایت حاصل ہوتی ہے، اور محض والی ہونے کی حیثیت سے وہ مطالبہ کا حق رکھتا ہے، لیکن اصل محل کے اندر اس کا کوئی حق مقرر نہیں ہوتا۔

بلکہ یہاں پر صورت حال یہ ہے کہ اصل محل (مکان) کہ اندر اس کا حق منفعت مقرر ہو چکا ہے اور ایسے حق مقرر اور متعین فی المحل کے عوض رقم لینا جائز ہے، جیسا کہ کتب فقہ کے دیکھنے سے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے حقوق میں بہت بڑا فرق ہے، ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہے، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کر سکتے۔

حق شفعہ کے عوض میں مال لینا درست نہیں، اس وجہ سے کہ یہ محض حق تملک کی ولایت ہے، جس کی قیمت نہیں ہوا کرتی، اور یہاں پر محض حق تملک کی ولایت نہیں، بلکہ ایسا حق منفعت ہے جو محل سے متعلق اور اس میں مقرر ہو چکا ہے۔ جس کی قیمت ہوا کرتی ہے۔  
مذکورہ بالا تفصیل اور دونوں قسم کے حقوق کا فرق کتب فقہ کی مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے۔

- ۱- حق الشفعة اذ هو عبارة عن ولاية الطلب، وتسليم الشفعة لقيمة له فلا يجوز اخذ المال في مقابلته (شامی کتاب الصلح ۴/۲۷۳)۔
- ۲- وهذا بخلاف الصلح عن حق الشفعة على مال حيث لا يصلح لانه حق التملك ولاحق في المحل قبل التملك، اما القصاص فملك المحل في حق الفعل فيصح الاعتياض عنه (عناية شرح ہدایہ ۸/۲۲۶)۔
- ۳- حق الشفعة ليس بحق متقرر في المحل لانه مجرد حق التملك وما ليس بحق يتقرر في المحل لا يصح الاعتياض عنه (عناية شرح ہدایہ ۸/۲۲۶)۔
- ۴- لو صالح الشفيع عن الشفعة — فالصلح باطل لان لاحق للشفيع في المحل، انما الثابت له حق التملك وهو ليس لمعنى في المحل، بل هو عبارة عن الولاية، وانها صفة الوالى، فلا يحتمل الصلح عنه، بخلاف الصلح عن القصاص لان هناك المحل يصير مملوكاً في حق الاستيفاء فكان الحق ثابتاً في الملك (بدائع الصنائع ۶/۲۲۶)۔
- ۵- بخلاف الاعتياض عن ملك النكاح بالطلاق وعن القصاص بالصلح لان ذلك كله متقرر في المحل... الخ (كفايه شرح هداية: ۸/۲۲۸)۔

عبارات مذکورہ کے مفہوم و منطوق سے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا حق لازم جو مقرر فی المحل ہو، اس کے عوض بطور مصالحت کے رقم لینا جائز ہے۔ اجارہ داری کا معاملہ جس کی مدت مقرر ہوئی ہو اور مدت متعینہ سے قبل مالک مکان تخلیہ مکان کرانا چاہتا ہو، چونکہ مقررہ مدت تک کے لئے محل (مکان) کے اندر اس کا حق منفعت مقرر ہو چکا ہے (یعنی متعینہ مدت تک اس کو نفع اٹھانے کا حق حاصل ہو چکا ہے) اب ایسے حق لازم کے عوض صلح



کر کے کرایہ دار کو مال وصول کرنے کی اجازت ہے، اور مذکورہ بالا عبارات کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

پگڑی کے لین دین کی تیسری صورت:..... پگڑی کے پائے جانے کا تیسرا موقع جو سب سے اہم ہے، اس وقت پیش آتا ہے جب کہ مالک کی مرضی کے بغیر کرایہ دار اپنی جگہ کسی دوسرے نئے کرایہ دار کو مقرر کر دیتا ہے اور اس بناء پر وہ اس سے کافی رقم پگڑی کے نام سے خود وصول کرتا ہے، جس طرح کہ خود اس نے اس سے قبل مالک مکان کو پگڑی کی رقم ادا کی تھی۔

پگڑی کی پہلی صورت کے ضمن میں ابتداء میں یہ بات گزر چکی ہے کہ موجودہ حالات اور عرف کے تحت آج کل کے لحاظ سے پگڑی کی حیثیت بمنزلہ ثمن کے اور مکان کی حیثیت بمنزلہ بیع کے ہے، جس کی پوری تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے۔ اگر ایسی صورت ہے تو اس اصل کرایہ دار کو کلی اختیار ہے کہ اپنی مملوکہ عمارت کو فروخت کر دے اور نئے کرایہ دار سے پگڑی کے نام سے جتنی رقم چاہے وصول کر لے اور یہاں پہ پگڑی دراصل ثمن کے درجہ میں ہوگی اور مکان کی حیثیت بیع کی ہوگی، اور مالک زمین جس طرح زمین کا کرایہ اصل کرایہ دار سے لیتا تھا، اسی طرح اب زمین کا کرایہ وہ نئے کرایہ دار سے وصول کرے گا۔ اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، یہ صورت شریعت کے موافق اور حالات و عرف کے بھی عین مطابق ہے۔

لیکن اگر اصل کرایہ دار کو مکان کا کرایہ دار ہی سمجھا جائے اور مکان کی ملکیت اصل مالک ہی کی سمجھی جائے تو مسئلہ پیچیدہ بن جائے گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ مالک مکان کی رضامندی کے بغیر اس مکان میں از روئے شرع کس قسم کے تصرفات کی اجازت ہے، نئے کرایہ دار کو مقرر کرنا، اور اس سے پگڑی وصول کرنے کا شرعاً اس کو استحقاق ہے یا نہیں؟

### کرایہ دار کے اختیارات:

فقہاء کرام نے صاف صراحت فرمائی ہے کہ کرایہ دار کو پورا اختیار ہے کہ کرایہ کے مکان میں خواہ خود رہے یا دوسرے کو رہنے کے واسطے دے دے، اور دوسرے کو رہنے کے لئے خواہ بطور عاریت کے دے دے یا بطور اجارہ کے۔ یعنی یہ کرایہ دار بھی کسی نئے کرایہ دار سے کرایہ وصول کرے۔ شرعاً اس کو یہ تمام حقوق حاصل ہیں۔ حتیٰ کہ اگر مالک مکان یہ شرط بھی لگا دے کہ کسی دوسرے شخص کو رہنے کے واسطے مکان نہ دینا تب بھی کرایہ دار اس مکان کو دوسرے کو دے سکتا ہے اور مالک مکان کی یہ شرط لغو اور کالعدم سمجھی جائے گی۔ کتب فقہ میں اس کی صراحت و تفصیل موجود ہے۔

۱- وله السكنى بنفسه واسكان غيره باجارة وغيرها (شامی ۵/۱۸)۔

۲- للمستاجران يؤجر من غير موجره، واما من موجره فلا يجوز به يفتى قوله من غير موجره سواء كان موجره مالکاً أو مستاجراً من المالك (شامی ۵/۵۶ مسائل شتی)۔

۳- وما لا يختلف باختلاف المستعمل فتقيد الموجر بشخص معين هدر فلو شرط الموجر سكنى واحد بعينه في اجارة الد ارجاز للمستاجران يسكن غيره لان الشرط ليس بمفيد لعدم التفاوت في السكنى، وما يضر بالبناء كالحداثة والقصاره فهو خارج بدلالة العادة (مجمع الانهر ۲/۲۷۷، شامی ۵/۱۸)۔

مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں کرایہ دار کو جو اختیارات حاصل ہوئے اور جس سے مختلف شکلیں سامنے آئیں وہ یہ ہیں:

۱- کرایہ دار کے مکان میں خود بھی رہ سکتا ہے اور دوسرے شخص کو بھی یہ مکان بطور کرایہ کے دے سکتا ہے۔

۲- جب دوسرے نئے کرایہ دار کو مکان دیا جاسکتا ہے تو اصل کرایہ دار کو اختیار ہے کہ (شرعی حیلہ کے تحت) جتنا کرایہ چاہے مقرر کر دے، اور بطور پگڑی کے جتنی رقم لینا چاہے، جائز طریقہ سے لے سکتا ہے، یعنی وہ رقم پہلے ماہ کے کرایہ میں محسوب کر دی جائے۔

اس صورت میں ابھی مالک مکان اور اصل کرایہ دار کا معاملہ ختم نہیں ہوا، بلکہ اصل کرایہ دار بھی اپنے مالک مکان کو حسب دستور سابق کرایہ ادا کرتا رہے گا اور دونوں کرایہ دار اپنے حال پر باقی رہیں گے۔

اگر اسی صورت میں اصل کرایہ دار نئے کرایہ دار کو اپنی جگہ مستقلاً رکھ کر خود برطرف ہونا چاہتا ہے تو اس کا اس کو اختیار نہیں، بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ نیا کرایہ دار مالک مکان سے باقاعدہ از سر نو معاملہ کرے۔



حق کرایہ داری فروخت کرنا:..... لیکن اگر کرایہ دار اپنے حق کرایہ داری کو فروخت کرنا چاہتا ہے تو اس کے جواز کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ یہ حق کی بیع ہے اور بیع حقوق کی نہیں، بلکہ اموال کی ہوتی ہے، بیع کی حقیقت ہے: "تملیک النال بالنال" (مبسوط سرخسی، فتح القدیر ۸/۳۴۰) اور یہاں پر تملیک المال بالنال نہیں ہے، بلکہ انتقال الحق الی الاخر ہے اور محض حق مال نہیں ہوا کرتا، گو عرفاً اس حق کی حیثیت مال کی تسلیم کی جاتی ہو، کیونکہ مال کی حقیقت ہے: "ما یبیل الیہ الطبع و یمکن ادخارہ لوقت الحاجة و امکن احرازہ و التصرف فیہ علی وجه الاختیار" (شامی ۳/۳، بحر الرائق ۵/۲۷۷)۔

مال کی مذکورہ تعریف حق کرایہ داری پر صادق نہیں آتی، گو عرفاً اس کو مال سمجھا جاتا ہو اس لئے محض حق کے بیع کے جواز کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ جواز کی صورت:..... البتہ جواز کی ایک اور صورت ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ جب اصل کرایہ دار کو حق ہے کہ نئے کرایہ دار کو مکان بطور اجرت کے دے دے اور جتنا چاہے کرایہ لے لے (علی اختلاف الاقوال) تو اس کو چاہئے کہ جتنی رقم وہ حق کرایہ داری کو فروخت کر کے حاصل کرتا، اتنی ہی رقم نئے کرایہ دار سے پہلے ماہ کے کرایہ میں حاصل کر لے، اور بعد ازاں اس سے برطرف ہو جائے اور مالک کی رضامندی کے ساتھ نیا کرایہ دار پرانے کرایہ دار کی جگہ پر مستقلاً ہو جائے، اور مالک کا جو معاملہ اصل کرایہ دار سے تھا وہ اب نئے کرایہ دار سے ہو جائے۔ اگر مالک بھی نئے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لینا چاہتا ہے تو اس کے جواز کی بھی وہی صورت ہے کہ پہلے ماہ کے کرایہ میں اتنی رقم محسوب کر لے۔

اور جواز کی مذکورہ بالا صورت اسی وقت عمل میں آسکتی ہے جب کہ مالک مکان اور نئے اور اصل کرایہ دار کے درمیان پہلے سے طے ہو جائے کہ اتنی رقم فلاں کو دینی ہوگی اور فلاں اتنی رقم وصول کرے گا۔

اس کا ثمرہ اور فائدہ صرف یہ ہوگا کہ اصل مالک یا کرایہ دار نئے کرایہ دار سے پگڑی یا حق کرایہ داری کے سبب سے ناجائز طریقہ سے پگڑی کے نام سے جو رقم لیتا تھا، مذکورہ بالا صورت کو اختیار کر لینے کی وجہ سے اس کے جواز کی شکل پیدا ہو جائے گی۔

### خلاصہ کلام:

- ۱- کرایہ داری کا معاملہ طے ہوتے وقت پگڑی کے لین دین کا معاملہ طے ہوا، اور اس علاقہ کا عرف یہ ہے کہ اس پگڑی کے لین دین کی وجہ سے اصل مالک دکان یا مکان سے بے دخل ہو جاتا ہے، اس کے سارے مالکانہ اختیار سلب ہو جاتے ہوں اور کرایہ دار کو حاصل ہو جاتے ہوں، تو یہ بیع کے حکم میں ہے، اور پگڑی کی رقم بمنزلہ ثمن کے اور دکان و عمارت بمنزلہ بیع کے ہے، اور کرایہ دار اس زمین کا ہوتا ہے جس پر دکان و عمارت قائم ہے، گویا زمین مالک کی ہے اور عمارت کرایہ دار کی۔
- ۲- اگر پگڑی کا لین دین واپسی کی شرط کے ساتھ ہو تو یا تو اس کو قرض پر محمول کیا جائے گا یا رہن پر۔ رہن کے مقابلہ میں قرض پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے اور سارے احکام اس میں قرض ہی کے جاری ہوں گے۔
- ۳- تخلیہ مکان کی وجہ سے کرایہ دار کا مالک سے رقم کا مطالبہ کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کرایہ داری کی مدت طے نہیں ہوئی تھی، یا مدت مقررہ ختم ہو چکی، تب تو تخلیہ مکان کے سبب کرایہ دار کا مطالبہ کرنا درست نہیں، البتہ مجبوری کی صورت میں مالک مکان کو دینے کی اجازت ہے، لیکن کرایہ دار کو لینے کی اجازت نہیں۔
- ۴- کرایہ داری کی مدت مقرر تھی اور اس مقررہ مدت سے قبل مالک مکان کرایہ دار سے مکان خالی کرانا چاہتا ہے تو اس کو رقم کے مطالبہ کا بدستور حق حاصل ہے۔
- ۵- اصل کرایہ دار کو حق ہے کہ کسی بھی نئے کرایہ دار کو اس میں رکھ دے اور جتنا چاہے کرایہ وصول کرتا رہے، لیکن سابقہ کرایہ دار کا معاملہ بدستور باقی رہے گا۔
- ۶- اصل کرایہ دار کو یہ حق نہیں کہ حق کرایہ داری کو فروخت کر کے نئے کرایہ دار کو مستقلاً اپنی جگہ مقرر کر دے۔
- ۷- بہتر اور جواز کی صورت یہ ہے کہ حق کرایہ داری کے عوض جتنی رقم لینا منظور ہو اصل کرایہ دار نئے کرایہ دار سے پہلے ماہ کے کرایہ میں اتنی رقم وصول کر لے، پھر خود برطرف ہو کر مالک کی مرضی سے نئے کرایہ دار کا مالک مکان سے معاملہ کرادے۔ مالک مکان بھی اگر اس نئے کرایہ دار سے کچھ رقم بطور پگڑی کے لینا چاہتا ہے تو مذکورہ حیلہ کے تحت لے سکتا ہے۔



## پگڑی کا مسئلہ

- مولانا عبداللہ جو لم نے اپنے اس عربی مقالہ میں پگڑی کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:
- ۱۔ اگر متعین مدت کے لئے مکان، دکان کرایہ پر دیئے گئے اور معاملہ کرایہ داری طے کرتے وقت ہی ماہانہ یا سالانہ کرایہ سے کچھ زائد رقم لینا، دینا طے پا گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، یہ زائد رقم کرایہ کا ایک جز تسلیم کیا جائے گا۔
  - ۲۔ اور اگر کرایہ داری کی مدت متعین نہیں کی گئی تو یہ عقد ہی صحیح نہیں، اور یہ زائد رقم بنام پگڑی لینا بھی درست نہیں ہوگا۔
  - ۳۔ کرایہ دار نے اگر متعین مدت کے لئے مکان، دکان کرایہ پر لیا اور وہ اس مدت کے اندر کسی دوسرے کرایہ دار کو مکان اسی مدت کے لئے دے اور کرایہ سے زائد رقم بصورت پگڑی لے تو جائز ہوگا۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیوبند

الف۔ اصل مالک مکان جو رقم پگڑی کے نام پر لیتا ہے اس کا لینا زرا جاہرہ پیشگی کی تاویل سے احقر جائز سمجھتا ہے۔

ب۔ ایک کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کو اپنا کرایہ کا مکان یا دکان وغیرہ دیتے وقت اس سے جو رقم لیتا ہے اس میں احقر کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ اس نے اگر اس مکان یا دکان وغیرہ میں کوئی تعمیری اضافہ کیا ہے، یا اس میں اس کا اثاثہ و سامان وغیرہ ہو اور اس کے عوض میں کرایہ پر لینے والے سے کچھ لینا چاہتا ہے، خواہ پگڑی کے نام پر لے تو احقر کے نزدیک اس کا لینا بھی جائز ہے گا۔

ج۔ ایسے موجودہ قوانین واجب الارض کے تحت جن قوانین میں کسی تبدیلی و تغیر کا اختیار نہ ہو تو ہندوستان جیسے ملک میں اس کا لینا دینا بھی اضطراب اجتماعی کی تاویل سے بندہ کے نزدیک جائز رہتا ہے۔

د۔ اس کے علاوہ اور جو لینا دینا محض حقوق مجردہ کے عوض کی بناء پر ہو، وہ البتہ ناجائز رہے گا۔

مفتی عبدالوہاب پٹیل، ویلور تامل ناڈو:

اجارہ کہتے ہیں مدت متعین کر کے معین مقدار عوض ہر دکان یا مکان کرایہ پر لے کر نفع اٹھانا، درمختار میں ہے: ”ہی تملیک نفع بعوض بیان المدة“۔

اجارہ کی اس تعریف سے دکان اور مکان کو کرایہ پر اٹھاتے وقت پگڑی لینے کا مفہوم نکالنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لہذا اپنی طرف سے پگڑی کی شرط لگانا باطل اور حرام ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگوں کو کیا ہوگا ہے کہ اپنی طرف سے ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو قرآن پاک میں نہیں ہیں، لہذا اپنی طرف سے سو شرطیں بھی لگالیں جو قرآن پاک میں نہ ہوں، باطل اور حرام ہیں۔ پس اجارہ پر پگڑی لینا باطل اور حرام ہے (بخاری شریف/ ۳۴۸)۔

مفتی خلیل احمد صاحب جامعہ نظامیہ حیدرآباد:

غیر اسلامی ملک میں پگڑی کی رقم لینا شرعاً جائز ہے۔ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ دارالحرب کے متوطنین سے مردہ جانور یا خون وغیرہ فروخت کر کے قیمت لی جاسکتی ہے۔ بنائی علیہ پگڑی کی رقم بھی لی جاسکتی ہے۔ البتہ اسلامی ملک میں یہ مسئلہ معرض بحث میں ہوگا۔



پگڑی کے لین دین کی مختلف نوعیتیں ہیں:

۱۔ یہ کہ مالک جائیداد خود کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لیتا ہے اور کرایہ علاحدہ مشخص کرتا ہے، اس بناء پر کرایہ دار خالی کرتے وقت دوسرے سے پگڑی کی رقم زائد یا کم لے کر مالک جائیداد سے کرایہ نامہ لکھا دیتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ کہ مالک جائیداد نے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم نہیں لیا۔ اب مارکٹ کا معیار بڑھ جانے کی وجہ سے کرایہ دار دوسرے کو پگڑی کی رقم لے کر دے دیتا ہے۔ مالک جائیداد سے کرایہ نامہ ہو جاتا ہے۔

پہلی صورت میں سوال یہ ہے کہ کرایہ کے علاوہ پگڑی کی رقم کس چیز کا معاوضہ ہے، کیونکہ جائیداد کا معاوضہ کرایہ دیا جا رہا ہے اس نوعیت سے جائز نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ پگڑی کی رقم کو ایک مدت معینہ کا کرایہ سمجھا جائے، یوں کہا جائے کہ کرایہ کا کچھ حصہ پیشگی لیا گیا اور کچھ حصہ ماہ بوماہ، یہ صورت جواز کی ہے۔

کرایہ دار کا از خود دوسرے کو جائیداد حوالہ کرنا اور پگڑی کی رقم لینا غیر مجاز تصرف ہے، مالک جائیداد کے حقوق کو سلب کرنا ہے، ہو سکتا ہے کہ مالک جائیداد کسی اور کو کرایہ پر دے۔

مولانا محمد آدم پالنپوری کا کوسی، گجرات:

الف۔ پگڑی کی رقم لینا مالک مکان کے لئے جائز ہے، کیونکہ یہ اجرت معجلہ ہے اور ماہ بوماہ وصول ہونے والا کرایہ اجرت مؤجلہ ہے، اگر کرایہ داری کی پوری مدت معین نہ ہو اور مالک مکان اس طرح کہے کہ پہلے ماہ کا کرایہ ایک لاکھ پانچ سو روپیہ پھر ہر مہینے کا کرایہ پانچ سو روپیہ ہوگا تو یہ صورت بھی جائز ہے (مستفاد از کفایۃ الفتی ۷/۳۳۹)۔

ب۔ ایک کرایہ دار دوسرے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم صرف اس صورت میں لے سکتا ہے جب کہ موجودہ کرایہ دار نے اس مکان یا دکان میں کوئی تعمیری کام کرایا ہو، چنانچہ بمسوط سرخسی (۱۵/۱۳۰) پر مذکور ہے:

”فان اجرھا باکثر مما استاجرھا به تصدق بالفضل الا ان یکون اصلح منها بناءً او زاد فیھا شیاً فحیثذ یطیب له الفضل“ اور فتاویٰ عالمگیری (۴/۳۳۵) پر مذکور ہے:

”ولو زاد فی الدار زیادة کما لو وتد فیھا وتدأ وحفر فیھا بئراً وطین او اصلح ابوابھا او شیئاً من حوائطھا طابت له الزیادة“

نیز در مختار میں اس مسئلہ میں ”او اصلح فیھا شیئاً“ جو آیا ہے اس پر علامہ شامی نے لکھا ہے:

”بان جصھا۔۔۔ وکذا کل عمل قائم لان الزیادة بمقابلة ما زاد من عنده حملاً لامره علی الصلاح“ (رد المحتار ۶/۲۹ مطبوعہ بمصر)۔

اگر موجودہ کرایہ دار نے اس مکان میں کوئی تعمیری کام نہ کرایا ہو تو وہ دوسرے کرایہ دار سے پگڑی نہیں لے سکتا۔

ج۔ کرایہ دار مالک مکان سے پگڑی کی رقم کسی بھی صورت میں نہیں لے سکتا ہے۔ (مستفاد از کفایۃ الفتی ۷/۳۳۸، فتاویٰ رحیمیہ ۳/۲۵۶)

مولانا مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی بھوپال:

کرایہ دار کیونکہ مالک نہیں لہذا صرف استعمال کا حق رکھتا ہے، فروخت کرنے کا حق نہیں، لہذا وہ کسی دوسرے کرایہ کو پگڑی لے کر دے تو یہ شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر اس نے دکان یا مکان میں اپنے صرف خاص سے اضافہ کیا ہو تو اس کا بدل لے سکتا ہے۔ مالک مکان پیشگی کرایہ کے نام سے رقم لے سکتا ہے، جبکہ ماہانہ کرایہ میں اس رقم کو وضع کر دے، لیکن اس رقم کو ضبط کر لینا جائز نہیں۔



مولانا سید نظام الدین صاحب، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ:

مکان یا دکان کی پگڑی کے مسئلہ پر غور کرتے وقت نفس مسئلہ کے علاوہ پگڑی کے مروجہ طریقہ کو سامنے رکھا جائے۔

۱۔ عقد اجارہ میں مدت معلوم ہونا چاہئے۔ مگر مروجہ طریقہ میں مدت متعین نہیں ہوتی۔

۲۔ پگڑی کا معاملہ زبانی ہوتا ہے۔ رقم کی کوئی رسید نہیں دی جاتی اور نہ کوئی لکھا پڑھی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ قانون میں پگڑی لینا صحیح نہیں ہے۔ عام طور پر یہ معاملہ حکومت سے چھپا کر کیا جاتا ہے اس طرح مالک مکان انکم ٹیکس دینے سے بچ جاتا ہے۔

۳۔ مروجہ پگڑی کی رقم مکان یا دکان کے جائے وقوع کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی ہے، اس کی کوئی حد نہیں۔ کبھی کبھی پگڑی کی رقم دکان یا مکان کی اصل قیمت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ماہانہ ملنے والے کرایہ کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہوتی۔

اگر کسی وجہ سے کرایہ دار دکان و مکان خالی کر دے تو پگڑی کی رقم لوٹائی نہیں جاتی، اس لئے کہ اس کی حیثیت پیشگی کرایہ نہیں ہے، بلکہ بظاہر یہ رقم فوری قبضہ کا بدل ہے۔

۴۔ پگڑی کی مروجہ شکل سے استحصال کا رنگ بڑھتا جاتا ہے۔ رہی مدت کا نہ ہونا اور معاملہ کو حکومت کی نظر سے چھپا کر کرنا اور کوئی دستاویز نہیں اور رقم کی کوئی حد نہیں۔ کیا شریعت اسلامی مروجہ صورت میں پگڑی کی اجازت مطلقاً دیتی ہے، یا کچھ شرائط کے ساتھ۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر مکان یا دکان کا عقد اجارہ باضابطہ تحریری اگر سینٹ کے ذریعہ ہوتا ہے اور مدت کا تعین ہوتا ہے، اس میں پگڑی نہیں ہوتی، مالک مکان پگڑی لینے کے بجائے وقت مقررہ پر مکان خالی کرانے کو زیادہ ترجیح دیتا ہے اور اس میں کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔ جب کہ پگڑی میں کرایہ کم اور کبھی کبھی برائے نام ہوتا ہے۔ البتہ اس طرح کے عقد اجارہ میں اکثر مکان یا دکان کا مالک ایک بڑی رقم بطور پیشگی کرایہ لیتا ہے، جو بالاقساط کرایہ کی رقم سے وضع ہوتا ہے اور یہ بات معاہدہ میں زبانی اور تحریری طور پر شامل ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کی تنقیح کرتے ہوئے اس کی جائز صورتوں کو واضح کیا جائے اور جو صورتیں ناجائز ہیں ان کو واضح طور پر ناجائز کہا جائے۔

مولانا محمد حنیف، مفتی مدرسہ ریاض العلوم، گورنری جوینور:..... پگڑی والے مسئلہ میں یہ گزارش ہے کہ تملیکات جو از قبیل مبادلات اور معاوضات ہیں ان میں بدل اور عوض لینے کے لئے جائز شکل اس ناکارہ کے محدود علم میں صرف دو صورتوں میں منحصر ہیں:

۱۔ تملیک العین بالعوض کہ اس کا دوسرا نام بیع ہے۔

۲۔ تملیک المنافع بالعوض کہ عبارت ہے اجارہ اور استجارہ سے۔ اور کھلی بات ہے کہ منافع میں ملکیت کسی عین کے تابع ہی ہو کر ثابت ہو سکتی ہے، اس لئے کہ منافع کا وجود استقلالی ممنوع ہے؛ چنانچہ اس کے وجود کے غیر استقلالی اور غیر قائم بالذات ہونے ہی کے سبب فقہاء اس پر ایراد عقد کو خلاف قیاس، ثابت بالنص نیز معلل بالضرورت اور مقید بالتعامل فرماتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کی تملیک کسی سے بلا ملک اور بغیر المالك غیر متصور ہے، لہذا ابتدائی یکبارگی یا کرایہ داری کی جملہ مدت میں باقساط مالک مکان کرایہ دار سے جو کچھ پگڑی کے نام پر وصول کرتا ہے، اس کے تجویز کی توجیہ تو حسب قواعد شرعیہ ممکن ہے، چنانچہ بعض اکابر مثلاً مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کفایت المفتی میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور جواز مؤجذ بھی ہے، باقی بعد ازاں کرایہ دار عین مستجارہ اور اس کے تابع ہو کر اس کے منافع کا جب مالک ہی نہیں ٹھہرا اور نہ مالک کی طرف سے مجاز اور وکیل ہی ہے، پھر کسی سے بعوض یا بلا عوض تملیک منافع اور اس کا عوض وصول کرنے کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے۔“

مولانا نسیم احمد قاسمی، امارت شرعیہ، پٹنہ:

پگڑی کا رواج تقریباً ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ہے، ہندوستان کے مراکز دہلی، بمبئی، کلکتہ وغیرہ میں اس کا رواج اس قدر عام ہے کہ چھوٹی چھوٹی دکانوں اور مکانات پر بھی ہزاروں روپے ”پگڑی“ کے نام پر مالکان کرایہ داروں سے وصول کرتے ہیں، پگڑی کی مروجہ صورتیں اور ان کا حکم شرعی حسب ذیل ہے:

پگڑی کی پہلی صورت یہ ہے کہ مالک مکان و دکان کرایہ دار سے بوقت کرایہ ماہوار متعینہ کرایہ کے علاوہ یکمشت ”پگڑی“ کے نام سے ایک بڑی رقم وصول

کرتا ہے اور بسا اوقات یہ پگڑی کی رقم دکان و مکان کی اصل مالیت و قیمت سے بھی زیادہ ہوتی ہے، نیز اس صورت میں عموماً کرایہ کم ہوتا ہے، اور پگڑی لینے کی صورت میں عموماً مالک مکان و دکان اپنے حقوق مالکانہ سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے۔

پہلی صورت جائز ہے۔ اور یہ سمجھا جائے گا کہ مالک نے اس طرح کرایہ کا کچھ حصہ یکمشت تعجیل و وصول کر لیا ہے اور اس کا کچھ حصہ قسطوں میں وصول کر رہا ہے۔۔۔ فقہاء کرام کے یہاں اس کی نظیر بھی موجود ہے، علامہ شامی پگڑی کی ایک صورت کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہاں یہ طریقہ مروج ہے کہ صاحب "خلو" جب مکان معمولی کرایہ پر لیتا ہے، تو ناظر اوقاف کو کرایہ کے علاوہ کچھ مزید درہم دیتا ہے، جس کو "خدمت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ دراصل اجرت مثل کا تکملہ ہے، (رد المحتار المعروف بالثامی ۱۷/۳)۔ علامہ شامی نے کتاب البیوع اور کتاب الاجارہ میں "بدل خلو" اور "کدک" (شامی ۱۵/۳-۱۶) وغیرہ پر بڑی محققانہ بحث کی ہے، جس سے پگڑی کی مذکورہ صورت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

پگڑی کی دوسری صورت یہ ہے کہ جب کرایہ دار اپنی مرضی سے وہ دکان یا مکان کسی دوسرے کرایہ دار کو دیتا ہے تو اس سے کرایہ کے علاوہ جتنی چاہتا ہے "پگڑی" کے نام پر رقم وصول کرتا ہے، جس کا وہ خود مالک قرار پاتا ہے، البتہ کرایہ حسب سابق مالک کو ملتا رہتا ہے اور کبھی اس پگڑی کی رقم کا ایک حصہ مالک کو بھی دے دیا جاتا ہے۔

اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان جو مدت متعین ہوئی تھی وہ مکمل ہوئی تو اس صورت میں کرایہ دار کا کسی اور کو مکان کرایہ پر دینا اور اس سے صاحب مکان کی اجازت کے بغیر "پگڑی" وصول کرنا، یا اس صورت میں خود مالک مکان سے پگڑی وصول کرنا شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ مدت اجارہ کی تکمیل کے بعد کرایہ دار کا مکان پر کوئی حق باقی نہیں ہے کہ وہ اس کا عوض طلب کرے، اور اگر کرایہ دار مدت متعینہ کے اندر اسے کرایہ پر دے کر "پگڑی" کی رقم حاصل کرتا ہے تو یہ جائز ہے، کیونکہ اجارہ عقد لازم ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے "الفقہ الاسلامی وادلہ ۴/۷۰۳-۷۰۸، المغنی لابن قدامہ ۵/۲۰۹ ہدایۃ المحتاج ۲/۲۲۷)، اس کے ذریعہ کرایہ دار کو حق استفادہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ ایسا ایک حق ہے جسے فروخت بھی کیا جاسکتا ہے، (فقہاء نے حقوق کی دو قسمیں کی ہیں: حقوق مجردہ، حقوق غیر مجردہ، حقوق مجردہ کا عوض لینا حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ جیسے حق شفعہ، البتہ حقوق غیر مجردہ کا عوض جائز ہے، جیسے حق قصاص وغیرہ "الفقہ الاسلامی ۳/۲۱" علامہ شامی نے لکھا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی بعض حقوق کا عوض لینا جائز ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے شامی ۱۵/۳) نیز کرایہ پر مکان لینے کی صورت میں کرایہ دار کو اس کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اس نے جس کام کے لئے اس مکان یا دکان کو حاصل کیا ہے اسے اسی کام کے لئے کسی دوسرے کو کرایہ پر دیدے (بدایۃ المجتہد ۲/۲۲۹، مسو ۱۵/۷۸)، لہذا جب مدت اجارہ باقی ہے تو کرایہ دار کو اس کا اختیار ہے کہ چاہے تو خود اس حق سے استفادہ کرے یا اسے فروخت کر دے۔

جب مالک مکان اپنا مکان کرایہ دار سے خالی کرنا چاہتا ہے تو اس وقت کرایہ دار اس سے کچھ رقم وصول کرتا ہے۔

اس کے اندر بھی وہی تفصیل ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ مدت اجارہ کے اندر کرایہ دار مالک مکان یا دوسرے کرایہ دار سے "پگڑی" وصول کر سکتا ہے۔ البتہ مدت اجارہ کے ختم ہو جانے کے بعد کرایہ دار کا بغیر "پگڑی" لئے ہوئے مکان خالی نہ کرنا ظلم و زیادتی ہے، جس کا شریعت اسے حکم نہیں دیتی ہے، جب مدت ختم ہوگئی تو از روئے معاہدہ کرایہ دار کو مکان خالی کر دینا لازم ہے۔

☆☆☆



## پگڑی کا مسئلہ

(یکم اپریل ۱۹۸۹ء)

دوسری نشست بعد نماز عصر ۵ بجے شام کو مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی کی صدارت میں شروع ہوئی اور تلاوت قرآن کے بعد مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے پگڑی کے مسئلہ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ پگڑی کا رواج نیا نہیں ہے، فتاویٰ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی ہجری میں اس کا رواج ہو چکا تھا، محمد بن ہلال حنفی متوفی ۹۵ھ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے اور پگڑی کو جائز قرار دیا ہے، جمہوری نے بیان کیا ہے کہ ان کے شیخ نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے جس میں محمد بن ہلال کی رائے کو رد کیا ہے، مختصر شیخ خلیل کی شرح میں درودیر نے اس پر بحث کی ہے۔

یہ رواج کبھی صرف قاہرہ میں رہا اور کبھی دوسرے شہروں میں بھی، سلطان غوری نے غوریہ نامی شہر میں جملوں کی دکانیں کچھ رقم لے کر کرایہ داروں کو دی اور ان کے حق خلو کے لئے تحریر لکھ کر دی، کتابوں میں یہ بھی آتا ہے کہ پگڑی کے نام پر اس زمانے میں لوگ چار سو دینار تک لیا کرتے تھے۔

فقہ کی اصطلاح میں جسے ہم اجارہ کہتے ہیں، پگڑی اسی ذیل میں آتی ہے، پگڑی کے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں ذیل کے نکات کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

(۱) مکان یا دکان یا آراضی بحیثیت مالک جب ہم کسی کو کرایہ پر دیتے ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے کرایہ کی مدت معین کر دی ہے یا نہیں، اجارہ کا مفہوم ہے منافع کی بیع، اور عقود و معاملات میں کوئی پہلو مبہم نہیں ہونا چاہئے جو منقضی الی المنازعہ ہو۔

(۲) معقود علیہ بہر حال معلوم ہونا چاہئے، کرایہ کتنا ہوگا، یہ بھی طے ہونا چاہئے، چاہے کرایہ روزانہ یا ماہوار کی بنیاد پر ہو، اور چاہے سال یا سیزن کی بنیاد پر۔

(۳) کرایہ داری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بھی طے ہو جائے کہ کتنے دنوں کے لئے مکان یا دکان کرایہ پر رہے گی، اس مدت کے اندر دکان یا مکان کے مالک کو خالی کرانے کا حق نہیں ہوگا، اگر مدت طے نہ ہو تو اس سے جھگڑے پیدا ہوں گے، اگر مدت کا تعین ہو جاتا ہے تو مدت کے اندر مالک کو مکان خالی کرانے کا حق نہیں رہتا، اصل ماہ النزاع مسئلہ وہ ہے جس میں اگر مکان یا دکان کی کرایہ داری کی مدت کا تعین نہیں ہوتا، وہ معاملات جس میں مدت کی صراحتاً تعین نہیں ہوتی تو رفع ابہام کے لئے عرف و عادت سے مدد لی جاسکتی ہے، یا نہیں، عرف عام یا عرف خاص کے ذریعہ مدت کا تعین کر سکتے ہیں نہیں؟ ”ما ثبت بالعرف کما ثبت بالنص“ بعض لوگ لیز کرتے ہیں گیارہ مہینے پر اور ایک خاص مدت کے تعین کے ساتھ کرایہ طے ہوتا ہے، اگر گیارہ مہینے کے لئے کرایہ پر طے ہوا ہو تو شاید اس صورت میں پگڑی نہیں لی جاتی اور جہاں پگڑی لی جاتی ہے اس میں مدت متعین نہیں ہوتی، پگڑی کا لینا مالک کے حق میں مکان کے لئے عیب بن جاتا ہے، اسی وجہ سے ایسے مکان کا زرخشن کم ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ مکان مالک کے قبضے میں نہیں رہتا بلکہ کرایہ دار کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔

(۴) پگڑی کے نام پر جو رقم مالک مکان کرایہ دار سے وصول کرتا ہے وہ اصل کا جزء ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ کہ وہ رشوت ہے جس کا لینا دینا حرام ہے؟

(۵) مالک مکان سے جس مدت اور مصرف کے لئے کرایہ دار نے مکان لیا ہے، اسی مدت کے اندر اسی مصرف کے لئے دوسرے کرایہ دار کو یہ کرایہ دار مکان دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ دوسرے کرایہ دار سے پگڑی لے سکتا ہے یا نہیں؟ یہ امر بھی زیر غور آنا چاہئے کہ دوسرے کرایہ دار سے کس حد تک کرایہ لے سکے گا، کیا اتنا ہی جتنا کہ خود اصل مالک کو ادا کر رہا ہے، یا اس سے زیادہ بھی لے سکتا ہے؟

امام اعظم کے نزدیک پہلا کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کو کرایہ پر دے سکتا ہے، لیکن اصل کرایہ سے زیادہ نہیں لے سکتا، کیونکہ امام اعظم کے نزدیک حقوق کی بیع جائز نہیں، امام شافعی کے یہاں حقوق کی بیع جائز ہے۔ اس لئے پہلا کرایہ دار دوسرے کرایہ دار سے اصل کرایہ کی رقم سے زیادہ بھی لے تو ان کے نزدیک جائز ہے، پہلے کرایہ دار نے جس مصرف کے لئے مکان لیا ہے، اس مصرف کے سوا دوسرے مصرف کے لئے



کرایہ پر کسی کو مکان دے تو فقہاء اسے ناجائز کہتے ہیں۔

(۶) بلا تعین مدت پگڑی لے کر مکان کرایہ پر دیا گیا اور ذہنی طور پر یہ طے کیا کہ کرایہ دار کو ابدی طور پر رہائش اور انتفاع کا حق منتقل ہو گیا تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں کرایہ دار دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟

(۷) بیع میں مال ہونا ضروری ہے، مال کا مطلب خصوصاً احناف کے یہاں اعیان سمجھا جاتا ہے، دوسرے ائمہ کے یہاں حقوق بھی مال ہیں، بعض حقوق محض دفع ضرر کے لئے ہوتے ہیں، مثلاً حق شفعہ دفع ضرر کے لئے ہے، اب اگر شفیع اپنا حق شفعہ بیع دیتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ اس کو کوئی ضرر نہیں ہے، حالانکہ ضرر ہی کی وجہ سے شریعت نے اس کو یہ حق دیا ہے، اس لئے ایسے حقوق کی بیع کی اجازت نہیں دی جاسکتی، لیکن جن حقوق کی مشروعیت محض دفع ضرر کے لئے نہیں ہے، بلکہ ان کی ایک مستقل حیثیت ہے، وہ ثابت شدہ درجہ رکھتے ہیں، ان کے سلسلے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کی بھی بیع درست نہیں، جبکہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بہت سے حقوق کی بیع کا بھی فتویٰ دیا گیا ہے۔ آپ کو طے کرنا ہے کہ کرایہ دار کو جو بعض مخصوص حقوق حاصل ہو جاتے ہیں، خصوصاً اس مکان میں جس کے مالک نے پگڑی لے کر خود اپنے حق کو محدود کر لیا ہے، کیا وہ حق جو کرایہ دار کو آج کے عرف میں حاصل ہوتا ہے، کیا وہ ثابت اور مستقل ہے یا نہیں؟ اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جائے یا ناجائز؟ اس کی حیثیت مال کی ہے، یا نہیں؟ اگر کسی کی سمجھ میں اور تنقیح ہو تو مجھے بتادیں گے۔

حکیم ظل الرحمن صاحب:

ایک چیز گڈول ہوتی ہے، اسی کے بدلے میں پگڑی ملتی ہے، مکانوں کی پگڑی مالک کو بسا اوقات کرایہ دار اس لئے دیتے ہیں کہ پگڑی دے کر دوسرے بہت سے اخراجات سے کرایہ دار بیچ جاتا ہے۔

قاضی صاحب:

آپ جو کچھ بھی کہیں، یہ ہے بہر حال ایک حق۔

مولانا افضل الحق صاحب:

چند باتیں جو آپ نے فرمائیں بنیادی طور پر وہ صحیح ہیں، لیکن ایک بات اور ہونی چاہئے کہ حق ملکیت کیا چیز ہے؟ شرعی طور پر حق ملکیت اور چیز ہے اور قانونی طور پر حق ملکیت اور ہے، حق ملکیت اس طرح پر ہے کہ آج کے کرایہ دار کے مالکانہ حقوق مالک مکان سے زیادہ ہیں، کرایہ دار کو سرکار نے مالکانہ حقوق میں سے بعض حقوق دیئے ہیں، ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ سرکار نے کرایہ دار کو مالک سے جو زیادہ حقوق دیئے وہ شرعی طور پر کہاں تک درست ہیں، یہ بھی غور کرنا کہ سرکاری قانون اور شرعی قانون میں جب ٹکراؤ ہو جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کس پر عمل کرنا چاہئے۔

قاضی صاحب:

آپ اپنی رائے دیجئے۔

مولانا افضل الحق صاحب:

میں تو ابھی رائے نہیں دے رہا ہوں مسئلے کی تنقیح کر رہا ہوں۔

قاضی صاحب:..... بہت اچھا۔

ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری صاحب:

جو مضامین پڑھے گئے وہ بہت اہم ہیں، جن سے کئی پہلو سامنے آئے، وہ بھی بنیادی طور سے مولانا مجاہد الاسلام صاحب نے بہت اچھی اور تفصیلی بات کی، لیکن عرض یہ ہے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ حقوق ہیں جو اللہ کے مقرر کردہ ہیں اور یہ منصوص ہوتے ہیں، دوسرے حقوق وہ ہیں جو اللہ کے مقرر کردہ نہیں ہیں، ان حقوق سے اگر ظلم و تعدی پھیلے تو ان کا احترام نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان پر پابندی لگائی جائے گی، ہمیں فیصلہ کرتے وقت

یہ دیکھنا ہے کہ کوئی چیز اسلام کے بنیادی اقدار سے تو متصادم نہیں ہے، یا شریعت کا کوئی حکم تو اس سے نہیں بدل رہا ہے، اگر ان میں سے کوئی بات ہے تو چاہے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہو، ہم اس فتویٰ پر پھر غور کریں گے، اور اگر وہ ظلم کا ذریعہ بن رہا ہو تو ہم عدم جواز کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ پگڑی ظلم کا ذریعہ ہے، بلکہ یہ شیطانی چکر ہے اور یہ استحصال کا ذریعہ بنتی ہے، کیا ہم ان چیزوں کو جو ہمارے یہاں رائج ہو گئی ہوں، خواہ ان کے ذریعہ ظلم ہو رہا ہو اور خواہ ان کی بنیاد عرف فاسد کیوں نہ، محض رائج ہو جانے کی وجہ سے جائز کہیں گے۔ پگڑی کا مسئلہ براہ راست اسلام کے نظام عدل سے ٹکراتا ہے، جب تک ہم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہ کر سوچیں گے۔ بہت سے ظلم و عدوان کی صورتوں کے جواز کا فتویٰ دے دیں گے، میں کہوں گا کہ اس دور میں تمام اسلامی تحریکات میں جو بات بھی سوچی گئی، وہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہ کر سوچی گئی، جس کی وجہ سے بہت سی چیزیں جائز کر لی گئیں۔ جب تک اسلام کے نظام عدل کے اندر رہ کر نہیں سوچیں گے، اور جب تک ہم سرمایہ دارانہ نظام کو توڑ پھوڑ کر نہیں رکھ دیں گے، اس وقت تک ہم اسلام کے نظام پر پورے طور پر عمل نہیں کر سکتے، اگر قانون ظلم اور استحصال کو روکنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، تو اس کی پیروی اور اکرام و احترام میرے نزدیک شرعاً ضروری ہے۔

پگڑی کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ کے بعض نظریات کو قبول کر لیا جائے تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہم اس سے علاحدہ ہیں جبکہ کتاب و سنت کی رو سے وہ اوفق بالشرع ہیں، بالخصوص اس وقت جب کہ پگڑی کے معاملہ میں آپ کہہ رہے ہیں کہ تسلیم کر لیا جائے کہ حقوق کی بیع ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ حق پیدا ہوا یا نہیں، تو یہ دروازے ظلم و عدوان کے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں اور میرے سامنے پگڑی کا یہ رواج جو آج کل ہے وہ اسلام سے متصادم ہے اور میرے نزدیک اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔

مولانا ابوالحسن صاحب:

بدل خلو کے مسئلہ پر اب تک جو بات چیت ہوئی، مقالے پڑھے گئے اس میں جو باتیں ہمارے سامنے آئیں، کچھ رجحان تو وہ ہیں جیسا کہ مقالے آپ کے سامنے پڑھے گئے، اس میں پگڑی کے مسئلے پر اکثر حضرات کا رجحان جواز کی طرف ہے، مگر اس میں جیسا کہ مولانا مجاہد الاسلام صاحب نے نتیجہ کیا ہے کہ اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب اجارہ کی مدت مجہول اور کرایہ دار اور مالک کے درمیان مدت کی کوئی تعیین نہ ہو، ایسی صورت کے اندر فقہ کی رو سے یہ اجارہ جب صحیح نہیں ہے، تو ایسی حالت کے اندر کسی کرایہ دار سے دوسرے کو پگڑی دے کر بیچنے کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ جب کرایہ دار کا اپنا معاملہ اجارہ صحیح نہیں ہے فاسد ہے، تو یہ کس طرح درست ہوگا کہ وہ اس حق میں تبدیلی کرے یا کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے، اس لئے اس مسئلہ میں ذرا تفصیلی بحث ہونی چاہئے، اور میرا خیال یہ ہے کہ آپ کے اجارہ کی وہ شکلیں جس میں کرایہ کی رقم اور مدت متعین ہو اور مالک جس میں یہ سمجھتا ہے کہ اب وہ سارے حقوق کرایہ دار کو دے رہا ہے، تو اس صورت میں کرایہ دار کو دی ہوئی پگڑی کی رقم سے زیادہ لینا یا اتنا ہی لے کر دوسرے کو کرایہ پر دینا درست ہوگا، اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن یہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جیسا کہ ہمارے مقالہ نگار حضرات نے خاص طور پر مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب نے بتایا کہ جبکہ کرایہ دار اور مالک کے درمیان پہلے سے یہ بات طے ہو گئی ہو، اور پگڑی کی رقم انہوں نے گویا کرایہ کے طور پر نہیں بلکہ مکان کی قیمت کے طور پر وصول کیا ہو، ظاہر ہے اس صورت میں جب وہ اس چیز کو فروخت کر چکا ہے اور عرف کے اندر اس کو بیع سمجھا جاتا ہے اور مدت کے اندر اندر جبکہ معاملہ متعین مدت کے اندر ہو رہا ہے، تو اس صورت میں کرایہ پر دیتا ہے دوسرے کو، اور خود پگڑی وصول کرتا ہے، تو ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں شرعی نقطہ نظر سے کوئی قباحت نہیں ہے، اور جو ہمارے ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ آج کل جو پگڑی کا رواج ہے یہ ظلم و تعدی ہے، یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ہم ظلم و تعدی کس کو کہیں گے، ظلم و تعدی تو اس صورت میں ہے جبکہ جبراً قہراً اس پر کوئی چیز مسلط کی جائے، اور جب مال کی مقدار مالک اور کرایہ دار آپس میں خود رضامندی سے طے کر رہے ہیں اور وہ اپنے نفع نقصان کو سمجھ کر معاملے طے کر رہے ہیں، تو ایسی حالت میں میں سمجھتا ہوں کہ اس کو مزاج اسلام اور اس کے نظام عدل کے خلاف اور ظلم و تعدی قرار دینا صحیح نہ ہوگا، اس لئے آج کی محفل میں ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ایسی صورت میں جس میں کوئی تصریح موجود نہیں ہے، یا جس میں صراحت نا جائز ہونے کی موجود ہے، ہم اس کو جائز قرار دیں تو درست نہ ہوگا، اس لئے کرایہ اور پگڑی کے سلسلے میں ہمارے مقررین اور مقالہ نگار نے جس پہلو پر روشنی ڈالی ہے، وہ صحیح اور درست ہے اور جن پہلوؤں پر ابھی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے اس پر دوبارہ غور کریں اور تمام حضرات اس کو تسلیم کریں۔



مولانا جلال الدین انصاری صاحب:

اس میں دوسرا سوال یہ ہے کہ پگڑی کرایہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ پگڑی کو کرایہ کا حصہ قرار دینا بڑی زیادتی ہے یہ دراصل قانون ملکی سے بچنے کی ایک تدبیر ہے، جس طرح انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس دیئے جاتے ہیں، اسی طرح کی چیز ہے، اس لئے آج ملکی قانون سے بچنے کے لئے یہ تدبیر کی جاتی ہے، پہلے پگڑی کے نام پر کبھی حاصل کر لی جاتی ہے، اس طرح یہ ڈھنگ اپنایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کو فقہی طور سے جائز نہیں کہا جاسکتا، اور ایک بات یہ کہی گئی کہ مدت کی تعیین ضروری ہے، لیکن موجودہ حالات میں مدت کی تعیین نہیں ہوتی اور اس میں بھی مدت کی تعیین نہیں کی جاتی ہے کہ گیارہ مہینے کی رسید کاٹی جائے گی اور بارہ مہینے کی نہیں کاٹی جائے گی، اس لئے کہ اگر بارہ مہینے کی رسید مل گئی تو کرایہ کے مالک کو جھٹ سے یہ استحقاق ہوگا آپ پر، اور آپ کو مکان خالی کروانے کا استحقاق نہ ہوگا، اور اس طرح مجبوری یہ ہے کہ اگر کرایہ دار کو یہ حق دے دیا جائے یا اسے خالی کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس طرح سے کسی کا بھی کاروبار جم نہیں سکتا ہے، آدمی کو اپنا کاروبار جمانے میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔۔۔ اور اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ یہاں کاروبار سے بھگا دیا جائے گا اور کاروبار نہیں چلے گا، نفع نہ ہوگا تو کوئی بھی آدمی یہاں آنے کو تیار نہیں ہوگا، اس لئے دقت دونوں طرف ہے، لہذا ان دونوں پہلو پر غور کرنا چاہئے اور موجودہ حالت میں مدت کی کوئی تعیین وغیرہ نہیں۔ اس میں مجلس فقہ اسلامی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، جو میرے خیال میں صحیح نہیں۔ کیونکہ وہ صورت یہاں پائی نہیں جاتی، نیز اس وقت جو پگڑی کا عام رواج ہے کرایہ دار اس کو ایک ذریعہ زندگی اور سرمایہ سمجھتے ہیں اور ضروری ہو یا نہ ہو، اسے باقی رکھتا ہے، اور دوسری طرف مالک اس سے خالی کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر فضل الرحمن صاحب نے جو فرمایا وہ بھی اہم ہے اور یہ ظلم دونوں طرف سے ہوتا ہے اور موجودہ حالت میں میرا خیال یہ ہے کہ ملک کے قوانین کے تحت پیدا ہونے والی جو دشواریاں ہیں، انہیں سامنے رکھا جائے اور اس کا حل تلاش کیا جائے۔

ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب:

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ اس قسم کے مسائل پر رائے دیتے وقت صرف فقہی جزئیات پر نظر نہیں رکھنی چاہئے، بلکہ دین کے مجموعی مزاج کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے، حقیقی قیمت کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ ایک اضافی چیز ہے، کوئی مستقل چیز نہیں ہے، اس وقت پگڑی کا جو طریقہ رائج ہے، کیا عقد کی صحت کے لئے یہ بات ضروری نہیں کہ عاقدین کی معاشی حالت یکساں ہو؟ ایک امیر شخص جب غریب آدمی سے عقد کرتا ہے تو غریب کی غربت سے بے جا فائدہ اٹھا کر غریب کو مجبوری کی پوزیشن پر کھڑا کر دیتا ہے۔ آپ غور کریں کہ کیا ان کی حیثیت مساوی ہے، اور کیا عقد کی ہر شرط پوری ہو رہی ہے؟ یہ بھی دھیان میں رکھیں کہ پگڑی کی رقم لکھ کر نہیں دی جاتی ہے، کیونکہ لکھنے کی صورت میں ٹیکس لگ جانے کا خطرہ رہتا ہے، پگڑی بھی سود کی طرح دولت سمیٹنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ صرف فقہی جزئیات کی تنقیح کا نہیں ہے بلکہ یہ ان امور میں سے ہے جو اخلاقی اور سماجی اقدار سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا برہان الدین سنہلی صاحب:

اصل نقطہ بحث یہ ہے کہ اگر تعیین مدت کے بغیر کرایہ پر دیا تو اصلاً ایک مہینہ کے لئے ہوتا ہے۔ پھر دوسرے مہینہ کا پہلا دن آیا اور مالک خاموش رہا تو دوسرے مہینہ کے لئے ہو جائے گا، یہ جب ہوتا ہے جب ماہوار کے حساب سے دیا گیا ہو اور مدت کی تعیین نہ ہوئی ہو، تو مدت کا متعین نہ ہونا مضر نہ ہوگا۔ ایک ہے ملکی قانون اور ایک ہے فقہی مسئلہ، ہم ملکی قانونی نہیں بدل سکتے۔ لیکن شرعی مسئلہ بتا سکتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایک کمیٹی بنا دی جائے، فقہ کی کتابوں میں جو خلوا الحوانیت کے الفاظ آئے ہیں، ان سے مراد دوکان خالی کرنا نہیں ہے، بلکہ سیاق و سباق کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد چھبہ وغیرہ قسم کی کوئی چیز ہے جو اعیان میں سے ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:

اجارہ خلاف قیاس ہے، جو منصوصات ہمارے سامنے ہیں، وہ پگڑی کو جائز قرار نہیں دیتے۔

مولانا احمد علی قاسمی صاحب:

اگر کوئی مالک مکان مجبور ہو، اور پگڑی دیئے بغیر مکان خالی نہ کر اس کے تو کیا حکم ہے؟



ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب:

مقالات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن و سنت سے استدلال کرنے کے بجائے شامی اور درمختار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ دھیان میں رکھنا چاہئے کہ ”الضرورات تبیح المحظورات“ ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ پگڑی کی رقم بطور ضمانت ہے یا کیا ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

مصالح شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے عرف و رواج پر عمل کرنے کی گنجائش نکلتی ہو تو نکالی جانی چاہئے۔

مولانا عزیز الرحمن صاحب فتحپوری:

”سکنی“ اور ”خلو“ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زمین الگ اور مکان الگ، کسی نے بنا اور غرس (تعمیر اور درخت) کے لئے زمین اجارہ پر لیا، اپ مدت ختم ہو گئی تو کیا حکم ہوگا کہ مکان توڑ ڈالو، درخت نکال لے جاؤ، تو وہ شخص جو اپنی رقم سے باغ یا مکان لگاتا ہے، یا مالک مکان اس سے رقم لے کر بناتا ہے، اور اس میں اپنی زمین کا حق جس بھی لے لیتا ہے، فقہاء کرام اسے خدمت یا تصدیق کہتے ہیں، سکنی ایک زائد چیز ہے، خلو ایک الگ چیز ہے، مجرد وضع یہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس کے عوض کوئی کچھ لینا چاہئے تو واقعی یہ رشوت ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

سکنی سے مراد وہ لکڑیاں ہیں جو مکان کے ساتھ جڑ جاتی ہیں، ان کی قیمت وصول کی جاسکتی ہے یا نہیں، اس کو قرار بھی کہا جاتا ہے، محمد ابن ہلال حنفی نے اس سے یہ مفہوم لیا ہے۔

مفتی نسیم احمد صاحب مظفر پوری:

بدل خلو پیشگی کرایہ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مکان کی قیمت سے زیادہ پگڑی لینا جائز ہے یا نہیں؟ یہ بات بھی زیر بحث آنی چاہئے کہ حق ملکیت کیا چیز ہے؟

مفتی خلیل احمد صاحب حیدرآبادی:

پگڑی لینا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ وہ کسی چیز کا عوض نہیں، اسے کرایہ پر مکان دینے کا عوض کہا جاسکتا ہے، لیکن اس عمل کے عوض کچھ لینا دینا درست نہ ہوگا، رشوت ہوگا، جیسے فقہاء نے نکاح کرانے کے عوض کا لینا رشوت اور حرام قرار دیا ہے، پگڑی کو پیشگی کرایہ قرار دیا جائے تو درست ہوگا، کرایہ دار کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ پگڑی لے کر کسی اور شخص کو کرایہ پر وہ مکان دے۔

مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی صاحب:

اب تک کی تحقیق کے مطابق پگڑی کا رواج دسویں صدی ہجری میں شروع ہوا، یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ پگڑی کا مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ ہے، گرچہ اس کے پیچھے استحصالی ذہنیت کا رفرما ہو سکتی ہے۔ حقیقی کرایہ اور مروجہ کرایہ کی تفریق کسی درجے میں موثر تو ہو سکتی ہے، لیکن پگڑی کی رقم کی تعیین میں واحد عامل نہیں ہے، پگڑی کی بنیاد اب عرف پر ہے، عرف بھی صحیح ہے فاسد نہیں، بعض احادیث سے حق کا مال ہونا ثابت ہے، اس لئے عرف کی بنیاد پر کرایہ دار کو اور مالک کو پگڑی کی رقم لینے دینے کا حق ہونا چاہئے۔

جناب ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب:

یہ کہنا کہ حقیقی کرایہ کوئی چیز نہیں ہے صحیح نہیں ہے۔

مفتی محمد زید باندہ:

حتی الوسع اس بات کی سعی کی جائے کہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے جو چیزیں جائز ہو سکتی ہیں ان کے لئے جواز کی راہ اختیار کی جائے۔

مفتی انور علی اعظمی:

پگڑی عام طور پر اس وقت ہوتی ہے جب مدت کرایہ نہیں ہوتی، اہل علم، اہل فتویٰ اور اہل فقہ حضرات کو چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے، ایسے مسائل کو آسان بنائیں۔ اگر پگڑی کے جواز کا اعلان ہو تو عوام بڑی دشواریوں میں پڑ جائیں گے۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

پگڑی ایک طرح کی سماجی ضرورت بن گئی ہے اس میں قصور وار نہ مالک مکان ہے نہ کرایہ دار، اس کے پیچھے استحصالی ذہنیت کے کار فرما ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، فقہائے متاخرین نے جس طرح بعض حقوق کی بیع کو عموم بلویٰ کی بناء پر درست قرار دیا ہے، اس طرح پگڑی کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا؟ پگڑی کے ساتھ جو اجارہ ہوتا ہے اس میں مدت متعین ہی نہیں ہوتی، متعین مدت فرض کر کے ہمیں ہوائی بحث سے احتراز کرنا چاہئے۔

مولانا سعود عالم صاحب قاسمی:

اسلامی نظام عدل کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے، کیا پہلے زمانے میں موجودہ دور جیسا استحصال تھا، ہمارے زمانے میں سراسر استحصال ہے، یہ معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہیں ہوتا، یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہر وہ چیز جو باہمی رضامندی سے ہو وہ جائز ہوگی؟ اگر ایسا ہے تو کیا سود جائز ہوگا؟ مدت کی تعیین کے سلسلہ میں مولانا برہان الدین سنہلی نے فقہاء کا یہ قول جو بیان کیا ہے کہ ایک ماہ کے ختم ہونے پر دوسرے ماہ کی مدت خود بخود مقرر ہو جائے گی تو میرا خیال ہے کہ ایسا فقہاء کے زمانے میں ہوگا، ہمارے زمانے کے لحاظ سے تو پگڑی ہر حال میں ناجائز ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب:

فقہاء نے جو تعیین مدت کی شرط لگائی ہے وہاں یہ شرط بذات خود مقصود نہیں ہے، بلکہ دفع نزاع مقصود ہے۔ جہاں تعیین نہ پایا جائے وہاں بھی اجارہ درست ہونا چاہئے۔ حق کا تعلق ایک شیء کی ذات سے ہے، دوسرے اس کے قبضے سے۔ کیا ایسی کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ ذات کی طرف سے ملکیت حاصل ہو، لیکن قبضہ کی طرف سے حاصل نہ ہو؟ غور کرنا ہے کہ انسان اپنے اس حق سے جس کا تعلق ذات سے ہے بالعوض یا بلا عوض دست بردار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء کی عبارات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو حقوق دفع ضرر کے لئے نہ ہوں، بلکہ جلب منفعت کے لئے ہوں ان کا عوض لیا جاسکتا ہے۔ یہ سوال کہ حق ملکیت کیا ہے؟ تو عرض ہے کہ حق ملکیت دراصل دو اجزاء پر مشتمل ہیں ”حق عین“ ”حق قبضہ“ حق قبضہ کے سقوط سے حق عین ساقط نہیں ہوتا۔

مفتی نعمت اللہ صاحب:

مدت کی تعیین کو نزاع ختم کرنے کے لئے فقہاء نے ضروری قرار دیا ہے۔ حق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق شیء کی ذات سے ہے اور دوسرے کا تعلق قبضہ سے ہے۔ حقوق مجردہ کی بیع صحیح نہیں ہے۔ وہ حق جس کا تعلق دفع ضرر سے ہے اس کی بیع ناجائز اور جس کا تعلق جلب منفعت سے ہے اس کی بیع جائز ہے۔ ”من ترک مالا او حقا فلورثتہ“ اس سے ظاہر ہے کہ بعض حقوق کی بیع کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب:

دونوں طرح کی باتیں سامنے آئیں، فقہی جزئیات کے نقطہ نظر سے بھی اور مقاصد و مصالح کے لحاظ سے بھی۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے اصول و مقاصد کو سامنے رکھے بغیر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس ذیل میں یہ بات بھی واضح رہے کہ جو قواعد نصوص سے مستنبط ہیں ان کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ خنزیر و مبیہ کا کھانا جائز نہیں، لیکن حالت اضطرار میں قرآن نے اجازت دی ہے انہیں خصوصی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے ”الضرر یزال“ اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ وغیرہ قواعد کا استخراج کیا ہے۔

☆☆☆

تفاسیر و علوم قرآنی اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر  
**دارالاشاعت** کی مطبوعہ مستند کتب

**تفاسیر و علوم قرآنی**

تفسیر عثمانی بجز تفسیر مع عنوانات جدید کتب ۱ جلد	مولانا شبیر عثمانی، ایشیا سوسائٹی پبلسٹی، لاہور
تفسیر مظہری اردو	۱۲ جلدیں قاضی محمد حسن ایشیا سوسائٹی پبلسٹی، لاہور
قصص القرآن	۲۳ حصے در ۲ جلد کامل مولانا حافظ الرحمن سیو سوسائٹی، لاہور
تاریخ ارض القرآن	علامہ سعید سلیمان ندوی، لاہور
قرآن اور ماحولیات	انجینئر شفیع حیدر دانش، لاہور
قرآن سائنس اور تہذیب و تمدن	ڈاکٹر حفصہ فیماں قادری، لاہور
لغات القرآن	مولانا عبدالرشید نعمانی، لاہور
قاموس القرآن	قاضی زین العابدین، لاہور
قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی انگریزی)	ڈاکٹر عبدالرشید عباس ندوی، لاہور
ملک الیسان فی مناقب القرآن (عربی انگریزی)	حسان پینیر، لاہور
امسال قرآنی	مولانا اشرف علی تھانوی، لاہور
قرآن کی باتیں	مولانا احمد سعید صاحب، لاہور

**حدیث**

تفسیر البخاری مع ترجمہ و شرح اردو ۳ جلد	مولانا امجد علی اعظمی، فاضل دیوبند
تفسیر سلیم المسلم	مولانا زکریا اقبال، فاضل دارالعلوم کراچی
جامع ترمذی	مولانا فضل احمد صاحب، لاہور
سنن ابوداؤد شریف	مولانا امجد علی اعظمی، فاضل دیوبند
سنن نسائی	مولانا فضل احمد صاحب، لاہور
معارف الحدیث ترجمہ و شرح ۳ جلد ۷ حصے کامل	مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، لاہور
مشکوٰۃ شریف مترجم مع عنوانات ۳ جلد	مولانا عبدالرحمن کاندھلوی، مولانا عبدالرحمن اویس، لاہور
ریاض الصالحین مترجم	مولانا طفیل الرحمن نعمانی مظاہری، لاہور
الادب المفرد کامل مع ترجمہ و شرح	از امام بخاری، لاہور
منظاہر حق جدید شرح مشکوٰۃ شریف ۵ جلد کامل اعلیٰ	مولانا عبدالرشید جاوید غازی پوری، فاضل دیوبند
تقریر بخاری شریف ۴ حصے کامل	حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، لاہور
تجدید بخاری شریف	علامہ حسین بن مبارک زبیدی، لاہور
تنظیم الاشتات شرح مشکوٰۃ اردو	مولانا ابوالحسن صاحب، لاہور
شرح البیہقونی نووی ترجمہ و شرح	مولانا مفتی عاشق الہی الہرقنی، لاہور
قصص الحدیث	مولانا محمد زکریا اقبال، فاضل دارالعلوم کراچی

ناشر:- دارالاشاعت اردو بازار کراچی فون ۲۶۳۱۸۶۱-۲۶۳۱۸۶۲-۲۶۳۱۸۶۳-۲۶۳۱۸۶۴-۲۶۳۱۸۶۵





علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

# سلسلہ جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۹

- کاروبار میں اولاد کی شرکت
- قبضہ کی حقیقت اور قبضہ سے پہلے خرید و فروخت
- حقوق و منافع کی خرید و فروخت
- پگڑی اور اس سے متعلق شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی  
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت بکاتم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی  
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت بکاتم  
شیخ الاسلام جناب مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت بکاتم

دارالافتاح

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ، کراچی، پاکستان